

# تفسیر المیزان معارف القرآن

تصنیف لطیف

حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقیؒ

تلمیذ رشید

امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

# تفسیر الفرقان فی تفسیر معارف القرآن

تصنیف لطیف

حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقیؒ

تلمیذ رشید

امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اشاعت اول: 2010ء

کمپیوٹر لے آؤٹ: محمد امتیاز احمد

طابع: ذکی سنز پرنٹرس کراچی

ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی

ایڈریس:

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

6 سندھی جماعت کو آپریٹو سوسائٹی، جوگی موڈ بس اسٹاپ

نیشنل ہائی وے کراچی۔ 75030

رابطے کیلئے 021-35000278

0300-2707097

web: [www.hikmatequran.org](http://www.hikmatequran.org)

## فہرست مضامین

46.....	اس کا نتیجہ	19.....	<b>پیش لفظ</b>
47.....	عقل و تمیز	19.....	یورپ سے تعلق
48.....	محصولات	19.....	احساس حقیقت
48.....	خارجی تعلقات	20.....	قرآن کا ذوق
50.....	الزام فساد	20.....	ریشی خطوط
52.....	رفتائے کار کی تعذیب	21.....	جامعہ ملیہ اسلامیہ
53.....	سنت اللہ	22.....	طبع جدید
55.....	طاقت کی نمائش	23.....	<b>باب نمبر ۱: قصص القرآن</b>
56.....	کلمہ حق کا خوف	23.....	فلسفہ تاریخ
57.....	<b>باب نمبر ۲: انجام</b>	23.....	سبب اختصار
57.....	جھوٹے وعدے	24.....	دوا اور مقصد
58.....	احسانات کی یاد	25.....	اقسام ثلاثہ
61.....	فرعون کی ناقابلیت	26.....	احسن القصص
63.....	اقتدار کا بھوت	27.....	حضرت عیسیٰ علیہ السلام
64.....	ذہاب الی اللہ	27.....	اور قسمیں
65.....	نتیجہ کی بشارت	28.....	رجوع الی المقصود
66.....	حسن خاتمہ	30.....	<b>باب ۲: فر اعنه مصر</b>
67.....	بصائر للناس	30.....	چھوٹ چھات
69.....	تفاسیر پر ایک نظر	30.....	قومیت متحدہ کی ضرورت
69.....	وسعت بیان	31.....	ترمذی میں ہے
70.....	اوائل عہد	35.....	اسباب حیات
71.....	زاویہ نگاہ	38.....	بیگار
75.....	جدید راہ	39.....	زاویہ نگاہ کا فرق
76.....	مابعد کی تفسیریں	41.....	سرمایہ داری
81.....	الفاظ کی غلط تعبیر	42.....	نعت عظمیٰ
87.....	غلط فہمی کے اسباب	44.....	حرمت سود
91.....	دعوت و تبلیغ	45.....	غلامی کے اثرات

134	فرشتوں کا مسجدہ	95	سورة البقرة
136	آدم کی جنت	95	سورة کانام
139	نزول الہام	95	ترتیب نزول
141	باب نمبر ۲: قرآن حکیم کی ضرورت	95	ما قبل سے تعلق
142	علمی خرابی	96	موضوع سورة
145	عملی کمزوری	98	روئے سخن
146	انتظامی نقص	98	مضامین کی فہرست
148	اجمال کی تفصیل	104	باب ا: وحی الہی کی ضرورت
148	تذکیر بمابعد الموت	104	حروف مقطعات
149	شفاعت	105	محکم، تشابہ
150	تذکیر بآلاء اللہ	107	موجودہ کتاب
151	غلامی کے آثار باقیہ	109	ارباب تقویٰ
153	تورات کا نزول	109	ایمان بالغیب
154	افراط کا ارتکاب	110	اقامت صلوٰۃ
155	سپاہیانہ زندگی	110	انفاق فی سبیل اللہ
156	شہر کا داخلہ	111	انصار
158	پانی کی تلاش	112	کفار
162	رفع اشتباہ	112	فطرت انسانی کے متعلق مذاہب مختلفہ
164	قانون سے نفرت	113	قرآن کا فیصلہ
165	حیلہ سازی	114	منافقین
167	باریک بینی	116	اصلاح و افساد
170	حیات قومی کی لئے تین قسم کے لوگوں کی ضرورت	121	جرم کا اقرار
171	دست و بازو نہیں بن سکتے	122	امثال قرآنی
172	سکمان حق	123	دو قسم کے لوگ
172	جہلائے یہود کی حالت	124	دعوۃ الی التوحید
174	نجات کا قانون	128	نکتہ چینی
176	عہود و مواثیق	130	(الف) ایمانی کمزوری
178	ہمیشہ سے عادت ہے	130	(ب) ضعف طبیعت
180	ماتحت نہیں رہ سکتے	131	(ج) کوتاہ عقلی
180	تقلید اعمیٰ	133	آدم علیہ السلام



244	غیر اللہ کی غلامی	182	انکار کا سبب
246	صرف کرنے کا قانون	183	پابندی تو راہ کا دعویٰ غلط ہے
250	حکومت کی قابلیت	184	آخرت کے متعلق خیالات
253	فوجداری قانون	186	قابل نفرت ہیں
255	ضابطہ دیوانی	191	علحدگی کا حکم
257	مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت	193	اعتراف کی پوچھاڑ
259	روزہ کی فرضیت	195	ناخ و منسوخ؟
260	صدقۃ الفطر	196	اعتراف کی اصلی غرض
263	روح مذہب کی پابندی	198	ارکان اسلامی کی انتہائی غرض
264	اتباع قانون	202	تنفیخ ملل
267	باب نمبر ۵: معاملات	203	حقیقت قبلہ
268	قمری حساب ہو	206	بعثت کی ضرورت
270	باب نمبر ۶: سیاست مدن	210	انصاف سے کام لیں
271	فصل اول: جہاں گیری	215	دعائے رزق
271	کوئی مقام مستثنیٰ نہیں	216	دعائے خلیل
273	کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں	219	ایک اور حجت
275	کوئی وقت مستثنیٰ نہیں	220	صنۃ اللہ
276	جہاد ہی میں زندگی ہے	222	شہداء علی الناس
277	فریضہ حج	223	بیت المقدس عارضی قبلہ کیوں بنا؟
280	حج کے احکام	225	تحویل قبلہ
283	تجارت بھی جائز ہے	227	مرکز قائم کرنا ہے
284	اتحاد عمل شرط ہے	229	قبلہ ایک ہی ہو گا
284	شریف النسب کو دعوت اسلام دو	229	چند لطیف نکلتے
285	دو قسم کے آدمی	233	باب ۳: تہذیب اخلاق
286	مقطع سخن	233	اخلاق کی تفصیل
289	پورے پورے مسلم بن جاؤ	235	مواقع صبر
290	جہاد فی سبیل اللہ کی غرض	238	تعلیم گاہ حریت
293	مکالیف کا آنا ضروری ہے	239	تبلیغ و دعوت
294	کہاں روپیہ صرف کریں	242	باب ۴: تدبیر منزل
294	جہاد کب تک رہے گا	242	دولت کمانے کے ذرائع

337	اثبات قیامت	296	ناجائز ذرائع کا استعمال حرام ہے
338	ایک اور مثال	297	کتنا خرچ کریں؟
340	انفاق فی سبیل اللہ کی شرطیں	297	یتامی کی تربیت
340	من واذیٰ نہ ہو	299	فصل ثانی: جہاں داری
341	رضائے الہی پیش نظر رہے	299	توطیہ و تمہید
342	بہترین مال خرچ کرو	300	نکاح کی غرض
345	انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف	301	مسلمان کی عظمت
346	سود کی حرمت	303	افزائش نسل
349	اعلان جنگ	304	برو تقویٰ کی حفاظت
351	قرض کا قانون	307	طلاق کے متعلق چند الفاظ
354	رہن کی اجازت ہے	308	تین حیض کا انتظار
354	ارکان خلافت اور تعلق باللہ	310	طلاق رجعی
356	یوں دعا کرو	311	حلالہ
357	حسن خاتمہ	313	ضرر دینا جائز نہیں
359	بسم اللہ الرحمن الرحیم	314	رکاوٹ پیدا نہ کرو
359	الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ	315	مسئلہ رضاعت
359	<b>سورہ آل عمران</b>	317	عورت انتظار کرے
359	سورہ کانام	318	طلاق قبل الوطی
359	ترتیب نزول	321	فصل ثالث: ضروریات جہاد
360	ما قبل سے تعلق	321	میدان جنگ اور موت
360	روئے سخن	322	روپیہ بھی دو
362	موضوع سورہ	323	انتخاب امیر
362	تلخیص مضامین	324	شرائط انتخاب
365	باب نمبر ۱: الوہیت مسیح	325	نزول برکات
365	نصاریٰ کی غلط کاری	326	فوج کا امتحان
366	نزول قرآن	330	باب ۷: خلافت کبریٰ
368	قطعی فیصلہ	330	ایک لطیف نکتہ
369	تقسیم کتاب	332	خلیفہ اسلام کے فرائض
370	فطری طریق	334	جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں
371	فیصلہ کن راہ	335	وجود باری تعالیٰ

398	نبی اُمّی کے لئے پیشین گوئی	372	ایک مثال
399	مریم سے وعدہ ہائے خداوندی	373	نتیجہ
403	مریم کا تعجب	374	رجوع الی المقصود
404	عیسوی معجزات	374	خلاصۃ المرام
405	صراط مستقیم	375	دعائے ہدایت
406	من انصاری الی اللہ	376	تباہی کی وعید
407	مکر کی تشریح	377	غلبہ اسلام
409	وعدہ ہائے خداوندی	377	جنگ بدر
409	رجوع الی المقصود	378	اختلاف مقاصد
410	توفی کی تحقیق	379	فرزندان اسلام
411	رافع الی	381	باب نمبر ۲: دعوت اسلام
412	تیسرا وعدہ	381	فصل اوّل: نصاب تعلیم
412	فضیلت و برتری	381	اساس عالم
412	دو قسمیں	382	صرف اسلام مطلوب ہے
413	کامیابی کا عہد	383	ترقی ناممکن ہے
414	ابن اللہ کا ابطال	383	دوزخ کی بشارت
415	مباہلہ کی دعوت	385	قانون سے اعراض
416	توحید خالص	385	یہ کیوں
418	سینہ بسینہ تعلیم	386	فصل ثانی: شرائط خلافت
419	کائنات غلت	386	حکومت کی دعا
420	باب نمبر ۳	388	انقطاع تعلقات
420	فصل اوّل: اہل کتاب کی خرابیاں	390	انتباہ
420	انتہائی سفاہت	391	بہترین طریق عمل
421	خدع و فریب	392	فصل ثالث: تاریخی نظائر
422	فضل عظیم	392	برگزیدہ خاندان
423	خان و بد عہد	393	عمران کی بیوی کی دعا
425	اصلی قانون	394	قبولیت دعا
425	عاقبت کار	395	بشارت یحییٰ
426	تحریف کتاب	396	طلب آیت
426	انسان خدا نہیں بن سکتا	397	مریم کی برگزیدگی

468	امیر کی تخصیص	428	اغذیثاق
469	موت کا وقت	430	انتہاء
470	استقلال شرط ہے	432	طغرائے امتیاز
470	نصرت الہی کا وعدہ	433	کوئی عذر نہیں رہا
472	ایفاء وعدہ	435	ایک اعتراض
474	فساد عظیم کی روک تھام	436	حج بیت اللہ
476	نزول اطمینان	437	آیات ینات
477	معنی خیر حقیقت	440	اپنی تکذیب آپ
478	بھاگنے والوں کی تعداد	441	فصل ثانی: انقطاع تعلقات
479	کون لوگ بھاگے ہیں	443	فرقہ بندی ممنوع ہے
481	صرف حسرت باقی ہے	445	دعوت و ارشاد
482	تنظیم جماعت کے اصول	447	اختلاف سے بچو
484	توکل علی اللہ	449	اتحاد و اختلاف کے نتائج
484	خیانت ناممکن ہے	451	خیر الامم
486	شان بینہما	452	اللہ نگہبان ہے
487	ہذا الصائر للناس	453	مزید تفصیل
488	کالیف کا لطیف جواب	455	منافقین سے پرہیز
490	انظار مسرت	456	مزید تشریح
490	جنگ میں مرنا یقینی نہیں	457	باب نمبر ۴: غزوہ احد
492	آپ غمگین نہ ہوں	457	فصل اول
493	فرق و امتیاز	457	ما قبل سے ربط
493	فصل ثانی	457	واقعات احد
493	ان سے پرہیز کرو	459	رجوع الی المقصود
494	ناشائستہ حرکات	460	غزوہ بدر
495	دجل و فریب	460	اعداد ملائکہ
497	فصل ثالث: اوصاف ضروریہ	461	بیجا انتقام
497	اولو الالباب	462	جنت کی طلب
498	وہ فرض یہ ہے	464	تذکیر بایام اللہ
499	وعدہ الہی	465	بیان للناس
500	فضائل مخصوصہ	465	غم کا علاج
501	حی علی الفلاح	466	مقصد کیا تھا

539	مقصد کیا تھا
539	نزول برکات
541	ملائکہ کی آمد
543	نصرت الہی کا ظہور
544	طریق جنگ
546	باب (۲): جنگ سے بھاگنا جرم ہے
547	دست عمل
549	آفتاب آمد دلیل آفتاب
550	اوّلی الامر کی اطاعت
551	جہاد ہی میں زندگی ہے
551	قلت تعداد کا عذر
552	فرض منصبی کی حفاظت
553	تقویٰ اللہ
553	دارالندوہ میں مشورہ
555	قانون تحذیب
556	بیت اللہ کے وارث
557	ہمیشہ جنگ کرتے رہو
559	تقسیم غنائم
560	گدایان عشق
562	جھگڑا مت کرو
563	اسباب ہزیمت
564	ارباب نفاق
565	تذکیر بایام اللہ
566	نقض عہد
567	سامان حرب کی فراہمی
568	خون ریزی مقصد نہیں
570	تحریض علی القتال
571	کتاب من اللہ
572	وعدہ الہی
573	سیاسی مواخات

<b>تفسیر الفرقان فی معارف القرآن (جلد دوم)</b>	
505	تمہید
506	انتخاب طبعی
507	قوموں کی جنگ
507	القرآن الحکیم
507	جزئیات تنازع للبقاء
509	فلسفہ جنگ
510	متمدن اقوام
511	کتاب مبین
512	فرصت جہاد
515	مقصد کا تعین
516	مسلمان کے خون کی قیمت
517	عالمگیر اورری
518	فضیلت و برتری
520	آلات حرب کی فراہمی
521	جنگ اور جہاد
524	اسوہ حسنہ
525	حکومت اور جہاد
526	اصیو ادا علی اللہ
527	<b>سورۃ الانفال</b>
527	سورہ کا نام
527	ترتیب نزول
528	ما قبل سے ربط
529	موضوع سورہ
531	تلخیص مضامین
533	باب (۱): قانون جنگ
533	انتیازات مسلم
535	غزوہ بدر پر اجمالی نظر
535	جنگ کے لئے نہیں نکلے
537	اخراج عن البیت

601	قلت تعداد	575	رزق کریم
602	غربت کا خوف	577	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
603	جزیرہ نمائے عرب	577	اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
604	فصل سوئم: جاہدوا فی اللہ حق جہادہ	577	سورة التوبہ
604	اصلاح عام	577	سورة کانام
606	غلط عقائد	578	ترتیب نزول
606	شرک فی الاعمال	578	ما قبل سے تعلق
607	عالم اور دولت مند	579	ترک بسم اللہ
608	جہاد ہمیشہ رہے گا	579	موضوع سورة
609	دھوکا دہی	581	خلاصہ مضامین
610	کوئی استثنا نہیں	581	باب اوّل: اعلان جنگ
611	غار ثور کا واقعہ	582	باب دوم: ارباب نفاق
612	ہر وقت تیار رہو	583	باب سوم: السائقون الاولون
613	باب ۲	585	باب نمبر ۱
613	فصل اوّل: ارباب نفاق	585	فصل اوّل: اعلان جنگ
613	مصالح خصوصی	585	انذار حرب
614	غفور و درگزر	586	غور کی مہلت
614	شکی لوگ	587	الحج الاکبر
615	جاسوس ہیں	588	پابندی عہد
616	فتنہ سے بچتے ہیں	590	قتل عام
617	غازی یا شہید	591	درس قرآن
617	روپیہ بیکار ہے	592	وجہ مخالفت
618	کذب آفرینی	592	مزید تشریح
619	بندگان زر	593	بہترین علاج
619	مصارف صدقات	595	فصل دوم: آمادہ گی جہاد
620	رسول پر کتہ چینی	595	مقصد انتخاب ہے
622	تمسخر و استہزا	596	رفع اعذار و مواعظ
623	تذکیر بایام اللہ	596	مذہبی تقدس
624	الجہاد فی سبیل اللہ	597	احب الاعمال الی اللہ
625	بخیل لوگ	600	دنیاوی ضروریات

باب نمبر ۳ .....	628	رجوع الی المقصود .....	652
فصل اوّل: السابقون الاولون .....	628	تنبیہ .....	654
پیچھے رہنے کا نتیجہ .....	628	باب نمبر ۱: صبر و تقویٰ .....	655
دولت اور نفاق .....	630	فصل اوّل: تاویل احادیث کی تعلیم .....	655
گاؤں کے لوگ .....	631	سردلبرہاں .....	655
قابل الزام .....	632	سچا خواب .....	656
دیہاتی زندگی .....	632	تعبیر .....	656
السابقون الاولون .....	633	آیات للسائلین .....	658
مختلف اقسام .....	634	مشورہ قتل .....	658
مسجد ضرار .....	635	تدبیر الہی .....	659
انتباہ .....	637	باپ سے درخواست .....	660
فصل ثانی: اشاعت جہاد .....	638	صبر جمیل .....	660
بہترین سودا .....	638	ایک سوال .....	662
خارجی علامات .....	639	یابشری .....	662
دعائے مغفرت نہ کرو .....	639	لطف خداوندی .....	663
اصحاب ثلاثہ .....	640	استدلال واستشہاد .....	665
اعلیٰ ترین طبقہ کے فرائض .....	642	فصل ثانی: دوسرا دور .....	666
جہاد کی ابتدا .....	644	معاذ اللہ .....	666
مسرت وشادمانی .....	644	پاک دامنی .....	667
حسب اللہ .....	645	معنی خیز تفسیر .....	668
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ .....	647	برہان رب .....	669
<b>سورۃ یوسف</b> .....	647	عبادنا الخالصین .....	669
سورۃ کا نام .....	647	فریب کاری .....	670
مقام نزول .....	647	عزیز کا فیصلہ .....	670
ترتیب مضامین .....	647	ایک اور حیلہ .....	671
بائبل اور قرآن .....	648	اعتراف شکست .....	672
موضوع سورۃ .....	650	السمن احب الی .....	672
اجمال کی تفصیل .....	651	ساتی و باورچی .....	673
جذبہ امانت .....	652	اعلان توحید .....	674
باقی خواب .....	652	حقیقی تعبیر .....	676

699	فصل دوم	676	صاف مطلب
699	رسول اللہ ﷺ	677	بادشاہ کا خواب
699	الہام	677	ذریعہ نجات
701	انبیاء کرام کا طریق عمل	678	الزامات کی تحقیق
702	انجام	679	امر آة العزیز کی شہادت
703	ہدایت و رحمت	680	محقق کی رائے
705	الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ	680	حمکین فی الارض
705	ذکرئی: پارہ عسم کی تفسیر	681	حقیقہ علیم
705	سکی اور مدنی تقسیم	682	بصار و حکم
705	سکی سورتیں	685	باب نمبر ۲
705	مدنی سورتیں	685	خواب کا سچا ہونا
706	اس کی حکمت	685	فصل اوّل
706	رسول کی ضرورت	685	بھائیوں کی آمد
707	قلب القرآن	686	رواگی کی اجازت
708	الغبا	687	اللہ پر بھروسہ
708	موضوع سورۃ	688	پیالہ کی چوری
708	جزائے اعمال پر زور	689	کدنا لیوسف
710	یوم الفصل	689	انتم شرمکانا
710	عظیم الشان خبر	690	مشورہ کے مطابق بیان
711	ایک نکتہ	691	صبر جمیل
713	تشریح الفاظ	691	اعتماد علی اللہ
713	مناظر قدرت سے استدلال	692	انتہائے صبر
713	قیامت کا دن	693	استجاب و حیرت
714	آثار و قرائن	694	حجتہ اللہ البالغہ
715	پہاڑوں کے مختلف حالات	694	کرشمہ ہائے قدرت
716	نتائج اعمال	695	عجائبات قدرت
716	عذاب کا سبب	696	اقسام قصص
717	ارباب تقویٰ	696	قد جعلہ ربی حقا
718	جنت کی حقیقت	697	یوسف کی دعا
718	کس روز	698	چند موعظت



740	وحی والہام	719	رجوع الی المقصود
740	واقعات قیامت	721	<b>النازعات</b>
741	خمسہ مستحیرہ	721	موضوع سورۃ
742	تطابق اقسام	723	رفع استبعاد قیامت
743	بعض خصوصیات	723	اقیام القرآن
743	عالم گیر تعلیم	724	رجوع الی المقصود
745	<b>الانفطار</b>	724	فرشتوں کی خصوصیت
745	تفخیص مضامین	725	اظہار تعجب
745	مالک یوم الدین	726	فرعون کی ہلاکت
745	حادثہ قیامت	727	عبرۃ لمن یحشی
746	آخر یہ کیوں	728	نتائج اعمال
746	محافظ موجود ہیں	729	قیامت کی تاریخ
747	ظہور نتائج	730	دنیا کی زندگی
748	مالک یوم الدین	731	<b>عبس</b>
749	<b>المطففين</b>	731	تفخیص مضامین
749	تفخیص مضامین	732	مساوات عمومی
750	القسطاس المستقیم	732	عبداللہ بن ام مکتوم
750	تاجروں کی مثال	732	یہ عتاب نہیں
750	امثال القرآن	733	عصمت انبیائے کرام
751	تذکیر بما بعد الموت	734	غلط فہمی کا ازالہ
751	جد اگانہ نتائج	734	خصوصیات قرآن
752	انکار کا سبب	735	اعتبار
753	ارباب تقویٰ	735	انسان کی ناشکر گزاری
754	مقرئین اور ابرار	736	ابتداء انتہا
754	تقسیم کی اصلی غرض	736	درمیانی زندگی
754	باہمی تقابل	737	اسلام کی خصوصیت کبریٰ
755	الجوزاء من جنس العمل	738	غور و نسل بے کار ہے
756	<b>الانشقاق</b>	738	عمل کی قاہرانہ قوت
756	تفخیص مضامین	739	<b>التکویر</b>
756	یا ایھا الانسان انک کادح	739	تفخیص مضامین
756	ہلاکت و بربادی		

772	ضرورت الہام	757	احب الیمین
772	الحمد للہ رب العالمین	758	مجرمین کے نتائج
773	اعتبار	758	مناظر قدرت
774	حیوانات کی نگہداشت	759	اعتبار
774	وحی والہام	760	<b>البروج</b>
774	الامشاء اللہ	760	تلخیص مضامین
775	جہر و خفی	760	مخالفین اسلام یقیناً برباد ہوں گے
775	باہمی تطبیق	760	اقسام ثانیہ
776	تبلیغ قرآن	760	والسماوات البروج
776	راہ نجات	761	الیوم الموعد
777	دین قیم	761	شاہد و مشہود
778	<b>الغاشیہ</b>	761	شہادت کی تفصیل
778	تلخیص مضامین	762	جرم کی نوعیت
778	اصول کامرانی	763	الہامات انبیائے کرام
778	ناکام لوگ	764	اگر عذاب میں تاخیر ہو
779	ارباب ایمان	765	تاریخی شہادت
779	طبع انسانی کا خاصہ	766	کفار کا انکار
780	سادگی طبع	766	یہ فیصلہ اٹل ہے
781	بلندی مقصد	767	لوح محفوظ
782	استقلال	768	<b>الطارق</b>
783	فروتنی	768	تلخیص مضامین
783	ایک مثال	768	یوم الدین
784	فرض تبلیغ	768	الطارق
785	<b>الفجر</b>	769	طریق استشہاد
785	تلخیص مضامین	769	نفسی شہادت
785	جزائے اعمال	770	بعث بعد الموت
785	اقسام کی تفصیل	770	نشاۃ ثانیہ
786	ہماری رائے	771	مزید مہلت
786	جفت اور طاق	772	<b>الاعلیٰ</b>
787	واللیل اذا یسر	772	تلخیص مضامین

801	اختلاف اعمال	787	عبرت و موعظت
802	کامیاب لوگ	788	تذکیر بایام اللہ
802	بحط مستقیم مخالف	789	انفرادی احتساب
804	ارباب تقویٰ	789	اس کا اصلی سبب
805	<b>الضحیٰ</b>	790	آخری احتساب
805	تفخیص مضامین	791	ظہور نتائج
805	والمنعمۃ ربک فحدث	792	<b>البلد</b>
805	شان نزول	792	تفخیص مضامین
806	دن اور رات کی شہادت	792	لقد خلقنا الانسان فی کبد
806	دائمی وعدہ	792	طریق استشہاد
807	ماضی کی تذکار	793	رسول اللہ ﷺ
808	ارحوا من فی الارض	793	فرزند آدم
809	تبلیغ قرآن	793	غلط مصرف
810	<b>الانفصاح</b>	794	اصلی راہ
810	تفخیص مضامین	795	فک رقبتہ
810	رفع موانع	795	مساکین ویتائے
810	شرح صدر	795	احب المینمۃ
811	بوجہ کا ہلکا ہونا	796	بد بخت
811	رفع ذکر	797	<b>الشمس</b>
812	رنج و راحت	797	تفخیص مضامین
812	اثابت الی اللہ	797	کامرانی و خسران
814	<b>التین</b>	797	مناظر قدرت
814	خلاصہ مضمون	798	طریق استدلال
814	فما یکذبک بعد بالدین	798	نفس انسانی
814	تین اور زیتون	799	جواب قسم
815	بقیہ اقسام	799	تاریخی شہادت
815	استشہاد کا مقصد	800	قرآن کا منصب اصلی
816	احسن تقویم	801	<b>اللیل</b>
816	بدترین خلائق	801	تفخیص مضامین
816	ایک استثناء	801	ان سحیم لشی

831	واقعات قیامت	817	جزائے اعمال
831	زلزلہ	818	<b>العلق</b>
832	حکم خداوندی	818	تلخیص مضامین
832	مختلف گروہ	818	دشمنان اسلام کی بربادی
833	<b>العادیات</b>	818	شوق عبادت
833	تلخیص مضامین	819	آپ کا خوف زدہ ہونا
833	ان الانسان لرہہ لکنود	819	مانا بقاری
833	گھوڑوں کی شہادت	820	ابتدائی الہام
834	انسان کی ناشکری	820	رجوع الی المقصود
835	مرض کا سبب	820	احسانات خداوندی
835	غلط فہمی کا ازالہ	821	انسان کی سرکشی
836	تذکیر بمابعد الموت	821	مخالفت کی انتہا
837	<b>القارعة</b>	822	تباہی کا اعلان
837	تلخیص مضامین	823	تاخیر کا سبب
837	یوم التغابن	824	<b>القدر</b>
837	تباہی عالم	824	تلخیص مضامین
838	نتائج اعمال	824	العروة الوثقی
839	<b>التکاشف</b>	824	شب قدر کی بزرگی
839	تلخیص مضامین	825	نزول قرآن
839	حقیقت اعمال	825	خصوصیات شب
839	کثرت طلبی	825	تنبیہ واعتبار
840	حقیقت اعمال	827	تلخیص مضامین
841	رجوع الی المقصود	827	نبی الانبیاء کی ضرورت
841	اگر حقیقت پیش نظر رہتی	827	تقسیم مذاہب
843	<b>العصر</b>	828	رسول من اللہ
843	تلخیص مضامین	829	اختلاف کیوں ہوا
843	کلید کامرانی	829	کیا تعلیم تھی
843	زمانہ کی شہادت	830	مخالفین کا انجام
843	طرق تذکیر	831	<b>الزلزال</b>
844	کامیاب لوگ	831	تلخیص مضامین

859	شکر نعمت	846	<b>الہمزہ</b>
860	اس کا نتیجہ	846	تلخیص مضامین
861	<b>الکافرون</b>	846	اخلاق اور دولت
861	تمہید	846	باہمی تصادم
861	انقطاع تعلقات	846	گمان باطل
861	ناممکن	847	نتیجہ
862	دامنی فیصلہ	848	<b>الفیل</b>
863	آخری اعلان	848	تلخیص مضامین
863	ادوار ثلاثہ	848	شعار الہیہ
864	یہ اعلان جنگ ہیں	848	واقعہ کی تفصیل
864	لکم دینکم ولی دین	849	قانون تغذیب ام
866	<b>النصر</b>	850	تشریح الفاظ
866	تمہید	850	ضروری تشریح
866	فوز و ظفر کا اعلان	851	نتائج و عبر
866	نصرت الہیہ کا اظہار	852	عیسائی اور مسلمان
867	اعلان وفات	853	<b>القریش</b>
867	دوسری توجیہ	853	تمہید
869	<b>اللہب</b>	853	صوفیائے کرام و علمائے عظام
869	تمہید	853	شوق تجارت
869	کفار کی ہزیمت	854	بصار و حکم
869	ابولہب	856	<b>الماعون</b>
870	درس عبرت	856	تمہید
871	<b>الاخلاص</b>	856	مالی قربانی
871	تمہید	856	زبانی دعویٰ
871	توحید خالص	857	حقیقت نماز سے غفلت
871	اللہ کی وحدانیت	857	ماعون
872	احد اور واحد	858	<b>الکوثر</b>
872	اللہ الصمد	858	تمہید
872	برابری کا دعویٰ	858	حیات ملی
873	نتیجہ	858	کوثر کا مطلب

880	قرآن حکیم کی تفسیر و تعبیر کا جامع اسلوب ...	874	الفلق .....
883	”مکاتب قرآنیہ“ کا قیام .....	874	تمہید .....
884	قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت کا دوسرا پہلو: .....	874	جسمانی مضرات سے تعویذ .....
885	جمعیت الانصار کا قیام .....	874	توطیہ و تمہید .....
889	دفعہ دوم (۲) .....	875	رجوع الی المقصود .....
889	دفعہ سوم (۳) .....	875	خلاف فطرت سے پناہ .....
890	دفعہ چہارم (۴) .....	875	ضروریات زندگی فراہم ہوں .....
892	عام فہم ترجمہ قرآن کی ضرورت اور ترجمہ شیخ الہند .....	876	ناگہانی آفات .....
897	”نظارة المعارف القرآنیہ“ کا قیام پس منظر اور مقاصد .....	876	حاسد سے بچا .....
900	نمبر ۱۷: .....	877	الناس .....
901	نمبر ۱۸: .....	877	تمہید .....
901	نمبر ۱۹: .....	877	روحانی مضرات سے تعویذ .....
901	نمبر ۲۰: .....	877	شدید ترین دشمن .....
905	حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی .....	878	صفات الہیہ .....
908	”تفسیر الفرقان فی معارف القرآن“ .....	878	پناہ کی طلب .....
912	حوالہ جات .....	879	ابتدا اور انتہا .....

## پیش لفظ

### یورپ سے تعلق

عرب کے رہنے والے عموماً تجارت کرتے تھے، اسی غرض کے لئے وہ دور دراز کے سفر اختیار کرتے تھے اور مال دولت لے کر اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ ہندوستان میں بھی وہ برابر آتے رہتے اور مدت ہائے دراز سے ایک ملک کی چیزیں دوسرے میں منتقل کرتے، مگر اب آہستہ آہستہ ان کو یورپین قوموں نے میدان تجارت سے دھکیلنا شروع کیا، مغلوں کے زمانہ میں انہوں نے مختلف اطراف میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں اور آخر کار عرب شکست کھا کر بالکل پیچھے ہٹ گئے اور ہندوستان کا پورا بازار ان کے قبضہ میں آ گیا۔

ان کی تجارت کیا تھی؟ عام لوگ تو اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتے تھے، مگر حساس دل، بیدار مغز اور دور بین ارباب سیاست اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ اس تجارت کی تہ میں کیا چیز کام آ رہی ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان خوب سمجھتے تھے کہ یہ تجارتی کوٹھیاں تجارت کے پس پردہ کیا کیریئرہ دوانیاں کر رہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے قدم اس سر زمین پر جم سکیں، مگر کسی نہ کسی طرح انجام کار ہندوستان کی سیاست کلیہً یورپ کے قبضہ میں آ گئی۔

یورپ میں اگرچہ مختلف قومیں آباد ہیں، مگر جہاں تک ان کی سیاست کا تعلق مشرق کے ساتھ ہے، اس میں وہ سب متحد ہیں اور ایک ہی انداز پر وہ مشرقی قوموں کے ساتھ سلوک کرتی ہیں، البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس میدان میں سب سے آگے انگلستان ہے۔ اس نے ہندوستان کے اندر باقی تمام یورپین کو شکست دے کر تنہا اپنا اجارہ قائم کیا اور ڈیڑھ سو سال تک بلا شرکت غیرے اس سر زمین پر اپنا جھنڈا لہراتا رہا۔

### احساس حقیقت

انگریزوں نے جب اس ملک پر قبضہ کر لیا تو اپنی حکومت مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک اجنبی ظالم حکومت کا خاصہ ہے۔ ابھی ان کو اقتدار قائم کئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ دہلی کے مردم خیز شہر میں شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اس حقیقت کا احساس کر لیا کہ ان کی سیاست کا رخ کس طرف ہے، اس لیے انہوں نے اپنی سرکردگی میں ایک جماعت بنائی، جس کا مقصد وحید یہ تھا کہ انگریز کی سیاست کو قدم قدم پر آگے بڑھنے سے روکے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حضرت سید احمد بریلوی کو امیر المجاہدین بنا کر سرحد کی طرف بھیجا، مگر افسوس کہ اپنے ہی

ہاتھوں اس کوشش کو ناکام ہونا پڑا۔

۱۸۵۷ء میں ہندو مسلمانوں نے متح دھو کر انگریز کے خلاف بڑا زبردست محاذ قائم کیا اور یہ ہندوستان کو اجنبی اقتدار سے آزاد کرنے کی پہلی متفقہ کوشش تھی، مگر انجام کار انگریز ہی غالب رہا اور رہی سہی ہندوستانی قوت کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ اس مسلسل ناکامیوں کے باوجود یہاں کے رہنے والے ہمت نہ ہارے اور مل جل کر انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے استخلاص وطن کیلئے کام کرنے لگے۔ اس سعی و جہد کی پوری تاریخ آپ کے سامنے ہے جسکے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

## قرآن کا ذوق

غالباً ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی قدس سرہ اپنے استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے دیوبند آئے ہیں۔ ان دنوں وہاں تعلیم پارہا تھا۔ مولانا کے علم و فضل و ذکا، بیدار مغزی اور سیاست دانی سے دارالعلوم کا بچہ بچہ واقف تھا، جیسے ہی ان کے آنے کی خبر ملی، مولانا محمد میاں المعروف بہ مولانا منصور مجھے ان کی خدمت میں لے گئے۔ کہہ نہیں سکتا کہ ان سے مل کر کس قدر مسرت و شادمانی اور اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اس کیفیت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ مولانا کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ وہ جب تک رہے قرآن کریم اور حجة اللہ البالغہ کا درس برابر ہوتا رہا۔ سردی کی راتوں میں بارہا ایسا ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد جو درس شروع ہوا، تورات کے تین چار بج گئے اور استاد و شاگرد میں سے کسی نے بھی تھکن محسوس نہ کی۔

مولانا کافی دن تک رہے۔ دن رات یہی مشغلہ رہتا تھا۔ ان صحبتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں درس و فکر کا ذوق پیدا ہو گیا۔ دیوبند سے فارغ ہو کر میں میرٹھ کالج میں عربی کا پروفیسر ہو گیا اور مولانا نے مسجد فتحپوری دہلی کے شمالی کمروں میں “نظارة المعارف القرآنیہ” کو قائم کیا۔ میں ہر شنبہ کی شام آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور پیر کے روز میرٹھ واپس جاتا۔ آخر مولانا افغانستان کو روانہ ہو گئے اور میں تین سال کے بعد کالج کی پروفیسری چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا، جہاں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد “دارالارشاد” میں شب کے وقت قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے اور ایک عجیب و دلنریب ایمانی کیفیت قلوب و اذہان میں پیدا کرتے تھے۔

## ریشمی خطوط

۱۹۱۶ء کے اوائل ہی میں ریشمی خطوط اور غالب نامہ کے سلسلہ میں طول و عرض ملک میں تلاشیاں اور گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ کو تو حکومت نے “رائچی” میں نظر بند کر دیا اور مجھے یہ حکم ملا کہ لاہور شہر کی میونسپل حدود سے باہر نہ جاؤں اور پنجاب سی، آئی، ڈی کے دفتر میں ہفتہ وار اپنی حاضری کی اطلاع دیا کروں۔ آخر مارشل لا کا مشہور حادثہ فاجعہ ہوا، بادشاہی مسجد کا سب سے پہلا مقدمہ تھاجو سپیشل ٹریبونل میں پیش ہوا،



اخباروں کے اندر اسکا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مجھے ”عمور در یائے شور“ اور ”ضبطی جائیداد“ کی سزا ملی اور فیصلہ کے آخر میں یہ بھی لکھا گیا کہ اگر یہ رحم کی درخواست کرے گا تو اسکی سماعت نہ ہوگی۔ ۱۵ دن لاہور سینٹرل جیل میں رہنے کے بعد ملتان سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

گرمقاری سے دو ایک روز پہلے میں نے خواب دیکھا کہ ملک نصر اللہ خاں عزیز ایڈیٹر اخبار ”کوثر“ اور میاں ریاض بی اے کو اکھاڑا بوٹا مل لاہور میں قرآن پڑھا رہا ہوں۔ پہلے سورہ یوسف کی تفسیر کا درس دیا پھر سورۃ العصر کا، اگلے دن یہ دونوں جو اس وقت اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے میرے پاس آئے، تو میں نے اپنا خواب ان سے بیان کیا، انہوں نے بتایا کہ ہم تو اپنا اپنا خواب بیان کرنے آئے تھے۔ ہم تینوں کے خواب میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ میں نے کہا کہ گرمقاری کا زمانہ بالکل قریب تھا، آپ تو اوصی بالحق اور توصی بالصبر پر پوری قوت کے ساتھ عامل رہیں۔ انشاء اللہ فتح و کامرانی ہمارے ہم رکاب ہوگی۔

ملتان سینٹرل جیل میں فرصت کا تمام وقت قرآن کریم کے لئے وقف تھا۔ بنی اسرائیل کے واقعات و حوادث بار بار سامنے آتے تھے۔ ان کی پوری تاریخ ازبر تھی اور فرعون نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا، وہ بھی مخفی نہ تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ایک ایک آیت ہندوستانیوں اور انگریز پر صادق آرہی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل اور فرعون کے حالات بیان کر کے پیشین گوئی کے طور پر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی پوری زندگی معجزانہ انداز میں بیان کر دی ہے۔ انگریز ہمارے ساتھ وہی کر رہا ہے جو فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ کر رہا تھا۔ اگر ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ اپنے سامنے رکھ لیں، تو ہم یقیناً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ انگریز اور فرعون میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں کی سیاست ایک ہی طرح کی تھی۔ اس لیے لازمی تھا کہ نتیجہ بھی ایک ہی قسم کا نکلے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

یہ تاثرات تھے جو میرے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ ملتان سینٹرل جیل سے نکلنے کے بعد جب میں لاہور آیا تو ترک موالات کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ جامعہ کے قیام کے لیے حضرت شیخ الہند قدس سرہ دیوبند سے علی گڑھ گئے اور میں لاہور سے۔ مولانا محمد علی مرحوم، حضرت شیخ الہند قدس سرہ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھے حکم دیا کہ میں جامعہ میں قرآن کریم کا درس دوں، جس خدمت کو میں اس وقت تک انجام دے رہا ہوں۔

علی گڑھ میں مجھے ان تاثرات کے قلم بند کرنے کا موقع ملا جن کو میں نے ”بصائر“ کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ میری پہلی کوشش تھی جو کتاب کی صورت میں ظاہر ہوئی، مگر ارباب ذوق نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دیکھا کہ ان کے حالات اس میں پورے پورے بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ کتاب کئی مرتبہ چھپی۔ ادھر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکتبہ

جامع کو قروں باغ میں آگ لگادی گئی، تو اس میں نہ صرف میری تمام مطبوعات نذر آتش ہو گئیں بلکہ کئی نئی کتابوں کے مسودات کو بھی راکھ کا ڈھیر ہونا پڑا۔

طبع جدید

اب جب ملک میں سکون پیدا ہوا اور حالات رو بہ اصلاح ہونے لگے، تو احباب نے پیہم اصرار کیا کہ اس کو پھر سے شائع کروں، مگر ادھر تو ہمت ٹوٹ چکی تھی اور اس کا کوئی نسخہ نہ ملتا تھا۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا اور سمجھا کہ بلا ٹل گئی، مگر یہ بات نہ تھی۔ تقاضے ہو رہے تھے اور ان کی قوت بڑھ رہی تھی کہ اتفاق سے حامد علی خاں صاحب ناظم مکتبہ کی سعی و کوشش سے اس کا ایک نسخہ مل گیا جو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کے لطف و کرم کے طفیل ہدیہ قارئین کرام ہو رہا ہے۔

عبداللہ الحی کان اللہ لہ

۷ ار رمضان ۱۳۶۸ھ

۱۴ جولائی ۱۹۴۹ء

جامعہ نگر دہلی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

## باب نمبر ۱ قصص القرآن

### فلسفہ تاریخ

قرآن کریم میں گزشتہ امتوں کے واقعات و حوادث بیان کئے گئے ہیں۔ ان قصوں کے بیان کرنے میں اس کتاب عزیز کا ایک اندازِ تبلیغ یہ ہے کہ وہ عموماً واقعہ کے انہیں اجزاء کو بیان کرتا ہے جو نتائج و عبرت اور موعظت و موضوعِ حکایت کے لحاظ سے قصہ کے ضروری و ناگزیر اجزاء ہیں۔ اور ان چیزوں کو بالکل چھوڑ جاتا ہے جن کے بیان سے موضوعِ استدلال و مقصدِ موعظت کو کوئی تعلق نہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ توریت سامنے رکھ لی جائے اور کسی مشترک قصہ کو دونوں میں دیکھا جائے۔ تورات کا مقصد بیانِ قصص سے عبرت و موعظت اور استخراج و عرضِ نتائج نہ تھا، اس لیے وہ ایک مؤرخ و راوی کی طرح اول سے آخر تک تمام واقعات بیان کرتی ہے اور اس باب میں صرف جمع و استقصاء و احاطہ کو پیش نظر رکھتی ہے۔ نفع و عدم نفع، و احتیاج و عدم احتیاج کو نہیں، برخلاف اس کے قرآن کریم کا مقصد ”کتاب پیداؤں و خروج“ کی طرح جمع واقعات و تاریخ نہیں ہے، بلکہ ہدایت و موعظت۔ وہ کسی قصہ کو لیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ مؤرخ کی طرح مرتب کر دے، بلکہ اس لئے کہ ان سے کسی خاص تعلیم کے لیے استشہاد کا کام لے، حفظ واقعات و تاریخ دنیا کے لیے بیکار ہے بجز اس کے کہ اس کے نتائج مستقبل میں کام آئیں۔ فلسفہ تاریخ کا یہی مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اقوام و امم کے مشہور ایام و سنین و انقلابات سے استخراجِ نتائج و استنباطِ شواہد و تعلیل و توجہ امور کرتا ہے، اسی کا نام بصائر و موعظت ہے اور اس معنی میں دنیا کے پاس قصصِ اولین کے لیے بجز قرآن کے اور کوئی کتاب نہیں۔ قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (۱۰۴:۶) تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیلیں پہنچ چکی ہیں، تو جس نے دیکھا، اس نے بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا، اس نے اپنے حق میں برا کیا۔

### سبب اختصار

اختصار بیانِ قصص و عدم اعتناء بہ بعض جزئیات واقعہ کی ایک علت تو یہ ہے۔ کہ دوسری ایجازِ بلاغت و عدم اعادہ

و تکرار جزئیات ہے، یعنی جن جزئیات کو سامع قرینہ سے خود سمجھ لے گا، کیونکہ انکی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے، ان کا اعادہ بالکل ترک کر دیا جاتا ہے۔ جو جزئیات قصص ضمناً واضح ہو جاتے ہیں ان کی طرف مستقلاً اشارہ نہیں کیا جاتا، یا جن الفاظ اتصال و ربط کو بیان و قرینہ بتلا رہا ہے اس کو ترک کر دیتا ہے۔

ایک اور قسم ہے یعنی تیسری۔ قرآن مجید میں بڑا حصہ قصص کا بنی اسرائیل و اہل کتاب کے متعلق ہے۔ یہ قصص نہایت شرح و بسط سے روایات یہود میں موجود تھے اور یہود و نصاریٰ عموماً ان سے واقف تھے۔ پس قرآن مجید ان کے بعض اجزا کو اس بنا پر چھوڑ جاتا ہے کہ سامع ان کے بیان کا محتاج نہیں اور پورا قصہ اس کے علم میں موجود ہے، صرف اشارہ کافی ہو گا۔ اشارہ کر کے اس کے ذہن کو اس نتیجہ کی طرف پھیر دیا جائے جو اس قصہ میں موجود ہے۔ مگر غفلت و ضلالت کی وجہ سے وہ معرض ہے۔ مخاطب کے لیے اس میں کاوش اور دلچسپی بھی ہے، ورنہ وہ ایسی باتوں کے سننے سے گھبر جائے جو اس کو پہلے سے بصرح تمام معلوم ہیں۔

### دو اور مقصد

پس قصص معلومہ و مشہورہ اہل کتاب کے بیان میں قرآن ارشادات پر اکتفا کرتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں اس کے دو مقصد اور بھی ہیں، اکثر واقعات ایسے تھے جن کی روایت و کتابت میں سخت غلطیاں پڑ گئی تھیں۔ یا راویوں اور کاتبوں کے ادہام و رسوم و عوائد سے مختلط ہو گئے تھے یا عدم اسباب نامہ حفظ کی وجہ سے بعض کڑیاں معدوم ہو گئی تھیں یا تقلید و پرستش قدامت کی وجہ سے مکتوب تورات پر روایات احبار و علماء تفسیر و تاویل شرح کو مقدم کر دیا تھا۔ سوان امور کی اصلاح و تصحیح بھی قرآن کریم نے اپنے اعمال مہمہ میں داخل کی، کیونکہ اختلاف کے لیے حکم، اور ظنون و ادہام کے لیے وہ کتاب مبین تھا۔ پس جن قصص میں اور قصہ کے جن حصص میں ایسے اغلاط پیدا ہو گئے تھے، ان کو خاص طور پر بیان کر کے، اصلیت مستورہ کو واضح کر دیا ہے۔

یا بعض عقائد کی غلطیاں تھیں جو بعض واقعات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھیں اور ان کی وجہ سے لاکھوں انسان ضلالت میں مبتلا ہو گئے تھے، تو بیان واقعات کے ضمن میں ان کی حقیقت بھی کھول دی اور اہل کتاب پر واضح کر دیا کہ ان کی معلومات تاریخی اس بارے میں لائق احتجاج نہیں۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن مجید قصص اہل کتاب کو جب بیان کرتا ہے، تو اس کا انداز اور مقصد بیان کیا ہوتا ہے، مختصر جملوں میں یہ کہ:

(الف) استدلال و موعظت وغیرہ، اور یہ عام ہے۔

(ب) تصحیح بعض واقعات مہمہ۔

(ج) رد بعض عقائد مبنی علی القصص۔

ان تینوں صورتوں میں وہ صرف ان ہی کلموں سے تعرض کرتا اور بیان کرتا ہے، جن سے استدلال و موعظت یا تصحیح و اقعات یا تصحیح عقائد مقصود ہے۔ باقی کے لیے مخاطبین کے علم اور قصص کی شہرت پر اعتماد کرتا ہے۔

### اقسام ثلثہ

پس قرآن مجید کے اختصار بیان کی تین قسمیں ہوئیں۔

(۱).... مقصود تاریخ نہیں، بلکہ بعض ایام و سنین مشہورہ عالم سے استدلال و استشہاد اور بعض نتائج عبرت و ہدایت

کے لیے نظائر و امثال و استقراء تاریخی، اس لیے صرف مطلوبہ اجزاء کو لے لیا۔

(۲).... ایجاز بلاغت، و عدم تکرار غیر ضروری، و قناعت بہ قرآن و دلالت معنوی۔

(۳).... مخاطبین میں وہ واقعات شہرت رکھتے ہیں اور ان کی تفصیل ان کے پاس موجود ہے، پس اشارات پر اکتفا اور

باقی کے لئے سامع کے علم پر اعتماد، الا یہ کہ تصحیح و اقعات یا تصحیح عقائد مقصود ہو اور اس لیے باوجود علم مخاطبین ان

کو اغلاط سے الگ کر کے صورت صحیحہ میں جلوہ گر کیا جائے۔

پہلی قسم کی مثال میں تقریباً تمام حصہ قصص پر نظر ڈالیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کے واقعات تورات کی

چار کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ کیونکہ مقصود تاریخ محض تھا۔ لیکن قرآن کریم نے جس قدر بیان کیا ہے وہ زیادہ سے

زیادہ چار صفحات میں آسکتا ہے، کیونکہ مقصود عبرت و موعظت و استدلال و استشہاد و جمع نتائج تھا، قرآن صرف حضرت

موسیٰ کی پیدائش، خروج، محاربہ فلسطین و عمالقہ اور پھر بعد از موسیٰ میں سے صرف قصہ طالوت و عہد دادو سلیمان کو بالا

اختصار بیان کرتا ہے اور ان کے نتائج پر توجہ دلا کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے واقعات کتاب پیدائش کے تین صفحات میں آئے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم تمام سوانح لوط علیہ السلام

میں سے صرف اسی قدر حاصل سخن لے لیتا ہے کہ:

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيقَهُمْ وَصَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۖ (۱) وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ۖ

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۖ قَالَ لَیْقَوْمٌ هَؤُلَاءِ بَنَاتٍ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْذَلُوا فِي صَیغِی ۖ

أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ۖ (۲) قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَالَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقِّ ۖ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۖ (۳) قَالَ لَوَ أَنَّ

لِی بَیْكُمْ قُوَّةٌ أَوْ أَوْحِیَ إِلَی رُكُنٍ شَدِيدٍ ۖ (۴) قَالُوا یَلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَصْلُوَا إِلَیكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّیْلِ

وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرَاتُكَ ۖ إِنَّهُ مُصِیْبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۖ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۖ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیبٍ

ۖ (۵) فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَابًا ۖ وَمَنْ سِجِّیلٌ ۖ مَّنْضُودٌ ۖ (۶) مُسْوَمَةٌ عِنْدَ

رَبِّكَ ۖ وَمَا هِیَ مِنَ الظَّالِمِینَ بِبَعِیدٍ ۖ (۷)

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے، تو وہ ان سے غمناک اور تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مشکل

کادن ہے اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ دوڑتے ہوئے آئے اور یہ لوگ پہلے ہی سے برے کام کیا کرتے تھے۔ لوط نے کہا کہ بھائیو! میری لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لیے پاک ہیں، تو خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارہ میں میری آبرو نہ کھو، کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں۔ وہ بولے کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں کی ہمیں کوئی حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اسے تم جانتے ہو۔ لوط نے کہا اے کاش! مجھ میں تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں پناہ پکڑ سکتا، فرشتوں نے کہا کہ لوط ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں، یہ لوگ ہر گز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تو کچھ رات رہے سب اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص مجھے پھر نہ دیکھے، مگر تمہاری بیوی کہ جو آفت ان پر پڑنے والی ہے وہی اس پر پڑے گی ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، اور کیا صبح کچھ دور ہے۔ تو جب ہمارا حکم آیا، ہم نے اس بستی کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا اور ان پر پتھر کی تہ بتہ کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کئے ہوئے تھے اور وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

اب غور کرو، سارے قصہ لوط علیہ السلام کا حاصل ہے اور جتنا واقعہ بیان کیا ہے اس کے انداز بیان خواتیم آیات اور جابجا کے ارشادات میں کس طرح ہدایت و تنبیہ و موعظہ و بصیرت کو ملحوظ رکھا ہے۔ برخلاف اس کے صفحات تورات ان حکم و ابصار سے یکسر خالی ہیں، البتہ نہایت تفصیل سے ایک بے اثر قصہ جمع کر دیا ہے۔ لایسن ولا یغنی من جوع۔ اسی طرح قصہ نوح و قصہ طالوت کو دیکھئے اور مقابلہ کیجئے۔

حضرت لوط وغیرہم کا نسب نامہ، وطن کی حالت، قوم کی بدکاریوں کے مشرع و واقعات، آپس کا سوال و جواب، بعد از عذاب کی حالت، ان تمام امور کو قرآن نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ہمیشہ بہ تتبع قرآن ہر حکیم اجتماعی نظر انداز کر دے گا۔

### احسن القصص

دوسری قسم کی مثال بھی تمام حصہ قصص میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سورۃ یوسف کو دیکھے، غیر ضروری ٹکڑوں کو کس طرح نظر انداز کر دیا ہے، بھائی مشورہ کرتے ہیں کہ باپ سے یہ جا کر کہیں گے، اب چاہئے کہ ان کا باپ کے پاس جانا اور طے شدہ مشورہ کے مطابق باتیں کرنا بھی بیان کیا جائے۔ داستان سراسر اس قسم کے ٹکڑوں کو ہمیشہ دو جگہ دکھلائے گا، ایک مشورہ کے وقت اور ایک ملاقات پدر کے وقت۔ تورات میں ایسا ہی ہے، لیکن قرآن صرف ایک موقعہ کو لے لیتا ہے اور چونکہ دوسرے موقع پر اسی کے مطابق حکام ہوئے، اس لئے اس کو بیان نہیں کرتا:

إِذْ جَعَلْنَا إِلَىٰ آبَائِهِمْ فِتْنَةً فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَاهُ وَمَا كُنَّا لِنُغَيِّبَ حَفِظِينَ ۝ وَنَقَرْنَا فِيهَا الْقُرْآنَ لِقُبُلِهِمْ وَنَقَرْنَا فِيهَا ۝ وَإِنَّا لَصَدُوقُونَ ۝ اب اس کے بعد ہی باپ کا جواب ہے۔  
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۝

اس دوسری قسم میں اس کو بھی دیکھئے کہ جس مقام پر اشخاص کے ناموں سے کوئی خاص نتیجہ یا اثر نہیں مرتب ہوتا،

وہاں ان کے نام بھی نہیں لیے جاتے، یوسف کے بھائیوں کے نام نہیں بتلائے، کیونکہ ان سے کوئی فائدہ نہ تھا، اور اہل کتاب کو معلوم، اسی طرح وہ مقامات جہاں قال، قالوا اجاب کو مخذوف کر دیا ہے، مثلاً سورۃ مومنون میں فارسلنا فیہم رسولاً منہم، ان اعبدا للہ الخ “ان اعبدا للہ” رسول کا قول ہے، مگر بیان نسبت قولی کو ترک کر دیا، کیونکہ قرآن سے معلوم ہے۔ بصورت عام چاہئے تھا، قال اعبدا للہ، الخ۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تیسری قسم کی بنا پر بھی تمام قصص اہل کتاب پر نظر ڈالیے، ایک بڑا نمونہ سورہ یوسف ہے۔ قرآن مجید بقیہ حصص کے لیے معلومات مخاطبین یعنی اہل کتاب پر اعتماد کرتا ہے، الا یہ کہ تصحیح واقعات و رفع اختلافات، و رد عقائد باطلہ کی ضرورت پیش آجائے، اس کی عمدہ مثال حضرت مسیح کا قصہ ہے۔ سورۃ مریم اور بعض حصص آل عمران سے مقصد حضرت مسیح کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ بنی اسرائیل کی ضلالت، انکار و قتل انبیائی، دعوت موسوی کے ظہور آخری و تبشیر ظہور رسالہ کبری و دعوت عظمیٰ وغیرہ مقاصد پیش نظر ہیں۔ اسی سلسلہ میں ان غلطیوں کا ازالہ بھی ضروری ٹھہرا جو حضرت مسیح کے متعلق یہود و نصاریٰ میں پھیل گئی تھیں۔ یہود نے نبوت کا انکار کیا اور مریم صدیقہ پر زنا کا الزام لگایا، نصاریٰ نے ظہور مسیحی کی حقیقت گم کر دی اور “عبداللہ” کو “ابن اللہ” ٹھہرایا، پس ضمناً جزئیات کو بھی بیان کر دیا جن سے ان گمراہیوں کا رد ہو جاتا تھا، مثلاً جزئیات پیدائش حضرت مسیح وغیرہ۔

واقعہ صلیب کی اصلیت گم ہو گئی تھی۔ پس ضرور تھا کہ تصحیح واقعہ کر دیا جائے، لہذا ماقتلوه و ما صلیبوه و لکن شبہ لہم فرمایا۔ اسی طرح حضرت سلیمان کے واقعات، قصص یہود و روایات طالمود میں بے حد مسخ ہو گئے تھے۔ یہودیوں کے یہاں حضرت سلیمان کی وہی حیثیت ہو گئی تھی، جیسے عوام مسلمانان ہند میں “امیر حمزہ” امی ایک فرضی ہیر و کی صدہار مز خرافات و مافوق الفطرۃ عجائب و غرائب ان کی طرف منسوب ہو گئے تھے اور گھر گھر پھیل گئے تھے، کتاب اللہ تو دراء ظہود ہم تھی۔ زیادہ تر دار و مدار روایات احبار و مکتوبات طالمود تھا، جیسے آجکل قرآن سے زیادہ قصص الانبیاء مساجد کے جماع میں مقبول ہے۔ قرآن حکیم نے ان طغوتیوں کا انسداد کیا اور عہد سلیمان کے اصلی اور سچے واقعات بیان کر دیئے۔ قصہ ہاروت و ماروت اور انکار کفر سلیمان، جس کی تفسیر میں لوگ سرگرداں ہیں، اسی قسم کے ماتحت لا کر حاصل کیجئے۔

### اور قسمیں

ایک مرتبہ پھر ان قصص پر نظر ڈالیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے موضوع و مقصد اور طرز استدلال و استنباط نتائج کی بنا پر کئی قسموں میں منقسم ہیں۔

(الف).... بعض سورتیں ہیں، جن میں ان قصص کے بیان کرنے سے ایک طرح کا استقرار تاریخی مقصود ہے، یعنی

یہ ثابت کرنا کہ آغاز نزول ہدایت سے لے کر اس وقت تک شریعت الہیہ کی یکساں تعلیمات نے ہمیشہ یکساں نتائج پیدا کئے ہیں، اور اس لئے ماضی کا استقراء ثابت کرتا ہے کہ حال و مستقبل میں بھی ان مؤثرات و اسباب سے وہی نتائج پیدا ہوں گے۔ سورہ ہود ملاحظہ کیجئے۔

جن سورتوں میں یہ طرز استدلال مقصود ہے، ان میں گزشتہ واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور وہ بالکل ایک مرتب و منظم زنجیر کی طرح ہیں، جس میں یکے بعد دیگرے ایک ہی شکل و صورت کی کڑیاں رکھ دی گئی ہیں۔

(ب).... بعض سورتیں ہیں، جن میں یہ استقراء تاریخی مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف کسی ایک عمل اور اس کے نتیجہ کی طرف دنیا کو متوجہ کرنا ہے جو بارہادنیامیں ظاہر ہو چکا ہے اور ہمیشہ وہی نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے لیے ترتیب تاریخی کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف گزشتہ واقعات میں سے زیادہ واضح، زیادہ مؤثر، زیادہ جامع اور مخاطبین کے معلومات و فہم سے زیادہ اقرب حوادث کا چن لینا کافی تھا۔ چنانچہ ان سورتوں کا انداز یہی ہے، اور تم پاؤ گے کہ ان میں تاریخی ترتیب بالکل مفقود ہے۔ سورہ شعراء کو دیکھئے۔

(ج).... کہیں وحدت ادیان و توحید شرائع مقصود ہے، اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ایک ہی شریعت الہیہ ہے، جس کی طرف برابر ہر ظہور نے دعوت دی اور سب کی دعوت کا مقصد قیام دین الہی و عدم تفرقہ و اختلاف تھا، چنانچہ سورہ شوریٰ کا یہی موضوع اصلی ہے۔

### رجوع الی المقصود

گزشتہ اوراق میں ہم نے بڑی حد تک قصص القرآن پر پوری تفصیل سے بحث کر دی ہے، اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قصوں میں پہلی قسم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات و حوادث تھے، اس رسالہ میں ہم اپنے مباحث کو صرف بنی اسرائیل ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ ان حالات و واردات کے بیان کرنے سے ہمارا صرف یہ مقصد ہے کہ کتاب عزیز کے بعض پہلوؤں کو ممتاز و نمایاں کیا جائے اور ارباب نظر و بصیرت پر یہ کیفیت واضح ہو جائے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اگر چشم بصیرت واہو، تو ہم اس وقت بھی قصہ فرعون و موسیٰ کا تماشا ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

ہم نے بنی اسرائیل کو قصص القرآن کی اولین صف میں لا کر کھڑا کیا، اور سب سے پہلے ان ہی کے سوانح و حالات سے بحث کی، اس انتخاب کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن حکیم نے سورہ بنی اسرائیل میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے درآئے، اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی چھائی، اور ان کو عذاب دینے کے لئے دو جابر و قاہر قومیں مسلط ہوئیں۔ پہلی بربادی بخت نصر والی بابل کے ہاتھوں ہوئی اور دوسری نیش قیصر روم کے ہاتھوں۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ



أُولَٰئِكَ بِمَا عَصَوْا عَنْكُمْ عِبادَ اللَّهِ أَتَوَّلُوا الْأُولَىٰ بَأْسِ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَلِ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝

اور ہم نے بنی اسرائیل سے اسی کتاب میں صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دودفعہ فساد کرو گے اور دونوں دفعہ ملک پر بڑی زیادتیاں بھی کرو گے، تو جب ان فسادوں میں پہلے فساد کا وقت آیا، تو ہم نے تمہارے مقابلہ میں اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کیے جو بڑے سخت گیر تھے اور وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیا ہی کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی، یعنی اہل بابل کے ہاتھوں اور دوسری کا ظہور یورپ سے ہوا، یعنی روم۔

رسول اللہ ﷺ نے جہاں ماور صد ہا امور پر پیشین گوئی کے طور پر روشنی ڈالی اور وہ سب کے سب حرف بہ حرف ثابت ہوئے، اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا۔

لیاتین علی امتی ما ائی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل۔

میری امت پر بھی وہ سب کچھ گزرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گذر چکا ہے۔

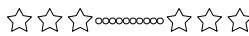
ٹھیک اسی طرح فتنہ تاتار کے ظہور میں مسلمانوں کے لیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل کی واسطے بخت نصر کے ظہور میں تھا۔ یہ فتنہ ایشیا کا تھا اور وہ ہو چکا ہے، دوسرا یورپ کا ہے جو ہو رہا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بنی اسرائیل کے متعلق نہایت ہی مفصل و مبسوط درس دیئے ہیں اور اس میں قوم کی اجتماعی و انفرادی خرابیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مندرجہ بالا حدیث نے یہ بتا دیا کہ مسلمانوں میں وہ تمام باتیں پیدا ہو کر رہیں گی جن کا شکار بنی اسرائیل ہوئے۔ سورۃ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے مسلمانوں اور یہودیوں کے حالات کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ فرزند ان اسلام ٹھیک ٹھیک یہودیوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

فراعنہ مصر نے صدیوں تک بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ ان کی فطری آزادی کو سلب کر لیا اور ان کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تا آنکہ قدوس حق نواز نے اپنا دست اعانت دراز کیا، اور موسیٰ عمران کو فرعون کی تباہی و بربادی کے لئے بھیجا۔ آج اس زمانہ کے فراعنہ وہ سب کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں جو کئی ہزار برس قبل بنی اسرائیل کے ساتھ سرزمین مصر میں ہوا۔ وما یعقلها الا العلیمون، وقلیل ماہم۔ ہم نے اسی حقیقت کو آئندہ اوراق میں بیان کیا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں

گفتہ آید در حدیث دیگران



## باب ۲

## فراعنہ مصر

## چھوت چھات

کنعان کا ایک اسرائیلی نوجوان سرزمین فراعنہ میں قدم رکھتا ہے، غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا جاتا ہے۔ پھر وہی نوجوان عمل صالح کی قاہرہ قوت سے مصر کے تاج و تخت کا مالک بن جاتا ہے۔ فراعنہ مصر کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مصریوں کو اس زمانہ میں غیر قوموں سے بڑی نفرت تھی، حتیٰ کہ ہندوؤں کی طرح چھوت کرتے تھے۔ توراۃ میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے دسترخوان چنوا یا اور انہوں نے اس کے لئے الگ اور ان کے لیے جدا، اور مصریوں کے لئے جو ان کے ساتھ کھاتے تھے علیحدہ چنا۔ اس لیے کہ مصری کی لوگ عبرانیوں کے ساتھ کھانا کھا نہیں سکتے، مصری اسے مکروہ جانتے ہیں۔“ (پیدائش ۳۴-۳۳)

ایسی قوم کی نگرانی میں بنی اسرائیل کو قریباً چار سو سال تک مصر میں مقیم رہنا پڑا۔ قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کیے۔ اس اجنبی رعایا کے تباہ و برباد کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس طرح اللہ کی زمین، فراخی و وسعت کے باوجود اس قوم پر تنگ ہو گئی، تا آنکہ مالک السموات والارض کے ہاتھ نے حرکت کی اور ایک ہی آن میں فراعنہ مصر کی ظالمانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا، اور آئندہ کے لئے یہ قانون بنادیا کہ جب کبھی کوئی فرعون اس کرہ ارض کی پشت پر نمودار ہو گا، اس کو سمندروں میں غرق کرنے کے لیے فوراً ایک موسیٰ پیدا کر دیا جائے گا، جو اس کو آنا فائتا ہی کے سمندر میں غرق کر دے گا۔ دنیا اس وعدہ الہی کے ماضی کو دیکھ چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے۔ وکان وعداً مفعولاً۔

فرعون نے اس قوم پر جو جو مظالم کیے، ان کی الم انگیز داستان تو بہت طویل ہے اور ایک مبسوط تصنیف کی محتاج ہے۔ ہم نے فی الحال قرآن حکیم کے چند مقامات کو درس و فکر کے لیے چن لیا ہے، کہ ان سے استنباط و استخراج کیا جائے اور ارباب فہم و بصیرت ان نتائج و عبر کو آویزہ کو شش بنائیں۔

## قومیت متحدہ کی ضرورت

اقوام عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، تسلط و تنزع اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب ہیں، ان میں سب سے اہم و اعظم ترین اتحاد و اشتراک عمل ہے، قوم کے تمام افراد اپنے آپ کو ایک ہی جسم کے اجزائے مختلفہ یقین

کریں۔ سب کا مقصد ایک ہی ہو، اسی کا عشق دامن گیر ہو اور اسی کی محبت کی زنجیریں سب کے پاؤں میں ہوں، مریں تو اسی کے لیے اور زندگی ہو تو اسی کی خاطر۔

پیکرش از قوم وہم جانشی ز قوم  
ظاہرش از قوم وپہنائش ز قوم

قرآن حکیم نے جابجا اتحاد و اجتماع کو زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اصل قرار دیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے عرب کو اور پھر تمام دنیا کو ان الفاظ میں مخاطب کر کے فرمایا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ (۳: ۱۰۳)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو سب کے ہاتھ ہی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں، اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے سرفراز کئے گئے، تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا، پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

شارع علیہ السلام نے اسی بنا پر اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا اور علیحدگی کو جاہلیت سے تعبیر کیا۔

من خراج من الطاعة وفارق الجباعة فبات، مات، ميتة جاهلية۔

جو اطاعت سے باہر ہو گیا اور اس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا پھر اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

ترمذی میں ہے

من فارق الجباعة شذافا فکانا خلع ربة الاسلام عن عنقه۔

جو شخص بالشت بھر بھی جماعت سے باہر ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں یہ حدیث بیان کرتے تھے۔

علیکم بالجباعة فان الشيطان مع الواحد، وهو من الاثنين ابعد۔

جماعت سے الگ نہ ہو، ہمیشہ جماعت بن کر رہو، کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہو تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا و انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے۔ ان میں اتحادی اور جماعتی قوت پیدا ہو گئی، اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔

اسی طرح: علیکم بالسواد الاعظم اور فانه من شذ، شذ فی النار۔ اور: ید الله علی الجباعة: اور: لایجمع الله امق علی الضلالة۔

تمہیں جماعت کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اس لیے جو جماعت سے الگ ہو اودہ دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کی تائید و نصرت فقط جماعت کے ساتھ ہے۔ میری امت کو اللہ گمراہی پر جمع نہیں کر دے گا۔

اس بارے میں مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

نماز میں جماعت پر زور دیا، ”اھدن ی“ کی جگہ ”اھدنا الصراط المستقیم“ فرما کر بتا دیا کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں، ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے۔ جمعہ و عیدین کو اگر حقیقت بین نظر سے دیکھے تو اتحاد کی غرض نمایاں اور ممتاز نظر آئے گی۔ زکوٰۃ کی غرض و غایت ہی یہی تھی کہ جماعتی زندگی کی بقا و استحکام کی جانب فرزند ان تو حید کو متوجہ کیا جائے۔ شارع نے ”توخذ من اغنیائہم و تر دالی فقرا تہم“ میں اسی فلسفہ اجتماع کو بیان کیا تھا۔ حج میں مجملہ اور اسرار و مصالح کے ایک سب سے بڑی غرض و مصلحت یہی ہے۔ جب ایک شخص نے حضرت رسالت سے دریافت کیا کہ حج کسے کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا، ”الحج عرافۃ“، میدان عرفات میں اجتماع کا نام حج ہے۔ چنانچہ تمام ائمہ اعلام کا یہی مذہب ہے کہ جو شخص عرفات میں حاضر نہ ہو اس کا حج نہیں ہوتا۔

ہر ظالم و جابر اور اجنبی حکومت کی اولین سعی و کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز طریقوں سے کام لے کر اپنی رعایا میں پھوٹ اور اختلاف ڈال دے، ان کے مختلف گروہ بن جائیں، ان میں اس قدر اختلافات پیدا ہوں کہ شب و روز ان میں مبتلا رہ کر ایک دوسرے کو فنا کرنے کی فکر میں رہیں۔ اگر ایک بھائی ترقی کرنے لگے تو دوسرا اسکے گرانے اور ذلیل کرنے کے درپے ہو۔ ہر وقت اپنی ہی قوم کے ذبح کرنے کی تجاویز پر غور و فکر ہوتی رہے۔ اس اختلاف و تفریق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اجنبی حکومت کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہیں، جو ہر وقت ان مختلف گروہوں کو آپس میں لڑاتی رہتی ہے اور ہر ضعیف جماعت کو قوی کے مقابلہ میں بھڑکا کر دونوں کی قوت کو پاش پاش کر دیتی ہے۔

اس خانہ جنگی کے باعث رعایا کے دل میں نہ تو کبھی شریفانہ جذبات پیدا ہوئے ہیں اور نہ ہی کبھی حریت و استقلال قومی کا انہیں خیال آتا ہے، بلکہ ہر فریق کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہی اجنبی حکومت ہمارے ملک پر قابض رہے اور بباگ و دہل ہر جماعت اپنی کوتاہ فہمی اور کم عقلی کی وجہ سے اس کا اعلان کرتی ہے کہ ہماری زندگی صرف اس حکومت کے بقا و استحکام کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے تمام جماعتیں اپنے اپنے طور پر اس کے قیام کی خاطر ہر قسم کی غداری اور ملت فردشی کی مرتکب ہوتی ہیں اور نہیں دیکھتیں کہ وہ دراصل اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ قدرت کی جانب سے ہر قوم کو جارہانہ اور مدافعانہ قوت و طاقت نوازش کی جاتی ہے، کہ حسب ضرورت اس کو غیروں کے مقابلہ میں صرف کیا جائے، لیکن آہ ثم آہ! اختلاف کے وقت یہی چیز اپنے بھائیوں کو غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے صرف کی جاتی ہے۔ فیاللاسف و یاللعار!

اپنے حقوق کی نگہداشت، حریت حقہ کی حفاظت اور ارتقاء ملت کا خیال دل سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اجنبی حکومت خواہ کیسی ہی ظلم و جور کرنے والی اور ناانصاف و مفسدہ پرداز ہو، جسکے مظالم روز روشن کی طرح ”الم نشرح“ ہو چکے ہوں اور جس نے کبھی اپنے عہد کی پابندی نہ کی ہو، اختلاف و تفریق کے وقت اسی کو رحمت الہی قرار دیا جاتا ہے۔ خوشامد، چالوسی اور تملق کے جذبات خبیثہ ان بد بختوں کی تمام انفرادی و اجتماعی زندگی کو فنا کر دیتے ہیں۔ سورہ قصص ان حقیقتوں کی طرف ہماری یوں راہنمائی کرتی ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٥٠﴾

فرعون ملک مصر میں بہت بڑھ چڑھ رہا تھا اور اس نے وہاں کے لوگوں کے الگ الگ گروہ قرار دیئے تھے، ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو اس قدر کمزور سمجھ رکھا تھا کہ انکے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، اس میں شک نہیں کہ وہ فساد یوں میں سے ایک فساد تھا۔ اس آیت میں فرعون کے چند مظالم بیان کئے گئے ہیں۔

(الف).... بنی اسرائیل کے سپاہیانہ جذبات کو فنا کرنے کے لیے فرعون نے سیاسی فریب اور مکاری کے ذریعہ اس میں بغض و عداوت، پھوٹ و نفاق اور باہمی انتقام کے امراض پیدا کر دیئے، ان کی جمعیت کو توڑ دیا، ان کی قومیت کو فنا کر دیا اور انکی اجتماعی قوت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، یہی مسئلہ توازن ہے۔

جب ایک قوم اختلافات و منازعات باہمی کا شکار ہو جائے تو اسکا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے، اقبال کی جگہ اوبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ غلامی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر خدا کی لعنت طاری ہوتی ہے تو وہ غلامی اور محکومی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہے۔ مفسرین کرام نے ضَرْبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ آيْنَ مَا تُنْقِضُوا إِلَّا يَحْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلُ مِنَ النَّاسِ (۳:۱۱۲) جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے، مگر اللہ کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے اور نیز لوگوں کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے کہیں ان کو پناہ مل گئی تو دوسری بات کی ہے، کی یہی تفسیر کی ہے۔ اور هُوَ النِّقَادُ عَلَى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ (۶:۶۵) وہی خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر کی طرف سے کوئی عذاب تمہارے لیے نکال کھڑا کرے، کا مطلب یہی ہے۔

سورۃ انفال میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، کہ آپس میں جھگڑا کرنے سے تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

(ب).... فوجی طاقت: جب بنی اسرائیل میں مختلف جماعتیں پیدا ہو گئیں، تو اب فرعون کو یہ خیال دامن گیر ہوا کہ چوں کہ اس قوم میں ابھی تک کچھ لوگ بیدار دماغ، متحرک اعصاب اور مضطرب دل رکھتے ہیں اور سیاست کی چھپی ہوئی چالوں کے زہر آلود اثر کو محسوس کرتے رہتے ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے۔ نہ لڑکے زندہ رہیں گے نہ ان میں حریت و استقلال قومی کے خیالات پیدا ہوں گے۔ صبر و استقامت، ہمت و جوانمردی اور جوش فداکاری و سرفروشی یک قلم نابود ہو جائے گا۔ نوجوان ہی سے فوج بنتی ہے جو ہتھیار سنبھالتی ہے اور دشمنوں کے ساتھ میدان جہاد و قتال گرم کر کے اپنے حقوق کی حفظ و نگہداشت کرتی ہے۔ قتل کرنے سے لڑکوں کا نام و نشان باقی نہ رہے گا، فوجی طاقت فنا ہو جائے گی۔ حکومت کو رعایا کی جانب سے کسی قسم کا خوف و خطر باقی نہ رہے گا اور اس طرح یہ لوگ بے دست و پا ہو کر اس ظالمانہ حکومت کے ہاتھ میں آئے۔ بے جان بن جائیں گے اور اپنی فطری حرکت کو چھوڑ کر اس کے اشاروں پر چلیں گے۔

اس ظلم و جور اور قہر و استبداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی فوجی طاقت پر عالم ممت طاری ہو گیا اور آن واحد میں نشو و ارتقا سے رک گئی۔

(ج) قلت افراد: لڑکوں کے ذبح کرنے سے فرعون کے پیش نظر ایک چیز یہ بھی تھی کہ بنی اسرائیل کی آبادی روز بروز کم ہوتی جائے، تاکہ بتدریج ان کی ترقی کی تمام راہیں بند ہو جائیں اور کچھ مدت کے بعد ان کا نام و نشان بہ حیثیت قوم کے حرف غلط کی طرح دنیا سے باطل ہو جائے۔

(د).... اخلاقی قوت: قوم، عبارت ہے اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے، رسول کریم نے اپنی بعثت کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

”بعثت الائم مکارم الاخلاق“ میں عمدہ ترین اخلاق کی تکمیل و اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ قوموں کی بنیاد مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً اس کے افراد آپس میں مل جل کر اور جماعت بن کر رہیں۔ سپاہیانہ جذبات اور جنگ جوینانہ احساسات رکھتے ہوں۔

فضائل اخلاق اور محاسن اعمال سے آراستہ ہوں۔

فرعون نے لڑکوں کو ذبح کیا، کہ بنی اسرائیل کی لڑکیاں آزادانہ عصمت فروشی کریں، ان کی اخلاقی قوت برباد ہو، ہر گلی اور کوچہ میں فاحشہ عورتوں کے چکلے ہوں جن کی نگرانی خود ارکان حکومت کے ذمہ ہو۔ انہیں کی سرپرستی اور ولایت میں بد عملی و بد کرداری کا بازار گرم ہو اور اس بد بخت قوم کی ہر لڑکی حاکم سے سند اجازت لے کر بازار میں اپنے حسن و جمال کی نمائش کر سکے، فوجی لوگ بغیر کسی ظاہری رکاوٹ کے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کر سکیں اور اگر ارکان حکومت کو دو شیزہ اور نوجوان لڑکیوں کی تلاش و جستجو ہو تو آسانی سے مل سکیں۔

(ہ).... نوجوان: اسے معلوم تھا کہ آزادی و حریت کی راہ میں بوڑھے ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں۔ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان میں مصلحت، دوراندیشی اور عاقبت بینی آجاتی ہے۔ بات بات میں بحث و جدل کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کی کمزور ہڈیاں ٹکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت نہیں کر سکتیں، اس لیے بچنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ قربانی اور ایثار کی اگر کوئی توقع ہو سکتی ہے تو صرف نوجوانوں سے جو دالہانہ و مضطربانہ نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر اپنی ہر چیز حریت و استقلال قومی کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے نوجوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ فرعون نے اس فتنہ کو روکنے کی یہ تدبیر کی کہ نوجوانوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا۔

یہ مظالم آپ کے سامنے ہیں ان کو دیکھئے اور پھر گہری نظر سے دیکھئے۔ فرعون کیا چاہتا ہے؟ یہ کہ: قوم حریت و اجتہاد فکر سے محروم رہے۔ مذہب و اخلاق سے اجنبی اور فسق و فجور میں مبتلا ہو۔ اپنے آباؤ اجداد کے روشن کارناموں کو فراموش کر دے اور قومی روایات سے دور جا پڑے۔ غلامی اور محکومی کی بوجھل بیڑیاں اس کے پاؤں میں ہمیشہ کے لیے رہیں۔ اپنی قوم کی آزادی کے خیال سے محروم ہو کر غلامی پر قناعت کر لے۔

اپنے تمام اوقات بیکاری میں صرف کرے، اس میں سستی اور کاہلی پیدا ہو، جسم و جان کمزور و ناتوان ہوں۔ منافقت، بد عہدی اور ندامت نفس کا شکار ہو۔

اکبر مرحوم نے اپنے انداز خاص میں فرمایا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سو جھی۔

ارباب بصیرت خوب سمجھتے ہیں کہ اکبر نے کس طرح آیت کے نتائج و ثمرات کو اس شعر میں بیان کر دیا ہے جو یورپین تہذیب و شائستگی کا مغز اور نچوڑ ہیں۔

### اسباب حیات

جس قوم کے قبضہ میں سامان حرب ہو، وہ آلات جنگ کے استعمال سے واقف ہو، اور ہمیشہ رزم گاہوں میں شریک ہوتی ہو۔ وہی قوم زندہ رہتی ہے، اس کے قبضہ اقتدار میں ہر قسم کی طاقت ہوتی ہے، حاکمانہ طور پر زندگی بسر کرتی ہے اور کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے مقابلہ کا خیال بھی دل میں لاسکے۔ تمام دوسری قومیں مجبور ہوتی ہیں کہ اس کے ہر فرمان کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

وتتک ان شئنا علی الناس قولہم، ولاینکر القوم حین نقول۔

اور ہم اگر چاہیں تو لوگوں کی بات کا انکار کر دیں لیکن جب ہم کہیں تو کوئی ہماری بات رد نہیں کر سکتا۔ زمین و آسمان کی ہر چیز زندہ رہنے کی سعی و کوشش میں مصروف رہتی ہے، یہی تنازع للبقاء ہے اور اس کشمکش میں صرف اسی کو دائمی زندگی نصیب ہوتی ہے جس میں قوت و طاقت ہو اور اس لیے اصلح و امثل ہو، یہی بقائے اصلح ہے اور اس کا دوسرا نام ”انتخاب طبعی“ ہے۔

ٹھیک اسی اصول کے مطابق قرآن حکیم نے اس کش مکش حیات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۝

یہ کفار سدا تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں۔

اس تصادم اور باہمی جنگ و جدل کا علاج قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ۶۰)

اور مسلمانو! سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے، جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے مقابلہ کے لئے ساز و سامان مہیا کئے رکھو، کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی ڈھاک بٹھائے رکھو گے اور نیز ان کے سوا دوسروں پر بھی، جن کو تم نہیں جانتے اور ان کے جال سے اللہ خوب واقف ہے۔

اور یہ دائمی حکم نافذ کر دیا کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلِلَّهِ (انفال ۳۹) اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے اور ایک خدا کا حکم چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آیت کی تفسیریوں کی:

(الجهاد ماضی الی یوم القیامة)

مسلمانوں کے بقاء قیام کے لئے ضروری ہے کہ وہ فریضہ جہاد سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں اور یہ فرض دائمی ہے کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔

جب صحابہ کرام کی ایک جماعت میں یہ گفتگو ہوئی کہ: ای الامال احب الی اللہ ساری نیکیوں اور عبارتوں میں سب سے زیادہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک محبوب مقبول ہے۔ تو اس کے جواب میں سورۃ صف نازل ہوئی جس میں فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُيُوتًا مَرُوضًا ۝ (الص ۴)

اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماد سے لڑتے ہیں، گویا ایک دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے۔ اور یہ دیوار بھی کیسی؟ ایسی جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت و برتری کے لیے صرف یہی ایک حدیث بس کرتی ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح حدیث میں روایت کیا ہے، جس سے معلوم ہو گا کہ ختم نبوت کے اعلیٰ ترین مرتبہ کے باوجود رسول اکرم ﷺ کس طرح



شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو کرتے ہیں:

والذی نفسی بیدۃ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم اقتل۔  
خدا کی قسم اگر ممکن ہو تاؤں میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ ختم نہ ہو جائے۔

تبنت سلیبی ان نبوت بحبھا  
واھون شیء عندنا ما تبنت

ترجمہ: سلیبی نے چاہا کہ ہم اس کی محبت میں جان دیدیں اور جو اس نے خواہش کی وہ ہمارے نزدیک نہایت ہی آسان بات تھی۔

اگر کسی قوم کو فنانا منظور ہو تو اس کی آسان ترین صورت یہی ہے کہ اس سے آلات حرب چھین لیے جائیں۔ ہر قسم کے سامان جنگ کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے اور قانونی طور پر اس کی خرید و فروخت بند کر دی جائے۔ اس طریق عمل کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ تمام قوم خود بخود بے دست و پا ہو جائے گی۔ اس کی بہادری کے تمام جذبات حقہ پر عالم ممت طاری ہو جائے گا۔ پھر اس قوم کے کروڑوں افراد ہوں گے جو بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے ہوں گے۔ ایک اجنبی انسان ہو گا جو ان لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتا ہو گا۔ رعب و ہیبت کا یہ عالم ہو گا کہ حاکم نام سنتے ہی کانپ جائیں گے۔

ہر وہ حکومت جس کی بنیاد ظلم و جور، جبر و استبداد اور قہر و غلبہ پر ہو، جو دلوں کے بجائے جسموں پر فرماں روائی کرتی ہو، جس کے تعلقات اپنی رعایا کے ساتھ محض تاجرانہ اصول پر مبنی ہوں، وہ ہمیشہ اسی قانون کی پناہ لیتی ہے اور اپنی ماتحت اجنبی رعایا سے ہر قسم کا سامان جنگ چھین لیتی ہے، قرآن حکیم ان حقائق عالیہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے:

وَإِذْ نَبَّيْنَاهُ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكَ سُوءَ الْعَذَابِ (البقرة ۴۹)

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تم کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچاتے تھے۔  
اس بدترین عذاب کی تفسیر میں حسب ذیل امور داخل ہو سکتے ہیں جو بطور ”اعتبار“ کے اس آیت سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔  
(الف) فرعون نے بنی اسرائیل سے آلات حرب چھین لیے، اب وہ اپنی فطری حکومت کو چھوڑ کر حکام کے اشاروں پر چلتے، انہیں کی کہتے، ان کے احسانات کی یاد سے ان کی زبانیں نغمہ سنج رہتیں۔ چونکہ غلامی و محکومی کی وجہ سے تمام قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں، اس لیے وہ دیکھتے تو ان کی آنکھوں سے، سنتے تو ان کے کانوں سے اور غور فکر کرتے تو انہیں کے القائے شیطانی کے مطابق۔ سچ ہے: فَإِنَّهَا لَا تَعْلَى الْاِكْبَارُ وَلَكِنْ تَعْلَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج ۲۲) بات یہ ہے کہ کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے

ہیں، جو لوگ غلام و محکوم ہوتے ہیں ان پر ہر اعتبار سے یہ آیت صادق آتی ہے۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یصرون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم العغفلون۔

ان کے دل تو ہیں مگر ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں بھی ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان بھی ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لینے، غرض یہ لوگ چار پایوں کی طرح کے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہوئے، یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

(ب) فرعون تمام جلیل القدر عہدوں کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیتا اور بنی اسرائیل کو نہایت ہی ذلیل اور ادنیٰ کاموں کے لئے مجبور کرتا۔

”مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی اور ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔“ (خروج، ۴۱، ۳۱:۱)

(ج).... اگر قدرتی اسباب و ذرائع کی فیاضی سے ملک کی زرعی حالت قابل اطمینان ہوتی، تو مصنوعی قحط ڈال کر گرائی پیدا کر دی جاتی۔

(د).... کام کی اس قدر کثرت ہوتی کہ صبح سے شام تک لگاتار مصروف رہنے کے باوجود پھر بھی کم ہونے میں نہ آتا، کثرت کار اور ہجوم مشاغل کی وجہ سے ان کی دماغی قوتیں بیکار ہو جاتیں۔ جسمانی قوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے، آنکھوں کی قوت جاتی رہتی، کان، بہرے ہوتے جاتے اور مسائل ملکی میں کبھی درس و فکر کا موقع نہ ملتا۔ ”تم اس میں سے کچھ کم نہ کرو کہ وہ کاہل ہیں اور ان کا کام بڑھا دیا جاوے تاکہ اس میں مشغول رہیں اور بیہودہ باتوں کی طرف متوجہ نہ ہوں۔“ (کتاب خروج، ۵: ۸، ۹)

بیگار

چونکہ بنی اسرائیل غلام و محکوم ہونے کی وجہ سے بالکل بے دست و پا ہو گئے تھے، ان کو بیگار کے لیے پکڑا جاتا، ان سے کام لینے میں جبر و ظلم روار کھا جاتا، کوشش کی جاتی کہ انہیں کسی کام کا آرام نہ ملے، اول تو انہیں مزدوری نہ ملتی اور اگر ملتی بھی تو برائے نام۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ ۚ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ ۖ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَاسْتَعَاثَ الَّذِي مِّنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِّنْ عَدُوِّهِ ۚ

اور ایک ایسی حالت میں جب کہ تمام شہر غافل تھا موسیٰ شہر میں آئے اور دو آدمیوں کو دیکھا لڑ رہے ہیں، ان میں ایک موسیٰ کی قوم کا تھا اور دوسرا اس کے دشمن کے گروہ کا۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکام کو جب کبھی کوئی کام کرانا ہوتا، تو بنی اسرائیل کے افراد کو زبردستی بیگار میں پکڑ لیتے، جانوروں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کرتے۔ چنانچہ وہ بنی اسرائیل اس لیے موسیٰ کو دیکھ کر چیخ اٹھا تھا۔ “اور ان دنوں میں یوں ہوا کہ جب موسیٰ بڑا ہوا تو اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور ان کی مشقتوں کو دیکھا اور دیکھا کہ ایک مصری ایک عبرانی کو جو اس کے بھائیوں میں سے ایک تھا، مار رہا ہے۔ (خروج، ۲۱، ۱۱:۶)

حاکم وقت کے تمام افراد تو اپنا وقت آرام سے گزارتے، مگر ان بنی اسرائیلیوں کے لئے آرام کی صورت نہ تھی۔ ان کا تمام وقت پیٹ پالنے کی خاطر روٹی کمانے میں صرف ہوتا اور ہر قسم کی ذلت و رسوائی اور تکلیف و مصیبت برداشت کرتے۔ اپنی قومی حکومت کے گھمنڈ میں حاکم قوم بنی اسرائیل کے ہر فرد کو اپنا زر خرید غلام خیال کرتی۔ اسے یقین تھا کہ سرزمین کنعان کا یہ مہجور گلہ صرف اسی لیے دیا گیا ہے، کہ چار پایوں کی طرح اس کے آگے جھکے۔ اس کے لیے وہ جس کو چاہتی جان سے مار ڈالتی۔ نہ تو ان مظالم کی باز پرس کرنی والا کوئی تھا، اور نہ کوئی ایسی عدالت تھی جہاں بنی اسرائیل مرافعہ کر سکتے اور اگر مرافعہ کرتے بھی توفیصلہ ان کے خلاف ہوتا۔

### زاویہ نگاہ کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک انسان اپنے شرف و مجد کو اپنی ہی غلط کاریوں کی بنا پر کھو بیٹھتا ہے، اپنی فطرت صالحہ کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی فضیلت و برتری کو ضائع کر دیتا ہے جو اسے تمام کائنات ارضی و سماوی پر نوازش کی گئی تھی، تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ بدترین خلائق بن جاتا ہے، تمام عزتیں اور بزرگیاں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور وہ ذلت اور رسوائی کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے انسانی بزرگی و فضیلت پر مختلف مقامات میں نہایت تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انسان اشرف ترین مخلوقات ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں آتا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوَدَّ وَالْبَحْرِ وَزَكَّيْنَاهُمْ مِّنَ الطَّلَبِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝۵

اور ضرور ہم نے انسان کو عزت دی ہے اور خشکی اور تری میں ان کو سوار کر کے پھرایا، ان کو سفر کرنے کے وسائل سمجھائے اور الوان نعمت سے انکار زق مقرر کیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو شرف بخشا۔

شرک و بت پرستی کی ممانعت صرف اسی لیے کی گئی ہے، کہ انسان جب سب سے اشرف و اعلیٰ ہے تو وہ کیوں خدائے برتر کے سوا کسی اور چیز کے آگے جھکے جو رتبہ میں اس سے کمتر ہے۔ جس وقت بنی اسرائیل نے ایک قوم کو بت پرستی کرتے

ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ایک بت بنا دیجئے تاکہ اس کے آگے جھکیں، تو موسیٰ نے اسی فضیلت و شرافت انسانی سے استدلال کر کے جواب دیا تھا کہ تم زمین و آسمان کی ہر چیز سے افضل و اعلیٰ ہو، اس لیے تمہیں اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قَالَ اَخْبِرَ اللَّهُ اَبْغِيَكُمْ اِلٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

موسیٰ نے کہا کہ میں تمہارے لیے اور معبود ہونڈ لاؤں؟ حالانکہ اس نے تمہیں تمام عالم پر فضیلت و بزرگی عنایت کی ہے۔ سورۃ "التین" کا تو موضوع ہی یہی ہے کہ وہ انسان کی بزرگی کا اعلان عام کر دے۔ اور بتا دے کہ جب کہ دنیا کے تمام فلاسفہ اور حکماء انسانی شرف و مجد کو معلوم کرنے سے عاجز رہے، تو لسان الہی نے اس حقیقت مستورہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (۹۵:۴) ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا ہے۔ عدل ہی خیر کی حقیقت ہے۔ اور وہ صرف شرف و عظمت ہی کے لیے ہے۔ وہی خیر البدیۃ ہے۔ یہی وہ خصوصیت کبریٰ تھی جس کی بنا پر آدم کو ارض الہی کی خلافت نوازش کی گئی اور یہی سبب تھا کہ وہ معبود ملائک قرار پایا۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است

بر عناصر حکمراں بودن خوش است

مگر جس وقت وہ اس حقیقت کو گم کر دیتا ہے، اخلاق و اعمال کی گندگی اور ناپاکی اس کے عقائد و یقینات کے چشمہ صافی کو متعفن و بدبودار بنا دیتی ہے، اس کی فطرت صالحہ کا آئینہ طوفانوں اور آندھیوں سے گرد آلود ہو جاتا ہے اور اپنی بزرگی برتری کو کھو بیٹھتا ہے، تو پھر جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت قرآن نے اعلان کیا۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اُذُنٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلٰۤاْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷۹:۷۹) یہی الاعیٰ شرا البدیہ، اصلب النار اور الذلین نسوا اللہ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ ہیں، اور ختم اللہ علی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غَشَاوَةٌ بھی ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا گیا ہے۔

اس غلامی و محکومی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان محکوموں کی عقل جانوروں سے بھی کم ہو جاتی ہے اور اس وقت ہر ایک شخص بغض و حسد کا پتلا بن جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں تو اس ذلت و رسوائی میں رہوں اور دوسرا بھائی ترقی کر جائے۔ اس لیے وہ اس کو فنا کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہائیل و قاتیل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ قاتیل اپنے بھائی ہائیل کو صرف اس لیے قتل کرتا ہے کہ جب میری قربانی کو شرف قبول نہیں بخشا گیا تو اس کو یہ عزت کیوں نوازش کی گئی۔ مگر قتل کے بعد حیران و پریشان ہو کر پھرتا ہے۔ اسے کچھ نہیں سوچتا کہ اب لاش کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ ایک کو آکر اس کو دفن کرنے کی ترکیب بتاتا ہے۔ اس پر قاتیل کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ بصد حسرت و ندامت پکاراٹھتا ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْٓ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِىْ سَوۡۤءَۃَ اَخِيْ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝

کیا میں ایسا گیا گذرا ہوں کہ بلا سے اس کو ہی جیسا ہوتا، تو اپنے بھائی کی فضیحت یعنی لاش کو چھپا دیتا، الغرض وہ اپنے لئے پر بہت ہی پشیمان ہوا۔

وہ غلامی و محکومی کو دنیا کی انتہائی عزت و سربلندی خیال کرتا ہے، اسی پر قانع رہتا ہے۔ اگر حریت و آزادی کے لیے سعی و کوشش کی جائے تو کفر و ارباب کفر کی حکومت کے قیام و ثبات کی خاطر اس تحریک استقلال کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کا مطمح نظر دولت و ثروت کی تلاش اور اس کا مقصد عزت و جاہ اور خطابات کی جستجو ہوتی ہے۔ اگر ارباب دجل و شیطنت کی طرف سے کبھی مروت و احسان اور احترام و اکرام دیکھتا ہے تو اس کو اپنی کائنات حیات اور سرمایہ افتخار و ناز خیال کرتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو متروک و مہجور کر کے غیروں کی دوستی پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی نسبت فرمایا۔

بَشِيرِ الْمُتَّقِينَ بِأَنَّهُمْ عَدَاوَا كَيْبَهُ ۖ  
عِنْدَهُمُ الْعِزَّةُ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۝

منافقوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کو دردناک عذاب ہوتا ہے، کہ یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے پھرتے ہیں، کیا کافروں کے ہاں اپنی عزت بڑھانا چاہتے ہیں؟ تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

### سرمایہ داری

ظالم حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محکوم قوم میں سے بعض افراد کو اپنی اغراض مشومہ کے لیے چن لیتی ہے۔ ان کے اعزاز و اکرام میں مبالغہ کرتی ہے۔ دولت و ثروت سے ان کو مالامال کر دیتی ہے اور پھر خود ان ہی لوگوں کے ذریعہ ان کی قوم پر ظلم و جور کرتی ہے، ان کے حقوق پر غاصبانہ تصرف کرتی ہے اور ان کی راہ ترقی کو مسدود کر دیتی ہے۔

إِنَّ قَادِرُونَ كَانَ مِنْ قَوْمٍ مُّؤَسَّسِي فَبَنَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوتُوا بِالْعُصْبَةِ أُولِيَ الْقُوَّةِ

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا، اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔ (۲۸:۷۶)

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم کا ایک فرد تھا، مگر فرعون نے اس کو اپنے ساتھ ملا لیا، اس کو قوت و طاقت دی اور دولت سے سرفراز کیا۔ اب اس کی ہر سعی و کوشش اور غور و فکر کامرکز یہی تھا کہ فرعون کی حکومت مضبوط و محکم ہو اور اس کی اپنی قوم اس کے خلاف سر نہ اٹھا سکے۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ سونے چاندی کے خزانوں نے اس کو مغرور و سرکش بنا دیا تھا، اس لئے وہ اپنی قوم پر ظلم کرتا اور اسے ابھرنے نہ دیتا۔

لوگوں نے اسے سمجھایا کہ غیروں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے غداری کرنا ٹھیک نہیں۔ سرمایہ داری کے غرور میں تم غریب و مفلس کو نہ بھولو اور ہر ایک کا حق ادا کرو۔ اس نے ان باتوں کی پروا نہ کی، اور ہر ظلم و عدوان میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حریت و آزادی کا پیغام بربنا کر بھیجا۔

وَلَقَدْ آرَسْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سِحْرٌ كَذٰبٌ ۝

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف، تو انہوں نے کہا کہ یہ تو جادو گر ہے جھوٹا۔

آخر جب یہ کسی طرح اپنی ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئے تو سنت کے مطابق انکے ساتھ وہی ہوا جس کے وہ حقدار تھے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِءَاِذِهٖ الْاَرْضَ ۚ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوْكَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝

پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، تو خدا کے سوا کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی اور نہ وہ بدلہ لے سکا۔

نعمت عظمیٰ

ملوکیت اور سرمایہ داری یہ دو سب سے بڑی لعنتیں ہیں جو ابن آدم پر اس وقت مسلط کر دی جاتی ہیں، جب وہ حق کو ٹھکراتا ہے اور باطل کی سرپرستی میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اللہ نے اسلام کو بھیجا کہ وہ ان کی بیخ کنی کرے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ ”اقامۃ الارادۃ تفافات واصلاح الرسوم“ کے باب میں بعثت نبوی کا راز اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اعلم ان العجم والروم لها توار ثوا الخلافة قروناً كثيرة و خاضوا في لذّة الدنيا، ونسوا الدار الاخرة واستحوذ عليهم الشيطان تعبقوا في مرافق المعيشة وتباهاوا بها وورد عليهم حكماً وعوغيهم وفقيرهم الا قد استولت عليه واخذت بتلابيبه واعجزته في نفسه واهاجت عليه غبوماً وهبوماً لا ار جاعلها وذلك ان تلك الاشياء لم يكن لتحصيل الا ببذل اموال خطيرة ولا تحصل تلك الا موال الا بتضعيف الضرائب على الفلاحين والتجار واشباههم والتضييق عليهم فان امتنعوا قاتلوهم وعذبوهم، وان اطاعوا جعلوهم بمنزلة الحبيروالبقر ويستعمل في النضج والدياس والحصاد ولا تقتنى الا ليستعان بها في الحاجات ثم لا تترك من العناعت حتى صاروا لا يرفعون رءوسهم الى السعادة الا خروية اصلاً ولا يستطيعون ذلك وربما كان اقليم واسع ليس فيهم احد يهيمه دينه ولم يكن ليحصل ايضاً الا يوم يتكسبون بتهية تلك البطاعم والملابس والا بنية وغيرها ويتركون اصول المكا سب التي عليها بناء نظام العالم وصار عامة من يطوف عليهم يتكفون محاكاة الصناديد في هذه الاشياء والا لم يجد واعند هم خطوط ولا كانوا عند هم على بال وصار جمهور الناس عيالاً على الخليفة يتكفون منه تارة على انهم من الغزاة على انهم من الغزاة والبديرين للبدينة يترسون برسومهم ولا يكون المقصود دفع الحاجة ولكن القيام بسيرة سلفهم وتارة على انهم شعراء جرت عادة البلوك بصلتهم وتارة على انهم زهاد و فقر أعيقب من الخليفة ان لا يتفقد حالهم فيضيق بعضهم بعضاً ويتوقف مكاسبهم على صحة البلوك والرفق بهم وحسن المباحرة معهم والتبليق منهم وكان ذلك هو الفن الذي يتعمق افكارهم فيه ويضيع اوقاتهم معه فلما كثرت هذه الاشغال هيات

خسیسہ و اعراضوا عن الاخلاق الصالحة وان شئت ان تعرف حقيقة هذا البرض فانظر الى قوم ليست فيهم الخلافة ولا هم متعبدون في لذائذ الاطعمة والا لبسة تجد كل واحد منهم بيده امره وليست عليه من الضرائب الثقيلة ما يثقل ظهورهم فهم يستطيعون التفرغ لامر الدين والملة ثم تصور حالهم لو كان فيهم الخلافة وملائكتها وسخروا الرعية وتسلطوا عليهم فلما عظمت هذه البصيبة واشد هذا البرض سخط عليهم الله والملائكة المقربون، وكان رضا تعالى في معالجة هذا المريض بقطع مادته فبعث نبياً آمياً ﷺ لم يخالط العجم والروم ولم يترسم برسومهم وجعله ميزاناً يعرف به الهدى الصالح المرضي عند الله من غير المرضى وانطقه بذعادات الاعاجم وقبح الاستغراق في الحيوۃ الدنیا والا طینان بها ونفث في قلبه ان يحرم عليهم رعوس ما اعتاده الاعاجم وبتاهاوبها کلبس الحریر والقسی والا رجوان واستعمال او انی الذهب والفضة وحلی الذهب غیر المقطع والثياب المصنوعة فیها الصور وتزیق البيوت وغیر ذلك وقضى بزوال دولتهم بدولته وریاستهم بریا ستمه و بانه هلك كسرى فلا كسرى بعده وهلك قیصر فلا قیصر بعده۔

معلوم کرنا چاہئے کہ جب عجم اور روم کے لوگ مدت ہائے دراز سے سلطنت کے مالک ہوتے چلے آئے اور دار آخرت کو بھول کر دنیوی لذت میں بھرپور ہو گئے، اور شیطان ان پر غالب آگیا، تو انہوں نے معیشت کے منافع میں بہت خوش کیا اور انہیں امور کو مایہ ناز اعتدالیوں سے اعضائے شہر میں ایک نہایت سخت بیماری سرایت کر گئی تھی اور بڑی آفت برپا ہو گئی تھی۔ رعایا، دہقان اور امیر و غریب میں سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا تھا جس پر عیش و آرام مسلط نہ ہو گیا ہو۔ اس کو تھکا تھکا کر بے انتہا مصائب اور درخشاں میں نہ پھنسا دیا ہو، یہ عیش و آرام زیادہ تکلیف کا باعث اس لئے ہو گیا تھا کہ جب تک بہت سامان نہ صرف کیا جائے یہ لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور مال کی اتنی مقدار پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہوروں پر ٹیکس زیادہ کئے جائیں وہ خوب تنگ کئے جائیں۔

اگر یہ لوگ ٹیکسوں کے ادا کرنے سے دست کشی کریں تو حکام کو ان سے لڑنا پڑے گا۔ طرح طرح کی ان کو تکلیف دینا ہوگی اور اگر وہ لوگ ان کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں گے تو حکام گدھے اور نیل کا سان کا درجہ کر دیں گے، جو آپاشی جو تھے اور اناج کی کٹائی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ صرف اپنی مطلب براری کی لیے یہ چار پائے ذخیرہ کیے جاتے ہیں، ایک گھنٹہ محنت سے ان کو فرصت نہیں ملا کرتی۔ امراء ایسے ہی گرفتار بلا ہو کر سعادت اخروی کی طرف سرٹھا کر نہیں دیکھتے اور ان کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اور بسا اوقات ایک بہت بڑے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو دین کا اہتمام اور خیال ہو اور نیز یہ سب عیش کے سامان ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرتے ہیں، جن کا پیشہ یہی ہوتا ہے کہ کھانے کی چیزیں، لباس، عمارت وغیرہ کو درست کرتے رہیں، ایسے لوگ پیشوں کے ان اصول سے پہلو تہی کرتے ہیں جن پر نظام عالم کا مدار ہے۔

ان کے علاوہ اور عام لوگ جو بڑے لوگوں کی حضوری میں رہتے ہیں، ان سب امور میں ان ہی کی نقل کرتے ہیں، ورنہ ان کو ان امراء کی خدمت میں بازیابی نہ ہو۔ ان کے دلوں میں ان کی کچھ وقعت نہ رہے اور اکثر لوگ پادشاہ پر بار

ہو جاتے ہیں۔ اس پر وہ مختلف طریقوں سے متقاضی رہا کرتے ہیں۔ بعض دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم غازی اور شہر کے منتظم ہیں، ایسے لوگوں کی وہ روش تو اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اپنے فرائض ادا کرنے کا کچھ بھی قصد نہیں کرتے، صرف اپنے بزرگوں کے حالات ہی کے پیرو رہا کرتے ہیں۔ اور بعض دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں جن پر انعام و اکرام کرنے کی سلاطین عادی ہو کر تے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم درویش و پارسایں بادشاہوں کو زیبا نہیں ہے کہ ان کی طرف سے غفلت برتے، اس واسطے کہ یہ فرقے ایک دوسرے کی تنگدلی کے باعث ہوتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع معاش اسی پر موقوف ہوتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خدمت میں رہیں، ان سے نیاز مندانه پیش آئیں، تہذیب سے ان کے ساتھ گفتگو کریں، ان کی چاپلوسی کرتے رہیں۔ اس فن میں ان کی عقل منہک رہتی ہے، اس کی وجہ سے ان کے اوقات غارت ہوتے ہیں۔ جب اس قسم کے مشغلے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو ان کے دلوں میں پوج اور فضول باتیں جاگزیں ہو جاتی ہیں اور عمدہ اخلاق سے وہ اعراض کرتے رہتے ہیں۔ اگر تم کو اس مرض کی اصلی حقیقت معلوم کرنی ہو تو ان لوگوں کی حالت میں غور کرو جن کو امور سلطنت سے آزادی ہوتی ہے۔ لذیذ کھانوں اور عمدہ لباسوں میں ان کو انہماک نہیں ہوتا، ہر شخص ان میں سے آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے، اگر ان ٹیکسوں کا بار ان پر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین اور ملت کی خدمت کر نیکی توفیق ملتی ہے۔ پھر ان ہی لوگوں کی اس حالت کو خیال کرو کہ ان کے ہاتھ میں زمام خلافت آجائے، رعایا کو وہ اپنا مطیع بنا کر ان پر اپنا قبضہ کر لیں۔

جب ایسی مصیبت زیادہ بڑھ گئی اور اس قسم کی بیماری بہت سخت ہو گئی تو اس وقت خدائے تعالیٰ اور ملائکہ مقررین نے ان پر غصہ ظاہر فرمایا۔ خدا کی مرضی ہوئی کہ اس مادہ فساد کو بالکل قطع کر دے۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک بنی امی صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو بھیجا جس کا عجم اور روم سے کسی قسم کا میل جول نہ ہوا تھا۔ ان کے رسوم کو اس نے بالکل اختیار نہ کیا تھا۔ اس پیغمبر کو خدائے تعالیٰ نے میزان قرار دیا، جس کو ان طریقوں کی پوری شناخت تھی جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ تھے۔ اس نے عجیبوں کی رسموں کی مذمت بیان کی اور دنیاوی زندگی میں مستغرق ہو جانے کی قباحتیں ظاہر کیں۔ اس پیغمبر کے دل میں خدا تعالیٰ نے القا فرمایا کہ لوگوں پر وہ امور حرام کر دے جن کے عجی لوگ خو کر ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر کرتے، مثلاً ریشم کا استعمال، ارغوانی لباس، سنہری اور زرد پیلے برتن، سنہری زیور، ایسے کپڑے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار کرنا وغیرہ۔

خدا تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس کی دولت سے ان کی دولتوں کا استیصال کر دے اور اس کی ریاست سے ان کی ریاستوں کو نیست و نابود کر دے، اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو جائے اور اب اس کے بعد کوئی کسری نہ ہونے پائے اور نیز اس کے ذریعہ سے قیصر بھی ہلاک ہو جائے پھر کوئی قیصر نہ ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱۱۱ و ۱۱۲)

حرمت سود

دوسری جگہ حرمت سود کی نسبت تحریر فرمایا:

”وسمّا لتبریم ان اللہ تعالیٰ یکرہ الرفاہیۃ البالغۃ کالحریر والار تفاقات المحوۃ الی لا معان فی طلب



الدنيا كانية الذهب والفضة وحلى غير مقطوع من الذهب كالسوار والخلال والطوق والتدقيق في المعيشة والتعبق فيها لان ذلك مردى لهم في اسفل السافلين صارف لا فكارهم الى الوان مظلمة“ (حجۃ اللہ البالغہ ۶۹۲)

اور سود کے حرام ہونے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہایت عیش پسندی، مثلاً ریشم کا لباس پہننا پسند ہے اور علیٰ ہذا القیاس وہ ارتقاات جن میں طلب دنیا کے اندر غرق ہو نیکی حاجت پڑتی ہے، جیسے سونا چاندی کے برتنوں کا استعمال کرنا، ان زیورات کا پہننا جو بڑے بڑے زیور ہیں اور گھڑ کر بنائے جاتے ہیں، جیسے نگین، گوجری اور ہنسی وغیرہ اور کھانے پینے میں زیادہ تکلف کرنا، کیونکہ یہ امور لوگوں کو اسفل السافلین میں گرا دیتے ہیں اور ان کی فکر کو تاریک رنگوں کی طرف پھیرنے والے ہیں۔

### غلامی کے اثرات

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عذاب جو کسی قوم پر نازل ہوتا ہے یہ ہے کہ اس پر غیروں کو حاکم بنا دیا جائے۔ ضریت علیہم الذلۃ کی یہی تفسیر کی گئی ہے۔ اس سے قوم کے تمام شریفانہ جذبات فنا ہو جاتے ہیں، فاسد خیالات، ذلیل عواطف اور ناپاک رجحانات کا غلبہ اور استیلاء ہو جاتا ہے اور آخر قوم پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اپنی قوم کو لے کر نکلتا ہے، کہ انہیں آبائی وطن دشمن سے واپس دلادے، مگر دیکھئے وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ پہلے انہیں یوں جوش دلایا جاتا ہے کہ تم انبیاء کی اولاد ہو۔ بادشاہت تمہارے گھر کی لونڈی ہے اور تمہیں ایسے ایسے فضائل و کمالات دیئے گئے ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يَقُوْمُواْ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمْ مَّلُوْکًا ۚ وَ اَتٰکُمْ مَّا لَمْ یُوْتِ اَحَدًا مِّنْ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ (المائدہ ۲۰)

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! اللہ نے جو تم پر احسانات کیے ہیں ان کو یاد کرو، کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ نعمتیں دیں جو دنیا جہان کے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس ملک پر تمہارا قبضہ ہو کر رہے گا جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ استقلال و ثبات قدم سے کام لو اور پیچھے ہٹنے کا خیال بھی نہ آنے پائے۔

یَقُوْمُواْ اَدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ وَلَا تَتَرَدُّوْا عَلٰی اَدْبَارِکُمْ فَتَقْلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۱﴾ (المائدہ ۲۱)

بھائیو! شام کا مقدس ملک جو خدا نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے اس میں داخل ہو اور پیچھے نہ پھیرنا ورنہ اٹلے گھاٹے میں آ جاؤ گے۔

غور کیجئے کہ تاجوش انگیز و ولولہ نیز خطبہ ہے کہ مردے بھی زندہ ہو جائیں، مگر ان کی قوم جو چار سو سال سے فرعون کی

غلام چلی آ رہی تھی، کیا یاں انگیز جواب دیتی ہے۔

قَالُوا يَبْسُوْنَ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ؕ وَاِنَّا لَنَرٰكَ تَدْعُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ؕ فَاِنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝  
 قَالَ رَجُلٌ مِّنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا اَدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَانْكَبُوْا عَلَيْنَ ۙ وَعَلَى  
 اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝  
 قَالُوا يَبْسُوْنَ اِنَّا لَنَرٰكَ تَدْعُلَهَا اَبَدًا مَا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا  
 لَهٰنَا قٰعِدُوْنَ ۝  
 قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَآخِىْ فَاَفْرِقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝  
 قَالَ فَاتَّهَمَ مَحَرَّمَةٌ  
 عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ يَتَّبِعُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (المائدہ ۲۲-۲۶)

وہ لگے کہنے کہ اے موسیٰ، اسی ملک میں تو بڑے زبردست لوگ ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں، ہم تو اس میں  
 قدم رکھتے ہی نہیں۔ ہاں وہ لوگ اسمیں سے نکل جائیں، تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔ خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے  
 دو آدمی تھے کہ ان پر خدا نے مہربانی کی اور وہ بول اٹھے ان پر دروازے میں تو کھس پڑو، اور جب تم دروازے میں گھس  
 پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔ وہ بولے اے موسیٰ، جب تک اس میں  
 دشمن ہیں ہم تو کبھی بھی اس میں قدم نہیں رکھیں گے، ہاں تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو اور ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس پر  
 موسیٰ نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار، اپنی ذات خاص اور میرے بھائی کے سوا اور کوئی میرے بس کا نہیں۔ تو ہم  
 میں اور ان نافرمان لوگوں میں امتیاز کی جیو۔ خدا نے فرمایا اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک ان کو نصیب نہ ہوگا، جنگل میں  
 بھٹکے بھٹکے پھریں گے، تو تم نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کرنا۔

غلامی اور محکومی کیسی بری بلا ہے کہ:

(الف).... یہ لوگ جب مصر سے نکلے تھے تو حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر یہ عہد کر کے نکلے تھے کہ ہم اپنے آبائی وطن  
 کو لینے کے لیے ہر ممکن قربانی کریں گے، مگر غلامی انہیں اپنے عہد پر قائم نہیں رہنے دیتی اور آگے بڑھنے سے  
 صاف انکار کر دیتے ہیں۔

(ب).... اس قدر بزدل اور بے حس ہو گئے ہیں کہ اپنے باپ دادا کی میراث لینے کے لیے بھی ان میں کوئی جوش  
 نہیں پیدا ہوتا۔

(ج).... ہمت پست ہو جاتی ہے، غلامی پر قانع ہو کر اشیاء و قربانی سے گریز کرتے ہیں اور موت سے گھبراتے ہیں۔

اس کا نتیجہ

ان ناشائستہ حرکات کی سہرا ان بد بختوں کو یہ دی گئی کہ چالیس سال تک اس پاک زمین میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا،  
 تاکہ اس زمانے میں وہ تمام لوگ فنا ہو جائیں جن کے دل و دماغ پر غلامی کے جراثیم مسلط ہیں، دوسری نسل پیدا ہو جو آزاد  
 سر زمین میں نشوونما پائے، جہاں اللہ کے سوا اور کسی کی حکومت نہ ہو اور اس کے ذریعہ اس ارض مقدس پر قبضہ کیا جائے۔

## عقل و تمیز

غلامی کے نتائج فاسدہ اسی جگہ پر ختم نہیں ہو جاتے، یہ ایسی متعدی بیماری ہے کہ اس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا، قوم کی عقل و خرد پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے۔ حق و باطل اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ ہر شعبہ باز اور سامری صفت اٹھتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے قوم کو لیجاتا ہے۔ قوم میں اتنی بھی سمجھ باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے رہنماؤں میں تمیز کر سکے۔ سامری کا قصہ پڑھیے اور دیکھیے اس کا ایک ایک لفظ ہم پر منطبق ہو رہا ہے۔

لِكِنَّا حَبَلْنَا أَوْدَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۖ فَأَخَرَهُ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُورٌ  
فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى ۖ فَتَنَسَوْا ۝ (طہ ۸۷ تا ۸۸)

بلکہ قوم کے زیوروں کا بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا، اب ہم نے اس کو ڈالا اور اسی طرح سامری نے بھی ڈالا، پھر اس نے لوگوں کے لئے پچھڑا نکال کھڑا کیا، یعنی بت جس کی آواز پچھڑے کی تھی، اس پر لوگ کہنے لگے کہ یہی تو تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود اور وہ بھول گیا ہے۔

دیکھیے غلامی نے ان کی عقل پر کیسے پردے ڈال دیئے اور ذرا غور و فکر نہ کیا کہ۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۚ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝ (طہ ۸۹)

کیا ان لوگوں کو اتنی بات بھی نہ سوجھ پڑتی تھی کہ پچھڑا ان کی بات کا نہ تو الٹ کر جواب دے سکتا ہے اور نہ ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ دیکھ کر انہیں فرمایا:

يَقُومُوا إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝ (طہ ۹۰)

بھائیو! یہ تو اس کے ذریعہ سے تمہاری آزمائش کی جا رہی ہے، ورنہ تمہارا پروردگار رحمن ہے، تم میرے کہنے پر چلو اور میری بات مانو۔

مگر وہ لوگ کب ان کی سننے والے تھے اس لئے انہوں نے دو ٹوک جواب دیا:

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَكِفِينَ حَتَّىٰ يُبْرِحَ إِلَيْنَا مُوسَى ۝ (طہ ۹۱)

ہم برابر اس پچھڑے کی پرستش پر جبرے رہیں گے جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس نہ آئیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ:

غلامی میں انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتا۔

ہر شخص آسانی کے ساتھ دھوکا دے سکتا ہے اور دھوکا کھا سکتا ہے، امتحان کی آزمائش میں کوئی پورا نہیں اترتا۔

## محصولات

رعایا کی انتہائی غربت و ناداری اور ذلت و عکبت، حاکم قوم کے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات خبیثہ پیدا کر دیتی ہے، پہلے وہ اگر صرف ان لوگوں کی دشمن تھی جو اپنی عاجز و درماندہ اور محکوم قوم میں حق و حریت کا احساس پیدا کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں اور اس سعی و کوشش میں اپنی تمام زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ تو اب جبکہ تمام قوم میں حس و بیداری نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگتی ہے تو وہ ان سب کو فنا کرنے کی فکر میں لگ جاتی ہے اور اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ بن پڑے تو تمام قوم کو اس سر زمین سے نکال باہر کرے، گھر سے بے گھر ہو کر فقیروں کی زندگی بسر کرے اور بتدریج اس کا نام و نشان دنیائے مٹ جائے۔

فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِظَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بنی اسرائیل ۱۰۳)

پھر فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ملک سے اکھیڑ دے کہ رہنے نہ پائیں۔

مگر اس کے ارکان سلطنت نے ایسا کرنے سے روکا اور کہا کہ اگر یہ لوگ چلے گئے تو جس قدر ادنیٰ اور معمولی درجہ کے کام ہیں، وہ بھی ہم ہی لوگوں کو کرنے پڑیں گے، اس لیے ان کی جلاوطنی قرین عقل و انصاف نہیں، بلکہ انہیں سر زمین مصر ہی میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے، غیر ملک کے پروانہ ہائے راہ داری سے انہیں محروم کر دیا جائے۔ ہماری کوشش یہی ہو کہ وہ ہمیشہ غریب و نادار ہی رہیں اور ان پر مختلف قسم کے ٹیکس لگا دیئے جائیں، کہ ان کے بوجھ سے دیں اور ابھرنے نہ پائیں۔ اس پر فرعون نے اپنے لوگوں سے کہا: دیکھو بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں، آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں، اس لیے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھادیئے تاکہ انہیں سخت کاموں کے بوجھوں سے ستاویں۔“ (خروج، ۹: ۱۱ تا ۱۱)

## خارجی تعلقات

بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے فرعون کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسی کے غلام و محکوم رہیں، جبر و استبداد سے اپنے آپ کو بادشاہ اور خدا تسلیم کرانا چاہتا ہے، اس کا مقصد حیات یہی ہے کہ یہ عاجز و درماندہ جماعت اس کی چوٹ پر سردھرے۔ اسی کے آگے دست سوال دراز کرے، کسی بیرونی طاقت اور خارجی حکومت سے اپنے تعلقات و روابط نہ رکھے۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ بلاد اجنبیہ سے رشتہ مودت جوڑ کر یہ کہیں میرے خلاف فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ ممالک خارجہ کے حالات و واقعات سنکر اس میں جوش و ہيجان پیدا ہو گا۔ آزادی کے خیالات اور

استقلال قومی کے جذبات سے معمور ہو کر اس ظالم و جابر حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گی۔ چنانچہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، کہ اپنی قوم کو تمہارے پنجہ قہر و ظلم سے نجات دلاؤں تو اس نے چھوٹے ہی کہا:

لَئِنْ أَتَّخَذْتُ إِلَهًُا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُودِينَ ﴿۲۹﴾ (الشعر آء ۲۹)

اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو خدا مانا تو میں تجھ کو قیدیوں میں لے جا دوں گا۔

اس سے فرعون کا یہی مقصد تھا کہ میرے سوا کسی اور خارجی طاقت سے تعلق نہ رکھیں اور نہ اس کو اپنا مذہبی امام و پیشوا تسلیم کریں۔ پھر اس نے اسی پر قناعت نہ کی، بلکہ اس قوت کو فنا کرنے کے لئے ہر قسم کی تیاری شروع کر دی اور دوسرے لوگوں کو بھی تیاری کا حکم دیا۔ اسے یقین تھا کہ جس طاقت سے موسیٰ نے اپنا رشتہ قائم کیا ہے وہ کمزور و ناتوان ہے اور اس لیے اس کو آسانی کے ساتھ تباہ کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس طاقت کی جلالت قدر اور کبریائی سے واقف نہ تھا، اس لیے اس نے نہایت ہی تمسخرانہ انداز میں اپنے وزیر سے کہا:

فَأَوْقِدْ لِي يَهُامُنْ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَى ۚ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۳۰﴾  
وَاسْتَكْبَرُوا وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَلَمُوا أَنَّهُمُ الْبَيْنَاءُ لَئِيَّازُجْعُونَ ﴿۳۱﴾ (القصص ۳۸-۳۹)

اے ہامان! اچھا تو ہمارے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ لگا پڑا دے پکو۔ ان سے ہمارے لئے ایک پکا محل بنواتا کہ ہم اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو جھانکیں اور ہم تو اس دعویٰ میں موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتے ہیں اور فرعون اور اس کے لشکروں نے ناحق ملک میں بہت سراٹھایا اور انہوں نے ایسا سمجھا کہ وہ ہماری طرف لوٹا کر نہیں لائے جائیں گے۔

دنیا داروں اور مادہ پرستوں اور ظالم و جابر حکومتوں نے روحانی طاقتوں کے اثر و نفوذ اور ثمرات و نتائج کے اندازہ کرنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے، جس وقت نوح کو کشتی بناتے وقت ان کی قوم نے لکارا ہے اور ان پر استہزاء کیا ہے، تو وہ بھی اس غلطی میں مبتلا تھے۔ ابراہیم کو آگ میں ڈالنے وقت نمرود بھی اسی کا شکار ہوا تھا، فرعون بھی اسی وادی کا ایک رہ نور تھا، عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے جانا یہ بھی اسی غلط فہمی کا ایک نتیجہ تھا جس میں یہودی مبتلا تھے اور کفار مکہ بھی اسی کوتاہ فہمی کے مرتکب ہوئے جب وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔

یہ واقعات جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ایسے نہیں جن سے ارباب دجل و شیطنت ناواقف ہوں۔ اس کرہ ارضی کے تمام ذرات، دریاؤں اور سمندروں کی مچھلیاں اور آسمان کے چمکتے ہوئے نجوم و کواکب ان باتوں کو جانتے ہیں۔ ہر قوم و ملت کے پاس ان حوادث کی پوری تفصیل موجود ہے اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب کبھی دنیا کی جابرانہ طاقتوں نے روحانی قوتوں کا مقابلہ کیا ہے تو سچائی نے باطل کو ہمیشہ شکست دی ہے اور دائمی طور پر حق ہی کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْطَمُونَ ﴿۳۲﴾

اس میں شک نہیں کہ یہ کافر اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے روکیں۔ سو یہ لوگ تو مال کو اسی طرح پر خرچ کرتے ہی رہیں گے، مگر پھر آخر کار وہی مال ان کے حق میں موجب حسرت ہوگا۔ خرچ بھی کریں اور پھر مغلوب بھی ہوں اور قیامت کے دن کافر سب جہنم کی طرف ہلکے جائیں گے۔ جس آیت سے ہم نے اس عنوان کے لیے استدلال کیا تھا اس پر دوبارہ نظر ڈالئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فرعون کیا کر رہا ہے۔

- (الف).... جو لوگ ملک اور قوم کی خدمت کرتے تھے، وہ ان کو غلط کافر مبی، مکار اور جھوٹا قرار دیتا ہے۔  
 (ب).... ان لوگوں کی خدمات کی اس کے دل میں کوئی عزت و توقیر نہیں۔  
 (ج).... فرعون غرور و تکبر کا پتلا تھا اور اس کا تمام تر اعتماد اپنی مادی قوتوں پر تھا۔  
 (د).... اسے خیال تھا کہ اس کے جابرانہ طرز عمل اور ظالمانہ طریق کار سے حق و حریت کی تحریک رک جائے گی، جس کی وجہ سے ملک میں شورش پیدا ہو رہی ہے اور اس کی سلطنت نقصان سے محفوظ رہے گی۔

## الزام فساد

فرعون نے دیکھا کہ باوجود ان تمام باتوں کے بنی اسرائیل حریت و آزادی کی تحریک میں برابر حصہ لیتے ہیں، اور موسیٰ کی جماعت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے تو اس نے تنگ آکر دوسری راہ اختیار کی، جن لوگوں کے دماغ نشہ حریت سے سرشار اور جذبات قومیت و وطنیت سے لبریز تھے جو اپنی قوم کو غلامی اور محکومی سے نکال کر آزادی دلانے کے آرزو مند تھے، انہیں پاگل اور مجنون کا خطاب دیا، کہ اس طرح عوام الناس ان فداکاران ملت اور سرفروشان حریت کے پھندے میں مبتلا نہ ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دربار میں آتے ہی سب سے پہلے یہی مطالبہ کیا تھا۔

أَنْ أَرْسِلَ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ (الشعر آء ۱۷)

تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ روانہ کرو۔

مگر اس نے آزاد کرنے کی بجائے لوگوں کو مخاطب بنا کر کہا:

قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۖ (الشعر آء ۲۷)

وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے مجنون ہے۔

لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ پروانہ دارا انہیں پاگلوں پر نثار ہوتے ہیں، اپنے اندر حریت و استقلال کی تشنگی محسوس کرتے ہیں اور ظلم و سفاکی کے دور کرنے کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ دراصل دنیا کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ اس نے ارباب اصلاح و تجدید کو ابتداء میں پاگل کہا ہے، مجنون کا خطاب دیا ہے، جادوگر بتایا ہے اور مفسد کے نام سے یاد کیا ہے۔ ناصرہ کے اسرائیلی نوجوان کو جب حکومت کے سامنے پیش کیا گیا، کہ وہ اس بزرگ و جلیل ہستی کو پھانسی دے تو اس پر جو الزامات لگائے گئے تھے، ان میں اولین الزام یہی فساد تھا۔ مدین کا پیغمبر جلیل لوگوں کو کم تو لے سکتا ہے، مگر وہ اسی

کو مفسد قرار دیتے ہیں۔ لوط صرف اسی لیے فسادی تھے کہ وہ اپنی بد بخت قوم کو ایک غیر فطری طریق عمل سے روکتے تھے۔ رؤسا قریش کی نظر میں رسول اللہ ﷺ بھی اسی جرم کے مرتکب تھے، مگر قدوس حق نواز کی کار فرمائی ملاحظہ ہو کہ تھوڑی سی مدت کے بعد تمام لوگ اسی مفسد کو اپنا امام اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں اور اسی ملک کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک چپہ اس کی فضیلت اور برتری کے آگے جھک جاتا ہے۔

جب فرعون نے دیکھا کہ لوگ، حکومت کی ان باتوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ ان اعلانات کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اور برابر اس جدید تحریک میں حصہ لے رہے ہیں، تو اس نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ جو تمہاری آزادی اور استقلال کے طالب ہیں، حقیقت میں انہیں تم سے کوئی ہمدردی نہیں اور تمہاری خیر خواہی ان کے پیش نظر نہیں، بلکہ وہ فساد پھیلانے، بد امنی پیدا کرنے، نظام صالح کو درہم برہم کرنے، قانون کو توڑنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی غرض سے ان حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کی نیتوں میں خلوص نہیں، دلوں میں جوش و ولولہ نہیں اور ان کے دماغوں میں افساد فی الارض کے سوا اور کوئی خیال نہیں، اس لئے رعایا کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان لوگوں سے الگ رہے اور ان کی مجلسوں میں شریک نہ ہو، فرعون کہتا ہے:

إِنَّ هَٰذَا السَّحَرَاءُ عَلَيْهِمْ ۖ يُؤَيَّدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۚ (الاعراف ۱۱۰ تا ۱۰۹)

یہ تو بڑا جادو گر ہے، چاہتا ہے کہ تم سب کو تمہارے ملک سے نکال باہر کرے، تو اب تم لوگ کیا صلاح دیتے ہو۔  
کبھی غصہ و جذبہ انتقام کے خیال سے یوں خطاب کرتا ہے:

ذُرُوْثٍ أَقْتُلْ مُوسٰی وَلْيَدْعُ رِبِّهٖ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفُسَادَ ۚ (المومن ۲۶)

مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور وہ اپنے پروردگار کو اپنی مدد کے لیے بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو الٹ پلٹ کر ڈالے یا ملک میں فساد نکال کھڑا کر دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہی تھی، کہ وہ امن کے پیغمبر، ظلم و جور کو دنیا سے مٹانے والے اور بنی اسرائیل کو ایک ظالمانہ حکومت سے نجات دلانے والے ہیں۔ انہوں نے فرعون کے دربار میں آتے ہی، اولین مطالبہ یہ کیا کہ ادوآئی عبادہ اللہ۔ چاہئے تھا کہ وہ حکومت جس نے تہذیب و شائستگی کے پھیلانے اور علم و فضل کی نشر و اشاعت کے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیے تھے، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف اس قوم کی فلاح و بہبود اور نفع و سود کی خاطر جہان بانی و فرماں روائی کر رہی ہے، جس کا ادعا یہ تھا کہ اس پڑ مردہ قوم کو پھر زندہ کرنا چاہتی ہے جس کی حکومت مدتوں رہی ہے، اس کی دراز دستی ملاحظہ ہو کہ:

(الف) .... جو لوگ قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں ان پر فساد کا الزام لگایا جاتا ہے، ان کو مذہب کا بگاڑنے والا اور رسم و رواج قومی کا تبدیل کرنے والا کہا جاتا ہے۔

(ب) .... چونکہ حکومت کی بنیاد تمام تر ظلم و جور پر ہے، اس لیے اس کو اپنی تباہی و بربادی کا ہر وقت خوف دامن گیر رہتا ہے۔ مصلحین کی ہر کوشش کو اپنی تخریب کا باعث خیال کرتی ہے، شب و روز اسی فکر میں غلطاں و پچپاں

رہتی ہے، اپنے خیالات و افکار اسے خطرات و مہالک بن کر نظر آتے ہیں۔ جب کبھی ارباب اصلاح کی طرف سے کوئی صدائے حق بلند ہوتی ہے، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب میری بربادی کا وقت آگیا۔ اور یہ اعلان حریت مجھے فنا کرنے کے لیے کیا گیا ہے، اس لیے وہ سختی کی راہ اختیار کرتی ہے اور سرفروشان ملت کو قید و بند کی تکلیفیں پہنچاتی ہے، حالانکہ وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ لوگ فساد پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ امن عامہ کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر رہے ہیں۔

### رفقائے کار کی تعذیب

اگر بعض اسباب و مصالح خفیہ کی بنا پر حکومت رہبر ان ملت اور مصلحین قوم پر ہاتھ نہیں ڈالتی، تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کو بے دست و پا بنادیا جائے، جو لوگ ان کے اعوان و انصار ہیں ان کو کسی طریق سے الگ کر دیا جائے، ان میں باہمی کوئی تعلق قائم نہ رہے اور اس طرح ان فداکاران حریت کی تمام کوششیں اکارت جائیں، اس لیے ان کو طرح طرح کی تکالیف دی جاتی ہیں۔ ان کو گھر سے بے گھر کیا جاتا ہے، ان کی جائیدادیں ضبط کی جاتی ہیں، جس وزن دان کی تاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا جاتا ہے، گلے میں آہنی طوق ہیں اور پاؤں میں لوہے کی بو جھل بیڑیاں اور اگر اس پر بھی یہ لوگ راہ حق سے منحرف نہ ہوں تو قانون کی سخت گیریاں ہیں اور پھانسی کے تختے۔

جب فرعون پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ موسیٰ و ہارون کو گرفتار کرنے سے ملک میں عام فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے، تو اس کو ارکان سلطنت نے حسب ذیل مشورہ دیا:

أَرْجِهْ وَأَخَاكَ وَأُزِيلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِيَتَيْنِ ﴿١١﴾ (الاعراف ۱۱)

موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کے معاملہ کو اس وقت ملتوی رکھئے اور اطراف و جوارب کے قصبات میں کچھ ہر کارے روانہ کیجئے۔ اگرچہ موسیٰ و ہارون کے آزاد رہنے کا ارکان سلطنت نے مشورہ دیا، مگر وہ اس لئے نہ تھا کہ ان کی خیر خواہی مطلوب تھی، نہ اس لیے کہ وہ ان کو تکلیف و مصیبت سے بچانا چاہتے تھے، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ملک میں فساد نہ ہونے پائے۔ مگر اسی کے ساتھ ان لوگوں کا دوسرا حکم ان الفاظ میں نافذ ہوا:

اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَكُمْ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ (المومن ۲۵)

ان لوگوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ جو لوگ موسیٰ کے ساتھ خدا پر ایمان لے آئے، ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور عورتوں کو زندہ رہنے دو۔

اس حکم سے فرعون اور اس کے ارباب مشاورت کا یہی مقصد تھا کہ جب یہ لوگ ہمارے اعلانات کی جانب سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے تو بہتر ہے انہیں قتل کی دھمکی دی جائے۔ شاید یہ اشد شدید عذاب ان کی ہمتوں کو پست، ان کے ارادوں کو کمزور اور ان کے جوش و ولولہ کو سرد کر دے، مگر جب یہ حکم بھی بیکار ثابت ہوا تو اس نے نہایت ہی غصہ میں کہا:



فَلَا تَقْطَعْنَ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا صَلِّبَتْكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ ۚ وَلِتَعْلَمِنَّ أَنِّيَأْأَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْعَثُ (طہ ۷۱)

تو تمہارے ہاتھ اور تمہارے پیر لے سیدھے کاٹ ڈالوں اور تم کو کھجور کے تنوں پر سولی چڑھا دوں، تو سہی اور اب تم کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہم دو فریقوں میں کس کی مار زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔

مگر ان خوفناک اور دہشت انگیز احکام نے انکے ثبات قدم میں تزلزل پیدا نہیں کیا، وہ اپنے ارادوں پر قائم رہے۔ وہ نہایت ہی جوش و ولولہ اور عشق و محبت کے ساتھ آگے بڑھے اور بے خودانہ و مجنونانہ لہجہ میں فرعون کو عین دربار میں للکار کر کہا:

قَالُوا لَنْ نُؤْمِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ ۚ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (طہ ۷۲)

بولے کہ کھلے کھلے معجزے جو ہمارے سامنے آئے ان پر، جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اس پر تو ہم تجھ کو کسی طرح ترجیح دینے والے ہیں نہیں، تو جو کر نیو والا ہے کر گذر، تو دنیا کی اسی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے کہ ہم کو عذاب دے یا بہت کرے تو جان سے مراد ہے۔

سچائی کی پرستش اور حق کی حمایت نے کمزور و ناتوان لوگوں کو ہمیشہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے، پھر وہ حق کی حفظ و صیانت کے لئے باطل کا مقابلہ کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باطل کی طاقت خواہ کیسی ہی زبردست ہو، مگر وہ ان میں ضعف و اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی: فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (ال عمران ۱۳۶) پھر وہ لوگ خدا کی راہ میں تکلیف پہنچنے سے ہارے نہیں، وہ نہ سست ہی ہوئے اور نہ دب گئے: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبہ ۴۱) غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، میں یہی حقیقت مضمر تھی: الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (فصلت ۳۰) یہ صرف اس لیے اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں کہ وہ باطل پرستارانہ قوتوں اور فراعنہ و وجاہلہ وقت سے خوف زدہ نہیں ہوتے، ان کو نہ تو اپنی جان عزیز ہوتی ہے اور نہ مال۔ پھر نصرت الہی بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، اور کم من فئۃ قلیۃ غلبت فئۃ کثیرۃ کی حقیقت خفیہ مستبدانہ حکومتوں کے سامنے آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ حق کی قوتوں کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیتی ہیں، مگر دراصل ان کی تباہی کا وقت آگیا ہوتا ہے، اس لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ:

آلَنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۱۰:۹۱)

کیا اب ایسے وقت میں ایمان اور تیرا حال تو یہ تھا کہ اس سے پہلے برا برا فرمائی کرتا رہا اور تو مفسدوں میں سے ایک ہی تھا۔

سنت اللہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں آتے ہیں اور اس سے اپنی نجات کا مطالبہ کرتے ہیں، تو دیکھو وہ اکیلے ہوتے ہیں، کوئی ان کا یار و مددگار نہیں، فرعون کی حکومت ہے، جس کے قہر و استبداد، ظلم و جور نے عرش الہی تک کو ہلا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کہتا ہے اور جو اس کو نہ مانے اس کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے، وہ موسیٰ کے مطالبہ پر استہزاء و تمسخر کرتا ہے۔ ان کو ذلیل اور اپنے آپ کو عزیز و محترم خیال کرتا ہے: أَمَّا خَيْرٌ مِنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۚ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ (۱۰:۹۲)

(الزخرف ۵۲) بیشک، میں اس شخص سے جو کچھ عزت نہیں رکھتا اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا کہیں بہتر ہوں، ان کو جادو گر اور پاگل کہتا ہے، تمام درباری اس پر ہنستے ہیں۔

اس غربت اولیٰ کا منظر تمہارے سامنے ہے۔ تمام ملک کو ان کی مخالفت پر ابھارا جاتا ہے، عوام الناس میں اس کے خلاف جوش پھیلا جاتا ہے۔ آہ! تم نہیں دیکھتے کہ فرعون کی تمام باطل پرستارہ سعی و کوشش کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ملک کس

کا ساتھ دیتا ہے اور روز بروز کس کے اعوان و انصار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرعون ابتداء میں نرمی سے کام لیتا ہے، جب یہ طریق عمل کامیاب ثابت نہیں ہوتا تو سختی کرتا ہے، کہ شاید لوگ ڈر کر موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیں۔ وہ جادو گروں کو دعوت دیتا ہے کہ جلسہ عام میں اس کو ذلیل کریں، مگر وہ جو بے کسوں کا چارہ ساز اور آہ نیم شبی کا سننے والا ہے، اس کی کار فرمائی ملاحظہ ہو کہ جو لوگ حق کی مخالفت پر کمر باندھ کر آئے تھے، وہی موسیٰ کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ اور لاکھوں انسانوں کے سامنے اس ظالم و جابر بادشاہ کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔

یہ سنت اللہ ہے کہ حق کی حمایت کرنیوالے ابتداء میں ہمیشہ کم ہوا کرتے ہیں۔ ان کا ارتقاء تدریجی ہوا کرتا ہے۔ ارباب دولت و ثروت ان کو ذلیل خیال کرتے ہیں، مگر انجام کار وہی کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ بدعہ الا سلام غریبا و سيعود غریبا فطوبی للغرباء۔ اس حق پرست جماعت کی سچائی اور صداقت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں بہت کم لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر جو اس حزب اللہ میں داخل ہوتے ہیں، وہ پھر پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا ہر قل نے ابوسفیان سے گفتگو کرتے وقت اظہار کیا۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے رسول عربی کی سب سے زیادہ مخالفت کی، انجام کار وہی سب سے زیادہ فداکار اسلام ثابت ہوئے۔ عمرو بن عاص، نجاشی والی حبش کے پاس قریش کا سفیر بن کر جاتا ہے کہ ان مسلمانوں کو حاصل کر لے جو کفار مکہ کی تکالیف و شدائد سے تنگ آکر حبش کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ چند سال کے بعد یہ حالت ہوتی ہے کہ وہی والی عمان کے پاس سفیر اسلام بن کر جاتے ہیں اور ہزاروں اشخاص کے مسلمان ہو جانے کی خوشخبری دربار رسالت میں لاتے ہیں۔

خالد بن ولید جنگ احد میں کفار کے کمان دار ہیں اور مسلمانوں کو فنا کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان کو دیکھتے تو لات و عزی کے مندروں کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہیں اور اکثر فتوحات کی بدولت ان کو دربار رسالت سے سیف من سیف اللہ کا معزز و محترم خطاب نوازش کیا جاتا ہے۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ مکہ جانے کا قصد کرتے ہیں تو حدیبیہ کے میدان میں عروہ بن مسعود قریش کے سفیر بن کر آتے ہیں کہ آپ کو اس ارادہ سے باز رکھیں، وہ خود بخود مدینہ میں آتا ہے اور اسلام قبول کر کے اپنی قوم میں اسی کی تبلیغ و اشاعت کرتا ہے۔ عمر بن الخطاب گھر سے تلوار لے کر نکلتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا سر قلم کریں، مگر جاتے ہی حلقہ بگوش اسلام بن جاتے ہیں۔ طفیل دوسی جبکہ مکہ میں آتے ہیں تو اپنے کانوں میں روئی کی ڈاٹ رکھ لیتے ہیں کہ محمد ﷺ کی آواز کان میں نہ پہنچے۔ بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر پھرتے اور محمد ﷺ کی آواز کو پہنچاتے

ہیں۔ وہی عبدیایل ثقفی، جس نے طائف میں غلاموں اور بچوں کو پتھر پھینکنے کے لئے نبی ﷺ کے پیچھے لگا دیا تھا، انجام کار مدینہ میں حاضر ہوتا ہے، اور وہاں سے اپنی قوم کے لئے ایمان و یقین لے کر جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ جنگ حنین میں جبکہ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے، کون تھا جو رکاب نبوی ﷺ کو تھامے ہوا تھا، یہ وہی ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب تھا جو اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا کا بیٹا تھا، مگر آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا۔

یہی سنت اللہ ہے کہ انجام کار اپنے اور بیگانے سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور سب مان جاتے ہیں کہ جس راہ پر ہم کو یہ مصلح اعظم لیجانا چاہتا ہے، وہ یقیناً نجات کی راہ ہے اور اس پر چل کر ضرور کامیاب ہوں گے۔ ہماری تمام قیمتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ وہ ہمیں حکومت و آزادی دلوانے کا وعدہ کرتا ہے۔ ضرور ہے کہ یہ پورا ہو کر رہے، یہی وجہ ہے کہ ملک اس کے ساتھ ہو جاتا ہے اور ظالمانہ حکومت کے اعوان و انصار میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

### طاقت کی نمائش

قوم میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں، اسے اپنی غلامانہ ذلت اور محکومانہ رسوائی کا احساس ہو رہا ہے، وہ اپنے دل میں تڑپ پاتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ آزاد سر زمین ہو، کوئی غیر حاکم نہ ہو اور نہ کسی کے ماتحت زندگی بسر کرنی پڑے، اس لئے سعی و کوشش ہوتی ہے۔ عام لوگوں میں جوش و ہيجان پیدا ہوتا ہے، شوق و ولولہ طلب سے ہر ایک سر فروشانہ اقدام کرنا چاہتا ہے، مگر حکومت سدر راہ بن جاتی ہے۔ اس حیات قومی اور سرگرمی عمل کو دبانیے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشتی ہے۔ ہر قسم کے ظالمانہ قوانین کی تدوین و ترتیب ہوتی ہے اور اگر یہ شویدہ سر لوگ ان مجنونانہ اجتماعات کو قائم کریں تو ان کو ڈرانے اور دھمکانے کے لئے فوجی طاقت کی نمائش ہوتی ہے۔

جب فرعون نے دیکھا کہ موسیٰ و ہارون کا اثر برابر بڑھتا جاتا ہے، تو اسے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ اگر اس وقت ان کی راہ میں زبردست رکاوٹ نہ پیدا کی گئی، تو آگے چل کر یہ دونوں میری حکومت کو برباد کر دیں گے۔ اس لئے اپنا رعب و اقتدار قائم رکھنے اور ان کو ہیبت زدہ کرنے کے خیال سے اس نے اپنی تمام تر فوجی طاقت کا مظاہرہ کیا، کہ رعایا کے لوگ اس شاہانہ شان و شوکت، فراوانی مال و دولت، کثرت اعدا و دشمن، سامان حرب کی نمائش اور تلواروں کی چمک سے خوفزدہ ہو جائیں اور حریت و استقلال قومی کے خیالات و افکار کو دلوں سے نکال دیں۔

فَجَبَّ السُّعَىٰ وَقَابَلَتْ يَوْمَهُمُ الْمَغْلُوبُ ﴿٥٠﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُمْ مُجْتَبِعُونَ ﴿٥١﴾ (الشعر آء ۳۷ تا ۳۸)

اس روز مقرر کے وعدے پر جادو گر جمع کئے گئے اور لوگوں میں منادی کرادی کہ اب تک تو خیر تم لوگ الگ تھک رہے، اب ایسے موقع پر بھی تم لوگ جمع ہو گے یا نہیں۔  
اس نمائش سے فرعون کا مقصد یہ تھا کہ،

(الف) جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے ہیں، وہ اپنے انجام اور عاقبت کار سے خوفزدہ ہو کر آزادی کے جنون کو سر سے نکال دیں۔

(ب) عام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس حکومت کے قبضہ و اقتدار میں کس قدر قوت و طاقت ہے۔ وہ جب چاہے کتنی فوج فراہم کر سکتی ہے۔ پھر جس سلطنت کے ذرائع و وسائل اس کثرت کے ساتھ ہوں، وہ ایک بے سرو سامانی موسیٰ سے کیا خوفرزدہ ہوگی۔

(ج) چونکہ موسیٰ کے بار بار مطالبہ آزادی و حریت نے عوام الناس پر اپنا اثر ڈال لیا ہے اور لوگوں کے دلوں سے حکومت کا رعب اٹھ گیا ہے، یہ نمائش کی گئی کہ اس کا رعب قائم ہو جائے اور اس کی ہیبت میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پائے۔

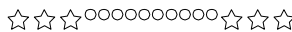
## کلمہ حق کا خوف

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوت و طاقت فرعون کے ساتھ ہے۔ سلطنت کے خزانے اس کے قبضہ و اقتدار میں ہیں اور فوج اس کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کلمہ حق اور خدا کا ارادہ حریت کی پادشاہت اور خسروی ملاحظہ ہو کہ ان کی تعداد قلیل ہے، ان کے پاس ذرائع و وسائل عیش و کامرانی نہیں۔ وہ لوگوں کو پھولوں کی بیج پر لیٹنے کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ کانٹوں کے بستر ہیں جن کی طرف ان کو بلاتے ہیں، مگر یہی چھوٹی سی جماعت ہے جو باوجود قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کے جنود کفر و ضلالت میں ہیبت پیدا کر رہی ہے۔ ایوان حکومت میں زلزلہ آرہا ہے اور اعضاء و ارکان حکومت اپنے آپ کو خطرات و مہالک میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ ﴿٥١﴾ وَإِنَّا لَجَبِينُمْ خِذْرُونَ ﴿٥٢﴾ (الشعر آء ۵۴ تا ۵۶)

بنی اسرائیل تھوڑی سی جماعت ہیں، اور انہوں نے ہمیں سخت ناراض کیا ہے اور اگرچہ ہماری جماعت کثیر ہے مگر ہمارا شیوہ احتیاط ہے، اس لئے تم کو مدد کے لئے بلاتے ہیں۔

فرعون کا دل اس جماعت کی روز افزوں ترقی اور کامیابی کو دیکھ کر کانپ رہا ہے۔ اسے اپنی کمزوری و ناتوانی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ کل جن لوگوں کی امداد و اعانت پر مجھے پورا اعتماد اور بھروسہ تھا آج وہ میری جماعت سے کٹ کر موسیٰ علیہ السلام سے مل گئے ہیں، اس لئے دوراندیشی کے خیال سے وہ اپنے باقی ماندہ اعوان و انصار کو مدد کے لیے بلاتا ہے، مگر اس مدد کے طلب کرنے میں بھی وہ دجل و فریب اور وسائل سیاست سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنی بے بسی اور بے کسی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور ظاہر بین نظروں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہانہ رعب و داب، قوت و طاقت اور تائید الہی اسی کے ساتھ ہے۔ مگر اہل نظر اور ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اس قسم کے اعلانوں کی تہ میں کون سی چیز کام کر رہی ہے اور حقیقت اصل یہ کیا ہے۔



## باب نمبر ۳

## انجام

## جھوٹے وعدے

ظالم حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ جب وہ دیکھتی ہے کہ اب رعایا میں اپنی آزادی کا قوی احساس پیدا ہو گیا ہے، قوت و طاقت اور فوجی نمائش نے کوئی کام نہیں دیا، بلکہ اس کا جوش و عشق حریت و استقلال اور ترقی کرتا جاتا ہے، اب اگر سختی سے کام لیا تو بنابنائیا کھیل بگڑ جائے گا، تو پھر وہ جھوٹے وعدوں پر آتی ہیں۔ رعایا کو غلط امیدیں دلاتی ہیں اور دور از کار تو قعات سے ان کا دل بہلاتی ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی حرارت قومی سرد پڑ جائے اور جوش میں کمی پیدا ہو۔

فرعون پر جب کبھی مصیبتیں نازل ہوئیں اور تکالیف نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا، تو وہ ہمیشہ موسیٰ سے طالب اعانت ہوا۔ اور وعدہ کیا کہ اگر ان مصیبتوں اور تکلیفوں کے بادل چھٹ گئے تو میں اسی وقت نبی اسرائیل کو آزاد کروں گا، مگر ایسا بارہا ہوا کہ موسیٰ کی دعاؤں نے فرعون کی عین وقت پر یادری کی اور اس کو ہر تکلیف و مصیبت سے نجات مل گئی، لیکن وہ ہمیشہ بد عہد ثابت ہوا اور کبھی اپنی بات پورا کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی، کہ فراعنہ و دجالہ کی یہی سنت ہے۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَعَمَ عَلَيْهِمُ الرَّجْزُ قَالُوا يٰنُوسَىٰ اذْعُمْ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ ۚ لَٰكِنْ كَشَفْتُ عَنْآ الرَّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَٰكِنْ سَلَوْنَا مَعَكَ بَنِي إِسْرٰءِيلَ ۖ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرَّجْزَ اِلٰٓى اٰجَلٍ هُمْ بِلُغْوٰكِ اِذَا هُمْ يَنْكُشُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ (الاعراف ۱۳۳ تا ۱۳۵)

جب ان پر عذاب نازل ہوا تو کہتے: اے موسیٰ، تم سے جو خدا نے قبول دعا کا وعدہ کر رکھا ہے اس کے آسرے پر اپنے پروردگار سے ہمارے حق میں دعا کرو اور اگر تم نے ہم پر سے اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم ضرور تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی ضرور تمہارے ساتھ بھیج دیں گے، پھر جب ہم ایک وقت خاص کے لئے جن تک ان کو پہنچنا تھا عذاب کو ان سے ٹال دیتے، تو وہ فوراً ہی بد عہدی کرنے لگتے۔

اس آیت میں حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(الف).... جب حکومت پر کوئی مصیبت آتی تو اسی ذلیل و کمزور رعایا کی طرف توجہ ہوتی، اس کی مدح و ستائش کے گیت گائے جاتے، اس کے سپاہیانہ جذبات، مالی فداکاری اور جوش مذہبی سے اپیل کیا جاتا۔

(ب).... اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے ان لوگوں سے صلح و آشتی کی جاتی اور ان سے درخواست کی جاتی کہ عارضی طور پر وہ اپنی مخالفانہ کوششوں کو ترک کر دیں۔

(ج).... ان سے وعدے کئے جاتے کہ اس مصیبت عظمیٰ اور واہیہ کبریٰ سے نجات حاصل کرتے ہی تمام مطالبات قومی پورے کر دیے جائیں گے۔ تمہاری ہر تکلیف و مصیبت کا علاج ہو جائے گا اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

(د).... لیکن جب تکلیفوں سے نجات ملتی اور رنج و غم کے بادل چھٹ جاتے تو ان تمام وعدوں پر پانی پھر جاتا، کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ ان کی حقیقت نہ ہوتی، بلکہ جس قوم نے دھوکے میں آکر اس قدر جوش فداکاری و سرفروشی کا اظہار کیا تھا، اس کی عملی قوتوں کو معطل و بیکار کرنے کے لئے اور زیادہ سخت قوانین کی ترغیب عمل میں آتی۔

چاہئے یہ تھا کہ جس بد بخت قوم نے اپنی زندگی اور موت، حکومت کے حوالہ کر دی ہو، جس نے اپنی دولت و ثروت اس پر قربان کر دی ہو اور جس نے ہر ممکن طریقہ سے اس کی امداد و اعانت کی ہو، اس کی ہر طرح دل جوئی کی جاتی، اس کی ترقی کے لئے مختلف تدابیر سوچی جاتیں اور اس کو موقع دیا جاتا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے اوپر خود حکومت کر سکے، مگر فرعون کی شوریدہ سری ملاحظہ ہو کہ وہ صرف بد عہدی ہی پر قناعت نہیں کرتا اور اپنی بیہودہ حرکت پر نادم نہیں ہوتا، بلکہ بنی اسرائیل کو تکلیف و مصیبت میں ڈالنے اور ان کا دل دکھانے کا پورا سامان کرتا ہے۔ ان کی تفحیک و تحمیق اور ان کی سادہ لوحی پر تمسخر و استہزا کرتا ہے۔ وہ لوگ تو اپنی قومی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں، مگر یہ ان کی سعی کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ إِذْ أَهَمُّ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿٢٥﴾ (الزخرف ۷۷)

تو جب موسیٰ ہمارے مجرے لے کر ان کے پاس آئے تو وہ لگے ان کی ہنسی اڑانے۔  
مگر انجام کار اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمسخر و استہزا دراصل خود اپنے ساتھ کر رہا تھا۔

احسانات کی یاد

حکومت کرنے کے دو طریقے ہیں۔

(الف) اگر حاکم جماعت کو رعایا کے ساتھ الفت و ہمدردی ہے، تو اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوگی کہ ان میں اخلاق صالحہ اور صحیح کریکٹر پیدا کر دے اور ان کی ایسی تربیت کرے کہ خود ان میں حکومت و جہانبانی کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

(ب) لیکن اگر تلوار کے زور سے اور طاقت کے بل پر لوگوں کو اپنا غلام و محکوم بنالیا ہے، اس کے تعلقات و روابط اپنی ماتحت قوموں کے ساتھ محض تاجرانہ اصول پر مبنی ہیں اور اس کو رعایا کے سود و زیاں سے کوئی سروکار نہیں، تو اس کی کوشش ہوگی کہ ان لوگوں میں سیرت نہ پیدا ہو، روز بروز یہ بد اخلاقی کے گڑھے میں گرتے جائیں، ان کو اپنی گذشتہ شاندار تاریخ سے واقفیت نہ ہو اور ہمیشہ میرے ہی غلام رہیں۔

تورات ہمیں بتاتی ہے کہ فرعون کا طرز حکومت دوسری قسم کا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی حکومت کے ثبات و قیام کے لئے مسئلہ توازن پر عمل کرتے ہوئے بنی اسرائیل کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان کو ہمیشہ ذلیل سے ذلیل خد متوں کے لئے مجبور کرتا تھا، کہ ابھرنے نہ پائیں۔ ملک میں جس قدر اصلاحات نافذ ہوتی تھیں، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حکام کی مختصر جماعت کو فائدہ پہنچے، اس کی جیبیں سونے اور چاندی کے سکوں سے بھر پور ہوں، اگرچہ ایسا کرنے سے بنی اسرائیل کے لاکھوں افراد بھوک اور فاقہ کشی کی وجہ سے مرجائیں اور ہزاروں فرزندان آدم مختلف امراض اور بیماریوں کا شکار ہوں۔

جس حکومت کا یہ طرز عمل ہو جو اصلاح کے پردے میں انسانوں کو ذبح کرتی ہو، جو انسانی ہمدردی کا نقاب پہن کر ہمارے سامنے آئے اور اپنے عشوۂ و ناز سے عوام الناس کو اپنا فریفتہ کر لے، مگر جب نقاب کو الٹے تو بھیڑیوں اور درندوں کی طرح اپنے گرد و پیش کے تمام انسانوں کو چیرے اور پھاڑے۔ ظاہر ہے کہ کسی شریف انسان کو ایک لمحہ کے لئے بھی ایسی حکومت کے ساتھ ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر افراد رعایا اس کی سحر طرازیوں سے مسحور ہو گئے تھے، تو جس وقت ان میں جس و بیداری پیدا ہوگی، اس کے اشد شدید دشمن بن جائیں گے اور ایسی ظالمانہ حکومت کے تباہ و برباد کرنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں گے۔

پانی سر سے گزرنے کے بعد حکومت کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے تنبیہ و اعتبار کی راہیں کھل گئی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و تربیت نے ان کو آزادی کے لئے تیار کر دیا ہے۔ اب فرعون اپنی حکومت کے بقا و استحکام کی خاطر اپنے گزشتہ احسانات یاد دلاتا ہے، اپنے سابقہ کارناموں کا تذکرہ کرتا ہے، اس نے جو جو اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی منظر عام پر جلوہ نمائی کی جاتی ہے۔ اور اس تمام تر خدع و فریب اور دجل و شیطنت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان فریب کاریوں اور ملمع سازیوں میں پھنس کر رعایا کے عام لوگ اس حکومت کو اللہ کا احسان عظیم خیال کریں، بادشاہ وقت کو ”ظل اللہ“ اور ”اوتار“ سمجھیں اور اس سے انحراف و بغاوت کو گناہ عظیم تصور کریں۔

فرعون پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ بنی اسرائیل حریت و استقلال کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ موسیٰ نے آتے ہی دربار فرعون میں اپنا مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ: ارسل معنا بنی اسرائیل، مگر اس صدائے حریت نے اس قوم کو آزادی بخشے اس لیے قابل غور اپنی حکومت و فرمان روائی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے وہ ان الفاظ میں موسیٰ کو خطاب کرتا ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فَيُنَاوِلِنَا اَوْ كُنْتَ تَسْمِنُ ۖ (الشعراء: ۱۸)

کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں رکھ کر بچے سانئیں پالا اور تیری اتنی عمر ہونے آئی تو اپنی اس عمر میں سے برسوں ہمارے ہاں رہا۔ تم تہذیب و شائستگی سے عاری، تمدن و حضارت سے بے بہرہ، محاسن اخلاق و فضائل اعمال سے ناواقف اور علوم و معارف سے محروم تھیں، جنگلیوں کی سی زندگی بسر کرتے، حیوانوں کی طرح رہتے اور درندوں کی مانند ایک دوسرے



کو چیرتے پھاڑتے تھے، کپڑا پہننے، کھانا کھانے، بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ تمہاری بے کسی اور بے بسی کی یہ حالت تھی کہ سمندر کی موجوں کے رحم پر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ تمہارا کوئی نگران کار و محافظ نہ تھا۔ ہم نے تمہاری نگہداشت اپنے ذمہ لی، تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، تمہیں مہذب و شائستہ بنایا، رہنے کا ڈھنگ سکھایا، قصور و محلات شاہی میں رہ کر تم میں عقل و شعور اور تمیز پیدا ہوئی، تمہارے آرام کی خاطر ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچادیں، کیا یہ قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسی شفیق و مہربان حکومت سے انحراف و بغاوت کرو اور اپنی قوم میں اس کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات خبیثہ پیدا کرو۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے خوب آشنا تھے کہ ان احسانوں کا شکر گزار ہونا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ فرعون کا یہ مقصد ہر گز نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور اس کی تعلیم و تربیت سے وہ اپنی قوم میں زندگی پیدا کرنے کے قابل ہوں، بلکہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد پیش نظر تھے اور اپنے ہی زاویہ نگاہ سے ان امور کو انجام دیا تھا، اتفاق سے دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان باتوں پر کون عقل مند شکر گزاری کا مطالبہ کرے گا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ زید اپنے ایک دوست خالد سے ملنے کے لئے جاتا ہے، رستہ میں اسکو اتفاقاً ایک ہزار روپیہ کی تھیلی مل جاتی ہے۔ کیا خالد کو یہ حق حاصل ہے کہ زید کو اپنی شکر گزاری کے لئے مجبور کرے۔

موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ مجھے اس لئے نہیں پرورش کیا گیا کہ ان لوگوں کو میرے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی تھی، بلکہ ان کی خود غرضی اور مطلب پرستی نے ان کو اس کے لئے مجبور کیا تھا۔ فرعون کی بیوی نے جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے خاوند کے بچہ ظلم سے بچانے کی کوشش کی تو یہ کہا:

فَرَأَيْتَ عَيْنِي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ يَتَّخِذَ وَلَدًا (القصاص ۸)

یہ میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو تم لوگ اسکو مارو نہیں، عجب نہیں کہ ہم کو فائدہ پہنچائے اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں۔

یہ تو فرعون کے گھر والوں کی غرض و غایت تھی مگر اللہ تعالیٰ کا مقصد کچھ اور ہی تھا وہ چاہتا تھا، لیکن لہم عدوا و حوذا، ان کے دشمن اور ان کی پریشانی کا باعث ہوں۔

جس حکومت نے اس بچے پر روپیہ صرف کیا ہو کہ اس کے عوض میں تمام قوم کو اپنا غلام بنائے۔

جس نے تہذیب و شائستگی اس لئے سکھائی ہو کہ غلامی میں اور زیادہ قوت و استحکام ہو۔

جس نے ہمدردی و مروت کا اظہار اس لیے کیا ہو کہ محکومیت کی بیڑیاں اور طوق مضبوط ہوں۔

جس نے ہر قسم کی سہولتیں اس لئے بہم پہنچائی ہوں کہ ان کو اپنی خود غرضیوں کا شکار کرے۔

جس نے سفر میں آسانیاں پیدا کر دی ہوں کہ تمام کی تمام قوم آرام طلب بن جائے۔

جس نے علوم و فنون کی ترویج اس لیے کی ہو کہ ان کو اپنی گزشتہ تاریخ بالکل تاریک نظر آئے، اپنے آباؤ اجداد کو ہر

قسم کی خوبی اور نیکی سے خالی پائیں اور یہ لوگ سستے داموں غلامی کے لئے تیار ہوں۔



جس نے طہارت و پاکیزگی، عفت و پاکدامنی اور نیکی و فرشتگی سے متنفر کرنے کی پوری کوشش کی ہو۔  
جس نے ہر بد اخلاقی اور فسق و فجور کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہو، اور ملک میں اس کی عام نشر و اشاعت کر دی ہو۔  
اور جس نے قوم کی قوم کو ادنیٰ ترین ضروریات زندگی کے لیے غیروں کا محتاج و دست نگر بنا دیا ہو۔  
وہ حکومت ہر گز اس قابل نہیں کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور کبھی کوئی صاحب نظر و بصیرت اس فرعون کے آگے  
سر تسلیم خم نہ کرے گا۔ چنانچہ موسیٰ نے اس فرعون کو مطالبہ کا جواب ان الفاظ میں دیا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَبْتَغَاهَا عَلَىٰ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ ﴿٢٢﴾ (الشعر ۲۲)

یہ احسان پرورش جو تم مجھ پر رکھتے ہو کیا اسی کے بدلے تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔  
فرعون اپنے گزشتہ احسانوں کو یاد دلاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے شکریے میں وہ بنی اسرائیل کو ابھی اور ایک  
مدت تک اپنا غلام بنائے رکھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام اس کو صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ ان کا شکر ادا کرنا بالکل غلط ہے۔ تمہیں  
ہر گز جائز نہیں کہ اس احسان پرورش کی خاطر تمام قوم کو برباد کر دو۔

یہ فرعونی حکومتوں کا خاصہ ہے کہ جب تحریکات قومی کسی طرح نہیں دیکھتے، رعایا میں آزادی کا جوش بڑھتا جاتا ہے، نہ  
تو تمسخر و استہزاء کام دیتا ہے اور نہ جابرانہ طریق حکومت کا میاب ثابت ہوتا ہے، تو اپنی رعایا کے جذبہ شکر گزاری کو تحریک  
دینے کے لئے اپنے احسان جتاتی ہیں اور اس طرح کوشش کرتی ہیں کہ عوام الناس اس دھوکے میں آکر ان کا ساتھ دیں اور  
آزادی کی راہ حق ترک کر دیں۔ اگرچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی رعایا پر کوئی احسان نہیں کیا اور  
واقعات اس کی پوری شہادت دے سکتے ہیں، مگر پھر بھی احمق اور کوتاہ اندیش لوگ اپنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے اس  
چال بازی کو نہیں سمجھتے اور حکومت کا ساتھ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

### فرعون کی ناقابلیت

اس بد بخت کا کبھی بھی یہ مقصد نہ ہوا کہ بنی اسرائیل آزاد ہوں، اس نے ان کی ترقی کی تمام راہیں بند کر دیں تھیں۔  
ذلیل ترین خدمتیں ان کے سپرد کی جاتیں اور کبھی ان کو دولت مند ہونے کا موقع نہ دیا جاتا۔ یہ لوگ مصر میں قریباً  
چار سو سال تک غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے اور کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ حکومت کر سکتے۔ اب اس سے زیادہ محکومانہ  
زندگی بسر کرنا کسی طرح بھی قرین عقل و انصاف نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف اس لئے ہوئی تھی کہ بنی  
اسرائیل آزاد ہوں، اور فرعون کے قہر و استبداد سے نجات حاصل کریں۔ ان کو ایسا قانون نوازش کیا گیا تھا، جو ہدیٰ و نور تھا،  
جو حریت و استقلال کا ذمہ دار و کفیل تھا۔ موسیٰ ہر قسم کے سامان و وسائل اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ اپنی عاجز و دردماندہ  
قوم کو غلامی و محکومی کی ذلت و رسوائی سے نکال کر حکومت و خلافت تک لے جانے کے قابل تھے۔ اس لئے انہوں نے جس  
وقت قومی آزادی کا مطالبہ کیا تو اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ میں اس قوم کو راہ ترقی دکھلا سکتا ہوں، ملاحظہ ہو:

فَأَلْقَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعْنَا مِنْهَا إِدْرَاكًا فَإِذَا هِيَ بَيْتَاءُ لِلْكَافِرِينَ ﴿٣٣﴾ (۲۶:۳۳، ۳۲)

اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ صرغ اڑ رہا ہے اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ نکالنے کے ساتھ سب دیکھنے والوں کی نظر میں بڑا چمک رہا تھا۔

ان معجزات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے حریف فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کو یہ بتانا چاہتے تھے۔

(الف).... یہ لاٹھی بالکل بے جان تھی، میرا ہاتھ لگتے ہی اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور وہ حرکت کرنے لگی۔ ایسے ہی بنی اسرائیل چار سو سال تک تمہارے غلام رہے، مگر تمہارا قانون زندگی بخش ثابت ہونے کے بجائے ان کی موت کا باعث بن گیا اور وہ حقیقت میں مر گئے۔ کیونکہ محکومیت اور موت دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ حقیقت ایک ہی ہے، اگرچہ نام مختلف ہیں۔ زندگی صرف حکومت اور جہاں بانی کو کہتے ہیں۔ جس وقت بنی اسرائیل تمہاری غلامی سے نجات حاصل کر کے میرے قانون پر عمل کرنا شروع کر دیں گے تو وہ فوراً زندہ ہو جائیں گے اور ارض مقدس کی حکومت انہیں نوازش کی جائے گی۔

(ب).... حرکت کرنے کے بعد لاٹھی نے ان تمام سانپوں کو نگل لیا جو فاسامانی کی خاطر جادو کے زور سے بنائے گئے تھے۔ بنی اسرائیل میرے قانون کا اتباع کر کے زندہ ہو جائیں گے اور ان تمام دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیں گے جنہوں نے اب تک ان مظلوموں اور بے کسوں کو سانپ کی طرح کاٹ کھایا ہے، جن کی تہذیب و شائستگی، تعلیم و تربیت اور اصناف علوم و فنون کی نمائش بظاہر نہایت ہی دل فریب اور دل خوش کن تھی، لیکن حقیقت میں اس کا زہر نہ صرف جسم کو ہلاک کر دیتا تھا بلکہ روح پر بھی عالم ممت طاری کر دیتا تھا۔

(ج).... میرے ہاتھ نے میرے حکم کی تعمیل کی تو روشن ہو گیا اور اب کسی آنکھ کو طاقت نہیں کہ اس کی طرف دیکھ سکے، سب کے سب محو حیرت و استعجاب ہیں۔ ایسے ہی جب بنی اسرائیل میرے دست و بازو بن کر حریت قومی کے لیے سرفروشانہ اقدام کریں گے، ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں گے تو ان کی ترقی نہایت سرعت کے ساتھ ہوگی۔ تمام قومیں ان کو حیرت سے دیکھیں گی۔ کسی میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو گی اور دنیا میں ان کا نام روشن ہو جائے گا۔

ان دونوں معجزات کو قرآن حکیم نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ ایک جگہ انکو فتح و کامرانی اور غلبہ فرمایا: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ (ہود ۹۶) ایک موقع پر ان کو آزادی کے زبردست دلائل سے تعبیر کیا: فَذٰلِكَ بُرْهٰنُنَا مِنْ رَبِّكَ (قصص ۳۲) ایک مقام پر ان کو اللہ نے اپنی آیات کبریٰ سی یاد کیا۔ مقصد ان تمام آیات کا یہی ہے کہ اب بنی اسرائیل کی آزادی کا وقت آگیا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ قانون موجود ہے جو ان کے استقلال قومی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

ان معجزات کو دیکھ کر فرعون کو اس امر کا موقع مل گیا کہ عوام الناس کو دھوکا دے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو مخاطب

کر کے کہا:

إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلَيْنِمْ ﴿٣٥﴾ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ ﴿٣٦﴾ (الشعر آء ۳۴ تا ۳۵)

بیشک یہ شخص ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے نکال باہر کرے۔

### اقتدار کا بھوت

ظالم و جابر اور اجنبی حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے حق و صداقت کو روز روشن کی طرح دیکھ لیتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ رعایا جو مطالبات پیش کرتی ہے وہ جائز اور درست ہیں اور ہر طرح سے ان کے پورا کرنے کی اہلیت بھی ان میں ہے، بلکہ بسا اوقات حکومت کے بعض ذمہ دار افراد بھی اس حقیقت کو کھلے الفاظ میں تسلیم کر لیتے ہیں اور خود لوگوں کو بھی ان کی تقریروں سے یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اب ہمارے حقوق ادا ہوں گے اور ہمیں کامل آزادی نصیب ہوگی۔

مگر ہمیشہ مواقع میں اقتدار اور رعب کا بھوت افراد حکومت کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ انہیں یہ ڈر لگتا رہتا ہے کہ اگر ہم نے رعایا کے مطالبات تسلیم کر لیے تو ہمارے اقتدار میں فرق آجائے گا۔ ہمارا ڈر لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے گا، قانون بالکل لغو و مہمل ہو کر رہ جائے گا اور ہماری حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، اس لئے وہ ان کے مطالبات کو ٹھکرادیتی ہے اور ان کے پورا کرنے سے بلطائف الجلیل انکار کر دیتی ہے۔

چنانچہ فرعون اور اس کی حکومت کے افراد یہی کیا کرتے تھے۔ سورۃ مومنون میں آتا ہے:

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٥﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴿٣٦﴾ فَقَالُوا أَنْتُمْ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِدُوْنَ ﴿٣٧﴾ فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴿٣٨﴾ (المومنون ۳۵ تا ۳۸)

پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنی نشانوں اور دلیل ظاہر کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا، تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے بھی سرکش لوگ۔ تو آپس میں لگے کہنے، کیا ہم ان دو شخصوں پر کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کی قوم کی قوم ہماری خدمت گار ہے۔ غرض ان لوگوں نے دونوں کو جھٹلایا تو انجام یہ ہوا کہ ہلاک کر دیئے گئے۔

فرعون اور اس کے ارباب شوریٰ نے حضرت موسیٰ کے مطالبات تسلیم نہ کئے اور بنی اسرائیل کو آزادی کامل دینے سے انکار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کے سب حق کے ٹھکرادینے کی وجہ سے برباد ہو گئے۔ پس آج بھی جو حکومت فرعون کے نقش قدم پر چلے گی، وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ لے کہ اس کا بھی وہی انجام ہو گا: وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

## ذہاب الی اللہ

جب نوبت یہاں تک آگئی تو بنی اسرائیل ترک وطن اور ہجرت الی اللہ کیلئے مجبور ہو گئے، کہ بلاد بعیدہ میں جا کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے سعی و کوشش کریں اور اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے آنے والے وقت کیلئے تیار ہو جائیں، مگر بد بخت فرعون نے انکے اس رستہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کیں اور ہر طرح سے مسلح ہو کر ان کا دور تک تعاقب کیا۔

فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَنْعُ قَالَ أَصْحَبُ مُوسَى إِنَّا لَمَذْكُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ؕ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۶۲﴾ (الشعر آء ۶۰ تا ۶۲)

تو فرعون کے لوگوں نے دن نکلنے نکلنے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ پھر جب دونوں جماعتیں ایسی قریب ہو گئیں کہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ کے لوگ لگے کہنے کہ اب تو دشمن نے ہم کو آلیا۔ موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور کوئی دم میں وہ مجھ کو مخلصی کا رستہ دکھائے گا۔

فرعون کا لشکر اور اس کا ساز و سامان دیکھ کر بنی اسرائیل کے اوسان خطا ہو گئے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، جو قوم ہمیشہ سے دوسروں کی غلام و محکوم رہی ہو وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتی ہے، اگرچہ منزل مقصود اس کے سامنے ہو اور سپیدہ صبح نمودار ہو گیا ہو، مگر پھر بھی وہ شک میں مبتلا رہے گی۔ آزادی کی راہ آسان نہیں۔ اس میں تکلیف و مصیبت کا آنا ضروری ہے۔ قصر آزادی کی طرف صرف ایک ہی راستہ جاتا ہے جس کا فرش اینٹ اور چوٹے کا نہیں، بلکہ انسانی خون اور اس کے مغرور سروں کا ہے، قرآن نے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمْ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُّوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهُ ۖ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۶۳﴾ (البقرة ۲۱۳)

کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ مزے سے بہشت میں داخل ہو گے اور ابھی تک تم کو ان لوگوں کی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور تکلیفیں بھی اور جھڑ جھرائے بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے چلا اٹھے، آخر خدا کی مدد کے آنے کا کوئی وقت بھی ہے؟ سنبھلو سنبھلو! اللہ کی مدد کا وقت آگیا ہے۔

جس وقت فرعون نے تنگ آ کر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، اس وقت بھی ان لوگوں نے موسیٰ ہی پر تمام الزام رکھا تھا کہ جس قدر تکالیف و شدائد حکومت کی جانب سے ہم پر نازل ہو رہی ہیں، وہ آپ ہی کی وجہ سے ہیں۔ اگر آپ یہ مطالبہ نہ کرتے تو آرام سے زندگی بسر ہوتی: قَالُوا أَوْفِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (الاعراف ۱۲۹) مگر موسیٰ نے ان کے اس اعتراض کی کوئی پروا نہ کی، اپنی کوشش میں مصروف رہے اور ان کو بتا دیا کہ میری کوششوں کا یہ نتیجہ ہو گا۔

عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَن يَهْدِيَكُمُ اللَّهُ وَيَسْتَخْلِفْكُمْ فِي الْأَرْضِ (الاعراف ۱۲۹)

اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو ملک میں اس کا جانشین بنائے۔ یہ غلامی ہی کے نتائج تھے جن کی بنا پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت بنانے کی درخواست کی اور یہی وہ چیز تھی جس نے ان کی ہمتوں کو پست اور ارادوں کو کمزور کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا وعدہ قطعی اور یقینی ہے، مگر بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھتے اور انجام کار اپنی بزدلی اور کمزوری کا اظہار یوں کرتے ہیں فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ، تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ اور ان لوگوں سے لڑو، ہم تو اسی جگہ بیٹھے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ غلاموں اور محکوموں کے جذبات صادقہ پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے، پھر نہ تو ان میں ہمت کی بلندی ہوتی ہے اور نہ ارادہ کی قوت۔ وہ درخت کی ٹہنی کو، جنگلوں اور پہاڑوں کے ہر پتھر کو اور قدرت کی ہر جلوہ نمائی کو اپنے سے زیادہ عزیز و محترم خیال کرتے ہیں۔ اور اس لیے ہر ذلیل سے ذلیل چیز کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ اس غلامی نے ان کو بزدل بنا دیا اور باوجود آزادی حاصل کرنے کے وہ فرعون کے لشکر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے، مگر موسیٰ نے انہیں اطمینان دلایا کہ جب میں حق پر ہوں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی میری اس تحریک آزادی کو فنا نہیں کر سکتی۔ خدائے کریم جو بے کسوں کا چارہ ساز اور مظلوموں کا دادرس ہے، مجھے اس وادی میں اکیلا نہیں چھوڑے گا کہ گم کردہ اور راہ بھٹکتا پھروں، بلکہ وہ میرے ساتھ ہے اور رہ نمائی کرتا ہے، وہی نجات و کامرانی کی صورت بھی پیدا کر دے گا۔

### نتیجہ کی بشارت

جس وقت بنی اسرائیل سر زمین مصر میں انتہائی مظالم کا شکار ہو رہے تھے آسمانوں پر ان کی قسمت کا فیصلہ یوں کیا جا رہا تھا۔

وَنُيِّنُّكَ أَنْ تَنْتَفِعَنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۖ وَتُكَيِّنُ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۖ (القصص ۶۳۵)

اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جو لوگ اس کے ملک میں کمزور سمجھے گئے تھے ان پر احسان کریں اور انہیں کو سردار بنائیں اور انہیں کو سلطنت کا وارث ٹھہرائیں اور انہیں کو ملک میں جمائیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو بنی اسرائیل کی طرف سے جس بات کا خطرہ تھا وہ انہیں کے ہاتھ سے ان کے آگے لائیں۔

قرآن حکیم نے ان الفاظ میں ایک دائمی قانون عدل کی طرف ہماری رہ نمائی کی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیا قوت کے جاہ و جلال کی نمائش گاہ ہے اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل۔ طاقتور قومیں اور زبردست حکومتیں کمزوروں کو اپنا غلام و محکوم بنا لیتی ہیں، ان میں پھوٹ اور نفاق، بغض اور کینہ اور باہمی انتقام کے جذبات خبیثہ پیدا کر کے ان کی جمعیت کو توڑتی ہیں۔ ان کے مختلف گروہوں اور فرقوں کو آپس میں ملنے نہیں دیتیں، کیونکہ وہ اگر مل کر ایک ہو جائیں گے تو کمزور نہ رہیں گے اور اتفاق و یکجہتی کی طاقت اعلیٰ ترین ظالموں کے تاج و تخت کو الٹ دے گی۔ یہ حال مصر میں بنی

اسرائیل کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کا ایک دوسرا قانون بھی ہے، خدا کا زبردست ہاتھ کبھی کبھی چپکنے والی حرکت کا بھی اظہار کرتا ہے، جب ظلم اور طاقت کی انتہا ہو جاتی ہے، جبر و تشدد اور غرور و تکبر کا شیطان حد سے تجاوز کرتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنا دیتی ہے اور وہی زمین جو کمزوروں کے لئے قتل گاہ تھی، طاقت والوں کی تباہی و ہلاکت کا تماشا گاہ بن جاتی ہے۔ پس اس دن چھوٹے بڑے کیے جاتے ہیں اور بڑوں کو چھوٹا کیا جاتا ہے۔ وہ کمزور کر دیئے گئے تھے، وہ کہ بے کس اور بے نوا تھے، وہ کہ صرف رونے ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے اور لٹنے لٹانے کے لئے تھے، قابل غور وقت آتا ہے کہ احسان الہی کا کے سزاوار ٹھہرتے ہیں اور کمزوری کی جگہ طاقت کے لئے، بے کسی کی جگہ فرماں روائی کے لئے، رونے کی جگہ خوشیوں کے لئے، ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لئے اور لٹنے کی جگہ لوٹنے کے لئے تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوت فرعون کی جگہ قوت موسوی کی تلوار آن کی آن میں دنیا کو پلٹ دیتی ہے اور صدیوں کی گری ہوئی قومیں پھر جاہ و جلال ربانی کے ظہور و قیام کے لئے دنیا کی وارث اور خلیفہ بنا دی جاتی ہیں۔

حسن خاتمہ

اس قدوس حق نوار کی کار فرمائی دیکھئے کہ اس ضعیف و کمزور قوم کو کس طرح وارث تاج و تخت بنا دیتا ہے۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَاٰلُوْا یُسْتَفْعُوْنَ مَسَارِقِ الْاَرْضِ وَمَعَارِبِهَا الَّذِیْنَ بَرُکْنَا فِیْهَا ۚ وَ تَبَّتْ کَلِیْمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ بِمَا صَبَّوْۤا ۚ وَ دَمَرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَ مَا کَاٰلُوْا یَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳﴾ (الاعراف ۱۳)

اور ملک شام کی زمین جس میں ہم نے برکت دی تھی، آخر کار ہم نے ان لوگوں کو اس کے پورب اور پیچھم کا مالک کر دیا جو فرعون کے ہاں کمزور سمجھے جاتے تھے اور اے پیغمبر، چونکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے ظلموں پر صبر کیا، اس لئے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا، ان کے حق میں پورا ہوا اور جو سختیاں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کے ساتھ کرتے تھے اور بڑی بڑی اونچی عمارتیں ان سے بے گار میں بنواتے تھے، اس سارے انتظام کو ہم نے درہم برہم کر دیا۔

ادھر تو بنی اسرائیل کو ارض مقدس کا وارث بنا دیا اور ادھر فرعون اور اس کی قوم کو سرزمین مصر سے محروم کر دیا۔

فَاٰخِرُ حَسْبُهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَّ عِیُّوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ کُنُوْۤا مَقَامِرَ کَرِیْمٍ ﴿۱۵﴾ کَذٰلِکَ ۚ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۶﴾

(الشعر آء ۵۷ تا ۵۹)

غرض ہم نے فرعون کے لوگوں کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت کی جگہ سے نکال باہر کیا، ایسا ہی ہوا اور بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔

## بصائر للناس

تم نے دیکھ لیا کہ یوسف غلامانہ حیثیت سے مصر میں داخل ہو کر اس سرزمین کے وارث بن جاتے اور تمام اطراف مملکت میں اسرائیل عزت و کرامت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر جب وہ اپنے شرف و مجد انسانی کو کھو بیٹھتے ہیں اور دائرہ انسانیت سے نکل کر جانوروں اور درندوں کی زندگی اختیار کرتے ہیں، تو ان پر عذاب الہی اس صورت میں نازل ہوتا ہے کہ ان پر ظالم و جابر بادشاہ مسلط کیئے جاتے ہیں جو ان میں پھوٹ اور نفاق کے جذبات پیدا کر کے ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، ہر ایک جماعت دوسری کو فنا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ قریباً چار سو سال تک غلام رہتے ہیں۔ پھر جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو جاتی ہے اور جبر و استبداد اپنے کمال پر پہنچ جاتا ہے، تو رحمت الہی جوش میں آتی ہے اور موسیٰ کو ان کی نجات کے لئے مبعوث کرتی ہے۔ وہ ایک مدت تک فرعون کے گھر میں پرورش پاتے ہیں کہ سیاست کی چال بازیوں اور مکاریوں سے خوب واقف ہوں۔ حکومت کے نظروں فریب، رعب و داب اور ظاہری شان و شوکت کی حقیقت سے آگاہ ہوں اور جہاں بانی و جہاں داری کے اصول و ضوابط کو معلوم کر لیں، پھر ان کو خود جلاوطنی کی مقدس منزل پیش آتی ہے اور دس سال تک شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے ہیں کہ اس طریق سے غلامانہ زندگی بسر کر کے ان کو معلوم ہو کہ میری قوم کی حالت کیا ہوگی جو چار سو سال سے غلامانہ طور سے رہ رہی ہے، پس وہ آئے اور بے باکانہ فرعون کے دربار میں للکار کر اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

فرعون کو دیکھو، وہ پہلے اس تحریک آزادی کو ہنسی میں اڑانا چاہتا ہے، اور موسیٰ کو مجنون کا لقب دیتا ہے، مگر تھوڑی سی مدت کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے ملک میں جڑ پکڑ لی ہے، تو وہ سختی پر اتر آتا ہے اور فداکاران حریت کو قید اور پھانسی کی دھمکی دیتا ہے۔ اسے خیال ہوتا ہے کہ یہ سختیاں میری سلطنت کو اور زیادہ محکم و استوار کر دیں گی، مگر دراصل یہی جابرانہ طریق عمل اس کی حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ چند روز کے بعد وہ سمندر میں غرق ہوتا ہے اور وہی مظلوم و بے کس وارث تخت و تاج بن جاتے ہیں۔ سچ ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بِصَاحِرِ النَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾

(القصص ۳۳)

اور اگلی امتوں کے ہلاک کیے پیچھے ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی جس سے لوگوں کی آنکھیں کھلتی تھیں، اور انکے لئے ہدایت اور رحمت تھی اور اس غرض سے دی گئی تھی کہ لوگ نصیحت پکڑ لیں۔

اس خدائے قدوس کے وعدہ کی سچائی کو دیکھو، اس نے کس طرح ایک فرعونی حکومت کو تباہ و برباد کیا۔ پس جس کی آنکھیں ہیں، وہ دیکھے، جس کے کان ہیں، وہ سنے اور جس کا دل ہے وہ غور کرے۔ کہ یہ وعدہ صرف ماضی کے لئے نہ تھا بلکہ مستقبل کے لئے بھی ہے، جو حکومت فرعون کے نقش قدم پر چلے گی وہ اسی طرح سمندروں میں غرق ہوگی۔ اس وعدہ الہی

کے ماضی کو تمام دنیا دیکھ چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے: وکان وعد امفعولا منزل مقصود سامنے ہے اور سورج اگرچہ دکھائی نہیں دیا، مگر اس کی روشنی خبر دے رہی ہے کہ ظلمت و تاریکی گئی اور نور کا زمانہ آگیا۔ یاس و قنوط کی کوئی وجہ نہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۖ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٨﴾ (الشعوریٰ ۲۸)

اور وہی تو ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت کی برکت کو پھیلا دیتا ہے اور وہ کار ساز اور سزاوار حقیقت ہے۔

فیضی گماں میر کہ غم دل نہفتہ ماند  
اسرار عشق انچہ تو اں گفت گفتہ ایم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین۔

☆☆☆○○○○○○○○☆☆☆☆



بسم الله الرحمن الرحيم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی

## تفاسیر پر ایک نظر

وسعت بیان

تفاسیر کا جس قدر ذخیرہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کے دیکھنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فرزندان اسلام نے اپنے تہذیب و شائستگی اور تمدن و حضارۃ کے مبارک عہد میں قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور بصائر و حکم پر زور دینے اور دنیا کو اس کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے کس قدر انتہائی سعی و کوشش سے کام لیا ہو گا اور اس کی تعلیمات صالحہ کی نشر و اشاعت میں کس درجہ ایشاد و فدویت کا اظہار کیا ہو گا، ان جلیل القدر بزرگوں نے اس کتاب عزیز کے حقیقی مفہوم و معانی کی تبلیغ و دعوت میں سرفروشانہ اقدام کیا اور دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار تالیفات لکھیں، اگر اس وقت ہم تمام زبانوں کی تفسیروں کو نظر انداز کر کے صرف عربی ہی کو لے لیں تو یقین کیجئے کئی ہزار تک ان کی تعداد پہنچے گی۔ ہم ارباب بصیرت کی ضیافت طبع کے لئے صرف چند تفاسیر کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ان کی وسعت بیان کا اندازہ ہو، ملاحظہ کیجئے۔

تفسیر ابن الجوزی: ۲۷ جلدوں میں ہے۔

تفسیر الاصبہانی: ۳۰ جلدوں میں ہے، اس کے مؤلف ابو مسلم اصبہانی ہیں، جن کی تفسیر کے اقتباسات جا بجا تفسیر کبیر میں درج ہیں۔ امام فخر الدین رازی اکثر مقامات پر ان کی شناخت کرتے ہیں۔

کتاب الجامع فی التفسیر: ۳۰ جلدوں میں ہے۔

تفسیر ابن النقیب: کچھ اوپر پچاس جلدوں میں ہے۔

کتاب التحریر والتبجیر: اس کی پچاس سے زائد جلدیں ہیں۔

تفسیر الادنفوی: علامہ ادنفوی، روم کے شہرہ آفاق عالم تھے۔ اس تفسیر کے وہی مؤلف ہیں، اس کی ۱۲۰ جلدیں ہیں۔

تفسیر القزونی: تین سو جلدوں میں ہے۔

تفسیر حدائق ذات البہ: پانچ سو جلدوں میں ہے۔

اس وسعت بیان کو دیکھئے، کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کرے گا کہ یہ تفسیریں کسی زمانہ میں قرآن حکیم کی

انسائیکلو پیڈیا (موسوعات) نہ رہی ہوں گی۔ اقوام و امم عالم کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اس کثرت کے ساتھ اپنی کسی کتاب کی خدمت کی ہو۔ یہ شرف و مزیت اور خصوصیت کبریٰ صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کثرت سے اس کی شرح و تفسیر کی گئی، اس کے احکام و ضوابط کی تدوین و ترتیب میں عمریں صرف کی گئیں، کشف سرائر و معجوبات کے لئے تالیفات لکھی گئیں لیکن پھر بھی ارباب فہم و بصیرۃ اور حقیقت شناس حلقوں سے یہی صدائے عشق و وارفتگی بلند ہو رہی ہو کہ: القرآن لاتقفی عجائبہ ولا تنقصی غرائبہ۔

### اولا نکل عہد

عبد الملک بن مروان ۲۵ ہجری میں تخت خلافت پر متمکن ہوا، اس نے اولین کام یہ کیا کہ اپنی تمام تر توجہ علوم و فنون کی تدوین کی جانب پھیر دی۔ اطراف و اکناف خلافت میں اعلان کر دیا کہ ہر ایک فن پر کتابیں تالیف ہوں۔ علماء عظام کو دعوت دی اور ان کو تصنیف کی طرف متوجہ کیا۔ سعید بن جبیر سے درخواست کی کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کچھ تحریر کریں۔ وہ اپنے زمانہ کے امام اور تفسیر میں یمکٹائے روزگار تھے، انہوں نے تفسیر لکھ کر بھیجی جس کو شاہی کتب خانہ میں جگہ دی گئی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے اور زیادہ اس دائرہ کو وسعت دی اور تمام بلاد و امصار اسلامی میں احکام نافذ کر دیئے کہ سنن و احادیث پر تالیفات تیار ہوں۔

دوراؤں میں تفسیر کا طریق نہایت ہی دلاویز اور معنی خیز تھا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ قرآن میں اخلاق بھی ہے اور فلسفہ اخلاق بھی، تمدن و حضارۃ کے احکام بھی ہیں اور تہذیب و شائستگی کے اصول و ضوابط بھی، تدبیر منزل و سیاست مدن کے آئین و قوانین بھی ہیں اور جہانگیری و جہانداری کے قواعد تنظیم و تشکیل بھی، لیکن انداز بیان، طریق تعبیر اور اسلوب تحریر کچھ اس درجہ جاذب قلوب و انظار واقع ہوا ہے کہ ان علوم سے کوئی واقف ہو یا نہ ہو جس وقت یہ اعجازی کلمات اس کے کانوں تک پہنچیں گے اس کی فطرت صالحہ اور قلب سلیم کا یہی اقتضار ہے گا کہ ہر وقت ان سے حلاوت اندوز رہے اور اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوں۔

ابتدائی زمانہ کی تفسیروں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں نہ منطقی دلائل ہیں نہ فلسفیانہ موشگافیاں، نہ ان کو ریاضیات و طبعیات سے کوئی سروکار ہے، اور نہ ہیئت و نجوم کے زور سے استدلال و حجت کو قوی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، صاف صاف اور کھلی کھلی باتیں ہیں، کسی قسم کا خفا اور حجاب نہیں۔ البتہ اگر ان میں کوئی حقیقت نمایاں اور ممتاز پہلو لئے ہوئے ہے تو وہ عمل کی دعوت ہے اور بس۔ شتیق بن سلمہ اور ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب نے اپنے عہد حکومت میں ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباس کو امیر الحج مقرر کر کے بھیجا تھا۔ انہوں نے خطبہ حج اس انداز سے بیان کیا اور سورہ نور کی تفسیر اس دل فریب طریق پر کی کہ کفار ترک و روم بھی اگر اسے سن لیتے تو یقیناً دائرۃ اسلام میں داخل ہو جاتے اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہتا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ سورہ بقرہ کی ایسی معنی خیز

و موثر اور دلاویز تفسیر بیان کی کہ ایک شخص تو بے اختیار پکار اٹھا لو سبھ هذا الدیلم لاسلمت اگر کفار دیلم اس کو سن پاتے تو ضرور حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا محض افسانہ ہی افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے اور تاریخ کے صفحات اس قسم کے بے شمار امثلہ و نظائر سے پر ہیں۔ غیر مسلم قوموں کو جب کبھی قرآن کی تعلیمات کے سننے اور ان میں درس و فکر کرنے کا موقع ملا تو پھر ان کے مسلمان ہو جانے میں کوئی تاثر نہ رہا۔

عہد نبوت سے جب تک قرب و اتصال رہا تفسیر کا یہی انداز تھا، خلفائے اربعہ، عبد اللہ بن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر کے اسمائے گرامی دور اوّل میں نہایت ہی جلی قلم سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور باوجود امتداد عہد اور استیلائے جہل ان کی تابناکی اور درخشندگی میں کسی قسم کا فرق نہیں پیدا ہوا۔

مکہ مبارکہ میں ابن عباس کے شاگردوں کی فہرست تو بہت ہی طویل ہے، لیکن مجاہد، عطاء ابن ابی رباح، عکرمہ مولیٰ بن عباس، سعید بن جبر اور طاؤس اس کے ارشد تلامذہ میں شامل اور اس لئے خصوصیت سے مشہور ہیں۔ تفسیروں میں ابن عباس کے جس قدر اقوال ملتے ہیں وہ سب انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کو تیس بار قرآن سنایا ہے۔ کوفہ کی سرزمین عبد اللہ بن مسعود کے شاگردوں کی وجہ سے علوم و معارف قرآن کا نشیمن بنی ہوئی تھی۔ اسی طبقہ میں حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب قرطبی، ابو العالیہ ضحاک بن مزاحم، عطیہ، قتادہ، زید بن اسلم، مرہ ہمدانی ابومالک اور ربیع بن انس ہیں۔

تیسرے دور میں سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبد بن حمید اور ابو بکر بن شیبہ ہیں۔

### زاویہ نگاہ

قرآن حکیم کے نزول کی غرض و غایت یہ تھی کہ جو لوگ اس کی تعلیم پر عمل کریں ان میں اعلیٰ ترین اخلاق پیدا ہوں، انہیں حکمین فی الارض حاصل ہو اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی اس سے نا آشنا نہ تھے۔ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے شاہ ہر قل کو اسلام کی دعوت دی۔ ابو سفیان ان دنوں روم ہی میں تھے، اس نے ابو سفیان سے اسلامی تعلیمات، رسول اللہ ﷺ اور فرزند ان اسلام کے متعلق مختلف سوال کئے اور آخر میں کہا

ان يك ماتقول حقا فانه نبی

ولیبعلن ملكه ماتحت قدمی

”اگر یہ سچ ہے جو تم کہتے ہو، تو وہ بنی ہے اور اس کی سلطنت ضرور میرے قدموں کے نیچے کی سر زمین تک پہنچے گی۔“  
اسی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت خبیبؓ کو حارث بن عامر بن نوفل کی اولاد شہید کرتی ہے تو وہ حسب ذیل اشعار پڑھتے ہیں۔

لقد جمع الا حزاب حولي واليؤ

قبائلهم واستجمعوا كل مجبع

”انہوہ در انہوہ لوگ میرے گرد آگروں آٹھیرے ہیں اور انہوں نے بڑی بڑی جماعتوں کو بلا لیا ہے۔“

وكلهم مبدى العداوة جاهد

على لا نى فى وثاق بضياع

”یہ سب کے سب میرے دشمن اور عداوت کا اظہار کرنے والے ہیں اور میں اس ہلاکت گاہ میں بندھا ہوا ہوں۔“

وقد جمعوا ابنا عهم ونساءهم

وقربات من جزم طويل ممتع

”قبیلوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی بلار کھا ہے اور مجھے ایک مضبوط بلند لکڑی کے پاس لے آئے ہیں۔“

وقد خيدوني الكفر والبوت دونه

وقد هبلت عيني من غير مجزع

”انہوں نے کہہ دیا ہے کہ کفر اختیار کرنے سے مجھے آزادی مل سکتی ہے، مگر اس سے تو موت میرے لئے بہت سہل ہے، میری آنکھوں سے آنسو لگا تار جاری ہیں مگر مجھے کچھ ناشکیبائی نہیں۔“

فلمست بببد للعد وتخشعاً

ولا جزعاً انى الى الله مرجع

”میں دشمن کے سامنے نہ عاجزی کروں گا اور نہ روؤں اور چلاؤں گا، میں جانتا ہوں کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔“

ومالى حذار الموت انى لميت

ولكن حذارى حجم نار ملفع

”موت سے مجھے اس لئے ڈر نہیں کہ میں مر جاؤں گا، لیکن میں تو لپٹ جانے والی آگ کے خون چوسنے سے ڈرتا ہوں۔“

فذلوالعرش صيدنى على ما يراحب

فقد بصغوالحصى وقد ياس مطبع

”اس عرش عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لینی چاہی اور مجھے شکیبائی کے لئے فرمایا ہے، اب انہوں نے زدو کو ب سے میرا تمام گوشت کوٹ دیا ہے اور میری امید جاتی رہی ہے۔“

فوالله ما ارجو اذامت مسلماً

على اى جنب كان فى الله مصرعى

”بخدا جب میں اسلام پر جان دے رہا ہوں تو میں یہ پرواہ نہیں کرتا کہ راہ خدا میں کس پہلو پر گرتا اور کیونکر جان دیتا ہوں۔“

وذلك فى ذات الا له وان يشاء

بىدارك على اوصال شلو مبزعى

”خدا کی ذات سے اگر وہ چاہے تو پوری امید ہے کہ وہ پارہ ہائے گوشت کے ہر ایک ٹکڑے کو برکت عطا فرمائے۔“  
سب سے آخر میں انہوں نے فرمایا:

اللهم بلغنا رسالتہ

رسلک فبلغه ما یصنع بنا

”اے خدا، ہم نے تیرے رسول کے احکام ان لوگوں کو پہنچا دیئے اب تو اپنے رسول کو ہمارے حال اور ان کی کرتوتوں کی خبر دیدے۔“

یہ نتائج و ثمرات تھے قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت کے، صحابہ کرام کی مقدس جماعت خوب جانتی تھی کہ قرآن کا نزول صرف اس لئے ہوا ہے کہ:

(الف).... اس کو نہایت ہی غور و خوض سے پڑھیں اور اس کی آیات میں درس و فکر کریں۔

(ب).... جس قدر پڑھیں اس پر عمل پیرا ہوں۔

(ج).... قرآن حکیم پر عمل کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں۔ خود رسالت مآب کی یہ کیفیت تھی کہ:

وكان رسول الله ﷺ يترتل السورة حتى تكون اطول من اطول منها وقامه باية يردوها حتى الصباح۔

”رسول ﷺ اسوۃ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک معمولی سورۃ بڑے سے بڑی سورۃ ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ ایک ہی آیت پر ٹھہر جاتے تھے اور اسی کو بار بار صبح تک پڑھتے تھے۔“

حضرت عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس کی رائے ہے کہ:

ان الترتیل والتدبر مع قلته القراءة افضل من سرعة القراءة مع كثرتها بان المقصود من القراءة فہمہ وتدبرہ والفقہ فیہ والعمل بہ وتلاوته وحفظہ وسیلۃ الی معانیہ کما قال بعض السلف نزل القرآن لیعمل بہ فاتخذوا تلاوته عبلاً ولہذا کان اهل القرآن هم العالمون والعاملون بہا فیہ وان لم یحفظوا عن ظهر قلب واما من حفظہ ولم یفہمہ ولم یعمل بہ فلیس من اہلہ وان اقام حروفہ اقامتہ السہم واما مجردة التلاوة من غیر فہم ولا تدبر فی فعلہا البر والفاجر والمومن والمنافق کما قال البنی ؓ مثل

البنافق الذی یقر القرآن کبثل الريحانة ريحها طيب وطعها مرو قال مشعبة حدثنا ابو حمزة قال قلت لابن عباس انی رجل سريع القرآءة وربما قرعت القرآن فی ليلة مرة او مرتين فقال ابن عباس لان اقرأ سورة واحدة اعجب الى من ان افعل ذلك الذی تفعل فان كنت فاعلاً لا بد فاقراً قرآءة تسبغ اذنيك ويعيه قلبك قال ابن مسعود فقوا عند عجائبه وحركوا به القلوب ولا يكن هم احدكم اخر السورة وقال عبد الرحمن بن ابی ليلى دخلت على امرأة وانا اقرأ سورة هود فقالت يا عبد الرحمن هكذا تقرأ سورة هود والله انی فيها منذ ستة اشهر وما فرغت من قراتها۔

”آہستہ پڑھنا اور غور کرنا جس میں قرآن اگرچہ تھوڑا پڑھا جاوے یہ اس سے بہتر ہے کہ جلد اور زیادہ پڑھا جائے کیونکہ پڑھنے سے مقصود سمجھنا اور غور کرنا ہے تاکہ اس پر عمل ہو سکے، اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا معانی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ بعض سلف نے کہا ہے کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے مگر لوگوں نے اس کی تلاوت کو ایک مستقل عمل بنالیا، اسی لئے گزشتہ طبقات میں اہل قرآن وہی سمجھے جاتے تھے جو قرآن کے عالم اور عامل تھے اگرچہ ان کو زبانی حفظ نہ بھی ہوتا تھا لیکن جس شخص نے قرآن کو یاد کیا اور اس کے مطالب نہ سمجھے نہ ان پر عمل کیا تو وہ اہل قرآن سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے حروف کو تیر کی طرح اس نے درست کر لیا اور وہ تلاوت تو ہر نیک و بد، مومن اور منافق کر سکتا ہے جو فہم و تدبر سے خالی ہو، رسول ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے منافق کی مثال ریحان کی ہے جس کی بو عمدہ اور مز اکر واپے۔ شعبہ نے کہا ابو حمزہ نے ابن عباس سے عرض کیا میں تیز پڑھنے والا ہوں بعض اوقات ایک ہی شب میں ایک دو مرتبہ قرآن ختم کر دیتا ہوں۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ مجھے ایسے قرآن پڑھنے سے ایک سورت پڑھنا بہتر معلوم ہوتی ہے، بہر حال اگر تم تیزی ہی سے پڑھنا چاہو تو بھی ایسا پڑھو کہ تمہارے کان سنیں اور تمہارا دل اسے یاد کر لے۔ ابن مسعود نے فرمایا ہے کہ قرآن کے عجائب پر ٹھہرو اور ان سے دلوں کو حرکت دو اور تمہاری یہ کوشش نہ ہو کہ خواہ مخواہ آخر سورہ تک پہنچو، عبد الرحمن بن ابی لیلى فرماتے ہیں کہ میں ایک عورت کے پاس گیا اور میں سورہ ہود پڑھ رہا تھا اس نے کہا اے عبد الرحمن تم اس طرح سورہ ہود پڑھتے ہو خدا کی قسم میں چھ مہینے سے اس سورہ کو پڑھ رہی ہوں اور اب تک اس سے فارغ نہیں ہوئی۔“

عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

كان الرجل منا اذا تعلم عشر ايات لم يجاوزهن حتى يعرف معانيهن والعمل بهن وقال ابو عبد الرحمن السلمي حدثنا الذين كانوا يقرؤنا انهم كانوا ليستقروا من النبي ﷺ وكانوا اذا تعلموا عشر ايات لم يخلفوها حتى يعلموا بها فيها من العمل فتعلمنا القرآن والعمل جميعاً۔

”جب کوئی شخص ہم میں سے دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس سے آگے نہ بڑھتا جب تک ان کے معانی اور ان پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتا۔ ابو عبد الرحمن سلمی نے فرمایا ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو ہم کو پڑھاتے تھے اور وہ رسول ﷺ سے پڑھا کرتے تھے، جس وقت دس آیتیں پڑھ لیتے تو ان سے تجاوز نہ کرتے جب تک ان پر عمل نہ کر لیتے لہذا ہم

نے قرآن اور اس پر عمل دونوں اکٹھے سیکھے۔“

اس پاک گروہ کی نظر صرف اسی پر نہ تھی بلکہ وہ اس امر پر بھی غور و فکر کرتے کہ تعلیم قرآن سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب اس سے کس قسم کے انقلابات و تغیرات رونما ہوئے ہیں، اس لئے ان لوگوں نے اس حقیقت کبریٰ پر مہر لگادی کہ:

لا یصلح اخر هذه الامة الا باصلاح اولها

“اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح فقط اسی چیز سے ہوگی جس سے اس کے اوّل کی اصلاح ہوئی۔“

جدید راہ

اب ایک نیا دور شروع ہوا، ایک ایک آیت کے لئے متعدد مطالب اور مختلف روایات ذکر کی جانے لگیں، جن میں بعض تو یقیناً قابل قبول اور لائق استناد تھیں، مگر بیشتر غلط اور موضوع، رد و قبول کے محک پر ان کے پرکھنے کی ضرورت تھی تاکہ کھوٹے اور کھرے میں، غث اور سمین میں فرق و امتیاز ہو جائے اور حق و باطل میں التباس و اشتباہ باقی نہ رہے۔ ان بزرگوں نے مختلف اقوال کو صرف اس لئے جمع کر دیا تھا کہ آیات کے مفہوم میں جس قدر ممکن سے ممکن اقوال منقول ہوں یا ہو سکتے ہوں اور جس قدر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہو سکتا ہو ناظرین کے روبرو بغیر حک و اضافہ کے تمام و کمال پیش کر دیا جائے اور ہر ایک سخن شناس طبیعت کے لئے اس امر کا موقع حاصل رہے کہ وجدان سلیم، ذوق صحیح اور اصول تفسیر کی اعانت سے ان اقوال کو جرح و تعدیل کے میزان میں تولے اور نقد و اختیار کے بعد جس کو چاہے ترجیح دے اور جسے چاہے مرجوح قرار دے۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری میں علامہ ابو جعفر بن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جس کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائینی کی رائے یہ ہے کہ لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن حریلم یکن ذلک کثیر (تفسیر ابن جریر کی تلاش میں اگر ایک شخص چین تک کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی) ابن جریر کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ وہ ہر ایک بات میں روایت کے پابند ہیں۔ ان کا خاص مذاق یہی ہے کہ حدیث کے نام سے خواہ کیسی ہی لغو اور مہمل بات کہی جائے، سب پر ایمان لانے کو تیار ہو جاتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ حقیقت اصل یہ کیا تھی اور عقل سلیم کہاں تک اس کو قبول کرنے کو تیار ہوگی۔ ایک ایک آیت کے متعلق مختلف اقوال و روایات پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات ترجیح بھی دے جاتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو عبد الرحمن محمد بن حسین نیشاپوری ہیں۔ ان کی وفات ۲۱۴ ہجری میں ہوئی۔ انہوں نے تفسیر حقائق لکھی اور ربط و یاس روایات و مطالب کا ایک انبار جمع کر دیا۔ یہی حال ابو اسحق احمد ثعلبی کا ہے۔ ابو محمد عبد اللہ جوینی، ابو القاسم عبد الکریم قشیری، اور ابو الحسن بن احمد اسی طبقہ میں شامل ہیں۔ اس صدی کی تفسیروں میں صرف اتنا فرق

ہے کہ ان میں روایات تو بیان کی جاتی ہیں مگر ان کے اسناد کو حذف کر دیا جاتا ہے چنانچہ کشف الظنون میں ہے:

ثم الف في التفسير طائفة من المتأخرين فاختصروا الا سائيد ونقلوا عن الاقوال تبذرا فدخل من هنا الدخيل والتبس والصحيح بالعليل ثم صار كل من سنح له قول يورده ومن خطب بباله شيء يعتد به ثم ينقل ذلك خلف عن السلف ظاناً ان له اصلاً غير ملتفت الى تحرير ماورد عن السلف الصالح-

“اس کے بعد متاخرین میں سے ایک جماعت نے تفسیر تالیف کیں اور اسنادوں کو مختصر کر دیا، بہت سے اقوال نقل کئے یہاں سے زائد باتیں داخل ہونے لگ گئیں اور صحیح و ضعیف آپس میں ملتبس ہو گئے۔ اس کے بعد جس کو جو بات معلوم ہوئی وہی درج کر دی اور جو کچھ اس کے خیال میں آیا اسی پر اعتماد کر لیا، اس کے بعد ہر پچھلا طبقہ اپنے متقدمین سے نقل کرنے لگا۔ اس خیال سے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کی اصلیت ہوگی، انہوں نے اس کی تحقیق نہ کی کہ سلف صالح سے اس میں کیا منقول ہے؟”

ان غلط اور بے بنیاد روایات کا اندازہ علامہ سیوطی کے صرف اس ایک قول سے ہو سکتا ہے کہ:-

رأيت في تفسير قوله تعالى غير المغضوب عليهم ولا الضالين نحو عشرة اقوال مع ان الوارد عن النبي ﷺ وجميع الصحابة والتابعين ليس غير اليهود والنصارى-

“میں نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف اقوال دیکھے ہیں حالانکہ رسول ﷺ، جمہور صحابہ اور جملہ تابعین سے یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی دوسرا قول بھی روایت نہیں کیا گیا۔”

## ما بعد کی تفسیریں

جس قدر زمانہ بڑھتا گیا اور عہد نبوت سے بعد و ہجر ہوتا گیا، تفسیر کی صورت بھی نمایاں تبدیلیاں اختیار کرتی گئی اور انجام کار ایسا انقلاب عظیم پیدا ہوا کہ جن مطالب اور روایات کے حق میں محکمہ تحقیق کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ قابل قبول نہیں ہیں، وہی زیادہ مشہور ہو گئیں۔ اور عام طبائع نے ان کو شرف اجابت بخشا۔ ہر بات میں پیچیدگی، مشکل پسندی اور عجائب پرستی کا طومار بھر گیا۔ حکمت و فلسفہ کی نکتہ آفرینیاں دکھائی دینے لگیں، معانی و بیان کے حقائق بیان کئے جانے لگے اور ہیئت و نجوم کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر ہونے لگی، مگر جس قدر ان چیزوں میں زیادتی ہوتی گئی اتنی ہی قرآن سے دوری ہوتی گئی اور منشاء قرآن کی خصوصیت میں فرق آتا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مفسرین کرام کی زندگی کا مقصد وحید اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس کتاب عزیز کے اسرار و معارف کی نشر و اشاعت ہو اور اس کے مفہوم و معانی کی تبلیغ و دعوت ہو، لیکن جب ان تفسیروں میں بحث و نظر کی جاتی ہے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ: لایسمن ولا یغنی من جوع، تفسیر کبیر ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں بطلموسی ہیئت و نجوم اور فلسفہ یونان کے سوا کیا دھڑا ہے۔ مخالفین کے شبہات بیان کریں گے اور اپنا تمام زور استدلال ان کی تقویت



میں صرف کر دیں گے، لیکن جواب کے وقت اس درجہ ضعف و کمزوری کا اظہار کریں گے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہ شبہ اور زیادہ قوی ہو جائے گا۔ بعض ارباب نظر و بصیرت کو خود امام فخر الدین رازی کے اسلام ہی میں تردد ہے، مگر یہ خیال تو درست نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ اس میں دنیا جہان کی باتیں ہیں مگر تفسیر نہیں، جو اس کا اصلی موضوع و مقصد تھا۔ چنانچہ آگے چل کر آپ کو بعض اکابر کی رائے ان کی تفسیر کے متعلق معلوم ہوگی۔ پس اگر بعض نکتہ سنج طبائع کا یہ مطالبہ ہو کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر کا پڑھنا بے سود ہے تو شاید کچھ لوگ ان کی تائید کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ قرآن کا نزول تو اس لئے ہوا تھا کہ اس کے درس و فکر سے حیات انفرادی و اجتماعی میں انضمام و توحید پیدا ہو۔ ہر مسلم قانت کی تشنہ لبی دور ہو اور ہر ایک فرزند اسلام اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے مگر ان تفاسیر سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ لوگوں نے ان تفاسیر کا درس و مطالعہ شروع کیا حالانکہ ضرورت تھی قرآن حکیم کی تلاوت کی۔ پس وہ چشمہ حیات سے بہت دور جا پڑے اور اب تو بعض کے نزدیک خود قرآن کا درس ممنوع و ناجائز ہے یا لیتنی مت قبل هذا کنت نسیا منسیا۔ پنجاب کے ایک جلیل القدر سجادہ نشین کی رائے ہے کہ الحمد کے صرف الف کے معانی و مطالب معلوم کرنے کے لئے ۳۶۰ علوم کی ضرورت ہے۔ ذلک مبلغهم من العلم۔

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!

دنیا میں ہمیشہ تغیرات و انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تمام اقوام و امم عالم بھی ادوار مختلفہ میں سے گزرتی رہتی ہیں۔ فن تفسیر بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ ہو سکا، ہر زمانہ میں اس کا رنگ بدلتا گیا اور اب تو اس میں ایسی ایسی تبدیلیاں واقع ہو گئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ابتدا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین نے قرآن حکیم کی آیات کے مناسب تمام ان احادیث، مرویات صحابہ اور اقوال تابعین کو ایک جگہ جمع کر دیا جن سے اخذ مطالب اور فہم معانی میں سہولت و آسانی ہو اور وہ تمام بصائر و حکم سامنے آجائیں جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوں۔ ان کے بعد معتزلہ کا گروہ سامنے آتا ہے، جنہوں نے فلسفہ یونان سے مرعوب و ہیبت زدہ ہو کر تمام آیات صفات کی تاویل شروع کر دی اور متبادر معانی و مطالب کو ترک کر کے بعید از فہم حقائق کی جانب متوجہ ہو گیا۔ نکتہ آفرینیوں اور فلسفیانہ مشکافیوں کا دروازہ کھول دیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے الحاد و زندقہ، فتنہ و فساد اور توجیہ و تاویل کا باب مفتوح کر دیا۔ فلسفہ کی نشر و اشاعت نے عقائد و اخلاق میں اور زیادہ تزلزل پیدا کر دیا۔ متکلمین آگے بڑھے اور ہر شبہ کا جواب دینے لگے۔ اس لئے قرآن کی شرح و تفسیر، علم کلام کے مطابق ہونے لگی۔ فقہاء کے گروہ نے صرف استنباط احکام و اخذ مسائل ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیا اور ان کی سعی و کوشش یہیں تک محدود رہی، ارباب لغت نے دوسری حیثیت سے نظر ڈالی۔ علمائے نحو کے سامنے یہی فن تھا اسی کی خاطر انہوں نے کلام عرب سے شواہد کی تلاش و جستجو کی اور صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تین ہزار ترکیبیں بیان کر دیں۔ اہل سلوک و احسان نے صرف تصوف کو اپنی غایت الغایات یقین کر کے قرآن حکیم کو تصوف کے قالب میں ڈھال دیا، ظواہر کو چھوڑ کر بطون کے پیچھے پڑ گئے اور مغز کو پھینک کر محض چھلکے پر قناعت کر بیٹھے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلام کو اس ہندوانہ تصوف سے

پہنچا۔ اور لوگ تو اب تک اس کے دام میں پھنسے ہوئے ہیں فہل من مذکر۔

فاران کی چوٹی پر نزول الہام اس لئے ہوا تھا کہ مسلمانوں کے لئے قانون اساسی کے طور پر کام دے۔ مگر زمانہ کی نیرنگ سازی ملاحظہ ہو کہ وہ اب ہر کس و ناکس کی رائے و خیال کا دست خوش بن گیا اور ہر شخص اپنے مذاق خاص کے مطابق اس کی تفسیر کرنے لگا، اس بے اصول خطرناک آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا بہت بڑا حصہ زید و عمر کے اقوال اور شیخ و سید کے باطل و اکاذیب کا ذخیرہ بن گیا۔ آیات احکام کے مفہوم متعین کرنے میں اعجاب کل ذی رای ہدایہ کی آمیزش ہونے لگی۔ وسعت معلومات، اسلوب تحریر اور لہجہ بیان ظاہر کرنے کے لئے تفسیر قرآن میں مفروضات و تخیلات کی جس قدر جولانی دکھاتے بنی، اچھی طرح دکھائی گئی اور یہ خیال نہ آیا کہ ہم تلامذہ بالقرآن کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نظامی شاعر تھے، مگر وہ بھی اس درد انگیز و حسرت خیز منظر کو نہ دیکھ سکے، بیتاب ہو گئے اور ان الفاظ میں رسول اللہ ﷺ سے فریاد کی۔

دین ترا در پے آرائش اند

در پے آرائش و پیرائش اند

بسکہ بر و بستہ شدہ برگ و ساز

گر تو بہ بنی نہ شناسیش باز

یہ کیفیت ہمیں چھٹی صدی ہجری تک تو نظر آتی ہے کہ احساس تو ہے، اگرچہ اس وقت بھی اس عالم آشوب طوفان کے روکنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن بعد کو تو اس قدر استیلائے کفر و ضلالت ہوا کہ اتنی حس و بیداری بھی باقی نہ رہی۔ غوغائے عجبت میں یہ فریاد بھی کسی کی زبان سے نہ نکل سکی۔ وہ دین فطرت جو حجاز کی وادیوں میں اپنے اصلی حسن و جمال کے ساتھ دلفریبی اور کشش کا باعث تھا، اس پر مجوسیوں کی عجائب پرستیاں، یہودیوں کے دوراز کار افسانے اور بت پرستوں کے رسم و رواج چھا گئے اور اب ہمارا زمانہ آیا تو دودھ سے پانی کا جدا کرنا سخت ترین کام ہو گیا۔ دقت آفرینی اور عجائب پسندی کی بنیاد پر جو جو شاخیں نکلیں، جیسے جیسے شگوفے پھولے اور تفسیروں میں جس نہج پر اس قسم کی روایتیں پھیلی پھولیں، ان کو دیکھ کر بدن پر رو نگئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قلم میں طاقت نہیں کہ ان کو تحریر میں لاسکے۔

ابو الفیض فیضی اکبری دربار کے نور تن تھے۔ قدرت سے طبیعت نکتہ سنج پائی تھی۔ سواطع الالہام قرآن کی تفسیر لکھی، جس میں یہ التزام کیا گیا کہ تمام تفسیر میں اوّل سے آخر تک ایک لفظ بھی منقوٹ نہ ہو۔ اس نفسانی ہیجان کو پورا کرنے کے لئے انہیں جس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالنا پڑا ان کے انداز تحریر سے ظاہر ہے۔ عبارتوں کی عبارتیں، فقروں کے فقرے اور ترکیبوں کی ترکیبیں یکے بعد دیگرے چلی آرہی ہیں جن میں باہم کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایک بے معنی کلام ہے جس کے لئے دلائل و دلائل فریب ترکیبوں اور جملوں کی تلاش ہو رہی ہے، صورت ہے لیکن معنی نہیں، جسم ہے مگر روح سے خالی، ایک حی و قائم انسانی وجود ہے جس کے تمام اعضاء و جوارح کاٹ دیئے گئے ہیں۔

شیخ علی بن احمد مہائم ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کی وفات ۸۳۵ ہجری میں ہوئی۔ شیخ محی الدین بن عربی کے بے انتہا شاخوواں اور مسئلہ وحدت وجود میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے انہوں نے تفسیر رحمانی لکھی۔ چونکہ تصوف میں ذوق رکھتے تھے اس لئے قرآن حکیم کی تفسیر اسی صوفیانہ رنگ میں کی۔ آیات کا مطلب احسان و سلوک کے رنگ میں بیان کیا۔ قرآن کی نظم و ترتیب پر بھی روشنی ڈالی تو یہی چیز غالب رہی۔ انہیں اس امر کا خیال نہ رہا کہ رسول اللہ ﷺ محض تصوف ہی سکھانے نہ آئے تھے بلکہ وہ شیل موسیٰ بھی تھے اور آپ کی بعثت کی غرض و غایت یہ تھی کہ فرزند ان اسلام شہداء علی الناس بن جائیں اور اخلاف ارضی کے جائز وارث قرار پائیں۔ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی آئے، انہوں نے ایک تفسیر لکھی جس کا نام انوار التزیل و اسرار التاویل ہے۔ عربی مدارس میں اس کا ابتدائی حصہ درس میں شامل ہے۔ اکثر علما نے اس پر حواشی بھی تحریر کئے ہیں۔ تفسیر کی کیفیت یہ ہے کہ فن معانی، بدیع اور بلاغت میں جو کچھ لکھتے ہیں جارا اللہ ز مخشری کی تفسیر کشاف سے لیتے ہیں اور بغیر حریت رائے و اجتہاد کے اس کی تقلید کرتے ہیں۔ فلسفہ و کلام کے مسائل کی نوبت آتی ہے تو فخر الدین رازی سے طالب اعانت ہوتے ہیں۔ جب مفردات الفاظ اور اشتقاق کے مباحث سامنے آتے ہیں تو امام راغب اصفہانی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

ہم نے اوپر جو کچھ لکھا اس سے ان جلیل القدر بزرگوں کی تفہیم و تنقیص مقصود نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کا اظہار ضروری تھا۔ الساکت عن الحق شیطان اخرا اس اور پھر اس وادی میں ہم ہی اکیلے نہیں بلکہ دوسرے ارباب بصیرت بھی ہمارے رفیق طریق ہیں۔ چنانچہ صاحب کشف الظنون کی رائے ملاحظہ ہو۔

ثم صنف بعد ذلك قوم برعوائی شی من العلوم وملا کتابہ ببا غلب علی طبعہ من الفن واقتصروا فیہ علی ماتہرہو فیہ کان القرآن لاجل هذا العلم لا غیر مع ان فیہ بیان کل شی فالنحوی ترا لیس له ہم الا الاعراب وتکثیر الالوجہ المحتملة فیہ وان کانت بعيدة وينقل قواعد النحو ومسائله وفروعه وخلافیاته کالزجاج والواحدي فی البسيط وابو حیان فی البحر والنهر، والاخباری لیس له شغل الا القصص واستيفاءها والاخبار عن سلف سواء کان صبیحة او باطلة ومنهم الثعلبی والفقیه یکاد لیعرف فیہ الفقه جیباً و رہباً استطردالی اقامة ادلتہ الفروع الفقہیة التي لا تعلق لها بالایة اصلا والجواب عن ادلة المخالفین کا القرطبی وصاحب العلوم العقلیة خصوصاً الامام فخر الدین قدماء تفسیرہ باقوال الحكماء والفلاسفة وخرج من شیء الى شیء حتی یقضى الناظر العجب قال ابو حیان فی البحر جمع الامام الرازی فی تفسیرہ اشياء كثيرة طویلة لاحاجة لها فی علم التفسیر ولذلك قال بعض العلماء وفیہ کل شیء الا التفسیر والمبتدع لیس له قصد الا تحریف الایات وتسویتها علی مذهبه الفاسد بحیث انه لولاه له شاردة من بعيد اقتضاها او وجد موضعاً له فیہ احدی مجال سارع الیه والمحدد فلا تسئل عن کفره والحادة فی آیات الله وافتراءه علی الله مالم یقله ومن ذلك القبیل الذین یتکلمون فی القرآن بلا

سند ولا نقل عن السلف ولا رعايته الاصول الشرعية والقواعد العربية كتفسير محمد بن حنيفة الكرماني في مجلدين سباه العجائب والغرائب ضمنه اقوالا هي عجائب عند العوام وغرائب عما عهد عن السلف بل هي اقوال منكرة لا يحل الاعتقاد عليها ولا ذكرها الا للتحذير من ذلك وسئل البلقيني عن فسر بهذا افاقتي بانه ملحد واما كلام الصوفية في القرآن فليس بتفسير قال ابن الصلاح في فتاواه وجدت عن الامام الواحدى انه قال صنف السلفي حقائق التفسير ان كان قد اعتقد ان ذلك تفسير فقد كفر قال النسفي في عقائده النصوص تحبل على ظواهرها والعدول عنها الى معاني يدعيها اهل الباطن الحاد<sup>①</sup>۔

“اس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنہوں نے کسی ایک علم میں فوقیت حاصل کی ہے اور اپنی کتاب کو اسی فن سے بھر دیا ہے جو اس کی طبیعت میں غالب تھا اور محض اسی پر اکتفا کیا جس میں اس نے مہارت حاصل کی تھی، گویا قرآن صرف اسی علم کے لئے نازل ہوا تھا، حالانکہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ نحوی کو فقط اعراب اور وجوہ ترکیب ہی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ وہ بعید ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ نحو کے قواعد، مسائل فردع اور خلافیات ہی کو داخل کرے گا۔ جس طرح زجاج و واحدی نے بسیط میں اور ابو حیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے۔ اخباری کو صرف قصے اور ان کی تکمیل ہی پیش نظر رہتی ہے۔ گزشتہ قسموں کا خیال رہتا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ تعلیلی ان لوگوں میں سے ہیں۔ فقیہ کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ساری فقہ داخل کر دے، بسا اوقات فقیہ فرعیات فقہ کی دلیلیں لاتا ہے حالانکہ نفس آیت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر مخالفین کے جواب بھی نقل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں سے قرطبی ہیں۔ ارباب علوم عقلیہ میں امام رازی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر کو حکماء اور فلاسفوں کے اقوال سے بھر دیا ہے اور کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں، جس سے دیکھنے والا تعجب میں رہ جاتا ہے۔ ابو حیان نے بحر میں کہا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں درج کر دیں جن کی علم تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی، اسی لئے بعض علما نے کہا ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔ ایک بدعتی کی غرض آیتوں کی تحریف ہوتی ہے تاکہ ان کو اپنے فاسد مذہب پر منطبق کرے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی دور کی بات بھی سوچتی ہے تو اسے لے لیتا ہے یا اگر کوئی ایسا موقع پاتا ہے جس میں اس کی کچھ بھی بات بن سکے تو فوراً بنالیتا ہے۔ اور ملحد کا تو ذکر ہی کیا ہے، وہ خدا کی نسبت جھوٹ بناتا ہے جو اس نے بالکل نہیں کہا۔ اور جو لوگ قرآن میں بلا سند سلف صالحین کے اقوال کے ماسوا قواعد عربیہ اور اصول شرعیہ کے بغیر کچھ کہتے ہیں وہ سب اسی قسم میں شامل ہیں۔ محمود بن حمزہ کرمانی کی تفسیر دو جلدوں میں اسی قسم کی ہے جس کا نام العجائب والغرائب رکھا ہے۔ اس میں ایسے اقوال نقل کئے ہیں جو عوام کے نزدیک عجیب اور طریق سلف سے دور ہیں بلکہ ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد ہی جائز نہیں اور ان کا ذکر تحذیر کے سوانا جائز ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق بلقینی سے فتویٰ طلب کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ایسے مفسر ملد ہیں اور قرآن کے بارہ میں صوفیہ کا کلام تفسیر نہیں۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ میں نے امام

① کشف الظنون، ج ۲ ص، مطبوعہ

واحدی سے دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ سلسلی نے حقائق التفسیر لکھی ہے جو شخص اس کو تفسیر کہے وہ کافر ہے۔ نسفی نے اپنے عقائد میں کہا کہ نصوص کو اپنے ظواہر پر محمول کیا جائے گا اور ان سے اہل باطن کے معانی کی جانب پھرنا الحاد ہے۔ اس قسم کی تفاسیر کے درس و مطالعہ اور بحث و نظر نے ہماری تمام قوتوں پر عالم ممات طاری کر دیا، چونکہ انسان منفعل اور اثر پذیر واقع ہوا ہے اس لئے عام لوگوں نے قتل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور آخر یہ کہنا پڑا: لم یبق من الاسلام الا رسمہ۔

### الفاظ کی غلط تعبیر

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کے اکثر الفاظ کے حقیقی مفہوم و معانی بدل دیئے گئے۔ لسان الہی نے ان کو جن مواقع میں استعمال کیا تھا اور جو مطالب صاحب شریعت علی صاحب الصلوٰۃ والتحیۃ کے پیش نظر تھے، وہ بالکل فراموش کر دیئے گئے ہم مثال کے طور پر چند الفاظ پیش کرتے ہیں۔

(۱) توکل: عام لوگوں کے نزدیک اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ایک انسان بیکاروں اور اپاہجوں کی زندگی بسر کرے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے، کوئی کام نہ کرے۔ لوگوں کے صدقات و خیرات اور نذر و ہدا یا پر نظر رکھے لیکن قرآن اس کا مفہوم بالکل جدا گانہ بتاتا ہے، اس کے نزدیک توکل کے یہ معنی ہوں گے کہ مشکلات و مصائب کے وقت ہمت و استقلال، عزم و ثبات قدم اور جوش صادق و دلولہ عمل کے ساتھ مصروف کار ہو، نتائج و ثمرات کی طرف سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرائض حیات کو ترک نہ کر دے، بلکہ خدائے حق نواز سے پوری توقع رکھے کہ وہ ضرور کامیابی نوازش کرے گا۔ چنانچہ فرمایا:

قَالُوا يَبْنَؤُ سِإِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَنَنذُرُكُمْ لَخُلُوعِهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٣﴾  
قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا ۚ إِنَّ كُنْتُمْ مَوْمِنِينَ ﴿٢٤﴾ (المائدہ ۲۲-۲۳)

”وہ لوگ لگے کہنے اے موسیٰ! اس ملک میں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں، ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جاداخل ہوں گے، خدا سے ڈرنے والوں میں سے دو آدمی تھے جن پر خدا نے اپنی خاص مہربانی کی وہ بول اٹھے کہ ان پر چڑھائی کر کے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازوں میں گھس پڑو بلاشبہ تمہاری فتح ہے اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔“

(۲) صبر: مشہور یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی تکلیف و مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کریں۔ ذلتوں اور رسوائیوں کے برداشت کرنے کی عادت ڈال لیں، پیش اور اف نہ کریں، سب طرف سے لعنت و نفرین ہو اور ہم خاموش بیٹھ کر سنا کریں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ صحیح اصول اور مقاصد صالحہ کو پیش نظر رکھ کر کام کرتے وقت جس قدر

بھی تکالیف و شدائد آئیں ان کو برداشت کریں۔ باوجود ان آلام و مصائب کے اپنے مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کام برابر جاری رکھیں اور رکاوٹوں سے گھبرا کر اپنے آپ کو بے دست و پانہ نہ بنالیں۔ حسب ذیل آیتیں اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔

وَكَانَ مِنْ بَنِي قُتَيْبَةَ مَعَهُ رَيْثُونٌ كَثِيرٌ ۖ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ  
وَاللَّهُ يَحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿٢٦﴾ (ال عمران ۱۳۶)

”اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت انکو اللہ کی راہ میں پہنچی اس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری نہ یو داپن کا اظہار کیا اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا اور اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہے۔“

اصْبِرُوا وَاَصَابِرُوا وَاَرَْابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٧﴾ (ال عمران ۲۰۰)

”اپنے مقصد پر مرمٹو، دوسروں کو مرنے کے لئے تیار کرو، دشمنوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرو، اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

قرآن حکیم! ارباب صبر و استقامت سے کم از کم اتنی توقع ضرور رکھتا ہے کہ اپنے سے دگنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں:

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٨﴾ (ال انفال ۶۶)

”اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو خدا کے حکم سے وہ دو ہزار کافروں پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔“

(۳).... تقدیر: اس عقیدہ کے غلط مفہوم نے بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کچھ کم حصہ نہ لیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ جب سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو ہمیں کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے بقاء و قیام کے لئے کوشش کرنا ترک کر دی۔ بیکاروں اور اپاہجوں کا ایک گروہ بن گیا اور بے دست و پابن کر دوسروں کے لئے بار دوش ثابت ہوئے۔ لیکن یقین کیجئے کہ اسلام کبھی اس سے آلودہ دامن نہیں ہوا۔ اس کی تعلیم کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ مسلمان قنط و بیکاری کی زندگی بسر کریں بلکہ وہ تو یکسر پیغام عمل ہے۔ اس نے اپنے نزول کے اولین روز بباگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ:

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۚ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُؤْتَىٰ ۚ ﴿٢٩﴾ (النجم ۳۹ تا ۴۰)

”انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائے گی۔“

پھر فرمایا۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ (الزلزال ۷ تا ۸)

”جس نے ذرہ بھرنیکی کی ہوگی وہ اس نیکی کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھربرائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“  
دوسری جگہ کہا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ (البقرہ ۱۳۴)  
”ان کا کیا ان کو اور تمہارا کیا تم کو۔“

گویا اس نے ہر ایک کے سامنے دعوت عمل پیش کی اور بتا دیا کہ یہ صرف انسان کی اپنی سعی و کوشش ہے جو اچھے اور برے نتائج پیدا کرتی ہے انہی اعمال کم تردد علیکم فمن وجد خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذلك فلا يلمن الانفسه میں اسی حقیقت کو واضح کیا۔

قرون اولیٰ کے مومنین قانتین تقدیر کا مفہوم صرف اتنا جانتے تھے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی حکومت ہمارے نفع و نقصان، سود و زیان داد و ستد، سلب و عطاء، اور حیات و ممات کی مالک نہیں، صرف خدائے یگانہ و قہار ہی کی ذات ہر قسم کے احکام نافذ کرتی ہے اور اسی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس عقیدہ نے عرب کے بادیہ نشینوں میں اتنا جوش و ولولہ عمل اور استقلال و ثبات قدم پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے قیصر و کسریٰ کی تخت گاہوں کو الٹ دیا، اس وقت تو ایک ایک قطرہ طوفان در بغل تھا اور اب سب کے سب یاس و حسرت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ فشتان بینہما۔

(۴).... جہاد فی سبیل اللہ: بہت سی زبانیں تو اس کے ذکر ہی سے گنگ ہیں، شیاطین الانس کا خوف ان کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کئے ہوئے ہے کہ وہاں اللہ کے خوف کے لئے جگہ نہیں یخشون الناس کخشية الله أو أشد خشية (النساء ۷۷) اور جنہیں ابھی بولنے کی طاقت حاصل ہے وہ اسے جہاد با نفس پر محمول کرتے ہیں اور: رجعا من الجهاد الا صغری الجہاد الا کبر کی غلط اور موضوع حدیث سے ان کا نفس خادع تمسک و اعتقام کرتا ہے۔ گویا ابلیس نے ان علمائے سو کو اپنے اعمال شیطانی کے لئے ایک آلہ بنالیا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَانَتْهُمْ بُنْيَانًا مَرْصُوعًا ۖ (الص ۴)

”بیشک خدا ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک دیوار ہیں جس میں سیسہ پلایا گیا ہے۔“

تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جن لوگوں سے تمام تعلقات و روابط منقطع کئے گئے وہ وہی تین جلیل القدر صحابہ تھے جو کابلی کی بنا پر جنگ تبوک میں شریک نہ ہوئے۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنَّهُ لَا



مَلْجَأٍ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ۖ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الشَّوَابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾ (التوبہ ۱۱۸)

”اور ان تین پر بھی جو بانظار امر خدا ملتی رکھے گئے تھے یہاں تک کہ جب زمین باجود فرخی ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آگئے اور سمجھ گئے کہ خدا کی گرفت سے اس کے سوا اور کہیں پناہ نہیں پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تاکہ وہ آئندہ کے لئے توبہ کئے رہیں بیشک اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

جو لوگ جہاد میں شریک نہ ہوں، ان کی نسبت فرمایا کہ نہ صرف یہی مصیبتوں اور تکلیفوں کا نشانہ بنیں گے بلکہ ان کی وجہ سے تمام قوم مبتلائے آلام ہوگی۔

وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٦﴾ (الانفال ۲۶)

”اور اس بلا سے ڈرتے رہو جو خاص کر ان ہی لوگوں پر نازل نہیں ہوگی جنہوں نے تم میں سے سرتابی کی ہے بلکہ سب اس کی زد میں آجاؤ گے اور جانتے رہو کہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔“

جس طرح ہر شخص اپنی انفرادی زندگی کے بقا و قیام کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم نے تمام مسلمانوں پر حیات اجتماعی کے قائم و دائم رکھنے کے لئے جہاد کو الزم اللوازم قرار دیا۔

وَ اعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُنْهَوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَ عَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)

”اور سپاہیانہ قوت اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے لئے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔“

پھر نبوت کے اعمال مہمہ میں سب سے اشرف و اعلیٰ مقام اسے نوازش کیا گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (الانفال ۶۵)

”اے نبی! مسلمانوں کو جنگ و قتال کرنے کے لئے ابھارو۔“

عالم الغیب والسماء کو اس امر کی اطلاع تھی کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تر زندگی بطالت و بد عملی اور جبن و نامردی کی تصویر ہوگی۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراش کر نفس خادع کے فریب میں مبتلا ہو جائیں گے اور قتال فی سبیل الحق والحریۃ ترک کر دیں گے۔ اس لئے سورہ توبہ میں ان کے ایک ایک عذر لنگ کو بیان کیا، ہر ایک کی حقیقت آشکارا کر دی اور بتا دیا کہ تمہیں کسی طرح بھی اس فرض اہم و قدم سے نجات نہیں مل سکتی۔ یہ فوجی خدمت ہر مسلم مرد و عورت۔ امیر و غریب، پادشاہ و فقیر اور آقا و غلام پر لازمی ہے اور اس سے کسی کو حق استثناء حاصل نہیں۔ ہم اس وقت صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔

(الف).... مخالفین و معاندین اسلام نے اپنی مجتمہ قوت سے اسلامی حکومتوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا

ہے، مسلمانوں کے تمام بلاد و امصار تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ حمیت مذہبی کی وجہ سے مسلمان مقابلہ



کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوں، دشمنانِ دین فوراً اپنے مواعید کا ذبح کا اعلان کر دیتے ہیں کہ فرزندِ انِ اسلام کے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کی جائے گی، ان کے مقدس مقامات کا احترام کیا جائے گا اور ان کے مذہبی و سیاسی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت روانہ رکھی جائے گی۔ اس قسم کی دل فریب باتیں سن کر اکثر حیلہ جو طبیعتیں پکاراٹھتی ہیں کہ ایسے لوگوں سے جنگ کرنا حد درجہ کی سفاہت و بد اخلاقی ہے، یہ تو پیکرِ فرشتگی و ملکوتیت ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان پر اعتماد کرنا جہل و نادانی ہے، وہ کبھی اپنا وعدہ پورا نہ کریں گے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْكِرِينَ أَنْ يَعْزُزُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شُهُودَيْنَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ (التوبہ ۷۱)

”مشرکوں کو کوئی حق نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد رکھیں اور اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی دیے جائیں۔“

(ب) مسلمان اپنے گھروں میں نیک کام کرتے ہیں۔ علمائے کرام قرآن و حدیث کے درس میں مصروف ہیں۔ گروہ صوفیہ اپنی خانقاہوں میں اللہ اللہ کے نعرے لگاتا ہے کہ تزکیہ نفس حاصل ہو۔ ہزاروں لاکھوں انسان ہیں جو ان سے اپنی تشنگی کو دور کرتے اور سیراب ہو کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ یہ لوگ ان اعمالِ صالحہ کو پیش کر کے اپنے آپ کو قتال فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن لسانِ الہی ان بد بختانِ ملت کو ظالم قرار دیتی ہے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۱﴾ (التوبہ ۱۱)

”کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد رکھنے کو اس شخص کی خدمتوں جیسا سمجھ لیا جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے۔ اللہ کے نزدیک تو یہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتے۔“

حضرت عبد اللہ بن المبارک نے اپنے سال کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ تین ماہ تجارت کرتے، تین ماہ درس حدیث میں مصروف رہتے، تین مہینوں میں حج ادا کرتے اور باقی ایام جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کرتے۔ انہوں نے حضرت فضیل بن عیاض کو خط بھیجا جو اس وقت بیت اللہ میں معتکف تھے اور حضرت عبد اللہ مصروف جہاد۔ اس خط کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

يا عابد الحرمين لو ابصرتنا  
لعلبت انك بالعبادة تلعب!

فضیل رو پڑے اور کہا ابو عبد الرحمن سچ کہتا ہے۔

(ج) دنیاوی ضرورتیں ماں باپ کی محبت، رشتہ داروں کی خبر گیری، مساکین و غربا کی اعانت اور زمین و جائیداد کی حفاظت، ان میں سے ایک چیز بھی جنگ سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۖ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِّنْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٣﴾ (التوبہ ۲۳)

”کہہ دو، اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، کنبے والے، مال جو تم نے کمائے ہیں، سوداگری جس کے مند اپڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو اور مکانات جن کو تمہارا جی چاہتا ہے، اللہ، اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیاد عزیز ہوں، تو صبر کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لا موجود کرے اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو سرتابی کریں۔“

(د).... قلت تعداد، فقد ان اسباب اور ضعف ظاہری کی بنا پر جہاد کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرٍ ۖ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ (التوبہ ۵۲)

”اللہ بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت لگی تم پر تنگی کرنے، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔“

(ہ) تاجرانہ تعلقات اور ملازمت کے روابط کی بنا پر کسی قوم سے جنگ کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا اور یہ خیال نہ ہو کہ اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو جائیں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا ۖ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۖ (التوبہ ۲۸)

”مسلمانو! مشرک تو گندے ہیں، تو اس برس کے بعد حرمت والی مسجد کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں اور اگر ان کے ساتھ لین دین بند ہو جانے سے تم کو مفلسی کو اندیشہ ہو تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔“

پس ان تمام آیات نے واضح کر دیا کہ جب تک آنکھوں میں بصارت ہے، کان سن سکتے ہیں، ناک سونگھ سکتی ہے، زبان میں قوت گویائی، ہاتھوں میں پکڑنے کی طاقت اور پاؤں میں چلنے کی قابلیت ہے، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاد کی تیاری کرے۔ تمام محبتوں اور چاہتوں پر اس کی شیعہ شنگی دوار فتہنگی غالب رہے۔ اس کا سودا سر میں ہو اور اسی کی زنجیر پاؤں میں ہوں کہ یہی احب الاعمال الی اللہ ہے، یہی سنام الاسلام ہے، یہی عصارہ ایمان اور مغز عبادت ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۖ وَلِلَّهِ آيَاتُكُمْ الْبُرْهَانُ ۖ هُوَ سَيُكَلِّمُ الْمُسْلِمِينَ ۚ مَنْ قَبْلَ رَفِي ۚ هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٢٢﴾ (۷۷، ۷۸:۲۲)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو حق جہاد کرنے کا ہے۔ اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لئے چن لیا، پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، یہی ملت تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے اور اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمہارے لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتہ کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹا دو۔ وہی تمہارا ایک آقا اور مالک ہے اور پھر جس کا خدا مالک و حاکم ہو اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار۔

احادیث نے اس کی اہمیت کو اور زیادہ کھول کر بیان کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

والذی نفسی پیدا لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم قتل۔

”خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو کر دوبارہ زندہ ہو جاؤں پھر شہادت کا درجہ حاصل کر کے زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہو کر زندہ ہوؤں پھر قتل کیا جاؤں۔“

دوسری حدیث میں کہا:

رباطیوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا۔

”ایک دن اللہ کی راہ میں جو کیداری کرنی بہتر ہے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے۔“

جس شخص نے جہاد کا ایک لمحہ کے لئے بھی ارادہ نہ کیا ہو، اسی حالت میں مر گیا ہو اس کی نسبت فرمایا کہ وہ منافق کی موت مرا ہے۔

من مات ولم یغزو لم یحدث بابہ بنفسہ مات علی شعبۃ من نفاق۔

”جو شخص مر گیا نہ تو اس نے اپنی زندگی میں کبھی جہاد کیا اور نہ اسے کرنے کا ارادہ ہی دل میں پیدا ہوا وہ نفاق کی موت مرا۔“

ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا:

ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف۔

”جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔“

**غلط فہمی کے اسباب**

آیات کا مفہوم سمجھنے میں اکثر غلطیاں اس لئے سنگ راہ ہو گئیں کہ باریک بین نگاہوں نے الفاظ کو موشگافی کی نظر سے دیکھا اور جب اس سے بھی سیری نہ ہوئی تو داماں نگاہ کو تنگ کرنے کے لئے ہر قسم کی تاویلات سے مدد لی اور بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ بے شبہ قرآن حکیم کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لئے سخن فہم اور نکتہ سنج طبیعت کی ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دار کے اصول سے بھی علیحدگی ممکن نہیں۔ قرآن کے پڑھنے والے کو جس علم

وفن پر عبور لازم ہے وہ اسوہ حسنہ رسول اللہ ہے۔ جس کی ناواقفیت سے تفسیر میں صدہا مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ دوسری غلط فہمی شان نزول کے متعلق پیدا ہو گئی۔ ہر آیت کے لئے کوئی نہ کوئی واقعہ فرض کر لیا گیا، پھر اس کے مطالب کو اسی مخصوص حادثہ میں محدود کر دیا۔ ان میں بیشتر وہ واقعات تھے جو اہل کتاب سے منقول اور اس لئے ناقابل اعتماد تھے، مگر ان ارباب تفسیر نے انہیں اسرائیلیات کو اصل و اساس قرار دیکر قرآن کی تفسیر لکھی اور اس طرح اس کتاب کی اجتماعی اور محیط الکل حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ قرآن کو افسانہ گوئی کی کتاب بنا دیا۔ قصہ یوسف واقعہ حسن و عشق بن گیا اور اب تو عام زبانوں پر یہ جاری ہے۔

کہ من اسیر بمعشوق اور بفرزند است!

سلیمان کے عجائب و غرائب تو زبان زد خاص و عام ہیں۔ ہاروت و ماروت کا ذکر بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ امتوں کے واقعات اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ لوگ ان سے بصیرت اندوز ہوں، ان سے استخراج و استنباط نتائج و شواہد کریں، جہاں گیری و جہانداری کے اصول و ضوابط کی تعلیم ہو۔ پھر مصیبت یہ ہوئی کہ قرآن کے مخاطب کو صرف عرب کے لئے مخصوص کر دیا، کہا کہ یا ایہا الناس سے مراد کفار مکہ ہیں اور یا ایہا الذین امنوا کاروئے سخن اہل مدینہ کی جانب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نزول قرآن کے وقت اولین مخاطب یہی لوگ ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا کی باقی قومیں اور آنے والی نسلیں ان آیات کی مخاطب نہیں بن سکتیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اختلف اهل الاصول هل العبرة بعموم اللفظ او بخصوص السبب والارحج عندنا الاول“

”اہل اصول کا اس امر میں اختلاف ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہو گا یا خصوص سبب کا، ہمارے نزدیک قول اول ہی ارجح و اقویٰ ہے۔“

باوجود اس قسم کی تصریحات کے متاخرین نے پھر بھی کچھ خیال نہ کیا۔ اسی کا آج اثر ہے کہ صرف برکت اور بزرگی کی خاطر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک اس کے مخاطب عرب تھے نہ کہ ہم۔ انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ قرآن بار بار درس و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے، محض الفاظ پر زور دینا اور حقیقت سے غافل رہنا شریعت کے نزدیک بیکار ہے۔ اس کا روئے سخن عالمگیر ہے۔ وہ ایک بین المللی جامعہ کے قیام کے لئے آیا ہے۔ وہ ہماری انفرادی و اجتماعی خرابیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان کی اصلاح و تہذیب کے لئے مرتب قانون پیش کرتا ہے، مگر چونکہ یہ حقیقت پیش نظر نہیں اس لئے ہماری قوتیں بیکار ہو گئیں، اباہوں کی امت بن گئے۔ احیاء اور تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی تو یورپ کی جانب دیکھا، اسی کی تقلید اعلیٰ کی، زنجیروں نے ہمارے پاؤں کو بو جھل کر دیا۔

اقسام القرآن کا علم نہایت ہی معنی خیز اور لطیف و دلآویز تھا، جس سے صدہا سرائے و مجربات فطرت کا کشف و بروز ہوتا

تھا مگر اول تو ان کی نظر ہی وہاں تک نہ پہنچی اور اگر امام فخر الدین رازی کو کچھ تنبہ ہوا بھی تو اتنا سا کہہ کر رہ گئے کہ: ”قسمیں صرف ان چیزوں کی بیان کی جاتی ہیں جو جلیل القدر ہوں۔“

قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا کہ جو لوگ ایمان باللہ اور عمل صالح رکھتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں شاد کام و باہر اور رہیں گے اور کبھی انہیں حزن و ملال نصیب نہ ہو گا۔ ارباب تفسیر نے اس امر پر مہر لگادی کہ اعمال صالحہ کے جن نتائج و ثمرات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قیامت کے لئے مخصوص ہیں، دنیا میں مسلمان ذلیل و رسوا رہیں گے، اس خیال نے چنگی پیدا کی اور اب تو یہی عقیدہ ہر مسلمان کے قلب و دماغ پر حاوی ہے۔ پس مسلمان دنیا کی جانب سے غافل ہو گئے اور محکومانہ زندگی پر قناعت کر بیٹھے، مگر قرآن کہتا ہے کہ:

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿٢٥﴾ (۲۵:۲۶:۳۹)

”جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب نے ایسی طرف سے آلیا کہ انہیں اس کی خبر بھی نہ تھی، ان کو اس دنیا کی زندگی میں اللہ نے ذلت کا مزہ اچکھایا۔“

دوسری جگہ فرمایا:

أَفْتَوْهُمُ مِّنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ تُنْفِخُ الْفُيُوءُ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ﴿١٨٥﴾ (البقرة ۸۵)

”تو کیا کتاب الہی کی بعض باتوں کو ماننے ہو اور بعض کو نہیں۔ پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کو ذلت ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں۔“

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا۔

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ أَيْنَ مَا تَشَقَّقُوا إِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ﴿١١٢﴾ (ال عمران ۱۱۲)

”جہاں دیکھو، ذلت ان پر سوار ہے مگر اللہ اور نیز لوگوں کے عہد پیمان کے ذریعہ سے کہیں ان کو پناہ مل گئی تو دوسری بات ہے خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔“

یہ تمام آیات اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ذلت و مسکنت، خسران و خذلان اور غلامی و محکومی اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب شدید کی نشانیاں ہیں، البتہ جن ارباب قدس و طہارت کو وہ اپنے فضل مخصوص کی لئے چن لیتا ہے، ان کو جنت ارضی، خلافت الہی اور سرفرازی و سر بلندی نوازش کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۳﴾ (ال عمران ۱۲۳)  
 ”نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“  
 پھر کہا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵:۲۱﴾  
 ”اور ہم زبور میں پسند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے۔“  
 اس سے زیادہ اور کیا صداقت ہو سکتی ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۵۴:۲۴)  
 ”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو سلطنت ضرور عطا کرے گا۔“  
 سیاست تو ان کے نزدیک شجرہ منوعہ سے کم نہ تھی۔ اس کا قرب و اتصال بھی ان کے لئے ارتکاب کبیرہ کے برابر تھا اور بعض نکتہ آفریں طبائع نے تو اپنی بدنماتی کا یہاں تک ثبوت دیا کہ لاتفر باھذہ الشجرۃ کی تفسیر میں لکھا کہ اس میں جس درخت کے قریب جانے کی ممانعت کی گئی ہے وہ یہی سیاست ہے۔ اس خیرہ نظری کی انتہائی ہوئی کہ مذہب اور سیاست کو دو جداگانہ چیزیں سمجھا جانے لگا۔ اب تو ہر شخص اس کو مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں سے تسلیم کرتا ہے اور ارباب عمام اپنے مواعظ و خطب میں بانگ دہل کہہ اٹھتے ہیں کہ مذہب کا حلقہ دوسرا ہے اور سیاست کا دوسرا۔ ساء ملیحکون۔  
 آہ! ان بد بختان ملت کو یہ تمیز نہ رہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ معجزات قاہرہ اور بشارات عظیمہ دیکر فرعون کے پاس بھیجتا ہے۔ فرعون مشرک بھی ہے، مے نوش بھی ہے، بدکار بھی ہے۔ فاسق بھی ہے، فاجر بھی ہے غرض وہ سب کچھ ہے جو دنیا کا ایک سیہ کار اور شریر و ظالم انسان ہو سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر برحق تھے۔ توحید الہی، رد شرک و اصنام پرستی، تزکیہ نفس و اخلاق، درس کتاب و حکمت ان کے فرائض نبوت کے حقیقی ارکان ہیں، ان کا مخاطب ایک مشرک و فاجر پادشاہ اور ایک مشرک و فاجر حکمران قوم تھی۔ اگر سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ نادانی اور جہل کے ابلیس نے تمہیں سمجھایا ہے، اور اگر ایک قوم کو غلامی سے نجات دلانا ایک غیر دینی عمل ہے، جیسا کہ بد بختانہ تم سمجھتے آئے ہو، تو اب ضروری تھا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت و تبلیغ بھی اس چیز سے بالکل علیحدہ رہتی، جس کا نام تم نے سیاست رکھا ہے۔ وہ آتے اور فرعون سے سب کچھ چاہتے، مگر وہ نہ چاہتے جو نہ تو دین ہے اور نہ پیغمبرانہ دعوت کا کوئی جزو حقیقی، مگر قرآن حکیم تمہارے سامنے موجود ہے، خدا نے فرعون کو نہ تو توحید کی دعوت دی نہ اس کی شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں، نہ اس کی سیاہ کاریوں کا جائزہ لیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتا کر رخصت کیا۔

إِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿۲۰﴾ (۲۴:۲۰)

”فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ بڑا سرکش اور ظالم ہو گیا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور انہوں نے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا کہ۔

أَنْ أَدَّاءِ إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنَّ لَكُمْ رَسُولًا أَمِينًا ﴿۱۷﴾ (۱۷:۴۴)

”خدا کے بندوں یعنی (بنی اسرائیل) کو مجھے واپس دیدو جسے تم نے اپنا محکوم بنارکھا ہے، میں تمہارے پاس ایک امانت دار رسول بن کر آیا ہوں۔“

تم نے غور کیا، یعنی حضرت موسیٰ نے فرعون کے آگے اپنی تبلیغ کا مقصد یہ نہیں کہا کہ فسق و فجور چھوڑ دو، گناہ اور شرارت سے باز آ جاؤ، نیک زندگی اختیار کرو، پاک طریقوں پر عمل کرو، بلکہ اولین مطالبہ یہ کیا کہ خدا کے جن بندوں کے پاؤں میں تو نے اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیریں ڈال دی ہیں انہیں چھوڑ دے اور مجھے واپس دے دے۔ خدا نے مجھے اس قوم کا امین بنایا ہے۔ اس کے بندوں کو میں آزادی دلاؤں گا، محکومی کی جگہ ایک حکمران قوم بناؤں گا، خدا کے بندے خدا کی امانت ہیں، تو ظالم و مستبد ہے اس لئے تو اس امانت کا مستحق نہیں، یہ شرف اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے کہ میں اس امانت کو ٹھیک ٹھیک اپنے پاس رکھوں گا۔

یہ مطالبہ اگرچہ نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا، لیکن درحقیقت وہ سیاست کی روح، سیاست کا مغز اور سیاست کی حقیقی تفسیر تھا۔

## دعوت و تبلیغ

اب ہم اتنی منازل مختلفہ طے کرنے کے بعد مذہب کے اس اہم و اقدم باب کی طرف توجہ کرتے ہیں، جس میں داخل ہونے کے بعد ہر قوم نے کامرانی و سربلندی کی راہیں اپنے سامنے کشادہ پائی ہیں اور جہاں ذرا سی ذلتہ قدم نے ان کو ہمیشہ کے لئے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

اسلام سے قبل جس قدر اقوام و امم اس زمین کی پشت پر پیدا ہوئیں، اگر ان کے تنزل و انحطاط کے اصولی اسباب و مراتب کا درس و مطالعہ کیا جائے تو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز علت یہی نظر آئے گی جو تمام امراض و مفسد ملی کے لئے بمنزلہ اصل و اساس کے کام دے گی کہ امت کے تمام افراد نے تبلیغ و دعوت کے اہم و اقدم فرض سے بعد و ہجر اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ برائی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ گویا آنکھیں اس لئے نہ دی گئی تھیں کہ ان سے دیکھنے کا کام لیتے: فانھا لاتعین الابصار ولكن تعين القلوب التقى الصدور۔

پھر اس کے ساتھ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ایک مخصوص گروہ نے دعوت و اصلاح کو اپنے اندر محدود کر دیا کہ کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ ہندوؤں میں صرف برہمن ہی ویدوں کے عالم بن سکتے ہیں، دوسروں کو صرف

ان معبودان باطل کی رسوم کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ رومن کی تھو لک کے فادروں نے کتاب مقدس کے اسرار و خزانہ پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ دیا۔

قرآن حکیم کا نزول ہوا کہ وہ ان بیڑیوں کو کاٹ دے جو لوگوں کے پاؤں میں ڈال دی گئی ہیں۔ اس نے ہر مسلم کا فرض قرار دیا کہ وہ مبلغ ہے اور اسلام و قرآن کی آواز دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچانا اس کا مقصد حیات۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۱۱۰:۳)

”لوگوں کی راہ نمائی کے لئے جتنی امتیں پیدا ہوئی ہیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

دوسری جگہ فرمایا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۱۲۳:۲)

”اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا تاکہ لوگوں کے راہ نمائے ہو۔“

سورۃ حج میں فرمایا:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۱:۲۲)

”اگر حاکم بنا کر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں تو نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، لوگوں کو اچھے کاموں کے لئے کہیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے اور سب چیزوں کا انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

یہ تمام آیات بغیر کسی اختلاف و تفریق کے بباگ و بیل اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمان صرف اس غرض کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں کہ وہ ہر نیکی کے آمر اور ہر برائی کے ناهی ہیں۔ تبلیغ و دعوت ان کا طغرائے امتیاز ہے جو ان کو باقی تمام اقوام عالم سے نمایاں کرتا ہے۔ اس کا ہر ہر فرد پیکر دعوت و اصلاح ہے اور اس میں کسی ایک گروہ کی تخصیص نہیں، بلکہ یہ فرض عام اور سب پر فرداً فرداً حاوی ہے۔

سورہ عصر نے تو کامیابی اسی تبلیغ و اشاعت ہی کو قرار دیا کہ اگر فرزند ان اسلام تو اسی بالحق و تواصی بالصبر نہ کریں گے تو خسران و غدلاں اور ذلت و ادبار میں مبتلا ہوں گے اور پھر صرف وہی لوگ مستوجب عقوبت نہ ہوں گے جنہوں نے تبلیغ و ارشاد کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی تو قرار دیا مگر اس کے ادا کرنے میں تساہل سے کام لینے لگے، بلکہ پوری امت کی امت مبتلائے آلام ہوگی: و اتقوا فتنة الذين ظلموا منكم خاصة۔

جبکہ ہر مسلم داعی الی الحق پیدا کیا گیا تھا تو کیسے ممکن تھا کہ لسان نبوت خاموش رہتی اور صحابہ کرام اس موضوع پر کسی



قسم کی روشنی نہ ڈالتے۔ رسول اللہ ﷺ نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

بلغوا عنی ولو ابیة۔

”اگر ایک آیت بھی جانتے ہو تو اس کی نشر و اشاعت کرو۔“

فلیبلغ الشاهد الغائب فان الشاهد عسی ان یبلغ من هو ادعی له منه۔

”ہر وہ شخص جو اس وقت موجود ہے غائب کو اس کی اطلاع کر دے ممکن ہے جس کو اس کی خبر پہنچے وہ مبلغ سے زیادہ صاحب فہم و فراست ہو۔“

پھر ایک جگہ فرمایا:

من رای منکم منکر افلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فیلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان۔

”تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے وہ طاقت سے کام لے کر اس کو روکے اگر قوت نہیں تو زبان سے ورنہ دل سے ضرور ہی برا جانے اور یہ ضعیف ترین درجہ ایمان ہے۔“

مزید تاکید کے بعد پھر ارشاد کیا۔

الا کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیتہ۔

”تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت سوال کیا جائے گا۔“

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت کو واضح کیا:

لو وضعتم الصبصامة علی هذه و اشار الی قفاه ثم ظننت انی انفذ كلمة سبعتها من البني ﷺ قبل ان تخیروا علی لا انفذتها۔

”اگر تم تلوار کو میری گردن پر رکھ دو اور مجھے یہ توقع ہو کہ گردن کٹنے سے قبل میں ان کلمات کی تبلیغ کر سکوں گا جو نبی ﷺ سے سن چکا ہوں تو ضرور کہہ کر رہوں گا۔“

صحابہ کرام کی حیات مقدس اس امر کی شاہد ہے کہ ان میں ایک ایک فرد مجسم دعوت اسلام تھا، وہ کہیں جاتے تبلیغ کا دردان ان کے دل میں تھا۔ ان کا ہر اقدام وادب اسی غرض کے لئے ہوتا۔ تجارت تھی تو اسی کے لئے، زراعت تھی تو اسی کی خاطر۔ بلاد بعیدہ اور ممالک اجنبیہ کے دور دراز سفر تھے۔ جنگلوں اور بیابانوں کی بادیہ پیمائی تھی، پہاڑوں کی سربلک چوٹیاں، سمندروں اور دریاؤں کی طوفان خیز موجیں، آندھیوں اور طوفانوں کی ہلاکت خیز بربادیاں ان کی راہ میں حائل تھیں، مگر ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے لئے سنگ راہ ثابت نہ ہوئی۔ قید خانوں کی کوٹھری میں بھی وہ اسوہ کو سنی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور برابر تبلیغ میں مصروف رہتے۔ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر زندگی اسی فرض جلیل کے ادا کرنے

میں گزر گئی، لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے، گالیاں دیں، مجنون و ساحر کہا، کس لئے؟ صرف اس لئے کہ داعی حق، ناشر صداقت اور مبلغ قرآن تھے۔

لیکن آہ ثم آہ! مسلمانوں نے اس اسوۂ حسنہ کو ترک کر دیا۔ اس سے بعد و ہجر اختیار کیا اور اس کو درءِ ظہود ہم پھینک کر یقین کر لیا کہ ضرور کامیاب ہوں گے، لیکن صدیوں کے تجربہ نے آج اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ جب تک ہر فرزند اسلام قرآن حکیم کی دعوت کے لئے سربکف کو شش نہ کرے گا اور اس کتاب عزیز کو لے کر سرفروشانہ اقدام نہ کرے گا امت مسلمہ کا تنزل و انحطاط سے نجات حاصل کرنا محال قطعی ہے۔

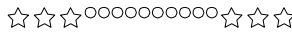
چند ابتدائی صدیوں تک مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ تبلیغ و دعوت ہر مسلمان کا فرض حیات ہے، مگر آخر جمود و استبداد نے ان کی قوتوں کو پامال کر دیا اور گروہ علمائے اس پر قبضہ کر لیا، گویا یہ اقلیم فرمانروائی تھی جو صرف انہی کے لئے مخصوص تھی، لیکن آج وہ بھی اپنے فرض سے غافل خانقاہوں میں تسبیح و سجادہ پر قانع ہیں۔

پس وقت آگیا ہے کہ ہر وہ مسلم جس کے دل میں اسلام کا درد اور دین کی ٹیس ہے میدانِ عمل میں آگے بڑھے اور قرآن کی نشر و اشاعت میں لگ جائے۔

أَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ (۱۵۳:۶)

واخِر دعونا ان الحمد لله رب لعلمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم۔



## سورة البقرة

(رکوع ۴۰ آیات ۲۸۶)

## سورة کا نام

قرآن حکیم میں جس قدر سورتیں ہیں ان کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام معین کر دیئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں گائے ذبح کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں، وہ اس کی حکمت سے آگاہ نہیں، اس لئے جدل و مناظرہ کا بازار گرم کرتے ہیں تا آنکہ بہت سے سوال و جواب اور بحث و تحقیص کے بعد تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس میں قرآن کے اہم واعظم ترین اصول کی تعلیم تھی جو اقوام و امم کے عروج و ارتقاء کی اساس و بنیاد ہے، اس لئے اس سورہ مبارکہ کا نام ”بقرہ“ تجویز ہوا۔

## ترتیب نزول

یہ سورہ تمام و کمال دارالہجرت ہی میں نازل ہوئی ہے۔ ”صاحب اتقان“ نے صرف دو آیتوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔

## ما قبل سے تعلق

قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ آتی ہے۔ ایک عاجز و درماندہ انسان خدائے قدوس کے حضور میں کھڑا ہو کر الصراط المستقیم کی درخواست کرتا ہے کہ وہ راہ حق کو پائے اور ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہے۔ اس سورہ مبارکہ میں دعاء کو اجابت بخشی گئی اور ایسی تعلیم نوازش ہوئی جو ہدیٰ للمتقین ہے اور جس کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ ان کو اولئک علی ہدیٰ من ربہم و اولئک ہم المفلحون کے پاک و مزی کی گروہ میں شامل کر دیتی ہے۔

ام الكتاب میں مغضوب علیہم اور الضالین کے نقش قدم پر چلنے سے پناہ مانگی گئی تھی، اس سورہ نے شرح و تفصیل کے ساتھ ان مغضوبین کے جذبات و احساسات، الف و عادات رسم و رواج، اور امراض و مفسدات سے بحث کی، ضالین کے حقائق مستورہ کو آل عمران نے بے نقاب کیا۔

فاتحہ الكتاب متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح و تفسیر، یہ اجمال ہے اور وہ تفصیل۔

## موضوع سورة

آپ پہلے چند مقدمات کو پیش نظر رکھ لیجئے کہ ان پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

(الف).... قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک موضوع (Subject) ہے اور اوّل سے لے کر آخر تک وہ سورۃ اسی پر مبنی ہے، جس قدر مطالب درمیان میں آگئے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر و ضروری اطراف بحث و تعلیم ہیں۔

(ب).... ہر سورۃ کی ابتدا و انتہا، اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

(ج).... جب ہر سورۃ کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہو گئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلہ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعویٰ سے دلیل اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے تصریف آیات سے جا بجا تعبیر کیا ہے۔ ”صرف“ کے معنی لغت میں رد الشئ من حالة الى حالة کے ہیں۔

یہ اصول اساسی آپ کے سامنے ہیں، سورہ بقرۃ کی ابتداء میں فرمایا: اولئک علی ہدی من ربہم و اولئک ہم المفلحون، فلاح کے حسب ذیل معانی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱).... الذی انفتحت لہ وجوہ الطفر ولم تستغلق علیہ، جس کے لئے ظفر و کامرانی کے ابواب مفتوح ہوں اور اس کی تمام رکاوٹیں ایک قلم مفقود ہو جائیں۔

(۲).... الفلاح بمعنی البقاء، فیکون المعنی اولئک ہم الباقون فی النعمیم المقیم، فلاح کے معنی بقا بھی بیان کئے جاتے ہیں، اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ دائمی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۳) اصل الفلاح الشق، فعلى هذا يكون المعنى اولئک هم المقطوع اولئک هم بالخیر فی الدنیا والاخرة، فلاح کے معنی انشقاق اور قطع و برید کے بھی آتے ہیں، اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ دنیا و آخرت کی ہر قسم کی خیر و برکت اور عزت و کرامت صرف فرزند ان اسلام کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

ان تینوں معانی میں دراصل کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے کہ دنیا کی ہر انتہائی کامیابی و کامرانی، اجلال و تجلیل، جہانگیری و جہانداری، جنت ارضی و سماوی مخصوص ہے ان ارباب فضل و کمال کے لئے جن کے یہ خصائص و امتیازات اور کمالات و فضائل ہیں اور وہ کبھی ناکام و خاسر نہیں رہ سکتے۔ اسی سورۃ کے آخر میں دعا کی گئی:

فانصرنا علی القوم الکفرین، جس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہمارے مخالفین و معاندین تباہ و برباد ہوں، اور ہمیں ان پر ظفر و کامرانی نصیب ہو۔

پس اس سورۃ کے اوّل و آخر نے ہمیں بتا دیا کہ اس کا موضوع اصلی یہی ہے کہ اس میں ایسی تعلیم دی جائے جو مسلمانوں کے اندر صحیح کریکٹر پیدا کر دے، وہ اپنے مذہب اور اخلاق کے پابند رہ کر دنیا و آخرت کی انتہائی کامیابیوں اور کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہوں۔ گویا دوسرے الفاظ میں اس کا موضوع و مقصد مسلمانوں کو خلافت کبریٰ کی تعلیم دینا اور اس سے سرفراز کرنا ہے۔

اگر ہم ان تمام احادیث و آثار کو پیش نظر رکھیں جن میں اس سورہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں تو ہمارے دعوے کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تجعلوا بيوتكم مقابر، وان البيت الذي تقرأ البقرة فيه لا يدخله الشيطان۔ (ترمذی)

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت ہو وہاں شیطان کا داخلہ بند ہوتا ہے۔

ایک جگہ آپ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت ظاہر کی:

لکل شی سنام وان سنام القرآن سورة البقرة۔ (ترمذی)

ہر ایک چیز کا ممتاز و نمایاں حصہ ضرور ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کبریٰ اور علو و رفعت سورہ بقرہ کو حاصل ہے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ، رسول اللہ ﷺ کو جنگ کے لئے ایک جماعت بھیجنا تھی جس کے لئے سردار کی تلاش میں تھے، جن لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں ان میں سے ہر ایک سے آپ یہ پوچھتے کہ قرآن کے کونسے اجزاء حفظ ہیں، اتنے میں ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے سورہ بقرہ یاد ہے، آپ نے فرمایا کہ، تم اس جماعت کے امیر ہو۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے وہ سب سے چھوٹا تھا<sup>۱</sup>۔

مسلم میں انس بن مالک سے روایت ہے:

كان الرجل اذا قرأ البقرة وال عمران جديبينا۔

جو شخص بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا اس کی ہم بے انتہا قدر و منزلت کرتے تھے۔

نبیہی نے کتاب الدلیل میں عثمان بن ابی العاص سے روایت نقل کی ہے کہ، میں باوجود اس امر کے کہ صغیر السن تھا اور میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھے طائف کی گورنری نوازش فرمادی، صرف اس لئے کہ میں نے سورہ بقرہ پڑھی تھی۔

شعب الایمان میں ہے کہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورہ مبارک کو آٹھ سال میں ختم کیا اور اس کے درس و فکر سے فارغ ہونے پر اونٹ ذبح کیا اور تمام دوستوں کو دعوت دی۔

ان احادیث و آثار کو بار بار پڑھئے، آپ اس کے سوا اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچیں گے کہ اس سورہ کا موضوع، خلافت کبریٰ

① ترمذی ج ۲، ص ۱۱۱

اور مسلمانوں کو ایسی تعلیم دینا ہے جو انہیں تمام مہذب ممالک پر حکمران بنادے، چنانچہ دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے۔ وما ذلک علی اللہ العزیز ۔

روئے سخن

قرآن حکیم کا درس و فکر ایک اور عجیب و غریب اصل و اساس کی جانب ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ دنیا کے اندر صدہا اقوام و امم ہیں۔ ان کے مذاہب و ادیان ہیں، سوم و عوائد ہیں، عقائد و اخلاق ہیں۔ قرآن حکیم اس لئے آیا کہ تمام اختلافات کے لئے حکم اور ظنون و ادہام کے لئے کتاب مبین ہو، اس لئے ضروری تھا کہ اس کا روئے سخن سب کی جانب ہو، ہر ایک کی غلط کاریاں بیان کر کے اس کو صحیح راہ عمل دکھا دے۔

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، سورہ اعراف تک اس نے مختلف ادیان و مذاہب کو مخاطب کیا، قرآن حکیم کے نزول کے وقت یہودیوں کی سب سے بڑی جماعت تھی جس کو مذہبی ہونے کا دعویٰ تھا، یہ لوگ شریعت موسوی کے حامل اور اسی کے مبلغ و داعی تھے، لیکن مدت ہائے دراز سے اپنے فرض جلیل سے بعد و ہجر اختیار کر چکے تھے۔ اس لئے سب سے پہلے بنی اسرائیل کو اس سورہ میں مخاطب کیا گیا، ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیاں ظاہر کیں، ان کی حاکمانہ زندگی کے امراض و مفسد بیان کئے۔ تبلیغ و دعوت کے دوران میں انہوں نے جن بد کاریوں کا ارتکاب کیا تھا ان پر تفصیلی روشنی ڈالی اور آخر میں بتا دیا کہ اس وقت یہ لوگ مسند تبلیغ سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، ان کی جگہ پر مسلمان کام کریں گے۔

دنیا کی قوموں اور ملتوں میں جب کبھی انقلابات ہوئے ہیں وہ ہمیشہ نتیجہ ہوتے ہیں ارباب علم و فضل کی سعی و کوشش اور دعوت و تبلیغ کا، ان کے وعظ و تذکیر سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اور حریت و استقلال کے جذبات میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ قتل و بیکاری اختیار کر لیں تو تمام قوم پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے، یہ لوگ قوم کے لئے بمنزلہ قلب کے ہوتے ہیں، ان کی صحت و تندرستی پر حیات ملی کا دار و مدار ہے اور ان کے بیمار ہونے سے تمام قوم امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔

سورہ بقرہ میں یہودی علماء کی خرابیاں ذکر کیں تاکہ امت مسلمہ کے اہل علم ان سے بصیرت اندوز ہوں اور اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے بچانے کی کوشش کریں۔

مضامین کی فہرست

دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں۔

(الف) .... عوام الناس، جن کی نظر نتائج و ثمرات، اور ظواہر اعمال پر ہوتی ہے، وہ درخت کو اس کے پھل کی وجہ سے شناخت کرتے ہیں، ان لوگوں میں تنبیہ و اعتبار پیدا کرنے کے لئے سورہ بقرہ کے ابتدا سے لے کر دوسرے

پارہ کے دوسرے رکوع تک مخصوص کر دیا۔

(ب).... ارباب علم و فضل جو حقائق و معارف کے شیفہ، اسرار و حکم کے دلدادہ اور بصادغوا مض کے جویاں ہیں، ان کے لئے سورہ کے تمام بقیہ اجزا ہیں وہ ان کی تحلیل و تفرید کریں، ارباب سیاست، اس کے درس و فکر میں مصروف ہوں، جو جماعتیں، قوانین و ضوابط کی تنظیم و تشکیل کی ذمہ دار ہیں، اس کو آدیزہ گوش بنائیں اور جن کی سعی و کوشش صرف علم کے کسب و حصول کے لئے وقف ہے، اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔

سورہ بقرۃ کو حسب ذیل ابواب و فصول میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا باب وحی والہام کی ضرورت از ابتداء سورہ تا آیت۔ ۷

پہلے دور کو ع میں بتایا کہ ہر جدید تعلیم و تحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(۱).... ارباب ایمان و صلاح جو اس تعلیم حق کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیتے ہیں۔

(۲).... دجالہ کفر و شیطنیت، جن کا مقصد وحید یہی ہوتا ہے کہ ہر اصلاح کی مخالفت ہو، اور دنیا کا نظام ہمیشہ درہم برہم رہے۔

(۳).... منافقین، دونوں جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں، کفار و مشرکین سے یہ لوگ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

پھر تذکیر بآلاء اللہ کے بعد ان کو قانون الہی کی جانب توجہ دلائی اور بتایا کہ وحی والہام پر صرف وہی لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں، جن میں حسب ذیل امراض ہوں۔

(الف).... ایمان کمزور ہو۔

(ب).... طبیعت ضعیف ہو۔

(ج).... عقل کوتاہ ہو۔

ان کو بتایا کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس لئے وہ الہام ربانی کے آگے سر جھکانے کو مجبور ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام پر لاشان مضطرب پھرتے رہے تا آنکہ وحی الہی نے ان پر چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان قلب اور تلج صدر کا باعث بنے۔

پس قصہ آدم سے ثابت ہو گیا کہ دنیا میں انسان کو سکون و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الہی کا پابند بنائے، اس کے بغیر نہ تو اس کی زندگی کسی کام آئے گی اور نہ وہ حیوانات کے درجہ سے ترقی کر سکے گا۔

دوسرا باب قرآن حکیم کی ضرورت آیت ۸۳ سے ۱۴۶ تک،  
پانچویں رکوع میں یہودیوں کی اجمالی خبریاں ذکر کی گئیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) .... علمی۔

(ب) .... عملی۔

(ج) .... انتظامی۔

رہج اول سے ان امراض و مفاسد پر نہایت ہی شرح و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی اور دو باتوں کا فیصلہ کیا گیا۔  
(۱) .... آیت ۶۹ تک یہ بتا دیا گیا کہ جس وقت تم خلافت ارضی اور فضلیت علیٰ العلمین سے سرفراز تھے، تم نے ایسی بد کرداریوں اور بد عملیوں کا ارتکاب کیا جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم سے حکومت چھین لی گئی اور تم پر ذلت و مسکنت طاری کی گئی۔ حیات ملی کے لئے تین قسم کے ارباب فضل و کمال کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن تمہاری قوم ان سے یکسر خالی تھی، پس آئندہ ہمیشہ کے لئے تم جہانگیری و جہاں داری سے محروم کر دیے گئے۔

(۲) .... آیت ۸۷ تک اس حقیقت کو بے حجاب کیا کہ تم مسلمانوں کے ساتھ مل کر بھی دعوت و ارشاد کا فرض اہم و اقدم انجام نہیں دے سکتے، اسی ذیل میں ان کے عالموں، دولتمندوں اور عام لوگوں کی باطل پرستیوں اور غلط عقیدوں کو بیان کیا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ بنی اسرائیل محکومانہ زندگی ہی بسر کر سکتے تھے، مگر یہ بھی صاف کر دیا گیا کہ وہ شریف رعایا بننے کی بھی قابلیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ آیت ۹۸ تک اس پر بحث کی اور ساتھ ہی فرزند ان اسلام کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے تمام تعلقات و روابط سابقہ ان سے منقطع کر لیں۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ بحث کا دائرہ بالکل تنگ ہو گیا تو نسخ ادیان و ملل کی طرف توجہ کی اور اس کو اپنے شبہات کا نشانہ بنایا۔ لیکن فوراً ہی مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ان شبہات کے پیش کرنے سے ان کی اصلی غرض کیا ہے۔ آیت ۱۱۳ تک یہی بحث تھی، اب انہوں نے نسخ قبلہ کو لیا اور اس پر اعتراضات کی بوچھا شروع کر دی۔ قرآن نے اس کے دو جواب دیئے۔

(الف) الزامی۔

(ب) اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، بنائے کعبہ اور دعائے خلیل کا تذکرہ کیا اور انہیں بتا دیا کہ اب دنیا کی ہدایت و راہ نمائی صرف قرآن کے لئے مخصوص ہے اور فرزند ان اسلام ہی مسند تبلیغ و ارشاد کے مالک ہونگے۔ یہ بحث آیت ۱۱۵ تک ختم ہو جاتی ہے۔

تیسرا باب تہذیب اخلاق، یہاں سے قرآن کی اصلی تعلیم شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلے ان اخلاق کو پیش کیا جاتا ہے جو انفرادی حیثیت سے ہر انسان میں پیدا ہونا ضروری ہیں، جو اصل و اساس حیات ملی ہیں، اور جن کی غرض و غایت یہ



ہے کہ قوم میں صحیح کری کٹر پیدا ہو، ساتھ ہی اس تعلیم گاہ کی جانب اشارہ کیا جس میں داخل ہونے کے بعد ان اخلاق کی تہمتہ و تولید ہو سکتی ہے۔ آیت ۶۲ تک۔

چوتھا باب، تدبیر منزل، رزق کمانے کے ذرائع و وسائل پر بحث کی۔ صرف کرنے کا قانون دیا، دیوانی اور فوجداری ضوابط کی تدوین کی۔ اندیشہ تھا کہ ان امور میں مصروف رہنے کی وجہ سے لوگوں کی روحانیت اور تعلق باللہ میں ضعف و کمزوری نہ پیدا ہو جائے، اسلئے روزے فرض کر دیئے اور مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جانب توجہ دلائی۔ آیت ۸۷ تک۔

پانچواں باب، معاملات، اس میں دو باتوں کا فیصلہ کیا:-  
(الف) ناجائز طریق سے کسی کا مال کھانا قانونی جرم ہے اس سے پرہیز کرو اور ان امور کا فیصلہ خود ان کا کریکٹر کر دے گا، کیونکہ پہلے اس کی تعلیم دی جا چکی ہے، عدالت کو شاذ و نادر ہی مداخلت کی نوبت آئے گی۔

(ب) مسلمان اپنے تمام حسابات قمری مہینوں کے مطابق رکھیں، کیونکہ کائنات خلعت حضرت ابراہیم نے قمری مہینوں میں ایام حج معین کئے ہیں۔ (آیت ۱۸۸ تا ۱۸۹)

چھٹا باب، سیاست مدن، اس میں تین فضلیں ہیں۔

فصل اول جہانگیری، اس میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱).... کوئی وقت، کوئی شخص اور کوئی جگہ جہاد فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ نہیں قرار دی جاسکتی۔

(۲).... ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جس قدر روپیہ اس کی جائز اور ضروری حاجات زندگی سے بچ جائے وہ تمام و کمال جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر خلافت اسلامی کی نذر کر دے۔

(۳).... حج ضروری قرار دیا گیا تاکہ ان تمام اعمال مہمہ کی مشق ہو، جو جہاد کے لئے لازم اللوازم ہیں۔

(۴).... وحدت مقصد ضروری ہے۔

(۵).... ہر شریف اور خاندانی انسان کے پاس اسلام کی آواز حق و حریت پہنچانا فرائض دین میں سے ہے۔

(۶).... جہاد فی سبیل اللہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

(۷).... اس راہ ایثار و فدویت میں تکالیف و شدائد سے کوئی چارہ کار نہیں۔

(۸).... جہاد کب تک رہے گا اور اسے کس قدر روپیہ کی ضرورت ہے۔

(۹).... ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ کبھی اس احب الاعمال الی اللہ کے لئے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

(ق).... جب لڑائیوں کی کثرت ہوگی، تو یتامیٰ بھی ضرور بہت زیادہ تعداد میں نظر آئیں گے، ان کی تعلیم و تربیت اور حفظ و صیانت کے لئے قانون بنایا گیا۔ آیت ۲۲۰ تک۔

فصل ثانی، جہانداری، اس میں ان مسائل کا تذکرہ ہے۔

(۱).... کسی غیر مسلم کو حاکم نہ بنایا جائے۔

(۲).... جس قدر قومیں مسلمانوں کے ماتحت رہیں گی ان کو کامل اندرونی آزادی دی جائے گی۔

(۳).... جدید قانون کی وضع و ترتیب کے وقت اس امر کا خیال رہے کہ وہ نظام صالح کا حامی، برو تقویٰ کا محافظ و نگران کار اور نوع انسانی کے لئے زندگی بخش ہو۔

(۴).... صدر جمہوریہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، اگر اس کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو چار ماہ کی مہلت دی جائے، اگر اس نے اپنی اصلاح کر لی تو بہتر، ورنہ معزول کر دیا جائے۔

(۵).... عزل کے وقت اس کی تمام سابقہ واجب الادا قوم ادا کر دی جائیں۔

(۶).... معزول ہونے پر وہ ان اصلاحات کو خراب و برباد کرنے کی کوشش میں نہ لگ جائے جن کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا۔

(۷).... اگر معزول شدہ حاکم دوسری مرتبہ رعایا کے حقوق کی نگرانی کا عہد و میثاق کرے تو اسے انتخاب میں آنے کا موقعہ دیا جائے۔

(۸).... اگر وہ تین مرتبہ معزول ہو تو پھر اسے امیدوار کے طور پر کھڑے ہوتے ہی روک دیا جائے۔

(۹).... حاکم کی رائے کو کچھ ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

(۱۰).... معزول شدہ حاکم دوسروں کے انتخاب میں رکاوٹیں نہ پیدا کرے۔

(۱۱).... حکومت کے لئے خود اپنے آپ کو پیش نہ کرے، بلکہ قوم خود ان لوگوں کی تلاش کرے۔ اور جن میں قابلیت و استعداد ہو ان کے ہاتھ میں عنان سلطنت دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۱۲).... حکومت کرنے میں ذاتی اور خاندانی مصلحتوں کی پروا نہ کرے، بلکہ عامہ ناس کا نفع و سود پیش نظر ہو۔

آیت ۲۴۲ تک۔

فصل ثالث، عملی سیاست کا نمونہ، اس میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱).... یہ ضروری نہیں کہ جو شخص میدان جنگ میں جائے گا وہ مر ہی کرے گا۔

(۲).... جنگ کے لئے امیر کا انتخاب ضروری ہے۔

(۳).... شرائط انتخاب بیان کئے۔

(۴).... رائے عامہ کا احترام ضروری ہے۔

(۵).... کام شروع کرنے سے پہلے فوج کا امتحان ہو۔

(۶).... صرف ان لوگوں کو میدان جنگ میں بھیجا جائے جن کے اندر سب سے زیادہ اعتماد علی اللہ اور قربانی کا جذبہ

صادقہ ہو۔ آیت ۲۵۲ تک۔

ساتواں باب، خلافت کبریٰ، اس میں حسب ذیل امور کا تذکرہ ہے۔

(۱).... تمام مہذب اور شائستہ ممالک پر مسلمانوں کی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

(۲).... خلیفۃ المسلمین کے فرائض۔

(۳).... مال دار اپنی تمام دولت و ثروت، خلافت اسلامی کی نذر کر دے۔

(۴).... مال قبول کرنے کے لئے چند شرائط کو بیان کیا، جب تک ان قیود کے ماتحت روپیہ نہ دیا جائے گا خلافت کبھی

اس کو لینے کے لئے تیار نہ ہوگی

(۵).... مالداروں کی طرح ارباب علم و فضل بھی ان شرائط کو پیش نظر رکھ کر ملک و ملت کے لئے اپنے تمام علوم

و معارف وقف کر دیں۔

(۶).... جب مال کو دور کرنے کے لئے سود کی حرمت بیان کی۔

(۷).... قرض کا قانون مدون کیا۔

(۸).... ارکان خلافت کو بتادیا کہ ان کے تعلقات و روابط اپنے خالق کے ساتھ کس قسم کے ہوں اور انہیں تدوین

قانون کے وقت کس امر کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے، آیت ۲۸۶ تک۔

مضامین کی فہرست آپ کے سامنے ہے، اس اجمال نے جہاں اور صدہا امور پر روشنی ڈالی ہے، وہاں ان دو حقیقتوں کو بھی واضح کر دیا ہے کہ۔

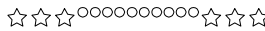
(الف).... اس سورت کی تمام آیات باہم مربوط اور مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ تمام کڑیاں

باہم دگر پوست کر دی گئی ہیں۔

(ب).... اس میں خلافت کبریٰ کے نظم و ادارہ کی تعلیم دی ہے اور اس سورۃ کا مقصد یہ ہے کہ فرزند ان اسلام

کمزوری کی جگہ طاقت کے لئے، بے کسی کی جگہ فرماں روائی کے لئے اور رونے کی جگہ خوشیوں کے لئے تمام عالم

میں نمایاں اور ممتاز ہوں۔



## باب ۱ وحی الہی کی ضرورت

الْم ۝

### حروف مقطعات

قرآن حکیم میں ۲۹ سورتیں ہیں، جن کی ابتدا حروف مقطعات سے کی گئی ہے، مفسرین کرام ان حروف کے متعلق مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسرار و رموز ہیں جن کی اطلاع کسی انسان کو نہیں دی گئی، یہ حروف بھی ان میں شامل ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کے معانی رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہیں، کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے اسرار و خفایا ہیں، بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ متشابہات ہیں اور ان میں گفتگو کرنا قرآن کی رو سے جرم ہے، لیکن ایسے بھی ہیں جو ان کے مطالب بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن مسعود اور ابن عباس کا یہی مذہب ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں قرآن حکیم کا نزول اس لئے ہوا کہ اس کی ضلالت و گمراہی دور ہو اور عمل حق و صالح کی قاہرہ قوت نافذ ہو۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس امر کو تسلیم کر لیں کہ قرآن کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کے مطالب کوئی فرد بشر نہیں جانتا، تو دوسرے الفاظ میں اس اعتقاد کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کا ایک جزو ایسا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اس لئے بیکار ہے۔ حالانکہ قرآن اپنی نسبت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ہدی للناس ہے، برہان ہے، بصائر ہے، نور ہے، بصیرت ہے اور سب سے آخریہ کہ وہ العلم ہے اور دنیا کے پاس اس کے سوا جو کچھ ہے ظن ہے، تخمین ہے، انکل کی باتیں اور قیاسات ہیں۔ اس زمین کی پشت پر جس قدر ادعاء علم کے اعلانات ہیں ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ پس یہ ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حروف مقطعات کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔

البتہ جن لوگوں نے ان کو متشابہات میں داخل کیا اور اس لئے ان کے درس و فکر سے الگ ہو گئے، ان سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ انہوں نے جس آیت سے استدلال کیا وہ حسب ذیل ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۚ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ⑤ (ال عمران ۵)

”وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے بعض آیتیں محکم ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا ان کا اصلی مطلب کسی کو معلوم نہیں اور جو لوگ علم میں بڑی پانگاہ رکھتے ہیں وہ تو اتنا ہی کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔“

اس آیت میں دو لفظ بیان کئے گئے ہیں۔

محکم، متشابہ

یہی دونوں لفظ محل بحث و نظر ہیں، اس لئے ہم فی الحال ان کو ترک کر کے ایک اور چیز پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں جس قدر علوم و معارف موجود ہیں، اگر ان تمام کی تحلیل و تفرید کی جائے تو دو چیزیں ممتاز نظر آئے گی جن پر تمام مباحث علمیہ کا دار و مدار ہو گا اور جو حقیقی اور فطری تقسیم ہو گی ہر علم اور کتاب کی، دو جلیل القدر اصل و اساس حسب ذیل ہیں۔

(الف) بدیہی جس کا فہم و ادراک ہر شخص کے لئے آسان و سہل تر ہو، جس کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہ ہو۔  
(ب) نظری، پہلے بدیہی مقدمات کو ترتیب دینے کی ضرورت پڑتی ہے، تب کہیں جا کر اس کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہوتی ہے۔

تعلیم دینے کا فطری طریق یہی ہے کہ ابتداء میں بدیہیات کو پیش کیا جائے، پھر جوں جوں استعداد و قابلیت بڑھتی جائے، نظریات کی جانب توجہ ہو۔ اس قاعدہ کی پابندی سے صحیح نشو و نما اور تربیت ہو سکتی ہے، لیکن جو لوگ کوتاہ بین اور کج فہم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نظریات کو پہلے لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم بیکار رہ جاتی ہے اور کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

یہ دو اصول آپ کو ہر جگہ جاری و ساری نظر آئیں گے، فلسفہ، منطق، ہندسہ، نجوم، مابعد الطبیعیات، علم النفس وغیرہ، کوئی علم اور کتاب نہیں جس نے ان اصولوں کی پابندی نہ کی ہو۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی جانب، آل عمران کی اس آیت نے ہماری راہ نمائی کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ قرآن کی تمام آیات دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں:

(الف) .... محکمات، جن کو آپ بدیہیات سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی اصل و اساس ہیں، انہیں پر تمام تعلیمات الہیہ کا دار و مدار ہے۔

(ب) .... متشابہات، جن کے لئے دوسرا لفظ نظریات کا ہے۔

قرآن میں بحث و نظر کا صحیح طریق تو یہی تھا کہ ابتدا میں محکمات کو لیتے، جب ان سے فارغ ہو جاتے پھر متشابہات کی جانب توجہ کرتے، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کچی ہو وہ اس قاعدہ سے گریز کرتے ہیں، اور سب سے پہلے متشابہات میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں چند مقاصد ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

(۱).... لوگوں کو پریشان کر کے تشویش و اضطراب میں ڈال دیں، جن عقائد و اخلاق کو وہ اب تک درست تسلیم کرتے تھے انہیں غلط معلوم ہونے لگیں۔ ایک آیت کا مفہوم دوسری کے خلاف کر دیں۔ اصول سے الگ ہو کر اپنی رائے سے قرآن کی آیات کا مطلب جداگانہ قرار دیں۔ شک پیدا کر کے قوائے علیہ کو فنا کریں۔

(۲).... چونکہ ان کی عملی قوت بالکل بیکار ہوتی ہے، اس لئے چاہتے ہیں کہ احکام و اوامر پر عمل کرنے سے قبل ہی ان کے نتائج و ثمرات سے آگاہی حاصل کریں۔ اپنی خواہش اور باطل عقیدہ کے مطابق معنی کریں اور محکمات کو چھوڑ کر محض متشابہات ہی پر حصر کر دیں۔

ان اوامر و نواہی کے نتائج و عواقب نہ صرف اللہ ہی جانتا ہے بلکہ راسخین فی العلم بھی ان سے محروم نہیں رہتے۔ یہ درجہ علیا ان کو صرف اس لئے نصیب ہوا کہ پہلے انہوں نے محکمات و بدیہیات کو لیا، جب ان میں رسوخ و کمال پیدا کر لیا تو متشابہات و نظریات کی جانب جھک گئے اور یہ راہ حق صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ارباب بصیرت ہوں اور عقل و خرد سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔

اس قدر گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ جن لوگوں کو رسوخ فی العلم حاصل ہو وہ متشابہات اور حروف مقطعات کے مطالب سے آگاہ ہوتے ہیں، اب صرف اتنا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ارباب فہم و بصیرت کون ہیں جو اس گروہ میں شامل ہونگے۔ اس کا جواب بھی خود قرآن ہی سے دریافت کرنا چاہئے۔

قرآن حکیم نے دین الہی کا دوسرا نام العلم رکھا ہے:

وَلَقَدْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ \* (البقرة ۱۱۳)

اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، بعد اس کے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الہی آچکا ہے۔

ہر جگہ گمراہ قوموں کے بغی و ضلالت اور عدوان و سرکشی پر ملامت کرتے ہوئے کہا: فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ \* بَغْيًا بَيْنَهُمْ \* (۱۷: ۳۵) حالمین قرآن کی نسبت کہا: فی صدور الذین اتوا العلم (۲۹: ۳۸) وہ ان کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا، نیز کہا کہ یہ برہان ہے اور نور و ہدیٰ ہے اور ہر جگہ کفر کو کہا کہ وہ ظن ہے، شک ہے، تخمین ہے اور انکل کی باتیں اور قیاسات ہیں: وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ ؕ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۳﴾ پھر دین الہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو ایمان کہا اور ایمان والوں کو مومن۔ ایمان، امن سے ہے اور امن کے معنی طمانینۃ النفس اور زوال خوف و شک کے ہیں۔ ان تمام تصریحات سے واضح ہو گیا کہ دنیا میں علم و یقین صرف ایک ہے اور وہ وحی الہی ہے اور اس کے

سوا اور جس قدر ادعائی علم کے اعلانات ہیں، ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نیز یہ کہ ایمان کے معنی یقین حاصل کرنے کے ہیں اور مومن وہ ہے جس کے پاس شک کی جگہ یقین ہو، یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو الذین یعلمون اور الذین لایعلمون اور الاعی اور البصیر سے تشبیہ دی، یعنی صاحبان علم اور پینا اور ارباب جہل اور اندھے۔ اس بنا پر علم اضافی و محدود تو دنیا کے پاس ہے مگر علی الاطلاق العلم قرآن کے سوا اور کوئی نہیں، اور قرآن جس کے پاس ہے وہی دنیا میں سب سے زیادہ عالم اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔ پس وہ راسخ فی العلم ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ حروف مقطعات اور مشابہات میں گفتگو کرے۔

ہمیں یہ یقیناً معلوم ہے کہ عرب میں مقطعات حروف کا استعمال عام طور پر ہوتا تھا۔ عرب کے لوگ اس سے اجنبی نہ تھے، اگر یہ کوئی جدت طرازی ہوتی تو ضرور تھا کہ سب سے پہلے وہی اس کی مخالفت کرتے، کیونکہ ان سے بڑھ کر قرآن کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا؟ تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس سے اس امر کی تائید ہو سکے کہ کسی عرب نے اعتراض کیا ہو۔

عرب میں حروف ہجا کو اصول کلمات تسلیم کیا جاتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے معنی معلوم تھے۔ بلکہ بعض اوقات اذکیاء ملک کا انہیں میں امتحان ہوتا تھا، اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ جس لفظ میں نون و فاجع ہوں، اس کے معنی ہمیشہ خروج کے ہوں گے۔ مثلاً نفر، نفث، نفخ، نفق، نفذ، و نفذ وغیرہ، اگر فاولام جمع ہوں تو اسکے معنی شکافتن کے آئیں گے۔ مثلاً فلق، فلج، فلذ، فلو وغیرہ۔

اسی طرح اگر ہم ترقی کرتے چلے جائیں تو صرف ایک حرف کے معانی و مطالب بھی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اگر ان قواعد کو ملحوظ رکھا جائے جن سے حروف مقطعات کے مطالب معلوم ہو سکتے ہیں، تو کہا جاسکتا ہے کہ ”الم“ اس صورت کا نام ہے۔ اور اس صورت میں جس قدر مضامین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ”الم“ میں ان کی جانب اجمالی اشارہ ہے۔

شیخ صدر الدین قونوی نے حروف مقطعات کے متعلق دورائے تحریر کئے ہیں جن میں ان کے اجمالی معانی و مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں ایسے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں جن پر کاربند ہو کر ارباب فضل و کمال مقطعات کے معانی معلوم کر سکتے ہیں: ومن شاء التفصیل فلیدرجہ ثمہ۔

موجودہ کتاب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۤ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱

اس کتاب میں کچھ شک نہیں، ڈروالوں کو راہ بتاتی ہے۔

اس سورۃ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے نازل کرنے کا وعدہ موسیٰ

سے کیا گیا تھا اور اس میں ذرا شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں، اس کی صداقت حسب ذیل آیت سے ہوتی ہے۔  
 ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (الاستثنائی، ۸۱: ۸۱)“

یہ دعویٰ تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ہدیٰ للمتقین ہے۔ قرآن حکیم نے اپنی نسبت دوسری جگہ کہا وہ: ہدیٰ للناس ہے، لیکن دراصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں جہاں اس نے کہا وہ: ہدیٰ للناس ہے، تو اس سے یہ مراد ہے کہ اس میں متقی اور غیر متقی دونوں شامل ہیں۔ اس جگہ صرف: ہدیٰ للمتقین کہا، اس نے غیر متقی کو اس درجہ حقیر و ذلیل خیال کیا کہ اس کا ذکر ہی مناسب نہ سمجھا۔

تقویٰ کے معنی حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

جعل النفس فی وقایة مایخاف، ہر اس چیز سے بچنے کی کوشش کرنا جو اس کے لئے ضرور نقصان کا باعث ہو۔  
 حفظ النفس مایوشم، گناہ کی جانب دعوت دینے والی چیزوں سے پرہیز کرنا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک شخص نے پوچھا تقویٰ کی کیا تعریف ہے؟ انہوں نے کہا، جب تم ایسے راستے سے گزرو جس میں چاروں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیا کرو گے؟ سائل نے جواب دیا کہ اس وقت میری کوشش یہ ہوگی کہ میں ہر ممکن طریق سے اپنے دامن کو کانٹوں میں الجھنے سے بچاؤں اور صحت و سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاؤں۔ فرمایا یہی تقویٰ ہے۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ متقی وہ شخص ہے جو ہر اس چیز سے پرہیز کرے جو اس کے مقصد حیات میں رکاوٹ پیدا کرے، ہر تکلیف و مصیبت پر غالب آئے اور راہ آزادی کی تمام الجھنوں اور دلربائیوں سے دامن کو پاک رکھتا ہو منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف اسی کو متقی کہا جاسکتا ہے جو اپنے مقصد حیات پر مر مٹے۔

بہر حال ان تمام تصریحات نے بتادیا کہ اس کتاب میں ایسی ہدایتیں اور بصیرتیں موجود ہیں جن پر عمل کرنے سے متقی تیار ہوتے ہیں اور کوئی شخص متقی نہیں بن سکتا، جب تک وہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔

فارسی میں کہتے ہیں ”ایں دایہ شیردہ ایں جوان است“ ظاہر ہے کہ جوانی کے عالم میں دودھ پلانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عہد طفولیت میں دودھ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوی و طاقتور بن گیا۔ چونکہ اس کی جوانی اور توانائی شمرہ ہے اس دودھ کا اس لئے کہا گیا کہ: شیدہ جوان است۔ ٹھیک اسی طرح قرآن نے کہا کہ: ذلک الكتاب ہدیٰ للمتقین اس کتاب کی ہدایت سے متقین تیار ہوتے ہیں، قرآن کا ایک حصہ مکہ میں نازل ہو چکا ہے، اس پر عمل کر کے بہت سے لوگ ارباب صلاح و تقویٰ کے پاک و مز کی گروہ میں داخل ہو چکے ہیں، اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ: ذلک الكتاب ہدیٰ للمتقین۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں شخص طبیب اور معالج ہے تو دیکھو اس کے مریضوں کی کیا کیفیت ہے اور اس کے بیمار کس قدر شفا یاب ہوتے ہیں۔ اسی اصول پر مذہب اور صحائف و اسفار آسمانی کی



حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر ایک کتاب کی تعلیم بہترین انسان بنا دیتی ہے تو یقین کیجئے کہ وہ منزل من اللہ ہے ورنہ تحریف و تبدیل نے اس کے اثر کو زائل کر دیا ہے۔

یہودیوں کے پاس موسیٰ کی کتاب ہے جس کی نسبت قرآن بھی ہدیٰ و نور کے الفاظ استعمال کرتا ہے، وہ لوگ تورات کو کتاب الہی مانتے ہیں، وحی والہام کے سلسلہ کو تسلیم کرتے ہیں، جن اصولوں پر وہ اپنی کتاب کو وحی الہی ثابت کرتے ہیں وہی قرآن کے متعلق استعمال کر کے دیکھ لیں اور پھر بتائیں کہ اس وقت کس کتاب کو زیادہ حق حاصل ہے کتاب الہی ہونے کا، تورات کو یا قرآن کو۔

تمہارا دعویٰ ہے کہ تورات نے متقین کی ایک جماعت تیار کی، قرآن بھی اپنے ارباب تقویٰ و طہارت کو پیش کرتا ہے، دونوں کا باہمی مقابلہ کرو اور انصاف و حق پرستی کو پیش نظر رکھ کر بتاؤ کہ کونسی تعلیم زیادہ موثر، نتیجہ خیز اور مشرب رکت ہے۔ چنانچہ اگلی دو آیتوں میں ان متقین کو پیش کیا جاتا ہے جو قرآن کی تعلیم سے تیار ہوئے، پھر ان کا مقابلہ ہو گا ان لوگوں سے جو توراۃ کی تعلیم کا بہترین نمونہ تھے۔

### ارباب تقویٰ

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۱﴾

”جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔“

### ایمان بالغیب

جس چیز کا ہمارے ظاہری اور باطنی حواس اور اک نہیں کر سکتے، وہ غیب ہے۔ ارباب تقویٰ کی اولین خصوصیت یہ بتائی کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر وہ ہر اس چیز کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، جس کو انہوں نے کسی طریق پر بھی محسوس نہ کیا ہو، حضرت ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہما سے یہ جملہ بار بار نقل کیا جاتا ہے کہ: لو كشف الغطاء ما زدت يقيناً، اگر درمیانی حجاب اٹھا دیئے جائیں تو ہمارے یقین و اذعان میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہو گا۔ رسول کا کہنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا دونوں برابر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی اور قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت نے ایسے ارباب طہارت پیدا کر دیئے جن کا طغرائے امتیاز یہی تھا کہ وہ بغیر کسی دلیل و حجت کے رسول کے آگے جھک گئے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء سے توراۃ لے کر آتے ہیں، بنی اسرائیل کو اس پر ایمان لانے کو کہتے ہیں۔ لیکن وہ جواب دیتے ہیں کہ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهَنَّمَ (۵۵:۲) جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے نہیں۔

## اقامت صلوٰۃ

لغوی طور پر صلوٰۃ کا لفظ دعا اور رحمت کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن قرآن حکیم میں نے اس کو ایک اصطلاحی معنی کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے طرز عمل سے اس کی تفسیر بیان کر دی ہے اور اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نماز کو ادا کریں، فرائض و واجبات، سنن و مستحب کا خیال ہو۔ اوقات کی پابندی ہو اور تعدیل ارکان پیش نظر رہے۔

جس وقت سورۃ ہمز مل نازل ہوئی اور قم الدلیل الاقلیلاً کا حکم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس میں صرف رسول اللہ ہی مخاطب تھے، لیکن صحابہ بھی آپ کے شریک ہوئے۔ تمام شب اللہ کے حضور میں کھڑے رہتے اور ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں تھوڑا وقت صرف کرنے پر عتاب نازل نہ ہو۔ یہ اس وقت کی حالت ہے جبکہ پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں۔ جس وقت ان نمازوں کا حکم ہوا تو صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ کان میں پڑے اور سب کچھ چھوڑ کر فوراً مسجد میں آگئے۔ انہیں کے بارے میں کہا گیا: رَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ (۳۷: ۲۳) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام سنتے ہیں تو اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑی چیز بھی ان کو اپنی دلفریبیوں اور محبوبیتوں کا شیفہ نہیں بنا سکتی۔

پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جب وہ نماز پڑھے تو یہ سمجھ لے کہ جس طرح میں اس وقت حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ سنتے ہی مسجد میں آگیا ہوں، ایسے ہی جب کبھی اسلام کو میری زندگی کی ضرورت ہو، تو میں فوراً اپنے آپ کو پیش کر دوں اور کوئی چیز بھی میرے لئے رکاوٹ کا باعث نہ بن جائے۔ سوتے وقت ہر مسلمان اپنے ایمان و اسلام کو دیکھے کہ اللہ کے ساتھ میں نے جو عہد باندھا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی تو نہیں پیدا ہو گئی اور کیا میں اس کے نام پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ہر شخص خود اپنا محتسب بن جائے اور قبل اسکے دوسرے لوگ اس پر حرف گیری کریں وہ خود ہی عیوب کو دیکھے اور اصلاح کرے“، بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا: ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (۵۵: ۲) سجدہ کر کے دروازہ میں داخل ہو، وہ اس پر عمل تو کیا کرتے، الناس کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا اور سریں کے بل رینگتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ فشتان بینہما۔

## انفاق فی سبیل اللہ

متقین کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ خواہ روپیہ ہو، ان کے قوائے عملیہ ہوں اور خواہ ان کی جان ہو، وہ سب کچھ حق و حریت کے لئے قربان کر دیتے ہیں، صحابہ کی جانی اور مالی قربانیوں سے تاریخ کے

اور اوراق بھرے ہوئے ہیں اور کسی مزید ثبوت کے محتاج نہیں، لیکن مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کافی ہو گا۔ جانی قربانی کے بارے میں بخاری کی حسب ذیل روایت ملاحظہ ہو۔

قال المقداد يومئذ يا رسول الله انالانقول لك كما قالت بنو اسرائيل لموسى فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون، ولكن امض و نحن معك (بخاری کتاب التفسیر)

معرکہ بدر میں مقداد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ انہوں نے موسیٰ سے یہ کہہ دیا۔ اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون بلکہ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ مالی قربانی کی کیفیت یہ ہے کہ جنگ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے، ابو بکر جاتے ہیں اور سب کچھ لا کر نذر رسالت کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ گھر میں بچوں کے لئے کیا رکھا، جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول۔ ان کے مقابلہ میں یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان سے بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہتے ہیں تو ان کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے: فَاهْزَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿۲۴﴾ (۵: ۲۴) تم جاؤ اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ جب کبھی ان سے روپیہ مانگا جاتا ہے تو کہتے: يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ﴿۵﴾ (۵: ۶۴) خدا کا ہاتھ تنگ ہے۔

انصار

یہاں تک مہاجرین کا تذکرہ تھا، جو سر زمین مکہ میں تعلیم قرآن سے تیار ہوئے، اب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے جو مدین میں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۵﴾

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترنا تجھ پر اور جو کچھ اترنا تجھ سے پہلے اور وہ آخرت کو یقین جانتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبائل آباد تھے، بنو نضیر، بنو قریظ بنو قینقاع۔ انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ یہودیوں اور انصاریوں کی باہمی جنگ رہتی، جب کبھی یہودیوں کو ناکامی ہوتی تو وہ کہا کرتے کہ نبی آخر الزماں کے ساتھ مل کر ہم تم کو فنا کر دیں گے، علاوہ ازیں انہوں نے مدینہ اور اس کے اطراف میں اپنی تعلیم گاہیں جاری کر رکھی تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے۔ انصار کے لڑکے ان کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے اور ان کے عقائد وغیرہ سے واقف ہوتے، اس لئے جس وقت حضور اقدس ﷺ کا ظہور ہوا یہ لوگ جو درجہ اسلام میں داخل ہونے لگے، ان میں عبد اللہ بن سلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کی حسب ذیل خصوصیات اس آیت میں بیان کی گئیں۔

(الف) قرآن حکیم پر ان کا ایمان ہے۔

(ب) اس سے ما قبل کے تمام صحائف و اسفار آسمانی کے قائل ہیں۔

(ج) جزائے اعمال کا بھی انہیں یقین ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾

انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی مراد کو پہنچے۔

مہاجرین و انصار کے یہی دو گروہ ہیں جو راہ حق پر قائم ہیں اور دنیا میں خلافت کبریٰ سے سرفراز ہوں گے، چنانچہ دنیا اس کا تجربہ کر چکی ہے۔

کفار

ہر جدید تحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(الف) اس تحریک کے حامیان کار ہوں۔

(ب) سخت مخالف ہوں۔

(ج) جن کے تعلقات دونوں کے ساتھ ہوں۔

پہلی تین آیتوں میں ارباب صلاح و تقویٰ کا ذکر کیا، اب کفار و مخالفین کا تذکرہ آتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

وہ جو منکر ہوئے برابر ہے ان کو تو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے۔

حَتَّمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۖ ﴿٧﴾

مہر کر دی اللہ نے ان کے دل پر اور ان کے کان اور ان کی آنکھوں پر ہے پردہ اور ان کو بڑی مار ہے۔

فطرت انسانی کے متعلق مذاہب مختلفہ

اب تک فطرت انسانی کے بارے میں دنیا کے خیالات حسب ذیل رہے ہیں:

(الف) انسان کی فطرت میں بدی ہی بدی ہے۔ ماہر کی تربیت اسکو عارضی طور پر خوش نما کر دیتی ہے۔ وہ خصائص

فطرت کے اعتبار سے بالکل حیوان ہے، لیکن تربیت پذیری کے لحاظ سے اس پر فوقیت رکھتا ہے، درخت کی شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر درست کر لیتے ہیں۔ (Diogenes) دیوجانس کلبی اس فلسفہ اخلاق کا مشہور پیشوا گذرا ہے۔

(ب) اس کی فطرت بالکل سادہ ہے، اس میں نہ نیکی ہے نہ بدی۔ وہ محض ایک منفعل، اثر پذیر اور نقش انگیز وجود

ہے، وہ ایک دامن ہے جس کے اندر گنجائش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر اس کو پتھر ملا ہے تو اس کو بھر لیگا، پھول ملے ہیں تو ان کو اٹھا لیگا۔ حکماء یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے، معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی، آج یورپ میں بھی حکماء اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے۔

(ج) نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں، بالقوہ وہ شیطان اور فرشتہ دونوں ہے، دنیا میں آکر جس قسم کے خارجی اثرات ملتے ہیں انہی کے مطابق اس کی کوئی ایک قوت نشوونما پاتی اور بروز کرتی ہے۔ اگر نیکی کے اثرات ملے تو قوت ملکوتی ابھرے گی اور چمکے گی، لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گرد و غبار چھا جائے گا تو نیکی کی چمک ماند پڑ جائے گی اور بدی کی تاریکی پھیل جائے گی۔ دنیا کے قدیم و جدید دوروں میں اس مذہب نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ تقریباً تمام حکمائے اسلام اسکے قائل ہیں۔ ابن مسکویہ اسی کا داعی ہے۔ دور جدید کے حکمائے اخلاق نے اسی کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ فخر الدین رازی نے وہدیناۃ النجدین اور فالہمہا فجورہا و تقوہا کی اس مذہب کی بنا پر تفسیر کی ہے۔

### قرآن کا فیصلہ

لیکن قرآن نے ان سب سے الگ اپنی راہ نکالی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان خالص و کامل نیکی ہے، اس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس قدر بھی برائی ہے، وہ اس کا کسب خارجی ہے۔ نیکی اس کا فطری عمل اور بدی غیر فطری، خارجی اور غیر صناعی ہے۔ اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت ہے اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے۔ قرآن اسی کو فطرت صالحہ، دین الہی، دین قیم، دین حنفی، صراط مستقیم، فطرت اللہ، صلبۃ اللہ اور اسلام کہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت، اسلام ہے اور کفر ایک صناعی اور غیر فطری عمل۔ اگر ایک انسان مسلم ہے تو اس کو یوں کہو کہ وہ اپنی اصلی فطرت صالحہ پر قائم ہے۔ اسکی فطری روشنی نور دے رہی ہے، لیکن اگر ایک انسان مسلم نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا چراغ بجھ گیا۔ اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا، گرد و غبار کی تعافت نے اس کو سیاہ کر دیا اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ، غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جبکہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی۔ ختم اللہ علی قلوبہم و علی سماعہم و علی ابصارہم غشاوة اور سو اعلیہم ائذرتہم امر لم تنذرہم لایؤمنون وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری درجہ ضلالت کی طرف اشارہ ہے اور لہم قلوب لا یفقیہون بہا، (الایتۃ) اولئک کالانعام بل ہم اضل اور جعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقیہوۃ میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کر دیا گیا ہے۔

یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواۃ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اپنی اصل اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے اب باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہہ بالا کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہودیت کے اثرات اس پر غالب آگئے تو یہودیت کا جھوٹا اس کے چراغ فطرت کو گل کر دے گا، اگر نصرانیت یا مجوسیت کا طوفان اٹھا تو اسی میں اس کی کشتی فطرت ڈگر گانے لگے گی۔

جب خدا نے ذریت انسان سے پوچھا: الست بربکم، کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں، تو اس نے تصدیق کی اور بلیٰ کہا، اب اگر تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں ہے، ایک غیر فطری صنایع ہے۔ اسی فطرۃ صالحہ کا نام قلب سلیم ہے اذ جاءه رب بقلب سلیم جبکہ ابراہیم اللہ کے حضور میں فطرۃ صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اس کی فطرت کو باہر کا کوئی بڑے سے بڑا جلوہ بھی مرعوب و ہیبت زدہ نہ کر سکا۔

شرایع الہیہ کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ انسان نے صنایع اور خارجی ضلالت کا جو زنگ فطرۃ صالحہ پر چڑھا لیا ہے اسے دور کر دے اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے۔ اسی لئے ہدایت الہی کو قرآن نے ذکر اور کفر و ضلالت کو نسیان کہا ہے۔ نسیان کی انتہا غفلت ہے۔ اس کو قرآن نے منہائے ضلالت قرار دیا۔ لہم قلوب لا یفقہون بہا (الایتہ) کی یہی تفسیر ہے الذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے کیونکہ فطرۃ صالحہ تو وہ تھی جس نے بلیٰ کہا تھا یعنی خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتہ کا اقرار کیا تھا اب اگر وہ اس ہستی کے رشتہ کو بھلا رہے ہیں جس کے آگے اصلی فطرت بلیٰ کہہ چکی ہے تو اس رشتہ کو نہیں بھلا رہے بلکہ اپنی فطرت اصلی کو بھلا رہے ہیں۔

پس جن لوگوں نے اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر دیا اور اس کی روشنی کو آندھی اور طوفان سے محفوظ نہ رکھا اس پر ظلمت اور تاریکی چھا گئی۔ وہ انسانیت سے نکل کر حیوانوں کے دائرہ میں داخل ہو گیا، اب اس کے لئے نبی کا انداز و عدم انداز برابر ہے، علم و معرفت حاصل کرنے کے تین ہی ذرائع تھے، دل، آنکھ اور کان مگر کفر کی زنگ آلودگی نے اس کے آئینہ کو بالکل سیاہ کر دیا اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہیں رہی۔ اب اس کو جس قدر بھی عذاب دیا جائے کم ہے کہ اس نے اپنی تصدیق کو بھلا دیا، جو اس کے اندر ودیعت کی گئی تھی۔

منافقین

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ①

اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں، ہم یقین لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور ان کو یقین نہیں۔

بنی اسرائیل، جن کو اس سورۃ میں مخاطب کیا گیا ہے، کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے لوگ ہیں جو تمام اعمال مذہبی کے پابند ہیں، مگر ان کی اخلاقی حالت میں کسی قسم کی اصلاح نہیں پیدا ہوئی، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن کی تعلیم ہی محل بحث و نظر ہے۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے اور اس جماعت کے سرار و محجوبات کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔

منافقت کے اقسام حسب ذیل ہیں۔

(الف) ہر ایمان کا اظہار ہو، لیکن حقیقت میں وہ تمام ضروریات ملی کا منکر اور تعلیم الہیہ کا اشد شدید دشمن ہو۔

(ب) ظاہر و باطن، دونوں اعتبار سے تذبذب اور اضطراب ہو۔

(ج) فسق و فجور کی کثرت اور عدوان و ضلالت کا اثر اس درجہ غالب آگیا ہو کہ دنیا کو دین پر انفراد کو اجتماع پر اور کفر کو اسلام پر ترجیح دے۔

اگر ان مراتب سے گانہ کو پیش نظر رکھا جائے تو کتاب و سنت کے تمام مقامات حل ہو جائیں گے اور کسی آیت اور حدیث میں اختلاف معلوم نہ ہو گا۔ حدیث میں منافق کی علامتیں مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ہر بات جھوٹ کہے۔

(۲) ہمیشہ بد عہدی کرے۔

(۳) خائن اور بے ایمان ہو۔

(۴) جھگڑے کے وقت گالیوں پر اتر آئے۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل مدینہ میں عبد اللہ ابی بن سلول ایک بااثر شخص تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ تشریف لے آئے، شہر کی تمام جماعتوں نے مل کر یہ طے کر لیا کہ آپ ہی ان کے تمام مناقشات و منازعات کا فیصلہ کریں۔ عبد اللہ کے لئے اب اس وقت اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنی کمزوری کو محسوس کر کے خاموشی اختیار کرے۔ مخالفت کرنے کی طاقت نہ تھی، اس نے بھی اسلام کا اظہار کر دیا اور مسلمانوں کے ساتھ مل گیا، لیکن دراصل اس کی یہی کوشش رہی کہ بن پڑے تو مسلمانوں کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی وجہ سے تعلیم قرآن پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶

”و غابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے، اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں بوجھتے۔“

اسلام کے دو درجے ہیں۔

(الف) اعمال کے ساتھ اخلاق کی تہذیب و شائستگی کا بھی خیال ہو تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ عزت ملے گی۔

(ب) ظاہری اعمال کی پابندی پر زور دیا جائے اور اصلاح اخلاق سے آنکھیں بالکل بند کر لی جائیں، ممکن ہے بعض اسباب کی بنا پر دنیا میں ان لوگوں کو عزت و کرامت نصیب ہو، لیکن مرنے کے بعد تو قطعاً محروم رہیں گے۔

ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ محاسن اعمال و فضائل اخلاق کی طرف تو توجہ نہیں کرتے اور اس پر امید رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد نجات کے مستحق ہوں گے، گویا اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کیونکہ نتائج اعمال تو وہی دے گا۔ دنیا میں اس امر کی انہیں آرزو ہے کہ مسلمان ان کا اکرام و احترام کریں اور اس طرح مسلمانوں کو بھی خدع و فریب میں رکھنا چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ خود ہی دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ اپنی فطرت صالحہ کو فراموش کر چکے ہیں اور یہی فتہائے ضلالت ہے کہ تنزل کو ترقی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠﴾ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿٩﴾

”ان کے دل میں آزار ہے پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار اور ان کو دکھ کی مار ہے اس پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔“  
آپ کو معلوم ہے کہ عبد اللہ بن ابی کی رسم تاجپوشی ادا ہونے والی تھی کہ رسول اللہ کی تشریف آوری سے رک گئی، اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا مگر اس خیال سے کہ یہ لوگ گھربار چھوڑ کر فقر و فاقہ کی حالت میں یہاں آئے ہیں، خود ہی فنا ہو جائیں گے، خاموش رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جہانداری کے لئے چند اخلاق فاضلہ ضروری ہیں، منافقین کی حالت یہ ہے کہ خصائص حکومت تو اپنے اندر پیدا نہیں کرتے اور خواہش جہانداری کو ترقی دے رہے ہیں۔

مسلمان اگرچہ مفلس و نادار ہیں لیکن انہیں اپنی اصلاح کا خیال ہے اور برابر اس فکر میں ہیں، جب یہ لوگ حکومت کے قابل ہو جائیں گے تو فوراً خلافت ارضی ان کے سپرد کر دی جائے گی۔ اس وقت منافقین کو بے انتہا تکلیف ہوگی اور دیکھیں گے کہ جس حقیقت کا ہم انکار کرتے تھے وہ صادق ہو کر رہی اور ہم اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔

وَإِذْ أَقْبَلُ لَهُمْ لَاتُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۖ قَالُوا أَتُتْبَعُونَ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

”اور جب کہتے ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو سنو ارنہ۔ سن رکھو وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں سمجھتے۔“

### اصلاح و افساد

دنیا میں اصلاح و افساد، باہم مخلوط ہیں۔ نور و ظلمت دست و گریباں ہیں۔ خیر و شر ہم آغوش ہیں اور ایک دوسرے کو مستلزم۔ جس چیز کو ایک اصلاح کہتا ہے دوسرا اسی کو افساد کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس لئے آتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ مظلم سے نجات دلوائیں، لیکن فرعون اسی کو افساد کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ باوجود اس اختلاط و التباس کے ان دونوں میں ایک حد فاصل بھی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی رو سے اس کی حقیقت کو متیقن کر دیں۔ قرآن نے اس کے لئے حسب ذیل عنوانات قائم کئے ہیں۔

(الف) جزئیات اصلاح و افساد اور ان کے آثار و علامات کی تعین و تشخیص۔ قرآن حکیم نے نہایت تفصیل سے ان جزئیات کو بیان کیا ہے، ہم اختصار کی خاطر صرف چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) چور چوری کرتا ہے، ایک کا گھر برباد ہوتا ہے لیکن خود چور کا گھر آباد ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ افساد بھی ایک دوسری صورت میں اصلاح ہے۔ بالین ہمہ اس کو ہر شخص افساد کہتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر جب مصر میں پیمانہ کی چوری کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿١٢﴾ (۴۳)

خدا کی قسم تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس لئے یہاں نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں۔

(۲) ایک شخص اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے اور محدود چوری کی جگہ ڈاکے ڈالتا ہے، اس سے اگرچہ لٹنے والوں کی



بستی بالکل لٹ جاتی ہے مگر لوٹنے والوں کا گھر، مال و دولت کی کان بھی بن جاتا ہے، ایک شخص غیر فطری طریقوں سے لذت نفسانی حاصل کرتا ہے اور اس کو اپنے نفس کی بھلائی اسی میں نظر آتی ہے، وہ اس کو فلسفہ عیش و امید کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیسا مفسدانہ فلسفہ ہے جو حفظ صحت کو، نسل کو، مال و دولت کو اور انسان کے قواعد طبعی کو یکسر برباد کر دے۔

اِنَّكُمْ لَتَنَاقُتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقَاطَعُونَ السَّبِيلَ وَ تَأْتُونَ فِي نَادِيَكُمُ الْمُنَکَّرَ (۲۹: ۲۹)

تم فعل خلاف و ضح فطری کرتے ہو، ڈاکہ ڈالتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بد اخلاقیوں کے کام کرتے ہو۔ انہی نتائج مہلک کے لحاظ سے ایک پیغمبر خدا نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا۔

رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۰﴾ (۲۹: ۳۰)

خدا یا مجھ کو مفسد لوگوں پر نصرت عطا کر۔

(۳) ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے، اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے، اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے، اس کی اخلاقی طاقت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل یک قلم سرچشمہ قساد ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں، اور اس کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی ہوں۔ پس جو شخص اس حکومت کے برخلاف جہاد کرتا ہے، وہ اس کو مفسد قرار دیتی ہے، لیکن تم کو معلوم ہے کہ خدا اس کو کیا کہتا ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيْعًا يَسْتَفْعِفُ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يُدَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَ يَسْتَعْمِي نِسَاءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۸﴾ (۲۸: ۳)

”فرعون نے مصر میں سرکشی کا بڑا ہی سراٹھایا تھا، اس نے رعایا کو کمزور کرنے کے لئے گروہ در گروہ کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان کے بچوں کو ذبح کرتا ان کی عورتوں کو بے عصمتی کے لئے چھوڑ دیتا، بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔“

ان کے علاوہ اور بے شمار جزئیات ہیں۔ قرآن حکیم نے مفسدین کی کوئی خاص دنیوی علامت نہیں بتائی جو ان کے اعمال کی عکسی تصویر ہو، بلکہ وہ صرف اپنے اعمال ہی سے شناخت کئے جاسکتے ہیں۔ فساد، دراصل عدم محض و تیرگی خالص کا نام ہے اور تاریکی میں صرف تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ اب اصلاح کی بعض امثلہ و نظائر ملاحظہ ہوں:-

(۱) ارباب اصلاح جو کام کرتے ہیں صرف اپنے نور ایمان کی ہدایت سے کرتے ہیں، ان کو ترغیبات کی ضرورت نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿١٠: ٩﴾  
 “جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور صالح اعمال اختیار کئے، تو اللہ ان کے ایمان کی روشنی کو ان کے لئے شمع ہدایت بنادیتا ہے ان کے لئے نعمتوں کی جنت ہے اور اس کی نہروں کی روانی کا نظارہ۔”

(۲) مصلحین میں ہمیشہ باہم محبت دیگا لگی ہوتی ہے، باہمی پھوٹ اور نفاق صاحب اصلاح گروہ میں نہیں ہو سکتا۔  
 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ﴿١٩: ٩٦﴾

“جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، سو قریب ہے کہ خدائے رحمن ان کے لئے محبت کا دروازہ کھول دیگا۔”  
 (۳) عمل صالح انسان کے دل کو سنوراتا ہے اس لئے پچھلے گناہوں کا جو داغ دل میں ہوتا ہے، اس کو بھی مٹا دیتا ہے۔  
 وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿٢٤: ٢﴾

“اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا اور قرآن حکیم پر یقین کیا جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لئے پیام حق ہے، سو وہ یقین کریں کہ ان کے تمام گناہ جھڑ گئے اور ان کے دل کو سنوار دیا گیا۔”

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ اعمال صالحہ کی حالت اعمال مفسدہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ زندگی اور طاقت و صحت ہیں، اس لئے زندگی ہی کے نتائج کا ان سے ظہور ہوتا ہے۔ وہ روشنی ہیں، اس لئے روشنی ہی کے تمام آثار و علامت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

(ب) اصلاح و افساد یا خیر و شر دنیا میں مخلوط اور بالکل ملے جلے ہیں لیکن اصلاح، افساد پر اور خیر، شر پر کماؤ کیفا غالب ہے۔ یعنی بلحاظ حقیقت کے بھی، بلحاظ وجود کے بھی اور بلحاظ نتائج کے بھی۔

مفسدین و مصلحین کی صفیں تمہارے سامنے ہیں، تم نے اصلاح کو افساد سے، نور کو ظلمت سے، پھول کو کانٹوں سے الگ کر کے دیکھ لیا۔ لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ کاغذ کے صفحات پر تو ان کو الگ کیا جاسکتا ہے۔ سطح زمین پر ان کی بزم آرائی نہیں ہو سکتی، فرشتوں نے خلقت آدم پر اعتراض کیا اور بظاہر آدم نے جنت ہی میں ان کے اعتراض کی تصدیق بھی کر دی، لیکن تم کو صرف آدم کے عمل ہی کو نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ اس کے دقیق نتائج پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے، آدم نے غلطی کی اور خود اپنا بنا بنا یا گھر اجاڑا، لیکن تم نے دیکھا کہ اس افساد نے کیا اصلاح کی۔ اس تخریب نے کیا تعمیر کی۔ بغور دیکھو! اس تخریب نے ایک عالم کھڑا کر دیا، جس میں آدم کی اولاد چلتی پھرتی نظر آتی ہے، اس لئے آدم کا یہ گناہ فرشتوں کے اعتراض کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ یہ اس کا عملی جواب ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ فساد سے دنیا برباد ہو جائے گی۔ خدا نے ان کو دکھادیا کہ اصلاح و افساد لازم ملزوم ہیں۔ اس لئے اگر ایک گھر برباد ہو گا تو دوسرا آباد بھی ہو جائے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مادہ عالم کی ترکیب میں دونوں اجزاء برابر کی نسبت رکھتے ہیں یا ان میں کوئی جز غالب بھی ہے، خدا

کا فیض عام جواب دیتا ہے کہ:

”سبقت رحمتی علی غضبی“

”میری رحمت میرے غصہ پر سبقت لے گئی ہے۔“

اس لئے خیر شر پر، اصلاح افساد پر غالب ہے۔ خدا نے فرشتوں کو یہی جواب دیا ہے۔ فرشتوں کو حضرت آدم کے دامن پر صرف ایک فساد کا دھبہ نظر آیا تھا، جس کو خون کے چھینٹوں نے اور رنگین و نمایاں کر دیا تھا، لیکن خدا نے کہا کہ ایک دھبہ ہزاروں نقش و نگار کے پردوں میں چھپ جاسکتا ہے۔

پس جس طرح مقدار و کمیت کے لحاظ سے خیر شر پر غالب ہے، اسی طرح کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ شر و فساد سے زیادہ لطیف، نرم، رقیق اور تربیت پذیر ہے۔ شر و فساد ایک کونکہ ہے جو پھونکنے کے بعد بھڑکتا ہے لیکن خیر و اصلاح کی برق جو دفعتاً روشن ہو جاتی ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهُ ۝ (۹۱: ۹۰)

”وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا اور وہ ناکامیاب رہا جس نے اس کو دفن کر دیا۔“

اصلاح اصل فطرت صالحہ ہے اور افساد خارجی ضلالت کا نتیجہ۔ پس ضرورت صرف تزکیہ و تربیت کی ہے تاکہ زنگ دور ہو جائے اور آئینہ چمک اٹھے، اس تربیت و تزکیہ کے بعد اس کا قوام اس قدر لطیف ہو جاتا ہے کہ۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يَبُوعُ ۖ وَلَوْ كَمْ تَبْسُتُهَا كَادُ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ (۲۴: ۳۵)

”قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگائی جائے۔ روشنی پر روشنی ہے، خدا اپنی روشنی کی طرف جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔“

(ج) ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہے، جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہے۔

”جس وقت اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کو پیدا کیا اسی وقت سے حد بھی قائم کر دی۔ آدم کو یہ حد بتائی گئی تھی۔“

وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذِهِ السَّبْجَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (۲: ۳۳)

اور اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا تاکہ زیادتی و انحراف کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔  
لیکن چونکہ یہ حد محسوس نہ تھی اس لئے شریعت نے اس کے امتیاز کا ذریعہ صرف ذوق صحیح کو قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”الاثم ملحاك في نفسك“

”گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے۔“

اور یہ ذوقی شہادت فطرتی چیز ہے۔ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اسی کا نام

نور ایمان اور یہی خیر و شر کی حد فاصل قائم کر سکتا ہے۔

(د) اصلاح و فساد کا توازن طبعی، صرف دین الہی کے ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے، دنیا میں ہزاروں سیارات گردش کر رہے ہیں، ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے کی حد میں قدم رکھے، لیکن فطرت ان کو مضبوطی میں جکڑ دیتی ہے۔ قدرت الہی ان کو کشش باہمی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتی۔ اس لئے سب اپنے اپنے طور پر ایک نہایت منظم، نہایت باقاعدہ اور نہایت مرتب گردش کر رہے ہیں۔

انسان کا، اس کے اعمال کا اور اس کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہتے ہیں، اس لئے وحی الہی مذہب کی سنہری زنجیر سے ان کی مطلق العنانیوں کو جکڑ دیتی ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا (۳: ۹۸)

”سب کے سب خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، کہ ایک دوسرے پر تعدی نہ کرنے پائے اور دنیا کی میزان عدل کا پلہ برابر رہے۔“

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷: ۲۵)

”ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل حقہ و براہین واضحہ کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارنا کہ عدل و توازن قائم رہے۔“

(ه) لیکن اس توازن کے قائم رکھنے کے لئے جزئیات عمل میں مصالح عامہ کا لحاظ ضروری ہے۔

انسان کے جذبات، فطرت کے دوسرے قوائے طبعیہ سے زیادہ ذکی الحس، زود اثر اور سرلیج الاشتغال ہیں، اس لئے وہ باوجود اس جذب و کشش کے باہم ٹکرانا چاہتے ہیں، پس۔

وَلَوْ أَنَّبَغَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۖ (۲۳: ۷۱)

”اگر حق بھی ان کا اتباع کرتا تو زمین و آسمان اور ان کے رہنے والے برباد ہو جاتے۔“

دنیا کو اس تباہی سے بچانے کے لئے اس کو بجز واکراہ ایک مرکز پر لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی فطری ضرورت جہاد، قصاص اور تغیر و عقوبت کی سنگ بنیاد ہے۔

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)

”اور ہم نے لوہا اتارا کہ اس میں سلطان و نفوذ کی بڑی خوفناکی ہے اور لوگوں کے لئے فوائد بھی ہیں۔“

قرآن حکیم نے جابجا اسی توازن طبعی کے ذریعہ قیام امن و سلام عام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۖ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢﴾ (۲: ۲۵۱)

”اور اگر خدا بعض آدمیوں کے ظلم و زیادتی کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا، تو زمین تباہ ہو جاتی۔ لیکن خدا تو دنیا پر احسان

کرنے والا ہے۔”

اس منطقیانہ ترتیب سے جو اوپر گزر چکی ہے، دو باتیں خود بخود بطور نتیجہ کے ثابت ہوتی ہیں اور ان پر کسی مزید دلیل و برہان کی ضرورت نہیں رہتی۔

- (۱) اعمال صالحہ کی ایک محدود زندگی ہے اور وہ جسمانیات کی طرح صحت و مرض، یعنی اصلاح و فساد سے گھری ہے۔
  - (۲) جمہوریت صالحہ اور اجتماعی قوت عادلہ اس کو امراض سے محفوظ رکھتی ہے اور اصلاح کو ترقی دیتی ہے۔
- چونکہ قرآن حکیم کی تفسیر میں اصلاح و فساد ایک اہم و اقدم باب تھا، اس لئے ہم نے تفصیل سے کام لیا کہ تمام مراتب کا کشف و ظہور ہو جائے۔ اب آپ اس آیت کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لیجئے جو اس بحث کے آغاز میں تحریر ہوئی ہے۔ ان منافقین کی کوشش یہ ہے کہ حق دہ کر رہے اور کفر کو غلبہ و اقتدار نصیب ہو، اس لئے وہ مفسد ہیں۔
- جرم کا اقرار**

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ امْنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا أَنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

”اور جب کہئے ان کو ایمان میں آؤ، جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ، کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے یہو قوف، سنتا ہے وہی ہیں یہو قوف پر نہیں جانتے۔“

سفہت کہتے ہیں کو تاہ عقلی اور ناعاقبت اندیشی کو، منافقین اپنے آپ کو ارباب فہم و فراست خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو یہو قوف کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسلام کی خاطر اپنے وطن و دیار کو، عزیز و اقارب کو اور مال و جائداد کو قربان کر دیا۔ یا حقیقت میں یہو قوف وہ شخص ہے جو علم کی پرواہ نہیں کرتا، اخلاق کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور فضائل و محاسن کے کسب و حصول کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور یقیناً ہر سلیم الفطرۃ انسان اس کی تصدیق کرے گا۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۖ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزَؤُونَ ۗ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

”اور جب ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہتے ہیں ایمان لائے ہم اور جب اکیلے ہوتے ہیں طرف اپنے سرداروں کے، کہتے ہیں تحقیق ہم تمہارے ساتھ ہیں، سوائے اس کے نہیں کہ ہم ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بچ سرکشی ان کی کے، بیکتے ہیں۔“

یہ لوگ خود اپنی زبان سے اس امر کا اقرار کر رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجالس میں صرف استہزاء و تمسخر کی غرض سے جاتے ہیں ورنہ دراصل ان کو تلاش و جستجوئے حق نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے ہی ساتھ ہنسی کرتے ہیں اور اپنے نفسوں کی صلاحیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ دونوں جگہ عزت کے آرزو مند ہیں مگر جلد ہی ان کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہو جاتی ہے اور پھر چاروں طرف سے ذلت و رسوائی نصیب ہوتی ہے۔

شیاطین سے مراد ان کے سردار اور روسائے کفر و ضلالت ہیں۔

یہاں تک منافقین کی چند اصولی غلط کاریاں صاف کر دی گئیں۔

(۱) ان کے ظاہر و باطن میں اختلاف شدید ہوتا ہے۔

(۲) خدع و فریب ان کی عادت ہے۔

(۳) جاہ طلبی ان کی غایت الغایات ہے۔

(۴) مسلمانوں کی نسبت انہیں پورا یقین ہے کہ قرآن کے پابند رہ کر کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

(۵) فرزند ان اسلام کو غیروں کا غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۶) فساد پھیلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(۷) مسلمانوں کو ناعاقبت اندیش اور کوتاہ بین خیال کرتے ہیں۔

(۸) جانی و مالی قربانی سے گریز کرتے ہیں۔

(۹) تعلیم الہی کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں۔

## امثال قرآنی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰةَ بِالْهٰذِي ۖ فَمَا رِيحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ⑤

یہی لوگ ہیں جنہوں نے مولیٰ گرہی بدلے ہدایت کے، پس نہ فائدہ پایا سوداگری ان کی نے اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔  
قرآن حکیم کا درس و فکر ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے اعلیٰ ترین مطالب و مقاصد کے اظہار کے لئے امثلہ و نظائر پیش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بہت بڑا حصہ انہی تمثیلات پر مشتمل ہے۔ کہیں ہواؤں کی تصریف ہے، بادلوں کا انبساط ہے، زمین کی نشوونما ہے، لیل و نہار کا اختلاف ہے۔ موجودات و مخلوقات کے مختلف اشکال و الوان ہیں، کو اکب و سیارات اور نجوم و ثوابت کے طلوع و غروب ہیں۔ انقلابات طبعیہ کے مناظر جمیلہ ہیں۔ رعد و برق کے دہشت انگیز اور خوف دلانے والے نظارے ہیں۔ بیع و شراء اور خرید و فروخت کی منازعات و منافشات ہیں اور ان میں وہ تمام اسرار و معارف بیان کئے گئے ہیں جو فہم انسانی کا منتہائے اور اک ہیں۔ وَ لَقَدْ فَتَرْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ⑥ (۳۹: ۲۷)

ان امثال و نظائر کے بیان کرنے سے قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی قلبی و روحی حیات و ممت، اقوام و ملل کے انقلابات، ملکوں اور حکومتوں کے تسلط و تنزع اور ہدایت الہی اور شقاوت انسانی کے مختلف مدارج و مراتب سامنے آجائیں: وما یعقلہا الا العالمون۔

مجملہ ان امثال قرآنیہ کے بیع شر کی ایک لطیف و بدیع اور جامع و مانع تمثیل ہے، جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا

ہے۔ ایک شخص بازار جاتا ہے کہ کچھ خرید کرے، اس کی انتہائی سعی و کوشش یہی ہوگی کہ بہتر سے بہتر چیز خریدے، کبھی اس کو اپنا نقصان گوارہ نہ ہوگا، مگر ان لوگوں کی حماقت و نادانی ملاحظہ ہو کہ ہدایت دے کر گمراہی اور ضلالت خرید رہے ہیں۔ پس یہ تجارت کہاں نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے اور یہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

## دو قسم کے لوگ

منافقین کے مختلف اقسام ہیں، کچھ تو اس درجہ اسلام کے دشمن ہیں کہ ان سے کبھی نیکی کی توقع ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ہمیشہ اسلام کی تباہی و بربادی کی تجاویز سوچتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے لوگ اپنی طبعی کمزوری سے مجبور ہیں، ہر اثر کو قبول کر لیتے ہیں، ہر صحبت و ہم نشینی ان پر غالب آ جاتی ہے اور ہر زبردست شخصیت ان کو اپنے قابو میں لا سکتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ قرآن جس طرح پہلی جماعت کی پروا نہیں کرتا تو دوسری طرف سے بھی آنکھیں بند کر لے، اور ان کی ہدایت و راہ نمائی کی کوئی سبیل تجویز نہ کرے۔

اگلی آیتوں میں دو قسم کی مثالیں بیان کی گئی ہیں، عام مفسرین کا خیال ہے کہ ان مثالوں سے ایک ہی طرح کے لوگ مراد ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برخلاف ہے، دو الگ الگ گروہ ہیں اور دونوں کے خصائص و امتیازات کو واضح کیا جا رہا ہے۔ ایک کی شقاوت قلبی اور جو دو کفر و روشن کیا ہے تو دوسرے کی کمزوری و ناتوانی کو بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ اگر پہلی جماعت سے اعتنا نہ کیا جائے تو دوسرے گروہ کو وقف فراموشی نہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے دوسرا طائفہ ترہیب و ترغیب کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

اس قدر تمہید کے بعد آپ آیات مندرجہ ذیل میں غور و فکر کیجئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَاتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ اٍتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۷۷﴾  
صُمْ بِكُمْ عَنْهُمْ لَا يَنْزِعُ عَنْهُمْ ۖ ﴿۷۸﴾

”مثال ان کی جیسے مثال اس شخص کی ہے جو جلانے آگ، پس جب روشن کیا جو کچھ گردا سکے تھالے گیا اللہ روشنی انکی اور چھوڑ دیا انکو بیچ اندھیروں کے، نہیں دیکھتے بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ نہیں پھر آتے۔“

ان دونوں آیتوں میں منافقین کی اس جماعت کو بیان کیا گیا ہے جو ایمان لے آئے۔ اسے اسلام کی حقیقت و حقانیت کا یقین ہو گیا، لیکن جس وقت آگے چل کر اس کے مصالح خصوصی و ذاتی اغراض کا مفاد اسلام و منافع اجتماعیت کے ساتھ تصادم ہوا تو فوراً ایمان و اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھی اور یوں اپنی تمام قوتوں کو برباد کر دیا۔ پس ان کی آنکھوں، انکے کانوں اور ان کی زبانوں کا بیکار ہو جانا نتیجہ ہے ان کی بد اعمالی کا اور ان کے راہ حق کو ترک کر دینے کا، جس کو وہ صحیح یقین کر چکے تھے۔

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٌ وَّ رَعْدٌ وَ يَرْقَىٰ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اِذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ

وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٥﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْهُوٌّ فِيهِ ۖ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۖ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَبْعِهِمْ وَأَبْصَارَهُمْ ۖ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾

”یا جیسے مینہ برستا ہے آسمان سے، اس میں ہیں اندھیرے اور گرج اور بجلی، ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو، قریب ہے بجلی کہ اچک لے انکی آنکھیں جس بار چمکتی ہے ان پر چلتے ہیں اسمیں اور جب اندھیرا پڑا کھڑے رہے اور اگر چاہے اللہ بجائے لٹکے کان اور آنکھیں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں جو اپنی کمزوری، طبیعت کی وجہ سے ان مصیبتوں کا نشانہ بن رہے ہیں، ان لوگوں کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو شب کے وقت کہیں جا رہا ہو، رعد و برق کے خوف سے اپنی جان بچانے کی فکر میں ہو، اسلام تو قبول کر لیا، مگر اب یہاں مشکلات کا سامنا ہے۔ عزیز و قریب، وطن و یار، مال و جائیداد سے علیحدگی ہے۔ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے سربکف پھرنا ہے، منہیات شرعیہ سے اجتناب ہے۔ یہ قربانیاں ان کو تکلیفوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں، یہ چونکہ طبیعت کے کمزور ہیں، اس لئے ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر اب بھی اپنے کانوں اور آنکھوں سے کام نہ لینگے تو ان پر عالم ممات طاری کر دیا جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مثال سے منافقین کی حقیقت اصل یہ ہے کہ ان کی عام طور پر یہی کیفیت ہوتی ہے۔ مذہب بین بین ذلک لالی ہولاعولالی ہولاع کی پوری تصویر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں سے تعلقات قائم رہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ دوستی ہے تو کفر سے بھی رشتہ انخوت نہ ٹوٹنے پائے، حق کی تائید ہے تو باطل بھی قائم و دائم رہے، نور سے استفادہ ہو رہا ہے تو ظلمت و تاریکی بھی کوئی بری چیز نہیں پھر کیوں اس سے مفت میں بیر مول لیا جائے۔

منافقین کا پہلا گروہ توازن فرق تابع قدم اسلام کا اشد شدید دشمن ہے، اس سے کسی خیر و صلاحیت کی توقع ہی رکھنی فضول ہے، البتہ دوسری قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ انکی رکاوٹوں کو دور کیا جائے، رشد و ہدایت ان کے سامنے ہو، ممکن ہے ترغیب و ترہیب سے وہ اپنے اندر عبرت و موعظہ پیدا کریں اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں، اس لئے اگلی آیات میں ان کی جانب توجہ کی جاتی ہے اور تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ ان کے لئے تنبیہ و اعتبار کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔

### دعوة الی التوحید

گزشتہ آیات میں تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، آخر میں منافقین کے متعلق بحث تھی کہ یہ دو قسم کے ہیں۔ کچھ تو اس درجہ اشد شدید دشمن اسلام ہیں کہ ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی بے سود اور لا حاصل ہے۔ البتہ دوسری جماعت بھی ہے جو اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے۔ ہر صحبت اور سوسائٹی اسے اپنے اندر جذب کر لے گی۔ اسی آخری گروہ کی نسبت کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اپنے ظاہری و باطنی حواس سے کام نہ لیا تو آخر کار کچھ مدت کے



بعد ان پر قحط و بیکاری چھا جائے گی اور پھر ان سے کام نہ لیا جاسکے گا۔ اگلی آیتوں میں اسی جماعت کو توحید کی جانب دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے کہ شاید ان سے تذکیر و موعظت پیدا ہو اور وہ اپنی اصلاح و تہذیب کی طرف توجہ کرے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا إِلَهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢﴾

”اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو اور تم سے اگلوں کو شاید تم پر ہیز گاری پکڑو، جس نے بنادیا تمہارے لئے زمین کو بچھو نا اور آسمان کو عمارت اور اتار آسمان سے پانی پھر نکالا اس سے میوہ کھانا تمہارا سونہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو۔“

قرآن حکیم کا درس و فکر ہمیں بتاتا ہے کہ مخالفین و معاندین کو راہ حق پر لانے کے لئے تین قسم کی تذکیر و موعظت سے کام لیا جاتا ہے۔

(الف) تذکیر بالآلہ، اپنی نعمتیں یاد دلا کر عبرت و بصیرت پیدا کرنا مثلاً ﴿فَإِذْ كُنَّا لِلَّهِ عَدُوًّا قَدَرْنَا لَكُنَّا الْكَاذِبِينَ﴾ ﴿١٣: ٦٤﴾

(ب) تذکیر بایام اللہ، گذشتہ اقوام و امم کے عروج و تسفل کی تاریخ اور اس سے استنباط نتائج و غیرہ مثلاً۔ ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾ ﴿١٣: ٥﴾

(ج) تذکیر بمابعد الموت، مرنے کے بعد اعمال انسانی کے نتائج بیان کر کے نیکی کا شوق دلانا مثلاً ﴿يَعْلَمُ إِذَا بُعِثَ رَافٍ إِلَى الْقَبُورِ ۚ وَحِصْلَ مَا فِي الْقُبُورِ﴾ ﴿١٠٠: ٩، ١٠﴾ ان آیات میں تذکیر بالآلہ سے کام لیا گیا ہے، تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات صالحہ کی اصل و اساس توحید باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ حَقَّقًا﴾ ﴿٩٨: ٥﴾ زندگی کے جس قدر مراتب مختلفہ ہیں، سب خدائے واحد کے قبضہ میں ہیں۔ موت حیات کا وہی مالک ہے، وہی بادلوں سے پانی برساتا ہے اور وہی حیات انسانی کے بقا و قیام کے تمام ضروری سامان پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ کس قدر کوتاہ بینی اور جہل و ضلالت ہے کہ غلامی کرتے وقت ہم کسی اور کو بھی اس کا شریک بنالیں خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں، رسوم و عوائد ہوں، نسلی روایات و عقائد مالوفہ ہوں اور خواہ وہ سلاطین جابرہ ہوں غرض کہ ہر وہ چیز جس کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ عملاً یا اعتقاداً دیا جائے سب اس میں داخل ہیں۔

سورہ یوسف میں اسی طرف اشارہ کیا۔ ﴿أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خِيفَ أَخِي ۖ أَلَا إِلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۚ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَتَيَبِيضُ مِنْهَا أُنْثَىٰ ۖ وَابْنُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ ۚ أَمَرَ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِلَاهًا﴾ ﴿١٢: ٣٩، ٤٠﴾ حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی۔ ﴿يُنَىٰ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ ﴿٣١: ١٢﴾

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٠﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَأْزَنُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٩١﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلًّا زُرِعُوا مِنْهَا مِنْ شَعِيرَةٍ رِزْقًا ۚ قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۚ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۚ وَلَهُمْ فِيهَا أَنْدَادٌ مُطَهَّرَةٌ ۚ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٩٢﴾

”اور اگر تم ہو شک میں اس کلام کے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی اور بلاؤ اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو، پھر اگر نہ کرو، اور البتہ نہ کرو گے، پس جو آگ سے، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار ہے منکروں کے واسطے اور خوش خبری دے ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے ہیں باغ بہشتی، ان کے نیچے ندیاں ہیں جس بار طے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ وہی ہے جو ملتا تھا ہم کو آگے، اور ان کے پاس وہ آئے گا ایک طرح کا اور ان کے لئے ہیں وہاں عورتیں پاکیزہ اور انہیں وہاں ہمیشہ رہنا ہے۔“

قرآن حکیم نے مخالفین اسلام سے بار بار اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ان میں اگر اس کتاب عزیز کے مقابلہ کی طاقت ہے تو اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے اس کے مثل لکھنے کی کوشش کریں۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٩٠﴾ (۱۷: ۹۰)

”کہو کہ اگر آدمی اور جنات جمع ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا اور کلام بنالائیں تاہم اس جیسا نہیں بنا لائے، اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک کیوں نہ ہو۔“

ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا:

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ ۚ وَادْعُوا مَنِ اسْتَلْطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١﴾ (۱۶: ۱۱)

”کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی اسی طرح کی بنائی ہوئی زیادہ نہیں تو دس ہی سورتیں لے آؤ اور خدا کے سوا جس کو مدد کے لئے تم سے بلاتے بن پڑے بلاؤ۔“

پھر ان الفاظ میں مطالبہ کیا:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ ۚ وَادْعُوا مَنِ اسْتَلْطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۰﴾ (۳۹: ۱۰)

”کیا یہ لوگ قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کو خود پیغمبر نے بنالیا ہے تو ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی ایسی ہی ایک سورۃ بنالادو اور خدا کے سوا جس کو تم سے بلاتے بن پڑے بلاؤ۔“

چنانچہ آیت زیر بحث میں بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ ایک سورۃ بنا کر لے آؤ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جواب کس اعتبار سے مانگا جا رہا ہے؟ عام مفسرین کی رائے ہے کہ فصاحت و بلاغت میں مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ

مسلمان تو ایک طرف خود معاندین اسلام بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی فصیح و بلیغ عبارت پیش کرنا غیر ممکن اور انسانی طاقت سے باہر ہے، جب خود اہل زبان اس کی مثل لانے سے عاجز ہوں تو دوسروں کی حقیقت ہی کیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنی نسبت کہا کہ وہ ہدیٰ للناس ہے، نور ہے، بصائر ہے، اس کا روئے سخن عالمگیر ہے، وہ تمام اقوام و امم عالم میں وحدت و جمعیت پیدا کرنے آیا ہے، اس کا مقصد اصلی ایک امة صالحہ اور مدینہ فاضلہ کا بقا و قیام ہے، وہ تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ اور خلافت کبریٰ کی تعلیم دینے آیا ہے۔ یہ اسی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس نے عرب کو ایک زندہ قوم بنادیا جس نے زنا کاری، شراب خوری، قمار بازی اور صدا جرائم کو آن واحد میں سر زمین عرب سے حرف غلط کی طرح محو و باطل کر دیا۔ جس نے عرب کے جنگلوں اور وحشیوں کو خدا کا مقدس دست عمل بنادیا، جو قیصر و کسریٰ کے خزائن کے مالک بنا دیے گئے اور یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور محیر العقول انقلاب عظیم صرف تیس سال کے قلیل ترین زمانہ میں ہوا۔ کیا دنیا کی تاریخ ہمیں کوئی ایسی نظیر بتا سکتی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ریفارمر اور مصلح کو ایسی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی ہو۔

یہ حقائق ثابتہ ہیں جو تاریخ کے اوراق میں اب تک اپنی تابناکی و درخشندگی سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں، یہ واقعات ہیں جن کو انسان اگر بھول جائیں تو ممکن ہے مگر نہ تو آسمان پر چمکنے والے ستارے فراموش کر سکتے ہیں اور نہ زمین کے رہینگے والے جانور اور سمندروں اور دریاؤں کی تیرنے والی مچھلیاں ان کو بھلا سکتی ہیں۔

جو کچھ اوپر مذکور ہوا یہ قرآن حکیم کا اثر تھا، پس اگر مخالفین اسلام میں ہمت ہے تو وہ کوشش کر کے دیکھیں، اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے ایسا قانون مرتب کر کے لائیں اور اگر تمام دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے تو پھر قرین عقل و انصاف یہی ہے کہ اسی کتاب عزیز کے آگے سر نیاز جھکا دیں اور اپنی گردنیں خم کر کے بغیر کسی قسم کے بحث و مذاکرہ کے اس کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کر لیں ورنہ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بد اخلاقی و بد کرداری کے عواقب المیہ سے انہیں کوئی نجات نہ دلا سکے گا۔

البتہ جو لوگ اس قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے، سب سے پہلے ان کے اعمال صالحہ کی جزا اسی دنیا میں انہیں ملے گی۔ بہشت زرار رضی کے مالک بنا دیئے جائیں گے اور خلافت و نیابت الہی کے مستحق قرار پائیں گے، یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ نیک کاموں کا بدلہ دنیا میں نہیں ملتا، بلکہ اس کی اولین قسط اسی جگہ سے شروع ہوتی ہے۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے پھر حقیقی ثمرات و نتائج مرنے کے بعد ظہور پذیر ہوں گے جن کی نسبت قرآن نے کہا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾

کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کے نیک عملوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پردہ غیب

میں موجود ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

مَا لَعَيْنَ رَأَتْ وَلَا اَذْنَ سَمِعَتْ وَلَا خَطَلَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرًا۔

نہ تو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسانی دل و دماغ میں ان کا خیال گذرا۔

اس آیت میں بھی جنت کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان میں نہریں بہتی ہوں گی جن کی وجہ سے ان میں شادابی اور تروتازگی ہمیشہ رہے گی۔ کھانے کو مختلف قسم کے پھل ملیں گے جو اگرچہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں، مگر کھاتے وقت معلوم ہو گا کہ ہر ایک کا مزہ اور ذائقہ جداگانہ ہے پھر پاکیزہ اور طاہر بیباں ہوں گی اور سب سے آخر میں یہ کہ اس زندگی میں دوام اور خلود ہو گا؛ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔

نکتہ چینی

انسانی تہ دو سرکشی نے بہت کم مجز و انکساری کا اظہار کیا ہے، بلکہ اپنے ظہور و شہود کے لئے دوسری راہیں نکال لیتی ہے، جب قرآن حکیم کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس کی تعلیم پر نکتہ چینی شروع کر دی، مکہ مبارکہ میں قرآن کا ایک حصہ نازل ہو چکا تھا، عوام الناس نے خدائے قدوس کو چھوڑ کر احبار اور رہبان کو اربابا من دون اللہ کا درجہ دیدیا تھا، بت پرستی میں سب کے سب مبتلا تھے، ان لوگوں کی جہالت و نادانی واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ إِتَّخَذَتْ بِعَيْنَهَا وَأَنْ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبِيتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٢٩﴾ (۴۱)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کا ساز بنا رکھے ہیں، ان کی مثال مکزی کی سی ہے کہ اس نے گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ گھروں میں بودے سے بودا مکزی کا گھر ہے، اے کاش یہ لوگ اتنی بات سمجھتے۔  
پھر سورہ حج میں کہا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَبْ مَثَلًا فَاسْتَبْعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَفْتِدُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴿٢٢﴾ (۷۳)

”لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اس کو کان لگا کر سنو خدا کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اس کے لئے سب کے سب اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چمڑا نہیں سکتے۔ کیسے بودے یہ بت جو مکھی کے نیچے پڑیں اور اس کو نہ پکڑ سکیں اور کیسی بودی وہ بیچاری مکھی جس کا پیچھا کیا جائے اور پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔“

اس قسم کی آیات سن کر منافقین کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوئے اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس

کتاب میں ایسی حقیر و ذلیل اور مکروہ چیزوں کا ذکر ہو وہ اللہ کی کتاب نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ان چیزوں کا نام لینا اخلاق و مروت کے قانون میں جرم و معصیت ہے۔ کوئی تہذیب یافتہ انسان ان کا ذکر اپنی زبان پر نہ لائیگا، پھر وحی والہام تو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اگلی آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجُ أَنْ يُضْرَبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۙ

اور اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر، پھر جو یقین رکھتے ہیں سومانے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کیا اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض تھی اللہ کو اس مثال سے۔

ہر چیز کا حسن و قبح اس کے نتائج و ثمرات سے تعلق رکھتا ہے۔ درخت اپنے پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے، عاقبت کار ہی نیکی و بدی کا پتہ دیتی ہے، انما الاعمال بالخواص میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ہر صاحب بصیرت کی نظر انجام پر ہوتی ہے، مگر احق اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر ابتدائے کار ہی میں کٹ جتنی شروع کر دیتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بہتر سے بہتر زبان میں آسان سے آسان ترکیبوں اور جملوں کے ذریعہ لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اگر فصاحت و بلاغت کا خیال ہو، مشکل الفاظ، غیر معروف ترکیبیں اور نامانوس طرز بیان اختیار کیا جائے، فلسفہ و منطق کی مدد سے استدلال میں زور پیدا کیا جائے، ہندسہ و نجوم کے لاینحل مسائل سے اور اق کتاب کو زینت دی جائے تو اس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ ایک مخصوص طبقہ تو ضرور ان علمی تحقیقات سے فائدہ اٹھا سکے گا جس کی تعداد بہت ہی کم ہوگی، مگر بیشتر افراد علم کی برکات سے محروم محض رہیں گے۔ آج یورپ کے ماہرین فن تعلیم باوجود اس قدر علم و فضل کے اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ سہل ترین زبان کے ذریعہ تعلیم دینا بے انتہا مفید و نفع بخش ہے۔ چنانچہ اس قاعدہ کے ماتحت جدید مصنفات کا ذخیرہ فراہم کیا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم نے تیرہ صدی پیشتر اس نظریہ کو وضع کیا، اس نے شرک و بت پرستی، اصنام و طواغیت کی غلامی اور دجالہ و شیطانین کی کج نظری کو ایسی عام فہم مثالوں میں واضح کیا کہ سب کے سامنے ان کی حقیقت اصل یہ آگئی اور لاکھوں کروڑوں انسان راہ راست پر آگئے۔ اس نے تہذیب و دانشگاہی، جہانگیری و جہاں داری اور عمران و اجتماع کے مسائل کو قصص و اخبار ماضیہ کی شکل میں پیش کیا کہ خود استنباط نتائج و استخراج عبرت کر لیں۔ پس ایسے امثلہ و نظائر، جو ہزاروں انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کا باعث بن جائیں، اس قابل ہیں کہ ان کا بار بار ذکر کیا جائے اور ان کے ذکر سے زبان کبھی نہ تھکے۔ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر انسانوں کی فلاح و کامرانی ہے پھر وہ کیوں نہ ان چیزوں کا ذکر کرے۔ اس قسم کی مثالوں کے جہاں اور صد ہا فوائد و منافع ہیں، اس کا یہ ایک بین اور لازمی نتیجہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے قلوب غبار شک و اشتباہ سے گرد آلود نہ ہوں، جو اب تک اپنی فطرۃ صالحہ پر قائم ہوں اور جو خارجی اثرات ضلالت سے منفعل اور اثر پذیر نہ ہوئے ہوں۔ وہ ان مثالوں کے سنتے ہی فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ یہ تعلیم بیشک اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ ان کے دل تو پہلے ہی سے مومن تھے مگر اب تک انہیں اظہار کا موقع نہ ملا تھا، اب خود بخود ان کی زبان پر ایسے الفاظ

جاری ہو گئے جن سے ان کا اسلام عالم آشکار ہو گیا۔

مگر جن کے دلوں میں کبھی ہوتی ہے، قلب سلیم کی جگہ زنگ آلود اور سیاہ دل رکھتے ہیں، اعمال فاسقہ کی کثرت اور کفر وجہل کے غلبہ واستیلاء کی بنا پر ان کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہوتی ہیں، روشنی کی جگہ تاریکی، حق کی جگہ باطل اور اسلام کی جگہ کفر کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ جو بد بخت اپنے مصالح خصوصی کی بنا پر اپنے کفر و نفاق کو چھپائے پھرتے تھے اور مسلمانوں کے مجامع میں اسلام پرستی کا اظہار کرتے تھے، ایسی مثالوں کے سنتے ہی کہتے ہیں کہ بھلا ان مثالوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان سے تو اور زیادہ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی، وہ بظاہر اپنی دینی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی منافقت اپنا ظہور کرتی ہے کہ فرزند ان اسلام ان کی چالبازیوں میں نہ آئیں، اور آئندہ کے لئے ان سے احتراز و اجتناب کریں۔

يُفْضِلُ بِهِ كَثِيرًا ۖ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُفْضِلُ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٥﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ وِثَاقِهِۦ ۖ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٦﴾

”گمراہ کرتا ہے اس سے بہتیرے اور راہ پر لاتا ہے اس سے بہتیرے اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے علم ہیں، جو توڑتے ہیں۔ اقرار اللہ کا مضبوط کئے پیچھے اور توڑتے ہیں جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنا اور فساد کرتے ہیں ملک میں انہیں کو آیا نقصان۔“

اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی مثالوں سے بہت سے لوگوں کی گمراہی کا اظہار ہوتا ہے اور بہتوں کی ہدایت ظاہر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدائے قدوس نیکی اور طہارت کا سرچشمہ ہے تو وہ کیسے دوسروں کو گمراہ کرے گا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بندوں کے واسطے کفر و ضلالت کو پسند نہیں کر سکتا۔ وَلَا يَهْدِيْ لِعِبَادَةٍ الْكَفْرِ ؕ (۳۹:۷) پس اس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی ضلالت اور گمراہی کا اظہار ہوتا ہے اور گمراہ بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں حسب ذیل امراض ہوں۔

### (الف) ایمانی کمزوری

ایک شخص جب دوسروں کے لئے قانون بنائیگا تو ان کی سہولت و آسانی کی پرواہ نہ کرے گا، مگر جب اپنی نوبت آئے گی تو ہر قسم کی سہولتیں تلاش کرے گا۔ لیکن اس کا ایمان اس درجہ کمزور ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر سہل و آسان تر قانون ہونے کے وہ پھر بھی اس کا پابند نہیں رہ سکتا اور نقض عہد کا مرتکب ہوتا ہے۔

### (ب) ضعف طبیعت

فطرت انسانی اس بات کی مقتضی کہ خاندانی تعلقات قائم رہیں صلہ رحمی کی جائے اور قرابت داری کے جو روابط ہیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ منافق کی فطرت اس درجہ کمزور ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھی پورا نہیں کر سکتا، گھر والوں میں جھگڑا اور فساد ڈالتا ہے اور خاندانوں میں جنگ و جدل برپا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

## (ج) کوتاہ عقلی

فتنہ و فساد کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے کہ اس میں ضیاع مال و دولت کے علاوہ زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، مگر اس کی سعی و کوشش ہی یہی رہتی ہے کہ حق و صداقت کو فنا کرے اور کفر و بطالت اس کی جگہ لے۔ یہی وہ بد طینت اور بد اخلاق ہیں جو اس تعلیم صحیح سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ناکام اور خاسر رہیں گے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ؕ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَبِيْعًا ۚ ثُمَّ اَسْتَوٰى اِلَى السَّبْعِ اَفْسُوْلَهُنَّ سَبْعَ سَبُوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٨٦﴾

تم کس طرح منکر ہو اللہ سے، اور تھے تم مردے، پھر اس نے تم کو جلادی، پھر تم کو مارتا ہے پھر جلادے گا پھر اسی کے پاس لٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا ان کو سات آسمان اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

جس کار ساز قدرت کے قبضہ میں زندگی اور موت اور اس کے تمام اسباب و مراتب ہوں اس سے انحراف و بغاوت کی کوئی صورت نہیں، بلکہ طوعاً و کرہاً اسی چوکھٹ پر اپنا سر نیاز جھکانا پڑے گا۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَفَغَيَّرِ دِيْنَ اللّٰهِ يَتَّبِعُونَ وَلَوْ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾ (۸۳)

”کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش میں ہیں، حالانکہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں چار و ناچار اسی کے حکم بردار ہیں اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔“

پھر ایک جگہ یوں ارشاد کیا:

يَتَّبِعُ الْجِنَّ وَّ الْاِنْسَ اِنْ اَسْتَعْطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَّ الْاَرْضِ فَاَنْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٥٥﴾ (۵۵: ۵۳)

”اے گروہ جن و انسان! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے ہو کر کہیں کو نکل بھاگو تو نکل دیکھو، مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو۔“

پس ہر فرزند آدم کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ رب الارباب کے آگے اپنی گردن خم کر دے اور اسکے تشریفی و تکوینی قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے۔

اگر ہم انسان کی تحلیل و تفرید کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو چیزوں سے ترکیب دیا گیا ہے۔ (۱) جسم (۲) روح اور ان دونوں کا اثر اک کا نام انسان ہے۔ جسم کی کثافت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسکے مالوفات و مطلوبات اور ہوں اور روح کے دواعی اور، اس لئے کہ یہ یکسر نورانیت اور لطافت ہے پس اسکی طلب و جستجو بھی اس سے جدا گانہ ہونی چاہئے، جب اللہ تعالیٰ نے جسم اور روح کو پیدا کیا تو ان کی تربیت اور تکمیل بھی وہی کرے گا۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿٩٢﴾ (۹۲: ۱۲) میں اسی طرف



اشارہ ہے۔ چنانچہ جسمانی ضرورتوں کیلئے اس نے کرہ ارضی کی تخلیق کی اور روحانیت کے لئے آسمان بنایا، زمین و آسمان دونوں مل کر ہماری تمام روحانی و جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ سورہ تغابن میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوْرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۶۴﴾ (۳:۶۴)

“عین ضرورت کے مطابق اس نے روحانیت و مادیات کے دو مخزن بنائے پھر ان سے فائدہ اٹھانے کے بہتر سے بہتر اسباب و وسائل بہم پہنچائے اور ہر چیز کا محل استعمال، قوی و اسباب کے لحاظ سے نتائج کا آخری فیصلہ خدا ہی پر ہو سکتا ہے دوسری تمام قوتیں وہاں بیکار ہیں۔”

جب ہماری موت و حیات اور ان کے تمام درمیانی مراحل وابستہ ہیں اسی یگانہ و تہوار کے ساتھ، پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون سے اپنے آپ کو آزاد کر لیں، بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اس کی پابندی کرنی پڑے گی۔ گزشتہ تین رکوع میں اس مسئلہ کو واضح کر دیا گیا کہ ہر انسان کو قانون الہی تسلیم کرنا ضروری ہے اور اس سے مفرکی کوئی صورت نہیں۔ آئندہ حضرت آدم کا قصہ بیان کیا جائے گا تاکہ اس مثال سے اور زیادہ وضاحت ہو اور کسی قسم کا شک و اشتباہ باقی نہ رہے۔ اس قصہ کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقات قائم کرنا وحی الہی کی پابندی اور مذہب کا اتباع انسان کا فطری جذبہ ہے، مذہب کی پیروی صرف اس لئے کرائی جاتی ہے کہ اس کے جذبات فطرت کی تکمیل و تربیت ہو، وہ حقائق و معارف جو ذاتی تجربہ کی بناء پر انسان کو صدیوں کے بعد معلوم ہوتے، وحی الہی کی معرفت چند لمحوں کے اندر جان لے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہوتا ہے، کوئی نہیں جو اس کا علاج و مداوا کرے، طبی امداد و اعانت کی کوئی صورت نہیں، خود اس کی طبیعت علاج کرتی ہے اور ایک مدت کے بعد اس کا زخم مندمل ہونے لگتا ہے تا آنکہ وہ بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ اگر زخم لگتے ہی اسے ڈاکٹر کی دوا میسر آجاتی تو اسے اتنی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑتی اور قلیل ترین زمانہ میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا اور یقیناً اس کا ہر رگ و پے ڈاکٹر کا شکر گزار ہوتا کہ اتنی مصیبت سے نجات بخش دی۔

یہی حال مذہب اور انبیاء و رسل کا ہے، انسان کی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ وابستہ رہے، اگر اسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا تو مدت ہائے دراز کے بعد تکمیل ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رافت و رحمت سے کام لے کر اس دشوار گزار راستہ کو نہایت ہی مختصر کر دیا اور انبیائے کرام کے ذریعہ اس کی تمام مشکلات آسان کر دیں۔ چنانچہ قصہ آدم سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

گزشتہ رکوع کی آخری آیت میں فرمایا تھا کہ۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جَبِيْنًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ (۲۹:۲) زمین و آسمان کی تخلیق کیوں عمل میں آئی اور ان کو کس غرض کے لئے پیدا کیا گیا؟ قصہ آدم ان تمام باتوں پر روشنی ڈالے گا اور ان تمام کا حاصل یہ ہو گا کہ سب سے باغی ہو کر صرف ایک کے وفادار بن جائیں۔ اسی کا عشق دامن گیر ہو اور اسی کی محبت و شیفنگی میں مجنوں و ارباب دیہ پیائی ہو۔



آدم علیہ السلام

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٥﴾

”اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب بولے کیا تو رکھے گا اس میں وہ شخص جو فساد کرے وہاں، اور کرے خون، اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔“

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی کہ میں اس زمین میں اپنا ایک نائب بھیجنا چاہتا ہوں، جو نوع انسانی کی سعادت و ہدایت کے لئے خاص ذمہ دار حکومت قائم کرے، میری عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور، طغیان و سرکشی اور ضلالت و گمراہی سے میری زمین پاک ہو، میرا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک قائم ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو اور کدہ ارضی سعادت و امنیت کی ایک بہشت زار بن جائے۔

آدم مختلف عناصر و اجزائے ارضی سے ترکیب دیئے گئے تھے، ضرور یہ تھا کہ آگے چل کر ان کی اولاد میں ان گونا گوں اجزائے ترکیبی کے اثرات و نتائج کا ظہور و برذر ہو، قبائے آدم خون کے چھینٹوں سے رنگین نظر آئی، اس لئے فرشتوں نے محض اظہار حقیقت کی غرض سے کہا کہ اس کی اولاد سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے، انہیں آدم کے کمالات اور محاسن و فضائل کی اطلاع نہ تھی، اس لئے حق بجانب تھے، لیکن واقفیت ہونے پر انہیں اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا پڑا۔

فرشتے ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں، وہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا کی ذات ناقص و دو نام سے پاک و صاف ہے، مگر ساتھ ہی اس کے جب یہ دیکھتے ہیں کہ اولاد آدم خون کی ندیاں بہا دیگی اور قتل و غارت گری کی مرتکب ہو گی تو جہاں وہ آدم کے متعلق اپنے شبہات پیش کرتے ہیں، اسی کے ساتھ اس سے بھی غافل نہیں کہ اس کی پیدائش میں کوئی حکمت مضمر ہے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ ان کو یہی جواب دیا گیا کہ تخلیق آدم کی غرض و غایت سے ہم واقف ہیں اور تھوڑے سے انتظار کے بعد تم بھی جان لو گے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَقْبِلُوا بِأَسْمَاءِ هٰٓؤُلَاءِ إِن كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿٣٦﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا بِهٰذَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿٣٧﴾ قَالَ يٰٓآدَمُ أَقْبِلْ بِأَسْمَائِهِمْ ۚ فَلَمَّا أَتٰهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۚ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاعْلَمُوا مَا تُنٰدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٣٨﴾

اور سکھائے آدم کو نام سارے پھر وہ دکھائے فرشتوں کو، کہا بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو، بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو نہیں معلوم مگر جتنا تو ہی اصل دانا پنختہ کار، کہا اے آدم بتا دے ان کو نام ان کے، پھر جب اس نے

بتا دیے نام ان کے، کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو۔

چونکہ آدم کو خلافت ارضی اور نیابت الہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس لئے اسکو وہ تمام علوم و معارف سکھائے گئے، جو قانون عدل کے قیام و نفاذ، ضلالت و طغیان کے رفع و انسداد اور سعادت و امنیت عالم کے لئے ضروری و ناگزیر تھے۔ ہر چیز کی حقیقت و ماہیت، اس سے جلب منافع اور دفع مضرات کے تمام طرق کی تعلیم دی اور اس قدر قابلیت و استعداد پیدا کر دی کہ تمام اشیاء کے استعمال کے اسباب و ذرائع اور ان کے انتہائی ثمرات و نتائج معلوم کرنے کی ضرورت و احتیاج خود بخود اس کے مشکلات و موانع کو دور کر دیگی، اگر ایک شخص بھوک کی شدت سے تڑپ رہا ہے اور اتفاق سے اس نے انگور کا باغ دیکھ لیا تو خود بخود اس کے لئے راستہ تلاش کر لے گا۔

ملائکہ الرحمن کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ وہ تمام حوائج نفسانی سے پاک ہیں۔ کھانے پینے کی انہیں ضرورت نہیں، وہ فرمان الہی کے تابع ہیں اور ان کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ۔ لَا يَصْنَعُونَ اللَّهُ مَا آفَكُهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ پھر ان سے یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ زمین کی چیزوں کے خواص و امتیازات سے واقف ہوں گے، مگر چونکہ انہوں نے خلق آدم پر اپنا شبہ ظاہر کیا تھا اس لئے ان کے اطمینان کی خاطر اور رفع اشتباہ کے واسطے ان سے کہا گیا کہ ان اشیاء کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالو، وہ فوراً سمجھ گئے اور اپنی لاعلمی کے معترف ہوئے اور مان گئے کہ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة، تو ہی ان اسرار و مصالح سے واقف ہے جو وجود آدم میں پنہاں ہیں، ہم میں یہ استعداد ہی نہیں کہ ان چیزوں کے متعلق کچھ لب کشائی کر سکیں۔

آدم کو ان میں سے ہر ایک چیز سے کام لینا تھا، اس لئے انہوں نے سب کچھ بتا دیا، اور واضح کر دیا کہ اللہ کی زمین میں نظم و نسق قائم کرنے اور اس کو الصراط المستقیم پر لانے کے لئے جس قدر عقل و دانائی، فہم و فراست اور علم و دانشمندی کی ضرورت ہے، ملائ سافل کے فرشتے اس سے یکسر محروم ہیں۔ اس فضیلت علمی کے ظاہر ہونے پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں خوب جانتا تھا کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں کس غرض کے لئے پیدا کی گئیں ہیں، کون ان سے کام لے سکتا ہے، اور یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ تمہاری موجودہ استعداد کتنی ہے اور آئندہ چل کر تم میں کہاں تک ترقی ہو سکتی ہے، پس ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر آدم کی تخلیق عمل میں آئی۔

فرشتوں کا سجدہ

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبٰلِیْسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۝۱۶ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۶﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے قبول نہ کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں سے۔ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ آدم کی پیدائش اس لئے عمل میں آئی کہ وہ دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے قیام کا باعث بنے، اس کی وجہ سے عادل و منصف حکومت قائم ہو، زمین امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے، انسانوں کی گمراہیاں اور

ضلالتیں دور ہوں، لوگ تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کی جانب متوجہ ہوں اور کرہ ارضی کی ہر چیز سے بہرہ اندوز ہوں۔ پس جب آدم کی تخلیق اس لئے ہوئی تو ضروری تھا کہ تمام فرشتوں کو اس کا مطیع و فرماں بردار بنادیا جاتا، اس کے احکام و اودا مر کے آگے ان کی گردنیں جھک جاتیں تاکہ وہ قلوب بنی آدم میں نیکی اور طہارت کی تحریک کریں، وحی الہی کو لبیک کہنے اور انبیاء و رسل کی تعلیم کے آگے سر نیاز خم کرنے کے لئے ان کو تیار کریں، اس طرح آدم کی راہ میں جو مشکلات و موانع ہوں ان کے دور کرنے میں اس کے معین و مددگار بنیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اطاعت آدم کا حکم دیا، انہیں اب کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ تھی۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلے باید ازوے رخ متاب

اس کی فضیلت علمی کا اقرار وہ پہلے کر چکے ہیں، اس حکم کے سنتے ہی ان کی گردنیں آدم کے آگے جھک گئیں اور گویا زبان حال سے اس امر کا عہد و میثاق کیا کہ وہ کبھی اس سے منحرف نہ ہوں گے اور ہمیشہ اس کے تابع فرمان رہیں گے۔ ابلیس نے آدم کی اطاعت و انقیاد سے صاف انکار کر دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ فرشتہ تھا، لیکن قرآن حکیم صاف اعلان کرتا ہے کہ اس کو فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ۔ **كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ** (۵۰: ۱۸) وہ جنات کے گردہ سے تھا۔ دوسری جگہ آیا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَبِينًا قَائِمًا لِّلْجَبَلِ لَئِيْلَآءٍ اِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُوْنَ ﴿٥٠﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيْنَا مِنْ دُوْنِهِمْ  
بَلْ كَانُوا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اِنتُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ (۴۱، ۴۰)

“اور جب کہ خدا سب لوگوں کو جمع کئے پیچھے فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ آدم زاد تمہاری ہی پرستش کیا کرتے تھے، وہ عرض کریں گے کہ خدا یا تو پاک ہے، ہم کو تجھ سے سروکار ہے نہ ان سے، ہماری نہیں بلکہ یہ لوگ شیاطین کی پرستش کیا کرتے تھے اکثر ان میں انہیں کی معتقدہ تھے۔ پھر ایک جگہ کہا:

اَفَتَتَّخِذُوْنَ ذُرِّيَّتَهُ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِیْ (۵۰: ۱۸)

“تو لوگو! کیا ہم کو چھوڑ کر ابلیس کو اور اس کی نسل کو اپنا دوست بناتے ہو۔”

حالانکہ فرشتگان خداوندی کے لئے کسی نے بھی آج تک اولاد ثابت نہیں کی، اولاد ہمیشہ مرد و عورت کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور فرشتے اس سے پاک ہیں، لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا صاف صاف انکار کیا اور فرمایا: **وَجَعَلُوا الْبَلٰیْکَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا** (۴۳: ۱۸) پھر فرشتوں کی خصوصیت کبریٰ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ طہارت و پاکیزگی اور نیکی و معصومیت کے پیکر ہیں: **لَا یَغْضُوْنَ اللّٰهُ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ** (۶۵: ۶) لیکن ابلیس کا جہاں ذکر آیا تہر دو سر کشی اور طغیان و ضلالت کے ساتھ آیا۔ پس یہ بات صاف ہو گئی کہ ابلیس ایک جداگانہ مخلوق ہے جو فرشتوں کی بجز مستقیم مخالف ہے۔ جس کی رگ و پے میں عصیان و عدوان سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس سے

اطاعت و فرماں برداری کی توقع رکھنا بھی فضول ہے، اس لئے جس وقت اس کو سجدہ کے لئے کہا گیا، وہ فوراً بول اٹھا: عَاشَجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ﴿۱۷﴾ (۱۷: ۶۱) دوسری جگہ اور زیادہ تفصیل آئی ہے، جب اس نے سجدہ سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَمْنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۚ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۱۸﴾ (۱۸: ۷۶)

”جب ہم نے تجھ کو حکم دیا تو آدم کے آگے جھکنے سے، تجھ کو کون سی چیز مانع ہوئی؟ وہ بولا میں اس سے بہتر ہوں، کیونکہ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو خاک سے پیدا کیا۔“

گویا انکار کی اصلی وجہ اس کا غرور باطل تھا کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے بہتر خیال کرتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ استکبار کبھی پسند نہیں آسکتا، چنانچہ اس کبر و نخوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لعنت کا طوق ہمیشہ کے لئے اس کی گردن میں ڈالا گیا۔

## آدم کی جنت

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۚ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۰﴾

”اور کہا ہم نے اے آدم! بس تو اور تیری عورت جنت میں رہ اور کھاؤ اس میں محفوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے، پھر تم بے انصاف ہو گے۔“

کتاب و سنت میں بحث و نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا علم بھی موجود ہے جس کی ترکیب جسمانیات سے نہیں ہے، اس کو نہ تواجزائے ارضی سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہاں عناصر کا سلسلہ چل سکتا ہے، وہ یکسر روحانیت ہی ہے، تمام وہ حقائق جو ہمارے روزمرہ کے محاورے میں صرف معانی تک محدود ہیں، اس عالم میں ان کا وجود بھی ہے جو صفات و محضات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بینا انا نائم رایت الناس یعرضون علی، وعلیہم قبص، منها ما یبدخ الشدی، منها ما دون ذلك وعرض علی عربین الخطاب، وعلیہ قبص بجرہ، قالوا فبا اولت ذلك یا رسول اللہ، قال الدین،۔

”خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں مگر کسی کا قمیص تو سینہ تک ہے اور کسی کا اس سے نیچے اتنے میں عمر کی باری آئی تو ان کا قمیص اتنا لمبا تھا کہ پھینچے جا رہے تھے۔ صحابہ نے یہ عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! اس کی تعبیر کیا ہے آپ نے فرمایا: ”دین۔“ دوسرے موقع پر یوں کہا:

سبعت رسول اللہ ﷺ یقول بینا انا نائم اتیت بقدر لبن، فشربت حتی انی لاری الی یخرجنی اظفاری ثم اعطیت فضلی عربین الخطاب، قالوا فبا اولتہ یا رسول اللہ! قال العلم۔

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ میں سو رہا تھا کہ میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے اتنا سیر ہو کر پیا کہ اس کی ترو تازگی میرے ناخنوں سے ظاہر ہونے لگی پھر بقیہ دودھ عمر کے حوالہ کر دیا۔ صحابہ نے عرض کیا

یا رسول اللہ اس کی تاویل کیا ہے؟ فرمایا: علم۔“

عوام الناس کے نزدیک دینداری اور علم و فضل کی حقیقت معانی کی سوا اور کچھ نہیں، مگر اس عالم میں ان کے وجود ہیں، اسی قسم کے اور صدہا احادیث ملیں گی، جن میں اس موضوع پر اور زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے، حکمائے اسلام کی اصطلاح میں اسے عالم مثال کہتے ہیں۔ عالم مثال آثار و علائم اور نتائج و ثمرات کے اعتبار سے عالم اجسام سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی اثر و نفوذ کے لحاظ سے نہایت ہی وسیع ہوتا ہے۔

آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ حقیقی جنت نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ قرآن حکیم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد پھر نکلنا نہ ہو گا، بلکہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

لَا يَسْأَلُهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرِجِينَ ﴿١٥﴾ (۲۸:۱۵)

”ان کو بہشت میں کسی طرح کی تکلیف چھوئے گی بھی تو نہیں اور نہ یہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے۔“

وہم فیہا خالدون بھی اسی کی ایک خصوصیت بیان کی گئی ہے، تو ضرور ہے کہ زمین ہی کا ایک ٹکڑا اس غرض کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، جس میں قوائے مثالیہ کے ذریعہ جنت کے آثار و محضات پیدا کر دیئے گئے ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ آدم خلافت ارضی کے لئے خلق ہوئے تھے، پھر اس حقیقی جنت میں کیسے رہ سکتے تھے، اس جنت ارضی میں بھی انہیں صرف اس لئے عارضی طور پر رکھا گیا تھا کہ ان کی قوتیں نشو و نما حاصل کر لیں اور زمین میں کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کی مثال اس بچہ کی سی ہے جو ابھی ماں کی گود میں ہے، کچھ مدت تک اس کا صرف دودھ پر گزارہ ہے کہ کھانے کی قابلیت اس میں پیدا ہو۔ جس طرح بچہ ہمیشہ کے لئے ماں کا دودھ نہیں پی سکتا، اسی طرح آدم دائمی طور پر اس جنت میں نہیں رہ سکتے، بلکہ جس وقت ان میں محنت و مشقت کی استعداد پیدا ہو جائے گی فوراً وہاں سے نکال دے جائیں گے۔

مگر انہیں ایک درخت کے قریب جانے سے روک دیا گیا، مفسرین کرام نے اس درخت کی حقیقت و ماہیت پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام و کمال و جولانی طبع کے سوا اور کچھ نہیں۔ کتاب و سنت سے اس بات کا پتہ نہیں لگا کہ وہ درخت کونسا تھا، پھر جب ناموس الہی اور لسان نبوت نے خاموشی اختیار کی تو ہمیں فلسفیانہ موٹکافیاں کرنے کا کیا حق حاصل ہے، البتہ اس درخت کی مثال اس کڑوی دوا سے دی جاسکتی ہے جو ماں اپنے پستان پر اس لئے لگا لیتی ہے کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے اور ساتھ ہی اس کی محبت بھی والدین کے ساتھ بدستور قائم رہے۔ والدہ بچہ کو اس کے قریب جانے سے روک دیتی ہے، مگر جب وہ نہیں مانتا اور اسے منہ لگائی دیتا ہے تو آخر اس کا کڑوا پن اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دودھ ترک کر دے۔ یہی کیفیت آدم کے متعلق نظر آتی ہے، انہیں روک دیا جاتا ہے کہ اس کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۚ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ

مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِينٍ ﴿٢٠﴾

”پھر پھسلا دیا ان کو شیطان نے اس سے، پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے تم سب اترو ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک وقت تک۔ آدم ایک مدت تک وہاں رہے تا آنکہ ان کے نکلنے کا زمانہ آگیا، دوسری جگہ آتا ہے کہ:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿٢٠﴾ (۱۱۴:۲۰)

”اور ہم نے اگلے زمانے میں آدم سے درخت کی نہ کھانے کا ایک عہد دیا تھا تو آدم اس کو بھول گئے اور ہم نے ان کے ارادے میں استقلال نہ پایا۔“

درخت کا کھانا تھا کہ جنت ارضی کی تمام نعمتیں یک قلم مفقود ہو گئیں۔ اس کے تمام اثرات و علائم جاتے رہے اور وہ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا رہ گیا۔ جنت کی سر زمین حوائج انسانی سے بالکل پاک ہے۔ سورہ ط میں ہے۔

إِنَّ لَكَ الْآلَاءَ تَجُوعُ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿٢١﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَىٰ ﴿٢٢﴾ (۱۸:۱۹، ۲۰)

”یہاں بہشت میں تو تم کو ایسے مزے ہیں کہ نہ تم بھوکے رہتے ہو اور نہ ننگے رہتے ہو اور نیز یہ کہ یہاں نہ تم پیاسے رہتے ہو اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔“

جس وقت انہوں نے پھل کھایا اور پیشاب پاخانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش کرنے لگے، مگر وہ تو تمام سامان عارضی تھا، اب جبکہ وہ کام کرنے کے قابل ہو گئے تو ان سے سب کچھ چھین لیا گیا۔

فَبَدَّلَ لَهُمَا سِوَاهُمَا وَطَفَقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ ذَرِّ الْجَنَّةِ (۲۰:۱۲۱)

”تو اپنی اپنی پردے کی چیزیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور لگے باغ بہشت کے پتے اپنے اوپر چپکانے۔“

چونکہ یہ پہلے سے طے شدہ بات تھی کہ آدم ہمیشہ کے لئے اس جنت ارضی میں نہیں رہ سکتے۔ شجرہ ممنوعہ کو ان کے اخراج کا ایک سبب قرار دیا گیا، اس لئے اس کے پھل کا کھانا تھا کہ انہیں وہاں سے نکلنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ ”ہبط“ کے لفظ سے بعض ارباب علم کو یہ شبہ ہوا ہے کہ آدم کی جنت ضرور آسمانوں پر ہوگی، کیونکہ ہبوط کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے ہیں۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے لئے یہی لفظ استعمال کیا، اِهْبِطُوا مِصْرًا (۶۱:۲) وہاں سب کا اتفاق ہے کہ اس جگہ نقل مکان کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے۔ تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہونے کو بھی کہتے ہیں۔ پس یہاں بھی ہبوط آدم کے یہی معنی ہیں کہ ان کو جنت ارضی سے نکال کر دوسری زمین میں رہنے کا حکم دیا گیا۔

جنت سے نکلنے کا باعث ابلیس ہوا، اس سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ابلیس کی لعنت کا سبب آدم تھے، اس لئے اب قدرتی طور پر دونوں میں بغض و عداوت کا بیج بویا گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے:

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَذَا عَدُوُّكَ وَلِيزَوْجُكَ فَلَا يَخْرُجْ جَنَّتُكَ ﴿٢٣﴾ (۱۱۷:۲۰)

”تو ہم نے آدم سے کہا کہ آدم! یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بی بی کا دشمن ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا

باہر کرے اور تمہاری شامت آجائے۔

پھر دائمی طور پر فرزند ان آدم کو ان الفاظ میں تنبیہ کر دی۔

يٰۤاٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَكَ اَبُوۡنُكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا ۚ اِنَّهٗ يَرٰكُمۡ ۚ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ (۷:۲۷)

”اے بنی آدم، کہیں شیطان تم کو راہ خدا سے بہکانہ دے، جس طرح کہ اس نے تمہارے والدین کو بہشت سے نکلوا یا کہ

لگا ان کا لباس اب ان سے اتروانے، تاکہ ان کے پردہ کرنے کی چیزیں ان پر ظاہر کر دے، غرض اغوائے شیطان سے

بچتے رہو، کیونکہ وہ اور اس کی ذریات تم کو ادھر سے دیکھتے رہتے ہیں، جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔“

جس وقت حضرت آدم علیہ السلام وہاں سے نکال دیئے گئے انہیں ایک دائمی قانون کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ دستور العمل یہ تھا کہ دنیا دار العمل ہے، کوئی شخص یہاں قتل و بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، بلکہ ہر ایک کو محنت و مشقت کرنی پڑے گی۔ اسی سے وہ کمالات و فضائل حاصل کرے گا، اسی پر اس کی فلاح و کامرانی کا دار و مدار ہو گا، جہاں اس نے عیش و آرام کا خیال کیا، تباہ و برباد ہو جائے گا اور کبھی اسے کامیابی نصیب نہ ہو گی، سورہ بلد میں فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝ (۹۰:۳)

## نزول الہام

فَتَلَكَّمٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّوَابُ الرَّحِيْمُ ۝

”پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں، پھر متوجہ ہوا اس پر، بیشک وہی معاف کرنیوالا مہربان ہے۔“

جنت سے نکلنے کے بعد آدم مدت ہائے دراز تک پریشان خاطر رہے، انہیں رہ رہ کے وہاں کی نعمتیں یاد آتی تھیں، ہر وقت مضطرب رہتے، اپنے عزم و استقلال کی حقیقت ان پر واضح ہو گئی تھی۔ حیران تھے کہ وہی اطمینان قلب پھر نصیب ہو۔ ویسے ہی عیش و طرب کی زندگی ہو اور اسی آرام کے ساتھ دن کشیں، مگر کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی لطف و نوازش سے کام لیا اور انہیں چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان و سرور کا باعث ہوئے، وہ کلمات دوسری جگہ ذکر کئے گئے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۷:۲۳)

فَلَمَّا يَآئِيْتِكُمْ مِّمَّنْ هٰذَاۤى فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِآيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

”ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سب، پھر کبھی پہنچے تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت، تو جو کوئی چلا میری ہدایت پر

نہ ڈر ہو گا ان کو اور نہ غم اور جو منکر ہوئے اور انہوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی، وہ ہیں دوزخ کے لوگ، اسی

میں رہیں گے۔“



چونکہ آدم علیہ السلام کے اطمینان قلب کا باعث وہی کلمات تھے جو اللہ کی جانب سے الہام کئے گئے تھے، اس لئے آئندہ کے لئے یہی قاعدہ کلیہ بنادیا گیا کہ انسانوں کے عزم و ارادہ ہمیں قوت و طاقت پیدا کرنے، فطرت اصلیہ کو خارجی اثرات ضلالت سے بچانے، اللہ کے حضور میں قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہونے کے لئے، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کو مبعوث کیا کرے گا، ان صحائف و اسفار آسمانی پر ایمان لانا ہر انسان کا فرض ہو گا جو ان پیغمبروں پر نازل ہوں گے اور جن الہامات کا مقصد ہی یہی ہو گا کہ اس کے اندر جذبات صادقہ کی تولید ہو، دعا کو بہترین وسیلہ فلاح و کامرانی خیال کرے اور خالق و مخلوق کے تعلقات و روابط میں کسی قسم کی کدورت نہ پیدا ہو۔ اسی موضوع پر دوسری جگہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا بَالِغُنَاكُمْ فَاِذَا بَلَغْنَا لَكُمْ اُكْلًا لِّمَا كُنْتُمْ عَلَىٰ فِتْنَةٍ مِّنْكُمْ فَاَصْلَحْ وَلَا تَخْوَفْ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ  
 (۳۵:۳۶) ۴ ۵ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۶

”اے بنی آدم! جب تکھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس پہنچیں ماورے ہمارے احکام تم کو پڑھ کر سنائیں تو ان کا کہا مان لینا، کیونکہ جو شخص ان کے کہنے کے مطابق پرہیز گاری اختیار کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرے گا تو ان پر نہ تو خوف طاری ہو گا اور نہ وہ آزرہ خاطر ہوں گے اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے اور ان سے انکار بیٹھیں گے، وہی دوزخی ہوں گے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

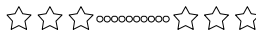
پھر دوسرے موقع پر یوں ارشاد ہوا:

فَاِذَا بَلَغْنَا لَكُمْ مَعِي ۙ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هٰذَا يَفْلَاحْ وَلَا يَضِلْ ۚ وَلَا يَشْقٰ ۙ ۶ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذٰلِكَ فَاِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً  
 ضَنْكًا ۚ وَنَحْشُرُ لَآيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰی ۷ (۱۲۳:۱۲۴)

”پھر اگر تمہارے پاس ہماری طرف سے ہدایت آئے تو جو ہماری ہدایت پر چلے گا، نہ راہ راست سے ہٹے گا اور نہ ہلاکت میں پڑے گا اور جس نے ہماری یاد سے روگردانی کی، تو اس کی زندگی ضیق میں گزرے گی اور قیامت کے دن بھی ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔“

یہاں تک باب اوّل کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس لئے وہ مجبور ہے کہ ناموس الہی کے آگے اپنی گردن جھکا دے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو اور زیادہ وضاحت سے صاف کر دیا کہ وہ برابر پریشان و مضطرب پھرتے رہے، تاکہ ان کے وحی الہی نے چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان قلب اور دلچسپی کا باعث بنے۔

پس قصہ آدم نے اس دعویٰ پر مہر لگادی کہ دنیا میں انسان کو سکینہ و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الہی کا پابند بنائے، ورنہ اس کے بغیر اس کی زندگی بالکل بیکار ہو جائے گی۔





## باب نمبر ۲

## قرآن حکیم کی ضرورت

گذشتہ آیات میں مطلق وحی کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بقاء و قیام کے لئے الہام الہی کا نزول اتنا ہی ضروری ہے، جیسا کھیتی کے لئے سورج کی روشنی، جسم کی حفظ و صیانت کے لئے طب و ڈاکٹری اور حیات انفرادی کے لئے ہوا۔ پس جس طرح ان میں سے ہر ایک چیز اس درجہ ضروری اور لازمی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی انسان ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، ایسے ہی روح کی تکمیل و تربیت جذبات صادقہ کی نشست و تولید اور اخلاق فاضلہ کی تہذیب و شائستگی کے لئے الہام کی ضرورت ہے، مذہب، اس کا داعیہ فطرت ہے، پس اس کے لوازمات کی فراہمی بھی الزم اللوازم۔ الہام الہی نے ہر زمانہ میں اس کی ضروریات و مقتضیات کے اعتبار سے مختلف اشکال و صورت اختیار کئے۔ جزئیات میں گو اختلاف رہا ہو، لیکن اصول و کلیات میں ہمیشہ اتحاد رہا۔ تمام صحائف و اسفار آسمانی کے اور اق کو دیکھ جائیے، اساس و بنیاد سب کی ایک ہی ہوگی اور ایک ہی حقیقت کی طرف سب کی دعوت ہوگی۔ اس لئے کہ سچائی ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گی۔ آپ اپنی سہولت و آسانی کے لئے اس کے مختلف نام رکھ لیجئے، مگر مسمی تو وہی ہے۔

عبار اتنا شقی وحسند واحد  
وکل ان ذالک الجبال لیشیر

کبھی وحی الہی نے نوح کو اس وادی کا رہ نور دیا اور کبھی اس نے حجاز کی وادیوں میں ابراہیم و اسمعیل کو نوازا۔ اسرائیل کے گھرانے پر نظر ڈالی تو ایک آگ کی تلاش میں نکلنے والے کو اپنا والہ و شیفہ بنا لیا اور کبھی ناصرہ کے ایک نوجوان کو اپنی آواز کے لئے چن لیا، تا آنکہ وادی بطحا کی قسمت جاگ اٹھی۔ غار حرا میں ایک یتیم سربہ زانو معتکف تھا۔ رحمت کے محافظ فرشتے اس کے ارد گرد صف بستہ تھے، تمام دنیا خواب غفلت میں تھی، مگر وہ بیدار اور سر بسجود تھا کہ خداوند گویا ہو۔ ایک انسان کے منہ میں اپنا کلام ڈالا اور دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام نازل کیا: ”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قد و سیویں کے ساتھ آیا اور اس کی داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی، وہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں۔“ (کتاب الاستثناء ۲: ۲۰۳۳)

اگرچہ الہام کی مختلف صورتیں رہیں، مگر سب سے آخری اور مکمل ترین شکل میں جو وحی نازل ہوئی، وہ قرآن ہی ہے اور اب جبکہ یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ ہر انسان کو الہام الہی کا اتباع کرنا ضروری ہے، تو یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ اس زمانہ میں چونکہ وہ الہام قرآن حکیم کے اوراق میں مسطور ہے، اس لئے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنانا لازمی ہے۔ مگر اس کی وہ لوگ مخالفت کرتے ہیں جن کے پاس پہلی کتابیں موجود ہیں اور اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اس لئے قرآن مجبور ہے کہ ان اقوام و امم کی خرابیاں ذکر کرے، تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ایک قوم بھی اس مقدس فرض کے قابل نہیں رہی۔ مذاہب تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ان سب میں زیادہ قابل اعتناء یہودیت ہے جو اپنے آپ کو ابراہیم و اسمعیل کی طرف منسوب کرتی ہے اور جس کے اتباع خیال کرتے ہیں کہ جنت کے اجارہ دار یہی لوگ ہیں۔ اس لئے سورہ بقرہ میں سب سے پہلے اسی قوم کو مخاطب کیا گیا، کہ عیسائی دراصل انہیں کی ایک مہذب شاخ سے وابستہ ہیں جن کا ذکر آل عمران میں آئے گا۔

قرآن کی ضرورت ثابت کرنے سے قبل یہودیوں کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں پر بحث کی جائے گی، پھر ان کے مختلف طبقات امت کے سوانح و حالات کی تنقیح ہوگی۔ ان کی مذہبی کمزوریوں اور اخلاقی فروگزاشتوں کو واضح کیا جائے گا اور اس تمام بحث و مذاکرہ کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ ان لوگوں نے اس درجہ اپنے قلب کو زنگ آلود کر لیا ہے اور اس قدر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کیا ہے کہ اب ان کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہو گئی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے بہت دور جا پڑے ہیں اور غضب الہی نے ان کی حیات قومی کے شیرازہ کو منتشر کر دیا ہے۔ تبلیغ و دعوت کے فرض سے ان کا کوئی سروکار نہیں اور نبوت اسرائیل کے خاندان سے منتقل ہو کر اسمعیل کے گھرانہ میں آ گئی ہے۔

اگلے رکوع میں یہودیوں کی خرابیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے گی، بعد ازاں اسی اجمال کی تفصیل ہوگی۔

## علمی خرابی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْعَمْتُ عَلٰيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اَوْفٍ بِعَهْدِكُمْ ۖ وَاٰيٰتِيْ فَآذِهٖنَّ ۝۱۵

“اے نبی اسرائیل! یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا تم پر اور پورا کرو اقرار میرا، میں پورا کروں گا اقرار تمہارا اور میرا ہی ڈر رکھو۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں، کیونکہ ان کا دوسرا نام اسرائیل (عبد اللہ) بھی ہے۔ قرآن حکیم ان کی خرابیاں ذکر کرنے سے قبل تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ سے ان کے اندر حس و بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایک شریف انسان کی تنبیہ کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ تم شریف زادے ہو۔ چنانچہ اس آیت میں بھی انہیں بتایا گیا کہ تمہارے آباء کرام وہ لوگ تھے جن پر ہر قسم کی نعمتیں نازل ہوئیں، ان کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، حکومت نوازش کی گئی اور یہی سب سے بڑے نعمت ہے کہ کسی امت کو ایسے اعلیٰ ترین عقائد و اخلاق کی تعلیم دی جائے کہ

ان کا لازمی اور قطعی نتیجہ حکومت و جہانداری ہو۔ چنانچہ دوسرے موقع پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمُوا لَكُمْ إِلَهُكُمْ إِذْ جَعَلَ آيَاتِكُمْ آيَاتِهِ وَجَعَلَكُمْ مِلَّةً وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يَأْتِ  
أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠:٥﴾

”جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! اللہ نے جو تم پر احسانات کئے ہیں، ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا اور تم کو وہ نعمتیں دیں جو دنیا جہان کے لوگوں میں کسی کو نہیں دیں۔“

گویا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو روحانی اور جسمانی دونوں بادشاہتیں نوازش کیں، پھر ایسے لوگوں کے لئے تو یہ کبھی بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی غلامی کو چھوڑ کر انسان کو اپنا رب بنالیں۔

اس قدر تذکیر و موعظت کے بعد ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس عہد کی پابندی کریں جو انہوں نے خدا کے ساتھ کیا تھا، اس ایفاء عہد کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ بھی اپنے وعدے کو پورا کرے گا جو ان سے کیا تھا، گویا اس آیت میں دو عہدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک عہد بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا ان سے۔ یہ دونوں کے دونوں عہد حسب ذیل ہیں:

”تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا، جیسا اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کے خاص گروہ ہوئے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور نام اور عزت میں زیادہ بالا کرے اور خداوند اپنے خدا کی مقدس گروہ ہوئے جیسا اس نے کہا۔“ (کتاب استثناء ۹۱، ۸۱، ۷۱: ۶۲)

خداوند کی آواز کو نہی ہے، یہی کتاب ان الفاظ میں اس پر روشنی ڈالتی ہے ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا“ (کتاب استثناء ۹۱، ۸۱، ۷۱)

بنی اسرائیل سے اب بھی یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے عہد کی پابندی کریں۔ خداوند کی آواز کے شنوا ہوں اور قرآن حکیم پر ایمان لے آئیں، تو پھر وہ ایسی قوم بنادیئے جائیں گے جو صفت، نام اور عزت میں زیادہ بالا ہوگی۔

جب مذہبی جماعت کی عزت و حرمت کا اصلی سبب اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور اسی لئے لوگ اس کو اکرام و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، تو اس کے لئے کبھی یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر اللہ سے بھی ڈرے، بلکہ اسے فقط ایک ہی ذات کا خوف اپنے دل میں رکھنا چاہئے۔ ایک دل میں دو ڈر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ قَالَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۹: ۱۳﴾ اس سے بڑھ کر اس جماعت کی اور کیا ذلت ہو سکتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری قوت بھی اس کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔

وَامِنۡهُنَا اٰتٰتُكَ مُصَدِّقَاتُنَا مَعَكُمْ وَلَا تَكۡفُرُوۡنَ اَوَّلَ كٰفِرٍ بِهٖ ؕ وَلَا تَسۡتَوۡٓءِبِلِیۡنَ اِلٰیَّ مَسۡنَاۡ قَلِيۡلًا ؕ وَاٰتٰیۡنَا فَاَتَقۡنُوۡنَ ۝

”اور مانو جو کچھ میں نے اتارا، سچ بتاتا ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر مت بنو اور میری آیتوں پر تھوڑا مول مت لو اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔“

تصدیق کی ضرورت صرف پیشگوئیوں کے لئے محسوس ہوا کرتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ باوجود تحریفات لفظی و معنوی کے پھر بھی کتب سابقہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ گذشتہ آیت میں ہم نے ایک پیشین گوئی کتاب استثناء سے نقل کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے موسیٰ جیسا ایک پیغمبر بھیجا جائے گا۔ ”موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے۔ کسی نے بھی مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اس لئے کہ وہ سب کے سب ملت اسرائیلی کی تجدید و احیاء کے لئے بھیجے گئے تھے، بلکہ خود مسیح علیہ السلام بھی اسی انتظار میں چلے گئے، جب یوحنا بتسمہ دینے والے کے پاس یروشلم سے کاہن اور لیوی آئے اور انہوں نے آکر پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا، میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔“ (یوحنا ۱:۱۲)

جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، آپ نے اول ہی روز شیل موسیٰ ہونے کا اعلان کر دیا۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمۡ رَسُوۡلًا شَٰهِدًا عَلٰیكُمۡ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوۡنَ رَسُوۡلًا ۝ (سورہ الزمل ۱۵)

جس طرح ہم نے فرعون کی طرف موسیٰ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، تمہاری طرف بھی محمد کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو تمہارے مقابلے میں گواہی دیں گے۔

اس لئے بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس قرآن پر ایمان لے آئیں، کیونکہ اس کو مان لینے سے ان کی کتابوں کی صداقت پر مہر لگ جائے گی اور تمام دنیا کو یقین ہو جائے گا کہ صحائف آسمانی کی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوں گی۔ مخالفت کا بیج بونے والے تم نہ بن جاؤ، کیونکہ تم مکا، مدینہ، و بنی، علیہ الہی کے قائل، انبیاء و رسل کے سلسلہ سے واقف اور کتب سابقہ کا علم رکھنے والے ہو، تعلیم یافتہ ہو کر تمہیں انکار کی گنجائش نہیں۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی تمہارا ہی اتباع کریں گے اور تمہارے ہی نامہ اعمال میں ان کی غلط کاری بھی لکھی جائے گی۔

یہودی عالموں نے کبھی حق کی آواز کو لبیک نہ کہا، بلکہ اپنے دنیاوی فائدوں کی خاطر برابر سچائی کو قربان کرتے رہے، حالانکہ انہیں خوب یقین تھا کہ آپ ہی وہ نبی ہیں۔ یَعْرِفُوۡنَہٗ كَمَا یَعْرِفُوۡنَ اٰبۡنَآءَہُمۡ ؕ (سورہ البقرة: ۱۴۶) قرآن حکیم نے بار بار ان کی اس غلط کاری کو بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے لئے اس سے زیادہ بد اخلاقی اور شیطنت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

وَلَا تَلۡبِسُوۡا الْحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡفُرُوۡا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

اور صحیح میں غلط نہ ملاؤ اور یہ کہ جان کر سچ کو چھپاؤ۔

ہر وہ چیز جو عین ضرورت کے وقت ملے، حق ہے اور ہر غیر ضروری چیز باطل، پس یہ ارباب علم و فضل کی شان سے کس درجہ گری ہوئی بات ہے کہ قوم و ملت کو جن احکام کی ضرورت ہے، ان کی طرف تو کوئی بھی توجہ نہ کرے، حالانکہ ان پر حیات قومی کا دار و مدار ہو اور ان امور پر زور دیا جائے جو فروغیات کا حکم رکھتے ہوں اور پھر اسی پر قناعت نہ ہو بلکہ حق بات جاننے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے، سچائی کو چھپانے کی کوشش ہمیشہ اس وقت کی جاتی ہے جب خود اس پر عمل نہ ہو۔ اس لئے لوگوں کو بھی اس سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ اگر انہیں صداقت کا علم ہو گیا اور انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا، تو یہ علما مورد طعن و تشنیع بنیں گے کہ باوجود جاننے کے اس پر عمل نہیں کرتے۔

## عملی کمزوری

گذشتہ آیات میں ان کی عملی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اب ان کی عملی حالت کو بیان کیا جاتا ہے۔

وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۵﴾

اور قائم کرو نماز اور زکوٰۃ دیا کرو اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

بعض لوگوں کو جان عزیز ہوتی ہے اور بعض کو مال، اس لئے ان سب کے جوش ایمان و ولولہ دینی کے امتحان کی خاطر نماز اور زکوٰۃ دونوں کو لازم کر دیا گیا اور یہ کہ سب کے ساتھ مل کر کام کرو۔

قوموں کے عروج و زوال کے جو اصلی اسباب و مراتب ہیں، ان میں بنیادی چیز یہی ہے کہ سب ایک ہو کر رہیں۔ ان کی قوتوں میں اجتماع و انضمام ہو۔ جہاں انتشار و اختلاف ہو، قوم برباد ہو جائے گی، اس لئے کہ علیحدہ ہونے کی صورت میں عوام الناس اور تعلیم یافتہ اشخاص میں بعد و ہجر کی خلیج حائل ہو جائے گی۔ تمام لوگ بغیر کسی سردار اور امیر کے رہ جائیں گے اور اہل فضل و کمال کے پاس دماغ تو ہو گا مگر دست و بازو نہ ہوں گے، کیونکہ کام کرنے والے عوام الناس ہی ہوا کرتے ہیں۔

جب کسی قوم میں تنزل و ادبار کی ابتداء ہوتی ہے تو بہترین دل و دماغ عوام سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ مل کر فرائض مذہبی ادا نہیں کرتے۔ عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم خلوت میں زیادہ اطمینان کے ساتھ کاموں کو انجام دے سکتے ہیں۔ عام لوگوں میں تہذیب نہیں ہوتی، تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، آداب مجلس سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے طبیعت کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس عزلت گزینی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ان امور کو بالکل ترک کر دیتے ہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

کفار قریش میں دستور تھا کہ ایام حج میں عوام الناس تو عرفات کے میدان سے واپس لوٹتے، مگر یہ لوگ مزدلفہ ہی سے واپس آجاتے اور اس طرح حدود حرم سے باہر جانے کی انہیں ضرورت محسوس نہ ہوتی، یہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منتخب جماعت خیال کرتے تھے، اس لئے عرفات میں جانا پسند خاطر نہ تھا، قرآن نے انہیں حکم دیا۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ (سورة البقرة: ۱۹۹)

”پھر جس جگہ سے اور لوگ چلیں تم بھی وہیں سے چلو اور اللہ سے مغفرت چاہو، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

استغفار اسی لئے کرنے کا حکم دیا کہ اس علیحدگی سے تمام قوم برباد ہوتی تھی، آئندہ اس غلطی کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اجتماعی زندگی پر سب سے زیادہ زور دیا، کہیں فرمایا من فارق الجماعة فمات ميتة جاهلية، ”جو شخص جماعت سے الگ ہوا، اور وہ اُسی حالت میں مر گیا، تو اُس کی یہ موت جاہلیت کی موت ہوئی“، ایک جگہ فرمایا علیکم بالجماعة فان الشيطان مع الفزة وهو من الاثنين ابعده، ”شیطان جماعت سے الگ نہ ہو کیونکہ جب کوئی تنہا ہو تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا، دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے۔“ علیکم بالسوا دالاعظم اور فانه من شذ شذی النار اور ید الله علی الجماعة اور لاتجتمع امتی علی الضلالة، مشہور احادیث اور زباں زد خاص و عام ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وایاکم والفرقة فان الشاذ من الناس الشيطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب، ”علیحدگی سے بچو اس لئے کہ جو الگ ہو وہ شیطان کے قبضہ میں آگیا، جس طرح ایک بکری اگر ریوڑ سے الگ ہو جائے تو وہ بھیڑیے کا مال ہوتی ہے۔“

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مثل المومنین فی توادهم ووتعاطفهم کمثل الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر بالحمى، مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء، ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے، جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔ ”دوسری جگہ یوں ارشاد ہوا: المسلم للمسلم کالبنيان يشد بعضه بعضا،“ ان کی مثال دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے۔“ ظاہر ہے کہ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں، اگر ہے تو اجتماعی۔ وہ دیوار کا ایک جز اور ان اجزاء کے ملنے سے مضبوط دیوار بنی ہے۔

نماز میں بھی صف بندی پر زور دیا کہ سر اہنہ اور پاؤں ایک سیدھ میں رہیں اور اس پر ان الفاظ میں تنبیہ کی لتسون صفوفکم اولیخالفن الله بین وجوهکم، ایک روایت میں فرمایا: سواد صفوفکم فان تسوية الصفوف من اقامة الصلوة۔ یہ تمام تصریحات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ باہم مل جل کر رہنا اور اکٹھے ہو کر کام کرنا کس درجہ ضروری ہے، مگر افسوس مسلمان ان سب ارشادات کو فراموش کر چکے اور اب تصویر تنزل بنے ہوئے ہیں۔

## انتظامی نقص

أَتَا مُؤُونَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٢٠٠﴾

”کیا لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو اور تم کتاب پڑھتے ہو، پھر نہیں سمجھتے۔“

مذہب جب دعوت دے گا تو عمل کی، اس کے اوامر و احکام ایک ایسی امت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو یکسر عمل ہو، اس لئے ہر وہ شخص جو اپنی قوت عملیہ کو فنا کر دے، مذہب کے نزدیک مردود ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی جو

دوسروں کو تو کام کرنے کی دعوت دیتے ہیں، مگر خود اس سے محروم محض رہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے شاعروں کی ایک اصولی غلط کاری بیان کی ہے اور وہی دراصل ان کے تمام امراض و مفسدات کی علت العلل اور بمنزلہ بنیادی پتھر کے ہے۔ وَ أَتَاهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿۲۲۲﴾ (سورہ اشعر آء ۲۲۲) اور یہی باتیں کہا کرتے ہیں جو خود نہیں کیا کرتے۔ پھر سورہ صف میں مسلمانوں کو تادیب فرمایا: لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۲﴾ (سورہ الصف ۲) آل عمران میں یہودیوں کی ایک خرابی یہ بتائی کہ۔ وَ يُحِبُّونَ أَنْ يُخْبَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (سورہ آل عمران ۱۸۸) اور کیا کرایا تو کچھ نہیں اور اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، ایک عرب شاعر سے کسی رئیس نے کہا میری تعریف کرو۔ شاعر نے جواب دیا افضل حتی اقول کچھ کر کے دکھاؤ کہ میں تمہاری تعریف بھی کروں۔

اگر ایک مذہبی جماعت اس امر کی آرزو مند ہو کہ لوگ اس کی امامت و پیشوائی کو تسلیم کر لیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو عمل صالح کا بہترین نمونہ بن کر دکھائے۔ اس لئے کہ قدر و قیمت عمل کی ہے نہ کہ باتوں کی۔ ان اکرام مکم عند اللہ اتفاقاً، مگر ان یہودیوں کی عجیب حالت ہے کہ باوجود کتاب پڑھنے کے وہ اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ عمل سے اس درجہ بعد اور اس پر مذہبی ریاست و حکومت کی طلب، این چپ بوالعجبی است!

وَ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿۲۰﴾ الَّذِيْنَ يَطُوعُونَ اَمْرًا مَّلُوفًا رَّيِّبًا ۚ وَ اَتَاهُمْ لِجَعُونُ ﴿۲۱﴾

“صبر اور نماز سے مدد طلب کرو اور البتہ نماز بھاری ہے مگر ان لوگوں کے لئے (آسان) ہے جو عاجزی کرنے والے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔”

تمہیں صبر و استقامت اور دعا سے کام لینا چاہئے کہ یہی چیزیں کامیابی کی ذمہ دار و کفیل ہیں، مگر اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جنہیں احتساب اعمال کا یقین ہو، ورنہ دوسروں کو ان تکالیف و مصائب کے برداشت کرنے کی کیا ضرورت؟

قرآن حکیم کے بعض الفاظ کا مفہوم اس طرح غلط بیان کیا جا رہا ہے کہ ان کا اصلی مطلب اب کسی ذہن میں نہیں آتا اور غلط مطالب ہی ضرب الامثال اور محاورات کے طور پر استعمال ہونے لگے ہیں، ان میں صبر بھی ہے۔ ہم نے تفسیر کے مقدمہ میں اس پر کافی روشنی ڈال دی ہے۔ ومن شاء التفصیل فلیدرجہم نشہیہ۔

یہاں تک بنی اسرائیل کی خرابیوں سے اجمالی بحث کی، تفصیل آگے آئے گی۔ ہم ارباب ذوق سلیم کی سہولت و آسانی کی غرض سے ان امراض و مفسدات کی تشخیص کئے دیتے ہیں کہ عبرت و بصیرت ہو:

(۱) علمی خرابیاں ①۔

① اہل بصیرت ان خرابیوں کا وقت نظر اور عمیق غور و فکر سے مطالعہ کریں پھر دیکھیں کہ اس وقت علماء کی کیا حالت ہے اور کیا فردا فرڈا یہ تمام امراض ان میں موجود نہیں ہیں۔ علماء سو کے حالات عام لوگوں پر مخفی نہیں اس لئے ہمیں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ فہل من مدد کر۔



(الف) عہد کی پابندی نہیں کرتے۔

(ب) قرآن حکیم پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ اس سے ان کی کتاب کی تصدیق ہوتی ہے۔

(ج) کتاب الہی کی تبلیغ و دعوت کے مقابلہ میں دنیوی جاہ و عزت کو ترجیح دیتے ہیں۔

(د) ضروریات دین سے لاپرواہو کر فروعیات پر اپنی تمام تر قوت صرف کرتے ہیں۔

(ه) حق و صداقت کو مخفی رکھتے ہیں کہ عوام الناس کے نزدیک مورد طعن و تشنیع نہ بنیں۔

(۲) عملی کمزوریاں

(الف) اللہ کے پاک نام پر معمولی سے معمولی بدنی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے۔

(ب) قومی نشو و ارتقا کے لئے خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

(ج) اجتماعی قوت اور اتحاد قومیت میں اختلاف و تفریق پیدا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(۳) انتظامی نقائص۔

(الف) مذہبی احکام و اوامر اور اخلاق و تہذیب کے باب میں بے انتہا کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔

(ب) دوسروں سے جب مطالبہ کریں گے تو نہایت سختی سے۔

(ج) احتساب اعمال کا یقین نہیں، اس لئے نظم و ترتیب امور کی پرواہ نہیں کرتے۔

اجمال کی تفصیل

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ كُنُوْا اِنْعَامًا لِّتَذْكُرُوْا اَنۡعُمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ كُنْتُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۰﴾

اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو بڑا کیا جہاں کے لوگوں سے۔

جب بنی اسرائیل میں انبیاء و رسل کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ مخاطبہ و مکالمہ الہی کے لئے یہی لوگ مخصوص تھے، حکومت بھی ان کے پاس تھی، اس لئے اپنے زمانہ میں یہی سب سے زیادہ بزرگ و برتر تھے۔ آباء کرام کی اولاد میں ہونا خود ایک شرف و مجد ہے اور یہ بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے، مگر جس وقت انہوں نے اپنے فرائض تبلیغ و دعوت سے انحراف و تجاوز کیا، ان پر ذلت و مسکنت طاری ہو گئی۔ اللہ کی رحمت بیکر اس سے دور ہو گئے اور ان کی تمام فضیلت و بزرگی چھن گئی۔ ولئن کفرتم ان عذابا لشدید۔

تذکیر بما بعد الموت

وَالَّذٰی يَمُوتُ يُرٰى نَفْسُهٗ اَنۡ يَّجْزٰی نَفْسُهٗ عَنْ نَّفْسٍ شٰیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنصَرُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اس دن سے بچو کہ کوئی شخص دوسروں کے ایک ذرہ برابر بھی کام نہ آئے گا۔ اس کی طرف سے سفارش قبول نہ ہوگی

اور اس کے بدلہ میں کچھ نہ لیں گے اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔



چونکہ آگے چل کر بنی اسرائیل کی خرابیوں پر مفصل و مبسوط بحث ہوگی اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ جس قوم کی تمام تر تاریخ ان سیاہ کاریوں اور بد عملیوں سے بھری ہوئی ہو، اس کے لئے اس کے سوا اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے تخت سلطنت سے محروم کر دیا جائے اور وہ غلاموں کی زندگی بسر کرے۔ اس آیت میں انہیں بتا دیا کہ حادثہ قیامت کو پیش نظر رکھیں اور انصاف و دیانت سے جواب دیں۔

اگر ایک شخص کسی جرم کا مرتکب ہو اور اسے عدالت میں پیش کر دیا گیا ہو تو سزا سے بچنے کی صرف یہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ:

(الف) دوسرا شخص اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ مجرم کو چھوڑ کر مجھ سے مواخذہ کرو۔

(ب) سفارش ہو جائے اور یوں اس کی جان خلاصی پائے۔

(ج) جرمانہ اور معاوضہ ادا کر دے کہ یہ بھی نجات کی ایک شکل ہے۔

(د) یار و مددگار آکر اپنی طاقت و قوت سے کام لے کر ملزم کو چھڑالیں۔

مگر جن لوگوں نے حق پرستوں کی مخالفت کی، سچائی کے فنا کرنے کی فکر میں رہے اور انکار و جھوٹ میں زندگی بسر کی، ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ انہیں اپنے اعمال کا آپ جواب دینا ہوگا۔ جس دن کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہو کہ:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۖ وَأُمِّهِ وَأَبْنَاهُ ۖ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۖ (سورة عيسٰ ۳۶، ۳۷)

”اس دن ایسی نفسی نفسی پڑیگی کہ آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں، اور اپنے باپ اور اپنی بیوی، اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی نجات کا غم ہو گا کہ وہ اس کو بس کرتا ہے۔“

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصَلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (سورة الممتحنة ۳)

”قیامت کے دن نہ تمہارے رشتہ دار وہاں تمہارے کچھ کام آئیں گے اور نہ تمہاری اولاد، اس دن تم سب کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو خدا باریک بین نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔“ پس جب حقیقت یہ ہو تو کسی کی خاطر جھوٹ کیوں بولا جائے۔

## شفاعت

اس آیت میں شفاعت کا تذکرہ آیا ہے۔ اگر اس کے حسب ذیل مراتب پیش نظر ہوں تو اس کی حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

(الف) وجاہت: مجرم پادشاہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ قانوناً اسے سزا ملنی چاہئے مگر ایک بہت بڑا رکن سلطنت اس کی سفارش کرتا ہے، پادشاہ کو اندیشہ ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو سلطنت میں بہت سی خرابیوں کا موجب ہو گا، اس لئے رعب میں آکر مجرم کو چھوڑ دیتا ہے، اس کو شفاعت و جاہت کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ

کی جناب میں اس قسم کا عقیدہ رکھے تو اس کے کفر و شرک میں کس کو کلام ہو سکتا ہے تعالیٰ اللہ عباد یقولون،  
گر بہ محشر خطاب قہر کند  
انبیاء راجہ جائے مغفرت است؟

قیامت کو سب کی یہ کیفیت ہوگی،

وَحَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَنَسًا ﴿۱۰۸﴾ (سورة طہ ۱۰۸)

”اور مارے خوف کے خدائے رحمن کے آگے سب کی آوازیں بیٹھ جائیں گی، پس تو سوائے آہستہ آہستہ بات کرنے کے اور کچھ نہ سنے گا۔“

لَيْسَ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۰۹﴾ (سورة المؤمن ۱۰۹) بھی اسی روز کے لئے آیا ہے، پھر کس کی وجاہت وہاں کام آسکتی ہے۔

(ب) محبت: بادشاہ کا محبوب و عزیز، سفارش کرتا ہے اور وہ اس کے عشق و محبت کی بنا پر مجرم کو رہائی بخشتا ہے کیونکہ تعمیل ارشاد نہ کرنے کی صورت میں اسے اس کے رنجیدہ خاطر ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسا خیال بھی جناب باری کی شان میں کفر باللہ سے کم نہیں، وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۱۰۹﴾ (سورة الانبیاء ۲۸) اور وہ اس کے جلال سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

(ج) اجازت: شامت اعمال سے ایک شخص نے جرم کیا، مگر اس پر نادم ہے۔ بادشاہ ہی سے طالب مغفرت ہے۔ کسی امیر کی پناہ میں نہیں آتا، ہر وقت اسی کی رحمت پر نظر ہے، بادشاہ اس کو معاف کرنا چاہتا ہے مگر آئین سلطنت کے خلاف ہے۔ ایک امیر اس کی مرضی پا کر سفارش کر کے اس کا قصور معاف کر دیتا ہے، اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔ کتاب و سنت کی تصریحات اس کی تائید میں ہیں اور کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔

من ذا الذي يشفع عنده الا باذنه میں اسی طرح اشارہ ہے: الا من اذن له الرحمن وقال صوابا کا یہی مطلب ہے اور اُسی مضمون کی کثرت سے احادیث ملیں گی۔ اس آیت میں جس شفاعت کا انکار کیا گیا ہے وہ اس کے لئے ہے جس کی تمام عمر حق و صداقت کے استیصال میں گزری ہو اور جسکی آواز ایک مرتبہ بھی سچائی کی حمایت میں بلند نہ ہوئی ہو۔

تذکیر بالاء اللہ

وَإِذْ نَحْيَيْنَاكَ مِنَ الْفِرْعَوْنَ يَسُومُونَكَ سُوءَ الْعَذَابِ يُدَبِّحُونَ أَبْنَاءَكَ ثُمَّ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكَ كُفَّ وَفِي ذَلِكَ لَكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۰۹﴾ وَإِذْ قَرَّبْنَا بَبَأَكُمْ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا الْفِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۱۰﴾

”اور ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی، تم کو بڑی تکلیف دیتے، تمہارے بیٹے ذبح کرتے اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتیں، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو

چیر دیا پھر تم کو بچا دیا، فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔ ”شاہان مصر کو فرعون کہا کرتے تھے۔ آل فرعون سے مراد اس کے اعوان و انصار، اتباع و مقلدین، اور اس کی قوم کے تمام افراد ہیں۔

ان آیات میں فرعون کے مختلف مظالم بیان کئے گئے ہیں، ہم نے اپنی کتاب بصائر میں موسیٰ و فرعون کے واقعات پر نہایت ہی شرح و بسط سے بحث کی ہے اور ان کے تمام اطراف و جوانب کو صاف کر دیا ہے، اس لئے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو اس کو ملاحظہ کیجئے۔

بحیرہ قلزم کے شمالی کنارہ پر بنی اسرائیل کھڑے تھے۔ آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر، اس یاس و قنوط کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کیا کہ وہ اپنی لاٹھی سمندر پر ماریں۔ عالم مثال کی قوتوں نے انہیں وقت پر مدد دی، پانی خشک ہو گیا اور وہ لوگ اطمینان کے ساتھ پار ہو گئے۔ فرعون بھی اپنے لشکر سمیت سمندر میں گھس گیا، جب عین وسط میں پہنچا تو قوائے مثالہ کے ذریعہ پھر سب طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا اور چند لمحوں کے اندر وہ بدترین گروہ انسانی اپنے اعوان و انصار کے ساتھ غرق ہو گیا۔ بنی اسرائیل دوسرے کنارہ پر کھڑے اس مسرت انگیز نظارہ کو دیکھ رہے تھے کہ وہ قوم، جس نے آج تک ہم کو غلاموں کی طرح رکھا، آج بے بسی اور بے کسی کی چیخیں مار رہی ہے، مگر کوئی نہیں جو اس کی مدد کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تمام ان رکاوٹوں کو دور کر دیا جو ان کی راہ میں مختلف اسباب کی بنا پر اس وقت پیدا ہو گئی تھیں جبکہ فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

### غلامی کے آثار باقیہ

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۱﴾

”اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا، پھر تم نے اسی کے پیچھے بچھڑا بنالیا اور تم بے انصاف تھے اس پر بھی ہم نے تم کو معاف کیا شاید تم احسان مانو۔“

جب بنی اسرائیل نجات پا کر آگے بڑھے تو اب وہ ایک آزاد قوم تھے جن کے لئے قانون اور دستور العمل کی ضرورت تھی، ورنہ ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ ان کے خیالات میں انتشار نہ پھیل جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ کوہ طور پر آکر چالیس روز تک اعتکاف کریں۔ سورۃ اعراف میں فرمایا:

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا فِيْهَا بَعْثًا فَرَقْنَاهُ بِمِثْقَالِ رَيْبَةٍ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ﴿۱۴۲﴾ (سورۃ الاعراف)

”اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے دس راتیں اور بڑھا کر ان سے چالیس کو پورا کر دیا اور یوں پروردگار موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا ہو گیا۔“

اللہ تعالیٰ کا قانون بھی یہی ہے کہ چالیس روز کے ذکر و فکر اور استغراق کے بعد روحانی کمالات کا فتح باب ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام بھی اسی لئے چلہ کشی کرتے ہیں کہ انسانی نجاستوں اور گندگیوں سے پاکیزگی اور طہارت حاصل کر کے عالم ملکوت کے فیوض و برکات حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس نصاب کو تیس روز میں پورا کر لیا، مگر آخری روز ان سے کچھ ایسی غلطی ہو گئی کہ اس کے کفارہ کے لئے دس روز اور اعتکاف کرنا پڑا، اس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون چہل ایام برابر قائم رہا۔ اس میدان کے ہر راہ رو کے لئے اعتزال عن الناس اور علیحدگی ضروری ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکالمہ الہی سے قبل کئی کئی روز تک غار حرا میں معتكف رہا کرتے کہ جبرئیل سے پوری مناسبت پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو وہاں مصروف ذکر اللہ تھے۔ ان کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کی قوم نے سونے چاندی کا پچھڑا پوجنا شروع کر دیا اور اس کے مختلف اسباب تھے۔

(۱) یہ لوگ مصر میں قریباً چار سو سال سے مقیم تھے، مصری گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا تو انہوں نے بھی اس کی پوجا شروع کر دی جو ان کی صحبت و ہم نشینی کا اثر تھا۔

(۲) بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے مصریوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے، فرعون نے تمام جلیل القدر عہدے اپنی قوم کے لئے مخصوص کر لئے تھے اور ادنیٰ ترین کام ان کے سپرد تھے۔ ان کی آمدنی کے اسباب و ذرائع بند تھے، جس قدر ملتا تھا ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہوتا تھا، اس لئے انہیں دولت کے ساتھ الفت و دلبستگی ہو گئی اور یہ ہر غلام و محکوم قوم کے امتیازات میں سے ہے کہ اسے دولت سے محبت پیدا ہو، پھر رپیہ ان کا امام و پیشوا ہوتا ہے اور یہی ان کا قبلہ، معبود و کعبہ مسجود ان کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست  
گر زر طلبی سخن دریں است

بنی اسرائیل آزاد ہو چکے ہیں، اب ان پر کسی انسان کی حکومت نہیں، ایک اللہ کے غلام ہیں۔ آزاد سر زمین ہے اور وہ ہیں، مگر غلامی کے اثرات اب تک ان کے دل و دماغ پر جاری ہیں اور ان کے رگ و پے میں جاری و ساری، جس وقت انہوں نے سونے چاندی کا پچھڑا دیکھا فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ اسی کی بندگی ان کا مایہ حیات ہے۔ چنانچہ ان کی آئندہ قومی زندگی میں اس قسم کے بکثرت واقعات پیش آئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ ان کا مقصد حیات صرف جمع مال و دولت تھا، ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء اور اشتوا بایت اللہ ثمننا قلیلاً، اسی کی موید ہیں، صدیاں گزر گئیں، مگر یہ خصوصیت کبریٰ اب تک یہودیوں میں علی وجہ الکمال دکھائی دیتی ہے، ان سے بڑھ کر اور کوئی قوم صاحب دولت و ثروت نظر نہیں آتی۔

(۳) جب ایک قوم ترقی کرنے لگتی ہے تو قانون نہ ہونے کی شکل میں اس سے دو قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

(الف) افراط، روحانیت میں جائز حدود سے تجاوز کر جانا، جیسے نصاریٰ نے عبد اللہ کو ابن اللہ بنا دیا۔

(ب) تفریط، مادیت میں بہت دور نکل جانا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کی

بہترین مثال ہے، یہی دونوں اصولی غلطیاں ہیں جن سے سورۃ فاتحہ میں پناہ مانگی گئی۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین یہودی تفریط کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں کیونکہ وہ سرے سے مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں اور عیسائی افراط میں مبتلا ہیں کہ ایک بشر کو خدا بناتے ہیں۔

یہ لوگ اس وقت دونوں غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سونے کا چھڑا پوجنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خداوند جو دارالوری ثم والوری ثم وراء الوری ہے اس میں حلول کر گیا ہے، بت پرست یہی خیال کرتے ہیں پیر پرست اور قبروں کے پوجنے والے اس سے عبرت اندوز ہوں۔ افراط کی مثال آگے آئے گی جبکہ انہوں نے ارنا للہ جہرۃ کہا۔ چونکہ ان کے پاس کوئی قانون نہ تھا۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاطر جبل طور پر سرسبز انوکھ تھے اس لئے ہم نے درگزر کیا کہ آئندہ اس کے مرتکب نہ ہوں اور قانون ملنے پر اپنی قوتوں کو صحیح مواقع میں صرف کریں۔

### تورات کا نزول

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بَاتِلًا خَذَلْتُمْ الْعَجَلَ فَتَوَبُّوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۖ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۖ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۶﴾

”اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حجت دی کہ شاید تم راہ پاؤ۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تم نے چھڑا بنا کر اپنا نقصان کیا۔ اب اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو اور اپنی جان مار ڈالو تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہی معاف کرنے والا مہربان ہے۔“

فرقان اس قوت کو کہتے ہیں جس سے حق و باطل، نیک و بد اور اسلام و کفر میں تمیز ہو، ہر کتاب الہی کے نزول سے قبل لوگوں میں ایک قوی احساس پیدا کر دیا جاتا ہے، وہ اپنے روزمرہ کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو معلوم کرتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ اصلاح و تہذیب کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو کسی مصلح اور ریفارمر کا محتاج سمجھتے ہیں، حق کے لئے ان کے اندر تشنگی پیدا ہوتی ہے اور اب وہ اس چشمہ آب کی تلاش میں نکلتے ہیں جو ان کی پیاس کو دور کر دے۔ اگر فرقان پہلے سے نہ پیدا کر دیا جائے تو کتاب بیکار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ جب لوگ ضرورت اصلاح ہی محسوس نہیں کرتے تو انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر پیاس نہ ہو تو کتنی ہی برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے گلاس بھر بھر کر پیش کیجئے کسی کی نگاہ بھی نہ اٹھے گی۔ جب بھوک نہیں تو کھانے کی ہر چیز بیکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الامانة نزلت في جذر قلوب الرجال فعلموا من الكتاب وعلموا من السنة۔

”لوگوں کے سويدائے قلب میں امانت کا نزول ہوا، اس لئے انہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی اور ان سے بہرہ اندوز ہوئے۔“

اس میں امانت سے مراد یہی فرقان ہے، جو ہر نبی کی بعثت سے قبل نازل ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے لوگ نبی کے لئے یکسر انتظار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی بعثت سے قبل عرب میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو دین جاہلیت کو چھوڑ کر یہ خبریں دیا کرتے تھے کہ عنقریب ایک رسول ظاہر ہونے والا ہے جو ابلیس اور اس کے لشکر پر غالب ہوگا، ان اشخاص میں عثمان بن حریث، عبید، زید بن عمرو اور ورقہ بن نوفل کے نام خصوصیت سے مشہور ہیں۔ زید بن عمرو تو وہ بزرگ ہیں جنہوں نے رسول موعود کی تلاش میں دور دور کے سفر کئے اور آخر یہ معلوم کر کے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوں گے، اسی مبارک انتظار میں رہ کر انتقال کر گئے، یہ حضرت عمرؓ کے چچا تھے۔

یہاں فرقان سے مراد وہی تشنگی ہے جو بنی اسرائیل میں قانون الہی کے لئے پیدا کر دی گئی تھی۔ بعض لوگوں نے اس سے نجات موسیٰ اور تباہی فرعون بھی مراد لی ہے، مگر بعد کی آیت پہلے معنی کی زیادہ مؤید ہے۔ ہر نبی کے ساتھ دونوں چیزیں نازل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ موسیٰ کو بھی نوازش کی گئیں، تاکہ بنی اسرائیل راہ حق اپنے سامنے دیکھ لیں اور آئندہ کسی غلط کاری کے مرتکب نہ ہوں۔

گذشتہ آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ غیبت میں ان لوگوں نے مچھڑا پوجنا شروع کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے عفو و درگزر کیا۔ مگر اس جگہ یہ نہیں بتایا تھا کہ معاف کرنے کی صورت کیا ہوئی۔ اس آیت نے اس اجمال سے پردہ اٹھادیا اور بتایا کہ موسیٰ نے آکر انہیں ان لوگوں کے قتل کرنے کا حکم دیا جو سب سے زیادہ اس بدکرداری میں حصہ لینے والے تھے۔ چونکہ ان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو چکی تھی اور انہوں نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا کہ ہم نے بدترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے وہ قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے، حالانکہ وہ ان کے عزیز و قریب ہی تھے۔ یہ آمادگی فرقان کا نتیجہ تھی، ورنہ یاد رکھئے مشرک قومیں جن کے رگ و پے میں بت پرستی اثر کر چکی ہو اور ان کی فطرۃ ثانیہ بن گئی، ہو کبھی اپنے آپ کو فنا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گی، کیونکہ وہ اسی کو حق خیال کرتی ہیں اور انہیں اصلاح کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی آمادگی کو دیکھ لیا تو ان کو لطف و نوازش سے معاف کر دیا، کہ شروع میں اس قسم کی غلطیاں ہو جانا بعید نہیں۔

افراط کا ارتکاب

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصَّعِقَةُ ۖ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۶۰﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ مَوتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۶۱﴾

“اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم تیرا یقین نہ کریں گے جب تک اللہ کو سامنے نہ دیکھیں، پھر بجلی نے تم کو آلیا اور تم دیکھتے تھے، پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تم کو دوبارہ زندہ کر دیا، شاید تم شکر گزاری کرو۔”

حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل میں سے بہترین دل و دماغ کا انتخاب کیا اور ان میں سے ستر اشخاص کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم ان آنکھوں سے کھلم کھلا خدا کو نہ دیکھ لیں گے، تمہاری کبھی تصدیق نہ کریں گے۔ چونکہ انہوں نے بے انتہا گستاخی سے کام لیا اور موسیٰ کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، حالانکہ وہ بکثرت نشانات دیکھ چکے تھے، اس لئے صاعقہ حق نے ان کو آلیا اور ان پر بیہوشی طاری ہو گئی۔

تمام محققین کا اتفاق ہے کہ صاعقہ سے موت نہیں ہوتی، اس سے انسان بیہوش ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر وقت پر خبر نہ لی جائے تو اس کی موت کا باعث ہو جائے گی۔ جب سب پر غشی طاری ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے، انہیں اس امر کا اندیشہ ہوا کہ اگر یہ لوگ مر گئے تو قوم بغیر کسی نگران کار و محافظ کے رہ جائے گی۔ جب کام کرنے والے دماغ نہ رہیں گے تو قوم خود بخود فنا ہو جائے گی، اس لئے انہوں نے والہانہ و مصطریانہ دعائی:

وَ اخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّيَتَوَاتُوا ۖ فَلَمَّا آخَذَتْهُمْ الرُّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلِ وَ اِيَّاي ۖ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الشُّفَهَاءُ مِنَّا ۚ (سورة الاعراف ۱۵۵)

”اور موسیٰ نے ہمارے وعدے پر حاضر لانے کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی منتخب کئے، پھر جب ان کو زلزلہ نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اگر تو چاہتا تو مجھ سمیت ان لوگوں کو پہلے ہی سے ہلاک کر دیتا۔ ہم میں سے جو لوگ احمق ہیں وہ ایک حرکت کر بیٹھ، اے کیا اس کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کئے دیتا ہے؟“

قرآن کریم نے غشی اور بیہوشی کی حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن میں موت کا لفظ حسب ذیل معانی پر استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) حقیقی موت۔

(۲) کفر و جود اور فناء سے ویداری۔ اِنَّكَ لَا تُسَبِّحُ الْمَيِّتَ وَلَا تُسَبِّحُ الْقَبْرَ اِذَا دُعِیَ اِلَیْهِمْ اُولَٰئِكَ مُّذٰبِرٌۭیْنٌ (النمل ۸۰)

(۳) زمین کی قوت نوابی کے مردہ ہونے پر۔ وَاللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیْلَۃَ فَتَبٰیْءُ سَحَابًا فَسَفَّٰنْہُۭ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَلَمَّحْنَا بِہِ الْاَرْضَۃَۤ اٰیَۃًۭ لِّقَوْمٍۭ یَّظُنُّوْنَ کَذٰلِکَ النَّسُوْرُ (اطر ۹)

اس بیہوشی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی اور دوبارہ ان کے اندر احساس پیدا ہو گیا تاکہ پھر اس غلط کاری میں مبتلا نہ ہوں اور کام کریں۔

سپاہیانہ زندگی

وَعَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنِّ وَالسَّلٰوٰی ۚ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰوْا لَکِن کَاٰوًا اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۷﴾

”اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا (ہم نے کہا) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، پر اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔“

افراط و تفریط کے بعد اب توراۃ نے بنی اسرائیل کے لئے راہ توسط و اعتدال قائم کر دی اور ان کو ارض مقدس کی حکومت کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ ترقی کا اولین زینہ ہے سادہ اور سپاہیانہ زندگی۔ تمام قوم میں سپاہیانہ جذبات ہوں، روزمرہ کی ضروریات بالکل مختصر اور محدودے چند ہوں، جنگ میں اسی پر کامیابی کا دار و مدار ہے، اس لئے سب سے پہلے ان کو اسی زندگی کے لئے تیار کیا گیا، ان کی مثال ایک فوج کی تھی جو جنگ کے لئے تیار ہو رہی ہو، اس لئے ان کی تمام ضروریات قدرت خود بخود پورا کر دیتی۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی تھی اور وہ ضرورتیں نہایت ہی مختصر تھیں۔ جنگل میں دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ اور کھانے کے واسطے گوشت، چنانچہ ان کو سب کچھ میسر تھا، مگر ضرورت تھی ان کو قانون کا پابند بنانے کی، اس لئے یہ دستور العمل بنادیا گیا کہ جب ہر قسم کی ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ لیا ہے تو کل کے لئے ذخیرہ نہ رکھیں۔

غلامی سے ابھی ابھی نجات حاصل کی تھی، اس کے جراثیم دور نہیں ہوئے تھے، اس لئے قانون کی پروانہ کی اور دوسرے روز کے لئے جمع کرنا شروع کر دیا، مگر اس حرکت سے خدا کا تو کیا نقصان ہو تا خود اپنا ہی بگاڑا۔

### شہر کا داخلہ

وَ اِذْ قُلْنَا اَدْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَمَكَثُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ حَطْلِكُمْ ۚ وَسَيُنْذِرُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٠﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا اقْوَالَ غَيْرِ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَاَتَوْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥١﴾

”اور جب ہم نے کہا اس شہر میں داخل ہو اور جہاں چاہو اس میں کھاتے پھر وافر اغت اور دروازہ میں سجدہ کر کے داخل ہو اور کہو گناہ بخش، تاکہ ہم تمہاری تقصیریں بخش دیں اور نیکی کرنیوالوں کو اور زیادہ دیں گے پھر ان لوگوں نے جن کی راہ ظلم و شرارت کی راہ تھی، خدا کی بتلائی ہوئی بات ایک دوسری بات سے بدل ڈالی، پھر ہم نے ظلم و شرارت کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں کی سزا تھی۔“

اب تک یہ لوگ جنگلوں کی زندگی بسر کرتے تھے جہاں ایک طرف تو ضروریات حیات نہایت ہی قلیل اور مختصر تھیں، دوسری طرف فواحش و منہیات اور حرام کاری کے سامان بھی نایاب تھے، ایک مدت تک جنگل میں رہنے کے بعد ان کے دل میں خود بخود شہری زندگی کی آرزو پیدا ہوئی۔ انہیں اجازت تو دی گئی، مگر ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہاں شہوت پرستی اور بدکاری کے دواعی بہت کثرت سے ملیں گے، اس لئے بچتے رہنا۔ قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا اور گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا، کہ وہی ہر قسم کی آلائشوں اور ناپاکیوں سے پناہ میں رکھنے والا ہے، اس



کی رسی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ جب شہر میں داخل ہو تو کمال اطاعت و فرماں برداری کا خیال دل میں ہو۔ مگر داخل ہوتے ہی ان سے ضبط نہ ہو سکا اوبد کاری شروع کر دی، زنا کے مرتکب ہوئے۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا اور ہزاروں تباہ<sup>۱</sup> ہوئے۔

شہر میں داخل ہوتے وقت انہیں دو باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔

① ادخلوا الباب سجدا، بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے شہر میں جاؤ، مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی درست نہیں معلوم ہوتے، ایک شخص کے لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سجدہ بھی کرے اور آگے بھی بڑھتا جائے، اس سے بہتر صاحب مدارک کی رائے ہے، وہ فرماتے ہیں:

“امروا بالسجود عند الاقتراب الى الباب شكر الله تعالى وتواضعاً له”

“اللہ کا شکر ادا کرنے اور تواضع و انکساری کے اظہار کے لئے انہیں حکم دیا گیا کہ دروازہ پر پہنچ کر سجدہ کریں۔”

رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو شہر میں داخل ہونے سے قبل دو رکعت نماز پڑھ لیا کرتے۔ اگر اس روایت کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو یہ معنی اقرب الی الفہم معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن جو معنی ہم نے اختیار کئے ہیں وہ بھی بالکل صاف ہیں، وہ گاؤں سے نکل کر شہر میں آرہے ہیں، جہاں شہوت پرستی کے اسباب کثرت سے ملتے ہیں، جنگل میں خواہشات نفسانی پورا کرنے کا انہیں کوئی موقع نہ تھا، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ شہر سے باہر دو رکعت نماز پڑھ لینا اور شہر میں داخل ہوتے وقت تمہارے سر اللہ کے حکم کے آگے جھکے رہیں۔ خلاف ورزی کا خیال بھی نہ آنے پائے، ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔

(۲) ... قولوا حطة ای حط عن اخطایان، ہماری خطا کاریاں معاف کر دی جائیں، یعنی انہیں استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بنی اسرائیل نے ان دونوں حکموں کی پروا نہ کی، زنا کے مرتکب ہوئے۔ پھر گناہوں میں مبتلا ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ شریعت کے احکام و اوامر کی عزت ان کے دلوں سے جاتی رہتی اور وہ ان کو تمسخر و استہزا کی نگاہ سے دیکھتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور شریعت کے حکموں پر تمسخرانہ انداز میں نکتہ چینی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تمسخر و استہزا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

• یہ شہرِ طیم معلوم ہوتا ہے، اس کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

”سو اسرائیلِ طیم میں مقیم ہوئے، اور لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی، انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی، سو لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا، اور اسرائیلی بھل عنور سے ملے، تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔“ (گنتی ۳۱: ۲۵ و ۳۰) یہ قہر کیا تھا؟ اس کی تفسیر اگلی آے توں میں کی گئی ہے۔

”اور اس مرد کے پیچھے خیمہ میں گھسا، اور ان دونوں کو اسرائیلی مرد اور اس عورت کے پیٹ کو چھیدا، تب بنی اسرائیل میں سے وبا جاتی رہی، وہ جو اس وبا میں مرے چوٹیں ہزار تھیں۔“ (گنتی ۲۸: ۵۲ و ۵۳)

قیل بنی اسرائیل ادخلوا الباب سجدا و قولوا حطة فدخلوا یزحفون علی استأثمهم فبدلوا و قالوا حطة حبة فی شعرة:

”بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ شہر کے دروازہ میں جھک کر گھسو اور زبان سے حطہ کہتے جاؤ، انہوں نے کیا کیا، سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حطہ کے بدلے حبة فی شعرة (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔“  
یہ ان کے تمسخر کی انتہا تھی کہ شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی عزت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ جب انہوں نے شریعت کے ساتھ استخفاف کیا اور گناہوں میں مبتلا ہوئے تو خدا کے غضب نے انہیں آلیا اور خود دنیا میں انہیں دکھا دیا کہ نافرمانی کی یہ سزا ہوا کرتی ہے۔

### پانی کی تلاش

وَ إِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كَلُوا وَ اشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللَّهِ وَ لَا تَعْتَوُوا الْاَرْضَ مُفْسِدِينَ ﴿۵﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مار، پھر اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ ہم نے کہا اللہ کی روزی سے کھاؤ اور پو اور ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔“

شہر میں وبا پڑی اور ہزاروں مر گئے تو تنگ آکر پھر انہوں نے جنگل کی راہ لی۔ یہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ آخر سب نے مل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی تو حکم ہوا کہ پتھر پر لکڑے مارو۔ لکڑی کا لگنا تھا کہ بارہ قبائل کے لئے بارہ چشمے بن گئے۔ انہیں اب بھی ہر چیز بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ قانون کے پابند رہ کر ان چیزوں کو کام میں لائیں اور بے راہ روی اختیار نہ کریں۔

مگر وہ ایک مرتبہ شہر کی زندگی کو دیکھ چکے تھے، تمدن و عیش پرستی اور آرام و آسائش کے جس قدر سامان شہروں میں میسر آسکتے تھے، دیہات میں ان کا عشر عشیر بھی ملنا ناممکن سے تھا۔ اب وہ کس طرح اس سادہ زندگی پر قناعت کرتے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا، گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَاَدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِنْ اَرْضٍ مِّنْ بَعْلٰهَا وَتٰتٰهَا وَفُؤْمَهَا وَعَدَسَهَا وَبَصِلٰهَا ۚ قَالَ اَسْتَسْبِدُّونَ الْاِنْسِي هُوَ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۚ وَضَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالتَّسْكِنَةَ ۚ وَبَاَعُوْا بَغْضَبِ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶﴾

”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ، ہم ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے، پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کرو۔ وہ ہمارے لئے اس چیز کو نکال دے جو زمین میں اگتا ہے، مثلاً ساگ اور لکڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے جواب

دیا کہ کیا تم ایک بہتر چیز بدلے میں ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو، کسی شہر میں چلے جاؤ، جو تم ہانگتے ہو وہ تم کو وہاں مل جائے گی۔ اور ان پر خواری اور نامرادی کی مار پڑی اور خدا کے غضب کے سزاوار ہوئے، یہ اس لئے کہ وہ اللہ کا حکم نہ مانتے تھے اور نبیوں کا ناسخ خون کرتے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ تمام حدیں توڑ کر بے لگام ہو گئے تھے۔“

بنی اسرائیل کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، اس کے لئے ضرورت تھی سپاہیانہ زندگی کی، اب جو انہوں نے اپنے مطالبات پیش کئے، تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے، جن چیزوں کی تمہیں تلاش ہے ان سے تمہاری بدویانہ زندگی کو نقصان پہنچے گا۔ مگر جب وہ کسی طرح نہ مانے تو ان سے کہا گیا کہ یہ چیزیں شہر میں مل سکتی ہیں، وہاں جا کر کاشتکاری کرو، شہری زندگی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ان میں کابلی اور سستی پیدا ہوتی۔ چنانچہ ان کے قوائے علیہ آہستہ آہستہ بیکار ہوتے چلے گئے اور آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی۔ اس آیت میں چند باتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک دوسری کے لئے علت اور سبب بن رہی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی اور اللہ کے غضب میں آگئے، یہ مصائب اس لئے نازل ہوئے کہ وہ کفر آیات اللہ اور قتل انبیاء کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان امراض کے اسباب یہ تھے کہ ان کے اندر عصیان و عدوان کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اب ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ذلت: قرآن نے خود دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی ہے۔ فرمایا:

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ اِنَّ مَا تَقْفُوْا اِلَّا بِحَبْلِ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكِنَةَ (سورة آل عمران ۱۱۲)

“ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے، یہاں یہ خاکے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو تو یہ بھی ذلت ہی کی پناہ ہوئی۔ خدا کا غضب ان پر چھا گیا، محتاجی اور بد حالی میں گرفتار ہو گئے۔“

یہاں ذلت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ وہ دوسروں کے محکوم رہیں گے اور کبھی ان کو حکومت نہ ملے گی۔ خازن میں ہے الذلۃ الجویۃ، یعنی ذلت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی حکومت میں رہیں اور ان کو جزیہ یعنی ٹیکس ادا کریں، آل عمران کی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

“ذلتهم انك لا تری فی اليهود ملکا قاهرا ولا رئیساً معتبراً بل هم مستضعفون فی جمیع البلاد۔“

“ان کی ذلت یہ ہے کہ نہ تو ان میں کوئی زبردست صاحب تاج و تخت ہے اور نہ صاحب اثر نفوذ بلکہ ہر جگہ ضعیف و کمزور ہی رہتے ہیں۔“

ان تمام تصریحات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ذلت غلامی و محکومی کے مترادف ہے۔

مسکنت: بعض کی رائے یہ ہے کہ اس سے بھی مراد جزیہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہودی کتناہی دولت مند کیوں نہ ہو، مگر

وہ فقر و تنگدستی ہی کا اظہار کرے گا۔ امام راغب اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ وہ کیسے ہی صاحب جاہ و ثروت ہوں، مگر رعب و ہیبت ان سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔

کفر بایات اللہ: اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی، اس کی آیات کا انکار اور اس کے ارشادات کے ساتھ تمسخر و استہزاء۔ قتل انبیاء: نبیوں کو قتل کرتے تھے، یہ یہودیوں کی خصوصیت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس جرم کے مرتکب کیوں ہوتے تھے، اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے قبل پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ نبی کی بعثت کس لئے ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے کہا:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (سورۃ براہیم ۵)

”اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آؤ۔“ سورہ اعراف میں مختلف پیغمبروں کا ذکر کیا اور ان کی دعوت کا مقصد اصلی بیان کیا۔ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ (سورۃ اعراف ۳۰) کہ اللہ کے سوا تمام مجبودان باطل کی غلامی سے انکار کرو، اگر ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو مستقل رسالہ بن جائے۔ بالجملة ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر نبی کی زندگی کا مقصد وحید اپنی امت کی اصلاح و تجدید ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک تحریک لے کر آتا ہے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام سعی و کوشش وقف کر دیتا ہے، اسے اپنی جان کی پروا نہیں ہوتی۔ مخالفین اگر اس کی زندگی کے درپے ہوتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اس کے خون اور گوشت کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کے وجود سے وہ تحریک قائم ہے، اگر اس کو جان سے مار ڈالیں گے تو ضرور وہ تحریک بھی فنا ہو جائے گی۔ یہودیوں نے جو اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو صرف اس لئے کہ وہ ان کی غلط کاریوں پر تنبیہ کرتے تھے اور ان کی اصلاح کے آرزو مند، یہ لوگ اس غلط گمان میں مبتلا تھے کہ اگر ہم نے ان کو مار ڈالا تو یہ سلسلہ اصلاح و تجدید بھی ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔

پس یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہ رہی کہ نبی کا جان سے مار ڈالنا اور اس کی تحریک کا فنا کر دینا دونوں ایک ہی ہیں۔ اگر ایک شخص نبی کا نام تو عزت و تکریم سے لیتا ہے مگر اس کے طریق عمل کو مٹا رہا ہے، تو یہ بھی قتل نبی کا مرتکب ہو رہا ہے اور حدیث کی یہ وعید اس کے لئے تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہے۔ امام احمد اپنی مسند میں عبد اللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔

أشد الناس عذاباً رجل قتلہ نبیاً او قتلہ نبیاً، او امام ضلالة او مبطل من المبطلین۔

”شدید عذاب کا مستحق وہ شخص ہے جس کو نبی نے قتل کیا، یا اس نے نبی کو قتل کیا، یا جاہل اور گمراہ امام جسکی وجہ سے لاکھوں انسان گمراہ ہوں یا وہ شخص جو جاندار کی تصویر کھینچتا ہو۔“

نبی کی سنت کا زندہ کرنا خود اس رسول کو زندہ کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

من احیا سنتی فقد احیا منی ومن احیا منی کان معی فی الجنة۔

”جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

یا بنی وذلک من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنة۔  
 ”پنا! یہ میری سنت ہے اور جس نے میرے طریق عمل سے دوستی رکھی، وہ مجھے محبوب رکھتا ہے اور مجھ سے دوستی رکھنے والا میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔“  
 نبی ﷺ نے کتاب الزہد میں روایت کیا:

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید۔

”جب امت میں فتنہ و فساد ہو اور ایک مسلمان میری سنت سے تمسک و اعتصام کرے تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔“  
 یہ تمام روایات ببالغ دہل اعلان کرتی ہیں کہ نبی کی سنت کا زندہ کرنا خود اس نبی کو زندہ کر دینا ہے۔

عصیان و عدوان: اس کے عام معنی تو نافرمانی ہی کے ہیں، مگر اس کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مذہب کے جس قدر احکام ہیں ان کی ایک تو صورت ہوتی ہے جس کی پابندی ہر شخص کو کرنی پڑتی ہے، مگر ایک روح اور حقیقت بھی ہوتی ہے جو اس صورت کی پابندی سے پیدا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر مسلمان صاحب استطاعت عید اضحیٰ کے ایام میں قربانی کیا کرے، پھر سورہ حج میں اس کی حقیقت پر بھی روشنی ڈال دی۔ لَنْ يَنْتَظِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَآ دِمَآؤُهَا وَلَٰكِنْ يَنْتَظِرُ النَّفْسَ مِنْكُمْ ۖ (سورہ الحج ۳) گوشت اور خون میں سے خدا کے پاس کوئی چیز نہیں جاتی، بلکہ اس کا مقصد اصلی تو جذبہ ایثار و فدائیت کا پیدا کرنا ہے اور بس۔ حج سے فراغت کے بعد فرمایا کہ یہاں پر آکر لوگ دو قسم کے ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں صرف دنیا اور اس کی جاہ و منزلت مطلوب تھی اور یہ لوگ ملک و ملت کے لئے بیکار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کی نظر دنیا اور آخرت دونوں پر ہوتی ہے۔ اصل میں کام کرنے والے یہی ہیں۔ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورہ البقرہ ۲۰۱، ۲۰۲) آیتوں میں وہی تقسیم بیان کی گئی ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

شریعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چند اخلاق فاضلہ قوم میں پیدا ہوں، مگر ان کے لئے بعض اعمال کا پابند بننا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ حقیقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

جب کسی قوم میں تنزل شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اعمال کی روح و حقیقت کو کھو بیٹھتی ہے اور صرف ظاہری شکل و صورت پر زور دیتی ہے، اس کو عدوان کہتے ہیں۔ لیکن اس عدوان کا انتہائی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو بھی غیر ضروری سمجھنے لگ جاتی ہے، اس لئے کچھ مدت کے بعد احکام و اوامر کا ترک شروع ہو جاتا ہے اور لوگ شریعت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے، اس کا نام عصیان ہے۔

عصیان و عدوان کے امراض جب حد سے بڑھ جائیں اور اعمال مذہبی سے بعد و ہجر اپنے کمال پر پہنچ جائے، تو ان

لوگوں کی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے جن کے ذریعہ سے شریعت نوازش ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا جاتا ہے، ان کو حقیر و ذلیل خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور اگر ذرا انہوں نے حق و صداقت کے لئے آواز بلند کی، تو چونکہ وہ پہلے ہی سے ادنیٰ سمجھے جاتے تھے، ان کو قتل کیا جاتا ہے اور پھر اس کی آخری منزل اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا ہے جس کے بعد ذلت و رسوائی ہے اور غضب الہی ۱۰۔

### رفع اشتباہ

گذشتہ آیات سے معلوم ہو گیا کہ یہودیوں کی غلامی و محکومی کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے، اب یہ کبھی حکومت سے سرفراز نہ ہوں گے بلکہ ہمیشہ ماتحت ہی رہیں گے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر ان میں بعض افراد اچھے ہوں تو پھر بھی حکومت انہیں کو ملنی چاہئے، کیونکہ ذلت و مسکنت اجتماعی حیثیت سے نازل ہوئی ہے نہ کہ انفرادی اعتبار سے۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا جاتا ہے کہ:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مِنْ أَمْنِ يَوْمِ الْآخِرِ وَاعْبَادَ صَالِحِينَ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۲۷﴾ (البقرۃ ۱۲۷)

”پیشک وہ لوگ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین، جو کوئی ان میں سے اللہ پر اور پچھلے دن پر یقین لایا اور نیک کام کیا تو ان کی مزدوری ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں۔“

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت اس قسم کے لوگ موجود تھے جو اپنے سچے دین پر قائم اور راہ راست پر گامزن تھے، مگر ان کے کان آپ کی دعوت سے نا آشنا ہے تا آنکہ مر گئے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ ہو گا۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی، چنانچہ حسب ذیل روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

روی ابن جریر عن مجاہد فی قصۃ سلمان رسول اللہ ﷺ عن اولئک النصاری ومارای من افعالہم، فقال لم یوتوا علی الاسلام، قال سلمان فاظلمت علی الارض و ذکر ت اجتہا

۱۰ اس آیت میں یہودیوں کی چند خرابیاں ذکر ہوئی ہیں۔ (۱) عدوان (۲) عصیان (۳) قتل انبیاء (۴) کفر بایات اللہ۔ مسلمان اس آیت کو سرسری نظر سے دیکھ کر آگے نہ گزر جائیں بلکہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ان میں سے کوئی خرابی ہے جو ان پر صادق نہیں آتی۔ کیا عصیان و عدوان سے وہ اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہیں۔ اکثر افراد کا مذہبی کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ جو پابند ہیں وہ روح و حقیقت سے بے خبر ہیں صرف کلمہ کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ کس طرح رسول اللہ کی سنت کو مردہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے گویا دوسرے الفاظ میں رسول اکرم کے قتل کے درپے ہیں۔ پھر کفر بایات اللہ (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

تو اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ ہے۔ جب نوبت یہاں تک آگئی تو یہودیوں کو ان حرکات کا جو صلہ ملا، مسلمان بھی اس سے محروم نہیں رہے یعنی ذلت و مسکنت اور اللہ کا غضب ان کی حکومتیں چھین گئیں، غیروں نے ان پر قبضہ کر لیا بلکہ خود ان کو مدد دی کہ ہمارے بھائیوں کو فاکر و اور ان کے ملکوں پر قبضہ کر لو۔ اب محکومی و غلامی ہے، ذلت و رسوائی ہے اور خدا کے غضب میں مبتلا ہیں فاعتبوا یا اہل الابصار۔

دھم، فنزلت ہذا الایۃ، ان الذین امنوا والذین ہادوا، فدعا سلمان فقال نزلت ہذا الایۃ فی اصحابک ثم قال من مات علی دین عیسوی قبل ان یشیع علی فهو علی خیر ومن سب عیسی ولم یموت ہی فقد ہلک۔

”ابن جریر نے مجاہد سے سلمان کا بہت بڑا قصہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلمان نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ان انصاری کا کیا حال ہو گا اور ان کے اعمال کا جو اسی نے دیکھے تھے کہ جنہوں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ نہایت ہی زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ نے فرمایا ان کی موت کفر پر ہوئی۔ سلمان کہتے ہیں کہ سنتے ہی مجھ پر دنیا تاریک ہو گئی، میں نے ان کے ورع و تقویٰ کا ذکر کیا، پس یہ آیت ان الذین امنوا نازل ہوئی۔ آپ نے سلمان کو بلا کر کہا کہ تمہارے دوستوں کے حق میں آیت نازل ہوئی ہے، پھر فرمایا کہ جو شخص دین عیسیٰ پر مر گیا اور میری اطلاع اسے نہیں ہوئی تو وہ حالت اسلام میں مر اور جسکے پاس میری نبوت کی خبر پہنچ گئی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لایا تو ہلاک ہو گیا۔“

اس شان نزول نے خود بتادیا کہ اس آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آپ کے وقت تک موجود تھے اور حق و صداقت کو کھو نہیں بیٹھے تھے۔ قرآن حکیم کی دوسری آیتیں اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةَ لِدِّينَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصْرٰی ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قَسِيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَبَعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰی اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رُبُّنَا اَمَنَّا فَاَكْتَبَتْنَا مَعَ الشَّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۚ وَنَطْمَعُ اَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (المائدہ ۸۲، ۸۳)

”اور مسلمانوں کے لئے تبلیغ و دعوت کے اعتبار سے سب لوگوں میں ان کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں اور نیز یہ کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے اور جب قرآن کو سنتے ہیں جو اس رسول پر نازل ہوا ہے، تو ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہے کہ ان سے آنسو جاری ہیں، اس لئے کہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا ہے۔ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں، تو تصدیق کرنے والوں کے ساتھ ہم کو بھی لکھ رکھ اور ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر اور حق بات جو ہمارے پاس آئی ہے اس پر تو ایمان لائیں نہیں اور توقع یہ رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک بندوں کے ساتھ بہشت میں لے جا کر داخل کرے گا۔

پھر سورہ آل عمران کے آخر میں یوں ارشاد ہوا:

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ (ال عمران ۱۹۹)

”اور اہل کتاب میں سے بیشک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کتاب تم مسلمانوں پر اتاری ہے اور جو ان پر اتاری ہے، ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں اور اللہ کی آیتوں کے عوض میں تھوڑے سے دام نہیں لیتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے اجر ان کے پروردگار کے ہاں تیار موجود ہیں۔“



پس معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں وہی لوگ مراد ہیں جو آپ کی بعثت کے وقت موجود تھے، پھر جو ایمان لے آئے وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوں گے۔ باقی رہا حکومت کا مسئلہ تو وہ بھی ضمناً سمجھ میں آ گیا کہ بعض افراد تو ہر قوم میں اچھے ہوتے ہیں، لیکن ان کی وجہ سے تمام قوم کو عزت کا مستحق نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ اس کا فیصلہ ہمیشہ اجتماعی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ بات تو ہر ایک تسلیم کرے گا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ ارباب صلاح و تقویٰ ضرور ہوتے ہیں، اگر چند افراد کی اچھائی یہودیوں کو حقدار حکومت بناتی ہے تو دوسرے مذاہب بھی اس کے دعویٰ دار بن سکتے ہیں، پس یہ مطالبہ ہی سرے سے غلط ہے۔ تم ذرا ان کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو۔ ان لوگوں سے کیسی کیسی غلیاں سرزد ہوئیں جن میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے اور کچھ آگے آتی ہیں، پھر بتانا کہ ایسی قوم کے متعلق محکمہ تحقیق کا کیا فیصلہ ہونا چاہئے۔

### قانون سے نفرت

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ۖ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۲۱﴾

”اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تم پر پہاڑ اونچا کیا، ہم نے کہا جو ہم نے تم کو دیا اس کو زور سے پکڑو اور جو اس میں ہے اسے یاد کرتے رہو، شاید تم پناہ میں آ جاؤ۔ پھر اس کے بعد تم نے روگردانی کی۔ پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم زیاں کاروں میں ہوتے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ توراۃ کے پابند رہیں گے، وہ دامن کوہ میں کھڑے تھے اور اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ وہ ان پر گر رہا ہے۔ اس کے گرتے ہی تمام لوگ فنا ہو جائیں گے اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو قانون تم کو دیا گیا ہے وہی تمہارے لئے زندگی بخش ہے، اگر تم اس کو ترک کر دو گے تو مٹ جاؤ گے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے اور زیادہ واضح کر دیا کہ یہ پہاڑ تمہارے سامنے رفیع و بلند دکھائی دے رہا ہے، جب تک یہ اپنی جگہ پر قائم ہے تم زندہ ہو، جہاں تمہارے اوپر گرنا اور تم پس گئے، پس اسی طرح یقین کر لو کہ توراۃ کی پابندی میں زندگی ہے، اور ترک میں ذلت و رسوائی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ ان کے سر پر بلند کر دیا گیا تھا، بلکہ اپنے سامنے اس کو دیکھ رہے تھے۔ حدیث میں آتا ہے فرفعت لنا صخرة، جس کے معنی صاحب بحار الانوار نے یہ کئے ہیں کہ ظہرت لابصارنا، یعنی چٹان ہمیں نظر آنے لگی۔ پس یہاں بھی یہی معنی مراد ہیں کہ وہ اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔

باوجود اس قدر پکے عہد کے ان لوگوں نے نفرت کا اظہار کیا اور کہا۔ سَبَعْنَا وَعَصَيْنَا (البقرة ۹۳) ایک جگہ ان کا یہ قول نقل کیا: وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ (البقرة ۸۸) اور کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں، ہم اس نبی کی تعلیم قبول نہیں کرتے۔ اس عصیان اور نفرت کا نتیجہ تو یہی تھا کہ تم کو اسی وقت فنا کر دیا جاتا۔ مگر چونکہ اس وقت کوئی دوسری قوم تبلیغ



ودعوت کافر ادا کرنے اور دنیا میں قیام عدل کے لئے تیار نہ تھی، اس لئے ہم نے تم پر اپنا فضل کیا، تم میں برابر مجددین انبیاء بھیجے رہے جو تمہاری غلط کاریوں کی اصلاح کرتے اور پھر تمہیں راہِ راست پر لے آتے، انبیائے مجددین کے بھیجنے کو اس آیت میں فضل و رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں تک ان کے مرضِ تولی اور نفرت کا ذکر کیا۔ اگلی آیتوں میں اس کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں کہ انہوں نے کس کس طرح قانونِ الہی سے نفرت کی:

### حیلہ سازی

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۷۴﴾

“اور جن لوگوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی ان کو تم جان چکے ہو، تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر ہم نے اس قصہ کو عبرت بنایا ان لوگوں کے لئے جو اس وقت شہر میں تھے اور بعد میں آنے والوں کے لئے اور پرہیزگاروں کے لئے ہند و نصیحت۔”

اس واقعہ کی شرح دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَسَلُّهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِينَتُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرْعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ ۖ بَلَّوْهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۷۵﴾ (اعراف ۱۶۳)

“ان سے اس گاؤں کا حال دریافت کرو جو دریا کنارے واقع تھا، جب ان کے بڑے لگے بہت سی زیادتیاں کرنے کہ جب ان کے سبت کا دن ہوتا تو مچھلیاں پانی پر تیری ہوئی ان کے پاس آ جاتیں، مگر جس دن نسبت نہ مناتے نہ آتیں۔ اسی طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بسبب اس ی نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے۔”

بنی اسرائیل کے لئے شنبہ کا روز عبادت کے لئے مخصوص تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ اس دن کوئی کام نہ کیا جائے، جیسے اب بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ جب جمعہ کی اذان سنیں تو تمام کاروبار دنیوی ترک کر کے فوراً مسجد میں آجائیں، إِذَا نُودِيَ لِلْمَسْلُوكِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعة ۹) قانون کا تقاضا یہ تھا کہ یوم السبت کو مچھلی کا شکار بھی نہ کریں، مگر مصیبت یہ تھی کہ صرف شنبہ کے روز تو مچھلی بکثرت آتی اور باقی ایام میں ایک بھی نہ ملتی۔ دریا کے کنارہ پر رہتے تھے، ان کے لئے اس سے بہتر دوسری غذا نہ تھی، حیران تھے، آخر علمائے نے انہیں یہ حیلہ سکھا دیا کہ شنبہ کے روز دریا سے فاصلہ پر گھرے گڑھے کھود لیں تاکہ پانی آسکے، مچھلی بھی خود بخود آجائے گی، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دن بھر مچھلی گڑھوں میں آتی رہتی اور شام کو جا کر شکار کر لیتے، اس میں بظاہر قانون کی صورت بھی قائم رہی اور ان کی غرض بھی حاصل ہو گئی۔

یہ ارباب حیل کی فریب کاری تھی، جب اس مرض کی انتہا ہو گئی اور باوجود تنبیہ و تادیب وہ لوگ باز نہ آئے تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ ان لوگوں کے تین گروہ تھے، ایک وہ جو عوام الناس کو ان حیلوں کی تعلیم دیتا، دوسرا ان کی اس مکاری پر خاموش رہا اور تبلیغ و دعوت کا فرض ادا نہ کرتا۔ یہ دونوں گروہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئے، تیسرا فرقہ بچ گیا جو ان کے اصرار و تمرد کے باوجود وعظ و ارشاد میں برابر مصروف رہا۔ چنانچہ اس کی تفصیل دوسری جگہ آئی ہے۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۚ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۚ قَالُوا مَعَذِرَةَ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنحَنَّا الَّذِينَ يَتُخَفُونَ عَنِ السَّوْءِ ۖ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ ۖ بَمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٦﴾ (الاعراف ۱۶۵، ۱۶۶)

“اور جب ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے جو سبت کے دن شکار کرنے سے منع کرتے تھے کہا، کہ جن لوگوں کو خدا ہلاک کرنا یا ان کو سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، بھلا ان کو تم بے فائدہ کیوں نصیحت کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں اور یہ بھی خیال ہے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں۔ تو جب ان لوگوں نے وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں بھلا دیں، تو جو لوگ برے کام سے منع کرتے تھے ان کو تو ہم نے بچا لیا اور جو لوگ شرارت پر اصرار کرتے رہے، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں ہم نے ان کو عذاب سخت میں مبتلا کیا۔”

جب قوم کا بیشتر حصہ اس مرض خبیث کا شکار ہو گیا تو ان کی اخلاقی حالت بھی مسخ ہوتی چلی گئی۔ ان کے اخلاق جانوروں کی طرح ہو گئے۔ وہ اگرچہ انسانوں کی صورت میں تھے، مگر اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی چیز ماہہ الافراق نہ رہی تھی۔ اب وہ خیر البریہ کی بجائے شر البریہ، الاعمیٰ اور الذین لا یعلمون تھے۔ انجام کار، قوم کی قوم زنا کی عادی بن گئی اور جس کی آخری کڑی یہ تھی کہ وہ بندر اور سور بنا دیئے گئے۔ کیونکہ بعض امراض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ بالکل جانوروں کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان کی صحت عمدہ ہے، کوئی خارجی مضر چیز اس پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی، جہاں اس کی صحت نے جواب دیا کہ چاروں طرف سے امراض کا حملہ شروع ہو جاتا ہے اور طبیعت ان کو فوراً قبول کر لیتی ہے، یہی حال روحانی صحت و تندرستی کا ہے۔ جب ایک قوم بری عادتیں قبول کرنا شروع کر دیتی ہے تو سب سے پہلے اس کے اخلاق پر ان کا اثر نمودار ہوتا ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ جن حیوانوں کے اخلاق اس نے ابتدا میں قبول کئے تھے، انہیں کا برا اثر عالم مثال تک پہنچنے پر ان کی صورتیں اخذ کر لیں اور انجام کار، ان کی صورتیں بھی ویسی ہی ہو جائیں۔ انسان اگر تنزل کے گہرے گڑھے میں گرنا شروع ہوا اور اس سے انسانیت چھین لی جائے تو سب سے پہلے وہ بندر بنتا ہے، اس لئے کہ حیوانات میں سے انسانوں کے قریب ترین یہی جانور ہے۔

سورہ نساء میں اہل کتاب کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو اہل سبت کا ہوا، چنانچہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّن قَبْلِ أَن نَّطْفِئَ سَوْفَهَا فَنَرَكُمَا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمَا أَوْ  
نَنْعَمَهُمْ كَمَا نَعْنَأُ صُفُفَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٢٤﴾ (النساء ۴۷)

”اے اہل کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل فرمایا ہے اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے، قبل اس بات کے کہ ان کے چہرے بگاڑ کر ان کی پشت کی طرف کر دیں اور اب وہ تنزل کو ترفی خیال کرنے لگ جائیں یا جس طرح ہم نے اصحاب السبت کو پھینکا دیا تھا، ان کو بھی پھینکا دیں اور جو خدا کو منظور ہے وہ ہو کر رہے گا۔“  
قانون ترک کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ حیلہ جوئی سے کام لیا، اس کی ظاہری شکل بھی قائم رہی۔ دیکھنے والا اعتراض بھی نہیں کر سکتا اور اپنا مطلب بھی نکل آیا۔ اب اس کے چھوڑنے کی دوسری صورت بیان کی جاتی ہے۔

### باریک بینی

جب قانون پر عمل کرنا منظور نہ ہو تو اس میں فلسفیانہ موٹو گائیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات مل جائے۔ سوالات کثرت سے کئے جاتے ہیں۔ باتیں بہت سی پوچھی جاتی ہیں۔ فرضی صورتیں پیش کرتے ہیں اور ان تمام کا حاصل ترک قانون کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، ملاحظہ ہو:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۚ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُمُّدُ بِاللَّهِ أَنَّ أَكُونُ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿١٠﴾ قَالُوا اذْءُكُنَّا رَبِّكَ يَبِينُ لَنَا مَا هِيَ ۖ قَالَ إِنَّهَا يَقُولُ ۖ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا فَارِصٌ وَلَا بَكْرٌ ۖ عَوَانُ بَيْنَ ذَلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿١١﴾ قَالُوا اذْءُكُنَّا رَبِّكَ يَبِينُ لَنَا مَا لَوْ نَهَاكَ ۖ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ ۖ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ ذِي صَفْرٍ ۖ فَافْعَلْ لَّوْنَهَا تَسْمُهُ الظُّرَيْنُ ﴿١٢﴾ قَالُوا اذْءُكُنَّا رَبِّكَ يَبِينُ لَنَا مَا هِيَ ۖ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿١٣﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ ۖ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا ذَلُومَ تَبْشِيرَ ۖ وَلَا تَسْقِ الْحَرثَ ۖ مُسْلِمَةٌ ۖ لَا شَيْءَ فِيهَا ۖ قَالُوا النَّن جِئْتُ بِالْحَقِّ ۖ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٤﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ بولے، کیا تو ہم سے استہزا کرتا ہے، انہوں نے کہا، اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادانوں میں سے ہو جاؤں۔ بولے اپنے رب کو ہمارے لئے پکار کہ ہمیں بتادے وہ گائے کیسی ہے، کہا، وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہونہ بوڑھی اور نہ بن بیانی، ان کے درمیان ہے۔ پس جو حکم تم کو ملا ہے اس کو کرو۔ بولے اپنے رب کو ہمارے واسطے پکار ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ کہا حکم الہی یہ ہے کہ اس کا رنگ پیدا ہو۔ کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ بولے ہمارے لئے اپنے رب کو پکار کہ وہ بتادے کہ وہ کس قسم کی ہے کیونکہ ہم کو گایوں میں شبہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائیں گے۔ کہا وہ فرماتا ہے ایسی گائے ہو، جو نہ تو کبھی بل میں جوتی گئی ہو نہ کبھی آپ پاشی کے لئے کام میں لائی گئی ہو، پوری طرح صحیح سالم، داغ دھبے سے پاک و صاف بولے اب ٹھیک بات بیان کی، پھر اس کو ذبح کیا اگرچہ ایسا کرنے پر وہ (دل سے) آمادہ نہ تھے۔“

اگر وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم سنتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو انہیں اتنی تکالیف برداشت کرنے کی نوبت ہی نہ

آتی، مگر ان کی نیت نہ تھی، اس لئے کثرت سوال سے موسیٰ کو تنگ کر دیا۔ پس خود تنگی میں مبتلا ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ قانون اپنی ابتدائی شکل میں بہت سادہ اور سہل ہوتا ہے، مگر جوں جوں آپ سوالات کرتے جائیں گے، قیود اور پابندیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔ حضرت موسیٰ انہیں بار بار کہتے ہیں اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ مِثْرَا حکم بغیر کسی مصلحت کے نہیں بلکہ اس میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، مگر وہ اپنی کٹ جھتی سے کیوں باز آنے لگے، اس لئے نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأْتُمْ فِيهَا ۗ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۲۷﴾ قُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُعْطِي اللّٰهُ الْمَوْتِى ۙ وَيُرِيكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۸﴾

“اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر اس کے دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے اور جو تم چھپاتے تھے اللہ کو اس کا باہر نکالنا تھا۔ پھر ہم نے کہا اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور تم کو اپنے نمونے دکھاتا ہے، شاید تم عقل کرو۔”

جب ان لوگوں نے گائے ذبح کر لی تو اتفاق سے وہاں ایک قتل ہو گیا اور باوجود سخت کوشش کے قاتل کا پتہ نہ لگا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو حکم دیا کہ گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ مردہ زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا پتہ بتا دیا۔ اب اس پر اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتا ہے کہ جس حکم کی تمہیں مصلحت معلوم نہ تھی وہ کس طرح تمہارے لئے زندگی بخش ثابت ہوا۔ آئندہ تمہیں چاہئے کہ نبی کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ یقین کر لو کہ نبی کے ہر حکم میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت و حکمت ہوگی، مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہیں بھی اس کا علم ہو جائے۔ دیکھو گائے ذبح کرنا تم بے سود خیال کرتے تھے، مگر موسیٰ کو خبر تھی کہ اس پر عمل کرنے سے تمہیں کس قدر فائدے حاصل ہوں گے، پس پھر کبھی یہ حرکت نہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ انہیں گائے ذبح کرنے سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ:

(الف) نبی کی اطاعت قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قوم زندہ ہو جاتی ہے۔

(ب) نبی کے ہر حکم میں حکمتوں اور دانائیوں کے خزانے مخفی ہوتے ہیں۔

(ج) حیات قومی کے لئے قربانی الزام اللوازم ہے۔

بعض مفسرین نے قتل کے واقعہ کو پہلے فرض کیا ہے اور گائے کے ذبح کرنے کو اس کے بعد، حالانکہ قرآن حکیم کی آیات اس کی تائید نہیں کرتیں، بلکہ ان سے وہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم پہلے ہوا ہے، بعد ازاں اتفاقی طور پر دوسرا واقعہ پیش آگیا<sup>①</sup>۔

① (۱) آیات ماسبق میں علمائے یہود کی تین اصولی غریباں ذکر کی گئی ہیں:

(الف).... قانون الہی سے نفرت۔

(ب).... حیلہ سازی۔

(ج).... تعق اور باریک بینی۔

اگر صادق و مصدق رسول اکرم ﷺ کا یہ قول صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ:

لیاتین علی امتی ماتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل۔

”جو کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا وہی میری امت کے ساتھ ہو گا۔“

تو یقین کیجئے کہ علمائے یہود کے خرابیاں آج امت مسلمہ کے علمائے سو میں موجود ہیں۔ ہم پہلے حیلہ سازی کو لیتے ہیں، پھر باریک بینی پر بحث کریں گے، مگر صرف اشارات پر اکتفا کیا جائے گا۔

رسول ﷺ نے حیلوں کا سد باب یہاں تک کیا کہ قاضیوں کو ہدایا قبول کرنے سے روک دیا کہ رشوت ستانی کا ایک حیلہ بن سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہدایا الولا غلغل ابو داؤد میں ہے: استعملنا علی عمل و درمناہ و درمناہ اخذہ بعد ذلک فہو غلغل ہم نے اسے کام پر لگایا اور تنخواہ معین کر دی اس کے علاوہ وہ جو کچھ لوگوں سے لے گا وہ غلغل ہے۔ ایک روایت میں فرمایا: اخذ الامیر الہدیۃ سحت امیر کا ہدیہ قبول کرنا مال حرام کا لینا ہے۔ اسی طرح مقروض سے ہدیہ اور تحفہ کا لینا ناجائز قرار دیا کہ سود کے لئے حیلہ بن سکتا ہے۔ اذا اقترض احدکم قرضاً فاہدی الیہ او حبلہ علی ال دابتہ فلا ید کیہا ولا یقبلہ الا ان یکون جری بینہ و بینہ قبل ذلک اگر تمہارا مقروض تمہیں ہدیہ دے یا سواری کے لئے جانور پیش کرے تو اس پر سوار نہ ہونا اور ہدیہ بول نہ کرنا ہاں اگر پہلے ہی سے یہ سلسلہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اسی بنا پر اجلہ صحابہ نے ہدیہ مقروض کی نسبت فتویٰ دیا کہ وہ ربوہ میں داخل ہے۔

باوجود کتاب و سنت کی تصریحات کے ارباب دجل و فریب اور اہل جدل و مکارہ نے وہ وہ حیلہ سازی کی ہیں کہ:

دائے گر در پس امروز بود فردائے!

دوسری صدی کے شروع ہی میں بعض علماء سو اور فقہاء نے حیلہ تراشیں شروع کر دی تھیں اور تیسری صدی کتاب الحیل کی باقاعدہ تدوین و ترتیب عمل میں آگئی تھی، اس میں انہوں نے اپنے پیشرو یہودیوں کو بھی مات کر دیا۔ خدا کا حکم تھا کہ ہر مالدار کو کوڑے، انہوں نے سال کے آخر میں تمام مال بیوی کے نام بہہ کر دیا کہ خدا دعو کے میں آکر ہم کو مفلس و نادار سمجھے گا۔ و ما یخدعون الا انفسہم و ما یسعرون۔

اجیرہ زانیہ کے اجر مثل کا جزیہ کس سے مخفی ہے۔ اس نے صاف صاف زانیہ کی اجرت کو جائز قرار دیا اور تو سب کا رد بارز ثابت کیا، اس کے حلال و طیب ہونے کی صورت ملاحظہ ہو: ان یستأجرہا لکنس بیۃ اولطی ثیابہ او طبخ طعامہ او نقل متاع من مکان لی مکان و یشتہا طہا الزنا ثم ینزی۔

کسی شخص نے گھر کا کام کاج کرنے کے لئے یا کھانا پکانے کے لئے یا کسی اور فعل مباح کے لئے ایک عورت سے عقد اجارہ کیا کہ اتنی مزدوری پر میرا کام کر دینا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرائی کہ تجھ سے زنا بھی کروں گا، تو چونکہ یہ مشروع باطل و غیر مشروع بوضفہ ہے اس لئے اجارہ فاسد ..... (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھے) ہوا، لیکن اجرت حلال ٹھہری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی فقہی حیلے نے ذرا چشم و ابرو دیکھ کر کسی اچھی سی اما کو کام کاج کے لئے مزدوری پر رکھ لیا، ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرائی کہ گاہ کا کچھ اور مسئلہ بھی جاری رہے گا تو کسی اجرت اس ملا کے لئے جائز اور حلال و طیب ہے۔ تعالیٰ اللہ صلی علیہ وسلم علوٰ کہید۔

مسئلۃ نفاذ قضاء قاضی ظاہر ادا ہونا بھی اسی قبیل سے ہے۔ عدالت میں قاضی کے دو روایت بتا لیجئے پھر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا تو وہ حلال و طیب ہے اگر چہ صد ہا حیلوں اور مکاریوں کے بعد یہ فیصلہ صادر ہو ہو، گو باشریعت کے تمام اوامر و انوائی کا داور و داور اور مواخذہ آخرت کی بنا صرف دنیا کے احکام و ظواہر ہیں، روح و حقیقت اعمال اور محاسن و فضائل اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

دارزدستی این کو نہ آستیناں میں!

تعق اور باریک بینی: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہلک المتعقون باریک بینی کرنے والے ہلاک ہوں گے، مگر مسلمانوں نے اس کی پروانہ کی اور اب تو ان کے مذہب کی ہر شاخ میں اس طرح تعق جاری و ساری ہو گیا ہے کہ حق کو باطل سے الگ کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے، اس لئے کہ اس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔

پانی کتنا پاک ہو تا ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے، اس لئے کہ پیدا ہوتے ہی اس پاک و ناپاک پانی میں تمیز کرنی پڑتی ہے۔ اصل شریعت نے ہر انسان کی طبیعت اور سلامت و ذوق پر چھوڑ دیا تھا مگر ارباب فتاہت نے تو اس میں اتنی پابندیاں عائد کر دیں کہ مشکل پڑ گئی۔ اس میں فقہاء خرمان و بخارا کی تفریعات دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان کے نزدیک اس کو نہیں کا پانی ناپاک ہے جس میں سے چر سا اور رہت کے ذریعہ پانی نکالا جاتا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ اس میں گوبر وغیرہ گر جاتا ہو۔ یہی حال مسئلہ خلق قرآن اور امکان کذب باری کا ہے۔

## حیات قومی کی لئے تین قسم کے لوگوں کی ضرورت

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَّسْقَىٰ فَيَكْبِتُ مِنْهُ النَّبَاتُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَّهْبَطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، حالانکہ بعض وہ پتھر ہوتے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، وہ بھی ہیں جو پھٹتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کام سے بے خبر نہیں۔“

اس قسم کے واقعات تمہارے سامنے ہوتے رہے، اگر دیدہ عبرت وا ہو تا تو ہدایت و سعادت انسانی کے صدمہ ہمارے تھے جن کا ان سے پتہ لگ سکتا تھا، مگر تمہارے دلوں پر ان کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور سختی میں پتھروں سے بھی آگے نکل گئے، حالانکہ پتھروں کی مختلف قسمیں تمہارے سامنے ہیں اور ان کے حالات تم سے جدا لگائے۔

اور اس آیت میں دراصل اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی مثال دیکر کراہیکر حقیقت کبریٰ کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کے نشو و ارتقا کے لئے تین قسم کے ارباب علم و فضل کی ضرورت ہے۔

(الف) وہ اہل علم و معرفت جن کے قلوب میں فیوض و برکات الہیہ کے دریا موجزن ہوں، جو اپنے حکیمانہ مواعظ اور کتاب و سنت کے درس و افتاء سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مستفید کریں، چاروں طرف ان کے علم و فضل کی نہریں جاری ہوں اور ہر جانب کے تشنہ لب وہاں آکر اپنی پیاس کو دور کریں، ہزاروں دلوں کی زندگی کا باعث ہوں اور ان سابقین اولین کی فیض صحبت سے کوئی بھی محروم نہ رہے۔

(ب) ایسے صاحبان دانش و حکمت جو اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی راہ نمائی کر سکیں، ان کی آس پاس کی آبادی سے مستفید ہو اور اپنے ارد گرد رہنے والوں کی اصلاح کرنے کے قابل ہوں۔

(ج) وہ ارباب ورع و تقویٰ جن کے قلوب اپنے خالق کے ساتھ وابستہ ہوں اور اللہ کا خوف ان کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو، جب انہیں کوئی صحیح بات بتادی جائے ان کی گردنیں فوراً اس کے آگے جھک جائیں۔ وہ یکسر اطاعت و انقیاد ہوں اور اس کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔

جب تک کسی قوم میں مذکورۃ الصدر تین قسم کے لوگ موجود رہیں گے قوم زندہ رہے گی اور ان کا فہم ان اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہو گا۔ بنی اسرائیل سے یہی کہا جاتا ہے کہ گذشتہ تین اصولی غلطیوں کے ارتکاب کے بعد تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے اور تمہاری طبیعتیں اس درجہ کند ہو گئیں کہ اب وہ کسی صحیح تعلیم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتیں، اس لئے تم پتھر سے بھی گزرے ہو، پھر خلافت و حکومت تمہیں کیسے دی جاسکتی ہے۔

## دست و بازو نہیں بن سکتے

گذشتہ آیات میں اس مضمون کو صاف کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل مسلمانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں، ان پر ہمیشہ کے لئے ذلت و مسکنت لازم کر دی ہے اور اب انہیں حکومت نصیب نہ ہوگی، اب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس درجہ اپنے قوائے علیہ کو برباد کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ان کے دست و بازو بن کر بھی تبلیغ و اشاعت مذہب کی قابلیت ان میں باقی نہیں اور ان کے ساتھ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مساوی نہیں۔

أَقْتَضَىٰ مَوْزُؤُا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرَّفُونَ مِّنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾  
 “اب کیا تم مسلمانوں تو قیام رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لینگے اور ایک گروہ تھا ان میں جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر سمجھنے کے بعد اس کو بدل ڈالتا تھا اور وہ جانتے تھے۔”

علماء کی شان یہ ہے کہ جس قدر صحیح تعلیم ان کے پاس ہے، بغیر رد و بدل اور حک و اضافہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ یہودیوں کے عالم اس بات سے واقف تھے کہ سرزمین حجاز میں نبی آخر الزماں کی بعثت ہوگی۔ انہیں اوس و خزرج کے مقابلہ میں جب کبھی شکست ہوتی تو ہمیشہ انہیں ڈراتے کہ وہ وقت بہت قریب ہے، جب ہم اس نبی کے ساتھ مل کر تمہیں فنا کر دیں گے، چنانچہ یہی تادیبی کلمات اوس و خزرج کے اسلام کا باعث بنے۔ لیکن جس وقت آپ کی بعثت ہوئی تو چونکہ آپ بنی اسرائیل میں نہیں پیدا ہوئے تھے، انکار کر بیٹھے اور جس قدر پیشین گوئیاں حضور اقدس کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں، ان کو لفظاً و معناباً لٹا کر شروع کر دیا۔

قرآن حکیم نے تحریف کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ و معنی دونوں پر مشتمل ہے، کتاب مقدس میں تحریف لفظی اور معنوی کا ہونا اس درجہ مسلم اور متفق علیہ امر ہے کہ اب اس پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ خود عیسائی محققین تسلیم کرتے ہیں کہ لفظی اور معنوی دونوں تحریفیں عمل میں آئی ہیں۔ دوسری جگہ اہل کتاب کی اس خرابی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ۚ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ (المائدہ ۱۳)  
 “لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے اور ان میں سے چند لوگوں کے سوا سب کی چوری کی اطلاع تم کو ہوتی ہی رہتی ہے۔”

یعنی اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کا اثر یہ ہوا کہ ایک حصہ کتاب کا بالکل چھوڑ بیٹھے اور جس پر عمل کرنے کا ارادہ ہوا اس میں اپنی مطلب پرستی کے لئے بجا تاویلات شروع کر دیں اور اس طرح تمام کتاب بیکار ہو گئی ❶۔

❶ قرآن حکیم تعریف لفظی سے تو محفوظ رہا مگر معنوی تحریف سے نہ بچ سکا۔ قرآن پڑھنے کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص خالی الذہن ہو کر اس میں غور و فکر کرے اور شارع علیہ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھے، پھر دیکھے قرآن کن عقائد و غیثیات کی تعلیم دیتا ہے اور کن اخلاق و اعمال پر زیادہ زور دیتا ہے۔ مگر اب حالت



پھر ایسے خائن اور بد دین مسلمانوں کے ساتھ مل کر کیا کریں گے، یہاں بھی ان ناپاک حرکات سے باز نہ آئیں گے بلکہ مسلمانوں کو ان کا خوگر بنانے کی کوشش کریں گے۔ وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ ۱۲۰) حدیث میں آتا ہے۔ لَا إِيْمَانُ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لِلّٰهِ۔

### کتمان حق

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَا بِغَضُومِهِمْ إِلَىٰ بَعْضِ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٥٩﴾

”اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم مسلمان ہوئے اور جب ایک دوسرے کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں، کیوں ان کو خبر دیتے ہو اس کی جو اللہ نے تم پر کھولا ہے تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے رب کے آگے تم کو جھوٹا ثابت کریں، کیا تم کو عقل نہیں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔“

منافقین یہود کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں پر اپنا اخلاص و ایمان ظاہر کرنے کے لئے کبھی کبھی ان پیشین گوئیوں کو بیان کر دیا کرتے تھے جن میں حضور ﷺ کا ذکر ہوتا، مگر جس وقت انہیں علماء و احباء کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تو ان کو تنبیہ کی جاتی کہ ان امور کی اطلاع مسلمانوں کو کس لئے دیتے ہو۔ یہی چیزیں قیامت کے دن ہمارے لئے الزام کا باعث بن جائیں گی اور ہم خدا کے روبرو ملزم قرار دیئے جائیں گے۔ مگر ان کے چھپانے سے ہوتا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے، وہ وحی والہام کے ذریعہ آپ کو ان پیشین گوئیوں کی اطلاع دیدیگا۔ چنانچہ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ناموس الہی نے آپ کو شیل موسیٰ قرار دیا۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾ (الزلزلہ) (مسلمانوں کے علمائے سونے مسائل جہاد کو حکومت سے ڈر کر مخفی رکھا اور یہودیوں کے نقش قدم پر چلے۔)

### جہلائے یہود کی حالت

ان آیتوں میں یہودی عالموں کی چند کمزوریاں بیان کی ہیں، مسلمانوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ اگر عالم ہمارا ساتھ نہ دیگئے تو شاید جاہل اس طرف رخ کریں اور نکثیر سواد ہی کا فائدہ حاصل ہو، اگلی آیت میں ان جاہلوں کے خیالات کا تذکرہ ہے، پس جن لوگوں کے افکار و خیالات اس قسم کے ہوں، ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا فضول ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَاحٍ وَّانْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٥٨﴾

یہ ہے کہ عقائد پہلے معین کر لئے جاتے ہیں پھر ان کی تائید کتاب سے تلاش کی جاتی ہے اور اپنی رکیک تاویلات کا اس کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی کو تحریف معنوی کہتے ہیں جس کا ذکر صحیفون الکلم عن مواضع میں ہوا۔ ایک حنفی اھتے ہے اور تمام قرآن کو فقہ حنفی کے مطابق کر دکھاتا ہے۔ ایک شافعی کہتا ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت مذہب شافعی کی تائید کرتی ہے۔ یہی حال مالکیوں اور حنبلیوں کا ہے اور ارباب بدع و احداث کا کیا کہنا گویا قرآن صرف انہیں امور کے لئے نازل ہوا ہے۔ فواسفا!



”اور ان میں جاہل ہیں جو کتاب کی تو خبر نہیں رکھتے مگر آرزوئیں بنا رکھی ہیں اور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ گمان کرتے ہیں۔“

امانی، امینۃ کی جمع ہے جس کے معنی تلاوت کے ہیں، ایک شاعر کہتا ہے۔

تبنی کتاب اللہ اول لیلۃ

تبنی داؤد الیہور علی رسل

یعنی جاہل توراۃ پڑھتے ہیں مگر مفہوم و مطلب سے کوئی غرض نہیں، صرف الفاظ پر قناعت کرتے ہیں اور طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں، باوجود اس کے یقین رکھتے ہیں کہ جنت میں داخل ہوں گے۔ معنی سمجھے بغیر کتاب الہی کس کام آسکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی آرزو اور خواہش کے لئے ہیں، روح المعانی میں ہے:

”امانی جمع امینۃ واصلہا امنیۃ افعولۃ وھو فی الاصل مایقدر الانسان فی نفسه من منی اذا قدر ولذلك تطلق علی الکذب وعلی مایتمنی۔“

گویا لکھنا پڑھنا جانتے نہیں مگر خواہشات بڑی بڑی ہیں، اپنے علم سے جو کچھ سن رکھا ہے اسی کو مایہ ناز و سرمایہ آخرت تصور کرتے ہیں۔ ان کی آرزو ہائے باطلہ ملاحظہ ہوں:

”کہ جنت میں یہودی اور نصرانی کے سوا اور دوسرا کوئی شخص نہیں جاسکتا: لَنْ یَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصْرٰی (البقرۃ ۱۱۱) اگر بہ فرض محال یہودی جہنم میں گئے بھی تو صرف چند روز کے لئے: وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرۃ ۸۰)“

اس قسم کے خیالات فاسدہ ہیں جو ان کو خوش رکھتے ہیں۔ حالانکہ جنت میں جانے کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی کی جائے اور قلب سلیم لے کر اس کے حضور میں حاضر ہو: اِلَّا مَنْ لَّی اللّٰہُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٌ (الشعر ۸۹) نیز فرمایا: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْہُہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُخْصِیْنٌ فَلَہٗ اَجْرٌ کَاَعْدَدَ رَبِّہٖ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمۡ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ ۱۱۲) ❶

فَوَيْلٌ لِلَّذِیْنَ یُکْتَبُونَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْہِمۡ ۚ ثُمَّ یَقُولُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لَیْسَتْۡ اِیْہِ تَمَنَّا قَلِیْلًا ۚ فَوَيْلٌ لَّہُمْ مِمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْہِمۡ وَوَيْلٌ لَّہُمْ مِمَّا یُکْتَسِبُوْنَ ۝

❶ دونوں امراض مسلمانوں میں موجود ہیں، عام دستور ہے کہ فجر کی نماز کے بعد مفہوم سمجھے بغیر ایک دو جزو پڑھ لیں گے اور اس پر اپنے آپ کو ثواب کا مستحق خیال کریں گے۔ تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ صحابہ کا طرز عمل قرآن کے متعلق کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال میں بقرہ ختم کی، خود صاحب وحی والہام رات رات بھر ایک آیت میں صرف کر دیتے۔

فائین الثبیا وائین الثری  
وائین معاویۃ من علی

یہی حال مسلمانوں کے عقائد کا ہے، اعمال صالحہ سے اجتناب، اخلاق فاضلہ سے پرہیز، بدعات و محدثات میں مبتلا اور جنت کے ٹھیکیدار:

وسوف تری اذا انکشف الغبار  
افس تحت رجلک امر حبار

”پس ان لوگوں کے لئے خرابی ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اس کے عوض میں تھوڑی سی قیمت لیں۔ پس خرابی ہے ان کے لئے کہ ان کے ہاتھوں نے لکھا اور خرابی ہے ان کے لئے کہ اس کو پیشہ بنالیا۔“

اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ کتاب الہی کی آیات کے ساتھ اہل علم اپنے تفسیری نوٹ اور حواشی بھی لکھ لیا کرتے تھے، آیت میں اور ان جملوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ رکھتے تھے اور اس لئے دوسرا شخص دونوں میں تمیز نہ کر سکتا تھا، جب عوام ان سے کوئی مسئلہ پوچھتے تو یہ ان حواشی کو دیکھ کر جواب دے دیتے اور کہتے کہ یہی خدا کا حکم ہے، حالانکہ وہ ان کی اپنی خواہشات اور ابلیسی الہامات کا آئینہ ہو تا تھا اور یہ شیطنت صرف اس لئے کی جاتی تھی کہ رؤسائے قوم کے یہاں ان کو قدر و منزلت نصیب ہو اور دولت ہاتھ آئے اور ہر جگہ آؤ بھگت ہو، قل متاع الدنیا قلیل، اگر دنیا کے تمام خزان بھی ایک شخص کے قبضہ میں آجائیں، یہ بھی اس کی خواہشات کو پورا نہ کر سکیں گے، کیونکہ آرزوں کا سلسلہ دراز تر ہو تا جائے گا<sup>۱۰</sup>۔

ویل کالفظ قرآن حکیم میں تین معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(الف) اگر گناہوں کی حالت ابتدائی ہے تو ویل کے معنی افسوس کے ہوں گے، ایک شریف انسان کے لئے اتنا بھی بہت ہو تا ہے۔

(ب) درمیانی حالت میں اس کا مفہوم تباہی و بربادی ہو گا۔

(ج) اور آخری حالت میں اس سے دوزخ مراد لی جائے گی۔

## نجات کا قانون

وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۖ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَكُمْ أَفَرْتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

”اور کہتے ہیں کہ ہم کو سوائے گنتی کے چند روز کے آگ نہ لگے گی، ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے کہ اللہ اپنے قول کے خلاف نہ کرے گا یا جاننے کے بغیر اللہ پر جھوٹ بولتے ہو۔“

کہتے ہیں کہ یہودی خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی جہنم میں داخل نہ ہو گا۔ البتہ مجرموں کے لئے چند روز کا عذاب ضروری ہے، تعداد ایام کے متعلق روایات مختلف ہیں، بعض سات روز کہتے ہیں، بعض کا عقیدہ چالیس ایام کا ہے اور گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ تو کسی کا بھی عقیدہ نہیں۔

<sup>۱۰</sup> آج کل عربی مدرسوں میں تمام تر قوت تفسیروں اور ان کے حواشی میں صرف کی جاتی ہے حالانکہ قرآن میں غور و فکر کرنا اور ہے اور تفسیروں میں بحث و نظر اور، جب لوگ علماء مسائل دریافت کرتے ہیں توفیق کی چند کتابوں کے حوالے لکھ کر جواب دیا جاتا ہے کہ خدا کا یہی حکم ہے۔ کتاب و سنت پر اصحابہ الرأی کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔

عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اس لئے سولی پر چڑھے کہ تمام بدکاروں کے لئے کفارہ بن جائیں، اب جو شخص بھی ان پر ایمان لے آئے گا اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی ❶۔

قرآن حکیم نے اگر ایک طرف کفارہ کا ابطال کیا لا تزودا زماخری، تو دوسری جانب یہ بھی بتادیا کہ کسی بزرگ کی اولاد میں سے ہونا یا کسی ولی کی طرف منسوب ہونا نجات کا باعث نہیں ہو سکتا۔ نجات دنیوی و اخروی کے لئے عمل صالح اور ایمان باللہ کی ضرورت ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ نوح جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنے بیٹے کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تو وہاں سے جواب ملا: إِنَّهُ كَيْسٌ مِنْ أَهْلِكَ ❶ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود ۴۶)۔ تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ نوح ولوط کی بیویوں کو صرف اس لئے جہنم میں بھیج دیا گیا کہ انہوں نے عمل صالح کو اپنے پاؤں سے ٹھکرا دیا اور پیغمبروں کی رشتہ داری کے گھمنڈ میں مغرور ہو گئیں: فَحَبَّ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتِ نُوحٍ وَ امْرَأَتِ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَاثَتَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ❷ (التحریم ۱۰)۔ تم اس کو بھی نہیں بھولو گے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو وہ صفا پر تمام قبائل مکہ کو بلا کر ان کے سامنے دعوت حق پیش کی تو اس خطبہ کے آخری الفاظ کیا تھے: فاطمہ بنت محمد انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك ضرا ولا نفسا، اے فاطمہ محمد کی بیٹی، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالے، اس لئے کہ میں تیرے نفع و ضرر کا ذرہ برابر بھی مالک نہیں ہوں، پھر یہ کس درجہ جہل و نادانی ہے کہ بزرگوں کے نام لیا ہونے کی بناء پر نجات کے دعویدار بنتے ہیں اور دل ایمان سے خالی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی چیز کام نہ آئے گی، اس کے دربار میں مجازات عمل کا قانون یہ ہے:

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ❶ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ❷ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ❸ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ❹

”کیوں نہیں، جس نے گناہ کیا اور اس کو اس کے گناہ نے گھیر لیا، یہی لوگ دوزخ کے ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہی جنت کے لوگ ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔“

جب ایک شخص بدی کا مرتکب ہو اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اور زیادہ لذت و حظ نفس محسوس کرے تا آنکہ ہدایت و رشد کے تمام راستے بند ہو جائیں، وہ شخص بد اخلاقی کی آگ سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا اور بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نجات کا ذمہ نہیں لے سکتی، صرف اعمال صالحہ ہی سعادت اخروی کی کفالت کرتے ہیں۔ فَبِمَنْ يَّعْمَلُ مَتَقَلِّ ذُرَّةً خَيْرًا يَرَىٰ ❶ وَمَنْ يَّعْمَلُ مَتَقَلِّ ذُرَّةً شَرًّا يَرَىٰ ❷ (الزلزال ۸) اور فیصلہ یہ ہو گا۔ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ❸ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ❹ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ❺ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ❻ وَمَا أَزْدُرُكَ مَا هِيَ ❼ نَارًا حَامِيَةً ❽ (القارعة ۹، ۱۰)۔

❶ یہی عقیدہ اب مسلمانوں میں رائج ہوتا جاتا ہے، جس نے امام حسین علیہ السلام کے عشق میں دو آنسو بہا دیئے، جو شیخ عبد القادر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں داخل ہو گیا وہ بھی دوزخ میں نہ جائے گا۔ یہ خیالات فاسدہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مسلمانوں میں آئے اور اب مسلمان اس پر لہنا دعوئی جمائے پیٹھے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انہا ہی اعمال کم تردد علیکم فمن وجد خیرا فليحب الله ومن وجد غير ذلك فلا يلومن الانفسه،  
”یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کا احتساب تم سے کیا جا رہا ہے، اگر حسن ثواب ملا تو خدا کا شکر ادا کرو، ورنہ تم خود ملامت کے قابل ہو۔“

### عہود و موافق

اب تک یہودیوں کی غلط کاریاں ذکر کیں، علماء کے امراض پر اصولی بحث کی اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید کی، آئندہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خداوند قدوس سے جو عہد و پیمان کیا تھا اس کا کیا حشر ہوا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٦﴾

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا، ماں باپ اور شہ دار اور یتیم اور مسکین سے نیک سلوک کرنا اور لوگوں کو نیک بات کہنا اور نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، پھر تم میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب پھر بیٹھے اور تم کو دھیان نہیں۔“

بنی اسرائیل سے حسب ذیل باتوں کا عہد لیا گیا تھا۔

(۱).... اللہ کے سوا کسی دوسرے کی غلامی نہ کریں، اپنی ضروریات زندگی میں اسی سے طالب اعانت ہوں اور سب سے باغی بن کر اس ایک کی اطاعت کا جو اپنی گردن میں ڈال لیں تاکہ سب کے سامنے سر بلند ہوں: میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لئے کوئی صورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا، تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔ (خروج ۵: ۳، ۴)

(۲).... چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد شان ربوبیت میں والدین ہی ہوتے ہیں، عاصی و نافرمانیہ دار اولاد پر احسان کرنے سے جی نہیں چراتے اور اپنی اولاد کے لئے ہر کمال کے آرزو مند رہتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ برواحسان کا حکم دیا، تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے (خروج ۲۱: ۲۰) قرآن حکیم نے اس پر اور زیادہ زور دیا، ایک جگہ فرمایا:

وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا أما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما - واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحهما كما ربياني

صغیرا۔ (بنی اسرائیل ۲۳)

”اور تمہارے پروردگار نے حکم قطعی دیدیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔ اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو ان کے آگے“ ہوں ”بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے کہنا تو ادب سے کہنا اور محبت سے خاکساری کا پہلوان کے آگے جھکائے رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کوپالا ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم کی جیو۔“

(۳).... عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، یہ بھی دراصل ماں باپ کی محبت کا ایک جز ہوتا ہے اور وہ صلہ رحمی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں: اور ان میں سے جو میرے دوست ہیں اور میرے حکموں کو یاد رکھتے ہیں ہزاروں پر رحم کرتا ہوں (استثنائی ۵:۰۲)

(۴).... یتامیٰ اور مساکین کی نصرت و اعانت: اور لاری اس لئے کہ اس کا کوئی حصہ اور میراث تیرے ساتھ نہیں اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھانکوں کے اندر ہیں آویں اور کھادیں اور سیر ہوویں۔ (استثنائی ۹۲:۹۱)

(۵).... ان پر یہ بھی لازم کر دیا گیا کہ لوگوں سے ہمیشہ اچھی بات کہیں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کریں۔ مگر تم ان میں پورے نہ اتارے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَضْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فِرَاقًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ ۖ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَإِن يَأْتُواكُم اُسْرًا تَعْلَوْهُمْ ۖ وَهُوَ مُحَرَّرٌ عَلَيْكُمْ ۖ اِخْرَاجُهُمْ ۖ اَفْتَوْا مَنْ يُّؤْنِ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ؕ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلَىٰ اَشَدِّ الْعَذَابِ ۖ وَمَا لِلّٰهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٥١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٥٢﴾

”جب ہم نے تم سے قول لیا کہ آپس میں خون نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے شہروں سے جلاوطن کرنا، پھر تم نے اقرار کیا اور تم اقرار کرتے ہو۔ پھر وہی تم ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور نیز اپنوں میں سے کچھ لوگوں کے مقابلہ میں ناحق اور زبردستی ایک دوسرے کے مددگار بن کر ان کو ان کے شہروں سے جلاوطن کرتے ہو اور اگر وہی لوگ قید ہو کر تمہارے پاس آویں تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا، تو کیا یہ اس لئے ہے کہ کتاب الہی کا کچھ حصہ تو ماننے ہو اور کچھ حصے سے منکر ہو، پھر تم میں سے جن لوگوں کے کاموں کا یہ حال ہے انہیں پاداش عمل میں اس کے سوا کیا مل سکتا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب اور تمہارے کاموں سے اللہ بے خبر نہیں، یہی ہیں جنہوں نے آخرت دیکر دنیا کی زندگی خریدی، سو نہ تو ان کے لئے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد دی جائے گی۔“

علاوہ ان عہود و موافق کے جن کا ذکر گذشتہ آیت میں گذر چکا ہے، ان سے تین اور باتوں کا بھی اقرار لیا گیا تھا۔  
(الف) خانہ جنگی کر کے باہم خوں ریزی نہ کرنا کہ اس سے تمہاری اجتماعی قوت کو نقصان پہنچے گا اور حیات قومی فنا ہو جائے گی۔

(ب) اپنے عزیزوں کو ترک وطن پر مجبور نہ کرنا کہ ادھر تو تمہاری جماعت روز بروز کم ہوتی جائے گی اور اس طرح وہ جلا وطنی کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے تنگ آکر تمہارے دشمنوں کے ساتھ سازش کر لیں گے اور اس طرح غیروں کو تم پر حملہ کرنے اور تمہیں غلام بنانے میں آسانیاں پیدا کر دیں گے۔

(ج) اپنی قوم میں سے کسی کو گرفتار نہ ہو تا دیکھو تو فدیہ ادا کر کے اسے چھڑا لینا۔ ان لوگوں نے پہلے دو حکموں کی تو پروانہ کی مگر تیسرے لئے خوب اہتمام کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں اوس اور خزرج کی دو قومیں بستی تھیں جن کی ہمیشہ آپس میں جنگ رہتی۔ شہر کے اطراف میں یہودیوں کے بھی دو قبیلے آباد تھے، بنو نضیر اور بنو قریظہ، ان میں سے اوس اور بنو قریظہ باہم ایک دوسرے کے حلیف تھے، ایسے ہی خزرج اور بنو نضیر آپس میں معاہدہ تھے، جب کبھی اوس و خزرج میں جنگ ہوتی، ان قبائل کو بھی بوجہ دوستی اور حلفانہ کے ان کی مدد کرنی پڑتی۔ پھر جنگ کے نتائج میں جہاں اوس و خزرج بے خانماں برباد ہوتے، بنو قریظہ اور بنو نضیر بھی اس مصیبت سے محفوظ نہ رہ سکتے۔ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ بنو نضیر کے اخراج میں بنو قریظہ کا دخل ہوتا تھا اور بنو قریظہ کی جلا وطنی میں بنو نضیر حصہ دار ہوتے تھے، البتہ اتنا ضرور تھا کہ جب ایک جماعت میں سے کوئی اسیر ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال سے راضی کر کے قیدی کو رہا کر ادیتی۔ اگر کوئی ان کی اس حرکت پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ اسیر کارہا کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے اور جب لوگ یہ کہتے کہ قتل و اخراج میں تم نے کیوں دشمنوں کی مدد کی تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ دوستوں کا ساتھ نہ دینا عار اور ننگ کی بات ہے۔

اس یہودہ حرکت پر انہیں کہا گیا کہ مرض بھی برابر پیدا کرتے رہیں اور علاج بھی جاری رکھیں، یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس طرح کبھی مرض نہیں زائل ہوا کرتا۔ پس ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں ذلیل کر دیئے جائیں اور کبھی انہیں عزت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ بنو نضیر کو رسول اللہ ﷺ نے ملک شام کی طرف جلا وطن کر دیا۔ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنالیا۔ سچ ہے ایسے لوگوں کی سزائیں نہ تو کسی قسم کی تخفیف ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ان کی طرفداری کر سکتا ہے۔

ہمیشہ سے عادت ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَعَّلْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ  
الْقُدُسِ ۖ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ ۖ فَفَرِّقْنَاهَا كَذَّبْتُمْ ۖ وَفَرَّيْقَاهَا تَفْتَلُونَ ﴿٢٤﴾

”اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو صریح معجزے دیئے اور پاک روح سے ان کی امداد کی، تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہش کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلادیا اور ایک جماعت کو قتل کرتے۔“

اگر ایک قوم سے احیائاً غلطی ہو تو درگزر کیا جاسکتا ہے مگر جس کی صدیوں سے یہی کیفیت ہو، اس کے لئے بہترین فیصلہ یہی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے تلوار پھین لی جائے اور نوع انسانی کا ہر فرزند اس بد بخت قوم سے نفرت کرے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نوع انسانی پر معاش و معاد کے اعتبار سے کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے، اگر پہلے سے اس کا سد باب نہ کیا گیا تو نسل انسانی فنا ہو جائے گی، اس وقت خطیرۃ القدس میں ملأء اعلیٰ کے تمام فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ بنی آدم کو اس واہیہ کبریٰ سے کسی نہ کسی طرح بچانا ضروری ہے، اس بحث و مشاورہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں جو شخص ہر اعتبار سے بہترین ہو، اس کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور تمام ہمت اس کی تعلیم و تربیت میں صرف کی جاتی ہے۔ اس کے احکام و اوامر نافذ کرنے کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ ارباب فہم و فراست کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ اس کے لئے یکسر اطاعت و انقیاد بن جائیں اور اس طرح یہ پاک اور مزیں گروہ امة اخراجت للناس کی مصداق ہو۔

ازکی خلق اللہ کا قلب اب ان ملائکتہ الرحمن کے وحی والہام کا مورد بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں ایسے خیالات و افکار پیدا کئے جاتے ہیں جو اس ملت کی رشد و ہدایت اور فلاح و کامرانی کا باعث ہوں۔ کبھی تو وحی والہام سے اس کی اعانت ہوتی ہے، کبھی رویائے صادقہ مدد کا باعث بن جاتے ہیں اور بعض اوقات ہاتف غیبی سے نصرت و یاوری ہوتی ہے، ایسا بھی ہوا کہ فرشتوں نے آکر اس سے بالمشافہ گفتگو کی ہے۔

فرشتوں کی یہ جماعت اس ازکی خلق اللہ کے دوستوں اور مددگاروں کی امداد و اعانت کو اپنا فرض اولین خیال کرتی ہے، ہر خیر و برکت سے انہیں حصہ دیا جاتا ہے، مگر جو لوگ اس کے مخالف ہوں ان کو رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے۔ ہر تکلیف و مصیبت ان پر طاری کی جاتی ہے کہ ان کی ہمتیں پست ہوں اور دنیا و آخرت میں انہیں ذلت و رسوائی نصیب ہو۔ نبوت کے اصول و کلیات تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ملا اعلیٰ کا اجماع بھی ان میں سے ایک اصل ہے۔ اسی اجماع کا نام شریعت کی اصطلاح میں تائید روح القدس ہے۔ جب اس کی خیر و برکت کسی نفس ذکی کے شامل حال ہو تو اس سے اس قدر عجیب و غریب برکات کا اظہار ہوتا ہے کہ عادیۃً ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ انہیں برکات کو معجزات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ تائید روح القدس ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات بکثرت ظہور میں آئے۔



## ماتحت نہیں رہ سکتے

بنی اسرائیل کے متعلق اب تک دو باتوں کا فیصلہ ہوا ہے:

(۱) ان میں حکومت کرنے کی قابلیت نہیں اور تلوار ان سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہے۔

(۲) مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ان کے دست و بازو بن کر دعوت و ارشاد کا فرض ادا نہیں کر سکتے۔

آئندہ بتایا جائے گا کہ ان لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا یا ان کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم کرنا بھی جائز نہیں۔ ان کی تمام قومی زندگی و غلبہ سازی اور حیلہ سازی کی تاریخ ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی نگرانی میں رہ کر بھی چین سے نہ بیٹھیں گے، بلکہ اوّل تو ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ یہی امراض و مفسد مسلمانوں میں پیدا ہوں اور اگر اس میں ناکام رہے تو ان کے ساتھ دھوکا کریں گے اور عین وقت پر نقصان پہنچائیں گے، اس لئے آگے چلکر یہ تعلیم دی جائے گی کہ ان سے ترک موالات کے بغیر چارہ ہی نہیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات و روابط رکھنا ممنوع و ناجائز ہے۔

## تقلید اعلیٰ

وَقَالُوا اقْتُلُوا بُنَا غُلْفًا ۖ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۳﴾

”اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے، یہ نہیں، بلکہ ان کے کفر کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت کی، پس بہت کم ایمان لاتے ہیں۔“

ان لوگوں نے امانت کے ادا کرنے میں، ہمیشہ خیانت سے کام لیا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک گندگیوں اور نجاستوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غلف، اغلف کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو پردہ کے اندر ہو۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ اپنے آپ کو قرآن حکیم کی تعلیم سے بے نیاز خیال کرتے ہیں اور غرور و تکبر کی بنا پر اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی آیات بینات ان کے قلوب و اذہان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ غلف، بضم اللام، غلاف کی جمع ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ہمارے دل خزینہ دار علم و حکمت ہیں۔ ہمیں آپ کے سامنے زانوے ادب نہ کرنے کی ضرورت نہیں: فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (المؤمن ۸۳) ”اور جب ان کے رسول ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو یہ لوگ اپنی لیاقت علمی پر بڑے نازاں ہوئے۔“

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مذہبی امام و پیشوا ہیں، ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو گئے، ان کا اوّلین فرض یہ ہونا چاہئے کہ حق بات کو ماننے کے لئے تیار رہیں اور اس کو اس طرح لبیک کہیں جیسے بھوکا کھانے کو اور پیاسا پانی کو لینے کے لئے لپکتا ہے، مگر ان بد بختوں کی حالت یہ ہے کہ ایسی صحیح تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جو دنیا و آخرت کی ترقی کا ذمہ لیتی ہے اور تمسخر و استہزا کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو ان مضامین سے کیا



تعلق، گویا دوسرے الفاظ میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ، جس جگہ آج ہیں اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں گے۔ پھر جس قوم نے خود ہی ترقی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، اپنے پاؤں میں اندھی تقلید کی بوجھل زنجیریں ڈال لی ہوں، ان سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے۔

وہ تنزل و انحطاط کو پسند کرتے ہیں، پس اس جمود و استبداد کی بنا پر جس کا سبب وحید و کفر و عصیان ہے جس کا انہوں نے پہلے ارتکاب کیا، ان پر اللہ کی لعنت نازل ہو چکی ہے۔ ان کے دل حق بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس کی رحمت ان سے روٹھ گئی ہے۔<sup>①</sup>

لَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ<sup>۱</sup> وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا<sup>۲</sup> فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ<sup>۳</sup> فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ<sup>④</sup>

”اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب پہنچی جو اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔ پھر جس کو انہوں نے پہچان رکھا تھا ان کے پاس آگیا تو انکار کر بیٹھے، پس منکروں پر اللہ کی لعنت ہو۔“

بنی اسرائیل کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ جس ”شیل موسیٰ“ کی خبر کتاب استثناء کے اٹھارویں باب کی ۱۵ تا ۱۹ آیات میں دی گئی ہے<sup>⑤</sup>، ابھی تک دنیا میں ظاہر نہیں ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ذات مقدس کا ظہور مکہ مبارکہ میں ہو گا اور اس کا مقام ہجرت مدینہ منورہ قرار پائیگا، اسی لئے انہوں نے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کو اطراف مدینہ میں آباد کر دیا تھا، ان کی اوس و خزر ج سے ہمیشہ جنگ رہا کرتی۔ ان کی کوشش یہ رہتی کہ جس طرح ممکن ہو ان کا نام و نشان مٹا دیں۔ جب کبھی انہیں شکست ہوتی تو والہانہ و مضطربانہ دعا کرتے کہ خداوند! بنی آخر الزماں کو بھیج کہ ہماری مصیبتوں اور تکلیفوں کے دن ختم ہوں اور کفار پر غلبہ حاصل کریں۔ چنانچہ یہی باتیں انصار کے مسلمان ہونے کا باعث بنیں۔ گویا یہودی اپنی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کو اس وجود اقدس کے ساتھ وابستہ یقین کرتے تھے، کیونکہ انہیں وعدہ دیا گیا تھا کہ:

① مسلمان بھی اس کو رائے تقلید کا شکار ہو گئے۔ تحقیق و اجتہاد کا درازہ بند کر دیا، کتاب و سنت سے بعد و بجز اختیار کیا۔ فقہ کی چند کتابوں میں مذہب کو مقید کر کے اصلی سرچشمہ حیات سے دور چاڑھے۔ اس کو غیر ضروری خیال کرنے لگ گئے اور اس طرح فتنہ ذوق و داء ظہود ہم کے مرتکب ہوئے۔ اسی الحاد فی العمل کا نتیجہ ہے کہ غیروں کے حکوم بن گئے ہیں اور لعنتی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

② پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں: ”وہ خداوند تیرا خدا، تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں، تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (کتاب استثنائی، ۱۵ تا ۱۹)“

”اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے.... تو خداوند تیرا تجھے زمین کی قوموں کی بہ نسبت سرفراز کرے گا۔ یہ ساری برکتیں تجھ پر آویں گی اور تجھے پہنچے گی۔“ (کتاب استثنائی ۱: ۸۲ و ۲) آگے چل کر فرمایا:

”اگر تو خداوند اپنے خدا کے حکموں کو حفظ کرے گا اور اس کی راہوں پر چلے گا تو خداوند تجھ کو اپنے لئے پاک قوم بنائیگا جیسا کہ اس نے تجھ سے قسم کی ہے اور زمین کے سارے فرقے دیکھیں گے کہ تو خداوند کے نام سے کہلایا سو وہ تجھ سے ڈرتے رہیں گے۔“ (کتاب استثنائی ۹۰، ۸۲)

اسی لئے قرآن حکیم ان سے بار بار مطالبہ کرتا ہے کہ اس رسول پر ایمان لے آؤ، کہ تمہاری پیشینگوئیوں کی تصدیق ہو، مگر کورانہ تقلید، قومی روایات اور تعصب و ہٹ دہرمی کی بنا پر صاف انکار کر بیٹھتے۔ حالانکہ جس طرح انہیں اپنی اولاد کے شناخت کرنے میں کبھی دھوکا نہیں ہوا، ایسے ہی وہ آپ کو بھی پہچانتے تھے۔ یعرفونہ کہا یعرفون ابناءہم، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ:

(الف).... موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک کسی نبی نے کتاب استثناء کی پیشین گوئی کے مطابق مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، حالانکہ اس دور ان میں ان کے پاس برابر نبی آتے رہے۔

(ب).... عیسیٰ علیہ السلام کے بعد چھ سو برس تک بنی اسرائیل میں ایک بھی نبی نہ آیا۔

(ج) وہ.... مانتے ہیں کہ موسیٰ کی مانند جس نبی کی بعثت کا وعدہ دیا گیا ہے، وہ نبی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمعیل میں سے ہو گا۔

(د) ضمناً اس حقیقت سے وہ آگاہ تھے کہ اب نبوت ہمارے خاندان سے منتقل ہو کر اسمعیل کے گھرانے میں چلی جائے گی۔

پس جب باوجود ان تمام حقائق ثابتہ کے وہ نہیں مانتے، تو ان پر خدا کی لعنت ہو اور اس کی خیر و برکت سے دور ہوں۔

### انکار کا سبب

بَسْمًا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ فَبَآءُ ذٰلِكَ بِغَضَبِ عَلٰی غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

”اپنی جان کو انہوں نے بے مول خرید کر اللہ کے اتارے ہوئے کلام کے منکر ہو گئے اس ضد پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل اتارے، سو غصہ پر غصہ ممالائے اور منکروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔“

ان لوگوں کی توقعات یہ تھیں کہ وہ نبی ان کی قوم میں سے ہو گا، ان کے غلط عقائد اور بیجا توہمات کی تائید کرے گا، اور اس کا مذہب ان کی خواہشات و الوفات کے مطابق ہو گا، مگر جب دیکھا کہ وہ بنی اسمعیل کے خاندان میں پیدا ہوا ہے، ان

کے تمام عقائد باطلہ اور حریت فاسقہ کی مخالفت کرتا ہے تو ان کے بغض و حسد کی کوئی حد نہ رہی۔  
گو یا باوجود شناخت کرنے کے ان کے انکار کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہیں چھوڑ کر دوسری قوم کو اپنے فضل و اکرام کے لئے کیوں مخصوص کر لیا گیا، پس دوہرے غضب کے مستحق ہوئے۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنا پر اور دوسرے آپ کے نہ ماننے کی وجہ سے۔ ایسے کافروں کو اسی دنیا میں محکومی کی ذلیل زندگی بسر کرنی پڑے گی۔<sup>۶۵</sup>

پابندی توراۃ کا دعویٰ غلط ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا آتَيْنَاكُمْ قَالُوا اتُّوْمِنُ بِمَا وَرَاۤءَ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۖ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَآءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

“اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے کلام پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو اس سے نیچے آیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ حالانکہ وہ حق ہے، جو ان کے پاس ہے اس کو سچ بتاتا ہے، ان سے کہو کہ اگر تم مومن تھے تو اس سے پہلے خدا کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے تھے۔“  
علماء یہود نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن ہم پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہے جو توراۃ میں موجود ہیں، پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم صرف توراۃ کو مانیں گے اور کسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنانے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو ان انبیاء کو کیوں قتل کیا جو صرف توراۃ کی دعوت دیتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ پابندی توراۃ کا دعویٰ کرنا سرے سے غلط ہے، تم ہمیشہ سے کتاب الہی کے منکر رہے ہو۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَ أَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمِعُوا ۚ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَأَشْرَىٰ بَوَاقِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ يُنْسَىٰ أَمْرُهُمْ بِهٖ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

۶۵ یہی حال آج کل کے علمائے سوا اور ارباب عمام کا ہے۔ کتاب و سنت کی تصریحات کا انکار صرف اس بنا پر کر دیں گے کہ ان کی مزعومہ تفاسیر جلالین، بیضاوی، ابن کثیر، فتح البیان، خازن، کشف اور مدارک میں نہیں ہے۔ جمود و استبداد نے ان کے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہے۔ تقلید اعلیٰ نے ان کی سوچنے اور غور کرنے کی قوت کو سلب کر لیا ہے۔ کسی عربی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی۔ جلالین و بیضاوی اور بعض جگہ مدارک کا درس ضرور ہوتا ہے، مگر قرآن پڑھنا اور چیر ہے اور زید و بکر کے اقوال میں غور و فکر کرنا اور۔ ہم حنیفوں کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی عملی تفسیر حدیث سے بہت دور ہیں۔ اکثر مواقع میں ہمیں شوافع اور حنابلہ کے مقابلہ میں ضعیف و کمزور احادیث سے تمسک و اعتصام کرنا پڑتا ہے۔ ہدایہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ہماری سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مستند فقہ کی کتاب ہے۔ اس کی نسبت علامہ زلیعی بار بار اپنی تخریج میں لکھتے ہیں کہ صاحب ہدایہ متعدد جگہ موضوع احادیث سے اپنے مذہب کو ثابت کرتے ہیں۔ بہر حال علماء سوا اور اصحاب الرائے نے کتاب و سنت سے بعد و بجز اختیار کیا۔ اس لئے غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے اور حکومت و سرفرازی کے لئے دوسروں کو چن لیا گیا۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ (الانعام ۶۵) کہو کہ وہی اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے کوئی عذاب تمہارے لئے نکال کھڑا کرے۔

”اور تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر آئے، پھر تم نے اس کے چھٹے پھڑپھڑایا اور تم ظالم تھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور طور کو تم پر بلند کیا۔ ہم نے کہا جو ہم نے تم کو دیا اس کو قوت کے ساتھ پکڑو اور سنو، انہوں نے جواب دیا ہم نے سنا اور مانا نہیں اور ان کے کافر ہونے کی وجہ سے گو سالہ کی دوستی ان کے دلوں میں رچ گئی، تم کہو اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان بری چیز کا حکم کرتا ہے۔“

توراة کے تم پابند نہ بنے اور انبیاء مجد دین کو برابر قتل کرتے رہے۔ تم نے موسیٰ سے پابندی توراة کا عہد کیا، مگر اعمال حیات سے ثابت کر دیا کہ اس کتاب کو اپنی زندگی کا دستور العمل نہ بناؤ گے، اس انکار وجود کا اصل سبب یہ تھا کہ کفر و باطل پرستی نے تمہارے دلوں پر روپیہ کی محبت پیدا کر دی تھی، تم نے مال و دولت کو اپنا قبلہ بنالیا تھا اور تمہارے دلوں نے کفر کو اس طرح قبول کر لیا تھا، جیسے کپڑا رنگ کو جذب کر لیتا ہے۔

اگر ایمان کے یہی کارنامے ہیں اور وہ ایسی ہی غلط کاریوں اور بیہودہ حرکتوں کا حکم دیتا ہے، تو کیا پھر اس سے بدترین کوئی اور ایمان بھی ہو سکتا ہے۔ ضمیر فروشی کرو، دولت کو اپنا امام بناو اور روپیہ کے آگے سربسجود ہو جاؤ، اس پر بھی مومن رہو، کیا خوب!

## آخرت کے متعلق خیالات

یہاں تک ان کی دنیاوی زندگی، ان کے روزمرہ کے کارناموں اور ان کے عقائد و اخلاق پر بحث ہوئی ہے۔ اب بیان ہوتا ہے کہ باوجود ان ناشائستہ حرکتوں کے، اپنی نجات کے متعلق انہوں نے کیا کیا منصوبے باندھ رکھے ہیں۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ كُفْرًا فَتَسْمِعُوا لِلْأَخْبَارِ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمِثُّوا نُفُوسَكُمْ بِأَنفُسِكُمْ ۚ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٥٠﴾ وَلَنْ يَتَسَوَّوْا أَبَدًا ۚ بَلَا قُدْرَتٌ أَيْدِيهِمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِمْ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعْطَىٰ أَلْفُ سَنَةٍ ۖ وَمَا هُوَ بِمُخْرَجٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ إِنَّ يُعْطَىٰ ۖ وَاللَّهُ بِصِغِيرَاتٍ مِنَ النَّفْسِ عَلِيمٌ ﴿٥٢﴾

”تم کہہ دو، اگر اللہ کے ہاں لوگوں کے سوا آخرت کا گھر تمہیں ملنا ہے، اگر سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو اور جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اس کی وجہ سے کبھی یہ آرزو نہ کریں گے اور اللہ گنہگاروں کو خوب جانتا ہے اور تو ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے کے لئے حریص پائیگا، بلکہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسکی عمر ہزار ہا سال کی ہو اور اتنا جینا عذاب سے اس کو بچانہ دے گا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

دولت کو امام بنانا، توراة کی دعوت پر سبعینا و عصینا کہنا، اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، پھر اس پر کہنا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا (البقرہ ۱۱۱) اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہی اللہ کے محبوب اور برگزیدہ ہیں، پس اگر وہ اپنے دعوائے محبت میں سچے ہیں تو اللہ کے نام پر مرنے کے لئے تیار ہوں، اس کے قانون کی نشر و اشاعت میں لگ

جائیں اور اس کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کریں۔ جو شخص صحیح تعلیم کی خاطر اپنی ہر متاع حیات قربان کرنے کو تیار نہیں، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو محبوب الہی کے نام سے مشہور کرے اور اس شخص پر ہر گز اعتماد نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے نصاریٰ نجران کو اس امر کی دعوت دی: تَعَالَوْا نَدْعُكُمْ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ۖ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّغَنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكُذِبِينَ ۝ (ال عمران ۶۱) کہ ہم دونوں اپنی اپنی تعلیم پر قربان ہونے کو تیار ہوں۔ مگر جھوٹوں سے یہ توقع کہاں، یہی حال ان یہودیوں کا ہے، یہ لوگ اپنی جانوں کو زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہی ہمارے اعمال فاسقہ کا احتساب شروع ہو جائے گا، اس لئے موت کی آرزو کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان ظالموں کی حقیقت کا پہلے ہی سے علم تھا، مگر عام لوگوں میں اپنی محبت الہی کا راگ الاپتے تھے، اب اس مطالبہ کی بنا پر ان کی قلبی کھل گئی اور کسی شخص کو ان کے ظاہری تقدس سے دھوکا نہ ہو گا۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ قوم اور وطن کے لئے اپنی جانیں تک لڑا دیتے ہیں، عزت و ناموس اور شہرت و ناموری کی خاطر ہر چیز قربان کر دیتے ہیں، مگر یہ لوگ اہل علم ہونے کے باوجود اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے اور مدت ہائے دوران تک دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک جاہل آدمی اگر ایسا کرے تو اس کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ تعلیمات صادقہ پر اپنے آپ کو قربان نہ کر سکے۔

جو لوگ مذہبی جذبات کو پاؤں تلے روند کر دنیا میں رہنا چاہتے ہوں وہ ہر گز عزت کے قابل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نہایت ہی باریک بین نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ان کو ضرور ذلیل کر کے غیروں کا محکوم بنادے گا ۝

● گذشتہ آیات میں علمائے یہود کی حسب ذیل خرابیاں ذکر کی گئی ہیں:

(الف) اپنی کتاب پر عمل کرنے کے دعویدار ہیں مگر ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔

(ب) ان کا نصب العین اور مقصد حیات جمع مال و دولت ہے۔

(ج) خدا کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہیں مگر اس کے لئے قربانی نہیں کر سکتے۔

(د) مذہبی جذبات کو پامال کر کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اسی ترتیب سے اگر آپ امت مسلمہ کے علمائے سوکے حالات کی تفتیش کریں تو یہ تمام خرابیاں ان میں نظر آئیں گی۔

(۱) دعویٰ توفیق کی پابندی کا ہوتا ہے مگر عملاً وہ اپنے بزرگوں اور پیروں کے غیر مستند اقوال کو مذہب بنائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی تمام زندگی گناہوں میں بسر ہوتی ہے، مرتے وقت اس کے وارث ایک قرآن بخش دیتے ہیں اور یہ بد بخت عالم کہتے ہیں کہ اس کے تمام گناہ معاف ہو گئے، ایک آدمی سال بھر نماز نہیں پڑھتا، جمعۃ الوداع کے روزہ دور کھتے قضاے عمری کی نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کی تمام نمازیں معاف ہو جاتی ہیں۔

(۲) شادی اور موت کے وقت جن رسوم کو جائز قرار دیا جاتا ہے وہ سب کی سب مسلمانوں نے عجم سے مستعار لیں اور صرف روپیہ کمانے کی خاطر ان کو مذہبی رنگ دیدیا۔

(۳) اگر خدا سے محبت ہوتی تو اپنی زندگیاں اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے وقف کر دیتے۔

## قابل نفرت ہیں

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٠﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴿٥٢﴾

”کہہ! جو کوئی ہو جبرئیل کا دشمن جبرئیل کا دشمن ہو گا سو اس نے تو اللہ کے حکم سے تیرے دل پر یہ کلام اتارا ہے جو کلام اس کے سامنے ہے اس کو سچ بتاتا ہے اور مومنین کے لئے ہدایت و خوش خبری ہے، جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا دشمن ہو گا تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے اور ہم نے تیری طرف واضح آیتیں اتاریں اور بدکار ہی ان سے منکر ہوں گے۔“

یہودی کفر و ضلالت کے انتہائی مراتب پر پہنچ چکے ہیں، ان کی ایک ایک غلطی واضح کر دی گئی ہے۔ آخر میں انہوں نے پابندیِ توراۃ کا دعویٰ کیا مگر جھوٹے ثابت ہوئے اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ بغیر کسی جدید وحی والہام کے ان کی اصلاح نہ ہوگی۔ اس لئے انہوں نے یہ دریافت کرنا شروع کیا کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے؟ آپ نے فرمایا جبرئیل۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو ہمارا قومی دشمن ہے۔ جب کبھی ہم پر کوئی بلا نازل ہوئی اسی کے ذریعہ سے ہوئی، اگر کوئی دوسرا فرشتہ وحی لا تا تو ہم آپ کو نبی تسلیم کر لیتے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے نازل ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے تمہاری کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے اور اربابِ ایمان و اخلاص کے لئے ہدایت و بشارت ہے۔

تمہیں جبرئیل سے عداوت اس لئے ہے کہ اس نے تمہیں منصبِ نبوت سے محروم کر دیا اور بنی اسمعیل کو مکالمہ الہی کے لئے منتخب کیا۔ اسی لئے تم رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا اظہار کر رہے ہو۔ مگر یاد رہے کہ جو آپ کا دشمن ہے وہ اللہ، اس کے ملائکہ اور تمام رسولوں کی دشمنی اپنے سر لیتا ہے۔ اس آیت میں میکائیل کا نام خاص طور سے ذکر کیا گیا، کیونکہ وہ لوگ اس کو اپنا دوست خیال کرتے تھے: ”اور اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندان کی حمایت کے لئے کھڑا ہے۔“ (دانی ایل ۲۱:۱) اب اس سے بھی دوستی کی توقع نہ رکھو، کیونکہ وہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دے گا۔ تعلیم کے اصول کو دیکھئے، اس کے نتائج پر نظر ڈالئے، سچائی معلوم کرنے کا صحیح طریق یہی ہے، اس تعلیم پر عمل کر کے دیکھو، اس کے نتائج تمہیں معلوم ہو جائیں گے، البتہ بد اخلاق تو سوائے انکار کے اور کچھ نہیں جانتے۔

أَوَلَمْ نَكُنَّا عَهْدًا بِآبَائِهِمْ قَبْلَ نَزْلِهِمْ مِنْهُمْ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ بِنُزُولِ آيَاتٍ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ فَكُفُّوا أَعْيُنَهُمْ عَنْ نُزُولِهَا وَكَانُوا طَائِفًا مِمَّنْ كَفَرُوا ﴿٥٤﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِئِنْ لَمْ يَنْتَهِ عَنِ الْكُفْرِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

”آیا کیا، جب یہ عہد باندھیں گے تو ان میں سے ایک جماعت اس کو پھینک دے گی، بلکہ ان میں سے اکثر یقین نہیں

(۴) غیروں کے ساتھ مل کر غلط فتاویٰ شائع کر کے اور مسلمانوں کو دھوکا دے کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ آج ترکوں پر جس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہو رہی ہیں یہ ہندوستان کے علمائے سواد فقہائے دنیا کے فتاویٰ کے دردناک نتائج ہیں۔

کرتے اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس رسول پہنچا جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے، تو کتاب پانے والوں میں سے ایک جماعت نے اللہ کے کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا جانتے ہی نہیں۔ کتاب پر عمل کرنا تمہارا مقصد نہیں، تمہاری قومی خصوصیت ہی عہد کرنا اور توڑنا۔ تمہارے پاس مختلف اوقات میں توراۃ کی تصدیق کرنے والے رسول آتے رہے، مگر تم نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اب بھی مسلمانوں پر الزام رکھنے کے لئے تم نے یہ دریافت کیا کہ وحی لانے والا کون ہے، ورنہ یہ مقصد ہر گز نہ تھا کہ صداقت ظاہر ہونے کے بعد اس کو مان بھی لو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم اپنی تمام دنیاوی عزتوں کو کھو بیٹھتی ہے تو اس وقت یہ کہنا شروع کر دیتی ہے کہ مذہب کو دنیا سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف روحانیت کی تعلیم دیتا ہے اور آخرت کی کامیابی کا ذمہ لیتا ہے۔ مذہب ہی لوگ دنیا کی حکومت و سرفرازی اور عزت و رفعت سے محروم رہتے ہیں، اس لئے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے کہ یہی جہاد اکبر ہے اور اسی پر نجات کا دار و مدار۔

کسی نبی کی تعلیم روحانیت تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ وہ دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، روحانیت و مادیت دونوں کی جامع ہوتی ہے۔<sup>۱</sup>

• آج کل مسلمان بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ کتاب و سنت کی تصریحات پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ سیاست اور مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس ذیل میں ہمارے سامنے سب سے پہلے سورۃ نور کی یہ آیت آتی ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَغْفِرَنَّهُمْ فِي الْآخِرِ كَمَا اسْتَغْفَرَ الَّذِينَ مِنَ الذَّنْبِ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُنَظِّقَنَّ لَهُمْ فِيهِمْ وَبِئْسَ لَكُم مِّن لَّغْوٍ  
لَّيَبْدِلَنَّ لَهُمْ مِّن بَعْدِ عَذَابِهِمْ آمَنَّا (النور)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور نوازش کرے گا، جیسے ان لوگوں کو حکومت سے نوازش کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، اس کو ان کے لئے جما کر رہے گا اور خوف و خطرہ جو ان کو لاحق ہے اس کے بعد ان کو اس کے بدلے میں امن دے گا۔“

اس آیت میں مسلمانوں کو خلافت ارضیٰ، دین کے جہاد اور امن بعد از خوف کا وعدہ دیا ہے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ دوسری جگہ فرمایا: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ (ال عمران ۱۳۹) اور ہمت نہ ہارو، اور آزرہ خاطر نہ ہو اور اگر تم سچے مسلمان ہو تو آخر کار تمہارا ہی بول بالا ہے سورہ صف میں آیا: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ، اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق و نیکر بھیجا کہ تمام ادیان عالم پر اس کو غلبہ و اقتدار نوازش کرے۔ اس کے ہم معنی سورہ بقرہ میں فرمایا: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا، شہید کے معنی یہ بھی ہیں کہ لوگوں کا نگران کار و محافظ ہو اور تمام قومیں اس کی سرپرستی میں کام کریں۔ موسیٰ کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو ان کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا: ان ادوا الی عباد اللہ اور فارسل معنا بنی اسرائیل۔ یہی سیاست کا نچوڑ اور مغز تھا جو موسیٰ کی نبوت کا مقصد تھا۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم کی اور آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

احادیث بھی اس موضوع پر اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصا اور احاطہ بہت مشکل ہے، صرف ایک حدیث پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

شَكُنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ مَتَوَسِدٌ بِرِدَاةٍ لَهُ فِي ظِلِّ الْكُعْبَةِ فَلَمَّا دَعَا اللَّهُ لَنَا، قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ فِي مَنْ قَبْلِكُمْ يَحْضُرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ فَيَجْعَلُ فِيهِ فَيَجْعَالُ بِنَاشِرًا فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيَشْقَى وَمَا يَصْدَا ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَيَشْطُ بِأَمْسِلَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لِحْبِهِ مِنْ عَظْمٍ وَعَصَبٍ وَمَا يَصْدَا ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَاللَّهُ يَشْنُ هَذَا الْأَمْرَ حَتَّى يَسِيرَ الرَّأْسُ مِنْ مَنَعَةِ أَلِي حَضَرٍ مَوْتٍ لَا يَخَافُ إِلَّا اللَّهَ وَلَكِنْ تَسْتَعْبِلُونَ،

ہجرت سے پیشتر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اعدائے حق کے ظلم و جور کی حد ہو گئی، آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں بٹھوایا کہ آہ سے چیر دیا مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی



وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيمٍ ۖ وَمَا كَفَرُ سُلَيْمُ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرٌ ذَا يُعْلِمُونَ النَّاسَ  
السَّحَرُ ۖ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَكِيدِينَ بَبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۖ وَمَا يُعْلِمُونَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ  
فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۖ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ  
وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ  
أَنْفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكُنْهُنَّ أَمْوَاجًا ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥١﴾

”اور اس علم کے پیچھے پڑ گئے جس کو شیطان سلمان کی سلطنت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کفر کیا۔ لوگوں کو جادو سکھاتے اور اس علم کی پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر اترا اور وہ کسی کو نہ سکھاتے جب تک نہ کہتے کہ ہم آزمائش میں ہیں پس تم کافر مت بنو، پھر ان سے سکھتے وہ چیز جس سے مرد اور اس کی عورت میں جدائی ڈالتے اور اللہ کی اجازت کے بغیر وہ اس جادو سے کسی کو نقصان نہ پہنچا سکتے۔ اور وہ چیز سکھتے ہیں جس سے ان کو نقصان ہے اور فائدہ نہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جو کوئی جادو کا خریدار ہو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور وہ بہت بری چیز ہے جس پر انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے، کاش! انہیں سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز کرتے تو اللہ کے پاس بہتر بدلہ تھا، کاش! انہیں سمجھ ہوتی۔“

کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں لیکن اس کو بھی انہوں نے برداشت کر لیا اور حق سے انحراف نہ کیا۔ اس خدا کی قسم دعوت حق کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ وہ وقت قریب ہے جب یمن سے حضر موت تک ایک سوار چلا جائے گا اور اس کے دل میں اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہو گا۔ یعنی راہ میں ہر جگہ صرف مسلمان ہی ہوں گے، کوئی غیر نہ ہو گا جو حملہ کرے یا لوٹے۔ یہ ہونے والا ہے مگر تم جلدی کرتے ہو۔

ایک اور حدیث میں عدی بن حاتم سے بخاری روایت کرتے ہیں: لتربین الطعينة تحل عن الحيرة حتى تطوف بالكعبة اور لتفتحن كنوز كسرى، آپ نے فرمایا عدی اگر تم جیتے رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ حیرۃ سے ایک پردہ نشین عورت تن تنہا سفر کر کے آئے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی، اور اس تمام سفر میں اللہ کے سوا کوئی چیز اس کے لئے موجب خوف نہ ہو گی۔ اور قریب ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسریٰ کے خزانے کھول دیئے جائیں۔ عدی کہتے ہیں کہ میں زندہ رہا اور دونوں باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں وکننت فی من افتتح كنوز كسرى! کتاب و سنت کے یہ چند اشارات صاحب فہم کے لئے کافی ہیں، کس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے حق میں ثابت ہو رہی ہے کہ لتتبعن سنن من كان قبلكم، حتیٰ کہ لو دخلوا حوض ب لد خلتموه بھی پورا ہو گیا۔ اب انتظار کرنے والوں کے لئے بجز انتظار غفلت کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ یہودیوں کی مغضوبیت، نصاریٰ کی ضلالت، مشرکین کی بت پرستی، اقتدار بغیر سنت ان میں سے ہر ایک خوست مسلمانوں پر چھائی اور اب بطن الارض خیر من ظہرہا کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ زمین کے کیزوں کے لئے زندگی میں عیش ہے اور جنگل کے درندوں کے لئے جینے میں راحت، مگر ایک مسلمان کے لئے اب زمین کی پیٹھ پر کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔ مگر یہ غلامانہ اور محکومانہ زندگی بسر کرے اور اپنی ذلتوں کا بوجھ اٹھائے، اس کے نیچے چلا جائے!

نہ نگم، نہ برگ سبزم، نہ درخت سایہ دارم  
ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا؟

امت مسلمہ کے علماء سو کی کس قدر بد بختی ہے اور کس طرح یہودیوں کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں کہ اجنبی حکومت کی خاطر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل الحق والحریت سے روکتے ہیں۔ ترکوں کے خلاف فتاوے شائع کرتے ہیں، مسلمانوں کو کافر بتانے کی انہیں بہت مشق ہے، خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتے، خلیفۃ المسلمین سے جو بد بخت بغاوت کرتا ہے، اس کو مبارک باد دینے کے لئے ہندوستان سے سفر کرتے ہیں، ان تمام حرکات کو تعلیم قرآن کے مطابق خیال کرتے ہیں اور اگر کسی شخص نے قرآن کی طرف پشت کر دی تو فوراً فینڈ ولا داء ظہو دھم کی تلاوت کر کے اس پر کفر اور ارتداد عن اسلام کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ پس وقت آگیا ہے کہ آج ایک نئی صف ماتم بچائی جائے اور ان ارباب عمام کی بد کرداریوں پر سینہ کوئی کی جائے۔



مذہبی لوگوں کی عزت و حرمت کا اصلی سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب الہی کے محافظ اور اس کی تعلیمات کے ناشر ہوتے ہیں، لیکن جس وقت اس فرض جلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو ان کی عزت بھی جاتی رہتی ہے اور وہ شر البریہ بن جاتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ باوجود اس بد عملی و بد کرداری کے لوگ ان کا احترام کریں، نذریں اور ہدیے ان کے سامنے پیش ہوں اور عوام الناس انہیں اپنا امام و پیشوا تسلیم کریں۔ چونکہ ان کے پاس صحیح تعلیم نہیں ہوتی اور اخلاق فاضلہ سے دور ہوتے ہیں، اس لئے خدع و فریب اور حیلہ سازی سے کام لے کر اپنی عزت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان آیات میں اس قسم کی شرارتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزات بیان کئے گئے ہیں، مگر بنی اسرائیل نے ان کی ذات اقدس کی طرف صدامت و خرافات اور مافوق الفطرت عجائب و غرائب منسوب کئے، جیسے مسلمانوں میں امیر حمزہ ایک فرضی ہیر و کی نسبت حیرت انگیز واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ سلاطین کی پہلی کتاب میں سلیمان کی طرف کفر اور معبودان باطل کی پرستش بھی منسوب کی گئی ہے:

”اس کی سات سو جو روئیں و بیگمات تھیں اور تین سو حرمین اور اس کی جو روؤں لئے اس کے دل کو پھیرا کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جو روؤں نے اس کی دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا.... اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی.... سوا بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا۔“ (سلاطین ۱۱: ۹۷ و ۱۰۳)

یہودیوں نے فسق و فجور کی راہ اختیار کی۔ حضرت سلیمان کی حکومت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے اور ان تمام باتوں کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے۔ قرآن نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی معصومیت اور طہارت کا اعلان کیا اور بتا دیا کہ خدا کا پیغمبر کبھی کفر و مشرکانہ رسوم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ تمام تر شرارت یہودیوں کی ہے جو ایک پیکر قد و سیت اور مجسم پاکبازی کو کافر بتاتے ہیں اور اس طرح اعلان کرتے ہیں کہ عہد عتیق میں لفظی و معنوی تحریف ہوئی ہے۔ صحائف آسمانی میں سے قرآن صرف ان امور کی تصدیق کرتا ہے جو حقیقت میں ایسے ہی ہیں اور جہاں غلطی ہوتی ہے فوراً اس سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور سچائی کا اعلان کر دیتا ہے۔

بابل عہد قدیم کا نہایت ہی بارونق اور شاندار شہر تھا۔ کسی زمانہ میں وہ تہذیب و شائستگی کا مرکز تھا۔ اس کی جائے وقوع دریائے فرات کے کنارے تھی۔ عراق عرب کا دار السلطنت ہونا اس کی شہرت و عظمت کا اور زیادہ باعث بن گیا۔ اس کے کھنڈرات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان شہر تمدن و حضارت کا گھر تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی فصیل ۵۵ میل لمبی، ۴۴ فٹ بلند اور ۸۵ فٹ چوڑی تھی۔ جس وقت بخت نصر نے یہودیوں کو تباہ کیا، یہ شہر اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ یہودی قید ہو کر بابل میں آباد ہو گئے۔ اب ان کے لئے حکومت کی جگہ غلامی، عزت کے بجائے ذلت اور تخت سلطنت کی جگہ

گردن ملت و نکبت تھی۔ خدا کا وعدہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا۔ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ يٰقُوْبِ اٰمْرًا عَیْلًا فِی الْکِتٰبِ لَتَنْفَسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اَوَّلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِمْرًا اَوَّلٰی بَاسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا حِلٰلَ الدِّیَارِ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (بنی اسرائیل ۵، ۴) ”اور ہم نے بنی اسرائیل سے کتاب میں صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دودفعہ فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں بھی کرو گے۔ تو جب ان میں پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلہ میں اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کئے جو بڑے سخت گیر تھے۔ وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔“

ان لوگوں نے بائبل میں دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے دو فرشتہ خصلت بزرگوں ہاروت وماروت کو بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے لفظ ملک سے دھوکا کھا کر ان کو حقیقی فرشتہ قرار دیا ہے اور پھر ان تمام غلط اور دور از کار روایات کا انبار جمع کر دیا ہے جن کو کوئی سلیم الفطرت انسان قبول کرنے کو تیار نہیں۔ قرآن حکیم نے حضرت یوسف کی نسبت کہا: اِنَّ هٰذَا اِلَّا مَلٰکَ کَرِیْمٌ (یوسف ۳۱) ایسے ہی یہاں بھی ان کو ملک کہا گیا، انہیں اپنی عزت رفتہ یاد آگئی اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کس طرح اس گزشتہ عروج کو حاصل کریں۔ ہاروت وماروت نے اذکار اور اوراد اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ سے اپنی بزرگی اور تقدس کو قائم کیا ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کاہل تو پہلے ہی سے تھے۔ مفت کی روٹیاں کھا کر کام کرنے کی قوت سلب کر چکے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ بغیر کام کئے لوگ ان کی تعریف و توصیف کریں، ویجیون ان یحمدوا بسا لم یفعلوا، فَوَرَّان کی جانب متوجہ ہو گئے اور درخواست کی کہ انہیں بھی ان اشغال و وظائف کی تعلیم دی جائے۔ دونوں بزرگوں کا یہ دستور تھا کہ تعلیم دینے سے قبل لوگوں سے عہد لیتے اور انہیں کو سمجھا دیا کرتے تھے کہ ان دعاؤں کو ناجائز اور غیر مشروع مواقع پر استعمال نہ کرنا۔ ہمارا وجود اور ہماری تعلیم تم لوگوں کے لئے ایک قسم کی امتحان گاہ ہے۔ اس سے تمہارے ایمان و اسلام کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس قسم کی باتیں کر کے دونوں بزرگ اپنے دامن کو آلود عصیاں ہونے سے بچا لیتے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم شروع ہوتی۔ یہودی اب دو چیزوں کے مالک تھے۔ ایک وہ علوم جو کتاب مقدس میں موجود تھے، جن کی تبلیغ و دعوت کے لئے انہیں مامور کیا گیا تھا، دوسرے وہ شیطانی باتیں جو انہوں نے بائبل میں رہ کر حاصل کیں۔ مفسرین نے فتعلیون منہا میں منہا کی ضمیر کو ہاروت وماروت کی طرف راجع کیا ہے، لیکن ابن کثیر نے یہی معنی اختیار کئے ہیں جن کو ہم نے اوپر درج کیا ہے اور ان تمام روایات کو غلط ثابت کیا ہے جن سے ہاروت وماروت کی طرف ارجاع ضمیر معلوم ہوتا ہے۔

باوجود اس قدر تنبیہ و تادیب کے یہودی ان کی نصیحت پر عمل نہ کرتے اور ان وظائف و اوراد کو ایسی جگہ استعمال میں لاتے جہاں شر و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ خاوند اور بیوی میں ناچاقی پیدا ہو اور ایک آباد بارونق گھر کھنڈرات کا ڈھیر دکھائے دے۔ ان بد بختوں کو اتنی تمیز نہ تھی کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، ان کی کوششوں کو کسی کے نفع و نقصان میں کیا دخل اور جو کچھ ان کے پاس اور دواذکار تھے وہ ان کے لئے یکسر نقصان و زیاں کا باعث تھے، انہیں ذرہ برابر بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جب یہ لوگ دیکھتے تھے کہ چاروں طرف سے روپیہ بکثرت آ رہا ہے، لوگ ان کو قدر و منزلت کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے،۔ اپنے نفس کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب کو بھول جاتے تھے، حالانکہ اصل چیز اعمال و اخلاق کی درستی ہے۔ مرنے کے بعد صرف قلب سلیم اور فطرۃ صالحہ ہی سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ دولت کسی کام نہیں آتی۔ کاش تعلیم صحیح اور عمل صالح اختیار کرتے تو دنیا میں بھی سرفراز رہتے اور آخرت میں بھی عزت کی زندگی بسر کرتے۔<sup>۱۰</sup>

### علیحدگی کا حکم

انصار مدینہ کے رہنے والے تھے۔ زراعت پیشہ ہونے کی بنا پر یہودیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ یہودیوں نے اطراف شہر میں اپنے مدرسے قائم کر رکھے تھے جن کو بت المدارس کہتے تھے اور جن میں انصار کی اولاد تعلیم حاصل کیا کرتی تھی۔ اس لئے صحبت و ہم نشینی کی بنا پر ان میں کچھ نہ کچھ عادتیں یہودیوں کی آگئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک جدید امت پیدا کرنا چاہتے تھے جو تمام جغرافیائی حدود اور قومی پابندیوں سے آزاد ہو اور وہ شہد آء علی الناس کے مرتبہ کبریٰ پر فائز ہو۔ ضرورت تھی کہ انصار کو ان سے الگ کر دیا جائے مگر مدت ہائے وداز کے تعلقات کو ایک قلم توڑ دینا، ایک حکیم اجتماعی کی نظر میں ناموزوں تھا، اس لئے ان اور اق میں تفصیل کے ساتھ ان کی غلط کاریوں کو بیان کیا۔ ان کے علمی و عملی نقائص کو واضح کیا اور ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں پر روشنی ڈالی، تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ بنی اسرائیل میں حکومت کرنے، مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور ان میں عمدہ رعایا بننے کی مطلق قابلیت نہیں ہے۔ فرزند ان اسلام کسی پر بھروسہ نہ کریں بلکہ خود اپنے اندر کام کرنے کی قوت پیدا کریں۔ یہودیوں کی طرف سے ان کے دلوں میں عام نفرت و حقارت پیدا ہو اور اس طرح ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد پڑ جائے۔ چنانچہ اب وقت آگیا کہ مسلمانوں کو ان سے دائمی طور پر الگ رہنے کا حکم دیا جائے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥٧

”اے ایمان والو! تم“ راعنا“ مت کہو اور“ انظرنا“ کہو اور سنتے رہو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

جس وقت رسول اللہ ﷺ و عظود تذکیر میں مصروف ہوتے اور مسلمانوں کو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو عرض کرتے کہ مزید توضیح فرما دیجئے اور ایسے موقع پر“ راعنا“ کا لفظ استعمال کرتے۔ یہ مراعات سے ہے یعنی“ راعنا سبعك و فرغہ نکلا“ ہماری بات سن لیجئے، مگر یہودیوں کے نزدیک یہ شب و شتم کے موقع پر بولا جاتا تھا اور اس کے معنی یہ

<sup>۱۰</sup> یہی حال آج عالموں اور صوفیوں کا ہے۔ کتاب و سنت و توراء ظہور ہم ہے جن سے ان کی عزت برقرار رہتی، اب تعویذوں اور گندوں پر زور ہے۔ یہی ان کی آمدنی کے ذرائع ہیں اور انہیں سے اپنی منزلت لوگوں کے دلوں میں قائم کئے ہوئے ہیں۔ بعض ارباب احسان و تصوف نے تو تمام قرآن ہی تعویذات کا مجموعہ بنا دیا ہے اور اعمال قرآنی ایک کتاب شائع کر کے اپنے زعم باطل میں تحقیقات کا جدید باب مفتوح کیا ہے۔ پھر جن مولویوں اور صوفیوں کا ذریعہ معاش صرف تعویذات رہ گئے ہوں وہ اللہ کے نام پر کہاں اپنے آپ کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ لوکاہلی اور سستی کے دنیا میں زندہ نمونے ہیں۔ کاش اس فریب خوردہ زندگی کو ترک کر کے تبلیغ و دعوت قرآن کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔

ہوتے تھے کہ ”اسم لا سمعت“ خدا تمہیں سننے کا موقعہ ہی نہ دے۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ ”زَعُونَةُ“ سے مشتق ہے، جس کے معنی احمق اور بیوقوف کے ہیں، مسلمان اپنی سادگی کی بنا پر اس کو استعمال کرتے تھے، مگر اس سے یہودیوں کو ان کی تضحیک و تمحیق کا مشغلہ ہاتھ آ جاتا تھا اور کہتے کہ ہم تو اس رسول کے ساتھ استہزاء خفیہ خفیہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمان تو علی الاعلان کرتے ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل روایت اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔

فلما سمعت اليهود هذه الكلمة من المسلمين، قالوا فيما بينهم: كنانا سب محمداً سراً فاعلنوا به الآن۔ فكلوا يا تونہ و يقولون ”راعنا يا محمد“ ويفضحون فيما بينهم، فسبعها سعد بن معاذ رضى الله عنه فقتل لها وكان يعرف لعنه۔ فقال لليهود لئن سمعتمنا من احد منكم يقولها لرسول الله ﷺ لا ضربين عنقه۔ فقالوا اولستم تقولونها فانزل الله تعالى هذه الآية۔

”جب یہودیوں نے مسلمانوں کو یہی کلمہ کہتے سنا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا ہم تو سراً محمد کو گالی دیتے تھے مگر وہ تو علانیہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آتے اور کہتے ”راعنا یا محمد“ اور آپس میں خوب ہنستے۔ اتفاقاً سعد بن معاذ نے ان کو ایسا کرتے دیکھ لیا، وہ تازہ لگے کہ یہ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں کیونکہ وہ عبرانی سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اب کے میں نے تمہیں یہ لفظ رسول اللہ ﷺ کی شان میں کہتے سن لیا تو میں مار ڈالوں گا۔ انہوں نے کہا تم بھی یہی کہا کرتے ہو۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہودیوں کی اس شرارت کے متعلق دوسری جگہ آتا ہے وَرَاعِنَا لَيَّا بِالْأَسْتِمْتِمْ وَطَعْنَا فِي الدِّينِ (النساء ۴۶) زبان کو مروڑ مروڑ کر اور دین اسلام پر طعن کی راہ سے ”راعنا“ کہہ کر خطاب کرتے ہیں، اس لئے شریعت نے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو حکم دیدیا کہ ان کے اعمال حیات تو ایک طرف، ان کے الفاظ و محاورات سے بھی پوری نفرت کرنی چاہئے اور قولاً عملاً اعتقاداً ان سے کلی اجتناب کیا جائے۔ ہاں اگر تم کوئی بات نہ سمجھ سکو تو ”اظنونا“ کہہ دیا کرو اور سمجھنے کی کوشش بھی کرو، رہے یہ گستاخ اور دریدہ دہن تو ان کو گستاخی کی سزا مل جائے گی اور دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا ہو کر رہیں گے۔

مَا يَوْمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۵۵﴾

”کتاب والوں میں سے جو منکر ہیں اور مشرک، نہیں، چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی نیک بات اترے اور اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت کی وجہ سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مکالمہ و مخاطبہ کے لئے چن لئے اور پھر وہ ترقی کے اعلیٰ مراتب پر پہنچ جائیں۔ بلکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مسلمانوں کو ترقی سے روک دیں، انہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملے اور دائمی طور پر ہمارے ہی غلامی رہیں۔ حالانکہ شریعتوں کے نازل کرنے میں کبھی اس امر کا خیال نہیں کیا جاتا کہ ایک قوم جو حد درجہ کی نالائق ہو۔ کتاب الہی سے بعد و ہجر اختیار کر چکی ہو، فسق و فجور میں مبتلا ہو، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے منحرف ہو۔ پھر بھی اس کو اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لے؟ اس

کے فضل عظیم کی ایک ہی قوم اجارہ دار نہیں بن سکتی بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ اس آیت میں مشرکین کا نام لیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ بھی اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا متبع سمجھتے تھے۔ نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ، ختنہ، اللہ کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا، اشہر حرم میں لڑائی نہ کرنا تمام رسمیں ان میں موجود تھیں، ان کو قرآن حکیم کا نزول اس لئے ناگوار تھا کہ اب عرب کی سیادت اور حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گی اور وہ تمام دنیا کی حکومت حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی حکومت چھین جائے ضرور دوسروں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گی۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی دوست نہیں بن سکتی بلکہ ان کے مقابلے میں تمام کفار و مشرکین اور اہل کتاب ایک ہو جایا کریں گے، اس لئے کہ کفر ملت واحدہ ہے۔ سورہ انفال میں فرمایا: “وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ”۔ (الانفال ۷۳) اسلام کی دشمنی میں تمام کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ قرآن حکیم نے اس قدر صاف صاف اس موضوع پر آیات بنیات پیش کی ہیں کہ شاید ہی اس سے زیادہ کسی اور مسئلہ پر گفتگو کی ہوگی۔ ایک جگہ فرمایا: “وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَهُمْ”۔ (البقرہ ۱۲۰) پھر کہا: “وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَذُوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنْ اِسْتَطَاعُوا”۔ (البقرہ ۲۱۷) آل عمران میں: “لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ”۔ (آل عمران ۲۸) پھر سورہ ممتحنہ کے آخر میں فرمایا: “يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَسْؤُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَسُوءُ الْكَافَرُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ”۔ (المتحنہ ۱۳) کس درجہ کھول کھول کر بیان کیا: “يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُكُمْ بِغَيْرِ اللَّهِ وَأَمَّا تَخِفُّ صُدُّوهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٠﴾ هَآؤُنْكُمْ أُولَآئِ تَحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِأَلْكِئِبِ كَلْبَةٍ وَإِذَا لَقَوْكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَٰلَيْكُمْ الْوَآمِلَ مِنَ الْغَيْظِ”۔ (آل عمران ۱۱۹، ۱۱۸)۔

مگر مسلمانوں نے ان آیات کی بے حرمتی کی، ان کا احترام ان کے دلوں سے جاتا رہا، علمائے سونے ان کی تاویلات شروع کر دیں اور ان تمام حرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بلاد و امصار اسلامی یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھوں سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو بے آبرو کر کے آگ کی نذر کیا جاتا ہے، ان کے شہروں پر ہل چلائے جاتے ہیں، کھیتیاں برباد کی جاتی ہیں، ارض مقدس چھین جاتی ہے۔

مگر آہ ٹم آہ! ان کے بدن پر جوں تک نہیں ریختی اور ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے، فیا لیتنی مت قبل اھذا وکنت نسیا منسیا۔

اعتراض کی بوچھاڑ

گذشتہ آیات میں اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ مسلمان اہل کتاب سے کسی قسم کی تعلقات بھی نہیں رکھ سکتے اور ان

سے اتحاد کلیۃً ممنوع و ناجائز ہے، ان سے علیحدہ ہونے کے بعد مسلمانوں کو مستقل قانون اور دستور العمل کی ضرورت ہوگی تاکہ ان کا وجود قائم رہ سکے۔ یہ قانون تو فساد کفری اذکرم سے شروع ہو گا مگر یہاں سے اس کی تمہید بیان کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہودی قرآن حکیم پر اعتراض کرتے ہیں اور وحی الہی ان کا جواب دیتی ہے، لیکن اب انقطاع تعلقات ہو چکا ہے، ترک موالات کی بنا پر وہ نہ تو مجلس نبوی میں کھلے ہندوں شریک ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے عام مجامع میں انہیں شرکت کا موقع حاصل ہے۔ اس اجتناب کی بنا پر وہ مسلمانوں پر کوئی برا اثر نہیں ڈال سکتے، مگر نیش عقرب کی طرح مقتضائے طبیعت سے بچنا بھی مشکل، اس لئے انہوں نے تجویزیہ کی کہ جب کبھی کوئی اکاد کا مسلمان راہ میں مل جائے تو اس کو بہکانے کی پوری کوشش کریں: ”إِنْ يَتَّبِقُوا يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً“ (الممتحہ ۲) اور ان کے سامنے ایسے اعتراضات کئے جائیں جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور اس طرح ان کے ایمان میں خلل واقع ہو: ”وَذَكِّرْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُدْذِنُكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيسَاءِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ“ (البقرۃ ۱۰۹) بغض وعداوت کی بنا پر اہل کتاب کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ایمان کے بعد تم کو پھر کفر و ضلالت میں لے جائیں۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے ایک مدت تک بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی۔ آخر میں ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کا قبلہ بیت اللہ بنادیا گیا۔ یہ اس امر کی تمہید تھی کہ مسلمان دنیا کی تمام اقوام و امم سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ قائم کرتے ہیں اور ایک جدید قومیت صالحہ کی اساس و بنیاد محکم و استوار کرنے کی فکر میں ہیں، اس لئے وقت آگیا کہ مخالفین و معاندین اسلام بھی پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کو فنا کرنے میں مصروف ہوں۔ تحویل قبلہ نے انہیں بہترین موقع دیدیا اور تمام آلات سے مسلح ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے لُح قبلہ پر اعتراض کرنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ کے ازلی وابدی اور محیط الکل علم پر نکتہ چینی کی۔ شارع علیہ السلام کی ذات اقدس کو مورد طعن و تشنیع بنایا کہ اپنی خواہشات کو مذہب کا نام دے رکھا ہے، جس طرح جی چاہتا ہے منہ کر لیتا ہے، اگر یہ مذہب الہامی ہو تا تو قبلہ بار بار نہ بدلتا۔ آئندہ آیات میں ان تمام مباحث کو صاف کر دیا جائے گا اور قبلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے گی، مگر اس بحث کے دو پہلو ہوں گے (۱) الزامی (۲) تحقیقی، جواب دینے سے قبل ارشاد ہوتا ہے:

مَا تَسْأَلُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَذِيرٍ فَذَرْهَا ۖ أَوْ مِثْلَهَا ۚ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ (البقرۃ ۱۰۷، ۱۰۸)

”ہم جب کسی آیت کو موقوف یا فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی پہنچا دیتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں۔“

پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جس قدر بغض وعداوت ہے، اس کا اصلی سبب صرف یہ ہے کہ بنی اسمعیل پر کیوں وحی الہی نازل ہوئی اور بنی اسرائیل کو کس لئے اس فضیلت کبریٰ سے محروم کر دیا گیا؟ ظاہر ہے

کہ وحی والہام کے بدلتے ہی حکومت کا مسئلہ بھی جدید صورت اختیار کرے گا۔ یعنی یہودی ذلیل ہوں گے اور مسلمانوں کو حکومت نوازش ہوگی، اسی لئے وہ بد بخت زیادہ چیخ و پکار کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب ہم کسی ملت کو منسوخ کرتے ہیں تو پھر دو صورتیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں، اس سے بہتر قوم کو اس کی جگہ کھڑا کر دیں یا اس جیسی ہی ہو۔ چنانچہ یہودیوں کی مفضوبیت کے بعد اس کے مساوی درجہ کی قوم عیسائیوں کی کھڑی کر دی گئی، اب ان سے بہتر قوم کو پیدا کیا جاتا ہے: کنتم خیر امة اخراجت للناس، جو تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور ارض الہی کا ایک ایک گوشہ نفعہ توحید سے معمور ہو جائے گا۔

زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہے۔ وہ ایک قوم کو حکومت نوازش کرتا ہے، جب اس میں ناقابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری ملت قائم کی جاتی ہے کہ نظام عالم میں خلل نہ واقع ہو، اور ارض الہی فساد کا گہوارہ نہ بن جائے۔ پھر اقوام و امم کے تغیر و تبدل پر اللہ تعالیٰ کا علم کس طرح محل اعتراض بن سکتا ہے، اگر عرب کے ظہور و شہود کو ہم نے باقی قوموں سے موخر کر دیا تھا اور کائنات خلعت ابراہیم کے بعد اس پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا تھا تو یہ کسی نہ کسی مصلحت کی بناء پر تھا، چنانچہ اس تاخیر کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آج دنیا کی تمام قومیں اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں اور وہ جہاں جاتی ہے فتح و نصرت اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

ناسخ و منسوخ؟

فن تفسیر میں ناسخ و منسوخ ایک اہم ترین باب ہے، جس سے ناواقفیت زلتہ قدم کا باعث ہوتی ہے۔ نسخ کی تعریف میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر اس کے متعلق عجیب و غریب مباحث پیدا ہو گئے۔ حضرات صحابہ و تابعین کے کلام کا استقرا بتاتا ہے کہ وہ نسخ کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ذریعہ زائل کر دینا، اس لئے اگر عمل کی مدت ختم ہو گئی، کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر کی جانب پھیر دیا، یہ بتایا کہ پہلے جو قید تھی وہ صرف اتفاقی طور پر لگائی گئی تھی۔ لفظ کی عمومیت میں کچھ تخصیص کر دی، منصوص اور مقیس علیہ ظاہری میں امر فارق کو بیان کر دیا، یا جاہلیت کی کسی عادت اور قانون کو دور کر دیا، تو ان کے نزدیک یہ تمام صورتیں نسخ میں داخل ہوں گی۔

ابن حزم نے کہا:

”النسخ فی اللغة موضوع باء معنیین احدهما الزوال علی جهة الانعدام والثانی الی جهة الانتقال“

لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں (۱) ایک، حکم بالکلیہ زائل کر دینا (۲)، حکم کی مدت عمل ختم ہو گئی اس کی جگہ دوسرا حکم دینا۔

ایک مثال سے یہ مضمون اور زیادہ واضح ہو جائیگا، طبیب اپنے مریض کی حالت کا اندازہ کر کے اس کے لئے منضج کا نسخ



تجویز کرتا ہے، جب اس کا اثر مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو مسہل کا نسخہ دیتا ہے، یہی مثال ہے تمام احکام شرعیہ کی۔ مگر متاخرین ارباب تفسیر نے نسخ کی جو تعریف کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک ہی وقت میں دو متناقض حکم صادر ہوں تو دوسرا پہلے کے لئے نسخ ہوگا، مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ منطقیوں نے تناقض کے لئے آٹھ شرطیں معین کی ہیں۔

درتنا قض ہشت وحدت شرط داں  
 وحدت موضوع و محمول و مکاں  
 وحدت شرط و اضافت جزو و کل  
 قوت و فعل است در آخر ماں

لیکن کیا کوئی صاحب علم و بصیرت ثابت کر سکتے ہیں کہ جن آیتوں میں وہ نسخ و منسوخ کو تسلیم کرتے ہیں ان میں کہیں یہ شرطیں بھی پائی جاتی ہیں یا نہیں والنبیۃ علی البدعی، اگر ہم اس وقت، جبکہ الیوم اکملت دینکم کی آیت ہمارے سامنے ہو، نسخ و منسوخ کو قرآن میں تسلیم کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قریباً تمام قرآن بیکار ہے۔ خود زمانہ رسالت میں نسخ کا ہونا مسلم اور اس کی مثال بیمار اور طبیب کی ہے، ایک امت کو وجود میں لانے کے لئے ان تمام منازل میں سے گزرنا ضروری ہے، مگر اب تو وہ ایک مکمل قانون کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور کسی کو اس میں تغیر و تبدل کا حق نہیں۔ بعض لوگوں نے پانسو آیات کو منسوخ تسلیم کیا۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بیس آیات ہیں اور امام المتاخرین شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں صرف پانچ آیتوں پر اکتفا کیا۔ یہ رفتار خود بتا رہی ہے کہ کسی طرح آہستہ آہستہ نسخ و منسوخ کے اصول کو اس وقت قرآن سے زائل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ کی پانچ آیتوں میں آپ زراقت نظر سے کام لیں تو ان کا نسخ بھی جاتا رہتا ہے اور اس طرح تمام کتاب اول سے لے کر آخر تک قابل عمل بن جاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان پانچ آیات کی اپنے مقام پر ایسی توجیہ کر دی ہے کہ کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔

اور اس آیت سے تو کسی طرح استدلال ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ اس میں ملتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے۔

اعتراض کی اصلی غرض

أَمْ تَرْيَدُونَ أَنْ نَسْأَلَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ لَ الْكُفْرِ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿٢٥﴾

”کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسے سوال کرو، جیسے اس سے قبل موسیٰ سے کئے گئے تھے اور جو کوئی



یقین کے بدلے انکار لیوے، وہ سیدھی راہ بھول گیا۔

جس وقت مسلمانوں نے یہودیوں سے قبلہ پر اعتراضات سنے تو ان کے دل میں بھی خلجان پیدا ہوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سوالات کئے، انہیں جواب دیا گیا کہ جب تم نے شارع ﷺ کو اللہ کا رسول (ﷺ) تسلیم کر لیا، اب اس کے احکام و اوامر میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ جو شبہات تمہارے دل میں پیدا کئے گئے ہیں، ان کی اصل غرض تو یہ ہے کہ تمہارے ایمان و اسلام میں خرابی آجائے اور بنیادی اصول غلط نظر آنے لگیں۔ کثرت سے سوال کرنا، فلسفیانہ مشگافیاں اور دور از کار مباحث لا کھڑے کرنا، ان یہودیوں کا کام ہے۔ ان کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے سوالات سے تنگ کر دیا اور پھر اس سوال و جواب کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ ایسے سوالات کرنا مسلمانوں کی شان سے بعید ہے۔

جن لوگوں میں کام کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور وہ نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انہیں سوالات کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے کیونکہ انہیں فرائض کی ادائیگی ہی سے فرصت نہیں ہوتی کہ سوالوں کی طرف ان کا دماغ متوجہ ہو، البتہ بیکار لوگ برابر سوال کرتے رہتے ہیں کثرت الکلام تبغی عن قلت العمل، اسی لئے عرب میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ کن بد اولات کن لسانا زبان کی بجائے درست عمل بننے کی کوشش کرو۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِسْلَامِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْتَصُواْ وَاصْفَحُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ (البقرۃ ۱۰۹)

”بہت سے کتاب والے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر بنادیں اور یہ اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں تمہارے لئے حسد ہے باوجود اس بات کے کہ حق ان پر کھل چکا ہے پس تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک اللہ اپنا حکم بھیجے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس آیت میں یہودیوں کے اعتراض کی اصلی غرض بیان کر دی کہ وہ مسلمانوں کو دین حق سے منحرف کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی بغض و عداوت کی بنا پر کہ بنی اسمعیل پر کیوں کروچی نازل ہوئی۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اب زمانہ کی ضروریات اسی بات کی مقتضی ہیں کہ قرآن کا نزول ہو۔ کیونکہ تورات، زبور اور انجیل میں سے کوئی کتاب بھی انسان کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔

جب ایک عالم آدمی قانون کا اتباع چھوڑ دیتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی راہ حق سے منحرف ہو جائیں۔ ورنہ اس پر اعتراضات ہوں گے۔ یہی حال یہودیوں کا ہے۔ اپنی کتاب کو دواعظہو دھم کر دیا: اب مسلمانوں میں بھی یہی بے عملی کا مرض پیدا کرنے کی فکر میں ہیں، اسی لئے اعتراض کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اصلی مقصد اسلام سے الگ کرنا ہے تو ان کے غصہ و انتقام کی کوئی حد نہ رہی، کہ ان کی عزیز ترین متاع حیات پر حملہ ہو رہا تھا۔ مگر انہیں سمجھا دیا گیا کہ بدلہ لینے کا ابھی وقت نہیں آیا، اس وقت تو درگزر

سے کام لینا زیادہ مناسب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جہاد فی سبیل اللہ کے احکام نافذ کرے۔ چنانچہ جب مسلمان اس کے لئے تیار ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: ”أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلُمًا ۖ وَإِنَّا اللَّهُ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝۱۰۱“ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۖ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتَّ مَثَاصِوَامُ وَيَبْعُ وَصَلَوْتُ ۖ وَمَسْجِدُ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝۱۰۲“ (الحج ۳۹، ۴۰)، جن مسلمانوں سے کافر لڑتے ہیں، ان کو بھی ان کافروں سے لڑنے کی اجازت ہے، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور کچھ شک و شبہ نہیں کہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو صرف اتنی بات کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے صومعے اور گرجے اور یہودیوں کی عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے اور جو اللہ کی مدد کرے گا، اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ کچھ شک و شبہ نہیں کہ اللہ زبردست اور سب پر غالب ہے۔

یہ فرصت کا وقت ہے اس کو غنیمت جانو اور لڑائی کے لئے جن ابتدائی امور اور اخلاق و جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی مشق ان ایام میں کر لو۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج ابتدائی تعلیم کے قائم مقام ہیں، جب تک ان میں کمال نہ پیدا ہو گا جہاد میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ اس آیت میں دو چیزوں کا حکم دیا کہ عفو اور صفحہ سے کام لو۔ ”عفو“ سے مراد یہ ہے کہ ان کی حرکات کو اس وقت اپنے دل سے اس طرح فراموش کر دو کہ باوجود زور دینے کے پھر بھی یاد نہ آئیں اور ”صفحہ“ کا منشا یہ ہے کہ ان باتوں کی طرف توجہ تک نہ کیجئے۔ کیونکہ جب ان باتوں کی یاد تمہارے دل میں تازہ ہوگی فوراً بھڑک اٹھو گے۔ اس لئے عفو سے کام لو اور آنے والے وقت کے لئے تیار ہو جاؤ، ان ایام میں تمہارے فرائض یہ ہوں گے:

### ارکان اسلامی کی انتہائی غرض

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تَقَدَّمُوا لَأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۰۳

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیجو گے وہ اللہ کے پاس پاؤ گے، بیشک اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔“

نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، بچپن کی تعلیم، اور جوانی میں عمل صالح کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کو آرام ملتا ہے، پس اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر نماز اور زکوٰۃ کی مشق کرو اور یہ محنت ضائع نہ جائے گی، بلکہ اب جس قدر مشقت برداشت کرو گے، میدان جنگ میں اتنا ہی فائدہ ہو گا، تم میں جوش و ولولہ، عزم و ثبات قدم اور استقلال و استقامت کے جذبات حقہ پیدا ہوں گے اور ایثار و فدویت کی بنا پر کفار و منافقین کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ گے، کیونکہ جنگ کے موقع پر یہی اخلاق کام آتے ہیں۔ تعداد اور سامان حرب کی کثرت کچھ بھی مفید نہیں ہوتی: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارا ایک ایک کام نہایت ہی گہری نظر سے دیکھ رہا ہے، اس کی مصلحت چاہتی ہے

کہ ابھی جہاد کا حکم نافذ کرنے میں تاخیر ہو۔

قرآن حکیم نے صدامقامات پر نماز کو مسلمانوں کا اولین فرض قرار دیا، کہیں فرمایا: **وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرُّكُوعِ** (البقرة ۴۳) ایک جگہ آیت: **حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ۖ وَقُومُوا لِلَّهِ قَنِتِينَ** (البقرة ۲۳۸) بعض مواقع پر یوں ارشاد ہوا: **إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا** (النساء ۱۰۳) **أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** (الروم ۳۱)، **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (البقرة ۱۵۳)**، **وَإِذْ كُنَّا نَسُجَّدُ لِلَّذِينَ لَا يَكُنْ لَكُمْ عَلَيْهِمْ كِبَىٰ ۖ وَتَسْتَغْفِرُ لَهُمْ** (الزلزل ۸)، **وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي** (طہ ۱۳)، **مُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا** (المؤمنون ۲)، **وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ** (المؤمنون ۹)، **رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ (النور ۳۷)**، **كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ آمَنُوا بِمَا هُمْ يُحَافِظُونَ** (الذريت ۱۸، ۱۷) **يَسْتَغْفِرُونَ** (الذريت ۱۸، ۱۷)

ان آیات کے علاوہ اور بہت کثرت سے آیات ملتی ہیں جن میں نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تاکید کو ان الفاظ میں واضح کیا:

عن ابن مسعود قال سألت النبي ﷺ أي الأعمال أحب إلى الله تعالى قال الصلاة لوقتها۔

“ابن مسعود کہتے ہیں میں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے پوچھا، انفرادی حیثیت سے اعمال انسانی میں سے کو نسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔“

حضرت جابر سے ہے کہ الفرق بین العبد و بین الکفر ترک الصلوٰۃ، بندہ اور کفر میں فرق کرنے والی چیز نماز کا ترک کر دینا ہے، ایک حدیث میں فرمایا: مروا اولادکم بالصلوٰۃ وهم ابناہ سبع سنین و اضربوہم علیہا وهم ابناہ عشر سنین و فراقوا بینہم فی المضاجع، سات سال عمر والی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو، دس سال ہونے کے باوجود نہ پڑھیں، تو ان کو مارو اور اپنے پاس مت سونے دو۔ عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ صحابہ صرف ترک صلوٰۃ ہی کو کفر سے تعبیر کرتے تھے۔ کان اصحاب رسول اللہ ﷺ لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفرًا غیر الصلوٰۃ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو حسب ذیل خط لکھا: ان اہم امور کم عندی الصلوٰۃ، من حفظہا وحافظ علیہا حفظ دینہ ومن ضیعہا فہو لہا سواہا اضیع تمہارے جس قدر اعمال و امور ملکی ہیں ان میں میرے نزدیک اہم و اعظم ترین نماز ہے، جس نے اس کی نگرانی کی اس نے اپنے دین کو بچا لیا اور جس نے اس ادنیٰ ترین مشقت کو برداشت نہ کیا، اس سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے اور کسی بڑے ملکی کام میں اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی زکوٰۃ کے لئے بھی قرآن حکیم میں مختلف آیات نازل کی گئیں۔ مؤمنین کی شان یہ بیان کی: **وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** (المؤمنون ۴) **وَجَعَلْنَاهُمْ أَكْبَرًا يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ** (الانبیاء ۷۴) عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں آتے ہی اعلان کیا: **أَوْصِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا**

دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم ۳۱) اسلحیل کی تعلیم کے اصول اساسی یہ تھے: وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (مریم ۵۵)  
قرآن حکیم میں جہاں کہیں زکوٰۃ کا لفظ آتا ہے، اس سے فقہاء کی اصطلاحی زکوٰۃ مراد نہیں بلکہ اللہ کے نام پر خرچ کرنا  
اور فقر و مساکین کو کھانا کھانا، خصوصاً کی آیات میں تو اس کے سوا اور دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ مدینہ میں آکر اس کا  
قانون مرتب ہوا اور شارع علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بناتے وقت یہ وصیت کی:

ان الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من اغنياءهم فتدفع على فقرائهم۔

”اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے کہ ان کے دو تہمندوں سے لے کر ان کے فقر و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔“

اور اسی زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے پر ابو بکر نے اصحاب الروۃ سے جنگ کی اور فرمایا:

والله لا قاتلن من فرق بين الصلوة والزكاة، فان الزكاة حق المال والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها الى رسول الله ﷺ لقاتلتهم على منعها،

”اللہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ جنگ کروں گا، اس لئے کہ یہ مال کا حق ہے واللہ اگر یہ  
بکری کا ایک بچہ بھی مجھے نہ دیں گے جبکہ یہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے، تو نہ دینے پر ضرور لڑوں گا۔“

نماز اور زکوٰۃ دونوں کو مسلمانوں پر فرض کیا گیا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ جہاد کے لئے ایک آیت بھی نازل نہ ہوئی تھی، یہ  
ترتیب نزول خود اس امر پر شاہد ہے کہ شریعت کی نظر میں نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ اور حج بالکل ابتدائی تعلیم کے درجہ پر ہیں۔  
اعلیٰ ترین تعلیم اور انتہائی اسلامی ڈگری دوسری ہے، جس کا نزول ایک مدت کے بعد ہوا۔ اور سورہ بقرہ میں فرمایا:

لَيْسَ الذِّبَانُ أَنْ تَوَلَّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (البقرہ ۱۷۷)

”مشرق و مغرب کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنا ہی بڑی نیکی نہیں بلکہ آگے چل کر تمہیں اس سے اعلیٰ ترین نیکی بھی  
بتائی جائے گی۔“

سورہ صف میں اور زیادہ واضح کر دیا:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُيُوتًا مَرْصُوعًا ۝ (صف ۴)

”اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو کہ اس کی راہ میں ایسے صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ دیوار ہیں جس میں  
سیسہ پلایا گیا ہے۔“

خود اس سورہ کا شان نزول ہی بتاتا ہے کہ صحابہ، جو تمام اعمال اسلامی کی پابند تھے، اس امر کے متلاشی ہوئے کہ اب  
انہیں وہ کام بتایا جائے جو اصحاب الہ اعمال الی اللہ ہو، اس سوال کے جواب میں صف کا نزول ہوا، پھر سورہ توبہ میں تو صاف  
صاف کہہ دیا کہ:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ  
عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (توبہ ۱۹)

”کیا حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادی کو اس شخص کے برابر کر دیا جو اللہ اور یوم آخرۃ پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔“

سورہ نساء کو دیکھو! نماز جو تمہارے نزدیک جہاد اکبر تھی، قرآن کی نظر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں کس طرح ابتدائی درجہ میں آگئی۔ قصر صلوٰۃ کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) قصر جماعت (۲) قصر رکعات (۳) قصر اوقات، پہلی صورت کو اسی سورہ نساء نے صاف کر دیا: وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقِمْ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ (النساء ۱۰۲) رکعات کے متعلق یہ حکم ہوا کہ چار کی جگہ سفر میں دو پڑھ لیا کرو: وَإِذَا حَضَرْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلْيَسْ عَلَيْنَكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تُقْصِرُوا مِنَ الصَّلَاةِ (النساء ۱۰۱) اب رہا قصر اوقات کا مسئلہ۔ تو شارع ﷺ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ جمع صوری ہو سکتی ہے، تمام دن سفر کرتے کرتے ایک شخص دوپہر کو ضرور قیام کرے گا۔ پس ظہر و عصر کو ملا کر پڑھ لے، رات کو کسی نہ کسی جگہ آرام کرے گا۔ اس وقت مغرب اور عشاء ادا کرے، بلکہ غزوہ خندق میں آپ نے چار نمازیں ایک ہی وقت میں ادا کیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: احس ليلة في سبيل الله افضل من الف ليلة يقام ليلها ويصام نهارها، اللہ کی راہ میں ایک رات کی چوکیداری، ہزار شب کی ایسی عبادت سے بہتر ہے کہ تمام راتوں میں قیام ہو اور دن کو روزہ ہو۔ ایک حدیث میں آیا: رباط يوم في سبيل الله خير من الدنيا وما عليها، فی سبیل اللہ ایک روز چوکیداری کرنا، دنیا اور اس کے تمام سامانوں سے بہتر ہے۔

فضیل بن عیاض، بیت اللہ الحرام میں مصروف عبادت تھے، عبد اللہ بن المبارک نے انہیں حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے:

يا عابد الحرمين لو ابصرتنا  
لعلبت انك بالعبادة تلعب!  
من كان يخضب خده بدموعه  
فخورنا بدمائنا تنتخب!  
ريح العبير لكم ونحن عبيدنا  
دهج السنايك والغبار الاطيب!

حقیقت تو یہی تھی جو اوپر بیان کی گئی۔ مگر بد بختانہ ہم نے جہاد فی سبیل اللہ کو بالکل فراموش کر دیا اور آج اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ نماز اسی لئے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کر دی گئی کہ جنگی خدمت تمام مسلمانوں پر لازم ہو۔ بیک وقت ایک لشکر جہاد تیار ہو جس کے اندر قربانی اور امیر کی اطاعت کا جذبہ صادقہ راسخ ہو اور جو ہر قسم کی بدنی تکلیف کو برداشت کر سکے۔ زکوٰۃ کا منشا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو تا کہ جب کبھی خلافت اسلامی کو روپیہ کی ضرورت ہو تو ہر مسلمان اپنی تمام جائیداد خلافت کی نذر کر دے اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے اور ابو بکر کے اسوہ

حسنہ پر عمل کرے، جس نے اللہ کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دیا تو رسول نے دریافت کیا، بال بچوں کے لئے کیا رکھا؟ ابو بکر نے عرض کیا: ابقیت لہم اللہ ورسولہ، سچ ہے۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند؟  
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند؟  
دیوانہ کنی ہر دو جہا نش بخشی  
دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند؟

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ۚ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۰﴾  
بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۱﴾

”اور کہتے ہیں کہ جنت میں ہر گز نہ جائیں گے مگر وہ جو یہودی ہوں گے یا نصاری۔ یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر وہ سچے ہوں تو کوئی دلیل لائیں۔ بیشک جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے فرمانبردار بنا دیا اور وہ نیکی پر ہے تو اس کی مزدوری اس کے رب کے پاس ہے اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو غم۔“

یہودیوں کی ایمانی حالت تو یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی راہ حق اختیار نہیں کرنے دیتے، مگر باوجود ان حرکتوں کے نجات کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے۔ حالانکہ دخول جنت کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ یکسر اطاعت و فرماں برداری بن جائے، اس کا اٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا، جینا اور مرنا سب اسی کے لئے ہو: إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۱۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۱۳﴾ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) جس کی فطرت صالح اور قلب سلیم ہوا لا من لق الله بقلب سليم، اور جو الذین امنوا و عملوا الصلحت کے گروہ میں شامل ہو۔

## تنبیخ ملل

وَقَالَتِ الْيَهُودُ نَبِيُّهُمْ عَلِيٌّ شَوْءٌ ۖ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ نَبِيُّهُمْ عَلِيٌّ شَوْءٌ ۖ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۴﴾ (البقرة ۱۱۳)

”اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی راستی پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہودی راستی پر نہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کہا جن کے پاس علم نہیں، پس جس بات میں وہ جھگڑتے تھے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کرے گا۔“

جب نصاریٰ نجران کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو علماء و احبار یہود بھی ان سے ملنے کے لئے آئے، باہمی گفتگو ہوتی رہی تا آنکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نہایت ہی گستاخانہ الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ

نصاری بالکل غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ادھر عیسائیوں نے حضرت موسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور کہا کہ سب کے سب یہودی ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہیں اور لطف کی بات یہی ہے کہ دونوں گروہوں کا توراۃ پر ایمان ہے جس میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ دونوں کی نبوت کا اعلان ہے۔ ایک دوسرے کو گمراہ کہنا اور راہ حق پر نہ سمجھنا، اس لئے ہے کہ ان میں سے کوئی فریق اقوام و ملل کے بدلنے اور منسوخ ہونے کا قائل نہیں۔

نسخ قبلہ پر اعتراض کرنے سے قبل یہ دونوں آپس میں فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے؟ اور یاد رہے جب تک وہ تنبیخ ادیان و ملل کے اصول کو تسلیم نہ کریں گے خود ان کا وجود ثابت نہ ہو سکے گا۔ یہودی دنیا میں اس وقت رہ سکتے ہیں، جب موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان کو منسوخ مان لیا جائے اور اگر یہود و نصاریٰ باہمی رضامندی سے ایک نتیجہ پر پہنچ بھی جائیں تو ان سے دست و گریبان ہونے کے لئے مجوسی ہیں۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کے اصلی پیروکار وہی لوگ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کرنا اور اصول تنبیخ ملل کو تسلیم نہ کرنا، تعلیم یافتہ جماعت کی شان سے بالکل بعید ہے۔ یہ جاہلوں کی باتیں ہیں جو ارتقاء و نزول اقوام کے اصول و ضوابط سے واقف نہیں ہوتے۔ اس جھگڑے کے طے کرنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ گھر میں بیٹھ کر غور و فکر کرتے، اس وقت انہیں معلوم ہو جاتا کہ دنیا میں قوموں کا بننا اور بگڑنا، اسی اصول پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ جب یہ لوگ اس طرح فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنا، ان کی زندگی کا اصلی مقصد ہے۔ اور صرف اسی ایک غرض کی خاطر سوالات کا سلسلہ جاری ہے۔ پس جب حق کی تلاش نہیں تو ان جھگڑوں کے طے ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ ان سب کا فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھئے کہ وہ احکم الحاکمین حقیقت اصل یہ کو واضح کرے گا۔

### حقیقت قبلہ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَتَّعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسُلِيَ فِي خَرَابِهَا ۖ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ (البقرة ۱۱۴)

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے منع کیا اور اس کے اجازت کی کوشش کی، ایسے لوگوں کو مناسب نہیں کہ مسجدوں میں آئیں مگر ڈرتے ڈرتے، ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔“

دنیا میں ہر قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک نہ ایک مرکز ہو، تمام افراد ملت اسی کے ساتھ وابستہ ہوں۔ ہر ایک شخص کو اسی کے ساتھ پیوستگی اور مواصلت ہو اور یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے ماتحت کام کر رہی ہے۔ ہزاروں لاکھوں نجوم و کواکب اور ثوابت و سیارات ہیں، مگر سب کا تعلق سورج کے ساتھ ہے جس



سے وہ اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک درخت کی صد ہا ٹہنیاں اور شاخیں ہیں، مگر تمام کارزق جڑ سے آتا ہے۔ ہر دریا اور نہر کے لئے چشمہ ہے، پس اسی قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ امت مسلمہ کی ہدایت و راہ نمائی کے لئے ایک مرکزی درس گاہ ہوتی جس کی شاخیں تمام دنیا میں پھیل جاتیں جو ان تمام متفرق اور منتشر اجزاء کے لئے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہوتی جو سب کے لئے جڑ کا کام دیتی۔ جس کے سرچشمہ سے تمام عالم اسلامی کے دریا اور نہریں سیراب ہوتیں، چنانچہ اس غرض کے لئے واد غدیدی ذمہ کو منتخب کیا گیا۔ وہ سب سے اعلیٰ تعلیم گاہ قرار پائی اور دنیا بھر کی تمام مساجد کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا گیا کہ سب درس گاہوں کی نگراں کار و محافظ ہو۔ جب مختلف بلاد و امصار اسلامی کے مسلمان اپنی اپنی تعلیم گاہوں سے فارغ ہوں تو ایک مرتبہ اس مرکزی درس گاہ میں بھی ضرور حاضر ہوں۔

یہودیوں نے نسخ قبلہ پر اعتراض کیا کہ بیت اللہ قبلہ نہ بنے۔ لیکن دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں لامرکزیت کی ترویج و اشاعت ہو، ایک مرکز سے وابستہ نہ رہ سکیں، ان کی قوتیں منتشر ہو جائیں، ان کی متحدہ طاقت فنا ہو جائے۔ ان کا کوئی تعلیمی مرکز نہ رہے اور جب مرکز نہ ہو گا تو وہ دنیا بھر کی مسجدیں خود بخود ذکر الہی سے خالی ہو جائیں گی، کوئی قوت ان کی نگراں کار نہ ہوگی، ان کا نظام قائم نہ رہ سکے گا۔ پھر ان سے بڑھ کر بھی کوئی دوسرا شخص ظالم ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کو مسجد میں قدم رکھتے ہوئے ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان پر عذاب نہ نازل ہو جائے۔ آخر میں ان کا انجام بتا دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل رہیں گے اور آخرت میں عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے۔

وَاللّٰهُ الْمَشْرِقِيُّ وَالْمَغْرِبِيُّ ۚ فَآيِنَّمَا اتَّوَلَّوْا فَنَسَمَّ ۖ وَجْهَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاَسَمَّ عَلَیْہِمْ ؕ (البقرة ۱۱۵)

“اور اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم رخ کرو ادھر ہی کو اللہ متوجہ ہے، بیشک وہ گنجائش والا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔”

مذہبی آدمی ہونے کے باوجود بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بیت المقدس ہی میں محدود کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف اسی طرف رخ کرنے سے انوار تجلیات الہیہ کا نزول ہو سکتا ہے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کے لئے تو مشرق و مغرب سب برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس جگہ کچھ لوگ جمع ہو کر اس کے ذکر میں مصروف ہوں گے اس کی رحمت فوراً اس طرف متوجہ ہو جائے گی۔ اس کی رحمت کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور وہی جانتا ہے کہ اس کا صحیح محل نزول کونسا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک بزرگ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی یاد کرتا ہے تو وہاں اس کی رحمت نازل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر عام لوگ اس کا اتباع کریں تو اور زیادہ انوار الہیہ نازل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ بیت اللہ کی بنیاد ابراہیم و اسمعیل دونوں نے مل کر رکھی اور اس وقت سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ہر نبی نے اس کا حج کیا، گویا بنا کی تاریخ سے لے کر امت مسلمہ کے وجود تک کوئی ایک زمانہ بھی اس پر ایسا نہیں گزرا کہ کوئی نہ کوئی پیغمبر جلیل طواف کعبہ کی غرض سے یہاں نہ آیا ہو۔ بیت اللہ بننے کے چالیس سال بعد حضرت اسحق علیہ السلام نے بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور آخر داؤد و سلیمان نے اس کی عمارت بنائی۔ اب ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس قدر اس کی رحمت کے نزول کا باعث بن



سکتا ہے، بیت المقدس اس کا عشر عشر بھی نہیں۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنی لئے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار کی پیشین گوئی ہے، وہ جس طرح بھی رخ کریں گے فتح و نصرت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی۔ دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پھیل کر رہیں گے اور مشرق و مغرب پر انہیں کا قبضہ ہوگا، اللہ کی وسعت کو کون پاسکتا ہے، دوسری جگہ سورہ قدر میں اسی قسم کی پیشین گوئی کی: تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۚ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۱۰۱﴾ لیلتہ القدر میں امن اور سلامتی کا جو پیغام نازل ہوا ہے وہ مشرق و مغرب تک پھیل کر رہے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحٰنَهُ ۚ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ بِدِيْعِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَاَنۡشَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۰۳﴾

“اور کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، سب اس کے فرماں بردار ہیں، آسمانوں اور زمین کا وہی موجد ہے اور جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔”

اہل کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت صرف بیت المقدس ہی میں مل سکتی ہے۔ اس غلط عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے پہلے یہودی عزیز علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ اس کی ذات اقدس ان تمام تعلقات اور قیود سے پاک ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی مملوک ہے۔

بنی اسرائیل کی شریعت میں علماء و مشائخ کیلئے ابن اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے معنی محبوب الہی ہوتے تھے، مگر جس وقت عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف یونانیوں کو اپنے مذہب کی جانب بلانے کی کوشش کی، تو ان کے عقول عشرہ کے مسئلہ سے فائدہ اٹھا کر کہنے لگے کہ عقل اول کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ اس لئے اگر پہلے احبار یہود مجازی طور پر ابناء اللہ کہے جاتے تھے تو عیسیٰ علیہ السلام حقیقی معنی کے اعتبار سے ابن اللہ ہیں۔

عقول کا سلسلہ چلانا بالکل غلط ہے۔ اس نے اپنی حکومت کسی کے حوالہ نہیں کی بلکہ ہر چیز کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے ہے۔ ابداع کہتے ہیں: ایجاد شیء لا من شیء فیخبرہ الشیء من کتم العدم بغیر مادۃ کہ بغیر مادہ کے کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لانا، پس زمین و آسمان اور اس کی ہر چیز کا مبدع وہی ہے، اس میں عیسیٰ علیہ السلام بھی داخل ہیں اور اس کے فرماں بردار بندے۔ دوسری جگہ آیہ: لَنْ يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يُكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ (النساء ۱۷۲) مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہر گز کسی قسم کا عار نہیں اور نہ فرشتوں کو جو خدا کے مقرب ہیں۔ قیامت کے روز جب ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا خدا مانو، تو وہ اپنی بریت و پاک دامنی کا اظہار کریں گے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ لِيٰعِيسٰى ابْنِ مَرْيَمَ اَنْتَ قُلْتُ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاٰوِیْهِمُ الْهٰیۡنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۚ بِحَقٍّ ۚ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتُہٗ ۚ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ عَلٰمُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۴﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا

مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۱۱، ۱۱۶)

پس جس طرح عزیر و عیسیٰ کو خدا کا بیٹا ماننے میں وہ غلطی پر ہیں، ایسے ہی اس کی توجہ کو بیت المقدس کی جانب محدود کرنے میں غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنْزِيلًا آيَةً ۖ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۱۶﴾

“اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ایسے ہی جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان ہی جیسی باتیں کہا کرتے تھے، ان سب کے دل ایک ہی طرح کے ہیں۔ ہم نے یقین والوں کے لئے اپنی نشانیاں صاف طور پر بیان کر دیں۔”

توراة کو کتاب الہی اور موسیٰ کو نبی ماننے کے باوجود تحویل قبلہ پر اعتراض کرنا اور تنسیخ ملل کے اصول کو تسلیم نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ مذہب سے بہت دور جا پڑے ہیں، اس صورت میں قبلہ کی بحث تو بعد میں آئے گی، پہلے ان لوگوں کو مطمئن کر لیں جو اپنی جہالت و لاعلمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ نبی بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے کیوں نہیں براہ راست گفتگو کرتا یا ہم میں سے ہر ایک کو کس لئے نبی نہیں بنایا جاتا، ہم پر بھی اللہ کی آیتوں کا نزول ہو اور ہم سے معجزات ظہور میں آئیں، دوسری جگہ ان جاہلوں کا اسی قسم کا مطالبہ بیان کیا: وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِحَقِّ نَبِيِّهِ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رَسُولُ اللَّهِ (الانعام ۱۲۴) ان کے جواب میں کہا گیا: أَنَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے، اسی کو نوازش کرے گا۔

اس قسم کے سوال و جواب وہی لوگ کرتے ہیں، جو جاہل ہوں اور دین سے بے بہرہ، یہودی بھی ان جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ دونوں جماعتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر طبیعت میں کبھی اور جہالت نہ ہوتی تو آیات کے سنتے ہی ان میں یقین و اذعان پیدا ہو سکتا تھا۔

## بعثت کی ضرورت

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۷﴾ (البقرۃ ۱۱۷)

“ہم نے تمہیں حق دے کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ والوں کی نسبت سوال نہیں کیا جائے گا۔”

ممکن تھا اہل کتاب کی کج بختیوں اور جاہلانہ باتوں سے رسول اللہ ﷺ تنگ دل ہوتے، جیسے سورہ شعراء میں فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسًا أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾ (الشعراء ۲) اس لئے آپ کے اطمینان قلب کے لئے فرمایا کہ ہم نے تم کو خواہ مخواہ رسول بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ دنیا کے حالات و واقعات اسی امر کے مقتضی تھے، اس لئے کہ:

(الف).... بنی اسرائیل کو زمانہ ہوا مسیح سے قبل ہی غضب الہی میں مبتلا ہو چکے تھے، ان کو سانپ اور سانپ کے بچے کہا جاتا تھا۔ مسیح علیہ السلام کی لعنت نے ان کو اور زیادہ مسخ کر دیا اور اب ان میں انسانیت کا ذرہ برابر بھی شائبہ باقی نہ رہا۔ ہمسایہ قوموں کی صحبت و یک جانی سے ان میں بت پرستی آگئی۔

(ب).... یورپ قرون مظلمہ میں سے گزر رہا تھا اور چاروں طرف جہالت کا دور دورہ تھا۔ انگلستان میں برٹن اور سکسن وحشی قومیں آباد تھیں۔ نار تھمبر لینڈ، مڈ لینڈ، کون ٹیز، نار فوک، سوفوک اور ساسیکس اضلاع انگلستان میں ووڈن بت کی پوجا ہوتی تھی۔

فرانس، برن ہلڈ سگ برٹ، فرے دی گوئن دی، اور مل ہے رک کے نصف پر افسانوں کی حکومت تھی، جبکہ پادریوں کے ایماء سے بہت سی بیہودگیاں روار کھی جاتی تھیں۔ فرانس ہمیشہ سکین قوم سے دریائے الب پر جنگ کرتا رہتا تھا۔ یہ لڑائی ۷۸۲ء کے بعد تک جاری رہی۔ جبکہ ہزار سکین قیدی نہایت ہی بے رحمی سے شہر ووڈن میں قتل کئے گئے۔ ہنگری ان دنوں بے انتہا وحشی و بربری اقوام کے قبضہ میں تھا جس کو ظالمانہ وسائل سے اپنی مذہب میں لایا گیا تھا۔

(ج).... ایران میں مجوسیت و کیم کا زور تھا جنہوں نے زر، زن اور زمین کو وقف عام کر دینے سے اخلاق انسانی اور نوعی ارتقا کا ستیاناس کر دیا تھا۔

(د).... ہندوستان میں پرانوں کا زمانہ تھا۔ ایام مارگی فرقہ قابو یافتہ تھا جو اپنے ناپاک اور گندے اصولوں کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا۔ مندروں میں عورتوں اور مردوں کی برہنہ تصاویر بنا کر رکھی جاتی تھیں۔ انہی کی پرستش ہوتی تھی۔ عبادت خانوں کے درودیوار پر ایسی تصویریں آویزیں ہوتی تھیں جن کو ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شریف اور مہذب انسان دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔

(ه).... چین کے رہنے والے اپنے ملک کو آسمانی فرزند کی بادشاہت تصور کر کے خدا سے منہ موڑ چکے تھے۔ ہر کام کے جد اجدا بت مقرر تھے۔ کوئی بارش کا ہے، کوئی امن کا ہے اور کوئی جنگ کا۔ عام خیال یہ ہے کہ کنفیوشس نے آکر چین کی اصلاح کی ہے، مگر اس وقت تک اس کا بھی ظہور نہ ہوا تھا۔

(و).... مصر میں عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور انبیت کے متعلق نئے عقیدے بنتے تھے، جن کی وجہ سے ایک فرقہ دوسرے کی تکفیر کرتا، باہمی خون ریزی ہوتی اور اگر موقع بن پڑتا تو آگ میں بھی جلادیتے۔

(ز).... عرب میں خود سری تھی، اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرتے، جو اور شراب کا عام دستور تھا۔ بیٹوں کو زندہ دفن کر دیتے، پتھر، درخت چاند، سورج، پہاڑ اور دریا ان کے معبود تھے۔ انسانی حقوق کا کوئی ضابطہ نہ تھا، اسی لئے قتل انسان، رہزنی، جس بیجا، ناجائز تصرف، بیجا مدخلت کے مرتکب ہوتے تھے۔

پس عین ضرورت کے مطابق آپ کی بعثت ہوئی، اس لئے آپ اپنا فرض برابر ادا کرتے رہیں، جو لوگ راہ حق اختیار

کریں ان کی ہمتوں کو اور زیادہ بڑھائے اور دنیا و آخرت کی کامیابی کی ان کو بشارت دیجئے، لیکن جو آپ کی مخالفت کریں ان کی کمر ہمت کو توڑیے اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دیجئے۔ رہے ضدی اور ہٹ دھرمی لوگ، ان کا سمجھنا آپ کے ذمہ نہیں اِنَّمَا اَنْتَ مَذْكِرٌ ۝ لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّطٍ ۝ (الغاشیہ ۲۲، ۲۱) ان کی ناپاک اور طحیدانہ زندگی کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ قُلْ اِنْ هَدَىٰ اللّٰهُ هُوَ الْهَدٰى ۚ وَلَئِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ  
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلٰى ۚ وَلَا نَصِيْرٌ ۝ الَّذِيْنَ اَتَيْنَهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهُ حَقَّ  
تِلَاوَتِهِ ۚ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

“اور تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک ان کا دین اختیار نہ کر لو۔ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت وہی اعلیٰ ہدایت ہے اور اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آگیا ہے، انکی خواہشوں کی پیروی کی تو پھر اللہ سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسکو پڑھتے ہیں جیسا پڑھنے کا حق ہے۔ اور وہی اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور جو کوئی اس سے منکر ہو گا، وہی نقصان میں رہے گا۔

یہاں بالکل صاف صاف کہہ دیا اور “نہ لانے سے اس کے دوام اور ہمیشگی کی طرف اشارہ کیا کہ یہود و نصاریٰ ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں سے خوش نہیں ہو سکتے۔ اسلام کے لئے بغض و عداوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ ان یقول بنی اللہ، اسی معصیت کی طرف سورہ بروج میں اشارہ کیا: وَمَا نَقِبُوا مِنْهُمْ اِلَّا اِيْوَمَنَا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، سچ ہے۔

حياتك ذنب لا يقاس به ذنب!

البتہ اگر مسلمان اپنے قرآن کو ترک کر دیں اور ان کی اطاعت قبول کر لیں تو پھر وہ ان کے ساتھ ہیں، مگر ان اہل کتاب کی اطاعت کو قرآن حکیم کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ طٰطِعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْسَانِكُمْ كُفْرًا ۚ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ  
وَ اَنْتُمْ تُثَلِّىٰ عَلٰىكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهُ ۚ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(آل عمران ۱۰۱، ۱۰۰)

“مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے کسی فرقہ کا بھی کہا مانو گے وہ تمہیں راہ حق سے پھر دیں گے اور ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اور تم کیسے کفر کرنے لگو گے؟ حالانکہ اللہ کی آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور اس کے رسول تم میں موجود ہیں اور جو شخص اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رہے بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی۔“

اطاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوا کرتی ہے، جب کسی قوم کے پاس قانون نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کے پاس

قانون بھی ہے اور اس کی شرح بھی، رسول اکرم ﷺ کی حیات مقدس قرآن کی عملی تفسیر ہے، باوجود اس کے پھر وہ یہود و نصاریٰ کی فرماں برداری کریں تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کی رحمت سے دور جا پڑے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَلَوْلَا اَنْ تَبْتَئِكَ لَعَدَّتْ كَيْدُكَ تَتَرَكْنُ اِيْنِهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۚ اِذَا لَا دُفْنُكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۷۵، ۷۴)

”اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے تم کو ثابت رکھا تو تم ضرور جھکنے لگ جاتے ان کی طرف تھوڑا سا۔ ایسا ہوتا تو ہم ضرور دونا عذاب زندگی کا اور دونا عذاب موت کا چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔“

رسول اکرم ﷺ کی تمام تر زندگی اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمیشہ نصرت و یادری کی اور کبھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، پس معلوم ہوا کہ آپ نے یہود و نصاریٰ کے اتباع کا خیال بھی نہیں کیا۔ اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ رسول اللہ ﷺ معاذ اللہ اہل کتاب کا اتباع کر سکتے ہیں، سخت غلطی کا مرتکب ہونا ہے۔ اس آیت کے معنی دو طریق پر ہو سکتے ہیں۔

(الف) رسول اللہ ﷺ کی معرفت تمام امت مسلمہ سے خطاب کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کا اتباع کیا تو ظالم بن جاؤ گے۔ چنانچہ آل عمران کی آیت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔

(ب) غیر ممکن اور محال کو فرض کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اِلَهٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء ۲۲)

اگر محال اور ناممکن کے حسب ذیل اقسام کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو اکثر اشکالات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔

(۱).... عقلی، جو کبھی نہ ہو سکی مثلاً نظیر باری تعالیٰ۔

(۲).... فطری، جو نیچر کے خلاف ہو، آفتاب کا ایک غائب ہو کر پھر کبھی نہ نکلتا۔

(۳).... عادی، نیچر کے جس قدر قوانین ہمیں معلوم ہیں، ان کے خلاف، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اسی تیسری قسم میں داخل ہیں۔

محال عقلی تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں وجود کے قبول کرنے کی قابلیت اور استعداد ہی نہیں ہوتی۔ محال فطری، اس حکیم علی الاطلاق کی حکمت کلی کے خلاف ہے، اس لئے نہیں ہوتا، مگر اس میں وجود کی قابلیت ضرور ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے متعلق ہو سکتی ہے۔

محال عادی، ہمیشہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر ہوا ہے۔

قرآن حکیم صرف ارباب صلاح و تقویٰ کے لئے نازل کیا گیا ہے، وہی اس میں درس و فکر کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کے لئے پوری ہمت صرف کرتے ہیں۔ جو بات انہیں سمجھ میں نہ آئے آپ سے دریافت کر لیتے ہیں۔ یہی لوگ مومن ہیں، اس لئے صرف انہی کی تعلیم کی طرف آپ کی توجہ ہونی چاہئے۔ یہود و نصاریٰ بات کی بچ کرتے ہیں۔ ان پر

وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی اپنی ذلت و رسوائی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں اور آخر میں یہی لوگ ناکام و خاسر رہیں گے۔

## انصاف سے کام لیں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْعَمُوْا عَلٰى الَّذِيْنَ اٰتٰوْا بِكُمْ اَمْوَالَهُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۱ وَ اَتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝۱۸۲

”اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ سارے جہان پر تم کو بڑا کیا اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے نہ کسی کی سفارش کام دے اور نہ لوگوں کی ان کو مدد پہنچے۔“

گذشتہ آیات میں تحویل قبلہ کے متعلق الزامی جواب دیا گیا۔ اب تحقیقی اعتبار سے گفتگو کی جاتی ہے۔ ان کی قومی دیانت، خاندانی بزرگی اور احتساب اعمال کو پیش کر کے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں اور صحیح جواب دیں۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمٰتٍ فَاَتٰتَهُنَّ ۚ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۖ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتَیْ ۚ قَالَ لَا یَنْبَلٰی عَنْہٗدِی الطَّمٰثِیْنَ ۝۱۸۳

”اور جب ابراہیم کے پروردگار نے ان کو چند باتوں میں آزمایا، پھر انہوں نے ان کو پورا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھ کو تمام لوگوں کا پیشوا بناناؤں گا۔ ابراہیم نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا کہ ظالموں کو میرے عہد سے کچھ حصہ نہ ملے گا۔“

یہاں سے امت مسلمہ کی مؤسس اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی ترک وطن اور ذہاب الی اللہ کی مختلف منازل، قربانی کے مراتب اور بنائے کعبہ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ یہ تفصیل خود ان کی کتابوں میں موجود ہے، اس کو پڑھ لینے کے بعد بتائیں کہ ابراہیم کے وارث کا قبلہ کونسا ہونا چاہئے؟ اگر باوجود اس کے پھر بھی نہ مانیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام سعی و کوشش فتنہ و فساد برپا کرنے کے لئے ہے، ورنہ توراۃ کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا قبلہ یہی ہونا چاہئے۔

امتحان اور آزمائش کی غرض یہ ہوتی ہے کہ:

(الف) .... امتحان لینے والا خود اس شخص کی قابلیت اور استعداد کو دریافت کرنے کی فکر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں۔

(ب) .... دوسروں پر اس کے فضائل و محاسن اور کمالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

(ج) .... اس کی کمزوریوں کو دور کر کے کامل و مکمل بنانا مقصود ہے۔

چنانچہ اس جگہ دوسرے معنی مراد ہیں، وہ کلمات کیا تھے جن میں ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا؟ قرآن نے خود، دوسرے مقامات پر ان کو بیان کر دیا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) .... قوم سے علیحدگی، حضرت ابراہیم کی قوم ستارہ پرست تھی، انہوں نے بہت سمجھایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر انہیں اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور اعلان کر دیا: **إِنَّا بَرِئُوا مِنْكُمْ وَبِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ** (الممتحنہ: ۴) اور اس طرح بتا دیا کہ حق و حریت کی راہ میں قومیت کی آہنی زنجیریں پاؤں کو بوجھل نہیں کر سکتیں، اسلام ان پابندیوں سے آزاد اور ایک بالاتر حقیقت ہے۔ تمام قومیں اور ملتیں اس کے دائرہ میں داخل ہوتے ہی اپنے امتیازات و خصائص کو مٹا دیتیں ہیں اور صرف ان اکرامک عند اللہ اتفاق ہو ہی ان کے لئے باعث فخر و افتخار رہ جاتا ہے۔ پس اگر قومیت اور اسلام میں کبھی تصادم ہو تو ایک مسلم قانت کا فرض ہے کہ وہ فوراً اس کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر دے۔

(ب) جانی قربانی، جب قوم کی مخالفت حد سے بڑھ گئی تو سب نے مل کر انہیں آگ میں ڈال دیا۔ **قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ لَمُعِلِّينَ** (الانبیاء: ۶۸) کلمہ حق کی خاطر اس کائنات غلت نے آگ میں کود پڑنا گوارا کیا، اس لئے قدوس حق نواز کی طرف سے حکم ہوا **قُلْنَا إِنَّا نُؤْتِيكَ بِزَوْجٍ سَلَمَاءَ لَهَا إِبْرَاهِيمَ** (الانبیاء: ۶۹)

(ج) ترک وطن، باوجود ان تکالیف و شدائد کے انہوں نے دعوت الی اللہ کے اہم و اقدم فرض کو ترک نہیں کیا۔ آخر چار و ناچار انہیں وہ منزل اختیار کرنی پڑی جو ہر داعی حق کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے اور فرمایا: **إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيِّدِينَ** (الصافات: ۹۹) توحید کے لئے انہیں وطن چھوڑنا پڑا اور بتا دیا کہ وطنیت، اسلام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مسلمان ایک خاص جگہ کے رہنے والے نہیں، وہ شہداء علی الناس بنا کر بھیجے گئے ہیں، کہ دنیا بھر کی قوموں کی نگرانی کریں اور سب جگہ ان کی حکومت ہو، اس لئے تمام روئے زمین ان کا وطن ہے۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

(د) بیٹے کی قربانی، ایک شخص اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے، اس کے لئے قوم اور وطن کا قربان کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ مگر وہ ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کی عزیز ترین متاع حیات بیٹے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ یہی سب سے زیادہ کٹھن منزل ہوتی ہے، اس لئے سب سے آخر میں اس کو رکھا گیا: **فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يَتِيمٌ إِنِّي أَنَا فِي الْمَتَامِ أَتَىٰ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَأْمُرُ ۖ قَالَ يَا بَتِ اِفْعَلْ مَا تَأْمُرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّادِقِينَ** (۷) **فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ** (۸) **وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا بُرْهِيمُ ۖ قَدْ صَدَّقَتِ الرُّؤْيَا ۖ إِنَّا كَذَبْنَاكَ فَخَرِي** (۹) **الْمُحْسِنِينَ** (۱۰) (الصافات: ۱۰۵، ۱۰۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان چاروں امتحانات میں کامیاب ثابت ہوئے۔ دوسری جگہ آتا ہے: **وَابْرَاهِيمَ الَّذِي عَقِلَ**



(الجم ۷۳) دنیا کو معلوم ہو گیا کہ اس زمین کی پشت پر ابراہیم سے بڑھ کر اور کوئی مسلم نہیں اور وہ خود پکار اٹھے:  
 اَسَلْتُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۱﴾ (البقرة ۱۳۱) ایک اور جگہ کہا: اِنَّ صَلَاحَ وَنُصْحِي وَمَحْيَايَ وَمَمَلِكِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۲﴾ لَاشْرِيكَ  
 لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۳۳﴾ (الانعام ۱۳۳، ۱۳۲) دوسرے مقام پر یوں توحید کا اقرار کیا: اِنِّیْ بِرَبِّیْٓ اَمِنًا  
 تُشْرِكُ کُوْنُ ۚ اِنِّیْ وَجْهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۸﴾ (الانعام ۷۸، ۷۹)

جب ابراہیمی کمالات ظاہر ہو گئے تو فرمایا: ہم تم کو دنیا کا امام و پیشوا بناتے ہیں، اگر حکومت و فرمانروائی کے دروازہ میں  
 کسی قوم کو داخل ہونے کی خواہش ہو تو وہ تمہاری امامت و پیشوائی میں کام کرے، ایثار و فدویت اور فداکاری و سرفروشی اس  
 کے لئے الزم اللوازم ہے، گویا اس وجود مقدس نے دنیا کو بتا دیا کہ کامیابیوں کی بنیاد قربانی ہے، جو لوگ اس کے لئے تیار نہ  
 ہوں گے، وہ بھی زندہ نہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فوراً فرمایا کہ: لاینال عہدی الظالمین۔

یہ عہد صرف حضرت اسحق کے ساتھ مخصوص نہ تھا جیسا یہودیوں نے سمجھا، بلکہ حضرت اسمعیل بھی اس میں شریک تھے  
 تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) خدا نے درود غم کو سنا، ہاجرہ کے ۶۱:۲۱ کتاب پیدائش

سارہ کے، ۵۲:۲۱ کتاب پیدائش

(۲) خدا نے نام رکھا، ہاجرہ کے فرزند اسمعیل کا ۶۱:۲۱ کتاب پیدائش

سارہ کے فرزند اسحق کا ۷۱:۹۱ کتاب پیدائش

(۳) خدا نے برکت دی ہاجرہ کے فرزند اسمعیل کو ۷۱:۹۲ کتاب پیدائش

سارہ کے فرزند اسحق کو، ۵۲:۰۲ کتاب پیدائش

(۴) خدا ساتھ تھا، اسمعیل کے ۲:۰۲ کتاب پیدائش

اسحاق کے ۶۲:۴۲ کتاب پیدائش

(۵) قوموں اور پادشاہوں کا باپ ہو گا، اسمعیل ۵۲:۶۱ کتاب پیدائش

اسحق ۷۱:۶ کتاب پیدائش

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا تھا، اس میں  
 ان کے دونوں صاحبزادے اسمعیل و اسحق شریک تھے۔ دو آیتیں اور بھی پیش نظر رکھ لیجئے کہ مزید وضاحت ہو:

جو تیری صلب سے پیدا ہو گا وہ ہی تیرا وارث ہو گا اور وہ اس کو باہر لے گیا اور کہا کہ اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور  
 ستاروں کو گن، اگر تو انہیں گن سکے اور اسے کہا کہ تیری اولاد ایسے ہو گی (کتاب پیدائش ۵:۱۴) حضرت اسمعیل یقیناً



ابراہیم کی صلب سے تھے، آگے چل کر اسمعیل کا نام لیا: اور اسمعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھو میں اسے برکت دوں گا اور اسے بروہد کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔ (پیدائش ۱۲:۷۱)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ کلمات جن میں ابراہیم کا امتحان ہوا یہ ہیں:

(۱) موچھوں کا کم کرنا (۲) ڈاڑھی کا بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی ڈالنا (۵) ناخنوں کا کترنا (۶) ناک صاف کرنا (۷) بغل کے بال مونڈنا (۸) موئے زیر ناف مونڈنا (۹) پانی سے استنجا کرنا (۱۰) اور کلی کرنا۔ ان کا اعتماد اس روایت پر ہے جس کو ترمذی نے عائشہ سے نقل کیا ہے: ”عشر، من الفطرة، قص الشارب، واعفاء الدحية، والسواك، والاستنشاق، وقص الاظفار، وغسل البداجم، وتنف الابط، وحلق العانة، وانتقاض الباء، والمبضضة“۔ لیکن ہم نے جو معنی اختیار کئے ہیں وہی حضرت ابن عباس کی رائے ہے:

الكلمات التي ابتلى بها ابراهيم فراق قومه في الله حين امر الله بفقا رقتهم ومحا جته نهرو في الله حين قال احي واميت، ومبره على قذ فهم اياك في النار ليحرقوه في الله، والهجرة بعد ذلك من وطنه وبلادته حين امره بالخروج عنهم وما امره به من والصبر عليها، وما ابتلى به من ذبح ولده۔

مگر ترمذی کی روایت بھی ہمارے مخالف نہیں، اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرۃ اولیٰ تو محض نیکی ہی ہے، اس میں بدی کی مطلق آمیزش نہیں۔ مگر اس کی ثانوی تخلیق میں خیر و شر، دونوں کو ودیعت کیا گیا ہے، اگر ایک شخص کا قلب سلیم ہے اور خارجی اثرات ضلالت سے اس کے آئینہ کو گرد آلود نہیں کیا گیا تو وہ ضرور اپنے خالق کے آگے جھکے گا اور جو چیزیں اس کے تزکیہ نفس اور طہارت و پاکیزگی میں خلل انداز ہوگی، ان کو دور کرنے کی کوشش کریگا۔ اس طہارت کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان خصائل فطرت کا اپنے آپ کو عادی بنالیا جائے۔

اگر ایک شخص چالیس روز تک ان خصائل فطرت کو ترک کر دے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے ارادہ میں ضعف، اس کے عزم میں کمزوری اور اس کی طبیعت میں کدورت پیدا ہوگئی ہے، خیالات میں پرآگندگی اور افکار میں تشنت ہے۔ حضرت ابراہیم اس رواج کے بانی ہیں، قوم میں ایک خاص کریکٹر پیدا کرنا، ان کا مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے بدن میں کدورت پیدا کرنے والی ہوں، ان کو فوراً کاٹ دیا جائے تاکہ آہستہ آہستہ طبیعت اس درجہ پر آجائے کہ صحیح فرض معلوم ہونے پر انسان اپنی زندگی بھی قربان کر سکے۔

طہارت و پاکیزگی کے یہ اصول اساسی اس قدر آسان ہیں کہ عام انسانوں میں ان کی اشاعت نہایت سہولت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے ان کو عام کر دیا اور ہر شخص ان کا عادی بن گیا تاکہ مجددین ملت اور دعاۃ اسلام کی تعلیم کو لوگ قبول کرنے کو تیار ہوں اور ان کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں، وہ ایک حد تک دور ہو جائیں۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۚ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّٰی ۖ وَعَهْدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ

طَهْرًا يَتَّبِعِي لِبَلَّائِيَيْنِ وَالْعَافِيَيْنِ وَالْمُحْسِنِينَ الشُّجُودِ ﴿٩٦﴾

“اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے اجتماع اور پناہ کی جگہ بنایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم کی جگہ کو نماز کی جگہ مقرر کرو اور ابراہیم اور اسٹعلیل سے کہا کہ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔”

سرزمین عرب میں بیت اللہ کے سوا اور کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ یمن، حضر موت، خلیج فارس کے کناروں، شام کے جنگلوں اور حرہ و عراق عرب سے لوگ ہر سال یہاں جمع ہو کر فریضہ حج ادا کیا کرتے تھے۔ مورخین اس کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ یہودی اور عیسائی متفق ہیں کہ بیت المقدس کی بنیاد اسحق نے ڈالی اور سلیمان نے اس کی تکمیل کی۔ اس لئے کعبہ کی تعمیر یروشلم سے قریباً ۹۲۱ سال اور مسیح علیہ السلام سے ۱۹۲۱ سال پیشتر کی ہے۔

ہندوستان کی تہذیب کا اولین دور جو وید کا ابتدائی زمانہ ہے، مسیح سے تین ہزار چار سو سال پیشتر کا تھا، اس دور میں یہاں کوئی مندر نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ عبادت الہی کے لئے دنیا میں جو اولین گھر تعمیر ہوا، وہ بیت اللہ ہی تھا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾ (ال عمران ۹۶)

“مثلاً” مشتق ہے ثاب یثوب سے، جس کے معنی ہیں بار بار رجوع کرنے کے۔ گویا ابراہیم نے جو گھر بنایا ہے وہ زیارت گاہ خلائق ہو گا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے زخمی دل یہاں آکر شفا کا مرہم پائیں گے۔ مضطرب روحوں کو اس کی آغوش میں آرام نصیب ہو گا۔ گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم اس جگہ آکر اپنی گندگیوں اور ناپاکیوں کو دھوئیں گے۔ اسی روشنی کی طرف سب پروانے دوڑیں گے اور اسی آشیانہ کی جانب تمام پرندے اڑیں گے۔ اس فریضہ حج کو نہ تو کوئی دنیوی طاقت روک سکے گی اور نہ یہ گھر ہی برباد ہو گا۔

پھر یہی نہیں بلکہ وہ امن کا گھر ہو گا۔ اَمِنًا يُنْفِیْ اِلَيْهِ مَنُیْثِرٌ كُلُّ شَوْءٍ (القصص ۵) عرب کے لوگ باوجود اپنی وحشت و بربریت کے حرم کے اندر نہ تو کسی کا خون بہاتے تھے اور نہ کسی سے جنگ کرتے تھے۔ ایک عیسائی بادشاہ ابراہہ والی یمن نے اس پر حملہ کیا اور برباد ہو گیا ①۔ امن والا گھر اس لئے بنایا گیا کہ لوگ اس جگہ آئیں اور امن و اطمینان قلب کے ساتھ خدا کی یاد کر سکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ میدان میں جس جگہ کو عبادت گاہ مقرر کرتے، وہاں ایک لمبا بن گھڑا پتھر ستون کی طرح کھڑا کر دیتے تھے۔ جیسے اب بھی مسلمان کھلی جگہ میں نماز پڑھتے وقت اپنی چھڑی وغیرہ گاڑ لیا کرتے ہیں، جسے سترہ کہتے ہیں۔ مقام ابراہیم ایک مشہور جگہ ہے، جس کے دیکھنے سے خودی نشان یاد آجائے گا اور بار بار اس

① یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے سال ہوا۔ اس میں دراصل یہ بتانا تھا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن عیسائی ہوں گے۔ یہی خانہ کعبہ پر اپنے پیٹروا برہہ کی طرح حملہ آور ہوں گے اور آخر ان کا وہی انجام ہو گا جو ان کے ہم مذہب کا ہوا۔ چنانچہ موجودہ واقعات اس کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں، اس کا ایک ٹکڑا پورا ہو گیا دوسرے کا انتظار ہے وما ذلک علی اللہ بعزیز وکان وعدا مفعولاً۔

کی زیارت کرنے سے وہی جذبات پیدا ہوں گے جو کائنات خلقت اور اس کے فرزند جلیل میں تھے۔ اس لئے حکم ہوا کہ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ، تاکہ اس جگہ قدم رکھتے ہی تمام واقعات ذہاب الی اللہ یاد آجائیں۔ ہر شخص اسلام کی خاطر اپنی جان، اپنا مال، وطن، دیار اور شعوب و قبائل کو قربان کرنے کو تیار ہو۔ ان قربانیوں نے ابراہیم کو دنیا کا امام و پیشوا بنادیا۔ پس تم بھی ان چیزوں کی مشق کر کے امامت و پیشوائی کے لئے دعا کرو! واجعلنا للمتقین اماما۔

یہ گھر اس لئے بنایا گیا تھا کہ خدائے واحد کی غلامی کرنے والے یہاں آئیں اور اپنے محبوب حقیقی سے قرب و وصال کی فکر کریں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے تمام کام اسی خدائے یگانہ کے اختیار و ارادہ سے انجام پاتے ہیں۔ ہر قسم کی داد و ستد، سلب و عطا اور نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر قسم کا کمال اور حسن و خوبی اسی کی ذات اقدس میں موجود ہے۔ اور اس کے سوا اس عالم کا اور کوئی مربی و محسن نہیں، تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی اطاعت سے سر موخراف جائز نہ ہو گا۔ اور یہ لازم ہو گا کہ اس کی خدمت گزاری میں انسان مصروف رہے۔ اسی کا ہر دم دھیان رکھے۔ اسی کی محبت میں اپنے آپ کو دیوانہ بنائے۔ جسے تو اسی کی خاطر اور مرے تو اسی کا کلمہ پڑھتا رہے۔

پس اگر اس خدا کو محبوب حقیقی خیال کرتے ہو تو اس سے مواصالت اور اتحاد و یگانگی کی فکر میں ہر ایک ماسوائے اللہ سے بیزار ہو کر آب و طعام اور لذت جماع کو ترک کر دینا، اس کی تجلی گاہ کی جانب پاؤں نہ سر برہنہ لبیک کہنا، والہا نہ و مجنونانہ دوڑنا اور وہاں پہنچ کر کبھی شوق و وجد میں اس تجلی گاہ کے گرد گھومنا، کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا، کبھی دشمن محبوب کے خاص مکان پر سنگ باری کرنا، کبھی جان و مال سے فدا ہونے کو تیار رہنا اور کلمہ حق کی عظمت اور خدائے واحد کی محبت و پرستش کے لئے جمع ہونا، ہی طواف ہے۔ گویا اللہ کے خوف اور اس کی تلاش و جستجو نے ان لوگوں کے اندر ایک آتش کدہ محبت مشتعل کر دیا ہے اور اس کا دھواں، والہانہ صداؤں اور بے قرارانہ فریادوں کی صورت میں ان کی زبانوں سے اٹھ رہا ہے۔

جمال کعبہ مگر عذر ہر داں خواہد  
کہ جان خستہ دلاں سوخت دریا بانش!

دعائے رزق

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ لِهَذَا بَكَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَكَ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ  
وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۸۸﴾

”اور جب ابراہیم نے دعا مانگی کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے ان لوگوں کو روزی دے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں۔ اللہ نے فرمایا اور جو منکر ہو گا، اسکو بھی چند روز کے لئے فائدہ اٹھانے دوں گا، پھر مجبور کر کے دوزخ کے عذاب میں داخل کروں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

چونکہ یہ وادغیر ذی زہر تھی، اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے دو باتوں کے لئے دعا کی۔

(۱) اس کو امن والا گھر بنا اور یہ جنگل ہے، اس کو آباد کر کے شہر بنا۔

(۲) یہاں کے رہنے والوں کو رزق کو نوازش کر، چنانچہ جو لوگ مکہ مبارکہ جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اس کی سرزمین

پیداوار سے خالی ہے اور وہاں زراعت نہیں ہوتی۔ مگر باوجود اس کے بازاروں میں سبز و تر میوے اور ترکاریاں

نہایت ہی ارزان قیمت پر مل جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مقصد یہ تھا کہ اس جگہ صرف ایمان والے آباد ہوں اور انہیں کو رزق ملے، مگر اللہ تعالیٰ

نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کفار کو بھی اس سامان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے گا، آخر ایک وقت ایسا آئے گا کہ

ان کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور ایک کافر بھی دکھائی نہ دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآن حکیم نے کھلے الفاظ میں اعلان

کر دیا: ”انما المشا کون نجس فلا یقرہوا المسجد الحرام بعد عامہم ہذا“۔ مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے

لئے مخصوص ہیں، اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں،

بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔ مرض الموت میں شارع علیسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی، ان میں سے

ایک یہ تھی: ”آخر جو المشا کین من جزیرۃ العرب“، حضرت عمر کی روایت میں ہے: لاخر جن اليهود والنصارى من جزیرۃ

العرب حتی، لا ادم الامسلم امام احمد کی روایت میں ہے: اخر مات حکم بہ رسول اللہ ﷺ اخر جو یہود اهل الحجاز و اهل

نجران من جزیرۃ العرب، ابن شہاب زہری نے ان الفاظ میں روایت کیا: لا یحب تنعم دینان فی جزیرۃ العرب۔

چونکہ مسلمانوں کا مذہب عالمگیر تھا، اس لئے اس کی ارضی وسعت و انتشار کے لئے عبادت گاہ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ، اس

کی سرزمین حجاز اور اس کا ملک جزیرہ عرب دائمی مرکز قرار پایا۔ پس ضروری ہوا کہ اس تمام سرزمین کو غیروں کے عنصر

سے پاک و صاف کر دیا جائے اور صرف خدائے واحد کے ماننے والے اس جگہ کو آباد کر سکیں۔

دعائے خلیل

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا  
وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۗ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تَبَّ عَلَیْنَا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ الثَّوَابُ  
الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

”اور جب ابراہیم اور اسماعیل، خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور دعا مانگ رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری  
یہ خدمت قبول کر، بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے اور اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنا اور ہماری  
نسل میں ایک امت پیدا کر جو تیری حکم بردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمیں معاف کر، بیشک تو ہی  
بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔“

کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت ابراہیم اور اسمعیل نے کی پھر بنو جرہم، بنو عمالقہ، قصی، اور قریش نے اس کی تجدید کی۔ تجدید عمارت کی ضرورت مرور زمانہ کے اثر یا سیلاب کے صدموں کی بنا پر ہوتی تھی۔ پانچ ہزار سال تک کسی غیر قوم نے قبضہ کر کے اس کو نہیں گرایا اور یہ ایسا شرف ہے جو دنیا کے کسی عبادت خانہ کو حاصل نہیں ہوا۔ جس وقت یہ پیغمبر ان جلیل خانہ کعبہ کی اساس و بنیاد کو بلند کر رہے تھے تو ان کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات جاری تھے، خداوند! جس مقصد کے لئے ہم اس گھر کی تعمیر کر رہے ہیں اس کو ضرور پورا کی جیو، تو ہماری دعاؤں کو سنتا اور نیتوں کو جانتا ہے، شہرت و ناموری کی آرزو نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ اس کو توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔

ہماری اولاد میں ایک ایسی جماعت ہمیشہ رہے جو تیرے احکام کی پیروی اور اتباع کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنائے اور چونکہ وہ الگ تھلگ ہوگی، اگر اس کے پاس کوئی قانون نہ ہو تو راہ حق سے بھٹک جائے گی۔ اس لئے تو اس کو دائمی اور ابدی قانون نوازش کر۔ اور اگر قانون ملنے کے باوجود اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ان کے ساتھ لطف و نوازش سے پیش آ۔ یہ دعائیہ کلمات صاف بتا رہے ہیں کہ جس امت مسلمہ کی تخلیق کے لئے درخواست کی جا رہی ہے ضروری ہے کہ وہ ان کی اولاد میں سے ہو۔ اسحق علیہ السلام اور ان کی اولاد سے اس دعا کو کوئی تعلق نہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٦﴾

”اور اے ہمارے پروردگار! ان ہی میں سے ان میں ایک رسول بھیج کہ تیری آیتیں انہیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتوں کی تعلیم دے اور ان کی اصلاح کرے، بیشک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔“

ان میں ایک رسول بھیج جو حسب ذیل فرائض انجام دے۔

(الف) تلاوت آیات۔ تیری آیات کو پڑھ کر سنائے تاکہ لوگ ان کا مفہوم و مطلب سمجھ لیں اور جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں وہ ترجمہ کے ذریعہ واقفیت بہم پہنچائیں۔

(ب) تعلیم کتاب، تلاوت کے بعد جس قدر شکوک اور شبہات پیدا ہوں ان کو دور کرنا، کیونکہ جب تک اعتراضات کو دور نہ کیا جائے گا قانون کی جانب توجہ نہ ہوگی۔

(ج) تعلیم حکمت، بعض لوگوں نے حکمت سے نبی کی منہاج عمل اور سنت مراد لی ہے اور اس کی تائید میں مقداد کی روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ نے تین مرتبہ زور دیکر فرمایا: الا وانی اوتیت الكتاب ومثله، یعنی کتاب اللہ اور مثل اس کے سنت واسوۂ حسنہ رسول اللہ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معنی فی نفسہ ٹھیک ہیں مگر قرآن حکیم کی تصریحات اس سے بلند نظری کی طالب ہیں۔ یوسف علیہ السلام کی نسبت فرمایا: وَلَقَدْ بَدَّلْنَا أَشِدَّةً اِتِّينَهُ حُكْمًا وَعَلَّمْنَا (یوسف ۲۲) عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ کی نسبت کہا: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (ال عمران ۴۸) لوط علیہ السلام کے متعلق کہا: وَلَوْطًا اِتِّينَهُ حُكْمًا وَعَلَّمْنَا (الانبیاء ۷۴) قرآن کی نسبت کہا: یس والقمران الحکیم۔ سورۃ بقرہ میں حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا: وَمَنْ يَتَّقِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اتَّقَى خَيْرًا كَثِيرًا، تو یہ اور اسی قسم کی صدہا آیات بتاتی ہیں کہ حکمت سے مراد علم

اور داناتی کی باتیں ہیں جن تک صرف ارباب فہم و فراست ہی کی دسترس ہو سکتی ہے۔ گویا قرآن کی تعلیم کو ایسے اصول کلیہ پر حل کرنا کہ دنیا کے تمام مذاہب ان سے انکار نہ کر سکیں اور اس کی عالمگیر دعوت کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ ابن وہب کہتے ہیں: نقلت لہا لک ما لہ حکمة قال المعرفة بالدين والفقہ فیہ والاتباع لہ، میں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ حکمت کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ دین کی معرفت، اس میں درس و فہم اور اس کے اتباع کا نام حکمت ہے۔ بعض کے نزدیک مصالح شرعیہ اور احکام دین کا معلوم کرنا حکمت ہے۔ حق و باطل میں تمیز کرنا اور حقائق اشیاء کی معرفت بھی اسی قبیل سے ہیں۔

(د) تزکیہ نفس۔ انسان کی سعادت و نیک نجاتی کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے دکھائی نہ دیں۔ انسانی طبیعت منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے۔ محض تعلیم کی سماعت وہ اثر نہیں پیدا کر سکتی جو انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے، پس نبی اس نمونہ کو پیش کرتا ہے اور اپنی صحبت و ہم نشینی سے لوگوں کو پاک اور مڑکی بناتا ہے۔

تو عزیز ہے، اس دعا کو شرف اجابت بخش اور رسول پیدا کر۔ یہ ضرور نہیں کہ اسی وقت وہ رسول آجائے، نہیں بلکہ جب تیری حکمت اور مصلحت تقاضا کرے، لیکن ایک دفعہ ضرور ہو کر رہے۔ آپ نے فرمایا ہے: ”انادعوا ابی ابراہیم“۔ انجام کار یہ دعائیں قبول ہو کر رہیں، اس رسول نے آیات کی تلاوت بھی کی اور نہ صرف عرب کے لوگوں کو پاک بنایا، بلکہ وہ خود دوسروں کے پاک ہونے کا ذریعہ بنے جن کو آپ نے تعلیم دی۔ وہی دنیا کے رہبر اور معلم بن گئے اور قیصر و کسری کے خزانوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آ گئیں:

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے

کھیلنے جاتے تھے ایواں گہہ کسریٰ میں شکار!

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّا فِي الْآخِرَةِ لَنِبْلِ الصَّالِحِينَ ﴿۵﴾

”اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے اعراض کرے مگر وہی جو احمق ہو۔ اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی منتخب کیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوں کے زمرے میں ہوگا۔“

یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب، سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کرتے ہیں، اب ان کی تعلیم سے وہی شخص منحرف ہو گا جسے دنیا اور آخرت کی عزت مطلوب نہیں۔ کیونکہ ابراہیم کو ہم نے نہ صرف دنیا میں معزز و محترم کیا، بلکہ آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں کے گروہ میں ہوں گے۔ پس دنیا اور آخرت کی کامیابی صرف ان کے نقش قدم پر چلنے سے مل سکتی ہے۔ دوسرے مذاہب میں ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم ملے گی، مگر ابراہیم کا طریق ایسا ہے کہ وہ دین اور دنیا، سیاست اور مذہب سب کو حاوی اور جامع ہے اور یہی مذہب ہر قسم کی ترقی کا ذمہ دار و کفیل ہے۔

تحویل قبلہ سے پہلے اہل کتاب خاموش تھے، مگر اس کے بدلتے ہی شدید مخالفت شروع کر دی۔ قرآن نے ان وعدوں

کی طرف توجہ دلائی جو ابراہیم کے ساتھ کئے گئے تھے، پھر ان کی دعاؤں کا تذکرہ کیا اور بیک وقت ان تینوں فرقوں پر حجت قائم کر دی۔ اگر اب بھی یہ لوگ آپ کی رسالت تسلیم نہ کریں تو ان سے بڑھ کر اور کون احمق ہو گا؟

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۰﴾ وَوَعَىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يٰٓيُنَىٰ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَبْتُغُوا إِلَٰهًا وَانْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۱﴾

“جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ ہماری ہی فرمانبرداری کرو، تو اس نے عرض کیا کہ میں سارے جہان کے پروردگار کا حکم بردار ہوں۔ اور ابراہیم اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کر گئے اور یعقوب بھی کہ بیٹا! اللہ نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس تم مسلمان ہی مرنے۔“

وہ قانون جس کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کو دنیا و آخرت میں سرفراز کیا گیا یہی ہے کہ: إِنَّ صَلَاحَ وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمْلِكِ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۰﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۳۱﴾ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) اسی کی وصیت انہوں نے اپنی اولاد سے کی کہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلم قانت بن جاؤ اور یہی چیز ہے جس کی جانب رسول اللہ ﷺ دعوت دے رہے ہیں: قُلْ هَذِهِ سَبِيلُ اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعِيَ ۚ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰۸﴾ (یوسف ۱۰۸)

### ایک اور حجت

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۖ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۲﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۳﴾

“کیا تم اس وقت موجود تھے جس وقت یعقوب کو موت آئی۔ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے بڑوں یعنی ابراہیم اور اسمعیل اور اسحق کے معبود خدائے واحد کی غلامی کریں گے اور ہم اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو اپنے زمانہ میں ہو گزری ان کا کیا ان کو اور تمہارا کیا تم کو اور جو کچھ وہ کر گزرے ہیں تم سے اس کی متعلق کوئی باز پرس نہ ہوگی۔“

اسلام کی تعلیم تو وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، مگر یہودی کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے قریب وصیت فرمائی تھی کہ یہودیت کے پابند رہنا۔ یہی وصیت سینہ بسینہ ہم تک پہنچی ہے، اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا کہ ان کی وصیت تو یہی تھی کہ خدائے واحد کی غلامی کرنا اور ان کی اولاد نے بھی یہی اقرار کیا تھا۔ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ، ان کی وفات کے وقت کون شخص موجود تھا جس پر تمہاری روایت کی انتہا ہوتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ انہوں نے ایسا کیا تو تمہیں کیا؟ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، اپنے لئے تم خود راہ نجات تلاش کرو اور دیکھو کہ یہ تعلیم صحیح ہے یا نہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۖ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۴﴾



اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو سیدھے راست پر آ جاؤ، ان لوگوں سے کہہ دو یہ نہیں، بلکہ ہم ابراہیم کے طریق پر ہیں جو ایک طرف تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ تو ان کے پاس نقل صحیح ہے اور نہ مشاہدہ پیش کر سکتے ہیں، مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ ہدایت درہنمائی صرف یہودی یا نصرانی ہونے سے مل سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان میں سے کوئی راستہ بھی نیکی کی طرف نہیں لے جاتا، دونوں گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، ایک نے مسیح کا انکار کیا اور تفریط میں مبتلا ہوئے۔ دوسرے نے اس کے ماننے میں حد درجہ کا غلو کیا اور افراط کے مرتکب ہوئے، پس ہدایت نہ تو افراط میں ہے اور نہ تفریط میں، بلکہ اعتدال و توسط میں ہے۔

قُولُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اَنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اَنْزِلَ اِلَىٰ اٰبَائِهِمْ وَاِسْلَمِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَاَلْاَسْبَاطَ وَمَا اَوْفٰی مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَا اَوْفٰی النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ لَا تَقْرِیْ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ؕ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِیْمٰلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدْ اٰهْتَدَوْا ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ لَّآلِهٰهُمْ فِیْ شِقَاقٍ ؕ فَسَیَكْفِیْهُمْ اللّٰهُ ؕ وَهُوَ السَّیِّعُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۲﴾

”تم لوگ ان یہود و نصاریٰ سے کہہ دو، کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو اتر تم پر اور جو اتر ابراہیم اور اسمعیل اور اسحق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملا اس پر۔ ہم ان میں سے ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی ایک خدا کے فرماں بردار ہیں۔ جن چیزوں پر تم ایمان لائے ہو۔ اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ان ہی چیزوں پر ایمان لے آئیں تو راہ راست پر آ گئے اور اگر انحراف کریں تو وہ ضد پر ہیں، ان کے شر سے اللہ تمہارے لئے کافی ہو گا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

وہ لوگ تو ہر بات میں کوئی نہ کوئی حجت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ”نومن ببعض و نکفر ببعض“ کبھی کہتے ہیں ”نومن بما انزل الینا ویکفرون بما وراءہ“ مگر ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر نبی پر ایمان لاتا ہے، صداقت کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو، اس کو لبیک کہنے والا مسلمان ہی ہوتا ہے۔ اس کا مذہب عالمگیر اور ہر سچائی اس کے دامن میں جگہ پکڑنے والی۔ اسی حقیقت کی طرف حدیث نے اشارہ کیا: کلمۃ الحکمة ضالۃ المؤمن فحیث وجدہا فهو حق بہا حکمت و دانائی کی بات مسلمان کی گم شدہ متاع ہے، جہاں دیکھے اس پر قبضہ کرے کہ وہی اس کا وارث ہے۔ ”اگر اب بھی وہ اس تعلیم صحیح کے آگے گردنیں خم نہ کریں تو معلوم ہو گیا کہ ان کا اصلی مقصد، اسلام کی عداوت اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے آرزو مند اور ان کی قومیت متحدہ کے فنا کرنے کی فکر میں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کے شر و فساد سے تمہیں محفوظ رکھے گا اور ان کی دشمنی کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔“

صبغة اللہ

صِبْغَةَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ؕ وَنَحْنُ لَهُ عٰبِدُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اَتُحَاۡجِظُوْنَنِیْ بِاللّٰهِ وَهُوَ رَیُّنَا وَرَبُّکُمْ ؕ وَلَنَا

• یہ پیش گوئی تھی، چنانچہ دنیا کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ چند سال کے اندر نصاریٰ کی حکومت، مجوس کی سلطنت اور ارباب کفر و شیطنت کے بلا و اصرار کس طرح ایک ایک کر کے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے، اگر آج بھی مسلمان حقیقی معنی میں اس آیت پر ایمان لے آئیں تو پھر یہی وعدہ ان کے ساتھ بھی پورا ہو سکتا ہے۔ وکان وعدا مفعولا۔



أَعْمَلْنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ وَنَخْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿٦٠﴾

”ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ، کیا تم لوگ اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو، حالانکہ وہی تمہارا بھی اور ہمارا بھی پروردگار ہے اور ہم کو ہمارے اور تم کو تمہارے عمل، اور ہم خالص اسی کو مانتے ہیں۔“

اسلام نے اپنا عقیدہ پیش کرتے وقت کمال درجہ کی بے تعصبی اور فراخ دلی کا اظہار کیا، مگر یہودی اب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہبی رنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک ایک شخص یہودی یا نصرانی نہ بن جائے۔ رنگ دینے اور دین اختیار کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقتوں کا اقرار کرے۔ یہی اللہ کا رنگ اور دین ہے اور صرف اسی تعلیم پر کاربند ہو کر ہم میں یہ جذبہ صادق پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی انسان کے آگے ہماری گردن نہ جھکے اور تمام انسانوں سے باغی ہو کر ایک اللہ کی حکومت کو مان لیں۔ بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ”ای الدین احب الی اللہ“، آپ نے فرمایا: ”الحنيفية السبعة حاکم“ اور ابن عساکر نے سعد بن عبد اللہ بن مالک خزاعی سے آپ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ”احب الدین الی اللہ الحنیفیة السبعة“۔

(ب) دوسرا رنگ انسانوں کا خود تجویز کردہ ہے جس کو قبول کرنے کے بعد انسان تو حید سے نکل جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت شروع کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس تعلیم سے فطری جذبات کی تربیت ہوتی ہو وہی بہترین مذہب ہے۔ اور ہم اسی خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ یہ کس قدر جہالت کا سوال ہے کہ اللہ کا رنگ کس قسم ہو گا؟ تعلیم یافتہ کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس قسم کی باتیں کرے۔ ایسے لوگوں سے تو جس قدر بھی جلد انقطاع تعلقات کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

أَمَرُ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى ۖ قُلْ أَعْلِمْتُ أَنَّ اللَّهَ وَمَنْ أَعْلَمَ مِنْكُمْ شَهِادَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٦١﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾

”یاد رکھو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب، یہ سب یہودی یا نصرانی تھے، ان سے کہو کہ کیا تم بڑے جاننے والے ہو یا اللہ۔ اور اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی تھی۔ اور اس نے اس کو چھپایا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی اس کا کیا اس کو اور تمہارا کیا تم کو اور تم سے ان کے کاموں کی پوچھ نہ ہو گی۔“

ذرا انصاف سے بتاؤ تو سہی کہ ان لوگوں میں سے کون یہودی تھا۔ توراۃ کے ابتدائی اور اق کو دیکھو وہاں یہودیت کی

تاریخ موجود ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا: يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْ اٰیٰتِہِمْ وَمَا اُنْزِلَتْ الشُّرَاحُ وَالْاَنْجِلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِہٖۤ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵﴾ (ال عمران ۶۵)

”اے اہل کتاب! ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات و انجیل کا نزول ان کے بعد ہوا کچھ تو عقل سے کام لو۔“ ایک جگہ کہا: مَا كَانَ لِاٰیٰتِہِمْ یُھُوْدِیًّا وَلَا نَصْرَ اِیْنًا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۷﴾ (ال عمران ۶۷)

شہداء علی الناس

سَيَقُولُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلٰہُمْ عَنۢ قِبَلَتِہِمْ اَلَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْہَا قُلُوبُہِ السُّفٰہٰی وَالْمَغْرِبُ یُھْدٰی  
مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۸﴾

”یہ قوف اب بھی یہی کہیں گے کہ جس قبلہ پر مسلمان پہلے تھے اس سے کیوں پھر گئے کہہ دو کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہے جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔“

توراة کی شہادت پیش کی گئی۔ کتاب پیدائش کے واقعات بیان کئے گئے اور سب کو معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی کہ قبلہ عالم بن جائے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ملت ابراہیم کا پابند ہو گا اس کا قبلہ بیت اللہ ہی ہونا چاہئے، لیکن باوجود ان حقائق ثابتہ کے احمق یہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بیت المقدس کو چھوڑ کر بیت اللہ کی جانب کیوں پھر گئے۔ یہ اعتراض ان کی سفاهت و کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ تو مغرب و مشرق کی طرف یکساں ہے، مگر جس قدر مرکز اعلیٰ ترین ہو گا اس کے نتائج بھی نہایت ہی شان دار ہوں گے۔ اس لئے امت مسلمہ کو بہترین مرکز نوازش کیا گیا کہ وہی اس عزت و کرامت کی مستحق تھی اور ایک عالمگیر مذہب کے لئے یہی موزوں و مناسب تھا کہ توحید کا پہلا گھر آخری نبی کا قبلہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰہِدًا عَلٰی النَّاسِ وِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰہِدًا

”اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو اور تمہارے مقابلہ میں رسول تم پر گواہ ہو۔“

جس طرح تمہیں بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، ایسے ہی ہم نے تم کو امت عادلہ پیدا کیا ہے جس میں یکسر خیر و برکت ہی ہے، تاکہ تم تمام دنیا کے لئے راہ اعتدال و توسط میں نمونہ ہو۔ ہر قوم و ملت تمہاری نگرانی میں رہ کر صراط مستقیم حاصل کرے کہ طریق استقامت صرف تمہارے ہی پاس ہے اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس نمونہ ہو۔ وسط کے معنی عدول اور خیال کے آتے ہیں۔ چنانچہ زہیر کہتا ہے۔

ہم وسط یرضی الانام بحکمہم

اذنزلت احدی الیالی بمعظم۔

بعض کے نزدیک اس کے معنی درمیان کے ہیں یعنی غلو و تفصیر کے درمیان اسلام کی تعلیم ہے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو کیا اور یہودیوں نے تحریف و تبدیل سے کام کیا لیکن قرآن حکیم اس افراط و تفریط سے پاک راہ اعتدال اختیار کئے ہوئے ہے۔

پھر یہ نگرانی اسی جگہ دنیا ہی میں ختم نہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز بھی تمہیں بطور شہید اور گواہ کے کام دینا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب تمام قومیں میدان محشر میں موجود ہوں گی اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے سوال کرے گا کہ کیا تم نے تبلیغ حق و صداقت کا فرض ادا کر دیا؟ سب اثبات میں جواب دیں گے، مگر ان کی امتیں انکار کریں گی، اس پر امت مسلمہ شہادت دے گی کہ بیشک ان پیغمبران جلیل نے اپنا فرض ادا کیا<sup>۱</sup>۔

بیت المقدس عارضی قبلہ کیوں بنا؟

وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب على عقبيه وان كانت لكبيرة الا على الذين هدى الله،

اور جس قبلہ پر تم پہلے تھے اس کو قبلہ ہم نے اس لئے بنایا تھا کہ معلوم کر لیں کہ رسول کی پیروی کون کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا اور قبلہ کا بدلا جانا سب کے لئے تکلیف دہ تھا مگر ان لوگوں کے لئے آسان ہو گیا جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ جس مسئلہ کے متعلق کوئی حکم موجود نہ ہو تا اس میں اہل کتاب کے اتباع کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ نماز تو آغاز نبوت ہی میں فرض ہو چکی تھی، مگر قبلہ کے متعلق کوئی صاف حکم موجود نہ تھا۔ اس لئے آپ مکہ

۱) .... اس آیت میں دو چیزوں کو بیان کیا:

(الف) مسلمان دنیا کے امام و پیشوا ہیں اور ان کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ ہوگی، ہر نیکی کے قائم کرنے والے اور ہر برائی کے دور کرنے والے یہی ہوں گے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْعُرْوَةِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران)

(ب) قیامت کے روز ان لوگوں کو بطور گواہ کے پیش کیا جائے گا۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ ہر نبی نے اپنا فرض ادا کیا۔ ان دو چیزوں کو پیش نظر رکھ کر ہر مسلم کا مقصد حیات خود بخود معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس کی نشر و اشاعت میں سربکف کوشش کرے۔ دنیا کا ایک ایک کو نہ چھان مارے اور کوئی امت ایسی نہ رہ جائے جس میں اس نے اسلام کی تبلیغ نہ کی ہو۔ اگر ایسا نہ کرے تو قیامت کے روز شہادت دینے کے قابل نہ ہوگا اور یہی رسول علیکم السلام شہید اسے محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شہادت اسی صورت میں میسر ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس فرض کو ادا کرے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ حالت زبان حال سے بیکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ عوام تو ایک طرف تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں۔ آہ! وہ کتاب جو دنیا کی ہدایت و راہنمائی اور عالمگیر امن و سلامتی کے لئے آئی تھی اس کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کی جا رہی ہے۔

۱۔ اے فرزند ان اسلام! وائے عزیزان ملت! ایسا نہ ہو کہ آج تم اس فرض اہم و اقدم سے اجتناب کرو اور کل جبکہ تمام اقوام عالم ایک میدان میں جمع ہوں گی، سب کے سامنے تمہیں ذلیل و سوا ہونا پڑے اور خود رسول بھی تمہاری نسبت یہ شکایت کرے: يَا رَبِّ اِنِّي قَتَوْتُ اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (الفرقان ۳۰) پس ابھی وقت ہے خواب غفلت سے بیدار ہو اور کتاب عزیز کو ہاتھ میں لے کر اپنے فرض کو ادا کر۔ نہیں معلوم کل کیا ہونے والا ہے، اور یوم تبیض وجود و تسود وجود کو کس کا چہرہ سفید ہوگا اور کس کا سیاہ۔ وشر النداة يوم القيامة۔

مبارک کہ میں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھتے رہے اور بیت اللہ کی جانب بھی پشت نہ ہوتی تھی، اس لئے اگر بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اقامت مکہ کے دوران میں آپ نے بیت اللہ کی جانب نماز ادا کی ہے تو ایک لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔

جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس ہی قبلہ رہا، مگر ہجرت کے دوسرے سال ۷ ماہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے قبلہ بدل دیا اور اول بیت وضع للناس کو مسلمانوں کا قبلہ گاہ بنادیا، جسے مکعب شکل ہونے کی وجہ سے کعبہ، صرف عبادت الہی کے لئے بنائے جانے کے سبب بیت اللہ اور عظمت و حرمت کی بنا پر مسجد الحرام کہا جاتا تھا۔ بیت المقدس کو عارضی قبلہ بنانے کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(الف) جب تک آپ مکہ مبارک میں رہے بیت المقدس قبلہ رہا کیونکہ مشرکین مکہ بیت المقدس کے احترام کے قائل نہ تھے اور کعبہ کو تو انہوں نے خود ہی اپنا بڑا معبد بنا رکھا تھا، اس لئے شرک چھوڑ دینے اور اسلام قبول کرنے کی بین علامت مکہ میں یہ رہی کہ مسلمان ہونے والا بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے۔

(ب) مدینہ میں زیادہ تو یہودی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے نزدیک بیت اللہ کی کوئی عزت نہ تھی۔ وہ صرف بیت المقدس ہی کو انوار تجلیات الہیہ کا مہبط یقین کرتے تھے، اس لئے مدینہ میں اسلام قبول کرنے کی نشانی یہ قرار پائی کہ بیت اللہ کی جانب نماز پڑھیں۔

(ج) دنیا معلوم کر لے کہ عرب نے رسول اللہ ﷺ کا اتباع اس لئے نہیں کیا کہ آپ ان کے آبائی قبلہ کو اپنا سجدہ گاہ بنا رہے ہیں، بلکہ وہ آپ کی دعوت کو حق و صدق پر مبنی خیال کرتے ہیں اور اس لئے جس طرح آپ کا ارشاد ہوتا ہے فوراً اپنے آپ کو پھیر لیتے ہیں، اگرچہ ایک قوم کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آبائی قبلہ کو ترک کر دے، مگر چونکہ حق ان پر واضح ہو چکا تھا اس لئے وہ ہر ایک بات کے لئے تیار ہو گئے۔

(د) جس قدر منافقین ہیں اور اپنے ایمان کو چھپائے پھرتے ہیں الگ ہو جائیں تاکہ آئندہ صرف راسخ الایمان ہی میدان عمل میں نکلیں۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ عَمَّا يُنَاصِرُكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ ﴿۳۱﴾

”اور اللہ ایسا نہیں کہ تم مسلمانوں کے ایمان کو ضائع ہونے دے، خدا تو لوگوں پر شفقت رکھنے والا مہربان ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو تمام جہات سے یکساں تعلق اور نسبت ہے۔ اس کی تجلیات زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہیں اور عالم تکوین کے اطراف و جوارب اس کے نزدیک ایک ہی درجہ رکھتے ہیں نوللہ المشرق والمغرب فالینما تولوا فثم وجہ اللہ اور اللہ نود السبوت والارض کا یہی مطلب ہے، لیکن جب کسی جگہ میں اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ ایک مدت تک اس کی یاد میں مصروف رہتا ہے، اس کے پاک نام پر قربانی کرتا ہے اور اس کے شوق وصال میں ریاضتیں اور مجاہدے کرتا ہے تو اس جگہ دوسرے مقامات کی نسبت انوار الہیہ زیادہ نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر مدت ہائے دراز تک وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بزرگ موجود رہے اور برابر خدا کو یاد کرتا رہے تو پھر اس مقام کو ایک قسم کی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوسرے مقامات اس سے محروم

رہتے ہیں۔ گرد و پیش کے لوگ خود بخود اس جگہ کی طرف کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اس کی عزت و توقیر ان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور باقی مقامات کے مقابلہ میں اس کے احترام کو لازمہ قومیت خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔

جب لوگ اس کے لئے یکسر طلب بن جائیں تو علماء اعلیٰ کی دعائیں ان کی امداد و اعانت میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اس جگہ کو ان کا قبلہ بنا دیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر ہر نبی نے اس گھر کا طواف کیا اور برابر حج کرتے رہے۔ اہل عرب نے اس کی عظمت شروع کر دی۔ زمانہ جاہلیت میں باوجود وحشت و بربریت کے اس کی عزت کرتے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی داعی ہوئیں کہ اسے قبلہ بنا دیا جائے اور دینا تقبل منا انک انت السميع العليم کو شرف اجابت نصیب ہو۔

قبلہ بننے کے لئے ہزار ہا سال کی سعی و کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ ابراہیمی تعلیم کا اثر تھا کہ عرب ابابعد بیت اللہ کو اپنا قبلہ مانتے رہے اور اس کے مجاورین کو اشرف ترین عرب شمار کرتے رہے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ہزار ہا سال کی محنت و جانکاهی اور ابراہیم و اسماعیل کی دعاؤں کو ضائع کر دیتا۔ جدید قبلہ بنانے کے لئے اتنی ہی کوشش دوبارہ کرنی پڑتی اور اس لئے مزید دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ کوئی عقلمند یہ تجویز نہیں کر سکتا کہ اس پرانی کوشش کو برباد کر کے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے حکم کو داعی قرار دے۔

چونکہ بیت المقدس عارضی قبلہ تھا اور یہ اولین فرزند ان اسلام کے ایمان و اسلام کی آزمائش تھی، اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال کا پید ا ہونا ایک قدرتی امر تھا، کہ ایام امتحان کی نمازوں کا کیا حشر ہو گا۔ خصوصاً صحابہ کرام کی زیادہ فکر تھی جو اسی زمانہ میں فوت ہو چکے تھے۔ اس آیت نے یہ شبہ دور کر دیا کہ ان لوگوں کا اجر ثواب کبھی ضائع نہیں ہو گا۔ ابن عباس نے ایمان کم کے معنی صلاتکم الی بیت المقدس کئے ہیں۔

تحویل قبلہ

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَتَّبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذًا لَئِنِ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۵﴾

”تمہارا منہ پھر پھر کر آسمان کی جانب دیکھنا ہم ملاحظہ کر رہے ہیں پس ہم اس قبلہ کی طرف تجھے پھیر دیں گے جس کو تو چاہتا ہے، تو اب مسجد حرام کی طرف اپنا منہ پھیر اور جس جگہ تم ہوا کرو اسی کی طرف منہ پھرو اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ان کے رب کے حکم سے ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں اور اگر تم کتاب والوں کے پاس تمام دلائل لے آؤ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں اور نہ تم ہی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہو اور نہ ان میں کا کوئی فریق بھی دوسرے فریق کے قبلہ کی پیروی کرنے

والا ہے اور تمہیں جو علم نوازش کیا گیا ہے اگر اس کے بعد تم ان لوگوں کی خواہشوں پر چلے تو بے شک تم بھی بے انصافوں میں سے ہو جاؤ گے۔“

رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ ایک قوم کی ہزار ہا سال کی سعی و کوشش یوں رائیگاں نہ جائے گی اور عرب کو جو بیت المقدس کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے صرف ان کے امتحان کی خاطر ہے، جب آزمائش میں پورے اترے تو اب قدرتی طور پر آپ اس امر کے لئے یکسر انتظار بن گئے کہ کس وقت تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے، چنانچہ اسی حالت میں ان آیات کا نزول ہوا اور بیت اللہ کو ہمیشہ کے لئے دنیائے اسلام کا مرکز و حید بنا دیا گیا، آپ کا ارشاد مبارک ”انا دعوة ابراہیم“ بتاتا ہے کہ آپ ہی ابراہیمی دعاؤں کے حقیقی مصداق ہیں اور دونوں باپ بیٹوں کی یہی دعا تھی کہ ”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“۔ اہل کتاب کے نزدیک اس جگہ کا قبلہ قرار پانا اور آپ کا نبی ہونا اعلیٰ بدیہیات میں سے تھا، مگر وہ لوگ آپ کی نبوت کو صرف عرب تک محدود خیال کرتے تھے اور اس لئے خاموشی سے آپ کے دعاوی کو سن لیتے تھے، لیکن جس وقت قبلہ بدلا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو ہم پر حملہ کیا جا رہا ہے اور اب نبوت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمعیل میں چلی جا رہی ہے، اس لئے فوراً اسخ و منسوخ کی بحث چھیڑ دی۔

اہل کتاب کے بغض و حسد کی یہ حالت ہے کہ اگر آپ ان کے سامنے تمام دلائل پیش کر دیں پھر بھی وہ بیت اللہ کو قبلہ نہ مانیں گے اور چونکہ آپ کو بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اس ادنیٰ ترین قبلہ کی طرف متوجہ ہوں، خود اہل کتاب کو دیکھو، ایک ہی توراۃ پر سب کا ایمان ہے، لیکن قبلہ میں سب مختلف ہیں، ایک دوسرے کا اتباع نہیں کرتے۔ سامریوں کا قبلہ اور ہے یہودیوں کا دوسرا اور عیسائیوں کا رخ مشرق کی جانب ہوتا ہے، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ آج چہل کروڑ نفوس اسی بیت اللہ الجلیل کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا أَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾  
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٨٧﴾

”جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ (حقیقت استقبال کعبہ) کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اور ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ حق بات کو چھپاتا ہے، حق وہی ہے جو تمہارے رب کا حکم ہے پس شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔“

کوئی شخص اپنے بیٹوں کے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا، پس جس طرح یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے، ایسے ہی اہل کتاب کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے، مگر بددیانتی کی وجہ سے اس کو مخفی رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: کسانیکہ داوہ ایم ایشاں را کتاب، می شنوے را یعنی حقیقت استقبال کعبہ را چنانکہ می شناسند فرزندان خویش را۔

مسلمانوں کا دائمی قبلہ یہی ہونا چاہئے اس لئے دل میں کبھی کوئی شک نہ پیدا ہونے پائے۔

## مرکز قائم کرنا ہے

اب تک بنی اسرائیل کو الزامی و تحقیقی جواب دیا گیا اور تحویل قبلہ کی بعض مصلحتوں پر روشنی ڈالی گئی۔ اب بیان کیا جاتا ہے کہ تمام امت مسلمہ کے لئے ایک ہی قبلہ مقرر کرنے سے اصلی مقصد کیا ہے اور کونسی غرض و غایت پیش نظر ہے:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَنِينًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

”اور ہر جماعت کو ایک ہی طرف منہ کرنا ہے سو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو جس جگہ بھی تم ہو گے اللہ تم کو جمع کر دے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس جگہ سے تم نکلو تو مسجد حرام ہی کی طرف منہ کرو اور یہی حقیقت میں تیرے رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔“

بیت اللہ کا قبلہ بنانا اس لئے ہے کہ ایک عالمگیر اخوت قائم کر کے اس کے لئے تمام عالم میں ایک مرکز بنادے کہ وحدت مقصد کے ساتھ وحدت مرکز ہونا ضروری ہے۔ پس مسلمانوں کی ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ جس طرف بھی جائے اور جدھر کا سفر کرے، نماز پڑھتے وقت اسی بیت اللہ کی جانب رخ کرے۔ جب مرکز ایک ہی ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس امر کی سعی و کوشش کرے کہ خیر و صلاح، نیکی و پاکدامنی، طہارت و پاکیزگی اور ایثار و فدویت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور سابق القدم رہے۔ سبقت کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں میں پیش پیش رہنے کی کوشش کریں اور دوسری شکل یہ ہے کہ جس مرکز پر امت مسلمہ کے تمام فرزندان جلیل جمع ہوں، ان کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ہر ایک سے آگے رہنے کا جنون دامن گیر ہو اور حقیقت میں اعلیٰ ترین عزت و کرامت کا وہی مستحق ہو گا جو اس میدان مسابقت میں سب کا امام و پیشوا بن جائے۔ مرکز کی وحدت ہم میں اس قدر جوش و ولولہ، عزم و استقلال، صبر و استقامت، علو ہمتی اور بلند پروازی پیدا کر دے گی، کہ ایک ایک مسلمان تمام دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائے گا اور وہ یقین کر لے گا کہ صرف وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب اعمال و اخلاق میں ہم بہترین بن جائیں گے، پھر کسی کو ہم سے یارائے دم زدن نہ ہو گا۔ وَاِنِّي لَفِي تَنَافُسٍ مِّنَ الْمُتَنَافِسِينَ۔

سورۃ تغابن میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے: يَوْمَ يَجْعَلُكُمُ لِلْجَنَّةِ ذٰلِكَ يَوْمَ التَّغَابُنِ (التغابن ۹) تمہیں اقوام عالم سے مقابلہ کرنا ہے، میدان محشر میں ان سے مقابلہ کرتے وقت اگر ان سب سے آگے بڑھ گئے تو کامیاب رہے ورنہ اصلی ناکامی وہی ہوگی۔ گویا ایک فرزند اسلام دنیا میں بھی ہر ایک سے آگے رہنے کی کوشش کرے کہ: الدنیا مزدرة الاخرة، اس لئے قرآن نے تعلیم دی کہ: ”واجعلنا للمتقين اماما“ کی دعا کیا کرو۔ پھر سورۃ غاشیہ میں فرمایا: والی السباء کیف دفعت گویا ایک مسلمان کا مقصد آسمان کی طرح بلند و برتر ہونا چاہئے۔

مرکز قائم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ جب ہر ایک مسلم کو حج بیت اللہ کے لئے جانا ضروری ہے اور وہاں دنیا کے بہترین



مسلمان جمع ہوں گے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے اندر اس قدر طہارت و پاکیزگی پیدا کر لیں کہ ان کے سامنے ذلیل و رسوا نہ ہوں، اگر ایک مرکز نہ ہوتا تو اس قدر جوش و ولولہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا، رہا اس جگہ پر دنیا کے ہر گوشہ سے مسلمانوں کا جمع کرنا، سو یہ اللہ کے قبضہ میں ہے۔ وہ ضرور سب کو یہاں لا کر چھوڑے گا۔ تمہارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ جہاں کہیں سے تم نکلو تمہارا رخ اسی جانب ہو اور باقی تمام مسلمان بھی اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، اگر تم اس مرکز کا احترام کرو گے تو ضرور دنیا و آخرت میں سرفراز ہو گے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۚ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلَئِمَّتْ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٥﴾

”اور جہاں سے تو نکلے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو اور جہاں کہیں تم ہو کرو تو اسی کی طرف اپنا منہ کرو تاکہ لوگوں کو جھگڑنے کی جگہ نہ رہے مگر ان میں سے وہ جو بے انصاف ہیں سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس لئے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید تم راہ پاؤ۔“

اس آیت میں مزید تاکید کے طور پر رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ وہ ہمیشہ اسی کو اپنا قبلہ بنائیں، ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسلمان کو قبلہ بدلنے اور رسول کے طرز عمل سے استدلال کرنے کا خیال نہ پیدا ہو، بلکہ اب اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی، ورنہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ مسلمانوں کا کوئی اصول بھی قابل اعتماد نہیں، رہے ظالم و بدکار سو وہ اپنی کٹ جتنی سے کبھی باز نہ آئیں گے۔ عیسائی اب تک یہی کہتے ہیں کہ عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر بیت اللہ قبلہ بنایا گیا حالانکہ ابراہیمی عہد انہیں خوب یاد ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس شخص نے صد ہا سال کی بت پرستی کو فنا کر دیا، جو اس قوم کے نزدیک بے انتہا عزیز و محبوب اور لازمہ قومیت تھی، وہ اپنی قوم کو خوش کرنے کے لئے ایسا کس طرح کر سکتا ہے۔

پس آئندہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہو گیا کہ بیت اللہ ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کا مرکز رہے گا، جب یہ لوگ دوسری اقوام میں تبلیغ و دعوت کے لئے جائیں تو ان کی خاطر اپنے قبلہ اور دوسرے اصول اساسی کو ترک نہ کر دیں، تم لوگوں کو اعلیٰ ترین مرکز دیا گیا، اس لئے اس کے حقوق ادا کرنے میں میرے سوا اور کسی انسان کا خوف تمہارے دل میں نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم پر اتمام نعمت کروں گا، خلافت ارضی نوازش ہوگی اور چونکہ یہ تعلیم عین فطرت انسانی کے مطابق ہے، اس لئے بہت جلد ترقی کر جاؤ گے۔ دوسری قوموں کو اگر اخلاق حسنہ و اعمال صالحہ کے کسب و حصول میں صد ہا سال صرف کرنے پڑے ہیں تو تم اس تعلیم کی بدولت چند سال میں ان نیکیوں کے مالک بن جاؤ گے اور دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں تمہیں مل جائیں گی۔



## قبلہ ایک ہی ہو گا

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْنَكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

”جیسا ہم نے تم میں ہی سے ایک رسول بھیجا، جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتا ہے اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب سکھاتا ہے اور عقل کی باتیں اور تم کو ایسی باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔“

کسی کو یہ خیال نہ آنے پائے کہ اہل کتاب کے ساتھ مصالحت کرنے کی خاطر ان کے قبلہ کو بھی دوسرے درجہ پر ہی تسلیم کر لیا جائے۔ اس لئے کہ جب تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی رسول بھیجا گیا ہے، اس کی بعثت میں کسی قوم کی تخصیص نہیں بلکہ اس کا روئے سخن عام اور سب کی طرف ہے اس لئے قبلہ بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزول سے قبل عرب خانہ جنگی اور خون ریزی میں مبتلا تھے، نظام صالح اور قومیت متحدہ سے بہت دور جا پڑے تھے۔ اب ان کو ایسی تعلیم دی گئی جس نے ان شتر بانوں کو جہانباں بنادیا اور رسول امی کی گود میں تاجداران عالم نے پرورش پائی۔

چند لطیف نکتے

اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ جو مسجد آخر میں قبلہ قرار پائے گی وہ درجہ میں بھی پہلی مسجد سے برتر ہوگی۔ دیکھئے ان آیات میں مکہ کی تعریف کی گئی ہے۔

(۱) سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی، اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفا کی سائڈ نیاں آکے تیرے گرد بے شمار ہوں گی، وہ سب جو سب کے ہیں آئیں گے وہ سونا اور لباس لائیں گے اور خداوند کی تعریفوں کی بشارتیں سنائیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ مینط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔ (یسعیاہ ۶۰:۵-۶)

مدیان، عیفا، سبا، قیدار اور مینط پانچوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے ہیں، جو عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے، ان کی نسل کے قبائل رسول اللہ ﷺ کے دین میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی ان سب نے مل کر صرف ایک مذبح منی پر اپنی قربانیاں پیش کی تھیں۔ قوموں کے نام، منی، کاپہ، عرب کا قاطبہ مسلمان ہونا، حجة الوداع میں سب کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا یہ تمام تاریخی واقعات بتا رہے ہیں کہ شوکت کا گھر دراصل بیت الحرام ہے۔

(۲) حجی نبی کی کتاب میں ہے:

”اس پچھلے گھر کا جلال پہلے گھر کے جلال سے زیادہ ہو گا۔ رب الافواج فرماتا ہے: اور میں اس مکان میں سلامتی بخشوں

گا، رب الافواج فرماتا ہے۔“ (جی، ۹:۲)  
مسلمان ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں:

اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت يا ذا الجلال والاكرام۔

(۳) مکاشفات یوحنا میں ہے:

”جو غالب آئے میں اسے اپنے خدا کے مقدس میں ایک ستون بناؤں گا۔ وہ پھر کبھی باہر نہ نکلے گا اور میں اپنے خدا کا نام اور اپنے خدا کے شہر یعنی اس نئے یروشلیم کا نام جو میرے خدا کے پاس سے آسمان سے اترنے والا ہے اور اپنا نیا نام اس پر لکھوں گا، جس کے کان ہوں وہ سنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتا ہے۔“ (مکاشفات یوحنا ۲۱:۳ و ۳۱)

عارف یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں دو باتوں کا ذکر کیا ہے (۱) نیابروشلیم، (۲) نیا نام،

نئے یروشلیم سے مراد کعبہ ہے۔ آسمان سے اترنے کے یہ معنی ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے آسمان سے حکم نازل ہو گا قرآن میں ہے: قَدْ نَزَّلَ نَفْثًا فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُؤَيِّنَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا (البقرة ۱۴۴)

صلح حدیبیہ کے وقت عہد نامہ میں اسم رحمن لکھا گیا تو ہسیل سفیر کفار نے کہا واما الرحمن فوالله ما لغرفه (خدا کی قسم ہم نہیں جانتے رحمن کون ہے) قرآن میں ایک جگہ آیا وَهُمْ يَدْعُ الرِّحْمٰنَ هُمْ كُفْرًا ۚ (الانبیاء ۳۶) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرِّحْلٰنِ قَالُوا وَمَا الرِّحْلٰنُ (الفرقان ۶۰) یہی وہ نیا نام تھا جس سے اہل عرب باوجود اہل زبان ہونے کے واقف تھے۔ قرآن نے اگر انہیں روشناس کرایا۔

(۴) زبور میں داؤد علیہ السلام کی مدح و ستائش کرتے ہیں:

”مبارک وہ ہیں جو تیرے گھر میں بستے ہیں، وہ سدا تیری ستائش کریں گے (سلاہ) مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہے، ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وہ بکا کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کو آن بناتے۔ پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی۔ (زبور: ۴۸: ۴، ۵، ۶)

ان آیات سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(الف) یہ خدا کا ایک گھر ہے، وہاں کے باشندے مبارک ہیں اور وہ ہمیشہ خدا کی تقدیس اور بزرگی بیان کرتے رہیں گے۔

(ب) ان لوگوں کی قوت و شوکت کا سبب خود اللہ تعالیٰ ہو گا۔

(ج) بکا ایک ایسا نام ہے جو معرفہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔

(د) وادی بکا میں سے گزرتے وقت ایک کنواں بنائیں گے۔

اب ان کا مصداق ملاحظہ ہو۔

(۱) بسنے والوں سے مراد حضرت اسمعیل کی اولاد ہے۔ حضرت ابراہیم دعا کرتے ہیں رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذٰلِکَ عِنْدَ بَیْتِکَ (ابراہیم ۳) خداوند! میں نے اپنی اولاد کو اس وادی میں تیرے عزت والے گھر کے پاس آباد کیا ہے جس میں زراعت نہیں ہوتی۔

(۲) جس وادی کا نام بکا زبور میں ہے اس کی نسبت قرآن یوں کہتا ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ (ال عمران ۹۶) پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکا میں ہے۔

(۳) کنوئیں کے متعلق بخاری میں ہے، فلما بلغت الوادی سعت جس وقت ہاجرہ اس وادی میں پہنچیں تو پانی کے لئے دوڑیں پھر فرمایا وَغَضَّ عَقْبِیْہِ عَلٰی الْاَرْضِ قَالَ فَانْشِقْ الْمَاءُ فَدْهَشْتُ اَمَّا اسْمٰعِیْلُ فَجَعَلَتْ یَحْضُرُ رِشْتَہٗ لَہٗ اِیْذٰی زَمِیْنٍ پرماری پانی ابل پڑا اسمعیل کی ماں حیران رہ گئی اور سے کھود کر کنواں بنانے لگی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے جدا علی ہیں۔ ان شان دار قوموں کے پدر بزرگوار کی مسجد کو قبلہ قرار دینا گویا تینوں قوموں کو اتحاد نسبی و جسمانی کی یاد دلا کر اتحاد روحانی کے لئے دعوت دینا اور متحد بن جانے کا پیغام سنا دینا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان، خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے اس کی پرستش کرتے ہیں اور یہ پرانی بت پرستی اب تک ان میں قائم ہے۔

عبادت کرنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے اولاً جس چیز کی پرستش کی جائے اس کی عظمت سے دل بھر پور ہو، اس کے جلال و کبریائی سے جسم انسانی پر روٹ گئے کھڑے ہوتے ہوں، اور یکسر توجہ بن کر اس کے حضور میں کھڑا ہو۔ ثانیاً اس کی حمد و ستائش کے گیت زبان سے گائے جائیں اور تیسرے یہ کہ اپنی آرزو بر آنے کی اس سے درخواست ہو۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی توجہ الی قبلہ سے نہیں ثابت ہوتی، بلکہ نماز کے تمام اجزا میں خدائے قدوس کی طرف توجہ ہوتی ہے اس کی پاکی بیان کی جاتی ہے، اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہوتا ہے۔ مسلمان تو ایک طرف خود مشرکین بھی اس گھر کو نہیں پوجتے تھے بلکہ وہ ان بتوں کی پرستش کرتے جو اس کے اندر رکھے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان بتوں کو پاش پاش کر کے ایک اللہ کی عبادت کے لئے اس کو خاص کر دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بھی بت پرستی کی بقایا میں سے ہے۔ اس اعتراض کا جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے سن لینا چاہئے: انک حجرا لافضل ولا تنفع تو ایک پتھر ہے کسی کے نفع و نقصان سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ پتھر صرف اس لئے ہے کہ طواف کی ابتداء اور انتہاء معلوم کرنے کا کام دے۔ ہمیں زبور میں اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں: ”وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کوئے کا سر اہو گیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے۔“ (زبور ۸۱: ۲۲، ۳۲) دانیال میں ہے: ”جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ

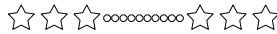
سے آپ نکلا۔ (دانیال ۵۴:۲) انجیل میں انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل میں یوں فرمایا: انہوں نے اس سے کہا ان بڑے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکیدار باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔ وہی کونے کے سر کا پتھر ہو گیا۔

یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔

اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی پادشاہت تم سے لے لی جائے گی۔ اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ (متی ۱۲:۱۲ تا ۱۴)

پس حجر اسود وہی نشان ہے جس کا ذکر کتاب مقدس کی ان آیات میں آیا ہے۔ قبلہ کی بحث نے دراصل اس بات کو واضح کر دیا کہ ابراہیمی دعائیاتی کے لئے تھی۔ یہودیوں نے اپنے قوائے علیہ کو بیکار کر دیا۔ دعوت و تبلیغ کے فرض کو چھوڑ بیٹھے، کتاب الہی میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس لئے اب خود بخود زمین و آسمان سے ندا بلند ہونے لگی کہ دعوت ابراہیم کا مصداق ظاہر ہو۔ کیونکہ دنیا تباہی و بربادی کے گڑھے میں جاری ہے۔ چھ صدی تک یہ زمین الہام الہی سے محروم رہی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ایک جدید قومیت کی بنیاد ڈالنے کے لئے وہ تعلیم دی جس کا تذکرہ اگلی آیتوں میں آتا ہے۔



## باب ۳

## تہذیب اخلاق

جب یہودیوں کی نسبت یہ فیصلہ ہو گیا کہ وہ ناکارہ محض ہیں تو اب خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسری قوم اٹھ کر کرہ ارضی کی تہذیب و شائستگی کے فرض کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ قرآن نے دعویٰ کیا کہ وہ اس اہم واقعہ فرض کو ادا کرنے کے لئے تیار ہے اور یہاں سے اس نے اپنی تعلیم شروع کی جس نے چند سال کے اندر عرب میں ایسا مہر العول انقلاب پیدا کر دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

اگرچہ اسلام کے سامنے جملہ اقوام و ملل پر برتری حاصل کرنا ہے۔ نہو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلمہ مگر اس نے اس کی طرف تدریجی قدم بڑھایا کہ اولین سنگ بنیاد ٹھیک طور سے رکھا جائے تاکہ اس پر قومیت صالحہ کی جدید عمارت محکم و استوار ہو سکے۔ اس نے سب سے پہلے اخلاق انسانی پر نگاہ ڈالی اور ان کی اصلاح و تہذیب کو مطمح نظر بنالیا کہ قوم میں صحیح کیر کٹر پیدا ہو اور ان اکہ مکہ عند اللہ اتقا کم کا مصداق بن جائے۔ یہی اخلاق اعمال کا سرچشمہ ہیں اور ان ہی پر حیات قومی کا دار و مدار۔

## اخلاق کی تفصیل

انسانی ارتقا اور اس کے مدارج علو و رفعت ان چار عنوانوں سے باہر نہیں: (۱) تہذیب اخلاق (۲) تدبیر منزل (۳) سیاست مدینہ (۴) خلافت کبریٰ۔ جس قدر انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے ان کا رویے سخن ایک ایک قوم کی طرف تھا، اس لئے ان کی انتہائی ترقی بھی سیاست مدینہ سے آگے نہ بڑھ سکی، مگر رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لئے بھیجے گئے تھے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا ۲۸) اس لئے آپ کو خلافت کبریٰ کا وعدہ دیا گیا اور آپ کی امت کو شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کیا گیا۔

یہاں سے تہذیب اخلاق کا باب شروع ہوتا ہے جس میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي اذْكُرْتُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲﴾

پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا احسان مانو اور ناشکری مت کرو، اے مسلمانو! صبر اور دعا سے مدد طلب کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہے:

(الف) ذکر، ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا الست برکم کے جواب میں جو ملی کہا تھا فراموش نہ ہوئے پائے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کی حقیقت طاری ہو اور الا بذکر اللہ تطمئن القلوب سے حلاوت اندوز ہو، ان صلاحی و نسکی و محیای و مصلاتی اللہ رب العلمین لاشریک لہ و بذلک امرت وانا اول المسلمین کا جذبہ عشق و شیفگی پیدا ہو، اور اسلمت لرب العلمین اس کے ہر رگ و پے میں جاری و ساری ہو، جس طرح دنیا میں ہر قوم کے لئے مرکز ہونا ضروری ہے، نجوم و کواکب کا تعلق سورج کے ساتھ ہے۔ درخت کی مختلف شاخیں جڑ سے متعلق ہیں، ایسے ہی نوع انسانی اپنے مرکز حقیقی سے وابستہ ہو کہ وہی سرچشمہ حیات ہے اور وہی ہماری ضروریات زندگی کو پورا کرنے والا۔ جھکے تو اسی کے آگے، عاجزی و فروتنی ہو تو اسی کی خاطر اور مانگو تو اسی سے وہی دے گا۔

(ب) شکر۔ جو کچھ اس نے دیا اس کو صحیح موقع و محل پر صرف کرنا شکر ہے، لَیْن شَکَرْتُمْ لَکَزِيدْنٰکُمْ وَلَیْن کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابَیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم ۷) اگر اس کو بیجا خرچ کیا تو یہ کفر ہو لہذا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لَیْبَلِّغَنَّ اَشْکُرْکُمْ اَمَّا اَکْثَرُ وَمَنْ شَکَرَ فَإِنَّا یُضَاعِفْ لِنَفْسِہٖ ۹ وَمَنْ کَفَرَ فَإِنَّ رَبِّیْ غَفِیْ کَرِیْمٌ (النمل ۴۰) لوط علیہ اسلام پر نعمتوں کے نزول کا سبب شکر قرار دیا نَجِّیْنٰھُمْ بِسَحَابٍ ۱۰ نِعْمَۃٌ مِّنْ عِنْدِنَا ۱۱ کَذٰلِکَ نَجْزِیْ مَنْ شَکَرَ ۱۲ (القر ۳۵، ۳۴) چونکہ وہ خدا کی دی ہوئی چیز کو صحیح موقع و محل پر صرف کرتے تھے اس لئے ہم نے ان کو عذاب سے نجات دی۔

(ج) صبر، ہر مقصد کے حصول میں تکلیفوں اور مصیبتوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ تمام دنیا سے شرک و بت پرستی کو دور کرنا، اس کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں توحید کی نشر و اشاعت اور اقوام عالم پر برتری کا حصول بے انتہا قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے مقصد حیات پر مرنے کے لئے تیار رہنا اور مصائب و موانع کی بنا پر اپنے نصب العین کونہ چھوڑنا صبر ہے۔ سورہ آل عمران کے آخر میں خلافت ارضی کی شرط اسی صبر کو قرار دیا: اَصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تَفْلَحُونَ، ایک جگہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی قوتوں میں سے شمار کیا: وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۱۴ (ال عمران ۱۸۶) دوسری جگہ اس کو اولو العزم پیغمبروں کے محتضات میں شامل کیا قَاصِدٌ کَمَا صَبَرُوا لَوْلَا الْعَزْمُ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف ۳۵) قرآن حکیم ہر صابر مسلمان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ دس کافروں پر بھاری ہو اِنْ یَکُنْ مِنْکُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ یُغْلِبُوا مَا تَتَّبِعُونَ (الانفال ۶۵) جنگ میں کامیابی کے مختلف اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَاطِيعُوا اللہَ وَرَسُولَہٗ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوا اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ۱۵ (الانفال ۴۶) لڑائی کے موقع پر اسی صبر و استقامت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے: رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ ۱۶ (البقرہ ۲۵۰) اسی صبر پر امامت و پیشوائی عالم نوازش کی گئی وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیۃً یَّہْدُوْنَ بِاَمْرِنا لَمَّا صَبَرُوا (السمۃ ۲۴) اسی کی خاطر بنی اسرائیل ہر قسم کی خیر

وبرکت کے نزول کا باعث بن گئے وَ تَمَثَّلْتَ بِكَ الْحُسْنَى عَلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ بِمَا صَبَرُوا (الاعراف ۱۳) بہترین جزا صرف صابرین کو ملے گی وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۵﴾ (النحل ۹۶) ان کو بغیر حساب ہر چیز نوازش ہوگی إِنَّمَا يُجِزِي الضَّالُّونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾ (الزمر ۱۰) اسی صبر و استقامت پر پانچ ہزار فرشتوں کی اعانت کا وعدہ دیا گیا: اِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فُورِهِمْ هَذَا يَتَذَكَّرُ لَكُمْ بِخَسْفَةِ الْإِلَهِ مِنَ الْبَلَاءِ (ال عمران ۱۲۵) آل عمران کی اس آیت نے تو صبر کے معنی بالکل ہی واضح کر دیے: وَكَانَ مِنَ نَبِيِّ قَتْلٍ مَعَهُ رَيْثُونٌ كَثِيرٌ قَبَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿۱۳۶﴾ (ال عمران ۱۳۶) یہاں تو مقصد پر مرنے کے سوا اور کوئی مطلب ہی نہیں لیا جاسکتا۔

(د) دعا۔ اللہ تعالیٰ سے اعانت کے طلبگار رہنا، آدم علیہ السلام مدتوں پریشان پھرتے رہے تاکہ آنکہ انہوں نے دعا کی اور مصیبت سے نجات حاصل کی، ادعوتی استعجب لکم اسی لئے کہا گیا، مومنین کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ (الفرقان ۶۵) ذکر یا علیہ السلام کے خصائص و امتیازات بیان کرتے ہوئے کہا: إِنَّهُمْ كَانُوا يُسْهِمُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَ رَهَبًا (الانبیاء ۹۰) گناہوں کی مغفرت صرف دعا کے ذریعہ ہو سکتی ہے: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ ۖ إِلَّا اللَّهُ (آل عمران ۱۳۵)۔

امام احمد نے اپنی مسند میں نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: الدعاء هو العبادة ایک روایت میں آتا ہے: الدعاء مخ العبادة۔ ابن ماجہ میں ہے: ليس شيء اكرم على الله من الدعاء دعا سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک اور کوئی چیز بزرگ و برتر نہیں۔ بیہقی نے دعوات کبیر میں روایت کیا ہے: ان ربکم سی کریم یستجی من عبده اذا رفع یدیه الیه ان یردھما صفر اتمھار پروردگار باحیاء ہے، جب ایک بندہ اس کے حضور میں ہاتھ پھیلاتا ہے تو خالی واپس کرتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔

مواعق صبر

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۵۰﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں خبر نہیں۔

یہاں سے ان مواعق کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں صبر کے بغیر چارہ نہیں اور جو ہر راہ روح کے لئے ضروری و ناگزیر ہیں کہ بغیر ان تکالیف و مصائب کے اچھے اور برے میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر جہاں لڑائیوں کا فلسفہ بیان کیا ہے وہاں بار بار اس حقیقت کبریٰ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جنگ صرف اس لئے ہوئی، اور ان مصیبتوں کا نزول اس بنا پر ہوا کہ منافق اور مومن میں تمیز ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

الطَّالِبِينَ ﴿٦٥﴾ وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ الْكُفْرَيْنَ ﴿٦٦﴾ (ال عمران ۱۴۱، ۱۴۰) دوسری جگہ کہا وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ (ال عمران ۱۵۴) اور ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّتَمُّعِ الْجَنَاحُ فَبِأَذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ تَافَقُوا (ال عمران ۶۵، ۶۶)

اصل بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی شہدائے خون اور گوشت سے وابستہ ہے، کھیتی کے لئے پانی اور سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے گردنیں نہ کٹیں، ہزاروں انسانوں کا خون نہ بہے۔ قوموں کی کھیتی کو خون سے سینچا جاتا ہے۔ جب تک کسی قوم کے بہترین افراد قتل نہ ہوں، اس میں کبھی جوش و ولولہ انتقام نہیں پیدا ہوتا۔ اسی کی طرف قرآن نے ارشاد کیا جب کہا: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ (ال عمران ۱۴۰) جب قوم کی قوم میں جذبہ ایثار و فدویت پیدا ہو جائے گا اور بچہ بچہ یکسر جوش و انتقام بن جائے گا تو کس کو ہمت ہوگی اس سے مقابلہ کرنے کی۔ یہی وہ حیات قومی ہے جو شہداء کے خون بہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ ایک قوم پر غیروں کو مسلط کر دیا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ جو لوگ ہماری راہ میں اپنی جانیں دیں گے ان کی قوم کبھی غیروں کی غلام و محکوم نہیں بن سکتی، بلکہ وہ ابدی زندگی کی وارث بن جاتی ہے مگر یہ زندگی عظیم الشان قربانی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتداء ہماری تری انتہا کے بعد!

بنی اسرائیل کو جب بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ اسی قربانی سے ڈرتے تھے اور مرنے سے جی چراتے تھے۔ پھر تمہیں معلوم ہے ان کا کیا حشر ہوا؟ قرآن خود اس کو بیان کئے دیتا ہے۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ (المائدہ ۲۶)

خدا نے فرمایا اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک ان کو نصیب نہ ہوگا۔ مصر کے جنگل میں بھٹکے بھٹکے پھریں گے تو تم نا فرمان لوگوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرنا۔

گویا چالیس سال تک ان کو حکومت و سرفرازی سے محروم کر دیا گیا۔ یہی وہ قتال فی سبیل اللہ ہے جس کی نسبت قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس راہ میں مرنے کے بعد تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی نیکی نہیں جس کے لئے اس قسم کا وعدہ کیا گیا ہو: تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١٠﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (الصف ۱۱، ۱۲) حدیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی آرزو شہید فی سبیل اللہ کے سوا اور کوئی نہیں کرتا: ما من احد يدخل الجنة يحب ان يرجع الى الدنيا وله ما في الارض من شيء الا الشهيد يتنى ان يرجع الى الدنيا فيقتل عشر مرات لبإیری من الكرامة شهيد چاہتا ہے کہ دنیا میں آئے اور راہ حق و حریت میں بارہا قتل ہو۔ اور یہ خواہش اسی عزت و کرامت نے پیدا کی جو مرنے کے بعد اسے میسر آئی، اور اس لئے کہ اس کی راہ میں جان



دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

تَبْتَ سَلِيمِي اِنْ نَبْتَ بِحَبْهَا  
وَاهُونَ شَى عَنَدَنَا مَا تَبْتَ!

ایک جگہ فرمایا: مومن میت بیوت الا ختم عملہ الا من مات مرابطاً سبیل اللہ، فانہ ینولہ عملہ الی یوم القیمة وامن من فتنة القبر کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہوتا ہو، الا وہ شخص جس کے جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہو دنیا سے گیا، پس اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنات جاریہ تین ہیں: اولاد صالح، علم نافع اور اوقاف و تعمیرات خیرہ۔ گزشتہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ جہاد کا ہر کام بھی اس قسم میں داخل ہے کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کے لئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے۔ پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوعی حفاظت کے جذبات رکھتا ہو۔ اور اس لئے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی وقتی نہ ہو دائمی ہو۔ عمل کا اجر تو نتائج پر موقوف ہے۔ جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملیں گے، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے؟ اسی چیز کی طرف آیت زیر بحث نے ارشاد کیا کہ جب حق پر کبھی موت طاری نہیں ہو سکتی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی راہ میں قربان ہونے والے پر موت طاری ہو، اس کے اعمال حسنہ کے ثمرات و نتائج میں کسی قسم کا انقطاع نہیں ہوتا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۖ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٧﴾

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور میوہ جات کی کمی سے آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے رحمت اور عنایت ہے۔ اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔

موت تو سب سے بڑی مصیبت تھی جو انسان کو بالکل دنیا اور اس کی ہر چیز سے، الگ کر دیتی ہے۔ اب ان چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو بظاہر اس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتیں، مگر ان کا تسلسل اور برابر رہنا مصیبت اور تکلیف میں موت سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور اکثر لوگ ایسے موقعوں پر کمزوری اور بزدلی کا اظہار کرتے ہیں۔ دشمن کا خوف دامن گیر ہے، قید خانہ کی کوٹھریاں، نظر بندی کی مصیبت اور جلا وطنی کی تکلیف کا ڈر لگا ہوا ہے۔ حکومت نے سامان رسد پر قبضہ کر لیا ہے۔ مصنوعی قحط سے ملک کو تنگ کر رکھا ہے۔ اموال و اجناس ادا میں روز بروز کمی ہو جاتی ہے۔ یار و مددگار اور عزیز و قریب فنا ہوتے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں قلت ہوتی جاتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے اور ہر داعی حق کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُّوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللّٰهُ ۚ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾ (البقرہ ۲۱۴) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُتْرَكُوا اَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ﴿۲۱۵﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۱۶﴾ (العنکبوت ۲، ۳) سورہ آل عمران میں ہے: وَكَانَ مِنْ نَّبِيِّ قَتْلٍ مَعَهُ رَيْبُيْنِ كَيْفٍ ۚ فَمَا وَهَنُوا لِمَا آصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (ال عمران ۱۶۶) جو لوگ ان مصائب و تکالیف سے پریشان خاطر انہیں ہوتے بلکہ: انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو فتح و کامرانی کے مستحق ہیں۔ بے شک

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

الفاظ و بشا، الصبرین کس درجہ حقیقت صبر کو ظاہر کرنے والے ہیں کہ ان مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں مگر راہ حق میں دعوت الی الخیر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور آخر یہی لوگ رحمت عامہ اور خاصہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔  
تعلیم گاہ حریت

اِنَّ الصَّفَا وَالْمُرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۳۱﴾

صفا اور مرہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پھر جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر ان دونوں کی درمیان طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اور خوش دلی سے نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان جانے والا ہے۔  
ہر تعلیم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کی ضروری ہے۔

(۱) نصاب تعلیم بہترین ہو کہ اسی سے قوم کے بچوں میں حس و بیداری پیدا ہوگی۔ جوش و ولولہ عمل سے قوم زندہ ہو جائے گی اور جذبہ قومیت و وطنیت ہر شخص میں نظر آئے گا۔

(۲) معلم کا وجود اس تعلیم کا بہترین نمونہ ہو کہ تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس کے ساتھ انسانی نمونہ عمل نہ ہو۔

(۳) تعلیم گاہ ایسی ہو جس کی روایات شاندار ہوں اور جس کی تربیت نے بہترین افراد امت پیدا کئے ہوں۔

اسلام نے ان تینوں ضرورتوں کو بہترین طریق سے پورا کیا۔ اس نے قرآن حکیم کو نصاب تعلیم تجویز کیا کہ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۚ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿۴۲﴾ (حم السجدہ ۴۲) اسی کی نسبت حضرت عمرؓ نے کہا سبنا کتاب اللہ، رسول اللہ اس کے معلم ہیں علیہم الكتاب والحكمة جو خود اس تعلیم کے اکمل ترین نمونہ ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱) کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کان خلقہ القرآن، درس گاہ حریت یہی بیت الحرم ہے

جس میں آنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجَابُ الْبَيْتِ مِنْ اَسْطِطَاعِ اِلَيْهِ سَبِيلًا**۔  
 تہذیب اخلاق کے باب میں جن جذبات حقہ کی تعلیم دی گئی ان کی تربیت و تکمیل کے لئے فرمایا کہ صفا اور مروہ کا طواف کر لیا کرو اور بار بار سعی بین الصفا والبروۃ تو اور بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی کہ کثرت کار و مشق کی بنا پر ہر وقت ابراہیم واسمعیل کے مقامات ذہاب الی اللہ یاد آتے رہیں گے اور بتدریج وہی اخلاق و جذبات جڑ پکڑیں گے۔ ابراہیم نے اس گھر کی بنا اس لئے ڈالی تھی کہ اس جگہ مجاہدین فی سبیل اللہ تیار ہوں۔ اس لئے سپاہیانہ زندگی کے لوازمات کی تکمیل بھی اسی جگہ ہو سکتی ہے۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ جس جگہ سورہ بقرہ میں احکام حج بیان کئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ جہاد کے فرائض کا بھی تذکرہ ہے۔ اگر قرآن کی آیات باہم دگر مربوط مسلسل ہیں تو وہاں اس کے سوا اور کوئی معنی ہو نہیں سکتے کہ حج اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

جو لوگ اس کا بار بار طواف کر کے اپنے جذبات حقہ کی تکمیل کریں گے، اللہ تعالیٰ ان امتیازات کو ضائع نہ کرے گا بلکہ صحیح موقع پر ان سے کام لے لیگا۔ وہ موقعہ کونسا ہوگا اس کو اللہ کے سوا دوسرا نہیں جانتا۔ جب میدان جنگ میں مسلمانوں اور کافروں کی صفیں آراستہ ہوں گی کامیابی کے لئے صبر و استقامت اور عزم و استقلال کی ضرورت ہوگی، اس وقت مسلمان دعا کریں گے رَبَّنَا آفِرْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۰﴾ (البقرہ ۲۵۰) اس وقت ان جذبات حقہ سے کام لیا جائے گا۔ جب فرعون کو عین دربار میں جادو گروں نے لٹکارا اور اس نے جواب میں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تو انہوں نے بھی یہی دعا کی تھی: وَمَا تَنْفَعُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اَمْنًا بِاَيْتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا رَبَّنَا آفِرْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوْفِقْنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۲۶﴾ (الاعراف ۱۲۶) ہمارا اس کے سوا اور جرم ہی کیا ہے کہ جب اللہ کی آیات ہمارے پاس آگئیں تو ہم نے ان کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ اب تم ہمیں قتل سے ڈراتے ہو تو خداوند اہم پر صبر انڈیل دے کہ خوف کے مارے پھسل نہ جائیں اور مریں تو مسلمان ہوں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ خواتیم آیات دراصل تمام آیت کے مطالب و معانی کا مغز اور لب لباب ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مفسرین نے اس موضوع کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ اور ایک اہم ترین باب اب تک بند کا بند ہی رہا کہ تَرَكَ الْاَوَّلَ لِلَاخِرِ۔

### تبلیغ و دعوت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۚ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاصْلَحُوْا وَبَيَّنُّوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنَا السَّوَابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفٰرٌ ۙ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْقَرُوْنَ ﴿۵﴾

وہ لوگ جو ان صاف حکموں اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں، بعد اس کے کہ ہم نے انہیں نازل کیا۔ اور کتاب میں

لوگوں کو صاف صاف سمجھا دیا، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں مگر جن لوگوں نے توبہ کی، اور اپنی حالت درست کر لی اور صاف صاف بیان کر دیا تو ان کی توبہ ہم قبول کرتے ہیں اور ہم بڑے قبول کرنے والے مہربان ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار ہی کی حالت میں مر گئے تو ان پر خدا کی لعنت اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی، وہ ہمیشہ اسی لعنت ہی میں رہیں گے، نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

یہ وہ اخلاق ہیں جن کو ہر مذہب و ملت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کتاب الہی میں ان کے بیان کرنے سے مقصد یہی ہے کہ ان کی نشر و اشاعت ہو۔ اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کریں۔ مگر جو بد بخت ان کی تبلیغ و دعوت سے گریز کرتے ہیں، ان کی مثال اس شخص کی ہے جو جنگل میں پانی کے ایک شیریں چشمہ پر قابض ہے مگر نہ تو انسان کی تشنہ لبی کو دور کرتا ہے اور نہ کسی جانور کو اپنی پیاس بجھانے دیتا ہے ایسے شخص پر زمین و آسمان کی ہر چیز لعنت کرے گی۔ یہی حال ان ارباب علم کا ہو گا جو اپنے علم کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ ان سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو جائیں گے۔ اہل کتاب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ دعوت و ارشاد کے فرض کو ترک کر چکے تھے: **وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَقَوْا بِهِ هُمْنًا قَلِيلًا فَبُغِضَ مَا يَشْفَعُونَ** (ال عمران ۱۸۷) شارح علیہ السلام کو یہی حکم دیا گیا: **وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَذَا الْقُرْآنَ لِأَشَدِّرْكُمْ بِهِ وَمَنْ بَدَّلْهُ (الانعام ۱۹) رسول کو اسان الہی نے ان الفاظ میں خطاب کیا: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَدِّلْهُ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (المائدہ ۶۷)**

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و دعوت رسول اور اس کے جانشینوں کا فرض ہے، مگر جو اس مقصد حیات کو ترک کر دیں گے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں گے۔ ملائکہ الرحمن سے دوری نصیب ہو گی۔ اور اس طرح خیر و صلاح سے یک قلم الگ ہو جائیں گے۔ کیونکہ نیکی کا الہام فرشتوں ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہوں گے ❶۔

❶ امت مسلمہ کے علماء و مشائخ ان آیات میں درس و فکر سے کام لیں کہ تبلیغ و دعوت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وما اجتمع قومی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدأ رسولہ بینہم الا نزلت علیہم السکینۃ و غشیہم الرحمة و حفتہم الملائکۃ و ذکرہم اللہ فی من عندہ اور جب ایک قوم مسجد میں اس لئے آتی ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کرے اور اس کے درس و افتاء کو اختیار کرے تو اس پر اللہ کی سکینت و رحمت نازل ہوتی ہے ملائکہ اپنی خیر و برکت میں انہیں لے لیے ہیں، اور ملا علی بن ابی طالب کا ذکر ہوتا ہے۔ ترمذی نے ابن مسعود سے اور داری نے ابو ذر سے روایت کی کہ نصر اللہ امراء سبع منا شیاء فبلغہ کیا سب سے قرب مبلغ اوسی لہ من سامعہم اس شخص کو خوش رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا اور اس کی پوری پوری اشاعت کی۔ اس لئے کہ بہت سے سننے والے داعی سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور وہ زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ داری نے حسن سے مرسل روایت کیا ہے کہ: من جاءہ الموت وھو یطیب العلم یحیی بہ الاسلام فبینہ و بین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنة جو شخص اس حال میں مر گیا کہ احیاء و تجدید ملت کے لئے علم دین حاصل کر رہا تھا تو اس میں اور نبیوں میں درجات کے اعتبار سے جنت میں صرف ایک ہی درجہ کا فرق ہو گا، ایک روایت میں ہے کہ آپ کے سامنے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کا ذکر کیا

گیا۔ ایک وہ قہاجو صرف فرائض نمازی ادا کرتا اور باقی اپنا تمام وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرتا اور دوسرا صائم الدہر اور قائم اللیل تھا۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا: افضل هذا العالم الذی یصلی المکتوبة ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النهار ویقوم الیل کفصل علی ادناکم، وہ عالم جو فرض نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی تعلیم میں مصروف ہوتا ہے اس عابد کے مقابلہ میں جو صائم الدہر اور قائم اللیل ہے ایسا ہی بزرگی اور شرافت میں اعلیٰ ہے جیسے میری فضیلت و برتری تم میں سے ادنیٰ ترین پر ہے۔ عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنی مسجد میں گئے تو دیکھا دو گروہ ہیں۔ فرمایا دونوں نیکی میں مصروف ہیں مگر ایک دوسرے سے افضل ہے۔ جو لوگ اللہ کے ذکر میں مصروف ہیں اور اس کی طرف توبہ و انابت کر رہے ہیں خدا کی مرضی پر موقوف ہے انہیں کچھ نوازش کرے یا کچھ بھی نہ دے واما هولاء فیتعلمون الفقه او العلم ویعلمون الجاهل فہم افضل مگر یہ لوگ دوسروں کو فقط علم کی باتیں سکھاتے ہیں اور جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، یہ ان سے افضل و اعلیٰ ہیں پھر فرمایا انما یبحث معلما ثم یجلس فیہم کہ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور انہی کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابو بکر بن حزم مدینہ کے قاضی کو لکھا:

انظر ماکان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاکتبه فانی خفت دروس العلم وذہاب العلماء ولا تقبل الاحادیث النبویة ﷺ ولیفشو العلم ولیجسوا حق یتعلم من لا یتعلم فان العلم لایہلک حتی یکون سہا۔

دیکھو جو آپ کی حدیثیں تمہیں ملیں ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے علم دین کے منٹے اور علما کے چل بسے کا خوف ہے اور صرف حدیث ہی قبول کرنا کسی اور کا قول نہ ہو۔ علما کا فرض ہے کہ وہ اشاعت علم میں مصروف ہوں تعلیم دینے میں لگ جائیں تاکہ جاہل علم حاصل کر لیں۔ اس لئے کہ جہاں علم پوشیدہ ہو اور وہ ضائع ہو گیا۔ علما کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنی تمام عمر اسی فرض جلیل میں صرف کرتے مگر ان بد بختان ملت نے کتاب و سنت کی ان تصریحات کی پروا نہ کی اور علم کو چھپانا شروع کر دیا اور اب تو دعوت و ارشاد میں ایک عالم بھی مصروف نہیں فیاللاسف ویاللعاء کیا ان علمائے سوء کو یاد نہ رہا کہ من سئل عن علم فکتہ الجہہ اللہ یوما لقیۃ بلجام من نار جس عالم سے کوئی بات دریافت کی گئی اور باوجود جاننے کے اس نے بتانے سے گریز کیا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالے گا۔ بیشک اس صادق و مصدوق نے سچ فرمایا تھا کہ الا ان شر الشرار العلماء کہ بدترین خلائق اور شر البریہ یہی۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

عالم ہیں جو اپنے علم کی نشر و اشاعت سے غافل ہیں۔ نتیجتاً نے شعب الایمان میں حضرت علیؑ سے روایت کی کہ علمائہم شہ من تحت اہیم السباع من عندہم تخرج الفتنة وفہم تعود۔ اس آسمان کی چھت کے نیچے جو کچھ ہے اس میں بدترین یہی علماء ہیں کہ یہی فتنہ و فساد کے بانی ہوں گے اور پھر انہی پر ہر قسم کی مصیبت نازل ہوگی۔

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب مدارج السالکین میں ماسی تبلیغ و دعوت کی حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

المرتبة السادسة مرتبة البیان العام وهو تبیین الحق وتبیؤة من الباطل با دلتہ وشواہدہ واعلامہ بحیث یصیر مشہودا للقلب کمشہود العین للبریات وھذا المرتبة هی حجة اللہ علی خلقہ التی لا یعذب احدہا۔ ولا یفعلہ الا بعد وصولہ الیہلہو هذا البیان هو الذی یبحث بہ الرسل وجعل الیہم والی العلماء بعدہم وبعد ذلک یضل الہ من یشائی۔

چھٹے درجہ میں بیان عام کا شمار ہو گا جس کا مشاہدہ ہے کہ دلائل و براہین اور شواہد و اعلام کے ذریعہ حق و باطل میں ایسی تمیز کر دیجائے کہ قلب ان میں ایسے ہی فرق و امتیاز کر سکے جیسے آنکھ۔ اسی تبلیغ و ارشاد کے بعد اللہ کی حجت قائم ہوتی ہے اور اسی سے انکار و جود عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ اسی کی خاطر انبیاء کی بعثت ہوئی اور یہی فرض کیے بعد دیگرے علمائے امت کے ذمہ عائد ہوتا رہا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اپنی عدیم النظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اما المجازات بالوجه الرابع فلا تكون الا بعد بعثة الانبیاء وکشف الشبهة وصحة التبلیغ لیہلک من ہلک عن بینة ویحیی من حی عن بینة۔ مجازات کی چوتھی صورت یہ ہے کہ انبیاء مبعوث ہوں، مخالفین کے شبہات دور کئے جائیں، صحیح معنی میں تبلیغ ہو تاکہ جو ہلاک ہو تو جہت قائم ہونے کے بعد اور جو زندہ رہے وہ دلائل و براہین سے اطمینان حاصل کر کے۔

اس وقت ہمارے عالموں کی جو حالت ہے وہ صاف بتا رہی ہے کہ ان میں یہودیوں کی مغضوبیت اور نصاریٰ کی ضلالت آچکی ہے۔ کتاب اللہ ان کے وراہ ظہور ہم ہی فیہلک ہم ثم ویلک ہم۔

## باب ۴

## تدبیر منزل

اب تک انفرادی حیثیت سے تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، مگر ظاہر ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زندگی نہیں۔ زندگی اگر ہے تو اجتماعی۔ اسی لئے نبی عربی نے ہمیشہ حیات اجتماعی پر زور دیا، مگر قوم ہمیشہ افراد سے بنتی ہے، اس لئے ضروری تھا کہ پہلے فرد افراد پر ایک شخص میں صحیح کریکٹر پیدا کر دیا جائے تاکہ آئندہ چل کر قومی عمارت محکم استوار ہو۔ جب اس سے فراغت ہو گئی تو اجتماعی زندگی کی طرف توجہ کی۔ یہاں آکر انسانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات و روابط قائم ہوتے ہیں۔ نکاح کی بنا پر اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام باپ کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔ گھر دراصل ایک چھوٹی سی حکومت ہے جس میں نظم و نسق اور عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ ان تمام امور پر اس باب میں بحث ہوگی۔

جب خانگی زندگی شروع ہوئی تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزی کمانے کی صورت کیا ہو اور روپیہ کس طرح حاصل کیا جائے؟ اس لئے سب سے پہلے ان ذرائع و وسائل کو بیان کیا جائے، جن سے روپیہ مل سکے۔

دولت کمانے کے ذرائع

وَالْهٰكُمُ الْاِلٰهُ وَاحِدٌ ۚ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٥﴾

”اور تمہارا معبود تو وہی ایک خدا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، رحمن ہے رحیم ہے۔“

اسلام کا مایہ ناز اور سرمایہ افتخار مسئلہ توحید کا ہے جس کی وجہ سے وہ مذہب وادیان عالم سے ممتاز و نمایاں ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں توحید خالص دیکھنے کا متمنی ہے، اس لئے تہذیب اخلاق سے لے کر خلافت کبریٰ تک ہر جگہ اس کی حفاظت الزم اللوازم ہوگی۔ تدبیر منزل میں گھر کی زندگی کا ذکر ہے، کھانے کمانے کے مسائل ہیں، مگر یہاں بھی اس جل اللہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور سب سے پہلے اسی کی تعلیم دیا اور بتا دیا کہ اسی کی ذات اقدس تمہاری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار و کفیل ہے، وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلٰى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود) پس یہ نہ ہو کہ اگر کسی دقت کوئی دقت پیش آئے تو غیر اللہ سے طالب اعانت ہو، نہیں! اسی کی طرف توجہ ہو اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہو۔ اس قدر تمہید کے بعد اب دولت کمانے کے ذریعوں کی تفصیل آتی ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰخْتِلَافِ الْاَنْبِيَاۡ وَالتَّهٰارِ وَالْغُلُوْكِ الَّتِي تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلْنَا

اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۚ وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲۷﴾

”بیشک آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور جہازوں میں جو آدمیوں کے نفع کی چیزیں لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے نازل کرتا اور زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد شاداب کرتا ہے اور حیوانات میں جو زمین میں پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، غرض ان سب میں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں ہیں۔“

اسلام کی تعلیم صرف احسان و تقصوف اور رہبانیت کے لئے نہیں نازل کی گئی، بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ اس کی وجہ سے شہداء علی الناس کا درجہ حاصل ہو اور کنتم خیر امة اخراجت للناس کی عزت نصیب ہو۔ وہ صرف حکومت و سر فرازی کے لئے ہے، اس لئے دولت کمانا اس کے اصول اساسی میں سے ہے، اس نے مال کو خیر سے تعبیر کیا: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ (البقرۃ ۲۱۵) اس نے دولت کو امتوں اور ملتوں کے قیام کا باعث بتایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء ۵) پھر اس نے بار بار اتفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و خیرات پر زور دیا، البتہ اس کے لئے حدود اور قوانین ہیں جو اپنی جگہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت کمانا کسی شریف انسان کا مقصد حیات نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے ملک و ملت کی راہ میں صرف کرنا اس کی انتہائی غرض ہونی چاہئے۔

سب سے پہلے انسان کی صدا ہر دور میں جو زمین و آسمان کی پیدائش اور اختلاف لیل و نہار سے پوری ہوتی ہیں۔ پانی کے شیریں چشمے جنگلوں اور پہاڑوں میں تشنہ لبوں کی سیرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ درختوں کی ٹہنیاں میوؤں کے بوجھ سے جھکی جاتی ہیں، ان چیزوں کی پیداوار میں انسانی کوشش کو دخل نہیں، بلکہ قدرت خود بخود مہیا کر رہی ہے اور موسم کے تغیر و تبدل نے ان کے پورے کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ سورہ نمل میں فرمایا: هُوَ الَّذِي اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝ يُثْبِتُ لَكُمْ بِهِ الْوُجُودَ وَالْزَيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ﴿۱۰۱﴾ (النمل ۱۰۱) وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسیا جس میں سے کچھ تمہارے پینے کا ہے اور اس سے درخت پرورش پاتے ہیں جنہیں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو۔ اسی پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ سوچ سمجھ کو کام میں لاتے ہیں ان کے لئے اس میں ایک نشانی ہے۔

پھر جہازوں اور کشتیوں کے لئے بحری تجارت کے راستے کھلے ہیں۔ سورہ روم میں فرمایا: لِيَجْزِيَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ (الروم ۴۵) سورہ جاثیہ میں آیا: اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لِيَجْزِيَ الْفُلْكَ فِيْهِ بِاَمْرِهِ وَلِيَتَّبِعُوْا مِنْ فَضْلِهِ (الجاثیہ ۱۲) ایک جگہ کہا: وَعَلَى الْفُلْكَ تُخْمَلُونَ (المؤمنون ۲۲) ان تمام آیات میں بتایا کہ کشتیوں کے ذریعہ تم دریاؤں اور سمندروں میں تجارت کر کے اللہ کا فضل تلاش کرو۔

زمین جب امساک باران کی بنا پر مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا ہے اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا



ہے: **وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاصْبَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (النحل ۶۵)** ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا: **وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَاصْبَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الباقیہ ۵)** تو زمین کی زندگی سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس میں کاشتکاری کر سکیں اور وہ زراعت کے قابل بن جائے، گویا اس آیت میں بتا دیا کہ زراعت اور کھیتی باڑی بھی زرق کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔

جانور کثرت سے زمین میں پھیلانے گئے ہیں۔ دوسری جگہ اس کی اغراض پر بحث کی، مجملہ ان کے ایک آیت یہ بھی ہے کہ **وَتَخْبِلُ اَعْيَالَكُمْ اِلٰیٰ بَدَلٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلِغِيْهِ اِلَّا بِشَيْءٍ اَلْفَنَسِ (النحل ۷)** اور جن شہروں تک تم بے جان کاہی نہیں پہنچ سکتے، چارپائے وہاں تک تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں علاوہ اس کے ایک مصلحت یہ بیان کی: **وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (النحل ۵)** اور اسی نے چارپایوں کو پیدا کیا جن میں تم لوگوں کی زینت ہے اور فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔

اس میں جانوروں کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کی تعلیم دی۔

ہواؤں کا تغیر و تبدل خود ایک حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، مگر صرف ارباب عقل و خرد ہی اس کی جانب توجہ کر سکتے ہیں۔ سورہ جاثیہ میں آیا: **وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ اِلَيْتُمْ تَقُوْمُ يَّعْقِلُوْنَ (الباقیہ ۵)** آج ہم اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ دنیا ہوا سے کیا کیا کام لے رہی ہے۔ اور علوم و معارف کے ذریعہ سے اس کو کسی طرح اپنے تابع فرمان بنا لیا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان جس قدر بادل نظر آتے ہیں، وہ سب انسانوں کے مطیع و فرمانبردار ہیں کہ صاحبان دانش و بینش انھیں اور ان سے قوت برقی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ضروریات پیدا کیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسباب و وسائل بھی بہم پہنچا دیئے۔ پھر ان سے فائدہ حاصل کرنے اور ان کو اپنی ضروریات میں لانے کے لئے عقل نوازش کی۔ دولت کمانے کے ان قدرتی ذریعوں کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہونا عقل والوں کا کام نہیں۔

غیر اللہ کی غلامی

**وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَندَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَذْيُوْرًا عَذَابِ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۚ وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۴۰﴾**

”اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو بھی اس کا شریک بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت خدا سے رکھنی چاہئے اور جو ایمان والے ہیں انہیں اللہ کے ساتھ بہت محبت ہے اور اگر یہ ظالم عذاب دیکھنے کے وقت جس بات کو سمجھیں گے اب سمجھ جاتے کہ سب قوت اللہ ہی کی ہے اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے تو کیا اچھا ہوتا۔“



انسان کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ ان خزانِ قدرت میں غور کرتا، ان سے کام لیتا اور اپنی ضروریات پوری کرتا۔ اگر بالفرض زرق کمانے میں کوئی دقت محسوس ہوتی تو اسے برداشت کرتا، مگر بعض بد بختوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ سے علیحدہ ہو کر غیروں سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں، دوسروں کو اپنا رازق اور مربی خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کی غلامی و محکومی کو اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتے ہیں، ان کے آگے خاکِ مذلت چاٹتے ہیں اور اس طرح اپنی تمام عمر صرف کر دیتے ہیں مگر ایک مسلمان کی شان اس سے کہیں زیادہ رفیع و بلند ہے۔ اس کے گردن اللہ کی سوا اور کسی کے آگے نہیں جھک سکتی، بلکہ اسے جس قدر تکلیف ہوگی اس کے عشقِ خداوندی میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔

اربابِ ایمان اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ انجامِ کار، یہی صحیح تعلیم کام آئے گی اور دنیا و آخرت میں صرف اسی شخص کو آرام نصیب ہو سکتا ہے جو اس قانون کا پابند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر غیر اللہ کے آگے ان کی گردن نہیں جھکتی، البتہ جو لوگ مشرکانہ رسوم کے پابند ہیں، راہِ حق میں ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ تمام قوتیں بیکار ثابت ہوں گی جن پر انہوں نے اعتماد کیا تھا، اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان قوتوں پر اعتماد کرنا سخت غلط کاری تھی، مگر اب یہ ندامت کس کام آئے گی؟ لَیْسَ الْبُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (المومن ۱۶)، یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۱﴾ اِلَّا مَنْ لَّیَّ اللّٰهُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۲﴾ (الشعر ۸۱، ۸۲) جس دن کی نسبت یہ خبر دی گئی ہے: یَوْمَ یَغْفِرُ الذُّرَّۃَ مِنْ اٰخِیْہِہٖ ﴿۸۳﴾ وَاَمَہٗ وَاٰبِیْہِہٖ ﴿۸۴﴾ وَصٰحِبِیْہِہٖ وَبَنِیْہِہٖ ﴿۸۵﴾ لِّکُلِّ اَمْرِیْ مِنْہُمْ یَوْمَیْمِدٍ شَآءَ یُّغْفِرْہِہٖ ﴿۸۶﴾ (العنکبوت ۳۳، ۳۴)۔

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اٰتٰبَعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا وَرَآوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِہِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا لَوَ اَنَّیْ لَنَا کَرَمًا فَتَنَّبَعْنَا مِنْہُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا کَذٰلِکَ یُرِیْہُمُ اللّٰهُ اَعْمَالُہُمْ حَسٰتٍ عَلَیْہِمْ وَمَا ہُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۸۸﴾

”جبکہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے بالکل الگ ہو جائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیں گے اور تمام باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور یہ تابع لوگ یوں کہیں گے، کاش! ہمیں ایک دفعہ جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے صاف الگ ہو جائیں گے جس طرح یہ ہم سے الگ ہو گئے، یوں اللہ ان کے اعمال کو انہیں سرتاسر موجبِ حسرت دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلتا کبھی نصیب نہ ہوگا۔“

دنیا کی زندگی میں بارہا تجربہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹے انسان کی تقلید آنکھیں بند کر کے شروع کی جاتی ہے، حکومت کے آگے اندھا دھند سجدہ کیا جاتا ہے، مگر عین وقت پر آکر ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی، ہر ایک اپنی براعت و پاک دامن کی کا اظہار کرتا ہے اور وہ شخص بے یار و مددگار رہ جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا حال تھا، قیامت کی کیفیت اس سے زیادہ درد انگیز ہے۔ جن لوگوں کو آج خدا بنایا جا رہا ہے، ان کے سامنے نذر و نیاز پیش کی جاتی ہے، مرنے پر ان کی قبروں کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور انہیں سجدہ گاہ بنالیا جاتا ہے وہ اس روز صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے اپنی عبادت

کے لئے کبھی نہیں کہا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے روز سوال ہو گا کہ کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا معبود بنا لو تو وہ جواب دیں گے: مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ بَنِي وَرَبِّكُمْ (المائدہ ۱۷) یہ تو ایک پیغمبر معصوم کا حال تھا، اب ان معبودانِ باطل کی کیفیت ملاحظہ ہو: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هَؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ﴿١٨﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْتَبِغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّى نَسُوا آلَئِكَ ۖ وَكَلُوا قَوْمًا بُورًا ﴿١٩﴾ (الفرقان ۱۸، ۱۷) اور جس دن خدا کا فروع کو اور ان معبودوں کو جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پوجتے ہیں اپنے حضور میں جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ، کیا میرے ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا تھا یا یہ آپ ہی راستے سے بھٹک گئے؟ ان کے معبود عرض کریں گے کہ، تو پاک ہے ہم کو یہ بات کسی طرح زبیا ہی نہ تھی کہ تیرے سو اپنے لئے دوسروں کو کار ساز بناتے، بلکہ بات یہ تھی کہ تو نے ان کے بڑوں کو آسود گیاں دیں یہاں تک کہ تیری یاد بھلا بیٹھے اور یہ آپ ہی ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

جب ان مشرکین کے اسبابِ شفاعت ناکام ثابت ہوں گے تو غصہ و انتقام کے مارے دنیا میں دوبارہ جانے کی کوشش کریں گے کہ ان معبودانِ باطل سے اپنی علیحدگی کا اظہار کر سکیں۔ مگر بے سود۔

### صرف کرنے کا قانون

روپیہ کمالیا، اب بتایا جاتا ہے کہ اس کے صرف کرنے کا صحیح موقعہ و محل کونسا ہے؟

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿٢٠﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾

”لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تم کو بدی اور بے حیائی کے باتوں کی تعلیم دے گا اور یہ چاہے گا کہ تم اپنے اللہ کی ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔“

مسلمانوں کو خلافتِ ارضی حاصل کرنا ہے، اس لئے انہیں صرف اس چیز کا استعمال کرنا چاہئے جس کی طہارت و پاکیزگی کا انہیں یقین ہو، جس کو ناجائز ذرائع سے نہ حاصل کیا گیا ہو اور جس کی قانونِ الہی نے اجازت دیدی ہو۔ اس مقصدِ عظیم کے کسب و حصول کے لئے ضرورت ہوگی بہترین دل و دماغ کی۔ اور یہ تروتازگی نہیں پیدا ہو سکتی جب تک عہدہ سے عہدہ پاکیزہ اشیاء استعمال میں نہ ہوں۔ پس دنیا کی ہر اچھی چیز ایک مسلمان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ کھائے اور حکومت کے لئے تیار ہو۔ البتہ ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہے جو روحانی و جسمانی صحت کے لئے مضر ہوں، جن سے جذباتِ خبیثہ اور اخلاقِ فاسقہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور جن سے ارادوں میں ضعف و کمزوری آجائے۔ یہ خصوصیت صرف نبی کی تعلیم کو حاصل ہے کہ اس سے انسانی ارادہ میں قوت پیدا ہوتی ہے اور شیطان ہمیشہ بے حیائی اور بد خلقی کی تعلیم دیتا ہے جس کا انتہائی

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نبی کی تعلیم ہی سے نفرت ہو جاتی ہے، رسول کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے قانون بنایا جاتا ہے اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِبَئَاءَ لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمُّ بَيْنَهُمْ عَنْ قَوْمِهِمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۷۱﴾

“اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے اتارا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر اپنے بڑوں کو چلتے پایا، اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں اور ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہے جو سوائے بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا، یہ کافر بہرے گونگے اور اندھے ہیں سو کچھ نہیں سمجھتے۔”

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ صرف کرنے میں نبی کے قانون کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ، ہم اپنے باپ دادا کی رسم کو کبھی نہ چھوڑیں گے، اگر ان کی تقلید نہ کی تو خاندان بھر میں ناک کٹ جائے گی۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان رسوم میں نہ تو عقل و دانائی کی کوئی بات ہے اور نہ ان سے کسی شخص کو رشد و ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ جب وہ خود ہی فہم و تدبر سے محروم تھے تو دوسروں کو ان کی تقلید سے کیا نفع مل سکتا ہے؟ جو لوگ تعلیم قرآن سے اعراض کر کے ان رسوم کی پابندی کا دم بھرتے ہیں، ان جانوروں کی طرح ہیں جن کو ایک شخص پیچھے سے آواز دے رہا ہو اور یہ سوائے آواز کے اور کچھ نہ سمجھیں۔ اولئک کالا نعماء بل ہم اضل،

“نقص” اس آواز کو کہتے ہیں جس سے چرواہا بکریوں کو بلاتا ہے، یہاں ناعق تو حضور اقدس ہیں اور تمام کفار جانور ہیں جو آپ کی آواز سننے کے باوجود اس میں غور سے کام نہیں لیتے۔<sup>۱</sup>

۱۔ جن لوگوں نے اندھی تقلید کی زنجیریں اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں جو دنیا کو ان پابندیوں سے آزاد کرنے آئے تھے، مگر اب خود ان اغلال و سلاسل کو پکڑنے ہوئے ہیں جن کے نزدیک فقہ کی چند جزئیات وحی والہام سے بڑھ کر ہیں، جو اماموں کے اقوال کے ہوتے ہوئے صحیح احادیث کو پائے استغناء سے ٹھکرادیتے ہیں، جن کے نزدیک بیضاوی و جلالین اور دوسرے مفسرین کے اقوال کا یاد رکھنا ہی سب سے بڑی قرآن دانی اور تفقہ فی الدین ہے، جو صرف فقہاء و مشائخ کے جزئیات ہی سے استدلال کرنا اپنے لئے مایہ ناز و سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں، وہ ان آیات میں غور و فکر سے کام لیں۔ جن ائمہ عظام کی تقلید کا آج دعویٰ کیا جاتا ہے خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ لہٰذا کو رائے تقلید سے روکتے تھے۔ مرنے نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لہٰذا کو دوسروں کی تقلید سے روکتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: لا ینبغی لمن لم یعرف دلیل ان ینفی بکلامی جو شخص میرے دلائل سے واقف نہیں وہ میرے مذہب پر فتویٰ نہیں دے سکتا۔ جب کبھی امام ابو حنیفہ کوئی فتویٰ دیتے تو کہہ دیا کرتے کہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اگر کسی کے پاس اس سے بہتر جواب ہو تو وہ احق بالقبول اور اولی بالصواب ہے: وکان رضی اللہ عنہ اذا افتقروا یقول ہذا رای النعمان بن ثابت یعنی نفسہ وہو احسن ماقدرا نا علیہ فمن جاءہ بحسن منه فهو اولی بالصواب۔ امام مالک کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ: مامان احد الادھو ماخوذ من کلامہ ومردود علیہ الا رسول اللہ ﷺ آپ کے سوا ہر شخص سے اس کے اقوال کی باز پرس ہوگی۔ حاکم اور بیہقی نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے: اذا صحت الحدیث فھو مذہبی۔ ایک روایت میں اس طرح آتا ہے: اذا رایتہم کلامی یرخلف الحدیث فاعملوا بالحدیث وادعوا بکلامی الحائظ، اگر میرا کوئی مسئلہ حدیث کے مخالف ہو تو اسے دو پر اور دے مارو اور حدیث

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣١﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ  
الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَبَشِّرِ الظَّالِمِينَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۚ ﴿٣٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ  
الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَبَشِّرِ الظَّالِمِينَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۚ ﴿٣٣﴾

”مسلمانو! جو طیب چیزیں ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی غلامی کرتے ہو، اس  
نے تو تم پر صرف مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ جانور بھی جس کو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے  
نامزد کیا گیا ہو، پھر جو شخص بے قرار ہو جائے بشرطیکہ عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو تو اس پر کچھ  
گناہ نہیں ہوتا، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

ایک مسلمان جس نے اپنی ہر چیز خداوند قدوس کے نام پر قربان کر دی ہو، لذت طعام و شراب ہی کو اپنی زندگی کا  
مقصد نہیں بنا سکتا، بلکہ بہترین چیزیں کھائے اور خدائے واحد کے سوا اور کسی کے آگے اس کی گردن نہ جھکے، پاکیزہ چیزیں تو  
بہت کثرت سے ہیں، اس لئے صرف ان اشیاء کو بیان کیا جاتا ہے جن کا استعمال ممنوع و ناجائز ہے۔

(۱) مردہ۔ اگر ایک جانور کا ذبح کرنا ضروری تھا اور وہ ذبح کئے بغیر مر گیا تو اس کا گوشت حرام ہو گا۔ ایسے وحشی جانور  
جن کے ذبح کرنے پر قدرت نہ ہو اگر بسم اللہ کہہ کر تیریا اور کسی تیز ہتھیار سے زخمی کر دیا تو وہ حلال ہو گا، البتہ  
بندوق کے شکار کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ مڈی اور مچھلی کو بغیر ذبح کئے کھانے کی اجازت ہے۔ آپ نے فرمایا:  
”هو الطهور ماء الحل ميتته“۔ مڈی کے متعلق شیخین کی روایت ہے کہ: روى عن ابن ابی اوفی قال غزونا مع  
رسول الله ﷺ سبع غزوات اوستأ وكننا ناكل الجراد ونحن معه، “ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے  
ساتھ مل کر چھ یا سات لڑائیاں لڑیں اور ان ایام میں مڈی کھاتے رہے۔“

مردار کی حرمت پر یہود و نصاریٰ بھی متفق ہیں “اور جو کوئی کسی حیوان کو جو از خود مر گیا ہو یا اسے درندے نے پھاڑا ہو  
کھاوے تو وہ شخص خواہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیس کا وہ اپنے پکڑے دھوے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک  
ناپاک رہے تب وہ پاک ہو گا۔“ (احبار ۵۱: ۷۱)

(۲) خون۔ ہر قسم کا خون حرام ہے، لیکن شارع نے جگر اور تلی مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ دارقطنی میں ہے: “احل لنا من

پر عمل کرو۔ امام احمد فرماتے تھے: لا تقلدنی ولا تقلد مالک ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیہم نہ تو میری تقلید کرو اور نہ مالک اور زاعی اور نخعی اور کسی  
دوسرے کی تقلید کرو۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اذا قلت قولا و کتاب الله یخالفه اتروا قلی بکتاب الله قلیل اذا کان خبر الرسول الله ﷺ یخالفه قال  
اتروا قلی بخبر رسول الله ﷺ، جب میرا کوئی قول کتاب و سنت کے مخالف ہو تو میرے اقوال کو ترک کر کے کتاب و سنت کا اتباع کرو۔  
یہ تصریحات ان ائمہ عظام کی ہیں جن کی کو رائہ تقلید پر ناز کیا جاتا ہے۔ جن کے اقوال کو کتاب و سنت پر ترجیح دی جاتی ہے، وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ  
کتاب و سنت سے اعتصام و تمسک ہی نجات کا ذریعہ ہے، مگر ان لوگوں نے اتخذوا احبارهم و دہبانہم اربابا من دینی اللہ پر عمل کر کے معصوم کی تقلید کو  
ترک کر کے غیر معصوم کو اپنا امام و قدوہ بنالیا ہے۔ دنیا میں علم ہمیشہ آزاد رہا اور اس نے کبھی کسی کی تقلید نہ کی، مگر آہ! مسلمانوں نے اس کی آزادی بھی سلب  
کر لی اور اپنے دماغوں کو دوسروں کا غلام بنالیا، پھر اس تقلید کے ہوتے ہوئے نہ تو ان میں اجتہاد فکر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ حریت رائے۔

الدم دمان ومن الميتة ميتتان الحوت والجراد ومن الدم الكيد والطلال، ”کتاب احبار میں ہے: “اور تم کسی پر ندے اور چرندے کا کچھ لہو اپنے سب مکانوں میں نہ کھائیو اور جو انسان کسی خون میں سے کھائے گا وہ اپنی قوم سے کٹ جائے گا۔“ (احبار ۷۲، ۷۳: ۲۷)

(۳) سور کا گوشت۔ “اور سور کہ کھر اس کا دوحے ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرہ ہے پر وہ جنگلی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے۔“ (احبار ۷: ۱۱)

(۴) ماہل بہ لغیر اللہ۔ وہ جانور کبھی حلال نہ ہو گا جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے یا اس کے لئے نامزد کیا گیا ہو اور اس حرمت میں صرف جانور ہی داخل نہیں ہیں، بلکہ ہر نذر و نیاز جو خدا کے سوا دوسرے کے نام پر کی جائے۔ نووی نے شیخ ابراہیم مروزی شافعی سے نقل کیا ہے کہ: اگر کسی حاکم کے آنے پر بطور بھیونت کے کوئی جانور ذبح کیا جائے تو اگرچہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، مگر وہ ماہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا، کذا فی الدر المختار۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے: اجمع العلماء ان مسلماً ذبح ذبیحة وقصد بذبحها التقرب لی غی اللہ صار مرتداً و ذبیحته ذبیحة مرتد، جمہور علماء کی رائے ہے کہ اگر ایک مسلمان غیر اللہ کے تقرب کی خاطر جانور ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جائے گا۔ مسلم میں ہے: لعن اللہ من ذبح لغير الله، اس شخص پر خدا کی لعنت جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے۔ شاہ عبد العزیز دہلوی سے دریافت کیا گیا کہ: کسے گاؤ یا بڑیا مرغ بنام کدام شہید یا یالی دبح نہاید چہ حکم است؟ انہوں نے جواب دیا: ذبح کہ آں جانور بنام مرغ خداوند خواہ پیغبر باشد خواہ ولی خواہ شہید خواہ غیر انسان حرام است، واگر بقصد تقرب بنام اینا ذبح کردہ باشد ذبیحہ آن جانور ہم حرام و مردار ہے شود و ذبح کنندہ مرتد ہے شوء، توبہ ازیں فعل منع لازم است۔

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا اور نذر و نیاز دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی دوسرے کی خاطر بیچ رہا ہے۔ حالانکہ یہ حق صرف اللہ کے لئے مخصوص تھا۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتا کہ اس کا بندہ کسی اور سے بھی تعلق رکھے، اس لئے کوئی مسلمان ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ آج کل پیروں اور بزرگوں کے لے جس قدر منتیں مانی جاتی ہیں سب اسی حرمت میں داخل ہیں۔ اضطراری حالت میں ان چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس میں دو شرطیں لازم کر دی گئی ہیں۔ انسان خود اس کی خواہش اور آرزو نہ کرے۔ قانون توڑنا اس کا مقصد نہ ہو اور کھاتے وقت اپنی ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔ ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہ ہو گا۔ اور یہ اس کی رحمت ہے کہ گناہ کی چیز سے گناہ اٹھالیا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتَوْتُونَ بِهِ شِمْنَا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكْنَهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰةَ بِالْهٰدَىٰ وَالْعَذَابُ

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الْاٰدِیْنَ اَخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ۝

“بیشک جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں، ایسے لوگ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں بھرتے اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دردناک عذاب ہو گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دیکر گمراہی خرید لی اور بخشش چھوڑ کر عذاب سودوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں! یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ کتاب میں اختلاف پیدا کریں وہ بہت دور کے خلاف میں ہوں گے۔“

علماء کا فرض ہے کہ وہ تدبیر منزل کے ان بنیادی اصول و عقائد کو تمام دنیا میں پھیلا دیں، تاکہ لوگ خانگی زندگی میں قدم رکھتے ہی صراطِ مستقیم پر چلنے لگیں اور شرک و بدعت سے پرہیز کریں۔ لیکن جو علماء و مشائخ ان تعلیمات صالحہ کی نشر و اشاعت نہیں کرتے اور مذہبی پیشوا ہو کر ان حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور کبھی بد اخلاقی کے نتائج فاسدہ سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ ایسے حریص و طامع عالموں کی خدا کے نزدیک کوئی قدر نہ ہو گی۔ انہیں شرف ہم کلامی نصیب نہ ہو گا اور ان کے نیک کام ان کی غلطیوں کا کفارہ نہ بن سکیں گے۔ عذاب کی یہ سختی صرف اس لئے ہے کہ کتاب تو عین ضرورت کے مطابق نازل کی گئی، مگر انہوں نے اس کی شرح و تفسیر میں اختلافات پیدا کر دیئے اور اب کوئی شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایسا کرنے میں وہ خود بھی راہِ حق و صراطِ مستقیم سے دور جا پڑتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تبلیغ و دعوت ہر مسلم کا فرض قرار دیا ہے اور اس امت مرحومہ کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران ۱۱۰) مگر جو لوگ تبلیغ و اشاعت سے انحراف کریں اور ستمان حق کے مرتکب ہوں ان کو اشد شدید عذاب کا مستحق قرار دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: اَوَّلِيْكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرۃ ۱۵۹)، بنی اسرائیل کی سب سے بڑی خرابی یہی ذکر کی گئی ہے کہ وہ ستمان حق کیا کرتے تھے۔

### حکومت کی قابلیت

قوموں کا ارتقاء ہمیشہ تدریجی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ابتداء میں تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی، بعد ازاں تدبیر منزل کے اساسی اصول بیان کئے گئے۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ قرآن حکیم یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا گھر ایک مستقل درس گاہ ہو جس میں اولاد کی تربیت اس طریق پر کی جائے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر حکومت کرنے کے قابل بن جائیں۔ تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ شارع کی زندگی میں جس قدر علمی اعزازات ملتے تھے ان کا معیار قرآن حکیم تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: “خیرکم من تعلم القرآن وعلمه”، مگر عملی غر و افتخار کی لئے خود اس شخص کی گھر کی

زندگی کو دیکھا جاتا تھا۔ اہل و عیال کے ساتھ وہ کس طرح پیش آتا ہے، گھر میں نظم و نسق کیسے قائم کرتا ہے اور جھگڑوں کے وقت فیصلہ کی کیا صورت ہوتی ہے: خید کم خید کم لاہلہ میں اسی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ پس ایک مسلمان کا گھر چھوٹی سی سیاسی در سگاہ ہے جس میں حکمرانی اور جہانداری کے مسائل کی تعلیم ہوتی ہے اور جہاں سے فرمانروا بن کر نکلتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوكُمْ وَجُوهَكُمْ قَبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَ النَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الصَّلَاةَ وَالْزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَكَانُوا مِنَ النَّاسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٥٥﴾

”یہی نیکی نہیں کہ مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ ایک شخص اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاوے اور خدا کی محبت کی راہ میں اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرنے میں صرف کرے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔“

تہذیب اخلاق کے باب میں صرف ذکر، شکر، صبر اور دعا پر زور دیا گیا کہ انفرادی طور پر تہذیب و شائستگی کے لئے یہی صفات حسنہ کافی تھیں۔ جب ترقی کر کے تدبیر منزل میں قدم رکھا تو فرائض میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ابتدائی جماعتوں میں کتابیں کم ہوتی ہیں اور طالب علم پر ذمہ داری بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی، مگر جب وہ ثانوی تعلیم کے لئے کسی درس گاہ میں داخل ہو گا تو اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جائیں گی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کے لئے تو صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا کافی تھا، مگر تدبیر منزل میں آکر ان پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا بلکہ فرائض میں اضافہ ہو جائے گا اور اب ان امور میں بھی درخورانی حاصل کرنا ہو گا۔

(۱) تہذیب اخلاق کے لئے جن امور کو ضروری قرار دیا گیا تھا وہ اب بھی بدستور ثابت قائم رہیں گے۔

(۲) بخیل میں حاکم بننے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ سمول بن عادیانے کیا خوب کہا ہے:

إذا البرء لبیدنس من اللوم عراضہ

فکل رداء یرتدیہ جبیل!

وان ہو لم یحمل علی النفس ضیہہا

فلیس الی حسن الشناء سبیل!

تم اپنے اندر خرچ کرنے کی عادت پیدا کرو اور مال و دولت کی محبت پر غالب آؤ۔ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا: ای الصدقة اعظم اجرا، اجر و ثواب کے اعتبار سے بہترین صدقہ کس قسم کا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان تصدق وانت صحیح



شحیح تخشى الفقر وتامل الغنى ولا تبهل حق اذ ابلغت الحلقوم قلت لفلان كذا ولفلان كذا، وقد كان فلاحاً ایسے وقت میں تو صدقہ کرے کہ تندرست و جوان ہو، مال کی محبت دل میں اور فقر کا اندیشہ دماغ میں ہو، اگر جاں کنی کے وقت خیرات کرنی شروع کی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ خود بخود تقسیم ہو جائے گا۔ ان صدقات و خیرات کے مستحق سب سے پہلے تمہارے عزیز و رشتہ دار ہیں کہ حمیت و عصیت قومی کی وجہ سے وہ تمہارے دست و بازو بن جائیں گے، جہاں تمہارا پسینہ گرے گا وہاں وہ اپنا خون بہانے کو تیار ہوں گے۔ قرآن حکیم نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ ایک جگہ آتا ہے: **وَإِذَا الْقَرْبَىٰ حَقَّ** (بنی اسرائیل ۲۶) سورہ روم میں فرمایا: **قَالَتْ ذَا الْقَرْبَىٰ حَقَّ وَ الْمُسْكِينُ وَابْنُ السَّبِيلِ** <sup>۱</sup> **ذَلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ** <sup>۲</sup> **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (الروم ۲۸) حدیث میں آیا ہے کہ: مسکین کو خیرات دینا صرف صدقہ ہی ہوگا، مگر ایک رشتہ دار کو خیرات دینے میں دو حیثیتوں سے ثواب ملے گا۔ ایک صدقہ کے اعتبار سے دوسرے صلہ رحمی کی بنا پر۔

یتامیٰ ہیں جن کا کوئی نگران کار نہیں، اگر ان کی تعلیم کا خیال نہ کیا گیا تو نارتبیت یافتہ کی کثرت قوم کو برباد کر دے گی اور ان کی تھوڑی سی مدد نہایت ہی مفید نتائج پیدا کرے گی۔ سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: **فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ** (الضحیٰ ۹)، مبلغین و دعاۃ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک قوم کے یتامیٰ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تھوڑی سی تربیت بے انتہا مفید ثابت ہوگی۔ ادھر لڑائیوں کی وجہ سے جس قدر یتامیٰ ہوں گے، قوم کے لئے بار دوش ثابت ہونے کی بجائے بہترین افراد بن جائیں گے۔ ان اسرار و مصالح کی بنا پر حامل نبوت نے فرمایا: ”انا و کافل الیتیم کھاتین“۔

انکے علاوہ مساکین، مسافر اور سائل ہیں۔ مسکین سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی حاجت دوسروں کے پاس نہیں لے جاتا اور اس کے ظاہری حالات فقر و تنگدستی کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ دیکھنے والوں کو اس کے دولت مند ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: **ليس المسكين الذي ترده التمرة والتبرتان واللقمة واللقمتان ولكن المسكين الذي لا يجد غنى يغنيه ولا يظن له في تصدق عليه**، مسکین وہ نہیں جو در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے، بلکہ اس شخص کو مسکین کہتے ہیں جس کے پاس اتنا سامان نہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکے اور نہ لوگوں کو اس کی خبر ہے کہ صدقات و خیرات ہی کا مستحق سمجھا جائے۔

گردنوں کے آزاد کرنے میں روپیہ صرف کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ عام مفسرین نے اس کے معنی کو صرف غلاموں کے آزاد کرنے تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا مطلب عام ہے اور اس کی عمومیت میں نہ صرف غلام ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قرض لے کر سودر سود میں مبتلا ہیں، پھر اس سے بھی بڑھ کر اس کا اعلیٰ ترین مفہوم یہ ہے کہ ایک مسلمان جب شہداء اعلیٰ الناس کی فضیلت کبریٰ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ دنیا کی ہر غلام و محکوم قوم کو آزاد کر کے اس کو حق آزادی نوازش کرے اور یہ حق صرف مسلمان ہی کو پہنچتا ہے۔ اسی کو سورہ بلد میں مشکل ترین گھاٹی سے تعبیر کیا: **فَكَ رَقَبَةً** (البد ۱۳) پھر اس سے صرف سیاسی آزادی



ہی مراد نہیں بلکہ تمدنی، اخلاقی، عمرانی، اجتماعی اور علمی، سب افراد غلامی اس میں شامل ہیں اور سب سے آزاد کرنا فرزند اسلام کا فرض ہے۔

یہ نہ ہو کہ اوروں کو تیار کرتے کرتے اپنے آپ کو بھول جاؤ اور روپیہ خرچ کرنے پر قناعت کر بیٹھو، بلکہ خود بھی نماز اور زکوٰۃ کے پابند رہو تاکہ جانی و مالی قربانی کی مشق ہوتی رہے، اسی کے ساتھ پابندی عہد ضروری ہے ورنہ دوسروں کو تمہارے عہد و مواعیت پر اعتبار نہ ہو گا۔ قرآن نے ایقائے عہد پر بے انتہا زور دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ لَا يُخَالِفُونَ عَهْدَهُمْ (المومنون ۸) یہودیوں پر لعنت کے نزول کا سبب، نقض عہد کو قرار دیا: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل ۳۴) نصاریٰ میں بغض وعداوت صرف عہد پورا نہ کرنے کے باعث پھیل گئی۔ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نُنْصَرِي ۚ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدہ ۱۳)۔

سیاست کے ابتدائی احکام میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ خواہ فقر و تنگدستی ہو، علالت و بیماری ہو، خواہ میدان جنگ ہو اور لڑائی کی وجہ سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا ہو، مقصد حیات کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ جن لوگوں نے ان فرائض کو اخلاص و حسن نیت سے ادا کیا، وہی ارباب صلاح و تقویٰ ہیں اور وہی دنیا کی امامت و پیشوائی کے مستحق۔

### فوجداری قانون

یہ عمومی احکام تھے اب حکومت کی جانب توجہ ہوتی ہے۔ گھر ایک چھوٹی سی حکومت ہے جس کا فرمانروا شوہر ہے، بیوی اور بچے اس کی رعایا ہیں۔ جب کبھی گھر میں لڑائی ہو تو شوہر کا فرض ہے کہ عدل و انصاف سے کام لے اور اپنی اولاد کو بہترین سیاست کی تعلیم دے، ان کے مناقشات باہمی کا ایسا فیصلہ کرے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اگلی آیتوں میں ایسا قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے تمام جھگڑے آسانی طے ہو سکتے ہیں اور پھر اسی قاعدہ کو ہم وسعت دیکر حکومت کے انتہائی فرائض میں شمول کر سکتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر فسادات ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے اسباب بہت کثرت سے ہوں، مگر ان سب کی انتہا دو چیزوں پر ہوتی ہے: یا تو کسی کی عزت و حرمت برباد کرنے کے لئے اس کو ہلاک کیا جاتا ہے یا مال و دولت کی حرص اس کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے قانون کے دو حصے کر دیئے: (۱) فوجداری (۲) دیوانی۔

سورہ بقرۃ کے ابتدائی اور اق میں تم پڑھ آئے ہو کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی مختلف جماعتیں بنادی تھیں، ان کو آپس میں لڑاتا رہتا تھا، تاکہ ان کی خانہ جنگی سے اس کی حکومت اور زیادہ محکم ہو جائے۔ فوجی طاقت کو فنا کرنے کے لئے لڑکوں کو ذبح کرتا اور اس طرح اخلاقی قوت بھی تباہ ہو جاتی۔ اس صورت میں لڑکیوں کیلئے عصمت فروشی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب ملکی تو حکمران جماعت کے حصہ میں آتے اور تمام ذلیل ترین عہدوں پر بنی اسرائیل کو مقرر کیا جاتا۔

لیکن قرآن اس طرز حکومت کا شدید ترین دشمن ہے۔ اس کی تباہی و بربادی کے لئے موسیٰ عمران بھیجا جاتا ہے کہ جمہوریت صالحہ اور حکومت عادلہ کے قیام کے لئے بنی اسرائیل کو تیار کرے۔ اسلام چاہتا ہے جس طرح شوہر اپنے گھروالوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ ان کی اصلاح و تہذیب اس کا اولین مقصد ہوتا ہے، دن رات ان کی ترقی کی فکر دامن گیر رہتی ہے، اور جب ان میں قابلیت و استعداد دیکھتا ہے تو فوراً ان کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، ایسے ہی مسلمان اپنے گھروں سے باہر نکل کر قوموں اور ملکوں پر حکومت کریں گے۔ اس طرز حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ مختلف ممالک میں اب مسلمانوں کی حکومت نہیں رہی، مگر ان کا تمدن، ان کی تہذیب اور ان کی زبان کی ہمہ گیری اب تک وہاں کے آثار باقیہ میں سے ہیں اور باوجود سخت کوشش کے کوئی ہاتھ ان کو مٹانہ سکا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحَرُّ بِالنُّصْرَةِ وَالْعَبْدُ بِالنُّصْرَةِ ۚ فَتَنَ عُفَىٰ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۚ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۚ فَتَنَ اخْتِلَايَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾

”مسلمانو! مقتولین کے بارہ میں تم پر مساوات لازم کر دی جاتی ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو اس کے بھائی سے کوئی حصہ معاف کر لیا جائے تو معقول طور پر مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دینا، یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اے عقلمندو! تمہارے لئے مساوات ہی میں زندگی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ طاقتور قومیں کمزوروں سے پورا قصاص لے کر بھی راضی نہ ہوتی تھیں اور نہ قصاص دینے والے شرافت اور دیانت کا خیال رکھتے۔ اگر ایک آزاد اور شریف آدمی کو غلام مار ڈالتا تو وہ اس کی جگہ شریف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے۔ قاتل اگر عورت ہوتی تو پھر بھی عورت کے قتل پر قناعت نہ کرتے، بلکہ اس کا سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا۔ اسلام نے آکر اس قسم کی تفریق کو بالکل مٹا دیا اور فرمایا کہ مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ قصاص کے معنی مساوات اور مماثلت فی القتل کی ہیں۔ کما صرح بہ الخازن۔

قرآن حکیم کا دستور یہ ہے کہ وہ ایک قانون کلی بیان کر دیتا ہے اور عام طور پر جزئیات کو ذکر نہیں کرتا۔ مگر چونکہ بعض اوقات قانون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا، اس لئے اس کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے بعض ضروری مسائل بیان کر دیتا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔ چنانچہ یہاں بھی مقتولین کے بارے میں مساوات کا قانون ذکر کر کے اس کی بعض اصولی جزئیات کو بیان کر دیا کہ، اگر قاتل آزاد ہے تو اسی سے قصاص لیا جائے، غلام نے قتل کیا تو وہی سزا کا مستحق ہے اور عورت ہے تو وہی عقوبت کی مستوجب۔

قانون تو وہی تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا، مگر بعض اوقات مقتول کے وارث اس مقدمہ کو قابل معافی خیال کرتے ہیں یا اس جرم کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ بجائے قصاص کے صرف فدیہ پر راضی ہو جاتے ہیں۔ تو اسلام اس وقت نرمی کرنے کے لئے تیار ہے۔ قاتل کو خون بہا ادا کرنا ہوگا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ فدیہ وصول کرتے وقت سختی سے کام نہ لیا جائے اور قاتل کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریفانہ طور پر تمام رقم ادا کرے، نہ تو مقدار میں کمی کرے اور نہ خواہ مخواہ ٹالتا رہے۔

بنی اسرائیل میں جرمانہ کا دستور نہ تھا بلکہ قاتل ہی قتل ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ لطف و نوازش کا برتاؤ کیا اور سزا میں تخفیف کر دی، ورنہ سزائے قتل کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ ہوتی۔ جرمانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ مقتول کے وارثوں کو جس قدر نقصان پہنچا ہے، اس کی ایک حد تک تلافی ہو جائے گی اور فقر و تنگدستی سے بچ جائیں گے، اگر اس قدر رعایت کے بعد بھی کسی نے ظلم وعدوان سے کام لیا، قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا یا معاف کر کے دوبارہ خون کا مطالبہ کیا تو اس سے قانونی مواخذہ ہو گا اور حکومت مداخلت کرے گی۔

مسلمانوں کی ترقی کا لازمی مساوات میں پوشیدہ ہے۔ جو قوم سپاہیانہ زندگی کی خوگر ہو، جسے دنیا کی امامت و پیشوائی کے لئے منتخب کیا گیا ہو، جو دنیا اور آخرت میں اعمال و اخلاق کے اعتبار سے فضیلت و برتری کی لئے جن لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے تمام افراد کو برابر کے حقوق نہ دیئے جائیں، کہ ہر ادنیٰ ترین مسلمان انتہائی ترقی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکے۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کی غرض سے بہترین اخلاق و اعمال کی عادت ڈال سکے، جب تمام افراد ملت میں یہ جوش و ولولہ عمل پیدا ہو جائے گا تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

### ضابطہ دیوانی

كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى  
الْبَٰتِلِينَ ﴿٦٨﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَثْمُنُهُ عَلَىٰ الَّذِيْنَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلِيمٌ ﴿٦٩﴾ فَمَنْ  
خَافَ مِنْ مُّوَسِّ جَنْفًا أَوْ نِيْثًا فَاصْلَحْ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٠﴾

”جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت نزدیک معلوم ہو اور کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اس پر لازم ہے کہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے، متقین پر یہ ایک قسم کا حق ہے۔ پھر جو وصیت سن لینے کے بعد اسے بدل دے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اسے بدل دیں۔ بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے، البتہ جس شخص کو وصیت کرنیوالے کے طرف سے طرفداری یا جرم کا اندیشہ ہو اور وہ ان میں صلح کر دے تو پھر اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے قرآن میں جن پانچ آیتوں کو منسوخ تسلیم کیا ہے، ان میں سے پہلی یہی ہے۔ ان کا

خیال یہ ہے کہ چونکہ سورہ نساء میں وارثوں کے حصے معین کر دیئے گئے ہیں، اس لئے وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثلاً حظ الانثیین الخ کو نسخ قرار دیتے ہیں اور حدیث لا وصیة لوارث اس نسخ کو اور زیادہ واضح کرتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہو سکتی بلکہ اب بھی واجب العمل ہے اور اس کے لئے حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) قرآن حکیم نے جن مواقع میں وارثوں کے حصے معین کئے ہیں وہاں من بعد وصیة کے الفاظ بھی ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ دیکھئے بھائیوں کے ہوتے ہوئے جب ماں کا چھٹا حصہ مقرر کیا تو یہ شرط لگادی کہ ان حصوں کے مطابق تقسیم اس وقت ہوگی جبکہ وصیت پر عمل ہو چکا ہو گا: فَإِنْ كَانَ لَكَ إِخْوَةٌ فَلِأَمِّهِ الشُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِي بِهَا (النساء ۱۱) اس کے بعد کی آیات بھی دیکھ لیجئے۔ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبُومُ وَمِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِيْنَ بِهَا (النساء ۱۲) فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ وَمِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ تُوصُونَ بِهَا (النساء ۱۲) فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرًا مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِيْنَ بِهَا (النساء ۱۲) ان تمام آیات میں حصص بیان کئے گئے ہیں، مگر ہر آیت کے آخر میں من بعد وصیة کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وصیت جائز قرار دی گئی ہے۔

(۲) نزول کے اعتبار سے سورہ مائدہ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهِادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمْ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اِثْنَيْنِ اَوْ اَعْلَىٰ مِنْكُمْ اَوْ اَخْرَجَ مِنْ غَيْرِكُمْ (المائدہ ۱۰۶) جب موت کا وقت آجائے اور وصیت کرنے لگو تو دو عادل شخصوں کو اپنی وصیت کا گواہ بنالو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورہ مائدہ نے بقرہ کے حکم وصیت کو بدستور قائم رکھا۔

(۳) بخاری نے کتاب الوصایا میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ: وہ قیام مکہ کے دوران میں بیمار ہو گئے، رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور آپ اس امر کو نا پسند فرماتے تھے کہ ایک مسلمان مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد پھر اسی جگہ مرجائے۔ آپ نے سعد کے حق میں دعا کی تو سعد نے عرض کیا: یا رسول اللہ اوصی بھالی مکہ قال لا قلت فالشط قال لا قلت فالثلث قال لا قلت فالثلث کثیر انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعهم عالة یتکفون الناس فی ایدیہم وانک مہمبا انفق من نفقة فانہا صدقة حق القیمة التي ترفعها الی فی امراتک، سعد بار بار آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اپنا تمام مال و متاع خدا کی راہ میں صرف کر دوں، مگر آپ روکتے ہیں تا آنکہ تہائی مال کی وصیت کی اجازت مل جاتی ہے، اس کی وجہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ وارثوں کو غریب و تنگ دست چھوڑنے سے دولت مند رہنے دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

(الف) مکہ مبارکہ ہجرت کے آٹھویں سال فتح ہوا ہے۔

(ب) سورہ بقرہ کی آیت زیر بحث اور نساء کی آیات ۸ سے قبل نازل ہو چکی تھیں۔

(ج) فتح مکہ تک وصیت والی آیت پر مسلمان برابر عمل کرتے تھے۔ کوئی شخص اس کو منسوخ تسلیم نہ کرتا تھا۔ سعد کو وصیت کرنے سے روکتا کہ جب آیت وصیت منسوخ ہو چکی ہے تو تمہیں وصیت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، مگر آپ یہ نہیں فرماتے، بلکہ آپ کا اصرار یہ ہے کہ ثلث میں وصیت کرو، کیونکہ اگر تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر دیا تو اہل و عیال بھوکے رہیں گے۔

پس ان تمام باتوں سے معلوم ہو گیا کہ زمانہ رسالت میں یہ آیت منسوخ نہ تھی اور تمام صحابہ کرام اس کو قابل عمل خیال کرتے تھے، البتہ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب شریعت نے وارثوں کے حصے معین کر دیے ہیں تو پھر یہاں والدین اور رشتہ داروں کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ والدین اور رشتہ داروں کو شریعت کے مطابق حصہ مل گیا، مگر وہ ان کے لئے بالکل ناکافی ہے، بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے تو اس صورت میں اگر مرنے والا ان میں سے کسی کے لئے وصیت کر جائے تو شریعت اس کو پسند کرتی ہے۔ یا بعض اوقات یہ لوگ وارث نہیں بن سکتے، مثلاً وہ کافر ہیں تو ایسی حالت میں بھی ان کے لئے وصیت کر جانا شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہو گا۔ چنانچہ ابن عباس، حسن، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار کا یہی مذہب ہے۔

ارباب تقویٰ کے لئے یہی مناسب ہے کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کا خیال رکھیں۔ کوئی شخص وصیت میں تغیر و تبدل کرنے کا مجاز نہیں، البتہ اگر وصیت کرنے والے نے حق تلفی کی ہو اور جائز وارثوں کو محروم کر دیا ہو تو حاکم اس میں مناسب تبدیلی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر بدلنے میں حکومت سے نادانستہ غلطی ہو گئی تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف کر دے گا۔ پس اگر وقف خلاف مصلحت ہے تو اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت

تدبیر منزل کا جس قدر قانون بیان کیا گیا ہے بظاہر اس کا تمام تر تعلق دنیا ہی سے معلوم ہوتا ہے ممکن ہے۔ بعض لوگ اس میں اتنا شغف اور انہماک پیدا کر لیں کہ اپنی زندگی کے اصلی مقاصد کو بالکل فراموش کر دیں، صرف اسی کو اپنا حقیقی مقصد قرار دے اور خیال یہ ہو کہ اپنے نصب العین کے کسب و حصول کی خاطر یہ تمام جدوجہد ہو رہی ہے، اس لئے ضروری ہو کہ ان کی توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے تاکہ یہ حقیقت ان کے سامنے رہے کہ تدبیر منزل کے ابتدائی فرائض کے علاوہ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

جب ایک شخص اپنے گھر والوں کے نان و نفقہ اور باقی تمام ضروریات زندگی کا ذمہ دار و کفیل ہے اور اس چار دیواری میں فرماں روائی کر رہا ہے تو اس کا صرف یہی فرض نہیں کہ اپنی اولاد کے لئے روپیہ کمائے، بلکہ اس سے یہ بھی سوال ہو گا کہ جن لوگوں کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی، ان کی مذہبی تعلیم کا کیا انتظام کیا اور مذہب سے وابستگی پیدا کرنے کے لئے کونسے اسباب فراہم کئے؟ الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ آئندہ آیات میں

مذہبی تعلیم کی نشرو اشاعت کی جانب توجہ دلائی جائے گی، مگر اس بحث پر گفتگو کرنے سے قبل ان باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(الف) ہر قوم کے لئے سال بھر میں جشن و مسرت کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی دن مقرر ہوتا ہے، اس روز وہ اپنی شادمانی کا اظہار کرتی اور ضروریات زندگی سے آزاد رہتی ہے۔ اس دن کو عید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس تاریخ میں یا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی اعلیٰ ترین نعمت نازل کی تھی یا اسے کسی شدید ترین عذاب سے نجات دی تھی۔ یہود و نصاریٰ مشرک و مجوس اور دوسرے مذاہب صرف ان ایام میں عید مناتے ہیں جن میں وہ کسی خاص نعمت و کرامت سے سرفراز کئے گئے ہوں۔ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی والی آیت ہم پر نازل ہوتی تو اس روز کو ہم عید مناتے۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن خوب یاد ہے جس روز اس کا نزول ہوا اور وہ دن ہمارے لئے شریعت نے عید مقرر کر رکھا ہے اور وہ یوم الجمعہ ہے۔

رمضان میں قرآن کا نزول ہوا، جس نے تمام دنیا کو امن و سلامتی اور آزادی کا پیغام دیا، جس نے دنیا و آخرت کی بادشاہی کا اعلان کیا اور جس نے امت مسلمہ کو شہداء علی الناس کا مژدہ جاں فزا سنایا، پھر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے اور کونسا دن مسرت و شادمانی کا ہو سکتا ہے؟ دنیا کے جملہ مذاہب کا روئے سخن اپنی ہی مخصوص قوموں کی طرف رہا، اس لئے ان کے پیروکار صرف ایک ہی روز عید کرتے رہے۔ مگر قرآن کی دعوت عالمگیر ہے۔ تمام اقوام عالم اس کے مخاطب ہیں اور اس کے اتباع دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے پورا ایک مہینہ عید کے لئے مقرر کیا گیا، تاکہ نزول قرآن کی تذکار قائم رہے۔

(ب) ان ایام عیش و نشاط میں مسلمانوں کو زیادہ کام کرنے اور روزی کمانے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ان کا بیشتر حصہ اسی مسرت و شادمانی میں صرف ہوگا۔ لیکن اگر محض عید ہی رہتی تو ممکن تھا کہ لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر بد عملی و بطالت کے مرتکب ہوتے اور آخر تمام قوم فنا ہو جاتی، اس لئے خوشی کے ساتھ ساتھ ایک عبادت بھی لازم کر دی گئی تاکہ تدبیر منزل میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کی ملکیت اور روحانیت میں جس قدر کمی ہو گئی ہے اس طرح پوری ہو۔ اور اپنی اصلی حالت پر عود کر آئے۔ ان ایام فراغت میں قرآن پڑھو، گھر والوں کو تعلیم دو اور اگر اتنی قابلیت نہ ہو تو دوسروں سے سنو اور بال بچوں کو سننے کے لئے لے جاؤ۔

(ج) اندیشہ تھا کہ چونکہ رمضان میں ضروریات ایک حد تک خود بخود کم ہو گئی ہیں، کھانا بھی صرف دو ہی مرتبہ کھایا جاتا ہے، کہیں بخل و امساک کا مرض لوگوں میں نہ پیدا ہو جائے جس سے قومی ترقی رک جائے گی، اس لئے رمضان کے آخر میں صدقۃ الفطر لازم کر دیا گیا۔

## روزہ کی فریضیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

”مسلمانو! تم پر روزے ایسے ہی فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

”صوم“ کے معنی لغت میں مطلق امساک کے آتے ہیں، خدا نے مریم کو حکم دیا کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہارے پاس آئیں اور بات چیت کرنے کے آرزو مند ہوں تو یہ جواب دینا: اِنِّی نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اَکَلِمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (مریم: ۲۶) یعنی میں نے آج کلام نہ کرنے کا روزہ رکھا ہے، مگر شریعت نے اس لفظ صوم کو بھی مخصوص معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی الصوم فی الشہار عبارة عن الامساک عن الاکل والشرب والجماع فی وقت مخصوص وهو من طلوع الفجر الی غروب الشمس مع النیة، طلوع فجر سے غروب آفتاب تک طعام و شراب اور لذت جماع سے پرہیز کرنے کا نام روزہ ہے۔

دنیا کی ہر قوم میں روزہ رکھنے کا دستور ہے۔ عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجہ قہر و استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن کا روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ عیسائیوں میں روزہ رکھنے کا قانون تھا، مگر انہوں نے کفارہ کی آڑ پکڑی اور تمام اعمال صالحہ سے الگ ہو گئے۔ روزوں کے متعلق کتاب مقدس کی حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: ”اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کر کے آخر کو اسے بھوک لگی“ (۴:۲) دوسری جگہ آیا: ”اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اوداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ، وہ اپنا اجر پانچے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو، تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے، اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا“ (متی ۶: ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳) اور انہوں نے اس سے کہا کہ یوحنا کے شاگرد اکثر روزہ رکھتے اور دعائیں مانگا کرتے ہیں اور اس طرح فریسیوں کے بھی، مگر تیرے شاگرد کھاتے پیتے ہیں، یسوع نے ان سے کہا، کیا تم برائیوں سے جب تک دلہا ان کے ساتھ رہے روزہ رکھو سکتے ہو؟ مگر وہ دن آئیں گے اور جب دلہا ان سے جدا کیا جائے گا تب ان دنوں میں وہ روزہ رکھیں گے۔“ (لوقا ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴)

لعلکم تتقون۔ میں روزہ کی حقیقت اور اس کے فلسفہ کو واضح کیا کہ اس سے صحت و تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ غریب لوگوں کی حالت سے اُمرا عملی طور پر باخبر ہوتے ہیں، شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دینے سے قوم میں مساوات کے اصول کو ترقی ہوتی ہے، قوائے ملکیہ میں قوت، اور حیوانی خواہشوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ خدا تر سی کی طاقت انسان کے اندر محکم و استوار ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ سخت پیاس لگ رہی ہے، تنہا مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہے، مگر نہیں پیتا۔ روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس کرتا ہے، کھانا



موجود ہے، دیکھنے والا کوئی نہیں، مگر نہیں کھاتا، دل پسند بیوی پاس بیٹھی ہے۔ محبت کے جذبات دونوں میں موجزن ہیں، لیکن وہ اس سے احتراز کرتا ہے، اس لئے کہ خدا کے حکم کی عزت و حرمت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ اب کوئی دوسری قوت اس پر غالب نہیں آسکتی اور جب اس نے خدا کے حکم سے جائز حلال اور پاکیزہ خواہشات کو چھوڑنے کا اپنے آپ کو عادی بنالیا ہے تو حرام، ناجائز اور مکروہ عادتوں کے چھوڑنے میں اسے کوئی دقت محسوس نہ ہوگی۔ یہی وہ اخلاقی پاکیزگی ہے جس کا روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا شرع کا مقصود اصلی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: من لم یدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه، "اگر ایک روزہ دار جھوٹ کہنا، لغو بکنا اور فضول کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑ دینے کی پروا نہیں۔" دوسری حدیث میں آتا ہے: اذا كان يوم صوم احدكم فلا یفث ولا یضرب فان سابه احد فلیقل انی امرعصائم، "جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے تو نہ کوئی بیہودہ لفظ زبان سے نکالے اور نہ شور و شغب کرے اور اگر کوئی شخص اس کو گالی دے تو کھدے میں روزہ دار ہوں، گالی دینا اور جھگڑنا مجھے شایان نہیں۔"

تقویٰ و طہارت، ورع و پاکیزگی اور توبہ و انابت الی اللہ کا ذریعہ یہی روزہ ہے۔ عزم و استقلال، صبر و تحمل اور ثبات قدم اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ جنگ میں کامیابی کا ذمہ دار یہی ہے اور اسی لئے ہرمان طاقت چلتے چلتے نہر کے کنارہ پر رہ گئے، کیونکہ انہیں روزہ کی عادت نہ تھی، سفر کی تکالیف، بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت نہ کر سکے اور اس لئے طاقت نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

### صدقۃ الفطر

اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا اَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اٰخَرَ ۚ وَعَلَىٰ الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِيْنَ ۚ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ ۚ وَاَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِن كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۰﴾

”وہ گنتی کے چند دن ہیں پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا سفر میں تو دوسرے دنوں سے شمار پورا کر دے اور جو لوگ کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہوں ان پر ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے اور جو شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے تو یہ اس کے حق میں

بہتر ہے اور تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“

”وَعَلَىٰ الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِيْنَ“ سے اکثر لوگ مختلف شبہات میں پڑ گئے اور غلط راہ اختیار کر لی، حالانکہ مطلب بالکل صاف تھا اور یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ انہوں نے روزہ کی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور یہ سمجھ گئے کہ شریعت کے احکام بغیر کسی علت اور مصلحت کے ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ”فِدْيَةُ طَعَامِ مَسْكِيْنَ“ مبتدا مؤخر ہے اور ”عَلَىٰ الَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهُ“ اس کی خبر مقدم، طعام مسکین، فدیہ سے بدل واقع ہو رہا ہے اور یطیقونہ کی ضمیر طعام مسکین کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ روزہ ایک مستقل عبادت ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر چند اخلاق فاضلہ پیدا ہوں، لیکن بالکل ممکن ہے کہ باوجودیکہ روزہ اصلی معنوں میں رکھنے کی کوشش کی جائے اور پھر بھی کسی نہ کسی قسم



کی کوتاہی سرزد ہو اور ہمیں اطلاع تک نہ ہو۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ روزہ کی وجہ سے ہمارے مصارف تو ویسے ہی کم ہو گئے ہیں، کچھ اور زیادہ کفایت شعاری کریں اور پھر آہستہ آہستہ بخیل بن جائیں۔ ان امراض کو روکنے کے لئے شریعت نے یہ لازم کر دیا کہ ارباب دولت و ثروت روزہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی اللہ کے نام پر دیدیا کریں تاکہ بخل کا مرض نہ پیدا ہو۔

لیکن اگر یہی حکم رہتا کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا دیدیا کرو تو رمضان میں دگنی محنت کرنی پڑتی۔ تمام دن کام میں مصروف رہنا پڑتا اور قرآن میں غور کرنے کا موقع نہ ملتا، اس لئے شریعت نے یہ قانون بنا دیا کہ رمضان ختم ہوتے ہی عید کی نماز پڑھنے سے پہلے فقر و مساکین میں تقسیم کر دو۔ چاہئے تو یہی تھا کہ ہر روزہ کے مقابلہ میں ایک مسکین کا کھانا دیا جاتا، مگر شارع نے اس کثرت کا یہ علاج کیا کہ: ان رسول اللہ ﷺ فرض زکوٰۃ الفطر صاعاً من تمر و صاعاً من شعیر علی کل حرا و عبد ذکرا و انثی من المسلمین، ہر ایک صاحب استطاعت مسلمان اپنے اہل و عیال، بال بچوں اور لونڈی غلام کی جانب سے صدقۃ الفطر ادا کرے۔

اس صورت میں کثرت بھی محفوظ رہی اور فرض بھی ادا ہو گیا۔ قاعدہ تو یہی ہے کہ وہ صدقۃ الفطر ایک مسکین کا کھانا ہو لیکن اگر ایک شخص اس سے زیادہ صرف کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بلکہ یہ اس کے حق میں مفید ہو گا۔

بیشک روزہ رکھنا مشکل کام ہے، مگر تمہارے لئے یہی بہتر ہے کیونکہ جو طہارت و پاکیزگی اسلام کے پیش نظر ہے اس کے بغیر تم میں نہیں پیدا ہو سکتی اور آئندہ ارتقائے ملت کے لئے تمہیں جس قدر تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا ان کے لئے ابتدا ہی سے تیار رہنا ضروری ہے، کہ عادت پڑ جائے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٨﴾

”رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور فرقان کی کھلی کھلی باتیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ ضرور روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو گنتی کے دوسرے دن پورے کر لے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی نہیں کرنا چاہتا اور تاکہ تم لوگ اس شمار کو پورا کرو اور اس بات پر اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“

جس ماہ مقدس میں تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ، وہ یہی رمضان کا مہینہ ہے۔ اسی میں قرآن کا نزول ہوا، جس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(الف) نوع انسانی کے لئے سرچشمہ رشد و ہدایت ہے۔

(ب) ہدایت و رہنمائی کے وہ اصول و ضوابط جو نظر و فکر کے محتاج ہیں، قرآن حکیم نے ان کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے ان کو سمجھ لیتا ہے۔

(ج) جو لوگ اس کتاب عزیز کے درس و مطالعہ میں مصروف ہوں ان کی قوت فیصلہ اور زیادہ زبردست ہو جاتی ہے، حق و باطل میں تمیز کرنے لگ جاتے ہیں، علمائے سواور جاہل صوفیوں کے دھوکے میں نہیں پھنستے۔

یہ ماہ مقدس قرآن حکیم کے نزول کی سالگرہ کا مہینہ ہے، دوسری جگہ آیا: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ** (القدر) سورہ دخان میں اس کی نسبت فرمایا: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ** **إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ** ﴿۱﴾ **فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ** ﴿۲﴾ (الدخان ۴، ۳) ان دونوں آیتوں سے مراد یہی ہے کہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا، اس لئے ہر وہ مسلمان جو اس مہینہ میں زندہ ہو ضرور روزہ رکھے کہ جشن و مسرت کا اظہار ہو۔ البتہ مرض اور سفر کی حالت میں رخصت دی جاسکتی ہے کہ بعد کو اس کی کوپورا کر لیا جائے۔ ایک طالب علم کا فرض تو یہی ہے کہ باقاعدہ کالج میں حاضر ہو، لیکن اگر کسی ضرورت سے نہ آسکے تو اسے گھر پر سبق کو تیار کرنا ہو گا تا کہ باقی طالب علموں کے ساتھ درس میں شریک ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کسی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بلکہ وہ تمہاری سہولت و آسانی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سفر اور مرض میں رخصت دیدی۔ اگر غور سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا، تم اس پر عمل کر کے دائمی زندگی حاصل کر لو گے۔ اس تکلیف کے برداشت کرنے سے تمہارے لئے صد ہا سہولتوں اور آسانیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ پس اس کو تکلیف کون کہے گا؟ جس کا نتیجہ فضیلت علی العلمین اور خلافت ارضی ہو۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جو صرف تمہارے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور اس پر تم جس قدر بھی اس کی تجید و تقدیس بیان کرو کم ہے۔

اس قانون پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم میں عملی قوت پیدا ہو جائے گی، تمہاری مخفی قوتیں منصفہ شہود پر جلوہ افروز ہوں گی، جوش و ولولہ عمل پیدا ہو گا۔ قرآن کو اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا بھر میں اس کی نشر و اشاعت کرو گے اور کوئی بڑی سے بڑی قوت تمہاری راہ میں مزاحم نہ ہوگی۔

ممکن ہے دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے قرآن کی تلاوت نہ ہو سکے، اس لئے شارع نے رات معین کر دی کہ کھانے پینے سے طبیعت سیر ہو جائے گی، دن بھر جس قدر قوتیں مضحل ہو چکی ہیں عود کر آئیں گی اور رات کو اطمینان کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ آپ نے فرمایا: ”من قام رمضان ایامنا واحتسا باغفرله ماتقدم من ذنبه“۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ رمضان کے ایام میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے اور وفات کے قریب آپ نے دو مرتبہ دور کیا۔ گویا اگر ایک شخص رمضان میں ایک مرتبہ قرآن سن لے تو اس نے نصاب پورا کر لیا۔

## روح مذہب کی پابندی

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ

(۷۷)

”اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو میں ان کے قریب ہی ہوں۔ جب کبھی مجھ سے کوئی دعا کرے تو ہر دعا کر نیوالے کی درخواست کو میں قبول کرتا ہوں، پس انہیں چاہئے کہ میرے احکام مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ رشد و ہدایت حاصل کریں۔

گذشتہ آیات میں قانون کی ظاہری شکل و صورت پر زور دیا گیا کہ اس کی پابندی کے بغیر کوئی جذبہ صادقہ نہیں پیدا ہو سکتا، اب اس کی حقیقت و اصلیت کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر محض اشکال و صورت پر نظر ہو اور مقصد کی جانب سے غفلت و بے اعتنائی اختیار کی جائے تو نتائج و ثمرات کے نکلنے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ قرآن نے اس موضوع پر مختلف درس دیئے ہیں، مگر سورہ تکوین کا اثر ایک جامع و حاوی درس ہے۔ لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤہا ولکن ینالہ التقویٰ منکم میں اسی طرف اشارہ ہے۔

مذہب کی روح و حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے کٹ کر صرف ایک اللہ کا ہو کر رہے۔ اسی سے اپنی ہر مراد مانگے اور اسی کے آگے دست سوال دراز کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذہیت ۵۶) اس کی زندگی اور موت اس کا اقدام و ادب اور اس کی عبادت اور قربانی اسی کے لئے ہو، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) ایام رمضان میں روزوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چونکہ ان ایام میں قرب الہی کی راہیں کھل جاتی ہیں، اس لئے تم خدا سے دعا کرو، تَنْزِيلُ الْمَلَكَةِ وَ الزُّلُومُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ﴿۵﴾ سَلَّمَ (القدر ۵۳)، سورہ دخان میں اسی لیلہ مبارکہ میں قرآن حکیم کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶﴾ (الدخان ۶) حدیث میں آتا ہے: ینزل ربنا کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یتیقی ثلث الدلیل بالاخر فیقول من یدعون فاستجب لہ من یسألنی فاعطیہ ومن یستغفرنی فاغفر لہ، ”ہر شب کے آخری ثلث میں خداوند قدوس آسمان دنیا پر نزول اجلال فرما کر اعلان کرتا ہے، کوئی مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا کو استجاب بخشوں، سوال کرنے والا کہ اس کو نوازش کروں اور طلب مغفرت کے لئے کوئی مضطرب روح کہ اس کو تسکین دوں۔“

تمام مذاہب و ادیان کی اصل و اساس یہی دعا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانہ کے نیک لوگوں اور راست بازوں نے اپنے مقاصد مہمہ محض اس دعا کی بدولت حاصل کئے ہیں، جب تمام ظاہری اسباب و وسائل ناکام رہے تو دعائے گرہ کشائی کی اور ان کی تمام تکالیف و مصائب دور ہو گئیں۔ انبیائے کرام کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الدعاء مخ العبادۃ، ”دعا حاصل عبادت اور عصارہ بندگی ہے۔“ دوسری روایت میں آیا کہ: الدعاء هو العبادۃ، مگر

اس کے متعلق حسب ذیل امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(الف) دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہم اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دعا بھی ان میں سے ایک سبب ہے، اس کی بدولت بعض ایسے آسان و سہل ترذریعوں کی اطلاع ہو جاتی ہے جو اب تک ہم پر مخفی تھے۔

(ب) ہم اللہ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کر کے دعا مانگتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ہر دعا قبول ہو، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس دعا کی قبولیت ہمارے حق میں مضر ہو۔ ایک جگہ فرمایا: بَلْ اِتَاٰكَ تَدْعُوْنَ فَيَنْكُشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ (الانبیاء ۴۱) حدیث میں آتا ہے: ما من احد يدعوا لالا اتاه الله ما سال او كف عنه من السوء مثله ما لم يدع باثم او قطعية رحم، “جب تک ایک شخص کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے، جو مانگتا ہے اس کو دیتا ہے یا اس سے کسی برائی کو روکتا ہے، ابو داؤد نے سلمان سے روایت کیا ہے: ان ربکم محی کریم یستجی من عہدہ اذا رفع الیہ یدیہ ان یردہما صفرا خالیین، “اللہ تعالیٰ اس درجہ باحیا اور کریم ہے کہ وہ کسی دعا کرنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہتا۔“

مگر قبولیت دعا کے لئے شرط یہ ہے کہ قلب غافل اور بے پروا دل نہ ہو۔ ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے: ادعوا للہ واتم مواظبتہ بالاجابتہ، واعلموا ان اللہ لا یرد دعا من قلب غافل لاه، ایک اور حدیث میں آتا ہے: یرد دعا من لا یستجیب دعا من قلب غافل لاه، ایک اور حدیث میں آتا ہے: یرد دعا من لا یستجیب دعا من قلب غافل لاه۔

(ج) بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا غلط ہے کہ دعا کا کوئی فائدہ نہیں، ہم حالت مرض میں دوا کا استعمال کرتے ہیں، بسا اوقات دوا مفید نہیں ہوتی مگر علاج ترک نہیں کرتے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دعا قبول نہ ہونے پر اس کو ترک کر دیا جائے۔ ترمذی میں ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں: من لم یسأل اللہ یرد علیہ۔

(د) اگر ہم کسی کو بتانا چاہیں کہ کھیتی کس طریق پر ہوتی ہے؟ اور پودے کس طرح پھل دیتے ہیں؟ تو اس کو مخصوص موسم ہی میں دکھائیں گے۔ ایسے ہی دعا کے بھی آداب و مراسم اور خاص مواقع ہیں جن میں اس کو شرف اجابت بخشا جاتا ہے۔ گذشتہ روایات میں بعض شرطوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ اسی ذیل میں ایک اور حدیث بھی پیش نظر رکھ لیجئے! من ساء ان یرد دعا من عند اللہ عند الشدائد والکرب فلیکثر الدعاء فی الرخاء۔ جو شخص تکالیف و مصائب کے وقت اجابت دعا کا آرزو مند ہے، وہ فراخی و فارغ البالی کے ایام میں خوب دعا کرے۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے نے بتا دیا کہ ہمارے قانون کی کامل فرماں برداری کرو گے تو دعا ضرور قبول ہو کے رہے گی۔

## اتباع قانون

روزہ کے دو مقاصد کا تذکرہ گذشتہ آیات میں کیا گیا ہے، اب تیسرے مقصد قانون کی پابندی پر بحث کی جاتی ہے۔ جو قانون صحیح اس کو دیا جائے بلاچوں و چر اس پر عمل کرنے کو تیار ہو، تاکہ بد نظمی نہ ہونے پائے۔ اس جذبہ کی تربیت اور

مکمل حسب ذیل احکام سے کی جائے گی۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُمْ وَأَنْبِغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُوا الصِّيَامَ إِلَى الْآيِلِ وَلَا تَبَاشِرُوهُمْ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْزُبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِنَاسٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۵﴾

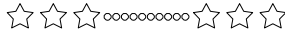
”روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا تمہارے لئے حلال کیا گیا۔ وہ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ اس بات کو جانتا تھا کہ تم اپنے آپ کو خیانت میں مبتلا کرتے تھے تو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہارے گناہ کو معاف کر دیا تو اب ان سے مباشرت کرو اور جو خدا نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے اس کو تلاش کرو اور جب تک تمہیں سفید خط صبح سے سیاہ خط سے متمیز ہو جائے اس وقت تک کھاؤ اور پیو، پھر رات تک روزہ پورا کیا کرو اور جس زمانہ میں تم مسجدوں میں اعتکاف کر رہے ہو اس وقت اپنی بیبیوں سے مت ملنا، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب بھی نہ جانا، اسی طرح اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔“

اگر روزوں میں مشکل ترین احکام کی پابندی کا اپنے آپ کو عادی بنالیا تو پھر خواہ کیسا ہی سخت سے سخت اور دقت طلب قانون دیا جائے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ مسلمانوں کو دنیا بھر میں حق و صداقت کی نشر و اشاعت کرنی ہے، ہر قوم ان کی مخالفت کرے گی اور ان کے فنا کرنے کی فکر میں رہے گی، ان مخالفین و معاندین کے تباہ و برباد کرنے کے واسطے خود مسلمانوں کو بھی تیار رہنا ہوگا۔ اس جنگی جذبہ کو بھڑکانے اور تیز کرنے کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوگی کہ خوب موٹے تازے ہوں اور تو مند سپاہی بن جائیں، لیکن اگر قوت پیدا ہوگئی اور نکاح نہ کیا تو شدید ترین خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زنا اور لواطت کی طرف رخ کریں گے یا یہود و نصاریٰ کی طرح رہبانیت کو اختیار کریں گے اور ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ماہ رمضان میں شب کے وقت تم اپنی عورتوں کے پاس جاسکتے ہو، اس سے

ایک تو تمہارے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے گا اور دوسرے اپنی ظاہری وجاہت اور زیب و زینت کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جب تک اللہ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہ ہوتا، رسول اللہ ﷺ اہل کتاب کا اتباع کیا کرتے تھے، چنانچہ نزول رمضان سے قبل مدینہ میں آپ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ نصاریٰ کا روزہ آٹھ پہر کا ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی عادت تھی کہ عشاء کی نماز تک کھاپی لیتے اور عورتوں کے پاس بھی چلے جاتے تھے، اس کے بعد وہ ان تمام چیزوں کو حرام سمجھتے، مگر یہ حکم نہ تھا۔ اس لئے اللہ نے ان کی طرف نظر رحمت کی اور کھول کر فرما دیا کہ رات کو کھانا پینا اور عورتوں کے پاس جانا جائز ہے اور اس مباشرت سے مقصد یہ ہے کہ اولاد پیدا کرو تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں ترقی ہو اور تمہارے مقاصد حیات کی تکمیل۔

آگے چل کر کھانے پینے کے اوقات معین کر دیئے اور بتا دیا کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتے۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ: ”یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے سفید اور سیاہ رنگ کی رسیاں لے کر اپنے تنکے کے نیچے رکھ لیں کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گی تو سمجھ لوں گا کہ وقت ہو گیا“، آپ نے فرمایا کہ: ”اس سے تاریکی شب اور سپیدہ صبح مراد ہے“: انما ذلك سواد الليل وبياض النهار، ”البتہ ایام اعتکاف میں رات کے وقت بھی عورتوں کے پاس نہیں جاسکتے۔“

یہ حدود الہیہ ہیں، ان کے قریب جانے کا خیال بھی دل میں نہ آئے، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ ان کا قرب و اتصال بتدریج حدود کے توڑنے کی دعوت دے اور تم گناہ میں مبتلا ہو جاؤ، اس لئے دور ہی رہنا اسلم و احوط ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ان لكل ملك حى وان حى الله محارمه فمن رتم حول الحى يوشك ان يقيم فيه، ”ہر بادشاہ کی حى ہوتی ہے، اللہ کی حى<sup>۱</sup> وہ فواحش و منہیات ہیں جن کے ارتکاب سے اس نے منع فرمایا ہے۔ جو شخص اس کے گرد پھر گیا عجب نہیں کہ اس میں داخل بھی ہو جائے۔“ اللہ نے ان قوانین کو شرح و بسط سے بیان کیا کہ لوگوں میں صلاح و تقویٰ پیدا ہو اور قوم بد عملی و بد کرداری سے محفوظ رہے۔



• سلاطین و امرا کا دستور ہے کہ وہ حکمران کی خاطر جنگل کے ایک حصہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں، اس میں کسی دوسرے شخص کو شکار کی اجازت نہیں ہوتی، اسی مخصوص رقبہ کو عربی میں حى کہتے ہیں۔

## باب نمبر ۵

## معاملات

تدبیر منزل میں صرف ایک گھر کی اصلاح پیش نظر تھی، لیکن انسان کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ وہ فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، مل کر رہنا اس کا طبعی تقاضا ہے۔ جب چند آدمی مل کر رہیں گے تو تقسیم عمل کے اصول کے مطابق ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے مناسب کام اختیار کر لے گا اور اس طرح ایک دوسرے کی ضروریات میں مدد دیں گے۔ آپس میں مبادلہ اشیاء کریں گے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ معاملات باہمی اور لین دین کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا جائے جو زندگی کے ہر شعبہ میں دلیل راہ و مشعل ہدایت کا کام دے سکے، فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور ان کو حکام کے پاس اس لئے نہ لیجاؤ کہ لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ذریعہ کھاؤ اور تم جانتے ہو کہ حقیقت حال کیا ہے۔“

قانون بنانے کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں:

(الف) جھگڑے کثرت سے پیدا ہوں، عدالت کو مداخلت کا موقع ملے اور حکومت کی جانب مرافعہ کرنے کے لئے لوگ مجبور ہوں، اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدع و فریب کا دروازہ کھل جاتا ہے، کذب آفرینی میں ترقی ہوتی ہے اور جھوٹے مقدمات سے عدالت کو فرصت نہیں ملتی ❶۔

(ب) جہاں تک ممکن ہو لوگوں میں جھگڑے کم ہوں، اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ پہلے قوم کے اندر صحیح کریکٹر پیدا کیا جائے، ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہو اور احتساب اعمال کا خوف دل میں ہو، اس صورت میں ہر معاملہ کا فیصلہ ان کی دیانت اور لمانت پر چھوڑ دیا جائے گا۔ حکومت کو صرف خاص خاص حالتوں میں مداخلت کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ قرآن حکیم یہی چاہتا ہے اور اس کا قانون یہی مقصد عظمیٰ پیش نظر رکھتا ہے۔

اس ایک آیت میں قرآن نے دراصل ان تمام مباحث اور فقہی مسائل کو بیان کر دیا جو کتب فقہ کے صداہا اوراق میں بھی نہ سما سکے۔ قرآن نے روزوں کو فرض کیا کہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے وہ حرام چیزوں کو ترک

❶ یورپین اقوام کا طرز حکومت اسی قسم کا ہے، جہاں ان کا قدم جاتا ہے ہر قسم کی بد اخلاقی وہاں نشوونما پاتی اور رعایا کو تباہ کرتی ہے۔

کرنے کی اپنے اندر عادت پیدا کریں، تاکہ آئندہ ناجائز طریق سے حاصل کیا ہوا مال ان کے نزدیک حرام ہو اور اس سے پرہیز کریں۔

متبادلہ اشیاء ہونے لگے اور خرید و فروخت کی صورت ہو تو ظلم و جور سے کسی کامال کھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اکل المال بالباطل کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: لوٹ مار کر کے وصول کرنا، قمار بازی، گانے بجانے کی اجرت، شراب کی قیمت اور کھیل کود سے روپیہ حاصل کرنا، رشوت لینا اور جھوٹی گواہی دینا، امانت میں خیانت کرنا اور اسی قسم کی صورتیں بیان کی جاسکتی ہیں، ام سلمہ کہتی ہیں کہ، ایک مرتبہ آپ نے اپنے صحیحہ کے دروازہ کے قریب لوگوں کو جھگڑتے سنا تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: انا انا بشرا وانه ياتيني الخصم فلعل بعضهم الحن بحجته من بعض فاحسب انه صادق فاقض له فمن قضيت له بحق مسلم فانما هي قطعة من النار فليصلها او يذرها۔

”میرے پاس مقدمہ آتا ہے، مدعی اپنی چرب زبانی سے دعویٰ ثابت کر دیتا ہے حالانکہ حق دوسری جانب ہوتا ہے۔ میں اس بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ نافذ کرتا ہوں، مگر وہ یہ سمجھ لے کہ ایک مسلمان کامال ناجائز طریق سے لینا آگ کو لینا ہے۔ اب وہ آزاد ہے اسے قبول کرے یا چھوڑ دے۔ قاضی شریح نے فرمایا: لايسعني الا ان اقضي بها يحضرنى من البيئتين وان قضائي لا يحل لك حراما۔“ شہادت کی بنا پر میں تمہارے حق میں فیصلہ کرتا ہوں، مگر اس بات کو خوب ذہن نشین کر لو کہ میرے حلال کرنے سے وہ چیز حلال نہ ہوگی، جب حرام ہے تو حرام ہی رہے گی۔“

تدو ابھالی الحکام سے مراد یہ ہے کہ رشوت دیکر کسی کامال نہ کھاؤ، جھوٹے مقدمے نہ بناؤ اور جھوٹی گواہی نہ دو۔

قمری حساب ہو

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٦﴾

”اور تم سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو، کہ لوگوں کے معاملات اور حج کے اوقات اس سے معلوم ہوتے ہیں اور گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آنا نیکی نہیں، بلکہ نیکی یہ ہے کہ ایک شخص تقویٰ اختیار کرے اور دروازوں میں سے ہو کر گھروں میں آئے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

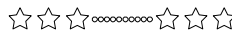
تدبیر منزل کے احکام بیان کر دیئے گئے، فصل خصوصیات کا قانون بھی مرتب ہو گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ تبادلہ اشیاء اور لین دین کے جس قدر معاملات ہوں گے، ان کے حساب کتاب کن ہنسیوں کے مطابق ہوا کرے گا: شمسی یا قمری؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شمسی حساب میں بڑی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اگر طلوع و غروب کے لحاظ سے اس میں معمولی سا تغیر ہوتا ہے تو عام نظریں اس کو محسوس نہیں کر سکتیں، اس کے لئے اعلیٰ ترین محاسبوں کی ضرورت ہے، جنہوں کے بغیر کام نہ چل سکے گا اور ایسے دیہات و قصبات بکثرت ملیں گے جہاں کے لوگ تہذیب و تمدن کے نام سے نا آشنائے محض ہوں گے، وہاں عمدہ ترین حساب



دانوں کا ملنا تکلیف سے خالی نہ ہوگا، اس لئے مسلمانوں کے واسطے قمری حساب مناسب رہے گا۔ ان کا مذہب عالمگیر ہے اور تمام اقوال عالم کی طرف اس کا روئے سخن ہے۔ چاند کی شکلوں میں جلد تخیل جلد تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ہر تعلیم یافتہ اور جاہل اس فرق کو دیکھ کر اوقات معین کر سکے گا اور وہی تغیرات ضبط اوقات کا کام دیں گے۔ چنانچہ امت مسلمہ کے مؤسس اوّل ابراہیم نے قمری حساب کے مطابق حج کے ایام مقرر کئے ہیں۔ اگر حساب شمسی ہوتا تو اس میں یہ بھی ایک تکلیف رہتی کہ رمضان و حج کے جو اوقات مقرر ہو جاتے وہی رہتے، ان میں تغیر و تبدل نہ ہو سکتا، اگر ایک قوم اس دوام کی وجہ سے آرام میں ہوتی تو دوسری کو مصیبت برداشت کرنی پڑتی۔ اب قمری حساب کے بموجب سال بھر کے مختلف موسموں میں ان فرائض کو ادا کرنے کا موقع ملے گا اور ہر قوم ان سے بہرہ اندوز سعادت ہو سکے گی۔

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ احرام حج باندھنے کے بعد گھر میں جانا ممنوع خیال کیا جاتا تھا، اس لئے پشت کی جانب سے نقب لگا کر اندر آ جاتے اور اس کو باعث ثواب خیال کرتے۔ خدا نے کہا، یہ لغو اور مہمل حرکت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام محرمات الہیہ سے پرہیز کرو، خدا کا خوف دل میں رکھو اور پھر اگر تم دروازہ میں سے گھر کے اندر آ گئے تو گناہ کی بات نہیں۔ قرآن حکیم کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایک مثال بیان کر کے اس سے مختلف قسم کے قوانین و ضوابط کا استنباط کرتا ہے۔ سورہ آل عمران میں غزوہ احد کا تذکرہ کر کے صد ہا مسائل کا استخراج کیا، انفال میں صرف غزوہ بدر کو پیش نظر رکھ کر پورا قانون جنگ مرتب کر دیا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان قاعدوں کو اچھی طرح ضبط نہ کر سکیں وہ اس مثال کو خوب ذہن نشین کر لیں، پھر قوانین خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔

شریعت نے جو قانون بنایا ہے اسے گھر تصور کیجئے۔ دستور یہی ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لئے جو دروازہ بنایا گیا ہے، اسی میں سے ہو کر اندر جانا چاہئے۔ اگر ایک شخص اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو گویا وہ مقصد اصلی کو فوت کر رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لئے جو ایام مقرر کئے وہ قمری مہینوں ہی میں آتے ہیں اور ان کا منشاء یہی ہے کہ مسلمان اپنا تمام حساب کتاب چاند پر رکھیں۔ اب جو لوگ اس میں رد و بدل کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل قوم کے نظام صالح کو برباد کرنا اور شریعت کی بلند عمارت کو گرانا چاہتے ہیں۔ کوئی عقلمند اسے نیکی کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتا کہ قانون کے اصول اساسی فتا ہوں، اس کی اصلی شکل و صورت میں تغیر آجائے۔ بلکہ برو احسان اور تقویٰ و طہارت یہی ہے کہ اپنے تعلقات الہیہ کو درست کر لو، امام ملت نے جو قانون بنادیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اگر تم نے اللہ کے قانون کی پابندی کی اور مذہب تمہاری زندگی کی ہر شاخ میں کار فرما رہا تو یقیناً علو و رفعت اور برتری تمہارے ہی لئے ہے۔ کیونکہ اوائل عمر ہی سے گھروں میں ایسی تعلیم دی جائے گی جس سے ایک طرف تو مذہبی جذبات و عواطف فرزند ان اسلام میں راسخ ہوتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ تدبیر منزل کے قانون پر عمل کر کے ملکوں اور قوموں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے، لیکن یہ نتائج و ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں، جبکہ قانون الہی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور اخلاقی السلم کافیہ پر پورا پورا عمل ہو۔

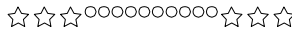


## باب نمبر ۶

## سیاست مدن

گذشتہ اوراق میں جس قدر قوانین و ضوابط بیان کئے گئے ہیں، ان کا تمام تر تعلق مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی سے ہے کہ ان کی داخلی اصلاح ہر اعتبار سے مکمل ہو، جب ہم سب مل کر ایک جگہ رہتے ہیں اور ہماری ضروریات زندگی برابر پوری ہوتی رہتی ہیں تو ہمیں اپنا مقصد حیات بھی معین کر لینا چاہئے، اس لئے کہ مقصد کے بغیر انسان کی تمام زندگی بالکل بیکار ہے۔ گذشتہ تعلیم نے ہم میں حس و بیداری پیدا کر دی ہے۔ اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ نے ہماری حیات انفرادی و اجتماعی کو مہذب و شائستہ بنا دیا ہے۔ تدبیر منزل کے بنیادی اصولوں نے ہمارا رشتہ خدائے واحد کے ساتھ جوڑ دیا ہے، فوجداری اور دیوانی قانون نے اصول مساوات کی بنا پر ہمارے لئے ترقی کی تمام راہیں کھول دی ہیں۔ پس جو قانون اس قدر زندگی بخش ہو، کیوں نہ اسی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و دعوت کو اپنی غایۃ الغایات بنا لیا جائے۔

تمام دنیا جہالت و تاریکی میں مبتلا ہے، اوہام و وسوس کے پنجے میں گرفتار ہے، اصنام و طواغیت اور دجا جملہ کفر و شیطنت کے آگے سرنگوں ہے۔ خدائے واحد کو چھوڑ کر معبودان باطل اور ارباب متفرقون کو اپنا خدا مانتی ہے۔ پس تم مسلمان اس قانون الہی کی نشر و اشاعت کے لئے سر یکف کوشش کرو، اعلائے کلمۃ اللہ تمہارا مقصد حیات ہو، اسی کی سرفرازی و سربلندی کے لئے اپنی ہر متاع عزیز قربان کر دو کہ دنیا میں پھر ایک مرتبہ حق کی روشنی پھیل جائے اور لوگ خدائے واحد کے پرستار بن جائیں۔



## فصل اول جہاں گیری

### کوئی مقام مستثنیٰ نہیں

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥﴾

”جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی ان سے اللہ کی راہ میں لڑو اور زیادتی نہ کرو اور اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

تمام دنیا مسلمانوں کی جولان گاہ ہے۔ کرہ ارضی کے گوشہ گوشہ میں انہیں اسلام کی نشر و اشاعت کرنی ہے کہ خیرامۃ اخراجت للناس کے مصداق حقیقی بن جائیں۔ مگر جس وقت حق و صدق کی دعوت کے لئے نکلیں گے تو دوسری قومیں ضرور ان کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کریں گی کہ ہر ایک میں اپنی زندگی کا عشق اور بقا کی محبت رکھی گئی ہے۔ ”تنازع للبقا“ کا قانون کائنات ارضی کی ہر چیز میں موجود ہے۔ دنیا میں زندہ رہنا صرف ایک مسلم ہی کا حق ہے، اس لئے وہ اصل و اصل ہے، پس مخالفین کو اتنی مہلت ہی نہ دی جائے کہ وہ مبلغین اسلام کے فنا کرنے کی تیاریاں کریں، بلکہ واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ پر عمل پیرا ہو کر انہیں فوراً کچل دیا جائے۔

لیکن یہ تمام تر جنگ و جدل صرف کلمہ حق کی خسروی و نفوذ اور سچائی کی بادشاہت کے لئے ہو۔ قانون الہی کی نشر و اشاعت اور اس کی تمکین فی الارض غایت الغایات ہو، نہ تو حمایت قومی اس کا سبب ہو اور نہ شہرت و ناموری کی بنا پر اس قدر خونریزی ہو۔ دوسری جگہ آیا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ ۱۹۳) ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ غنیمت کی خاطر جنگ کرتے ہیں، بعض کا مطمح نظر شہرت و ناموری ہوتا ہے، کسی کا مقصد عزت و مرتبت ہوتا ہے ان میں سے فی سبیل اللہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا، فی سبیل اللہ اس شخص کو کہا جائے گا جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے لڑتا ہے۔ جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال الرجل يقتل للمغنم والرجل يقتل للذکر والرجل يقتل لیری مکانه فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتكون کلمۃ اللہ ہی العليا فهو فی سبیل اللہ، ابو داؤد نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے: ان رجلا قال یا رسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وهو یتغنی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا جہاد، ”ایک نے آپ سے سوال کیا کہ، ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوتا ہے مگر دنیا کی عزت و کرامت اور جاہ و حشمت کا طالب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ، اسے ذرہ برابر بھی اجر نہ ملے گا۔“

کائنات خلت حضرت ابراہیم کے مقامات ذہاب الی اللہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ انہوں نے قوم اور وطن کو توحید خالص کے لئے قربان کیا تو پیشوائے عالم کے لئے چن لئے گئے، پس یہ تمام تصریحات واضح کرتی ہیں کہ جہاد کی اصلی غرض وغایت صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ مگر جنگ صرف ان لوگوں سے ہو جن سے مخالفت کا اندیشہ ہے یا جو اسلام کو تباہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کو فوراً قتل کر دینا چاہئے، اگر انہیں مہلت دی اور وہ اس درمیان میں آلات حرب سے مسلح ہو گئے تو پھر کامیابی کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ البتہ ان لوگوں سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں جو خطرۃ جنگ کرنے سے عاجز ہیں۔ ان میں لڑنے کی استعداد و قابلیت ہی نہیں اور نہ وہ کسی قسم کی تیاری کر سکتے ہیں۔ اگر ان سے بھی جنگ شروع کر دو گے تو ہماری برکتوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ، عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر ان میں سے کوئی امام کی حیثیت رکھتا ہو اور اس کے وجود پر فتح و شکست کا دار و مدار ہو تو اس کا قتل کرنا سیاسی مصالح کی بنا پر ضروری ہو گا۔ نبی رسول اللہ ﷺ عن قتیل النساع والصبیان، ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: ولا تقتلوا النساع والصبیان والشیوخ والرهبان ولا من اتقى اليكم السلام۔

یہودیوں میں بچے، عورتیں اور بوڑھے سب کے سب تہ تیغ کر دیئے جاتے بلکہ جانوروں تک کو مار ڈالتے۔ کھیت، باغات اور گھروں کا تمام مال و متاع آگ کی نذر ہوتا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ عین انتہائی جوش و غضب کے موقع پر بھی اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور بار بار تقویٰ و طہارت اور عفو و درگزر کی تعلیم دیتا ہے۔ مکہ کی فتح اور حضرت عمر کا داخلہ بیت المقدس صد ہا امثال و نظائر میں سے دو ہیں۔

وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ وَآخَرُ جُوهْمُ مَن حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جِزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٠﴾ فَإِنْ اتَّبَعُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١﴾

”اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے وہاں سے تم انہیں نکال دو اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے اور جب تک وہ لوگ تم سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے نہ لڑو، لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو۔ کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اگر باز آجائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

ایسے مخالفین و معاندین اسلام کو جو ہر وقت تمہارے فنا کرنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں جہاں پاؤ قتل کر دو، ان کو چھوڑ دینا اور مخالفت کا موقع دینا ہر گز قریں عقل و انصاف نہیں۔ جب وہ تمہارے قتل کے لئے ہر مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تو تم انہیں کیوں چھوڑتے ہو۔ ایک جگہ آیا: لَا يَرْجُونَ فِي مَوْتِهِمْ (التوبہ ۱۰) ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: أَلَا تَتَذَكَّرُونَ قَوْمًا نَّذَلْنَاهُمْ وَأَيَّاهُمْ وَهَمَّوْا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ يَدْعُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (التوبہ ۱۳)

بیت اللہ الجلیل کے اصلی وارث مسلمان تھے، اس لئے کہ یہ ابراہیمی ملت کے پابند تھے: إِنَّ أَوَّلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوا وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا (آل عمران ۶۸) مگر کفار نے ان کو وہاں سے نکال دیا اور خود اس پر غاصبانہ قبضہ

کر لیا۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مرکز سے ان کو الگ کر دیں اور اس جگہ کو واپس لے لیں۔ مگر مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ صرف بیت اللہ پر قبضہ کر کے ان کا فرض نہیں ختم ہو جاتا، وہ شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کئے گئے ہیں، وما ارد سلنک الا کافة للناس بشیدا و نذیرا کا طغرائے امتیازی خیر امة اخراجت للناس ان کی خصوصیت کبریٰ ہے۔ دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام آئے، ان کے وارث اصلی اب مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان رسولوں نے اپنی امتوں کے لئے مرکز قائم کئے، مگر کچھ مدت کے بعد ناخلف ان پر قابض ہو گئے۔ اس لئے بیت اللہ کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد ان کا دوسرا فرض یہ ہو گا کہ دنیا بھر میں جس قدر مذہبی مرکز ہیں ان پر بھی قبضہ کر لیں، تاکہ صحیح معنی میں شہداء علی الناس کے مصداق بن سکیں۔

آگے چل کر اس حکم کی علت بتادی کہ بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کتنی بڑی خرابی ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قناعت نہیں کرتے، دوسروں کے حقوق آزادی و حریت اور حکومت و فرماں روائی چھیننا چاہتے ہیں، توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں، اگر اس کے دفع کا انتظام نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ پس ایک بڑی برائی کے دور کرنے کیلئے چھوٹی برائی اختیار کر لینی چاہئے۔ یہ خود قدرت کا عالمگیر قانون اور کارخانہ قدرت کا دائمی عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

جب کبھی انفرادی و اجتماعی اغراض کا تصادم ہو تو ہمیشہ انفرادی فوائد کو قومی مقاصد پر قربان کیا جاتا ہے۔ کلی مصلحت کے مقابلہ میں جزئی مصلحت کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر ایک انسان کا قتل ہونا تمام ملک کے حق میں مفید ثابت ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ پس قتل و قتال اس قدر مذموم نہیں جتنا فتنہ و فساد اور یہ فتنہ بغیر قتال کے فرو نہیں ہو سکتا۔

مسجد حرام میں جنگ کی ابتدا کرنا جائز نہیں کہ کرہ ارضی میں صرف وہی ایک مقام ہے جس کو امن و سلامتی کا گھر بنایا گیا ہے۔ واذ جعلنا البیت مشابة للناس وامناء، البتہ اگر کفار کی طرف سے جنگ کی ابتدا ہو تو اس وقت مسلمانوں کو مجبوراً تلوار ہاتھ میں لینی پڑے گی، پھر یہ استثناء باقی نہ رہے گا۔

کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں

گذشتہ آیات سے دو باتیں ثابت ہو گئیں:

(الف) کوئی جگہ قتال فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔

(ب) کوئی مسلم اپنے آپ کو جہاد سے مستثنیٰ خیال نہیں کر سکتا۔ جو لوگ بیت اللہ میں گوشہ گیر ہوں، ذکر الہی اذکا

مقصد و حید ہو اور شب و روز اسی کی عبادت میں مصروف ہوں، تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق ان کے پیش نظر ہو وہ

بھی جنگ کی شرکت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے، کیونکہ جب خود بیت اللہ ہی میں جنگ شروع ہو جائے گی تو کون ان کی اعانت کے لئے آئے گا، بلکہ انہیں خود اس کے لئے تیاری کرنی پڑے گی اور تسبیح و سجادہ کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ پیچھے اور اراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض کو جو اشعار لکھ کر بھیجے تھے تو وہ رو پڑے تھے اور مان گئے تھے کہ عبد اللہ سچ کہتا ہے۔ اگر یہ بھی تمہارے اطمینان کے لئے کافی نہ ہو تو خود لسان الہی اپنی غیر مشتبہ آواز میں اعلان کرتی ہے: **أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ** (التوبہ ۱۹) اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری سے کسی مسلمان کو مفر نہیں۔

ہاں جب مخالفین اپنی شرارت سے باز آجائیں، اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا ترک کر دیں اور قرآن کی فناسامانی کے لئے خفیہ خفیہ تیاریاں کرنی چھوڑ دیں تو پھر جنگ کی ضرورت نہیں۔ قتل و قتل کا فتویٰ اس صورت میں دیا گیا ہے جبکہ اسلام کے بچاؤ کی صورت نہ رہے۔ دوسری جگہ حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بتادی: **حَتَّى تَضَعُوا أَوْدَاجَهَا** (محمد ۴) ”لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہو جائے۔“ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم ہو جائے، ساری دنیا ایک قوم اور تمام نوع انسان ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کرے۔

**وَلَقَدْ قَاتَلْتُمُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنْ اتَّبَعْتُمُ فَلَاعْدُوَانِ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ** (۵)

”اور ان سے لڑتے رہو تا آنکہ فساد باقی نہ رہے اور ایک خدا کا حکم چلے، پھر اگر باز آجائیں تو سوائے زیادتی کرنے والوں کے اور کسی کے ساتھ سختی نہیں۔“

حضرت عبد اللہ بن عمر نے فتنہ کے متعلق بیان کیا ہے: الاسلام قلیلاً فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوا واما یعذب بوجہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام کمزور و ناتوان تھا تو دشمنان دین و ملت مسلمانوں کو فنا کرنے کی فکر میں رہتے، مگر جب اسے حکومت و سلطنت نوازش کی گئی اور اسے تمکین فی الارض حاصل ہو گئی تو اب کسی مخالف میں اتنی ہمت نہ رہی کہ فرزند ان اسلام کو نیچا دکھا سکے۔ اور ان کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کر سکے۔ گویا سر زمین عرب میں اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو گیا اور اس کے دشمن ذلیل و رسوا ہو گئے۔

یکون الدین للہ کا مطلب بھی عبد اللہ بن عمر سے دریافت کرنا چاہئے، وہ فرماتے ہیں:

اتاہ رجلان فی فتنۃ ابن الزبیر فقال ان الناس صنعوا وانت ابن عمر، وصاحب النبی ﷺ فما یمنعک ان تخرج فقال ینعنی ان اللہ حرم دم اخی فقال الم یقل اللہ فقاتلوہم حتی لا تكون فتنۃ فقال قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ واتم تریدون ان تقاتلوا حتی تكون فتنۃ ویکون الدین لغير اللہ۔

”عبد اللہ بن زبیر کے فتنہ میں دو شخص ابن عمر کے پاس آئے اور کہا، لوگوں نے کیا کچھ کیا ہے آپ عمر کے

صاحبزادے اور رسول ﷺ کے صحابی ہیں کیوں نہیں نکلتے؟ انہوں نے جواب دیا، مجھے یہ بات منع کرتی ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا، کیا اللہ کا یہ حکم نہیں ققتاتلوہم حتی لاتکون فتنۃ؟ ابن عمر نے کہا، ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو گیا اور صرف اللہ کا دین ہو گیا، اور تم اس لئے جنگ کرتے ہو کہ فتنہ پیدا ہو اور غیر اللہ کے لئے دین ہو جائے۔

دونوں روایات کے ملانے سے اس آیت کے معنی خود بخود صاف ہو جاتے ہیں کہ تم برابر جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ و فساد کے اجزاء و عناصر محو و باطل ہو جائیں۔ کلمۃ اللہ اور قانون الہی بلند و برتر ہو، کسی شخص کو خدائی قانون کی خلاف ورزی کی طاقت نہ ہو اور اگر کوئی شخص اس کی توہین کرے تو حکومت اس کو فوراً سزا دے۔ اسلام اس امر کا آزر و مند ہے کہ قانون الہی عام ہو جائے۔ جملہ مذاہب امن و اطمینان سے اس کے ماتحت زندگی بسر کر سکیں۔ مذہبی مقامات، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں بدکار لوگوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کریں، خود آپس میں لڑنے نہ پائیں۔ جب کبھی ان میں سے کوئی اسلام کے قانون کی علی الاعلان توہین کرے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور سلطنت جس قانون کے بقا و استحکام کو اپنی غایت الغایات بنا لے وہ قرآن حکیم تسلیم کیا جائے۔

صرف یہی ایک صورت ہے جس سے دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے، ورنہ فتنہ ہمیشہ سراٹھاتا رہے گا اور لوگ کبھی چین سے زندگی بسر نہ کریں گے۔ اگر یہ لوگ اسلام کی مخالفت سے باز آجائیں اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) جس وقت مسلمانوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی ان کے شبہات و شکوک کو دور کر دیا تو وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(ب) اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں، مگر اس کی مخالفت نہ کرنے کا بھی عہد کرتے ہیں اور لوائے توحید کے ماتحت رہنا پسند کرتے ہیں تو شوق سے رہیں۔ مگر انہیں جزیہ ادا کرنا ہو گا۔

اگر ان دو باتوں میں سے کوئی بھی ان کو اسلام کی مخالفت سے باز نہ رکھ سکے۔ اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں اور برابر اسلام کی تباہی کے لئے تدبیریں سوچتے رہیں تو پھر ان کی سزا قتل ہوگی اور انہیں کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔

کوئی وقت مستثنیٰ نہیں

اَللّٰهُمَّ اِنِّهٖ اَنۡحَرَامُ بِاَلۡسَہۡرِ اَنۡحَرَامِ وَاَلۡخُمۡنُ قِصَاصُ فَمَنۡ اَعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاَعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِیَسۡۡۡرٍ مَّا اَعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ وَاَتَّقُوا اللّٰہَ وَاَعۡلَمُوۡا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیۡنَ ﴿۷۰﴾

”اب والے مہینوں کا معاوضہ ادب والے مہینے ہیں اور ادب کی تمام چیزوں میں مساوات ہے تو جو تم پر زیادتی کرتے تو جس قدر زیادتی اس نے تم پر کی ویسی ہی زیادتی تم، اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اشہر حرم، جن میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے چار ہیں: رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ ان مہینوں کا احترام، زمانہ جاہلیت میں کیا جاتا تھا، جنگ بند کر دی جاتی، راستے کھل جاتے اور تجارت شروع ہو جاتی۔ مسلمانوں کو اب بھی یہی حکم ہے

کہ ان مہینوں میں جنگ نہ کریں، لیکن اگر کفار کی طرف سے ابتدا ہو تو ان کو جواب دینا مسلمانوں کا اولین فرض ہے۔

مگر اس کا بہترین جواب یہ ہو گا کہ چونکہ کفار و مشرکین نے ہمارے مہینوں کی حرمت کو برباد کیا ہے، اس لئے ہم ان کے پاک مہینوں میں ان پر حملہ کریں اور اس طرح ان کو ذلیل و رسوا کر دیں، جب انہوں نے ہماری عزت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو ہم کیوں ان کی پروا کریں؟ یہی قصہ باقی قابل احترام چیزوں کا ہے۔ اگر وہ تمہاری مسجدوں کو شہید کریں تو تم ان کی عبادت گاہوں کو زمین کے برابر کر دو، اگر وہ تمہاری عورتوں کی عصمت و آبرو برباد کریں تو تم ان کی عورتوں کو لونڈی بنالو کہ یہ اس سے بھی زیادہ ذلت و رسوائی ہے۔ یہ مساوات کا سلوک ہے، ان کی بد اخلاقی کی سزا صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔

کسی قوم پر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہوا ہے کہ اس کے ارادہ میں جزم و استحکام پیدا ہو، ہمت بلند اور عزم و استقلال پورا ہو، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو مضبوط رکھیں، اللہ کے قانون کی عزت و حرمت ان کے پیش نظر رہے۔ ایسے لوگوں کی ہر موقع پر دستگیری کی جائے گی۔

جہاد ہی میں زندگی ہے

جہاد فی سبیل اللہ کے لئے قدم قدم پر روپیہ کی ضرورت ہوگی، اگر ہر ایک مسلمان لڑنے کے لئے تیار ہو گیا اور حکومت کے پاس روپیہ نہ ہوا تو سخت دقتیں پیدا ہوں گی، سامان حرب کی خریداری نہ ہو سکے گی، پھر اس کے علاوہ سلطنت کے اور سینکڑوں کام ہیں جو روپیہ کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ایسے وقت میں تو روپیہ کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے جبکہ دشمن نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ٹھان لی ہو، اس لئے فرمایا:

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۰﴾

”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور قانون کی پابندی اچھی طرح کرو، اللہ اچھی طرح قانون کی پابندی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ اس کے الفاظ اپنا مفہوم ادا کرنے میں بالکل صاف اور غیر مشتبہ ہیں۔ ابویوب انصاری کی روایت اس کی بہترین تفسیر ہے، وہ فرماتے ہیں:

نزلت هذه الآية فينا، معشر الانصار! لما اعز الله الاسلام وكثرنا صرورة، قال بعضنا لبعض سوا ان اموالنا قد ضاعت وان الله اعز الاسلام فلو اقمنا في اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها فانزل الله علينا نيرد علينا ما قلنا، وانفقوا في سبيل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة فكانت التهلكة الاقامة على الاموال واصلاحها وتركتنا الغزو۔

”ہم انصاریوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی، جس وقت اللہ نے اسلام کو عزت دی اور اس کے مددگار بہت ہو گئے تو ہم میں سے بعض نے خفیہ طور پر کہا کہ، ہمارے اموال برباد ہو گئے، اب جبکہ اسلام کو اللہ نے غالب کر دیا ہے۔ اگر ہم



اپنی زراعت کا خیال کریں اور زمین کو درست کر لیں تو برباد شدہ حصہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اپنی زمین پر جا کر اقامت گزین ہونا اس کو درست کرنا اور جہاد ترک کرنا ہلاکت تھا۔

مذکورۃ الصدر روایت نے بتا دیا کہ جہاد ترک کر دینا تباہی و بربادی ہے۔ صرف روپیہ دے کر اپنی جان چھڑالینا کافی نہیں، بلکہ روپیہ دینے کے ساتھ ساتھ خود جنگ کی تیاری اور جہاد میں شرکت ضروری ہے۔ ایسے موقع پر جن اور بخل سے کام لینا اپنے آپ کو ضعیف و کمزور اور مخالف کو قوی و طاقتور بنانا ہے۔ پس جان اور مال دونوں کو حاضر کرو، و جاهدوا باموالکم و انفسکم اور جو قانون تم کو دیا گیا ہے نیک نیتی سے اس کی پابندی کرو، اللہ تمہاری نصرت و دستگیری کرے گا۔ البتہ جن لوگوں کی نیت صالح نہیں ہوتی اور صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے قانون پر عمل کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی<sup>۱</sup>۔

### فریضہ حج

جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان کرتے کرتے درمیان میں قرآن نے حج بیت اللہ الحرام کا تذکرہ شروع کر دیا اور کچھ دور تک اس کا ضابطہ بیان کیا، اس سے فارغ ہونے کے بعد پھر جہاد فی سبیل اللہ کی طرف توجہ کی گئی، اگر ماقبل و مابعد میں درس و فکر سے کام لیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ قتال فی سبیل اللہ اور حج بیت اللہ میں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ربط و تعلق ہے، مگر اس ربط کو معلوم کرنے سے قبل تمام اعمال اسلامی پر نظر ڈالئے۔

نماز ہر مسلمان مرد و عورت پر لازم کر دی گئی، کہ جنگی خدمت ہر فرزند اسلام کے لئے ادا کرنا ضروری ہے۔ بیک وقت ایک لشکر جہاد تیار ہو جس کے اندر قربانی کا جذبہ صادقہ اور اپنے امیر کی اطاعت راسخ ہو اور جو ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کر سکے۔

زکوٰۃ: اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ فقرا و مساکین کو دے کہ ایک طرف تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو، تاکہ جب خلافت اسلامی کو اس کی دولت کی ضرورت ہو تو اپنی تمام جائیداد راہ حق میں لٹا سکے اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے اور دوسری جانب ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و رحم پیدا ہو جو ایک جذبہ فطری ہے۔ بخل و امساک کے عیوب سے پاک رہے اور قوم بھیک مانگنے سے بچ جائے۔

رمضان کے روزوں سے غرض یہ تھی کہ مسلمان اپنے اندر بھوک، پیاس اور دوسری تکلیفوں کے برداشت کرنے کی عادت پیدا کریں اور اگر کبھی انہیں مخالفین و معاندین اسلام کے مقابلہ میں مصائب و شدائد کا سامنا ہو تو ہمت نہ ہار دیں۔

<sup>۱</sup> آج ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی تمام جائیداد اللہ کی راہ میں قربان کر دیں۔ یورپ نے ان کے فنا کرنے کا عزم کر لیا ہے ہم لوگ اگر بد بختانہ ششیر کا قبضہ ہاتھ میں لینے کی طاعت نہیں رکھتے تو کیا ہوا! ہماری جبین تو سونے کے سکوں سے بھر پور ہیں۔ کیوں نہ انہیں کو خلافت اسلامی کی بھاد قیام کے لئے کھول دیں۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ ترکوں کے سینے نو گولیوں سے چھلنی ہوں اور ہم سے اتنا بھی نہ ہو کہ ایک وقت صرف خشک روٹی ہی پر قتا عت کر لیں۔

ایک فوج کے لئے جن امتیازات و خصائص کی ضرورت ہے اور جن کے بغیر کوئی لشکر کامیاب نہیں ہو سکتا وہ تو یہی ہیں۔ عام مسلمانوں نے ان کی پابندی کر لی، مگر ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان میں کتنوں نے صرف ظاہری صورت کی پرستش کی اور حقیقت سے بالکل غافل رہے اور وہ کس قدر ہیں جو مشکل سے مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ہر کٹھن منزل میں قدم رکھنے کے قابل ہیں، اس لئے کام شروع کرنے سے قبل ان کا امتحان ضروری ہے۔ وہ امتحان یہی فریضہ حج ہے تاکہ مضبوط اور توانا سپاہیوں کا انتخاب ہو سکے۔

اسلام ایک پیغام محبت ہے جو پھٹڑے ہوؤں کو ملاتا، بیگانوں کو اپنا اور آشناؤں کو صدیق حمیم بنادیتا ہے۔ اہل محلہ میں محبت و یگانگت پیدا کرنے کے لئے پنجگانہ نمازوں کے وقت محلہ کی مسجد میں جمع ہونا واجب کیا گیا۔ شہر والوں کے تعلقات کو محکم و استوار کرنے کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ مسجد جامع میں نماز جمعہ ادا کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ اہل شہر اور قرب و جوار کے دیہات کے رہنے والوں میں تعارف اور شناسائی کو پیدا کرنے کے لئے سال میں دوبار عید کی نماز قائم کی گئی اور آخر کار عالم اسلامی میں رابطہ دین و مذہب مضبوط تر کرنے کی خاطر مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف زبانوں، مختلف رنگوں اور مختلف ملکوں کے رہنے والوں پر عمر بھر میں ایک دفعہ حج بیت اللہ فرض کیا گیا کہ دین واحد کی وحدت میں سب کے سب شامل ہو سکیں۔

حج کے احکام ملاحظہ ہوں، ان کو جنگ کے ساتھ کس قدر شدید مناسبت ہے:

(۱) تمام حاجیوں کو سادہ بن سلا لباس پہننا پڑتا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک ہی رسول، ایک ہی قرآن اور ایک ہی کعبہ پر ایمان رکھنے والے ایک ہی صورت، ایک ہی لباس اور ایک ہی سطح پر نظر آئیں۔ چشم ظاہر بین کو ان اتحاد معنوی رکھنے والوں کے اندر کوئی ظاہری اختلاف محسوس نہ ہو۔ یہ اللہ کا لشکر ہے اور سب کے سب ہیں۔ فوج میں یو نیفارم ہونا ضروری ہے۔

(۲) ان لوگوں کو ایک خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے: سر منڈانا، ناخن کترانا۔ شکار کرنا اور عورتوں سے مباشرت کرنا ممنوع ہے، اگر کوئی شخص ان کا مرتکب ہو تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، کہ حاکم علی الاطلاق کی اطاعت راسخ ہو اور اس کے احکام ہماری مصلحتوں کے خواہ کیسے ہی مخالف ہوں، مگر ہماری گردنیں ان کے آگے جھک جائیں۔

(۳) ایک شخص نے حضور اقدس سے دریافت کیا کہ حج کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ، ”عرفات کے میدان میں جانے کا نام حج ہے۔“ جو شخص تمام ارکان حج ادا کرے اور میدان عرفات میں حاضر نہ ہو تو اس کا حج نہ ہو گا۔ گویا جس طرح آج تم خدائے واحد کی غلامی کا اظہار کرنے کے لئے اس میدان میں آئے ہو، آئندہ جب کبھی مسلمانوں کے خلیفہ کو کسی میدان جنگ میں اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر تمہارے اجتماع کی ضرورت ہو تو اسی طرح عزیز و قریب، وطن و دیار اور مال و جائیداد کو چھوڑ کر حاضر ہو جانا۔ اس میدان کی حاضری ایک طرح کی فوجی

نمائش ہوگی کہ کس قدر لوگ جنگ کے لئے تیار ہوئے ہیں۔

(۳) ہر حاجی کے لئے ضروری ہے کہ جب حج کو روانہ ہو تو اپنا زادراہ لے کر جائے تاکہ دوسروں کے لئے باردوش نہ بن جائے۔ ایسے ہی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہے اور ہر قسم کا ضروری سامان حرب اپنے پاس رکھے۔

(۵) ارکان حج سے فارغ ہو کر اپنی طاقت کے مطابق جانور ذبح کرے تاکہ معلوم ہو کہ ہم خود بھی خداے قدوس کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہیں، لَنْ يَتَّالِ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَتَّالِ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ۔ (الحج ۳۷)

(۶) حج میں تین چیزوں کی ممانعت ہے:

(۱) بے حیائی کی باتیں اور ناشائستہ کلام۔

(۲) ناشائستہ باتوں سے اپنے بھائیوں کو مخاطب کرنا۔

(۳) لڑنا، جھگڑنا، اس میں تعلیم دی کہ جب مسلمانوں کا لشکر ایک جگہ پر جمع ہو تو اسے ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے تاکہ آپس میں اختلاف و منازعت نہ ہونے پائے۔

(۷) ایک مرکز پر اجتماع سے مقصد یہ تھا کہ ان میں عالمگیر اتحاد و اشتراک پیدا ہو، شوکت اسلام کا اظہار ہو، بحری اور بری سفر کے فوائد حاصل ہوں، اللہ کے بندوں کا عظیم الشان دربار منعقد ہو، فوجی نمائش ہو، عالمگیر اتحاد اسلامی کا سالانہ جلسہ ہو، آثار قدیمہ کے جویا، صنایع عالم کے متلاشی، عالمان طبقات الارض، واقفان علم الاسماء اور محققین تاریخ اقوام و جغرافیہ عالم اپنی علمی تحقیقات کو فروغ دیں۔

(۸) جب فرزندان اسلام ان نکالیف و شدائد کو برداشت کر لیں گے تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ وہی حزب اللہ ہوگی جس کی فلاح و کامرانی کا وعدہ لسان الہی نے بار بار دیا ہے: إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (المجادلہ ۲۲)، وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصف ۱۷۳)۔

(۹) حج اگر مقصد اصلی ہو اور پھر تجارت بھی کر لے تو جائز ہے۔ ایسے ہی جہاد فی سبیل اللہ میں قانون الہی کی بلندی و برتری تو اصلی مقصد ہو، اس کے بعد اگر مال غنیمت بھی مل جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

(۱۰) حج کے بعد دو قسم کے آدمی فوراً ممتاز ہو جائیں گے۔ ایک وہ جن کے سامنے دنیا اور اس کی مآلوفات ہیں، مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا اتِّنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَنَا فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ ۲۰۰) اور دوسرے وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے طالب ہیں، وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا اتِّنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ ۲۰۱) یہی دوسری جماعت جنگ میں کام کرنے کے قابل ہوگی، تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ۔

## حج کے احکام

وَاتَّبِعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَخْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَبَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَافِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٣٦﴾

“اور حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو اور اگر محصور ہو جاؤ تو جیسے کچھ میسر آئے قربانی کرو اور جب تک قربانی ٹھکانے نہ پہنچ جائے اپنا سر نہ منڈاؤ، پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا اسے سر کی طرف سے تکلیف ہو تو بدلہ ہے روزے یا خیرات یا قربانی، پھر جب با امن ہو جاؤ تو جس قدر قربانی میسر آئے اور جس کو میسر نہ ہو تو زمانہ حج میں تین دن کے روزے رکھے اور جب واپس آؤ تو سات، یہ پورے دس ہو گئے، یہ قانون اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو اور اس بات کو جانے رہو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔”

مسلمانوں کو مضبوط اور طاقتور سپاہی بنانے کے لئے حج و عمرہ کا حکم دیا جاتا ہے۔ حج کے مقامات حسب ذیل ہیں:

(۱) .... بیت اللہ، جس کا طواف کیا جاتا ہے۔

(۲) .... صفا اور مروہ کی پہاڑیاں، جو بیت اللہ الجلیل کے پاس ہیں۔

عمرہ میں صرف بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے اور ان دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑا جاتا ہے۔

(۳) .... شہر سے مشرق کی جانب میں میل کے فاصلہ پر منیٰ ہے۔

(۴) .... منیٰ سے آگے بڑھ کر تین میل پر مزدلفہ ہے۔

(۵) .... مزدلفہ سے تین میل پر عرفات کا میدان ہے۔

فریضہ حج تین طریق پر ادا کیا جاتا ہے۔

(الف) افراد، ایام حج میں صرف حج ہی ادا کیا جائے، اس سے فارغ ہونے پر عمرہ کا احرام باندھے۔

(ب) تمتع، حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے، اس کے تمام ارکان پورے کرے اور پھر اسی سال حج بھی

کرے۔ تمتع کے معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ ایک شخص عمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول دیتا ہے اور اپنے

وقت پر حج کر لیتا ہے، اس درمیانی وقت میں وہ ان چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے جو احرام کی حالت میں

ناجائز تھیں، گویا عمرہ کی وجہ سے حج کے لئے تمتع کرتا ہے، اس لئے اس کو تمتع کہا گیا۔

(ج) قرآن، حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ دونوں کی یکجائی کرے اور دونوں کے لئے احرام باندھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ موسم حج میں صرف عمرہ کا احرام باندھے، مگر اس کا احرام کھولنے سے قبل حج

بھی ساتھ ہی ملا لے۔

چونکہ حج اور عمرہ کا مقصد فوجی تربیت کی تکمیل ہے، اس لئے بہتر ہے کہ مسلمان دو جداگانہ سفر کریں، ایک حج کے لئے دوسرا عمرہ کے لئے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ عمرہ کے ایام میں مکہ مبارکہ کے تمام ضروری حالات سے واقفیت ہو جائے گی۔ اس لئے حج کے موقع پر اس امر کے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی کہ امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے تبادلہ افکار و خیالات کرے، ان کی صحبت و ہم نشینی سے فیض یاب ہو اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے نشو و ارتقاء اور حیات اجتماعی پر غور کرے۔

البتہ اگر کوئی شخص راہ کی بد امنی یا بیماری کی وجہ سے رک گیا اور حج و عمرہ کے لئے نہ جاسکا تو اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کا جانور وہاں بھیج دے یا کسی معتبر آدمی سے کہہ دے کہ، قربانی کے روز میری طرف سے بھی وہاں ایک جانور ذبح کر دینا۔ جب اسے گمان غالب ہو کہ میرا جانور ذبح ہو گیا ہو گا تو احرام کھول دے۔ اس سے قبل سر منڈانے، یا بال کتروانے اور احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کی صورت مقصود نہیں بلکہ قربانی کا جذبہ پیدا کرنا منظور ہے، کیونکہ اگر صرف صورت ہی پیش نظر ہوتی تو جب تک حج ادا نہ ہوتا احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوتی۔ سر منڈانے کی اجازت حالت احرام میں اس شخص کو مل سکتی ہے جو بیمار ہو جائے، اس کے سر میں جو یس پڑ جائیں یا اور کوئی مرض ہو، مگر باوجود اس کے اسے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) سر منڈا کر تین دن روزے رکھے۔

(۲) چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کے مطابق الگ الگ دیوں دے دے یعنی فی مسکین پونے دو سیر۔

(۳) بکری ذبح کر کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

ان میں سے جو بھی صورت چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

جب دشمن کا خوف دامن گیر نہ ہو اور چاروں طرف امن قائم ہو جائے تو جو شخص تمتع یا قرآن کے طریق پر حج ادا کرے اسے ایام حج میں حرم کے اندر ایک جانور ذبح کرنا ہو گا۔ اور اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو اس کے عوض میں دس روزے رکھنے پڑیں گے۔ تین دن کے روزے نویں ذی الحجہ سے قبل اور باقی حج سے فارغ ہو کر وطن میں آکر رکھ لے۔ حج افراد تو ہر شخص کر سکتا ہے، مگر تمتع اور قرآن کی صرف ان لوگوں کو اجازت ہے جو دور دراز کے رہنے والے ہوں اور میقات کی حدود میں ان کے گھر نہ ہوں۔ میقات کے اندر رہنے والوں کو صرف افراد کی اجازت ہوگی۔ میقات سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہونا پڑتا ہے، خواہ عمرہ کی نیت ہو یا حج کی۔

یہ اعلیٰ ترین قانون ہے، اس کی پابندی کرو۔ تمہاری حیات قومی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں، ان میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں اور جسم واحد بن جائیں۔ اگر تم نے اس کو ترک کر دیا تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ تمہاری وحدت و جمعیت جاتی رہے گی اور اختلافات پیدا

ہونے کی وجہ سے تم پر غیروں کو مسلط کر دیا جائے گا۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۖ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفْثَ وَلَا فُسُوقَ ۚ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُ ۚ وَتَوَدُّوْا قَائِلًا خَيْرًا الرَّادُّ الثَّقَوِيُّ ۚ وَاتَّقُوا نِيَابِلَ الْأَكْبَابِ ﴿٢٥﴾

“اور حج کے چند مہینے معلوم ہیں، پس جس نے ان میں حج کو لازم کر لیا تو پھر ایام حج میں نہ کوئی فحش بات ہے اور نہ بے حکمی اور نہ نزاع اور جو کچھ نیکی تم کرو گے اللہ اس کو جان لے گا اور زادراہ لیا کرو، بیشک بڑا فائدہ خرچ کرنے میں بچتا ہے اور اے عقلمند و امجد مجھ سے ڈرتے رہو۔”

حج کے لئے تین مہینے مقرر ہیں: شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے دس ایام۔ ان دنوں میں حسب ذیل چیزوں کی ممانعت ہے:

(الف) رفث، فحش باتوں سے پرہیز کرنا۔ حدیث میں آتا ہے: اذا كان يوم صوم احدكم فلا يرفث ولا يضحك، تمام لغو اور فضول باتیں جو حج سے پہلے حرام تھیں، اب ان میں اور زیادہ حرمت آجائے گی۔ اپنی بیوی سے بے حجابی کی باتیں کرنا قبل از حج جائز تھا، مگر ان دنوں وہ بھی حرام ہوگا۔

(ب) فسوق، اس میں ہر قسم کا گناہ شامل ہے۔ ابن عباس، طاؤس حسن، سعید بن جبیر، قتادہ، زہری، ربیع، اور قرظی کی بھی یہی رائے ہے۔ خوشبو لگانا، بال کتر وانا بھی جائز نہیں۔

(ج) جدال، رقیقوں سے لڑنا جھگڑنا، گالی گلوچ دینا اور ناشائستہ الفاظ سے خطاب کرنا بھی ممنوع ہے۔

ایام حج میں صرف یہ تین باتیں ناجائز ہیں۔ ان کو ترک کر کے جو اچھا کام ہو شوق سے کرو، اس کی ضرورت جزا ملے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنا زادراہ لے کر جائے، دوسروں کے لئے باردوش نہ ہو۔ یمن کے لوگوں کا دستور تھا کہ سفر خرچ لیے بغیر گھروں سے حج کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ وہاں جا کر بھیک مانگتے، چوریاں کرتے اور دوسروں کا مال غصب کرنے کی فکر میں رہتے۔ بظاہر ان کا مقصد صبر و توکل پیدا کرنا تھا، مگر تقویٰ و طہارت حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان اپنا زادراہ ہمراہ لے کر نکلے، اس طرح ایک تو سوال کرنے سے بچ جائے گا دوسرے صدمہ گناہوں سے محفوظ رہے گا۔

ارباب عقل و خرد تو وہی ہیں جو خدا کی یاد میں اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر ہر وقت خدا کے نام پر قربان ہونے کا خیال رہتا ہے، مگر جو لوگ دنیا سے علیحدگی اختیار کر کے بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جب مسلمان حج کے زمانہ میں ان خصلتوں کے عادی بن جائیں گے تو انہیں زمانہ جنگ میں شریفانہ طور پر رہنا آسان ہو جائے گا اور یہ ایک خصوصی امتیاز ہو گا اسلامی لشکر کا کہ اس میں فسق و فجور اور تمام فواحش و منہیات کا ارتکاب نہیں ہوتا جبکہ دوسری قوموں کے لشکر ہر قسم کی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

## تجارت بھی جائز ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُواْ كَمَا هَدَيْتُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَبِنَ الضَّالِّينَ ﴿٢٥﴾

”تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو “مشعر الحرام” کے پاس یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا ہے اور بیشک اس سے پہلے تم ناواقف تھے۔“

ابن عباس کہتے ہیں کہ، زمانہ جاہلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالحجاز منڈیاں تھیں۔ حج کے ایام میں یہاں خوب تجارت ہوا کرتی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد لوگوں نے اس کو مناسب خیال نہ کیا کہ حج کے دنوں میں تجارت کی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب مقصود اصلی محض حج بیت اللہ ہے اور اس ذیل میں اگر تجارت بھی کر لی تو کوئی گناہ کی بات نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ تجارت حقیقی غرض نہ بن جائے۔ فضل کے معنی رزق ہیں۔ چنانچہ سورہ جمعہ میں فرمایا: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ (الجمعة ۱۰) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: يَصْرِفُونَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُونَ مِّن فَضْلِ اللَّهِ (الزلزلہ ۲۰) آل عمران میں آیہ: فَانْقَلِبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ (آل عمران ۱۷۴)

۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں تمام حاجیوں کو قیام کرنا پڑتا ہے۔ دنیا بھر کے عالموں کی کانفرنس باہمی مشورہ کر کے چند امور کا فیصلہ کرتی ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ناگزیر و ضروری ہوں۔ امیر حج ایک خطبہ دیتا ہے، اس میں ان امور کا اعلان کیا جاتا ہے جو اجتماعی حیثیت سے دنیائے اسلام کے واسطے مفید و نافع ہوں۔ اور بتایا جاتا ہے، کہ سال نو میں فرزند ان اسلام کا پروگرام یہ ہوگا۔ جو شخص اس روز عرفات کے میدان میں موجود نہ ہوگا، وہ ان تعلیمات سے محروم رہے گا اور حج سے جو اصلی غرض تھی فوت ہو جائے گی، اس لئے شارع نے فرمادیا کہ ”الحج عرفة“۔

عرفات کو جاتے ہوئے راستہ میں منیٰ اور مزدلفہ کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے، جب میدان عرفات سے فراغت ہوگی تو واپسی کے وقت دسویں رات کو مزدلفہ میں ٹھہرنا ہوگا۔ مغرب اور عشا کی دونوں نمازوں کو عشا کے وقت میں یکجا پڑھنا پڑے گا۔ “مشعر حرام” اسی مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے۔ “عند المشعر الحرام” سے مراد تمام مزدلفہ ہے، وہاں رہ کر اللہ کا ذکر کرنا ہوگا۔

اسلام سے قبل جتنے مذاہب تھے، ہر ایک کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس کی دعوت عالمگیر اور اس کے مخاطب تمام ادیان و مذاہب ہیں۔ ایسا قانون نوازش کیا گیا ہے جس سے مسلمان تمام دنیا پر فضیلت و برتری حاصل کر سکتے ہیں۔ نزول قرآن سے پہلے عرب میں حکومت و جہانداری کی قابلیت نہ تھی اور نہ اس قسم کا کوئی قانون ان کے پاس موجود تھا۔ پس اس موہبت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ پر جس قدر ممکن ہو خدائے برتر کی حمد و تقدیس بیان کریں۔

## اتحاد عمل شرط ہے

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٠﴾

”پھر جہاں سے دوسرے لوگ چلیں تم بھی اسی جگہ سے چلو، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“  
زمانہ جاہلیت میں قریش بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ”حمس“ کہتے تھے۔ زمانہ حج میں عام لوگ عرفات کے میدان میں جا کر قیام کرتے، مگر یہ مزدلفہ ہی تک رہتے۔ کیونکہ وہ حرم کی حد میں ہے اور عرفات اس سے باہر، انہیں خیال تھا کہ حدود حرم سے باہر جانا ان کی شرافت، وجاہت اور عزت کے خلاف ہے اور عوام الناس سے ملنا تقدس مذہبی کے منافی۔ قرآن حکیم نے اس آیت میں دو عظیم الشان غلطیوں کو دور کیا جن میں دنیا ہمیشہ سے مبتلا رہی ہے اور آج بھی باوجود تمدن و تہذیب میں انتہائی ترقی حاصل کرنے کے اس کا قدم اسی جگہ پر ہے:

(الف) اللہ کے نزدیک قومی امتیازات و خصائص کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی نظر میں سب یکساں ہیں۔ وہاں اگر کسی چیز کی پرشش ہے تو ورع و تقویٰ کی: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرت)، اس لئے نسل انسانی میں حقیقی مساوات ہونا ضروری ہے اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تمام امتیازات قومی مٹانہ دیئے جائیں۔

(ب) قوموں کی تباہی و بربادی کی ابتداء ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام الناس میں تعلقات و روابط قائم نہ رہیں اور ایک دوسرے سے ملنا ترک کر دیں۔ بہترین دل و دماغ کو دست و بازو کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ جب عام لوگوں سے میل جول نہ رہے گا تو اعوان و انصار کا فقدان ان کی فاسامانی کا باعث بن جائے گا۔ عوام الناس کو قدم قدم پر راہ نما اور مصلح کی ضرورت رہتی ہے، جب انہیں راہ حق و حریت بتانے والا کوئی نہ ملے گا تو روز بروز ضلالت و گمراہی میں بڑھتے جائیں گے، تا آنکہ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہے گا۔

ان دونوں خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اللہ نے کہا کہ کوئی شخص مزدلفہ میں نہیں ٹھہر سکتا، بلکہ سب کے سب عرفات میں قیام کریں اور اسی جگہ سے ان کی واپسی ہو۔ اب تک جو کچھ ہو گیا، اس کو صرف اس بنا پر نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اس کا اعادہ نہ ہو۔

## شریف النسب کو دعوت اسلام دو

فَإِذَا قُضِيَتْكُمْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۚ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلْقٍ ﴿٥١﴾

”پھر جب حج کے ارکان پورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادا کے ذکر میں لگ جاتے تھے ویسا بلکہ اس سے بڑھ کر خدا کا ذکر کرو۔“



جاہلیت میں دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تین دن تک مجالس و مجامع منعقد کرتے اور ان میں اپنے باپ دادا کے مفاخر و فضائل بیان کرتے۔ قرآن نے اس بیہودہ رسم کی اصلاح کی اور حکم دیا کہ اس کی جگہ پر اللہ کا ذکر ہونا چاہئے، جو خود بڑا ہے اور دوسروں کو بڑائی بخشتا ہے۔ باپ دادا کی بزرگی بیان کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

باپ دادا کا ذکر وہی لوگ کرتے ہیں، جو شریف اور خاندانی ہوں۔ جن کا ماضی مشہور آفاق ہو، جن میں درخشندگی اور تابناکی کے سوا کچھ نہ ہو اور جنہوں نے جو انردی و شجاعت، فیاضی و سخاوت اور مہمان نوازی و صلہ رحمی کے عظام امور انجام دیئے ہوں۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے بزرگوں پر کسی قسم کا فخر کر سکتے ہیں۔ پس اس آیت سے ضمنیہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ ہر مسلمان کا یہ اولین فرض ہونا چاہئے کہ جس وقت تبلیغ و دعوت اسلام کے لئے میدان میں قدم رکھے تو اس کا روئے سخن شریف اور خاندانی لوگوں کی طرف ہو، ان کو وہ مذہب کی طرف متوجہ کر دے۔ ان میں اعلیٰ ترین اخلاق اور شریفانہ جذبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں، صرف راستہ دکھانا باقی رہتا ہے۔ گویا بارود تیار ہے شتابہ دکھانے کی دیر ہے خود بخود بھڑک اٹھے گی۔ جب ان لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیم پیش کی جائے گی تو ان کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام دے گی اور بہترین خدمات مذہبی انجام دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الناس معادن كمعادن الذهب والفضة، لوگ بھی سونے اور چاندی کی کانوں کی مانند ہیں۔ سونے کی کان سے سونا ہی نکلے گا اور چاندی کی کان سے چاندی، یہی حال خاندانوں اور قبیلوں کا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: خیارکم فی الجاہلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقهوا، جو شخص زمانہ جاہلیت میں اچھا تھا اس کی اچھائی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی رہے گی، بلکہ جس وقت وہ قرآن میں درس و فکر کرے گا تو اس کی شرافت کو چار چاند لگ جائیں گے<sup>۱</sup>۔

## دو قسم کے آدمی

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۳۷﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۳۸﴾

• ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹار عربی درس گاہیں مصروف تعلیم ہیں، مگر جو لوگ وہاں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں عام طور پر ملک و ملت کے لئے عضو معطل ثابت ہوتے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہی لوگ آتے ہیں جو بیکار اور معذور ہوں۔ گھر کا کام کاج نہ کر سکیں، ادنیٰ خاندانوں کے ہوں، فہم و فراست سے کورے اور بلید الذہن ہوں۔

مگر جب انگریزی درس گاہوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم کا بہترین ذخیرہ یہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ خاندانی روایات اور ظاہری و جاہلیت کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہیں ہوتے۔ دل و دماغ اور عقل و دانائی میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تحریکات قومی میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں، لیکن مذہب سے بعد و بجران کے حاسن و فضائل کے آئینہ کو گرد آلود اور مکدر کر دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہترین جذبات ہوتے ہیں، مذہبی جوش، حمیت وطن اور خدمت اسلام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوتے، مگر ان کی اکثر کوشش بے موقع صرف ہوتی ہے۔ اس غلط کاری کو دور کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف قرآن کی تعلیم کو عام کر دیا جائے اور انگریزی خوانوں کے کان اس کی آیات سے آشنا ہو جائیں تو انشاء اللہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی، پھر مذہبی رنگ میں یہ لوگ جس قدر جوش و ولولہ کیساتھ کام کریں گے علماء ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔

”پھر لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے اور ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی خیر و برکت دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کے کئے کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

تعلیم حاصل کر لی، مذہبی اعمال کے پابند بن گئے مگر مقاصد و اغراض کے اعتبار سے جس قدر باہمی فرق مراتب ہوتا ہے اس کا ظہور نہ ہوا۔ بعض لوگ محض دکھانے کی غرض سے ان تمام تکالیف کو برداشت کر رہے تھے، اور بعض کے پیش نظر مقاصد عالیہ اور مصالح شرعیہ تھے۔ اس امتحان گاہ میں آتے ہی دونوں جماعتوں میں فرق و امتیاز ہو گیا اور ایک کی صف دوسرے سے جدا گانہ قائم ہو گئی۔ منافقین پکار پکار کے اپنے کفر و انفاق باطنی اور الحاد فی العمل کا اظہار کر رہے تھے اور مومنین قانتین کا خلوص و ایثار اپنا رنگ الگ دکھا رہا تھا اور یہ تفریق اس لئے ضروری تھی کہ حج سے فارغ ہوتے ہی جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا جائے گا، اگر ارباب عمل اور نااہل لوگوں میں علیحدگی نہ کی جائے تو میدان جنگ میں شہداء و تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پس مناسب یہی تھا کہ ان کو پہلے سے جدا کر دیا جائے۔

منافقین کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بیاگ دہل کہہ رہے تھے کہ: رہنا اتنا فی الدنیا، ان کے سامنے دنیا تھی، اس کا عیش و آرام، قدر و منزلت، اور عزت و اکرام تھا، شہرت و ناموری ان کی غایت الغایات تھی۔ نہ تو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ان کے پیش نظر تھے اور نہ انہیں اپنی اصلاح و درستی کا خیال تھا۔ اس لئے وہ دنیا ہی میں اپنی کوششوں کے تمام ثمرات و نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو اپنے جذبہ توح پرستی کی وجہ سے تمام دنیا کی فلاح و بہبود کا اپنے آپ کو ذمہ دار گردانتا تھا، جس کی اعلیٰ ترین غرض یہی تھی کہ ہر انسان صرف خدائے واحد کا غلام ہو، سب کی اسر و تعبد کی بیڑیاں کٹ جائیں اور کرۂ ارضی عدل و انصاف سے معمور ہو جائے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام دنیا و آخرت پر حاوی ہیں، اس لئے اس کی دعا یہ تھی:

رَبَّنَا اتِّنْفِیْ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ پس کام کرنے کے لئے یہی لوگ زیادہ مفید و نافع ثابت ہوں گے اور پہلے گروہ کو فوراً الگ کر دیا جائے گا، تاکہ اس کی صحبت و ہم نشینی دوسروں پر برا اثر نہ ڈالے۔

مقطع سخن

وَإِذْ كُرِّمُوا إِلَىٰ آلِيهِمْ مُّعَذَّدُونَ ۖ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ لَبِئْسَ اتَّخَذَ  
وَاعْلَمُوا أَنَّهُمْ إِلَيْهِ يُحْشَرُونَ ﴿٢٨﴾

”اور گنتی کے ان چند دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہو پھر جو دوسری دن میں جلدی چلا گیا تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں یہ اس کے لئے ہے جو ڈرے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اس بات کو جان لو کہ تم اسی کے پاس جمع

کئے جاوے۔”

فریضہ حج کے قریب تمام ضروری احکام آگئے، اب صرف ایک مسئلہ کو بیان کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ حج کا مقصد اصلی کیا ہے اور یہ عظیم الشان اجتماع کس غرض کے لئے کیا گیا ہے، تاکہ لوگوں میں تنبیہ و اعتبار پیدا ہو اور ہر شخص آنکھیں کھول کر دیکھے۔

قربانی سے فارغ ہونے کے بعد قاعدہ یہ ہے کہ حاجی تین دن تک منی میں ٹھہرے۔ ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ ان میں ذکر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دسویں تاریخ کو بڑے پتھر ”جرہ عقبی“ پر سات کنکریاں مارے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتا جائے۔ کنکریوں کے مارنے کا وقت صبح صادق کے طلوع سے شروع ہوتا ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کو تینوں پتھروں پر سات سات کنکریاں مارے، مگر ان دونوں تاریخوں پر زوال آفتاب کے بعد ماریں ہوں گی اور اس کے بعد مکہ جانے کی اجازت ہے اور اگر وہاں تیرہویں تاریخ کی صبح ہو گئی تو پھر تینوں پتھروں کو طلوع فجر کے بعد کنکریاں ماریں پڑیں گی۔

اصلی مقصد قربانی کا جذبہ صادقہ پیدا کرنا ہے۔ جب یہ حقیقت طاری ہو گئی تو خواہ اب دودن کا قیام ہو یا تین دن کا، قانون الہی کی پابندی الزم اللوازم ہے۔ اس بات کو خوب ذہن نشین کر لو کہ جس طرح آج اللہ کے حکم سے اس میدان میں اپنا اپنا زاد راہ لے کر آگئے ہو، آئندہ بھی وہ تم کو خلفائے اسلام کی معرفت، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے میدان جنگ میں آنے کی دعوت دیگا کہ اس کا قانون بلند و برتر ہو اور دنیا میں فساد نہ ہونے پائے۔ اس وقت تمہارا فرض ہو گا کہ اپنا اپنا سامان جنگ لے کر میدان حرب میں حاضر ہو جاؤ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ ۖ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٣٧﴾ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ ﴿٣٨﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۖ وَلَيْشَسَ الْبِهَادُ ﴿٣٩﴾

”اور بعض آدمی ایسا ہے کہ دنیا کی زندگی میں تم کو اس کی بات پسند آتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر اللہ کو گواہ لاتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب لوٹ کر جاتا ہے تو دوڑتا پھرتا ہے تاکہ ملک میں فساد پھیلانے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو غرور اس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ پس اس کے لئے دوزخ کافی ہے اور وہ واقعی برا ٹھکانا ہے۔“

شریعت نے چند اعمال ہر مسلم پر لازم کر دیئے ہیں کہ ان کی پابندی سے اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ پیدا ہوں۔ اللہ کی نظر ہمیشہ ان اخلاق پر ہوتی ہے اور اس کے نزدیک وہی اعمال معتبر ہوتے ہیں جن کا اثر اخلاق پر پڑے۔ جو لوگ ان اعمال شریعہ کے مقاصد کو فراموش کر دیتے ہیں ان کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔ گزشتہ آیات میں دو قسم کے آدمی بیان کئے گئے، اب ان کے خصائص و امتیازات پر اور زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اہل و نااہل میں تمیز ہو جائے اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱).... دنیاوی امور میں نہایت ہی دور بینی اور حزم و احتیاط کا اظہار کرتے ہیں، مصلحت اندیشی اور عاقبت بینی کے پیکر مجسم ہوتے ہیں، حب قومی، جوش ملی اور ولولہ دینی ان کے فقرے فقرے سے ٹپکتا ہے۔ فداکاری اسلام اور سرفروشی ملت ان کا دعویٰ ہوتا ہے۔

(۲).... عام مجامع میں قسمیں کھا کھا کر اپنے مذہبی جوش کا اعلان کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال حیات ہی ان کی پردہ دری کر دیتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ: چوں مخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔

(۳).... جب ان کی غداری اور ملت فروشی کا اظہار ہوتا ہے اور لوگ ان سے احتساب کرتے ہیں تو اپنی غلط کاری تسلیم کرنے بجائے جھگڑا کر ناشروع کر دیتے ہیں۔

(۴).... اس قسم کے بد بخت جب مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں تو ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں، ہنگامہ آرائی ان کا کام ہوتا ہے اور قوم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنا ان کا مقصد، تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور روپیہ وصول ہو۔

(۵).... عورتوں سے قانون کے خلاف فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور زنا کے مرتکب ہوتے ہیں، اس طرح کھیتوں کی تباہی عمل میں آتی ہے۔

(۶).... لڑکوں کے ساتھ بد کاری کرتے ہیں اور لواطت کے ذریعہ اپنی نسل بھی برباد کرتے ہیں۔

یہ لوگ ذبح کرنے کے قابل ہیں اور ان کو دنیا و آخرت میں ہر گز عزت نصیب نہ ہوگی۔ اگر قوم ان کو ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کرتی ہے اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ تعلیم صحیح کے مقاصد سامنے رکھو ورنہ مسند امامت سے الگ ہو جاؤ تو گھبرا کر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اپنا طریق عمل بدل دیا اور قوم کی متفقہ آواز کے آگے اپنی گردن جھکا دی تو دنیا بھر میں ذلت و رسوائی ہوگی۔ اس لئے عزت اسی میں ہے کہ مستبدانہ کارروائی کریں تاکہ کوئی باز پرس نہ کر سکے۔ اس قسم کے بدکار دزد زح کا ایندھن بنیں گے اور کبھی ان کا نام روشن نہ ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشِيرُ إِلَىٰ نَفْسِهِ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۷﴾

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی جان دے دیتے ہیں اور اللہ بندوں پر بڑی شفقت رکھتا ہے۔ اصلی معنی میں قوم کے راہ نمایہ لوگ ہیں جو اعمال کی صورت کے ساتھ مقاصد کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ خداوند قدوس کی رضا طلبی ان کی غایۃ الغایات ہوتی ہے۔ اگر آج انہیں مکہ میں جمع کیا گیا ہے تو کل خلیفہ اسلام کے حکم پر چین میں جاسکتے ہیں، قربانی کا جذبہ کامل طور سے ان میں پیدا ہو چکا ہے۔ اللہ اپنی رحمت سے ان کی کوششوں کو ضائع نہیں کرے گا۔

پورے پورے مسلم بن جاؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٨٩﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٩٠﴾

مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، پھر اس کے بعد کہ تمہارے پاس نشانیاں آچکیں اگر تم نے لغزش کی تو جان رکھو، اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

جس طرح اخلاص و حسن نیت کے ساتھ تم نے احکام حج ادا کئے ہیں ایسے ہی تم میں سے ہر شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو اور آئندہ تمہیں جو حکم دیا جائے اس کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرو۔ اسلام یہی نہیں کہ نماز و روزہ ادا کر دیا اور مطمئن ہو گئے، بلکہ تمام احکام کا پورا کرنا اور ان صلاقی و نسکی و محیای و مصلقی اللہ رب العلمین، کی حقیقت کو اپنے اوپر طاری کر لینا اسلام ہے۔ اس کے وجود سے دنیا میں ہر نیکی کا قیام ہو اور ہر برائی دور ہو۔ عیش پرستی اور آرام طلبی شیطان کی تعلیم ہے اور تباہی و بربادی کا پیش خیمہ۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ تم مسلمان اللہ کی راہ میں قربان ہونے سے پرہیز کرو۔ مگر تمہیں ان باتوں کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ تمہاری حیات قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے بہترین قانون نوازش کیا گیا ہے جس کا ایک مرتبہ تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ شربانی سے جہانبانی تک پہنچ گئے۔ اس حقیقت صادقہ کے بعد اگر تم نے قرآن چھوڑ دیا تو اللہ اپنے غلبہ و اقتدار سے کام لے کر تمہیں فنا کر دے گا اور یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالسَّحَابِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢٩٠﴾

کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ فرشتوں کیساتھ سائبانوں میں ان کے پاس آئے اور قصہ طے کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی جانب لوٹائے جاتے ہیں۔

اعلیٰ ترین قانون تمہارے پاس ہے، اس پر عمل کر کے نتائج بھی سامنے آ گئے، اب کیوں نہیں اس پر عمل کرتے اور کس انتظار میں ہو؟ کیا یہ چاہتے ہو کہ اللہ خود نزول اجلال کرے، ملائکہ اولیٰ الجحہ کا لشکر جرار اس کی جلو میں ہو اور بایں شان و شوکت تم سے آکر کہے کہ یہ میرا حکم ہے۔ اسے مانو اور اس پر عمل کرو۔ تمہارے لئے اتنا بس کرتا ہے کہ نبی عربی نے اس قانون کی تبلیغ کر دی۔ عمل کرنا تمہارا فرض ہے اور اگر باوجود ان دلائل واضحہ کے تمہیں یقین نہیں تو انتظار کرو۔ اللہ کا عذاب آکر تمہاری بیخ کنی کر دے گا۔ عذاب کے فرشتے تمہیں نیست و نابود کر دیں گے اور دنیا سے تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ جب تمہیں صاف صاف کہہ دیا کہ تمہاری زندگی کا راز جہاد فی سبیل اللہ میں پوشیدہ ہے، اس لئے اس کے بعد کس دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلے باید از دے رخ متاب!

جہاد سے منہ موڑ گئے تو فنا ہو جاؤ گے اور یہ بات ہو کر رہے گی۔ کیونکہ زمین و آسمان کے تمام امور کا نظم و نسق خود اللہ ہی کرتا ہے۔

سَلِّفِيْ اَسْمٰى اَعْيَلْ كَمْ اَتَيْنَهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ۚ وَمَنْ يُضِلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَلَاۤ اِلٰهَ سِوَاللّٰهِ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝  
بنی اسرائیل سے پوچھ لو ان کو ہم نے کتنی کچھ کھلی نشانیاں دیں اور جو شخص اس کے بعد کہ اللہ کی نعمت اس کے پاس پہنچ چکی ہو بدلتا ہے تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

اگر تمہیں کسی قسم کا شک و اشتباہ ہو کہ یہ قانون کس طرح ایک قوم کے لئے زندگی بخش ہو سکتا ہے اور محض جہاد فی سبیل اللہ پر کیسے حیات قومی کا انحصار ہے؟ تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ان کو توراۃ دی گئی کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں ترقی کر سکیں اور جہاد فی سبیل اللہ ان پر فرض کیا گیا۔ جب تک وہ ان دونوں کے پابند رہے خلافت ارضی ان کے پاس تھی اور جہاں انہوں نے ان سے بعد و ہجر اختیار کیا فنا ہو گئے۔ ان کے تزل و انحطاط کے اعظم ترین اسباب یہی دو تھے۔

(الف) کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا: كَذَبَ فِرْعَوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ ۚ كَتَبَ اللّٰهُ وِرَآءَ ظُهُورِهِمْ (البقرۃ ۱۰۱)  
(ب) جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ بیٹھے: فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (البقرۃ ۲۴۶)  
حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر بنی اسرائیل کے لئے اور کوئی نعمتیں ہو سکتی تھیں؟ مگر انہوں نے قدر نہ کی۔  
ایسے ہی تم مسلمانوں کو دو چیزیں نوازش کی گئی ہیں:

(۱) قرآن حکیم: لَاۤ اٰتٰیْتُهُ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (تم سجدہ ۴۲)

(۲) جہاد فی سبیل اللہ: وَجَاهِدُوْا فِيْ اللّٰهِ حَقَّ جِهَادٍ (الحج ۷۸)

اگر تم بھی ان کو چھوڑ بیٹھے تو تمہیں سخت عذاب دیا جائے گا اور تم پر فطاری ہوگی۔

## جہاد فی سبیل اللہ کی غرض

اللہ کی راہ میں لڑنے کا حکم دیا گیا۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ای اعمال افضل آپ نے ارشاد فرمایا: الصلوٰۃ لوقتہا، مگر جس وقت صحابہ کرام کو احب الاعمال الی اللہ کی تلاش ہوئی تو اس کے جواب میں سورۃ بقرہ صف نازل کی گئی: ان اللہ یحب الذین یقتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرموص۔ صرف قتال فی سبیل الحق والحریت ہی اللہ کو محبوب ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا: ای اعمال افضل قال الایمان باللہ ورسولہ قیل ثم ماذا قال الجہاد فی سبیل اللہ قیل ثم ماذا قال حج مبرور، دراصل ان تمام روایات میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ ہر جگہ فضیلت کا معیار جدا گانہ ہے۔ پہلا سوال انفرادی حیثیت رکھتا تھا، فرداً فرداً بہترین اعمال نماز ہی ہے کہ یہی عماد الدین ہے اور اسی پر آگے چل کر دین کی عمارت محکم و استوار ہوگی، لیکن جب احب الاعمال الی اللہ کا سوال کیا گیا تو اس کا

منشایہ تھا کہ قومی نقطہ نگاہ سے افضل ترین اعمال، ارشاد ہوا، جس کا نتیجہ اعلیٰ کلمۃ اللہ اور ظہور شعائر الہیہ ہو، تو وہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے کہ اسی پر قومی زندگی کا دارومدار ہے۔ ایک شخص نے آپ سے پوچھا، ذرۃ الاسلام، یعنی اسلام میں چوٹی کا عمل کیا ہے؟ تو جواب یہی تھا کہ الجہاد فی سبیل اللہ۔ اگلی آیات میں جہاد کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۱﴾

کافروں کے لئے دنیا کی زندگی عمدہ کر دکھائی گئی ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور جو لوگ پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے روز درجہ میں ان سے اوپر ہوں گے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ جو لوگ مذہب کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جب ان کے سامنے صحیح تعلیم پیش کی جاتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے صرف یہی چند روز عیش و نشاط زندگی ہے۔ اگر یہ اسی پر قیامت کرتے تو بھی ایک بات تھی، مگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اور ان پر آوازے کتے ہیں، حالانکہ قیامت کے روز فرزند ان اسلام ہی مدارج عالیہ کے مالک ہوں گے۔ کیونکہ وہ اخلاق فاضلہ کے طالب ہیں، دولت کی انہیں پروا نہیں۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کا اولین فرض یہ ہو گا کہ ان کفار کو اتنا ذلیل و رسوا کر دیں کہ آئندہ انہیں سر اٹھانے کا موقع نہ ملے اور ہمیشہ کے لئے غلامانہ زندگی بسر کریں۔ اس لئے کہ اگر انہیں کھلے بندوں چھوڑ دیا تو قانون کا احترام جاتا رہے گا، کسی شخص کے دل میں اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا نہ ہو گا، آنے والی نسلوں کے لئے صحیح راہ گم ہو جائے گی اور بہت جلد یہ دستور العمل مٹ جائے گا۔

جب ارباب اخلاق و اعمال قیامت میں مناصب جلیلہ پر فائز ہوں گے تو ضروری ہے کہ دنیا میں بھی وہ اعلیٰ ترین زندگی بسر کریں، تاکہ ارادہ خداوندی پورا ہو کر رہے۔ جس وقت بھی مسلمان اس فرض جلیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور بالفرض نہ تو سامان حرب ہو گا اور نہ جنگ کرنے کے لئے سپاہی، اللہ ضرور ان کی دست گیری کرے گا، ان کو کامیاب کر کے تمسخر کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کر دے گا۔ ضرورت ہے آگے بڑھنے کی، جب عزم مصمم، مستقل ارادہ، استقلال و ثبات قدم اور توکل و اعتماد علی اللہ ہے تو کامیابی قطعی و یقینی ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ وَاتَّخَذَ اللَّهُ نَبِيَّهُمُ الْكَتَابَ بِالْحَقِّ لِيُخْطَبَ بَيْنَ النَّاسِ فَمِنَ الْأُمَّةِ الَّتِي آتَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لَهَا اٰخْتِلَافًا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِادْنَاهُ ۖ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۲﴾



تمام لوگ ایک جماعت تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کی معرفت سچی کتابیں بھیجیں، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان میں کتاب الہی فیصلہ کر دے، مگر انہی لوگوں نے آپس کی ضد سے کتاب میں اختلاف کیا جن کو کتاب دی گئی تھی اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں، اللہ نے اپنی مہربانی سے وہ راہ حق مسلمانوں کو دکھادی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جس کو چاہے سیدھی راہ دکھائے۔

تمام انسانوں کو ایک ہی فطرۃ صالحہ پر پیدا کیا گیا تھا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اور کل مولود یولد علی الفطرة سے یہی مراد ہے اور اس لئے وہ امت واحدہ ہی تھے، اس پر ثابت و قائم رہنے کے لئے اللہ اپنے انبیاء و رسل بھیجتا رہا کہ الست بد بکم کے جواب میں جو بولی کہا تھا اس کی یاد دل میں برابر تازہ رہے اور قلب سلیم کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہوں، اسی کی حفاظت و نگرانی دنیا و آخرت میں ہر قسم کی ترقی کی ذمہ دار و کفیل ہوگی۔ انبیاء کا کام یہ تھا کہ مومنین کی ہمتیں بڑھائیں اور مخالفین میں ضعف و کمزوری پیدا کریں۔

چونکہ نبی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا، اس لئے ساتھ ہی کتاب بھی نازل کر دی۔ کہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اختلاف باہمی کا فیصلہ اسی کے مطابق کریں۔ آفتاب کے غروب ہونے پر چاند کی روشنی اندھیرے گھروں کا اجالا بن جاتی ہے۔ باوجودیکہ ان لوگوں کو منشاء الہی معلوم تھا، مگر پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا اور یہ جو کچھ ہوا صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہو۔ گزشتہ امتیں تو اختلاف کا شکار بن گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک جدید قومیت صالحہ پیدا کی اور امت مسلمہ کو ان اختلافات کی حقیقت واضح کر کے صحیح راہ دکھادی، کیونکہ شہد اعدی الناس ہونے کی وجہ سے صراط مستقیم پر چلنے اور دنیا بھر کی راہ نمائی کی قابلیت صرف مسلمانوں ہی میں تھی۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کی جو یکسر ہدایت و نور تھی، مگر ان لوگوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، پھر انجیل ان خصوصیات کے ساتھ اتری، لیکن بیکار، اختلاف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ قرآن کے نزول کی ضرورت محسوس ہوئی: وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَالِيَهُ (المائدہ ۴۸)

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو مٹا دیا جائے جو کتاب الہی میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کریں، عام طور پر دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں:

(۱).... کتاب الہی کے ساتھ تمسخر و استہزا کرنے والے۔

(۲).... قرآن میں اختلاف کرنے والے۔

ان دونوں گروہوں کو ذلیل کرنا اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی مسلمانوں کا فرض ہو گا، تاکہ پھر کبھی ان کے دل میں قانون الہی کی مخالفت اور اس سے تمسخر و استہزا کرنے کا خیال نہ پیدا ہو۔ اگر ان کو مقہور و ذلیل نہ کیا گیا تو دنیا میں قانون الہی کی عزت باقی نہ رہے گی اور اس کا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا۔ دنیا کی ہر سلطنت اپنے قانون کا احترام و اکرام کرتی ہے، اگر کوئی اس کی توہین کرے تو اسے فوراً سزا دی جاتی ہے، یہی اسلام کا مقصد ہے کہ اس کے قانون کی



اہانت نہ ہو۔

اس قسم کے لوگ دنیا کے مختلف گوشوں میں چھپتے پھریں گے اور ہر وقت موجود رہیں گے، اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو تمام دنیا کے لوگوں سے جنگ کے لئے تیار رہنا پڑے گا، کیونکہ کوئی زمانہ ان بد بختوں سے خالی نہ ہوگا۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا: وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (البقرۃ ۱۷) اور اسی لئے شارع نے فرمایا کہ الجہاد ماضی لیوم القیمۃ "جہاد کا سلسلہ قیامت تک رہے گا" تا آنکہ ویكون الدين كله الله کی پیشین گوئی صادق ہو۔

تکالیف کا آنا ضروری ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْتُمُ الْبُاسَاءَ وَالضَّالِّينَ وَذُرُوبًا  
حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ ۖ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۳۷﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور تکلیفیں بھی اور جھڑپیں بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن لو اللہ کی مدد قریب ہے۔

تم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آئے ہو اور تمہیں خلافت ارضی کے لئے چن لیا گیا ہے، مگر کیا اس بہشت زار ارضی میں بغیر کسی محنت و تکلیف کے داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی ان مشکلات و موانع کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی جو انبیاء و رسل کو راہ حق و صدق میں پیش آتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان ارباب صدق و صفا کو چاروں طرف سے مصیبتوں نے گھیر لیا، غنیم کی فوجیں محاصرہ کئے ہوئے تھیں، قدم قدم پر دشمن کا خوف دامن گیر تھا، جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، سامان خوراک کے تمام ذرائع و وسائل مسدود تھے، بھوک اور پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے، یہ بیرونی تکلیفوں کی حکایت تھی، ادھر گھر میں اختلاف پیدا ہو گیا، پریشانی و اضطراب کی وجہ سے کم ہمتوں میں بزدلی اور نامردی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور ان میں باہمی منازعت شروع ہو گئی، آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے سب کے سب مبتلائے مصیبت ہو گئے، مگر باوجود ان روح فرساحالات اور الم ناک حوادث کے رسول اور اس کے اعوان و انصار اپنے فرائض کے ادا کرنے میں برابر مصروف رہے۔ جب ان کی تمام سعی و کوشش ختم ہو گئی اور انہوں نے کام کرنے میں کسر باقی نہ رکھی، ادھر خارجی اعانت کی بھی کوئی توقع نہ رہی تو نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ پکار اٹھے کہ خداوند! اب تیری مدد کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں، تو اپنا دست اعانت دراز کر اور ہمارے مخالفین کو تباہ کر۔ اس وقت چارہ ساز حقیقی نے ان کی دست گیری کی اور انہیں کامیاب کر دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو مختلف اصول بیان کئے ہیں۔ پہلا قاعدہ یہ ہے کہ راہ حق میں تکالیف کا آنا ضروری ہے، اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سورہ عنکبوت میں فرمایا: أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتَزَكَّوْا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ

فَتَمَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٥﴾ ایک جگہ آیہ: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآلِهِمُ الْجَنَّةَ ۖ يُعَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (التوبہ ۱۱۱) دوسرے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس وقت نازل ہوا کرتی ہے؟ جب تک ایک شخص اپنی تمام قوتوں کو اس کی راہ میں وقف نہ کر دے، مدد نہ آئے گی۔ اسی قانون کی طرف سورہ یوسف میں اشارہ کیا: حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف ۱۱۰) سورہ آل عمران کے آخر میں گناہوں کے کفارہ کی نسبت فرمایا کہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ راہ حق میں ہر چیز قربان کر دیتے ہیں: فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي قَاتِلُوا وَقَاتِلُوا لَا تَكْفُرْ عَنْهُمْ سَبِيلُهُمْ (آل عمران ۱۹۵)

پس فرزند ان اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ محض دعا کے بھروسہ پر قناعت نہ کر بیٹھیں، بلکہ زور بازو سے بھی کام لیں۔ لوگوں کے جھوٹے وعدوں پر نہ جائیں، اپنی قوت کا اظہار کریں۔ اس لئے کہ دنیا میں اسی قوم نے دائمی زندگی حاصل کی ہے جس نے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لیا ہو، قدرت بھی اسی کو زندہ رکھتی ہے جو اصل و اصل ہو۔

کہاں روپیہ صرف کریں

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا آفَقْتُكُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الدِّينُ وَالْآخِرُ لِلْيَنَالِ وَالْيَسْئَلِ وَالْيَسْئَلِ ۖ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢٦﴾

تم سے پوچھتے ہیں کہ کہاں خرچ کریں، کہدو کہ جس قدر مال تم خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ اسے جانتا ہے۔

مقصد نہایت ہی بلند ہے، اس کے لئے خود تو تیار ہونا پڑے گا، مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی تیار کرنا ہو گا جو غربت و افلاس کی بنا پر سامان حرب نہیں خرید سکتے اور اگر بالفرض ان لوگوں نے تمہارے روپیہ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے صرف نہ کیا تو اس کے متعلق تم سے باز پرس نہ ہوگی، تمہیں اس سخاوت و فیاضی کا اجر مل جائے گا۔

جہاد کب تک رہے گا

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾

تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تمہیں گراں گزرتا ہے اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جب تیاریاں اس زور شور سے ہوں تو خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کب تک جاری رہے گی اور یہ قتل و قتل کب ختم ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ لڑنے بھڑنے میں تکلیف تو ضرور ہوتی ہے، بال بچوں سے دور رہنا پڑتا ہے اور

چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا، مگر یاد رہے کہ جس چیز کو تم اپنی کوتاہ بینی سے باعث تکلیف خیال کر رہے ہو وہی تمہارے لئے خیر و برکت کا سبب ہے۔ اس لئے کہ تم زندہ رہو گے اور تمہاری قوم کو دائمی زندگی نصیب ہوگی۔ آرام طلبی اور عیش پرستی بظاہر دلفریب ہیں، مگر ان کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی حیات کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ سورۃ انفال میں اس کی نسبت فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال ۲۴)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۚ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۚ وَصَدَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكَفَرُوْا بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاجْرَأْهُمْ مِنْهُ اُكْبِرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا يَزَالُوْنَ يَقَاتِلُوْكُمْ حَتّٰى يَكُوْلُوْكُمْ اَوْ تَكُوْلُوْهُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ ۚ اِنْ اسْتَطَاعُوْا ۚ وَمَنْ يَّزِدْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ فَيَبُتْ ۚ وَهُوَ كَافِرٌ ۚ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوا وَجْهَهُمْ لِلّٰهِ سَبِيْلَ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٦﴾

تم سے حرمت کے مہینوں میں لڑائی کرنے کی بابت پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اس میں لڑنا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ہے اور فساد مار ڈالنے سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر قدرت پائیں تو تم کو تمہارے دین سے لوٹادیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر وہ کفر ہی کی حالت میں مر جائے گا تو ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت جائیں گے اور یہی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں بتادیا کہ مخالفین اسلام ہمیشہ بغض و عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ان کی برابریہ کو شش رہے گی کہ تم کو دین حق سے برگشتہ کر دیں۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی جنگ کے لئے ہمیشہ تیار رہنا پڑے گا، پس معلوم ہو گیا کہ جنگ ہمیشہ رہے گی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ الجہاد ماضی الی یوم القیۃ، اگر تم نے جہاد ترک کر دیا، تو یہ راہ ارتداد کا اختیار کرنا ہو گا اور اگر اسی کفر کی حالت میں مر گئے تو تمہارے اعمال صالحہ کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ جو شخص تمام عمر وفادار رہ کر آخر وقت میں بغاوت کرے، اس کی یہی سزا ہے۔ اللہ کی رحمت واسعہ کے صرف وہی لوگ امیدوار ہو سکتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد وحید بنالیں۔ اسی کی خاطر ترک وطن کے لئے تیار ہوں اور اسی کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دیں۔ ان لوگوں کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے گا اور انہیں ہمیشہ کامیابی نصیب ہوگی۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہ آیا کہ جنگ ختم ہونے کا وقت یہ ہے: حَتّٰى تَضَعَ الْحَضْبُ اَوْزَارَهَا (محمد ۴) ”لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہو جائے“، یعنی جب تک جنگ کرنے والی ظالم و حریص قوتیں باقی ہیں، عالمگیر صلح و امن کے حصول کی کوئی توقع نہیں۔ اس لئے پہلے ان قوموں کو پامال کر دو۔ دوسری جگہ آیا کہ حَتّٰى اِذَا اَخْتَضَبْتُمْهُمْ (محمد ۴) ”یہاں

تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔ ”قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا، مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہو گا، پس جب تک دنیا جنگ اور بواغ جنگ سے باز نہ آئے گی، مسلمانوں کو بھی جنگ کرنی پڑے گی۔ جنگ صرف اسی وقت ختم ہو گی جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے آگے جھک جائے گی: هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (اصف ۹)۔

نہ جائز ذرائع کا استعمال حرام ہے

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالنَّبِيْزِ قُلْ فِيْهِمَا اَثَمٌ كَبِيْرٌ مِّنْ مَّنَافِعِ النَّاسِ ۚ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِمِّنْ نَّفْعِهِمَا ۚ

شراب اور قمار بازی کے متعلق تم سے دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں، مگر ان کے نفع سے ان کا نقصان بڑھ کر ہے۔

گزشتہ آیات نے بتا دیا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، جس کے لئے ہر مسلمان کو تیاری کرنی پڑے گی، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فوج کم ہے، روپیہ بھی کافی نہیں، مخالف دونوں اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہے، کیا اس حالت میں شراب اور قمار بازی کی اجازت ہو سکتی ہے؟ عرب کے لوگ عام طور پر ان امراض میں مبتلا تھے، جنگ کے لئے جو اکیلے ان کی عادت تھی۔ آج کل یورپ بھی ان دونوں سے کام لیتا ہے۔ لڑائی کے سپاہیوں کو شراب پلا دی جاتی ہے کہ بے باکانہ دشمن پر حملہ کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مصنوعی دلیری پیدا ہوتی ہے، شراب پی کر جائز حدود سے دور جا پڑتے ہیں اور جہاں نشہ اتر اور طبیعت اصلی حالت پر آگئی تو اور زیادہ ضعف و کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ شجاعت کا حقیقی جوہر فنا ہو جاتا ہے اور مختلف امراض کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے شریعت نے شراب اور قمار بازی دونوں کی ممانعت کر دی اور ساتھ ہی ممانعت کا سبب بھی بیان کر دیا کہ اس میں نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ دوسری جگہ اس کو اور واضح کر دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالنَّبِيْزُ وَالْأَفْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالنَّبِيْزِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنتُمْ مُنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ ۹۰، ۹۱)

”مسلمانو! شراب اور جو اور بت اور پاسے ان میں کا ہر ایک کام بس ناپاک شیطانی کام ہے، تو اس سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی وجہ سے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوادے اور تم کو یاد الہی سے اور نماز سے باز رکھے، تو کیا شیطان کے مکر پر اطلاع پائے پیچھے اب بھی تم باز آؤ گے یا نہیں۔“

ان آیات میں بیان کر دیا کہ شراب ام الخبائث ہے اور جو اتہائی و بربادی کا پیش خیمہ۔ حدیث میں آتا ہے نعن رسول اللہ ﷺ فی الخبر عشرۃ عاصرها و معتصمها و اشار بها و ساقیها و حاملها و محبولة الیہ و بائعها و متاعها و اهلها و اکل شمنها۔

## کتنا خرچ کریں؟

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٥﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد خرچ جائے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملہ میں غور و فکر کرو۔

ناجائز ذرائع کا استعمال حرام قرار دیا گیا تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہونا ضروری تھا کہ کتنا روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ اس لئے فوراً بعد فرمادیا کہ تمہاری ضروریات سے جس قدر خرچ جائے سب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر دو، اسی سے تمہارے جوش دینی اور دلولہ مذہبی کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ اگر تمہیں خدمت ملت اور ارتقاء اسلام کا خیال ہو گا تو خود بخود اپنی ضروریات کو کم کر لو گے اور اگر صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ملک اور قوم کا نام لیتے ہو گے تو اپنی ضروریات کا دائرہ اتنا وسیع کر لو گے کہ ایک کوڑی بھی باقی نہ رہے گی۔ خدا نے اپنے احکام کھول کر بیان کر دیئے ہیں، تاکہ تمہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں۔

## یتیمی کی تربیت

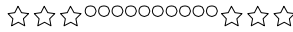
وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلِ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ ۚ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَارْحَمُوا أَمْكُم ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْتَبْتُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٦﴾

”اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ان کے لئے بہتری کا کام کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے اور سنوارنے والے دونوں کو جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشکل میں ڈال دیتا، بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔“

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ یتیم بہت زیادہ ہوں۔ اس لئے ایک قانون کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر اس میں کسی مستقل ضابطہ کو بیان نہیں کیا۔ اس لئے کہ شریعت اس سے پہلے مسلمانوں میں صحیح کیر کڑ پیدا کر چکی ہے، وہ چاہتی ہے کہ لوگ خود فیصلہ کر لیں۔ شارح نے اس کے لئے ایک اصل و اساس معین کر دی کہ: الاثم ملحاك في نفسك، ”گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔“ ایسی قوم کو قوانین و ضوابط میں جکڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ پس قرآن نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ تمہارے بھائی ہیں، جیسے اپنے بھائیوں کا خیال رکھو گے اور ان کی غور و پرداخت کرو گے، ایسے ہی ان یتیموں کا خیال رکھنا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس کے پیش نظر اصلاح ہے اور کون اس یتیم کی دولت برباد کرنے کی غرض سے اس کی دولت کو اپنے مال کے ساتھ ملا رہا ہے۔ خداوند قدوس اگر چاہتا تو اس کے لئے ایک ضابطہ معین کر دیتا، مگر اس نے تمہیں تکلیف میں ڈالنا پسند نہ کیا۔ باوجود اس قدر سہولت اور آسانی کے تم نے اب بھی ان کے مال میں خیانت کی تو کبھی ترقی نہ کر سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا۔ جب جنگ میں جانے والوں کو اس امر کا یقین ہو گا کہ اگرچہ ہم لڑائی میں مارے جائیں، ہماری اولاد پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ کیونکہ مسلمان ان کو اپنے بھائیوں کی طرح رکھیں گے اور بیٹوں کی مانند پرورش کریں گے۔ یہ خیال ان میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا کرے گا اور بالکل بے فکر ہو کر داد شجاعت دیں گے۔

یتامیٰ کے متعلق بحث کرنے سے قبل فرمایا تھا کہ جس قدر روپیہ تمہاری ضرورتوں سے بچ چائے اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے خلافت کی نذر کر دو۔ یہ فیصلہ کرنا کہ اصلی ضرورتیں کس قدر ہیں اور غیر ضروری کو نہی، ان کو ایک مثال سے واضح کر دیا کہ یتامیٰ کے لئے تمہاری کوشش ہمیشہ یہ رہے گی کہ ان کا روپیہ صرف ضروری مواقع پر صرف ہو اور کہیں ضائع نہ ہونے پائے۔ پس جو احتیاط اور دوراندیشی تم یتامیٰ کے معاملہ میں برتو گے، ویسی ہی کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی اپنے مال کے صرف کرنے میں ملحوظ رکھو۔



## فصل ثانی

### جہاں داری

توطیہ و تمہید

ہر قوم اپنی جداگانہ تہذیب رکھتی ہے۔ وہ اپنے تمدن کے پھیلانے میں کوشاں رہتی ہے۔ آج تک بیشمار قوموں کا ظہور ہوا اور ہر ایک نے اپنی شانستگی اور حضارۃ کو رواج دیا۔ اگر آپ ان تمام تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو الگ کر کے صرف قدر مشترک کی تلاش کریں تو سب میں یہی چیز نظر آئے گی کہ فطرت انسانی میں جس قدر اوصاف و کمالات اور محاسن و فضائل رکھے گئے ہیں، ان کی تولید و تربیت اور نشو و ارتقا ہو۔ کوئی تعلیم صحیح ان فطرت جذبات کو بدلنا نہیں چاہتی، بلکہ ان کی تکمیل اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ اگر انسان کو مطلق تعلیم نہ دی جاتی اور کسی تہذیب سے اس کو آشنا نہ کیا جاتا، پھر بھی ایک مدت کے بعد اس کے اندر سے ایک صدابلند ہوتی اور جذبہ فطرت سے متاثر ہو کر ضرور قدم آگے بڑھاتا۔ البتہ اتنا فرق ضرور رہتا کہ اسے راہ نمائے ملنے کی وجہ سے دیر لگتی اور دوسرے لوگ تعلیم و تربیت کی وجہ سے منازل مختلفہ کو جلد طے کر لیتے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہو گیا، کوسوں تک انسانی آبادی دکھائی نہیں دیتی، طبی مدد کا پہنچنا غیر ممکن اور محال ہے، اس کی طبی آرزو ہے کہ زخم اچھا ہو۔ اس لئے وہ صحرا میں تنگ و دو کرے گا، تا آنکہ مختلف اشیاء کے استعمال سے اس کا زخم مدت ہائے دراز کے بعد اچھا ہو جائے گا۔ یہ تمام سعی و کوشش اور بھاگ دوڑ صرف اس جذبہ فطرت کی تکمیل کے لئے کی گئی۔ اگر اس وقت جبکہ وہ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا اور یار و مددگار نہ ہونے کی وجہ سے کراہ رہا تھا، طبی اعانت میسر آ جاتی تو بہت تھوڑی دیر میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا۔ پھر دیکھتے کہ اس کی مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہ رہتی اور وہ طبیب کے لئے یکسر تشکر و امتنان بن جاتا۔

یہی حال تہذیب و شانستگی کا ہے۔ وہ انسان کے فطری جذبات و احساسات کو کم از کم وقت میں اعلیٰ ترین معیار پر پہنچا دیتی ہے اور یہ کسی کی طاقت نہیں کہ کوئی انسانی تہذیب اور داعیہ فطرت کو بدل دے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصد قوۃ واذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصد قوۃ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، سمندروں کی روانی بند ہو سکتی ہے اور دریا اپنا راستہ چھوڑ سکتے ہیں، مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان اپنی فطرت کو چھوڑ دے۔

## نکاح کی غرض

مرد و عورت کو دیکھئے، ان میں فطرت نے ایک ربط و تعلق قائم کر دیا ہے۔ اب آپ ان کو الگ رکھنے کی لاکھ کوشش کیجئے، مگر وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اپنے تعلقات قائم کر کے خواہشات طبعی کو پورا کریں گے۔ فرض کیجئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی آج پیدا ہوتے ہیں، دونوں کو ایک ایسے جزیرہ میں بند کیا جاتا ہے جہاں انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں، انہیں تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے اور مرد و عورت کے تعلقات کا نمونہ ان کے سامنے نہیں پیش کیا جاتا، مگر آپ دیکھیں گے کہ نوجوان ہوتے ہی جب ان کے قوائے شہوانیہ میں جوش و ہيجان پیدا ہو گا تو ان کی فطرت خود اندر سے پکار اٹھے گی اور مجبور ہوں گے کہ دونوں مل کر رہیں، ایک دوسرے کے ہم خیال ہوں، ہر ایک کے رنج اور خوشی میں شریک ہوں، تمام کام مشورہ سے کریں، کبھی ایک دوسرے سے ناراض نہ ہوں، ایک ہی جسم کے اجزاء ہوں، اولاد ہو جو ان کے بعد ان کے فرائض کی تکمیل کر سکے۔ جو قانون ان تعلقات و روابط کو مضبوط و محکم تر بناتا ہے اس کو اصطلاح میں تدبیر منزل کہتے ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہے وہ مل کر رہے گا۔ اس وقت جو قانون اس کے لئے مفید و نافع ہو گا وہ یہی ہے۔

سورۃ بقرہ کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ تہذیب اخلاق کے بعد تدبیر منزل کا قانون دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں عام طور پر انتظامی مادہ پیدا ہو، گھر کی چار دیواری سے بہتر اور کوئی درس گاہ نہیں ہو سکتی، گھر میں خاوند بیوی اور تمام بچے ہوتے ہیں، خاوند حاکمانہ زندگی بسر کرتا ہے، بیوی ہر بات میں اس کو مشورہ دیتی ہے، دونوں مل کر گھر کا انتظام کرتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت ان کے پیش نظر رہتی ہے اور ان کو بد اخلاقی سے بچاتے ہیں۔ اولاد کی حیثیت رعایا کی ہوتی ہے اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہو تو خاوند کی رائے کو ترجیح ہوتی ہے۔

یہ تو اس قانون کی عمومی حیثیت تھی۔ اب جو لوگ اس قانون کی مزید تعلیم کے آرزو مند ہوں گے اور بجائے گھر کی چار دیواری کے قوموں اور ملکوں پر حکومت کرنا اپنا مقصد بنالیں گے، وہ تدبیر منزل کا خصوصیت سے مطالعہ کریں گے، اسی کو آگے چلا کر سیاست مدن اور خلافت کبریٰ پر محمول کریں گے اور انہی مسائل سے استنباط و استخراج نتائج کر کے مختلف اقوام و ملل پر حکومت کرنے کے قابل بن جائیں گے۔

البتہ اتنا فرق ضرور ہو گا کہ یہاں جو قانون تھا وہ صرف ایک مرد اور عورت کے لئے تھا، جب آگے بڑھے تو اسی کو ایک ملک اور ایک قوم پر پھیلا دیا۔ مرد و عورت کے تعلقات باہمی کو حاکم و محکوم کے روابط کے ساتھ ملا دیا کہ دونوں کا انداز ایک اور طریق عمل متحد۔ ملک کیا ہے؟ بہت سے گھروں کے مجموعہ کا نام۔ پس جو قانون ایک گھر کے لئے کافی ہو سکتا ہے، وہی بہت سے گھروں کے لئے بھی کفایت کرے گا اور جو ضابطہ ایک گھر کا نظم و نسق قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور خاوند اور بیوی میں کشیدگی نہیں ہونے دیتا وہی راعی و رعایا اور حاکم و محکوم پر چسپاں ہو سکے گا۔ اگر گھر میں اس کو تدبیر منزل



کہیں گے تو قوموں اور ملکوں میں سیاست مدن اور خلافت کبریٰ کے نام سے تعبیر کریں گے۔

آئندہ آیات میں بتایا جاتا ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات کس قسم کے ہیں، ان کے رشتہ کو کونسی چیز مضبوط رکھ سکتی ہے، اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف ہو جائے، لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچے اور تعلقات قائم نہ رہ سکیں، تو اس وقت منازعات باہمی کے فیصلہ کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ نکاح و طلاق کے مسائل بیان ہوں گے اور انہی میں مزید غور فکر ہماری راہ نمائی کرے گا کہ ان کو خلافت کبریٰ پر منطبق کریں اور ان سے سیاسی مسائل کا استنباط و استخراج کریں۔

ارباب اصول نے کلام کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم آسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ متکلم کی غرض و غایت کیا ہے۔ ان میں سے بعض اقسام یہ ہیں:

(الف).... حوائے کلام۔ یہ بالکل بدیہی قیاس ہے اور ایک معمولی آدمی بھی اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم میں ہے: ولا تقل لهما اف جب والدین کو اف تک کہنا جائز نہیں تو ان کو مارنا پیٹنا بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

(ب).... اقتضائے کلام۔ اسی کو دلالت التزامی کہتے ہیں۔ ان لوازمات کی بنا پر کلام کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جو عادات یا عقلاً یا شرعاً اس کے لئے ضروری ہوں، مثلاً جب ایک شخص نے کہا کہ میں نے نماز پڑھی تو اقتضایہی ہے کہ وہ با وضو تھا۔ اقتضا میں مسکوت عنہ دراصل موقوف علیہ ہوتا ہے۔ پس جب موقوف ثابت ہے تو موقوف علیہ جو مذکور نہیں بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

(ج).... ایسی عبارت کے ساتھ اپنا مفہوم و مطلب ادا کرنا جو اعتبارات مناسبہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو، ان مدارج تلاش کے بعد اعتبار کا درجہ آتا ہے۔

ہم نے نکاح و طلاق کے مسائل سے سیاست کے مباحث اخذ کئے، اس طرز عمل سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے کہ ہم ان مسائل کو تفسیر کا درجہ دے رہے ہیں، بلکہ جس طرح اعتبار کے طور پر چند نتائج کا استنباط کیا جاسکتا ہے اسی طرح ان مسائل کی کیفیت ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ان تمام باتوں کو حواشی میں ڈال دیا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔

مسلمان کی عظمت

وَلَا تَنْكِحُوا النَّسَبَ كَيْتَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ ۖ وَلَا مِمَّنْ مُؤْمِنَةً خَيْرٍ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ۖ وَلَا تَنْكِحُوا النَّسَبَ كَيْتَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۖ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ۖ وَلَا تَعْجَبْكُمْ ۖ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾

اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً ایک مسلمان باندی مشرک عورت

سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو بھلی معلوم ہو اور مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً ایک مسلمان غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے، وہ تو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی عنایت سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں یتیمیٰ نظر آئیں اور ساتھ ہی رانڈوں کی بھی کثرت ہو۔ اگر مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کی عورتوں سے حسن و جمال اور دولت و ثروت کی وجہ سے نکاح کرنے شروع کر دیئے، تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ مسلمان عورتیں برباد ہو جائیں گی۔ مگر ان کا رہنے کی وجہ سے مجبور ہو کر بد عملی و بد کاری کی مرتکب ہوں گی۔ ادھر جب لڑنے والوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ان کی عورتوں کی حفظ و نگہداشت نہیں ہوتی، تو ہمت ہار دیں گے۔ اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

نکاح کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ عورت اور مرد میں دائمی اتحاد و اشتراک عمل پیدا ہو، ان کی اولاد کی اسلامی طریق پر نشو و نما ہو۔ ماں باپ کے اخلاق و عقائد کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ اگر ماں بے دین ہوگی تو اولاد میں اتحاد و زندگی کے امراض خبیثہ کا پیدا ہونا ضروری ہے، جس سے اسلام کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے گی، پھر خاوند اور بیوی کے باہمی اختلاف کی بنا پر تدبیر منزل کے فرائض میں خلل واقع ہو گا اور امور خانہ داری میں کبھی نظم و نسق قائم نہ رہ سکے گا۔ ان تمام مصالحوں کی بنا پر مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی۔ حدیث میں آتا ہے: **تَنْكِحُ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ لِّمَا لَهَا وَلِحُسْبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا** فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرُبِّتِ يَدَاكَ، عورتوں سے نکاح کرنے میں لوگ مال و دولت، خاندان، حسن و جمال اور عفت و پاک دامنی کو دیکھتے ہیں، تم صرف طہارت و پاکیزگی کو پیش نظر رکھو۔

اس آیت میں دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اپنی لڑکیوں کو مشرکین و معاندین اسلام کے نکاح میں نہ دینا۔ اس مسئلہ پر تمام دنیائے اسلام کا قاطبہ اتفاق ہے کہ ایک کافر، خواہ کیسا ہی صاحب اثر و نفوذ، جاہ و حشمت اور دولت و ثروت ہو، مگر اس کے ساتھ کسی مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اول تو عورت عام طور پر منفعّل اور اثر پذیر ہوتی ہے، صحبت و ہم نشینی کا اثر ہو کر رہے گا یا ممکن ہے وہ بتدریج اسلام کو چھوڑ کر کفر و ارتداد قبول کرے۔ دوسرے اگر وہ اسلام سے منحرف نہ ہوئی تو خاوند اور بیوی میں جنگ رہے گی اور تمام گھر بار میدان جنگ بن جائے گا<sup>①</sup>۔

① اللہ تعالیٰ اپنی آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، تاکہ ان سے مسائل سیاست کا استخراج کیا جائے۔ آپ اس کے دوسرے حکم پر نظر ڈالئے، اس میں بتا دیا کہ مسلمان عورتوں کو کفار کے نکاح میں دینا جائز نہیں اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی لڑکی کے لئے مسلمان خاوند ہی تلاش کرے۔ یہ ایک گوشہ اور خون کا رشتہ ہے جس کی حفاظت پر اس قدر زور دیا گیا کہ ایک مسلمان ہی اس کا نگران کا رو محافظ بن سکتا ہے۔ ہمارا ایمان و اسلام اس سے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہے۔ اولاد کو مذہب پر قربان کیا جاسکتا ہے، مگر دین کو اس کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس لئے ایک مسلمان کا مقصد حیات یہی ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کی باگ بھی صرف مسلمان ہی کے ہاتھ میں دے اور اس کا پادشاہ مسلمان ہی ہو۔ کفار و مشرکین کبھی مسلمانوں کے حاکم نہیں بن سکتے۔ آل عمران

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَدْنَىٰ ۚ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۚ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الثَّوَابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٣٠﴾

”اور تم سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ وہ گندگی ہے، پس تم زمانہ حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو لیں ان کے قریب نہ جاؤ، پھر جب نہادھو لیں تو جدھر سے تم کو حکم دیا ہے ان کے پاس آؤ، بیشک اللہ تو بہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جنگ کی وجہ سے مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے پر زور دیا گیا۔ نکاح ہی کے سلسلہ میں حیض، طلاق اور عدت کے ضروری مباحث ہیں، اس لئے ان کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوا۔ حیض کے متعلق دنیا افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔ یہودیوں اور مجوسیوں کے نزدیک ایام حیض میں عورتوں کے قریب جانا، ان سے بات چیت کرنا، ان کے پاس بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا ممنوع و حرام ہے۔ عرب بھی اسی قانون کے پابند تھے، مگر نصاریٰ ان سے بظن مستقیم مخالف تھے۔ وہ ان دنوں میں صحبت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔

اسلام نے راہ وسط و اعتدال اختیار کی، ایام حیض میں زنا شوئی کے تعلقات مختلف امراض و مفاسد کے باعث تھے، اس لئے ان کو تو حرام قرار دیا گیا کہ انسان ضرر اور نقصان سے محفوظ رہے۔ میل جول اور اختلاط میں کوئی حرج نہ تھا، اس لئے اس کی اجازت دی گئی۔

## افرائش نسل

نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنْتُمْ شَتْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُّسْلِمُونَ ۚ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾

”تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لئے پہلے بھیج دو اور اللہ سے ڈرو اور جانے رہو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دو۔“

مرد و عورت کے باہمی تعلقات و روابط میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حقیقی مقصد نسل انسانی کی زیادتی اور اس کی نشو و تربیت ہے۔ اس کے لئے قرآن حکیم نے ”کھیتی“ کا بہتر لفظ استعمال کیا، جس سے ایک طرف تو یہ مقصد تھا کہ خاوند اور بیوی کے نازک تعلقات کو ایسے اشارات و کنایات میں بیان کیا جائے کہ ہر گھر میں مرد و عورت، لڑکے اور لڑکیاں، چھوٹے اور بڑے اس کتاب کو پڑھ سکیں اور کسی قسم کا حجاب نہ پیدا ہو۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے جو دنیا میں قرآن کے سوا اور کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآن یہ بھی چاہتا تھا کہ ان تعلقات کی حقیقی

میں فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ عَلَيْكُمْ لَفَيْحًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا (البقرہ ۱۰۰) پس جب اہل کتاب کی اطاعت جائز نہیں تو کفار و مشرکین ان سے کہیں زیادہ اس ممانعت میں داخل ہوں گے۔

غرض و غایت بھی بیان کر دے۔ حیض کے ایام میں امراض خبیثہ اور مفسدہ کا اندیشہ تھا اور ضرر و نقصان کی وجہ سے یہ غرض نہیں حاصل ہو سکتی تھی، اس لئے پہلی آیت میں صحبت کی ممانعت کر دی۔

اب فرمایا کہ پاک ہونے کے بعد جب اور جس طریق پر آرزو ہو، اس کے قریب جاسکتے ہو۔ کوئی شخص اپنی کھیتی کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اصلی غرض پیداوار ہوتی ہے، کسان ایک قانون کے ماتحت خاص وقت میں بیج بوتا ہے، ہل چلاتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے اور وقت پر فصل کاٹ لیتا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص تمام ان لغو و مہمل طریقوں کو یک قلم ترک کر دے جس سے انسانی نطفہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اور شریعت کے قاعدہ کے مطابق صحبت کرے تاکہ اولاد پیدا ہو جو ان مقاصد کی تکمیل کرے جن کے لئے باپ کی زندگی وقف تھی۔

خداوند قدوس نے تمہیں ایک قانون نوازش کر دیا ہے، اس کی پابندی کا خیال رہے۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مشرکین عرب کا دستور العمل تمہیں معلوم ہے، مسلمانوں کو خوش ہونا چاہئے کہ قانون اسلام میں ان تمام تکالیف و شدائد کا سد باب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر گز تنگی اور مصیبت ڈالنے کا آرزو مند نہیں ❶۔

برو تقویٰ کی حفاظت

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْصَةً لِّآيَاتِكُمْ أَنْ تَبْذُلُوا وَتَتَّقُوا ۚ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۸۱﴾  
يُؤْخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْسَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤْخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۸۲﴾

”اور اپنی قسموں کے سبب اللہ کو مانع نہ بناؤ کہ نہ سلوک کرو اور نہ پرہیز گار بنو اور نہ لوگوں میں میل ملاپ کرو اور اللہ سنا جانتا ہے۔ تمہاری قسموں میں سے یہود پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا، مگر ان قسموں پر گرفت کرے گا جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“

قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے اصول اساسی اور مقاصد مہمہ کبھی نظر انداز نہ ہوں، اور وہ یہ ہیں:

(الف) .... برو احسان: دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔

(ب) .... تقویٰ و طہارت: اپنے اندر اخلاق فاضلہ پیدا کرنا اور ورع و پاکیزگی سے آراستہ ہونا۔

(ج) .... اصلاح بین الناس: لوگوں میں اگر منازعات و مناکشات پیدا ہوں تو ان کا رفع و انسداد اور ان کو آپس میں صلح و آشتی سے رہنے کی تاکید کرنا۔

❶ ان آیات میں مرد و عورت کے معاملات کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا، مگر ان کی جزئیات کو خود ان کے ایمان و دیانت پر چھوڑ دیا کہ اپنی ضروریات کے مطابق ہر قسم کا قانون وضع کر سکتے ہیں، مگر یہ خیال رہے کہ قانون اساسی نہ ٹوٹنے پائے اور افزائش نسل کا مقصد سامنے رہے۔ ایسے ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے جس قدر قانون مرتب کر دیا اس کا اتباع تو ہر حالت میں ضروری ہو گا، لیکن اگر اس سے مزید براں جدید حوادث و واقعات کی بنا پر اور زیادہ دستور العمل کی ضرورت محسوس ہو تو جدید قانون وضع کیا جاسکتا ہے، مگر اس کی تعظیم و تقبیل میں مقاصد شریعت فوت نہ ہوں اور قانون اساسی پر زدن نہ پڑے ورنہ اس پر مواخذہ ہو گا۔ اور تمام قانون بنانے والے مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

ایک مسلم کی زندگی کے اعظم ترین مقاصد یہی ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا قانون نہ بنے جو ان کے مخالف ہو، بلکہ اگر کبھی اتفاقاً ایسا ہو جائے تو اس قانون کو منسوخ کرنا ضروری ہو گا۔ اگر اس پر عمل کرنے کی قسم کھالی تھی تو اس کے لئے کفارہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ قسم کی خاطر قانون صحیح کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو خوش کرنے کی خاطر شہد کو حرام کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی: لِمَ تَحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ قَدْ فَضَّ اللَّهُ لَكُمْ تُحِلَّةَ أَيْسَابِكُمْ (التحریم ۱۰۲) ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”اگر میں کسی کام کے نہ کرنے کے لئے قسم کھاؤں، بعد میں معلوم ہو کہ اس کا کرنا بہتر ہے تو اپنی قسم فوراً توڑ دوں گا“، اس لئے کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اللہ کی قسم کھا کر نیک کاموں سے رک جائے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ قانون کس نیت سے بنایا گیا تھا اور کس ارادہ سے اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

قسمیں کئی طرح کی ہوتی ہیں:

(۱).... یمین لغو: جس کے دو معنی ہیں۔

(الف).... کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ زبان سے کھائی گئی۔

(ب).... قسم تو ارادہ سے کھائی گئی مگر گمان یہ تھا کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے درست ہوگی۔ دونوں قسموں پر شریعت کوئی مواخذہ نہ کرے گی اور نہ ان کا اعتبار ہو گا۔

(۲).... منعقدہ: آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائی جائے۔ اگر اس نے قسم پر عمل کر لیا تو بہتر، ورنہ ترک کرنے کی صورت میں کفارہ واجب ہو گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ:

(الف).... ایک غلام آزاد کر دے۔

(ب).... اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔

(ج).... یہ بھی نہ ہو سکے تو برابر تین دن تک روزہ رکھے۔

(۳).... غموس: ارادۃً ایک معاملہ کے متعلق جھوٹی قسم کھائی، اس کا گناہ اس قدر اشد شدید ہے کہ محض کفارہ کافی نہ ہو گا، بلکہ نہایت ہی الحاج و تضرع کے ساتھ توبہ و انابت الی اللہ کرنی ہوگی۔ تب جا کر یہ جرم عظیم معاف ہو گا یہ قسم ہمیشہ ماضی سے تعلق رکھتی ہے ①۔

① مذکورۃ الصداقیت نے قانون کے اصول اساسی بیان کر دیے، ان کو پیش نظر رکھ کر ہم جزئیات کے لئے قانون بنانے کے مجاز ہیں۔ یہ دستور العمل نذر اور یمین کے درجہ کا ہو گا اس میں برو تقویٰ اور اصلاح بین الناس کا خیال رکھنا ضروری ہو گا۔ اگر کوئی جدید قانون ان کی مخالفت میں بن گیا تو اس کا توڑنا ضروری ہو گا۔ اگر ارباب حل و عقد نہایت ہی غور و فکر اور کافی بحث و مشاورت کے بعد ایک قانون پر اتفاق کر کے اس کے نافذ کرنے کا عزم کر لیا، بعد میں اس کی

لِّلَّذِينَ يُؤَلُّونَ مِن نِّسَابِهِمْ تَرِثُصْ اَرْبَعَةٌ اَشْهُرٌ ۚ فَاِنْ فَاَعُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَبِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۱﴾

”جو لوگ اپنی عورتوں سے علیحدہ رہنے کی قسم کھالیں ان کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے، پھر اگر رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

قسموں کے سلسلہ میں طلاق کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جو عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی۔ اگر مرد و عورت میں اختلاف پیدا ہو جاتا اور وہ یہ بھی نہ چاہتا کہ میری عورت کسی دوسرے کے پاس جائے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اس کو چھوڑ دیتا کہ نہ تو وہ خاوند والی ہوتی اور نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی، تاکہ اسے تکلیف ہو اور مصیبت میں مبتلا رہے۔ یہ نہایت ہی بدترین رسم تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے اس غلط کاری کی اصلاح ہو۔ اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کرے گا تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف).... کوئی مدت معین نہ کرے۔

(ب).... چار ماہ کی مدت معین کر دے۔

(ج).... چار ماہ سے زائد کی قید لگا دے۔

(ک).... چار ماہ سے کم مدت کا تذکرہ کر دے۔

پہلی تین صورتوں کو شریعت کی اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں۔ ان تینوں کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر خاوند چار ماہ کے اندر اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا جائے تو اسے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا ہو گا اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی تو اس عورت پر طلاق کا نفاذ ہو گیا۔ اب بلا نکاح رجوع جائز نہ ہو گا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے اور حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑ دی تو کفارہ ادا کر دے اور قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے۔

شریعت طاہرہ نے ہمیشہ کے لئے ایک قاعدہ معین کر دیا کہ ایلاء کی مدت زیادہ سے زیادہ چار ماہ ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد و عورتوں کے حقوق بھی ادا نہ کریں اور ان کو اس طرح سے رکھیں کہ وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکیں، بلکہ خاوند کو چار ماہ غور کے لئے مل سکتے ہیں، اگر وہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنے کو تیار ہے تو بہتر اور نہ علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی۔ کیونکہ جب موانست کی کوئی صورت نہیں اور مزید فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے تو حکومت مداخلت کر کے خاوند اور بیوی میں تفریق کر دے گی۔

غلطیاں معلوم ہوئیں اور فوراً اس کی اصلاح کر دی، اس پر اصرار نہ کیا تو اللہ اپنے علم اور بردباری سے کام لے کر ان غلطیوں کو نظر انداز کر دے گا۔

## طلاق کے متعلق چند الفاظ

دنیا کے قدیم میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، عیسائیت کے پرستار جناب پولوس نے فرمایا: عورت ہی کے ذریعہ گناہ دنیا میں آیا اور عورت ہی کے طفیل میں ہم کو موت دیکھنی پڑی۔ برنارڈ، انٹونی، جیروم اور گریگوئے اعظم نے نہایت بلند آہنگی سے عورت کے متعلق شیطان کا آلہ، شیطان کے ہتیاروں کی جڑ، شیطان کا دروازہ، بچھو، شاہراہ عصیاں اور زبور کا زہر کے الفاظ استعمال کئے۔ خود یورپ کو اس بات کا فیصلہ کئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ عورت میں روح موجود ہے۔

ان مختلف اقوال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ازمنہ قدیمہ میں عورت کی نسبت کس قسم کے خیالات تھے۔ وہ کسی قدر شکوک و شبہات کی آماجگاہ رہی ہے۔ اس کے حق احترام و حریت کو خود غرض مرد نے ہمیشہ چھیننے کی کوشش کی۔ اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ اس کے تمام حقوق کو یک قلم فراموش کر دیا جاتا۔ باوجود اس قدر ادعائے تہذیب و تمدن کے یورپ میں اب تک یہ حالت ہے کہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب تک وہ ناکندہ ہے، باپ کے نام سے مشہور ہوتی ہے، جب نکاح ہو گیا تو خاوند کے نام میں اس کی شہرت فنا ہو جائے گی۔ کوئی عورت اپنے نام سے جائیداد نہیں خرید سکتی، یہی وجہ ہے کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں ہر قوم افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔

عرب طلاق دینے میں بالکل آزاد تھے، ان کے نزدیک عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔ اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، طلاق کی کوئی حد نہ تھی، جب چاہا رجوع کر لیا اور ذرا سی ناراضی پر الگ کر دیا۔ یہودی بھی اس باب میں عرب کے ہم آہنگ تھے۔ عیسویت کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی اصلاح کرے، مگر اس نے طلاق کے متعلق ایسا قانون مرتب کیا کہ آج دنیا اس پر عمل کرنے سے عاجز ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے، اسے طلاق نامہ لکھ دے، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی بیوی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔ (متی ۱۳: ۵)

ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوک جب اپنی بیویوں سے تنگ آ جاتے ہیں اور ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہوتی تو ان پر زنا کا الزام لگاتے ہیں، جس کے ثبوت میں جھوٹے گواہ پیش کئے جاتے ہیں اور اس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں نے یہ خیال کیا کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات ایسے ہی ہیں جیسے خدا کے روابط اپنی مخلوق سے ہیں۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ عورت ہمیشہ خاوند کی غلام رہے، اس کی پرستش کرے، مگر اس کے مرنے پر وہ بھی آگ میں جل جائے، دوسری شادی نہ کرے۔ اسی قسم کی اور پابندیاں بڑھادیں۔

قرآن حکیم نے ان تمام بندشوں کو دور کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی مردوں پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں: **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** (البقرہ ۲۲۸) طلاق کے بارے میں جس قدر



افراط و تفریط تھی اس کو دور کر کے راہ اعتدال معین کر دیا، قیود و شرائط لگا دیں اور لسان نبوت نے ان مختصر الفاظ میں طلاق کی حقیقت پر روشنی ڈالی کہ ابغض السباحات عند الله الطلاق، ”تمام جائز اور حلال اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین طلاق ہے۔“ گویا طلاق دینے میں بہت زیادہ دوراندیشی سے کام لینا پڑے گا۔ قرآن نے ان وجوہ و اسباب پر زیادہ وضاحت سے گفتگو نہیں کی۔ بعض مقامات پر صرف اشاروں سے کام لیا ہے اور اس کا قطعی و آخری فیصلہ ہر ملک اور قوم کی اپنی اپنی تہذیب و شائستگی پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ اس نے پابندیوں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی آزادی کو محدود کر دیا جائے ❶۔

### تین حیض کا انتظار

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ  
بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ  
بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ جَالٍ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾

”اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روک رکھیں اور اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو انہیں جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپا رکھیں اور اگر شوہر اصلاح کا قصد رکھیں تو اس مدت میں ان کے لوٹا لینے کے وہی زیادہ حق دار ہیں۔ اور جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر حق ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا بھی حق ہے اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔“

یہاں سے طلاق کے مختلف احکام بیان کئے جاتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) جس عورت سے خاوند نے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، اس کو حیض آتا ہو اور وہ آزاد بھی ہو، اس کو جب طلاق دی جائے گی تو اسے تین حیض تک انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مدت تقریباً تین ماہ ہو جاتی ہے، اس زمانہ انتظار کو شریعت کی اصطلاح میں ”عدت“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مدت میں دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اس انتظار کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ جن عورتوں سے شوہر نے صحبت یا خلوت صحیحہ نہ کی ہو، تو طلاق کی صورت میں ان کے لئے کوئی عدت نہیں، جس

❶ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کے حقوق ادا کرنا، اس کے جان و مال کی حفاظت، اس کی تعلیم و تربیت اور تمام ضروریات کی فراہمی حاکم کے ذمہ ہے، لیکن اگر وہ غفلت سے کام لیتا ہے، حقوق کی نگرانی نہیں کرتا اور اسکی حریت و آزادی کو سلب کر لیتا ہے تو وہ حکومت کا حق دار نہیں رہا، بلکہ رعایا متعلق ہو کر اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرے اور اس کو حکومت سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کرے۔ مگر اسے فوراً ہی الگ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے چار ماہ کی مہلت دی جائے گی۔ ممکن ہے وہ اپنی اصلاح کر لے اور حقوق ادا کرنے کو تیار ہو جائے، لیکن اگر باوجود تنبیہ کے اس کی حالت میں تغیر نہ ہو تو چار ماہ کے بعد رعایا اس کو تخت سے اتار دے گی اور اس کی جگہ دوسرے کو منتخب کر لے گی۔ سورہ توبہ میں جب کفار کو انداز حرب دیا گیا تو غور کرنے کے لئے انہیں بھی چار ماہ کا زمانہ دیا گیا۔ بِرَأْفَةٍ مِنَ اللَّهِ وَ رِسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ هَدَيْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ فَسَبِّحُْوا فِي الْكُرْهِ الْأَذَىٰ أَزْبَعَةً أَشْهُو (التوبہ ۱۲) اس سے معلوم ہوا کہ غور کرنے کے لئے شریعت نے سال کا تیسرا حصہ مقرر کر رکھا ہے، مرد کو چار ماہ کی مہلت دی گئی کہ فوراً دوسری جگہ نکاح مشکل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات اچھے ہو جائیں، ایسے ہی حاکم چار ماہ تک غور کرے، شاید اس مدت میں باہمی صلح و صفائی ہو جائے یا اس درمیان میں رعایا کوئی دوسرا حاکم تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔



عورت کو حیض نہ آتا ہو اس کی تین صورتیں ہیں۔

(الف).... کسی نے نابالغ لڑکی سے شادی کر لی اس کی عدت تین ماہ ہے۔

(ب).... اگر کوئی عورت بہت بوڑھی ہے کہ حیض کا خون بند ہو گیا، اس کو بھی تین ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔

(ج).... اگر وہ حاملہ ہے، اس کی عدت وضع حمل کے وقت ختم ہوگی۔

(۲) اگر ان عورتوں کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے اور اعمال کی ذمہ داری محسوس کرتی ہیں، تو اپنے حمل یا حیض کو مخفی نہ رکھیں۔ کیونکہ اخفا کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عدت کے شمار کرنے میں دقت پیدا ہو جائے گی۔

(۳) اگر خاوند اور بیوی اصلاح کے آرزو مند ہوں تو پھر زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان عورتوں کو پہلے خاوندوں ہی کی طرف لوٹا دیا جائے۔ تین ماہ کے زمانہ میں انسان کافی غور و فکر سے کام لے سکے گا۔ الگ رہنے کی وجہ سے عارضی رنجش اور ناراضگی دور ہو جائے گی۔ سابقہ الفت و محبت پھر عود کر آئے گی، پہلا تعلق قائم ہو جائے گا اور اس طرح ان جلد بازیوں کا تدارک ہو جائے گا جو طلاق کے متعلق تصور کی جاسکتی ہیں۔

(۴) مردوں کو توجہ دلائی کہ نکاح کی بنا پر جس طرح تمہارے حقوق عورتوں پر عائد ہوتے ہیں ایسے ہی ان کے حقوق تم پر ہیں، ان کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ اس ایک جملہ نے درحقیقت طلاق کے ناجائز استعمال کو روک دیا اور تمام دنیا میں عورت کی قدر و منزلت قائم کر دی جو اس سے پہلے اُس کو نصیب نہ تھی۔ البتہ جب خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہو گا تو توفیق رکھنے کی وجہ سے خاوند کی رائے کو ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

خاوند کا فرض ہے کہ اپنی بیوی کے حقوق کا خیال رکھے، اس لئے کہ وہ اس کی نگرانی میں رکھی گئی ہے، اگر مرد اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لے گا تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے اپنے غلبہ و اقتدار سے کام لے کر اُسے ذلیل کر دے گا<sup>۱</sup>۔

۱۔ گزشتہ آیات میں اگر مزید درس و فکر سے کام لیا جائے تو ان سے حسب ذیل مسائل کا استنباط ہو گا۔

(۱) اگر حاکم و محکوم میں اختلاف شدید ہو گا اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، بلکہ رعایا نے اس کو معزول کر دیا، اس وقت رعایا کے لئے مناسب یہی ہے کہ معزول شدہ حاکم کے تمام سابقہ مطالبات ادا کر دے۔

(۲) راعی و رعایا میں اگر مصالحت ہو جائے اور حاکم ادائے حقوق کا عہد و پیمان کرے تو زیادہ قرین عقل و انصاف یہی ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوم کی عتائ سیاست رہے۔

(۳) مگر حاکم یہ امر ہمیشہ اپنے ذہن نشین کر لے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں کہ رعایا میرے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کرے اور میرا حکم ماننے کو تیار ہو ایسے ہی رعایا کے بھی بہت سے حقوق ہیں جن کا پورا کرنا حاکم کا اولین فرض ہے۔ مثلاً اس کی جان و مال کی حفاظت، بیرونی و اندرونی مصائب سے حفظ و صیانت، تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام اور تمام داخلی و خارجی معاملات میں کامل حریت و استقلال وغیرہ وغیرہ۔

(۴) البتہ اگر راعی و رعایا میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو جائے اور ارباب حل و عقد دونوں جانب برابر ہوں تو جس طرف حاکم کی رائے ہوگی اسے ترجیح دی جائے گی۔

## طلاق رجعی

گزشتہ آیات میں مردوں کے حقوق بیان کئے گئے، اب عورتوں کے حقوق کا تذکرہ آتا ہے۔

الطَّلَاقُ مَرْئِنٌ فَاِمْسَاكِ بِمَعْرِوْفٍ اَوْ تَسْرِيْعٍ بِاِحْسَانٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَآءَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿٣١﴾

“طلاق دوہی مرتبہ ہے، پھر یا تو دستور کے مطابق روک رکھنا ہے یا خوبی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور جو مال تم نے ان کو دیا ہے، تمہیں جائز نہیں کہ اس میں سے کوئی شے لے لو، مگر یہ کہ خاوند اور بیوی کو اس بات کا خوف ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس صورت میں کہ تم لوگوں کو اس بات کا خوف ہو کہ میاں بی بی اللہ کے احکام کو پورا نہ کر سکیں گے اور عورت اپنی جان بچانے کے لئے کچھ دیدے تو اس میں دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی باندھی ہوئی حدود سے آگے بڑھ جائیں تو یہی لوگ ظالم ہیں۔”

پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ بعولتھن احق بہر دھن، اب اس طلاق کی مزید تفصیل بیان کی جاتی ہے، طلاق کی ایک قسم رجعی بھی ہے جس کا اس آیت میں تذکرہ ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایسی طلاق جس کے بعد عورت اپنے پہلے خاوند کی طرف لوٹائی جاسکتی ہے صرف دوہی مرتبہ ہے، بشرطیکہ ادائے حقوق کا خیال ہو۔ اس سے مقصد یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو طلاق کا وقوع نہایت ہی شاذ حالات میں ہوں۔

(۲) عرب میں دستور تھا کہ صدہا مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی خاوند رجوع کر سکتا تھا، جس سے عورتوں کے حقوق بالکل ہی فنا ہو جاتے تھے۔ اسلام نے آتے ہی مرد کی آزادی کو چھین لیا اور فرمایا کہ اگرچہ ایک شخص دودفعہ طلاق دے کر رجوع کا حق رکھتا ہے، مگر تیسری مرتبہ بھی طلاق دینے کے بعد یہ حق سلب ہو جائے گا اور اب خاوند اور بیوی میں علیحدگی ہو جائے گی، دو طلاقیں کے بعد اسے اجازت دی گئی کہ۔

(الف) عدت کے اندر رجوع کرے، اس سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے اور اس کے حقوق و مراعات کا خیال رکھے۔

(ب) ورنہ تیسری مرتبہ طلاق دیکر نیکی کے ساتھ رخصت کر دے۔

(۳) جب خاوند اپنی بیوی کو بغیر کسی قصور اور جرم کے طلاق دیتا ہے تو وہ مہر وغیرہ سے ایک پائی بھی واپس لینے کا مجاز نہیں اور اگر اب تک مہر ادا نہیں کیا تو طلاق کے وقت ایک ایک کوڑی شمار کر کے دینی ہوگی۔ یہ بھی

(۵) اگر دوبارہ حکومت لینے کے باوجود اس نے پھر بھی رعایا کے حقوق ادا نہ کئے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے بالاتر ایک اور قوت بھی موجود ہے جو اس نظام عالم کو قائم کئے ہوئے ہے، وہ فوراً اس پادشاہ کو ذلیل کر دے گی اور جب تک کوئی دوسرا شخص اس کی سرکوبی کے لئے تیار نہ ہو گا اس کو عدوان و سرکشی میں ترقی کرنے کا اور موقع دے گی، تا آنکہ اللہ کے غضب کا ہاتھ چکے اور اس کے خرمن حکومت کو جلا کر خاکستر کر دے۔

طلاق کی آزادی کو روکنا ہے۔ جب اتنی مدت تک دونوں کی صحبت و یکجائی رہی، نکاح کے وقت یہی عہد و پیمان ہوا تھا کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ اب اگر بعض اسباب کی بنا پر ناچاقی ہو گئی تو پھر بھی دیا ہوا مہر واپس نہیں لیا جاسکتا۔

(۴) مہر واپس لینے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس وقت جبکہ مرد و عورت میں اختلاف انتہا تک پہنچ گیا ہو اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہ رہی ہو، جانبین سے بذریعہ حکم کے فیصلہ کی کوشش کی گئی، مگر ناکام رہی، لیکن مرد طلاق دینے پر رضامند نہیں، عورت اس فکر میں ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس سے نجات حاصل کرے، ایسی حالت میں اگر عورت خود بخود اپنے خاوند کو کچھ دینے پر رضامند ہو جائے تو خاوند اس رقم کے وصول کرنے پر شریعت کے لحاظ سے گنہگار نہ ہوگا۔ اس قسم کی طلاق کو شریعت کی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے۔ اس روایت سے اس مسئلہ پر اور زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

عن ابن جریج قال نزلت هذه الآية في ثابت بن قيس وفي حبيبه وكانت اشتكت الى رسول الله ﷺ فقال اتردين عليه حديقته قالت نعم فدعا فذكر ذلك له قال وتطيب لي بذلك قال نعم قال قد فعلت فنزلت ولا يحل لكم ان تأخذوا مما اتيتموهن شيئا الاية

ابن جریر کہتے ہیں کہ یہ آیت ثابت بن قیس اور حبیبہ کے حق میں نازل ہوئی، حبیبہ نے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق چاہی، آپ نے فرمایا تم اس کا باغ واپس کرنے کو تیار ہو جو اس نے تمہیں مہر میں دیا تھا؟ اس نے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ آپ نے قیس کو بلا کر اس کی رضامندی لی اور طلاق دلوا دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت نے بتا دیا کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے ایسے ہی عورت بھی اپنے خاوند سے طلاق لینے کی مجاز ہے۔ یہ قانون کی حدود ہیں ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ ہو۔

حلالہ

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۖ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاءَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾

”پھر اگر عورت کو طلاق دیدے، تو اس کے بعد وہ عورت اس کو حلال نہیں جب تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو دونوں میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں، بشرطیکہ دونوں کو امید ہو کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ کی حدیں ہیں جن کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کے بیان فرماتا ہے جو سمجھتے ہیں۔“

تین طلاقیں کے بعد خاوند اور بیوی میں تفریق ہو گئی، اب یہ عورت اس وقت تک کے لئے اس پر حرام ہے جب تک کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح نہ کر لے، پھر یا تو وہ مر جائے، یا اس کو طلاق دیدے۔ اس کے بعد وہ عورت اپنے پہلے خاوند

کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ اس کو شرعی اصطلاح میں حلالہ کہا جاتا ہے۔ شریعت کے اعتبار سے تو یہی دو صورتیں نکاح کے جواز کی تھیں، مگر بعض ارباب حیل یہاں بھی خدع و فریب سے باز نہیں آتے اور حیلہ کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں یعنی جب پہلے خاوند نے طلاق دے دی پھر اس کو اپنی حرکت پر ندامت ہوئی اور اس نے دوبارہ نکاح کی آرزو کی تو اس کی خاطر ایک شخص نے نکاح کر لیا اور اس کے بعد اسے طلاق دے دی، تاکہ اس طرح وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہو سکے، مگر تمام ائمہ و فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ یہ نکاح حرام و ناجائز ہے۔

عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ: سئل رسول اللہ ﷺ عن المحلل فقال لا الا نکاح رغبت لا نکاح دلستہ ولا استتہزاء بکتاب اللہ ثم یدوق العسيلة، “آپ سے محلل کی نسبت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا نہیں، نکاح رغبت اور شوق سے ہونا ضروری ہے، اس میں فریب اور خدا کی کتاب کے ساتھ استہزاء و تمسخر نہ ہو۔ نکاح میں ضروری ہے کہ خاوند اور بیوی باہم متتبع ہوں۔” حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لا اوقی بمحلل ولا محلل لہ الا رجعتہ “جب کبھی میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا یا وہ جس کے لئے تحلیل کی گئی، لایا گیا تو میں نے دونوں کو سنگ سار کیا۔” سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ: دفع الی عثمان رجل تزوج امرأة یحلها لزوجها ففرق بینہما وقال لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبة غیر دلستہ، “حضرت عثمان کے پاس ایک مرد لایا گیا جس نے ایک عورت سے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ اس کو پہلے شوہر کے لئے حلال کر دے۔ آپ نے ان دونوں میں تفریق کرادی اور فرمایا کہ یہ صرف اس نکاح کے ذریعہ اس کی طرف لوٹ سکتی ہے جس میں رغبت ہو نہ کہ فریب کاری۔” اسی قسم کی الفاظ حضرت علی سے بھی منقول ہیں: لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبة غیر دلستہ، حضرت ابن عباس نے محلل اور محللہ کو ملعون فرمایا ہے: عن شعث عن ابن عباس قال لعن اللہ المحلل والمحلل لہ، حضرت حسن بصری کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: ان رجلا من قومی طلق امراتہ ثلاثا فندم وندمت فاردت ان انطلق فاتزوجها واصلقها صدا قائم ادخل بها کما یدخل الرجل بامرأتہ ثم اطلقها حتی تحل لزوجها فقالہ الحسن البصری اتق اللہ یا فتی ولا تکنن مسبا رنا ولحدود اللہ، “میری قوم میں سے ایک نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں، اس پر وہ دونوں نادم ہوئے، یہ میرا ارادہ ہے کہ اس عورت سے نکاح کر لوں، اس کا مہر ادا کر دوں اور پھر جس طرح شوہر اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے جاؤں اور اس کے بعد اسے طلاق دیدوں، تاکہ وہ اپنے شوہر کے لئے حلال ہو جائے۔ حسن بصری نے جواب دیا کہ اے نوجوان! اللہ سے ڈر اور اس کی حدود کے لئے آگ کی کھوٹی نہ بن۔”

پھر یہ کسی فرد واحد کی رائے نہیں کہ نکاح تحلیل حرام و ناجائز ہے، بلکہ سعید بن المسیب، حسن بصری، ابراہیم غنمی، عطاء بن ابی رباح، ابو الشعثاء جابر بن یزید، شعبی، قتادہ، بکر بن عبد اللہ المزنی، مالک بن انس، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، سلیمان بن داؤد البہاشمی، ابو خیشمہ زہیر بن حرب، ابو بکر بن شیبہ اور ابو اسحاق الجوزجانی جیسے اساطین امت و ائمہ اعلام اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

یہ رکاوٹ تو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ تیسری طلاق سوچ سمجھ کر دی جائے، مگر حلالہ کی یہ صورت تو بے حیائی، بے غیرتی اور بد اخلاقی کا فتح باب کرتی ہے۔ ایک شخص اپنی عورت کو تین مرتبہ طلاق دیتا ہے، وہ دوسرے مرد سے نکاح کرتی ہے، مگر مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے طلاق لے کر پھر پہلے خاوند کے پاس جائے۔ نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی ہمیشہ مل کر رہیں اور کبھی ان میں افتراق نہ ہو، یہ بد بخت اس مقصد اصلی کو فنا کر چکے، اب صرف قانون کی ظاہری صورت کے پابند بننا چاہتے ہیں۔ بلکہ اگر موجودہ خاوند اور بیوی میں اتحاد ہو گیا تو پہلے خاوند کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان میں لڑائی کرانے کی فکر میں لگ جائے۔ البتہ اگر اتفاق سے موافقت نہ ہو سکی، طلاق تک نوبت آگئی اور ادھر پہلے خاوند نے بھی نکاح کا شوق ظاہر کیا تو شریعت کی جانب سے ممانعت نہیں۔ ان حدود الہیہ کا توڑنا مناسب نہیں، ورنہ بے حیائی کا مرض پیدا ہو جائے گا<sup>۱</sup>۔

ضرر دینا جائز نہیں

وَ اِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَنْتَنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ اَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُنْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا

۱؎ گزشتہ آیات سے سیاست و ملک داری کے حسب ذیل مسائل کا استخراج کیا جاسکتا ہے۔ ہم مزید سہولت و آسانی کی خاطر فقہی احکام کو بھی ساتھ ہی درج کئے دیتے ہیں کہ تطابق میں دقت نہ ہو۔

(۱) نکاح ایک قسم کا معاہدہ ہے، طلاق دینے وقت خاوند مہر وغیرہ لینے کی کوشش نہ کرے، جن شرائط پر کسی شخص کے ہاتھ میں ایک قوم کی باگ دی جاتی ہے وہ بھی دراصل ایسا ہی معاہدہ ہے جس طرح خاوند اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ حاکم جب ان عہود و موافقت کا پابند نہیں اور قوم اسے معزول کر رہی ہے تو اسے جائز نہیں کہ جن اصلاحات کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا عزل کے وقت برباد کر دے۔ کیونکہ اس سے قومی نشو و نما تقابلیں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

(۲) مرد و عورت میں اصلاح نہیں ہو سکتی مگر خاوند طلاق دینے پر رضامند نہیں، اس صورت میں فدیہ دے کر عورت اپنے آپ کو آزاد کر سکتی ہے۔ امیر جب نالا ئق و بدکار ہو، رعایا کے حقوق کی مطلق پروا نہ کرتا ہو، بادجو و صدائے احتجاج بلند کرنے کے اصلاح کی طرف توجہ نہ کرے اور حکومت سے بھی دست بردار نہ ہو، تو قوم حکمت عملی اور دانائی سے کام لے کر امیر کو تخت سے اتارے، تاکہ ملک میں بد نظمی اور فساد بھی نہ ہو اور وہ برطرف بھی ہو جائے۔

(۳) حلالہ کی صورت یہ ہے کہ اگر تفریق کے بعد عورت نے دوسری جگہ شادی کر لی اور اتفاقاً وہاں سے بھی طلاق لینی پڑی اور پہلا خاوند بھی نکاح کے لئے تیار ہو گیا اور آئندہ حقوق کی نگہداشت کا وعدہ کیا، مگر اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنے نکاح کی خاطر دوسرے خاوند اور بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کر دے۔ ایسے ہی جب امیر معزول کر دیا گیا، رعایا نے دوسرے شخص کو اپنا امیر منتخب کر لیا، مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اس سے بھی گنہگار ہے، اس پر پہلے امیر کو دعوت دی گئی کہ اگر حکومت سنبھال لے اور اس نے بھی پابندی قانون کا عہد کیا، اس امیر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ عزل میں جدید امیر کو ناقابل ثابت کرنے اور نقصان دینے کی فکر نہ کرے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تین مرتبہ طلاق دینے کے بعد خاوند اور بیوی میں مصالحت ہوتی غیر ممکن ہو جاتی ہے اور ان کا باہمی ازدواج خلاف مصلحت ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی جو امیر رعایا کی صدائے احتجاج بلند ہونے پر تین مرتبہ معزول ہو چکا ہو، اب اس سے یہ توقع رکھنی فضول ہے کہ اپنی اصلاح کرے گا، بلکہ بہتر یہی ہے کہ آئندہ انتخاب میں اس کو امیدوار بننے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔

(۵) جو شخص اپنی عورت کو اس غرض سے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے کہ وہاں سے طلاق لے کر پھر اس سے نکاح کر لے تو وہ بے حیائی کا مرتکب ہوتا ہے، اپنے جذبہ صادق کو فنا کرتا ہے اور شریعت کی زبان میں اس کو ملعون کہا گیا ہے۔ پس اگر ایک مسلمان اپنی عورت کی عصمت و آبرو بچانے کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان و اسلام اور اللہ کا گھر اس سے کہیں زیادہ عزیز و محترم ہیں، کیا کلمہ اسلام کے حفظ و بقا اور قرآن حکیم کی دعوت و ارشاد کے لئے اس کے اندر جوش و ولولہ نہ پیدا ہو گا۔

لَتَعْتَذِرُوا ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا إِلٰهَ إِلَّا إِلٰهَ هُذُوًا ۚ وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣١﴾

”اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی پھر وہ اپنی عدت تک پہنچ گئیں تو ان کو دستور کے مطابق روک رکھو یا اچھی طرح رخصت کرو اور ان کو ستانے کے لئے نہ روک رکھو کہ زیادتی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا تو بیشک اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اللہ کے احکام کو ہنسی نہ بناؤ اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو تم پر ہے اور جو اس نے تم پر کتاب اتاری اور کام کی باتیں جن سے تم کو نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو اور جانے رہو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔“

چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق رجعی کے متعلق سخت بد نظمی اور بے ترتیبی تھی، اس لئے پھر تاکید مزید کی کہ اگر رجوع کرنا ہو تو بہتر، ورنہ دستور کے مطابق شریفانہ طور پر اس بیوی کو الگ کرو اور یاد رہے کہ بے زبان عورت کو صرف تکلیف و مصیبت میں ڈالنے کی غرض سے گھر میں بند نہ رکھنا، کیونکہ اس اختلاف کی صورت میں تمہیں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھر میں ہر وقت جنگ رہے گی، عورت تمہاری عزت کا مطلق خیال نہ رکھے گی، تمہیں ہر وقت اس کی غلامی کرنی پڑے گی، وہ اپنی اولاد کو تمہاری نافرمانی کی تعلیم دے گی اور اس کو بد اخلاق بنانے کی کوشش کریگی۔ پس جو شخص اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور ایسا کرنا قانون الہی سے تمسخر و استہزاء کرنا ہے۔ تمہارا فرض یہ ہو کہ اللہ کا قانون اپنے محل اصلی پر استعمال ہو۔ عورت تمہاری نگرانی میں رکھی گئی ہے، خانہ داری کے لئے ایک دستور العمل نوازش کیا، جس کے اصول اساسی تمہارے ذہن نشین کر دیئے گئے، ان اعلیٰ ترین نعمتوں کی قدر یہی ہے کہ ان سے عبرت اندوز ہو کر تذکیر و موعظت پیدا کرو۔ اگر تم نے اس قانون کو بیجا طریق پر استعمال کیا اور اس میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ حکومت بھی مواخذہ نہ کر سکے، تو یاد رہے اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، تمہارا دل و فریب اس پر مخفی نہیں رہ سکتا۔

رکاوٹ پیدا نہ کرو

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ إِذَا وَاجِهَهُنَّ إِذَا تَرَاصُوا يَنْكِحُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذٰلِكَ يُوَعِّظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذٰلِكُمْ أَذٰی لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

• امیر کافر فرض ہے کہ حکومت لیتے وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اس کو پورا کرے۔ اگر ایسا نہیں کرتا، رعایا اسے معزول کرنا چاہتی ہے اور وہ الگ نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ کو محام و استوار کرنے کی غرض سے اور زیادہ سخت گیر قانون وضع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے کامیابی ہوگی، اس کا اقتدار قائم رہے گا، اس کی قوم کے تمام افراد عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں گے۔ تمام جلیل القدر عہدے ان کے قبضہ میں ہوں گے اور رعایا ذلت و رسوائی کی زندگی کے لئے مجبور ہوگی۔ مگر اسے یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اوپر آپ ظلم کر رہا ہے۔ رعایا کے دل سے اس کی عزت و حرمت جاتی رہے گی، بغاوت انگیز تحریکوں کے لئے راستہ کھل جائے گا، اس کے قتل کی تدبیریں ہوں گی، تمام ملک فتنہ و فساد کا گھر بن جائے گا اور اس بد بخت امیر کو ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔

”اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دید و پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اس سے نہ روکو کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جب وہ جائز طور پر آپس میں راضی ہو جائیں، یہ اس کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی اور صفائی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اگر عورت کو طلاق دے چکے اور اس کی عدت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا اب وہ جس جگہ چاہے نکاح کر سکتی ہے، خواہ پہلے شوہر سے کرے خواہ کسی اور شخص سے، دونوں صورتوں میں کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا۔ بعض اوقات خود پہلا خاوند ہی طلاق دینے کے بعد اس عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے سے روکتا ہے، کیونکہ وہ اسے ذلت خیال کرتا ہے اور کبھی اس عورت کے رشتہ دار ہی سد راہ بن جاتے ہیں۔ اس آیت میں دونوں کو روک دیا گیا ہے، انہیں تو اپنی عزت بچانے کی فکر ہے اور یہ خیال نہیں آتا کہ اگر وہ نکاح نہ کر سکی تو ممکن ہے اس سے زیادہ خرابیوں کی مرتکب ہو۔<sup>۱</sup>

اس آیت کے متعلق حسب ذیل مسائل کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

- (۱) عورت جس سے نکاح کا ارادہ کرے وہ غیر کفو نہ ہو، مہر مثل سے کم مقرر نہ ہو، ورنہ عورت کے ولی کو روکنے کا حق حاصل ہو گا۔ اگر وہ نکاح کر لے گی تو عدالت اس کو فسخ کر سکے گی۔
- (۲) اگر شرعی گواہوں کے بغیر نکاح کرنے لگے، نابالغہ بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کر لے یا ایسے شخص سے ازدواج کی تجویز کی گئی ہو جس سے نکاح حرام ہے تو یہ تمام صورتیں باطل ہوں گی اور ہر شخص کو روکنے کا حق ہو گا۔
- (۳) شوہر اول سے نکاح کے جواز کی صورت یہ ہو گی کہ اس نے تین طلاق نہ دی ہوں، ورنہ حلالہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا۔

### مسئلہ رضاعت

مباحث طلاق میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے، اس لئے فرمایا:

وَالْوَالِدَتُ يُرَضِّعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْعِمَ الرِّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارُّ وَالِدَةُ بَوْلِدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ ۚ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۚ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَأَلْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۰﴾

• جب راعی در عایا کی تفریق کی بنا پر ایک امیر کو معزول کر کے دوسرے کے تقرر کی تجویز ہوئی اور باہمی عہد و پیمان بھی ہو گیا تو معزول شدہ امیر کو جدید فرمانروا کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہ حاصل ہو گا، وہ لوگوں کو اس کی جانب سے بدگمان کرنے کی کوشش میں نہ مصروف ہو جائے۔ اس سے ملک میں نظم و نسق قائم نہ رہ سکے گا اور جب راعیا کے سر پر کوئی نگران کار نہ ہو گا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور قتل و خونریزی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔



”جو شخص چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے، تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں اور باپ پر جس کا وہ بچہ ہے دستور کے مطابق ان کا کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی کو تکلیف نہ دی جائے، مگر اس کی برداشت کے موافق، نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان دیا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کے سبب، اور ایسا ہی وارث پر بھی لازم ہے، پھر اگر وہ دونوں اپنی مرضی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو کسی دایہ سے دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں، جبکہ دستور کے مطابق جو تم نے مقرر کیا ہے، حوالہ کر دو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ اس زمانہ میں خاوند اپنی حیثیت کے مطابق تمام مصارف برداشت کرے۔ اگر خاوند اور بیوی کا متفقہ فیصلہ یہ ہو کہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائیں تو اس کی اجازت ہے، مگر اجرت ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ دودھ چھڑانے کی مدت ڈھائی سال قرار دی ہے وَحَبْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (الاحقاف ۱۵) دراصل اس میں حمل کے چھ ماہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ حمل کی مدت تو نو ماہ ہے مگر ابتداء کے تین ماہ ویسے ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ حمل کا ظہور تین ماہ کے بعد ہوتا ہے۔ پس دودھ کا زمانہ تو وہی دو سال رہا اور چھ مہینے حمل کے ہوئے۔

اس آیت میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) خاوند اور بیوی دونوں مل کر اولاد کی تربیت کریں۔

(۲) خاوند کا فرض ہو گا کہ بیوی کے تمام مصارف کا انتظام کرے اور کسی قسم کی تکلیف نہ دے۔

(۳) دونوں کو اجازت ہے کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کو دوسری عورتوں سے دودھ پلوائیں۔

(۴) جب دونوں کا مشورہ ہو تو دودھ چھڑا سکتے ہیں<sup>۱</sup>۔

۱ جس ترتیب سے اوپر مسائل بیان کئے گئے ہیں اسی ترتیب سے نتائج ملاحظہ ہوں۔

(الف) عورت اور مرد اگر متحد ان خیال ہوں تو ان سے اولاد پیدا ہونا ضروری ہے جس کی تربیت ان پر عائد ہوتی ہے، ایسے ہی جب حاکم و محکوم میں اتحاد و یگانگت ہوگی تو ضرور ہے کہ دوسری قومیں ان کی مفتوح ہوں یا ان کے ماتحت رہنا پسند کریں۔ ان سب اقوام کی حیثیت اولاد کی ہوگی راہی و رعایا کا مشترک مقصد یہ ہو گا کہ ان کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہیں۔

(ب) رعایا علوم و معارف کا سامان فراہم کرے گی۔ حکام کا یہ فرض ہو گا کہ ملک میں امن قائم رکھیں۔ مصارف کا بندوبست کریں اور آزادانہ کام کرنے کا موقع دیں۔ ہر ایک جماعت اپنے اپنے فرائض کو محسوس کرے کوئی فرزند آدم دودھ سے انکار نہیں کرتا۔ یہ علوم بھی دودھ کی جگہ پر ہوں گے۔ اگر اشاعت تعلیم کے بعد جدید اقوام نے اسلام قبول کر لیا تو وہ ہمارے مساوی ہو جائے گی اور ان کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ج) خاوند اور بیوی اپنے مشورہ سے دوسری عورت کا دودھ بھی پلو سکتے ہیں، پس اگر ضرورت ہو تو راہی و رعایا دونوں مل کر دوسری قوموں سے بعض وہ علوم اور صنعت و حرفت سیکھ سکتے ہیں جن کی اب تک انہیں خبر نہ تھی۔

(د) متفقہ مشورہ سے بچہ کا دودھ چھڑا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مفتوحہ قوم کے سامنے ہم اسلام ہی پیش کریں، بلکہ اگر مناسب ہو تو ابتدا میں انہیں ماتحت رہنے دیں، اس درمیان میں انہیں مسلمانوں کے اخلاق و اعمال اور اسلام کے محاسن و فضائل کے درس و مطالعہ کا کافی موقع مل جائے گا۔ جب انہیں وہ خود بخود دائرۃ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیں۔



## عورت انتظار کرے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيهَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٣٣﴾

”اور جو لوگ تم میں مر جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن روکے رکھیں، پھر جب اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو جو وہ اپنے حق میں جائز طور پر کریں اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے۔“

جن عورتوں کے خاوند مر جائیں اور انہیں حمل نہ ہو تو خاوند کی وفات پر انہیں چار ماہ دس روز اپنے خاوند کے گھر میں رہنا ہو گا۔ رات کو کسی دوسرے کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ اس زمانہ عدت میں خوشبو لگانا، بناؤ سنگار کرنا، سرمہ، تیل اور مہندی بلا ضرورت استعمال کرنا اور رنگین کپڑے پہننا درست نہیں۔ عدت کے بعد انہیں نکاح کی اجازت ہے ۴۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۖ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تَأْوِعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْرِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاللَّهُ عَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

”اور اگر تم نے کسی بات کی آڑ میں ان عورتوں کو نکاح کا پیغام دیا یا تم اپنے دل میں چھپائے رکھو تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان کا ذکر کرو گے لیکن ان سے چپکے چپکے وعدہ نہ کر لو، مگر یہ کہ جائز طور پر کوئی بات کہہ دو اور جب تک میعاد مقررہ اپنے اختتام تک نہ پہنچ جائے، نکاح کی کرہ نہ باندھو اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“

عدت کے زمانہ میں صرف اشارۃً عورت کو نکاح کا پیغام دیا جاسکتا ہے، عدت ختم ہونے سے قبل نکاح کرنا حرام ہے۔ اگر مرد عزم کر لے کہ انقضائے عدت کے بعد اس سے نکاح کر لے گا تو اس کا کوئی حرج نہیں۔ ان احکام کی مصلحت یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں نکاح کرنے یا اس کا پیغام دینے کی اجازت مل جائے تو نکاح کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی تمام عمر مل کر رہیں اور یہ اتحاد آخر تک رہے گا۔ اب اگر اتفاق سے خاوند پہلے مر گیا تو اظہار

- معلوم ہوا کہ خاوند کی وفات پر عورت کو ایک مدت تک خاموشی کے ساتھ گھر میں رہنا ہو گا اور انتظام خانہ داری خود ہی کرنا ہو گا۔ ایسے ہی جب رعایا کو عادل حاکم نہ مل سکے تو اس فتنہ کے زمانہ میں وہ بد عملی کی مرتکب نہ ہو بلکہ گزشتہ احکام کی پیروی کرے اور جدید حاکم کی تلاش میں رہے اور یہ پہلے صاف ہو چکا ہے کہ مسلمان عورت صرف مسلم خاوند کو تلاش کرے گی، ایسے ہی مسلمان رعایا پر بھی فرض ہو گا کہ کسی غیر مسلم کو اپنا حاکم نہ بنائے بلکہ اس کی عنان سیاست مسلمان ہی کی ہاتھ میں رہے۔

افسوس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ مدت ہوئی چاہئے، ورنہ آئندہ رشتہ پر کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ عورت کو جب اس امر کا یقین ہو گا کہ وہ آسانی سے دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے تو اس کی محبت اپنے خاوند کے ساتھ کبھی محکم واستوار نہ رہ سکے گی۔ ہندو قانون نے اسی اتحاد کو لیا مگر حدود سے تجاوز کر گئے۔<sup>۱</sup>

## طلاق قبل الوطی

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مَتَّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرًا ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۰﴾

اگر ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دیدو کہ ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا یا ان کے لئے مہر مقرر نہیں کیا تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور ان کے ساتھ سلوک کرو، مقدور والے پر اس کے موافق اور بے مقدور پر اس کے موافق دستور کے مطابق سلوک کرنا ہے، یہ نیک لوگوں پر لازم ہے۔

نکاح کے وقت اگر مہر مقرر نہ ہو تو پھر بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ ایسی عورت کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے قبل ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ بھی ادا نہ کرنا پڑے گا، البتہ اس شخص کو اپنی استطاعت کے موافق کپڑوں کا ایک جوڑا ضرور دینا ہو گا اور یہی کپڑے مہر کے قائم مقام ہو جائیں گے۔<sup>۲</sup>

وَ إِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الذِّي بَيْنَهُمَا عَقْدًا لِلنِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۱﴾

“اور قبل اس کے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ تم نے ان کو طلاق دیدی اور ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے تو جو مقدار تم نے ٹھہرائی تھی اس کا آدھا لازم ہے مگر یہ کہ عورتیں چھوڑ بیٹھیں، یا وہ مرد چھوڑ بیٹھے جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے اور یہ بات کہ تم چھوڑ دو، یہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنا مت بھولو بیشک جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔”

یہ دوسری صورت ہے نکاح کے وقت مہر معین ہو چکا تھا، خاوند نے بغیر صحبت اور خلوت صحیحہ کے اس کو طلاق دے

۱۔ گزشتہ قانون سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب رعایا کے سر پر کوئی حاکم نہ ہو اور وہ کسی کی تلاش میں پھر رہی ہو، اس وقت کسی شخص کو جائز نہیں کہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے لئے پیش کر دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: من سال القضاء وكل الى نفسه ومن جبر عليه ينزل عليه ملك فيسدره، ترمذی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص قضا کا خود طلبگار ہو، اللہ کی نصرت اس کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ جس کو لوگ جبراً حاکم بنادیں ملائکہ الرحمن اس کی تائید کرتے ہیں۔

۲۔ رعایا نے اپنا حاکم منتخب کر لیا، عتوان حکومت بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی، کام شروع کرنے سے قبل اسے خیال ہوا کہ میں اس بار کا مقفل نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے استفادے دیا، اس صورت میں اگرچہ اس کے رعایا سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا مگر پھر بھی تقاضائے انصاف یہی ہے کہ اپنے مشوروں اور تجربوں سے لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے اور جن اصلاحات کو وہ اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کرتا ان کے لئے جدید حاکم کو مشورہ دے۔

دی، اب اس کے ذمہ نصف مہر ادا کرنا واجب ہو گا۔ کیونکہ نہیں معلوم اس بیچاری کے دل میں کس قسم کے خطرات و وساوس پیدا ہوں اور لوگ اس کی نسبت کیا کیا خیالات آفرینیاں کریں۔ اگر عورت خود ہی مہر لینا پسند نہیں کرتی، یا جس شخص کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے وہ نہیں لینا چاہتا تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ آخر میں خاوندوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عفو و درگزر سے کام لیں تو یہ طہارت و تقویٰ کے زیادہ قریب ہو گا یعنی انہیں شرعی طور پر نصف مہر ادا کرنا پڑتا تھا مگر انہوں نے پوری رقم دے دی یہ احسان و مروت اور بزرگانہ طرز عمل مفید نتائج پیدا کرے گا۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ۖ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿۴۰﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ ۚ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

”تمام نمازوں اور خصوصاً درمیانی نماز کی حفاظت کرو اور اللہ کے آگے مودب کھڑے رہو، پھر اگر تم کو خوف ہو تو پیدل یا سوار پر بڑھ لو، پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو وہ تعلیم دی ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“  
گزشتہ آیات میں نکاح و طلاق کے مسائل بیان کئے گئے، ممکن تھا بعض لوگ دنیاوی مسائل خیال کر کے ان کی پابندی نہ کرتے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فوراً نماز کی محافظت کا حکم دیا اور بتا دیا کہ نکاح و طلاق اور نماز کے احکام میں فرق کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ جس طرح تم نماز کی حفظ و صیانت کا خیال رکھو ایسے ہی ان مسائل کا بھی لحاظ کرنا اور ان کی روح و حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنكُم وَيَذَرُونَ أَذْوَاجَهُمْ ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۖ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۲﴾ وَلِلَّهِ مُلْكُ مَتَاعٍ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۴۳﴾ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

”اور جو لوگ تم میں مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو چاہئے کہ ایک سال تک بغیر اخراج کے بیویوں سے سلوک کرنے کی وصیت کر مریں، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں جائز طور پر وہ جو کریں اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے دستور کے مطابق سلوک ہے۔ یہ پرہیز گاروں پر حق ہے، اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔“

خاوند مرنے سے قبل اپنے وارثوں کو وصیت کر دے کہ اگرچہ شریعت نے اس عورت کے لئے جس کا خاوند مر جائے چار ماہ دس روز کی عدت مقرر کی ہے، مگر تم اس بیچاری کو عدت کے گزرتے ہی گھر سے نہ نکال دینا، بلکہ ایک سال تک اس کے قیام و طعام کا بند و بست تمہارے ذمہ ہے۔ اب اگر وہ خود بخود چلی جائے، اس جگہ رہنا پسند نہ کرے یا دوسری جگہ نکاح کرے تو اس کی اجازت ہے۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ ایک سال تک گھر میں عورت کو رکھنے اور سامان دینے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لئے کہ:

(الف) اس آیت میں عورت کی عدت ایک سال ہے، مگر والذین یتوفون منکم ویزرون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا میں چار ماہ دس روز ہے، پس اس نے سال بھر کے حکم کو منسوخ کر دیا۔

(ب) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی بیوی کے لئے خاوند ایک سال کے مصارف کی وصیت کرے، سورۃ نساء میں بیوی کا حصہ مقرر کیا گیا ہے: ولکم نصف ماترک ازواجکم، اس لئے وصیت کا حکم منسوخ ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں، کیونکہ:

(۱) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک سال پورا نہ کریں اور چار ماہ دس روز گزرنے کے بعد نکاح کر لیں تو سال بھر تک ان کو بند رکھنا اور ان کی ضروریات زندگی ادا کرنا ضروری نہیں، پس معلوم ہوا کہ عدت اور چیز ہے اور یہ سال کچھ اور ہے۔

(۲) خورد و نوش کا جس قدر سامان دیا جائے گا اس کو وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگلی آیت اس کو واضح کرتی ہے، وللمطلقت متاع بالمعروف حقاعلی المتقین، گویا اسلام عورتوں کے ساتھ احسان و مروت کا آرزو مند ہے اور وہ سلوک یہی ہو سکتا ہے کہ مہر کے علاوہ ایک سال تک اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کر دیا جائے۔

(۳) بخاری نے مجاہد سے روایت کی ہے: قال جعل اللہ تمام السنۃ سبعة اشھر وعشرین لیلة وصیۃ ان شاء سکننت فی وصیتھا وان شاعت خربت، انہوں نے کہا کہ چار ماہ دس روز کے علاوہ سال کا بقیہ حصہ سات ماہ بیس روز بطور وصیت کے قرار دیئے گئے ہیں، اگر چاہے تو ایام وصیت میں رہے اور اگر مرضی ہو تو چلی جائے۔

(۴) ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ خاوند مرتے وقت وصیت کر جاتا اور ضروری ہوتا کہ اس کی عورت سال بھر کسی جگہ نکاح نہ کر سکتی۔ قرآن نے اس دستور کی اصلاح کی، چار ماہ دس روز عدت کے لئے ضروری قرار دیئے اور باقی کو عورت کی مرضی پر چھوڑ دیا۔<sup>۱</sup>

۱۔ جس طرح خاوند اپنی بیوی کے لئے ایک سال تک کے مصارف کی وصیت کر جاتا ہے ایسے ہی حاکم اگر اپنے فرائض منصبی کے علاوہ رعایا کے دوسرے امور کی بھی نگرانی کرے اور اس کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آئے تو یہ خود حاکم کے لئے مفید ہو گا اور باہمی تعلقات زیادہ محکم و استوار ہوں گے، ورنہ راعی و رعایا کے تعلقات تاجرانہ رہ جائیں گے، رعایا کے دل میں اس کی محبت جاگیر نہ ہوگی۔

## فصل ثالث

## ضروریات جہاد

جہانگیری اور جہانداری کے احکام و ضوابط ضرورت کے مطابق بیان کئے گئے، تمام مسلمانوں میں ان کی نشر و اشاعت ہو گئی، ہر گھر میں ان کی تعلیم ہو گی اور ایک ایک بچہ ان سے واقف ہو گا۔ مشق کرتے کرتے ان کے اندر کام کرنے کی استعداد اور قابلیت پیدا ہو جائے گی، تا آنکہ ان کے سامنے دعوت عمل پیش کی جائے۔ چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ شروع کر تے وقت جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو گی ان کو اس فصل میں بیان کیا جائے گا۔

## میدان جنگ اور موت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ۖ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَر النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۱﴾

”کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کیا جو موت کے ڈر کے مارے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے، پس اللہ نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ، پھر ان کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ لوگوں کے لئے بڑے فضل والا ہے لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔“

بنی اسرائیل قریباً چار سو سال تک مصر میں غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے، تا آنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پنجہ فرعون سے ان کو نجات دلوائی۔ فرعون کی قوم ان کو ہلاک کرنا چاہتی تھی، ایک لشکر جرار ان کے تعاقب کے لئے نکلا، جس وقت یہودیوں نے اس عظیم الشان اجتماع کو دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کو اپنی جانوں کا خطرہ ہوا، فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْجُنُودُ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرِكُونَ (الشعر آء ۶۱) جو قوم صدیوں تک غلام و محکوم رہ چکی ہو، اس کے تمام جذبات حق و حریت فنا ہو جاتے ہیں، ارادہ میں ضعف و کمزوری محسوس ہوتی ہے، جوش و دلولہ سرد پڑ جاتا ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ محکومیت اور غلامی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لعنت نہیں ہو سکتی۔

یہاں سے فارغ ہو کر موسیٰ نے ان کی حمیت قومی اور عصیت میں جوش پیدا کرنے کے لئے فرمایا: يَقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خِصِينِ (المائدہ ۲۱) ارض مقدس تمہارا آبائی وطن ہے اس وقت غیروں نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے اپنے وطن کو آزاد کرنے کی کوشش کرو۔ مگر ان کا جوش و طغیت اس درجہ

مردہ ہو گیا تھا کہ انہیں ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوا اور بد بختانہ یہ جواب دیا کہ وہ صاحب صولت و ہیبت ہیں، ہم میں ان سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں، مگر جب موسیٰ کا اصرار بڑھتا گیا تو انہیں کہنا پڑا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا مُعِدُّونَ (المائدہ ۲۴)، ”تم جاؤ اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھ کر تمہاری جنگ کا تماشا دیکھیں گے۔“ اس بد بختانہ جواب کی سزا ملی کہ چالیس سال تک ارض مقدس میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا: فَاتَّخَذُوا مَحَرَّمَةً عَلَيْهِمْ اَزْبَعِينَ سَنَةً يَتِيَهُونَ فِي الْاَرْضِ (المائدہ ۲۶) موجودہ نسل تباہ ہو گئی، دوسری نسل نے آکر اس کو فتح کیا۔

قوموں کی زندگی اور موت ہمیشہ یہی ہوا کرتی ہے کہ اگر خود حاکم و فرمانروا ہوں تو زندہ ہیں اور اگر دوسروں کے مقہور و ذلیل ہیں تو انہیں مردہ کہا جائے گا۔ بنی اسرائیل نے ارض مقدس فتح کرنے سے انکار کیا اور مردہ ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا، دوسری نسل کے ذریعہ سے آبائی وطن نوازش کر کے زندگی بخشی۔ قوموں اور ملتوں پر اللہ تعالیٰ اسی قسم کا فضل و احسان کیا کرتا ہے، مگر وہ توجہ نہیں کرتیں۔

انسان جب کام کرنے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالتا ہے، مخالفین و معاندین کی کثرت ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر یہی خوف ترقی کر جائے تو کبھی کام کرنے کی ہمت نہ پیدا ہوگی اور دشمن سے مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اس لئے کام شروع کرنے سے قبل ہی فرمایا کہ انفرادی و اجتماعی حالت میں زندگی اور موت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کو زندگی بخشتا اور مارتا ہے۔ تمہاری حیات و ممات اسی خدائے واحد کے قبضہ میں ہے۔ اگر اس نے تمہیں زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کوئی انسانی طاقت تمہیں فنا نہیں کر سکتی اور یہ ضروری نہیں کہ تم میدان جنگ میں جا کر مر ہی جاؤ گے، بلکہ اس کا تعلق شہنشاہ اعظم اور مالک السبوت والارض سے ہے پس تم موت و حیات کی الجھن میں پھنس کر جہاد فی سبیل اللہ کے فرض سے نہ رک جاؤ۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَبِّحُهُ عَلَيْهِ ۝

”اور اللہ کی راہ میں لڑو اور جانے رہو کہ اللہ سنا جانتا ہے۔“

پس جب موت و حیات کسی انسان کے قبضہ میں نہیں اور جنگ میں بھی مرنا یقینی نہیں، تو اٹھ کھڑے ہو، اللہ کا قانون بلند و برتر کرنے کے لئے جہاد و قتال کرو کہ اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو، کرہ رضی امن کا گہوارہ بن جائے اور چونکہ تم محض اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرو گے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمہاری ہر دعا کو سنے، اس کو اجابت بخشنے اور تمہیں مخالفین کے مقابلہ میں کامیابی نصیب کرے۔

روپیہ بھی دو

مَنْ ذَا الَّذِي يَغْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعُّهُ لَهُ اَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ۚ وَالْيَه تَرْجَعُونَ ۝

کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تاکہ اللہ اس کے قرض کو اسکے لئے کئی گنا بڑھائے اور اللہ ہی تنگ دست

کرتا ہے اور کشائش دیتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

محض جان قربان کرنا کافی نہیں، بلکہ روپیہ خرچ کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ سامان حرب خریدو، دوسروں کو تیاری میں مدد دو اور خلافت اسلامی کو اپنی تمام دولت نذر کرو۔ میدان جنگ میں جاتے ہی تمہیں فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔ اس قدر مال غنیمت ملے گا کہ سمیٹ نہ سکو گے اور جس قدر تم نے اسلام کے بقا و قیام کے لئے صرف کیا تھا اس سے کئی گنا زیادہ مل جائے گا۔ صد ہا ممالک پر ہلالی جھنڈا اڑے گا اور ہزاروں کافرو مشرک دائرۃ اسلام میں داخل ہوں گے۔ تم غربت و افلاس کا خیال نہ کرو کہ قبض و بسط اور تنگدستی اور کشائش اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ تمہارے پاس لاکھوں روپیہ ہو مگر اللہ ایسے سامان پیدا کر دے کہ تمام دولت تمہارے لئے بیکار ثابت ہو اور ناداری و تنہی و سستی کی زندگی بسر کرو اور یہ بھی اسکے اختیار میں ہے کہ غربت کے ایام میں تمہیں ایسی فرحت و شادمانی نوازش کرے کہ بڑے بڑے دولتمندوں کو بھی نصیب نہ ہو۔

### انتخاب امیر

تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ ہر ایک فرزند اسلام جہاد فی سبیل اللہ کے جوش و ولولہ سے سرفروشی کے لئے تیار ہے۔ مگر جب تک اس عظیم الشان اجتماع کے لئے کوئی امیر نہ ہو اس کو حرکت نہیں دی جاسکتی۔ آئندہ آیات میں امیر کی ضرورت، اس کے خصائص و امتیازات اور وجوہ انتخاب پر گفتگو کی جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْاَمَلَا مِنْ بَنِي اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوسٰی اِذْ قَالُوْا لِبَنِيْٓہٖٓ اَتُحْمَلْ اَنْفُسُکُمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ قَالْ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاٰہِنَّا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْہِمْ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْہُمْ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۱﴾

”کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے حال پر نظر نہیں کیا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک پادشاہ مقرر کرو تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں، نبی نے کہا کیا عجب ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے جواب دیا کہ کیا چیز اللہ کی راہ میں ہمارے لڑنے میں مانع ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکال دیئے گئے ہیں، پس جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو بجز چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور اللہ عالموں کو خوب جانتا ہے۔“

تعلیمی کام اور ملکی انتظام دو جدا گانہ فرائض ہیں، مگر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک ہی وجود میں جمع کر دیتا ہے، ورنہ عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں۔ سموئیل نبی صرف تعلیمی امور کے منتظم اعلیٰ تھے، ان سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سپہ سالار کی ضرورت ہے جس کی امارت و سرکردگی میں ہم مخالفین سے جنگ کر سکیں۔ سموئیل کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ابھی اس کام کے لئے تیار نہیں، اسی لئے انہوں نے دریافت کیا کہ عین وقت پر بھاگو گے تو نہیں۔ سب نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ملک پر غیروں کا قبضہ ہے، ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا

گیا ہے، قومیت اور وطنیت دونوں فنا ہو چکی ہیں، اب بھی ہم لڑنے کو تیار نہ ہوں گے تو پھر اور کونسا وقت ہو گا؟ مگر انجام کار وہی ہوا جس کا کھکا تھا۔

جنگ میں جانے سے قبل اس امر کی ضرورت ہے کہ فوج ہر قسم کے سامان جنگ سے مسلح ہو، فنون حرب کی مشق کر لی ہو اور لڑائی کے وقت جن دسائس اور چال بازیوں کی ضرورت ہو انکی مہارت بہم پہنچالی ہو، یہ لوگ اس کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک عارضی اور ہنگامی جوش تھا جس نے ان کو لڑنے کے لئے ابھارا تھا۔

اس نبی کا نام سموئیل تھا جس کے لئے حسب ذیل شہادت کافی ہے: ”تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات سننے سے انکار کیا اور کہا، نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو، تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کی مانند ہوویں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی لڑے۔“ (سموئیل ۸:۹۱ و ۹۲)

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ کام شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے، آگے چل کر ان شرائط کا تذکرہ آتا ہے جن خصوصیات کی بنا پر اس کا تقرر عمل میں آئے گا۔

### شرائط انتخاب

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللَّهُ يُؤْتِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

”اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو پادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا، اس کو ہمارے اوپر کیونکر حکومت ہو سکتی ہے؟ حالانکہ اس کی نسبت ہم حکومت کے زیادہ حقدار ہیں اور اس کو تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اس کو تم پر پسند فرمایا ہے اور علم اور جسم میں اس کو فراخی دی ہے اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ فراخی والا واقف کار ہے۔“

ان کی درخواست پر طالوت کو پادشاہ مقرر کیا گیا۔ بنی اسرائیل کو خیال تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور فوجوں کی امارت کے لئے وجہ انتخاب صرف دولت ہی ہو سکتی ہے، ان کو اپنی فراخی و فارغ البالی پر ناز تھا، وہ طالوت جیسے غریب و مفلس شخص کو اپنا امیر کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے اعتراضات شروع کر دیئے۔ نبی نے کہا کہ امارت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

(الف) .... علم۔ ملک کا نظم و نسق قائم رکھ سکے، بہترین طریق سے حکومت کرنے کے قابل ہو اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھا سکے۔

(ب) .... جسم۔ اس کی ظاہری شکل و صورت پر رعب و داب ٹپکتا ہو۔ لوگوں پر اسکی ہیبت طاری ہو، فن حرب کا ماہر



اور فنون جنگ سے اچھی طرح واقف ہو اور فوجوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ لڑا سکے۔ یہ دونوں اوصاف طالوت میں علی وجہ الکمال موجود ہیں اور یہی باتیں ہیں جن کی بنا پر ایک شخص امیر یا پادشاہ منتخب کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا علم بہت وسیع ہے، اس کی نظر تمام لوگوں پر ہوتی ہے، وہ جس میں قابلیت اور استعداد دیکھتا ہے اس کو حکومت کے لئے چن لیتا ہے۔

دنیا نے ہمیشہ اپنے خاندان اور نسلی امتیازات کی پرستش کی ہے، نسل و قوم کے بت کے آگے برابر سر بسجود رہی ہے۔ اسلام نے آتے ہی ان قومی و نسلی امتیازات کو مٹا کر ہمیشہ کے لئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دیا اور عمل کے قانون الہی پر زور دیا۔ اس نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی اور اعلان کر دیا کہ: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ** (الحجرات ۱۳) یعنی ہر طرح کی فضیلت اور بزرگی کی بنیاد صرف عمل ہے اور کوئی شے نہیں۔ قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لئے ہے کہ باہد گر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو۔ سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں سب سے آخری مہم بھیجی تو اس کی سرداری اسامہ کو دی جن کے والد زید آپ کے غلام تھے۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو آپ نے فرمایا: **لقد طعنتم فی امارۃ ایبہ وقد کان لها اھلا وان اسامة لها اھل، تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کا اہل تھا اور اب اسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کا اہل ہے۔** اہل کے لفظ پر زور دیا یعنی طعن بیکار ہے، کیونکہ امارت و سرداری کے معاملہ کی بنیاد صرف اہلیت و قابلیت ہے اور کچھ نہیں۔

قرآن حکیم اس پادشاہ کا نام طالوت بیان کرتا ہے اور کتاب مقدس میں اس کا نام ساؤل آیا ہے، لیکن دراصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ساؤل کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

”تب وہ دوڑے اور اسے وہاں سے لائے اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا“ (سومیل ۱۰:۳۲) طالوت طول سے مشتق ہے اور اس سے قد کی لمبائی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مقدس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اسی ساؤل کے انتخاب پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔

سو ساؤل جواب میں بولا کیا میں بینیمینی نہیں، جو اسرائیل کے سب فرقوں سے چھوٹا ہے؟ اور کیا میرا گھرانہ بینیمینی کے فرقے کے سارے گھرانوں میں سب سے زیادہ چھوٹا نہیں؟ پس کیا سبب جو تو مجھ سے یوں بولتا ہے۔ (سومیل ۱۲:۹) پر نبی بلعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا؟ اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے پر اس نے آپ کو ایسا بنایا کہ گویا نہ سنا تھا (سومیل ۱۰:۷۲)

نزول برکات

امیر کا انتخاب ہو گیا مگر بنی اسرائیل اس پر مطمئن نہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ صاحب دولت ہی اس جلیل القدر

منصب کا اہل ہو سکتا ہے، ضرورت ہے کہ ان کے شبہات کو دور کر دیا جائے، ورنہ آگے چل کر رکاوٹیں پیدا ہوں گی، عام رائے کا احترام ضروری ہے۔ اس لئے فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْبَنِيُّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٨﴾

“اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ ان کے پادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور وہ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو موسیٰ اور ہارون کی اولاد چھوڑ گئی تھی، اس کو فرشتے اٹھائے ہوں گے، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک تمہارے لئے اس میں پوری نشانی ہے۔”

اگر یہ انتخاب صحیح ہے اور اللہ بھی اس کو پسند کرتا ہے تو اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ صندوق تمہارے پاس واپس آئے گا جس کو تمہارے دشمن تم سے چھین کر لے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا جس میں موسیٰ و ہارون کے تبرکات تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جنگ کے وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتے، ان کی برکت سے ان میں جوش و ولولہ اور استقلال و ثبات قدم پیدا ہوتا اور اپنی تمام قوت جنگ میں صرف کر دیتے۔ پوری ہمت سے کام لیتے اور مظفر و منصور واپس آتے۔ ایک دفعہ بعض ناگہانی حوادث کی بنا پر اس صندوق پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا، اس کے چھتے ہے انہیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ جہن و نامر دی نے ان کو گھیر لیا اور ہمت ہار بیٹھے۔ جس وقت دشمن تابوت کو لے گیا ہے تو اللہ کے کرشمہ ہائے قدرت کا ظہور ہوا، جہاں تابوت ہوتا وہاں پھیل جاتی اور تمام آبادی برباد ہونا شروع ہو جاتی۔ انہیں خیال ہوا کہ یہ اس صندوق کی نحوست کا نتیجہ ہے، اس لئے بیل گاڑی پر لاد کر بیلوں کو شہر سے باہر تک ہانک دیا۔ ملا سافل کے فرشتوں نے ان بیلوں کو بنی اسرائیل کی طرف متوجہ کر دیا اور گاڑی صندوق کے ساتھ شہر میں آگئی۔ اس واقعہ نے یہودیوں کے شبہات کو زائل کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ انتخاب صحیح ہے اور ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

### فوج کا امتحان

میدان جنگ میں جانے سے پہلے فوج کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جھوٹے اور سچے، کھوٹے اور کھرے اور کمزور اور طاقتور میں تمیز ہو جائے۔ لڑائی میں صرف بہادر اور طاقتور ہی مفید ہو سکتے ہیں، اعلان جنگ کے وقت چونکہ طبیعتوں میں جوش و ہيجان پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے ہر شخص اپنے اندر لڑنے کا شوق پاتا ہے، مگر محض شوق مفید نہیں جب تک فنون حرب سے واقفیت نہ ہو، تکلیفوں اور مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ ہو اور سخت سے سخت خوف کے وقت بھی گھبراہٹ طاری نہ ہو، اس لئے امتحان لینا ضروری ٹھہرا۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ

فَإِنَّهُ مَتَّعَ إِلَّا مَنَ اعْتَرَفَ عُرْفُهُ بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۚ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلتَمُوا اللَّهَ ۚ كَمْ مِّن فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئْتَهُ كَثِيرُهُ يَآذِنِ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٥﴾

”پھر جب طالوت فوجوں سمیت روانہ ہوا تو کہا کہ اللہ تم کو ایک نہر سے آزمائے گا پس اس میں سے جو پانی پئے گا تو وہ میرا نہیں ہے اور جس نے اس کو نہ چکھا تو بیشک وہ میرا ہے مگر جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے بھر لے۔ پس ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب نے پی لیا، پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی آج ہم میں طاقت نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں بول اٹھے کہ تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر اکثر اللہ کے حکم سے غالب آجاتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

طالوت ایک عظیم الشان فوج لے کر روانہ ہوئے اور کہا کہ راستہ میں ایک نہر آتی ہے، شدت تشنگی کے وقت تمہارا اس پر سے گزر ہو گا اور اسی جگہ تمہارے استقلال نفس کا امتحان ہو جائے گا۔ قانون تو یہی ہے کہ کوئی شخص ایک گھونٹ بھی پانی نہ پئے، مگر تمہاری حالت کو پیش نظر رکھ کر صرف ایک چلو پانی کی اجازت دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ تھی، معدودے چند کے سوا سب نے خوب پانی پی لیا۔ اب ان میں یہ طاقت نہ رہی کہ نہر کو عبور کر سکیں، پیٹ پھول گئے اور آخر اسی کنارہ پر انہیں ٹھہرنا پڑا۔ طالوت باقی ماندہ نوجوانوں کو لے کر پار ہوئے۔ دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں تو انہیں اپنی قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کا احساس ہوا اور پکارا اٹھے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں، مگر ان میں کچھ لوگ ایسے بھی پیکر صدق و اخلاص تھے جو صرف خدائے واحد کی ذات پر اعتماد توکل رکھتے تھے، انہیں یقین تھا کہ ہم صرف اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ کر رہے ہیں، جن لوگوں کو احتساب اعمال کا یقین ہو وہ صرف خدا ہی کی قاہرانہ قوت سے دب سکتے ہیں، ان کی قوت ارادہ اس درجہ مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کے پائے استقلال میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتی۔ ان کی نظر قلت و کثرت پر نہیں ہوتی، بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر اخلاص و ولولہ عمل اور ثبات قدم ہے تو چھوٹی سی جماعت عظیم الشان لشکر پر غالب آسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو کامیابی نوازش کرتا ہے جو اپنے مقصد حیات پر فناء ہونے کو تیار ہوں۔

مشہور جرمن فوجی جنرل برن ہارڈی اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے:

”چند تقیدات کا لحاظ کر کے جو تعداد سے عائد ہوتی ہیں اگر موجودہ عظیم الشان فوجی نظام کا صحیح طور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کامیابی کے ضروری و صحیح عناصر روحانی و اخلاقی قوتیں ہیں۔ یقین رکھئے کہ بڑی بڑی فوجیں ایک مختصر، سرفروش، مگر حسن قیادت والی فوج کے مقابلہ میں ہمیشہ عاجز و ناکام رہیں گی۔“

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا آفِرْغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥﴾  
فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّخَذَ إِلَهُهُ الْبُذْءَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۚ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ  
النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٦﴾

”اور جب جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کو وہ میدان میں آئے تو دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال اور ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافر قوم پر ہماری مدد فرما۔ پس انہوں نے ان کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت دیدی اور جو چاہا ان کو سکھایا اور اگر بعض کو بعض کے ذریعہ سے اللہ کا لوگوں کو دفع کرنا نہ ہوتا تو زمین ضرور تباہ ہو جاتی، لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑے فضل والا ہے۔“

میدان کار زار گرم ہو گیا تو مسلمانوں نے استقلال صبر و استقامت کی دعا کی، اللہ نے ان کی دعا کو شرف اجابت بخشا اور داؤد نے کفار کے سپہ سالار جالوت کی گردن اڑادی۔ چنانچہ ساؤل یا طالوت کے بعد داؤد کو بنی اسرائیل کی بادشاہت نوازش کی گئی اور وہ حکومت و نبوت سے سرفراز کئے گئے۔

دنیا میں اگر لڑائی کا سلسلہ بند ہو جاتا تو تمام کرمہ ارضی شر و فساد کا گھر بن جاتا، مگر اللہ کو ابھی اس کا باقی رکھنا منظور ہے۔ اس لئے کفر و ارباب کفر کی باطل پرستارانہ سعی و کوشش کو فنا کرنے کے لئے سرفروشوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے، انسانوں کے مقابلہ میں انسان ہی لاتے جاتے ہیں کہ کفار و معاندین اسلام کتے کی موت نہ مر میں بلکہ دل کی بھڑاس نکال کر جہنم میں داخل ہوں: لیہلک من ہلک عن بیئنا اور یہ اللہ کا فضل مخصوص ہے حق کو باقی رکھنے کی لئے ضرور ایک جماعت پیدا کر دی جاتی ہے: لا تزال طائفة من امتی یقتلون علی الحق ظاہرین الی یوم القیمۃ۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو تمہاری ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم تم پر پڑھتے ہیں اور بلاشبہ تم پیغمبروں میں سے ہو۔

گزشتہ قصہ پر دوبارہ نظر ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ اس سے حسب ذیل مسائل کا استنباط و استخراج ہوتا ہے۔

(۱) جنگ شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے۔

(۲) امیر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے:-

(الف) جہانگیری وجہانداری کے مسائل سے خوب واقف ہو۔

(ب) فنون جنگ میں اسے در خوردانی حاصل ہو۔

(۳) رائے عامہ کا احترام ضروری ہے، اگر اس کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو عام لوگوں کو اطمینان دلا جا جائے، ورنہ

کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

(۴) امارت کے لئے دولت پر نظر نہ ہو اور صدر نشینی کے لئے مال داروں کو تلاش نہ کیا جائے۔

(۵) جو لوگ اپنی خدمات پیش کریں ان کا امتحان لینا ضروری ہے کہ کھوٹے اور کھرے میں تمیز ہو۔

(۶) صرف مقصد حیات پر مرنے والوں سے کام لیا جائے۔

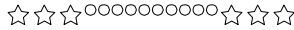
(۷) کامیابی کے لئے امیر کی نظر قلت و کثرت تعدا پر نہ ہو بلکہ جذبات حقہ اور اخلاق فاضلہ پر ہو۔

(۸) نتائج کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہی توکل ہے۔

(۹) حق و صدق کی مدافعت اور کفر و باطل پرستی کے استیصال کے لئے سرفروشنوں کا ایک گروہ ہمیشہ تیار رہے۔

(۱۰) بنی اسرائیل نے حکومت قائم کی، اس لئے مسلمان اپنی حکومت قائم کریں۔ یہ تمام قصہ اس لئے بیان کیا گیا تھا

کہ جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی حکومت قائم کی، ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کے حق میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ آپ کو بھی مخالفین و معاندین اسلام سے جنگ کرنی پڑیگی، انجام کار آپ غالب رہیں گے اور آپ کو امت مسلمہ کے بقا و قیام کے لئے سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اس لئے آپ کی آئندہ ضروریات کو پیش نظر رکھ کر یہ قصہ اس وقت بیان کیا جاتا ہے اور اس قصہ میں ان تمام سیاسی امور کی تعلیم دی گئی ہے جو قیام حکومت میں پیش آئیں گے اور آپ آسانی سے ان کی بنا پر تنظیم مملکت کر سکیں گے۔ حضرت داؤد انبیاء مرسلین میں سے تھے، ان کو جہانگیری و جہانداری کے علوم نوازش کئے گئے۔ آپ بھی نبی مرسل ہیں، اس لئے ضرور ہے کہ ان نوازش ہائے گونا گوں سے آپ بھی سرفراز کئے جائیں۔



## باب ۷ خلافت کبریٰ

### ایک لطیف نکتہ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَاتَّخَذْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَبُيِّنَتْ مِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا ۚ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُؤِيدُ ﴿۳۳﴾

”یہ تمام پیغمبر ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر برتری دی، بعض ان میں وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کو درجوں میں بلند کیا اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات دیئے اور ہم نے ان کو روح القدس سے قوت دی اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے پیچھے آئے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس نشانیاں آچکیں، لیکن وہ مختلف ہوئے تو ان میں سے کوئی تو ایمان لے آیا اور کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہے کرتا ہے۔“

اگرچہ ما قبل میں کئی انبیاء و رسل کا تذکرہ آچکا ہے جو نبوت میں مساوی ہیں، مگر پھر بھی ان کے فرائض کے اعتبار سے ان میں فرق مراتب ضرور ہے اور یہی امور ایک دوسرے پر ان کی فضیلت و بزرگی کا اظہار کرتے ہیں۔ جس مقصد کے لئے موسیٰ کی بعثت ہوئی اس سے داؤد کا نصب العین جداگانہ تھا۔ یہی حال عشق و محبت اور شیفتگی و وارفتگی کا ہے۔ بعض صرف ایک نظر سے اپنے محبوب حقیقی کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے ہیں، کسی کو باتوں کا موقع دیا جاتا ہے۔ بعض کے جنون کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کو دیدار اور کلام دونوں سے حصہ وافر ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے تھے جن کو خداوند قدوس نے شرف ہم کلامی بخشا۔

تعلیم و تربیت کو دیکھئے تو یہاں بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے، ان مراتب کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے: (الف) تہذیب اخلاق (ب) تدبیر منزل (ج) سیاست مدن (ک) خلافت کبریٰ۔ تمام انبیاء و رسل کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا، اس لئے ان میں سے کوئی بھی سیاست مدن سے آگے نہ بڑھ سکا۔ و ما من قریۃ الا خلا فیہا نذیر۔ رسول اللہ ﷺ جملہ اقوام و امم اور مذاہب و ادیان کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے۔ لتخرج الناس من الظلمت الى النور اور یہی وہ خصوصیت و حریت ہے جس نے آپ کو خلافت کبریٰ نوازش کی اور آپ کی امت کو شہداء علی الناس کا منصب جلیل عطا کیا۔ بنی اسرائیل کے مؤسس اول تو حضرت موسیٰ ہیں مگر ان کو انتہائی عروج، ارض مقدس کی حکومت

و فرماں روائی داؤد کے زمانہ میں نصیب ہوئی۔ دنیاوی کمالات اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان کو جو نمایاں اور ممتاز خصوصیت حاصل ہے، وہ کسی اور بنی اسرائیلی نبی کو نصیب نہیں۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام دکھائی دیتے ہیں، جن کی وساطت سے یہودیوں کو روحانی ترقیاں، اخلاقی کمالات اور باطنی فضائل حاصل ہوئے اور اس طرح جو سلسلہ موسیٰ بن عمران سے شروع ہوا تھا، ان دونوں بزرگوں کی تعلیم و تربیت نے اس کو کمال تک پہنچا دیا اور اس اعتبار سے ان کی جس قدر مدح و ستائش کی جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پہلے داؤد کا ذکر کیا اور ان کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا۔ مگر ان دونوں کی عجیب کیفیت ہے۔ دونوں نبی عربی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کو خدا کی آمد سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اپنے فضائل و کمالات اور ظاہری و باطنی ترقیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگیوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان کو رسول مکی کی ظاہری و باطنی رقت قدر میں اللہ کی شان نظر آتی ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ آیات میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و برتری کا اظہار کرنا تھا کہ آپ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ ارسل الی الناس كافة بشیدا و نذیرا ہیں۔ آپ کی تعلیم میں گزشتہ صد اقتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور آپ کی ذات اقدس میں نوح علیہ السلام کی سی سرگرمی، ابراہیم علیہ السلام جیسی نرم دلی، یوسف علیہ السلام کی سی درگزر، داؤد علیہ السلام کی سی فتوحات، یعقوب علیہ السلام کا سادہ سادہ، عیسیٰ علیہ السلام کی سی خاکساری، زکریا علیہ السلام کا ساز ہد اور اسماعیل علیہ السلام کی سی سبک روی موجود ہے۔

اے کہ بر تخت سیادت زائل جا داری

انچہ خواباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

فطرت انسانی تو محض خیر اور نیکی پر پیدا کی گئی تھی، مگر خارجی اثرات ضلالت اور بادر صرصر کے تیز و تند جھوکوں نے اس کے آئینہ فطرت کو گرد آلود کر دیا۔ صحیح تعلیم ان لوگوں کے پاس آئی کہ اپنی فطرت اصلہ کو قائم رکھیں، مگر ان لوگوں نے اختلاف پیدا کر کے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ تین نبی قریب قریب ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لئے آئے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ قہر و استبداد سے نجات دلوائیں: اَنْ اَرْسِلَ مَعَنَا یٰمُوسٰی (الشعراء ۱۷۷)۔ عیسیٰ علیہ السلام ماقبل کے مصدق اور مابعد کے لئے مبشر بنا کر بھیجے گئے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا یَبِئْنَ یَدَیْهِ مِنَ الشُّرُوءِ وَ مُبَشِّرًا بِرُسُولِیْ (مَنْ بَعْدِی اَسْمُهُ اَحْمَدُ) (الصافات ۶) اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے لئے آیت رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ جن لوگوں نے انبیاء بنی اسرائیل کی تعلیم کو صحیح طور پر اخذ کر لیا وہ نبی عربی کی تعلیم کے آگے فوراً سر جھکا دیں گے اور جن پر ان کی صحبت نے کوئی اثر نہیں ڈالا وہ ضرور اس تعلیم کی مخالفت کریں گے۔ یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں کشمکش ہو کر رہے گی اور جنگ ایک لازمہ انسانیت ہو جائے گی۔

کسری مشرقی نبوتوں کا مرکز تھا اور قیصر بنی اسرائیلی رسالت کا، دونوں کی آپس میں جنگ ہو رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر شہنشاہی اختیارات سے کام لے کر ان کے اختلافات کو رفع کیا اور ان کو اے توحید کے ماتحت زندگی

بسر کرنے پر مجبور کیا کہ آئندہ لڑنے نہ پائیں: تَبَرَّكَ الَّذِي ذَلَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان ۱) گویا آپ کا روئے سخن عالمگیر ہے اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس کی تعلیم عام ہو، اس غرض کی تکمیل خلافت کبریٰ سے ہوگی اور آپ کی امت کو یہ عزت و سربلندی نوازش کی جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِمَّنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ بِيَوْمِهِ لَا يَتِمُّ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۖ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۲۵﴾

مسلمانو! اس مال سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کر لو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی اور نہ سفارش، اور کافر ہی ظالم ہیں۔

قومی حیات وابستہ ہے حکومت و خلافت کے ساتھ، جس کے بقایا استحکام کے لئے ہر وقت روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے زمین میں گاڑنے اور بینکوں میں جمع کرنے کی بجائے اپنی تمام دولت خلافت کی نذر کر دو۔ جو سب سے زیادہ روپیہ دے گا اسی کی قدر ہوگی اور اگر بالفرض دنیا میں اس کا کوئی اجر نہ مل سکا تو مرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہو جائے گی اور یہی روپیہ تمہیں عذاب الیم سے نجات دلائیگا۔ جو لوگ خلافت کی مدد نہیں کرتے وہ نادانی و جہالت میں مبتلا ہیں اور اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی حکومت نہ ہوگی تو ان کو زندگی کا کیا لطف آئے گا۔

خلیفہ اسلام کے فرائض

مختلف اقوام و ملل میں جنگ ہو کر رہے گی، ارباب ایمان و اخلاص اپنی ہر چیز قربان کر دیں گے کہ دجاہلہ کفر و شیطنت کو مٹادیں، مگر شیاطین و طواغیت بھی اپنی باطل پرستانہ سعی و کوشش سے باز نہ آئیں گے۔ اس خلافت کا فرض ہوگا کہ اپنی قاہرہ قوت اور عالمگیر اقتدار سے کام لے کر ان کوششوں کو دبا دے۔ حکومت کے صدامشاغل ہوں گے، ہزار ہا صیغے اور محکمے قائم ہو جائیں گے۔ ماتحت حکام ملک کے نظم و نسق کا خیال رکھیں گے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ان کا نگران کا رو محافظ ہوگا اور جہاں یہ کسی بد عملی کے مرتکب ہوں گے فوراً ان کو تنبیہ کر دے گا۔ اس لئے اگلی آیات میں خلیفہ کے فرائض بیان کئے جاتے ہیں۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۱۲۶﴾

”اللہ کی وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کا تھانے والا، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے کون ہے، جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ جو کچھ خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے وہ جانتا ہے اس کی معلومات میں سے وہ کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر



جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو گھیر ہوئے ہے اور ان کی حفاظت اس کو گراں نہیں گزرتی اور وہ عالی شان عظمت والا ہے۔

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ صرف خدائے قدوس ہی کی ذات ہے جس کی غلامی کرنا انسان کے لئے باعث صد ہزار فخر و امتیاز ہے۔ وہی ایک قوت قدسی ہے جو تمام زمین و آسمان میں مصروف عمل ہے۔ اصل میں بمنزلہ حقیقیہ الحقائق صرف اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مگر جب بد بختان نوع انسانی اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے لگیں تو ذکر الہی تو حید سے بدل جاتا ہے یعنی اللہ کا اثبات اور غیر اللہ کی نفی، گویا تو حید کے سوا کوئی چیز مطلوب نہیں۔

دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں، مادہ اور صورت سے ترکیب دی گئی ہیں۔ جس صفت الہی کے عکس سے صورتیں بنتی ہیں اس کو حی سے تعبیر کرتے ہیں اور جس پر مادوں کی انتہا ہوتی ہے اس کا نام قیوم ہے۔ حی جو خود زندہ ہے اور دوسروں کو زندگی بخشتا ہے وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمن ۲۷) اور قیوم جو خود قائم ہے، اور دوسروں کے قیام کا موجب ہے۔ نظم و نسق قائم کرنے والا إِنَّ اللَّهَ يُنْزِلُ السَّلْوَٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَ وَلَٰكِنْ زَالَتِ إِنْ أَمْسَكَهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ (فاطر ۴۱) گویا یہ دونوں نام اللہ لا الہ الا هو کی شرح و تفسیر ہیں۔ غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ یاجی یا قیوم بار بار پڑھتے تھے کہ کفار و مشرکین کے مقابلہ میں اسلام زندہ و قائم رہے۔

وہ اگرچہ ہر چیز کو زندگی بخشتا ہے اور زمین و آسمان کا قیام اسی کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے، مگر باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ قوتوں کے اضمحلال اور ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اس پر اونگھ طاری ہو، بلکہ وہ برابر مصروف عمل رہتا ہے۔ کمزوری اور نقاہت کا نام و نشان نہیں، اس پر تعطل و بیکاری کا زمانہ نہیں آتا اور نہ کام کرتے کرتے اس کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بلکہ نیند سے پاک ہے۔

اللہ کے سوا جو کچھ ہے، زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں، سب پر اسی کا قبضہ ہے۔ اور وہی ہر انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر تم نے ایسے باجروت پادشاہ کی مخالفت کی تو یاد رہے اس کے دربار میں کسی کو شفاعت کرنے کی جرات نہ ہوگی، مگر ہاں جس کو وہ خود نجات دینے کا آرزو مند ہو اور اس کے لئے کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت دے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ شفاعت کی ضرورت وہاں محسوس ہوتی ہے، جس جگہ واقعات کا حاکم کو پورا علم نہ ہو اور اللہ کو تو ایک ایک ذرہ کی خبر ہے، اس کے علم کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ ہاں وہ خود ہی اپنے علم کے بحر ناپیدا کنار میں سے کسی کو ایک قطرہ نوازش کر دیتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی انسان کو اتنا علم دے دے جتنا اس کو ہے۔

اس کی حکومت و پادشاہت تمام آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی نہیں جو اس کے دائرہ حکومت سے نکلنے کی کوشش کرے اور وہ خارج بھی ہو جائے۔ يَبْعَثُ الْجَنِّ وَالْإِنْسَ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ (الرحمن ۳۳) بلکہ جس جگہ جائے گا اسی کی حکومت ہوگی۔ فلینا تو لو افشم وجہ اللہ، زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، وہ ان کی حفاظت سے نہیں جھکتا۔ اس کی ذات اقدس

بہت بزرگ و برتر ہے اور انسانی فہم و ادراک سے وراء الودی ثم وراء الودی ثم وراء الوری ہے۔ تمام چیزیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنا تعلق، اللہ کے ساتھ اسی قسم کا رکھے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور اس میں کمی نہ آنے دے۔ کیونکہ تمام خرابیوں اور بربادیوں کا سرچشمہ توحید کا چھوڑ دینا ہے۔ تمام مذاہب و ادیان کو اس توحید کے ماننے سے انکار نہیں ہو سکتا اور یہی غلیفہ کا اولین فرض ہے کہ اس آیت کو اپنی خلافت کے اطراف و جوانب میں شائع کر دے اور جملہ اقوام و ملل کو اس کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں

لَا اكْرَاهِي الدِّينَ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ  
الْوُثْقَىٰ ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ ﴿٢٥٦﴾

“دین کے بارے میں کچھ زبردستی نہیں، بے شک گمراہی سے ہدایت ظاہر ہو چکی، توجو طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے بے شک مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سستا جانتا ہے۔”

دنیا کا دستور ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جن قوموں کے پاس صداقت اور سچائی کی کوئی چیز بھی نہیں ہوئی انہوں نے دوسروں کو اپنے قبضہ میں لانے، اپنے اصول منوانے اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے نیزوں کے پھلوں، تلوار کی دھار اور ہتھیاروں کی جھکارسے فائدہ اٹھایا ہے اور قوت کے زور سے اپنے خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کی ہے۔ مگر اسلام ہی وہ سب سے پہلی آواز حق و صدق ہے جس کو تبلیغ و دعوت کے لئے کسی طاقت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے گمراہی و ضلالت اور ہدایت کو ایک دوسرے سے نمایاں کر دیا۔ سعادت و شقاوت انسانی کی راہیں واضح کر دیں۔ روشنی اور اندھیری صاف نظر آنے لگ گئی، نور و ظلمت میں فرق و امتیاز ہو گیا اور اس لئے انسان الہی نے ہمیشہ کے لئے اعلان کر دیا کہ لا اکراہ فی الدین خلیفہ کا کام یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت، نور و ظلمت، اور اسلام و کفر میں ایسا فرق و امتیاز کر دے کہ ہر شخص سمجھ جائے اور لوگوں کی ترغیب و تحریص کے سامان فراہم کر دے اور جو لوگ اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں، ان کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کر دے۔ پس جس نے طغیان و سرکشی کی ہر چیز سے نفرت کا اظہار کیا خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں یا انسان اور جن ہوں سب سے بغاوت کا اعلان کیا اور زمین و آسمان کے پادشاہ کے آستانہ جلال و کبریائی پر اپنا سر نیاز جھکا دیا اور اس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہو گیا تو بیشک اس نے ایسے محکم و مضبوط کڑے میں ہاتھ ڈالا جو کبھی بھی ٹوٹ نہیں سکتا، بلکہ برابر ترقی کرتا رہے گا۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم نے طاغوت سے علیحدگی اختیار کی، اس لئے تمہاری ترقی کے لئے عظیم الشان میدان کھول دے گا۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

”اللہ ان کا حامی ہے جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے اجالے کی جانب نکالتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں، جو ان کو اجالے سے اندھیروں کی جانب نکالتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“  
جو لوگ صرف خدا کے واحد کی غلامی کریں گے ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی، شیاطین اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کریں گے، ظلمت چاروں طرف سے گھیر لے گی، قوانین الہی میں شبہات رونما ہوں گے، لیکن اللہ نور السموات والارض کی ایک ہی جلوہ نمائی ان تمام طواغیت کو فنا کر دے گی، شکوک رفع ہو جائیں گے، ہدایت ورہ نمائی حاصل ہوگی۔ تمام رکاوٹیں حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گی، جب کبھی کوئی قوت حق کو دبانے کی کوشش کرے گی اس کو فوراً ابر باد کر دیا جائے گا اور مسلم قانت اپنے آگے نور ہی نور دیکھے گا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿١٦٠﴾ يَهْدِي بِيهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ نِصْرًا مُّوَدَّةَ رَبِّهِ وَالسَّلَامَ دِيخِرُجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (المائدہ ۱۵، ۱۶) لیکن انکار کرنے والے ظلمت و تاریکی میں مبتلا ہو جائیں گے، ان کو حق و صدق میں اس قدر شبہات پیدا ہوں گے کہ اس کو باطل سمجھنے لگ جائیں گے۔

وجود باری تعالیٰ

انسان کبھی فسق و فجور سے باز نہیں رہ سکتا جب تک اس کو دو باتوں کا یقین نہ ہو۔

(الف) اللہ موجود ہے اور وہ ہمارے ہر عمل حیات کا نگران کار و محافظ ہے۔

(ب) جو کچھ ہم کرتے ہیں ان کے متعلق ایک روز سوال کیا جائے گا اور احتساب اعمال سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ان دو باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ان اعمال و اخلاق کا پتہ لگا یا جائے جو نجات کا باعث ہیں اور ان سے پرہیز کیا جائے جو تباہی لانے والے ہوں۔ اس لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ،

(ج) نبی کی جانب توجہ کی جائے جو ان تمام باتوں پر روشنی ڈال سکے۔ اگلے رکوع میں چند واقعات بیان کئے گئے ہیں، مگر ان میں وجود باری تعالیٰ اور اثبات قیامت پر بحث کی گئی ہے۔ ان کو تسلیم کرنے کے بعد تیسرا مقدمہ نبوت خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّكَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُعْبَدُ وَيُؤْتِي ۖ قَالَ أَنَا نَحِي ۖ وَأُمِّي ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالسَّكَسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْغَرْبِ ۚ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٦﴾

”کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں بحث کی، اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دیدی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو پورب سے لاتا ہے پس تو اس کو کچھم سے لا، پس وہ کافر متحیر رہ گیا اور اللہ ناانصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ نبوت میں نمرود کو اپنی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و جلال کی وجہ سے دھوکا ہو گیا تھا کہ وہ خدا ہے، اسی لئے لوگوں سے سجدہ کراتا تھا، ابراہیم نے اس کو اللہ کی طرف توجہ دلائی تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ میرے سوا کوئی اور بھی خالق ارض و سما ہو سکتا ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہوں گی؟ انہوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کروڑوں جان دار ہیں جن کی زندگی اور موت کا رشتہ ایک بالائے قوت کے ہاتھ میں ہے، مگر وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکا اور کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں جس کو چاہوں قتل کر دوں یا معافی دے دوں، حالانکہ اگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور مارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اختیار و قدرت سے جان نکالنا۔

ابراہیم نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ زندگی اور موت کی حقیقت سے وہ نا آشنا محض ہے، اس لئے ایسے بلید الذہن کو سمجھانے کے لئے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو ایک ہی دن مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہ سنتے ہی اس کی عقل ماری گئی اور بھونچکا سا رہ گیا۔ اب اس صریح شکست کا تقاضا تو یہ تھا کہ فوراً ہدایت قبول کر لیتا، مگر اس کو طاغوت کی ہم نشینی حاصل تھی، اس لئے اپنی ضد پر قائم رہا۔ ہدایت کے تمام اسباب فراہم ہوں پھر بھی ایک شخص ان سے کام نہ لے تو پھر ایسے شخص کی راہ نمائی کے لئے اور کوئی جدید سامان نہیں پیدا کیا جاتا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ نمرود یہ جواب دے سکتا تھا کہ مشرق سے تو میں سورج نکالتا ہوں، تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم کی بات نے اس کو اس درجہ مبہوت کر دیا تھا کہ اس کے ہوش و حواس ہی بجانہ رہے تھے۔ مناظرہ کا بہترین طریق یہ ہے کہ مخالف کو تھوڑی دیر کے لئے حیران کر دیا جائے۔

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ ولی الذین امنوا یخضع من الظلمت الی النور والذین کفروا اولیہم الطاغوت فیخضعونہم من النور الی الظلمت، اس قصہ نے بتا دیا کہ ابراہیم کی راہ میں ایک طاغوت حائل ہوا، مگر اللہ نے ان کی فوراً راہ نمائی کی ایک نئی حجت سکھادی اور اس طرح کائنات خلعت کو ظلمت سے نور کی طرف لے آیا۔ مگر نمرود طاغوت کی غلامی کرتا تھا اس لئے اور زیادہ کفر میں پختہ کار ہو گیا۔

## اثبات قیامت

اَوَكَلَدْنِي مَرَعًا قَبِيَّةً وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا ؕ قَالَ اُنِيْ يُعْطٰى هٰذَا اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ؕ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلٰى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْصًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ؕ قَالَ اَعْلَمْتُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٥٠﴾

”کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جو ایک قصبہ پر گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گر پڑا تھا، کہنے لگا کہ اس کو اللہ اس کے مرے پیچھے کس طرح زندہ کرے گا، تو اس کو اللہ نے سو برس مردہ رکھا پھر اس کو جلایا فرمایا تو کتنی دیر رہا؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے کم ہو گا۔ فرمایا بلکہ تو سو برس رہا پس اپنے کھانے اور پینے کو دیکھ کہ سڑا تک نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھ کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائیں اور ہڈیوں کی جانب دیکھ کہ ہم کیونکر ان کا ڈھانچہ بناتے ہیں پھر ان کو گوشت پہنائے دیتے ہیں، پس جب اس کو کھل گیا تو بولا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

بخت نصر، والی بابل نے ۶۱۳ قبل مسیح بیت المقدس پر حملہ کیا اور ۵۹۹ میں اس کو بالکل ویران کر دیا۔ اکثر یہودی تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور جو بچے ان کو جلاوطن کیا گیا۔ ۵۳۶ میں اہل بابل بھی فنا ہو گئے۔ اس پر فورس، شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آنے اور یروشلم آباد کرنے کی اجازت دی۔ آخر کامل ایک صدی کے بعد بیت المقدس پھر آباد ہوا۔ اس تباہی کے زمانہ میں حضرت حزقیل کا اس بستی پر گزر ہوا، وہ اس المناک منظر کو دیکھ کر براہ حیرت و استعجاب کہنے لگے کہ نہیں معلوم اللہ تعالیٰ اس بستی کے مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ اس سوال کے جواب میں خود ان پر موت طاری کی گئی۔ برابر ایک سو سال تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ دوبارہ زندہ ہونے پر ان سے دریافت کیا گیا کہ کتنی دیر تک اس حالت میں رہے؟ ان کے لئے سو سال کی مدت برابر تھی، انہیں خیال ہوا کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ جس وقت اصحاب کہف سالہا سال کے بعد بیدار ہوئے اور ان سے پوچھا گیا کہ اس حالت میں کب تک رہے تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا تھا: قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف ۱۹) قیامت کے روز جب کفار سے پوچھا جائے گا کہ دنیا میں ان کے رہنے کی مدت کتنی تھی تو وہ بھی یہی جواب دیں گے قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (المؤمنون ۱۱۳، ۱۱۴) پس ان آیات کے ہوتے ہوئے جو لوگ حضرت حزقیل کے واقعہ کو محض خواب اور رویا پر محمول کرتے ہیں وہ یقیناً غلطی پر ہیں اور صحیح وہی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تم برابر ایک سو سال تک اس حالت میں رہے۔ اب ہمارے کرشمہائے قدرت ملاحظہ کرو۔ تمہارے کھانے پینے کی چیزوں میں بوسنک نہیں پیدا ہوئی۔ گدھے کو دیکھو گل سڑ گیا ہے، مگر اسے دوبارہ زندہ کئے دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حزقیل کو دو باتیں دکھانا چاہتا تھا۔

(الف) بعض چیزیں ایسی ہیں کہ لاکھوں کروڑوں برس گزرنے پر بھی وہ اپنی حالت پر قائم رہتی ہیں۔ ان کے خواص

واثرات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ اگرچہ انسان پر ہزار ہا برس تک فناطاری رہے مگر پھر بھی اس کے بعض اجزا کو محفوظ رکھے اور وقت پر ان میں زندگی پیدا کر دے۔

(ب) اگر ایک چیز گل سڑ کر فنا ہو جائے اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ اس آیت میں ان دونوں باتوں کو واضح کر دیا گیا، لیکن اس قسم کے واقعات عام لوگوں کے سامنے روزمرہ نہیں ہوا کریں گے۔ یہی ایک نظیر باقی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہوگی۔ جس وقت انہوں نے یہ کیفیت ملاحظہ کی تو بے اختیار ہو کر کہنے لگے کہ میں دل سے یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ احیائے یوم البعث میں چند چیزوں کو یاد رکھنا ضروری ہے:

(۱) خود زندہ کرنا: حضرت حزقیل اور ان کے گدھے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر کے دکھا دیا۔

(۲) زمانہائے دراز کے بعد زندگی بخش: اس کے لئے ان کو سو برس تک عالم ممات میں رکھا۔

(۳) خاص کیفیت سے زندہ کرنا: گدھے کو زندہ کر دیا۔

(۴) اتنی مدت تک روح کا باقی رکھنا: طعام و شراب کا باقی رہنا اور ان کے بدن کا موجود ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی روح باقی ہے۔ کیوں کہ بدن، طعام، شراب، مختلف اجزاء و عناصر سے مرکب ہیں، ان میں آسانی سے تغیر اور فساد آسکتا ہے، حالانکہ روح میں یہ بات نہیں۔

(۵) دوبارہ زندہ ہونے کے بعد برزخ کی مدت معلوم نہ ہونا: چنانچہ حزقیل نے جواب دیا کہ میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ایک سو سال تک رہے تھے اور یہی جواب قیامت کے روز کفار دینگے، لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضُ يَوْمٍ (المؤمنون ۱۱۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں اور ملتوں کو زندہ کرتا ہے، اگرچہ ان پر گنہگار اور غلامی کی صدیاں گزر جائیں مگر پھر بھی ان کو فضیلت و برتری مل سکتی ہے بنی اسرائیل ایک صدی تک بر باد رہے، آخر اللہ نے ان کی ساری اور انہیں دوبارہ حکومت نوازش کی، لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ (الزمر ۵۳)

ایک اور مثال

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوْ لَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۖ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾

“اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھ کو دکھا تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا، فرمایا کہ کیا تم کو یقین نہیں، عرض کیا کیوں نہیں۔ لیکن یہ کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا اچھا چار پرند لو، پس ان کو اپنے ساتھ بلاؤ، پھر ہر

پہاڑی پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر ان کو آواز دو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اور جانو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

چونکہ لوگوں کو احيائے اموات میں سب سے زیادہ شبہات ہوتے ہیں، اس لئے ایک اور مثال بیان کی جاتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے روز مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت کا سوال کیا، ممکن تھا بعض لوگوں کو ان کے اس سوال سے یہ شبہ ہوتا کہ باوجود پیغمبر ہونے کے ان کو حشر اجساد پر یقین نہ تھا، اس لئے فوراً بعد ان کا جواب نقل کر کے بتادیا کہ ان کو یقین تو حاصل تھا مگر وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ زندہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، ان میں سے ایک کیفیت کا مشاہدہ کر لیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان کی طبیعت میں یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق کیوں اور کس طرح کا سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس سوال کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) استفسار کے طور پر کہ اطمینان قلب مقصود ہے، چنانچہ ابراہیم کا سوال اسی قسم کا تھا۔ وہ احيائے موتی کی کیفیت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس آیت سے ایمان کی کمی اور زیادتی پر استدلال کیا ہے۔

(ب) جس امر کی نسبت سوال کیا جاتا ہے اس کے متعلق کسی کو شکوک و شبہات ہیں، کفار کہتے تھے مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيمٌ (یس ۷۸) ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے پر کون زندہ کرے گا۔

پہلی صورت ایمان میں داخل ہے اور دوسری کا تعلق ضلالت و گمراہی سے ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ چار پرندے لے کر ان کو پالو یہاں تک کہ خوب مانوس ہو جائیں، پھر سب کو ذبح کر کے ان کے اجزائے مختلفہ کو ملا لو اور ہر پہاڑ پر ایک ایک حصہ رکھ دو، اب انہیں آواز دو تو وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آجائیں گے۔ لوہاجب مقناطیس کے سامنے آئے گا تو ضرور ہے کہ اس کی طرف کھچے۔ حضرت ابراہیم کی آواز میں اس درجہ قوت مقناطیسی پیدا کر دی گئی تھی کہ جس جانور کا نام لیتے فوراً دوڑتا ہوا ان کے پاس چلا آتا، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ غالب ہے اور یہ کام کر سکتا ہے۔ تمام مخلوقات کو اپنے خالق کے ساتھ ایسا فطری ربط و تعلق ہے کہ اس کے ٹوٹنے کی کوئی دوسری صورت نہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں سال فطارت ہی رہے، مگر جس وقت خدائے قدوس ایک لفظ کن ارشاد فرمائے گا سب کے سب بھاگتے ہوئے اس کے پاس آجائیں گے۔

اب تک تین واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہو گیا کہ حق و صدق اور توحید کی نشر و اشاعت میں ظلمتیں پیدا ہوں گی، ان کے رفع و انسداد کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے آدمی پیدا کر دے گا جو ان ظلمتوں اور تاریکیوں کے پردوں کو چاک چاک کر کے دنیا کے سامنے اسلام کی اصلی صورت پیش کر دیں گے۔ خلیفہ کا فرض ہو گا کہ ایسے ارباب صلاح و تقویٰ کو ڈھونڈ نکالے، ان کو دعوت و ارشاد کے کام پر لگائے۔ جو لوگ ان سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں، ان کے لئے



آسانیاں پیدا کرے اور جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو ان کا تمام اطراف مملکت میں اعلان کرے۔ ان آیات نے خلیفہ کے دو فرض معین کر دیئے:

(الف) توحید کی نشر و اشاعت اور اس کی حفظ و صیانت۔

(ب) امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے کام لینا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی شرطیں

خلیفہ اور اس کے اعوان و انصار کے فرائض بیان کئے گئے، یہی لوگ حقیقی معنی میں خلافت کے دست و بازو ہوں گے، جن کے صدق و اخلاص اور حسن نیت پر ملک و ملت کی بہتری موقوف ہوگی۔ اگر ارباب دولت و ثروت بھی اس آسانی پادشاہت میں شریک ہونے کے آرزو مند ہوں، جس کا داخلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ممنوع قرار دیا تھا تو وہ اپنا مال خلافت کی نذر کریں، مگر یہ روپیہ چند شرطوں کے ماتحت قبول کیا جاسکتا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ نَارًا حَرَّةً سَبُعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۹۱﴾

”جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں کہ ہر بال میں سودانے ہوں اور جس کے لئے چاہتا ہے اللہ بڑھاتا ہے اور اللہ گنجائش والا وقف کار ہے۔“

خلیفہ اسلام کو سلطنت کے بقا و استحکام، قوم کی تعلیم و تربیت، لشکروں کی تیاری، سامان حرب کی خریداری اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ جو شخص ایسی ضرورت کے موقع پر مال صرف کرے گا اس کے خرچ کی مثال اس بیج کی سی ہے جو ایک دانہ سے سات سو بن جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس قسم کے صدقات کی خیر و برکت بیان کرتے ہیں: اور جو اچھی زمین میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل بھی لاتا ہے کوئی سو گنا پھلتا ہے کوئی ساٹھ گنا کوئی تیس گنا۔ (متی ۳۱: ۳۲) مرقس میں ہے: اور کچھ اچھی زمین پر گر اور وہ اگا اور بڑھ کر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا۔ (مرقس ۴: ۸) مگر قرآن حکیم بتاتا ہے کہ ایک مسلم قانت جب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیتا ہے تو وہ سات سو گنا بڑھتا ہے اور اس سے زیادہ کی حد نہیں۔ صحابہ کرام نے اس وعدہ کو دیکھ لیا کہ سینکڑوں خرچ کر کے کروڑوں کے مالک بن گئے۔ جس مال کے یہ ثمرات و نتائج ہوں اس کی شرطیں ملاحظہ ہوں:

مَنْ وَادَىٰ نَهْهُ

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَتًّا وَلَا آدَىٰ ۖ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۹۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ ۖ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يُتْبِعُهَا آدَىٰ ۗ وَاللَّهُ غَفِيٌّ حَلِيمٌ ﴿۹۳﴾



”جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کئے پیچھے احسان نہیں جتاتے اور نہ ستاتے ہیں ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ معقول بات اور درگزر کرنا ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد میں ستانا ہو اور اللہ غنی ہے حلیم ہے۔“

عام دستور ہے کہ کسی محتاج کو روپیہ دے کر لوگ اس پر احسان جتاتے ہیں اور تکلیف دیتے ہیں۔ جنہیں قومی کاموں میں خرچ کرنے کی عادت ہے، وہ ہر موقع پر اپنے چندوں کا ذکر فخر مہابت سے کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کم چندہ دیا ہے ان کا ذکر حقارت سے کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں بری ہیں کہ صدقات بھی دوا اور احسان بھی رکھو۔ بلکہ خرچ کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ نہ تو ان لوگوں پر احسان جتاؤ اور نہ انہیں یاد دلا کر اذیت دو۔ اللہ کے نزدیک صرف وہ مال قدر و قیمت رکھتا ہے جس کے بعد من اور اذی نہ ہو، ورنہ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اچھی بات کہہ دو اور کہو کہ اس وقت معاف کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق تو تم سے مواخذہ نہیں کرتا، مگر حلیم کے غضب سے بھی ہر وقت ڈرنا ضروری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ ۚ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَمَكَّنَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٤﴾

”مسلمانو! احسان جتا کر اور ایذا دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی خیرات کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے تو اس کو سپاٹ بنا چھوڑے، اس میں سے جو انہوں نے کمایا ان کے کچھ ہاتھ نہ لگے گا اور اللہ کافر قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔“

مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے صدقات و خیرات کو من اور اذی سے برباد نہ کریں اور یہ تو ایک مسلم کی شان ہی نہیں کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے کچھ خرچ کرے، بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، جس کو نہ اللہ پر یقین ہے اور نہ یوم آخرت پر۔

جو لوگ ریاء سمعہ اپنی دولت صرف کرتے ہیں ان کو اس مثال سے عبرت اندوز ہونا چاہئے۔ ایک پتھر پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہے ایک ہی زور کی بارش نے اس کو بالکل صاف کر دیا اور اس پر دانہ اگنے کی کوئی صورت نہیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کے لئے سات سو اور اس سے بھی زائد اجر و ثواب دیتا ہے، دوسری جانب وہ مال جو دکھانے کی غرض سے دیا گیا ہو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہنے دیتا، تمام محنت اکارت جاتی ہے۔

رضائے الہی پیش نظر رہے

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْيِئَتِنَا مِمَّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَذْءٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ  
فَأَثَرُهُ مَضْغَفِينَ ۚ فَإِنَّ لِمَ يَصُبُّهَا وَابِلٌ ۖ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٥﴾

”اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنی نیت ثابت رکھ کر خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس باغ کی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو کہ اس پر زور کا مینہ پڑا ہو اور وہ اپنے پھل دوچند لایا ہو اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑا تو پھوار ہی کافی ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو محض اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور نفس میں چنگی پیدا ہو۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس کام میں نفس کو تکلیف برداشت کرنی پڑے اس کے بار بار کرنے سے عادت ہو جاتی ہے اور پھر طبیعت میں وہی ملکہ راسخ ہو جاتا ہے، نفس کی مزاحمت جاتی رہتی ہے اور دوسرے اعمال صالحہ میں بھی دقت نہیں پیدا ہوتی۔ اس چنگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم اپنی عزیز ترین متاع حیات دولت کو اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں تو جس چیز کے لئے اس کو خرچ کریں گے خود اس سے بھی ایک قسم کا ربط و تعلق قائم ہو جائے گا اور خدا کی راہ میں زیادہ ثابت قدمی اور وفاداری نوازش ہوگی۔ ان صفات کو ملحوظ رکھ کر خرچ کرنے والوں کی مثال اس باغ کی ہے جو بلند مقام پر واقع ہے، جس کی ہوا لطیف اور بار آور ہے، بارش بھی خوب ہوتی ہے، اس لئے وہ باغ دگنا اور چو گنا پھل لاتا ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو، تو ہلکی پھوار بھی کافی ہو جاتی ہے، کیونکہ زمین اور اس کا موقع بہت عمدہ ہے۔

اَيُّوْذُ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنُ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ تَّجْوِيْلٍ وَّاَعْتَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ۚ لَهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۚ فَاَصَابَهَا اَعْصَابٌ فِتْنَةٍ ۚ فَاحْتَرَقَتْ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

”کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس کو وہاں ہر قسم کے پھل میسر ہوں اور اس کو بڑھاپا آ پینچے اور اس کے بال بچے ناواں ہوں، پھر اس باغ پر ایک گولہ آ پڑے جس میں آگ ہو اور وہ جل بھن جائے، اسی طرح اللہ تم سے احکام کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم غور کرو۔“

یہ تیسری مثال ہے کہ من، اذی اور ریا سے صدقات و خیرات پر کس طرح تباہی و بربادی نازل ہوتی ہے۔ ایک شخص کا باغ ہے جس میں ہر قسم کے میوہ جات ہیں، پیری و نقاہت کا زمانہ ہے، سب سے زیادہ احتیاج کا یہی وقت ہوتا ہے۔ پھر اہل و عیال میں اتنی طاقت نہیں کہ خبر گیری کر سکیں، اسی باغ پر تمام خاندان کی زندگی کا دار و مدار ہے، ایسی حالت میں ایک ہی آگ گولہ سے تمام باغ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو من و اذی، شہرت و ناموری اور دنیا کی قدر و منزلت کے لئے روپیہ دیتے ہیں کہ ہر جگہ ان کی فیاضی و سخاوت کا تذکرہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سخاوت کچھ کام نہ آئے گی اور یاس و حرمان کے سوا کچھ نصیب نہ ہو گا۔

بہترین مال خرچ کرو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَبَسُوْا الْخَبِيْثَ مِنْهُ

تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِهِ إِلَّا أَنْ تُغْبِضُوا فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفِيرٌ حَبِيدٌ ﴿٢٧﴾

”مسلمانو! جو پاک چیزیں تم نے کمائی ہوں اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے واسطے زمین سے اگائی ہیں خرچ کرو اور اس میں سے رڈی چیز کا ارادہ نہ کرنا، خرچ کرنے لگو حالانکہ تم خود نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کے لائق ہے۔“

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال دو جو جائز طریق سے کمایا گیا ہو اور اس میں سے بھی بہترین ہو۔ یہ مال یقیناً حیات قومی کی لئے زندگی بخش ثابت ہوگا، اللہ کو ناکارہ اور ردی اشیاء کی ضرورت نہیں، ان صدقات کے بغیر بھی اس کی ذات حمد کے لائق اور قابل ستائش ہے، اس لئے وہی چیز پیش کرو جو اس کی ذات اور صفات کے لائق ہو۔

اَلشَّيْطٰنُ يُعِدُّ كُمْ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يُعِدُّكُمْ مَّغْفِرًا مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٨﴾

”شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تم کو بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور برکت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا واقف کار ہے۔“

جب ایک شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگتا ہے تو اسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں غریب و مفلس نہ بن جاؤں، یہ تمام وساوس و خطرات شیطانی ہیں۔ ایک مسلم کا فرض ہے کہ ان کی پروا نہ کرے اور خوب دل کھول کر خلافت کی مدد کرے۔ اس کا ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی غلط کاریوں کا کفارہ ہو جائے گا، دوسرے اللہ تعالیٰ اس کو مال مال کر دے گا، اللہ کا علم بہت وسیع ہے، ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق اجر دیتا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَّشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

”جس کو چاہتا ہے سمجھ عطا فرماتا ہے اور جس کو سمجھ عطا کی گئی اس کو بیشک بہت بڑی خوبی عطا کی گئی، مگر صاحبان عقل ہی اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔“

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے گزشتہ آیات میں مختلف شرطیں بیان کی گئیں، جن کی تلخیص حسب ذیل ہے:

(۱).... دے کر احسان نہ جتاؤ۔

(۲).... دوسروں کو اذیت و تکلیف نہ دو۔

(۳).... دکھاوے کی غرض سے نہ ہو۔

① مگر مسلمان بالکل اس کے برعکس کرتے ہیں، بدترین مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، جب کھانا خراب ہونے لگے تو فقیر کو دیا جاتا ہے۔ جب کاروبار سے تھک گئے اور کام کرنے کی طاقت نہ رہے، تو دوچار اسلامی ہمدردی کی باتیں کر لیں۔ دماغ معطل ہو گیا، تفریح کا وقت نہ رہا، تو دوسرے قرآن میں آگئے۔ اپنے بچوں میں جو سب سے کمابہو، آنکھ اور فہم و فراست سے بے بہرہ ہو، تو اسے مذہبی تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ جن کتابوں کے فروخت ہونے کی زیادہ توقع ہو، اس کے لئے کاغذ کتابت اور طباعت کا بہترین انتظام کیا اور قرآن کو معمولی کاغذ پر شائع کیا۔ صحت کا بھی خیال نہ کیا، ان امراض کے ہوتے ہوئے مسلمان زندہ ہوں تو کیسے۔

(۴).... رضائے الہی پیش نظر رہے۔

(۵).... چنگی اور استواری کا خیال ہو۔

(۶).... بہترین مال خرچ کرو۔

(۷).... جائز ذرائع سے کمایا ہو۔

(۸).... فقر و تنگدستی کا خیال دل میں نہ آئے۔

(۹) بخل و امساک سے پرہیز کرو۔

ان تمام شرطوں کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس شخص میں اللہ تعالیٰ استعداد اور قابلیت دیکھتا ہے، اس کو علم و حکمت اور تفقہ فی الدین نوازش کرتا ہے۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت کے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے: وانه لحب الخیر لشدید، وما تنفقوا من خیر، میں خیر سے مراد مال ہی ہے اور خیر کثیر کا اطلاق علم و حکمت پر آتا ہے۔ گزشتہ آیات کے ربط و تعلق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شرطیں ارباب دولت و ثروت کے لئے بیان کی گئی ہیں وہی قیود اہل علم و فضل کے لئے ہیں، دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۷۵﴾ إِنَّ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهُهَا الْفُتُورَ آفَهُمْ خَيْرٌ لَكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۷۶﴾

”اور جو کچھ کوئی خیرات تم خرچ کرتے ہو یا کوئی منت مانتے ہو تو بیشک اللہ اس سے واقف ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا، اگر تم ظاہر میں خیرات دو تو بھی اچھا ہے اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجتمندوں کو دے دیا کرو تو وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور تمہارے کچھ گناہ دور کر دے گا اور جو اعمال تم کرتے ہو اللہ ان سے باخبر ہے۔“

مال و دولت کے صرف کرنے اور علم و حکمت کی نشر و اشاعت کے لئے تمام شرطوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر اب تمہیں اختیار ہے خواہ گاہ و بیگاہ اللہ کے نام پر دو یا ایک رقم نذر کے طور پر معین کر لو، نذر کے بعد اگر تم نے اس کو پورا نہ کیا تو اس کا بہت برا اثر اخلاق پر پڑے گا اور باقی فرائض ملت کے ادا کرنے میں بھی کاہلی سے کام لو گے۔ اس قدر تعلیم کے بعد بھی جو لوگ بر محل صرف نہ کریں اور بہانے بناتے پھریں، اللہ انہیں خوب جانتا ہے، ان کی کبھی مدد نہ ہوگی۔

علی الاعلان دینا اور خاموشی کے ساتھ چھپا کر دینا بھی جائز ہے۔ اگر رفاه عام کے لئے دینا ہے، سیاسی و مذہبی ضرورتوں میں صرف کرنا ہے، تو اعلان ہی مفید ہو گا کہ دوسروں کی ترغیب و تشویق کا باعث ہو اور اگر فقرا و مساکین کو دینا ہو تو چھپا کر دینا مفید ہو گا، اصل چیز حسن نیت اور اخلاص ہے، جب یہ ہے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی مفید و نافع ہو گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا إِلَهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسٍ كُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اللَّهُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾

”تمہارے ذمہ ان لوگوں کا راہ پر لانا نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے اور جو کچھ تم مال خرچ کرو گے سواپنے لئے اور اللہ کی رضا جوئی کے سوا خرچ نہ کرو اور جس قدر مال تم خرچ کرو گے اور وہ تم تک پورا پہنچا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔“

رسول اللہ ﷺ کا یہی فرض تھا کہ لوگوں کے سامنے قانون صحیح پیش کر دیں، شکوک و شبہات کو دور کر دیں اور دولت و علم کے مصارف بتا دیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ہی ان کے صرف کرنے کے بہترین مواقع ہیں۔ لیکن یہ آپ کا فرض نہیں کہ لوگوں میں جذبات صادقہ بھی پیدا کر دیں۔ انما انت مذکر لست علیہم بصیطر، پھر دوسری جگہ فرمایا: انک لا تہدی من اجبت ولكن الله یهدی من یشاء، مسلمانوں کو خود یہ ضرورت محسوس کرنی چاہئے کہ ان کی حیات ملی کا دار و مدار انفاق و جہاد فی سبیل اللہ پر ہے، باقی ہدایت و راہ نمائی تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ اسلام کی تعلیم کا تمام تر مقصد یہی ہو کہ اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں لٹا دی جائے تو وہ ذرا غور کر کے دیکھیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کا نفع و سود انہی کی جانب عود کرتا ہے یا نہیں۔ عزیز و قریب کی ہدایت کا باعث بنتے ہیں، اسلام کا بول بالا ہوتا ہے، خلافت اسلامی محکم و استوار ہوتی ہے، مال غنیمت سے مالا مال ہوتے ہیں اور جو قومیں ظلم و جور کا تختہ مشق بنی ہوئی تھیں، ان کی آزادی کا باعث بنتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں۔

### انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَاقًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۷۱﴾

”ان مفلسوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، ملک میں چل پھر نہیں سکتے، ان کی بے سوالی کے سبب انجان ان کو مالدار سمجھتا ہے، ان کی صورت سے تم ان کو پہچان لو گے، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو کچھ تم کام کی چیز خرچ کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔“

اس آیت میں ان لوگوں کو بیان کیا ہے جن پر ہم اپنی دولت صرف کر سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) مجاہدین (ب) جو جہاد میں مجروح ہوں (ج) علمائے ملت جو تعلیم حقہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوں، کتاب و سنت کا درس دیتے ہوں اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہوں (د) خلافت اسلامی کے اعضاء اور کان جو ملک کے نظم و نسق میں لگے ہوئے ہوں۔

یہ لوگ نالائق و بیکار نہیں، بلکہ شرعی ضرورتوں نے ان کو روزی کمانے، تجارت کرنے اور دوسرے مشاغل دنیوی

میں شریک ہونے سے روک دیا ہے۔ وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے اور نہ لگ لپٹ کر مانگتے ہیں۔ یہ شرط اس لئے لگادی کہ عام طور پر فقر و مساکین اصرار مالی کیا کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں تجارت کرتے تھے۔ ایک روز کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر بازار جا رہے تھے کہ حضرت عمر مل گئے، انہوں نے کہا اے امیر المومنین! کہاں کا قصد ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کمانے جاتا ہوں۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا، اپنے ضروری مصارف کے لئے بیت المال سے لے لیا کیجئے۔

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْدِي وَالْأَنْهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧﴾

”جو لوگ اپنے مال رات اور دن چھپے اور کھلے صرف کرتے ہیں ان کے رب کے ہاں ان کے لئے ان کا ثواب ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔“

شرائط کا علم ہو گیا، اب کسی مزید پابندی کی ضرورت نہیں، وقت معین کرنا بھی بے سود ہے، بلکہ ان لوگوں کو جب ضرورت ہو، دن ہو یا رات، سر آہو یا جھر آؤ زامد کرو۔

### سود کی حرمت

خلافت اسلامی اور اس کے اعضاء و ارکان کی غایۃ الغایات توحید کی نشر و اشاعت اور اعلیٰ ترین علم و حکمت کا درس و تعلیم ہے۔ ان مقاصد مہمہ کا حصول ممکن نہیں جب تک کثرت سے روپیہ نہ ملے۔ اس لئے گزشتہ آیات میں انفاق فی سبیل اللہ پر پورا زور دیا گیا ہے اور فرمایا کہ خرچ کرو گے تو بڑے اجر ملیں گے اور کامیابی نصیب ہوگی۔ انفاق کے جذبہ صادقہ کی تکمیل و تربیت کے لئے ضروری ہے کہ جس قدر اخلاق فاسقہ اس کے مخالف ہوں ان کو ترک کر دیا جائے۔ لوگوں کے دلوں میں مال کی محبت جاگیر نہ ہو، کیونکہ اگر مال کی محبت جڑ پکڑ گئی تو اللہ اور اس کے کلمہ حق کی محبت کم ہو جائے گی، جہاد فی سبیل اللہ کا شوق جاتا رہے گا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ سود خواری کو ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا جائے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اسے جائز نہ رکھا جائے، اس لئے اب یہاں سے سود کی حرمت پر بحث ہوتی ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ النَّسِئِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَاتَّقِهَا فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٨﴾

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کے حواس شیطان نے لپٹ کر کھو دیئے ہوں، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود ہی جیسی ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، تو جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچ چکی پھر وہ باز آگیا تو اسی کا ہے جو لے چکا اور

اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جس نے پھر سود لیا تو وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“  
امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔

الا مرالذی کان مشہور امتعارفاً فی الجاہلیۃ انہم کانوا یدفعون البال علی ان یاخذوا کل  
شہر قدراً معیناً ویکون راس البال باقیائہم اذا حل الدین طالبوا المدیون براس البال فان تعذر علیہ الا  
داعا زادوا فی الحق والا جل۔

”زمانہ جاہلیت میں رہا ایک مشہور متعارف امر تھا، ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ اس شرط پر قرض دیتے کہ ہر ماہ ایک معین رقم وصول کر لیا کریں گے اور اصل رقم بدستور باقی رہے گی۔ پھر جب قرض کے ادا کرنے کا وقت آجاتا تو قرضدار سے راس المال طلب کرتے اگر وہ اس اصل رقم کے ادا کرنے سے ہی اپنے آپ کو معذور پاتا تو رقم اور مدت دونوں میں اضافہ کر دیتے۔“

ہندوستان میں بھی اسی طرح کیا جاتا ہے، عرب جس کو رہا کہتے ہیں یہاں اس کو سود اور بیاج کہتے ہیں۔ یہاں بھی ساہوکار اصل رقم پر کچھ معین کر لیتا ہے اور اپنی سہولت کے اعتبار سے ماہوار یا سال کے ختم پر وصول کرتا ہے یا تمام سود کو اس المال میں شامل کر لیتا ہے۔ یہی سود اور سودور سود ہے۔ عرب اور ہندوستان میں اس مسئلہ کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کا سود نظر آتا ہے۔

جو شخص سود کھاتا ہے، قرآن حکیم نے اس کے حالات و واردات کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس کو شیطان چھو کر مجنوبہ الحواس کر دے۔ اس آیت میں سود خوار زندگی، اس کے عادات و خصائل، اس کے اعمال و افعال اور اس کے ثمرات و نتائج کی نہایت ہی جامع و مانع تشبیہ دی گئی ہے، وہ گویا اس مسئلہ کی پوری کتاب ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ شیطان اور جن کی ضرب سے انسان مجنون ولا یعقل ہو جاتا ہے اور صرع (مرگی) کی بیماری دراصل ایک طرح کی آسیب ہوتی ہے۔ مس جنون کے معنی میں بولا جاتا ہے اور مسموس پاگل کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوار زندگی کو ایک آسیب زدہ پاگل اور ایک مصروع کے حالات و خصائص سے تشبیہ دی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ان بد بختوں نے اپنی فطرت صالحہ، اپنے جذبات ملکوتیہ اور اپنے عواطف انسانیت کو بالکل بدل دیا اور کہنے لگ گئے کہ بیع و شرا مثل سود ہی کے ہے۔ ایک سود خوار عام تاجروں کی طرح اپنی ایک تجارت رکھتا ہے، وہ مبادلہ اثبات کی تجارت نہیں کرتا تو کیا ہوا، ایک ہی جنس کو دیتا اور ایک ہی جنس کو لیتا ہے، یہ بھی ایک کاروبار اور بیع و شرا ہی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے، اس لئے کہ۔

(الف) تجارت کا سبب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کو محنت و مشقت کی عادت پڑے۔ اسلام تجارت کا سبب سے بڑا حامی اور ان پیشوں کا مخالف ہے جن سے کاہلی اور سستی پیدا ہو اور جو انسان کو اخلاق فاضلہ اور کمالات انسانیت سے محروم کر دیں۔



(ب) سود خوار جب روپیہ دیتا ہے تو صرف نفع کا مالک ہوتا ہے، مگر تجارت میں سود زیاں اور نفع و نقصان کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

اس لئے بیچ و شر کو تو جائز قرار دیا گیا، اور سود کو حرام کر دیا۔ ترمذی نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ: لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا و موكله و شاهد یه و كاتبه، ”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، گواہوں اور اس کے کاتب پر لعنت کی ہے۔“

يَحَقُّ اللَّهُ الزُّبُلَا وَيُزِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَتِيَمٍ ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٥﴾

”اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی کافر گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

آپ سود خواری کے چند نتائج کو سامنے لائیے۔

(۱) سود خوار اپنے پیشہ کے لئے یہ خواہش کرنے پر مجبور ہے کہ لوگ اپنی ضروریات انجام دینے پر قادر نہ ہوں اور قرض کے لئے درخواست کریں۔ کسی کو قمار بازی کی عادت ہو، کوئی عیاشی میں مبتلا ہو، عیال داری کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہ ہو، لوگ اس کی حالت پر افسوس کریں گے، مگر بد بخت سود خوار دل ہی دل میں خوش ہو گا کہ حسب دلخواہ سود لینے اور اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کا وقت آگیا۔

(۲) یہ آمدنی محنت کو چھوڑنے اور آرام طلب ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔

(۳) ایک محدود جماعت ملک کے تمام سرمایہ پر قابض ہو جاتی ہے، اقتصادیات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔

(۴) بعض اوقات غیر اقوام کے لوگ ایک ملک کے سرمایہ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس ملک کے رہنے والے محروم رہ جاتے ہیں۔

مال کی تقسیم کا مسئلہ دولتمندوں اور فقیروں میں ہمیشہ سے منازعت کا باعث رہا ہے، یورپ اس لئے اور بھی مصیبت میں ہے۔ ارباب دولت و ثروت روز بروز روپیہ کو اپنے قابو میں کر رہے ہیں، غربا و مساکین کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اسی کشمکش نے یورپ میں مختلف فرقے پیدا کر دیئے، مگر اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے۔

ہنسلٹ: ان کا مقصد یہ ہے کہ جملہ املاک و امتیازات پر افراد قوم کا مساوی حق تصرف و یکساں حق مالکیت ہو۔

سوشیلسٹ: یہ چاہتے ہیں کہ اسباب معیشت پر سے شخصی ملکیت کو اٹھا دیا جائے اور جمہور کی ملک میں کر دیا جائے۔

نیشنلسٹ: ان کی غرض یہ ہے کہ اراضی سکتی اوزرعی کی ملکیت و پیداوار کو شخصی قبضہ سے نکال لیا جائے۔



بولشوسٹ: ان کا خیال یہ ہے کہ حکومت افراد کی تمام ضروریات کی متکفل ہو اور سب کو مساوی حقوق دیئے جائیں اور افراد کی تمام سعی و کوشش سے حکومت و قوم فائدہ اٹھائے۔

مگر یاد رہے حکیم سولون کے عہد سے لے کر آج تک کوئی انسانی دماغ اس عقدہ کی گرہ کشائی نہ کر سکا۔ املاک پر سے مالکوں کا حق ملکیت کا اٹھادینا عملاً اس قدر محال ہے کہ دنیا میں کبھی بھی اس کا رواج نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے اس کی یوں گرہ کشائی کی کہ تمام دولت مند سالانہ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ نکالیں، بیت المال میں جمع ہو۔ وہاں سے فقرا و مساکین کی مدد ہو اور ساتھ یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ بغیر سود کے قرض دیا کریں۔

سود کے مال میں کبھی برکت نہیں ہوتی، شراب قلیل مقدار میں نقصان نہیں پہنچاتی مگر ترقی کرتی ہوئی آخر کار مہلک ثابت ہوتی ہے، ایسے ہی سود خوار کی معاملہ ہے، جس کا انجام کار ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے سود لینے والے کو سود تو ملے مگر تمام موجودہ دولت اور اس کی مدد سے آئندہ کی بڑی پیداوار معدوم دے چند کام کرنے والوں کے پاس ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے، باقی تمام ملک جس کی متحدہ کوشش سے وہ رقم جمع ہوئی ہے اور جس میں سود خواروں کے سرمایہ اور مزدوروں کی محنت سے بہت بڑی خدمت لی گئی ہے سب اپنے واجبی استحقاق سے محروم رہیں، آرام طلبی کے خوگر ہوں، چیزوں کو گراں قیمت پر خریدیں، غرض ایک سود کی لالچ میں کئی طرح کا مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات اور صدقات سے تمام ملک یکساں طور پر فائدہ اٹھاتا ہے۔ فقرا اور مساکین اپنی حالت کو درست کر لیتے ہیں۔ دولت کا ایک حصہ تقسیم ہو جاتا ہے اور اس طرح دولت مندوں اور غریبوں کی باہمی کشمکش کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔

## اعلان جنگ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۸﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْنُوا فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۹﴾

”مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم مسلمان ہو تو جس قدر سود رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اور اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔ اور اگر توبہ کرتے ہو تو اصل رقم تمہاری ہے نہ تم کسی کا نقصان کرو گے اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے گا۔“

غور کرو! قرآن حکیم نے انسانی معاصی و جرائم کے متعلق طرح طرح کی وعیدیں فرمائی ہیں، لیکن سود کے متعلق ایک ایسا لفظ کہہ دیا ہے جس سے سخت تر وعید اور کسی سخت سے سخت جرم و معصیت کی بھی نسبت نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا کوئی فعل جلب نفع اور خود غرضی سے خالی نہیں، اس دو غرضی کا ایک بدترین ظہور جمع و حصول مال کی بھوک ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو اعمال انسانیت میں اس مرض کا کوئی ظہور اس درجہ انسان کے ملکوئی خصائل کے لئے مہلک، اس کی بہیمیت و معبت کے لئے مقوی، بیت اجتماع انسانیت کی صحبت

مدنی کے لئے سم قاتل اور عالم مخلوقات کے انسان کو خوفناک درندہ بنادینے کے لئے عمل السحر نہیں ہے جیسا کہ سود اور سود خواری کی زندگی کی مختلف شکلیں۔

یقیناً تمام انسانی گناہوں میں صرف یہی معصیت حرب من اللہ ورسولہ ہے، کیونکہ اور کسی معصیت میں انسان خدا کے بندوں کے لئے اس درجہ بے رحم اور خونخوار نہیں ہو جاتا، جس درجہ سود کو اپنا وسیلہ معاش بنالینے کے بعد از سر تا پا مجسمہ شقاوت و قساوت اور غفلت و صلابت بن جاتا ہے اور خدا کے بندوں کے آگے بے رحمی سے مغرور ہوتا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہو کر آمادہ جنگ و پیکار ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اس کو سزا دیگا اور انسانی آبادی اس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار کہتا ہے کہ انہا البیعم مثل الربوا، اس نے تجارت کی ایک دکان کھول دی ہے اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس معطل کر دیتی ہے۔ ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے مگر مظلوم قرضدار خود دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لئے اس درجہ سختی کی مستحق نہیں جس قدر سود اور سود خواری کی مہیب زندگی۔ پھر کیا صاحب من اللہ ورسولہ سے اس کی تعبیر صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں خود غرضی کے جس قدر اعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں، جیسی کاروباری بے رحمی میں سود خوار کا عمل ظلم و دغی اور انسانی عمروں، خاندانوں اور نسلوں تک جاری رہتا ہے۔ اور وہ جس شکار کو پکڑتا ہے اس کی بے کسی اور مظلومی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے اور جب تک ہمیشہ کے لئے اس کے تڑپنے، لوٹنے اور کراہنے کے نظارہ کا تحمل اپنے اندر نہ پیدا کر لے وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔ اس لئے صرف اسی معصیت کو حرب من اللہ ورسولہ سے تعبیر کیا گیا۔ البتہ اگر توبہ و انابت الی اللہ کر کے آئندہ سود کو بالکل ترک کر دینے کا عہد و میثاق کر لے تو اپنا اس المال لینے میں کوئی گناہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ربانکی ہر شاخ کو حرام قرار دیا اور سود خواروں کو اس کے نتائج الیمہ سے ڈرایا۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور دارقطنی نے عبد اللہ بن حنظلہ سے روایت کیا ہے کہ: درهم دہویا لکھ الرجل وهو یعلم اشد من ستۃ وثلثین زنیۃ، جو شخص معلوم ہونے کے باوجود سود کا ایک درہم کھاتا ہے، اس کو چھتیس زنا سے زیادہ کا گناہ ہوگا۔ ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ: الربوا سبعون جزءا ایسا ہا ان ینکح الرجل امہ، سود کے ستر اجزا ہیں، ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ وہ شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔ ابن ماجہ نے ابن مسعود سے روایت کیا کہ: ان الربوا وان کثر فان عاقبتہ تصیدل قل۔ سود کی بنا پر اگرچہ دولت میں زیادتی ہو جائے مگر انجام کار اس پر فتناری ہوگی۔

وَإِنْ كَانَ دُوعَسْرًا فَنُظِرُوا إِلَىٰ مِيسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَىٰ  
اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَلَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٩﴾

”اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو فراخی تک مہلت دینی چاہئے اور یہ کہ معاف کر دو تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو اور اس دن سے ڈرو جس روز تم اللہ کے طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر جو کچھ کسی نے کمایا اس کو پورا دے دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔“

راس المال کے وصول کرنے میں بھی اس امر کا خیال رہے کہ اگر قرضدار غریب و مفلس ہے تو اسے فراخی و فراغت تک مہلت دینا بہتر ہو گا اور اگر نہ لو تو اچھا ہے۔ آخر سود خواری کے زمانہ میں تم اصل رقم سے کئی گنا زیادہ وصول کر چکے ہو۔ اگر تم قیامت کے روز خدا سے نرمی کی توقع رکھتے ہو تو آج نوع انسانی کے ساتھ ہمدردی و اعانت اور لیت و نرمی کا سلوک کرو، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

### قرض کا قانون

سود کی ابتدا یوں ہوئی کہ لوگ قرض لے کر ادا نہیں کرتے تھے یا زمانہ دراز تک ادا کرنے کا نام نہ لیتے اور اس طرح قرض دینے والا مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اس لئے سود کا رواج ہوا کہ اب ہر شخص جلد ادا کرنے کی کوشش کرے گا، ورنہ انجام کار اس کی تمام جائیداد فنا ہو جائے گی۔ ادھر قرض خواہ کو بھی اپنے سرمایہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہے گا۔ اسلام نے آتے ہی اس مہیب ترین درندگی اور بربریت کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے کر اس کے بعد فوراً قرض کا قانون معین کر دیا جس نے ان تمام غلط کاریوں کی اصلاح کر دی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُب بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَفِيعُ أَنْ يُطْلَلَ هُوَ فْلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ ذَلِكُمْ أَفْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشُّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٧﴾

”مسلمانو! جب تم ادھار کا ایک میعاد معین تک لین دین کیا کرو، تو اس کو لکھ لیا کرو اور چاہئے کہ کاتب انصاف سے تمہارے درمیان لکھ دے اور جس طرح اللہ نے کاتب کو سکھایا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ لکھ دے اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق ہے اور اس اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اس میں کچھ کاٹ چھانٹ نہ کرے۔ پس اگر وہ شخص جس پر وہ حق ہے کم عقل یا کمزور ہو یا وہ خود نہ لکھو سکتا، ہو تو اس کا کارکن انصاف سے لکھواتا

جائے اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو، پس اگر وہ دو گواہ مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو، تاکہ کوئی ایک بھول جائے تو ایک عورت ان میں سے دوسری کو یاد دلا دے گی اور جب گواہ بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں اور چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا تو اس کو میعاد تک لکھ لیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک نہایت منصفانہ کاروائی ہے، اور گواہی کے لئے بہت درست ہے، لگتا ہے کہ تم کو شبہ نہ پڑے، مگر یہ کہ جس کا تم لین دین کرتے ہو وہ سودا آپس میں دام نقد ہو تو اگر اس کو نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جب تم سودا کرو تو گواہ تو کر ہی لیا کرو اور کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دی جائے اور اگر ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

کئی رکوع میں برابر اتفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا جا رہا ہے، اس سے خواہ مخواہ مال کی محبت کم ہوگی۔ سود کی حرمت نے اس الفت اور محبت کو اور بھی فکا کر دیا۔ اب جبکہ مسلمان اس درجہ پر آگئے تو ان کو بتایا جاتا ہے کہ مال و دولت ایک نہایت ہی اہم اور ضروری چیز ہے۔ قوموں اور ملتوں کا قیام و ثبات اس کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے تم اپنے مال کی خوب حفاظت کرو، روپیہ کو محفوظ رکھو اور وقت آئے تو سارے کا سارا قوم کی راہ میں قربان بھی کر دو۔ اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لئے قرضہ کا ایک قانون مرتب کیا۔ لین دین کے متعلق جس قدر انسانی معاملات ہو سکتے ہیں ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:-

(الف) لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہیں۔

(ب) جس چیز کو خریدنا ہے وہ موجود ہے، مگر قیمت بعد میں ادا کی جائے گی۔

(ج) قیمت تو موجود ہے، مگر جس چیز کو خریدنا ہے وہ موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور انہی کے متعلق گزشتہ آیت میں احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(د) لینے اور دینے کی کوئی چیز بھی موجود نہیں، فرضی بیع ہے، نہ روپیہ پاس ہے اور نہ مال، اسلام نے اس کی سختی سے مخالفت کی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے۔

گزشتہ آیت میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہے ہم سہولت و آسانی کی خاطر ان کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھ دیتے ہیں جو ترتیب آیت میں ہے۔

(۱) جب آپس میں کوئی معاملہ کرنے لگو اور دام یا چیز ادھار ہو تو اس کو لکھ لیا کرو۔

(۲) دستاویز اور یادداشت میں ادا کرنے کی مدت ضرور معین کر دو۔

(۳) کاتب اور وثیقہ نویس انصاف کے ساتھ لکھے، کسی کی رعایت کے خیال سے کمی بیشی نہ کر دے۔

(۴) وثیقہ نویس لکھنے سے انکار نہ کرے۔

(۵) جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے اور جس کو وہ رقم یا چیز ادا کرنی ہوگی، وہ خود اپنی زبان سے لکھوائے اور

لکھواتے وقت خدا کا خوف دل میں رکھے اور اس میں کمی زیادتی نہ کرے۔

(۶) اگر جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے وہ:

(الف) سفیہ ہے، خفیف العقل ہے، مجنون ہے اور اس کے حواس مختل ہو چکے ہیں۔

(ب) ضعیف البدن ہے، نابالغ ہے، پیر فروت ہے یا بد حواس ہے۔

(ج) کسی اتفاقی امر سے خود بیان کرنے اور لکھوانے کی قدرت نہیں رکھتا، مثلاً گونگا ہے اور کاتب اس کے اشارات

سے واقف نہیں یا اجنبی ملک کارہنے والا ہے اور یہاں کی زبان نہیں جانتا ہے۔ تو ان تینوں صورتوں میں اس کا

کارکن ٹھیک ٹھیک لکھوادے۔ کارکن حسب ذیل لوگ ہو سکتے ہیں:

(۱) ولی جس کا تصرف اسکے مال میں نافذ ہو سکے اور وہ باپ، دادا، باپ کا وصی، دادا کا وصی اور قاضی ہیں۔

(۲) وکیل، مترجم اور مفہم بھی کارکن اور ولی میں آجائیں گے۔

(۷) معاملہ اور دستاویز کی پختگی کے لئے دو مرد گواہ بنالو۔

(۸) اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے

یاد دلادے۔

(۹) عدالت جب گواہوں کو شہادت کے لئے بلائے تو وہ جانے سے انکار نہ کریں۔

(۱۰) گواہی صرف اس شخص کی معتبر ہوگی جس میں اسلام، عقل، بلوغ، آزادی اور عدالت ہو۔ بے دین کی شہادت

قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۱) قرض کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، لکھ لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے یہ ہو گا کہ:

(الف) اللہ کے نزدیک انصاف کی بات یہی ہے۔ جب عدالت میں مقدمہ جائے گا تو قاضی کو فیصلہ کرنے میں

مدد ملے گی اور صحیح واقعات اس کے سامنے آجائیں گے۔

(ب) گواہوں کو شک و شبہ کا موقع نہ رہے گا۔ دستاویز دیکھتے ہی ان کو تمام واقعات یاد آجائیں گے اور سچی

گواہی دے سکیں گے۔

(ج) جب قرض کی مقدار اور مدت ادا لکھی ہوگی تو کسی کو دوسرے کی نسبت بدگمانی کا موقع نہ رہے گا۔

(۱۲) اگر سودا دست بدست ہو تو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۳) باہم لیتے دیتے وقت گواہ کر لینے مفید ہوں گے، ورنہ ممکن ہے دکان دار کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول نہیں

ہوئی یا میں نے اس چیز کو فروخت ہی نہیں کیا۔

(۱۴) وثیقہ نویس اور گواہوں سے مفت کام نہ لیں، بلکہ ان کی اجرت ادا کر دینا، ورنہ تمہیں کاتب اور گواہ نہ مل سکیں

گے۔ عدالت کو تکلیف ہوگی اور لین دین بند ہو جائے گا۔ خدا سے ڈرو اور چند ملکوں کی خاطر عدالت کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کرو۔ اللہ کو خود معلوم ہے کہ یہی قانون تمہارے جھگڑوں کو دور کر سکتا ہے۔

رہن کی اجازت ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَىٰ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْلُمْ مَّقْبُوضَةً فَإِنْ آمَنَ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اُؤْتِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِيَّمًا قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٧﴾

”اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی قبضہ کر ہوئی، پس اگر تم میں ایک دوسرے پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اس کو دوسرے کی امانت ادا کر دینا چاہئے اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اس کو چھپائے گا تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔“

سفر میں اگر قرض لینے کی ضرورت محسوس ہو اور کاتب نہ مل سکے، تو ایسی حالت میں اطمینان کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ قرضدار اپنی کوئی چیز رہن کے طور پر قرض خواہ کے پاس رکھ دے اور اگر ان کو ایک دوسرے پر اعتماد ہے تو اس کی بھی ضرورت نہیں، البتہ اب مدیون کو چاہئے کہ خدا سے ڈر کر حق نہ مارے۔ آخر میں پھر تبصرہ کر کے فرما دیا کہ شہادت اور گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ تمہارے اعمال و اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔

عرب کے لوگ لکھے پڑھے نہ تھے، ان کے تمام قومی معاملات، معرکہ کھائے کارزار اور دواوین و اشعار کا دار و مدار صرف حافظہ پر تھا۔ ان کے سامنے قرآن نے یہ قانون بیان کیا اور نہایت ہی لطیف طریق سے بتا دیا کہ تم عنقریب دنیا کی عظیم الشان قوم بن جاؤ گے۔ کامیابی و کامرانی تمہارے ہم رکاب ہوگی، تمہارے باہمی معاملات اس قدر وسیع ہو جائیں گے کہ ان میں کتابت اور تحریر کی ضرورت محسوس ہوگی۔

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی تمام ضروریات اجتماعی کے لئے جو چیز اساس و بنیاد کا کام دے سکتی ہے وہ یہی ہے کہ کاتب ہوں، ان کی کتابت کا معاوضہ دیا جائے، گواہی کا قاعدہ یہ ہے کہ گواہ شہادت سے انکار نہ کریں، صاحب معاملہ اگر بچہ، بوڑھا، اور پاگل ہو یا اور کوئی عذر ہو تو اس کا ولی ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو آج تمام مہذب دنیا کے قانون کی بنیاد پر ہے، جس کو قرآن نے صرف ایک آیت میں بیان کر دیا ہے۔

ارکان خلافت اور تعلق باللہ

خلافت کبریٰ کے فرائض بیان کر دیئے گئے۔ اولیائے خلافت کا یہ کام ہو گا کہ اپنی ماتحت دول و اقوام کی نگرانی کریں۔ فتنہ و فساد نہ ہونے پائے اور ہر جگہ امن و سلامتی کا دور دورہ ہو، لیکن اگر اعضائے حکومت ہی کی نیتوں میں فرق آجائے اور وہی لوگ ظلم و جور پر کمر باندھ لیں تو ان سے کون باز پرس کرے گا؟ اور کس کے سامنے ان کے اعمال کا احتساب کیا جائے

گا؟ اس رکوع میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخْفَوْا يُحَاسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۹﴾

”جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے اور اگر جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ بہر حال تم سے اللہ اس کا حساب لے گا پھر جسے چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

ارکان خلافت کو بتایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی حکومت اللہ کے قبضہ میں ہے، البتہ یہ امانت تمہارے سپرد کر دی گئی ہے، اس لئے اترانہ جانا بلکہ اعلیٰ ترین حکمران جماعت ہونے کی وجہ سے تمہارا احتساب اور بھی زیادہ سخت ہو گا۔ اگر دوسروں کے اعمال پر نظر ہو گی تو تمہارے ارادے بھی ہمارے محاسبہ سے نہ بچ سکیں گے۔

نزدیکاں راہیں بود حیرانی!

صحابہ اس کو سن کر کانپ اٹھے اور حضور رسالت میں عرض کیا کہ وسوس و خطرات سے بچنا مشکل ہے۔ آپ نے فرمایا تم یہودیوں کی طرح سبعنا و عصینا نہ کہنے لگ جاؤ۔ اس پر سب کی گردنیں تسلیم و رضا کے طور پر جھک گئیں اور فوراً بعد دوسری آیت نازل ہوئی جس نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا سے منسوخ مانا ہے، حالانکہ ان آیات میں نوحی بحث ماننا ہے سو ہے۔ سورہ بقرہ کے بعد آل عمران کا نزول ہوا ہے اس میں بھی اس کے ہم معنی آیت موجود ہے: قُلْ اِنْ تُخَفُّوْا مَآثِیْ ضُوْرٍ کُمْ اَوْ تُبْدُوْا یَعْلَمْنٰہُ اللّٰہُ (آل عمران ۲۹) اصل بات یہ ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ جس وقت صحابہ کرام پریشان و مضطرب ہو کر بار رسالت میں حاضر ہوئے تو غایت خشیت اور شدت خوف کی بنا پر آپ کی نظر بھی الفاظ کے ظاہری عموم پر پڑی، مگر اللہ نے فوراً اپنی مراد واضح کر دی اور صحابہ کے اشکال کو دور کر دیا۔

اَمِّنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نَعْرِیْ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرٰنَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِيْرُ ﴿۸۰﴾

”ان کے رب کی طرف سے پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس کو انہوں نے اور مسلمانوں نے بھی مان لیا سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آئے، ہم اس کے پیغمبروں میں کسی کو جدا نہیں سمجھتے اور بول اٹھے کہ ہم نے سنا اور مان لیا، اے ہمارے پروردگار تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“

یہ وسعت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کی تمام صداقتوں پر ایمان کا اظہار کرتا ہے، حق و صدق کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو مسلمان اس کو لبیک کہنے کو تیار ہو گا۔ کیا کوئی قوم اس خصوصیت میں مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

## یوں دعا کرو

لَا يَكْفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسَعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا أَثَمَ أَسْمَانَا حَسْبُنَا عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفُ لَنَا وَلَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨﴾

”اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے موافق، اسے ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اس پر پڑتا ہے جو اس نے کمایا۔ اے رب! اگر ہم بھول چوک جائیں تو ہم کو نہ پکڑ، اے ہمارے رب! جیسا بوجھ تو نے ان پر جو ہم سے پہلے تھے رکھا تھا ویسا ہم پر نہ رکھ۔ اے ہمارے رب جس بوجھ کی ہم میں سکت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھو، اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا حامی ہے پس کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔“

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اب اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا کہ اس سے مراد غیر اختیاری امور نہیں ہیں کیونکہ اللہ کبھی ایسے احکام صادر نہیں کرتا جو ایک شخص کی طاقت سے باہر ہوں اور ان کے لئے اسباب فراہم نہ ہو سکیں، بلکہ جتنا کرو گے اسی کے مطابق جزا ملے گی قوت ارادی میں ضعف و کمزوری نہ آنے پائے اور کام کرنے کا عزم مصمم ہو پھر اگر غلطی ہو جائے تو یوں دعا کرو!

اگر ہم سے بھول کر کوئی غلطی ہو جائے یا باوجود یاد ہونے کے پھر بے ارادہ کوئی فعل سرزد ہو تو اس پر مواخذہ نہ کیجیو، قانون کے متعلق دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:

(الف) لوگ اس کو سمجھ لیں: کیونکہ اگر یوں ہی ان کو عمل کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ کبھی اس کے پابند نہ رہ سکیں گے۔

(ب) طاقت اور استطاعت سے زائد نہ ہو۔

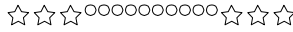
ان دونوں غلط کاریوں سے ہمیں محفوظ رکھنا، کیونکہ پہلی قومیں ان مصائب کی بنا پر فنا ہو گئیں۔ قانون ان کے لئے سخت تر ہوتا چلا گیا، ہم پر اس قسم کی بے سمجھی اور نادانی کا بار عظیم نہ ڈالنا اور جو قانون بھی نوازش ہو تو ہماری طاقت کا لحاظ کر کے دیا جائے، ہم اگرچہ غلط کریں مگر عفو و درگزر سے کام لینا اور سختی سے پیش نہ آنا، غلط کاری کے بعد فوراً مواخذہ نہ کرنا بلکہ چند روز کی مہلت دینا کہ ہم اصلاح کر لیں۔ ابھی ترقی کے بہت سے مواقع ہیں، مقاصد مہمہ پیش نظر ہیں اور ہم ابھی تک ایسے جرائم کے مرتکب نہیں ہوئے کہ ہمیں اس ترقی سے محروم کر دیا جائے، بلکہ تو اپنی رحمت سے آگے بڑھنے کا موقع نوازش کر اور اگر ہمارے مقابلہ میں کوئی دوسری قوم پیدا ہو تو اس کو فنا کر دے اور اس ترقی کے لئے صرف ہمارا ہی انتخاب عمل میں آئے۔ تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ تیرے سوا اور کس کے پاس جاسکتے ہیں اور جب ہم تیرے ہی غلام ہیں تو ہمیں کفار پر غلبہ نوازش کر۔ آمین یا رب العالمین۔



## حسن خاتمہ

اس حسن خاتمہ کے قربان جائیے جس میں اسلام کے انتہائی نصب العین اور غایت الغایات کو نہایت ہی واضح اور روشن الفاظ میں بیان کر دیا کہ فرزند ان تو حید دنیا کی تمام اقوام و ملل اور مذاہب و ادیان پر حاکم بنا کر بھیجے گئے ہیں اور شہدائے علی الناس اسی صورت میں بن سکتے ہیں جبکہ اس قانون پر عمل کریں، جو رسول عربی کی معرفت انہیں نوازش کیا گیا ہے۔ صبر و استقامت و عزم و استقلال اور ولولہ دینی و حب مذہبی اپنے اندر پیدا کریں، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہمیشہ تیار رہیں اور خداوند قدوس سے فتح و کامرانی کی دعا مانگیں۔

سورت کی ابتدا میں فرمایا تھا اولئک ہم المفلحون اور آخر میں بھی فانصرنا علی القوم الکفرین سے اسی طرف اشارہ کیا کہ ابتدا و انتہا ہی ایک سورت کے موضوع و مقصد معلوم کرنے کی کنجی ہے۔ اس مقصد کے کسب و حصول کے لئے دعا بہترین ذریعہ ہے، اس لئے اس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور وہ یہی ہے کہ فانصرنا علی القوم الکفرین۔ واللہ اعلم بالصواب۔





بسم الله الرحمن الرحيم  
الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

## سورۃ آل عمران (رکوع ۲۰- آیات ۲۰۰)

### سورۃ کا نام

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ قرآن حکیم میں جس قدر سورتیں ہیں ان کے نام ان کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات کی بنا پر رکھے گئے ہیں اور ان کو خود رسول اللہ ﷺ ہی نے معین فرما دیا تھا۔ اس سورۃ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ نبوت کا تاج بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کے سر پر رکھا جائے گا۔ اس میں موسوی سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اتباع و مقلدین کی غلط کاریوں کو بھی واضح کیا ہے۔ بنی اسرائیل کا سلسلہ نبوت دراصل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے شروع ہوتا ہے جن کے والد کا نام عمران تھا، اس لئے اس سورۃ کا نام بھی آل عمران ہی تجویز ہوا کہ اس خاندان کے بعض اکابر رجال کی سوانح زندگی کا اس میں تذکرہ ہے اور یہ نام خود لسان نبوت کا تجویز کردہ ہے، جیسا کہ مسند امام احمد میں نواس بن سمعان الکلابی سے مروی ہے: سبعت رسول الله ﷺ يقول، يوق بالقرآن يوم القيمة واهله الذين كانوا يعملون به فقد مهم سورة البقرة وال عمران وضرب لهما رسول الله ﷺ ثلاثة امثال ما نسيتهن بعد، قال كانهما غبا متان او ظلتان سوداوان بينهما شرق او فرقان من طير صوف يحاجان عن صاحبهما، آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز قرآن اور ان لوگوں کو لایا جائے گا جو اس کتاب عزیز پر عمل کرتے تھے، ان کے آگے آگے سورۃ بقرہ اور آل عمران ہوں گی جو ابریا سائے کی مانند چلیں گی اور ان ارباب ایمان کی جانب سے گفتگو کریں گی۔ ”اس سے معلوم ہو گیا کہ خود دربار رسالت سے اس سورت کا یہی نام تجویز ہوا ہے۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے بھی بیان کیا ہے۔

### ترتیب نزول

اس امر کو تمام مفسرین کرام تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سورۃ تمام و کمال مدینہ منورہ ہی میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کا بیشتر حصہ سورۃ بقرہ کے بعد نازل ہوا ہے۔ تیرہویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک غزوہ احد کا تذکرہ ہے۔ اور

اسی کے مختلف نتائج و ثمرات اور بصائر و حکم کو نہایت ہی دل آویز انداز سے بیان کیا ہے۔ یہ جنگ ۳ ہجری میں ہوئی ہے، اس لئے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام حصہ ۳ ہجری ہی میں نازل ہوا ہے۔

سورۃ کے ابتدائی رکوعوں میں عیسائیوں کے عقائد باطلہ کا رد کیا گیا ہے، وہاں ہمیں آیت مباہلہ بھی ملتی ہے جو فد نجران کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ یہ وفد ۹ ہجری میں مدینہ حاضر ہوا تھا اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ غالباً تمام ابتدائی رکوع ہجرت کے نویں سال نازل ہوئے ہوں گے، مگر آیات کی اندرونی شہادت اس فیصلہ کی تائید نہیں کرتی، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیصر اور دوسرے امراء کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں تعالوا الی کلمۃ سواعییننا و بینکم درج ہے۔ ارباب تاریخ کو معلوم ہے کہ قیصر وغیرہ کو ۶ ہجری میں خطوط روانہ کئے گئے۔ اس لئے ان تمام آیات کے متعلق یقینی طور پر بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کا نزول بھی ۶ ہجری سے قبل ہو چکا تھا۔

اب صرف آیت مباہلہ کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس کی بناء پر اس کے نزول کی کوئی تاریخ معین کر سکیں۔ بالکل ممکن ہے کہ یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی ہو جب وفد نجران دربار رسالت میں حاضر ہوا تھا اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ آیت بھی باقی تمام آیات کے ساتھ ہی اتری ہو اور جس وقت وفد نجران آیا ہو تو آپ نے اس کو انکے سامنے تلاوت کر دیا ہو، والعلم عند اللہ۔

ما قبل سے تعلق

سورہ بقرہ اور آل عمران کا آپس میں نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے الزہرہ اور ان کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ اس میں حضرت آدم کا تذکرہ تھا اور اس میں ان مثل عیسوی عند اللہ کمثل آدم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہودیوں کی خرابیوں کو بیان کیا گیا تھا اور اس میں عیسائیوں کے نقائص و ذنائب کی قلعی کھولی گئی ہے کہ دونوں کے دونوں بنی اسرائیل ہی کے دو مختلف گروہ ہیں۔ اس میں یہودیوں کو اسلام کی جانب دعوت دی گئی تھی اور اس میں عیسائیوں کو اسی راہ حق کی طرف بلایا گیا ہے اور قدرتی ترتیب بھی اسی بات کی مقتضی تھی کہ دعوت اسلام میں عیسائیوں کا درجہ بعد کو آئے۔ سورہ بقرہ کے آخر میں ان الفاظ میں دعا کی گئی تھی: فانصرنا علی القوم الکفرین۔ اس سورت کے ابتدا ہی میں اللہ لا الہ الا هو الہی القیوم ذکر کر کے بتادیا کہ مسلمانوں کی دعا کو شرف اجابت بخشا گیا، وہ کبھی ہلاک نہ ہوں گے بلکہ ان کو ایک قوی و طاقتور اور زندہ قوم بنا دیا جائے گا۔

روئے سخن

اس میں شک نہیں کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ان میں باہمی کوئی فرق و امتیاز نہیں، لیکن پھر بھی بعض امتیازات و خصوصیات کی بنا پر کسی پر علم غالب آ جاتا ہے اور اس کی تمام زندگی اسی کی نشر و اشاعت میں صرف

ہو جاتی ہے اور کسی پر عشق و شیفگی کے دروازے مفتوح ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام کائنات حیات اسی جذب و وارفتگی کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اگر موسیٰ و داؤد پر پہلی چیز غالب تھی تو زکریا اور عیسیٰ دوسری حقیقت کے نمونہ تھے، لیکن غرض ان سب کی حقائق و معارف الہیہ کی نشر و اشاعت تھی اور بس۔

قرآن حکیم کا مقصد دعوت و تبلیغ اسلام ہے۔ سورۃ بقرہ میں اس نے یہودیوں کو مخاطب کیا کہ وہی سب سے زیادہ مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ موسیٰ سے لے کر عیسیٰ تک ان میں انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے، مگر اپنے علم کے گھمنڈ میں انہوں نے ان بزرگان ملت کی پروا نہ کی۔ ان میں حیلہ سازی، قانون الہی سے نفرت، باریک بینی، آرام پسندی، ریاکاری اور عجب و غرور کے امراض خبیثہ پیدا ہو گئے۔ ان کے واقعات و حالات بیان کئے کہ مسلمانوں کے ارباب علم و فضل ان سے عبرت اندوز ہوں اور ان جرائم کے ارتکاب سے پرہیز کریں جن کی بنا پر بنی اسرائیل مغضوبیت کے مورد قرار پائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عام قاعدہ کے خلاف ہوئی تھی اور یہودیوں کا غرور و تکبر حد سے تجاوز کر گیا تھا، اس لئے بجائے اس کے کہ وہ اس عظیم الشان و بزرگ ترین ہستی سے فائدہ حاصل کرتے خود اسی کی ذات اقدس کو مورد طعن و تشنیع بنانے لگے، البتہ سنت اللہ کے مطابق چند نہایت ہی عاجز و درماندہ لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی اور ان کے علوم سے استفادہ حاصل کیا اور یہی قانون قدرت ہے کہ انبیائے کرام کے اولین اتباع ہمیشہ ضعیف و کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں، بدآلا سلام غریبا و سيعود غریبا فطین للغرباء۔ بعد میں انھیں لوگوں کو نصاریٰ کہا جانے لگا اور اس سورت میں یہی مخاطب ہیں۔ اس میں نہایت تفصیل سے ان کی خرابیاں اور غلط کاریاں ذکر کی گئی ہیں اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اگر وہ ان بد کاریوں سے بچنا چاہتے ہیں اور دنیا میں ایک زندہ قوم کی طرح رہنے کے آرزو مند ہیں، تو دائرہ اسلام میں داخل ہوں اور فرزندان اسلام کے دوش بدوش اصلاح و تجدید عالم کے فرائض حقہ انجام دیں۔

بعض مخصوص اسباب و وجوہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام عمر نکاح نہیں کیا۔ عیسائیوں نے اس نمونہ کی تقلید کی اور ان میں سے اکثر لوگوں نے تجرید و رہبانیت کی زندگی اختیار کر لی۔ انہوں نے دنیا کے لذائذ و مرغوبات کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور نہایت ہی شدید ریاضتوں اور مجاہدوں کے پابند بن گئے، مگر ایسا کرنا بالکل خلاف فطرت تھا، اس لئے راہبانہ زندگی میں ان سے بے انتہا فرگزاشتیں ہوئیں اور وہ سخت ترین جرائم کے مرتکب ہوئے، انجام کار ان میں سے بیشتر مجسمہ ملعونیت و شیطنت اور پیکر خست و بد باطنی بن گئے۔

اس سورت میں ان کی خرابیوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ کے ارباب تصوف و تجرید ان کو آویزہ گوش بنائیں اور جو غلط کاریاں عیسائیوں کے صوفیوں اور پیروں سے ظاہر ہوئی ہیں، ان سے ہمارے مشائخ کرام اور صوفیائے عظام پرہیز کریں۔

## موضوع سورۃ

گزشتہ سطروں سے یہ بات صاف ہو گئی ہوگی کہ اگرچہ سورۃ بقرہ میں یہودی مخاطب تھے، مگر ضمناً عیسائیوں کا تذکرہ بھی آجاتا تھا، اسی طرح آل عمران میں اصلی روئے سخن تو نصاریٰ کی جانب ہے، مگر بعض اوقات یہودیوں کا نام بھی آجاتا ہے، اس لئے کہ دونوں جماعتیں ایک ہی سلسلہ موسوی کی دو متصل کڑیاں ہیں۔ بنی اسرائیل نے سبعنا وعصینا کہہ کر قبول اسلام سے انکار کر دیا، اس لئے سورۃ بقرہ میں ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کی بنا پر ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے تلوار چھین لی گئی اور ان کو حکومت سے محروم کر دیا گیا۔ عیسائیوں سے بھی کچھ زیادہ توقع نہیں کہ وہ اسلام قبول کریں گے، اس لئے آل عمران کے ابتدا ہی میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی:

اللہم مالک المملکات توکى المملک من تشاء وتنزع المملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیبدک الخیر انک علی کل شیء قدير

”خداوند! تمام کائنات ارضی و سماوی تیرے ہی قبضہ و اختیار میں ہے پس تو اپنی قدرت سے کام لے کر نصاریٰ سے سلطنت چھین اور عاجز و درماندہ مسلمانوں کو نوازش کر۔“ آمین

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ نے ان دونوں سورتوں کو الزہرا و ان کے نام سے یاد فرمایا ہے جس کی معنی روشن، درخشندہ اور سفید کے ہیں۔ گویا سورۃ بقرہ میں مسلمانوں کو جس خلافت کبریٰ اور فضیلت علیٰ العلمین کا وعدہ دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اس سورۃ کے ابتدا ہی میں فرمایا تھا:

اولئک علی ہدی من ربہم واولئک ہم المفلحون

اور آل عمران کے اخیر میں فرمایا:

اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

مگر اس خلافت کبریٰ کے حفظ و بقا کے لئے چند قوانین اور خصوصیات کی پابندی لازمی اور ضروری ہے۔ اس سورۃ میں ان تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو خلافت اسلامی کو قائم و دائم رکھ سکتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں اس سورۃ کا موضوع اصلی خلافت اسلامیہ کی حفظ و صیانت ہے اور بس۔

## تلخیص مضامین

آل عمران کے تمام مضامین اول سے آخر تک اسی طرح مربوط اور مسلسل ہیں جس طرح آپ سورۃ بقرہ اور انفال و توبہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس سورۃ کا روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے، اس لئے سب سے پہلے ان کے عقیدہ مسیحیت کو باطل ٹھہرایا گیا اور توحید کو اصل و اساس تعلیمات الہیہ قرار دیا گیا۔ یہی تعلیم توراۃ اور انجیل کے اوراق میں محفوظ ہے اور اسی کا حامل قرآن حکیم ہے، مگر کتب الہیہ سے مستفید ہونے کا بہترین طریق یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور کائنات کا نشنہ کو بر باد نہ کرے

اور محکمات سے متشابہات، بدیہیات سے نظریات اور اصول سے مخصوصات کا استخراج و استنباط کرے۔ ورنہ ہمیشہ ناکامی رہے گی۔ آیت نمبر ۹ سے اس پر تاریخی شہادت پیش کی کہ جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو خراب کر لیا اور محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑ گئے وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں فرعون اور اس کی قوم کے نظائر بیان کئے، اس غلطی میں عیسائی بھی مبتلا ہوئے اور عقیدۃ الوہیت مسیح میں انہوں نے فرعونوں کے نقش قدم کی پیروی کی، پس ان کا بھی وہی حال ہو گا جو ان سے پہلے لوگوں کا ہوا۔ اور ان کے مقابلہ میں صرف ارباب توحید ہی کو کامیابی ہوگی کہ وہ محکمات سے متشابہات کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اگر نصاریٰ کو یہ خیال ہو کہ مسلمان قلت تعداد اور ضعف ظاہری کی وجہ سے ان پر غالب نہ آسکیں گے تو انہیں غزوہ بدر کا دیدہ عبرت سے مطلع کرنا چاہئے، دونوں جماعتوں کے مقاصد حیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مسلمان اپنی ہر چیز خدا کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہیں، اس لئے ان پر کفار کبھی غالب نہیں آسکتے، پس جبکہ عیسائیوں کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدائے قدوس سے حکومت کی دعا مانگیں۔ اس میں جہاں ایک طرف اس حقیقت کو واضح کیا کہ انجام کار حق غالب رہے گا اور دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں توحید کی حکمرانی ہوگی، وہاں یہ بھی بتادیا کہ آج کی تاریخ سے بنی اسرائیل کو نبوت کے تخت سیادت سے نیچے گرا دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔ یہ مضمون آیت نمبر ۱۱ سے نمبر ۲۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

خلافت اسلامی کے بقا و استحکام کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان تمام کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیں اور صرف اللہ کے قانون کی پابندی اختیار کریں۔ چنانچہ پہلے لوگوں کی کامیابی محض قانون الہی کے اتباع کی بدولت ہوئی، اسی ذیل میں حضرت زکریا، یحییٰ، مریم اور عیسیٰ علیہم السلام کے واقعات بیان کئے اور ساتھ ہی ساتھ افترا پر دازیوں کی اصلاح کردی، جو حضرت مسیح کی جانب منسوب کی جاتی ہیں، تا آنکہ یہ واضح ہو گیا کہ عیسیٰ بھی ایک انسان ہی تھے۔ جب باوجود ان حقائق ثابتہ کے نصاریٰ پھر بھی اپنے عقائد باطلہ پر قائم رہے اور ان کی گردنیں حق کے آگے نہ جھکیں تو انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی، مگر وہ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے، اس لئے انہیں توحید کی طرف بلایا گیا جو تمام مذاہب و ادیان میں ایک مشترک امر ہے اور جس کی نشر و اشاعت ہر مذہب کا اولین فرض۔ اس مضمون کو آیت نمبر ۶۴ پر ختم کیا۔

اہل کتاب توحید کو تو کیا مانیں گے وہ الثانیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو تعلیم ہمارے پاس ہے وہ راز سربستہ کی طرح ابراہیم سے ہم تک پہنچی ہے، اس لئے پہلے تو یہ بات بتائی کہ تم اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ توراۃ و انجیل کا نزول ان کے بعد ہوا ہے جن سے یہودیت و نصرانیت کی اشاعت ہوئی ہے۔ ابراہیم تو حنیف مسلم تھے اور اس وقت اگر اس کے نقش قدم پر چلنے والا کوئی نفس قدسی مل سکتا ہے تو وہ صرف نبی اُمّی ہی کی ذات ہے۔ جب باوجود ایک امر مشترک کی طرف بلائے جانے کے وہ لوگ اپنی ہٹ پر قائم ہیں تو آیت نمبر ۶۸ سے ان کی خرابیاں شروع کی گئیں کہ مسلمان ان سے پرہیز کریں اور اس سلسلہ میں یہ بات واضح کر دی کہ بے ایمانی اور دھوکا دہی اہل کتاب کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ اس خبث باطنی کا ظہور ان کے علم میں بھی ہو رہا ہے۔ مثل موسیٰ کی پیشین گوئی ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ تمام انبیائے سابقین نے رسول اللہ ﷺ کے

ظہور کی پیشین گوئی کی ہے، مگر ان کی شرح و تفصیل میں یہی وہ خدع و فریب سے کام لے رہے ہیں اور اپنے انبیائے کرام پر اتہامات لگاتے ہیں۔ آیت نمبر ۹۴ تک یہی مضمون چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ابراہیمی ملت اور اس کی خصوصیات پر بہت زور دے رہے ہیں اور ان کے اتباع و تقلید کے سب سے زیادہ مدعی ہیں، لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہیں ابراہیمی امتیازات و خصائص کی تلاش و جستجو ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب کو حق کی جستجو نہیں، بلکہ مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنے اعمال حیات سے اپنی تکذیب آپ کر رہے ہیں۔ آیت نمبر ۹۸ تک اسی پر بحث کی گئی ہے۔

گزشتہ آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کی خرابیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں، اب مسلمانوں کو آیت نمبر ۹۹ سے حکم دیا جاتا ہے کہ ان تمام لوگوں سے فوراً اپنے تعلقات توڑ لو، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے تعمیری پروگرام کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دو۔ داخلی اصلاح پر تمہاری توجہ مبذول ہو، تمام اختلافات کو یک قلم دور کر دو، کسی فرقہ بندی میں مبتلا نہ ہو، ورنہ یاد رکھو دنیا و آخرت میں اس تفریق کی وجہ سے برباد ہو جاؤ گے تمہیں جو خیر الامم کا لقب نوازش کیا گیا ہے، تو اس لئے کہ اختلاف کو دور کرو، تعلیم حقہ کی نشر و اشاعت میں سر بکف کوشش کرو اور اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچا دو۔ اگر تم نے اتحاد و یگانگت اپنے اندر پیدا کر لی اور تمہارا ہر افسر مجسمہ تبلیغ اسلام ہو گیا تو پھر تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی دشمنوں سے خوف نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں ایسی خرابیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ لازمی طور پر تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہ کریں گے۔ یہ مضمون آیت نمبر ۱۱۹ پر ختم ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۱۲۰ سے نمبر ۷۸ تک غزوہ احد کا تذکرہ ہے، اس کے مختلف نتائج و ثمرات پر بحث کی ہے، صحابہ کے شبہات کا جواب دیا ہے، اس کے حقائق مستورہ کو بے نقاب کیا ہے اور بصائر و حکم کو منصفہ شہود پر جلوہ افروز کیا ہے۔ جنگ کے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں، قوموں کی تنظیم و تشکیل کے قوانین پر روشنی ڈالی ہے، ان کے عروج و زوال کے مسائل پر گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ کفار و منافقین کے تعلقات مسلمانوں کو اپنی فتح و کامرانی کے نتائج صالح سے کس طرح محروم کر دیتے ہیں۔

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۃ آل عمران کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان فضائل و کمالات کو پیدا کیا جائے جن کی بنا پر وہ تمام عیسائی ممالک پر قابض ہو جائیں اور ہر جگہ صلیب کے بجائے ہلال لہراتا ہوا نظر آئے۔ اس لئے آیت نمبر ۱۷۹ سے یہودیوں کی خرابیاں بتادی جاتی ہیں کہ مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام بد اخلاقیوں سے پرہیز کریں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی تمام باتیں خراب نہیں ہیں۔ اس لئے آیت نمبر ۸۷ تک اچھی اور بری باتوں کو کھول کھول کر کے دکھا دیا کہ ان اعمال سے فرزند ان اسلام الگ رہیں اور ان باتوں پر عمل کریں۔ آیت نمبر ۱۸۹ سے ان خصائص و امتیازات کو بیان کیا جن کا کسب و حصول ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اور جن سے تمسک و اعتصام فوز و کامرانی کا ذمہ دار و کفیل، ان میں سے آخری چیز یہ بتائی: اَصْدِدُوا وَاَصْلِحُوا وَاَتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ اور اسی پر سورۃ کو ختم کر دیا۔



## باب نمبر ۱ الوہیت مسیح

### نصاری کی غلط کاری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلَمْ ۙ اِنَّ اللّٰهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝

”اللہ وہ ذات ہے جسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، تھامنے والا ہے۔“

حروف مقطعات اور دوسری آیت کی تفسیر پر ہم نے اپنی کتاب الخلافۃ الکبریٰ میں مفصل بحث کر دی ہے اس کی جانب رجوع کیجئے، البتہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں سورتوں کی ابتداء میں ایک ہی قسم کے حروف مقطعات تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی ایک ہی سلسلہ کی دو متصل کڑیاں ہیں۔ دونوں کے سامنے ایک ہی چیز پیش کی گئی ہے اور دونوں کو ایک ہی رنگ پر لانا منظور ہے۔

عیسائی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دائرہ نبوت صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ چنانچہ جس وقت انہوں نے اپنے بارہ شاگردوں کو بیرون نجات میں منادی کے لئے بھیجا تو انہیں حسب ذیل ہدایت کی: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا“ (متی ۱۰: ۶، ۵) مگر ان لوگوں نے سب سے پہلی غلطی یہی کی کہ یہودیوں کے علاوہ یونانیوں کو بھی عیسائیت کے دائرہ میں داخل ہونے کی دعوت دینا شروع کر دی، مگر یونانیوں نے ان کی شدت سے مخالفت کی۔ ان پر کامیابی حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اب مبشرین ودعاۃ عیسویت کو اس امر کی فکر دامن گیر ہوئی کہ عیسوی قانون کی ایسی خصوصیات بیان کی جائیں جن کی بنا پر وہ ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لے اور یونانی عقائد و یقینیات کے مطابق واقع ہو، تاکہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم کر لیں۔

حضرت موسیٰ کی شریعت میں ابن اللہ یا خدا کی اصطلاح پہلے سے موجود تھی جس کے معنی ہماری زبان میں محبوب الہی کے ہیں، زبور میں ہے: میں نے تو کہا کہ تم الہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو (زبور ۶: ۲۸) جس وقت حضرت مسیح کو یہودیوں نے سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ میری زندگی تو تمام تر اعمال صالحہ میں گزری ہے تو پھر کس نیک کام کے عوض میں مجھے یہ سزا دے رہے ہو۔ بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ اچھے کاموں کی وجہ سے نہیں بلکہ

اس لئے کہ تم اپنے آپ کو خدا کہتے ہو، اس پر حضرت عیسیٰ نے فرمایا: کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ تم خدا ہو، جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا، آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا ہے کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے، اس لئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں (یوحنا ۱۰: ۳۴ تا ۳۶)

نصاری نے اس اصطلاح سے فائدہ اٹھا کر یہ دعویٰ کر دیا کہ موسوی شریعت کے احیاء و تجدید کے لئے جس قدر انبیاء و رسل بھیجے گئے ہیں ان کو مجازی معنی میں ابن اللہ کہا جاتا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام جیسی پاکباز ہستی پر یہ افترا پر دازی کی کہ وہ حقیقی معنی میں اپنے آپ کو ابن اللہ کہتے تھے: سبحانک ہذ بہتان عظیم۔

اور انہوں نے دیکھا کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد کو یونانی بطور اصول موضوعہ تسلیم کرتے ہیں اور اس لئے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل اول کو پیدا کیا، اس نے عقل ثانی کو اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا تا آنکہ عقل عاشر پیدا ہوئی، زمین و آسمان اور تمام کائنات اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ عیسائیوں نے اس قاعدہ کو تسلیم کر کے اس پر اتنا اور اضافہ کیا کہ صادر اول کی روح حضرت عیسیٰ میں حلول کر گئی ہے، اس لئے وہ حقیقت میں ابن اللہ ہیں۔

یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس سورت میں عیسائی مخاطب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے الوہیت مسیح کے عقیدہ کو غلط ٹھہرایا۔ اللہ لا الہ الا ہو کا مفہوم یہی ہے کہ ہر جگہ اللہ ہی کار ساز ہے، تثلیث کا عقیدہ غلط ہے اور حی و قیوم سے اس طرف اشارہ کیا کہ کائنات عالم کی حیات محض ان اسمائے الہیہ کے فیض عمومی کا نتیجہ ہے۔

## نزول قرآن

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ ﴿١٠﴾ مِّن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ

الْفُرْقَانَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ﴿١١﴾

”تم پر ضرورت کے مطابق ایسی کتاب اتاری جو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے قبل تھیں اور پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل کو اتارا اور فرقان نازل کیا، بیشک جنہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست بدلہ لینے والا ہے۔“

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صدیوں تک کوئی نبی نہ آیا۔ اس زمانہ میں لوگوں نے مذاہب کو بالکل بدل ڈالا اور ہر طرف جہالت کی تاریکی چھا گئی۔ عین یاس و قنوط اور بد عملی و بطالت کے وقت اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نازل کیا کہ توحید کی نشر و اشاعت ہو، تہذیب اخلاق کا فرض سرانجام پائے اور دنیا میں جس قدر غلط عقائد و مہینیات رواں چائے گئے ہیں، ان کا ایک قلم استیصال ہو۔

لیکن اس کے سوا نزول قرآن کا ایک اور بھی مقصد تھا۔ کتب سابقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے متعلق پیشین گوئیاں موجود تھیں، جن کا مصداق اب تک اس زمین کی پشت پر ظاہر نہ ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت

عمومی کی بنا پر اس بزرگ ترین انسان کو کامل چھ سو سال کے بعد بھیجا، جو دعائے خلیل اور نوید مسیحا کو اپنی شخصیت کبریٰ میں لئے ہوئے تھا اور اس طرح آپ کے ظہور اقدس نے ان الہامی کتابوں اور ان کے لانے والوں کی تصدیق و توثیق کر دی۔ قرآن حکیم نہ صرف ان صد اقتوں کو تسلیم کرتا ہے جو اسفار آسمانی میں موجود ہیں، بلکہ ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیتا ہے اور پھر ان سب حقائق و معارف الہیہ کو اپنے اندر جمع کر کے ان کی تکمیل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی سے حسب ذیل وعدہ لیا گیا:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الْبَنِي إِسْرَءِيلَ أَنِّي مَعَكُمْ بِمَا كَتَبْتُ عَلَيْكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ عَصَاوِيًّا أَفْرِغْتُ عَلَىٰ ذَلِكُمْ عَذَابِي ۖ قَالُوا أَفَرَزْنَا قَالَ فَأَشْهَدُوا ۖ وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۸۰﴾ (آل عمران ۸۰)

“اور جب اللہ نے بنیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہو تو ضرور اس کو مانو گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ کہا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر میرا ذمہ لے لیا، وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، کہا کہ تم گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔”

کتب الہیہ کا سلسلہ تو بہت لمبا ہے، مگر اس کی قریب ترین کڑیاں توراۃ اور انجیل ہیں۔ تورات دراصل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی آگ نکالنے اور کسی چیز کے چھپا دینے کے آتے ہیں۔ اس کتاب کو تورات اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے۔ روشنی پیدا تو ہوتی ہے مگر تکلیف و مصیبت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ قرآن حکیم نے تورات کی نسبت یہ فرمایا ہے: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيهَا هُدًى وَذُكُورٌ (المائدہ ۴۴)** اور یہی الفاظ انجیل کی نسبت بھی بیان کئے گئے ہیں **وَأَتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَذُكُورٌ (المائدہ ۴۶)** تورات اور انجیل دونوں کی دونوں بنی اسرائیل کی ہدایت ورہ نمائی اور ان کے روحانی و جسمانی کمالات کے کسب و حصول کے لئے کافی تھیں اور یہ ہر کتاب الہی کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھیجی جائے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کر دے، مگر امتداد و وقت کی بنا پر اول تو ان میں تحریف لفظی و معنوی ہو گئی، دوسرے زمانہ نے اتنی ترقی کر لی کہ اب یہ دونوں کتابیں دنیا کی ہدایت کا فرض انجام نہیں دے سکتیں اور اب پھر ٹھیک وہ معنی صادق آجاتے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اس وقت صرف قرآن ہی تمام اقوام عالم کی رہبری کر سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے اور جس کی بابت لسان الہی یوں ارشاد فرماتی ہے۔ **يَكَادُ زَيِّتُهَا يُبْقِي عَذَابًا وَلَوْ أَنَّهُ تَشْتَشُ نَارًا ۖ يُؤْذَىٰ عَلَىٰ نُورٍ (النور ۳۵)** قریب ہے کہ اس کا تیل جل اٹھے اگرچہ اس کو آگ نہ بھی چھوئے، روشنی پر روشنی ہے۔

مگر ہر کتاب الہی کے ساتھ فرقان بھی نازل کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی ناقدانہ قوت میں اور زیادہ نور و بصیرت پیدا ہو، جس سے وہ حق و باطل، نور و ظلمت اور کفر و اسلام میں تمیز کر سکیں۔ انہیں اپنی اصلاح کا خیال دامن گیر ہو اور اپنے اندر الہی علوم کے لئے تشنگی محسوس کریں۔ فرقان کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو کتاب الہی کا محتاج

ودست نگر پائیں اور اس کی تلاوت کے لئے تیار ہوں، ورنہ اگر یہ ضرورت نہ پیدا کی جاتی تو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا۔

اب جن لوگوں نے اپنے کائنات کو تباہ کر دیا اور فرقان سے صحیح طور پر کام نہ لیا، وہ اللہ کی آیات بینات کے منکر ہوئے اور انہوں نے اندرونی کفر کا ارتکاب کیا۔ کتاب الہی سے فائدہ اٹھانے کے لئے فرقان اور ضمیر کی حفاظت الزم اللہ ازم ہے کہ خارجی اثرات ضلالت اس آئینہ کو گرد آلود نہ کر دیں۔ جو لوگ فرقان کو برباد کر دیتے ہیں ان کی عقل ماری جاتی ہے اور وہ اس درجہ احمق بن جاتے ہیں کہ غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ وہ سزا ہے جو ان کو اس جرم کی پاداش میں اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور ان کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر پھر رہا ہو۔ اس کو سورج کی روشنی کچھ کام نہ دے سکے گی۔ اسی طرح فرقان برباد کرنے کی وجہ سے کتاب الہی ان کے حق میں بیکار رہتی ہے۔

قائدہ اور ربیع بن انس کے نزدیک فرقان سے مراد قرآن حکیم ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ اس اعتبار سے آیت مذکورۃ الصدر کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے توراۃ اور انجیل کو اہل کتاب کے لئے ہدیٰ و نور بنا کر بھیجا تھا، مگر انہوں نے ان کتابوں میں اس قدر تحریفات سے کام لیا کہ غلط اور صحیح کی تمیز ہی اٹھ گئی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل کیا کہ حق و باطل میں فرق کر دے: **إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَتْلُو عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (النمل ۷۶)** بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: **وَ أَفْرَأَيْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّبًا عَلَيْهِ (المائدہ ۴۸)** اور ہم نے تم پر برحق کتاب اتاری ہے جو سب اگلی کتابوں کو سچا بتاتی ہے اور ان کی محافظ ہے۔

### قطعی فیصلہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

”بیشک زمین و آسمان میں سے کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں، وہی ہے جو ماں باپ کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زبردست حکمت والا ہے۔“

زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ وہی خوب جانتا ہے کہ کون شخص روح تعلیم اور حقیقت اعمال کا پابند ہے اور کس نے اپنے فرقان کو برباد کر دیا ہے۔ اس کی قدرت تو اتنی وسیع ہے کہ رحم مادر میں بھی انسانوں کی صورت بناتا ہے۔ پس جب حالت یہ ہے کہ ہر جگہ اسی کی ذات کار فرما ہے اور وہ عزیز ہے تو وہ یقیناً ان لوگوں کو سزا دے گا جو اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور فرقان کو برباد کر دیتے ہیں۔ البتہ ان کی سزائیں جو اس وقت تاخیر ہو رہی ہے، تو یہ کسی نہ کسی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ان آیات سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں بن سکتے، کیونکہ ان پر بہت سی باتیں چھپی کی چھپی ہی رہ گئیں۔ مرقس میں ہے: ”دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔“ (مرقس ۱۱: ۱۳-۱۴) انجیل متی میں ایک جگہ خود ان کا اعتراف موجود ہے: ”لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا، مگر باپ۔“ (متی ۲۳: ۳۴)

ابن جریر نے ان تمام آیات کے شان نزول میں ایک طویل روایت بیان کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ ایک مرتبہ چند نصاریٰ دربار رسالت میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنے لگے۔ آپ نے ان لوگوں کے سامنے حسب ذیل حقائق پیش کئے:

(۱) اولاد ہمیشہ اپنے والد کے مشابہ ہوا کرتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر موت طاری نہ ہوگی، حالانکہ عیسیٰ بن مریم ضرور کسی نہ کسی روز وفات پائیں گے۔

(۳) خداوند قدوس ہر چیز کا محافظ اور رازق ہے، عیسیٰ ایسا نہیں کر سکتے۔

(۴) اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور ابن مریم کو صرف وہی باتیں معلوم ہیں جو ان کو بتادی گئی ہیں اور بس۔

(۵) عیسیٰ کی صورت رحم مادر میں بنائی گئی اور اللہ ان تمام امور سے پاک ہے۔ ان تمام حقائق کو ان لوگوں نے تسلیم کیا مگر الوہیت مسیح کے عقیدہ کو خیر باد نہ کہہ سکے پھر جو لوگ ان بدیہی مقدمات کے بعد بھی اپنی غلط بات پر قائم رہیں وہ کیسے عذاب الہی سے بے خوف ہو سکتے ہیں۔

## تقسیم کتاب

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۚ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ①

”وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری جس میں سے بعض آیتیں محکم ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں، حالانکہ اللہ کے سوا ان کا مطلب کسی کو معلوم نہیں اور جو لوگ علم میں بڑی پایاگاہ رکھتے ہیں وہ تو اتنا ہی کہ کر رہ جاتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ محکم و متشابہ کی شرح و تفصیل میں اہل علم باہم مختلف ہیں متشابہ کے متعلق جابر بن عبد اللہ شعبی اور سفیان ثوری کی یہ رائے ہے کہ: ”مالم یکن لاحد الی علمہ سبیل“، ”کسی شخص کو اس کا علم نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود، قتادہ، ربیع اور ضحاک محکم کو نسخ اور متشابہ کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ لیکن محقق علماء کی راہ ان سب سے جداگانہ ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے ان الفاظ کے معانی سامنے آجائیں تاکہ اصل حقیقت پر دے میں نہ رہے۔ محکم کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: متضام المعنی واضح الدلالة قائم بنفسه لایحتاج ان یرجع فیہ لی غیرہ“، ”اس کے معنی اس قدر واضح اور کھلے ہوں کہ کسی دوسری جانب رجوع کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو“۔ ”روح المعانی میں ہے: واضحه المعنی ظاهرة الدلالة محكمة العبارة۔ نحاس اور ابن عطیہ کی رائے ہے: المحکم ما کان قائماً بنفسه لایحتاج الی ان یرجع فیہ لی غیرہ۔

ایک اور جگہ یہ بیان کیا گیا ہے: واضح المراد کہ سامع راہتاویل حاجت نمی افتد۔ ان تمام الفاظ سے معلوم ہو گیا کہ محکم ان تمام آیات کو کہتے ہیں جو اپنی مراد آپ واضح کرتی ہوں، ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ ان کا فہم و ادراک آسان و سہل تر ہو، ان کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ پڑے۔ اس قسم کی تمام آیات ام لکتاب ہیں، یہی اصل و اساس ہیں اور انہی پر تعلیمات الہیہ کا دار و مدار ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں: هن ام الكتاب لانهن مکتوبات فی جیبہم الكتب، ان کو ام الکتاب اس لئے کہتے ہیں کہ جملہ صحائف و اسفار آسمانی میں ان کو بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کیا گیا ہے۔

اس قدر تفصیل سے خود متشابہ کے معنی بھی واضح ہو گئے، یعنی ان کے معانی و مطالب معلوم کرنے کے لئے دوسری آیات کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے اور ان میں تاویلات مختلف کی گنجائش ہوتی ہے: یصدق بعضاً لا یدرک من نفس تلك الایة الا بالمراجعة الی آیات اخر۔ نحاس کہتے ہیں: المتشابہ ما یرجع فیہ لی غیرہ۔

## فطری طریق

دنیا میں جس قدر علوم و معارف موجود ہیں، اگر ان تمام کی تحلیل و تفرید کی جائے تو ان میں دو چیزیں ممتاز نظر آئیں گی جن پر تمام مباحث علمیہ کا دار و مدار ہے اور جو ہر علم اور کتاب کی حقیقی اور فطری تقسیم ہوگی اور وہ یہ ہیں: (الف) بدیہی: جس کا فہم و ادراک ہر ایک شخص کے لئے آسان و سہل ہو اور جس کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہ پڑے۔

(ب) نظری: بدیہی مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد اس کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہو۔ تعلیم دینے کا صحیح اور فطری طریق یہی ہے کہ ابتداء میں طالب علم کے سامنے بدیہیات کو پیش کیا جائے، جب یہ مقدمات اس کے ذہن میں راسخ ہو جائیں اور اس کی قابلیت و استعداد ترقی کر جائے تو نظریات کی طرف اس کی عنان توجہ پھیر دی جائے۔ اس قانون کی پابندی سے طالب علم کی نشو و نما اور تربیت بہترین طریق سے ہوگی۔ اور اگر کوتاہ بینی اور کج فہمی

کی وجہ سے پہلے نظریات کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کی تمام تعلیم اکارت جائے گی اور اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہ ہو گا۔ یہی دو اصول ہر جگہ جاری و ساری نظر آئیں گے۔ کوئی علم ایسا نہیں جس میں ان اصول کی پابندی نہ کی گئی ہو اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی جانب آیت مذکورۃ الصدر نے ہماری راہ نمائی کی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ قرآن کی تمام آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) محکمات۔ جن کو آپ بدیہیات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی اصل و اساس ہیں اور انھی پر تمام تعلیمات کا دار و مدار ہے۔

(۲) متشابہات۔ جن کے لئے دوسرا لفظ نظریات کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

### فیصلہ کن راہ

قرآن میں بحث و نظر کا صحیح طریق یہی ہے کہ ابتدا میں محکمات کو لیا جائے، جب ان میں درخور وافی حاصل ہو جائے، پھر متشابہات کی طرف توجہ ہو، مگر جن لوگوں کے دلوں میں ضلالت و گمراہی اور بغی وعدوان کے جذبات خبیثہ مخفی ہوتے ہیں وہ اس راہ حق و صراط مستقیم سے گریز کر کے سب سے پہلے متشابہات میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اس غلط راستہ کو اختیار کرنے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ:

(الف) لوگوں کے قلوب و اذہان کو پریشان کر کے تشویش و اضطراب میں ڈال دیں۔ جن عقائد و اخلاق کو وہ اب تک درست تسلیم کرتے تھے، انہیں غلط معلوم ہونے لگیں۔ ایک آیت کا مفہوم دوسری کے خلاف کر کے یہ بتا دیں کہ قرآنی آیات میں اختلاف و نقیض ہے۔ اصول و کلیات سے الگ ہو کر اپنی رائے سے قرآن کی آیات کا جدا گانہ مطلب قرار دیں۔ شک و اشتباہ پیدا کر کے لوگوں کے قوائے عملیہ کو بیکار کر دیں اور اس طرح بتدریج ان میں دین حق سے انحراف کا جذبہ فاسقہ پختہ ہو۔

(ب) تاویل کہتے ہیں: رد الشی الی الغایۃ المرادۃ منہ علما کان اوفعلا۔ اپنے ارادے کے مطابق کسی چیز کو لوٹا دینا۔ متشابہات میں غور کرنے والوں کی عملی قوت تو بالکل برباد ہو چکی ہوتی ہے، اس لئے اب ان کی دماغی کاوشیں صرف اس بات تک محدود رہتی ہیں کہ احکام و اوامر الہیہ پر عمل کیے بغیر انہیں ان کے نتائج و ثمرات سے آگاہی ہو۔ اپنی خواہشات نفسانیہ اور عقائد باطلہ کی تائید قرآنی آیات سے تلاش کرتے ہیں۔ محکمات کو چھوڑ کر صرف متشابہات ہی پر حصر کرتے ہیں اور روشن اور واضح باتوں کو ترک کر کے محض الفاظ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔



## ایک مثال

ہم اس تمام بحث کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ کسی قسم کا حجاب باقی نہ رہے۔ گزشتہ آیت میں جس اصول کی طرف ہماری راہ نمائی کی گئی ہے، اس سے حق و باطل میں بآسانی تمیز ہو سکتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور اس دعویٰ کی تائید میں وہ قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں ان کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہا گیا ہے:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ ۖ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَزُوْجُ مِنْهُ (النساء ۱۷۱) ”عیسیٰ اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جن کا مریم کی جانب القا ہوا اور اس کی روح ہیں۔“ ان کی دلیل یہ ہے کہ روح اللہ اور کلمہ اللہ کے الفاظ قرآن نے کسی اور نبی کے لئے استعمال نہیں کئے، اس لئے وہ ابن اللہ ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ ہونے کے لئے کن امتیازات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟ اس کے لئے صرف ماقبل کی آیت کی جانب رجوع کر لینا کافی ہے جس میں یہ دو باتیں بیان کی گئی ہیں:

(الف) ان اللہ لایخفی علیہ شیء عن الارض ولا فی السماء۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس پر مخفی نہیں۔

(ب) هو الذی یصور کم فی الارحام کیف یشاء۔ وہ رحم مادر میں اپنی مرضی کے مطابق بچہ کو صورت بخشتا ہے۔

اب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ان صفات کو تلاش کرتے ہیں تو انہیں ان سے یکسر خالی پاتے ہیں۔ تم پہلے پڑھ آئے ہو کہ انجیل لینے کے لئے وہ ایک درخت کی طرف بھاگے گئے تو انہیں وہاں پتوں کے سوا کچھ نہ ملا، کیونکہ انجیل کا موسم نہ تھا۔ وفد نجران نے یہ خود تسلیم کیا کہ وہ مریم کے پیٹ میں ایک مدت تک رہے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اور بس۔

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے الفاظ ان کے لئے استعمال کئے ہیں، مگر گزشتہ آیات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ یہ الفاظ متشابہات میں داخل ہیں، اس لئے ان کے وہی معنی لئے جائیں گے جو حکمت کو سامنے رکھ کر واضح ہوں گے۔ اب ہم قرآن حکیم کو دیکھتے ہیں تو وہ بآنگ دہل اس عقیدہ کی ناقابل تاویل الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ ایک جگہ آتا ہے: لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ (النساء ۱۷۲) ”مسیح کو ہرگز اس امر میں عار نہیں ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہو، اور نہ ملائکہ مقربین کو“، دوسری جگہ آتا ہے: إِنَّهُ لَا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ (الزخرف ۵۹) ”بس عیسیٰ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل فرمایا اور ان کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے نمونہ بنایا۔“ سورہ مائدہ میں ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهُ وَاحِدٌ (المائدہ ۷۳) بیشک وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تینوں میں کا ایک ہے، حالانکہ سوائے خدائے واحد کے اور کوئی معبود نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ بَنِي إِسْرَءِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۷۲) بیشک وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح بن مریم ہے، حالانکہ مسیح نے



بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میرے اور اپنے پروردگار اللہ کی غلامی کرو، آگے چل کر آتا ہے: مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ؕ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ؕ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ (المائدہ ۷۵) مسیح بن مریم سوائے رسول کے اور کچھ نہیں۔ بیشک ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ تھیں، وہ دونوں کھانا بھی کھاتے تھے۔

قیامت کی گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: عَآذْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِ وَاَنْتَ الْهَيْئُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِحِ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقِّ (المائدہ ۱۱۶) اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو، وہ فوراً عرض کریں گے۔ خداوند! تیری ذات ان چیزوں سے پاک ہے، میری طاقت نہیں کہ وہ بات اپنی زبان سے نکالوں جس کا مجھے حق نہیں۔ ”سورہ مریم میں کس قدر صاف الفاظ میں الوہیت مسیح کا انکار کیا۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۚ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝۱۸ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَنْفَطَرْنَ مِنْهُ وَتَتَنَسَّقُ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا ۝۱۹ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝۲۰ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝۲۱ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا لِحِ الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝۲۲ (مریم ۲۸۸ تا ۹۳) اور کہتے ہیں کہ رحمن اولاد رکھتا ہے، تم ایسی سخت بات لائے کہ کچھ عجب نہیں اسکی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں کہ انہوں نے رحمن کے لئے فرزند ثابت کیا، حالانکہ رحمن کی یہ شان نہیں کہ بیٹا بنائے۔ آسمان اور زمین میں کوئی چیز نہیں جو رحمن کے حضور میں غلام بن کر نہ آئے۔ ”اسی ذیل میں اس آیت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَتَنَ يُّنٰدِكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمُّهُ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدہ ۷۱) وہ یقیناً کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ ہی مسیح بن مریم ہے۔ کہو کس کو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی اختیار ہوا۔ جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں ہیں، ہلاک کرنے کا ارادہ کیا اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو ان کے درمیان ہے اللہ ہے کے لئے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

نتیجہ

قرآن حکیم کی یہ تصریحات تمہارے سامنے ہیں، ان کو پڑھو، ان آیات کا ایک ایک لفظ الوہیت مسیح کی صاف صاف تردید کرتا ہے، یہ الفاظ کسی دور از کار تاویل کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے بتا دیا کہ مسئلہ الوہیت میں بدیہیات و محکمات یہی آیات بینات ہیں، اس لئے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کو ان محکمات ہی پر عرض کر کے ان کے ایسے معنی لینے پڑیں گے جو کسی طریق سے بھی ان اصول سے مختلف نہ ہوں۔ ان آیات کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو خدا ابن سکتے ہیں اور نہ خدا کے بیٹے، اس لئے وہ انسان ہیں اور دائرۃ انسانیت میں داخل اور ان کو خدا بنانا ضلالت و گمراہی، بغی و عدوان اور متناہیات کی پیروی ہے۔ فہل من مدکر۔

## رجوع الی المقصود

یہ بحث ضمنتیج میں آگئی تھی۔ اب ہم پھر اصل کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اوپر کی تقریر کو پھر ایک مرتبہ دیکھ جائیے، ہم نے محکم و متشابہ کی جو معنی بیان کئے ہیں، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متشابہات کے مطالب و معانی نہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں بلکہ راسخین فی العلم کو بھی خدائے قدوس ان کا علم نوازش فرمادیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان ارباب فضل و کمال کو بھی ان کا علم نہ ہو تو ان متشابہات سے نوع انسانی کی ہدایت ورہ نمائی کا مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ قرطبی کہتا ہے کہ ابن عباس الراسخون کو اللہ پر معطوف مانتے تھے یعنی یہ لوگ بھی متشابہ کی تاویل سے واقف ہیں۔ ابن عباس کی نسبت تمہیں خود معلوم ہے کہ لسان نبوت نے ان کے لئے یوں دعا کی تھی، جس کو بخاری نے نقل کیا ہے: اللهم فقهه فی الدین وعلیہ التاویل، خداوند! اس کو دین کی سمجھ اور تاویل کا علم نوازش فرما۔ مجاہد کہتے ہیں: عرضت البصیف علی ابن عباس من اولہ الی اخرہ، اقفہ عند کل ایۃ واسالہ عنہا وکان یقول انامن الراسخین فی العلم الذین یعلمون تاویلہ۔ میں نے ابن عباس کو تمام قرآن اول سے آخر تک سنایا۔ ہر ایک آیت کے متعلق میں ان سے سوال کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے جو آیات قرآنی کی تاویلات سے واقف ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں: مافی کتاب اللہ الا وانا اعلم فیما ذلزلت۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں، جس کے نزول کا سبب مجھے معلوم نہ ہو۔ ابو عبد الرحمن السلمی کہتے ہیں: حدثنا الذین کانوا یقرؤنا القرآن عثمان بن عفان وعبد اللہ بن مسعود وغیرہما انہم کانوا اذا تعلبوا من النبی ﷺ عشا، آیات لم یجاوزوا حق یعلبوا ما فیہا من العلم والعمل۔ عثمان، عبد اللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ کا یہ دستور تھا کہ جب وہ رسول اللہ سے دس آیات پڑھ لیتے تو جب تک وہ ان کے علم و عمل، حرام و حلال اور معانی و مطالب سے واقف نہ ہو لیتے آگے نہ بڑھتے۔

مجاہد، ربیع بن انس، محمد بن جعفر ابن الزبیر اور ابن فورک کا یہی مذہب ہے کہ راسخین فی العلم بھی متشابہات کے مطالب سے واقف ہوتے ہیں اور اسی کو امام احمد بن حنبل، ابن قتیبہ، ابوسلیمان الدمشقی اور ابن تیمیہ نے ترجیح دی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر میں اس موضوع پر نہایت ہی معنی خیر و دل ویز گفتگو کی ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں: واعلم ان من قال ان من القرآن کلاما لا یفہم احد معنایہ ولا یعرف معنایہ الا اللہ فانہ مخالف لاجماع الامۃ مع مخالفة الكتاب والسنة۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی ایک آیت بھی ہے جس کے مفہوم اور معنی کو اللہ کے سوا کوئی انسان نہیں جانتا تو وہ نہ صرف اجماع امت کی مخالفت کر رہا ہے بلکہ وہ کتاب و سنت سے بھی بہت دور جا پڑا ہے۔

## خلاصۃ المرام

اس قدر تفصیل کے بعد آپ ایک اور حقیقت بھی سامنے لائیے۔ اسلام کی نسبت لیلہا کنہا رہا کہا گیا ہے، لم یجعل

لہ عوجا بھی اسی قرآن کے متعلق نازل ہوا ہے، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مذاہب و مشارب مختلفہ کیوں مسلمانوں میں پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب مختصر الفاظ میں یہی دیا جاسکتا ہے کہ جس قدر گمراہ کن فرقے ہمیں دکھائی دے رہے ہیں ان کی گمراہی و ضلالت کے مجملہ اور اسباب و علل کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے حکمت سے الگ ہو کر صرف تشابہات پر غور کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ راہ حق سے منحرف ہوتے چلے گئے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان ادا و امر و نواہی کے نتائج و عواقب نہ صرف اللہ ہے جانتا ہے بلکہ راسخین فی العلم بھی ان سے محروم نہیں رہے اور یہ درجہ علیا انہیں اس لئے ملتا ہے کہ وہ پہلے بدیہیات کو لیتے ہیں۔ جب ان میں انہیں رسوخ و کمال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر تشابہات و نظریات کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ راہ حق صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو رباب بصیرت ہوں اور عقل و ایمان سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔

### دعائے ہدایت

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ① رَبَّنَا أَنْتَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ② إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ③

”اے ہمارے رب! اس کے بعد کہ تو ہم کو ہدایت دے چکا ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر اور اپنی سرکار سے ہم کو رحمت عطا فرما بیشک تو بڑا دینے والا ہے، اے ہمارے پروردگار! بیشک تو ایک دن جس میں کچھ شک نہیں ہے تمام لوگوں کو اکٹھا کرے گا۔ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

ظاہر بات ہے کہ تشابہات میں گفتگو کرنا ہر ایک شخص کا کام نہیں، کیونکہ بسا اوقات ان میں بحث و نظر گمراہی و ضلالت کا سبب بن جاتی ہے اور بڑے بڑوں کے پاؤں یہاں آکر پھسل گئے ہیں۔ راسخین فی العلم بھی باوجود اپنے انتہائی فضل و کمال کے ضعف بشری اور نسیان و ذہول سے خالی نہیں۔ اس لئے ان کو خدائے قدوس کی جانب سے یہ تعلیم دی گئی کہ بار بار ان کی زبانوں سے یہ دعا نکلے: خداوند! ہم نے ابتدائی مدارج صحیح طریق سے طے کر لیے ہیں، حکمت ہمارے سامنے آچکی ہیں، اب آئندہ چل کر بھٹک نہ جائیں، علم و حکمت کے اعلیٰ ترین مسائل میں اس وقت تک غور کرنے کا ارادہ نہ کریں جب تک ہم ان کے سمجھنے کے قابل نہ ہوں اور ان کو بے سوچے سمجھے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ جس حد تک ہم خود بخود ترقی کر کے پہنچ سکتے ہیں وہاں تک تو کسی قسم کی کمزوری نہ آئے اور جن حقائق عالیہ پر ہم اپنے قصور فہم کی وجہ سے قابو نہ پاسکیں، تو اپنی رحمت خاصہ سے ان کی سمجھ نوازش فرما، تو اندھوں کو آنکھیں دیتا ہے اور پیاسوں کو پانی پلاتا ہے اور تو ہی ہر چیز بخشنے والا ہے۔

ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ شب کے وقت بیدار ہوتے تو یوں دعا مانگتے: لا الہ الا انت سبحانک استغفرک لذنبی واسئلك رحمة، اللهم زنی علما، ولا تزغ قلبي بعد اذ هديتني وهب لي من لدنك رحمة انت الوهاب، ام سلمہ کہتی ہیں کہ اکثر رسول اکرم ان الفاظ میں دعا مانگا کرتے

تھے یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک۔

راستخیز فی العلم صرف اتنی ہی دعا پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اور زیادہ توجہ و انابت الی اللہ میں یوں عرض کرتے ہیں: خدا وند! اگر ہم سے پہلے کسی قوم کو تو نے کوئی علم نوازش کیا ہے تو اس سے بھی ہمیں سرفراز کی جیو، تاکہ اس روز ہمیں شرمسار نہ ہونا پڑے، جب تمام قومیں ایک میدان میں جمع ہوں گی اور ہم سے وہ آگے نکل جائیں گی، اس دن کے ہونے میں تو یقیناً کوئی شک و اشتباہ نہیں، اس لئے اس عزت سے ہمیں محروم نہ رکھ۔

تباہی کی وعید

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۖ كَذَّابِ ۖ  
فِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۖ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۖ

”بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اللہ کے مقابلہ میں ان کے مال اور ان کی اولاد ان کے ہر گز کام نہیں آسکتی اور یہی لوگ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ ان کا حال فرعون والوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہو گا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔“

کتاب الہی سے فائدہ اٹھانے کا زرین اصول بتا دیا گیا، اب جو لوگ اس قاعدہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں ان کے مال و اولاد میں سے کوئی چیز ان کے لئے کفارہ نہ بن سکے گی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۸۵﴾ (البقرہ ۸۵) پس ان کے مال اور ان کی اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں، بس اللہ چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں مبتلائے عذاب رکھے اور ان کی جان نکلے اور وہ کافر ہوں۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا: لَا يَغْنُتُكَ تَغْلِبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿۸۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۸۷﴾ (آل عمران ۸۶ تا ۸۷) جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے، تھوڑا سا سامان ہے پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔ سورہ مریم میں آتا ہے: أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِالْإِيمَانِ وَقَالَ لَاؤْتِيَنِي مَالًا وَلَدًا ۖ وَلَدًا ۖ أَطَلَعَ الْغَيْبَ أَمْ اِتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۖ ﴿۸۸﴾ (مریم ۷۷ تا ۸۸) بھلا تم نے اسے بھی دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ میں ضرور مال و اولاد دیا جاؤں گا۔ کیا وہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا رحمن کے ہاں اس نے عہد لے رکھا ہے۔

جب کبھی یہ لوگ حق کے مقابلہ میں سر اٹھائیں گے وہیں کچل دیئے جائیں گے اور کبھی اسلام کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایسی قوموں کی تباہی کی تاریخ محفوظ ہے۔ فرعون والوں نے اپنے ضمیر کو برباد کر دیا۔ کتاب الہی کی پروانہ کی اور حق کو مٹانے کے لئے تیار ہو گئے، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی اپنا نام و نشان کھو بیٹھے۔ ایسے ہی جو بد بخت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں گے اور فرعون کے نقش قدم پر چلیں گے، وہ بھی یقیناً تباہ ہو کر رہیں گے اور بحرِ ذخار کی موجیں ان کو ہضم کر جائیں گی۔

## غلبہ اسلام

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سِتْغَلِبُونَ وَتُخْشَوْنَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْبِهَادُ ۝

”جو لوگ کافر ہو گئے ان سے کہہ دو کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اور دوزخ کی جانب لوٹائے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔“

یہود و نصاریٰ اور تمام مخالفین اسلام سے یہ کہہ دینا چاہئے کہ تم تعلیمات حقہ کو ترک کر چکے ہو، اس لئے تمہاری حکومت باقی نہیں رہ سکتی، تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور مسلمانوں کی ماتحتی میں تمہیں زندگی بسر کرنی پڑے گی اور پھر مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہونا پڑیگا۔ اس دنیا میں تمہاری مغلوبیت اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم ضرور دوزخ کا ایندھن بنو گے اور اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ مسلمان مفلس و نادار ہیں، قلت تعداد اور فقدان اسباب کی بنا پر تم سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے، تو اس واقعہ کا دیدہٴ عبرت سے مطالعہ کرو۔

## جنگ بدر

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي مِثْلِ هَذِهِ ۚ فَتُنَبِّئُهُمْ بِمَا لَهُمْ بَاطِلٌ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝

”ابھی تمہارے لئے دو فوجوں میں نمونہ ہو چکا ہے جو آپس میں گتھ گئیں، ایک فوج تو اللہ کی راہ میں لڑتی تھی اور دوسری کا فر تھی کہ مسلمانوں کو آنکھیں دیکھتے اپنے سے دو چند دیکھتے تھے اور اللہ اپنی مدد کا زور جس کو چاہے دیتا ہے، بیشک آنکھ والوں کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔“

اس آیت میں جنگ بدر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

(الف) .... کی سورتوں میں ایک ایسی جنگ کی خبر دی گئی تھی جس میں مسلمان مظفر و منصور اور کفار ناکام و خاسر رہیں

گے: اَمْرِيَقُولُونَ نَحْنُ جَبِيْنُ مُمْتَصِرٌ ۝ سِيَهْزَمُ الْجَنْعُ وَيُولُوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمْرٌ

۝ (القر ۴۴، ۴۶) اس جگہ ساعۃ سے مراد وہی شکست و ہزیمت کی گھڑی بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ

جب میدان بدر میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعا مانگ رہے تھے اور اللہ نے اس دعا کو شرف اجابت بخشا تو

آپ یہی آیت تلاوت کرتے ہوئے اپنے خیمہ سے باہر نکلے تھے: سِيَهْزَمُ الْجَنْعُ وَيُولُوْنَ الدُّبُرَ، بَلِ السَّاعَةُ

مَوْعِدُهُمُ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمْرٌ۔

(ب) .... جس وقت جنگ بدر ہوئی ہے مسلمان نہایت ہی کمزور و ناتواں، بے یار و مددگار اور بغیر کسی سامان و اسباب

حرب کے تھے اور کفار پوری شان و شوکت، بے انتہا سامان حرب اور عظیم الشان تعداد کے ساتھ مسلمانوں پر

حملہ آور ہوئے تھے۔ مگر باوجود ان تمام مخالف حالات کے فرزند ان اسلام ہی غالب رہے، پھر اس سے بڑھ کر

اور کونسا نشان صداقت ہو سکتا ہے۔

(ج).... اس جنگ کی پیشین گوئی خود اہل کتاب کے پاس موجود ہے: ”عرب کی بابت الہامی کلام، عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے اے دو انیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ، اے حیا کی سر زمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا (یسعیاہ، ۳۱: ۱۲-۱۳) اس پیشین گوئی میں چند باتیں بیان کی گئی ہیں: بھاگنے والے سے مراد رسول اللہ ﷺ اور اس میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔

ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر ہوئی اور قیدار کی ساری حشمت جاتی رہی۔ قیدار کا لفظ کتاب مقدس میں صرف بنی اسمعیل پر بولا جاتا ہے۔

عرب کی بابت الہامی کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشین گوئی کے ایک ایک لفظ کا تعلق سرزمین عرب سے ہے۔ ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں جنگ بدر کا ذکر ہے۔ پس جو ارباب بصیرت قوموں کی ترقی و تنزل، عروج و زوال اور علو و تسفل کے اسباب و علل میں غور کیا کرتے ہیں ان کے لئے یہی غزوہ بدر عبرتوں اور بصیرتوں کی صد ہار اہیں کھول دیتا ہے کہ وہ ان بصائر و حکم کو آویزہ گوش بنائیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں اور کافروں کا لشکر میدان جنگ میں صف آرا ہوا ہے تو مسلمان کافروں کو اور کافر مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتے تھے۔ سورہ انفال کی تفسیر میں ہم نے اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے ومن شاء التفصیل فلیدرہج ثبہ۔ دنیانے یہ دیکھ لیا کہ اس پیشین گوئی کے الفاظ کس قدر جلد پورے ہو گئے اور مہاجرین و انصار کی جماعت کتنے ہی قلیل زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے ممالک پر قابض ہو گئی۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وعدہ ان کو اب بھی دیا جاتا ہے، اگر وہ سچے دل سے اب بھی اسلام کے پابند ہوں تو ضرور وہی غالب و قاهر رہیں گے: لا تھنوا ولا تحزنوا و اتمم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

اختلاف مقاصد

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ  
وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْثِ ۚ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَ أَحْسَنِ الْمَالِ ۝

”لوگوں کے لئے خواہشات کی محبت مثلاً بیویاں، بیٹے اور سونے اور چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی آراستہ کر دی گئی ہے یہ دنیا کی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور اللہ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔“

عیسائیوں اور دوسرے کفار و مشرکین کو دیکھئے تو یہی چیزیں ان کی زندگی کا نصب العین ہوں گی۔ پھر جن لوگوں کے یہ مقاصد ہوں وہ ان مسلمانوں کا کیا مقابلہ کر سکیں گے جو اپنی ہر چیز خدائے قدوس کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہیں اور جب کبھی ان دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہو گا تو مخالفین اسلام ان محبوبات و مالوفات کی وجہ سے کبھی بھی مسلمانوں پر غالب نہ آسکیں گے، کیونکہ انہیں ہر وقت ان چیزوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ دامن گیر رہے گا۔ حالانکہ وہ ذرا غور سے کام لیں تو ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ دنیا کی تمام چیزیں انسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں۔

### فرزندان اسلام

قُلْ أُو۟سِبۡتُمْ بِخَبِيرٍ مِّنۢ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنۢدَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنْ تَحْتِہَا الۡاَنْهَارُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَاَزۡوَٰجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ یَصِیۡرُ بِالْعِبَادِ ۝۱۰۱ اَلَّذِیۡنَ یَقُولُوۡنَ رَبَّنَا اِنَّاۤ اَمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوبَنَا وَنَنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۰۲ اَلطَّٰغِیۡنَ وَالظَّٰلِمِیۡنَ وَالظَّٰلِمِیۡنَ وَالظَّٰلِمِیۡنَ وَالظَّٰلِمِیۡنَ وَالظَّٰلِمِیۡنَ ۝۱۰۳

”کہہ دو کیا میں ان چیزوں سے بہتر بتاؤں، جو پرہیز گار ہیں، اللہ کے ہاں ان کے لئے ایسے باغ ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور بیویاں صاف ستھری ہیں اور اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم بے شک ایمان لائے پس تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے، صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور حکم بردار اور خرچ کرنے والے اور پچھلی رات میں گناہ بخشوانے والے ہیں۔“

جو لوگ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر تمام دنیاوی لذتوں کو قربان کرنے کو تیار ہیں، انہیں بدرجہا اشرف و اعلیٰ نعمتیں نوازش ہوں گی اور وہ ہر جگہ کامیاب و بامراد ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دونوں جماعتوں کے حالات و واقعات کو دیکھ رہا ہے، اس لئے ناممکن ہے کہ مخالف غالب ہو جائے۔ ارباب ایمان ہمیشہ اس طرح والہانہ و مضطربانہ دعا کرتے ہیں: خداوند ہماری زندگی کا جو نصب العین تو نے مقرر کر دیا ہے ہم بھی اسی کو اپنا مقصد حیات قرار دیتے ہیں، اگر اس کے پورا کرنے میں ہم سے غلطیاں ہوں تو معاف کی جیو۔ اور دنیا میں وہ ان امتیازات و خصائص کی بنا پر اپنے ابنائے جنس سے نمایاں ہوتے ہیں:

(۱) الطہرین: مقصد زندگی پر مر مٹنے والے اور تکالیف و مصائب برداشت کر کے اپنے اندر قوت و طاقت پیدا پیدا کرنے والے۔

(۲) الصّٰدقین: اخلاق صالحہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینے والے، جو زبان سے کہیں اس کے پورا کرنے والے اور اس قدر ثبات قدم و استقلال والے کہ ہمیشہ ان کا قدم آگے ہی رہتا ہے پیچھے ہٹنے کا نام تک نہیں لیتے: وَالَّذِیۡنَ



جَاءَ بِالصَّدِيقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۝ ذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝ يُكْفِّرُ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (الزمر ۳۴-۳۵) اور جو سچی بات لے کر آئے اور اس کو سچ جانا وہی لوگ پرہیز گار ہیں، ان کے پروردگار کے پاس ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں، یہ نیکو کاروں کی جزا ہے، تاکہ اللہ ان سے برے اعمال دور کر دے جو انہوں نے کئے تھے اور ان نیک اعمال پر ان کو اجر عطا فرمائے جو وہ کرتے تھے۔ سورہ احزاب میں ہے: رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (الاحزاب ۳۳) کچھ مرد ایسے ہیں کہ اس عہد میں سچے رہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔

(۳) الْمُتَّقِينَ: اللہ تعالیٰ کا ہر حکم ماننے اور اس کی کامل فرماں برداری کے ساتھ ترقی کرنے والے۔

(۴) الْمُتَّقِينَ: اپنی دولت، اپنے تمام قوائے عملیہ اور اپنی ہر عزیز ترین متاع حیات اس کی راہ میں خرچ کرنے والے۔

(۵) السَّاعَتِينَ: بالاسرار: پھر وہ ان صفات جلیلہ پر فخر نہیں کرتے بلکہ اپنی اخلاقی و روحانی ترقی کے لئے تخلیہ میں عبادت کرنے والے اور خلوت میں اپنے اعمال و اخلاق کا احتساب کرنے والے۔ اپنی غلط کاریوں کو معین کرنے کے لئے بہترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہوتا ہے اور ایک انسان کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ آئندہ ان کے مرتکب نہ ہونے کا خدا سے عہد غلیظ باندھ لے۔ جس طرح بارش سے کھیتی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہے، اسی طرح رات کے آخری حصہ میں عبادت کرنا انسان کے فضائل و کمالات کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ابتدائی تعلیم کے قائم مقام ہیں، جب ایک مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا آرزو مند ہو تو اس پر اولین فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ تہجد کا پابند بن جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اس نماز کو ترک نہیں کیا۔ گویا اس طرح اشارہ کرنا مقصود تھا کہ جو لوگ دعوت و ارشاد کے فرض جلیل کو اپنے ذمہ لیتے ہیں، وہ فرائض عمومی کے علاوہ جن کو سب کے سب ادا کرتے ہیں ایک اور چیز بھی اپنے اوپر لازم کر لیں اور اس ذیل میں سب سے پہلے تہجد کی نماز آتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ينزل الله تبارك وتعالى في كل ليلة الى سماء الدنيا حين يبقى ثلث الليل الاخير فيقول هل من سائل فاعطيه، هل من داع فاستجب له هل من مستغفر فاعف له، "ہر رات کے آخری ٹکٹ میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرما کر اعلان کرتا ہے: کوئی سائل ہے کہ اس کو دوں، دعا کرنے والا کہ اس کی دعا کو مشرف اجابت بخشوں اور مغفرت کا طالب کہ اس کو بخش دوں۔" اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمر کی عادت تھی کہ جب سحر ہوتی تو صبح تک دعا و استغفار میں مصروف رہتے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کننا و مرأا اصلينا من الليل ان نستغفر في اخر السحر سبعين مرة۔ جب ہم تہجد کی نماز پڑھ چکے تو ہمیں حکم دیا جاتا کہ طلوع صبح تک ستر مرتبہ استغفار کریں۔



## باب نمبر ۲

## دعوت اسلام

## فصل اوّل: نصاب تعلیم

## اساس عالم

نصاری کی سلطنت قائم ہے، حکومت کے بیچارے و متکبر کی وجہ سے وہ کسی نئی دعوت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے، اس لئے ان پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جب تک وہ اسلام کو قبول نہیں کریں گے کبھی عزت کی زندگی نہیں بسر کر سکتے اور ان کی حکومت جاتی رہے گی، مگر اس دھمکی دینے سے پہلے ان کے سامنے پھر ایک مرتبہ اس حقیقت کو پیش کیا جاتا ہے کہ کائنات ارضی و سماوی کی اساس و بنیاد ہی توحید و ربوبیت خداوندی ہے۔ اگر وہ الوہیت مسیح کے غلط عقیدہ کو ترک کر کے صرف ایک خدا کو تسلیم کر لیں تو ان کی دائمی سربلندی کا وعدہ دیا جاتا ہے اور یہی وہ نصاب تعلیم ہے جس کی جانب ان کو دعوت دی جاتی ہے:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَالْمَلٰئِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالنَّقِصِطِ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۰﴾

اللہ گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں اور فرشتے اور علم والے اگر وہ انصاف پر قائم ہوں تو وہ بھی گواہ ہیں کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں وہ زبردست حکمت والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین دلائل پیش کئے ہیں:

(الف) اس کی تمام تعلیمات دیکھ جاؤ، ہر ایک کتاب الہی کی ورق گردانی کرو اور جملہ صحائف و اسفار آسمانی کا مطالعہ کرو، کہیں بھی توحید کے خلاف تعلیم نہ ہوگی بلکہ ہر جگہ یہی حکم دکھائی دے گا کہ خدائے واحد کی غلامی کرو۔

(ب) جس قدر انبیاء و رسل دنیا میں معبود ہوئے، ارباب کشف و الہام پیدا ہوئے اور جن لوگوں کو بھی ملائکہ الرحمن کے دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ان سے دریافت کرو گے تو وہ بھی توحید کے حامی نظر آئیں گے۔

(ج) جتنے اہل علم و فضل اس کرہ ارضی پر موجود ہیں اگر وہ انصاف و حق پرستی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں تو وہ بھی فقط توحید ہی کی جانب دنیا کو دعوت دیں گے۔

ان تمام کا قاطبہ بیبی فیصلہ ہے کہ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اب جو لوگ اس توحید کے خلاف کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ذلیل و رسوا کر دے گا، لیکن اس تباہی و بربادی میں وہ حکمت و داناتی اور نظام صالح کا ضرور خیال کرے گا۔

## صرف اسلام مطلوب ہے

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًا بَيْنَهُمْ ۚ  
وَمَنْ يُكْفَرْ بِاللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۸۵﴾

”بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی مخالفت نہ کی، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا آپس کی ضد سے، اور جو کوئی اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

تمام تعلیمات الہیہ، جملہ انبیاء و رسل، سب کے سب ارباب علم و فضل اور خود فطرت انسانی اس امر کی شاہد ہے کہ خدائے واحد ہی غلامی اور پرستش کے لائق ہے اور اس کو فقط توحید ہی مطلوب ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے نزدیک دین حق و صدق صرف اسلام ہے، قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: وَرَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ ۳) میں نے تمہارے لئے اسلام کو از روئے دین کے پسند کیا۔ ایک جگہ ہے: وَمَنْ يُتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۵) جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ سورہ نساء میں آتا ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (النساء ۱۲۵) اور دین کے اعتبار سے بہترین شخص وہ ہے جس نے اللہ کے آگے نیک نیکی کے ساتھ اپنی گردن کو خم کر دیا اور ملت ابراہیم کی پابندی اختیار کی۔

تمام مذاہب و ادیان عالم کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ اب تم ہر جگہ کچھ نہ کچھ شاہد شرک ضرور دیکھو گے، اس لئے اب اگر توحید خالص مل سکتی ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اتباع ہی سے مل سکتی ہے۔ قرآن حکیم نے نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ شرک اور توحید پر بحث کی ہے، پھر تمام کتب آسمانی میں سے صرف قرآن ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ پس اس وقت اس آیت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ اگر دنیا توحید محض کی آرزو مند ہے تو وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہو جائے۔

یہی توحید تھی جس کی تعلیم اہل کتاب کو بھی دی گئی، مگر انہوں نے آپس کی ضد اور ہٹ دھرمی، حرص و آرزو اور مال و زر کے کسب و حصول کی خاطر اس کو بدل دیا۔ جب ایک مذہبی آدمی عوام الناس پر اپنی حکومت قائم رکھنے کی خاطر مذہبی اصول و کلیات میں تغیر کرنا شروع کر دیتا ہے تو پھر ناممکن ہے کہ وہ معزز و محترم رہ سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے بہت جلد عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ ارباب مذاہب اسی وقت تک خلافت ارضی کے مستحق ہو سکتے ہیں جب تک وہ حق و صدق کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے رکھیں۔ دوسرے الفاظ میں اس آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ اگر ہمارے علمائے کرام ہمیں کتاب و سنت کی طرف بلائیں تو ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاؤ، مگر جس وقت وہ اپنی خواہشات کی پیروی پر مجبور کریں تو ان سے مخالفت کا اعلان کر دو اور ہر گز ان کے آگے سر تسلیم خم نہ کرو۔

## ترقی ناممکن ہے

فَإِنْ حَاجَّكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۖ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَدُ ۖ وَاللَّهُ بِصَيْرُوتِ الْعِبَادِ ۖ

”اس پر بھی اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہہ دو کہ میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں اپنے آپ کو اللہ کا تابع اور بننا چکے، اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان سے اور نیز ان پڑھوں سے کہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ پس اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو بیشک ہدایت پر آگئے اور اگر منہ موڑیں تو بس تم پر پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔“

اگر نصاریٰ اس بات کو تسلیم نہ کریں اور تم سے مناظرہ کرنے لگ جائیں تو ان نالائقوں سے اب زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان سے صرف اتنا کہ دیجئے کہ میرا اور میرے متبعین کا صراط مستقیم اور طریق عمل تو یہی ہے، اسی پر قائم رہ کر ہماری ہر قسم کی ترقی ہو سکتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم سلامتی کے دروازہ میں داخل ہو سکتے ہیں، آپ اسی توحید کو تمام اقوام عالم کے سامنے پیش کر دیجئے، جن میں اہل کتاب اور عرب کے ان پڑھ لوگ بھی داخل ہیں۔ اگر سب کے سب توحید خالص کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں تو بہتر، ورنہ انحراف کی صورت میں ان کی تمام ترقی رک جائے گی اور اس کی جگہ پر تنزل و انحطاط کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کی بعثت عمومی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے: تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝ (الفرقان) بابرکت خدا نے اپنے بندے محمد پر قرآن نازل کیا، تاکہ وہ تمام جہان کو ڈرائے۔ مسلم میں ہے: والذی نفسی بیدہ لا یسمعہی احد من هذه الامۃ یهودی ولا نصرانی ولم یومن بالذی ارسلت به الا کان من اهل النار۔ مجھے خدا کی قسم کوئی ایسا یہودی یا نصرانی نہیں جس کے پاس میرا پیغام پہنچے اور وہ اس پر ایمان نہ لائے مگر یہ کہ وہ ضرور دوزخ میں جائے گا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں: بعثت الی الاحمر والاسود میں سرخ و سیاہ تمام اقوام عالم کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ ایک مرتبہ فرمایا: کان النبی وبعثت فی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ، ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا مگر میں سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ الغرض ان تمام تصریحات نے بتا دیا کہ دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں اسلام کی آواز پہنچانا ہر مسلمان کا فرض ہے، تاکہ وہ بھی رسول کا اتباع حاصل کر سکے۔

## دوزخ کی بشارت

بد اخلاقی، فسق و فجور اور جمود و استبداد اہل کتاب کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کر چکا ہے کہ وہ کسی حقانیت کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اس لئے ان سے کہا جاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِالْآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۖ

فَبِمَا نُهُمْ بِعَذَابِ الْيَمِّ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ۝

”پیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کر ڈالتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہیں جو لوگوں کو انصاف کرنے کو کہتے ہیں، تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دیدو، یہی ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔“

جن لوگوں کی عادت ہی کفر بآیات اللہ، قتل انبیاء اور عدل و انصاف کی تعلیم دینے والوں کا قتل کرنا ہو، ان کو جہنم کی خوش خبری دیدو۔ ان جرائم کی پاداش میں ان کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے۔ قرآن حکیم نے حبط اعمال کو کئی معنوں میں استعمال کیا ہے:

(۱) ایک شخص اپنی تمام عمر دنیاوی کاموں میں لگا دیتا ہے، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کے کسب و حصول سے بالکلہ چشم پوشی کر لیتا ہے، اسے آخرت کا مطلق خیال نہیں آتا اور اس کے ان دنیاوی اعمال کا اس کی اخروی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ایسے شخص کی تمام سعی و کوشش اکارت جائے گی اور آخرت میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

قُلْ هَلْ تُنْتِظُونَ إِلَّا خُسْرًا ۚ أُولَٰئِكَ سَمِعُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۳ تا ۱۰۵) سورہ فرقان میں ہے: وَقَدْ مَنَّ آلِي مَاعِصِلًا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا ۝ (فرقان ۲۳) اور ہم ان کے اعمال

کی طرف متوجہ ہوئے جو انہوں نے کئے تھے تو ہم نے ان کو غبار پر اگندہ بنا دیا۔

(۲) ایک شخص مسلمان تھا اور عمل صالح کیا کرتا تھا، اس کے بعد مرتد ہو گیا اور اس نے کفر و الحاد کی راہ اختیار کر لی۔ اب چونکہ اس کا زاویہ نگاہ ہی بالکل بدل گیا ہے، اس لئے اس کی تمام پہلی نیکیاں اکارت جائیں گی وَمَنْ يُتَدَبَّذْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيُوتَ فَاُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرہ ۲۱۷)

(۳) انبیاء و رسل کے مخالفین پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تحریک کو فنا کر دیں، مگر وہ خود ہی ناکام و خاسر رہتے ہیں اور کسی جگہ ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی، بلکہ انبیاء علیہم السلام ہی غالب رہتے ہیں۔ ان منصوبہ بازیوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان کی توجہ نیکی کی جانب نہیں ہوتی، اس لئے مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہوں گے۔ آیت زیر بحث اسی قانون کو بیان کرتی ہے: إِنَّ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (المجادلہ ۲۰ تا ۲۱)

(۴) حدیث میں ایک اور صورت بھی حبط عمل کی بیان کی گئی ہے: ایک شخص نیک کام کرتا ہے مگر اس کی نیت اچھی نہیں، اس کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ چنانچہ حدیث میں دولت مند عالم اور مجاہد کی مثال دی گئی ہے۔ ان کا مقصد

صرف شہرت و ناموری تھی جو انہیں دنیا میں حاصل ہو گئی، اس لئے قیامت کے روز ان کا دامن اجر و ثواب سے خالی رہے گا۔

(۵) ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کی نیکیاں معدودے چند اور گناہوں کے انبار کے انبار ہوں۔

### قانون سے اعراض

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۳۷﴾

”کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا، ان کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان میں فیصلہ کرے، پھر ان میں کا ایک گروہ بے رخی کرتے ہوئے انحراف کر جاتا ہے۔“

اس آیت کے شان نزول میں دو مختلف روایات بیان کی گئی ہیں مگر نتیجہ دونوں سے ایک ہی نکلتا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے بیت المدراس میں تشریف لے گئے اور ان لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ نعیم بن عمر اور حارث بن زید نے آپ سے پوچھا: علی ای دین انت یا محمد، آپ کس دین پر ہیں؟ آپ نے فرمایا: ملت ابراہیمی میرا طریق عمل ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو یہودی تھے۔ آپ نے کہا کہ توراة لاؤ وہی اس بات کا فیصلہ کر دے گی، اس پر سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ایک دوسری روایت میں کہ یہودی ایک مرد و عورت کو دربار رسالت میں لائے جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے اور آپ سے فیصلہ کے خواستگار ہوئے، انہیں خیال تھا کہ آپ کوئی ہلکی سی سزا تجویز کر دیں گے اور اس طرح یہ لوگ رجم سے بچ جائیں گے۔ مگر آپ نے فرمایا کہ میں بھی توراة کے مطابق ان کو رجم کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ انہوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ میں اور تم میں توراة حکم ہے اور اس کا فیصلہ ناطق۔ آخر وہ توراة لے تو آئے مگر آیت رجم کو پڑھے بغیر آگے نکل گئے۔ عبد اللہ بن سلام نے روکا اور اس طرح ان کی خیانت ظاہر ہو گئی۔

یہ ہے ان کا حق سے انحراف اور قانون الہی سے نفرت، اسی سلسلہ میں ان پیشین گوئیوں کو بھی سمجھ لینا چاہئے جو کتب سابقہ میں ظہور رسالت کبریٰ کے متعلق ہیں اور جن کو یہ لوگ اپنے خبث باطنی کی وجہ سے چھپاتے ہیں، پھر ایسے نالائقوں کی ہدایت کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

### یہ کیوں

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَسْتَنَّا الثَّائِلَةَ إِلَّا آيَامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَكِرُونَ ﴿۳۸﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

”یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے چند روز کے ہم کو دوزخ کی آگ ہر گز نہ چھوئے گی اور ان باتوں

نے ان کو دین کے بارے میں دھوکا دے رکھا ہے جو یہ اپنی طرف سے بناتے ہیں۔ سو کیا حال ہو گا جب ہم ان کو اس دن اکٹھا کریں گے جس کے ہونے میں کچھ شبہ نہیں اور ہر شخص کو پورا دیدیا جائے گا جیسا کہ اس نے کیا ہے اور وہ بالکل ظلم نہ کئے جائیں گے۔

دائرۃ اسلام میں داخل نہ ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ انہیں صرف چند روز تک جہنم میں رہنا پڑے گا۔ یہودیوں نے تو نحن ابناء اللہ و احباءہ کی پناہ لے رکھی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا عیسائیوں کی نجات کا باعث بن گیا اور یہی مرض اب آہستہ آہستہ مسلمانوں میں سرایت کرنا جاتا ہے۔ یاد رہے جو قوم اعمال سے قطع نظر کر لیتی ہے وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم نے تو نہایت ہی کھلے الفاظ میں نجات کا قانون بیان کیا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾ (البقرہ ۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہی جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس قسم کے عقائد فاسدہ ہمیشہ اس وقت کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں جب وہ دین سے بعد و ہجر اختیار کر لیتی ہے اور محرمات الہیہ کا احترام ترک کر دیتی ہے۔

جن لوگوں کی عادت ہی یہی رہی ہو کہ انہوں نے انبیاء اللہ کو قتل کیا، وہ ابھی بھی ان ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئیں گے اور رسول اللہ کے بھی درپے آزار ہوں گے۔ اس طرح بتدریج اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے جو مستغلبون و تحشرون الی جہنم و بیئس البہاد، میں کی گئی ہے، رہا ان کا کفارہ تو اس کا ابطال و دو فیت کل نفس ما کسبت سے ہو جاتا ہے اور اس کی پوری کیفیت تو مرنے کے بعد نظر آئے گی، جب اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ اس وقت انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ کفارہ کا عقیدہ بالکل ہی غلط تھا۔

## فصل ثانی شرائط خلافت

### حکومت کی دعا

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تَوْفِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُدْلِلُ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱﴾

”کہو اے اللہ! ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو ہی عزت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، ہر بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بیشک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔“

عیسائی اس تعلیم صحیح کے آگے سر جھکاتے نظر نہیں آتے، بلکہ قرآن حکیم کی نشر و اشاعت میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ قائم نہیں رہ سکتے بلکہ بہت جلد برباد کر دیئے جائیں گے۔ مگر ان کی تباہی سے قبل رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو یہ دعا تعلیم دی جاتی ہے کہ سب کے سب نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں یوں التجا کریں: خداوند! حکومتوں کا دینا اور چھین لینا، عزت و کرامت کی بخشش اور ذلت و رسوائی کی پھینکار، سب تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہے، پس تو نصاریٰ سے حکومت چھین، ان کو ذلیل و رسوا کر، ان میں اختلاف و تفریق پیدا کر اور ان کی تمام حکومتیں اور مملکتیں چھین کر مسلمانوں کو دے اور فرزند ان اسلام میں اتحاد و اشتراک عمل پیدا کر، تو صرف ارباب استعداد و قابلیت ہی کو حکومت نوازش کیا کرتا ہے اور تیرے لئے یہ انقلاب نہایت ہی آسان اور سہل ہے۔

یہ مبارک دعا ان ایام میں مسلمانوں کو تعلیم دی جاتی ہے جبکہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو فاکر کرنے پر متفق ہو چکے تھے۔ پھر دیکھو اس کے الفاظ کس قدر جلد پورے ہو گئے، لیکن اے عزیزانِ من! اس غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ یہ وعدہ لسانِ الہی کا صرف صحابہ کرام ہی کے لئے مخصوص تھا، بلکہ آج بھی تم سے یہی عہد کیا جاتا ہے، مگر شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی!

دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، پھر کر کے دیکھ لو، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

تُولِیْمُ الْاَیْلِ فِی النَّهَارِ وَتُولِیْمُ النَّهَارِ فِی الْاَیْلِ ۚ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمِیْتِ وَتُخْرِجُ الْمِیْتِ مِنَ الْحَیِّ ۚ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۱۷﴾

”تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر لیتا ہے، اور تو ہی جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور جسکو چاہتا ہے بے شمار روزی دیتا ہے۔“

خداوند! رات کو دن، دن کو رات، سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنا تیرا معمولی کام ہے۔ نصاریٰ کے پاس ہر قسم کا سامان جہاگیر و جہانداری موجود ہے، ادھر مسلمانوں کی ناداری، و تہی دستی اور غربت و افلاس ضرب المثل ہے۔ پس اے ہمارے رب! تو نصاریٰ کے دن کو رات سے بدل دے اور ان کو نیست و نابود کر، مسلمانوں کی شب تاریک کو روشن و درخشندہ کر، انہیں علم و تدبیر عنایت فرما اور ان میں انتظام مملکت کی استعداد پیدا کر۔

تو بیجان سے جاندار، کافر سے مومن، جاہل سے عالم اور فاسق سے صالح پیدا کرتا ہے۔ پس تو اپنے فضل مخصوص سے مسلمانوں کو ملک گیری و ملک داری کا علم عطا فرما۔ ان کی موت کو زندگی سے بدل اور نصاریٰ پر موت و ہلاکت طاری کر کہ ان کی سرکشی اور متمادی طرز عمل نے زمین کو فساد کا گھر بنا دیا ہے۔ ویرحہ اللہ عبد اقال امینا۔

جن قوموں نے اپنی حکومت قائم کرنے میں صدیاں گزاری ہیں اور اسی کے محکم و استوار کرنے میں انہوں نے ہزار ہا سال صرف کر دیئے ہیں، خداوند! ان کی تمام حکومتیں اور سلطنتیں جلد تر مسلمانوں کو نوازش کر کہ تو ہی جس میں قابلیت دیکھتا ہے، اس کو بے حساب رزق دیتا ہے۔



خداوند قدوس نے قیام و استحکام سلطنت کے لئے چند نوامیس و سنن مقرر کی ہوئی ہیں۔ کسی قوم کی خاطر ان اصول و کلیات میں تغیر نہیں ہو سکتا، بلکہ جب کبھی کوئی قوم عمداً یا سہواً ان قوانین کی پابندی کرے گی تو وہ ضرور سرفرازی و سر بلندی سے بہرہ اندوز ہوگی۔ مسلمانوں نے ان اصول صحیحہ کو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا اور وہ یکسر عمل بن گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل ترین زمانہ میں انہوں نے وہ حیرت انگیز ترقی کی جو سلطنت روما کو تین سو سال میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جنگوں اور بیابانوں کے رہنے والے قیصر و کسریٰ کے محلات پر قابض ہو گئے اور جب تک وہ ان قوانین الہیہ کے پابند رہے دن دوئی اور رات چوگنی ترقی کرتے گئے۔ اسی نشو و نما کو یزق من یشاء بغیر حساب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے صحیح علم و عمل پر ترقی کرنے والی قوم کی مثال ان الفاظ میں بیان کی ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ خَرَّبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ تُنتُجُ أَكْثَرُهَا كَلٌّ لِّجَنِّ بِأَذْنٍ رَّبَّهَا (ابراہیم ۲۴ تا ۲۵) کیا تم نے دیکھا نہیں اللہ نے کیسی مثال بیان کی کہ پاکیزہ بات گویا ایک پاکیزہ درخت ہے، جس کی جڑ مضبوط اور ٹہنیاں آسمان میں ہوں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا رہتا ہے۔ اب بھی مسلمان اگر قرآن کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیں تو وہ یقیناً بے حساب حکومت اپنے سامنے پائیں گے۔

### انقطاع تعلقات

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو حکومت و سرفرازی کی دعا تعلیم دی گئی، اب انھیں اپنی داخلی و خارجی قوت کے محفوظ کرنے، جماعتوں کو مضبوط و مستحکم بنانے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنے کے لئے فرمایا جاتا ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۚ وَيُحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝

”مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ کا کوئی نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم لوگ ان کے شر سے بچاؤ چاہو، اور اللہ اپنے آپ سے تم کو ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی جانب لوٹ کر جاتا ہے۔“

اس ذیل میں اولین حکم ان کو یہ دیا گیا کہ وہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے دوستی نہ پیدا کریں۔ اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اللہ کی برکتیں اس سے دور ہو جائیں گی۔ کامیابی کے لئے اپنے رموز و اسرار کا محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور جو شخص مسلمانوں کے دشمنوں سے یار نہ گناہتے وہ بعض اوقات اپنی قوم کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔ قرآن حکیم نے اس موضوع پر نہایت ہی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک جگہ آیا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلٰیكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء ۱۴۴) اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لینا چاہتے ہو۔ دوسری جگہ فرمایا: اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرَى اَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ



يَتَّوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ (المائدہ ۵۱) اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بنائیو، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو وہ ان ہی کا ہو گا۔ سورہ مجادلہ میں ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرُسُلَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ (مجادلہ ۲۲) جو اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں تم ان کو نہیں پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اگرچہ وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ سورہ ممتحنہ نے تو بہت ہی صاف صاف اور رکھ رکھے کھلے الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے۔ ارباب ایمان کے لئے حضرت ابراہیم کا اسوہ حسنہ پیش کیا ہے: اِنَّا بَرَّأُوْا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُوْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحَدّٰكُمَا (الممتحنہ ۴) اس آیت میں ترک موالات کے حسب ذیل مراتب سہ گانہ بیان کئے گئے ہیں۔

(الف) انا براءؤامنکم ومما تعبدون من دون اللہ: وہ اللہ کے دشمن ہیں اس لئے ان سے ہر قسم کے تعلقات و روابط کا انقطاع حقیقی۔

(ب) کفرنا بکم ان کا قانون غلط اور جبر و تشدد پر مبنی ہے، اس لئے ان کے ہر قانون کی شدید ترین مخالفت اور نافرمانی۔  
(ج) بد ائیننا و بینکم العداۃ والبغضاء ابدًا: وہ ظلم و جور کے بانی اور فسق و فجور کے حامی ہیں، اس لئے ان سے کمال درجہ کا بغض اور عداوت۔

پس آج مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دشمنان اسلام سے ہر قسم کے تعلقات توڑ کر ان کے غلط قوانین کی نافرمانی کریں اور ان کے لئے عذاب الہی بن جائیں۔

لیکن اس ممانعت سے یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ تمام کفار سے بلا اختلاف و تفریق ہر قسم کے تعلقات ممنوع و حرام ہیں۔ قرآن نے دشمنوں کی دو بڑی تقسیمیں کر دی ہیں۔ سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نے ان خصائص و امتیازات کو بیان کیا ہے جن کی بنا پر ہم ایک دشمن سے اپنے روابط کو توڑ سکتے ہیں، فرمایا:

(الف) کفر و ابہاء جاءکم من الحق تعلیم صحیح کے دشمن ہیں۔

(ب) یخارجون الرسول وایاکم: رسول اللہ ﷺ اور ان کے جانشینوں کو ان کے مرکزی مقامات سے نکالنے کی سعی و کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

(ج) ان یتفقو کم یکونوا لکم اعداء ویسقطوا الیکم ایدہم والسننہم بالسوء وودوا لولکفرون: وہ تمہیں عالمگیر اتحاد اسلامی سے روکتے ہیں، تم میں اور تمہاری حکومتوں میں اختلاف کا بیج بوتے ہیں اور اس طرح جب تم الگ الگ ہو جاتے ہو تو ایک ایک کے ساتھ دشمنی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنی تمام قوت و طاقت تمہاری بربادی میں صرف کر دیتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تحریریں تمہارے لئے گالیوں سے بھری ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ تمہیں دین حق سے منحرف کر دیں۔

سورہ توبہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(۱) نكثُوا اِيْمَانَهُمْ : انہوں نے اپنے عہد و موافق کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

(۲) وھو باخراہ الرسول : رسول اور اس کے جانشینوں کو دار الخلافہ سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) وھم بدؤکم اول مرہ : ابتدا بھی انہیں کی جانب سے ہوئی ہے : والہادی اظلم اور سورہ بقرہ میں تو کئی جگہ فرمایا :

ولن ترضوا عنک الیھود ولا النصریٰ حق تتبع ملتھم، جب تک تم ان کے دین کا اتباع نہ کرو یہود و نصاریٰ تم سے

ہر گز خوش نہ ہوں گے۔ پھر فرمایا : لایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا، وہ تم سے برابر جنگ

کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کی طاقت ہو تو وہ تمہیں راہ حق سے منحرف کر دیں۔ الغرض ان آیات نے

اس فلسفہ کو بیان کر دیا جس کی وجہ سے ہم ان دشمنان دین و ملت کے ساتھ تعلقات نہیں رکھ سکتے۔

البتہ اس نے ان کفار کے ساتھ مروت و احسان کی اجازت دی ہے جنہوں نے نہ تو ہم سے جنگ کی ہو اور نہ ہمارے بے گھر ہونے میں ان کا کوئی ہاتھ ہو۔ چنانچہ اسی سورہ ممتحنہ میں آتا ہے : لَا یُنْهَکُمُ اللّٰهُ عَنِ الدِّینِ لَیْمَ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبْکُوْهُمْ وَ تَقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ (الممتحنہ ۸) اور بعض اوقات دفع شر کے لئے بھی ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔

انتباہ

قُلْ اِنْ تَخْضَعُوْا مَآئِیْ صُدُوْرُکُمْ اَوْ تُتْبَدُوْا یَعْلَمْنٰہُ اللّٰهُ ۚ وَ یَعْلَمُ مَآئِی السَّلٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰﴾ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۙ تَوَدُّ اَنْ یَّبَیْنَهَا وَ بَیْنَهَا اَمَدًا ۙ بَعِیْدًا ۚ وَ یُحَدِّثُکُمْ اللّٰهُ نَفْسَہُ ۚ وَ اللّٰهُ رَعُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۱﴾

”کہدو کہ اگر تم اس کو چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو بہر حال اللہ تو اس کو جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، جس دن کہ ہر شخص بھلائی کو اور برائی کو جو اس نے کی ہے پائے گا، آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور ان میں مسافت دراز ہوتی اور اللہ اپنے آپ سے تم کو ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا شفیق ہے۔“

تمہیں ظاہر اور باطن کسی صورت میں بھی ظالموں سے دوستی رکھنا جائز نہیں۔ اگر تم لوگوں سے یہ عذر کرو کہ مسلمانوں کی حکومت میں بد امنی ہے، جان و مال کا خطرہ ہے، اس لئے ہم کافروں کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں اور ان سے پیمان مودت باندھتے ہیں۔ تو یہ عذر لنگ اللہ تعالیٰ کی دربار میں کام نہ دے گا، کیونکہ اگر کہیں سے مسلمانوں کی حکومت چھین جائے تو یہ ان کا فرض ہے کہ فوراً اپنے مرکز خلافت میں جمع ہو کر اس ملک پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کریں اور یہ تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں کہ دار الحرب ہی کو اپنا وطن بنالو۔ قیامت کے روز یہی اعمال فاسقہ تمہاری ذلت و رسوائی کا

باعث بن جائیں گے۔ پس خدا سے ڈرو اور یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو۔ خدا کا حکم کسی ظلم و جور پر مبنی نہیں بلکہ اس کی رافت و رحمت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے اور اسی میں تمہاری زندگی ہے۔

### بہترین طریق عمل

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۶۱﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَالرَّسُولَ ۚ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۶۲﴾

”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کہہ دو کہ اللہ اور رسول کا حکم مانو پس اگر وہ انحراف کریں تو بیشک اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“

جو لوگ نحن ابناء الله واحباءہ کا نعرہ مستانہ لگاتے پھرتے ہیں اور جن کا دعویٰ یہ ہے کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودات وہ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ ان کی ہر وقت دستگیری اور اعانت کرے گا اور ان کے ساتھ اس کا وہی طرزِ عمل ہو گا جو وہ دوستوں کے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن اس توقع کے پورا ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم سب کے سب میرے نقش قدم پر چلو۔ میں قرآن حکیم کی خاطر تمام دنیا قربان کر دینے کو تیار ہوں، تم بھی اسی کتاب عزیز کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا انتہائی نصب العین بنالو، پھر یقیناً تمہاری مدد ہوگی اور تمہاری گزشتہ غلط کاریوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

عیسائیوں کے لئے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ انہیں نہایت ہی صاف اور ناقابل تاویل الفاظ میں کہہ گئے ہیں: ”اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دو سرائلی دینے والا بخشے گا۔“ (یوحنا ۱۴:۵۱) ایک جگہ انہوں نے فرمایا: ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔“ (یوحنا ۱۴:۲۱)

ان آیات نے عیسائیوں کے تمام عذر و رفع کر دیے، اب بھی اگر وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہونے سے گریز کرتے ہیں تو یہ ان کی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ ہر ایک مسلم اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرآن حکیم کی نشر و اشاعت، اعلائے کلمۃ اللہ اور اس پر عمل کرنا بنالے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مقدس کو اپنے لئے نمونہ تصور کرے۔ صرف یہی ایک صورت کامیابی کی ہے اور انحراف کی شکل میں تمام تر قیام رک جائیں گی۔

ان تمام آیات میں خلافت کے حاصل کرنے کی شرطوں کو بیان کیا گیا ہے جن کی تلخیص حسب ذیل ہے:

(الف) ہماری تمام قوت دعائیں صرف ہو اور صرف اللہ تعالیٰ سے حکومت و سرفرازی اور فضیلت علیٰ العلمین کی دعا مانگیں۔

(ب) یہود و نصاریٰ، کفار و مشرکین اور تمام مخالفین اسلام سے انقطاع تعلقات کر لیں اور ان کی دوستی پر ہرگز اعتماد نہ کریں۔

(ج) اللہ کے قانون کی پابندی کریں اور رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

## فصل ثالث تاریخی نظائر

آئندہ آیات میں چند تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن سے دو باتیں ثابت کرنی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہمیشہ ان لوگوں کی مدد کی ہے جو اس کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲) اب تک نبوت اور حکومت ابراہیم کے خاندان کی ایک شاخ میں رہی ہے، مگر آج کی تاریخ سے بنی اسرائیل سے نبوت چھین کر بنی اسماعیل میں چلی جائے گی۔

برگزیدہ خاندان

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِصْمَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۷۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۷۴﴾

”اللہ نے آدم نوح خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو تمام جہان میں سے چن لیا، یہ ایک دوسرے کی نسل سے تھے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام ہے، مورث اعلیٰ کے ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ تمام سلسلہ موسویہ کا تذکرہ آگیا۔ یہ لوگ آل ابراہیم میں شامل تھے، مگر ان کو الگ ذکر کیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اگرچہ آج تک صرف بنی اسرائیل ہی اس عزت و سرفرازی حکومت و سر بلندی اور مکالمہ و مخاطبہ الہی کے وارث رہے ہیں، مگر اب حضرت اسماعیل کی اولاد اس عروج و ارتقا کے لئے مخصوص کر لی جائے گی۔ گویا آل ابراہیم کے علیحدہ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی جانب اشارہ ہو۔

یہ تمام جلیل القدر انبیاء و رسل صرف اس لئے ان مراتب عالیہ پر فائز ہوئے اور ان کے خاندانوں کو ارض مقدس کی

حکومت ملی کہ انہوں نے اپنی زندگی کی غایت الغایات قانون الہی کا اتباع قرار دیا تھا۔ پس اگر مسلمان بھی اس ترقی کے آرزو مند ہیں تو قرآن حکیم سے تمسک و اعتصام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کے حالات سے واقف ہے، جس قدر ایک شخص اس کا قانون ترک کرے گا، وہ اتنی ہی اس کی امداد و اعانت بند کر دے گا۔ چنانچہ ان خاندانوں میں سے جن لوگوں نے قانون الہی کا اتباع ترک کر دیا انہیں ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا کر دیا گیا اور جتنا ایک شخص اتباع کرے گا اس کی اتنی ہی امداد ہوگی۔

### عمران کی بیوی کی دعا

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۹﴾

”جب عمران کی بیوی نے کہا، اے میرے رب! جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے اسے آزاد کر کے تیری نذر کیا ہے، پس میری طرف سے قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔“

اس آیت میں امراۃ عمران کے الفاظ نے بعض لوگوں کو اس شبہ میں ڈال دیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ حالانکہ سورہ تحریم کی یہ آیت وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم ۱۲) صاف بتا رہی ہے کہ عمران دراصل حضرت مریم کے والد کا نام ہے اور یہ عام دستور ہے کہ لوگ اپنے خاندان کے بزرگوں کے ناموں پر اپنی اولاد کے نام رکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ مریم کے بھائی کا نام ہارون تھا جس کی بنا پر انہیں سورہ مریم میں یا اخت طرون کہہ کر پکارا گیا۔ آج کل بھی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، مگر عیسائیوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اور اعتراض کیا اور یہ کوئی نیا اعتراض نہیں بلکہ چودہ صدی قبل یہی سوال خود رسول اکرم سے بھی کیا گیا تھا تو آپ نے بھی اس کا یہی جواب دیا تھا۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک امراۃ عمران سے مراد مریم کی والدہ ہیں۔

بنی اسرائیل قوانین الہیہ کو ترک کر چکے ہیں۔ تنزل و انحطاط کا زمانہ ہے اور بدترین زندگی بسر کر رہے ہیں، اس دور لازمہیت میں بھی بنی اسرائیل کے عام دستور کے مطابق عمران کی بیوی یہ منت مانتی ہے کہ جو لڑکا اس کے ہاں پیدا ہو گا وہ اس کو صرف بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دے گی۔ اب اس نذر کو شرف قبول بخشا اور اس سے وہی خدمت لینا خدا نے قدوس کی مرضی پر ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ۖ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذَرَيْتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۲۰﴾

”پھر جب اس کو جنا تو کہا میرے رب! میں نے تو لڑکی جنی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں ہوتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“

عمران کی بیوی کو یقین تھا کہ لڑکا پیدا ہو گا۔ لڑکی پیدا ہونے پر اسے کچھ حسرت سی ہوئی اور کہنے لگی کہ مذہبی خدمت تو بہترین طریق سے صرف لڑکا ہی ادا کر سکتا ہے۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ یہی لڑکی آئندہ چل کر دنیا میں نام آور ہو گی۔ بہر حال اس نے اپنی نذر کے مطابق اس کو ہیکل کے سپرد کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس نذر کو یوں شرف اجابت بخشا: **يُحْيِيهِمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰكَ وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفٰكَ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ** ﴿۳۱﴾ (آل عمران ۳۱) اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا اور تمہیں پاک و طاہر بنایا اور دنیا کی تمام عورتوں پر برگزیدگی نوازش کی۔ ایسی بیٹی پر ہزاروں بیٹے قربان جس سے خود ملائکہ الرحمن ہم کلام ہوں، جس کی طہارت و پاکیزگی کا قرآن حکیم میں بار بار اعلان ہو، جس کی نسبت لسان الہی کا یہ فیصلہ ہو کہ نہ صرف مریم، بلکہ اس کا بیٹا، دونوں کے دونوں کائنات ارضی و سماوی کے لئے عظیم و جلیل نشان بننے والے ہیں۔

### قبولیت دعا

**فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۖ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يَرِيءُ اٰلِيْكَ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۲﴾**

”سو مریم کو اس کے رب نے اچھی طرح قبول فرمایا، اور اس کو عمدہ پرورش سے پڑھایا اور اس کو زکریا کے سپرد کر دیا، جب کبھی زکریا اس کے پاس حجرے میں آتے تو اس کے پاس رزق پاتے۔ زکریا نے کہا اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ اس نے کہا اللہ کی طرف سے ہے، بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔“

بنی اسرائیل جس جگہ بیٹھ کر اور ادو وظائف اور نماز پڑھا کرتے تھے اس کو محراب کہتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام بیت المقدس کے مجاور تھے۔ جب حضرت مریم کی کفالت و سرپرستی کا مسئلہ پیش ہوا تو ہر ایک مجاور اس سعادتمند لڑکی کو اپنے پاس رکھنے کا آرزو مند تھا۔ مگر جب دلائل پیش کئے گئے تو زکریا کا پہلو غالب رہا اور مریم کو ان کے حوالہ کر دیا گیا۔ اول تو قرعہ اندازی نے ان کو ترجیح دے دی، دوسرے زکریا کی بیوی مریم کی خالہ ہوتی تھیں۔ یہ بھی قبول حسن کی ایک شان تھی جو اللہ کی جانب سے ہوئی کہ بہترین انسان کی نگرانی میں اس لڑکی کو رکھ دیا گیا۔

حضرت زکریا علیہ السلام درجہ کے زہد و تقویٰ، ورع و پاکیزگی اور قناعت و توکل علی اللہ کی زندگی بسر کرتے تھے، خود ان کے گھر میں کئی کئی روز تک فاقہ رہتا تھا، اس لئے مریم کے لئے قدرت خداوندی نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ جس وقت انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی فوراً تو اے مثالہ کی وجہ سے انہیں مل جاتی۔ اس طرح ان کی نشوونما پر کوئی مضرت صحت اثر نہ پڑا، اسی کو نبات حسن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب کبھی مریم کو دیکھنے کے لئے زکریا آتے تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی چیز اس کے پاس پاتے۔ ان نعمت ہائے گونا گوں کو دیکھ کر ایک روز انہوں نے لڑکی سے پوچھا کہ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ قدوس حق نوازی کرشمہ سازیاں ہیں، وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے: **وَمَنْ يَشِئِ اللّٰهُ يَجْعَلْ لَّدٰىهٖ مَخْرَجًا ﴿۳۳﴾ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَّكِلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق ۳۲-۳۳)**

## بشارتِ یحییٰ

هٰذَاكَ دَعَاكَ كَرِيًّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿۸۵﴾

”وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب! اپنی جناب سے مجھے اولاد صالح عطا فرما بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے۔“

جب زکریا نے دیکھا کہ یہ مریم کی نیک بختی اور پارسائی کا نتیجہ ہے کہ جب وہ دعا کرتی ہیں تو ہر چیز اپنے پاس موجود پاتی ہیں اور بنی اسرائیل کی اس گئی گذری حالت میں بھی ایسی پاکباز عورتیں پیدا ہو کر دوسروں کی سعادت و راہ نمائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں تو ان کے دل میں بھی جوش و ولولہ دعا پیدا ہوا اور انہوں نے بھی ایک نیک بخت اور سعید فرزند کی حق تعالیٰ سے والہانہ و مضطربانہ دعا کی۔

انہیں اب تک اپنی عورت کے بانجھ ہونے کی وجہ سے دعا کی طرف رغبت نہیں ہوئی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے محض اللہ تعالیٰ کے لطف و اکرام سے مریم کو ہر چیز مل جاتی ہے تو ان کا جو تھوڑا بہت اعتماد اب تک سلسلہ اسباب و علل پر تھا وہ اور بھی کمزور ہو گیا اور انہیں امید ہوئی کہ باوجود میری عورت کے بانجھ ہونے کے، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مجھے ایک فرزند صالح عطا کرے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ درگاہ خداوندی میں یوں عرض کرنے لگے: رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاسْتَعَلَ الرَّأْسُ شَبَابًا لَّمْ اَكُنْ بِدُعَاؤِكَ رَبِّ شَقِیًّا ۝ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتْ اِمْرًا عَلَیَّ عَاقِبًا ۚ اَفْهَبْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ ۱۰ یٰرَبِّیْ تُعْطِیْ وَ یَرِیْثُ مِنْ اِلٰی یَعْقُوبَ ۚ وَ اَجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ (مریم ۶۳) میرے رب! میری ہڈیاں کمزور پڑ گئیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا اور اے پروردگار! میں تجھ سے مانگنے میں کبھی محروم نہیں رہا اور میری عورت بانجھ ہے، تو مجھ کو اپنی طرف سے ایک وارث عطا فرما، جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے اور اس کو اے پروردگار پسندیدہ بنا۔

یہ جو زکریا نے ایک وارث کی دعا کی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ وہ اپنی جائداد اور دولت کا وارث طلب کرتے ہیں، اس لئے کہ انبیائے کرام کے پاس ہوتا ہی کیا ہے، جو وارث کی تلاش کریں، بلکہ ان کی غرض یہ تھی کہ میرے بعد وہ بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے والا یعقوب کی نبوت کا وارث اور ان کے علوم و معارف کا حامل ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ میری وفات کے بعد علوم نبوت کا سنبھالنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْبَحْرَابِ ۚ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَ حَصُورًا وَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

”جب وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، جو اللہ کے حکم کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور بدیوں سے رکنے والا اور نبی نیکو کاروں میں سے ہو گا۔“

رحمت الہیہ نے دستگیری کی اور ان کو ایک فرزند صالح کی بشارت دی، جس کے حسب ذیل امتیازات ہوں گے:

(۱) مصدقا بحکمۃ من اللہ: قرآن حکیم نے مصدق کے معنی پیشین گوئیوں کے پورا کرنے والے کے بیان کئے ہیں: نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (ال عمران ۳) خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی معنی میں کتب سابقہ کا مصدق کہا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مریم کو بغیر کسی خاوند کے فرزند رشید کی خوش خبری دی تھی: اذ قالت الملائکہ یریم ان اللہ یشاء بحکمۃ منه، حضرت یحییٰ کو ان کی تصدیق کے لئے بھیجا گیا تاکہ یہودیوں کا منہ بند ہو جائے اور وہ آپ کی پیدائش پر کوئی اعتراض نہ کر سکیں، یہی وہ کلمۃ اللہ ہیں جن کی تصدیق کے لئے یحییٰ تشریف لائے۔

(۲) سید: انسانوں کو طبعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) سید بالطبع: جو ابتدائی سے سرداری کے لئے پیدا کیا گیا ہو، اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے اور مشکلات و موانع کے ہجوم سے نہ گھبرائے۔ ایسے لوگ ہر قوم میں خال خال ہوتے ہیں انھی کی تعلیم دتر بیت اور صحبت و ہم نشینی سے بعض ایسے بندگان خدا نکل آتے ہیں جو دنیا کی تاریخ بنانے والے اور امتوں میں انقلاب عظیم پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، انھی میں شاہان اولوالعزم دکھائی دیتے ہیں اور انھی کی صف فاتحان ممالک و قائدین عسا کر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہی صفت کامل طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام میں ودیعت کی گئی تھی۔

(ب) عبد بالطبع: لیکن عموماً دنیا کی آبادی جن نفوس پر مشتمل ہے وہ ان اوصاف سے بالکل معرہ ہوتی ہے۔ ان کی خود کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی، وہ تعلیم و تربیت کے بعد بھی عموماً ایک ایسے شخص کے متلاشی رہتے ہیں جو ان کی تکمیل پکڑ کر جہاں جی چاہے لے جائے، انھی کو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی اصطلاح میں عبد بالطبع کہا جاتا ہے اور یہ اصطلاح آجکل کے جی حضوریوں پر پورے طور سے صادق آتی ہے۔

(۳) حضور: سرداری کے ساتھ عقیف و پاکدامن ہونا، ان انعامات الہیہ میں سے ہے جو لوگوں کو بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ کیونکہ سردار جن آزادیوں سے مستیع ہوتا ہے ان کی وجہ سے اس کا فسق و فجور میں مبتلا ہو جانا بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کو سرداری کے ساتھ عفت و طہارت دے کر ان کے والد کی دعا کو بدرجہ اتم قبول فرمایا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کے لئے ایک ایسا راہ نما مہیا کر دیا جس کی ان کو شدید ترین ضرورت تھی۔

(۴) ایک نیک بخت نبی ہوں گے۔

طلب آیت

قَالَ رَبِّ اَنْیَیْکُونُ لِیْ عِلْمٌ وَقَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ وَامْرَأَتِیْ عَارِیَةٌ ۚ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ



آيَةٌ قَالِ اٰتٰنَكَ الْاُنْكَلَمَ النَّاسُ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَلَا رَمَوْا ۚ وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيْرًا وَّاَسْبِغْ بِالْعِشِيْ وَالْاَبْكَارِ ۝

”اس نے کہا اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو گا حالانکہ مجھ پر بڑھاپا آچکا اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا اسی طرح ہو گا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ عرض کیا میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر۔ فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک اشارہ کے سوا لوگوں سے بات نہ کر سکو گے اور اپنے رب کا بکثرت ذکر کرو اور شام اور صبح تسبیح کرو۔“

ذکر کیا کو ان تمام وعدوں پر یقین ہے، مریم میں انہوں نے اس کا نمونہ بھی دیکھ لیا ہے، مگر پھر بھی بشارت کی قدرت کا ایک عظیم الشان نشان اور ان کے نزدیک حیرت انگیز کام ہے، اس لئے وہ ازراہ تعجب پوچھتے ہیں کہ اس کی کیا صورت ہوگی۔ حضرت ابراہیم نے بھی اس موقع پر یہی عرض کیا تھا: اَبَشِّرْ نَبِيْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسِّنٰى الْكِبَرَ فَيَمِ نُبَشِّرُوْنَ ۝ (الحجر ۵۴) اس کبر سنی میں تم مجھے اسحق کی خوش خبری دیتے ہو، درگاہ خداوندی سے جواب ملتا ہے کہ دنیا میں جس قدر مخلوقات روزانہ پیدا ہوتی ہے وہ محض والدین ہی کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں یکسر ہمارا تصرف ہوتا ہے اور یہی تمہارے ساتھ ہو گا۔ وہ ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر پھر بھی مزید اطمینان کے لئے نشانی طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنی عادت کے مطابق شب و روز ذکر الہی میں مصروف رہو گے، ایک وقت آئے گا کہ اللہ کے ذکر میں تو تمہاری زبان زمر مرہ سنج ہوگی مگر اس میں لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہ رہے گی اور تمہیں رمز و کنایہ سے کام لینا پڑے گا۔ جب یہ حالت ہو تو سمجھ لینا کہ یہی ضرور پیدا ہوں گے۔

تمہاری تمام قوتیں کام کرنے کے قابل ہوں گی، مگر ہم صرف ایک روحانی طاقت کو اتنا تیز کر دیں گے کہ تسبیح و تقدیس خدا تو کر سکو گے مگر دوسری باتوں سے اپنے آپ کو عاجز پاؤ گے، اسی سے تم سمجھ لو کہ عالم شباب میں تمہاری ہر قسم کی قوت بدرجہ کمال موجود تھی مگر پھر بھی اولاد سے تم محروم رہے، بڑھاپے میں یہ ہماری نیرنگ سازی ہے کہ اولاد ہو جائے۔ درمیان میں جو رکاوٹ حائل تھی اس کو دعائے دور کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک خاص معیار قوت ضروری ہے جو عموماً نوجوانوں اور تندرست و توانا آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اگر ایک ضعیف و ناتوان شخص بھی عزم مصمم کر لے اور اپنے اندر ارادہ کی پختگی، استقلال اور ثبات قدم پیدا کر لے تو جسمانی قوتوں کی تلافی ہو جائے گی۔

مریم کی برگزیدگی

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰرٰمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰٓى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰرٰمُ اقْنِطِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ۝

”اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو منتخب کیا اور تجھے پاک بنایا ہے اور قوموں کی عورتوں میں سے تمہیں چن لیا ہے، اے مریم! اپنے رب کی فرماں برداری کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ جھک جا۔“

اگرچہ عام قانون کے مطابق بیت المقدس کی خدمت اور جارب کشی کے لئے صرف مردوں ہی کا انتخاب عمل میں آتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی کی نذر کو قبول کیا اور مریم کو ہیکل کے لئے چن لیا، پھر زکریا جیسے بزرگ ترین انسان کی تربیت میں اس کو رکھا، اس کی ہر قسم کے گناہ کی آلائش سے حفاظت کی اور اس کو تمام زمانہ کی عورتوں پر فضیلت و برتری نوازش کی۔ بغیر خاوند کے اس کو ایک جلیل القدر پیغمبر کی ولادت کا فخر حاصل ہوا اور اسے فرشتوں سے ہم کلامی کا شرف نصیب ہوا۔ بخاری میں ان کی نسبت آتا ہے: خیر نسائھا مریم بنت عمران، وخیر نسائھا خدیجۃ بنت خویلد۔ ترمذی میں ہے: نسائکم من نساء العالین مریم بنت عمران وخدیجۃ بنت خویلد وفاطمة بنت محمد واسیۃ امراۃ فرعون، ”تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ تمام زمانہ کی عورتوں پر مریم، خدیجہ، فاطمہ اور آسیہ کو فضیلت و بزرگی حاصل ہے“، ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں: کمل من الرجال ولم یکمل من النساء الا ثلاث مریم بنت عمران واسیۃ امراۃ فرعون وخدیجۃ بنت خویلد، وفضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی الطعام۔ ”مردوں میں تو بڑے بڑے لوگ کامل ہوئے مگر عورتوں میں سے صرف مریم، آسیہ اور خدیجہ کو یہ عزت نصیب ہوئی اور جملہ کھانوں میں جو فضل و شرف ثرید کو حاصل ہے وہی مزیت و کرامت عائشہ کو باقی تمام عورتوں کے مقابلہ میں ہے۔“

پس جب مریم کی بزرگی اور برتری کی یہ کیفیت ہے تو اس کے شکریہ کے طور پر لسان الہی نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہر وقت خدائے قدوس کی فرماں بردار رہیں اور عبادت گاہ میں دوسروں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ قنوت دل کا فعل ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جو حکم کسی شخص کو ملے وہ اس کے پورا کرنے کے لئے فوراً تیار رہے۔ اس قنوت کا ظہور رکوع و سجود سے ہوتا ہے۔ بار بار مشق کرنے سے اس جذبہ صادقہ میں ترقی ہوتی رہتی ہے، اسی لئے ہر مسلمان پر رکوع اور سجود فرض کیا گیا ہے اور نماز کو معراج المؤمنین فرمایا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا: قنۃ عینی فی الصلوۃ۔

نبی امی کے لئے پیشین گوئی

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَتَيْتُكَ بِرِیْضٍ مَّرِیْمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۱۷﴾

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل ہو اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔“

حضرت مریم کی کفالت و سرپرستی کے لئے بیت المقدس کے خادموں میں جھگڑا ہوا تھا، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اگرچہ حضرت زکریا نے وجہ ترجیح بیان کئے، مگر کسی نے ان کو قابل غور خیال نہ کیا۔ آخر فیصلہ اس پر آٹھرا کہ توراۃ لکھنے کے قلم ندی میں ڈالے جائیں جس کا قلم خلاف عادت اوپر کو آئے وہی کفیل مقرر ہو، حسن اتفاق سے یہ سعادت زکریا کے

نصیب میں تھی اور وہ بازی لے گئے۔

ان تمام واقعات کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو نہ تھی اور نہ یہ باتیں آپ کے سامنے ہوئی تھیں، بلکہ صرف وحی والہام کی بنا پر آپ کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ ان حالات کے بیان کرنے کی غرض یہ تھی کہ جو سلوک ہم نے ان جلیل القدر بزرگوں کے ساتھ روا رکھا ہے، جس طرح ہم نے ان کی ہر تکلیف میں نصرت و دستگیری کی ہے، زکریا کو وارث کی ضرورت تھی، اس کو یحییٰ دیا، مریم کے نشو و نما کے لئے روحانی اسباب فراہم کر دیئے اور اس کو تمام دنیا پر فضیلت دی، اسی طرح آپ کے ساتھ ہو گا، ہر وقت تمہاری مدد ہوگی، بہترین جانشین نوازش ہوں گے اور تمام کائنات ارضی و سماوی پر تمہیں برگزیدہ کیا جائے گا۔

مریم سے وعدہ ہائے خداوندی

إِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يٰرَبِّیُّمُ إِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُنِیْ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اَسْمُهُ الْاُنْثٰی وَجِیْهَتِیْ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ ۚ وَمِّنَ الْمُنْقَرِبِیْنَ ۝۱۰ وَیَكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۱

”جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تم کو اپنے ایک حکم کی خوش خبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا، جو دنیا اور آخرت میں معزز اور مقرب بندوں میں سے ہو گا اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور بڑا ہو کر باتیں کرے گا اور نیک بندوں میں ہو گا۔“

عمران کی بیوی نے جو دعا کی تھی اس کے لئے دراصل بیٹی کی ضرورت تھی، مگر اب وہی خدمت مریم کے صاحبزادے انجام دیں گے۔ یہ اس دعا کا اثر تھا جو انکی والدہ نے کی تھی کہ اسکو خداوند تعالیٰ نے بغیر شوہر کے ایک فرزند صالح عطا فرمایا۔ حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے تذکرہ سے مقصد یہ تھا کہ وہ واقعہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تمہید کا کام دے۔ زکریا کو اولاد ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں، بڑھاپے نے سر کو سفید کر دیا ہے اور عورت بھی بانجھ ہے۔ جب ان حالات کے ہوتے یحییٰ پیدا ہو سکتے ہیں تو یہ کونسی مشکل بات ہے کہ عیسیٰ بغیر باپ کے ہو جائیں۔ سورہ مریم میں یہی ترتیب موجود ہے اور وہاں بھی اسی مقصد کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

آگے چل کر آئے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم کے پیدا ہونے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے: ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم، جب نصاریٰ حضرت آدم کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا شدہ مان لینے کے باوجود ان کو خدا نہیں بناتے تو کوئی وجہ نہیں کہ صرف باپ نہ ہونے کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام تو خدائی کے درجہ پر پہنچ جائیں اور آدم وہی انسان کے انسان ہی رہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مسیح کا لقب بھی قرآن حکیم میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ مریضوں کو صرف چھو کر اچھا کر دیتے تھے۔

بہر حال فرشتوں نے مریم کو ایک صابزادے کی بشارت دی جس کا نام عیسیٰ ہو گا اور جس کے خصائص کبریٰ حسب ذیل ہوں گے:

(الف) وجیہانی الدنیا والاخرۃ: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کی ذات پر نہایت ہی ناپاک الزامات لگائے ہیں، یہاں تک کہ ان کی موت کو بھی وہ لعنتی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے اپنی حماقت و نادانی سے ان بے بنیاد باتوں کو تسلیم کر لیا جو یقیناً از سر تا پا غلط اور بعید از حقیقت ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ظاہر بین مورخ حضرت عیسیٰ کو ناکام نبی قرار دے، کیونکہ اس کی نظر مادیات کی حدود سے آگے تجاوز نہیں کرتی، لیکن جو شخص نور بصیرت سے حیات مسیح کا درس و مطالعہ کرے گا وہ یقیناً تسلیم کر لے گا کہ بیشک وہ کامیاب و باہر اد نبی تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں ایسے قریباً ستر آدمی خدا پر ایمان لانے والے پیدا کر دیئے، جنہوں نے خدا کی پادشاہت کے آنے کی مسرت اندوز بشارت مختلف بلاد و امصار میں پہنچادی۔ چنانچہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کا ظہور مقدس سر زمین حجاز میں ہوا تو عیسوی قانون کے اصول صحیحہ پر چلنے والے جس قدر نفوس قدسیہ اس وقت سطح ارضی پر موجود تھے فوراً دائرۃ اسلام میں داخل ہو گئے، جن کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے: اَفَرَبُّهُمْ مَّوَدَّةَ لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصْرِيْكَ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قَسِيْصِيْنَ وَرَهْبَانًا وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَبَّحُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرَآیْ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضٌ مِّنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَمَّا فَاكُنْ بِنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُوْفِّیْ بِاِلٰهِهِ وَمَا جَاۤءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۚ وَنَطْلُبُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (المائدہ ۸۲-۸۴) اور مسلمانوں کی محبت میں سب لوگوں سے زیادہ قریب ان کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور اس سبب سے کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے اور جب اس کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتارا گیا ہے تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے امنڈ آتی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہم کو ماننے والوں کے ساتھ لکھ لے اور ہم کو کیا ہوا کہ ہم اللہ اور حق بات پر ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس آئی اور توقع یہ رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک بختوں کی جماعت کے ساتھ داخل کرے گا۔

وجیہانی الدنیا والاخرۃ کے متعلق دو باتوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ یہودیوں اور ان تمام لوگوں پر رد ہے جو حضرت عیسیٰ کو ایک ناکام نبی بتاتے ہیں۔ دوسرے اس میں دراصل ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے کہ جس وقت مسلمانوں کی داخلی و خارجی زندگی نہایت ہی بری ہو جائے گی اور وہ ایک مصلح عظیم کے محتاج ہوں گے، جبکہ حضرت مہدی علیہ السلام کی تجدید و اصلاح میں مصروف ہوں گے، اس وقت کی امداد و اعانت کے لئے اس نفس قدسی کو دور باہ بھیجا جائے گا، تاکہ اگر وہ ایک طرف فرزند ان اسلام کے نشو و ارتقا میں امام مہدی کے ناصر و مددگار ہوں تو دوسری جانب قرآن حکیم کا اتباع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے امام الانبیاء ہونے کا ثبوت دیں۔

(ب) ویکلم الناس فی البہد وکھلا: سورہ مریم میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جھولے میں بولنا ثابت ہے، اس کی تفصیل خود قرآن نے اس طرح بیان کی ہے: یُرِیْمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یَا لَحْتَ هَؤُلَاءِ مَا کَانَ اَبَیْکَ اَمْرًا سُوًّا وَمَا کَانَ اَمْرًا بِغِیًّا ۝ فَاسْأَلْ اِلَیْهِ ۚ قَالُوا کَیْفَ نُنْکَلُ مِنْ کَانَ فِی الْبَہْدِ صَبِیًّا ۝ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ ۙ اِنِّیْ اَلْکُتِبَ وَجَعَلْنِیْ نَبِیًّا ۝ وَجَعَلْنِیْ مُبْرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۚ وَ اَوْصِنِیْ بِالصَّلٰوَةِ وَ الزَّکٰوَةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَ بَرًّا بِوَالِدِیْ ۚ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلَامُ عَلٰی یَوْمِ وُلِدْتُ وَ یَوْمِ اَمُوْتُ وَ یَوْمِ اُنْعَثُ حَیًّا ۝ (مریم ۳۳-۳۷) اے مریم! تم نے بڑا غضب کیا، اے ہارون کی بہن! تمہارا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی، پس مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگ کہنے لگے، ہم اس سے کیونکر بات کریں جو گود میں بچہ ہی ہے۔ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا اور جہاں کہیں بھی رہوں مجھ کو مبارک بنایا اور جب تک زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور مجھ کو اپنی ماں کا تابع اور بنایا اور مجھے سرکش بد بخت نہیں بنایا اور مجھ پر سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں انتقال کروں گا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

مریم شادی شدہ نہ تھیں، اس لئے ان کی قوم بچے کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔ وہ خود تو صوم سکوت سے تھیں اس لئے انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا: فَاِمَّا تَرِیْنَ مِنَ الْاَنْبِیَآءِ اَحَدًا ۙ فَقُلُوْا لَیْ ۤیٰۤیٰ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اَکَلَمَ الْیَوْمَ اَنْسِیًّا ۝ (مریم ۲۶) ”پھر اگر کسی آدمی کو دیکھو تو اشارہ سے کہہ دی جیو کہ میں نے رحمن کے لئے روزہ کی منت مان رکھی ہے۔ پس میں آج کسی آدمی سے بات نہ کروں گی“، مگر مریم سے لوگوں نے کہا کہ ایسے بچے سے ہم کیسے بات کریں جو ابھی جھولے ہی میں ہے۔

تدبر فی القرآن کے لئے سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ انسان ان معانی کو معلوم کرنے کی سعی و کوشش کرے جو رسول اکرم کے صحابہ کی اکثر جماعت نے سمجھا ہو، کیونکہ اتباع السواد الاعظم کے مطابق ہمیں قرآنی آیات کا وہی مفہوم معین کرنا پڑے گا جس کی طرف اکثر صحابہ گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک استاد کے اکثر شاگرد کسی مسئلہ میں خاص رائے رکھتے ہیں، لیکن صرف معدودے چند دوسری رائے ظاہر کرتے ہیں تو ارباب خرد کا یہی فیصلہ ہو گا کہ جو اکثر شاگردوں کی رائے ہے وہی ان کے استاد کا مذہب ہو گا۔ چنانچہ تکلم فی البہد کے متعلق جمہور صحابہ کا وہی مذہب ہے جو زباں زد خاص و عام ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت کلام کیا ہے جبکہ عام طور پر بچے نہیں بولتے۔ کیونکہ اگر ہر بچہ اس وقت بولا کہ اتنا تو مریم کے اس کی طرف اشارہ کرنے پر قوم برا فروخت ہو کر یہ نہ کہتی: کیف نکلم من کان فی البہد صبیبا۔ قرآن حکیم کے الفاظ سے تو صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بعد ہی یہ گفتگو ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت مریم اس بچے کی پیدائش کو ہیکل کے کاهنوں سے مخفی نہیں رکھ سکتی تھیں، کیونکہ وہ بھی اسی جگہ رہتے تھے۔ سالہا سال تک ولادت مسیح کا قصہ پردہ خفا میں رہے، ناقابل تسلیم ہے، ادھر حدیث کے الفاظ بباگ دہل بتا رہے

ہیں کہ خود حاصل شریعت کا اس بارے میں کیا مذہب ہے: ماتکم احدی صغرة الا عیسویٰ وصاحب جریج“ عیسیٰ اور صاحب جریج کے سوا کسی نے بھی صغریٰ میں کلام نہیں کیا۔“ ان دلائل کی بنا پر ہم یقیناً اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تکلم فی البہد کے متعلق مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کی دونوں جماعتوں کا جو مذہب ہے وہ حق اور صداقت سے دور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جھوٹے میں جو کچھ کلام کیا اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ حضرت مریم کی بریت و پاکدامنی کا اظہار ہو۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہودیوں کی تاریخ پر اعتماد کر کے دنیا آج تک مریم کو معاذ اللہ ایک فاحشہ عورت تصور کرتی۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے لئے کوئی شرف و عزیت نہیں ہے، بلکہ ان کی والدہ کی بزرگی اور طہارت کا اعلان ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے اپنی نبوت کے اصول اساسی بھی بیان کر دیئے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اس وقت ان پر عمل بھی کرتے تھے، جس طرح کہ ہر ایک نابالغ مسلمان لڑکے کو معلوم ہے کہ نماز فرض ہے، مگر جب اس کا وقت آئے گا تو وہ اس کو ادا کرے گا۔ اس لئے حضرت عیسیٰ کے کلمات طیبات صداقت پر مبنی ہیں، رہی یہ بات کہ نبوت چالیس سال کے بعد ملتی ہے تو اس کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی شرعی حجت نہیں۔ ان ہم الاخصصون اور جب تک کہ کوئی کھلی اور ناقابل تاویل دلیل ہمارے پاس نہ ہو اس کو ہم اپنے آئندہ دعاوی کے لئے بنیاد قرار نہیں دے سکتے۔

آیت مذکورۃ الصدر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ہوں گے، کیونکہ وہ برابر ابوالدتی فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے یحییٰ اپنے لئے برابر ابوالدیہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ان کے والد بھی تھے اگر حضرت عیسیٰ کے والد ہوتے تو اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ ان کا تذکرہ بھی ضرور کرتے۔

آیت زیر بحث میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مریم سے دو وعدے کئے گئے ہیں جن میں سے ایک کے پورا ہونے کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورہ مریم میں موجود ہے اور باوجودیکہ پورے چھ سو سال کے بعد رسول اللہ پر قرآن کا نزول ہوتا ہے، مگر اس میں دوسرے وعدہ کے ایفا کا کوئی تذکرہ نہیں آتا، اس لئے ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے اور جس کے آنے کی خوش خبری انہوں نے اپنی امت کو دی تھی، اس کی امامت و پیشوائی کی تصدیق میں تمام دنیا کے سامنے گویا ہوں گے اور اس طرح دوسرا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور یہی جمہور اہل اسلام کا مذہب ہے اس پر مفصل بحث آگے آئے گی، انشاء اللہ۔

(ج) ومن الصالحین: کسی شخص کو حق نہیں کہ ان کی تمام تر حیات میں سے ایک واقعہ بھی قابل اعتراض بتا سکے، بلکہ ان کا شمار اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں میں سے ہو گا۔ اس آیت نے بتا دیا کہ یہودیوں نے بغض وعداوت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی جو تاریخ مرتب کی ہے، وہ سر تا پا غلط اور اس لئے ہرگز قابل اعتماد نہیں ہے۔

عیسائی اس آیت سے ایک غلط استدلال کرتے ہیں۔ ہم تفصیل کے ساتھ گزشتہ اوراق میں بحث کر آئے ہیں، اس جگہ صرف ایک نکتہ بیان کرنا مقصود ہے۔ ان اللہ یشہک بکلمۃ منہ کے لفظ منہ سے وہ لوگ یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ اس میں

ضمیر کا راجع اللہ کی طرف ہوتا ہے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک جز ہیں۔ اگر یہ کج فہم ذرا دقت نظر سے کام لیتے تو ان پر ان کی غلطی منکشف ہو جاتی۔ سورہ ۵۵ جاہلیہ میں تمام کائنات ارضی و سماوی کے لئے بھی یہی منہ آیا ہے: وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجماعہ ۱۳) اس سے بھی زیادہ اس آیت کو سامنے لائے: وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر ۲۹) میں نے آدم میں اپنی روح پھونک دی، پس اگر منہ کی بنا پر ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ خدا کا جز بن سکتے ہیں تو زمین و آسمان کی ہر چیز اور آدم بھی اس کے مستحق ہیں جو حق ابن مریم کو دیا گیا ہے۔

## مریم کا تعجب

قَالَتْ رَبِّ اَتٰى بِكَوْنٍ وَلَدًا وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بِشَيْءٍ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۸ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰتِ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۱۹ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ

“مریم نے کہا اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو گا حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ فرمایا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، وہ جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو کہہ دیتا ہے ہو جا تو ہو جاتا ہے اور اللہ عیسیٰ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھائے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب رسول ہو گا۔“

دنیا کے عام دستور کے مطابق مرد و عورت کے اختلاط سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اسی بنا پر مریم نے تعجب ظاہر کیا کہ خاوند ہونے کے بغیر میرے یہاں کس طرح اولاد ہو سکتی ہے، خدا نے کہا کہ دنیا میں قانون تو وہی ہے، مگر ہم اس کے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ دراصل ہر چیز کی علت تامہ محض ارادۃ الہیہ ہے، تمہارے حق میں صرف اتنا ہو گا کہ تمام ان قوتوں کو تمہارے اندر جمع کر دیا جائے گا جو سلسلہ توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں اور اس طرح مریم کو اطمینان دلادیا گیا۔

جس وقت حضرت زکریا کو یحییٰ کی خوش خبری دی گئی تو انہوں نے بھی ازراہ تعجب یہی سوال کیا تھا: اِنِّیْ یٰکُوْنُ لِیْ غَلَامٌ۔ ایسے ہی جب حضرت ابراہیم کو ایک غلام علیم اور فرزند صالح کی مسرت اندوز بشارت دی گئی تو ان کی بیوی نے کہا: عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ۔ جواب ملا: كَذٰلِكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ (الذریٰ۲۹ تا ۳۰) بات یہ ہے کہ یہ لوگ سب کے سب کبر سنی کو پہنچ چکے تھے اور اس عمر میں عموماً اولاد نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں ولد صالح کی پیدائش یقیناً ماں باپ کے لئے ایک آیت مبینہ ہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تو اور بھی عظیم الشان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مریم اور اس کے صاحبزادے کو دنیا کے لئے زبردست نشانی بتایا گیا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بغیر باپ کے اولاد کا پیدا ہونا، قانون قدرت کے خلاف ہے، ان کے لئے صرف اتنا ہی جواب کافی ہے کہ پہلے آپ تمام قوانین ولادت کا احاطہ کر لیجئے، پھر اس سوال کی طرف توجہ ہو گی، ورنہ خطر القتاد۔ مریم کو جو لڑکا دیا جائے گا اس پر حسب ذیل نعمتیں نازل ہوں گی:



(۱) اللہ تعالیٰ اس کو کتاب حکمت توراۃ اور انجیل کا علم نوازش کرے گا۔

(۲) اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا جائے گا۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں۔ انجیل میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے: ”اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔“ (متی، ۲۲: ۵۱) متی میں ہے کہ جس وقت انہوں نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو انہیں خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت کی: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔“ (متی ۱۰: ۶) گویا آج جو کچھ دنیائے عیسائیت میں ہو رہا ہے وہ یکسر تعلیم عیسیٰ کے مخالف ہے۔

### عیسوی معجزات

اِنَّ قَدْ جِئْتَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ اَنْتُمْ اَخْلَقْتُمْ لَكُمْ مِنَ الطَّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَانْفُخْ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُتِرَى الْاَكْمَةُ وَالْاَكْبَرُصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدْخِرُوْنَ ۚ فِىْ يَوْمٍ تَكْتُمُ ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

”میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے کچھڑے پرند کی سی شکل بناتا ہوں، پھر اس کے اندر پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ اڑنے والا جانور ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں اگر تم مومن ہو تو یقیناً اس میں تمہارے لئے نشان ہے۔“

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چند معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جب ایک کامل بزرگ کسی کام کا پختہ ارادہ کر لے اور اتفاق سے وہاں اسباب موجود نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی آرزو پورا کرنے کے لئے تمام اسباب جمع کر دیتا ہے۔ ان معجزات میں حضرت عیسیٰ کی قوت ارادی اور فراست ایمانی کے نتائج و ثمرات بیان کئے گئے ہیں۔ عام طور پر انسان یہ خیال نہیں کر سکتا کہ مردہ چیز بھی زندہ ہو سکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند قدوس پر اعتماد و توکل کر کے کہتے ہیں کہ میں تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مٹی سے پرند بناتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس میں تمام اسباب حیات جمع کر دیتا ہے، اور وہ اڑنے لگتا ہے۔

(۲) مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اپنی توجہ سے اچھا کر دیتا ہوں۔

(۳) مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتا ہوں، یہ خوارق عادت امور میری طاقت میں نہیں ہیں، میں فقط ارادہ الہیہ کا مظہر ہوں۔ یہ معجزات دراصل تمثیلی رنگ میں پیشین گوئیاں تھیں، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ



اگرچہ بنی اسرائیل روحانی طور پر بالکل برباد ہو چکے ہیں اور ان کی ملکیت پر عالم ممات طاری ہو چکا ہے، لیکن اگر وہ عیسیٰ کے دست و بازو بن گئے تو وہی روحانی زندگی پھر عود کر آئے گی اور اسی قسم کے آثار و علامت ان سے بھی ظہور میں آئیں گے۔

اب قوت ارادی سے قطع نظر کر کے میری فراست ایمانی میں درس و فکر سے کام لو۔ جو کچھ تم کھا کر آؤ یا گھروں میں ذخیرہ رکھو، اس کو میں بتا سکتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے قدوس نے حضرت عیسیٰ پر ان کی قوم کی مادی زندگی کے تمام مراتب و درجات کو اس درجہ واضح اور روشن کر دیا تھا کہ وہ ان کے تمام مراحل صعود و ہبوط اور مدارج ارتقاء و تنزل کو معین فرما سکتے تھے۔ ان کی تمام وہ قوتیں جو اس وقت ان میں مصروف عمل تھیں، مسیح علیہ السلام پر مخفی نہ تھیں۔ آئندہ جہاں تک وہ ترقی کریں گے، ان کے اعمال و اخلاق کی جس حد تک انتہا ہوگی اور جس قدر نتائج و ثمرات ظہور پذیر ہوں گے، ان سب کو وہ اسی وقت بتا سکتے تھے، مگر یہودیوں نے ایسے پاک اور مزرکی انسان کی صحبت و ہم نشینی سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، حالانکہ ان کے اطمینان کے لئے یہ معجزات کافی تھے۔

### صراط مستقیم

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلِأَحْلَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حَرَّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا ۝ (۱۰) إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۱۱)

”اور تورات کی تصدیق کرتا ہوں جو میرے زمانہ میں موجود ہے اور تاکہ بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام ہیں تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب سے نشانی لایا ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، پس اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اس لئے تھی کہ توراۃ کی پیشین گوئیوں کی تصدیق ہو اور بنی اسرائیل کے لئے جو چیزیں عارضی اسباب کی بنا پر حرام ہو گئی تھیں ان کو حلال کر دیا جائے۔ ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے: کان الذی جاء به عیسو الین مباحا به موسی۔ ”جو احکام لوگوں کو حضرت عیسیٰ کی معرفت ملے وہ ان مسائل کے مقابلہ میں آسان و سہل تر تھے جن کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔“ مقتضیات وقت کی بنا پر یہودیوں کے لئے جن چیزوں کو حرام کیا گیا تھا اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ ان کے فسق و فجور اور بد عملی و بطالت پر ان میں تنبیہ و اعتبار پیدا ہو اور وہ آئندہ اپنی حالت درست کر لیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے: فَظَلَمَ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيْبَاتٍ لَّهُمْ وَبَصَدْنَاهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ وَآخَذْنَاهُمُ الزُّبُلَ وَقَدْ هُمُوعَانَةٌ وَآخَذْنَاهُمُ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (النساء ۱۶۰ تا ۱۶۱) ”الغرض یہود کی شرارتوں کی وجہ سے ہم نے ان پر بہتیری پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال تھیں اور نیز اس وجہ سے کہ بہتیروں کو وہ اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو اس کی ممانعت کر دی گئی تھی، اور نیز اس لئے کہ وہ لوگوں کا

مال ناحق کھاتے تھے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُلْفٍ ۖ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَبَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوْ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِبَغْيِهِمْ (الانعام ۱۴۶) ”اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربی ہم نے ان پر حرام کر دی تھی، جو ان کی پشت یا انتڑیوں میں لگی ہوئی یا ہڈیوں سے ملی ہوئی ہو، یہ ان کی شرارت پر ہم نے سزا دی تھی۔“

بہر حال ابن مریم کی نبوت یہودیوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے تھی، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ تم آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلے آؤ اور میری تعلیم تو بہت ہی مختصر ہے، جس کی تلخیص صرف دو لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے کہ صرف ایک خدا کی غلامی کرو، یہ اسی خدائے قدوس کی ذات پر اعتماد و توکل کا نتیجہ ہے کہ میرے تمام ارادے پورے ہو جاتے ہیں۔ پس اگر تم بھی اس امر کے آرزو مند ہو کہ اس قسم کے واقعات تم سے بھی ظاہر ہوں تو اس خدائے واحد کی ذات سے تمسک و اعتصام کرو اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

جب ہم انجیل کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کے اوراق بھی اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ انہوں نے صرف تو حید کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ چنانچہ متی میں ہے ”پھر ایلئس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری پادشاہتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان! دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔“ (متی ۱۴: ۸، ۹، ۱۰) مگر عیسائیوں نے اس سے انحراف و اجتناب کیا اور آج وہ دنیا کو تثلیث کی دعوت دے رہے ہیں۔

### من انصاری الی اللہ

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ ۖ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۚ قَالَ الْخَوَارِثُونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۖ إِمَّا بِاللَّهِ ۖ وَ أَشْهَدُ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۱۰﴾ رَبَّنَا إِمَّا بِنَا أَنْزَلْتَ وَ أَتَّبَعْنَا الرَّسُولَ ۖ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۱۱﴾

”پھر جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر محسوس کیا تو کہا کہ کون ہیں جو اللہ کی طرف ہو کر میری مدد کریں۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے رب! جو کچھ تو نے اتارا ہم اس پر ایمان لے آئے اور رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ۔“

جب حضرت مسیح نے دیکھا کہ یہودی میری بات کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ انکار کئے جارہے ہیں اور میرے قتل کے درپے ہیں، تو انہوں نے اپنے اتباع و مقلدین سے دریافت کیا کہ اس تعلیم صحیح کو قائم رکھنے کے لئے کون شخص میرا معاون و مددگار بننے کو تیار ہے؟ حواریوں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں اور عرض کیا کہ ہم ان تعلیمات صالحہ کو باقی رکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں، خداوند قدوس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہیں اور اس رسول کے اسوۂ حسنہ کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھیں گے۔

ہمیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے والے ہر جگہ کامیاب و بامراد رہیں گے، پس تو بھی ہمارے ساتھ وہی معاملہ کر جو تو انبیاء و رسل کے اعوان و انصار کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

## مکر کی تشریح

وَمَكْرُهُمْ وَالْمَكْرُ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْبَاطِلِينَ ﴿٣٠﴾

”اور انہوں نے تدبیر کی اور اللہ نے تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔“

افسوس ہے کہ بعض کوتاہ اندیش لوگوں نے اس قسم کی آیات پر بیجا اعتراض کئے ہیں اور پھر ان کے جواب میں لوگوں کو عجیب عجیب حیرانیاں پیش آئی ہیں، ہمیں دفاع کی خاطر دور از کار تاویل کی ضرورت نہیں، بلکہ ذرا غور کرنے سے خود ہی مطلب صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مکر کرنے والا یا تو ان قوانین الہیہ سے یک قلم ناواقف محض اور بے خبر ہوتا ہے، جن کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج و ثمرات ظہور پذیر ہوتے ہیں یا وہ کسی جوش غضب اور طیش میں آکر ان اصول و کلیات کو عمداً نظر انداز کر دیتا ہے اور ان جرائم کا ارتکاب شروع کر دیتا ہے جن کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کون شخص ہے جو چاہے کن راجاہ در پیش کی شہرہ آفاق حقیقت سے ناشنا ہے اور جس نے اس کو بکرمات و معجزات سنا اور سمجھا نہ ہو، مگر پھر بھی ہم روزمرہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض مکار لوگ ایک بے گناہ شخص کو اپنے دام فریب میں مبتلا کر کے ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا یہ دجل و فریب دراصل خود ان کی تباہی کا سامان فراہم کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ بیگناہ ان کے دام فریب میں گرفتار ہو وہ خود ہی عذاب الہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں دراصل اس جزائے اعمال کے قانون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات صالحہ کو فغا کرنے اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کی خفیہ تدبیریں کی ہیں، لیکن خدائے حق نواز کا فیصلہ اس کے خلاف ہے، اس لئے وہ تو ناکام و خاسر رہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ ان کے ضرر و نقصان سے بچائے جاتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس کی مزید تشریح و توضیح کے لئے کچھ اور آیات بھی پیش کر دیں کہ حقیقت اصل یہ سامنے آجائے۔

(۱) سورۃ انفال میں آتا ہے: **وَإِذْ يَبْغُوكَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْيَهُودَ أَوْ يَحْتَضِرُونَكَ أَوْ يَحْضِرُونَكَ** وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْبَاطِلِينَ ﴿٣٠﴾ (الانفال ۳۰) کفار مکہ رسول اللہ کو گرفتار، قتل یا جلاوطن کرنے کی خفیہ تدابیر میں مصروف ہیں، مگر وہ آپ کے غبار راہ کو بھی نہیں پاسکتے، ناکام و خاسر غار ثور سے گھروں کو واپس لوٹتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے اطمینان کے ساتھ مدینہ میں رونق افروز نظر آتے ہیں۔

(۲) سورۃ یوسف میں ہے: **وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْهَوْنَ** (یوسف ۱۰۲) برادران یوسف عزم مصمم کر کے آتے ہیں کہ یوسف کو مار ڈالیں گے، مگر باوجود اس کے وہ کامیاب نہیں ہوتے اور یوسف زندہ سلامت

رہتے ہیں۔

(۳) سورۃ نمل میں ہے: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٥﴾ قَالُوا تَغَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ﴿٦﴾ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يُشْعُرُونَ ﴿٧﴾ نمل ۵۰ تا ۵۸) اور اس شہر میں نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے، وہ کہنے لگے کہ باہم اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور رات کو صالح اور اس کے گھر والوں کو جاہاریں گے پھر ہم ان کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ان کے متعلقین کے ہلاک ہونے کے وقت ہم تو موجود ہی نہ تھے اور ہم بیشک سچے ہیں اور انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی فکر میں ہیں، مگر نتیجہ بالکل ان کے خلاف نکلتا ہے: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ﴿٨﴾ اِنَّا دَمَرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩﴾ فَبَلَكَ يَوْمَهُمْ تَخَاوِيَةً يُبَاسًا عَظِمُوا ﴿١٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ وَادْعِيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَكَانُوا يُقْسِمُونَ ﴿١٢﴾ نمل ۵۱ تا ۵۳) پس دیکھو ان کی خفیہ تدبیر کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔ سو ان کے ظلم کے سبب یہ ان کے گھر ڈھسے ہوئے پڑے ہیں بیشک اس میں جانے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے، اور جو ایمان لائے تھے اور ڈرتے تھے ان کو ہم نے بچا لیا۔

(۴) وَالَّذِيْنَ يَبْكُرُوْنَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿١٣﴾ وَ مَكْرٌ اُولٰٓئِكَ هُوَ يُنَوَّرُ ﴿فاطر ۱۰﴾ اور جو لوگ بڑی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، اور ان کا مکر ہی نابود ہو گا۔

(۵) اسی سورت میں آگے چل کر آتا ہے: وَلَا يَحِثُّ الْبُكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهِ ﴿فاطر ۴۳﴾ اور بری تدبیر کا وبال بری تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔

(۶) قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَئِنْ اَللّٰهُ بُنِيَآئِهِمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ الشَّقَقُ مِنْ قُوَّتِهِمْ وَاَنَّهُمْ لَالْعَذَابِ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿النحل ۲۶﴾ ان کے اگلے لوگ مکر کر چکے ہیں پس ان کی عمارت پر بنیادوں کی جانب سے اللہ کا حکم آیا پھر ان کے اوپر سے ان پر چھت گر پڑی اور ان پر ایسی جانب سے عذاب آیا کہ ان کو خبر بھی نہ تھی۔

یہ تمام آیات تمہارے سامنے ہیں ان کو پڑھو اور بار بار پڑھو، ان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جو لوگ انبیاء و رسل کی مخالفت کرتے ہیں، ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور ارباب حق و صدق کی تباہی و بربادی کے منصوبے سوچتے ہیں وہ خود ہی بمصدق چاہ کن راجاہ درپیش ورطہ ہلاکت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہودیوں نے خدا کے ایک برگزیدہ انسان کو قتل کرنے کی کوشش کی، مگر خدا نے ان کو ہمیشہ کے لئے دوسروں کا غلام و محکوم بنادیا اور ان پر غیروں کی بندگی کی لعنت نازل کر دی۔ اسی طرح جس قوم اور فرد نے راہ حق سے انحراف کیا ہے، دوسروں کو منحرف ہونے کی ترغیب دی ہے اور دعاۃ حق و صدق کی کوششوں کو کچلنے کی ٹھان لی ہے، تو انجام کار وہی ناکام و خاسر رہے ہیں۔ الا ان حزب الشیطن هم الخسارون۔

## وعدہ ہائے خداوندی

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُحْيِيَ إِبْرَاهِيمَ مَتَوَفِّيكَ وَرَافِعَكَ إِلَىٰ مَوْطِئِكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

”جس وقت اللہ نے کہا اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور تم کو اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور جو کافر ہیں ان سے تجھ کو پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے ان کو ان پر جنہوں نے تیرا انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں، پھر میری ہی جانب تم کو لوٹنا ہے پھر میں ان باتوں میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔“

اس تدبیر کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت عیسیٰ کو یہ خیال ہوا کہ ان بد بختوں کی سعی و کوشش کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ میری تعلیم کا نام و نشان مٹ جائے گا اور اللہ کا نام لینے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ غزوہ بدر کے موقع پر اسی قسم کا خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا تھا۔

لیکن ہم نے عیسیٰ کو اطمینان دلایا کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، اس وقت یہ لوگ نہ تمہیں گرفتار کر سکتے ہیں اور نہ تم پر کسی قسم کا غلبہ حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ ہم تمہیں وقت موعود پر طبعی موت سے ماریں گے۔ اسی حفاظت کو دوسری جگہ اظہار نعمت کے طور پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَ إِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَنْكَ (المائدہ ۱۱۰) ”جب بنی اسرائیل کو میں نے تم سے روک دیا“ اور روایات یہود کے مطابق ہم حضرت عیسیٰ کا گرفتار ہونا تسلیم کر لیں تو یہ آیت غلط ٹھہرتی ہے اور باز رکھنے کا وہ مفہوم باقی نہیں رہتا جو اس کا اصلی مطلب ہے۔ اسی قسم کی آیت ایک اور جگہ بھی آتی ہے: وَ اذْكُرْ مَا نَعَمْتَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (المائدہ ۱۱) ”اللہ کا وہ انعام یاد کرو جو تم پر ہوا جب بعض لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں تو اس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔“

رسول اللہ اور چند صحابہ دیت وصول کرنے کی غرض سے بنو نضیر کے پاس جاتے ہیں، وہ لوگ آپ کو وہاں بٹھا کر اس لئے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چکی کا پات اوپر سے گر کر آپ کو شہید کر دیں، مگر آپ کو ان کے خدع و فریب کی اطلاع مل جاتی ہے۔ اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں اور ان کی تمام تدبیریں اکارت جاتی ہیں۔ پس اس آیت کو پیش نظر رکھ کر ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالفین اپنی حیلہ سازیوں میں بالکل ناکام و خاسر رہے ہیں۔

رجوع الی المقصود

آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے چار وعدے کئے ہیں، اسی ترتیب سے ہم ان کی ضروری تشریح کرتے ہیں:

(الف) انی متوفیک: ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ کے سخت ترین دشمن بن گئے تھے۔ سب کے سب اسی فکر میں تھے کہ انہیں مار ڈالیں۔ چنانچہ عید الفطر کے روز وہ انہیں پلاطوس، والی شام کے پاس لے گئے اور اس کی عدالت میں ان پر حسب ذیل الزامات لگائے:

(۱) یہ اپنے آپ کو مسیح پادشاہ کہتا ہے، لوگوں کو قیصر کا محصول ادا کرنے سے روکتا ہے اور حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم پھیلاتا ہے۔

(۲) یہ کافر ہے اس لئے کہ یہ ملت اسرائیل کی سخت توہین و تذلیل کرتا ہے اور اپنے آپ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہتا ہے۔

پہلے الزام کے متعلق حضرت عیسیٰ کا جواب یہ تھا کہ دنیا میں انبیاء و رسل اصلاح انسانیت کے لئے آتے ہیں نہ کہ افساد فی الارض کے لئے، میں بغاوت نہیں پھیلاتا بلکہ اصلاح کا بیج بوری ہوں۔ دوسرے جرم کی بابت وہ یہ کہتے تھے کہ دراصل تم خود شریعت اسرائیل کو ترک کر چکے ہو۔ اب تمہارے اکاذیب و باطل ہیں جنہوں نے مذہب کا نام اختیار کر لیا ہے۔ پس میں آیا ہوں کہ تم کو اصل تورات کی طرف لے آؤں، مگر یہودیوں نے ان کی کسی بات کو بھی تسلیم نہ کیا اور حاکم شہر کو مجبور کیا کہ وہ ان کی موت کا فتویٰ صادر کرے۔

## توفی کی تحقیق

لغت میں توفی کے معنی اخذ الشی وافیاً تاماً کے آتے ہیں یعنی کسی چیز کا پورا پورا لیتا۔ مردہ اپنی زندگی کا پورا حصہ پالیتا ہے، اس لئے اس کو بھی متوفی کہتے ہیں: **اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنفُسَ حَيْنَ مَوْتِهَا (الزمر ۴۲)** ”اللہ جانوں کو ان کے مرتے وقت قبض فرمالتا ہے“، دوسری جگہ آتا ہے: **قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ (السجده ۱۱)** ”کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر مقرر ہے تمہاری جان قبض کرے گا“۔ بعض لوگ قرآن نہ جاننے کی وجہ سے بیان کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں جس جگہ توفی کا لفظ ذی روح کے لئے استعمال ہوا ہے اور اللہ اس کا فاعل ہے تو اس کے معنی قبض روح کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے، اس قاعدہ کی غلطی واضح کرنے کے لئے صرف ایک آیت پیش کر دینا کافی ہے: **وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ (الانعام ۶۰)** ”اور وہی ہے جو رات کو تمہیں سلا دیتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کر چکے ہو“۔

قرآن نے تمام اختلافات کو دور کرنے کے لئے آل عمران کی ابتدا میں ایک قاعدہ معین کر دیا ہے اور وہ یہی ہے کہ مشابہات کو محکمات پر عرض کیا جائے۔ اسی قاعدہ کے مطابق اب ہم حضرت عیسیٰ کی وفات و حیات کے متعلق قرآن کی آیات میں درس و فکر کرتے ہیں، تو سب سے پہلے سورہ نساء ہمارے سامنے آتی ہے، جس میں دو باتوں کا فیصلہ کیا گیا ہے: **وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ (النساء ۱۵)** یہودیوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل ہی کیا اور نہ ہی صلیب دیا۔ ان محکمات کو تسلیم کرنے کے بعد ان وعدوں کو یاد کیجئے جو گزشتہ آیات میں مریم سے کئے گئے ہیں: **يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي النَّهْدِ وَكَهَلًا (مریم ۴۶)** ان دو میں

سے صرف ایک کے ایفاء کا تذکرہ سورہ مریم میں آتا ہے: اِنِّیْ عِبْدُ اللّٰهِ ﷻ اِنِّیْ اَلْکِیْبُ (مریم ۳۰) مگر دوسرے وعدہ کے متعلق قرآن بالکل خاموشی اختیار کرتا ہے، جس سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نزول قرآن تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا تھا۔ تمام قرآن کو دیکھ جاؤ کسی نبی کے ساتھ یہ دو وعدے نہیں کئے گئے اور نہ خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ عیسوی خصوصیات ہیں جو اور پیغمبروں میں موجود نہ تھیں۔

ان امور کی بنا پر متوفیک کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کرنے والا ہوں۔ صاحب کشف فرماتے ہیں: متوفی اجلک ومعناه انی عاصمک من ان یقتلک الکفار وموخر اجلک الی اجل کتبتہ لک ومیبتک حتف انک لا قتلا باید یهم، تمہیں کفار سے محفوظ کر کے اس وقت تک زندہ رکھوں گا جب تک تمہاری طبعی موت کا وقت نہ آجائے اور میں تم پر طبعی موت طاری کروں گا اور کفار کے ہاتھوں تم قتل نہ ہو گے۔ آیات کی نظم و ترتیب بتاتی ہے کہ ان وعدوں کی غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و کرامت کا اظہار ہے۔ اگر متوفیک کے معنی وہ نہ لئے جائیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں تو ان کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ علامہ زمخشری ہی کا مطلب درست اور اقرب الی الصواب ہے اور بخاری نے جو ابن عباس سے اس کے معنی میبتک نقل کئے ہیں تو وہ بھی اس کے منافی نہیں بلکہ بصریغہ اسم فاعل ہونے کی وجہ سے عین مطابق ہیں۔

### رافعک الی

(ب) رافعک الی: اور تمہیں اپنے پاس بلانے والا ہوں۔ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لئے ہوا کرتی ہے، مگر قرآن حکیم کی حسب ذیل آیات اس قاعدہ کلیہ کو توڑتی ہیں: وَاسْتَبِقُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ ۱۹۶) حالانکہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر سب سے پہلے عمرہ کے ارکان ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وَخُذُوهُمْ وَاحْضَرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ (التوبہ ۵) ظاہر ہے کہ پہلے پکڑنا اور پھر قتل کرنا ہو گا۔ ایک اور آیت بھی سامنے رکھ لیجئے: وَادْعِنَا اِلَی الْاِبْرٰهٖمَ وَاسْمٰعِیْلَ وَاسْحٰقَ وَیَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَالْیُوْسُفَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ؕ وَادْعِنَا دَاوُدَ دَبُّوْا (النساء ۱۶۳) پس ان تمام تصریحات سے واضح ہو گیا کہ واؤ کا ترتیب کے لئے ہونا ضروری نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومت نے حضرت عیسیٰ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، ان کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے وہ کسی دوسری قوم کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے اور یہ لوگ سب کے سب دشمن بن گئے ہیں۔ اب اگر وہ مصلوب ہو جائیں تو، یکلم الناس فی البہد وکھلا کا دوسرا وعدہ پورا نہیں ہو سکتا۔ پس اس کے پورا کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ فی الحال ان کو مخالفین کے خدع و فریب سے بچالیا جائے۔ یہ تم جانتے ہو کہ ان کی پیدائش عام قاعدہ کے خلاف ہوئی ہے: فَارْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَمْتَشَلْ لَهَا بِشَرًّا سَوِيًّا (مریم ۱۹) ”تو ہم نے ان کی جانب اپنی روح کو بھیجا تو وہ ان کے آگے پورا آدمی بن آیا“، اس روحانیت کا اثر ان کی جسمانی قوتوں پر پہلے ہی سے غالب تھا۔



اب جبکہ مخالفین ان کے قتل پر تلے ہوئے ہیں، تو وہ یکسر روحانیت بن جاتے ہیں اور عالم مثال کی قوتیں ان کو اوپر اٹھا لیتی ہیں اور یوں ہجرت الی اللہ و ترک وطن کی مقدس منزل بھی طے ہو جاتی ہے۔

باقی رہیں وہ احادیث جن سے بعض لوگوں نے تمسک کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی وفات ہو گئی ہے تو وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں، اس لئے کہ محدثین نے قاطبہ ان کے غلط اور موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے۔

تیسرا وعدہ

(ج) ومطهرک من الذین کفروا: یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ تجھے سولی پر لٹکا کر لعنتی موت ماریں، مگر میں تجھے ان سے بچا لوں گا اور اس لعنتی موت سے محفوظ رکھوں گا۔ ربی وہ تاریخ جو انہوں نے تمہاری پیدائش اور تمہارے مشن کے متعلق مرتب کی ہے اور جس کو غلطی سے عیسائیوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے، اس سے بھی میں تمہیں پاک کروں گا۔ تمہارے بعد ایک اور نبی آئے گا جو تمہاری تطہیر اور پاکیزگی بیان کرے گا، یعنی رسول اللہ ﷺ جنہوں نے قرآن حکیم کے ذریعہ تمام حقائق مستورہ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں ہے: ”لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا، تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔“ (یوحنا ۱۴، ۱۶: ۱۳)

فضیلت و برتری

(د) وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیمة: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کا صاف صاف انکار کر دیا، اس لئے وہ کافر ہیں اور اس آیت میں یہی لوگ مراد ہیں۔ ابن مریم کو قبول کرنے والے مسلمان اور عیسائی ہیں۔ اگرچہ مسلمان تو حقیقتاً عیسیٰ کو نبی اللہ مانتے ہیں اور عیسائی صرف ظواہر کے پجاری ہیں، مگر اتباع کا اطلاق دونوں پر ہو گا، اس لئے قیامت تک یہ دونوں گروہ بنی اسرائیل پر غالب رہیں گے۔

دو قسمیں

اگرچہ قرآن حکیم نے نبوت کے اشتراک عام کی وجہ سے سب انبیائے کرام کو نبی کہا ہے، مگر پھر بھی ان کی بعض خصوصیات کی بنا پر ان کو دو سلسلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) ایک سلسلہ تو انبیائے موسسین کا ہے جو اپنی دعوت سے جدید قومیتوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

(ب) دوسرے انبیائے مجددین ہیں جو مذہب سابق کی اصلاح و تجدید کے لئے آتے ہیں۔

انبیائے موسسین میں ان رسل عظام کی جلیل القدر ہستیاں ممتاز نظر آتی ہیں:

(۱) حضرت نوح علیہ السلام: ان کو دشمنوں نے ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود ہی برباد ہو گئے: فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَّعَهُ



- فِي الْفُلِّ الْمَشْجُونِ (اشعر آء ۱۱۹) پس ہم نے نوح اور اس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔
- (۲) حضرت ابراہیم: ان کو آگ میں ڈالا گیا مگر اللہ نے ان کو بچالیا: قُلْنَا إِنَّا لُكُنْهِ بِرَدَا وَ سَلَّمَا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (الانبیاء ۶۹) ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔
- (۳) حضرت موسیٰ: فرعون باوجود اپنی پوری کوشش کے ان کو قتل نہ کر سکا۔
- (۴) حضرت عیسیٰ: ان کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کی تجدید کرتے ہیں اور اگر یہ ان کی عدم قابلیت کی وجہ سے ممکن نہیں تو پھر ان کو ہمیشہ کے لئے نبوت سے محروم کرنے کو تیار ہیں۔ وہ آئندہ آسمانی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب بنی اسمعیل میں سے رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہو گا: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصافات ۶) تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد ایک رسول کے آنے کی خوش خبری دیتا ہوں جس کا نام احمد ہو گا۔
- (۵) رسول اللہ ﷺ کو کفار کہہ اور یہود مدینہ نے شہید کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور نہ ہی مصلوب ہوئے، بلکہ اپنی طبعی موت مر گئے۔ اس موقع پر ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے جس میں اکثر احمدی حضرات مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ دماقتلوہ و ما صلبوہ والی آیت کو آیت زیر بحث کی تفسیر بنا کر غلط بحث کر دیتے ہیں، حالانکہ وہاں نفی موت کے بعد رفع کا ذکر ہے جو ظاہر ہے کہ رفع جسمانی ہونا چاہئے اور آیت انی متوفیک و ادفعک الی میں رفع بصیغہ اسم فاعل یعنی زمانہ استقبال میں بیان کیا گیا ہے۔ پس دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور یہ دونوں آیتیں مل کر تفسیر ہوں گی اس آیت مبارکہ کی جس میں حضرت عیسیٰ کے متعلق وجیہانی الدینا والاخرۃ آیا ہے فافہم۔

### کامیابی کا عہد

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأَعْدِدْ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَأْوَاهُمْ مِنَ النَّارِ ۚ وَمَا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۚ ذَٰلِكَ تَشْلُوكُمْ عَلَيْكُمْ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝

”سو جن لوگوں نے انکار کیا ان کو میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہو گا اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے تو ان کے اجر ان کو پورے دے گا اور اللہ عالموں سے محبت نہیں کرتا، یہ آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں۔“

یہودیوں کی موجودہ حالت اللہ تعالیٰ کے کلام کی پوری پوری تصدیق ہے، اگرچہ بعض ان میں سے کروڑوں کے مالک ہیں، مگر عموماً یورپ و امریکہ میں در بدر پھرتے ہیں، ذلت و رسوائی اور خصوصاً بد اخلاقی ان کے سر پر سوار ہے۔ یہی دنیا کا عذاب ہے۔ البتہ جو لوگ حضرت عیسیٰ کو تسلیم کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

(الف) مسلمان: کہ وہی الذین امنوا وعملوا الصلحت کے مصداق حقیقی ہیں۔ علم صحیح کے حامل، ایمان باللہ رکھنے والے اور اعمال صالحہ کرنے والے، ان کو بہترین جزا ملے گی اور وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

(ب) نصاریٰ: یہ ظالم ہیں، کیونکہ انہوں نے الوہیت مسیح اور کفارہ کے غلط عقائد بنا کر اللہ کے ساتھ عبد اللہ کو شریک کر دیا اور نہ صرف ایمان باللہ کو خراب کیا بلکہ عمل صالح بھی ترک کر بیٹھے، یہ گودنیا میں کامیاب ہوں، مگر انجام کار ناکام و خاسر رہیں گے۔

یہ گزشتہ شریعتوں کے واقعات و حوادث ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے تھی کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ حقیقی کامیابی فقط قانون الہی کے اتباع ہی سے ہوا کرتی ہے اور یہ کہ ان دلائل و براہین اور بصائر و حکم کے درس و مطالعہ سے تم پر یہ واضح ہو جائے کہ عبد اللہ کبھی بھی ابن اللہ نہیں بن سکتا۔ کفارہ کا عقیدہ اگر صحیح ہو جائے تو احساس ذمہ داری جو تمام دینی و دنیاوی ترقی کا باعث اصلی ہے، فنا ہو جائے۔

### ابن اللہ کا ابطال

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٥٨﴾ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنَ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٥٩﴾

”یشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اسے مٹی سے بنایا پھر اسے کہا ہو بس وہ ہو جاتا ہے، حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔“  
آدم علیہ السلام کی حیثیت قرآن حکیم میں دو طریق پر بیان کی گئی ہے:

(الف) وہ ابو البشر ہیں: اس لئے بشریت کے تمام لوازمات و خصوصیات ان میں موجود ہیں، ان کی پیدائش، طفولیت، بھوک اور پیاس وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کو الوہیت سے بالکل ممتاز کر دیتی ہیں خلقہ من تراب ثم قال لہکن فیکون اور اس کی اولاد پر تو اس سے بھی زیادہ تغیرات آتے ہیں: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ﴿٥٨﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَفْثَةً فِي فَمِّ رَاقٍ مَكِينٍ ﴿٥٩﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا فَكَسَوْنَا الْعِظَ لَحْمًا ﴿٦٠﴾ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿٦١﴾ (المؤمنون ۱۲ تا ۱۴) اور مٹی کے خلاصہ سے ہم نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو محفوظ جگہ ہم نے نطفہ بنا کر رکھا پھر ہم نے نطفہ کو لو تھڑا بنایا، پھر ہم نے لو تھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا پھر ہڈیوں کو گوشت پہنا دیا پھر اس کو دوسری مخلوق بنا دیا۔ پس سب سے بہتر بنانے والا اللہ بڑا برکت ہے۔

(ب) وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں میں سے ہیں۔ ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوح و آل ابراہیم و آل عمران علی العلین۔ اب آپ ابن مریم کو لیجئے ان میں بھی جملہ لوازمات بشری پائے جاتے ہیں، پھر وہ خدا کیسے بن سکتے ہیں۔ عیسائی حضرت آدم کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا شدہ مان کر بھی ان کو خدا نہیں کہتے پھر مسیح علیہ السلام کس طرح الوہیت کے مستحق

ہو گئے۔ کرخی کہتا ہے: ہومن تشبیہ الغریب بالاغرب لیكون اقطع للخصم و اوقع فی النفس ”یہ غریب کی اغرب کے ساتھ تشبہ و تمثیل ہے جس سے مخالف کی حجت بالکل ناکام ہو جاتی ہے اور نفس انسانی اس کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی، ان کا مقصد حیات، ان کی کامیابی کی ابتدا و انتہاء، ان کی تعلیم اور اس کے ثمرات و نتائج یہی ہیں جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اور ان میں ذرہ برابر بھی شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں۔

## مباہلہ کی دعوت

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ آبْنَاءَنَا وَابْنَاتَنَا وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ  
وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ۖ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾

”پھر اگر اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم آچکا اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے تو کہہ دو آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو بلائیں پھر سب گڑ گڑا کر دعا مانگیں پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“

دانشمند شخص کے لئے دلائل کافی ہوتے ہیں، مگر جب عیسائیوں نے ان کے آگے بھی سر تسلیم خم نہ کیا اور صحیح تعلیم کی برابر مخالفت کرتے رہے، تو اب ان پر اتمام حجت کرنے کی غرض سے انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی کہ دعا کے ذریعہ اس کا فیصلہ کیا جائے جس کی قبولیت کے خود عیسائی بھی قائل ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص اپنی تعلیم کو صحیح خیال کرتا ہے، اس میں اتنی ہمت تو ہونی چاہئے کہ وہ قدوس حق نواز سے جھوٹے کی ہلاکت کا سوال کرے۔ رسول اللہ نے وفد نجران کے سامنے مباہلہ کی دعوت کو پیش کیا مگر انہوں نے میدان میں آنے سے گریز کیا۔ بخاری میں آتا ہے۔

جاء العاقب والسيد صاحبانجران الى رسول الله ﷺ يريدان ان يلاعنا، قال فقال احد هما لصاحبه  
لا تفعل فوالله لئن كان نبيا فلا عناة لا تصدح نحن ولا عقبنا من بعدنا، قالانا نعطيك ما سألتنا وابعث  
معنا رجلا امينا ولا تبعث معنا الا امينا۔

”نجران کے سردار عاقب اور سید صاحبانجران نے رسول اللہ کی خدمت میں ایک دوسرے پر لعنت کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے، مگر ان میں سے ایک نے کہا ایسا نہ کرو، اس لئے کہ اگر وہ نبی ہو تو نہ صرف ہم برباد ہوں گے بلکہ ہماری نسلیں بھی تباہ ہو جائیں گی۔ اس پر ان لوگوں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ ہم سے طلب فرمائیں ہم اسے ادا کرنے کو تیار ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کسی امانت دار آدمی کو روانہ کر دیجئے۔“

گویا یہ لوگ نہ دلائل کے آگے خمیدہ گردن ہوئے اور نہ ہی دعا کے واسطے تیار ہوئے۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ النِّقْصُ الْحَقُّ ۖ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمُ  
بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

”بیشک یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں اور بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے، پس اگر وہ بھاگ

کھڑے ہوں تو اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔“

صحیح تعلیم یہی ہے جس کو آپ پیش کر رہے ہیں کہ زمین و آسمان میں کام کرنے والا فقط اللہ ہی ہے، اگر عیسائی اپنے فاسد عقیدہ سے باز نہ آئیں تو وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔

## توحید خالص

قرآن حکیم نے اب مناظرے کا وہ روشن ترین اصول بیان کیا ہے جس سے کوئی سلیم الفطرت آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی انکار نہیں کر سکتا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶﴾

”کہہ دو اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب بنائے، پس اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔“

دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی اگر چھان بین کی جائے تو معلوم ہو گا کہ سب کے سب توحید پر متفق ہیں۔ سورہ ہود کو دیکھئے ہر ایک نبی کی تعلیم کی اساس و بنیاد یہی توحید بیان کی گئی ہے۔ نوح علیہ السلام فرماتے ہیں: لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ الْيَوْمِ (ہود ۲۱) ہود کی یہی دعوت ہے: يَقُومِرْ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ إِنَّكُمْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ (ہود ۵۰) صالح علیہ السلام کو دیکھئے: يَقُومِرْ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (ہود ۶۴) شعیب علیہ السلام کی یہی پکار تھی: يَقُومِرْ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (ہود ۸۴) اے قوم! اللہ کی پرستش کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ پھر اسی سورت کے آخر میں فرمایا: وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدُوْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود ۱۲۳) اور اللہ ہی زمین و آسمان کے غیب سے واقف ہے۔ ہر کام کا رجوع اسی کی طرف ہو گا۔ پس اسی کی پرستش کرو اور اسی پر اعتماد کرو۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا يُسَبِّحُ اِلَيْهِ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۵) جتنے رسول بھی ہم نے تم سے قبل روانہ کئے ان میں سے ہر ایک کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتِ (النحل ۳۸) ہم نے ہر امت میں اسی تعلیم کے ساتھ رسول بھیجے کہ اللہ کی پرستش کرو اور طاغوت سے بچو۔

یہ قرآن کی تصریحات ہیں جو اپنے مقصد کو باعلیٰ نداء ظاہر کر رہی ہیں، لیکن اگر تم دنیا کے مذاہب مختلفہ کی تحقیقات کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ توحید کے متعلق تمام دنیا کے مدعیان مذاہب بالکل متحد ہیں، اس لئے قرآن کی محبت نہایت ہی قوی ہے۔

اب تک ان لوگوں کا تذکرہ تھا جن کے پاس رسول آئے اور ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی کچھ نہ کچھ تعلیم موجود ہے، لیکن اگر تم مشرکین اور بت پرستوں کو دیکھو گے تو وہ بھی اصل توحید سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اگر اصنام و طواغیت کو پوجتے ہیں تو یہ بھی ساتھ ہی کہہ دیتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر ۳) اور هُوَ لَا يَشْفَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ، اللَّهُ كَسَرَهُمْ يَدَهُمْ وَشَرَّ بَنِي إِسْرَءِيلَ مَا يَشْكُرُونَ (مائدہ ۱۷)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں باوجود اختلاف عقائد و اعمال اور مذاہب و مشارب، اس امر کو ضرور تسلیم کرتی ہیں کہ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ یقین کیجئے کہ اگر تمام اہل کتاب اور دوسرے ادیان اس بنیادی اصول کو مرکزی نقطہ تسلیم کر لیں تو سب جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ اسی کی طرف قرآن ان سب کو بلاتا ہے اور یہی ایک چیز ہے جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لاسکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہر قل اور مقوقس کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اسی توحید خالص کی جانب ان کو دعوت دی ہے۔ بخاری میں ہے:

من محمد عبد الله ورسوله الى هرقل عظيم الروم سلام على من اتبع الهدى اما بعد فاني ادعوك بدعاية الاسلام اسلم تسلم، يوتك الله اجرک مرتين فان توليت فان عليك اثم الارسين ويا اهل الكتب تعالو الى كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله۔

”اے والی روم: اس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کا اتباع کرے۔ میں تمہیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرو کہ اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔ اور اللہ اس کا تم کو دو گنا ثواب دے گا، لیکن انکار کرنے پر تمام قوم کا عذاب بھی تمہیں پر نازل ہو گا۔ اے اہل کتاب توحید خالص کو مان لو جو ہم میں تم میں ایک امر مشترک ہے۔“

یہ کتاب و سنت کی تصریحات ہیں جن سے واضح ہو گیا کہ اگر مجوسی خیر و شر کے دو جداگانہ خدا تسلیم کرتے ہیں، عیسائی اب، ابن اور روح القدس کو درجہ ربوبیت دیتے ہیں، یہودی عزیر علیہ السلام کو عبد اللہ سے ابن اللہ بناتے ہیں اور آریہ روح، مادہ اور دوسری چیزوں کو قدیم مانتے ہیں، تو یہ ان کی اپنی اختراعات ہیں، ورنہ کسی مذہب کی اصل کتاب میں توحید کے سوا کوئی دوسری تعلیم نہیں دی گئی۔

اس آیت میں شرک کی ہر صورت کو حرام و ناجائز قرار دیا گیا ہے:

شرك في العبادت۔ اللہ کے سوا اور کسی چیز کے آگے اپنا سر نیاز نہ جھکائیں اور نہ اس سے دعا کے طالب ہوں، خواہ وہ عظیم و جلیل مظاہر قدرت ہوں اور خواہ وہ فرشتے اور پیغمبر ہوں، الا نعبد الا الله سے یہی مراد ہے۔

شرك في الصفات۔ اللہ کی صفات میں دوسروں کو شریک نہ کریں، کفار و مشرکین عرب اپنے بزرگوں اور بتوں میں بعض صفات الہیہ تسلیم کرتے تھے۔ انہیں کے نقش قدم پر چل کر آج کل بعض صوفی اپنے پیروں کی نسبت اسی قسم کا باطل عقیدہ رکھتے ہیں۔ لاشرک بہ شیئاً کا یہی مطلب ہے۔

شرک فی الاطاعت۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے سورہ توبہ کی آیت اتخذوا احبارہم ودرہبانہم اربابا من دون اللہ، تلاوت فرمائی تو عدی بن حاتم نے عرض کیا: لم یکنوا یعبدونہم، وہ ان کو نہیں پوجتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ایس یحرمون ما احل اللہ فیہ، مونہ ویحلون ما حرم اللہ فیستملونہ، ان لوگوں نے اپنے عالموں اور پیروں کو یہ درجہ دے رکھا تھا کہ جس چیز کو وہ حرام کہہ دیتے اس کو عوام الناس بھی حقیقتاً حرام سمجھنے لگتے، حالانکہ یہ درجہ کتاب الہی کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض مسلمانوں میں بھی اسی قسم کی خرابی آگئی ہے کہ وہ بعض اوقات ائمہ کرام کے استنباط و استخراج کو کتاب و سنت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ امام الائمہ حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اذا قلت قولا و کتاب اللہ یخالفہ اترکو اقول بکتاب اللہ فقیل اذا کان خبر رسول اللہ ﷺ یتخالفہ قال اترکو اقول بخبر رسول اللہ ﷺ۔ ”اگر میں کوئی مسئلہ کتاب اللہ کے مخالف بیان کروں تو میرے قول کو ترک کر کے کتاب اللہ پر عمل کرو، بعض لوگوں نے پوچھا کہ اگر وہ سنت رسول کے مخالف ہو تو، جواب دیا کہ سنت کی خاطر میرا قول ترک کر دو۔“

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

لا تقلدنی ولا تقلدن مالک ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرہم۔ ”نہ تو تم میری تقلید کرو اور نہ مالک، اوزاعی وغیرہ کی تقلید میں مبتلا ہو۔“ امام شافعی کا ارشاد ہے: اذا صح الحدیث فهو مذہبی، ”جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔“ مگر باوجود ان ناقابل تاویل الفاظ کے پھر بھی اندھی تقلید کی زنجیروں نے ان کے پاؤں کو بو جھل کر رکھا ہے: اعاذنا اللہ من الحور بعد الکوز، واتباع الهوی، واعجاب کل ذی رأی برأیہ۔

سینہ بسینہ تعلیم

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَحَاجُّونَ فِي الْإِبْرَاهِيمَ وَمَا أَذْنَبْتَ الشُّرْكَ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توراۃ اور انجیل اس کے بعد نازل کی گئی ہیں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔“

پہلے ایک اصولی بات کی طرف اہل کتاب کو دعوت دی گئی اب ایک اور امر مشترک کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اہل کتاب اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمام مذہبوں کا سنگ بنیاد یہی مسئلہ توحید ہے اور سب کا دعویٰ بھی ہے کہ کائنات خلقت حضرت ابراہیم ہمارے ہی مذہب پر تھی۔ لباب النقول میں ہے کہ نصارائے خنجران اور احبار یہود ایک مرتبہ دربار رسالت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ابراہیم ہماری ملت پر تھے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ تورات و انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم کے مدت ہائے دراز کے بعد ہوا ہے۔ اور اس لئے یہ سوال بھی مہمل اور بے معنی ہے کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی۔

پس تم ان چیزوں کو چھوڑ کر خود ان امور کو اصل و اساس بناؤ جن پر ابراہیم کا بند تھے کیونکہ ان کا وجود مقدس یہودیوں،

عیسائیوں، مسلمانوں اور مشرکوں سب کے نزدیک قابل احترام و تقلید ہے اور ان کا مذہب صرف اتنا ہے حنیفاً مسلماً۔

### کائنات خلقت

هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾  
مَا كَانَ اِبْرَہِیْمُ یَہُودِیًّا وَلَا نَصْرَآئِیًّا وَلَکِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۳۸﴾

”سنئے ہی ہو تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا، پھر اب ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تم کو کچھ بھی علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی بلکہ وہ راست رو فرماں بردار تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

ایک شخص ان باتوں میں جھگڑا کرے جن سے وہ واقف ہے تو ایک بات بھی ہے، مگر عدم علم کے باوجود اپنے دعوے پر زور دینا سراسر جہل و سفاہت ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ و عیسیٰ کے متعلق تو یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے، لیکن ابراہیم پر اس قسم کے الفاظ منطبق کرنا بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بعض جاہل حنفی کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بھی تو حنفی ہی تھے کیونکہ قرآن میں ان کے لئے حنیف آیا ہے۔

رہے مشرکین عرب جو اپنے آپ کو حنیف کہتے ہیں اور ابراہیم کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی اس بات کا یقین کر لیں کہ ابراہیم مشرک نہ تھے، بلکہ وہ سب سے کٹ کر صرف ایک ہی کی طرف ہو گئے تھے اور توحید خالص ان کا مذہب تھا جس کو صرف اسلام پیش کرتا ہے۔ گویا ان آیات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو ایسے اصول کی دعوت دی ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور جس سے کسی کو ذرہ برابر انحراف کی گنجائش نہیں۔

إِنَّ أَوَّلَ الْإِنْسَانِ يَٰۤاِبْرَہِیْمُ لِلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهَٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ وَٰلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۹﴾

”ابراہیم کی خصوصیت کے لوگوں میں سے زیادہ حقدار بیشک وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مسلمانوں کا حامی ہے۔“

ابراہیمی طریق پر چلنے کا اگر کوئی جماعت صحیح معنی میں دعویٰ کر سکتی ہے تو صرف وہ لوگ جو ان کی زندگی میں اس کائنات خلقت پر ایمان لائے اور اس کے نقش قدم پر چلے اور اس وقت اس کرہ ارضی میں جتنے لوگ بستے ہیں ان میں سے صرف رسول اللہ اور اس کے اتباع، مہاجرین و انصار ان تمام اصول و کلیات پر عامل ہیں جو حضرت ابراہیم کے تھے، باقی سب کا دعوائے اتباع غلط ہے اور اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو نفع و ضرر کے لئے صرف خدائے واحد کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، جو انسانوں کی ولایت اور شفاعت پر ادھار کھا کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ اپنے اعمال و اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَا لَآ لَا یَبْنُوْنَ ﴿۴۰﴾ إِلَّا مَنْ لَّیَّ اللّٰهُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۴۱﴾ (الشعر ۸۸، ۸۹) جس روز مال و اولاد میں سے کوئی چیز بھی کام نہ آئے گی۔ بلکہ نجات اس کو ملے گی جو قلب سلیم اور فطرت صالحہ لے کر دربار خداوندی میں حاضر ہو گا۔



## باب نمبر ۳

## فصل اوّل

## اہل کتاب کی خرابیاں

## انتہائی سفاہت

باوجود قدر مشترک کی طرف دعوت دینے کے، یہ لوگ اپنی ہٹ پر قائم ہیں، اس لئے اب ان کی خرابیاں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ مسلمان ان سے آگاہ ہوں، بعد ازاں ان سے تعلقات و روابط کو منقطع کرنے کا حکم دیا جائے گا:

وَدَّثَ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ ۖ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٥٠﴾

“اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں مگر وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور نہیں محسوس کرتے۔”

یہ لوگ خود تو اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتے مگر اس امر کو بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی دوسری جماعت اس کام کے لئے تیار ہو، اس لئے ان کی کوشش یہی ہے کہ جو خرابیاں ان میں ہیں وہی مسلمانوں میں بھی پیدا ہوں اور اس طرح بتدریج وہ دین حق سے منحرف ہو جائیں، مگر ظاہر ہے کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی کا فخر حاصل ہو چکا ہو اور اس نے آپ کے نمونہ اور اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیا ہو، وہ بھلا ان کے فریب و خدع میں کیا آئے گا، بلکہ الٹا انہیں لوگوں کو نقصان پہنچے گا، کیونکہ جب ان کی تمام تر سعی و کوشش مسلمانوں کے گمراہ کرنے میں صرف ہوگی تو ان کے قلوب و اذہان کی لطافت و نظافت سب جاتی رہے گی اور ان کو اپنی اصلاح و تہذیب کی طرف توجہ ہی نہ ہوگی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٥١﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

“اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم مشاہدہ کرتے ہو، اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل سے ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔”

ان آیات میں اہل کتاب کی حسب ذیل خرابیاں ذکر کی گئی ہیں:

(الف) کفر، بدایات اللہ۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ بنی اسماعیل میں ایک نبی آنے والا ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف قرآن حکیم الہام کرے گا، مگر باوجود ان تمام باتوں کے جاننے کے وہ ان حقائق ثابتہ کا انکار کرتے ہیں۔



(ب) کتبیس الحق بالباطل۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہے کہ تمام کتب سماوی کی تعلیم توحید ہے۔ سب کے اصول برواٹم ایک ہی ہیں اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ تمام دنیا کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں گے۔ لیکن وہ ان باتوں کی تو پرواہ نہیں کرتے الٹا اپنے رہبان و احبار کے خیالات فاسدہ اور آرائے کاسدہ کو اصل دین و عہد ملت خیال کرتے ہیں۔ ویقولون ہو من عند اللہ وما ہو من عند اللہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔

(ج) کتبمان حق۔ تورات کے احکام کو چھپاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا (الانعام ۹۱) کس نے وہ کتاب اتاری جو موسیٰ لائے تھے لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی۔ تم نے ورق ورق کر رکھا ہے اس کو ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپاتے ہو۔

### خدع و فریب

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلٰی الدِّیْنِ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاَكْفُرُوْا اٰخِرًا لَّعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝۱۰

”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ مسلمانوں پر جو اتارا گیا ہے اس پر دن چڑھے ایمان لے آؤ اور اس کے آخر میں انکار کر جاؤ، شاید وہ پھر جائیں۔“

اس آیت کے شان نزول میں مفسرین کرام نے مختلف روایات بیان کی ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے: قال عبد اللہ بن الصیف وعدی بن زید والحارث بن عوف بعضهم لبعض تعالوا نؤمن بها انزل علی محمد واصطبه غدوة ونكف به عشية حتى نلبس عليهم دينهم لعلهم يصنعون كما نصنع فيرجعون عن دينهم۔ ”ان یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ صبح کے وقت ہم قرآن پر ایمان لے آئیں اور شام کو انکار کر دیں تو اس سے خود مسلمان بھی شبہہ میں پڑ جائیں گے اور شاید انجام کار اپنے دین ہی کو ترک کر دیں۔“

ابن عباس فرماتے ہیں: قالت طائفة من اهل الكتب اذ القيتهم اصحاب محمد اول النهار فامنوا واذا كان اخره فصلوا صلواتكم لعلهم يقولون هولاء اهل كتاب وهم اعلم منا۔ صبح کے وقت مسلمانوں کے سامنے اظہار اسلام کرو اور شام کے وقت اپنی نماز ادا کرو، اس سے ان لوگوں کو ضروریہ خیال پیدا ہو گا کہ یہ اہل کتاب ہم سے زیادہ عالم اور سمجھدار ہیں کسی برائی کی وجہ سے تو اسلام ترک کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ ان بد بختوں کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ اسلام کی ترقی روک دیں۔

دنیا میں انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ ایک بات کو حق اور یقین خیال کر لیتی ہے، تو اس کو ترک کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتی۔ رسول اللہ نے جس وقت ہر قل کے پاس خط بھیجا اور اس نے ابوسفیان کو بلا کر مختلف سوال کئے تو

ان میں ایک سوال یہ بھی تھا: هل یرتد احد منهم سخطۃ لدینہ بعد ان یدخل فیہ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کیا کوئی شخص اس سے منحرف بھی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ابوسفیان اس وقت اسلام کے سخت ترین دشمن تھے مگر انہیں اس کا جواب نفی ہی میں دینا پڑا۔

ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ فرزند ان اسلام یوں تو دائرۃ توحید سے قدم باہر نہ رکھیں گے، ان کے ساتھ خدع و فریب سے کام لینا چاہئے۔ اور اس کی صورت یہ ہو کہ صبح کے وقت ہم اپنے آپ کو کامل اور پختہ کار مسلمان ظاہر کریں، تمام فرائض اسلام میں شریک ہوں تاکہ سب لوگوں کو یقین ہو جائے کہ ہم حسن و اخلاص نیت کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، مگر شام کے وقت پھر وہی الحاد و زندقہ کی راہ اختیار کر لیں۔ اس ناشائستہ حرکت کا اثر مسلمانوں پر بہت برا پڑے گا اور عجب نہیں وہ بھی اسلام کو ترک کر دیں۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم عالم ہیں، ہمارے فضل و کمال کو سب تسلیم کرتے ہیں، ہمارا اسلام میں داخل ہونا تو یہ واضح کر دے گا کہ ہم بالکل انصاف پسند ہیں، جہاں بھی حق مل جائے اس کو قبول کرنے کو ہمہ تن تیار ہیں اور ہمارا اسلام کا ترک کر دینا یہ ثابت کرے گا کہ ضرور اسلام میں ایسی خرابیاں ہوں گی جو ان پر واضح ہو گئیں اور جن کی وجہ سے انہوں نے اس مذہب کو ترک کر دیا، ورنہ حق بات کون عقلمند چھوڑ سکتا ہے۔

اس قسم کی ناشائستہ حرکات سے ارباب یقین و اذعان کو تو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، البتہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر اس کا کچھ نہ کچھ برا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے مرتدین کے قتل کا حکم دیا ہے، کیونکہ ایسا نہ ہو کہ ان کا مکر و فریب بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو خراب کر دے۔

## فضل عظیم

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا بِمَا نُنَافِیْکُمْ ۚ قُلْ إِنَّ الْهُدٰی هُدٰی اللّٰهِ ۚ اَنْ یُّؤْتٰی اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِیْتُمْ اَوْ یَحَاجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ ۚ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بَیْدُ اللّٰهِ ۚ یُوْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝

اور ایمان نہ لاؤ مگر اسی پر جو تمہارے دین پر چلے۔ کہہ دو کہ ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے، یا وہ تم سے تمہارے رب کے نزدیک جھگڑا کریں گے۔ کہہ دو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے۔

جو لوگ صبح کو اسلام قبول کر کے شام کے وقت اس سے بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں، ان کو وصیت کی جاتی ہے کہ ان کا اصلی ایمان صرف اس نبی کے لئے مخصوص ہے جو اسرائیلی شریعت اور قانون کا پابند ہو۔ اس بے ہودہ حرکت کا جواب انہیں یہ دیا گیا کہ کامل ہدایت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے اور وہی اپنی حکمت سے کسی فرد یا قوم کو حامل شریعت بناتا ہے۔ چنانچہ اس نے بنی اسمعیل کو ہدایت دینے کا وعدہ کیا: ”خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی

در میان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو.... میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (استثناء ۹۱، ۸۱، ۵۰)

ان الفاظ سے ظاہر ہوا کہ بنی اسماعیل میں سے جو نبی اسرائیل کے بھائی ہیں ایک نبی آئے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نبی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مثل موسیٰ ہیں، اس لئے اس پیشین گوئی کے مطابق یہ ضروری بات ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان سے ایک نبی ہو اور اس کو موسیٰ کی طرح ایک شریعت نوازش ہو۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَٰهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (الزلزلہ ۱۵) ہم نے تمہاری جانب ایک پیغمبر بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی جانب ایک رسول بھیجا تھا۔

اہل کتاب کا اصرار یہ ہے کہ وہ صرف ان انبیاء و رسل کا اتباع کریں گے جو ان کی شریعت کے پابند ہوں، حالانکہ سابقہ پیشین گوئی کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جس قسم کا قانون اہل کتاب کو دیا گیا ہے ویسا ہی قانون کسی اور کو بھی دیا جائے۔ پس جب حقیقت نفس الامری یہ ہے، تو یہ لوگ اپنے ہی رسولوں کے اتباع پر اصرار کرنے میں یقیناً غلطی پر ہیں، اگر یہ نہ تو رسول اللہ کو نبی مانیں اور نہ یہ تسلیم کریں کہ شریعت اسلامی کے اصول و کلیات وہی ہیں جیسے شریعت موسوی کے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ وہ خود حضرت موسیٰ کی صداقت کو مشتبہ بنا رہے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نبوت کسی خاص قوم اور ملک میں محدود نہیں، بلکہ یہ اللہ کا فضل مخصوص ہے جس کو چاہتا ہے اس فرض جلیل کے لئے چن لیتا ہے، اس لئے تم بنی اسرائیل ہی میں اس کو منحصر مت مانو۔

خائن و بد عہد

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنُوْهُ بِغَطَارٍ ذُوْءٍ اِلَيْكَ ؕ وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنُوْهُ بِدِيْنَارٍ لَاْ يُؤَدُّ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اَلَيْسَ عَلَيْنَا فِيْ الْاٰمِيْنِ سَبِيْلٌ ؕ وَيَقُوْلُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

”اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تم ہال کا ڈھیر اس کے پاس امانت رکھو تو وہ تم کو ادا کر دے اور ان میں سے وہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو وہ تجھے واپس نہ دے، سوائے اس کے کہ تم اس کے سر پر کھڑے رہو۔ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان امیوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں اور اللہ پر وہ جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“

ہر جماعت میں دو قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں: اچھے اور برے۔ اہل کتاب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اہل کتاب کی مذہبی خباثتیں معلوم ہو چکی ہیں، اب ان کے دنیاوی معاملات کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ وہ اسکو اپنا حق شرعی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ خدع و فریب سے کام لیں، ان کی امانتوں میں خیانت کریں، ان کے ممالک میں تجارت کی غرض سے جائیں، یا ایک مدت کے لئے ان کے شہروں کو اجارہ پر لے لیں، پھر آہستہ آہستہ ان پر قبضہ

جمالیں اور مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کر دیں، اور کبھی کبھی تہذیب و شائستگی اور تمدن و حضارت کی نشر و اشاعت کا بہانہ کر کے ان کے بلاد و امصار پر صلیبی جھنڈا گاڑ دیں۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ہم اہل کتاب ہیں، ہمیں اجازت ہے کہ غیر اہل کتاب کو دھوکا دے دیں اور اس پر ہم سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ کیونکہ نحن ابناء اللہ و احباؤہ کا طغرائے امتیاز ہمارے ہی لئے ہے۔

جب دنیاوی معاملات میں ان کی یہ حالت ہے کہ ایک دینار کے ادا کرنے میں وہ پس و پیش کرتے ہیں تو بڑی امانتوں میں ان پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے اور پھر اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں کس قدر خیانت سے کام لیا ہو گا۔ جو شخص دنیا کے کاموں میں حق ادا کرنے کو تیار نہیں، وہ دین کی باتوں میں بھی یقیناً خائن و بد عہد ہو گا۔ قرآن حکیم کا انصاف دیکھئے کہ اگر وہ ایک جانب اہل کتاب کو خیانت کا مرتکب بتاتا ہے، تو دوسری طرف اگر ان میں چند ارباب ورع و تقویٰ ہیں تو ان کو کبھی فراموش نہیں کرتا، بلکہ سب سے پہلے انھی کا ذکر کرتا ہے اور یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر ایک قوم میں کچھ آدمی خراب ہیں تو تمام کی تمام جماعت کو برا مت کہو۔ جو اچھے ہیں ان کی اچھائی کو تسلیم کرو اور ان کی نیکی کا اعتراف کرو۔

آج اگر تم آنکھیں کھول کر دیکھو تو یورپ اسی مرض شدید میں مبتلا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں اگر کسی کی عزت و آبرو ہے تو صرف سفید رنگ عیسائی اقوام کی۔ دول یورپ نے خصوصاً جو کچھ اسلامی ممالک کے ساتھ اس سلسلہ میں دجل و شیطنت سے کام لیا ہے اور جس ابلیسانہ خدع و فریب سے انہوں نے دول اسلامی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، وہ محتاج تشریح نہیں، نہ تو ان کے نزدیک کسی عہد و پیمان کی وقعت ہے اور نہ کسی کی عزت و آبرو کی، فہل من مدکر۔

اہل کتاب اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ حکم موجود نہیں اور کوئی شریعت اس قسم کے احکام نافذ نہیں کر سکتی۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا: انانصیب فی الغزو من اموال اہل الذمۃ الدجاجة والشاء۔ دوران جنگ میں ہمیں ذمیوں کی بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً مرغی یا بکری وغیرہ، تو کیا ہم بغیر قیمت ادا کئے ہوئے ان کو اپنے کام میں لاسکتے ہیں، کیونکہ وہ مسلمان تو ہیں نہیں، پھر ان کے مال پر قبضہ کرنے میں کیا قباحت ہے۔ ابن عباس نے ناراض ہو کر کہا: ہذا کما قال اہل الکتاب لیس علینا فی الامین سبیل، انہم اذا ادوا الجبۃ لم تحل لکم اموالہم الا بطیب انفسہم۔ اہل کتاب بھی تو یہی کہا کرتے تھے: لیس علینا فی الامین سبیل۔ یاد رکھو جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو ان کی ہر چیز تم پر حرام ہے، سوائے اس کے جو وہ خود اپنی مرضی سے تم کو دیں۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جب اہل کتاب نے لیس علینا فی الامین سبیل کا دعویٰ کیا تو رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: کذب اعداء اللہ ما من شئ کان فی الجاہلیۃ الا وھو تحت قدمی ہاتین الا الامانۃ انھا موداة امی البر والفاجر، خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں، میں نے جاہلیت کی ہر رسم کو محو و باطل کر دیا۔ یاد رہے امانت میں تم خیانت نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اچھا ہو یا برا، اس کی امانت بہر صورت واپس کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں آپ نے اس طرح فرمایا: لایبان لمن

لامانۃ له ولا دین لمن لاعہدہ، جو شخص امین نہیں اس کا دل بھی ایمان سے خالی ہے اور جو اپنے عہد کا پابند نہیں، وہ کبھی دینداری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ کے زمانہ میں فوجوں کو سرحد پر جمع کرنا شروع کر دیا کہ مدت عہد ختم ہوتی ہی دشمن پر حملہ کر سکیں۔ حضرت ابوہریرہ اسلمیؓ نے ان کو اس سے روکا کہ یہ بد عہدی اور خیانت ہے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کو اپنی تمام فوجیں واپس بلانی پڑیں۔ ان فی ذلک لعبدۃ لاولی الابصار۔

## اصلی قانون

بَلَىٰ مَنْ أَوفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۵۰﴾

”ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے، تو بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

اہل کتاب کی یہ باتیں بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں، اصلی قانون یہ ہے کہ ایفائے عہد سخت ضروری ہے، امانت کے بغیر کبھی کوئی جماعت بااخلاق نہیں بن سکتی۔ تعلیمات الہیہ کی تمام تربیاد اخلاق فاضلہ پر ہے، وہ کبھی بددیانتی کی تعلیم نہیں دے سکتی۔ جو لوگ حاکم بن کر اپنی رعایا کے حقوق ادا نہیں کرتے، ظلم پر کمر باندھتے ہیں اور دن رات بے انصافی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ عموماً جلد تباہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۚ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸) اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر امانت اس کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھو تو عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دوسری جگہ آیا ہے: فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتِنَ اَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (البقرہ: ۲۸۳) مسلمانوں کے خصائص و امتیازات بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (المؤمنون: ۸) جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ سورہ معارج میں ہے: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿۴۰﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِلُونَ ﴿۴۱﴾ (المعارج: ۳۲-۳۳) سورہ انفال میں مسلمانوں کو خیانت سے روکا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (الانفال: ۲۷) اے مسلمانو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور اپنی امانتوں میں خیانت سے کام نہ لو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارباب نفاق کی ایک علامت یہ بھی بتائی ہے: واذا اتمن خان، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت سے کام لیتا ہے۔

## عاقبت کار

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۵۱﴾

”جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض حقیر معاوضہ لیتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور ان سے اللہ بات بھی نہ کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے

دردناک عذاب ہے۔“

قرآن کی اس آیت میں مناظر قیامت میں سے ایک منظر کا سماں کھینچا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ارباب ورع و تقویٰ جب خدائے قدوس کی نوازش ہائے گوناگوں سے بہرہ اندوز سعادت ہوں گے تو کفار و مشرکین ان الطاف و اکرام الہیہ سے یکسر محروم رہیں گے۔ پس اس قسم کی آیات میں دراصل جزئیات پر بحث مقصود نہیں ہوتی، بلکہ ایک اجمالی حکم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرنی ہوتی ہے۔ قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: **مَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْكَ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ** (البقرہ ۲۶۱) ہر ایک دانہ کے سات خوشے، اور ہر ایک خوشہ میں سو سودانہ ہو گا۔ اب اس تفصیل سے درحقیقت یہ نہیں ثابت ہوتا کہ کوئی قسم انانج کی ایسی بھی ہونا ضروری ہے جس کے ایک دانہ سے واقعی سات سودانے پیدا بھی ہوں، بلکہ صرف کثرت مراد ہے۔

### تحریف کتاب

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُؤْنَ أَلْسِنَتَهُمُ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۵۹﴾

“اور ان میں ایک گروہ ہے جو اپنی زبان کو کتاب پڑھتے وقت مروڑتے ہیں، تاکہ تم خیال کرو کہ وہ کتاب ہی کا حصہ ہے، حالانکہ وہ کتاب سے نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔“

اہل علم کی حالت یہ ہے کہ کتاب الہی کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی آیات کو لے کر ان سے اپنا مطلب نکالتے ہیں اور غلط تفسیر کر کے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہی اللہ کا حکم ہے، حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ حقیقت اصلیہ کے بالکل برخلاف ہے اور رسول کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا۔ سورہ بقرہ میں آتا ہے: **يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِلَا دِلِيلِهِمْ** ثم يقولون هذا من عند الله، یعنی تحریف لفظی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس سورہ میں فرمایا کہ وہ تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ امام بخاری نے یہی معنی ابن عباس سے نقل کئے ہیں: **يَتَاوَلُونَهُ عَلَى غَيْرِ تَأْوِيلِهِ**، صحیح معنی کو ترک کر کے غلط تاویل کرتے تھے، لیکن مجاہد، شعبی، قتادہ اور ربیع بن انس کی رائے ہے کہ وہ تحریف لفظی کے بھی مرتکب ہوتے تھے اور یہی ہماری رائے ہے۔

انسان خدا نہیں بن سکتا

سورہ آل عمران میں تمام تر خطاب عیسائیوں سے ہے، اگرچہ کہیں کہیں یہودیوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے، مگر اصل میں روئے سخن نصاریٰ ہی کی جانب ہے، پس وہ لوگ جو اپنی حماقت و نادانی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت اور

خدا کی منسوب کرتے ہیں، ان سے کہا جاتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُنُوا رَبِّكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۚ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥١﴾

”کسی بشر کو شایاں نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور عقل اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم میرے بندے بن جاؤ، لیکن وہ کہے گا کہ تم ربانی بن جاؤ، اس لئے کہ تم کتاب پڑھاتے تھے اور اس لئے کہ تم درس دیتے تھے، اور تمہیں کبھی یہ حکم نہ دے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو خدا بناؤ، کیا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو تم کو کفر کا حکم دے گا۔“

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض کلمات ایسے نقل کئے گئے ہیں، جن سے ایک معمولی آدمی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہتے ہیں، مگر انہوں نے خود ہی اس غلط فہمی کو دوسری کئی جگہ صاف کر دیا ہے کہ میں اس لفظ کو اسی طرح مجازی معنی میں استعمال کرتا ہوں جس طرح بنی اسرائیل کے باقی انبیاء اور مشائخ استعمال کرتے تھے۔ اس لئے یہاں بتایا گیا کہ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ فہم و فراست، نبوت اور کتاب سے سرفراز فرماتا ہے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، اس لئے کہ یہ علاوہ کذب و افتراء کے سخت نادانی اور حماقت ہے، بلکہ خدا کا رسول تو لوگوں کو عالم ربانی بنادیتا ہے، جو اپنے شاگردوں کو تدریجی تعلیم یعنی اول ابتدائی علوم اور پھر انتہائی اصول و کلیات سکھاتا ہے۔

بخاری نے ربانی کے یہ معنی کئے ہیں: الذی یبہی الناس بصغر العلوم قبل کبارہ۔ جس وقت ابن عباسؓ کی وفات ہوئی تو محمد بن الحنفیہ نے کہا: مات ربانی هذه الامة۔ پس انبیاء علیہم السلام لوگوں کو صحیح علوم کی جانب متوجہ کرنے آتے ہیں اور وہ یہی کہتے ہیں کہ تم خدائے واحد کی پرستش کرو، کیونکہ تم کتاب الہی خود پڑھتے ہو اور دوسروں کو پڑھاتے ہو، اور اس کتاب میں فقط توحید ہی کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

بعض جاہل لوگ اپنی نادانی اور سفاهت کی بناء پر اپنے بزرگوں کو خدا اور مختار کل بنادیا کرتے ہیں، لیکن نبی سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے کے لئے کہے اور تمہیں اپنے بزرگوں کو ان مراتب تک لے جانے کی اجازت دے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ تم تو مسلمان بننے اور احکام خداوندی کے آگے اپنی گردنیں خم کرنے کی کوشش کرو اور خود نبی جو مرکز دانشمندی ہے، وہ اتنا بے وقوف بن جائے کہ تم کو اصل حقیقت سے ہٹ جانے کا حکم دے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

جس وقت نصارائے نجران کے سامنے رسول اللہ ﷺ نے ربوبیت مسیح پر نہایت ہی دندان شکن اعتراضات کئے تو اس سے ارکان وفد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاید اپنے آپ کو خدا بنانے کی خاطر الوہیت مسیح پر حملہ کر رہے ہیں، اس لئے



ان میں سے بعض نے دریافت کیا: اتزیدیا محمدان نعبدک کہا تعبد النصارى عیسوی بن مریم، اے محمد! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو اسی طریق پر پوجا کریں، جس طرح نصاریٰ عیسیٰ کی کرتے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی غصہ کے لہجہ میں فرمایا: معاذ اللہ ان نعبد غیر اللہ، اونا امر بعبادة غیر اللہ، ما بذلک بعثنی ولا بذلک امین، خدا کی پناہ کہ ہم غیر اللہ کی پرستش کریں، یا ایسا کرنے کا حکم دیں، نہ تو اس غرض کے لئے خدا نے مجھے مبعوث کیا ہے اور نہ اس کا مجھے حکم دیا ہے۔

انبیائے کرام کا تو طغرائے امتیاز یہی ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی غیر اللہ کی طرف نہیں بلا سکتے، قرآن حکیم میں آتا ہے: وما ارسلنک من رسول الا نوحى اليه انه لا اله الا انا فاعبدون۔ دوسری جگہ آتا ہے: ولقد بعثنا فی کل قرية رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وَسُئِلَ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مَنْ دُسِلْنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ الْهَتَۃَ يَتَّبِعُونَ (الزخرف ۴۵) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان سے ذرا پوچھو تو سہی کیا ہم نے رحمن کے سوا کسی اور کو بھی خدا بنایا کہ یہ لوگ اس کی پوجا کریں۔ اور ملاحظہ ہو: وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْ اِلَهٌ مِّنْ دُونِهِ فَاُولَٰئِكَ نَعْتَدِ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِيْنَ (الانبیاء ۲۹) اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں اللہ کے سوا تمہارا خدا ہوں، تو اس کو ہم اس کا بدلہ جہنم دیں گے، ظالموں کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے توحید کو اس درجہ صاف کر دیا ہے کہ اب ذرہ بھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ ایک دفعہ بعض لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! نسلم علیک کہا یسلم بعضنا علی بعض افلا نسجد لک، جس طرح ہم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، ویسے ہی آپ کی خدمت میں بھی سلام عرض کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ آپ نے اسی وقت جواب دیا: لاولکنا اکرموا نبیکم واعرفوا الحق لاهله فانه لا ینبغی ان یسجد لاحد من دون الله، ہر گز نہیں، ہاں اپنے نبی کا اکرام ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے اور ہر ایک کا حق پہچانو، یاد رکھو اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

جس قدر مذاہب برباد ہوتے ہیں ان کی ابتداء اسی جگہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں میں ایک شان الوہیت تسلیم کرنے لگتے ہیں اور پھر تعظیم سے عبادت کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہندوؤں کا مذہب اسی لئے تباہ ہوا کہ انہوں نے اپنے بزرگوں کے احکام کی خاطر خداوندی ارشادات کی کوئی پرواہ نہ کی اور اہل کتاب بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ پس ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے شخص کا اتباع کرے جو شریعت کا مخالف ہو، اگرچہ وہ کرامت کے زور سے آسمان ہی پر کیوں نہ اڑنے لگے۔

### اخذ میثاق

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَّا اٰتٰیْتُمْکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَحِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتَوْمِنُنَّ بِہٖ وَ لَتَنْصُرُنَّہٗ ۚ قَالَ ؕ اَقْرُرْکُمْ وَاَخَذْتُ عَلٰی ذٰلِکُمْ اٰصْرِیْ ۚ قَالُوْۤا اَقْرُرْنَا ۚ قَالَ فَاَشْہَدُوْۤا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ ⑥



”اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا اس لئے کہ ضرور میں نے تم کو کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس کو مانو گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے فرمایا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد لیتے ہو انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں، کہا پس گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔“

اہل کتاب باوجود ان آیات بینات کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کو تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف عرب کے لئے مخصوص ہیں، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہ سچ ہے کہ انبیاء علیہم السلام لوگوں میں صحیح تعلیم پھیلانے، ان کو مہذب و شائستہ بنانے اور ان کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کی غرض سے آتے ہیں، مگر ان اغراض و مقاصد کے علاوہ ان تمام انبیاء و رسل سے ایک اور بھی عہد و میثاق لیا جاتا تھا جس کی حفظ و صیانت اور اپنی اپنی امت میں نشر و اشاعت ان کے ذمہ تھی اور وہ عہد یہ تھا کہ ایک مدت کے بعد نبی آخر الزماں پیدا ہونے والا ہے، اس کی نصرت و اعانت اور اس پر ایمان لانا تمہارا فرض ہو گا۔ لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی، اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میرے اتباع کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔

اجلہ صحابہ کرام اور جمہور مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی، ابن عباس اور قتادہ وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ قرآن حکیم نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا کہ رسول اللہ سے قبل ہر ایک نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا: وما من امة الا خلا فیہا نذیر۔ اس زمانہ میں ہر ایک قوم اپنے اپنے ملک میں رہتی تھی، بین الاقوامی تعلقات مضبوط نہ تھے، اسی لئے ہر ایک قوم اپنے اپنے امتیازات و خصوصیات کو قائم کئے ہوئے تھی۔ مگر ایک وقت ایسا آنے والا تھا جبکہ قومیت اور وطنیت کی بندشیں ٹوٹنے والی تھیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ جب تمام قوموں کے درمیان تعلقات قائم ہو جائیں اور وہ پابندیاں اٹھ جائیں تو اس وقت تمام دنیا کے لئے ایک ہی پیغمبر بھیجا جائے، جو ان تفریقوں اور اختلافوں کو یک قلم مٹا دے اور تمام نسل انسانی کو ایک بنا دے۔ اس نبی آخر الزماں کا فرض یہ تھا کہ وہ تمام قوموں میں عالمگیر برادری قائم کر دے اس لئے ضروری تھا کہ تمام انبیائے کرام سے اس قسم کا عہد و میثاق لیا جاتا کہ وہ اپنی امت کو ہر وقت اس کے لئے تیار رکھیں کہ جس وقت وہ نبی آئے فوراً اس کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ چنانچہ رسول اللہ نے آتے ہی نسل انسانی کی وحدت کا اعلان عام کر دیا: یَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْثَرَ مَا كُنْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْفَكُكُمْ (الحجرات ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے کنبے اور قبیلے ٹھہرائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ واقعی تم میں زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: یَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا اور ان سے بہتیرے مرد اور عورتیں پھیلادیں۔

اس آخری نبی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرے گا۔ لا نفراق بین احد من رسلہ اس کا طرہ افتخار یہ ہوگا: یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک، اس رسول کے متعلق ہم کتاب استثناء کی پیشین گوئیاں تفصیل کے ساتھ گزشتہ اور اوراق میں درج کر چکے ہیں، اب رسولوں کے اعمال سے ایک اور شہادت اسی کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

”ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اس وقت رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں، چنانچہ موسیٰ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سا ایک نبی پیدا کرے گا جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یہ ہو گا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ امت میں سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔“ (اعمال ۱۲: ۳۲۳۲)

یہ الفاظ اپنی شرح آپ کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے نبی کا انتظار تھا اور آج تک رسول اللہ کے سوا اور کسی شخص نے مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ تمام انبیاء نے آپ کے ظہور اقدس کی اپنی امت کو خبر دی اور ہر ایک نبی سے اللہ نے یہ عہد لیا کہ وہ اس نبی موعود کی امداد و اعانت کے لئے اپنی امت سے ضرور وعدہ لے گا اور یہ میثاق لیا گیا کہ وہ اس عہد کو لوگوں میں برابر مشہور کرتے رہیں گے اور جو کتاب نازل ہوگی اس میں اس عہد و میثاق کی یاد تازہ کرادی جائیگا۔

فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۳۲﴾

”پھر اس کے بعد جو شخص منہ موڑے تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔“

اس قدر روشن دلائل کے بعد بھی اگر یہ لوگ دائرۃ اسلام میں داخل نہ ہوں، رسول اللہ کی نبوت کا اقرار نہ کریں اور دین کو ذریعہ تفریق و عدوان بنائیں تو ان بد اخلاقوں کی کوئی عزت نہ ہوگی اور ان کو برباد کر دیا جائے گا۔

انتباہ

أَفَغَيْرِ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ وَلَآ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۳۳﴾

”کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا اور کچھ چاہتے ہیں حالانکہ جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں بخوشی اور بجز اسی کے تابع اور ہیں اور اسی کی جانب لوٹائے جائیں گے۔“

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ خداوند قدوس کی توحید خالص اور اس دینِ قوم کو ترک کر کے کسی دوسری طاقت کے آگے اپنی گردنیں خم کرینگے۔ حالانکہ زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کے تابع فرمان ہے۔ وان من شئ الا یسبح بحمدہ۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی دو قسمیں ہیں:

(الف) تکوینی۔ یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ اس پر آثار و ثمرات خود مرتب کر سکے۔ مرنا، جینا بیمار، پڑنا وغیرہ سب اسی میں داخل ہیں: فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعَتَيْنِ (حم السجدہ ۱۱) پس اس نے

آسمان اور زمین کو حکم دیا کہ تمہیں طوعاً یا کرہاً ہمارے احکام کو تسلیم کرنا پڑے گا، انہوں نے عرض کیا کہ ہم طوعاً حاضر ہوتے ہیں۔

(ب) تشریحی۔ یہ انسان کے اختیار اور قدرت میں ہے، نماز پڑھنا وغیرہ۔ تمام انسان، ملائکہ اور زمین و آسمان تکوینی احکام کے مجبور و اکراہ پابند ہیں۔ ان کا خلاف ہی ناممکن ہے۔ فرشتوں کے متعلق آتا ہے: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ وہ اللہ کے اوامر کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ ایک جگہ اس طرح ہے: وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مِنَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ حَاشٍ، زمین و آسمان میں ہر ایک طوعاً و کرہاً اسی کا تابع فرمان ہے۔ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہے: أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يُتَفَكَّرُونَ ظِلُّهُ لَئِنْ يَشَاءْ يَنْفَخِ النَّفْثَ فِيهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ فِيهِ شُرَكَاءَ لِلَّهِ يَكْفُرُونَ بِهِ كَمَا تُفَكَّرُونَ ۝ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْهَبْلِ كُفُّوا عَنْهُهُمْ لَا يُسْتَكْبَرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (النحل ۴۸ تا ۵۰) کیا انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کی جانب نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اس کے سائے دائیں سے اور بائیں سے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی میں ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں جاندار اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر ہے اور کرتے ہیں جو کچھ سب ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ ایک جگہ پر یوں بھی ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۚ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یس ۳۸ تا ۴۰) اور سورج اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم کا اندازہ ہے اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ پھر کھجوروں کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو گیا۔ نہ سورج سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو آپکڑے اور نہ رات ہی دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور سب گھیرے میں تیر رہے ہیں۔

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رب الارباب کس قدر باجبروت اور باعظمت ہے۔ اب جو لوگ تشریحی احکام کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کی گرفت سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ایسے خدائے قدوس کی چوکھٹ پر سر رکھنا بیشک عزت کی نشانی اور اس کو چھوڑ کر انسانوں کے آگے سر بسجود ہونا ذلت و رسوائی کی دلیل ہے۔ حالانکہ اگر تم ذرا غور سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ انسان بسا اوقات مجبور ہو کر اسی ذات واحد کے آگے اپنی گردن خم کر دیتا ہے: وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوُجُّ كَالظَّلِيلِ دَعَا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الدِّبْرِ فَبِتْنَاهُمْ مُّقْتَصِدًا ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (القصص ۲۴) اور جب سائبانوں کی طرح موج ان کو چھپا لیتی ہے تو اللہ ہی کے لئے عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ ان کو خشکی کی جانب بچا لاتا ہے تو بعض ان میں اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار وہی کرتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں۔ انسان کی عجز و درماندگی ملاحظہ ہو: وَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الدِّبْرِ فَبِتْنَاهُمْ مُّقْتَصِدًا ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (النجم ۱۰) انہوں نے اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور ہر قسم کی عبادت کو اسی کے لئے

مخصوص کر دیتے ہیں، پھر جب وہ ان کو خشکی پر لے آتا ہے اور سمندر کی موجوں سے نجات بخشتا ہے تو پھر شرک شروع کر دیتے ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَیْنِ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان ۲۵) اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً اللہ ہی کا نام لیں گے۔ الغرض ان تمام تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ زمین و آسمان کا قیام، نوع انسانی کا وجود اور کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ اسی مذہب اسلام اور فرمان الہی کا پابند ہے۔

## طغرائے امتیاز

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْاِبْرٰهِيْمَ وَاسْمٰعِيْلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اَوْفَىٰ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيِّنَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ لَا نُنْفِقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٧﴾

”کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم تو اسی کے حکم بردار ہیں۔“

فرزندان اسلام و حلقہ گجستان توحید کا یہی طغرائے امتیاز ہے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات صالحہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ حق و صدق کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو، سب سے پہلے ایک مسلمان ہی اس کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہو گا۔ یہ خصوصیت دنیا کے اور کسی مذہب کو حاصل نہیں۔ ہر ایک جماعت کسی نہ کسی نبی کی تکذیب ضرور کرتی ہے۔ یہ صرف اسلام ہی میں بات پائی جاتی ہے کہ وہ تمام رسولوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لئے دنیا کا عالمگیر مذہب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۖ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿٨٥﴾

”اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین طلب کرے گا تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

گزشتہ آیات نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ پابند اسلام ہے۔ تمام انبیائے کرام نے اسی مذہب کی اپنی اپنی کتابوں میں پیشین گوئی کی ہے اور یہ خود تمام رسل کرام کی تصدیق کرتا ہے، اب اس کے بعد بھی اگر ایک شخص اس صراطِ مستقیم کو ترک کر کے دوسرا کوئی مذہب اختیار کرتا ہے تو وہ انجام کار ناکام رہے گا۔ اس لئے کہ دنیا کے تمام مذاہب وادیان کی تعلیمات اور کتابوں میں شدید ترین تحریف کی گئی ہے اور اس طرح راہِ حق گم ہو گئی ہے۔ اسلام ان تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ اس کو ترک کرنے کے یہ معنی ہیں کہ عمداً صراطِ مستقیم سے انحراف کیا جا رہا ہے۔

ادھر خود فطرت انسانی کو دیکھئے تو وہ اسی اسلام پر پیدا کی گئی ہے۔ جب تمام ارواح انسانی سے سوال کیا گیا: الست بریکم

تو سب نے بلی ہی میں جواب دیا تھا۔ گویا انسان کی فطرت ہی اسلام پر پیدا کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام، ہر ایک انسان فطرت اسلام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ اب جو شخص اسلام سے احتراز کرتا ہے وہ گویا اپنی فطرت صحیحہ کو برباد کرتا ہے جس کے بعد کامیابی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔

کوئی عذر نہیں رہا

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٠﴾

”اللہ ان لوگوں کی کیسے ہدایت کرے گا جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے اور وہ اقرار کر چکے کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔“

اہل کتاب کی عجب حالت ہے، تمام انبیائے سابقین پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ رسول اللہ کی صداقت کو برآی العین مشاہدہ کر چکے ہیں: یعرفونہ کہا یعرفونہ ابنائہم، پھر یہ آیات بینات ہیں جو اسلام کی صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسلام کی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدا کے حکم کے لئے اپنی چھوٹی سے چھوٹی مصلحت کو بھی قربان کرنے کو تیار نہیں، اس لئے وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ ان کی ہدایت کے لئے ہر گز کوئی دوسرا نبی نہ بھیجا جائے گا اور ان کی عقلوں پر ایسے پردے پڑ جائیں گے کہ صاف صاف باتیں بھی ان کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔

أُولَٰئِكَ جَزَّوْهُمْ أَلَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨١﴾ خُلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْقَرُونَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٣﴾

”ان کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے، اس میں رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی، مگر ہاں جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ جب یہ لوگ رسول اللہ کی تعلیم کو نہ مانیں گے تو ان پر لعنت طاری ہوگی۔ یعنی:

اللہ تعالیٰ سے دور ہوں گے جو طہارت اور قد و سیت کا سرچشمہ ہے۔

ملائکہ سے دور ہوں گے جن کی وساطت سے نیکی کی تحریک ہوتی ہے۔

اور انجام کار لوگ بھی ان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔

ان لعنتوں کی تفصیل کتاب استثناء میں اس طرح آتی ہے:

”لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوائہ ہو گا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے

بتاتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہو گا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچے گی، تو شہر میں لعنتی ہو گا، اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہو گا۔ تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہو گا۔ تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے، تو بھیڑ آنے کے وقت لعنتی ہو گا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہو گا۔ خداوند ان سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگا دے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا۔ یہاں تک کہ تو ہلاک ہو گا اور جلد نابود ہو جائے گا۔ تیرے عملوں کی برائی کے باعث جن کے سبب سے تو نے مجھے ترک کیا۔ (استثنا ۵۱: ۸۲ تا ۸۳)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَذَّادُوا كُفْرًا أَلَنْ نَقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الصَّالُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ۝

“بیشک جو لوگ ایمان کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہ کی جائے گی اور وہی گمراہ ہیں۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور کافر ہی مر گئے تو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے معاوضہ میں دے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہو گا۔”

جو لوگ ایمان کے بعد کفر کرتے ہیں اور پھر اس میں برابر ترقی کرتے جاتے ہیں ان کی توبہ ہر گز قبول نہ ہو گی۔ ایمان کا مطلب تو یہ تھا کہ آئندہ تمام اعمال فاسقہ سے پرہیز کیا جائے گا، مگر جب انہوں نے قبول اسلام سے انکار کر دیا اور وہ بھی اس قدر شدید کہ فسق و فجور میں برابر ترقی کر رہے ہیں، تو پھر ان کی توبہ بھلا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ اس کے قبول ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ انسان راہ حق اختیار کرے اور بدیوں سے بچے۔

اسلام سے انکار کرنے کے بعد اگر ایک شخص اپنی تمام دولت بھی خدا کی نذر کر دے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ چیزیں اس کو عذاب آخرت سے بچا سکیں گی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةُ دُوسری جگہ ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا نَهْنُونَ، الْإِمْنُ اتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: لَا يَمِيعُ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ۔ یہ بھی فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْوَأَالُ لَهُمْ مَتَانِي الْأَرْضِ جَبِينًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (المائدہ ۳۶) جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس جو کچھ زمین میں ہے سب اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی، قیامت کے دن کے عذاب سے اپنی نجات کے لئے دیدیں تو وہ بھی ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

“تم نیکی کو ہر گز نہ پاسکو گے جب تک وہ چیزیں خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔”

حقیقی نیکی حاصل کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنی محبوب و عزیز ترین متاع اللہ کے نام پر قربان کرنا سیکھے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اسلام کو جس قربانی کی ضرورت ہو اس کو خود ذوق سے پیش کرے۔ آج اگر ملت اسلام یہ چاہتی ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر فقط اس کو بچانے کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں تو اس وقت نیکی صرف یہی ہو گی کہ ہم فوراً اپنی ہتھیلیوں پر سروں کو رکھ کر میدان جنگ میں حاضر ہوں اور اگر اس وقت تبلیغ و دعوت اسلام کی اکناف و اطراف عالم میں ضرورت ہو تو ہر مسلمان مرد و عورت کا فرض ہے کہ وہ پیکر تبلیغ و مجسم دعوت بن کر گھر سے نکل جائے کہ آج صرف یہی نیکی ہے۔

### ایک اعتراض

برابر اہل کتاب ہی سے گفتگو چلی آرہی ہے۔ اسلام ان کو اصول و کلیات کی طرف بلاتا ہے اور وہ کج بحث جزئیات و فرعیات میں جھگڑتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک اور اعتراض کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اونٹ کا دودھ اور گوشت حلال ہے، مگر بنی اسرائیل کے نزدیک دونوں چیزیں حرام تھیں، اہل کتاب نے اعتراض کیا کہ آپ تو ملت ابراہیمی کے اتباع کا دعویٰ کر رہے ہیں حالانکہ اس میں ان چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس کے جواب میں فرمایا:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَءِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ الشُّرَءُةُ قُلْ فَأْتُوا بِالشُّرَءَةِ فَأْتُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٦

“بنی اسرائیل کے کھانے کی سب چیزیں حلال تھیں قبل اس کے تو رات اتاری جائے سوائے اس چیز کے جس کو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کر لیا، کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو تو رات لاؤ اور اسے پڑھو، پھر جو کوئی اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی ظالم ہیں۔”

بیشک اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل کے لئے ایک خاص وجہ سے حرام ہوا تھا، اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی مخصوص طور پر ان کے لئے حرام کر دی گئی تھیں، جس کے حسب ذیل اسباب تھے:

(الف) ہم نے ناخن والے جانور ان پر حرام کر دیئے اور یہ ان کے لغوی وعدوان کی سزا تھی: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَبَّلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ بَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَدِيقُونَ (الانعام ۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری میں سے ہم نے ان پر ان دونوں کی چربی حرام کر دی تھی، سوائے اس کے جو ان کی پشت پر لگی ہوئی ہو یا انتڑیوں میں ہو یا ہڈیوں سے ملی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی شرارت پر سزا دی تھی اور ہم یقیناً سچے ہیں۔



(ب) آئندہ چل کر انہیں چالیس سال تک بیابانوں میں مارے مارے پھرنا تھا، جہاں سوائے اونٹ کے اور کوئی جانور ان کے کام نہ آسکتا تھا، اس لئے اس کو حرام کر دیا گیا کہ سزا کی بھی تکمیل ہو جائے۔

(ج) ترمذی میں ابن عباس سے روایت ہے: ان اليهود قالوا للنبی ﷺ اخبرنا ما حرم اسرائیل علی نفسه قال کان یسکن البدو فاشتی عرق النساء فلم یجد شیاً یلائه الا تحريم الابل والبانها فلذلك حرمها قالوا صدقت۔ بعض یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت یعقوب نے اپنے اوپر کیا چیز حرام کی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جنگل میں اقامت گزریں تھے، ایک مرتبہ انہیں عرق النساء کی شکایت ہوئی تو اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑنا ان کے لئے نہایت ہی مفید و نافع ثابت ہوا۔ اسی بنا پر انہوں نے ان دونوں چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا، ان لوگوں نے اس کی تصدیق کی۔

جس وقت حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اس کا گوشت کھانا ترک کر دیا تو ان کی تقلید میں گھروالوں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد اس سے نفرت کرنے لگی اور اس نفرت نے یہاں تک ترقی کی کہ تمام بنی اسرائیل اس کو حرام سمجھنے لگے۔ اب اگر کوئی شخص اس کو کھالیتا تو لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور یہ خیال کرتے کہ اس نے خود حضرت یعقوب کی توہین کی ہے۔ جب تمام قوم کی قوم نے عملاً اس کو حرام کر دیا تو انجام کار تورات میں بھی اس کی حرمت کے احکام نازل ہو گئے۔

پس اس تمام تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ چیزیں ابراہیم پر ہرگز حرام نہ تھیں، بلکہ یہ اسرائیلی خصوصیت ہے، اب تم لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خود ابراہیم کے نزدیک اونٹ کا گوشت حرام تھا تو ذرا تورات لا کر یہ ثابت کر دو کہ ان چیزوں کو کائنات خلقت نے حرام کیا تھا اور اگر باوجود ثابت نہ کرنے کے پھر بھی اپنی بات پر قائم رہو، تو گویا اللہ پر افترا پرداز کرتے ہو۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ⑤

”کہہ دو کہ اللہ نے سچ فرمایا پس ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو ایک کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔“  
تم تمام فرعی مسائل چھوڑ کر اصل و اساس کو اپنے ہاتھ میں لے لو، شرک کو ترک کر کے توحید خالص سے اعتصام و تمسک کرو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ ایک جگہ آتا ہے: قُلْ إِنِّي هَدَيْتُ دِينِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ⑥ دِينَ قَبْلَ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ⑦ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (الانعام ۱۶۱) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ⑧ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (النحل ۱۲۳) پھر ہم نے تمہاری طرف الہام کیا کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا اتباع کرو، وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

حج بیت اللہ



گزشتہ آیات میں ابراہیمی خصوصیات پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن ان کی نشاۃ و تولید اور تربیت نہیں ہو سکتی جب تک انسان خود اس مقام ابراہیم سے شرف اندوز زیارت نہ ہو کہ اس کے دیکھتے ہی کائنات خلقت کے تمام مقامات ذہاب الی اللہ یاد آجائیں گے، وہی جذبات حقہ ہم میں بھی پیدا ہوں گے۔ توحید کی خاطر ہم بھی اپنی ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور تکالیف و شدائد میں مقصد حیات سے انحراف نہ کریں گے۔ اس لئے فرمایا:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۵﴾

”پہلا گھر جو لوگوں کیلئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور جہان کے لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔“  
لوگوں کے لئے سب سے پہلا گھر جو صرف عبادت کے لئے بنایا گیا وہ بیت اللہ ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے: ابوذر عرض کرتے ہیں: نیا رسول اللہ ای مسجد وضع اول، قال المسجد الحرام، قلت ثم ای قال المسجد الاقصی قلت کم بینہما قال اربعون سنة۔ سب سے پہلے کوئی مسجد بنائے گئی؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام اس کے بعد مسجد اقصیٰ اور ان دونوں کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا۔ قرآن حکیم نے مکہ کا دوسرا نام ام القریٰ یعنی بستیوں کی ماں رکھا ہے کہ یہاں سے تمام دنیا توحید حاصل کرے گی اور ہر ایک قوم اس کے سرچشمہ ہدایت سے سیراب ہوگی۔

پچھلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ دنیا کے تمام برگزیدہ رسولوں نے اپنے اپنے زمانہ میں رسول اللہ کی پیشین گوئی کی ہے، اس لئے آپ اول النبیین ہیں اور یہی وجہ ہوئی کہ اول بیت کو آپ کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔ حضرت ابراہیم اپنی اولاد کو ایک وادغید ذی زہر میں آباد کر گئے کہ اللہ کا مقدس نام لوگوں کو اس جگہ پر کشاں کشاں لے آئے گا۔

یہ گھر مبارک ہے۔ حدیث میں آتا ہے: صلوة فی مسجدی هذا افضل من الف صلوة فیما سواہ من المساجد الا المسجد الحرام۔ مسجد حرام کے سوا باقی تمام مساجد ارضی میں سے صرف میری مسجد میں نماز پڑھنے سے ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اس کی خیر و برکت اور رشد و ہدایت ایک وقت اور ایک ملک کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ دائمی، غیر منقطع اور تمام انسانوں کے لئے ہوگی۔ پہلی عبادت گاہیں اور قبلے ایک وقت کے لئے ہوتے تھے، اس لئے ان کی برکتیں بھی ختم ہو جاتیں، مگر یہ پاک گھر ہمیشہ کے لئے برکتوں اور رحمتوں کا سرچشمہ رہے گا اور جو ہدایت یہاں سے نکلے گی وہ محض عرب کے لئے مخصوص نہ ہوگی، بلکہ کرۂ ارضی کی تمام قومیں اور امتیں اس سے یکساں طور پر فائدہ حاصل کریں گی اور اس طرح بتدریج تمام نسل انسانی کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو جائے گی۔ جس کا قرآن نے آتے ہی اعلان کر دیا تھا۔

## آیات بینات

فِيهِ اٰیٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهٖمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا وَّلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّةُ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَمٰطَعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفِيْرٌ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵﴾

”اس میں بہت سی کھلی نشانیاں ہیں مثلاً مقام ابراہیم اور جو وہاں داخل ہو گیا وہ امن والا ہو گیا اور اللہ کے لوگوں پر اس گھر

کاج کرنا ہے اس پر جس کو اس تک پہنچنے کی طاقت ہو، اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔“ پہلے بیت اللہ الحرام کے امتیازات خصوصی اور برکات کو بیان کیا، اب تین کھلی کھلی اور ناقابل انکار نشانیوں کا ذکر آتا ہے، جن کی وجہ سے اس بیت اللہ کا اکرام و احترام ہمیشہ کے لئے ہوتا رہے گا اور تمام دنیا پر اتمام حجت ہو جائے گی۔ ان نشانات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) مقام ابراہیم: توراۃ میں بیت ایل یا بیت اللہ کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ دنیا کی تمام عبادت گاہوں میں سے صرف اسی گھر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو اللہ کا گھر کہا گیا۔ یہی ایک مقام ہے جس کے ساتھ اس کرۂ ارضی میں ابراہیم کی شہرت و رفعت کا ذکر وابستہ ہے۔ بیت المقدس اور دوسرے مذہبی مقامات کو یہ امتیازات حاصل نہیں ہیں۔ عرب کے لوگ بت پرستی اور شرک میں مبتلا تھے، مگر باوجود اس کے وہ بھی خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب منسوب کرتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کی قیام گاہ، ان کے ترک و وطن و ذہاب الی اللہ کے مختلف منازل، ان کا قربانی کرنا اور اللہ قدوس کے لئے ایک گھر تعمیر کرنا، یہ سب چیزیں وہاں ملتی ہیں۔ ان کے نظر آتے ہی خود ہم میں بھی ویسے ہی جذبات حقہ موجزن ہوں گے۔ اسی ایثار و فدویت کی نشیو تولید ہوگی اور اسی حق و حریت کے لئے ہم بھی جان و مال قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ (ب) ومن دخله کان امنا: عرب کے لوگ اسلام سے قبل اپنی جہالت و بربریت کے لئے شہرہ آفاق تھے، مگر باوجود اس کے پھر بھی انہوں نے اس گھر کو امن والا رکھا۔ بڑے سے بڑا مجرم یہاں آکر پناہ لے سکتا تھا اور کسی کو اس کے گرفتار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، قنادہ کہتے ہیں: کان هذا فی الجاہلیۃ کان الرجل لو چوکل جریرۃ علی نفسه ثم لجاء الی الحرم لم یتناول ولم یطلب۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ اگر ایک شخص جرائم کے ارتکاب کے بعد بیت اللہ میں آکر پناہ لیتا تو اسے کوئی گرفتار نہ کر سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لو وجدنا فیہ قاتل الخطاب ما مسته حتی یخرج منه، اگر میں اپنے والد کے قاتل کو بھی بیت اللہ میں دیکھ پاؤں تو جب تک وہ خود باہر نہ آئے گا میں اس کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ: جب ایک مجرم بھاگ کر حرم کی پناہ لے لے تو جب تک وہ باہر نہ آجائے اس پر حد نہیں جاری ہو سکتی۔ فتح مکہ کے روز خود لسان نبوت نے اس گھر کے امن والا ہونے کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔

قام النبی ﷺ الغد من یوم الفتح فقال ان مکة حرمها الله ولم یحرمها الناس فلا یحل لامری یومئذ بان الله والیوم الآخر ان یسفک بها دما او یعضد بها شجرة فان احد ترخص لقتال رسول الله ﷺ فقولوا ان الله قد اذن لرسوله، ولم یاذن لکم وانما اذن لی ساعة من نهار، ثم عادت حرمتها کحرمتها بالامس۔

”آپ نے فرمایا کہ اس گھر کی حرمت خدا کی طرف سے ہوئی ہے نہ کہ لوگوں کی طرف سے، پس ایک مسلمان کے لئے ہر گزیہ جائز نہیں کہ اس حرم میں خون بہائے یا اس کا کوئی درخت کاٹے اور اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے فعل سے استنبہ کرے تو اس سے کہہ دو کہ رسول کو تو خود اللہ نے اجازت دی تھی اور وہ بھی نہایت ہی قلیل وقت کے لئے اور تمہیں تو کسی نے اجازت نہیں دی۔ رسول اللہ کے اس قتال کے بعد اس گھر کی حرمت پھر سابق کی طرح عود کر آئی۔“

اس کے با امن گھر ہونے کا تو یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ رسول اللہ نے اس میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل ہونے کو قانوناً روک دیا: لا یحل لاحدان یحمل السلاح بمکۃ۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہتھیار بند مکہ میں داخل ہو۔

مُجملہ اور ضروریات کے، جن کی بنا پر بیت اللہ الحرام کو امن والا گھر بنانا ضروری قرار دیا گیا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی گھر کے ذریعہ سے دنیا کی تمام قوموں میں اتحاد و اشتراک عمل پیدا ہو اور کرہ ارضی فتنہ و فساد کی بجائے امن اور سلامتی کی جگہ بن جائے۔

(ج) ولله على الناس حج البيت: دنیا میں جس قدر مذہبی مقامات اور زیارت گاہیں موجود ہیں ان پر بارہا دشمنوں نے حملے کئے، ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ان کو تباہ و برباد کر دیا، مگر اس بیت اللہ الجلیل کے لئے تمام دنیا کے مسلمانوں پر لازمی کر دیا گیا کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت محفوظ رکھیں کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر قابض نہ ہو سکے، تاکہ یہ امن کا گھر رہے اور ہر زمانہ میں لوگ اس کاج کر سکیں۔ اہل جاہلیت باوجود جدال پسند ہونے کے اس بیت الامن کا احترام و اجالہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔

دوسری قوموں کے اختلاط سے بسا اوقات انسان اپنے خصائل و امتیازات کو فراموش کر دیتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ مٹ جاتے ہیں۔ ان خارجی اثرات سے بچنے کے لئے ہر صاحب استطاعت مسلمان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اپنی تمام زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہ بیت اللہ جا کر اپنے جذبات ملی کو تازہ کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے من استطاع الیہ سبیلا کی تفسیر رسول اللہ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا: الزاد والراحلة۔

چونکہ اس گھر کو تمام معتقدین توحید کے لئے مرکز قومی قرار دیا گیا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ مُجملہ اور شرائط اور قیود کے امن پر بہت زیادہ زور دیا جائے، تاکہ ہر سال دنیا کے بہترین دل و دماغ بلاروک ٹوک تبلیغ توحید کی سب سے بڑی مجلس شوریہ قائم کر کے ان ذرائع و وسائل پر غور کریں جن کی وجہ سے تمام دنیائے اسلام میں اتحاد قائم ہو، کرہ ارضی کی تمام اسلامی حکومتیں ایک لڑی میں منسلک ہو سکیں اور دنیا کے باقی حصوں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی راہ عمل معین کر سکیں۔ مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی، عمرانی و اجتماعی اور اخلاقی و ادبی احیاء و تجدید کے لئے حج سے بہتر کوئی اجتماع نہیں ہو سکتا، فہل من مدکر۔

حج کے اسرار و مصالح پر صد ہا دفاتر تیار کئے جاسکتے ہیں جن کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں اور عقلمند کے لئے گزشتہ سطور ہی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کافر کہا جو باوجود استطاعت، حج نہ

کریں۔ ان لوگوں میں صحیح طریق پر کام کرنے کی قابلیت حج کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ترین دماغ ایک مرکز پر جمع ہو کر ارتقائے اسلام اور بقائے خلافت کے مسائل پر غور کریں۔ حدیث میں آتا ہے: من ملک زاداد وراحلة ولم یحج بیت اللہ فلا یضراہ مات یہودیا اونصرانیا، جو مسلمان باوجود طاقت رکھنے کے حج نہیں کرتا، اب وہ خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس قسم کے الفاظ فرمائے ہیں: من اطاق الحج فلم یحج ففسوا علیہ مات یہودیا اونصرانیا۔ حسن بصری رضی اللہ عنہ حضرت عمر کا یہ قول نقل کرتے ہیں: لقد هبت ان ابعث رجالا الى هذه الامصار فينظروا لي كل من كان عنده جدقة فلم یحج فیضربوا علیہم الجبۃ مالہم مسلمین مالہم مسلمین، میں چاہتا ہوں کہ تمام بلاد اسلام میں ہر کارے بھیج کر ان لوگوں کو معلوم کروں جو باوجود استطاعت حج نہیں کرتے تاکہ ان پر میرے ہر کارے جزیہ لگا دیں، یاد رکھو اس قسم کے لوگ ہر گز مسلمان نہیں ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیائے اسلام میں سے بہترین حکمران گزرے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ان کی نسبت جو کچھ فرمایا ہے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت سے پُر ہے، وہ فرماتے ہیں: ”سینہ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد، در ہر درے صاحب کمالے نشستہ و در یک در مثلاً اسکندر و ذوالقرنین باں ہمہ سلیقہ ملک گیری و جہاں ستانی و جمع جیوش و برہم زدن اعدا و در دیگر نوشیر و انے باں ہمہ رفق و ولین و رعیت پروری و داد گستری اگر چہ ذکر نوشیر و ان در محبت فضائل حضرت فاروق سوا ادب است و در دیگر امام ابوحنفیہ و امام مالکی باں ہمہ قیام بہ علم فتویٰ و احکام و در دیگر مرشدے مثل سیدی عبد القادر جیلانی یا خواجہ علاء الدین و در دیگر محدثے بر وزن ابو ہریرہ و ابن عمر و در دیگر حکیمے مانند جلال الدین رومی یا شیخ فرید الدین عطار مردمان گرداگرد ایں خانہ خانہ ایستادہ اند، دہر محتاجے حاجت خود را از صاحب فن درخواست می نماید و کامیاب میگردد، سبحان اللہ! حضر عمر کے سامنے یہی حقائق تھے جن کی بنا پر وہ ہر ایک مستطیع مسلمان کو حج کے لئے مجبور کرتے تھے۔

## اپنی تکذیب آپ

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَٰتِ ٱللَّهِ ۖ وَٱللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”کہہ دو اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔“

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، علمائے عہد عتیق و جدید پر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حرفا حرفاً توراۃ اور انجیل کی تصدیق و تائید میں ظہور پذیر ہوا ہے، پس ایسے کھلے کھلے اور ناقابل انکار نشانات کے معلوم ہونے پر بھی اہل کتاب کا سر تسلیم خم نہ کرنا اور برابر منحرف رہنا، کس قدر بد نصیبی اور ہٹ دھرمی ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ اسلام ہی حق مذہب ہے اور یہ ایسی صاف باتیں ہیں کہ معمولی عقل والا آدمی بھی ان کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ بد بخت پھر بھی تکذیب کئے جا رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ خود توراۃ کی پیشینگوئی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہودہ حرکات کو دیکھ رہا ہے،

وہ ضرور ان کو سزا دے گا اور یہ اپنے کئے کا بدلہ پائیں گے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنِ آمَنَ تَبَغُّوهَا وَعِجَازًا أَتُنتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

کہہ دو، اے اہل کتاب! تم ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لاپچکے، باوجود خبردار ہونے کے تم اس میں عیب ڈھونڈتے ہو اور ان کاموں سے اللہ بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔

اہل کتاب کی برابر یہی کوشش ہے کہ جس طرح ممکن ہو لوگوں کو اسلام لانے سے روکیں، اپنی حماقت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس میں کج بحثی شروع کر دیں اور مسلمانوں کے دلوں میں خطرات و وساوس پیدا کر دیں اور یہ جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں۔

## فصل ثانی

### انقطاع تعلقات

مسلمانوں کو خلافت ارضی کا وعدہ دیا گیا، مگر اس کے لئے اولین شرط یہ قرار پائی کہ وہ کفار و معاندین اسلام سے دوستانہ تعلقات توڑ دیں، کیونکہ یہی رشتہ اتحاد ان کی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتا ہے۔ ممکن تھا کہ بعض حیلہ جو طبیعتیں اہل کتاب کی ظاہری رواداری، احسان و مروت اور زبانی پاسداری سے متاثر ہو کر ان کی دوستی کو ترجیح دیتیں، انہیں یہ خیال ہوتا کہ جب یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مذہب کے پابند ہیں تو ہمیں کاہے کو دھوکا دیں گے۔

اس شک و اشتباہ کو دور کرنے کے لئے گزشتہ آیات میں ان اہل کتاب کی خرابیاں نہایت تفصیل سے بیان کی گئیں کہ ان کا مکرو فریب واضح ہو جائے اور کوئی مسلمان ان کے خدع و فریب میں نہ پھنسے۔ جب ان کی اصلی تصویر سامنے آگئی تو اب فرزند ان اسلام کو ہمیشہ کے لئے یہ حکم سنا دیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فِرْيَقًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْثُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ۝

“اے ایمان والو! اگر ان میں سے کسی گروہ کا تم کہنا ہو کہ جن کو کتاب دی گئی ہے تو تمہارے ایمان لانے کے بعد وہ تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔“

اس آیت میں دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی شرط و جزا واقع ہو رہی ہیں:

(الف) شرط: اگر تم نے اہل کتاب کے کسی فریق کی اطاعت کی، اہل کتاب میں یہودی اور عیسائی دونوں برابر ہیں، اس لئے دونوں میں سے کوئی مراد ہو سکتا ہے۔ اطاعت کا لفظ بھی عام ہے اس میں کسی شق کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ اس میں مذہبی، اخلاقی، تعلیمی تمدنی معاشرتی اور سیاسی ہر قسم کی اطاعت و فرمانبرداری داخل ہے اور کوئی وجہ

نہیں کہ بغیر کسی دلیل کے ایک معنی کو خاص کر لیا جائے۔

بہر حال شرط یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہودیوں یا عیسائیوں کی اطاعت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

(ب) جزا: سزا یہ ملے گی کہ وہ درپردہ ایسی کوششیں جاری رکھیں گے، ایسے مکر و فریب سے کام لیں گے اور اس قسم کی حیلہ سازیاں کریں گے کہ مسلمانوں کو بے ایمان بنادیں، پھر وہی مدعیان اسلام اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کو قتل کریں گے اور اس قتل و خونریزی پر علی الاعلان فخر کریں گے، اپنی حکومتوں اور سلطنتوں کو ان کے حوالے کرتے جائیں گے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بعض سجادہ نشینوں نے سقوط بغداد پر حکومت برطانیہ کو مبارکباد پیش کی اور اس کے جلوس مسرت میں شریک ہوئے۔ اسلام پر حملہ ہوتے دیکھیں گے اور ان کے کان پر جوں تک نہ ریگے گی، اسلام و ایمان، جوش ملی و مذہبی اور ولولہ سرفروشی و فداکاری مٹ جائے گا اور اپنی مجلسوں میں قرآن و اسلام پر اعتراض کر کے اس کی عظمت و احترام کو مٹانے کی ناکام کوشش کریں گے۔

اس شرط و جزا نے واضح کر دیا کہ ان دونوں فریقوں کی اطاعت کرنا کفر کے مرادف اور ہم معنی ہے۔ پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے پرہیز کریں اور ان کی مخالفت کو اپنا شعار ملی قرار دیں، اگرچہ بعض کم فہم مسلمان اس حکمت کو سمجھنے سے اب تک قاصر رہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُبْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ٥

“اور تم کس طرح کفر کرنے لگو گے حالانکہ اللہ کی آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول موجود ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑ لیتا ہے وہ راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے۔”

غیروں کی اطاعت دو ضرورتوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے، اپنے پاس کوئی مکمل قانون اور دستور العمل موجود نہ ہو یا قانون تو ہو مگر اس کے عملی نمونے سامنے نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دونوں ضرورتوں کو پورا کر دیا ہے۔ ان میں قرآن موجود ہے جو درس حکمت ہونے کے ساتھ بہترین ضابطہ عمل بھی ہے، اس لئے انہیں یہود و نصاریٰ کی اطاعت ایک لمحہ کے لئے بھی جائز نہیں، تمام مسلمان اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کامیاب و بامراد وہی شخص یا جماعت ہو سکتی ہے جو اس کتاب کو اپنا امام بنائے اور اس کی شرح و تفصیل کے لئے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ٦

“اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرنا مگر مسلمان۔”

کامیابی اور حکومت کی بقا کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں تقوی اللہ پیدا ہو۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ حق تقاتہ کی ناخ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم ہے، مگر حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کی نہایت

عمدہ تطبیق بیان کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق عقائد سے ہے اور ما استطعتم اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تو جیہ کے بعد نسخ و منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ شریعت اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر ایک مسلمان مقاصد اسلام و محاسن شریعت کا پیکر مجسم ہو، اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کی مثال ہو اور تمام دنیا کے ارباب عقل و خرد اس کی سیرت اور کیریٹر کی تحسین پر مجبور ہوں اور جب تمام قوم میں ایسے افراد کی کثرت ہوگی تو ساری جماعت حقیقتاً خیر امت اخراجت للناس کی مخاطب صحیح بن سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ہر ایک مسلمان کو اپنے اندر تقوی اللہ اور خشیت الہی پیدا کرنے کا حکم دیا، یعنی خدا کا جو حکم ہے اس کے پورا کرنے میں کاہلی اور سستی نہ ہو، اس کے مقدس نام پر جان قربان کرنے کو تیار ہوں اور ہر حال میں فرماں بردار رہیں، نہیں معلوم موت کس وقت آجائے۔

فرقہ بندی ممنوع ہے

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۳۱﴾

”اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی تو اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تو اس نے تم کو اس سے بچالیا، اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔“

فتح و کامرانی کے لئے ایک ضروری عنصر یہ ہے کہ ساری قوم اس حبل اللہ الجلیل، نور و ہدی، شفاء لہما فی الصدور، کتب مبیین اور بصائر للناس یعنی قرآن حکیم کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ حبل اللہ کی شرح رسول اللہ ﷺ سے بھی قرآن حکیم ہی مروی ہے: کتاب اللہ ہو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض۔ اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے: انی تارک فیکم الثقلین، کتب اللہ تعالیٰ حبل ممدود من السماء الی الارض وعتدی اهل بیتی۔ میں تم میں کتاب اللہ اور اہل بیت دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں۔ عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں: هذا القرآن حبل اللہ۔ حضرت علی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ نے آنے والے فتنوں کا ذکر کیا تو صحابہ نے پوچھا ان سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ فیہ نباء من قبلکم وخیبر من بعدکم، وحکم ما بینکم وحوبل اللہ المتین۔ قرآن سے تمسک و اعتصام کرو اس لئے کہ عبرت و بصیرت کے لئے اس میں گزشتہ امتوں کے واقعات، آنے والے حوادث، قوانین و ضوابط بیان کئے گئے ہیں اور یہی حبل اللہ المتین ہے۔ مسلم



میں ابو ہریرہ کی روایت نے اس پر اور زیادہ روشنی ڈالی ہے: ان اللہ یرضی لکم ثلاثا ویسخط لکم ثلاثا یرضی لکم ان تعبدوا ولا تشمکوا بہ شئاً وان تعتصبوا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا، وان تناصحوامن ولاہ اللہ امرکم، ویسخط لکم ثلاثا، قیل وقال، وکثرة السوال، واضاعة المال، اللہ کو تمہاری یہ تین چیزیں پسند خاطر ہیں: شرک سے اجتناب اور ایک خدا کی عبادت، اعتصام بحبل اللہ اور اختلاف سے پرہیز اور یہ کہ حکام کی خیر خواہی اور فضول کو اس، کثرت سوال اور مال کا ضائع کرنا اسے پسند نہیں آتا۔

دنیا میں انفرادی کامیابی اور ذمہ داری کا احساس کوئی چیز نہیں جب تک اس میں اجتماع وانضمام نہ پیدا ہو۔ اگر ہم تمام قوم کو جسم سے تعبیر کریں تو اس کے تمام افراد مختلف اعضاء و جوارح ہوں گے۔ جسم کی ترقی اور نشوونما یہی ہے کہ اس کے تمام اعضاء تناسب کے ساتھ ترقی پذیر ہوں۔ اگر ایک شخص کی ایک آنکھ بہت بڑی اور قوی ہو اور باقی تمام جسم کمزور ہو تو وہ کبھی صحیح البدن نہیں کہلا سکتا۔ یہی حال قوم کا ہے اگر اس کے چند افراد مناصب عالیہ پر فائز ہوں، حالانکہ غلام ہوتے ہوئے یہ بھی محال ہے اور باقی لوگ اسی جہالت و لاعلمی، غربت و افلاس، غلامی و محکومی اور بے راہ روی و بطالت میں مبتلا ہوں تو یہ کامیابی نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور نعمتیں جماعت پر نازل ہوا کرتی ہیں۔ ید اللہ فوق یدہم سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ید اللہ علی الجماعت کا بھی یہی مطلب ہے۔ من شنذ، شنذ فی النار، جماعت سے علیحدگی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ اور ذلت و رسوائی کی ضامن ہے۔ جب کسی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جائے تو وہ خود بخود مٹ جاتی ہے، کیونکہ اس کے افراد آپس میں کٹ کر مر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم حکومتیں ہمیشہ قومیت متحدہ کو توڑنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔

عرب جاہلیت کی مثال تمہارے سامنے ہے، جہاں بھائی بھائی کا دشمن تھا اور ذرا سی بات پر خون کی ندیاں بہا نا ان کا دلفریب مشغلہ۔ قرآن مجید نے ان کو چند عقائد حقہ پر جمع کر دیا، جس کے اثر سے پشتینی دشمن پیکر اخلاص و محبت بن گئے کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور تاریخ کے اوراق اس قسم کی مثال سے خالی ہیں۔ اگر مسلمان اس کتاب عزیز کو اب بھی اپنا نام و پیشوا بنالیں تو اس میں اب بھی یہ قوت موجود ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو پھر ایک کر دے۔

کاش ہمارے عربی مدارس کے اساتذہ اپنے اثر سے کام لے کر مختلف بلاد و امصار کے طلبہ میں یہ روح اتحاد پھونکنے کی کوشش کریں تو کیا عجب ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان کی مساعی جلیلہ کو مشکور فرمائے۔ انگریزی درس گاہوں میں یہ بات شاید بطریق احسن ہو سکتی اگر وہاں یہ دو مخالف عنصر جمع نہ ہوتے۔

(الف) یورپ ہر چیز کو تاجرانہ نظر سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس لئے شاگرد کے نزدیک استاد کی حیثیت ایک تاجر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

(ب) اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر ذہانت مسلمانوں کی فرقہ بندی اور انتشار کی ترقی میں صرف کرتے ہیں۔



## دعوت و ارشاد

وَلَتَنُكِّنَنَّ مِنْكُمْ أُمَّةً يَذْعَبُونَ إِلَى الْخَبِيرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٠﴾

”اور چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیک کام کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

اہل باطل کی طرف سے افساد فی الارض کی کوششیں برابر جاری رہیں گی، پس اہل حق کا فرض ہے کہ وہ حقانیت کی تبلیغ میں پورے کوشاں رہیں اور اس کے لئے اعلیٰ ترین دل و دماغ مصروف عمل رہیں، تاکہ مخالفین حق کی دجالانہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس جماعت کے فرائض کی ضمنی تقسیم یوں ہو سکتی ہے:

(۱) دعوت الی الخیر: اصلاح ارض کے لئے قرآن اللہ تعالیٰ کا مکمل ترین فرمان ہے، ہمارا فرض ہے کہ اس کی آواز کو خدا

کی زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچادیں، چپہ بھر زمین اس سے خالی نہ رہے اور ہر جگہ قرآن ہی کی حکومت ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سب کے سب اس طفرائے امتیاز سے سرفراز تھے، ان کی زندگیاں اس تعمیل ارشاد کی بہترین نمونہ تھیں۔ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ اطراف عالم میں اسلام کی اشاعت ہمارا فرض ہے۔ بلغوا عفی ولو آیت نے ان کے اس شوق کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ اسی کی خاطر وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے تھے، مگر آہ ثم آہ! آج ہم اس عظیم ترین فرض سے غافل، آرام اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہی سہل انگاری ہماری بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔

آج دنیا کی کوئی طرف اسلام سے خالی نہیں، مگر اس کو ہماری سعی و کوشش سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ اس ایثار و فدویت کے آثار و علامت ہیں جو صحابہ کرام اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اس راہ میں ظاہر کی۔ اس وقت تو ہر فرد مبلغ اسلام اور داعی قرآن تھا۔ ہماری یہ حالت ہے کہ خود علمائے کرام نے اس فرض جلیل کو ترک کر دیا ہے اور اپنے بدترین نمونے سے اسلام کی وسعت میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ پھر قوم کی حالت کس قدر خطرناک ہے جو خرچ تو کر رہی ہے مگر آمدنی کے ذرائع و وسائل نہیں رکھتی، جب اس کے افراد نہیں بڑھیں گے تو عروج و ارتقا کی کیا صورت ہوگی۔

(۲) امر بالمعروف: مسلمان شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کئے گئے ہیں، اس لئے اس زمین کی پشت پر نیک راہ قائم

کرنا، لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دینا اور ان کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کرنا ایک مسلمان ہی کا فرض اہم و اعظم ہے۔ دنیا میں جب کبھی حق و حریت کی بنیاد پڑے تو اس کی خشت اول ایک مسلم ہی کے ہاتھ سے رکھی جانی چاہئے اور مسلمانوں کا اولین کام یہی ہے کہ وہ تمام افراد کو اتحاد و اشتراک عمل کی دعوت دیں کہ تمام نیکیوں کی بنیاد اسی پر ہے اور گزشتہ آیات میں اسی پر زور دیا گیا ہے۔

(۳) نہی عن المنکر: دنیا کے کسی گوشہ میں برائی ہو یہ مسلمان ہی کا فرض ہے کہ اس کو روکے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کا



کامیابی کے یہی تین اصول تھے جن کا نتیجہ اس آیت کے آخر میں بتا دیا گیا کہ جو لوگ ان اصول پر چلیں گے وہ اپنی دنیاوی شوکت کے مالک ہوں گے۔ آج مسلمانوں نے ان فرائض کو ترک کر دیا، اس لئے سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی نتیجہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اُولَئِكَ مُشْجَنُونَ اِنَّ يَبْعَثُ عَلَيْهِمْ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ فَلَاحِ يَسْتَجِيبُ لَكُمْ۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف ہو جاؤ، ورنہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر عذاب نازل کرے گا، پھر تم والہانہ دعائیں کرو گے اور ان کو شرف اجابت نہ بخشا جائے گا۔ ایک روایت میں آپ نے داعی اسلام کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے نام سے یاد فرمایا ہے: مَنْ اَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَى عَنِ الْمُنْكَرِ كَانَ خَلِيفَةَ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ وَخَلِيفَةَ رَسُولِهِ وَخَلِيفَةَ كِتَابِهِ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ یا ایہا الناس اتنبہوا بالمعروف واتنبہوا عن المنکر، تعیشوا بخیر۔ لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تو آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرو گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے: افضل الجہاد الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔

### اختلاف سے بچو

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۵۵﴾

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ ان کے پاس صاف احکام آچکے اور انہی کے لئے بھاری عذاب ہے۔“

مسلمانوں کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ اپنی مجتمع قوت کو پاش پاش کر دیں اور مختلف فرقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کا گلا گائیں۔ مسلمانوں سے قبل صد ہا اقوام و ملل دنیا میں ہو چکی ہیں جن کو دو نعمتیں نوازش کی گئی تھیں، اس زمانہ کے مطابق اعلیٰ ترین علم اور باہمی اتحاد و اشتراک عمل، مگر ایک وقت ان پر ایسا آیا کہ وہ اختلاف کا شکار ہو گئیں، ان میں فرقے فرقے بن گئے، ان کا شیرازہ قومی منتشر ہو گیا اور انجام کار اس جرم عظیم کی پاداش میں ان کو غلامی و محکومی کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ اگر مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگے تو یہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

لسان نبوت نے اس کثرت سے مسلمانوں کو اختلاف سے ڈرایا تھا کہ اس کا استقصا مشکل ہے، مگر افسوس کہ فرزند ان اسلام کچھ ایسے پنبہ درگوش ہیں کہ ان الفاظ کی طرف توجہ تک نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: لا تختلِفُوا فتختلف قلوبکم، اختلاف مت کرو کہ آخر کار یہی مرض تمہارے دلوں میں جاگیر ہو جائے گا۔ دوسرے موقع پر آپ نے اس سے یوں ڈرایا: انہا ہلکت بنو اسرائیل بکثۃ سوالہم و اختلافہم علی انبیائہم۔ بنی اسرائیل صرف اس لئے ہلاک ہوئے کہ وہ کثرت سے سوالات کرتے اور اپنے انبیائے کرام کے متعلق اختلاف میں مبتلا ہوتے تھے۔ جس وقت آپ نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ اشعری کو یمن کی طرف بھیجا تو منجملہ اور باتوں کے ایک وصیت خاص طور سے یہ فرمائی: تلاقوا ولا تختلفا، ایک دوسرے کی اطاعت کرنا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرزند ان اسلام کو تفریق کے عواقب

المیہ سے یوں ڈرایا: افتقرت الیہود علی احدى وسبعین فرقة وتفرقت النصارى علی ثنتين وسبعین فرقة، وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقة، یہودیوں کے ۷۱ فرقے بن گئے عیسائیوں کی تقسیم ۷۲ میں ہو گئی اور میری امت کے لوگ ۷۳ گر وہ بن جائیں گے۔ ابن ماجہ میں اس طرح آتا ہے: فواحدة فی الجنة وثنتان وسبعون فی النار قیل یا رسول اللہ! فمن هم قال الجباعة، ان میں سے ۷۲ تو جہنم کا ایندھن بنیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ جنت میں جانے والے کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ جو جماعت کے ساتھ ہیں۔ حاکم کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے آپ سے اس جماعت کے خصائص و امتیازات دریافت کئے تو آپ نے جواب دیا: ما انا علیہ واصحابی، صرف وہ لوگ جو میری اسوہ حسنہ اور میرے صحابہ کے طرز عمل کو مضبوطی سے پکڑیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ اسی اختلاف و تفریق کا خوف تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی سے مسلمانوں کو ڈرایا، ابو داؤد میں حضرت ابو ذر غفاری کی روایت ہے: من فارق الجباعة شبرا فقد خلع ريقه الاسلام من عنقه، جو شخص ایک بالشت بھر بھی جماعت کے اعمال و عقائد سے ہٹ گیا تو وہ دائرۃ اسلام سے خارج ہو گیا۔ بغوی کی روایت بتاتی ہے کہ دخول جنت کی اولین شرط یہی قیام اتحاد ہے: من ساء ان یسکن بحبوة الجنة فعليه بالجباعة فان الشيطان مع الغد وهو من الاثنين ابعد، جس مسلمان کی یہ آرزو ہے کہ وہ جنت میں قیام پذیر ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہے، اس لئے کہ جس نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تو شیطان فوراً اس پر قابو پالے گا اور جب دو مسلمان آپس میں متحد ہو جاتے ہیں تو ان میں جماعتی زندگی آ جاتی ہے اور اسی لئے شیطان ان پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

سبحان اللہ! رسول اللہ نے اپنی دور بین نگاہوں سے اس حقیقت کو اسی وقت اپنے سامنے دیکھ لیا تھا کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب خود عرب کے بعض لوگ ہی تمام مسلمانان عالم کے اختلاف و تفریق کا باعث بن جائیں گے، اپنی نفسانی خواہشات کی بنا پر دنیا بھر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے اور ان کی راہ ترقی میں زبردست رکاوٹ بن جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی صاف صاف فرما دیا تھا: ابو عامر عبد اللہ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم سب حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک مرتبہ حج کی خاطر مکہ کو روانہ ہوئے، جب وہاں حج سے فارغ ہو گئے تو نماز ظہر کے بعد حضرت معاویہ نے حسب ذیل خطبہ دیا:

ان رسول اللہ ﷺ قال ان اهل الكتابین افترقوا فی دینہم علی ثنتين وسبعین ملة وان هذه الامة ستفترق علی ثلاث وسبعین ملة یعنی الالهواء، کلہا فی النار الا واحدة وہی الجباعة، وانه سیخڑ جفی امتی اقوام تتجاری بہم الالهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لا یتقی منه عرق ولا مفصل الا دخلہ واللہ یا معشای العرب لئن لم تقوموا بہا جاء بہ نبیکم ﷺ یرفی کم من الناس احرى ان لا یقوم بہ،

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ ملت اسلام اپنی خواہشات نفسانی کی بنا پر ۷۳ جماعتوں میں منقسم ہو جائے گی۔ جماعت کے ساتھ رہنے والوں کے سوا باقی سب دوزخ کی نذر ہوں گے۔ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو یکسر بندہ حرص و آرزو ہوں گے، ان کے بدن کار و نگار و نگار و نگار میں آلودہ ہو گا۔ اے اہل عرب! اگر تم شریعت اسلام کو قائم نہیں رکھ سکتے، تو پروا نہیں اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لئے دوسری جماعتوں کو منتخب کر لے گا جو اس فرض کو فخر و مباہات کے ساتھ ادا کریں گے۔“

آج عرب کی سر زمین اسی کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور دنیا اسلام کو اسی نے تکلیف و مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتاب بصائر میں بحث کی ہے، ومن شاء التفصیل فلیدرجہ شہ۔

### اتحاد و اختلاف کے نتائج

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَ تَسْوَدُّ وُجُوهٌُ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۱۵۰﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۵۱﴾

”جس دن بعض منہ سفید ہوں گے اور بعض منہ سیاہ ہوں گے، کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے اچھا تم جو کفر کرتے تھے، تو عذاب چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اگر ایک جماعت میں مختلف اغراض و مقاصد کے لوگ مصروف عمل ہیں، ایک گروہ تو اتحاد کی دعوت دیتا ہے اور دوسرے اختلاف کی طرف بلاتا ہے تو لازمی امر ہے کہ دونوں کے نتائج و ثمرات جدا گانہ ہوں۔ اسی دنیا میں ان مختلف جماعتوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کامیابی کا ذریعہ وحید اتفاق اور صرف اتفاق ہے اور مرنے کے بعد ان ارباب اتحاد کے چہرے نہایت ہی روشن اور خوبصورت ہوں گے، مسرت و شادمانی، فرح و ابساط اور کامیابی و کامرانی پر خوشی کا اظہار کریں گے اور ان کی فضیلت و برتری ہر جگہ نمایاں ہوگی۔

لیکن جن بد بختوں نے اختلاف و انشقاق کی کوشش کی، اپنی قوم کو الگ الگ کرنے اور فرقے فرقے بنانے میں مصروف رہے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ غیروں نے ان کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا محکوم بنالیا۔ پھر مرنے کے بعد حزن و ملال، رنج و غم اور یاس و حرمان میں مبتلا ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں بہترین علم نوازش کیا گیا، مگر تم نے بد بختانہ کوئی قدر نہ کی، اب اس کفر و عصیان کے مزے لو۔

قرآن حکیم نے اگر جماعتی زندگی پر زور دیا ہے تو فرقہ بندیوں کے عواقب المیہ سے بھی ڈرا دیا ہے۔ سورہ انفال میں آتا ہے: وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا (انفال ۴۶) اور آپس میں جھگڑنا نہ کرنا کہ ایسا کرو گے تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔ آگے چل کر تالیف قلوب اور وحدۃ امتہ کو ایک عظیم الشان نعمت بتایا: وَالْفَّ يَبْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ

أَنْفَقَتْ مَآبِی الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَكَلَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ (انفال ۶۳) اور اُن کے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے، مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔ سورہ حشر میں بنو نضیر، یہود مدینہ کی ذلت و رسوائی اور جین و نامردی کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا: بِأَسْهُمَ بَيْنَهُمْ شَدِيدًا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى (الحشر ۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے، تم شاید خیال کرتے ہو کہ یہ اکٹھے اور ایک جان ہیں، مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ آج مسلمان اسی مرض اختلاف میں مبتلا ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو کافر بناتے ہیں۔

ففی رحمہ اللہ فرما کر ایک نہایت ہی دقیق اور بلند پایہ نکتہ کی طرف توجہ دلائی، جس تک پہنچنے کے لئے اس علم کی ضرورت ہے جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو اور وہ یہ ہے کہ خدا کی رحمتیں مختلف قسم کی ہیں۔ بعض وہ ہیں جو مومن اور کافر، سب پر یکساں طور سے نازل ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ارباب ایمان پر بھی اوقات خاصہ ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: ان الله نفحات، الافتعروضوا لها۔ اس تمہید کے بعد اس حدیث کو سامنے لاؤ جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: لن یدخل احدکم الجنة عملہ، محض اعمال کسی شخص کے دخول جنت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ کیا آپ کی ذات مبارک بھی اسی قاعدہ کلیہ میں داخل ہے۔ آپ نے فرمایا: حق انا الا ان یتغمدنی اللہ تعالیٰ برحمۃ۔ ہاں میرا بھی یہی حال ہے، البتہ صرف ایک صورت استثنائی کی ہے کہ خود خدائے رحیم وودود اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اعمال صالحہ پر بھی انسان کو نازاں نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے یہ ناز ہی کسی وقت خدا سے بعید کر دے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اس کی تعبیر یوں کر سکتے ہیں کہ اعمال صالحہ اللہ کی اس رحمت خاصہ کو جوش میں لائیں گے جو ارباب ایمان و اخلاص کو جنت میں داخل کرنے کا سبب بن جائے گی، پس اعمال فقط دخول جنت کا سبب قریب نہیں ہیں البتہ سبب بعید کہے جاسکتے ہیں۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلَمًا لِلْعَالَمِينَ ﴿٣٨﴾ وَلِلَّهِ مَآبِی السُّبُوتِ وَمَآبِی الْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٣٩﴾

”یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی جانب تمام کام لوٹائے جاتے ہیں۔“

ان اصول و کلیات کے ذکر کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ جس طرح پہلی قوموں کو علم صحیح دیا گیا اور اس کی وجہ سے ان میں اتفاق پیدا ہو گیا مگر ایک مدت کے بعد انہوں نے اس علم صحیح کی پروانہ کی اور اس اتحاد کو اختلاف سے بدل دیا، ایسے ہی ہم نے قرآن نازل کیا جس نے مسلمانوں کو ایک کر دیا لیکن وہ وقت بھی آسکتا ہے جب اس طریق مستقیم کے متعلق جس کو مہاجرین و انصار نے قائم کیا تھا مسلمانوں میں دو جماعتیں ہو جائیں۔

(الف) ایک گروہ مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چلنے کو اپنا فخر خیال کرے اور ہمیشہ مسلمانوں کو متحرک رکھنے کی سعی و کوشش میں رہے۔ اس جماعت کا امام و دستور العمل قرآن حکیم ہو گا اور اسی پر ماننا علیہ و اصحابی کے الفاظ صادق آئیں گے۔

(ب) دوسری جماعت اس اتفاق کی پروانہ کرے اور اس طرح کفار کے خدع و فریب کی شکار ہو جائے اور یہ جو کچھ ہو گا ان کی اپنی کر توت کا نتیجہ ہو گا۔ معاذ اللہ خدا کی طرف کسی ظلم کی نسبت نہیں ہو سکتی۔

## خیر الامم

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۸۱﴾

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی، تم نیک کام کا حکم دیتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یقیناً ان کے لئے اچھا ہوتا، ان میں بعض تو ایمان دار ہیں لیکن اکثر فاسق ہیں۔

دنیا میں آج تک صد ہا انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان کی امتوں نے اشاعت مذہب کا فرض بھی ادا کیا، مگر ان سب کا دائرہ عمل محدود تھا، ان سب میں اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ ﷺ کو نوازش کیا گیا کہ آپ کا روئے سخن تمام اقوام عالم کی طرف ہے، پھر آپ کو سب سے پہلے وہ قوم دی گئی جو دنیا میں ذلیل ترین خیال کی جاتی تھی، مگر آپ کے نفس قدسی نے اسی بدترین سر زمین میں سے مہاجرین و انصار کا بہترین گروہ تیار کر دیا جو سب قوموں پر سبقت لے گیا اور اقوام عالم، میزان اخلاق و ایمان میں ان کے پائنگ بھی نہ ہو سکے۔ اب جو لوگ بھی ان صحابہ کرام کے نقش قدم پر چل کر وہی فرائض ادا کریں گے وہ بھی خیر امت کے معزز ترین لقب سے سرفراز کئے جائیں گے: وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِالْحَسَنِ جَنُّوا فِي النَّارِ انْ كَانِیْكَ نِیْتِی کے ساتھ اتباع کیا، گویا خیر امت میں تمام دنیا کے مسلمان شامل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ان فرائض کو ادا کریں جنہیں صحابہ کرام انجام دیتے تھے۔

اس خیر کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ نوع انسانی کی رشد و فلاح، خیر و برکت اور ہدایت و سعادت کے لئے سعی و کوشش کریں۔ ان کی تخلیق کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ وہ ہر نیکی کے قائم کرنے والے اور برائی کے کرہ ارضی سے دور کرنے والے ہیں۔ ایک فرزند اسلام ہی وہ ذمہ دار ہستی ہے جو شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کی گئی ہے اور اسی کا یہ کام ہے کہ دنیا میں نیکی کی پادشاہت قائم کرے اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ دے: الَّذِیْنَ اِنْ مَكَثُھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ وَامَرُّوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ مسند امام احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ای الناس



خیر بہترین انسان کون ہے؟ آپ نے فرمایا: خیر الناس اقراہم واتتاهم اللہ وامرہم بالمعروف وانہام عن المنکر واصلہم للرحم، وہ جو سب سے زیادہ قرآن جاننے وال، اخدا سے ڈر رکھنے والا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والا اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے۔ ترمذی میں ہے: اتم توفون سبعین امۃ اتم خیرہا واکرمہا ستر امتوں میں سے تم ہی بہترین والیٰ ترین ہو۔ مسند امام احمد میں ہے رسول اللہ نے فرمایا: اعطیت مالہم یعط احد من الانبیاء، مجھے وہ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ صحابہ نے سوال کیا وہ کونسی ہیں؟ تو آپ نے مجملہ اور خصوصیات کے ایک یہ فرمایا: وجعلت امتی خیر الامم، میری امت کو بہترین کیا گیا۔

اب اگر مسلمانوں کو خیر الامم کہا گیا ہے تو اس کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پیکر تبلیغ حق و مجسمہ دعوت اسلام ہوں گے۔

اللہ نگہبان ہے

لَنْ يَضُرَّوْكُمْ الْاٰذَىٰ ۚ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوْلُوْكُمْ الْاٰذِبَارَ ۚ ثُمَّ لَا يَنْصُرُوْنَ ۝۱۰ ضَرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا تُثَقُّوْا ۚ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰلِیَةِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاُكِنُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۱۱

”بجز تھوڑی سی تکلیف دینے کے وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے اور اگر وہ تم سے لڑیں گے تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیریں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ جہاں کہیں بھی پائے جائیں ان پر ذلت کی مار ہے، سوائے اس کے کہ اللہ کی دستاویز اور لوگوں کی دستاویز کے ذریعہ سے پناہ لیں اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے اور ان پر مسکینی کی مار ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔“

اگرچہ اس آیت میں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں صرف بنی اسرائیل مراد ہیں۔ اس لئے کہ آئندہ جن عذابوں اور نقائص و زمام کا ذکر آتا ہے وہ سب کے سب صرف یہودیوں ہی پر صادق آتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام قبول نہیں کرتے، اس لئے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے خوف کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے کہ ایسا نہ ہو یہ دجل و فریب سے کام لے کر مسلمانوں کو نقصان پہنچادیں۔ اللہ تعالیٰ پیشین گوئی کے طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، ان کی خباثت زیادہ تر مسلمانوں کو گالی ہی دینے تک محدود رہے گی: وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اٰذَتْوَا النَّکِیْبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰثَرُکُمْ اَذٰی کَثِیْرًا (آل عمران ۱۸۶) اور تم اہل کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے۔ اور اگر ان سے دست بدست لڑائی کا موقع ہو تو آخر کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی یہودیوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہے کبھی



کامیاب نہیں ہوئے۔

یہ بد بخت یہودی اب آئندہ سے بحیثیت قوم کے کبھی معزز نہ رہ سکیں گے بلکہ ذلت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی۔ نہ ان کو امن چین نصیب ہوگا اور نہ انہیں حکومت مل سکے گی، ہمیشہ جس و قید اور قتل و غارت کا شکار رہیں گے۔ صرف دو صورتوں میں ان کو دنیا میں امن میسر آسکتا ہے:

(الف) حبل من اللہ۔ اللہ کے معاہدہ کو تسلیم کر لیں، مسلمانوں کی حکومتوں میں رہیں یا اسلام قبول کر لیں۔  
(ب) حبل من الناس۔ غیر اسلامی حکومتوں سے عہد و پیمان کر کے ان کے ماتحت رہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ لیں کہ خواہ وہ اسلامی حکومتوں کے ماتحت رہیں یا کسی اور غیر مسلم طاقت کو تسلیم کر لیں، دونوں صورتوں میں ذلت و مسکنت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی اور کبھی انہیں حکومت نہ ملے گی۔ یہودیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو باوجود ارباب دولت و ثروت ہونے کے نہ ان کے پاس حکومت ہے اور نہ دنیا میں ان کی عزت، اگر اس کے بعض افراد اچھے بھی ہوں تو اس سے قومی ارتقاء پر کوئی اثر نہیں پڑتا، قومی حیثیت سے وہ ذلیل ہی سمجھے جاتے ہیں۔

مزید تفصیل

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتَّبِعُونَ آيَةَ اللَّهِ إِنَّآ الْبَيْتَ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿٢٠﴾ يَوْمَئِذٍ يَمُنُّونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢١﴾ وَمَا يَفْعَلُوا  
مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوا بِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٢٢﴾

”وہ سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے وہ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ سجدے کرتے ہیں وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہی نیکیوں میں سے ہیں اور وہ کسی طرح کی نیکی کریں ہر گز اس کی ناقدی نہ ہوگی اور اللہ پر ہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔“

گزشتہ آیات میں یہودیوں کے مغضوب ہونے کا ذکر تھا، اس کا یہ مطلب ہر گز نہ تھا کہ اب اس قوم سے ہر قسم کی خیر و برکت اٹھ گئی ہے، بلکہ یہ فیصلہ قومی حیثیت سے تھا، اس کے بعض افراد نزول قرآن کے وقت بھی نہایت ہی پاکیزگی اور طہارت کی زندگی بسر کرتے تھے جن کے اوصاف و کمالات یہ تھے:

(۱) راہ حق و صدق اور اطاعت خداوندی پر قائم و استوار تھے۔  
(۲) راتوں کو اٹھ اٹھ کر تلاوت آیات کرتے: تَتَجَلَّىٰ جَنُّوهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (السجہ ۱۶) ان کے پہلو پچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔

(۳) اپنی پیشانیوں کو اللہ کے حضور میں خاک آلود کرتے اور اسکے آستانہ گبریا کی جبہ سائی کو اپنی سعادت سمجھتے۔

(۴) وہ خدائے واحد کی ربوبیت اور احتساب اعمال کا دل سے یقین کرتے۔

(۵) دوسروں کی خیر خواہی اور نوع انسانی کی رشد و ہدایت میں اپنی تمام زندگی صرف کرتے۔

(۶) پھر ان کی کیفیت ایمانی اور طہارت قلبی کی یہ حالت تھی کہ ہر نیکی میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں

رہتے اور ہر وقت واجعلنا للمتقین اماما کے الفاظ ان کی زبان پر ہوتے۔

ایسے افراد کی سعی و کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاسکتی۔ چنانچہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے اور ان کا اسلام کے دائرے میں داخل ہونا ان کے سابقہ اعمال صالحہ کا نتیجہ تھا: اسلمت علی ما اسلفت من الخیر کا یہی مطلب ہے۔ ان ارباب حق و صدق کا ایک اور جگہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے: وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ لِحُسْنٍ لِلَّهِ لَا يَشْتَوُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ فَيَكْتُلُونَ قَلِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (آل عمران ۱۹۹) اور بعض اہل کتاب ایسے بھی ہیں جو خدا پر اور اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا حصہ ان کے پروردگار کے یہاں تیار ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٨﴾  
مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرَثَ قَوْمٍ طَلَعُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۖ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٩﴾

”جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئیں گے وہ دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے۔ جو کچھ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی میں صرف کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو جو ان کی کھیتی کو پہنچے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔“

جو بد بختان نوع انسانی محض نفرت و حقارت کی وجہ سے مذہبی احکام کو ترک کر دیں، ان کے لئے مال و اولاد بیکار ہیں: لن تنفعكم ارحامكم واولادكم يوم القيامة۔ قیامت کے روز مال اور رشتے دار تمہارے کام نہ آئیں گے۔ ایک جگہ فرمایا: يوم لا ينفع مال ولا بنون، جس دن مال اور اولاد، دونوں چیزیں بے سود ثابت ہوں گی۔ ان لوگوں کی مثال یہ ہے کہ ایک قوم نے جبر و تشدد اور ظلم و جور کر کے اپنے ماتحتوں سے خوب کام لیا، جب کھیتی بالکل تیار ہو گئی تو ایک ہی سرد ہوانے اس کا ستیاناس کر دیا۔ یہی حال ان نالائقوں کا ہو گا۔ یہ اسلام کی مخالفت میں پوری ہمت صرف کر لیں انجام کار ناکام و خاسر ہی رہیں گے۔

## منافقین سے پرہیز

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ  
وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٣٨﴾

”اے ایمان والو! اپنے سواغیروں کو رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کمی نہیں کرتے، چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت میں پڑ جاؤ۔ بیشک ان کے منہ سے بغض ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بڑھ کر ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے یقیناً تمہارے لئے باتیں کھول کر کے بیان کر دی ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آتے ہی اولین کام یہ کیا کہ یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا، جس کی پوری عبارت ہم سورۃ بقرہ کی تفسیر میں درج کر چکے ہیں، اس کی ایک شرط یہ تھی کہ یہ لوگ ہماری مدد کریں گے اور اگر دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو ہمارے ساتھ مل کر اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں گے۔

باوجود ان تمام عہد و موافق کے ان کی حالت یہ تھی کہ مشرکین و کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف برابر اکساتے رہتے۔ ان کی درپردہ مدد کرتے اور ان سے ساز باز رکھتے۔ ان کے علاوہ منافقین کا ایک گروہ تھا جو ان سے ملا ہوا تھا۔ ان کا بھی یہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں اور ان میں اتحاد و اشتراک عمل نہ پیدا ہونے دیں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ان تمام لوگوں سے علیحدہ رہنے، ان پر اعتماد نہ کرنے اور ان کو قومی نشو و ارتقا کی تجاویز نہ بتانے کا حکم دیا جائے۔ یہ بد بخت مسلمانوں کی قومیت متحدہ فنا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، بد زبانیاں کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کی تقریریں بتا دیتی ہیں کہ ان کو فرزند ان اسلام کے ساتھ کس قدر بغض و عداوت ہے اور دلوں میں تو اس سے کہیں زیادہ بدخواہی اور دشمنی رکھتے ہیں۔

بطانۃ کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے راز کی خبر کر دو۔ بخاری میں ہے: مابعث اللہ من نبی ولا استخلف خلیفۃ الا کانت له بطانتان، بطانۃ تامرہ بالخیرو تحضہ علیہ و بطانۃ تامرہ بالسؤ و تحضہ علیہ و المصوم من عصبہ اللہ، ہر ایک نبی یا اس کے خلیفہ کے ساتھ دو ہم راز ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اسے ہمیشہ خیر و صلاح کا مشورہ دیتا ہے اور دوسرا فسق و فجور پر ابھارتا ہے اور معصوم وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت عمر کو یہ مشورہ دیا کہ اہل حیرہ میں سے ایک نوجوان غیر مسلم بہترین کاتب اور منشی ہے، آپ اسے کاتب السرو پر ایویٹ سیکر ٹری بنالیں۔ آپ نے فوراً ان کی درخواست کو اس جواب کے ساتھ رد کر دیا: قد اتخذت اذا بطانۃ من دون المؤمنین، اس صورت میں تو میں مسلمانوں کو چھوڑ کر ایک غیر مسلم کو اپنا ہم راز و واقف اسرار بنالوں گا اور یہ ناممکن ہے۔ حضرت انس نے ایک مرتبہ بعض لوگوں کے سامنے یہ حدیث بیان کی: لا تستضيؤا بنار البشر کین جس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی آگ سے تم روشنی نہ لو۔ مگر ان کے احباب اس کا اصلی منشا نہ سمجھ سکے اور حضرت حسن بصری سے جا کر اس کا مفہوم دریافت کیا۔ انہوں نے کہا اس کے معنی یہ ہیں: لا تستضيؤا البشر کین فی امورکم، اپنے کاموں میں مشرکوں سے مشورہ نہ

کر و اور اسی مذکورۃ الصدر آیت سے استدلال کیا۔

## مزید تشریح

ان آیات میں ان لوگوں کے مکرو فریب کو اور زیادہ واضح کیا جاتا ہے:

هَآأَنْتُمْ أَوْلَاءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَٰلَيْكُمْ  
الْأَكْمَالَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُؤْتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ تَبَسُّسَكُمْ حَسَنَةٌ تَسُوءُهُمْ وَإِنْ  
تُصَبِّحُكُمْ سَيِّئَةً يَفْرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصَبِّحُوا لَا تَتَّقُوا لِأَيْضَتِكُمْ كَيْدَهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِبَيِّعَاتِكُمْ لَٰمِعِظٌ ﴿٥١﴾

“سننے بھی ہو تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم تمام کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، کہہ دو کہ اپنے غصہ میں مر رہو، بیشک اللہ سینوں کے راز کو خوب جانتا ہے۔ اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچ جائے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی برائی پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گار نبوت تو تم کو ان کا فریب کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا، بیشک جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب اللہ ہی کے بس میں ہے۔”

جن لوگوں میں مسلمانوں کا راز دار بننے کی اہلیت نہیں ہے اور جن پر فرزند ان اسلام کو ہر گز اعتماد نہ کرنا چاہئے، ان کی علامات حسب ذیل ہیں۔

- (الف) تم مسلمان اگرچہ ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہو، مگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارے دوست نہیں۔
- (ب) ملاقات کے وقت تمہارے قومی جلسوں اور عام مجامع ملی میں وہ اس قسم کی تقریریں کر جاتے ہیں جن سے سادہ لوح مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے خیر خواہ ہیں، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہوتا ہے۔
- (ج) مسلمانوں کے لئے ان کے دلوں میں اس قدر بغض و عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ اگر فرزند ان اسلام کو ذرہ برابر بھی بھلائی نصیب ہو تو وہ بد بخت غصہ کے مارے اپنے ہاتھوں کو کاٹے کھاتے ہیں کہ مسلمان کیوں کامیاب ہو گئے۔

(د) ان کی تکالیف و شدائد پر ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ تمام لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں، ان کے خدع و فریب سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ:-

(۱) ہر شعبہ حیات میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کریں۔

(۲) تمام مسلمان اپنے مقصد حیات اور قرآن حکیم کی نشر و اشاعت کی خاطر فنا ہونے کو تیار ہو جائیں۔

یہ اخلاق و کمالات خدا کی طرف سے اس رحمت خاصہ کو جذب کر لیں گے جس سے اجانب و اخیر مسلمانوں سے مقابلہ کے وقت اپنی تدابیر میں ناکام و خاسر رہیں گے۔

## باب نمبر ۴

### غزوہ احد

### فصل اوّل

ماقبل سے ربط

قرآن حکیم میں لفظ بینات جس مدعا کو ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک حکم دے کر اس کے تمام اسرار و مصالح بتا دیئے جائیں اور اس کے خلاف کرنے میں جس قدر نقصان کے پہلو ہیں ان کو واضح کر دیا جائے تاکہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کفار و منافقین اور اہل کتاب سے تعلقات و روابط نہ رکھیں، مگر عام لوگ منافقین کے دھوکے میں آکر اس حکم کی پوری تعمیل نہیں کر سکتے۔ لہذا شرح و تفصیل کے ساتھ منافقین کی خرابیاں ذکر کی گئیں۔ اب اسی نظریہ کو دو مثالوں سے اور زیادہ واضح کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اٹھارویں رکوع تک دو لڑائیوں کا تذکرہ آئے گا۔

(الف) جنگ بدر۔ اس کے لئے فقط چند آیات مخصوص کی گئی ہیں، اس میں مسلمان کامیاب ہوئے اور وہ اپنی فتح و کامرانی کے نتائج و ثمرات بھی حاصل کر سکے، حالانکہ ان کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس سامان حرب بھی کچھ نہ تھا۔ اس کامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ کفار کے ساتھ ان کے کسی قسم کے تعلقات نہ تھے، ہر ایک شخص صدق و اخلاص، جوش و ولولہ، عمل اور عزم و ثبات کا پیکر تھا۔

(ب) جنگ احد۔ زیادہ بحث اسی سے ہے۔ اس میں مسلمان کامیاب تو ہو گئے مگر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس لئے کہ تیر اندازوں نے باوجود صریح احکام کے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی اور اہل کتاب و منافقین کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط قائم ہو چکے تھے۔ یہ دونوں واقعات صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو کس قدر اس امر کی ضرورت ہے کہ قدم قدم پر وہ رسول اللہ کی اطاعت کریں اور اہل کتاب و منافقین سے دوستی نہ رکھیں۔

واقعات احد

ہم یہاں قارئین کرام کی آسانی کے لئے اس جنگ کے مختصر واقعات درج کئے دیتے ہیں کہ آئندہ آیات میں انھی

واقعات کے اسرار و مصالح سے بحث ہوگی اس لئے ان کو غور سے پڑھ لینا ضروری ہے۔

ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر ہوئی تھی جس میں کفار کی قوت پاش پاش ہو گئی تھی، کفار قریش نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے خوب زور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ رؤسائے قریش نے ان کو مسلمانوں کے خلاف اس طرح ابھارنا شروع کیا: ان محمد اقد و ترم و قتل اختیار کم فاعینونا بهذا المال علی حربہ لعننا ذرک بہ ثارنا بمن اصاب منا۔ محمد نے تمہیں برباد اور تمہارے بہترین رجال کو قتل کر دیا پس مال سے ہماری اعانت کرو کہ ہم بدلہ لے سکیں۔ شوال ۳ ہجری کو تین ہزار کا لشکر جرار لے کر مدینہ پر چڑھ آئے، ابوسفیان ان کا قائد عسکر تھا اور احد کے درمیان میں خیمہ زن ہوئے جو مدینہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ کو اس لشکر کی خبر ملی تو آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ راہ عمل معین کریں۔ آپ کی ذاتی رائے تو یہی تھی کہ شہر میں رہ کر جنگ کرنی بہتر ہے، مگر نوجوان صحابہ نے یہ عرض کیا کہ میدان میں نکل کر لڑنا زیادہ قرین صواب ہے۔ اگرچہ فوراً بعد ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مل کر درخواست کی کہ آپ جو چاہیں فیصلہ فرمادیں ہم اس کو بسر و چشم قبول کریں گے، مگر آپ نے فرمایا: لاینبغی لنبی ان یلبس لامۃ فیضعہا حق یتقاتل، سامان جنگ پہن لینے کے بعد نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لڑے بغیر اس کو اتار دے۔ چنانچہ آپ ایک ہزار جوان لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔

عبداللہ بن ابی، سردار منافقین کی رائے اس فیصلہ کے بالکل مخالف تھی، وہ آپ کے ہمراہ چل تو پڑا، مگر عین راستے میں سے اپنے تین سو ہمراہی لے کر واپس لوٹ آیا اور اب ذات رسالت کے ساتھ صرف سات سو فد اکاران اسلام رہ گئے۔ میدان میں جاتے ہی آپ نے تمام صحابہ کو مختلف مقامات میں کھڑا کر دیا، ایک گھاٹی ایسی تھی جہاں سے مسلمانوں پر عقب سے حملہ ہو سکتا تھا، آپ نے وہاں عبداللہ بن جبیر کی زیر قیادت پچاس تیر اندازوں کو معین کر کے صاف الفاظ میں انہیں یہ حکم دیدیا: افضحوا الخیل عنا ولا نوتین من قبلکم والزموا مکانکم وان کانت النوبۃ لنا اوعلینا وان رایتہونا تخطفنا الطیر فلا تبدوحوا مکانکم، اس لشکر کو ہم سے دور رکھو اور وہ تمہاری طرف سے ہم پر حملہ نہ کر سکے، ہماری فتح ہو یا شکست مگر تم اسی جگہ رہو، ہمیں جانور نوح کھائیں لیکن تم اس مورچے سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہٹو۔

جنگ شروع ہوئی، مسلمان کامیاب ہو گئے اور مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ تیر اندازوں نے دیکھا کہ کفار کا تعاقب ہو رہا ہے اور ہم ہر طرح فتح حاصل کر چکے ہیں، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب ہمیں بھی دشمن کے تعاقب میں شریک ہونا چاہئے۔ امیر نے ان کو روکا مگر اکثر نے نہ سنا اور نیچے اتر آئے، جب کفار نے اس مورچہ کو تیر اندازوں سے خالی دیکھا اور اپنے آپ کو ان کی زد سے محفوظ پایا تو فوراً سنبھل گئے اور لوٹ کر مسلمانوں پر شدید حملہ کیا۔ تعاقب کی وجہ سے مسلمانوں کا لشکر غیر مترتب اور منتشر ہو چکا تھا، مورچہ خالی تھا، اس لئے مسلمان ان کی زد میں آ گئے، بعض لوگ جن کی تعداد نو سے یقیناً زیادہ نہیں، بے ترتیبی اور پریشانی میں بھاگ کھڑے ہوئے، کیونکہ وہ اصلی لشکر سے پہلے ہی کٹ چکے تھے۔

کفار نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا نشانہ بنالیا، آپ سخت زخمی ہوئے اور بہت سے مسلمان بھی شہید ہو گئے۔ آخر جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پر اگندہ جمعیت پھر یکجا ہو گئی ہے تو فوراً میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان اسی میدان میں رہ گئے۔ دوسرے روز مسلمانوں نے کفار کا حمراء الاسد تک تعاقب کیا، مگر وہ بہت دور جا چکے تھے، اس لئے یہ مدینہ کو واپس آ گئے۔

یہ مختصر واقعات ہیں جو آئندہ آیتوں میں بیان کئے جائیں گے۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کامیاب تو یقیناً ہو گئے، البتہ اس فتح و کامرانی سے وہ حسب دلخواہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اس دعویٰ کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں:

- (۱) مسلمان میدان جنگ ہی میں رہے، حالانکہ کفار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔
  - (۲) اگر کفار کامیاب ہوتے تو وہ ضرور مدینہ پر حملہ آور ہوتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔
  - (۳) کامیابی کی صورت میں کفار اسی میدان میں مسلمانوں کو بالکل فنا کر دیتے۔
  - (۴) راستے میں واپس جاتے وقت کفار نے ابوسفیان سے شکایت کے طور پر کہا: ما صنعنا شیئاً۔ ہم نے تو مسلمانوں کا کچھ بھی نقصان نہ کیا۔
  - (۵) زخمیوں کے لے جانے میں کفار کو سخت زحمت اٹھانی پڑی۔
  - (۶) کوئی مسلمان گرفتار نہیں ہوا۔
  - (۷) کافروں کو مال غنیمت نہیں ملا۔
  - (۸) خود مسلمانوں نے دوسرے روزان کا دور تک تعاقب کیا۔
- اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم جنگ احد کو مسلمانوں کی شکست سے تعبیر کریں۔ یہ سچ ہے کہ تیر اندازوں نے رسول اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، یہ ان کی غلطی تھی اور عارضی شکست اسی غلطی کا نتیجہ۔ اس لئے فتح کے فوائد تو کیا حاصل کرتے خود ہی نقصان اٹھایا۔
- رجوع الی المقصود

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾ إِذْ هَبْتَ طَائِفَتَيْنِ مِنْكَ أَنْ تَفْشَلَا

وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٦١﴾

”تو اپنے گھر والوں سے سویرے چلا۔ مسلمانوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا اور مومنوں کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔“

سبحان اللہ! رسول ﷺ کی ذات اقدس تمام صفات و کمالات انسانی کی جامع تھی، میدان جنگ میں آپ ایک عظیم الشان جرنیل کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دو قبیلوں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ انصار میں سے تھے۔ ایک خزرج کی شاخ بنو سلمہ اور دوسرا اوس کی شاخ بنو حارثہ۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے ان دو قبیلوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ راستے میں سے عبد اللہ بن ابی منافق اپنے تین سو آدمی لے کر واپس آگیا تھا۔ ایسے وقت میں اس قسم کا خیال آنا ایک قدرتی بات تھی اور حدیث نفس سے زیادہ اس کی حقیقت نہ تھی، یہ لوگ اپنی قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کو دیکھتے تھے، ادھر دشمن کی کثرت، سامان حرب کی فراوانی اور کفار کی قوت و شوکت پیش نظر تھی، کمزوری کا ایک خفیف سا خیال پیدا ہوا، مگر انہوں نے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ عین وقت پر اللہ نے ان کی دستگیری کی اور انہوں نے میدان جنگ میں خوب ہی بہادری کے جوہر دکھائے۔

ایک مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ تمام ظاہری اسباب سے کام لے کر نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دے کہ نتائج کی رسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

غزوہ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ ﴿۳۱﴾

”اور بیشک اللہ بدر کی لڑائی میں تمہاری مدد کر چکا ہے، حالانکہ تم بے سرو سامان تھے، پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔“

ان قبائل کے دل میں تھوڑا سا کمزوری کا احساس ہوا، اس لئے ان کو جنگ بدر کا واقعہ یاد دلایا جاتا ہے کہ دشمن کی تعداد اس میں تم سے تین گنا زیادہ تھی، تمہاری کمزوری اور بے سرو سامانی کی یہ حالت تھی کہ تم غالب نہیں آسکتے تھے، مگر باوجود اس کے تم مظفر و منصور واپس لوٹے اور کفار کی قوت پاش پاش ہو گئی۔ اس وقت تمہاری نصرت اس لئے کی گئی تھی کہ آئندہ تم کبھی اس قسم کے سوالات بیچ میں نہ لاؤ، بلکہ تمہیں نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ کر کام کرنا چاہئے۔

امداد ملا نکلے

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُبَدِّدَكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ أَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزِلِينَ ﴿۳۲﴾ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فُورِهِمْ هَذَا يُبْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ أَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿۳۳﴾ وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بَشْرًا لَّكُمْ وَلَيَطْغَيْنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النُّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۳۴﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَآئِبِينَ ﴿۳۵﴾

”جب تم مومنوں سے کہتے تھے کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے



تمہاری مدد کرے۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور پرہیزگار بنو اور وہ پورے جوش میں تم پر آپڑیں تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا اور اللہ نے صرف تمہارے خوش کرنے کے لئے اسے ٹھہرایا مدد و نصرت اللہ ہی کی طرف سے ہے، وہ غالب حکمت والا ہے۔ تاکہ وہ ان لوگوں کے ایک حصہ کو کاٹ دے جو کافر ہوئے ہیں، یا ان کو ایسا ذلیل کرے کہ نامراد واپس لوٹ جائیں۔

فرشتوں کے نزول پر ہم نے اپنی کتاب ”الصراط المستقیم“ میں تفصیلی بحث کی ہے، اعانت ملائکہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ثابت قدم رہیں۔ کفار کے دلوں میں ہیبت طاری ہو، ان کے لشکر کا ایک حصہ نیست و نابود ہو جائے اور جو باقی رہے وہ ذلیل ہو کر ناکام لوٹے۔ چنانچہ جنگ احد میں ایسا ہی ہوا۔ لڑائی کے شروع میں مسلمانوں نے کفار کے لشکر کا ایک حصہ بالکل تباہ کر دیا، بہتوں کو زخمی کیا اور انجام کار یہ دشمنان دین بے نیل مرام واپس لوٹے۔

### بیجا انتقام

جنگ احد میں مسلمان خود اپنی غلط کاری کی وجہ سے اس فتح و کامرانی کے نتائج و ثمرات سے مستفید نہ ہو سکے۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی ناکامی سے متاثر ہو کر انتقام لینے پر اتر آتی ہے اور اس جوش انتقام میں بعض اوقات حد سے گزر جاتی ہے۔ جس عدوان کو قرآن پاک نے سختی سے روکا ہے اس لڑائی میں خود رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مشکہ کیا گیا، ان حالات سے متاثر ہو کر مسلمان بھی اس غلطی میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ لہذا ارشاد ہوا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَلَا تَهَمَّنْ عَلَيْهِمْ ۚ وَاللَّهُ مَتَّي السُّبُوتِ وَمَتَّي الْأَرْضِ  
يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ٥٣

”اس میں تیرا کچھ دخل نہیں خواہ وہ ان پر رحمت سے لوٹے یا ان کو سزا دے بیشک وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

بخاری و مسلم میں ہے کہ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد رسول اللہ ﷺ بعض لوگوں کے نام لے کر ان پر بد دعا کرتے تھے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ جنگ احد میں آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا، تو آپ نے فرمایا: کیف یفلح قوم فعلوا هذا بنبیہم وھود عوھم الی ربھم عزوجل، جو قوم اپنے نبی کے ساتھ اس قسم کی حرکات کرے، وہ کیسے کامیاب ہو سکتی ہے حالانکہ وہ انہیں خدائے واحد کی طرف بلاتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں بتا دیا کہ بد دعا کرنا، بدلہ لینا اور انتقام کے لئے تیار ہونا آپ کی شان رحمت للعالمین کے خلاف ہے۔

اس قسم کے خطابات کا روئے سخن دراصل امت کی طرف ہوتا ہے، ورنہ رسول اللہ کی طبیعت میں تو اس وقت بھی انتقام اور بد دعا کا جوش نہ پیدا ہوا جبکہ طائف کے لوگوں نے چند اوباشوں کے ذریعہ آپ پر پتھر پھکوائے، جس سے پائے مبارک لہو لہان ہو گئے تھے اور جوتے سے پاؤں نکالنا دشوار ہو گیا تھا۔ پیغمبر علیہ السلام کو کفار کی بد بختی پر افسوس ہوتا تھا اور بعض

اوقات یہ حالت اضطراب کے درجہ کو پہنچ جاتی تھی، جس پر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی حکومت صرف اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی ہر ایک کی ہدایت و ضلالت کا ذمہ دار ہے، آپ کے اختیار میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں: لیس علیک ہداهم ولكن الله يهدي من يشاء، تم پر کسی انسان کی ہدایت لازمی نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ انک لا تہدی من احببت ولكن الله يهدي من يشاء اور فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب کا یہی مطلب ہے۔ چنانچہ اللہ نے ان کفار میں سے اکثر کو اسلام کی توفیق بخشی اور وہ نہایت ہی زبردست فداکار اسلام ثابت ہوئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۵﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۖ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۶﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا کہا مانو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اس وقت دنیا میں سود کا کاروبار جاری ہے۔ ایک حکومت سود پر قرض لے کر جنگ شروع کر دیتی ہے، خود بڑے بڑے مہاجن اپنے سود کی خاطر بڑی بڑی سلطنتوں کو لڑا دیتے ہیں کہ اس طرح یہ حکومتیں زیر بار احسان رہیں گی۔ یورپ کی عالمگیر جنگ میں یہ بھی ایک راز تھا۔ یہی حال عرب کا تھا۔ فقال کہتا ہے: ان اکثر اموال المشركين قد اجتمعت من الدنيا وكانوا ينفقون تلك الاموال على العبيدا كره المشركين ان يكثر من دولتي اسی سود سے جمع ہو کر فوجوں پر خرچ ہوتی تھی، اس لئے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ انہیں جو جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ دوسری قوموں کو اپنا غلام بنائیں اور اس کو اپنی آمدنی کا ذریعہ قرار دیں، بلکہ اس کا مقصد تو نوع انسانی کی ہمدردی، کلمہ حق کی نشر و اشاعت اور صراط مستقیم کی رہ نمائی ہے۔ اس لئے راہ حریت میں جو کچھ بھی خرچ ہو وہ عمدہ اور پاک مال ہو۔

یاد رکھو کامیابی کی یہ راہ نہیں کہ جنگ کا سلسلہ دراز تر کر کے نسل انسانی کو تباہ کر دو، بلکہ تقویٰ اللہ تمہارا طغرائے امتیاز ہو اور ہر صورت میں قانون الہی کی پابندی تمہارے پیش نظر رہے۔ صرف اسی حالت میں اللہ کی رحمت خاصہ تم پر نازل ہو سکتی ہے۔

جنت کی طلب

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۷﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكُظُمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۸﴾

”اور اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے جو پرہیز گاروں کے واسطے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

تمہارا معیار ترقی اس دنیائے دون کی چہار دیواری منحصر نہ رہنا چاہئے، بلکہ تمہارے پیش نظر وہ جنت رہنی چاہئے جو ترقی کی آخری سرحد ہے۔ حدیث میں آتا ہے: اِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ فَاَسْأَلُوْهُ الْفَرْدُوسَ، فانہ اعلیٰ الجنة و اوسط الجنة ومنہ تفجر انہا الجنة و سقفھا عرش الرحمن، اگر تم جنت کے طالب ہو تو خدا سے جنت الفردوس طلب کرو کہ وہ بہترین جنت ہے۔ اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں اور اسی کی چھت عرش باری تعالیٰ ہے۔ یہ جنت ایسی ہے کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ خود قرآن میں دوسری جگہ اس طرح آتا ہے: سَابِقُواْ اِلَیْ مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّکُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا کَعَرْضِ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ (حدید ۲۱) اپنے خدا کی مغفرت کی طرف لپکو اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے برابر ہے۔ اس لئے اکثر لوگوں کے نزدیک اس آیت میں جنت کی فراخی اور وسعت کو بیان کرنا ہے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے ہر قل کو اس جنت کی دعوت دی تو اس نے پوچھا پھر دوزخ کہاں گئی؟ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ فالین الدلیل اذا جاء النہار ارجب دن ہو تو رات کہاں جاتی ہے۔ اس قسم کی گفتگو ایک مرتبہ حضرت عمر کی یہودیوں سے بھی ہوئی تھی اور یہی جواب ابن عباس اور ابو ہریرہ سے بھی منقول ہے۔

پس ایک مسلم کی شان یہی ہے کہ وہ ایسی جنت کو مطمح نظر بنائے، لیکن یہ صرف ان لوگوں کو ملے گی جن میں حسب ذیل خصوصیات ہوں گی:

- (الف) سہاو علانیہ۔ لیلا و نہار، غربت و افلاس اور فراخی و تنگدستی، ہر وقت میں اللہ کے نام پر خرچ کرتے ہیں۔
- (ب) ایمان کی ادنیٰ حالت یہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ غلطی کریں تو یہ اپنے غصہ کو دباتے ہیں۔
- (ج) اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ عفو و درگزر کرتے ہیں اور باوجود انتقام پر قدرت پانے کے لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

(د) اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ جس سے قصور سرزد ہو اس کے ساتھ احسان و مروت کا سلوک کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ایسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا۔ آپ نے فرمایا: لیس الشدید بالصرعة ولكن الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب، پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو کشتی میں گرا دے، بلکہ قوی و طاقتور اسے کہا جائے گا جو غضب کے وقت اپنے اوپر قابو پالیتا ہے۔ فتح مکہ کے روز آپ نے قریش کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اس کی بہترین عملی تفسیر ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نسبت معلوم ہے کہ وہ نفیس ترین کپڑا استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دعوت کے موقع پر جلدی میں خادم کے ہاتھ سے شور بے کاپیالہ گر گیا اور آپ کے تمام کپڑے اس سے تر ہو گئے۔ خادم نے دیکھا تو نہایت مضطرب ہوا کہ اب امام کا غصہ اس پر اترے گا، اس نے فوراً یہی آیت پڑھ دی۔ امام صاحب ہنس پڑے اور دوسرا جوڑا منگو لیا۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ ذُنُوبَهُ إِلَّا اللَّهُ ۚ  
وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاءُهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ مِمَّنْ رَّبِّهِمْ وَجُزْءٌ تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَبِيدِ ﴿۸۱﴾

”اور وہ جو کوئی بر اکام کر بیٹھے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور بجز اللہ کے اور کون گناہ بخشتا ہے اور جو کر بیٹھیں تو دانستہ اس پر اصرار نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور بارغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر ہے۔“

ان آیات میں بعض دیگر شرطیں بھی بیان کی گئی ہیں:

(۱) جب وہ کسی ایسی بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوئی ہو، یا خود اپنا ہی نقصان کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے معافی خواہ ہوتے ہیں۔

(۲) اگر ان سے نادانستہ غلطی ہو جائے تو معلوم ہونے پر فوراً رک جاتے ہیں اور اس پر اصرار نہیں کرتے۔  
حدیث میں آتا ہے: ما صر من استغفر وان عاذق الیوم سبعین مرة، جو شخص توبہ کرتا ہے وہ اپنے جرم پر اصرار نہیں کرتا، اگرچہ وہ ایک روز میں اس کا ستر مرتبہ ارتکاب کرے۔ قرآن میں ہے: الم یعلموا ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ، کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول بخشتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: ومن یعمل سوعا ویظلم نفسه ثم یمستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما، جو شخص غلطی کا ارتکاب کرے گا یا اپنے اوپر ظلم کرے گا، پھر وہ اللہ سے مغفرت طلب کرے گا تو وہ خدا نے بندہ نواز کو غفور و رحیم پائے گا۔

تذکیر یا ایام اللہ

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ﴿۸۲﴾

”تم سے پہلے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں تو ملک میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔“  
تم سے پہلے اس کبڑی زمین کی پشت پر صدہا اقوام بس چکی ہیں، ان کو اخلاقی تعلیم دی گئی مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لو ان کا کیسا ہی برا انجام ہوا۔ اگر ایک قوم جوش جنون میں اخلاق صالحہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو وہ بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو غزوہ احد میں تکلیف پہنچی ہے، مگر وہ باوجود اس مصیبت کے اخلاق کو چھوڑ دینا اور کافروں پر زیادتی کرنا جائز نہیں کہ خلافت کبریٰ کا حصول محض اخلاق صالحہ پر موقوف ہے۔ ہم ایک شخص کے اسی وقت تک دشمن ہیں جب تک وہ ہمارے اسلام کا مخالف، ہماری کتاب کا دشمن اور مسلمانوں کو فتنہ کرنے کی فکر میں ہے اور جہاں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا پھر وہ ہمارا بھائی ہے اور بیٹوں سے زیادہ عزیز۔

## بیان للناس

هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٨٨﴾

”یہ لوگوں کو سمجھانا ہے اور پرہیزگاروں کے واسطے ہدایت اور نصیحت ہے۔“  
فتح و کامرانی کی آرزو مند جماعت کے لئے اس دستور العمل کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کبھی اعلیٰ ترقی پر فائز نہیں ہو سکتی۔

## غم کا علاج

ظاہر ہے کہ مسلمان جنگ سے فارغ ہو کر اپنی حالت پر غور کریں گے، رسول اللہ ﷺ کا زخمی ہونا انہیں یاد آئے گا، جلیل القدر صحابہ کا مجروح ہونا، حضرت حمزہ کا مثلہ کیا جانا، تیر اندازوں کی نافرمانی اور فتح و ظفر کے نتائج سے محرومی، یہ تمام واقعات ایک ایک کر کے ان کے سامنے آئیں گے، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض رنج و غم میں مبتلا ہو کر اپنا تمام وقت اس میں صرف کر دیں، ان لوگوں کو فلسفہ آلام و مصائب سمجھایا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ مصیبتیں تم پر آئیں مگر تمہیں ان سے بچد فوائد بھی تو حاصل ہوئے اور بعض نتائج تو صرف اسی صورت میں مل سکتے تھے کہ یہ تکالیف تم پر نازل ہوئیں۔ پس یہ حوادث تمہارے لئے مشہر برکات ثابت ہوئے، پھر رنج و غم اور حزن و ملال کیسا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٨٩﴾

”اور سست نہ بنو اور نہ غم کرو اور تم ہے غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

ایسے وقت میں جبکہ ان پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور تکلیفوں کی بارش ہو رہی ہے، انہیں یہ مسرت اندوز خبر دی جاتی ہے کہ اگر تم خداوند قدوس کا ہر حکم اعتقاداً و عملاً ماننے رہو اور اس کی راہ میں اپنی ہر عزیز ترین متاع قربان کرنے کو مستعد ہو تو آخر کار فتح و ظفر تمہاری ہی ہر کباب ہوگی۔

تفسیر ابن جریر طبری میں ہے کہ صحابہ جنگ احد میں سخت پریشان تھے، رسول اللہ کی وفات کی خبر مشہور ہو چکی تھی، خالد بن ولید پہاڑ پر اپنی جماعت کے ساتھ تھا کہ اتنے میں مسلمانوں نے ذات رسالت کو زندہ دیکھ لیا تو وہ بے انتہا مسرور ہوئے اور آپ نے دعا کی: اللھم لا تقو لنا الابلک و لیس احد یعبداک بهذا البلد غیہولاء فلا تھلکمھم، خداوند اتیری ہی تائید تقویت بخش ہے، اس شہر میں ان مسلمانوں کے سوا اور کوئی تیر اعبادت کرنے والا نہیں تو انہیں ہلاک نہ کر۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت نے یہ بتا دیا کہ ایک مسلمان خواہ کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو، قید خانہ کی کوٹھری ہو، آہنی رنجیریں اس کے پاؤں میں ہوں یا سولی کے تختہ پر لٹک رہا ہو، کوئی حالت ہو مگر اس پر کبھی یاس و قنوط نہ طاری ہونی چاہئے۔ وہ کبھی ہمت نہ ہارے اور غم نہ کرے کہ عاقبت کار وہی کامیاب و سر بلند ہوگا۔

## مقصد کیا تھا

إِنْ تَسْأَلُنَا عَنْ يَوْمٍ مَّعِيذٍ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَا وَلَهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ⑥ وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ الْكُفْرَاءَ ⑦

”اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ان کو معلوم کر لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور ظالموں سے اللہ محبت نہیں کرتا اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور کافروں کو مٹا دے۔“

اگر تمہارے آدمی شہید ہوئے ہیں تو تم نے ان کے بھی بہت سے آدمی مار ڈالے ہیں۔ وہ لوگ فتح حاصل کر کے اپنے گھروں کو نہیں لوٹے۔ یہ جنگ احد ہی کی طرف اشارہ ہے، جس میں مسلمانوں نے قلیل التعداد ہونے کے باوجود کفار کے بہت زیادہ آدمی مار ڈالے تھے اور اس قدر زخمی کر دیئے تھے کہ واپس جاتے وقت انہیں سواریاں بھی کفایت نہ کر سکیں اور انہیں مجبوراً اپنی گردنوں پر لادنا پڑا۔

اسی سورت میں آگے چل کر آتا ہے: اَوَلَمْآ أَصَابَكُمْ مِصْيَبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا (ال عمران ۱۶۵) تمہیں تو ایک ہی مصیبت پہنچی ہے اور تم نے اپنے مخالفین کو دو گنا مصیبت پہنچا دی ہے۔ بظاہر یہ آیت اس کے مخالف معلوم ہوتی ہے، مگر دراصل کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ پہلی آیت میں فقط غزوہ احد کے نقصانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں بدر اور احد دونوں کو شامل کر لیا ہے۔

لڑنے والوں میں یہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے کہ کبھی ایک فریق غالب اور کبھی دوسرا۔ غزوہ بدر میں تم ہر طرح کا میاب رہے، یہاں بھی فتح و کامرانی تمہارے لئے تھی مگر تمہاری ہی ایک جماعت کی تھوڑی سی غلطی اس پریشانی کا موجب ہوئی، لیکن باوجود اس کے حسب ذیل فوائد حاصل ہو گئے:

(۱) اللہ تعالیٰ اچھے اور برے میں تمیز کر دیگا، مصیبت کے وقت ہر ایک شخص کا امتحان ہوتا ہے، اس لئے سب کو مسلمان اور منافق کا علم ہو جائے گا۔

(۲) تم میں سے بعض کو وہ شہادت کے درجہ علیا پر فائز کرنا چاہتا تھا، کھیتی کے لئے آفتاب کی روشنی اور پانی ضروری چیزیں ہیں ورنہ وہ خراب ہو جائے گی۔ ایسے ہی قوموں کی حیات ملی شہیدوں پر موقوف ہے، قومی کھیتوں کو بہترین دل دماغ کے خون ہی سیراب کر سکتے ہیں۔ آزادی اور حریت کی راہ کافر صرف انسانی لاشوں ہی سے تیار ہوتا ہے۔ جب تک قربانیاں کثرت سے نہ ہوں گی قوم کبھی زندگی حاصل نہ کر سکے گی۔ جب اعلیٰ ترین افراد ملت ذبح ہوں گے تو قوم میں زندگی کے آثار نمودار ہوں گے، اس کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور جب تک انتقام نہ لے لے گی اسے چین نہ آئے گا۔

جنگ احد میں سید الشہداء حضرت حمزہ شہید ہوئے، ان کی شہادت رسول اللہ ﷺ کے لئے کسی قدر جوش و ہيجان کا باعث ہو گئی، اس کے بعد وہ بنو ہاشم سے بدلہ لئے بغیر نہ رہیں گے۔

یہ احتمال نہ ہوا کہ اس جنگ میں جو بظاہر کافروں کو غلبہ کی صورت حاصل ہو گئی ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں ہر گز نہیں، کفر و شرک کرنے والوں کو اللہ ہر گز دوست نہیں رکھتا۔

(۳) مومنین قانتین کو نمایاں اور ممتاز کر دے تاکہ وہ دوسروں کے امام و پیشوا بن سکیں۔

(۴) منافقوں کا زور توڑ دے کہ ان بزدلوں کو کہیں بھی عزت نصیب نہ ہو اور کافر فاجر ہو جائیں۔

أَمْرٍ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَكِنَّا يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الظَّالِمِينَ ﴿۲۷﴾

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں معلوم کیا جو جہاد کرنے والے ہیں اور نہ صبر کرنے والوں کو جاننا۔

اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ایک ایسی قوم بن جائیں جو حق و حریت کی راہ میں ہر تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہوں کہ اس کے بغیر دنیا و آخرت کی کامیابی ناممکن اور محال ہے اور یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا تھا جب تک ان پر یہ مصیبت نہ آتی اور مجاہد و صابر کی صفیں باقی لوگوں سے ممتاز نہ ہو جائیں۔ ایک جگہ آتا ہے: أَمْرٍ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَكِنَّا يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَمَسْتَهْمُ الْبِائِسَاءِ وَالضَّرَائِءِ وَذُلُّوا (البقرہ ۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یونہی بہشت میں جا داخل ہو گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی مشکلات تو پیش آئیں ہی نہیں ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ صعوبتوں میں ہلا ہلا دیئے گئے۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (العنکبوت ۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۲۸﴾

”اور قبل اس کے کہ تم اس سے موت کی آرزو کیا کرتے تھے سو اب تم نے آنکھوں کے سامنے اس کو دیکھ لیا۔“

غزوہ بدر میں جو صحابہ کرام شہید ہو گئے تھے ان کی فضیلت و بزرگی میں آیات نازل ہوئیں تو جنگ بدر میں جو لوگ شریک نہ ہو سکے تھے، انہیں اس امر کا بے انتہا افسوس ہوا، انہوں نے بارہا وہاں نہ مضطرب نہ دعا کی کہ اب پھر کوئی جنگ ہو اور انہیں فداکاری و جوش ملی کے اظہار کا موقع ملے۔ ایک روایت میں آتا ہے: ان رجلا من اصحاب رسول اللہ ﷺ كانوا يقولون ليتنا نقتل كما قتل اصحاب بدر ونشهد، اوليت لنا يوم ما كيوم بدر نقاتل فيه المشركين ونبلى فيه خيرا وتلتبس الشهادة والجنة والحياة والرزق۔ رسول اللہ کے بعض صحابہ یہ کہا کرتے تھے اے کاش ہم بھی اصحاب بدر کی طرح جنگ کرتے اور شہادت حاصل کرتے، جنگ بدر کی طرح پھر کوئی معرکہ کارزار گرم ہو کہ ہم بھی اس میں مشرکوں سے جنگ کر کے شہادت کے درجہ علیا پر فائز ہوں۔ جنت، حقیقی زندگی اور رزق سے بہرہ اندوز ہوں۔ یہی



لوگ چاہتے تھے کہ جنگ احد میں باہر جا کر لڑیں، اسی کو اس آیت میں تمنائے موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی ممانعت کی گئی ہے، بخاری و مسلم میں ہے: لَا تَتَّبِعُوا الْقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْتَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السَّيْفِ، دشمن سے جنگ کی آرزو نہ کرو بلکہ خدا سے عافیت طلب کرو اور اگر جنگ کی نوبت آجائے تو صبر و استقلال سے کام لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ گویا اسی آرزو کے مطابق تم اپنی آنکھوں سے اس جنگ کو دیکھ رہے ہو۔

## امیر کی تخصیص

میدان جنگ میں کامیابی کا دار و مدار سالار فوج کے وجود پر ہوتا ہے، وہ مارا گیا تو تمام فوج یا تو بھاگ پڑتی ہے یا دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اس غلط کاری کی اصلاح یوں کی گئی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ أَفَأَمَّا إِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۳۷﴾

”اور محمد رسول ﷺ ہی تو ہے کہ اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، پھر اگر وہ مر جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی بھی اٹے پاؤں لوٹے گا تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا۔“

غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ سخت زخمی ہو گئے، کسی نے یہ خبر اڑادی کہ آپ قتل ہو گئے ہیں۔ اندازہ کیجئے، کفار چار رگنہا تعداد سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں، خود فرزند ان اسلام مورچہ چھوڑ کر دشمن کی زد میں آ گئے ہیں، اسلامی فوج پر اگندہ اور منتشر ہو چکی ہے، اتنے میں خبر ملتی ہے کہ آپ شہید ہو گئے ہیں جو فوج کے جرنیل بھی ہیں، اس کے بادشاہ بھی ہیں اور جس فوج کی تمام امیدیں، ہر قسم کی کامیابیاں اور دنیا جہان کی برکتیں اسی وجود اقدس کے ساتھ وابستہ ہیں، جس کی خاطر وہ وطن و دیار، مال و دولت، عزیز و قریب اور زندگی تک قربان کر چکی ہے، جو اسے تمام زمین و آسمان سے زیادہ محبوب ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی، اگر کوئی اور فوج ہوتی تو یقیناً گھبراہٹ، مگر شمع محمدی کے پروانوں کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی، بعض مضطرب تو ضرور ہوئے مگر ایسے لوگ بہت ہی کم تھے، کیونکہ اگر مسلمان پریشان و مضطرب ہو جاتے اور اس گھبراہٹ میں یہ میدان جنگ چھوڑ دیتے تو ضرور تھا کہ کفار واپس ہوتے جب تک وہ مسلمانوں کا صفایانہ کر دیتے اور انہیں غلبہ حاصل نہ ہو جاتا۔

آپ غور کیجئے کہ رسول اللہ کی وفات کا اعلان ہوتا ہے اور بعض مسلمان گھبرا جاتے ہیں تو حضرت انس بن النضر فرماتے ہیں: ان كان محمداً قد قتل فان رب محمداً حي لا يموت وما تصنعون بالحيوة بعد رسول الله قاتلوا على ما قاتل عليه، اگر محمد قتل ہو گئے ہیں تو کیوں گھبراہٹ ہو اس کا خدا تو زندہ ہے اور رسول اللہ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اسی



مقصد پر تم بھی جان دیدو جس پر وہ شہید ہوئے ہیں۔ آیت زیر بحث میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد بھی ایک رسول ہیں، ان سے پہلے خدا کے بہت سے رسول ہو چکے ہیں۔ کسی انسان کو موت سے چارہ نہیں، ایک انسان خواہ وہ کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو اس پر ضرور موت طاری ہوگی۔ اب اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تو کیا تم یہ خبر سنتے ہی میدان جنگ سے بھاگ جاؤ گے اور اسلام چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرو گے۔

اس قسم کی حرکتیں تو کسی احمق ہی سے سرزد ہو سکتی ہیں، جو ان معمولی باتوں سے گھبرا کر دین اسلام ہی کو خیر باد کہہ دے اور لڑائی سے بھاگنے کی فکر کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اپنے پاؤں پر آپ کلباڑی مارے گا اور جو لوگ اپنی قوتوں کو صحیح مواقع میں صرف کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزا دے گا۔

### موت کا وقت

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ۚ وَمَنْ يُؤِذِ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يُؤِذِ ثَوَابَ  
الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَسَخَّرْنَا الشَّيْطَانَ ۝

”اور کسی شخص کے لئے نہیں کہ وہ اسلام کے حکم کے بغیر مر جائے۔ وقت مقرر لکھا ہوا ہے اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اس کو اس سے دے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا ہم اس کو اس میں سے دے دیں گے اور ہم شکر گزار بندوں کو عنقریب جزا دیں گے۔“

کسی کے مرنے سے گھبرانا فضول ہے، تمہیں اپنے فرائض سے ہرگز غافل نہ ہونا چاہئے۔ تم میں نظام کی وہ اعلیٰ قابلیت ہونی چاہئے کہ اگر امیر فوج قتل بھی ہو جائے، تو تم اپنے فرائض کی انجام دہی میں غیر متزلزل نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنے مقررہ وقت پر انتقال فرمائیں گے، اگرچہ قتل کے تمام اسباب جمع ہو جائیں مگر پھر بھی اس وقت سے قبل دشمن آپ کو قتل نہیں کر سکے گا کہ واللہ یعصمک من الناس کا وعدہ موجود ہے، کفار کا اس جنگ میں یہی مقصد تھا کہ آپ کو شہید کر دیں، مگر باوجود پوری کوشش کے وہ ناکام و خاسر رہے۔

جو شخص محض شہرت طلبی، جاہ پرستی اور قومیت کے جوش میں آکر لڑتا ہے، ہم دنیا میں اس کو پوری جزا دے دیتے ہیں اور جو صرف اس لئے اپنی جان قربان کرتا ہے کہ قانون الہی بلند و برتر ہو اور بہترین دل و دماغ اس قرآن کے پابند بن جائیں، تو ہم اسے دائمی زندگی نوازش کریں گے اور مرنے کے بعد بہترین اجر دیں گے۔ دراصل حقیقی اجر و ثواب کا وہی شخص مستحق قرار پاتا ہے جو عین ضرورت کے موقع پر اپنی خدمات پیش کرے۔ ایک جگہ آیا ہے: مَنْ كَانَ يُؤِذِ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَذَرْنَاهُ فِي حَرْثِهِ ۚ وَمَنْ كَانَ يُؤِذِ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (شوری ۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو اس کے لئے ہم اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہو گا۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: مَنْ كَانَ يُؤِذِ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِنَنْزِلِمْ يُؤِذِمْ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلُهَا مَذْمُومًا مَذْهُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ﴿۱۸﴾ (بنی اسرائیل ۱۸ تا ۱۹) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دیدیتے ہیں، پھر اس کے لئے جہنم کو ٹھکانا مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ نفریں سن کر اور درگاہ خدا سے راندہ ہو کر داخل ہو گا۔ اور جو شخص آخرت کا خواہشگاہ ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

### استقلال شرط ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ  
وَاللَّهُ يَحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿۱۹﴾ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا  
وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۰﴾ قَالَتْهُمْ اللَّهُ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَحُسْنُ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۱﴾

“اور بہت سے نبی ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربانی لوگ لڑے، پھر اس بنا پر وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں تکلیف پہنچی اور نہ خفیف ہوئے اور نہ عاجز ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور ان کی بات اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کہنے لگے اے ہمارے رب! ہمارے گناہ اور ہمارے کاموں میں ہماری زیادتیاں بخش اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں کافروں پر نصرت دے۔ سو اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ اور آخرت کا اچھا ثواب دیا اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔”

تاریخ کو اٹھا کر دیکھو صدہا، انبیاء اور رسل کو معاندین اسلام کے ساتھ جنگ کرنی پڑی ہے، انہیں سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے نہ تو ان کے عزم مصمم میں کسی قسم کی کمزوری آئی نہ انہوں نے بودے پن کا اظہار کیا اور نہ اپنی عارضی شکست کی وجہ سے دشمنوں کے سامنے انہوں نے عاجزی اور ذلت اختیار کی، بلکہ برابر ثابت قدم رہے اور یوں دعا کرتے رہے، خداوند! ہماری غلط کاریوں کی وجہ سے ہمیں شکست نصیب ہوئی ہے تو ہمارے گناہ معاف کر، ہماری زیادتیوں سے درگزر کر، ہمیں ثابت قدمی اور استقلال نوازش کر اور فتح و کامرانی سے بہرہ اندوز کر۔ چنانچہ وہ کامیاب ہو کر رہے۔

تم تو تھوڑی سی تکلیف ہی سے گھبرا گئے، تمہیں بھی ویسا ہی استقلال و ثبات قدم اور عزم راسخ رکھنا چاہئے، بڑی سے بڑی مصیبت میں تمہارے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا ہو اور جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر ہر چیز قربان کرنے کو تیار رہو۔

### نصرت الہی کا وعدہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُؤْذِكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿۲۲﴾ بَلِ اللَّهُ مُوَلِّكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْمُوَلِّينَ ﴿۲۳﴾

“اے ایمان والو، اگر تم نے کافروں کا کہا مانتا تو وہ تم کو اٹے پاؤں لوٹا دیں گے پھر تم ہی نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ ہی تمہارا حامی ہے اور وہی سب مددگاروں سے بہتر ہے۔”

کمزور طبیعت کے مسلمانوں نے دیکھا کہ کفار عظیم الشان لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں اور مسلمانوں میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں، تو انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کے ہمراہ ہو جانا چاہیے۔ ان سب کے جواب میں یہی کہا گیا کہ اس قسم کے خیالات لغو و مہمل ہیں، کفار و معاندین کی اطاعت و فرماں برداری تمہیں پھر کافر بنا دے گی کہ یہی ان کی دلی آرزو ہے۔ و لایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کی طاقت میں ہو تو تمہیں کافر بنادیں۔

تم ان سے کیوں گھبراتے ہو؟ تمہارا ولی و ناصر اللہ تعالیٰ ہے، تم اس کے نام پر جان دینے کو تیار ہو تو بڑی سے بڑی طاقت بھی تمہارا مقابلہ نہ کر سکے گی اور فرض کرو کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی تمہاری مدد کے لئے تیار نہ ہو تو وہ خدائے حق نوازاں کے لئے ملائکہ عظام کو نازل فرما کر ان کافروں کو ذلیل و رسوا کر دے گا۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِأَأْشَرُ كُوزًا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْلُوهٌ لِّلنَّارِ ۖ وَبِئْسَ مَثْوًى لِّلظَّالِمِينَ ﴿٥٠﴾

“عقرب ہم کافروں کے دلوں میں بہت ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ کا شریک مانا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالم کا ٹھکانا برا ہے۔”

ہم تمہاری بہت کافروں کے دلوں میں ڈال دیں گے اور یہ مدد ایسی ہو گی جو اسباب سے نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ یہ کام ملائکہ الرحمن کا ہو گا، اس کی وجہ سے کافروں کے اندر جبن و نامردی، ضعف و کمزوری اور اضمحلال و ناتوانی پیدا ہو جائے گی۔ اس کمزوری کا اصلی سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ سرسبز درخت کی ٹہنی، جنگل کا ہر تنکا، پہاڑ کا ہر پتھر اور قدرت کا ہر منظر ان کو بہت زندہ بنا دیتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ضعف کی یہ کیفیت ہو ان میں قوت کہاں سے آسکتی ہے اور وہ ایک مسلم قانت کے آگے کس طرح ٹھہر سکتے ہیں جو صرف ایک ہی خدا کا پرستار ہے۔ وہ ایک کے آگے جھکتا ہے کہ سب کے سامنے سر بلند ہو۔ توحید ہی وہ چیز ہے جو انسان میں ہمت پیدا کرتی ہے اور فرد واحد کو تمام دنیا کے مقابلے میں کھڑا کر دیتی ہے۔ سورہ یوسف میں ہے: ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار، کیا بہت سے خدا بہتر ہیں یا ایک قہار خدا۔

بخاری میں ہے: اعطيت خمسالم يعطهن احد من الادياع من قبل، نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الارض مسجد او طهورا واحلت لي الغنائم واعطيت الشفاعة وكان النبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة۔ مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں کہ اور کسی پیغمبر کو یہ نہیں نوازش کی گئیں۔ ایک ماہ کے فاصلہ پر میرے دشمن

مجھ سے مرعوب ہو جاتے ہیں، تمام زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور پاک ہے، مال غنیمت میرے واسطے حلال کیا گیا ہے، شفاعت عامہ مجھے دی گئی اور ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اور میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں، بلکہ واقعہ ہے جس کے نظائر آج بھی ہر جگہ ملتے ہیں۔ آپ پہلے خود اس جنگ احد ہی کو لیجئے۔ سات سو مسلمانوں نے کفار کے تین ہزار آدمیوں کو پریشان کر دیا۔ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گئے، راستے میں انہیں خیال آیا کہ افسوس جب مسلمانوں میں دم نہیں رہا تھا تو انہیں کیوں نہ فنا کر دیا، چنانچہ مدینہ واپس آنے کا انہیں خیال بھی آیا مگر کچھ ایسے مرعوب ہو گئے کہ ہمت نہ پڑی، صرف اتنا کیا کہ ایک بدوی کو کچھ دینے کا وعدہ کیا اگر وہ جا کر مسلمانوں کو ڈر دے۔ رسول اللہ کو بذریعہ وحی کفار کے ارادے کی اطلاع مل گئی تو آپ حمراء الاسد تک ان کے تعاقب میں گئے۔

پھر آپ کو معلوم ہے کہ ابوسفیان اگلے سال اسی میدان میں آنے کا وعدہ کر گیا تھا مگر نہ آیا۔ غزوہ خندق میں دس ہزار لشکر کے باوجود وہ راتوں رات مدینہ سے بھاگ نکلا اور اس کے بعد پھر کفار کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد یہی امداد و اعانت مسلمانوں کو بھی دی گئی۔ صحابہ کرام کی زندگی کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ آج جبکہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے، یورپ کی سفید رنگ اقوام کو سب سے زیادہ مسلمانوں ہی کا خوف لگا ہوا ہے، وہ ہر وقت پین اسلامزم کے خواب دیکھتے ہیں اور یہی انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔

### ایفاءِ وعدہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِآذَانِهِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأُمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ مَا أَرَكُم مَّا تَحِبُّونَ ۚ مِّنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَّفَكُمُ عَنْهُمْ لِيَبْلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۚ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٧﴾

”اور اللہ نے اپنا وعدہ یقیناً تم کو سچا کر دکھایا جب تم اس کے حکم سے ان کو کاٹ رہے تھے یہاں تک کہ تم نے نامردی کی اور حکم کے متعلق آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور تم نے نافرمانی کی، بعد اس کے کہ اللہ تم کو دکھا چکا تھا جو کچھ تم پسند کرتے تھے، تم میں سے بعض تو دنیا چاہتے تھے اور بعض آخرت کے طلبگار تھے، پھر تم سے ان کو پھیر دیا تاکہ تمہاری جانچ کرے اور بیشک اس نے تمہیں معاف کر دیا اور مسلمانوں پر اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت کا وعدہ کیا تھا تو جنگ احد میں ان کو یہ تکلیف کیوں اٹھانی پڑی؟ اس آیت نے یہ شبہ بھی دور کر دیا اور بتایا کہ وہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ ملائکہ الرحمن نے مدد کی، جنگ شروع ہوتے ہی کفار کے بہت سے آدمی مارے گئے، ان کے نو علم بردار یکے بعد دیگرے قتل ہوئے اور علاوہ ازیں کثرت سے سپاہی

زخمی ہوئے۔ اس قدر فاسامانی کے بعد انہیں بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں حتیٰ رایت النساء یشتدون فی الجبل دفعن عن سوقھن قد بدت خلاخلھن۔

کفار کے بھاگنے پر مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا، تیر انداز ایسے موقع پر متعین کئے گئے تھے کہ بھاگنے والی فوج ان کی زد میں تھی اور ان کے تیروں کی بوچھاڑ ان کو فنا کر رہی تھی، ان تیر اندازوں کو دربار رسالت سے یہ حکم مل چکا تھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں، مگر جب انہوں نے کفار کو بھاگتے دیکھا تو ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک یہ سمجھتا تھا کہ حکم رسالت اسی وقت تک کے لئے تھا جب تک مسلمانوں کو کامل فتح نہ ہو جائے، ان کا خیال تھا کہ فتح ہو چکی ہے اس لئے ہم بھی مال غنیمت میں حصہ لے سکتے ہیں، مگر امیر جماعت عبد اللہ بن جبیر کا اپنے چند ہم خیالیوں کے ساتھ اسی جگہ رہنے پر اصرار تھا۔ آخر ان میں سے چالیس تیر انداز نیچے اتر آئے اور الغنیمۃ الغنیمۃ کہہ کر مال جمع کرنے میں لگ گئے۔ انھی کے لئے فرمایا:

دنوی مال دیکھ کر ان کے دلوں نے کمزوری اور بزدلی کا اظہار کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم میں جھگڑا کیا۔

اور بالآخر نافرمانی کر کے نیچے اتر آئے۔

اگرچہ الفاظ عام ہیں مگر دراصل مراد وہی لوگ ہیں۔

مگر اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ یہ لوگ مشکلات و موانع سے تنگ آ کر اپنی جگہ نہیں چھوڑتے، بلکہ کامیابی ہو جاتی ہے، خدا کا وعدہ پورا ہو چکتا ہے اور کفار بھاگنا شروع کر دیتے ہیں، تب جا کر تیر اندازوں میں جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ اس قدر تفصیل کے بعد اب آپ آیت کو دیکھ لیجئے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ جب تم نے رسول اللہ کی حکم کی نافرمانی کی تو تم کو ان سے ہٹا دیا کہ اب خدائے قدوس تمہیں امتحان میں مبتلا کرے اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب کفار نے تیر اندازوں کی جگہ کو خالی پایا اور ان کی زد سے محفوظ ہو گئے تو لوٹ کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ یہی ابتلا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ تم میں جو بہترین افراد ہیں ان کے فضائل و کمالات کا اظہار ہو اور دنیا دیکھ لے کہ رسول اللہ سے بہتر کسی کو جاں نثار اور فداکار نصیب نہیں ہوئے۔

کفار کا نشانہ رسول اللہ کی ذات اقدس تھی، اس لئے صحابہ کرام کی ایک جماعت فوراً آپ کے گرد و پیش جمع ہو گئی، دشمن تیر پر تیر چلاتے ہیں، مگر کیا مجال ہے کہ ایک مسلمان بھی اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے ہٹ جائے۔ ایک آہنی دیوار ہے کہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ایک شخص تلوار کا وار کرتا ہے تو طلحہ اپنا ہاتھ کٹوا لیتے ہیں، مگر اس ذات قدس پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ ابن قمر آگے بڑھتا ہے کہ آپ کو شہید کر دے، مصعب بن عمیر علم بردار درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں اور خود شہید ہو کر آپ پر جان نثار کر دیتے ہیں۔ ابو دجانہ کفار کی جانب پشت کئے کھڑے ہیں کہ اس وجود

مقدس کے لئے ڈھال بن جائیں جو تیران کو لگتا ہے وہ نکال کر اپنے ہمراہی کو دیتے ہیں کہ اسی سے دشمن کو نشانہ بنایا جائے، اللہ اکبر!

اگر یہ مصیبت نہ آتی اور کفار یوں رسول اللہ پر حملہ نہ کرتے تو صحابہ کرام کی خوبیوں کا دنیا کو کیا پتہ لگتا۔ یہ قصور تو محض تیر اندازوں کا تھا جن کی غلطی سے تمام فوج میں ایک پریشانی سی پیدا ہو گئی۔ بعض لوگ جن کی تعداد نہایت قلیل تھی، دشمن کے حملے کی وجہ سے بھاگ گئے۔ ادھر مسلمانوں نے اس وجود اقدس کے گرد جمع ہو کر بہادری کی جو ہر دکھائے تو یہ غلطی اگرچہ نہایت ہی شدید اور مسلمانوں کے فنا کرنے کو کافی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا اور ان کے گناہوں کو بخش دیا اور اب کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان بزرگان امت پر لب کشائی کرے۔

فساد عظیم کی روک تھام

مسلمان اپنی فتح و کامرانی سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان میں سے بعض نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اب اندیشہ تھا کہ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد خود مسلمانوں میں کہیں جھگڑا شروع نہ ہو جائے، کیونکہ وہ ضرور اس امر پر بحث کریں گے کہ اس مصیبت کے باعث کون کون لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو ملزم بنانے کی کوشش کرے گا، اسی میں قوت انتقام صرف ہو کر خانہ جنگی تک نوبت پہنچ سکتی ہے، اس فساد عظیم کے روکنے کے لئے ان کی توجہ کو بالکل دوسری جانب پھیر دیا اور وہ اس قصہ ہی کو بھول گئے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلَوْنَهَا عَلَىٰ أَحَدٍ ۚ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَاجِكُمْ فَأَتَابَكُمْ عُنَابَ بَعْمٍ لِّكَيْلَا تَخْزَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۖ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو تمہارے پیچھے بلاتا تھا تو اللہ نے تم کو اس رنج دینے کے بدلے میں دوسرا غم پہنچایا تاکہ تم غم نہ کرو، اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا اور نہ اس مصیبت پر جو تم کو پہنچی اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

کفار نے نہایت شدت سے مسلمانوں پر حملہ کیا، اب یہ لوگ کفار کا تعاقب کرنے کی بجائے خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بے ترتیب اور منتشر ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو اپنی اپنی فکر تھی، بھاگا جاتا تھا اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا، جب رسول اللہ نے یہ حالت دیکھی تو آپ نے ان کو جمع کرنے کے لئے فرمایا: اٰلِی عِبَادَ اللّٰہِ اِنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ کے بندو میں اللہ کا رسول ہوں، میری طرف آؤ۔

غور کیجئے دشمن آپ کو فنا کرنا چاہتا ہے، مسلمان پریشان ہو کر منتشر ہو چکے ہیں، مگر رسول اللہ ان تمام مشکلات کی مطلقاً پروا نہیں کرتے اور تمام مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے بلند آواز سے پکارتے ہیں۔ جس پر تمام صحابہ کرام آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ غزوہ حنین میں بھی آپ نے ایسی ہی شجاعت کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان بھاگے جا رہے ہیں

اور آپ دشمن کی صف کی طرف بڑھ کر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

انا النبی لا کذب،

میں حقیقت میں خدا کا فرستادہ ہوں۔ اور نبی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ میدان جنگ سے ایک انچ بھی ہٹ جائے، جھوٹے لوگ ایسے مواقع میں راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔

انا ابن عبدالمطلب!

میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں، جس کی شجاعت و بسالت سے عرب کا بچہ بچہ واقف ہے، ایسے اعلیٰ ترین خاندان کا فرزند ان مشکلات و موانع میں کبھی بھاگ نہیں سکتا، بلکہ یہی میدان جنگ اس کے کمالات و فضائل قومی کے اظہار کا بہترین محل ہے۔

اس سے آپ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کا یہ طرز عمل حکام فوج کے لئے ایک اسوہ حسنہ ہے کہ ان کو کس قدر جاں باز ہونا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے آگے رکھیں تاکہ سپاہیوں میں ہمت اور جوش پیدا ہو۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو آوازدی تو کفار نے آپ کو پہچان لیا اور اپنے تیروں کا رخ آپ کی جانب پھیر دیا، ابھی مسلمان آپ کے گرد و پیش جمع بھی نہ ہو سکے تھے کہ آپ سخت زخمی ہو کر خندق میں گر گئے، اتنے میں فرزند ان اسلام بھی آپ کے گرد احاطہ باندھ کر بنیان مروض بن گئے۔

مسلمانوں کو پہلے تو یہ غم تھا کہ دشمن ہمارے تعاقب سے بچ گیا اور مال غنیمت وصول نہ ہو سکا، مگر اب جو رسول اللہ کی یہ حالت دیکھی تو وہ اپنا غم تو بھول گئے، تمام تکلیفیں اور مصیبتیں فراموش ہو گئیں اور آپ کی مصیبت ان سب پر غالب آگئی۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ایک عورت کو خبر دی گئی کہ اس کا والد، اس کا بیٹا اور اس کا خاوند، تینوں اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں، اس نے ان تمام باتوں کے جواب میں صرف اتنا پوچھا کہ بتاؤ رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا وہ خیریت سے ہیں، اس پر وہ بول اٹھی:

کل مصیبة بعدک جلد!

آپ زندہ ہیں تو کچھ پروا نہیں یہ تمام مصیبتیں بچ ہیں۔

جب مدینہ کی عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی کہ آپ زندہ ہیں تو انہوں نے اپنے خاوندوں، بیٹوں اور بھائیوں کی وفات پر ذرہ برابر بھی اظہار رنج نہ کیا۔ سچ ہے: لایومن احدکم حق اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین، جب تک ایک مسلمان مجھے سب سے زیادہ عزیز و محبوب نہ رکھے یہاں تک کہ وہ میرے مقابلہ میں اپنی اولاد تک کی پروا نہ کرے اس کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا اور صحابہ نے اپنے طرز عمل سے اس کامل ایمان کو ظاہر کر دیا۔



اس غم کا نازل کرنا ضروری تھا تا کہ تمہیں اس بات کا افسوس نہ رہے کہ مال غنیمت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ دشمن کا تعاقب نہ کر سکے اور یہ سب کچھ فلاں فلاں لوگوں کی نافرمانی کا نتیجہ تھا۔ اب تم اس تمام قصے کو بھول گئے اور لگے اس غم میں گھٹنے کہ ہماری بے خبری میں رسول اللہ زخمی ہو گئے۔

## نزول اطمینان

ثُمَّ انْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمْنَةً نُّعَاسًا يَغْشَى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ

”پھر اللہ نے غم کے بعد تم پر امن نازل کیا یعنی اونگھ جو تم سے ایک گروہ کو ڈھانک رہی تھی۔“

رسول اللہ کی آواز سنتے ہی مسلمان آپ کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ کفار نے یہ اجتماع دیکھا تو پریشان ہو کر گھر کی راہ لی اور صحابہ کرام اسی جگہ میدان جنگ ہی میں رہ گئے، بلکہ ان کے اطمینان و سکینت قلب کی یہ کیفیت تھی کہ ان پر اونگھ طاری ہو گئی۔ بخاری میں ابو طلحہ سے روایت ہے: غشینا ونحن فی مصافنا یوم احد فجعل سیفی یسقط من یدی و اخذھو یسقط فاحذہ۔ جنگ احد میں عین لڑائی کے وقت ہم پر اونگھ طاری ہو گئی، میری تلوار بار بار میرے ہاتھ سے گرتی تھی اور بار بار میں اسے اٹھاتا تھا۔ زبیر بن العوام کہتے ہیں: رفعت راسی یوم احد فجعلت انظرو ما منھم من احد الا وھو یبیل تحت حفتھ من النعاس میں نے جنگ احد میں اپنی نظر جو اوپر کی تو کیا دیکھا ہوں کہ ہر ایک مسلمان اونگھ کے مارے جھکا جاتا ہے۔ یہ آیت بتا چر ہی ہے کہ مسلمانوں کو تکلیف تو ہوئی، مگر شکست نہیں ہوئی کیونکہ میدان جنگ میں رہنا، دشمن کا بھاگ جانا اور اس قدر اطمینان کا ہونا کہ تلوار بھی زمین پر گر پڑے ظاہر کرتا ہے کہ انہیں دشمن کا کوئی خوف نہ تھا، خوف کے وقت نیند نہیں آسکتی۔

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَہَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّہٗ لِلّٰهِ ۚ يُخْفُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۚ يَقُولُوْنَ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ مَا قُتِلْنَا لَهٰٓنَا ۚ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَیْہِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٥٦﴾

”اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی وہ اللہ سے ناحق بدگمانیاں جاہلیت کی سی بدگمانیاں کرتے تھے۔ کہتے تھے کیا ہمارے اختیار میں کوئی بات ہے، کہہ دو کہ سب کام اللہ ہی کے اختیار ہے، وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو تجھ پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ جن کے لئے مقتول ہونا لکھا جا چکا تھا ضرور اپنے بچھڑنے کی جگہ آ نکلتے اور تا کہ اللہ ظاہر کر ائے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اور جو خیالات تمہارے دلوں میں ہیں ان کو نکھار دے اور اللہ سینوں کی بات سے واقف ہے۔“

ایک گروہ مسلمانوں کا تھا جس کے ایمان کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ یہ دوسری جماعت منافقین کی ہے جو عبد اللہ بن ابی



کے ساتھ راستہ ہی سے واپس لوٹ آئی تھی۔ جب ان بد بختوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں تکلیف اٹھانی پڑی اور خود رسول اللہ بھی سخت زخمی ہو گئے، تو اب یہ لگے کفار و مشرکین کی طرح بکواس کرنے کہ اگر یہ رسول واقعی خدا کی طرف سے ہوتے تو اس قدر مصیبت ان لوگوں پر کیوں آتی۔ ان کے اس قسم کے طعنوں کا ذکر سورہ فتح میں بھی کیا گیا ہے: **بَلْ فَتَنَّاكُمْ أَنْ لَنْ يَنْتَقِلَ الْرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ أَبَدًا (الفتح ۱۲)** بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر اور مومن اپنے اہل و عیال میں کبھی لوٹ کر آنے ہی کے نہیں۔

پھر اس پر قناعت نہ کی، بلکہ اب انہیں اپنے مشوروں کی اہمیت یاد آگئی اور کہنے لگے کہ اس وقت ہماری رائے کی طرف کسی نے توجہ تک نہ کی تھی، اگر اس پر عمل ہوتا اور شہر کے اندر رہ کر جنگ کی جاتی تو اپنے مسلمان بھی شہید نہ ہوتے اور اس قدر نقصان بھی برداشت نہ کرنا پڑتا۔ نوجوانوں کی رائے پر عمل کرنے کے یہی نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ان بکواس کرنے والوں کو یہ جواب دیا گیا کہ تمہیں اپنے مشوروں پر زور دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، مسلمانوں کی فداکاری و سرفروشی کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ہر وقت جاں نثاری کے لئے موجود ہیں، اگر مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی جب بھی وہ ضرور گھروں سے باہر نکل کر میدان قتال میں آتے اور اسلام کی خاطر سربکف کوشش کر کے شہید ہو جاتے، ان کے لئے مدینہ اور احد کے میدان برابر ہیں۔ تم ان کے شہید ہونے پر کس لئے اظہار افسوس کر رہے ہو۔ موت سے بھاگنا اور اس سے بچنے کے لئے تدبیریں پیش کرنا سخت بزدلی اور نامردی ہے۔ ایک مسلم کی شان تو یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا نام سنتے ہی فوراً میدان جنگ میں حاضر ہو اور ہر گز پس و پیش نہ کرے۔

ان باتوں نے تمہیں تو کوئی فائدہ نہ پہنچایا، البتہ دو باتیں ظاہر ہو گئیں اور انھی کو اللہ تعالیٰ بھی ظاہر کرنا چاہتا تھا: (الف) جن کے دلوں میں نفاق اور کھوٹ ہے وہ نمایاں ہو جائیں اور ہر شخص ان بد بختوں کو اصلی صورت میں شناخت کر سکے۔

(ب) جن ارباب ایمان و اخلاص کے دلوں میں کچھ کمزوری ہے وہ ان تکالیف و شدائد کی وجہ سے دور ہو جائے۔

## معنی خیر حقیقت

یہاں تک دو جماعتوں کا ذکر ہوا، اب تیسرے گروہ کا تذکرہ آتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَنْجَنِ ۚ إِنَّهُمْ اسْتَرْزَلَهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

”جن لوگوں نے اس روز تم سے پشت پھیری جس دن کہ دو جماعتیں بھڑ گئیں تو ان کو فقط شیطان نے پھسلانا چاہا اس کے کسی حصہ کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا اور بیشک اللہ ان کو معاف کر چکا بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تو کفار نے اپنی مجتمع قوت سے مسلمانوں پر حملہ کیا۔

یہ چونکہ کافروں کا تعاقب کر رہے تھے اور ادھر ادھر پر اگندہ ہو چکے تھے، اس لئے ان کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ رسول اللہ ﷺ نے بلند آواز سے پکارا کہ تمام جمع ہو جائیں، مگر اس پریشانی کے عالم میں سب کا اجتماع غیر ممکن تھا۔ چنانچہ کچھ تو ایسے تھے جو فوج سے الگ ہو گئے اور اب ان کے لئے مرکز کے ساتھ اتحاد رکھنا مشکل ہو گیا اور بعض وہ بھی تھے جو بھاگ کھڑے ہوئے۔

بھاگنے کے اسباب کو قرآن ہی نے خود بیان کر دیا ہے اور وہ تیر اندازوں کا اپنی جگہ کو چھوڑ دینا، رسول اللہ کے ارشاد کی تعمیل نہ کرنا اور مال غنیمت میں مصروف ہو جانا تھا، اسی ذلت کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اسی کی وجہ سے یہ تمام مصیبت آئی اور بعض لوگ بھاگ جانے پر مجبور ہوئے۔

یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ جنگ احد میں مسلمان بھاگے ہیں۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا ہمارا فرض ہے:

(۱) بھاگنے والوں کی تعداد کتنی تھی؟

(۲) کون کون لوگ بھاگے تھے؟

اسی ترتیب سے ان کا جواب ملاحظہ ہو۔

بھاگنے والوں کی تعداد

اس سوال کے جواب میں روایات، بیحد مختلف ہیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کا تیسرا حصہ بھاگ گیا تھا۔ ایک تہائی زخموں سے چور چور تھا اور صرف تیسرا حصہ میدان جنگ میں رسول اللہ کے گرد و پیش کھڑا تھا، مگر اس روایت کا مدعا صرف یہ ہے کہ لشکر اسلام میں تین غیر مساوی گروہ ہو گئے تھے۔ بہت ہی قلیل جماعت وہ تھی جو مدینہ کو بھاگ گئے اور جس کی تعداد مختلف روایات پر غور کرنے سے آٹھ نوے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرا وہ گروہ تھا جو زخمی ہو گیا۔ اس کی ٹھیک تعداد تو معین نہیں کی جاسکتی، مگر غالباً سو کے اندر ہی اندر تھی، لہذا ثابت قدم گروہ چھ سو کے قریب قریب تھا، کیونکہ مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو نفوس پر مشتمل تھا۔ اگر دو سو آدمی آپ کے ساتھ میدان میں رہ جاتے تو ناممکن تھا کہ کفار یوں میدان چھوڑ کر گھر کی راہ لیتے اور مسلمان ثابت قدم رہ سکتے۔ ایک دوسری روایت ہمیں بتاتی ہے کہ سرور عالم کے ساتھ گیارہ جاں نثار موجود ہیں، جن میں ابو بکر، علی، عبد الرحمن بن عوف، ابو عبیدہ بن الجراح، حباب بن المنذر، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن العوام، ابو دجانہ اور طلحہ کے نام خصوصیت سے معلوم ہیں۔ یہ روایت قابل تسلیم ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فدائے اسلام پہلی ہی صدا پر شمع رسالت کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

قتال کی روایت بھی ہماری تائید کرتی ہے: والذین تدل علیہ الاخبار فی الجبلۃ ان نفرا منهم تولوا و ابعد و افہنم من دخل المدینۃ او منهم من ذهب الی سائر الجوانب و اما الاکثرون فانہم نزلوا عند الجبل و اجتمعوا ہناک۔ روایات سے

یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھاگے تھے پھر بعض تو مدینہ میں جادا خل ہوئے اور کچھ دوسری طرف چلے گئے، مگر اکثر وہیں دامن کوہ میں جمع ہو گئے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بھاگنے والوں کی تعداد نو سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں، کیونکہ نفر کا اطلاق عربی میں تین سے نو تک پر آتا ہے۔

کون لوگ بھاگے ہیں

راویات میں کثرت سے حضرت عثمان، سعد انصاری اور عقبہ انصاری کے نام لیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ حضرت عمر کو بھی بھاگنے والوں میں شمار کرتے ہیں، مگر یہ غلط ہے اور بخاری کی حسب ذیل روایت بیاگ دہل اس کی تردید کرتی ہے۔

عن البراء قال القينا المشركين يومئذ واجلس النبي جيشا من الرماة وامر عليهم عبد الله وقال لا تبجحوا ان رأيتمونا ظهرونا عليهم تبجوا وان رأيتموهم ظهروا علينا فلا تعينونا فلما لقينا هربوا حتى رأيت النساء يشتردن في الجبل رعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمية، الغنيمية فقال عبد الله عهد الى النبي ان لا تبجحوا فابوا فلما ابوا احرف وجوههم فاصيب سبعون قتيلًا، واشرف ابوسفيان فقال اني القوم محمدا فقال لا تجيبوه فقال اني القوم ابن ابي قحافة قال لا تجيبوه فقال اني القوم ابن الخطاب فقال هو لاعتقلوا فلو كانوا احياء لا جابوا فلم يملك عمر نفسه فقال كذبت يا عدو الله ابقي الله عليك ما يخزيك، قال ابوسفيان اعل هبل، فقال النبي اجيبوه قالوا اما نقول قال قولوا الله مولانا ولا مولى لكم قال ابوسفيان يوم يوم بدر والحرب سحبال وتجدون مثله لم امرت بها ولم تسوني۔

”برابر کہتے ہیں کہ جنگ احد میں رسول اللہ نے عبد اللہ بن جبیر کی سرکردگی میں تیر اندازوں کو ایک مورچہ پر مقرر کر کے فرمادیا کہ ہماری فتح و شکست سے تمہیں کوئی بحث نہیں، تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا، لڑائی ہوئی تو کفار بھاگ کھڑے ہوئے ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھائے ہوئے پہاڑوں میں دوڑ رہی تھیں، اب تیر انداز غنیمت کہہ کر مورچے کو خالی کرنے لگے تو عبد اللہ نے انہیں روکا جب وہ باز نہ آئے تو اب خود مسلمانوں پر مصیبت آگئی اور ہمارے ستر آدمی شہید ہو گئے اور ابوسفيان نے پہاڑ پر چڑھ کر رسول اللہ ﷺ، ابو بکر اور عمر کو آواز دی، مگر رسول اللہ نے ہر سوال کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا کہ مت جواب دو، جواب نہ ملنے پر اس نے کہا کہ سب لوگ مر گئے، اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے اس پر حضرت عمر کو طیش آگیا، انہوں نے کہا او خدا کے دشمن تمہیں ذلیل کرنے کے لئے ہم سب زندہ ہیں۔ ابوسفیان نے اب بت ہبل کی جے پکاری تو آپ نے فرمایا تم اللہ کی جے پکارو، جب اس نے کہا: لانا العزی ولا عزی لكم تو آپ نے صحابہ سے فرمایا تم اس کا یہ جواب دو کہ ہمارا ولی و ناصر اللہ ہے اور تمہارا تو کوئی ولی نہیں۔ ابوسفیان نے کہا یہ جنگ بدر کا جواب ہے اور جنگ میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے، کبھی ایک فاتح کبھی دوسرا، تم بعض لوگوں کو مشلہ دیکھو گے میں نے اس کا حکم تو نہیں دیا مگر کچھ برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔“

یہ طویل روایت تمہارے سامنے ہے جو اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ حضرت عمرؓ ہر گز میدان جنگ سے نہیں بھاگے، بلکہ برابر اسی جگہ جمع رہے اور ابوسفیانؓ کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیتے رہے۔ بخاری کی اس روایت کے بعد کسی منصف مزاج مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ فاروق اعظمؓ کی شان میں گستاخی کرے۔

البتہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بھاگے ہیں۔ اسی وجہ سے شیعوں نے ان پر طعن کیا ہے اور ان کو مستحق خلافت تصور نہیں کرتے، مگر جس وقت خود لسان الہی ان کے جرم سے درگزر کرتی ہے پھر کس کو حق ہے کہ ان کی شان میں زبان درازی کرے۔ ادھر جمہور امت کا قاطبہؓ یہی فیصلہ ہے کہ خلافت کے لئے معصوم ہونا شرط نہیں اور اس الزام کا بہترین جواب تو وہ ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے دیا ہے، وہو ہذا:

عن عثمان بن وہب قال جاء رجل حج البيت فرأى قوما جلوسا فقال من هؤلاء القعود قالوا هؤلاء عقرش قال من الشيخ قالوا ابن عرفتاه فقال اني سائلك عن شيء اتحدثني قال انشدك بحممة هذا البيت اتعلم ان عثمان بن عفان فر يوم احد قال نعم قال فتعلمه تغيب عن بدر فلم يشهد ها قال نعم فكبر قال ابن عمر تعال لآخبرك ولا بين لك عما سالتني عنه اما فرار يوم احد فاشهد ان الله عفا عنه واما تغيبه عن بدر فانه كان تحته بنت رسول الله وكانت مريضة فقال له النبي ان لك اجر رجل ممن شهد بدرًا وسهبه واما تغيبه عن بيعة الرضوان فانه لو كان احدا اعز بطن مكة من عثمان بن عفان لبعثه مكانه فبعث عثمان وكان بيعة الرضوان بعد ما ذهب عثمان الى مكة فقال النبي بيده اليبس هذه يد عثمان فضرب بها على يدك فقال هذه لعثمان اذهب بهذا الان معك (بخاری غزوہ احد)

“عثمان بن وہب کہتے ہیں کہ ایک شخص حج کی غرض سے مکہ میں آیا تو اس نے بیت اللہ میں ایک مجمع کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا کہ قریش ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ ان میں شیخ کون ہے؟ کہا عبد اللہ بن عمرؓ تو وہ ان کے پاس گیا اور بیت اللہ کی حرمت کا واسطہ دے کر ان سے پوچھنے لگا کیا عثمانؓ جنگ احد سے بھاگے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں، پھر اس نے پوچھا کہ وہ جنگ بدر اور بیعت رضوان میں بھی شریک نہیں ہوئے حضرت عبد اللہ نے ہر ایک سوال کا جواب اثبات میں دیا تو اس نے زور سے تکبیر کہی۔ حضرت عبد اللہ نے کہا یہاں آؤ میں تمہیں ہر ایک بات کا اطمینان بخش جواب دوں۔ غزوہ احد سے وہ بھاگے تو خدا کی قسم ان کی غلطی معاف کر دی گئی۔ غزوہ بدر میں خود سرور کائنات نے ان سے فرما دیا تھا کہ میری صابری صابری کی خبر گیری کرو جو ان کے نکاح میں تھیں اور بیمار تھیں، تمہیں وہی اجر مال غنیمت کا حصہ ملے گا جو دوسروں کو ملے گا، رہا بیعت رضوان کی عدم شرکت تو اس کا قصہ یہ ہے کہ اگر مکہ والوں کے نزدیک ان سے زیادہ کوئی اور شخص معزز و خاندانی ہو تا تو رسول اللہؐ ضرور اسی کو بھیجتے، مگر ایسا کوئی نہ تھا اس لئے آپؐ نے عثمانؓ ہی کو بھیجا اور ان کی غیر حاضری میں یہ بیعت ہوئی آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور اس کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہو گئی۔ اس قدر تفصیل کے بعد اب حضرت عبد اللہ نے سائل سے کہا کہ اب تم جاسکتے ہو۔“

اس تمام روایت کا حاصل یہ ہے کہ یزید بن بشر سسکی فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مکہ میں داخل ہوتا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر سے حسب ذیل سوال کرتا ہے۔

(۱) کیا عثمان جنگ احد سے بھاگ گئے تھے؟

(۲) کیا وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے؟

(۳) کیا وہ بیعت الرضوان کے وقت موجود نہ تھے؟

وہ ان تینوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیکر ان کی تفصیل یوں فرماتے ہیں:

(۱) وہ بھاگے ضرور مگر خدا نے ان کے جرم کو معاف کر دیا۔

(۲) غزوہ بدر میں شرکت اس لئے نہیں کی کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت رقیہؓ کی تیار داری کا انہیں حکم دیا تھا اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ تمہیں اجر و ثواب بدریوں کا سا ملے گا۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں

خاک بر فرق قناعت بعد ازیں!

(۳) بیعت الرضوان کی عدم شرکت اس لئے تھی کہ آپ کفار قریش کو سمجھانے کے لئے سفیر بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ ہی کی کفار کے ہاتھوں مقتول یا محبوس ہونے کی مشتبہ خبر سن کر رسول اللہ نے صحابہ کرام سے بیعت رضوان لی۔ پس اس بیعت کے اصلی سبب خود حضرت عثمان ہی تھے۔

خداوند تعالیٰ کے معاف فرمادینے کے بعد کوئی طعن و تعریض ان بزرگوں پر ہرگز نہ ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان بزرگوں کا بھاگنا رسول اللہ ﷺ کی خبر وفات سننے کے بعد ہوا تھا، جس کا یہ مطلب بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اب یہ خطرہ پیدا ہونا امر طبعی تھا کہ کفار کیا عجب ہے جو اب مدینہ کا رخ کریں اور مسلمانوں مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی تلوار کے گھاٹ اتارنے لگیں۔

گو قوانین جنگ کی رو سے رسول اللہ کی خبر وفات پر یقین کرنا اور یوں اپنے لشکر سے الگ ہو جانا ایک غلطی تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس غلطی کے مرتکب کو وہ الزام نہیں دیا جاسکتا جو جہاد سے فرار کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔

صرف حسرت باقی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لَا خَافُوا مِنْهُمْ إِذَا مَرُّوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا ۚ لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْمَةً فَنِعْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَاللَّهُ يُخَيِّ وَيُيَسِّتُ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٥٧﴾

”اے مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کو نکلتے ہیں یا جہاد کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے، تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے، تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں

حسرت بتائے اور اللہ ہی جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

گزشتہ آیت میں منافقین کا یہ قول نقل کیا گیا تھا: لو کان لنا من الامر شیء ما قتلناھمنا، ممکن ہے ان باتوں کے سننے سے کبھی کسی وقت مسلمانوں کے دلوں میں بھی ایسے لغو خیالات آنے لگیں، اس لئے ان سے کہا گیا کہ یہ بالکل بے سرو پا باتیں ہیں۔

منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہمارے وہ رشتہ دار جو جنگ میں مارے گئے ہیں ہمارے ہی پاس رہتے، لڑائی میں شریک نہ ہوتے اور ہماری ہی طرح انکار کر دیتے تو ان پر یہ مصیبت نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا، البتہ ایک حسرت ہے جو ان کے دلوں میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کا غم انہیں زندگی بھر رہے گا اور اسی میں گھل گھل کر مر جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ زندگی اور موت کا رشتہ فقط خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہے، اس کے سوا کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی یہ اختیار نہیں رکھتی، اگر تمام مادی اور جسمانی قوتیں بھی کام کرنے سے رک جائیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ روحانی قوتوں کی مدد سے ہمیں زندگی نوازش کر سکتا ہے۔ جب حالت یہ ہے تو پھر زندگی اور موت کے جھگڑے میں ایک مسلمان کو پڑنے کی کیا ضرورت ہے، اسے تو ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کے پاک نام پر قربان کرنے کو تیار رکھنا چاہئے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۳۱﴾ وَلَئِنْ مَّثُمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿۳۲﴾

“اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور مہربانی یقیناً اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کئے جاؤ بیشک اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔”

مسلمانوں سے پھر کہا جاتا ہے کہ مال و دولت ساتھ جانے والی چیزیں نہیں، ان سے کہیں زیادہ یہ بہتر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قانون الہی کے بلند کرنے اور اسلامی فضیلت و برتری قائم کرنے میں جانیں لڑاؤ، جہاد کرتے کرتے شہید ہو جاؤ، یا مقصد حیات ادا کرتے اپنی طبعی موت سے مر جاؤ، ہر صورت میں اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہیں ڈھانچ لے گی، انسان کو ویسے بھی مر کر اور قتل ہو کر اللہ ہی کی حضور میں حاضر ہونا ہے، تو پھر اسی ایک محبوب کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا کر کیوں نہ حاضر ہو۔ اور خدا کی راہ میں لڑ کر جان دینا ایک مسلمان بلکہ ہر عقلمند انسان کا بلند ترین مقصد ہونا چاہئے۔

تنظیم جماعت کے اصول

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ؕ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ؕ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوْهُمْ فِي الْأَمْرِ ؕ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ؕ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۳۳﴾

“سو اللہ کی رحمت سے تم ان کے لئے نرم ہو اور اگر تم بد خو اور سخت دل ہوتے تو وہ تمہارے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے، سو تم ان کو معاف کر دو اور ان کے لئے استغفار کرو اور کام میں ان سے مشورہ کر لیا کرو پھر جب تم ٹھان لو تو اللہ

ہی پر بھروسہ کر دینیک اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ہے جو حیات انسانی کی تشدید و تکلیف کا مرکزی دائرہ ہے، فوج کے ایک حصہ نے نافرمانی کی ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف آپ کی ذات اقدس کو بلکہ تمام مسلمانوں کو تکلیف اٹھانی پڑی ہے، قوانین جنگ اس بات کے متقاضی ہیں کہ تیر اندازوں اور بھاگنے والوں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ ایسے وقت میں قرآن حکیم اعلان کرتا ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ نہایت ہی نرمی کا سلوک کیا، ان کی غلط کاریوں کی طرف توجہ تک نہ کی، بلکہ آپ نے ان سے فرمایا: انا انکم مثل الوالد، میں تمہارے ساتھ باپ کی طرح سلوک کرتا ہوں، اگر بیٹے سے کبھی فروگزاشت ہو جاتی ہے تو باپ اس کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے والد سے بھی بڑھ کر حسن سلوک اور شفقت و محبت کا اظہار کیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ ترقی ہمیشہ تدریجی ہو ا کرتی ہے، اگر اس وقت ان سے غلطی ہو گئی تو پھر اس کی اصلاح کر لیں گے۔ اس موقع پر آپ کے خلق عظیم کا اعلان ہونا بتاتا ہے کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کس اعلیٰ ترین بلند مقام پر تھے۔ آپ کے اسی خلق عظیم کا ذکر دوسری جگہ اس طرح آتا ہے: انک لعلی خلق عظیم۔ سورہ توبہ کے آخر میں ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ ۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس کبھی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: لا حلم احب الی اللہ تعالیٰ من حلم امام ورفقہ ولا جہل ابغض الی اللہ من جہل امام وخرقہ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین حلم و بردباری ایک امام و سردار کی ہے کہ باوجود قدرت کے درگزر کرتا ہے اور اس کی جہالت و خود سری سے بڑھ کر کوئی مغبوض ترین چیز نہیں۔

قانون جنگ کی رو سے نافرمانوں یا فرار کرنے والوں کو جو سزا دی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کو ایک بہانہ ہاتھ نہ لگ جائے، ورنہ امام کو جب معلوم ہو کہ فراریا نافرمانی کے تحت میں نفاق عمل مخفی نہ تھا، بلکہ غلط اجتہاد کی بنا پر ایسا ہوا تو پھر ایک شفیق اور دانشمند امام احتساب اعمال میں بھی اسی نسبت سے کمی کر دیتا ہے۔ چونکہ آپ کی ذات اقدس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپ اعلیٰ ترین معلم ہیں۔ اس لئے تمام قوانین عمل اور موجبات حیات ملیہ ایک ایک کر کے آپ اپنے صحابہ کو تعلیم فرماتے ہیں اور خود اس پر عمل کر کے دکھا دیتے ہیں۔

آپ کو حکم ہوتا ہے کہ ضروری کاموں میں اپنے صحابہ سے مشورہ کر لیا کریں، امرہم شوری بینہم مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ماتشاور و قوم قط الاھد والارشاد امرہم، جب کبھی ایک قوم کسی کام کے متعلق مشورہ کرے گی تو اس کو بہترین راہ عمل کی طرف ہدایت ہوگی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ما رایت رجلا اکثر استشارة للہما لجال من رسول اللہ ﷺ، میں نے رسول اللہ سے بڑھ کر کسی شخص کو لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر و عمر سے فرمایا: لو اجتمعنا فی مشورۃ ما خالفتکما، اگر تم



دونوں کسی بات میں متفق ہو گئے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔ چنانچہ ساری حیات طیبہ میں آپ کا یہی طرز عمل رہا۔ غزوہ بدر میں مشورہ سے نکلے، جنگ احد میں اگرچہ آپ کی رائے مخالف تھی، مگر کثرت رائے کو تسلیم کر لیا۔ جنگ احزاب میں آپ کفار کو کچھ دینے پر رضامند تھے مگر صحابہ کے مشورے سے رک گئے، خود واقعہ اُفک میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔

آخر میں فرمایا گیا کہ جس وقت مشورہ مکمل ہو جائے، مسئلہ کے تمام ضروری اور ناگزیر اطراف بحث سامنے آجائیں اور سب کے سب یا کثرت رائے سے ایک امر کا فیصلہ کر لیں، تو پھر اس میں تساؤل کی ضرورت نہیں، بلکہ جس قدر سامان و وسائل ہیں، ذرائع و اسباب ہیں اور قوت و طاقت ہے، اس مقصد کے کسب و حصول میں صرف کر دینی چاہئے اور کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرنا چاہئے۔ نتیجہ کی طرف سے بے نیاز ہو کر اس کو خدا پر چھوڑ دینا چاہئے، تو یقیناً آپ غالب رہیں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ آپ سے عزم کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مشاورۃ اهل الرأي ثم اتباعهم۔ ارباب حل و عقد کے ساتھ بحث و مشاورت کرنا اور پھر پوری ہمت سے اس کے مطابق عمل کرنا عزم ہے۔

توکل علی اللہ

إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُونَ ﴿۸۵﴾

”اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہی تم کو چھوڑ بیٹھے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ فقط اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔“

اگر مسلمانوں نے صحیح فیصلہ کر لیا، پھر کام کو اٹھ کھڑے ہوئے اور بالفرض ان کے پاس سامان حرب وغیرہ کچھ نہ ہو تو ضرور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز انہیں کسی نہ کسی صورت مہیا کر دے گا۔ خداوند قدوس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی ضروریات زندگی فراہم کر دیں، ایسے ہی دنیا کو صحیح علم کی ضرورت ہے جس کا بقا اللہ تعالیٰ کی نصرت اور دستگیری پر موقوف ہے۔ اس لئے جو لوگ اس کے باقی رکھنے کے لئے سربکف کوشش کریں گے یقیناً ان کی مدد ہوگی۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کسی رکاوٹ کی پروا نہ کریں، ضرور انہیں کو کامیابی ہوگی۔

خیانت ناممکن ہے

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تَبَوَّأُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۸۶﴾

”اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے روز لایا جائے گا جو کچھ اس نے خیانت کی ہے پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا ہے اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔“



غلول خیانت کو کہتے ہیں واصلہ اخذ الشی فی الخفیۃ، دراصل خفیہ طور پر کسی چیز کا لینا غلول ہے۔ میدان جنگ میں لڑنے کے بعد جس قدر سامان دستیاب ہو اس کو مال غنیمت کہتے ہیں جس کی تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(الف) تمام سپاہیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ان لوگوں نے سامان حرب کی فراہمی اپنے ذاتی مصارف سے کی ہے۔ اوائل عہد اسلام میں اسی صورت پر عمل کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لئے یہ بہترین شکل ہے کہ ہر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ذمہ دار بنادیا جائے اور وہ خود ضروریات جہاد فراہم کرے۔

(ب) بیت المال میں سب کچھ جمع کر کے وہاں سے مجاہدین کی تنخواہا ہوا دیا ہوا کرے اور تمام سامان جنگ اور آلات حرب کی فراہمی خود حکومت کے ذمہ ہو۔ موجودہ زمانہ میں یہ صورت زیادہ بہتر اور قابل عمل ہے اور ضابطہ اور نظام اسی امر کا مقتضی ہے۔

مال غنیمت کے پانچ حصے کئے جاتے ہیں۔ چار تو سپاہیوں کے لئے اور ایک امام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مال میں سے کچھ چھپالے تو وہ غلول کا مرتکب ہو گا۔ اس سے تمام مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور جب تک سب کے سب اسے معاف نہ کر دیں وہ مجرم ہی رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اونٹ کے چند بال لے کر فرمایا کہ میں اتنا بھی بلا قاعدہ صرف کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ سنتے ہی صحابہ سوئیاں اور دھاگے لے کر آگئے اور عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کو معمولی خیال کر کے لے گئے تھے۔

گزشتہ آیت میں نبی کریم کو یہ حکم دیا تھا کہ فاعف عنہم واستغفرلہم۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ صحابہ کو اب بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے کہ رسول اللہ نے ان کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ یہ نبی کی شان کے بالکل نامناسب ہے کہ زبان سے تو وہ عفو و درگزر کا اعلان کرے اور دل میں ان جرائم کی یاد تازہ رکھے۔

مفسرین کرام نے اس خیانت کو صرف جنگ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ بعض نے امور نبوت سے اس کو متعلق کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا اطلاق عمومیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت رسالت کی یہی مراد تھی۔ مسند امام احمد میں ہے: اعظم الغلول عند اللہ ذراع من الارض تجدون الرجلین جارین فی الارض اونی الدار، فیقطع احدہما من حظ صاحبہ خداعا، فاذا قطعہ طوقہ من سبعم ارضین یوم القیۃ۔ اللہ کے نزدیک بدترین خیانت یہ ہے کہ ایک پڑوسی اپنے ہمسایہ کی زمین یا گھر میں سے ایک حصہ صلب کرے تو قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ شہروں اور ملکوں کے حکام اور والیوں کے متعلق آپ نے صاف صاف اعلان فرمادیا تھا: من ولی لنا عملا ولیس لہ منزل، فلیتخذ منزلا ولیست لہ زوجۃ فلیتزوج، ولیس لہ خادم فلیتخذ خادما ولیس لہ دابة فلیتخذ دابة ومن اصاب شیئاً سوی ذلک فهو غال۔ جس شخص کو ہم نے کسی جگہ کا والی بنایا اور اس کے پاس گھر، بیوی، خادم یا سواری وغیرہ نہیں تو وہ ان میں سے ہر ایک چیز طلب کر سکتا ہے، ان کے سوا وہ جو کچھ رعایا سے وصول کرے گا تو وہ

خائن ہوگا۔ آج کل کے سرکاری ملازم اس فرمان رسالت سے عبرت اندوز ہوں۔ ایک مرتبہ آپ نے ابن اللبتیتہ المازدی کو صدقات وصول کرنے کے لئے تحصیلدار مقرر فرمایا۔ وہ صدقات لے کر دربار نبوی میں حاضر ہوئے تو عرض کیا: ہذاکم و هذا اھدی لی، صدقات تو یہ ہیں اور یہ چیزیں لوگوں نے مجھے ہدیہ کے طور پر دی ہیں۔ یہ سنتے ہی آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: مابال عامل بنعشہ علی عمل، فیقول ہذاکم و هذا اھدی لی، افلا جلس فی بیت ایبہ وامہ فینظر ایھدی الیہ ام لا والذی نفس محمدیۃ لایاتی احدکم منها بشیء الا جاء بہ یوم القیمة علی اقتبہ (مسند امام احمد) یہ عامل بھی عجیب لوگ ہیں ہم ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں وہ آکر کہتا ہے کہ یہ صدقات ہیں اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ دیا ہے۔ وہ گھر ہی میں کیوں نہیں بیٹھا رہا پھر دیکھتے لوگ اس کے پاس ہدایا لاتے ہیں یا نہیں، مجھے خدا کی قسم جو شخص ذرہ برابر بھی چیز اپنے پاس رکھے گا قیامت کو وہ اسے اپنی گردن پر لادے ہوئے لائے گا۔

آپ بار بار فرمایا کرتے تھے: ہدایا الولاۃ غلول، والیوں اور عالموں کو جو تحائف ملتے ہیں وہ سب غلول اور خیانت میں شامل ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا، جب وہ دور نکل گئے تو انہیں ایک شخص بھیج کر پھر واپس بلوایا، جب وہ آگئے تو ان سے پوچھا تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کس لئے واپس بلایا ہے، دیکھو، لاتصیین شیئاً بغیر اخن فانہ غلول ومن یفعل یات بہا غل یوم القیمة لہذا دعوتک فامض لعبدک۔ جن چیزوں کے وصول کرنے کا میں نے حکم دیا ہے ان کے سوا جو کچھ بھی تم لوگوں سے لوگے وہ غلول ہو گا اور تم اسے قیامت کے روز خود لے کر حاضر ہو گے۔ اس بات کے بتانے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا اب اپنے کام پر جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ کی امانت کو نہ صرف دوست بلکہ دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ ہر شخص آپ کو الامین کے نام سے پکارتا تھا۔ ایسے نبی سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ غلول جیسے جرم کا مرتکب ہو۔ اس لئے کہ خائن کبھی ترقی نہیں کر سکتا: ان اللہ لایھدی کید الخائنین۔

### شتان بینہما

اَفَمِنْ اَتْبَعِ رِضْوَانِ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخِطِ مَنِ اللّٰهِ وَمَا وُضِعَ لَهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۷﴾ هُمْ دَرَجَتْ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بِصِيْرَتِهِمْ بَاطِلٌ يُعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

”بھلا وہ شخص جو اللہ کی مرضی کا تابع ہو، اس جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ اللہ کے پاس لوگوں کے درجات ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ رضوان الہی کا اتباع کرنے والا ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ اس لئے کہ وہ قانون الہی کی خاطر اپنے اغراض و مقاصد کی پروا نہیں کرتا اور ہر چیز اس کے لئے قربان کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اپنی ضروریات کو مقدم رکھتا ہے وہ پورا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: اَفَمَنْ يُّعَلِّمُ اَنْثٰى اَنْثٰلٍ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْلٰی

(الرعد ۱۹) بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے۔ دوسری جگہ ہے: أَفَمَنْ وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَا يَتَذَكَّرُ أَلَيْسَ لِمَنْ يَشَاءُ اللَّهُ غَنًى (القصص ۲۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا اور اس نے اسے حاصل کر لیا تو کیا وہ اس شخص کا سا ہے جس کو ہم نے دنیا کی زندگی کے فائدے سے بہرہ مند کیا۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۱﴾

“بیشک اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا جب کہ انھی میں سے ان میں پیغمبر بھیج دیا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ سے کام لے کر محمد ﷺ کو تم میں مبعوث کیا، جو زندگی بھر تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب اور حکمت کے فرائض ادا کرتے رہے۔ جس پاکباز انسان کی حیات مقدس کا ایک ایک لمحہ ان مقاصد عالیہ میں صرف ہو، اس کی نسبت یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ غول کا مرتکب ہو گا۔ آپ کی شان اس سے بہت بلند تر واقع ہوئی ہے اور آپ کے متعلق ایسے خطرات و وساوس دل میں لانا ہر گز مناسب نہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی نسبت تو یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت تو بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ تو شرک اور چوری نہ کر، تو اس کا مطلب دراصل امت کو تعلیم دینا ہے اور بس۔

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ

ان تمام آیات میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طریق پر مسلمانوں کی منتشر قوت کو پھر یکجا کر دیا اور وہ لوگ جو جنگ احد میں الگ ہو گئے تھے ان کو دوبارہ متحد کر دیا۔ اس تمام تر بحث کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ جو لوگ آپ کے جانشین ہوں وہ اسی اسوۂ حسنہ کا پورا اتباع کریں:

(۱) دوستوں کی غلط کاری کے باوجود ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔

(۲) بد خلقی سے پرہیز کریں۔

(۳) تمہارے قلوب اپنے احباب کے لئے ہمدردی، محبت اور شفقت سے لبریز ہوں۔

(۴) ان کی غلطیوں کو دل سے بالکل فراموش کر دو اور پھر کبھی ان کو یاد بھی نہ کرو۔

(۵) ان کے لئے برابر دعا کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ ان کو آئندہ غلطیوں سے محفوظ رکھے۔

(۶) ان سے ہمیشہ مشورہ کرو اور اپنی رائے پر اصرار مت کرو۔

(۷) فیصلہ کے بعد عزم مصمم کر کے اس کام کو پورا کرنے میں لگ جاؤ اور اس میں اپنی پوری کوشش صرف کر دو۔

(۸) تمام مسلمانوں کی طرح امیر کا حق مساوی ہو، کسی چیز کو اپنے لئے خاص نہ کرو۔

(۹) قانون الہی کے بلند و برتر کرنے میں اپنی عزیز ترین متاع حیات تک قربان کر دو۔

(۱۰) تلاوت آیات میں برابر مصروف رہو اور لوگوں کو قرآن پڑھاؤ۔

(۱۱) خود اس قانون پر عمل کرو کہ لوگوں کے لئے نمونہ بن سکو۔

(۱۲) قرآن کی تعلیم دو اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرو۔

(۱۳) تعلیم حکمت میں مصروف ہو جاؤ اور قرآن کے اصول اساسی دنیا کے سامنے پیش کرو۔ یہ نتائج ہیں جو گزشتہ

آیات سے مستنبط ہوتے ہیں اور جن پر عمل کرنے سے ہمارے لیڈر اور رہنما ہماری پر آگندہ جماعتوں کو ایک مرکز پر لاسکتے ہیں۔

### تکالیف کا لطیف جواب

أَوَلَمْ آَاصَابِكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَئِذَا هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجُنُودُ الْفِتْنَةُ فَيَا ذُنُوبَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا

”کیا جب تم پر کوئی مصیبت آپڑی جس سے دو چند تم ان کو پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو یہ کہاں سے ہے، کہہ دو یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور جو کچھ اس روز تم پر مصیبت آپڑی جبکہ دونوں جماعتیں بھڑگئیں تو اللہ کے حکم سے تھا، تاکہ وہ مومنوں کو جان لے اور ان لوگوں کو جان لے جنہوں نے نفاق کیا۔“

غزوہ احد میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچ چکی ہے، ممکن ہے اس کا خیال ان کو آئندہ جنگ میں جانے سے روکے، اس لئے کہا گیا تم اتنی سی مصیبت سے پریشان ہو گئے، حالانکہ اس سے دگنی مصیبت تم ان کفار کو پہنچا چکے ہو۔ غزوہ بدر میں ان کے بہترین افراد قتل و قید کئے گئے، پھر اس جنگ میں بھی انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر بھی کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی، اس کا جواب یہی ہے کہ تم نے نافرمانی کی، تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور یہ تکلیف آئی۔

من عند انفسکم کی ایک اور لطیف توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے فیصلہ کے مطابق ہوا ہے۔ جنگ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت تم نے یہی کہا تھا کہ ہم ان کفار کو فدیہ لے کر رہا کئے دیتے ہیں۔ اس کے عوض میں ہمارے ستر آدمی دوسری جنگ میں جو قتل ہوں گے تو شہادت کے درجہ پر فائز ہوں گے۔ ترمذی میں ہے:

جاء جبرئیل الى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال ان الله كره ما صنع قومك في اخذهم الفداء من الاسارى وقد امرك ان تخيرهم بين ان يضربوا اعناق الاسارى وبين ان ياخذوا الفداء على ان يقتل منهم عدتهم فذكر ذلك رسول الله ﷺ للناس فقالوا يا رسول الله عشارتنا واخواننا، بل ناخذ فداءهم فتقوى به على القتال عدونا وليست تشهد منا عدتهم، فقتل منهم يوم احد سبعون عددا سارى اهل بدر۔

”جبریل نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ قیدیوں سے فدیہ قبول کرنے میں آپ کی قوم نے اچھا کام نہیں کیا، خدا کا حکم یہ تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دو اور اگر فدیہ قبول کرو تو پھر اس کے عوض میں اتنے ہی مسلمان آئندہ شہید ہوں گے۔ رسول اللہ نے صحابہ کے سامنے اس کو پیش کر دیا تو ان لوگوں نے عرض کیا کہ وہ بھی ہمارے بھائی ہیں، ہم فدیہ لیتے ہیں کہ آئندہ جنگ میں ہم اور زیادہ قوی بن سکیں اور ہمارے اتنے ہی آدمی شہید ہو جائیں، چنانچہ اہل بدر کی تعداد اساری کے مطابق جنگ احد میں مسلمان شہید ہو گئے۔“

نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ خود مسلمانوں نے جو کچھ کیا اور جس فیصلہ پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا، اسی کے مطابق نتائج نکلے۔ اب کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس واقعہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے ممتاز بھی کر دیا۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَتَّبِعُنَا هُمْ لِنَكْفِي يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿٦٥﴾ الَّذِينَ قَالُوا لَا خِوَانِيهِمْ وَقَعَدُوا أَلَا أَعْطَاكُمْ مَا قَاتِلُوا قُلْ فَادْرَعُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٦﴾

”اور ان سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو، انہوں نے کہا کہ اگر ہم لڑائی جانتے تو تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ یہ لوگ آج بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہیں۔ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں، یہ وہی ہیں اگرچہ خود تو بیٹھے رہے مگر اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو نہ مارے جاتے، کہہ دو اچھا اگر تم سچے ہو تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹا رکھو۔“

ان لوگوں سے کہا گیا کہ حق و صدق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہو اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو کہ کلمہ حق و حریت بلند و برتر ہو۔ انسان کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تو یہی جہاد فی سبیل اللہ ہی ہونا چاہئے، لیکن اگر اس کا شوق و ولولہ نہیں اور تمہارے دل اسلام کی محبت سے خالی ہیں، تو پھر اپنے آپ ہی کو بچانے کے لئے ہتھیار سنبھال لو کہ دشمن تمہارے فنا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، مگر ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ کسی طرح بھی جہاد کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ الٹا ان مسلمانوں کو مورد طعن و تشنیع بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا عقل سے کام لو، یہ بھی کوئی لڑائی ہے جس کے لئے تم ہمیں دعوت دے رہے ہو، دشمن کی تعداد ہم سے چار گنا زیادہ، اسباب و وسائل اور مال و دولت میں ہم سے بڑھ کر ہے، ادھر مسلمان غریب و مفلس اور بے دست و پا ہیں، اس حالت میں گھر سے جنگ کے لئے نکلنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں لے جانا ہے، ان حالات میں ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ جنگ ہو گی۔ اگر واقعات و قرآن اس بات کی شہادت دیتے کہ لڑائی ہو کر رہے گی تو خیر ہم بھی تمہارے ساتھ ہو لیتے۔

ان بد بختوں کو اتنا دکھائی نہیں دیتا کہ اسلام کو فنا کرنے کا مخالفین نے عزم کر لیا اور یہ لوگ اب تک اپنی مصالحہ خصوصی ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ منافق ہیں اور کفر کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ ان کے دلوں میں تو یہی ہے کہ ہم کبھی

مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں، مگر ظاہر داری کے طور پر ان خیالات کو چھپاتے ہیں، لیکن اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

یہ احمق پھر اسی پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اپنے مشوروں کی اہمیت، صابت رائے اور دانشمندی جتانے کے لئے کہتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان بھی ہمارا کہنا مان لیتے، جو جنگ میں شریک ہوئے ہیں، تو ہرگز قتل نہ ہوتے اور نہ ان کے ممالک ان کے قبضے سے نکلتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تمہاری بات ماننے سے انسان نہیں مرتا اور تمہاری صحبت و یکجائی زندگی بخش ہے تو ذرا اپنی موت کو تو ٹال دو، جب ایسا نہیں کر سکتے اور وہ ضرور آکر رہے گی تو اس موت سے یقیناً بہتر ہے کہ ایک مسلم جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان دیدے۔

### اظہار مسرت

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۱۶﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۚ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۷﴾ يُسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۸﴾

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردے خیال نہ کرو بلکہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں، اللہ نے ان کو جو اپنے فضل سے دیا ہے اس سے وہ خوش ہیں اور جو ان کو پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کی وجہ سے بھی خوش ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اللہ کی نعمت اور فضل سے خوش ہوتے ہیں اور بیشک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

حامیان حق و صدق کی موت، موت نہیں، بلکہ دائمی زندگی ہے، ان شہدائے ملت کو دودھری شادمانی اور مسرت ہوتی ہے:

(الف) اس لئے کہ قدوس حق نواز نے ان کی قربانی کو شرف قبول بخشا اور ان کو حیات ابدی نوازش کی۔

(ب) اس لئے کہ جو فرزند ان اسلام دنیا میں رہ گئے وہ قانون الہی کو دنیا میں اچھی طرح رائج کر دیں گے اور سعادت کی بنیاد رکھنے والے وہی شہدائے ملت تھے جو پہلے گزر چکے۔

### جنگ میں مرنا یقینی نہیں

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۹﴾

”جنہوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا بعد اس کے کہ ان کو زخم پہنچ چکے تھے، ان میں سے ان کے لئے بڑا اجر ہے جنہوں نے نیکی کی اور پرہیز گار بنے۔“

ابو سفیان احد سے بھاگ کر جب مقام زوحاء میں پہنچا تو اسے خیال ہوا کہ کام ناتمام رہ گیا اور ارادہ کیا کہ واپس چل کر مسلمانوں کا نام و نشان مٹالے، رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا کہ وہ مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ کرنے کا خیال کرے گا، اس لئے آپ نے دوسرے ہی روز اعلان کر دیا کہ کون ہے جو ان کفار کے تعاقب میں چلے گا۔ فوراً ستر

آدمیوں کی جماعت اس خدمت کے لئے تیار ہو گئی، جن میں حضرت ابو بکر وزیر بھی تھے، آپ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے آٹھ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا مگر درپردہ اسلام کا طرفدار تھا۔ اس کا رئیس معبد خزاعی مسلمانوں کی تکالیف کا ذکر سن کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا۔ ابوسفیان نے مدینہ کی طرف واپس لوٹنے کا ارادہ ظاہر کیا تو معبد نے کہا: میں دیکھتا آتا ہوں، محمد اس سرور سامان سے آرہے ہیں کہ ان سے مقابلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان کی ہمت نہ پڑی اور مکہ کو چلا گیا۔ اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿١٠٠﴾ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ دِفْعَلٍ لَّمْ يَتَسَنَّسْهُمْ سُوًى ۚ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿١٠١﴾ إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُ ۚ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا مِنِّي إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٢﴾

“جن سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے کے لئے بڑا سامان جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو مگر اس بات نے ان کا ایمان بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، غرض وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے، انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا اور وہ اللہ کی رضا پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے سو تم ان سے نہ ڈرو اور اگر تم مومن ہو تو مجھ ہی سے ڈرو۔“

ان آیات میں بدر صغریٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ احد کے میدان میں چلتے وقت ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ آئندہ سال بدر صغریٰ کے میدان میں ہماری اور آپ کی جنگ ہوگی اور آپ کی طرف سے حضرت عمر نے اس کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ دوسرے سال اسی وعدہ کے مطابق ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر مرالظہر ان تک آیا مگر کچھ ایسا مرعوب و ہیبت زدہ ہو گیا کہ اسی جگہ سے واپس لوٹ گیا۔ راستے میں نعیم بن مسعود اشجعی سے یہ کہتا گیا کہ اگر رسول اللہ کو روک دو تو دس اونٹ نذر دوں گا، ہم ضرور ان پر حملہ کرتے مگر خشک سالی کی وجہ سے ہم کچھ تیاری نہیں کر سکے۔

نعیم نے جس کو اس آیت میں شیطان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، مدینہ میں آکر مسلمانوں کو ڈرانا شروع کیا اور کہنے لگا کہ کفار نے تمہیں فنا کرنے کے لئے ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا ہے، تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالو، مگر ان الفاظ نے فرزند ان اسلام پر کچھ ہی اثر نہ کیا، وہ خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے نکل کھڑے ہوئے اور ان کی ہمت بڑھتی ہی گئی۔ یہ اپنے عہد کے مطابق بدر صغریٰ تک چلے گئے، مگر وہاں دشمن کا نام و نشان تک نہ تھا اور اس طرح ہر قسم کی تکلیف سے بچ گئے۔ اتفاق سے وہی ایام قبیلہ بنو کنانہ کے میلہ کے تھے، ان کی منڈی میں مسلمانوں نے بھی تجارت کی اور خوب کمایا۔

غرض خلاصہ یہ نکلا کہ اگر ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ جنگ میں بھی مارا جائے گا، بہت ممکن ہے کہ خود دشمن ہی مرعوب ہو کر میدان میں نہ آ سکے، اس لئے مسلمانوں کو موت سے ڈر کر اپنے فرائض میں کوتاہی ہر گز نہ کرنی چاہئے۔



یہاں تک غزوہ احد کی بحث ختم ہو گئی، اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ کفار و منافقین کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھو، ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔ اس دوستی کا نتیجہ بھی دکھادیا کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور ان لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ جب کفار و منافقین کی دوستی کا اثر رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہوئے ظاہر ہونے سے نہ رہا تو اب تو بدرجہ اولیٰ یہ دوستی اپنا رنگ لائے گی۔ چنانچہ آج کل مسلمانوں کی بالکل یہی حالت ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ کفار، اہل کتاب اور منافقین کی دوستی سے پرہیز کریں اور ان پر ایک لمحہ کے لئے بھی اعتماد نہ کریں۔

### آپ غمگین نہ ہوں

وَلَا يَخْزِيكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۖ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِطًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣١﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُثَبِّتُ لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۖ إِنَّمَا نثَبِّتُ لَهُمْ لِيُذْذَبُوا الشُّبُهَاتُ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٣٢﴾

”تمہیں وہ لوگ غم میں نہ ڈالیں جو کفر میں دوڑتے ہیں، یہ لوگ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لئے برا عذاب ہے، بیشک جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر کو مول لیا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور ان کو دردناک عذاب ہو گا اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے، ہم تو ان کو صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں مر جائیں اور ان کے لئے ذلت کی سزا ہے۔“

اگر خدا انخواسے مسلمانوں میں منافقین کے خصائل پیدا ہو جائیں، ان کی طرح وہ بھی اسلام کے ساتھ دغا بازی کرنے لگیں اور اس کے دشمنوں سے ساز باز رکھیں تو رسول اللہ ﷺ کو کس قدر رنج ہو گا، اس سے اسلام کی ترقی رک جائے گی۔ اس آیت میں آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ اگر کچھ نام نہاد مسلمان موج نفاق میں بہ جائیں تو آپ ان کی پروا نہ کیجئے کہ اسلام کی حفاظت و صیانت کے لئے فداکاروں کی ایک اعلیٰ ترین جماعت ہمیشہ تیار رہے گی اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک نہیں ہوئے وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ ان کو جس قدر مہلت مل رہی ہے یہ ان کے حق میں مفید ہوگی۔ اس فرصت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اور زیادہ گناہوں کا ارتکاب کریں گے، انہیں نیک و بد کی تمیز نہ رہے گی اور پھر آخر کار غیروں کے محکوم بن جائیں گے۔ ایک جگہ آتا ہے: فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (القلم ۴۴) تو مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دو، ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: تُعْجِبُكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَآئِ الْخَلْقِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ (النساء ۵۵) تم ان کے مال و اولاد سے تعجب نہ کرنا، خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے اور جب ان کی جان نکلے تو اس وقت بھی وہ کافر ہی ہوں۔



## فرق و امتیاز

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ دُسْلِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ فَأَمُونُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَتَنُوكُمْ فَانكُمُ أَجْرُ عَظِيمٌ ﴿٥٠﴾

”اللہ ایسا نہیں کہ مسلمانوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کر دے اور یہ بھی نہیں کہ اللہ تم کو غیب کی باتیں بتا دے، لیکن اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے، تو تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیز گار بنو گے تو تمہارے لئے بڑا اجر ہے۔“

مسلمانوں پر مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہوتی ہیں، وہ مہالک و شدائد میں مبتلا ہوتے ہیں اور بسا اوقات ان پر یاس و قنوط کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس کی حکمت کیا ہے اور ایسا کیوں ہوا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مومنوں کو منافقوں اور ملت فروشوں سے الگ کر دے اور سرفروشان اسلام کے جوش و ولولہ، عمل، فداکاری، ملت اور جذبہ اسلام پرستی پر مہر لگ جائے، کیونکہ مشکلات و موانع میں صرف مومن ہی صبر و استقلال، عزم و ہمت اور ثبات قدم کا اظہار کر سکتا ہے، غدار و ملت فروش تھوڑی سی مصیبت سے گھبرا کر کام چھوڑ دیتے ہیں، مگر سنت اللہیوں جاری ہے کہ واقعات پیدا کر کے اور تکلیفوں میں پھنسا کر اباب ایمان و نفاق کو جدا کیا جاتا ہے، لوگوں کو ان کے نام نہیں بتائے جاتے اور نہ یہ بتانا کسی کے لئے حجت اور سند ہو سکتا ہے، بلکہ حالات و واقعات خود بخود حقیقت کو بے نقاب کر دیتے ہیں اور پھر مسلمان کبھی ان سے دھوکا نہیں کھاتے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ اب ہر ایک شخص جب تکالیف و شدائد کی وجہ سے ممتاز ہو جاتا ہے تو پھر ہر ایک کو الہام بھی ہو جاتا، اس لئے کہ وحی والہام کے لئے جو انتخاب ہوتا ہے، اس کا قانون ہی بالکل جدا گانہ ہے اور اس انتخاب میں آنا کسی کی سعی و کوشش پر موقوف نہیں، بلکہ اللہ يعلم حیث یجعل رسالتہ، پس تمہاری ترقی کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ قانون الہی کو اپنا دستور العمل بناؤ، ان واقعات و حوادث میں ثابت قدم رہو، اسلام کے ساتھ غداری نہ کرو اور جہاد فی سبیل اللہ سے کبھی جی نہ چڑاؤ۔

## فصل ثانی

ان سے پرہیز کرو

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْغُلُونَٰ بِمَا أَنْتُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ ۚ بَلْ هُمْ شَرٌّ لَّهُمْ ۚ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ ٱلْقِيٰمَةِ ۚ وَلِلّٰهِ مِيرَٰثُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٥١﴾

”اور وہ لوگ یہ نہ سمجھیں جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ وہ ان کے لئے بُرا ہے عنقریب قیامت کے دن اس چیز کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔“

اس سورۃ میں اصلی مخاطب تو نصاریٰ ہیں مگر کبھی کبھی ضمناً یہودیوں کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ اس سورۃ کا مقصد وحید یہی ہے کہ عیسائیوں کی تمام حکومتیں مسلمانوں کو دلوادی جائیں اور ان کے ممالک پر فرزند ان اسلام کا قبضہ ہو، اس غرض کے حصول کے لئے کچھ شرطیں سورت کے ابتدا میں بیان کی گئی تھیں۔ اب اس بحث کو دور کو ع میں ختم کر دیا جائے گا، یہاں سے یہودیوں کی چند خرابیاں ذکر کی جاتی ہیں، جن کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے بیان کرنے سے مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ وہ ان امراض میں مبتلا نہ ہوں، ورنہ ان کی قومیت فنا ہو جائے گی اور وہ بھی یہودیوں کی طرح بن جائیں گے۔

یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہودیوں کی تمام رسمیں بُری نہیں ہیں۔ ہمیں ان میں فرق و امتیاز کی ضرورت ہے۔ پھر ان کو چھوڑ دیں جو بُری ہیں۔ چنانچہ ان میں ایک مرض بخل کا ہے۔ یہ لوگ اپنے مال و دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں، مگر وہ یقین کر لیں کہ یہی دولت ان کی ذلت کا باعث بن جائے گی، چنانچہ بنی اسرائیل کی حالت ان پر گواہ ہے۔

### ناشائستہ حرکات

لَقَدْ سَبَّحَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيَاتِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾

”اللہ نے ان کا قول سن لیا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انہوں نے کہا، نیز ان کا ناحق نبیوں کو قتل کر ڈالنا اور ہم کہیں گے کہ جلائے والا عذاب چکھو، یہ اس کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

یہودیوں کی حالت یہ ہے کہ وہ حد درجہ کے بخیل واقع ہوئے ہیں، اللہ کی راہ میں انہیں کچھ دینا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ فرعون کے صدیوں تک غلام رہے۔ وہ بد بخت تمام اعلیٰ ترین مناصب اور عہدے صرف اپنی قوم کو دیتا اور ذلیل کام ان کے سپرد کرتا کہ تمام دن محنت کرنے کے باوجود انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ لگے۔ جب ذرائع آمدنی نہ ہوں تو مال کی محبت ہو جانا ایک قدرتی امر ہے، یہی وجہ تھی کہ ان میں دولت کی الفت حد سے بڑھ گئی تھی، جب کبھی ان سے خدا کے نام پر مانگا جاتا تو تمسخر و استہزاء کے طور پر کہتے کہ خدا فقیر ہو گیا ہے جو ہم سے مانگتا ہے۔

اس بخل کے علاوہ ان میں دوسرا مرض یہ تھا کہ تعلیم صحیح کو ماننے کی خاطر ناحق انبیاء و رسل کو قتل کیا کرتے تھے، پھر بھلا ایسے مجرم کہیں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ اس بد بختی کا نتیجہ انہیں یہ ملا کہ خدا نے ان کو ایسا ذلیل کر دیا کہ باوجود کروڑ پتی ہونے کے وہ در بدر مارے مارے پھرتے ہیں۔

## دجل و فریب

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهْدُ إِلَيْنَا أَلَّا تَكُونُ لَنَا حَتَّى يَأْتِيَنَا بِقُرْآنٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ۖ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِهِ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ وَيَا لَذِي قُلُوبٍ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾

”جن لوگوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم دے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک ہمارے پاس وہ قربانی نہ لائے جسے آگ کھا جاتی ہو، کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت پیغمبر تمہارے پاس کھلی نشانیاں اور وہ بھی جو تم کہہ رہے ہو لپکے ہیں پھر اگر تم سچے ہو تو تم نے ان کو کیوں قتل کر ڈالا۔“

اس آیت میں یہودیوں کے ایک اور مرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم فقط اس رسول کے پیروں میں رہیں جو بنی اسرائیلی شریعت کا پابند ہو اور اس کے نزدیک قربانی دینے کا وہی قاعدہ ہو جو انبیائے بنی اسرائیل میں رائج تھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ اکثر اوقات پوری کی پوری قربانی آگ کی نذر کر دی جاتی تھی، جس کو وہ سوختی قربانی کہا کرتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ آسمان سے آگ نازل ہو کر اس کو کھا گئی جو قبولیت کی نشانی خیال کی جاتی تھی، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے: ”اور جب سلیمان دعامانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اتری اور سوختی قربانی کو اور ذبحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا۔“ (۲ توریت: ۱۷) اس قسم کی بحث وجدل سے ان کا منشا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے سوا کسی دوسرے خاندان کو علوم نبوت نہیں مل سکتے، اس لئے ہم صرف اپنی ہی شریعت کا اتباع کریں گے۔

سورہ بقرہ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ وہ بار بار اسی پر زور دیتے ہیں کہ ہم بنی اسرائیلی پیغمبروں کے سوا اور کسی پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت میں بھی وہی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تمہارے پاس بنی اسرائیلی رسول کثرت سے آئے، ان کے پاس معجزات و دلائل تھے، وہ موسوی شریعت کے پابند تھے اور اسی کی جانب تمہیں دعوت بھی دیتے تھے، باوجود ان باتوں کے تم نے انہیں کیوں قتل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم صرف دھوکا دینے کی خاطر رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں بنا رہے ہو۔ جس کی شریعت میں سوختی قربانی بالکلمہ منسوخ کر دی گئی، ورنہ اصل میں تمہارا ارادہ سرے سے مخالفت کرنے کا ہے اور تمہارے نمبر میں پیغمبروں کی دشمنی موجود ہے۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ ۖ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿١٨﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أَجُوزَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ مَّتَافٍ ۚ

الْعُرُورِ ﴿١٩﴾

”پس اگر یہ تم کو جھٹلا دیں تو تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو جھٹلا چکے ہیں جو کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے، ہر جان کو موت چلھنی ہے اور تم کو صرف قیامت کے دن پورے بدلے دیئے جائیں گے، پس جو آگ سے دور ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ ضرور کامیاب ہو گیا اور دنیوی زندگی تو صرف دھوکے کا سودا ہے۔“

روشن دلائل و براہین کے ہوتے ہوئے بھی اگر یہ لوگ تمہاری بات نہ مانیں تو پر وانیہ کیجئے، ان بد بختوں کی یہ قومی

خصوصیت ہے کہ ہر نبی کا انکار کیا جائے۔ چنانچہ ان کے پاس ایسے پیغمبر آئے جن کے پاس حسب ذیل چیزیں تھیں:

(الف) بینات: دلائل نبوت، معجزات اور ایسے صاف و صریح احکام جن کے نتائج فوراً معلوم ہو جائیں۔

(ب) زبر: چھوٹی کتابیں جو مفصل ہوں اور جن میں حکمت و دانائی کی باتیں درج ہوں۔ قرآن حکیم کی مختلف سورتیں

اور صحائف انبیاء اسی میں شامل ہیں: وانہ لغی زہر الاولین۔

(ج) کتاب منیر: چھوٹی چھوٹی کتابوں اور سورتوں کا مجموعہ مثلاً خود قرآن مجید قنادہ کہتے ہیں: الذیہر کتب الانبیاء و الکتب

النہیہ، هو القرآن الکریم۔ زبر سے مراد انبیائے سابقین کی کتابیں ہیں اور کتاب منیر بھی قرآن کریم ہے۔

لیکن یہ تکذیب کب تک، آخر ایک روز ان تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہو کر رہے گا اور جس دنیا کو تم نے اپنا مقصد حیات بنالیا ہے وہ تو اس متاع آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ حدیث میں آتا ہے: ان موضع سوطی الجنة خیر من الدنيا وما فیہا۔ (ترمذی) جنت میں ایک چابک کے برابر جگہ مل جانا دنیا و ما فیہا سے کہیں بہتر ہے۔

لَتُبْلَوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۖ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرٰكُوْا اَدٰی كَثِيْرًا ۗ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر (۳۱)

”تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں میں ضرور تمہاری آزمائش کی جائے گی اور ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی ہے اور مشرکوں سے بہت سی ایذا کی باتیں تم ضرور سنو گے اور اگر تم صبر کرتے رہو اور پرہیزگار بنے رہو تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔“

اس آیت میں ہمیں آئندہ کیلئے ایک خاص امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین مسلمانوں کے نہایت ہی شدید دشمن ہیں۔ یہ سب کے سب اسلام کے مقابلہ میں متحد ہو جائیں گے کہ الکفر ملۃ واحدة اور ان سب کا مرکز نقطہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں، ان کے ممالک پر قبضہ کر لیں، قرآن حکیم کو محو باطل کر دیں، دنیا میں ایک مسجد بھی قائم نہ رہے اور اللہ کا نام لینے والا ایک متنفس بھی موجود نہ ہو۔ موجودہ زمانہ کے تمام حالات پر یہ آیت پورے طور سے صادق آرہی ہے۔ اپنے گرد و پیش اگر نظر دوڑاؤ اور یورپ کی تاریخ اپنے سامنے رکھ لو تو اس کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

ان تکالیف و مصائب کے زمانہ میں مسلمانوں کو صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے، وہ اپنے مقصد پر مر مٹیں، ایک انج بھی اسلام سے نہ ہٹیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے طرز عمل کو اپنے سامنے رکھیں، اس کے بعد کامیابی صرف فرزند ان اسلام ہی کی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِنْ اٰیِ الْاٰمِنِیْنَ اٰوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۚ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ وَاَشْتَرَوْا بِهٖ ثَمٰنًا قَلِيْلًا ۚ فَبَشِّرْ مَا يَشْتَرُوْنَ (۳۲)

”اور جب اللہ نے ان سے عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی ہے کہ تم ضرور اس کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرو گے، پھر انہوں نے اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا مول لیا ہو کیا یہی برا ہے جو وہ خریدتے ہیں۔“

ان لوگوں کو کتاب دی گئی تھی کہ اس کی نشر و اشاعت کریں گے، مگر دنیوی اغراض مقاصد کی خاطر اس کو چھپاتے ہیں، افسوس کہ خود امت مسلمہ کے بیشتر طبقات اسی جرمِ استہان و عدم تمیز کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ عوت الی القرآن جو ان کی زندگی کا مقصد اصلی ہے اسی سے اغراض و انحراف ہے اور کتاب الہی سے بعد و ہجر ہی ان کے تمام امراض و مفاہد کا حقیقی سبب ہے۔ فہل من مدکر۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفَرُّ حُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ ؕ  
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”یہ ہر گز خیال نہ کرو کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اس سے جو انہوں نے کیا اور چاہتے ہیں کہ اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیا تو یہ ہر گز خیال نہ کیجیو کہ وہ عذاب سے پناہ میں ہیں اور ان کے واسطے دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہ یہودیوں کی آخری خرابی ہے کہ کام کرتے نہیں، کتاب کی تعلیم نہیں دیتے اور اس پر چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ علماء میں اس قسم کا مرض عموماً پیدا ہو جاتا ہے، وہ باوجود اپنا فرض منصبی ادا نہ کرنے کے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی قصیدہ خوانی کریں، مگر یہ تعریف و توصیف انہیں عذاب الہی سے نجات نہیں دلا سکتی۔

## فصل ثالث

### اوصاف ضروریہ

#### اولوالالباب

یہودیوں کی خرابیوں سے پرہیز کرنے کی تعلیم دینے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اگر مسلمان اس امر کے آرزو مند ہیں کہ وہ تمام عیسائی ممالک پر قابض ہو جائیں تو وہ ان اوصاف و کمالات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان آیات میں ذکر کئے جائیں گے۔ ان خصائص و امتیازات کے کسب و حصول کے بعد کسی نصرانی حکومت کو فرزند ان اسلام سے مقابلہ کی طاقت نہ ہوگی۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٢٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ سُبْحَنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢١﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْرَجْتَهُ ۚ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن أَنصَارٍ ﴿٢٢﴾

”بیشک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے بہتیری نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے ہوئے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔ ہمارے پروردگار تو نے اس کو بے فائدہ نہیں بنایا، تیری ذات پاک ہے پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ ہمارے رب، جس کو تو آگ میں ڈال دے پس اس کو تو نے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں۔“

انسانی عقل ہمیشہ خارج سے متاثر اور سبق اندوز ہوتی ہے۔ ارباب عقل و خرد زمین و آسمان کی پیدائش، اختلاف لیل و نہار اور زمانہ کے گزرنے سے صد ہا عبرتیں اور بصیرتیں حاصل کر لیتے ہیں، قوموں کے عروج و زوال، علو و تسفل اور ترقی و تنزل کے اصول و ضوابط معلوم کرتے ہیں۔ ان آیات کا درس و فکر انہیں بتاتا ہے کہ ہر چیز خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے ان ارباب خرد کی زندگی کا بھی ضرور کوئی نہ کوئی مقصد ہو گا، ورنہ وہ درجہ انسانیت سے گر جائیں گے۔

مگر یہ حقیقت ان لوگوں کو معلوم ہوتی ہے جو ہر حالت میں اپنے فرض منصبی کو یاد رکھتے ہیں، اس کے ادا کرنے کی انہیں ہر وقت فکر دامن گیر رہتی ہے، جب وہ ایک مرتبہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کر چکے ہیں اور انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہر چیز ایک خاص مقصد کے لئے بنائی گئی ہے، اگر وہ مقصد پورا نہ کرے تو اپنے درجہ سے گر جائے گی، ایسے ہی اگر مسلمان اپنے نصب العین سے گر جائیں تو وہ اعلیٰ ترقی سے محروم رہیں گے، یعنی جنت میں نہیں جاسکیں گے۔

اس لئے یہ لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ خداوند! تیرے تمام قاعدے ٹھیک ہیں، ہمیں ان قوانین پر چلنے کی توفیق دے، تاکہ اس اعلیٰ ترین راحت کو حاصل کر سکیں اور آتش سوزا سے نجات پائیں، کیونکہ جس شخص نے اپنے فرائض حیات میں کوتاہی کی وہ ذلیل ہو گا اور اس کے لئے جہنم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

وہ فرض یہ ہے

رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّنَا مِنَ الْآبْرَارِ ﴿٢٣﴾ رَبَّنَا وَاتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْوَعْدَ ﴿٢٤﴾

”ہمارے رب! بیشک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لئے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ پس ہم ایمان لے آئے، ہمارے رب تو ہمارے گناہ بخش دے ہماری برائیاں ہم سے دور کر اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کیجو، ہمارے رب! ہمیں وہ دے جس کا تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہمیں وعدہ دیا ہے اور قیامت کے روز ہمیں ذلیل نہ کی جو، بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

وہ فرض جس کے ادا نہ کرنے پر جہنم کی آگ کا خوف دلایا گیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خدائے واحد کی جانب بلارہے تھے، ہم نے اس آواز کو سن لیا، اب اسی کو اپنی زندگی کی غایت الغایات، انتہائی نصب العین اور اعلیٰ ترین مقصد بناتے ہیں۔ اگر اس عظیم ترین فرض کے ادا کرنے میں ہم سے غلطیاں سرزد ہوں تو خداوند معاف کر دیجیو، ان غلط کاریوں کا جبر نقصان کر کے ابرار کے ساتھ ہمارا خاتمہ کیجیو، تو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص میرے کام میں لگ جائے گا میں اس کو تمام دنیا سے بے نیاز کر دوں گا اور اس کو ہمیشہ کفار پر غالب رکھوں گا پس تو وعدہ کو پورا کر اور وہ انعامات نوازش فرما، ہماری تمناؤں کو اپنی رحمت سے پورا کر، ایسا نہ ہو کہ ہم ضروریات زندگی فراہم نہ ہونے کی وجہ سے اس فرض جلیل سے غافل ہو کر قیامت کے روز سب کے روبرو ذلیل ہوں، پس تو ہی ہماری ضروریات کو پورا کیجیو۔

وعدہ الہی

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ؕ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ؕ فَاَلَدِیْنِ  
هَاجِرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِّنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْدُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَفَتَلُوْا وَفُتِلُوْا اَلَا کُفِرْنَ عَنْهُمْ سَبَیْلَتِهِمْ وَلَا دُخِلَتْهُمْ جَنَّاتِ تَجْرِیْ  
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ؕ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَ کَاسِنِ الثَّوَابِ ۝۱۰

“پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو، جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں ضرور ان کے گناہ ان سے دور کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس کیا اچھا بدلہ ہے۔”

سورہ بقرہ کا خاتمہ اس دعا پر ہوا تھا: فانصرنا علی القوم الکفرین، اس سورت میں اس دعا کو شرف اجابت بخشا گیا اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی تمام حکومتیں مسلمانوں کو مل کر رہیں گی۔ لیکن اس فتح و کامرانی کے لئے ایک شرط بھی ہو گی وہ یہ کہ محض دعا پر قناعت نہ کر بیٹھیں، بلکہ دعا بھی کریں اور ہاتھ پاؤں بھی ماریں۔ کام کرو گے اور جان و مال قربان کرو گے تو ان نتائج و ثمرات سے بہرہ اندوز ہو گے۔

کام کی صورت یہ ہے کہ جس طرح پہلے ارباب ایمان نے حق و حریت کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا، تم بھی ہجرت الی اللہ اختیار کرو اور جس جگہ تمہاری ضرورت ہو وہاں جا کر کام کرو، ان لوگوں کی تو یہ کیفیت تھی کہ ان میں سے بعض اپنے گھر میں بہترین طریق سے خدمت حق انجام دے سکتے تھے، مگر وہاں کے رہنے والے ان کے شدید ترین خلاف بن گئے اور ان کو زبردستی اپنے وطن سے نکال دیا اور بعض لوگوں نے خود ہی دوسری طرف ہجرت اختیار کی، مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ اپنا فرض منصبی ادا کرنے سے قاصر نہ رہے، میری راہ میں انہیں ہر قسم کی تکلیف دی گئی، ان کے قتل کے منصوبے

باندھے گئے اور جس وقت مخالفین ان کے قتل کے درپے ہوئے تو مجبوراً انہیں یہی ہتھیار سنبھالنے پڑے اور شہید ہو گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام غلطیاں نظر انداز ہوں گی اور وہ ہر طرح با مراد ہوں گے۔

لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿٣٨﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٣٩﴾

”جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے یہ تو تھوڑا سا فائدہ ہے پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

کفار کی دنیاوی ترقی سے آپ پریشان خاطر نہ ہوں، یہ خیال نہ آنے پائے کہ ان کے پاس ہر قسم کا ساز و سامان موجود ہے، ہر جگہ ان کی حکومت ہے اور مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، یہ بالکل حقیر چیز ہے اور ان بد بختوں کے لئے ہر گز مفید ثابت نہ ہوگی۔ تم مسلمان اگر کام کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو سب کچھ مہیا کر دیا جائے گا۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: مَا يُجَادِلُ فِي إِلَهٍ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغُزُّكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (المومن ۴) خدا کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں تو ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ان الذين يفتنون على الله الكذب لا يفلحون۔ جو لوگ جھوٹ اللہ پر تہمت لگاتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ ایک مقام پر اس طرح آتا ہے: نمتعهم قليلاً ثم نضطرهم الى عذاب غليظ۔ انہیں ہم تھوڑا سا مال دیں گے پھر عذاب غلیظ کی طرف مجبور کر دیں گے۔

لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا رِبَاهُمْ هُمْ جُنُودٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خُلِدِ الَّذِينَ فِيهَا نَزْلاً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْآبَرَارِ ﴿٤٠﴾

”لیکن جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے واسطے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انھی میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیکیوں کے لئے بہت اچھا ہے۔“

جو تقویٰ اللہ اختیار کریں گے ان کو دائمی کامیابی اور آخرت میں جنت ملے گی اور اس جنت کی نعمتوں کا تو کوئی شخص وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آتا ہے: ملا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ کسی انسانی آنکھ نے ان کو نہیں دیکھا نہ کانوں نے سنا اور ان کا تو کوئی انسانی دماغ مخیل بھی نہیں کر سکتا۔

فضائل مخصوصہ

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَشِعِينَ لِلَّهِ ۖ لَا يَشْتَغُونَ بِلَايَةِ اللَّهِ شَيْئاً قَلِيلاً ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

”اور اہل کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ان کی



جانب اتارا گیا، اللہ کے سامنے عاجزی کرتے رہتے ہیں، اللہ کی آیات کے عوض تھوڑا سا مول نہیں لیتے، یہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ بیشک اللہ جلدی حساب کرنے والا ہے۔”

اہل کتاب میں بعض لوگ یقیناً اچھے ہیں، جن کی صفات اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام اوصاف و کمالات جو ان آیات میں ذکر کئے گئے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں موجود تھے۔ پھر وہ لوگ جو باوجود عیسائی یا یہودی ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے: الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ۖ وَإِذْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ قَالُوا امْنَابِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ۝ اُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ (القصص ۵۲ تا ۵۴) جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جب قرآن کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ بیشک وہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور ہم تو اس سے پہلے کے حکم بردار ہیں۔ ان لوگوں کو دگنابند لادیا جائے گا، کیونکہ صبر کر رہے ہیں اور بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہے: الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ اُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ (البقرہ ۱۲۱) جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو ایسا پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے، یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اس طرح بھی آتا ہے: مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَالَتِ هِيَ تِلَاوَةُ الْاٰیٰتِ اِنَّهٗ اِلٰهٌ اَحَدٌ ۚ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ (ال عمران ۱۱۳) ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں، جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ پھر ان صفات کا بہترین مجموعہ صحابہ کرام ہیں، پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کا ایک ایک فرد ان فضائل و محاسن سے متصف ہو جائے تاکہ نصاریٰ کے ممالک پر قبضہ کرنے کے قابل ہوں۔

حی علی الغلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

“اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور صبر کرو اور تیار کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ مراد حاصل کرو۔”

ان اوصاف مذکورہ کے بعد ان خصوصیات کو بھی اپنے اندر پیدا کر لو:

(الف) ہر وقت اپنے مقصد حیات پر مرنے کے لئے تیار رہو۔

(ب) مسلمانوں کو ہمیشہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے جوش دلاتے رہو اور ان کو بھی اعلیٰ مقاصد زندگی پر مرنے کے لئے تیار کرو۔

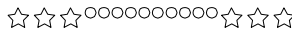
(ج) جس قدر تمہارے مخالفین ہیں ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرو تاکہ اگر وہ کوئی تدبیر اسلام کی بربادی کی سوچیں تو تم فوراً اس کا رد عمل کرو۔ آج کل دول یورپ کے سفر ایہی فرائض انجام دیتے ہیں اور اسی کام کے لئے اجنبی حکومتوں میں ان کے قونصل خانے تیار ہوتے ہیں۔ حدیث میں نہایت کثرت سے اس رابطہ فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ بخاری میں ہے: رابطہ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیہا۔

اللہ کے لئے ایک دن کی چوکیداری دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ ابو داؤد میں ہے: کل میت یختم علی عملہ الا الذی مات مرابطاً فی سبیل اللہ فانہ ینسولہ عملہ الی یوم القیمة ویامن فتنۃ القبر۔ ہر مرنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر مرابطہ فی سبیل اللہ کے اعمال قیامت تک بڑھتے رہتے ہیں اور فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے کہ اس نے نوع انسانی کے بقا کی خاطر اپنا وقت قربان کر دیا۔ مسند امام احمد میں حضرت ام درداء سے ہے: من رابط فی شئ من سواحل المسلمین ثلاثۃ ایام اجزأت عنہ رباط سنت۔ جس نے تین روز تک مسلمانوں کے سواحل سمندر کی حفاظت کی باقی مقامات کی سال بھر کی نگرانی اس کے برابر ہوگی۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے، اس کے دوران میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے: حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ یقام لیلہا ویصام نہارہا، اللہ کی راہ میں ایک رات جاگنا ایسے ہزار دن سے بہتر ہے جو روزوں سے بسر ہوں اور ان کی شب میں قیام کیا جائے۔ ترمذی نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے: عینان لا تمسہما النار عین بکت من خشیۃ اللہ وعین بانث تحرس فی سبیل اللہ۔ دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں لگے گی وہ جو اللہ کے خوف سے گریہ کرتی ہو اور وہ جو رات کو مسلمانوں کی پاسبانی کرے۔ مسند امام احمد میں ہے: من حرس من وراء المسلمین متطوعاً لا باجرة السلطان لم یر النار بعینہ جس شخص نے محض بوجہ اللہ بغیر اجر و تنخواہ کی چوکیداری کی وہ اپنی آنکھ سے دوزخ کو نہیں دیکھے گا۔

(د) اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔

ان صفات کے کسب و حصول کے بعد کامیابی یقینی اور قطعی ہے۔ بقرہ اور آل عمران دونوں نے مسلمانوں کے سامنے فلاح و کامرانی اور زندہ قوم بننے کی راہ کھول دی ہے: فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليکفر۔

الحمد لله الذي بنعمة تتم الصلحت





# تفسير المرقا

## في

## مكارف القرب

حصه دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

## تمہید

کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ ہمارے لئے عبرتوں اور بصیرتوں کے سینکڑوں خزانے اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے: و فی الافاق و فی انفسکم افلا تبصرون، مگر ہماری غفلت و خود فراموشی کی یہ کیفیت ہے کہ ہم ان عجائبات قدرت کو روزمرہ دیکھتے ہیں مگر ان سے کوئی درس عبرت حاصل نہیں کرتے اور نہیں جانتے کہ کار ساز قدرت نے ان میں کیا کیا حکمتیں رکھی ہیں نیدرون علیہا و ہم عنہا معرضون۔

تم نے کبھی اس کرۂ ارضی کے کون و فساد کے فلسفہ میں بھی غور کیا کہ ہزاروں شہر آباد ہوتے ہیں مگر ان میں سے بعض کو تو انسان آب و ہوا کی عمدگی اور جغرافیہ حدود کی خاطر اپنے رہنے کے لئے چن لیتا ہے اور باقی زراعت و زغن کا آشیانہ بن جاتے ہیں۔ زمین کی آبپاشی کے لئے سینکڑوں نہریں کھودی جاتی ہیں لیکن کچھ مدت کے بعد اکثر تو زمین ہی میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں، بعض دوسرے دریاؤں میں مل جاتی ہیں اور صرف نیل اور فرات ہی کا نام زبانوں پر رہ جاتا ہے۔ وادی کشمیر کو تو پھولوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے جس طرف نگاہ اٹھتی ہے روح وریحان و جنت نعیم ہی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے اور ایک سندھ کا ریگستان ہے جو ببول کے کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں کے واسطے چن لیا گیا ہے۔

ایک تناور درخت کے سایہ میں تم چھوٹا سا پودا لگاتے ہو مگر چند روز کے بعد وہ مر جھا جاتا ہے، لیکن وہ درخت جس کی جڑیں چاروں طرف دور در تک پھیلی ہوئی تھیں تمام رس چوس لیتا ہے اور اس ننھے پودے کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتا۔ جنگل میں ہزار ہا قسم کے درخت لہلہا رہے ہیں مگر صرف آبنوس کی لکڑی ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی لکھیاں بن کر زلفِ محبوب کی معطر لٹوں سے ہم کنار ہوتی ہیں اور باقی درخت ایندھن کے کام آتے ہیں۔ تم نے سمندروں اور دریاؤں میں بار بار دیکھا ہو گا کہ بڑی بڑی مچھلیاں منہ کھولے ہوئے دریا میں تیرتی پھرتی ہیں اور جو چھوٹی مچھلی ان کے سامنے آتی ہے اس کو نگل جاتی ہیں۔ غروبِ آفتاب کے وقت بہت سے پرندے خوراک کی تلاش میں ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں اور چھپر اور بھنگے کو کھا جاتے ہیں۔ جنگل میں ہزاروں لاکھوں جانور رہتے ہیں مگر اس کی حکمرانی صرف شیر ہی کو نصیب ہوتی ہے، ہاتھی کا کام ہی یہی ہے کہ صدا کیڑوں مکڑوں کو اپنے پاؤں تلے روند دے۔

ابھی اور آگے چلو اور عالم معنویات کی سیر کرو وہاں بھی یہی چیز دکھائی دے گی۔ کتنی زبانیں بنتی ہیں پھر ان میں سے

کس قدر بقائے دوام کا لباس پہن لیتی ہیں اور کن زبانوں کی نسبت مردہ ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ الہامی کتابیں بہت کثرت سے نازل ہوئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتی یہ عزت صرف قرآن حکیم ہی کو حاصل ہوئی کہ وہ ہر قسم کی تحریف سے پاک رہا اور جو الفاظ کہ لسان نبوت پر جاری تھے ہم آج انہیں کی تلاوت کرتے ہیں اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا۔ سینکڑوں مذاہب وادیان کے نام ہم ہمیشہ کتابوں میں پڑھتے ہیں ان میں سے ہر ایک مذہب اپنی اپنی قوم اور ملک کے لئے مخصوص رہا اور اسلام کو عالمگیر مذہب بننے کی کرامت نوازش کی گئی۔ خیالات و افکار کو دیکھو دن رات میں بے شمار باتیں ہمارے دماغ میں پیدا ہوتی ہیں مگر جب صبح کو نیند کا خمار جاتا رہتا ہے تو صرف چند باتیں یاد رہ جاتی ہیں، باقی سب بھول جاتے ہیں۔

### انتخاب طبعی

ہم نے بغیر کسی ترتیب کے چند باتیں عرض کر دیں۔ ان پر پھر ایک مرتبہ سرسری نگاہ ڈالو اور اس سنت اللہ کو تلاش کرو جو ان سب میں برابر کام کر رہی ہے۔ اسی قانون قدرت کے نتائج ہیں جو روزمرہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کارگاہ عالم میں ہوتے رہتے ہیں۔ اگر تم ذرا غور سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ دنیا میں جو چیز پیدا کی گئی ہے وہ بیکار نہیں، بلکہ اس کی پیدائش سے ضرور کوئی نہ کوئی غرض پوری ہوتی ہے، پھر اس کرہ ارضی کی حالت یہ ہے کہ اس کی ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں کہ نئی چیز وہاں آکر اپنا ٹھکانا بنالے، بلکہ اسے اپنی جگہ آپ نکالنی پڑے گی اور یہ ممکن نہیں جب تک دوسروں کے ساتھ مزاحمت اور کشمکش نہ کرے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہر چیز میں اپنی زندگی کا عشق اور بقا کی محبت رکھی گئی ہے اس لئے جگہ خالی نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ دونوں میں شدید جنگ نہ ہو، اسی کو اصطلاح میں قانون تنازع للبقاء کہتے ہیں۔ گویا ہر چیز اپنے آپ کو باقی رکھنے کے لئے دوسری سے جنگ کرتی ہے اور اس کوشش میں رہتی ہے کہ اپنے حریف اور مد مقابل کو فنا کر دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جنگ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی، ایک کو بہر حال مغلوب ہونا پڑے گا اور دوسرے کے لئے جگہ خالی کرنی ہوگی، لیکن اس کشمکش میں کامیابی صرف اسی کو نصیب ہوگی جس کے پاس قوت و طاقت ہے۔ قدرت خود بخود اس کو منتخب کر لے گی اور ضعیف کو برباد کر دے گی، اسی کو انتخاب طبعی یا بقائے اصلح کہتے ہیں۔

اس قدر تمہید کے بعد اب تم ان تمام چیزوں کو ایک مرتبہ دیکھ جاؤ جن کو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔ جنگل کے تمام جانور کوشش کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک جنگل کا بادشاہ بن جائے مگر قدرت کی نظر انتخاب شیر ہی پر پڑتی ہے کہ وہی سب سے زیادہ صاحب اثر و نفوذ ہے اور بکری صرف اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ اپنے بادشاہ کے لئے ترنوالہ کا کام دے۔ ہمارے خیالات میں باہمی کشمکش ہوئی اور ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ میں تو زندہ رہوں اور باقی سب کو وقف نسیان کر دوں، مگر اس جنگ میں صرف بہترین خیالات کا نقش فی الحجر بن کر رہ گئے اور دوسروں کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا گیا۔ دنیا میں ہر روز سینکڑوں چیزیں ایجاد کی جاتی ہیں، مگر تم دیکھو کہ موچی اور لوہار کافن تو آج ہر گاؤں اور قصبہ میں رونق

پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کیمیا کا نام ہی نام کتابوں میں رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز انسانوں کے لئے بالکل بیکار تھی اور لوہار اور موچی کا کام نسل انسانی کے لئے بے انتہا مفید تھا۔ پس قدرت نے ا صلح کو چن لیا اور غیر ضروری کو فنا کر دیا۔ ان گذشتہ سطروں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ جنگ میں مصروف ہے مگر غلبہ صرف اسی کو نصیب ہوتا ہے جس کے قبضہ میں طاقت ہوتی ہے اور جو کمزور ہوتا ہے اس کو فنا کر دیا جاتا ہے، کہ دنیا ضعیف کا مقتل اور طاقت والوں کے لئے بہشت ہے۔

## قوموں کی جنگ

اب تم ان سب کو چھوڑ کر انسانی آبادی میں آؤ اور اس کی انفرادی و اجتماعی حالت میں غور کرو تو یہاں بھی وہی قانون قدرت کا فرمانظر آئیگا، ایک انسان اپنے آپ کو باقی رکھنے کے لئے تمام ان چیزوں کو حاصل کرتا ہے جن سے اس کو قوت حاصل ہو۔ وہ اپنے وجود کے عشق میں صدا ہا جانوروں کا گوشت کھا جاتا ہے اس لئے کہ ان سب کے مقابلہ میں وہی زیادہ طاقت والا اور دنیا میں زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے، اس کے بعد تم اجتماعی طور پر بھی دیکھو تو طاقتور گھرانے اور حکومتیں کمزور نسلوں اور قوموں کو مقابلہ میں شکست دے دیتی ہیں جس قوم کے پاس قوت ہو وہ کہتی ہے کہ زمین میرے لئے ہے اس دعویٰ کے سنتے ہی تمام کمزور قومیں اس کے آگے جھک جاتی ہیں اور اس کے لئے اپنی جگہ خالی کر دیتی ہیں۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا کی تلوار نے یورپ پر واضح کر دیا کہ وہ سب سے زیادہ تیز ہے تو کسی کو طاقت نہ ہوئی کہ تجربہ کے لئے اپنی گردن پیش کرے بلکہ تمام مغرور حکومتوں نے خود بخود اس کے مطالبات کو تسلیم کر لیا، یہ بھی بقائے ا صلح ہے۔

## القرآن الحکیم

اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ صرف چند مثالیں تھیں کہ اس قانون کی ہمہ گیری ذہن نشین ہو جائے، ورنہ وہ تو کائنات عالم کے ایک ایک ذرہ کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس نظریہ کی طرف سب سے پہلے قرآن حکیم نے توجہ دلائی کہ وہی العلم ہے، اس کتاب عزیز کا ایک تہائی حصہ قانون تنازع للبقاء اور انتخاب طبعی کے بیان پر مشتمل ہے۔ نور اور ظلمت، حق اور باطل اور پھر سب سے آخر اسلام اور کفر میں جو جنگ ہے وہ اسی قانون کا ایک شعبہ ہے اور ان دونوں میں سے بقا صرف اس کو نصیب ہوتی ہے جو قوت و طاقت میں زیادہ ہو۔ ہم پہلے تنازع للبقاء کی چند جزئیات ذکر کریں گے۔

## جزئیات تنازع للبقاء

(۱)۔ مخالفین اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو۔

مَا يَدْعُو الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْبَشَرِ كَيْفَ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ (البقرة ۱۰۵)

”کافر اہل کتاب اور مشرکین نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی خیر و برکت نازل ہو۔“

(۲)۔ اہل کتاب یہ جاننے کے باوجود کہ اسلام سچا دین ہے محض حسد اور کینہ کی وجہ سے اس کو شش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کر کے کافر بنادیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِسْلَامِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (البقرة ۱۰۹)

”اس بات کے بعد بھی کہ اہل کتاب پر حق ظاہر ہو چکا ہے دلی حسد کی وجہ سے یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد تم کو کافر بنادیں۔“

(۳)۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے تاکہ دنیا سے اسلام مٹا دیں۔

وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (البقرة ۲۱۷)

”اور کافر تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے لوٹا دیں۔“

(۴)۔ کافروں کی عادت ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں تاکہ عوام الناس کے دلوں میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفَئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ (الصف ۸)

”یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں۔“

(۵)۔ اہل کتاب اور مشرکین ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے اس لئے ان کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں میں اختلاف پیدا کر دیں، ان کی حکومتیں ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں اور ان میں کسی قسم کا رابطہ اتحاد قائم نہ رہے، جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا تو پھر ایک ایک کر کے سب کو اپنی قوت و طاقت سے برباد کرنا شروع کر دیتے ہیں:

إِن يَشْفَقُوا كُنْتُمْ لَكَفُّرًا ۚ أَعْدَاءُ وَيَسْطَوْا إِلَيْكُمْ آيَاتِهِمْ ۚ وَالسِّنْطَةُ بِالسُّؤْلِ ۚ وَذُوَا لَوْتُ كُفْرًا ۚ (الممتحنہ ۲)

”اگر کافر تم کو پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور برائی کے ساتھ اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تم پر چلائیں اور وہ یوں آرزو کریں کہ تم سب کے سب کافر بن جاؤ۔“

(۶)۔ جس وقت اصحاب کہف اللہ پر ایمان لے آئے اور انہوں نے اس امر کا صاف طور پر اعلان کر دیا کہ ہم صرف ایک ہی پروردگار پر ایمان رکھتے ہیں اور اب ہمارا سر اس کے سوا اور کسی ہستی کے آگے نہیں جھک سکتا تو ان کی یہ حق پرستی اس ملک کے قانون میں سب سے بڑا جرم ٹھہرا اور ان عشاق حق کے لئے صرف جنگوں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غار ہی امن و عافیت کے گوشے رہ گئے اور بالآخر وہ آبادی کو چھوڑ کر ایک پہاڑ کی غار میں چھپ گئے:

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا (الكهف ۲۰)



“واقعی وہ لوگ اگر تمہاری خبر پا جائیں تو تم کو سنگسار کر دیں گے یا پھر تم کو اپنے دین میں لے جائیں گے اور تب تمہیں ہر گز فلاح نہ ہوگی۔”

(۷)۔ جب جادوگر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تو صرف اسی جرم کی پاداش میں فرعون ان سب کو پھانسی دینا چاہتا ہے:

لَا قُطْعَنٌ أَيْدِيكُمْ وَأَازُجُكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (الاعراف ۱۲۳)

“میں تمہارے مخالف ہاتھ اور پاؤں کا ٹونگا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔”

(۸)۔ یہود و نصاریٰ کبھی بھی مسلمانوں سے خوش نہ ہوں گے ان کی رضا مندی کے حاصل کرنے کی صرف ایک ہی

صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنا مذہب ترک کر دیں اور ان کے دین کو قبول کر لیں:

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرة ۱۲۰)

“جب تک تم یہود و نصاریٰ کا مذہب قبول نہ کرو گے وہ تم سے کبھی خوش نہ ہوں گے۔”

(۹)۔ اہل کتاب ہمیشہ ایسی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں جن سے اسلام کو نقصان پہنچے، اس کی حکومتوں میں بد اخلاقی پھیلے اور

اس طرح آہستہ آہستہ تمام بد کاری کا گھر بن جائیں:

وَيَتَّبِعُونَ بِالْأَنفُسِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ (الحجرات ۸)

“گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔”

(۱۰)۔ مخالفین اپنے آپ کو شریف اور مہذب اور مسلمانوں کو رذیل اور وحشی کہتے ہیں، اس لئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے

کہ مسلمانوں کو حکومت سے محروم کر کے ان کے بہترین مقامات پر قبضہ کر لیں:

لِيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (المنافقون ۸)

“عزت والا یہاں سے ذلیل کو نکال دے گا۔”

## فلسفہ جنگ

دنیا میں سینکڑوں قوتیں مصروف عمل ہیں، مگر ان کا ظہور نہیں ہوتا ہے جب تک ان کا باہمی تصادم نہ ہو، سمندر کی موجوں میں تلاطم موجود ہے مگر معلوم اسی وقت ہو گا جب ہوا کے تیز و تند جھونکے پانی کو تھپیر ماریں گے۔ عطر کی شیشی اگر بند کی بند ہی رہے تو وہ مشام جان کو معطر نہیں کر سکتی، اس کی بوئے جانفر ابار بار کے ملنے ہی سے پھیلتی ہے۔ اخلاق بھی ایک عظیم الشان قوت ہے۔ اگر انسان جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا تو اس کے تمام اخلاقی کمالات پہاڑ کے تاریک غاروں میں چھپ کر رہ جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرزند آدم کو اخلاق کی نمائش کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، اس لئے رہبانیت کو ناجائز قرار دیا اس لئے کہ انسان کا اخلاقی جوہر بھی دنیا کی دوسری قوتوں کی طرح تصادم اور کشمکش ہی کے ذریعہ



ممتاز ہو سکتا ہے۔

جنگ سے انسان کو سخت ٹھوکر لگتی ہے، اس کا نظام اخلاق بالکل بدل جاتا ہے اور وہ قوتیں ابھر آتی ہیں جو اب تک پوشیدہ تھیں۔ جو قومیں ہمیشہ جنگ میں مصروف رہتی ہیں ان میں شجاعت ایک قومی سیرت بن جاتی ہے، وہ بالطبع اولوالعزم، بلند حوصلہ، باضابطہ، مشقت پسند اور فیاض ہوتی ہیں، ان میں چستی و چالاکی آ جاتی ہے۔ میدان جنگ میں نہ صرف اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے بلکہ دوسروں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اس لئے خود غرضی کی جگہ دوسروں کی اعانت کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا ہے، عصبیت اور قومی الفت و محبت کا ولولہ ظہور کرتا ہے۔

علوم و فنون کی ترقی کا بہترین ذریعہ بھی جنگ کے سوا اور کوئی نہیں۔ دور و دراز کی سیر و سیاحت کا شوق بھی اس سے پیدا ہوتا ہے، اگر ہندوستان پر سکندر، رومی اور مسلمانوں کے حملے نہ ہوتے تو یہاں علم کی جگہ جہالت اور تہذیب کی جگہ وحشت ہوتی۔ اگر مسلمان یورپ میں داخل ہو کر عیسائی ممالک پر قبضہ نہ کرتے اور حروب صلیبیہ میں اہل کتاب کو متواتر شکستیں نہ ہوتیں تو یورپ آج اس اوج کمال پر نہ ہوتا اور تمدن کے نام سے نا آشنا محض ہوتا۔

آج جس قدر جھگڑے ہیں فسادات رونما ہوتے ہیں، اختلافات کی وجہ سے ہر ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے کی فکر میں رہتا ہے تو ان سب کا بہترین فیصلہ بھی صرف تلوار کی نوک ہی کر سکتی ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ یورپ کے متعصب عیسائیوں نے ترکوں کی نسبت کیسی بد گمانیاں پھیلادی تھیں، ان کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا، ان کو تہذیب کا دشمن اور تمدن کا مخالف کہا جاتا تھا، وہ حکومت کرنے کا قابل تھے۔ مگر اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آج وہی یورپ ان کو مہذب بھی کہتا ہے اپنی سفید رنگ حکومتوں میں اس کو شامل بھی کرتا ہے اور اخبارات ہیں کہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے تلوار کے زور سے یورپ پر واضح کر دیا کہ طاقت ہمارے پاس ہے اور ان کے جو کمالات اب تک مخفی تھے سب کی آنکھوں کے سامنے آ گئے اور انہوں نے بتا دیا کہ ہم مرد ہیں۔

### متمدن اقوام

اب تم میدان جنگ کو چھوڑ کر شہروں کے گلی کوچوں کی سیر کرو۔ رات کو پولیس کے سپاہی پاسبانی کرتے ہیں، اس لئے جب کبھی شہریوں کے سامنے چور اور ڈاکو کا نام لیا جاتا ہے تو وہ کانپ اٹھتے ہیں اور بزدلی کا اظہار کرتے ہیں ان کو صرف اپنی جان کی حفاظت کا خیال دامن گیر ہو جاتا ہے اور اس خود غرضی و نفس پرستی کی وجہ سے دوسروں کی امداد سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ان کی عصبیت جاتی رہتی ہے۔ یہی پولیس کی نگرانی ان کے اندر نامردی، پست ہمتی اور عیش پرستی پیدا کر دیتی ہے ان کی تمام تر توجہ فنون لطیفہ کی طرف ہو جاتی ہے، رقص و سرور میں انہیں لطف آتا ہے، لہو و لعب کو وہ پسند کرتے ہیں اور بالکل عورتیں بن جاتے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں عیش پرستی کی وجہ سے صرف عورتوں ہی سے آباد تھیں، اس لئے عرب کے جنگجو مرد اٹھے اور انہوں نے آنا فنا تمام ممالک پر قبضہ کر لیا۔

جب شیر کو پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس کی قوت مردی جاتی رہتی ہے اور اس کی نسل ہمیشہ کے لئے منقطع

ہو جاتی ہے۔ پانی کو اگر چاروں طرف سے بند کر دیا جائے تو اس میں بو پیدا ہو جاتی ہے اور کسی کے استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح جو قومیں جنگ نہیں کرتیں آہستہ آہستہ ان کی نسل کم ہو جاتی ہے۔ یورپ میں فرانس کے لوگوں کو سب سے زیادہ رقص و سرور کا عاشق کہا جاتا ہے اور اسی کو سب سے بڑھکر اس امر کی شکایت ہے کہ اس کی نسل میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں جرمنی کو دیکھو جس نے جنگ کا بیڑا اٹھایا تو اس کی نسل میں اس قدر افزائش ہوئی کہ اس کو نو آبادیات کی تلاش ہوئی۔

”پیٹ مین دیل“ اپنی مشہور کتاب ”تصادم الوان“ میں ایک جگہ جنگ کی بربریت اور خوفناکی کا ذکر کرتا ہوا اس کے مفید ترین نتائج کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

”ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا خیال ایک قابل تعریف جذبہ ہے، لیکن اگر اس کے لئے بہترین میدان عمل کی تلاش ہے جہاں اس کی اعلیٰ طریق سے تربیت اور ظہور ہو تو وہ میدان جنگ کے سوا اور کوئی نہیں۔ خوفناک خوں ریزی اور دہشت انگیز جدال و قتال ہی اس کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ تم مخالفت، جنگ، قتل و غارت گری اور اچانک موت کے خوف سے بچنا چاہتے ہو، مگر یاد رہے کہ ارضی کامرانی کی صرف یہی ایک امید افزا صورت ہے۔ اسی سے قومی سیرت پختہ ہوتی ہے اور اسی سے انسانوں میں فتح یا موت کا عزم صمیم پیدا ہوتا ہے۔“

”یہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ”توسیع انگلستان“ میں محکوم اقوام کی ذلیل خصلتوں اور جمود پر یوں رقمطراز ہیں:

”جو قومیں زمانہ دراز تک دوسروں کی محکوم رہیں اور انہیں دشمنوں سے جنگ کرنے کی کبھی نوبت نہ آئے تو یہی ان کی ذلت و کمبختی کے لئے موثر و قوی ترین وجہ ہے۔“

## کتاب مبین

دنیا میں قرآن حکیم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو تمام اختلافات کے لئے حکم اور ظنون و ادہام کے لئے کتاب مبین ہے، اس نے تیرہ صدی پیشتر ان تمام حقائق کو بے نقاب کر دیا جو انسانی نظروں سے پوشیدہ تھے اور جس نے اپنے فلسفیانہ انداز میں ان تمام بصیرتوں اور دانائیوں کو صرف ایک ہی آیت میں بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا، ہم نے جنگ کی جس قدر برکات حوالہ قلم کی ہیں ان کو پھر ایک مرتبہ ذہن نشین کر کے حسب ذیل آیات کی تلاوت سے حلاوت اندوز ہو:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (البقرہ ۲۵۱)

”اور اگر خدا ایک جماعت کو دوسری جماعت کی مدافعت کی قوت نہ دیتا تو دنیا برباد ہو جاتی لیکن خدا تو تمام نظام عالم کو اس کی تمام احتیاجات و ضروریات بخشنے والا ہے اس لئے تمام دنیا پر قوت کو تقسیم کر دیا۔“

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهْذَمَتِ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا (الحج ۴۰)

”اگر خدا ایک جماعت کو دوسری جماعت کی مدافعت کی قوت نہ دیتا تو حق اور صداقت کا دنیا میں کوئی محافظ نہ رہتا اور خدا پرستی مظلوم ہو کر فنا ہو جاتی شریعت کی تعلیم گاہیں اور معبد مہندم ہو جاتے صلوٰۃ الہی کا ادا کرنا جرم بن جاتا اور وہ تمام مسجدیں اجڑ جاتیں جن میں خدائے واحد کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔“

ایک جماعت کی سچائی اور دوسری کے بطلان کی حقیقت بھی اسی جنگ سے معلوم ہو سکتی ہے:

لِيُحَقِّقَ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (الانفال ۸)

”تا کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دے۔“

دنیا میں امن وامان نہیں قائم ہو سکتا جب تک تلوار ہاتھ میں نہ لی جائے اور صلح کی آرزو نہیں پیدا ہو سکتی جب تک سطح زمین پر انسانوں کا خون نہ بہایا جائے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلَهُ اللَّهُ (الانفال ۳۹)

”اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور سب اللہ کا دین ہو جائے۔“

سورہ محمد میں فرمایا:

فَإِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا أَثْخَتْنُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوُتُقُفَ فَإِمَّا مَثَابُغٌ وَإِمَّا فِدَاءٌ حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد ۴)

”پس جب تمہاری کافروں سے مٹ بھڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب ان کا خون بہا چکو تو مضبوط باندھ لو، پھر اس کے بعد یا احسان کرو اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔“

مسٹر برٹینڈرسل جنگ کے ختم ہونے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”یہ بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں علوم و فنون کی ترقی اس درجہ پر پہنچ جائے کہ باہمی تحاسد و تباغض کے جذبات خبیثہ دو مختلف قوموں میں موجزن ہوں ان کی آپس میں نہایت ہی خوفناک جنگ ہو اور اس طرح انسانیت کا خاتمہ ہو جائے، گویا جنگ کے نیست و نابود کرنے کی بہترین صورت خود جنگ ہی ہے۔“

## فرضیت جہاد

ان گزشتہ تصریحات سے جہاں آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ مخالفین اسلام برابر اس فکر میں رہتے ہیں کہ دنیا سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیں، حق کی جگہ باطل کا فروغ ہو علم اور تہذیب کی جگہ جہالت اور بربریت کا دور دورہ ہو اور امن کی جگہ فتنہ و فساد کھڑا ہو جائے، وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ جنگ دراصل دنیا کے لئے آیہ رحمت ہے۔ یہی تمام علوم حقہ اور صحیح عقائد کی اشاعت کا سبب بنتی ہے، اس کی وجہ سے انسانی جذبات، ملکوتی خصائل اور قومی سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، یہی قوموں میں شریفانہ احساس، خودداری عصبیت، بلند حوصلگی، فیاضی اور قربانی پیدا کرتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے

قانون بقائے ا صلح کا نفاذ ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ وہ شریعت جو بپاگ دہل اپنی تکمیل کا اعلان کرتی ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۳) ”آج میں تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر چکا اور تم پر اپنا احسان پورا کیا اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند کیا۔“ اپنے مقلدین کو جہاد کی تعلیم دے، چنانچہ کتاب و سنت نے نہایت ہی تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی اور اس کے ہر گوشہ پر بحث و نظر کی، ایک جگہ فرمایا:

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ کَرَّہٌ لَّکُمْ ۚ وَ عَسَى اَنْ تَکْرَهُوا شَیْئًا وَ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَ عَسَى اَنْ تُحِبُّوا شَیْئًا وَ هُوَ شَرٌّ لَّکُمْ (البقرہ ۲۱۶)

”تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تم کو گراں ہے اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور عجب نہیں تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو۔“  
دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہو:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (توبہ ۷۴)  
”اے نبی! ان کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان کے ساتھ نہایت ہی سختی کرو۔“  
سورہ انفال میں آتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (الانفال ۶۵)  
”اے نبی! مسلمانوں کو جنگ کرنے کی ترغیب دو۔“

لیکن جہاد بغیر سامان جنگ کے ممکن نہیں، اس لئے جدید ترین آلات حرب سے مسلح رہنے کے لئے ہر ہر مسلمان کو فرداً فرداً احکم ہوا کہ جس طرح وہ اپنی انفرادی زندگی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے ایسے ہی حیات اجتماعی کے باقی رکھنے کی فکر کرے:

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِزَابِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)  
”اور جہاں تک ہو سکے ان کے لئے قوت اور گھوڑے باندھے ہوئے مہیا کرو تاکہ ایسا کرنے سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر دہاک بٹھائے رکھو۔“

جب جہاد فی سبیل اللہ نوع انسانی کے لئے برکات الہیہ کے صدہا مخفی خزانے کھول دیتا ہے اور اس پر ہر قسم کی رحتوں کے دروازے مفتوح ہو جاتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ بنی آدم کی خیر خواہی کے لئے اپنے آپ کو جان جو کھوں میں ڈالنا کس قدر مفید نتائج پیدا کریگا اور جس شخص کا دل اس ولولہ جہاد سے خالی ہو اور اس کے قلب میں زندگی بھر ایک مرتبہ بھی نوع انسانی کی خدمت کا خیال نہ پیدا ہوا ہو، اس سے بڑھ کر بھی کوئی دوسرا شخص بد نصیب ہو سکتا ہے اور اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو دربار رسالت سے اس کی نسبت یہ فتویٰ صادر ہوتا ہے کہ وہ منافق کی موت مرا:

من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه به مات على شعبة من النفاق۔ (مسلم)

”جس شخص نے نہ تو کبھی جہاد میں شرکت کی اور نہ اس کے دل میں اس کا شوق پیدا ہوا اور وہ اسی حالت میں مر گیا تو وہ نفاق کی موت مرا۔“

بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ای الناس افضل، ”بہترین انسان کون ہے“ آپ نے فرمایا: مومن یجاہد بنفسه وماله، ”وہ مسلمان جو اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کر دے“، ترمذی میں ہے: من رابط ليلة في سبيل الله كانت له كالف ليلة صيامها وقيامها، ”جس شخص نے صرف ایک رات سرحد اسلام کی پاسبانی کی اس کو ایک ہزار دن کے روزوں اور ایک ہزار شب کے قیام کا ثواب ملے گا۔“ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک کے لئے تین سو اونٹ دربار رسالت کی نذر کئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا یضرب عثمان ان ماعمل بعدھا (ترمذی) ”اس کے بعد اگر عثمان کوئی نیکی نہ کرے تو اسے کوئی چیز بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی“ اور وہ فوراً جنت میں داخل ہو گا۔

جس وقت تمام عالم اسلامی پر غیروں کا حملہ ہو رہا ہو اس وقت تو ایک لمحہ کے لئے بھی جہاد میں شریک ہونا کرہ ار ضی کی تمام نعمتوں اور لذتوں سے بہتر ہوتا ہے: لغدوة وروحۃ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا، ایک دوسری روایت میں آتا ہے: خیر مما نطلع علیہ الشمس والقمر (بخاری) ”جہاد فی سبیل اللہ میں صبح یا شام کے وقت جانا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔“ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو یہ پھر جنت کی نعمتیں دیکھنے کے بعد کسی کو دنیا میں واپس لوٹنے کی آرزو نہیں ہوتی، لیکن شہید بار بار خداوند قدوس سے عرض کرتا ہے کہ میں پھر دنیا میں جاؤں اور تیرے نام پر دوسری مرتبہ ذبح ہوں تاکہ تیرے کلمہ حق کے لئے جان دینے کی لذت ایک ہی مرتبہ نہ ختم ہو جائے: ما من عبد یوت له عند اللہ خیر لیسمیہ ان یرجع الی الدنیا وان له الدنیا وما فیہا الا الشہید لمیری من فضل الشہادة فانه یسمیہ ان یرجع الی الدنیا فیکتلت مرة اخرى (بخاری) بلکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ وہ دس مرتبہ بار بار اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کرتا ہے: فیکتلت عشرا مرات لمیری من الکرامة۔

سبحان اللہ! ایک مجاہد کے لئے کس قدر اجر و ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے ترمذی میں ہے: مقام احد کم فی سبیل اللہ خیر من عبادت احد کم فی اہلہ ستین سنة، ”جہاد فی سبیل اللہ کی شرکت خواہ وہ تہوڑی سی دیر کے لئے ہو تمہاری ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔“ مسند امام احمد میں ہے: حرس ليلة في سبيل الله افضل له من الف ليلة يقام ليلها ويصام نهارها، ”ایک شخص ہزار رات برابر نماز میں مصروف رہے اور ایک ہزار دن کے روزے رکھے مگر اس سے وہ مجاہد فی سبیل اللہ بازی لے جاتا ہے جو صرف ایک رات کے لئے لشکر اسلام کی پاسبانی کرتا ہے۔“ کس قدر مبارک ہے وہ آنکھ جو رات بھر صرف اس لئے کھلی رہی کہ عسا کر اسلامی کی چوکیداری کرے: وحرمت النار علی عین سہرت فی سبیل اللہ (احمد) ”وہ آنکھیں کبھی دوزخ میں نہیں داخل ہو سکتیں جو میدان جہاد میں لشکر کی حفاظت کریں۔“ ان پاؤں کی خاک آنکھوں کا سرمہ بنانے کے قابل ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر غبار آلود ہوئے ہوں: من اغبرت قدما في سبيل الله ساعة من

نہار فہما حرام علی النار (احمد) جو پاؤں ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے ہوں پھر وہ جہنم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

### مقصد کا تعین

ہمارے سابقہ بیان سے یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ جہاد فی سبیل اللہ قوموں کو غلام بنانے کے لئے نہیں کیا جاتا، اس کا مقصد انسانوں کی آبادیوں کو برباد کرنا نہیں، دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کرنا نہیں، بلکہ اس کی انتہائی غرض تعلیم صحیح کی اشاعت، فتنہ و فساد کی روک تھام، عیسکوں کی دستگیری اور عاجز و درماندہ انسانوں کی نگرانی ہے، سورہ بقرہ میں ہے:

وَقَتْلُهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ ۱۹۳)

”اور ان سے یہاں تک لڑو کہ فساد باقی نہ رہے اور ایک اللہ کا طریق رہ جائے۔“

گویا جنگ جو کی جاتی ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فساد کا خاتمہ ہو، کیونکہ اگر دنیا میں بد نظمی رہی اور فتنہ کا وجود باقی رہا تو ایک شخص بھی آرام سے زندگی بسر نہ کر سکے گا، دین الہی برباد ہو جائے گا، ارباب حق ظلم و جور کا شکار ہوں گے اور انسانی ترقی بالکل رک جائے گی۔ اس لئے فرمایا:

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ ۲۱۷)

”اور مار ڈالنے سے بھی زیادہ خطرناک فتنہ کا وجود ہے۔“

اور اگر یہ جنگ نہ ہو تو دغا باز لوگ حق کا نام و نشان مٹا دیں گے اور باطل کو فروغ دیں گے جس کا نتیجہ نہایت ہی درد انگیز ہو گا:

وَلَوْ أَنَّبَغَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السُّلُوكُ وَالْأَرْضُ (المؤمنون ۷۱)

”اور اگر سچائی ان کی خواہشات کا اتباع کر لے تو تمام زمین و آسمان میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور پرستاران حق کے لئے کوئی گوشہ عافیت بھی باقی نہ رہے گا کہ اللہ کا نام تو لے سکیں۔“

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص جہاد میں حمیت قومی کی خاطر شریک ہوتا ہے، دوسرے کو جذبہ وطنیت اس کام پر برا بیگنہ کرتا ہے، کسی کو شہرت و ماموری کا خیال ہو ا ہے تو ان میں سے کسی کی نسبت یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من قاتل لتكون كلمة الله هو العليا فهو في سبيل الله، ”جو شخص صرف سچائی کی بادشاہت قائم کرنے کے خیال سے لڑتا ہے وہی فی سبیل اللہ مجاہد کہلانے کا مستحق ہو گا۔“ تو اس حدیث میں بھی یہی بتانا تھا کہ جہاد کا مقصد قتل و خون ریزی اور لوٹ مار نہیں بلکہ کلمہ حق کی خسروی کا اعلان ہے۔

جہاد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ عاجزوں و درماندوں عورتوں اور بچوں کو ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلائی جائے اگر ایسا نہ کیا تو ان لوگوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (النساء ۷۵)

”تم خدا کی راہ میں ضعیف مردوں عورتوں اور بچوں کے بچاؤ کے لئے کیوں نہیں جنگ کرتے حالانکہ وہ دعائیں کر رہے ہیں کہ خدا یا ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے باشندے بڑے ظالم ہیں۔“

گویا دنیا میں ایک مسلمان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ظلم و جور کو روکے، کسی پر تعدی نہ ہونے دے اور حق کو بلند و برتر کرے، جو قومیں دوسروں کی غلام ہیں اور آزادی کی آرزو مند ان کو آزاد کرانے میں سربکف کوشش کرے اور ہر ایک کی امداد و اعانت کے لئے ہر لمحہ و ہر آن پادر رکاب رہے۔

### مسلمان کے خون کی قیمت

یہ سچ ہے کہ کلمہ سق کی اشاعت اور دنیا کو تہذیب سکھانے کی جدوجہد میں جس قدر زیادہ ارزانی میں کسی شخص کا خون بہایا جاسکتا ہے وہ ایک مسلم ہی کا خون ہے اس لئے کہ وہی خیر امة اخراجت للناس کی لقب سے سرفراز کیا گیا ہے، وہی شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کیا گیا ہے اور دنیا کے عقائد صالحہ کی قیام کے لئے وہی ایک ذمہ دار ہستی ہے، اللہ تعالیٰ اسی امر کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے کہ اس کی عشاق کی رگ گلو پر میدان جنگ میں چھری پھرے اور وہ اپنے ہی خون میں تڑپیں: ان الله يحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم بینان مرصوص۔  
لیکن یہ یاد رہے کہ زمانہ امن میں مسلم کی جان سے بڑھ کر اور کوئی گراں قدر چیز بھی نہیں۔

وانا لنرخص یوم الروم انفسنا

”میدان جنگ میں ہم اپنی جان عزیز کو نہایت ہی ارزاں کر دیتے ہیں۔“

ولو نسام بھانی الامن اغلینا

”لیکن امن کے زمانہ میں سب سے زیادہ اگراں قدر بھی ہم ہی ہوتے ہیں۔“

حریش بن ہلال کہتا ہے:

نعرض للسیوف اذا التقینا وجوہا لاتعرض للطام

”ہمارے گرامی قدر خسارے جو صرف شرف و مجد کے لئے مخصوص ہیں اور آج تک کسی کی طاقت نہ ہوئی کہ ان پر تھپڑ مار سکے وہ جنگ کے روز تلواروں کے سامنے کر دیے جاتے ہیں۔“

اس لئے قرآن حکیم نے سب سے پہلے ایک مسلمان کے خون کی قیمت بھی بتادی کہ جو اس نفس قدسی پر ہاتھ ڈالے، وہ نتائج کو پیش نظر رکھ کر اس جرم کا مرتکب ہو: وَمَنْ یَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَدًّا فَبَعَثْنَا جَهَنَّمَ خُلْدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَتْهُ وَاعَدَ لَهُ عَذَابًا عَظِیْمًا (النساء ۹۳) ”جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ کی ہمیشگی ہے اللہ

کا غضب ہے، اس کی پھٹکار ہے اور بڑا ہی دردناک عذاب ہے جو اس کے لئے تیار ہو چکا ہے۔“

احادیث نے اس کو اور زیادہ کھول کر بتایا ہے، بخاری میں ہے: سبب المسلم فسوق وقتاله کفر، ”مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔“ ایک دوسری روایت ہے: بنی اللہ ان يجعل لقاتل المومن توبة (طبرانی فی الکبیر) ”خدا نے قاتل مسلم کی توبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ نسائی میں ہے: کل ذنب عسى الله ان يغفره الا من مات مشركا او قتل مومنا متعمدا“ امید ہے کہ اللہ ہر قسم کے گناہ معاف کر دے گا بجز اس کے جو شرک پر مرایا جس نے جان بوجھ کر مسلمان کو قتل کیا۔“ ترمذی میں ہے: لو ان اهل السماء والارض اشتروا كوفي دمر مومن لكبهم الله في النار“ اگر زمین و آسمان کی تمام مخلوق بھی ایک مسلمان کے خون میں شریک ہو تو خدا سب کو جہنم میں جھونک دے گا۔“

حجۃ الوداع کے روز آپ نے ایک مفصل خطبہ دیا جس میں آپ نے فرمایا: لا ترجعوا بعدی کفار ایضرب بعضکم رقاب بعض، ”میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگ جاؤ۔“ ابن ماجہ میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اسی دوران میں آپ نے بیت الحرام کو مخاطب کر کے فرمایا: ما اطيئك وما اطييب ريحك! ما اعظمتك واعظم حرمتك! والذى نفس محمد بيده لا حرمة المومن اعظم عند الله من حرمتك وما له ودمه وان نظن به خيبر، ”اے کعبہ! تو کتنا عظیم ہے اور تیری حرمت کتنی عظیم ہے، لیکن اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، ایک مومن کی حرمت خدا کی نظر میں تیری حرمت سے زیادہ ہے اور یہی عزت اس کے مال اور خون کو بھی حاصل ہے ہمارا کام یہ ہے کہ اس سے حسن ظن رکھیں۔“ ترمذی میں ہے: ذوال الدنيا اھون عند الله من قتل رجل مسلم، ”ایک مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں تمام دنیا کی بربادی کچھ بھی قیمت نہیں رکھتی۔“

قتل مسلم تو بڑی چیز تھی اس محترم ہستی کو ہتھیار سے ڈرانا بھی جرم قرار دیا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص اپنے حقیقی بھائی کو مارنے کے لئے تیار نہ ہو گا لیکن اس کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا بھی شریعت کی نظر میں بہت بڑا گناہ اور لعنت کا مستحق ہے: من اشار الى اخيه بحدیدة فان الملائكة تلعنہ حتی یدعه وان کان اخا لایبہ وامہ (مسلم) ”جو کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے فرشتے اسے لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اشارہ کرنا بند کر دے اگرچہ وہ اپنے حقیقی بھائی کی جانب ہی اشارہ کر رہا ہو،“ طبرانی میں ہے: لا تزعوا المسلم فان روعة المسله ظلم عظیم، ”مسلمان کو مت دھمکاؤ کیونکہ اسے دھمکی دینا بہت بڑا ظلم ہے۔“

## عالمگیر برادری

جب مسلمان کے خون کی یہ قیمت ہے تو ضروری تھا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا جاتا خواہ وہ اس کرہ ارضی کے کسی گوشہ میں آباد ہوتے، اس لئے قرآن حکیم نے رنگت و نسل کا امتیاز کئے بغیر سب کو بھائی قرار دیا: فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (ال عمران ۱۰۳) ”اللہ کے فضل سے تم اب ایک دوسرے کے بھائی ہو۔“ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ (الحجرات ۱۰) ”مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں پس جب دو بھائیوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرا



دو۔ بخاری میں آتا ہے: ”لایو من احدکم حتی یحب لایحیہ مایحب لنفسہ“، تم میں سے کوئی کامل مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جس کو وہ اپنے لئے چاہتا ہو۔ ”مسلم میں ہے: لا تدخلون الجنة حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا، جنت میں داخل ہونے کے لئے ایمان اولین شرط ہے لیکن تم میں سے کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ دوسرے مسلمان سے محبت نہ کرے۔“ بخاری و مسلم دونوں میں ہے: لا تحسوا ولا تحسوا ولا تنافسوا ولا تنافسوا ولا تباہوا ولا تباہوا ولا تنابزوا وكونوا عباد الله اخوانا، ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو باہم کینہ اور عناد نہ رکھو بد گوئی نہ کرو اور ایسا کرو کہ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔“ بخاری میں ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، ”مسلمان وہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔“ مسلم میں ہے: المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقیرہ، ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، پس اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو ظلم کرے نہ اسے ذلیل کرے اور نہ اس کو حقیر جانے۔“ ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یحد النظر الی اخیه (بخاری) جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نہ چاہئے کہ اپنے مسلمان بھائی کی طرف تیز نظروں سے گھورے۔“ بلکہ جب مسلمان کو دیکھے تو محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھے۔ اسی محبت اور چاہت کو قائم رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا یحل لرجل ان یمجر اخاه فوق ثلاث (بخاری) ”تین دن سے زیادہ دو مسلمانوں کو آپس میں جدا رہنا حرام ہے۔“ تر مذی میں ہے: ملعون من ضار مومنا او مکربہ، ”وہ شخص خدا کی رحمت سے دور ہو گیا جس نے مسلمان کو ضرر پہنچایا یا اس کے ساتھ فریب کاری کی۔“

### فضلیت و برتری

جب دنیا میں محترم ہستی صرف ایک مسلمان ہی کی ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ قانون انتخاب طبعی کے مطابق صرف اسی کو یہ حق پہنچ سکتا تھا کہ وہ اس کرۂ ارضی پر حکمرانی کرے تاکہ اس کا وجود امن عالم کا ذمہ دار ہو اور زمین میں خدائے واحد کی بادشاہت قائم ہو، اس لئے قرآن حکیم نے نہایت ہی کثرت سے قانون بقائے صلح کو بیان کرتے ہوئے اس امر کو واضح کیا کہ مسلمان ہی کامیاب ہوں گے اور ان کے مخالف پست ہمتی کا اظہار کریں گے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الصافات ۹)

”اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔“

سورہ آل عمران میں فرمایا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران ۱۳۹)

”ہمت نہ ہارو اور رنج نہ کرو اگر تم مسلمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔“

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (العنکبوت ۴)

”جو لوگ برے عمل کرتے ہیں کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم سے نکل بھاگیں گے کتنا برا حکم کرتے ہیں۔“

اور والعاقبة للمتقين اور ان حزب الله هم المفلحون اور ان جندنا لهم الغالبون اور كتب الله لاغلبين انا ورسلي چند آیات ہیں جو اس حقیقت پر مہر لگاتی ہیں کہ انجام کار تنازع البقا میں مسلمان ہی غالب رہیں گے اور کفار ذلیل ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَبَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوًّا (بنی اسرائیل ۸۱)

”کہہ دے کہ حق آیا اور باطل نابود ہوا یقین کر لو کہ باطل صرف نابود ہونے کے لئے ہے۔“  
سورہ یونس میں آتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (یونس ۸۱)

”اللہ باطل کو عنقریب محو کر دے گا وہ مفسدوں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔“  
حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو مخاطب کر کے فرمایا:

أَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ (یوسف ۵۲)

”خیانت کرنے والوں کو اللہ یوں ترقی نہیں دیا کرتا۔“

صداقت نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ کامیابی عنقریب تم کو بتا دیگی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون اصرار کر رہا ہے:  
يَقُومُوا عَلَيْكُمْ إِتِيَّ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (الانعام ۱۳۵)

”اے لوگو! تم اپنی جگہ کام کرو میں بھی کام کر رہا ہوں عنقریب جان جاؤ گے کہ انجام کار کس کے لئے ہے۔ اللہ کبھی ظالموں کو فلاح نہیں دیتا۔“

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو تکلیف دیتا ہے مگر دیکھو انجام کیا ہوتا ہے:

فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۚ كَذَلِكَ ۚ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَءِيلَ (الشعر آء ۵۹۳-۵۹۴)

”پس ہم نے قوم فرعون کو باغوں چشموں خزانوں اور عمدہ مقام سے نکال باہر کیا۔ اسی طرح ہم نے کیا اور بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنادیا۔“

جب حضرت نوح علیہ السلام کو دشمنوں نے تنگ کیا تو نتیجہ کیا نکلا:

فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلِّ الْمَشْحُونِ ۖ ثُمَّ أَخَّرْنَا بَعْدَ الْبُقْعَيْنِ ۖ (الشعر آء ۱۱۹-۱۲۰)

”پس ہم نے نوح اور اس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں بچالیا اور اس کے بعد باقی لوگوں کو ہم نے غرق کر دیا۔“

کفار کی عادت ہی یہی ہے کہ وہ دنیا میں تعلیم صحیح کی اشاعت کو روکیں اور کسی شخص کو بھی اس پر عمل نہ کرنے دیں اس لئے ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے:

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ذَلُّهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ (النحل ۸۸)

“جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا کی راہ سے مسلمانوں کو روک دیا ہم ان کے عذاب پر عذاب بڑھائیں گے اس لئے کہ وہ فساد کرتے تھے۔”

## آلات حرب کی فراہمی

دنیا میں صرف قوت ہی کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ چونکہ حق ہی میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اس لئے باطل کے مقابلہ میں وہی باقی رہے گا، لیکن اس بقا کے لئے ضروری ہو گا کہ حامیان صدق ہر وقت جدید ترین آلات حرب سے مسلح رہیں، ورنہ مخالفین ان کو برباد کر دیں گے اور کبھی ان کے عہد ناموں کی پابندی نہیں کی جائے گی، اس لئے کتاب و سنت نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ ہر قسم کا سامان جنگ تیار رکھیں کہ صرف اس کی کثرت دشمنوں کو ہیبت زدہ رکھے گی۔ سورہ انفال میں فرمایا:

وَاعِدُوا اللَّهَ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۷۳)

“اور جہاں تک ہو سکے ان کے لئے قوت اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے تیاری کرو تاکہ تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر دہاک بٹھاؤ۔”

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر زور دیا کہ قوت و طاقت کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ حکومت اسلامی کی ہر طریق سے مدد کریں۔ کہیں صدقات و خیرات کا اجر و ثواب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

من انفق نفقة في سبيل الله كتبت له سبعمائة ضعف

“جس شخص نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کچھ چندہ دیا تو اس کے نامہ اعمال میں سات سو گنا ثواب لکھا جائے گا۔”

عدی بن حاتم نے آپ سے پوچھا: ای الصدقة افضل، “بہترین صدقہ کونسا ہے؟” آپ نے فرمایا: خدمۃ عبدی سبیل اللہ او ظل فسطاطی سبیل اللہ او طرقة فعل فی سبیل اللہ، “مجاہدین کی خدمت کے لئے اپنا غلام وقف کر دینا، یا ان کے آرام کی خاطر خیمہ لگا دینا یا اونٹنی دینا” ترمذی میں آتا ہے: من جهز غازیانی سبیل اللہ فقد غزی و من خلف غازیانی اهلہ فقد غزی، “جس نے غازی کو سامان جہاد دیا یا اس کی غیر حاضری میں اس کے اہل و عیال کی نگرانی کرتا رہا، اس کو بھی مجاہد کے برابر ثواب ملے گا۔”

ہر ایک انسان اپنی انفرادی زندگی کے باقی رکھنے کے لئے مجبور ہے کہ روزی کمائے اور اپنا پیٹ پالے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا فرد افراد فرض ہے کہ امت مسلمہ کے بچانے کے لئے فنون جنگ کی تعلیم حاصل کرے اور آلات حرب سے ہر وقت مسلح رہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو شوق دلانے کے لئے فرمایا: من رمی بسهم فی سبیل اللہ فهو له عدل محار (ترمذی) “جس نے جہاد فی سبیل اللہ میں ایک تیر چلایا اس کو ایک غلام کے آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔”

آپ نے صرف اسی گھوڑے کی تعریف کی جس کو مالک صرف اس لئے پرورش کرتا ہے کہ جنگ میں اس سے خدمت لی جائے گی: الخیل معقود فی نواصیہا الخیر لالیوم القیمۃ الخیل ثلاثۃ ہی لرجل اجر وہی لرجل سترو علی رجل وزیر فاما الذی ہی لہ اجر فالذی یتخذ ہانی سبیل اللہ فیعد ہالہ ہی لہ اجر لایغیب فی بطونہا شیء الا کتب اللہ لہ اجرا، قیامت تک کے لئے گھوڑے کی پیشانی میں خیر و برکت مقدر کر دی گئی ہے، گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض تو اپنے مالک کے لئے اجر و ثواب کا باعث بنتے ہیں، کچھ اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور بعض اس کی مصیبتوں کا سبب بنتے ہیں۔ اجر و ثواب صرف اس گھوڑے کی وجہ سے ملتا ہے جس کو محض جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے پرورش کیا جائے، اس کی پیٹ میں جو چیز بھی جاتی ہے اس کا ثواب آقا کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔“

ترمذی میں ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ صحابہ سے دریافت کیا کہ تم لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ نوع انسان میں سے بہترین شخص کون ہے، پھر آپ نے فرمایا: رجل مہمسک بعنان فرسہ فی سبیل اللہ، ”اعلیٰ ترین انسان وہ ہے جو ہر وقت گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا ہے کہ اسے کب جہاد کا حکم ملے اور وہ فوراً سوار ہو کر میدان جنگ میں جا کر داد شجاعت دے۔“ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا: ای الناس افضل، ”بہترین فرزند آدم کون ہے؟“ آپ نے فرمایا: رجل یجاہد فی سبیل اللہ، ”صرف مجاہد فی سبیل اللہ ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اعلیٰ ترین انسان کہا جائے۔“

ہم نے مختلف قسم کی روایات جمع کر دی ہیں جن کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق خود سامان جہاد کی تیاری کرے۔ یہی ایک صورت مسلمانوں کے باقی رہنے کی ہو سکتی ہے اور اگر انہوں نے اس میں ذرا سستی سے کام لیا تو ان کی کمزوری سے مخالفین فائدہ اٹھا کر ان کو برباد کر دیں گے، کیونکہ باطل پرستوں میں بھی اپنی بقا کا عشق موجود ہے۔ پس ان کی فریب کاریوں اور فتنہ پرداز یوں کی روک تھام اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ تمام دنیا کے مسلمان ہر قسم کا سامان جنگ اپنے پاس رکھیں۔

لیکن ان احادیث سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان میں صرف گھوڑے کی سواری اور تیر اندازی پر زور دیا گیا ہے۔ بلکہ یہ چیزیں زمانہ رسالت میں قوت کا باعث تھیں اس لئے لسان نبوت نے ان کا تذکرہ کر دیا ورنہ اصل منشاء آپ کا یہ تھا کہ ہر قسم کا جدید ترین سامان حرب مسلمانوں کے پاس ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے سورہ انفال میں اس کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے اور جن ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے ان کے نام درج کر دیے ہیں کہ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔

## جنگ اور جہاد

مخالفین اسلام عموماً او یورپ کے رہنے والے خصوصاً جہاد کا نام سنتے ہیں تو کانپ اٹھتے ہیں اور ان کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، حالانکہ اگر وہ ذرا سمجھ سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جہاد بیکسر رحمت ہے اور نوع انسانی کے لئے صد ہا برکتوں کا موجب۔ مسلمانوں کو کتاب و سنت میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے جنگ کی اجازت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دی گئی، اس لئے کہ دونوں ایک دوسرے کے بخط مستقیم مخالف ہیں۔ جنگ میں انسان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے، وہ

کسی عہد نامہ کی پروا نہیں کرتا، وہ اپنی بات کا پابند نہیں رہتا اور ہر قسم کے وحشیانہ جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔  
قانون جنگ کی رو سے پھٹنے والے گولوں کا استعمال جائز نہیں مگر جب یورپ اور انگریزوں میں جنگ ہوئی تو انگریزوں نے ان گولوں سے کام لیا، دم دم کی گولیاں سخت ہلاکت انگیز اور ممنوع الاستعمال تھیں۔ مگر انہوں نے ہنگامہ ۱۵ء میں ان کو ہندوستانیوں پر استعمال کیا۔ جب دشمن ہتھیار ڈال دے اور حریف کی اطاعت قبول کر لے تو پھر اس پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں، مگر تسلیم پلونا کے بعد بھی آدھ گھنٹہ تک روسی توپ خانہ نے پلونا پر گولہ باری کی۔ تجارتی بندر گاہوں پر گولہ پھینکنا ممنوع ہے۔ لیکن اطالیہ نے ۱۱ء میں ساحل بیروت پر گولہ باری کی۔ غیر مسلح جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل کرنا جائز نہیں، مگر طرابلس کے نخلستانوں اور مقدونیہ و تھریس کے میدانوں میں بلا تمیز ہر مسلمان کو قتل کیا گیا۔ سوڈان کو فتح کرنے کے بعد دشمن کی لاش کو قبر سے نکال کر لٹکایا گیا۔

جو لوگ جنگ کو پسند کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ اس سفاکی و بربریت کے بعد بھی کوئی سلیم الفطرت انسان ان واقعات کی تائید کر سکتا ہے، لیکن یہ نتائج ہیں جو جنگ کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک مسلمان کہتا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوں تو اس لفظ کے کہتے ہی وہ دراصل اپنے اوپر صد ہا پابندیاں عائد کر لیتا ہے جو کتاب و سنت نے اس پر لازم کر دی ہیں اور وہ گویا تمام دنیا کو امن اور سلامتی کا پیغام دے دیتا ہے کہ اب اس کی بے پناہ تلوار صرف ان لوگوں کی رگ گلو پر چلے گی جو اس کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کریں گے، خود اس کے ہاتھ پاؤں بندھ جائیں گے اور وہ ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکے گا۔ اسے حکم دیا گیا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا (البقرہ ۱۹۰)

”صرف ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔“

اسے صاف طور سے کہا جاتا ہے کہ جب دشمن ہتھیار ڈال دے تو تم بھی فوراً قتل و قتل سے رک جاؤ:

فَإِنْ اِنتَهَوْا فَلَا عُدُوَّانَ اِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (البقرہ ۱۹۳)

”پس اگر وہ لڑنے سے باز آجائیں تو اس صورت میں ظالموں ہی کو نشانہ بنایا جائے۔“

اگر وہ صلح کی درخواست کریں تو اسی وقت اپنی تلوار نیام میں کر لو:

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (الانفال ۶۱)

”اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر اعتماد کرو۔“

جبکہ مخالفین اسلام لوگوں کی عبادت گاہوں، مندروں، گرجوں اور مسجدوں کو دوران جنگ میں لطائف انخیل سے کام لے کر مسمار کر دیتے ہیں تو اس وقت بتایا جاتا ہے کہ ایک مسلمان اس لئے جہاد کرتا ہے کہ ہر قوم کے عبادت خانے دشمنوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں اور لوگ اطمینان قلب کے ساتھ خدا کی بندگی کر سکیں:

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ قُلُوبًا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتَّ مَثَاقِمُ صَوَامِعُ وَبَيْعٌ وَصَلَوَاتُ مَسْجِدِ يُدُكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا - (الحج ۳۹ تا ۴۰)

”ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ جو اپنے گھروں سے بلا وجہ اتنی بات پر نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر خدا ایک جماعت کو دوسری جماعت کی مدافعت کی قوت نہ دیتا تو حق اور صداقت کا دنیا میں کوئی محافظ نہ رہتا اور خدا پرستی مظلوم ہو کر فنا ہو جاتی شریعت کی تعلیم گاہیں اور معبد مہندم ہو جاتے صلوٰۃ الہی کا ادا کرنا جرم بن جاتا اور وہ تمام مسجدیں اجڑ جاتیں جن میں خدائے واحد کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔“

یہ یاد رہے کہ جہاد کے لئے اولین اجازت اسی آیت سے ثابت ہوتی ہے جو بے انتہا مظلومیت کے بعد دی گئی اور اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاد کی اصلی غرض کیا ہے۔ یعنی لڑائی کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اور ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو نیز یہ کہ اگر اسلام کی حکومت قائم ہو جائے گی تو مسلمان اچھی باتوں کے کرنے کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے یعنی اسلامی حکومت کا ساری دنیا پر قائم ہونا ساری دنیا کی اصلاح اور امن وامان کا واحد ذریعہ ہے اور دنیا کی صلاح و فلاح اسی میں ہے کہ اس پر اسلام کی حکومت ہو۔

قرآن حکیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ نہیں ہو سکتی:

(الف) إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ (النساء ۹۰)

”جو لوگ ایسی قوم سے عہد کرتے ہیں جن سے تمہارا عہد ہے۔“

(ب) أَوْ جَاءَكُمْ حَصْرَتْ صُدُّهُمْ أَنْ يَقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ (النساء ۹۰)

”یا وہ جو حاضر ہو کر ظاہر کر دیں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے میں رک گئے ہیں۔“

کیا ان تصریحات کے بعد بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جہاد کا مقصد قتل و خونریزی ہے، رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ آپ فوج کو کسی مہم پر بھیجتے تو ارشاد فرماتے:

لَا تَقْتُلُوا شِيخًا فَانِيًّا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً (ابوداؤد)

”کسی کہن سال کو، بچے کو، کم سن کو اور عورت کو قتل نہ کرو۔“

عام طور پر فوج کو مخاطب کر کے یوں فرماتے ہیں:

اغزوا باسم الله في سبيل الله قاتلوا من كفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا وليدا۔

”اللہ کا نام لے کر اس کی راہ میں جنگ کرو، صرف کفار کو قتل کرو، جہاد کرو، لیکن خیانت اور بد عہدی سے بچنا، کسی کی

ناک کان نہ کاٹنا نہ کسی بچے کو قتل کرنا۔

ایک مرتبہ آپ کو اطلاع ملی کہ لڑائی کی دوران میں ایک عورت کو قتل کیا گیا ہے، آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ ایک دفعہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ اسلامی فوج نے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور اس سے راہ گروں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ نے فرمایا جو ایسا کرے گا وہ ثواب سے محروم رہے گا۔ سنن ابی داؤد میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے:

غزوت مع النبی ﷺ غزوة کذا وکذا فضیق الناس البنازل وقطعوا الطريق فبعث نبی الله منادی ینادی الناس ان من ضیق من لا او قطع طریقاً فلا جہاد لہ۔

”میں ایک جنگ میں آپ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا اور لوٹنا مارا آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کے گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔“

اسوہ حسنہ

جہاد فی سبیل اللہ اور جنگ کے درمیان ہم نے اوپر جو کچھ فرق بیان کیا ہے وہ محض الفاظ ہی نہیں ہیں جو شر مندہ معنی نہیں ہوئے، بلکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بہترین جانشینوں نے ان کو عملی جامہ پہنا کر دکھا دیا کہ دنیا میں صرف ایک مسلمان ہی اپنے اقرار کا پابند بن سکتا ہے۔ یورپ کی موجودہ تاریخ تمہارے سامنے ہے جس میں بد عہدی کے سوا اور کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی، حالانکہ یہی عیسائی حکومتیں سب سے زیادہ تہذیب و دانشمندی کی دعویٰ دہا رہیں۔ لیکن اس زمانہ کو دیکھو جس کو موجودہ تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔ رسول اللہ ﷺ فاتحانہ حیثیت سے اس سر زمین میں داخل ہوتے ہیں جہاں ان پر سب سے زیادہ مظالم کئے گئے ہیں، جس جگہ اس کے رفیقوں کو گرم سنگریزوں اور تپتی ہوئی ریت پر لٹایا گیا ہے، قانون اس امر کی اجازت دیتا تھا کہ تمام سر زمین حرم میں خون کی ندیاں بہادی جائیں اور ایک دشمن بھی باقی نہ رہے۔ لیکن جب خدا کا رسول امن کا پیغامبر، مجسمہ رحمت اور سلامتی کا پیکر اس میں داخل ہوتا ہے تو وہ حسب ذیل اعلان کرتا ہے:

- (۱)۔ جو کوئی شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۲)۔ جو کوئی شخص خانہ کعبہ کے اندر چلا جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۳)۔ جو کوئی شخص اپنے گھر کے اندر بیٹھے رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۴)۔ جو کوئی شخص ابوسفیان کے گھر جا رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۵)۔ جو کوئی شخص حکیم بن حزام کے گھر جا رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۶)۔ بھاگ جانے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
- (۷)۔ زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔
- (۸)۔ اسیر کو قتل نہ کیا جائے۔

۲۰ رمضان کو خود خدا کا برگزیدہ رسول شہر میں داخل ہوتا ہے، سر جھکا ہوا ہے سورہ فتح کی تلاوت ہو رہی ہے، اونٹ کی سواری پر بیت اللہ کو جا رہا ہے اور اونٹ پر اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام زید کے فرزند اسامہ کو سوار کئے ہوئے ہے۔ اب تم ایک قدم اور آگے بڑھو، جس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اسامہ کے لشکر کو روانہ کرتے ہیں تو فوج کے سامنے حسب ذیل خطبہ دیتے ہیں:

يا ايها الناس تقفوا اوصيكم بعشئ فاحفظوه عني، لا تخونوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تبشلوا ولا تقتلوا اطفالا ولا شيخا ولا كبيدا ولا امرأة ولا تعقروا ولا تحرقوا ولا تقطعوا الشجرة المباركة ولا تذبحوا شاة ولا بقرة ولا بغير الا للباكلة وسوف تيمرون باقوام قد فرضوا انفسهم بالصوامع فدعوهم وما فرضوا انفسهم وسوف تقدمون على قوم يا توكم بائنة فيها الوان الطعام فاذا اكلتم منها شيئا بعد شئ فاذكروا اسم الله عليها و تلقون اقواما قد فحسوا اوساط رؤسهم وتركوا حولها مثل العصائب فاحفظوهم بالسيف خفتا اندفعوا باسم الله افناكم الله الطعن والطاعون۔

”کو گو! ٹھیر میں تمہیں دس حکم دیتا ہوں، انہیں خوب یاد رکھو۔ خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، سردار کی نافرمانی نہ کرنا، کسی شخص کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹنا، بچے، بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا، کھجور یا کسی اور میوہ درادرخت کو نہ کاٹنا، نہ جلانا، بکری گائے یا اونٹ کو غذا کی ضرورت کے سوا ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں سے ملو گے جو عبادت گاہوں میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھے ہوں گے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا، تمہیں ایسے آدمی ملیں گے جو تمہارے پاس مختلف قسم کے کھانے برتنوں میں رکھ کر لائیں گے جب انہیں کھاؤ تو ہر ایک پر اللہ کا نام لینا، تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جن کے سر کے بال بچ میں منڈے ہوں گے انہیں تازیانہ کی سزا دینا، خدا کا نام لے کر روانہ ہو، خدا تم کو دشمن کے ہتھیار اور طاعون سے محفوظ رکھے۔“

یہ الفاظ اپنی شرح آپ کر رہے ہیں اور مزید تفسیر کے محتاج نہیں۔ حضرت عمرؓ کا داخلہ بیت المقدس تو اس درجہ زباں زد خاص و عام ہے کہ اس پر لکھنے کی ضرورت نہیں اور پھر یہ ایک ہی مرتبہ نہیں ہوا، بلکہ اسلامی تاریخیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں یہاں تو صرف اشارہ مقصود تھا۔

### حکومت اور جہاد

گذشتہ اوراق میں بہت تفصیل سے ہم اس حقیقت پر گفتگو کر چکے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ مقصد ہر گز نہیں کہ وہ انسانوں کو غلام بنائے، نوآبادیات کے لئے دوسروں کے ممالک پر چھاپہ مارے، تجارتی اغراض کی خاطر غیروں کی جائیداد پر قبضہ کرے اور سرمایہ داری کے اصول کی خاطر ادنیٰ قوموں کو اپنی غلامی میں لائے جیسا کہ آج باوجود ادعائے تہذیب و شائستگی اور صلح و امن بد بختانہ یورپ کی سفید رنگ آبادی کر رہی ہے، وہ یورپ ادنیٰ اقوام کی حفاظت کو آڑ بنا کر اسلام کے مقابلہ میں صلیب کی جنگ کھڑی کرنا چاہتا ہے اور موصل کے تیل کی خاطر ترکوں کو ان کے موردنی حق سے محروم کرنے کی فکر میں ہے۔



برخلاف اس کے جہاد کی اصلی غرض و غایت قوموں کی آزادی، غریبوں کی اعانت، ان کے حقوق کی حفاظت اور کلمہ حق کی نشر و اشاعت ہے: من قاتل لتکون کلمۃ اللہ فی العلیا فہو فی سبیل اللہ کے الفاظ بآنگ دہل اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ اسلام نہ تو یورپ کی مفروضہ قومیت کا دلدادہ ہے جس کا عفریت آج ہر تعلیم یافتہ کے سر پر سوار ہے اور نہ وہ وطنیت کے بے معنی لفظ کو اپنے اغراض فاسدہ کے لئے آڑ بناتا ہے، بلکہ وہ ان سب سے بالاتر ایک عام انسانی برادری کا پیغامبر ہے جس میں ایضاً و سود اور رومی و شامی کی کوئی تمیز نہیں، وہ انسانوں کے حقوق کا نگران کار اور ہر جگہ صرف سچائی کو حکمراں دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

### اجیبو اداعی اللہ

آج دنیا میں ظلم و جور کی حکومت ہے، خیالات فاسدہ کا دور دورہ ہے، جوع الارض نے یورپ کی مسیحی اقوام کو درندوں اور بھیڑیوں کی طرح ایشیائی اقوام کے لئے خون آشام بنادیا ہے، فراعنہ عصر کی استبدادیت نے انسانی آزادی کو سلب کر لیا ہے، قومیت اور وطنیت کی بے معنی الفاظ نے نوع انسانی کا خیال دلوں سے دور کر دیا ہے۔ بعض افراد نے دعویٰ مہدویت و مسیحیت کر کے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے بالکل دور کر دیا ہے، بعض کج فہموں اور کوتاہ اندیشوں نے اس کو مدافعانہ جنگ پر محمول کیا ہے۔ لیکن تم یقین کرو کہ ان میں سے ایک بات بھی ذرہ برابر سچائی اپنے اندر نہیں رکھتی۔ قرآن حکیم کے الفاظ اس قسم کی رکیک تاویلات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

مسلمان تو خیر امت کے معزز ترین لقب سے سرفراز کئے گئے ہیں۔ تاملون بالمعروف وتنہون عن المنکر تو ان کا طغرائے امتیاز ہے، دنیا سے برائی کو دور کرنا اور نیکی کا پھیلانا تو مسلم کے اولین فرائض ہیں۔ پھر کیا اب وقت نہیں آیا کہ مسلمان قرآن حکیم کی حقیقت سے خوب واقف ہوں اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس کلمہ حق کی آواز پہنچادیں اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہوں:

الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبہم لذلک اللہ وما نزل من الحق۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ

## سورۃ الانفال

سورہ کا نام

انفال، نفل کی جمع ہے جس کے معنی زیادتی کے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ کی اصلی غرض و غایت تو قانون الہی کی نشر و اشاعت، باطل پر ستارہ قوتوں کا ابطال و استیصال اور رضائے الہی کی تلاش و جستجو ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مال و اسباب کو بھی مسلمانوں کے لئے حلال و طیب قرار دیا ہے جو فتح و کامرانی کے بعد حاصل ہو۔ اس جگہ انفال سے مراد مال غنیمت ہے جیسا کہ ابن عباس، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ کی رائے ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں جنگ بدر، اس کے حالات و واقعات اور ثمرات و نتائج پر بحث کی گئی ہے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو باوجود قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کے جنود ضلالت پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوا۔ کفار کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور جو باقی بچے ان کو گرفتار کر لیا گیا، اس کے علاوہ بہت سامان غنیمت بھی ہاتھ آیا مگر تقسیم میں اختلاف رائے ہوا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اس کو صرف لڑنے والوں ہی پر تقسیم کیا جائے۔ اس منازعت کے رفع و انسداد کے لئے سورہ انفال کا نزول ہوا جس میں ان قواعد و کلیات کو بیان کیا گیا جن کے ماتحت مال غنیمت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس سورہ میں مال غنیمت کی تقسیم کے قوانین و ضوابط تعلیم دیے گئے ہیں، اس لئے اس کا نام الانفال قرار پایا۔

ترتیب نزول

آگے چل کر آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سورہ میں تمام تر تذکرہ جنگ بدر ہی کا ہے۔ اسی ایک لڑائی سے مختلف ثمرات و نتائج اخذ کر کے ان کو ایک مستقل قانون جنگ کی صورت میں مدون و مرتب کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ بدر ہجرت کے دوسرے سال وقوع میں آئی ہے، اس لئے ہم اس نتیجہ پر باسانی پہنچ سکتے ہیں کہ اس سورہ کا نزول بھی دوسرے ہی سال ہوا ہو گا اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سورہ مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ حسن، عکرمہ، جابر بن زید، عبد اللہ بن زبیر اور زید بن ثابت کی یہی رائے ہے۔ ابن عباس کا اس کو سورۃ البدر کے نام سے تعبیر کرنا بتاتا ہے کہ اس کا نزول مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ رکوع نمبر ۷۷ میں معاندین اسلام کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مختلف قسم کے عہد و موافق کئے، مگر انجام کار وہ اپنے الفاظ پر قائم نہ رہ سکے اور نقض عہد کے مرتکب ہوئے اور پھر یہ ایک ہی مرتبہ نہیں ہوا،

بلکہ اس جرم کا بار ہمارے کتاب کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو بھی سر زمین مکہ پر چڑھائی کرنی پڑی کہ ان مخالفین کو ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا کر دیا جائے، تاکہ آئندہ ان کو سر اٹھانے کا خیال بھی نہ آئے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ دونوں رکوع فتح مکہ سے قبل یا بعد نازل ہوئے ہیں۔

آیات نمبر ۳۵ تا ۳۰ کے متعلق بعض لوگوں کی رائے ہے کہ وہ مکہ مبارکہ میں نازل ہو چکی تھیں، لیکن اوّل تو اس دعویٰ کے تسلیم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی خارجی شہادت موجود نہیں دوسرے اکثر علمائے کرام اس طرف گئے ہیں کہ یہ سورۃ تمام و کمال مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔ ان آیات میں صرف گذشتہ واقعات کا تذکرہ ہے اور غالباً اسی بنا پر ان لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ ان کا نزول بھی مکہ ہی میں ہوا ہو گا، حالانکہ ان کے بیان کرنے سے اصلی مقصد یہ تھا کہ مسلمان ایسے دشمنوں کے مقابلہ میں اور زیادہ جوش و ولولہ اور صبر و استقامت سے کام لیں۔

ما قبل سے ربط

سورۃ اعراف میں مختلف انبیائے کرام کے حالات و واقعات بیان کر کے بتایا تھا کہ انہوں نے کس طرح اپنی اپنی قوم کو ہدایت و سعادت کی طرف دعوت دی اور پھر اس سعی و کوشش کا کیا انجام ہوا۔ اس سورۃ میں رسول اللہ ﷺ کے واقعات پر روشنی ڈالی کہ وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے کس قدر خواہاں تھے۔ نقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمو منین روف رحیم (التوبہ ۱۲۸)، اندیشہ تھا کہ یہ بڑھتی ہوئی خواہش آپ کی تکلیف کا باعث نہ بن جائے، اس لئے لسان الہی کو یہ کہنا پڑا: لعلک باخع نفسك الا لیکونوا مومنین (الشعر آء ۳) اور انک لاتھدی من احببت ولكن الله یھدی من یشاء (القصص ۵۶) اور انہا انت مذکر لست علیم بمصیط (الغاشیہ ۲۱ تا ۲۲)، مگر ایسے رحیم و شفیق نبی کو اس کی قوم نے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی، طائف کے لڑکوں نے اس پر پتھر پھینکے اور قبائل مکہ نے شب کے وقت اس کو جان سے مار ڈالنے کی سازش کی۔

سورۃ اعراف میں کفار قریش کی نسبت فرمایا تھا کہ جب ان کی مرضی کے مطابق معجزات کا ظہور نہیں ہوتا اور رسول اللہ ان کی خواہشات و مالوفات کی پیروی نہیں کرتے تو وہ تنگ آکر کہتے ہیں: وَاِذَا نَمَّ تَأْتِيهِمْ بَآئِلَةٌ قَالُوا لَوْلَا جِئْتِنَاهُمْ (الاعراف ۲۰۳) اس سورۃ میں اس کا جواب دیا گیا کہ جب قرآن حکیم کا نزول ہوتا ہے اور یہ لوگ اس کی آیات کو سنتے ہیں تو اپنی حماقت کا یوں اظہار کرتے ہیں: قَدْ سَبَعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا ۚ اِنْ هَذَا اِلَّا اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ (الانفال ۳۱) وہاں خدائے قدوس نے قرآن کی نسبت کہا تھا: هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (الاعراف ۲۰۳) اس سورۃ میں فرمایا کہ جب ارباب صدق و اخلاص اس کتاب عزیز کی آیات کو سنتے ہیں تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ان کے ایمان میں اور زیادہ استواری آجاتی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِینَ اِذَا ذُکِّرَ اللّٰهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَاِذَا تِلَیَتْ عَلَيْهِمْ اٰیٰتُهُ اَدْبَاهُمْ اِنَّمَا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُونَ (الانفال ۲)۔

## موضوع سورہ

قرآن حکیم کا روئے سخن عالمگیر ہے اور وہ دنیا کی تمام اقوام و ملل اور مذاہب و ادیان کی اصلاح و تہذیب کا ذمہ دار و کفیل ہے: **يَكْتُبُ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْبرَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّورِ** (ابراہیم ۱) اس لئے وہ ہر قوم سے مخاطب ہوتا ہے۔ اگر آپ گزشتہ سورتوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ سورہ بقرہ میں زیادہ تر بنی اسرائیل کی خرابیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی تحریفات لفظی و معنوی کو واضح کیا گیا ہے اور پھر ان کو اسلام کی دعوت دی ہے۔ آل عمران میں بیشتر نصاریٰ کے عقائد باطلہ کا تار و پود بکھیرا ہے، عقیدہ تثلیث کو غلط ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ عبد اللہ کبھی ابن اللہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ انسان کی انتہائی ترقی عبد اللہ بن جانے میں مضمر ہے: **لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ اَنْ يَكُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ** (النساء ۱۷۲) جب کفارہ کی نوعیت واضح ہو گئی تو اب عیسائیوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ اگر وہ نجات کے طالب ہوں تو دائرہ اسلام میں داخل ہوں۔ نساء اور مائدہ میں عرب کی داخلی اصلاح پیش نظر تھی کہ آگے چل کر یہی قوم شتربانی سے جہانبانی تک پہنچے گی، پس ضرورت تھی کہ ان کے تمدن و حضارت کی تہذیب کی جاتی اور ان کے غلط اصول کا قلع مع کر کے صحیح قوانین و ضوابط کو مدون و مرتب کیا جاتا۔

ایران میں مجوسیوں کی حکومت تھی، جو نور و ظلمت، خیر و شر اور حق و باطل کے دو جدا گانہ خالق تسلیم کرتے تھے اور اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ ان غلط عقائد و یقینات کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے، پس قرآن حکیم نے سورہ انعام میں ان کی غلط کاریوں کو واضح کر کے تباہ کیا کہ ان کی یہ تعلیم تمام انبیاء کرام، جملہ صحائف و اسفار آسمانی، قوانین الہیہ اور نوا میں فطرت کے بحض مستقیم مخالف ہے۔ تمام رسول صرف توحید و حق پرستی کے قیام اور و کفر و باطل پرستی کے استیصال کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس لئے مجوسیوں کے لئے اسلم و انسب یہی ہے کہ وہ خدا کے آخری قانون کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ لیکن ابھی دنیا کے مختلف گوشوں میں اور بھی چھوٹے درجہ کے مذاہب و ادیان تھے جن کے اتباع و مقلدین کی تعداد محدود اور جن کے اصول و عقائد کی عام طور پر نشر و اشاعت نہ ہوئی تھی، ان کو سورہ اعراف میں مخاطب بنایا گیا۔ اس طرح قرآن نے تبلیغ و دعوت عالم کا اہم و اقدم فرض انجام دیدیا اور ہر ایک مذہب کو موقع دیا کہ اپنی غلط کاری کو ترک کر کے صراط مستقیم سے تمسک و اعتصام کرے، کہ اس کے بغیر نہ تو دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے اور نہ نوع انسانی اپنی انتہائی ترقی حاصل کر سکتی ہے۔

ان حاملین مذہب کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے حق و صدق کو خیر باد کہہ دیا ہے، تعلیمات صالحہ سے منحرف ہو چکے ہیں، کتاب الہی تو در اضعاف ہر دو، فواحش و منہیات کا ارتکاب ہوتا ہے، اپنے باطل و اکاذیب ہیں جن کو عمود مذہب اور اساس ملت خیال کیا جاتا ہے، خود بھی ان پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان پر کاربند ہونے کی دعوت دیتے ہیں: **يَا مُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (التوبہ ۶۷) قرآن حکیم ایک النذیر العیدین کی طرح ان کے سامنے ان ناشائستہ حرکات کے المناک عواقب بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دنیا کی دولت و ثروت اور امن و آسائش بھی قانون الہی کے ماننے پر موقوف ہے کہ ان میں تمنہ و اعتبار پیدا ہو اور حق کو ٹھکرانے سے باز آجائیں۔ مگر ان کی کیفیت یہ ہے کہ اس صدائے حق کے آگے



۱۰:۳۴) ”میں زمین پر آگ ڈالنے آیا ہوں اور اگر لگ چکی ہوتی تو میں کیا ہی خوش ہوتا۔“ (لوقا ۱۲:۴۹)

مسلمانوں کو تمام اقوام عالم کا ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ نو کذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس (البقرۃ ۱۲۳) ان کو کنتم خیر امۃ اخراجت للناس کے معزز و محترم لقب سے سرفراز کیا گیا ہے، وہ اسرو و تعبد اور انسانی غلامی کی بیڑیاں کاٹنے آئے ہیں، وہ سب کو آسمانی بادشاہت میں داخل کرنے کے آرزو مند ہیں اور لوگ ہیں کہ ان کو تباہ و برباد کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس لئے قبل اس کے کہ ان کا نام و نشان مٹانے کے لئے دنیا مصروف سعی و جہد ہو، اس سورۃ میں ان کو قانون جنگ کی تعلیم دی جاتی ہے کہ حق کو بچانے کے لئے وہ خوف فنا ہو جائیں، قوم و ملک کو قربان کر دیں، مال و متاع کو اس کی راہ میں لٹا دیں، کیونکہ ان کی حیات قومی کاراز سرستہ اسی جہاد فی سبیل اللہ میں پنہاں ہے، جب تک مبلغین و دعاۃ اسلام مرنے مارنے پر تیار نہ ہوں گے، اس وقت تک ان کی تحریک کے بقا و دوام کی کوئی صورت نہیں۔

اس لئے جملہ اقوام عالم کے سامنے اسلام پیش کرنے کے بعد جنگ کا مفصل قانون دیا جاتا ہے کہ اس پر عمل پیر ہو کر ہر جگہ فتح و کامرانی سے بہرہ اندوز ہوں اور یہی اس سورۃ کا موضوع اصلی ہے۔ تاکہ ہر مسلمان کے سامنے یہ حقیقت رہے کہ جس قوم میں بھی دعوت اسلام کی غرض سے میں جا رہا ہوں اگر اس سے مزاحمت ہوئی تو اس سے مجھے مقابلہ کرنا پڑے گا، مخالف کے زور کو توڑنے کے لئے مجھ میں کافی قوت و طاقت کا ہونا ضروری ہے اور اگر میں اس راہ میں مارا گیا تو خدائے قدوس میرے خون کو ضائع نہ ہونے دے گا اور تمام دنیا کے مسلمان میرا بدلہ لینے کے لئے سر بکف کوشش کریں گے۔

### تلخیص مضامین

یہ بات تو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ قانون جنگ بیان فرماتا ہے، جس کی مشق بدر کی لڑائی میں کرائی گئی تھی اور یہ ایسے اصول و کلیات ہیں جن کی پابندی کا لازمی نتیجہ فتح و ظفر ہو گا، چنانچہ غزوہ بدر اس کی بہترین نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں تو اسی قدر تنبیہ پر اکتفا کیا کہ مال غنیمت میں منازعت کرنا رباب توحید کے شایان شان نہیں، بلکہ ان میں ان خصوصیات کا پید ا ہونا ضروری ہے جو مابعد کی آیات میں بیان کی گئی ہیں، پھر جنگ بدر کا تذکرہ کیا اور ان نوازش ہائے گونا گوں کو بیان کیا جو اس لڑائی میں مسلمانوں پر نازل کی گئی تھیں۔ اس عاجز و در ماندہ گروہ کے ہاتھوں کفار کو مقہور و ذلیل کیا، کیونکہ وہ باغی تھے اور رسول اللہ کے اشد شدید دشمن۔ آیت نمبر ۱۵ سے ان قوانین و ضوابط کو بیان کرنا شروع کیا جو فتح و کامرانی کی کلید ہیں اور جن میں سے اولین دستور العمل یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اپنی جان بچانے کی خاطر جنگ سے بھاگنا جائز نہیں۔ اگر اس نے ایسا کیا تو شریعت کی نظر میں وہ مورد غضب الہی ہو گا۔ آیت نمبر ۲۰ میں نظم و قاعدہ جنگ کی پوری پابندی اور امر اور رسائے لشکر کی کامل فرماں برداری پر زور دیا۔ آیت نمبر ۲۴ میں فرمایا کہ جب خلیفہ اسلام کی طرف سے جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان ہو تو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس آواز کے سنتے ہی اپنے اہل و عیال، مال و متاع اور وطن و دیار کو چھوڑ کر میدان جنگ میں حاضر ہو جائیں اور اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس فرض جلیل سے اعراض و اجتناب کیا تو ان میں عزم مصمم، صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کے جذبات صادقہ نہ پیدا ہوں گے اور پھر اسی پر بس نہ ہوگی، بلکہ قوم کی قوم مبتلائے آلام

و مصائب ہوگی اور سب کے سب غیروں کے غلام و محکوم بن جائیں گے۔

آیت نمبر ۲ میں فرائض کے حسن ادا پر زور دیا اور بتایا کہ امیر فوج کی طرف سے جو کام ان کے سپرد کیا جائے اسے دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔ چونکہ جنگ میں خصوصیت کے ساتھ جذبہ انتقام بھڑک اٹھتا ہے انسان بسا اوقات جوش، غیظ و غضب میں حد اعتدال سے تجاوز کر کے قانون کا پابند نہیں رہتا اور مظالم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے، اس لئے آیت نمبر ۲۹ میں تقویٰ و طہارت، ورع و پاکیزگی اور تہذیب و شائستگی کا تذکرہ کیا اور اس کے ثمرات و نتائج بھی دوسری آیت میں بتادیئے۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دی کہ کفار و مشرکین ان فضائل و کمالات سے بے بہرہ ہیں، اس لئے مسلمان عنقریب مسجد حرام کے وارث بنادیئے جائیں گے اور اسی رکوع کے آخر میں بتایا کہ اس پیشین گوئی کو کس طرح پورا کیا جائے گا؟ آیت نمبر ۳۹ میں مسلمانوں کو حکم دیا کہ مذہبی آزادی جان و مال کی حفاظت اور دنیا میں امن و سلامتی کے قیام و ثبات کی خاطر تمہیں قیامت تک جنگ کرنی پڑے گی، تا آنکہ جنگ آزما قوتیں چور چور ہو جائیں اور ارض الہی امن کا گہوارہ بن جائے۔ پھر اس کے بعد فوراً مال غنیمت کی تقسیم کے اصول و ضوابط پر بحث کی اور مختلف حصے مقرر کر دیئے، اسی ذیل میں جنگ بدر کے بعض واقعات اور فیوض و برکات الہیہ کا تذکرہ کیا۔ آیت نمبر ۴۵ میں فرمایا کہ جنگ کی اصلی کامیابی وحدت مقصد میں ہے اور اختلاف اغراض تباہی کا پیش خیمہ اور قومی بربادی کا موجب ہے۔

تمام دنیا مسلمانوں کو فنا کرنے کی فکر میں ہے اور سب نے باہمی عہد و پیمان کر کے یہ عزم کر لیا ہے کہ دنیا میں خدا کا نام لینے والا ایک متنفس بھی باقی نہ رہے۔ اگر مسلمانوں نے اس وقت خاموشی سے کام لیا تو یقیناً معاندین اسلام کی آرزو پوری ہو جائے گی۔ پس مسلمان اگر زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں تو ہر وقت جدید ترین آلات حرب سے مسلح رہیں اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت کو کام میں نہ لائیں، قوت و طاقت اور سامان حرب کی کثرت و فراوانی ہی وہ چیز ہے جو ان فرعون و وقت اور جبارہ و عصر کی اصلاح کر سکتی ہے۔ آیت نمبر ۶۰ میں اسی قانون کی جانب رہنمائی کی، مگر آخر میں یہ بھی بتادیا کہ خون بہانا اور انسانوں کا ذبح کرنا اسلام کے پیش نظر نہیں اور مسلمان جب اس طرف قدم بڑھائے گا تو مجبور و مضطر ہونے کی صورت میں، اس لئے اگر اغیار و اجانب صلح و آشتی کے آرزو مند ہوں تو ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا نہایت ضروری ہے۔ چونکہ مسلمان کو قیامت تک دنیا میں رہنا ہے اور ان کے مخالف بھی برابر اپنی مکارانہ چال بازیوں سے باز نہ آئیں گے، اس لئے نبی اور اس کے جانشینوں کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے رہیں اور ان کا فرض ہے کہ اپنے اندر اتنی قوت و طاقت پیدا کر لیں کہ خواہ کفار کی کتنی ہی بے شمار فوج ان کے سامنے ہو، مگر وہ پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیں اور ان سے برابر مقابلہ کرتے رہیں تاہم آنکہ کفر سر گلوں اور کلمۃ اللہ بلند و برتر ہو۔ آیت نمبر ۶۵ سے اسی قانون کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ آیت نمبر ۷۲ میں آخری ضابطہ جنگ بیان کیا، فرمایا کہ اسلام کو مٹانے کے لئے دنیا کی تمام شیطانی قوتیں آپس میں اتحاد و یگانگت پیدا کر لیتی ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیں اور ان کی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ اس داہیہ کبریٰ اور فتنہ عمیاء سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ کرہ راضی کی تمام اسلامی حکومتیں دینی و مذہبی اور سیاسی اتحاد کو محکم و استوار کر لیں اور سب ایک ہی لڑی میں منسلک ہو جائیں اور اسی پر سورہ انفال کو ختم کر دیا۔



## باب (۱)

## قانون جنگ

## امتيازات مسلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۖ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

”تم سے مال غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، کہدو کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو۔“

رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ کفار قریش کا ایک قافلہ شام سے سامان تجارت لئے ہوئے مکہ مبارکہ کو واپس جا رہا ہے، چونکہ یہ تمام تر سامان اس غرض کے لئے فراہم کیا جا رہا تھا کہ اس کو مسلمانوں کے فنا کرنے میں صرف کیا جائے، پس قانون جنگ کی مصلحت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ دشمنوں کی اس تدبیر کو توڑا جائے۔ چنانچہ آپ ۱۳ھ فقاء کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ مگر ابوسفیان سالار قافلہ کو بھی آپ کی نقل و حرکت کی اطلاع مل گئی، اس نے فوراً صمصم بن عمرو غفاری کو مکہ کی جانب روانہ کر دیا کہ تم جا کر وہاں کے لوگوں کو میرے حالات کی اطلاع دو تاکہ وہ میری امداد و اعانت کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوں اور بنظر احتیاط ابوسفیان نے اپنا اصلی راستہ چھوڑ کر سمندر کی راہ لی اور مسلمانوں کی زد سے بچ گیا۔ ابھی مسلمان اس قافلہ کی تلاش و جستجو ہی میں تھے کہ ان کو کفار کے لشکر جرار کی آمد کی خبر ملی۔ اب بعض تو اس فوج سے جنگ کرنے کے حق میں تھے اور دوسروں کا یہ خیال تھا کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے بے سرو سامانی کی حالت میں لڑائی ہو تو کیونکر؟ مگر انجام کار جنگ ہو کر رہی۔ قلتِ تعداد کے باوجود مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور بے شمار مال غنیمت ملا۔ اس کے تقسیم کرنے میں اختلاف رائے ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ نوجوان ہی اس کے حق دار ہیں اور بوڑھوں کو محروم کر دینا چاہئے، دوسرے لڑنے والوں اور نہ لڑنے والوں میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کے آرزو مند ہیں اور اس لئے تم سے اس کی تقسیم کے قواعد و کلیات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں یہ بات سمجھا دیں کہ میدان جنگ میں تم مال غنیمت جمع کرنے کی غرض سے نہیں آئے ہو، بلکہ تمہارا مقصد حیات تو صرف حق و صدق کی حفاظت، اعلائے کلمۃ اللہ اور کفر و شیطنت کا ابطال و استیصال ہے۔ پھر جھگڑنا تمہاری



شان سے گری ہوئی بات ہے۔ بلکہ یہ تمام سامان اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رسول اس کے احکام و اوامر کے مطابق تقسیم کرے گا، اسے ان مصارف کا الہام کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: **وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (الانفال ۴۱)** تمہیں چاہئے کہ تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرو، آپس میں صلح و آشتی سے رہو، اگر ایمان و اسلام کے پابند ہو تو اللہ کے قانون کو مانو اور رسول کے حکموں کے آگے اپنی گردنیں خم کرو۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ ۖ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

”مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اس کی آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو بڑھادی جاتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں یہی سچے ایمان دار ہیں انکے پروردگار کے پاس ان کیلئے درجے ہیں اور معافی اور عزت کی روزی ہے۔“

مسلم قانت وہ ہے جس کے مایہ ناز و سرمایہ افتخار حسب ذیل خصائص و امتیازات ہوں:

(الف)۔ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور تمام جسم کانپنے لگتا ہے۔  
(ب)۔ جب اللہ کی آیات ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے فہم و ادراک میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے، ایک جگہ آتا ہے: **اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَلًا ۖ تَتَجَسَّعُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۖ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر ۲۳)** ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: **وَإِذَا مَا أَنْزَلْنَا سُورَةً فَيَنظُرُونَ إِلَيْكُمْ وَتَرَاهُمْ يُعْذِرُونَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (التوبہ ۱۲۴)**۔

(ج)۔ وہ روپیہ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، بلکہ صرف خدائے قدوس کی ذات پر اعتماد و توکل کرتے ہیں۔  
(د)۔ نماز پڑھ کر وہ اس حقیقت پر مہر لگا دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہر حکم کے آگے اپنی گردن خم کرنے کو تیار ہیں۔  
(ه)۔ خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اس کو اسی کی راہ میں لٹا کر ایثار و فدویت کا ثبوت دیتے ہیں۔  
یہی لوگ اصلی معنی میں مومنین صادقین ہیں، انہیں کے لئے مناصب عالیہ ہیں، ان کی فروگزاشتوں کو بھی نظر انداز کیا جائے گا اور ان کو بغیر مانگے رزق ملے گا۔

## غزوہ بدر پر اجمالی نظر

چونکہ آگے چل کر غزوہ بدر کا تذکرہ آئے گا، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس جگہ مختصر طور پر اس جنگ کے تمام واقعات بیان کر دیں تاکہ آئندہ آیات کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

مکہ مبارکہ کی تکلیف دہ زندگی سے تنگ آکر رسول اللہ ﷺ نے الہام الہی کے مطابق مدینہ منورہ کو نشیمن رسالت بنایا اور بتدریج مسلمان بھی یہاں آکر آباد ہو گئے، لیکن کفار قریش کو یہ ہجرت ناگوار گزری اور انہوں نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے احباب کو حسب ذیل خط لکھا:

انکم اویتم صاحبنا وانا لنقسم باللہ لتقاتلنہ اولتخرجنہ اولنسیدن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نسائکم (ابوداؤد)

”تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ اس سے لڑو یا اس کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم سب مل کر تم پر حملہ آور ہوں گے تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے۔“

لیکن جنگ کے لئے ضروری تھا کہ ان کے پاس سامانِ حرب کثرت سے ہو، اس لئے ۲ ہجری میں قریش کا جو کاروان تجارت شام کو روانہ ہوا تو مکہ کے ہر ہر فرد نے اپنی دولت اس کی نذر کر دی تاکہ مسلمانوں کے فنا کرنے کے لئے وہ سامانِ حرب خرید کر کے لائے، ابوسفیان سالارِ قافلہ کے الفاظِ ملاحظہ ہوں جن کو ابن سعد نے نقل کیا ہے: واللہ ما بکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ لش وصاعد الابعث بہ معنا۔ گویا اس قافلہ کی روانگی صرف اس غرض کے لئے عمل میں آرہی تھی کہ شام سے سامان تجارت خرید آجائے اور پھر پوری تیاری کے بعد مسلمانوں پر حملہ ہو، جب یہ قافلہ اپنے سفر سے واپس لوٹ رہا تھا تو آپ کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان اپنے قافلہ کے ساتھ سامان تجارت لئے ہوئے مدینہ کے پاس سے گزرنے والا ہے۔ چونکہ آگے چل کر یہی سامان مسلمانوں کے تباہ و برباد کرنے میں صرف ہونے والا تھا، اس لئے قانون جنگ کے اصول کے مطابق آپ نے ضروری سمجھا کہ دشمن کی ان تیاریوں کو روکا جائے۔ چنانچہ آپ اسی ارادہ سے ۳۱۳ جان نثاروں کو لے کر نکلے اس نفل و حرکت کی اطلاع ابوسفیان کو بھی مل گئی، اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور سمندر کے کنارے ہوتا ہوا مسلمانوں کی زد سے بچ نکلا اور ضمیمہ بن عمرو غفاری کو مکہ کی جانب دوڑایا کہ لوگ اس کی مدد کو پہنچیں۔

## جنگ کے لئے نہیں نکلے

جب وادیِ زفران میں رسول اللہ ﷺ پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ کفار قریش ایک عظیم الشان لشکر لیکر ابوسفیان کی حمایت کے لئے آرہے ہیں، اب مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں تھیں، خاموشی کے ساتھ مدینہ کو واپس جائیں ورنہ سینہ سپر ہو کر ان سے جنگ کریں۔ اس لئے آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، چونکہ یہ لوگ جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کا بھی جواب ہونا چاہئے تھا کہ اس بے سرو سامانی کے ساتھ لڑنا خلاف مصلحت ہے۔ قرآن نے

ان کی اس حالت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ ۖ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَكُمَا يُسَافِتُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ (الانفال ۶۳۵) آپ نے فرمایا کہ مجھے بذریعہ وحی والہام اطلاع دی گئی ہے کہ دونوں گروہوں میں سے ایک پر یقیناً ہم لوگوں کو کامیابی نصیب ہوگی، وادعیہدکم اللہ احدی الطائفتین انہالکم (الانفال ۷) اگر قافلہ بچ کر نکل گیا تو پروا نہیں، اس لشکر پر فتح و کامرانی یقینی و قطعی ہے، اس پر تمام صحابہ کی گردنیں جھک گئیں۔  
مقداد نے کہا:

لأنقول کہا قال قوم موسى اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ولكننا نقاتل من بينك وعن شبالك وبين يديك وخلفك (بخاری)

”ہم قوم موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ ہم لوگ آپ کے داہنے سے بائیں سے سامنے سے اور پیچھے سے ہو کر لڑیں گے۔“  
ابن ہشام نے سعد بن معاذ کا حسب ذیل قول نقل کیا ہے:

یا نبی اللہ الانبی لک عریشاتکون فیہ ونعد عندک رکائبکم تلحق عدونا فان اعزنا اللہ و اظهرنا علی عدونا کان ذلک ما اچینا وان کانت الاخری جلسست علی رکائبک فلحقبت بہن و راعنا من قومنا فقد تخلف عنک اقوام یا نبی اللہ ما نحن باشد لک حبا منهم ولو ظنوا انک تلحق حربا مات تخلفوا عنک ینعک اللہ بہم ینا صحنوک ویجاہدون معک۔

حضرت سعد بن معاذ کے الفاظ پر غور کیجئے وہ عرض کرتے ہیں کہ اگر مدینہ کے مسلمانوں کو اس امر کا وہم و گمان بھی ہو تا کہ جنگ کی نوبت آئے گی تو وہ گر گز پیچھے نہ رہتے بلکہ آپ کے ہمراہ ہو کر داد جاں نثاری دیتے۔ ان کے اس جملہ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے، اسی سلسلہ میں ایک اور حدیث بھی دیکھ لیجئے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں کعب بن مالک سے روایت کیا ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لم اتخلف عن رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ غزاها الا فی غزوۃ تبوک غیر انی تخلفت عن غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنها انما خرج رسول اللہ ﷺ یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہم و بین عدوہم علی غیر میعاد۔

”جنگ تبوک کے سوا اور کسی لڑائی میں میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے نہیں رہا البتہ غزوہ بدر میں بھی شریک نہ ہوا مگر اس میں عدم شرکت کے باعث عتاب نازل نہیں ہوا کیونکہ آپ صرف قافلہ قریش کے لئے نکلے تھے اتفاقاً مخالفین سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔“

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تو ان کے پاس صرف دو گھوڑے اور ساٹھ اونٹ تھے، بدر پہنچے تو دیکھا کہ کفار مکہ کا لشکر جو تعداد میں ان سے سہ چند اور سامان میں ہزار چند زیادہ ہے، اتر اہوا ہے۔ جنگ سے ایک روز قبل جناب رسالت مآب نے میدان قتال کا معائنہ

کیا اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ فلاں دشمن فلاں جگہ اور فلاں فلاں اس جگہ قتل ہوں گے۔ ۷ ار رمضان کو جمعہ کے روز جنگ ہوئی، لڑائی سے قبل نبی اللہ نے نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ خدا کے حضور میں دعا کی اور فرط الحاح اور غیرتِ توحید نے یہ الفاظ بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلوا دیے کہ خداوند! ان مسلمانوں کے مارے جانے کے بعد دنیا پر توحید کی منادی کرنے والا کوئی بھی نہ رہے گا۔ آخر دونوں جماعتیں صف آرا ہوئیں۔ مسلمان قلت سامان و تعداد کے باوجود غالب آئے اور کفار کو ذلیل ترین شکست نصیب ہوئی، ان کے ستر آدمی مارے گئے جن میں وہ گیارہ سردار بھی تھے جنہوں نے دارالندوہ میں رسول اکرم کے قتل کا مشورہ کیا تھا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: شیبہ، عتبہ، ابو جہل، ابو النختری، زمعہ بن الاسود، عاص، بن ہشام اور امیہ بن خلف، اور اتنی ہی گرفتاریاں ہوئیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان اس جنگ کے لئے تیار نہ تھے تو رسول اللہ ﷺ مدینہ کو واپس کیوں نہ چلے گئے کہ پورے طور پر تیار ہو کر پھر میدان کارزار میں آتے؟ اگر ایسا ممکن نہ تھا تو دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ آپ مدینہ والوں کو امداد و اعانت کے لئے بلا لیتے، مگر آپ نے ان دونوں میں سے کسی بات کو بھی اختیار نہ کیا بظاہر اس کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں:

(الف) اگر آپ مدینہ کو لوٹ جاتے تو یقیناً ابو جہل کو اس کی اطلاع مل جاتی کیونکہ اس کے جاسوس بھی پھر رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کفار کے حوصلے بڑھ جاتے اور وہ زیادہ جوش و سرگرمی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہوتے۔

(ب) آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مدینہ کو مر کر جنگ بنایا جائے، کیونکہ قوانین جنگ کے اصول اساسی میں یہ شامل ہے کہ ہمیشہ دارالحکومت کو جنگ سے دور رکھنا چاہئے۔

(ج) آپ کو پیشین گوئی کی بنا پر اپنی فتح و کامرانی کا یقین کامل تھا جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس لئے آپ نے یہ ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اہل مدینہ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ اس سے یہ خیال نہ آئے کہ پھر آپ نے دعا میں اس قدر تضرع اور الحاح کا کیوں اظہار کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کے قبول ہونے کی شرائط میں سے ایک چیز یہ بھی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ آپ اس کے پابند ہوتے۔

اخراج عن البیت

كَمَا آخَرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُوا ۚ ۝ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۚ ۝

”جس طرح تمہارے رب نے حق کے ساتھ تمہیں تمہارے گھر سے روانہ کیا حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ ناخوش تھا۔ حق بات ظاہر ہونے کے بعد وہ تم سے جھگڑتے تھے گویا آنکھوں دیکھے وہ موت کی جانب ہانکے جاتے ہیں۔“

کما سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کرام نے اس کے متعلق مختلف اقوال بیان کئے ہیں، مگر ان سب میں قابل ترجیح یہ قول ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم میں صحابہ مختلف الرائے تھے، اللہ تعالیٰ نے بعض کی ناراضگی کا لحاظ نہ کر کے ایک مستقل قانون تقسیم غنائم نوازش کر دیا اور بتا دیا کہ ان کی مرضی کے مطابق اس کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح صحابہ اپنے ضعف ظاہری اور بے سروسامانی کو دیکھ کر یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس حالت میں کافروں کے ساتھ جنگ کی جائے۔ لیکن خدائے حق نوازنے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ باوجود بے سروسامانی کے تائید حق کی خاطر گھر سے نکل کھڑا ہو اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ آگے چل کر اس کی چند مصلحتوں کو بھی قرآن حکیم نے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: **يُؤَيِّدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكُلِّبَيْتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ** (الانفال ۷) دوسرے موقع پر یہ ارشاد ہوا: **وَالْيُؤَيِّدُ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا** (الانفال ۱۷) پھر کہا: **لِيُبَيِّنَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ فَيَرْكَبَهُ جَبِينًا** (الانفال ۳۷) آگے چل کر فرمایا: **يَهْدِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيِي مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ** (الانفال ۴۲)۔

چونکہ صحابہ جنگ کے لئے تیار ہو کر نہ نکلے تھے جیسا کہ ابی بن کعب اور سعد بن معاذ کی روایات سے معلوم ہو چکا ہے، اس لئے ان کا لڑائی سے عذر کرنا بالکل حق بجانب تھا۔ اس احتراز کو قرآن حکیم نے: **وَإِنْ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَمَكْرُوهٍ** اور **كَأَنَّمَا يَسْقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَيَنْظُرُونَ** سے تعبیر کیا ہے۔

**ابو ایوب انصاری کی روایت اس پر اور زیادہ روشنی ڈالتی ہے:**

قال رسول الله ﷺ اني اخبرت عن عيرابي سفيان انها مقبلة فهل لكم ان تخرج قبل هذه العير لعل الله ان يغنيناها فقللنا نعم فخرج وخرجنا فلما سارنا يوم ايو ميين قال لنا ماتدرون في قتال القوم فانهم قد اخبروا بخرجوكم فقللنا لا والله ما لنا طاقة بقتال العدو ولكننا اردنا العير ثم قال ماترون في قتال القوم فقللنا مثل ذلك (حافظ ابو بكر بن مردويه)

”آپ نے فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ آرہا ہے کیا تم قافلہ لوٹنا چاہتے ہو عجب نہیں اللہ ہم کو کامیاب کرے۔ چنانچہ ہم لوگ مدینہ سے نکلے تو دو ایک روز کے سفر کے بعد آپ نے فرمایا کہ ان کو ہمارے حملہ کی اطلاع مل گئی ہے اب ان سے جنگ کرنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ ہم ان سے جنگ نہیں کر سکتے ہم تو صرف قافلہ کی غرض سے نکلے تھے، آپ نے پھر یہی سوال کیا اور ہم نے بھی وہی عرض کیا۔“

ان لوگوں سے آپ نے اسی وقت فرمادیا تھا کہ قافلہ اور لشکر دونوں میں سے ایک پر فتح و کامرانی یقین و قطعی ہے: وَاذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِذَا طَلَقْتُمُوهُنَّ اِنْهَالَكُمُ (الانفال ۷)، مگر صحابہ باوجود اس حقیقت کے معلوم ہونے کے جنگ کرنے کو پھر بھی خلاف مصلحت سمجھتے تھے، وہ اپنی بے سروسامانی اور قلت تعداد کو دیکھتے تھے، دشمن کی کثرت تعداد اور اسباب و وسائل کی فراوانی بھی ان کی نظروں سے مخفی نہ تھی اس بناء پر ان کا خیال یہ تھا کہ اس وقت لڑائی کو اپنے سرمول لینا گویا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔

## مقصد کیا تھا

وَإِذْ يَعِدُّكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۖ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُطِلَّ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ٥

”اور جب دو جماعتوں میں سے ایک کی نسبت اللہ تم سے وعدہ فرماتا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ وہ تمہیں مل جائے جس میں کائنات لگے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچ کو اپنے کلمات سے سچا کر دکھائے اور کافروں کی جڑ بنیاد کاٹ ڈالے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کرے اگرچہ مجرم ناخوش ہوں۔“

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اکرم کا ارادہ قافلہ شام پر حملہ کرنا تھا، مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ اب کفار کا لشکر تھا اور مسلمان، آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، وہ قافلہ کو لوٹنا زیادہ پسند کرتے تھے کیونکہ اس میں ایک تو انہیں تکلیف نہ ہوتی دوسرے کفار سامانِ رسد سے محروم ہو جاتے تیسرے مسلمان اس کو اپنے کام میں لے آتے اور آئندہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے، ظاہر ہے کہ قافلہ سمندر کے کنارے دور جا چکا تھا، اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ اسی لشکر کے ساتھ جنگ کی جائے، آپ یہی چاہتے تھے اور یہی اللہ کا منشا تھا، اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ:

(الف) اس جنگ کی وجہ سے اس دینِ قویم کو ثبات و استقامت بخشے، اس کو تمکین فی الارض حاصل ہو اور لیکن لہم دینہم الذی ارتضى لهم وليبدلهم من بعد خوفهم امنا کی حقیقت آشکارا ہو جائے، فاقتلوهم حتی لا تكون فتنة ویکون الدین للہ اور لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا کا یہی مطلب ہے۔

(ب) کافروں کا استیصال ہو، ان کو اسلام کے مقابلہ میں سر اٹھانے کا خیال بھی نہ آئے اور حتی تضع الحرب اوزار ہا کا مصداق حقیقی سامنے آجائے، اس میں شک نہیں کہ قانون تنازع للبقاء کے اصول کے مطابق جب حق اور باطل، نور اور ظلمت، اسلام اور کفر میں آویزش ہوگی تو کلمہ ستم کو بلند و برتر کرنا باب ایمان و اخلاص کا فرض ہوگا، پس اگر اعلائے کلمۃ اللہ میں دجالہ، کفر و شیطنت کو تکلیف ہوتی ہے تو ہوا کرے، خدا کو اس کی پرواہ نہیں، کیونکہ کفر تو پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ اس کے ابطال میں اہل ایمان اپنی پوری سعی و کوشش کا اظہار کریں تاکہ ان کی صف دوسرے لوگوں سے ممتاز نظر آنے لگے۔

## نزول برکات

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِآلِيفٍ مِّنَ الْمَلِكَةِ مُرْدِفِينَ ۖ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٦ (الانفال ۱۰ تا ۹)

”جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرنے لگے پس اس نے تمہاری سن لی کہ میں ہزار لگا تار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا اور یہ تو صرف اللہ نے خوشخبری دی اور تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور فتح تو

اللہ کی طرف سے ہے بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ کفار کا لشکر کئی گنا زیادہ ہے تو آپ نے نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ دعا کی اور عرض کیا کہ اگر مسلمانوں کی یہ تھوڑی سی جماعت ہلاک ہو گئی تو اے اللہ! تیری عبادت کرنے والا دنیا میں کوئی بھی نہ ہوگا، اللہ نے اس دعا کو شرف اجابت بخشا اور ایک ہزار ملائکہ الرحمن ان کی مدد کے لئے بھیجے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

لما کان یوم بدر نظر رسول اللہ ﷺ الی المشرکین وهم الف واصحابہ ثلاثۃ و بضعۃ عشر رجلا فا ستقبل نبی اللہ ﷺ القبلة ثم مد یدہ فجعل یمتف بر بہ یقول اللهم انجینی ماودتني اللهم اتنی وماعدتني اللهم ان تهلك هذه العصابة من اهل الاسلام لا تعبدني الارض فما زال یمتف بر بہ ما د ید یہ حتی سقط رداءہ عن منكبیه فاتاة ابو بکر فاخذ رداءہ فالتقاہ علی منكبیه ثم التزمہ من ورائہ وقال یا نبی اللہ کفاک مناشدتك یریک فانه سینجزک ما وعدک فانزل اللہ عزوجل اذ تستغیثون ربکم۔

”جب معرکہ بدر کا دن آیا تو آپ نے لشکر کفار کو دیکھا جو ایک ہزار کی تعداد میں تھا اور مسلمان ۳۱۳، آپ نے قبلہ رخ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا کہ اے میرے رب! اپنے وعدوں کو پورا کر جو تو نے میرے ساتھ کئے ہیں اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو اس کرہ ارضی کی پشت پر تیرا نام لینے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا آپ کی بے خودی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کے کندھوں سے چادر بھی گر گئی ابو بکر نے آکر اس کو آپ کے کندھوں پر ڈال دیا اور گو د میں لے کر عرض کیا کہ یا نبی اللہ یہ الحاح و تضرع کافی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: اذ تستغیثون ربکم نازل کی۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فتح و کامرانی کا وعدہ پہلے ہی سے فرما دیا تھا، کیونکہ آپ بار بار فرماتے ہیں: اللهم انجونی ما وعدتني اللهم اتنی ما وعدتني۔ وہ عہد و مواعیت کیا تھے؟ حسب ذیل آیات ان پر روشنی ڈالتی ہیں:

”عرب کی بابت الہامی کلام۔ عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے اے دوانیوں کے قافلہ۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تمہاری سرزمین کے باشندو، روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگتے ہیں، کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس، ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے، کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا“ (یسعہ ۲۱: ۱۷۳ تا ۱۷۷)

یہ تمام آیات رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اور جنگ بر پر صراحتہ دلالت کرتی ہیں۔ بخاری میں ہے کہ جب آپ دعا کے بعد چمچہ میں سے باہر نکلے تو آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے: سیہزم الجمع ویولون الدبر یہ آیت سورہ قمر کی



ہے جس کی نسبت تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ مکہ میں ہجرت سے قبل نازل ہو چکی تھی۔ پس ان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مکی زندگی میں آپ کو جس فتح و نصرت کا وعدہ دیا گیا تھا وہ پورا ہونے والا تھا وکان وعدا مفعولا۔ چنانچہ وہی ہو کر رہا۔ یہی مطلب ہے ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ کا جو تم پہلے پڑھ آئے ہو۔

بعض مخالفین کہا کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی شریعت کو حسب ضرورت بدلتے رہتے تھے، مکی زندگی میں آپ صرف ایک معلم اخلاق کی صورت میں نظر آتے ہیں، مگر جب مدینہ میں اعران و انصار کی ایک جماعت فراہم ہو گئی تو بادشاہی قوانین نافذ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جن آیات کو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ آل حضرت کے ذہن مبارک میں بالہام خداوندی اپنی کامیابی کی مکمل اسکیم پہلے ہی سے محفوظ تھی۔ چنانچہ آیت سیہزم الجمع دیولون الدبر مکہ میں نازل ہو چکی تھی جس کا ظہور غزوہ بدر میں وہا۔

### ملائکہ کی آمد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرشتوں کی امداد کا وعدہ دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہم بتا آئے ہیں کہ ملائکہ الرحمن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) ملائع اعلیٰ، جو اس عالم میں نظام صالح قائم رکھنے پر مامور ہیں، جس کو وہ بذریعہ دعا انجام دیتے ہیں۔

(ب) ملائع سافل، ان کی حیثیت ایک کارکن جماعت کی ہے۔

بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ تمام دنیا کو فنا کرنے کے لئے ایک ہی فرشتہ کافی ہو سکتا تھا، پھر ایک ہزار کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اصل بات یہ ہے کہ اگر فرشتوں کے مختلف اقسام ان کے پیش نظر ہوتے تو یہ اعتراض ہی نہ ہوتا۔ ملائع سافل کے فرشتوں میں اتنی طاقت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی کام کو خود کریں، البتہ اگر کوئی کام ہو رہا ہو تو وہ اس وقت اپنی قوت کا اظہار کریں گے۔ اگر ایک شخص کسی کام میں مصروف ہو تو یہ اس کی قوت ارادی میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا کر دیں گے، لیکن جب کام نہ ہوتا ہو اور نہ کرنے کا ارادہ ہو تو یہ فرشتے بھی کچھ نہیں کرتے۔ آنکھیں بصارت سے محروم ہیں تو عینک لگانا بے سود ہے۔ اس لئے سب سے پہلے محکم و استوار ارادہ عزم صمیم اور استقلال کی ضرورت ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کامیابی کے تمام اسباب و مراتب فراہم کر دے گا۔ انسانوں کی مدد کے لئے ملائع سافل ہی کے فرشتوں کو الہام کیا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اللہ اگر چاہے تو پچھر اور بھنگے سے پوری قوم کی قوم کو تباہ کر دے، مگر جو کچھ قوانین اس نے مقرر کر دیے ہیں ان کی رعایت عموماً ملحوظ رہتی ہے۔ اعمال انسانی کی حفظ و صیانت کے لئے خدا نے دو فرشتوں کو مقرر کیا، دوسرے کاموں پر بھی متعدد ملائکہ کا تعین احادیث سے ثابت ہوتا ہے، پس حقیقت وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

ایک ہزار فرشتوں کی تعداد کا تعین مسلمانوں کے اطمینان قلب کی خاطر تھا۔ ابراہیم علیہ السلام احوال موتی کی مختلف کیفیات ملاحظہ کرنے کے آرزو مند ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ لیطین قلبی حواریین جب نزول ماندہ کی درخواست کرتے



ہیں تو ان کے سامنے بھی یہی حقیقت تھی: نَبُذْنَا أَنْ تَأْكُلَ مِنْهَا وَتَضْمِنَ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنَّ قَدْ صَدَقْتَنَا وَكَذَّبُوا عَنْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ (المائدہ ۱۱۳) زکریا علیہ السلام کو جب ایک فرزند صالح کی بشارت دی گئی تو وہ بھی ظاہری اسباب میں دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں: رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً (مریم ۱۰) اگر اس سے کم فرشتوں کے نزول کا وعدہ دیا جاتا تو ممکن تھا کہ مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو تا کہ ہم بہت کم ہیں اور کفار کی تعداد ایک ہزار ہے، اس لئے ایک قاعدہ میں لا کر ان کی دل بستگی کر دی اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد ہوگی، اب انہیں پورا اطمینان ہو گا کہ ہماری تعداد کفار سے کہیں زیادہ ہے، جوش مسرت میں وہ دل کھول کر جنگ کریں گے اور بہادری کے جوہر دکھائیں گے۔

یہ مدد اس لئے نازل کی کہ مسلمان ثابت قدم رہیں، ان کو اطمینان قلب اور سکینہ و شج صدر حاصل ہو اور بشارت قلب کے ساتھ جنگ کریں۔ سورۃ آل عمران میں بھی امداد ملا نہ کہ کے متعلق اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں: وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بُشًى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (آل عمران ۱۲۶) لیکن ان الفاظ سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ فرشتوں کی امداد کا صرف وعدہ ہی وعدہ تھا اور حقیقت میں ایک بھی فرشتہ نہیں آیا۔ آپ ان تمام لڑائیوں کے حالات و واقعات پر نظر ڈالئے، جن میں اس روحانی اعانت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ غزوہ بدر کو لیجئے، کفار کی تعداد ایک ہزار ہے، میدان کا بہترین حصہ ان کے قبضہ میں ہے، پانی کے چشموں سے انہوں نے مسلمانوں کو محروم کر دیا ہے، جس قدر سپاہی ہیں، تجربہ کار اور جنگ آزمودہ ہیں ادھر مسلمان صرف ۳۱۳ ہیں، سامان حرب نہ ارد، باوجود بے سروسامانی کے وہ کفار کو ذلیل و رسوا کر کے واپس لوٹا دیتے ہیں، پس یہ کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی جب تک فرشتے ان کے شریک کار نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ بخاری کی اس روایت کو بھی پیش نظر رکھ لیجئے:

جاء جبرئیل الى النبي ﷺ فقال ماتعدون اهل بدر رفيكم قال من افضل المسلمين او كلمة نحوها قال وكذلك من شهد بدرًا من الملائكة۔

”جبرئیل نے آکر رسول اللہ سے دریافت کیا کہ جنگ بدر کے شرکاء کے مراتب و درجات کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ تمام مسلمانوں میں سے افضل ہیں، جبرئیل نے کہا یہی فضیلت و برتری ان فرشتوں کو حاصل ہے جو اس لڑائی میں شریک ہوئے۔“

غزوہ احد کی بھی یہی حالت ہے۔ یہاں کافر چار گنا زیادہ ہیں، جن میں ایک ہزار سوار ہیں اور خالد بن ولید ان کے سپہ سالار ہیں، مگر اس لڑائی میں بھی کافروں کو بھانپنا پڑتا ہے۔

جنگ احزاب کو دیکھئے، اس میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس ۱۰ گنا زیادہ ہے، منافقین جاسوسی کر رہے ہیں اور ایک ایک لمحہ کی خبر دشمنوں کو دیتے ہیں، یہودی اپنے عہد و پیمان کو توڑ کر ان سے جا ملے ہیں، مگر اس پر بھی ان کو ناکام و لوٹنا پڑتا ہے اور یہ نتائج ہیں ملا نہ کہ کی نصرت و اعانت اور خدا کی بروقت دستگیری کے۔

دراصل کامیابی اور فتح و کامرانی تو خدائے قدوس کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ عزیز و حکیم ہے، حکمت و دانائی سے کام لے کر ارباب ایمان کو غلبہ و اقتدار نوازش کرے گا۔

## نصرت الہی کا ظہور

إِذْ يُغَشِّيكُمُ الْغُصَاثُ أَمْنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُم رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝

”جب اللہ اپنی طرف سے جہن سے چھین دینے کو تم پر اوگٹھ طاری کرتا تھا اور تم پر آسمان سے پانی نازل کرتا تھا کہ اس سے تم کو پاک کرے اور تم سے شیطانی نجاست دور کرے اور تاکہ تمہارے دلوں پر محکم گرہ لگا دے اور تمہارے قدم جمائے رکھے۔“

جس وقت رسول اللہ ﷺ میدان بدر میں خیمہ زن ہوئے تو حالت یہ تھی کہ وہاں چشمہ یا کنواں تک نہ تھا، زمین ایسی ریتیلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے، حباب بن منذر نے دربار رسالت میں عرض کیا کہ اس مقام کا انتخاب الہام کی بنا پر ہوا ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس کو وحی سے کوئی تعلق نہیں، حباب نے کہا بہتر ہو گا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور اطراف و جوانب کے کنوئیں بیکار کر دیئے جائیں، آپ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی پر عمل کیا گیا۔ اس روز اللہ کی طرف سے حسب ذیل برکات نازل ہوئیں۔

(۱)۔ باوجودیکہ جنگ کی حالت تھی دشمن کی کثرت تعداد کا بھی علم تھا اور اپنی بے سروسامانی بھی مخفی نہ تھی، پھر بھی مسلمانوں کو ایسا امن و اطمینان نصیب تھا کہ ان پر اوگٹھ طاری ہو گئی۔ عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں: النُّعَاسُ فِي الْقِتَالِ أَمْنَةٌ مِنَ اللَّهِ وَفِي الصَّلَاةِ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ اسی قسم کی نعمتوں کا ذکر جنگ احد کے متعلق بھی آتا ہے: ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُّعَاسًا يَّغْشَى طَائِفَةً مِّنْكُمْ (آل عمران ۱۵۴) چھپر میں جس وقت رسول اکرم ﷺ و کامرانی کے لئے دعا مانگ رہے تھے تو اس وقت آپ پر بھی اوگٹھ طاری ہو گئی تھی:

ان رسول اللہ ﷺ لما كان يوم بدر رُفِيَ العَرِيشُ مَعَ الصَّدِيقِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَهَمَّ اِيْدِعُوَانِ اخَذَتْ رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ سَنَةً مِنَ النُّوْمِ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ مُتَبَسِّبًا۔

(۲)۔ مسلمانوں کے لئے پانی کافی نہ تھا اور جب یہ لوگ شب کے وقت سو گئے تو بعض کو نہانے کی ضرورت ہو گئی، اس پر سب کے سب پریشان تھے، شیطان کے لئے بہترین موقع تھا کہ وسوس و خطرات سے ان کو تنگ کرے۔ چنانچہ بعض کو خیال آیا کہ یہ باتیں ارباب حق و صدق کی شان کے شایاں نہیں، پینے کو پانی نہیں ملتا اور نماز بھی بغیر وضو کے ادا کرنی پڑے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے بارش نازل کی جس سے چند فائدے حاصل ہوئے:

(الف)۔ جن کو غسل کی ضرورت تھی وہ پاک و صاف ہو گئے، وضو کر کے نماز ادا کی، کھانے پکانے اور جانوروں کے لئے برتنوں میں پانی بھر لیا، ریت جم گئی اور چلنے پھرنے میں آسانی ہو گئی۔

(ب) شیطان نے جس قدر وسوس و خطرات پیدا کئے تھے یک قلم دور ہو گئے، کیونکہ ان کو یقین ہو گیا کہ تائید الہی ہمارے ساتھ ہے اور ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

(ج) وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ جنود الہیہ کی نصرت و امداد کفار کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی، ان کے دل قوی و طاقتور ہو گئے اور ان کو انشراح صدر حاصل ہو گیا۔

ان تمام فیوض و برکات سے مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ اگر خارجی اسباب تمہاری نصرت و اعانت سے رک جائیں تو روحانی قوتوں سے تمہاری مدد کی جائے گی۔

## طریق جنگ

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى النَّبِيِّ أَنِ امْكُمُ مَعَكُمْ فَتُبَيِّنُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۖ سَالِقِينَ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَأَخْرَبُوا قَوْقِ الْأَعْنَاقِ وَأَخْرَبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذَلِكُمْ بِمَا كَانُوا شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَلِكُمْ فَذَوْقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ۝ (الانفال ۱۲-۱۳)

”جب تمہارا رب فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں تو تم مسلمانوں کو جمائے رکھو میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا پس تم گردنوں پر مارو اور ان کا ہر جوڑ کاٹو یہ اس کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہو گا تو بیشک اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔ یہ تو تم چکھ لو اور جان لو کہ کافروں کے لئے آگ کا عذاب ہے۔“

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، یہ بات پہلے صاف ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کی نصرت و یادری کے لئے فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔ جنگ کے روز اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو الہام کیا کہ میں تمہارے ساتھوں ہوں، اس لئے تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ فرزند ان اسلام میں صبر و استقامت اور استقلال و ثبات قدم کی جذبات حقہ پیدا کرو، جب ان کو یہ معلوم ہو گا کہ ایک عظیم الشان لشکر ہماری امداد پر ہے تو ان میں اور زیادہ ہمت و جرات پیدا ہوگی اور جوش و ولولہ دینی کے ساتھ جنگ کریں گے۔ ادھر میں کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دوں گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ جس وقت وہ دیکھیں گے کہ مسلمان تھوڑی سی تعداد اور فقدان اسباب کے باوجود پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے تو ضرور سمجھ جائیں گے کہ ان کی امداد و اعانت کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی لشکر کمین گاہ میں موجود ہو گا، جو ضرورت کے وقت پر حملہ آور ہو گا، اس خیال کے آتے ہی ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی اور ان پر رعب و ہیبت طاری ہو جائے گی۔ جنگ کا قانون بھی یہی ہے کہ فوج کا ایک حصہ تو دشمن کے سامنے ہوتا ہے اور باقی کو محفوظ رکھا جاتا ہے کہ وقت پر کام آئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ فنون سپاہ گری بھی تعلیم دیے جو کفار کے قلع فتح کرنے میں نہایت ہی مفید ثابت ہوئے، بلکہ فن سپاہ گری کے اصول قرار پائے۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ اس قاعدہ کا تذکرہ ان الفاظ میں آتا ہے: فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّجَالِ (محمد ۴) یہ عذاب ان کفار و مخالفین اسلام پر اس لئے نازل ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو ایسا کرے گا اس کی یہی سزا ہوگی۔ وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو گا، محکومانہ زندگی بسر کرے گا اور مر

نے کے بعد جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ ایک جگہ فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (المجادلہ: ۵) اسی سورۃ کے آخر میں آیات: إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخٰسِرُونَ (المجادلہ: ۱۹) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (الحشر: ۴) سورہ نساء میں آتا ہے: إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا (النساء: ۷۶) اس آیت کو بھی سامنے رکھ لیجئے:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء: ۱۱۵)



## باب (۲)

گزشتہ آیات میں غزوہ بدر کی بحث ختم ہو گئی۔ اب اس لڑائی سے مختلف نتائج کا استنباط واستخراج کیا جائے گا اور یہی چیزیں مستقل قانون کی شکل اختیار کر لیں گی۔ چنانچہ یہاں سے ان قوانین وضوابط کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جن کی مشق اس لڑائی میں کرائی گئی۔

## جنگ سے بھاگنا جرم ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمْ إِلَّا ذُبَابًا ۖ وَمَنْ يُؤَلِّمْهُمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّتَقْتَالَ ۖ أَوْ مُتَحَرِّزًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ ۖ فَكَذَّبَ بَاءً بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

”اے ایمان والو! جب کفار سے تمہارا مقابلہ ہو جو انہوہ کئے ہوئے ہوں تو ان کو پیٹھ نہ دو اور جو ان کو اس روز پیٹھ دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا ہنر کرتا ہو یا فوج میں جا شامل ہوتا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔“

جنگ میں کامیابی کے لئے اولین قانون یہ ہے کہ یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانہم بنیان مرصوص کا صحیح نقشہ سامنے آجائے، کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور پہاڑ کی طرح جم جائے۔ دشمن کو پشت دکھانا اور میدان جنگ سے منہ موڑنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنی جان بچانا مقصود ہے، ایک شخص کے بھاگنے سے تمام فوج بھاگنا شروع کر دے گی، دشمن غالب آجائے گا اور مسلمان دوسروں کے غلام بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کو اعظم ترین جرائم شمار کیا، اس کے ارتکاب پر غضب الہی کے نزول سے ڈرایا اور اس کے مرتکب کو دوزخ کی وعید سنائی اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ایک شخص کے بھاگنے سے فوج کی نظم و ترتیب (ڈسپلن) جاتی رہے گی، رعب میں فرق پڑ جائے گا اور سب کے سب مسلمان مبتلائے آلام و مصائب ہوں گے۔ لسان نبوت نے اس فرار عن الرحف کو اکبر الکبائر میں شمار کیا، چنانچہ بخاری میں آتا ہے:

اجتنبوا السبع الموبقات، قیل یا رسول اللہ وما هن؟ قال الشک باالله والسحر وقتل النفس التی حرم الله الا بالحق واکل الربا واکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات المومنات۔

”آپ نے فرمایا سات مہلک چیزوں سے بچوں، لوگوں نے پوچھا وہ کونسی چیزیں ہیں؟ آپ نے جواب یا کہ (۱) شرک باللہ (۲) جادو (۳) نفس انسانی کا قتل جس کو خدا نے حرام قرار دیا ہے البتہ جہاں قانون اس کے قتل کا فیصلہ کر دے تو کوئی گناہ نہیں (۴) سود کا کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) لڑائی کے دن میدان جنگ سے بھاگنا (۷) شریف و پاک دامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔“

حافظ ابو القاسم طبرانی ثوبان سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ جو شخص ان تین جرائم کا مرتکب ہو اس کا کوئی عمل صالح مفید و نافع نہ ہو گا۔ الشراک باللہ و عقوق الوالدین و الفرار من الزحف۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں بشیر بن معبد سے روایت بیان کی ہے کہ وہ بیعت کی غرض سے دربار رسالت میں حاضر ہوئے، آپ نے چند شرائط پیش کیں جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ: ان اجاہد فی سبیل اللہ۔ بشیر کہتے ہیں کہ میں نے فرار عن الزحف کے خوف سے اس شرط کو ماننے سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا: فبم تدخل الجنة اذا، ”پھر جنت میں کیسے داخل ہو گے“ اس پر میں نے اس شرط کو بھی قبول کر لیا اور بیعت سے شرف اندوز ہوا۔

قرآن حکیم نے بھاگنے کی صرف دو صورتوں میں اجازت دی ہے:

(الف) لڑائی کے لئے موجودہ مقام مناسب نہ ہو اور ماہرین فن حرب کے مشورہ سے اس کا تبدیل کرنا ضروری معلوم ہو۔  
(ب) خیال یہ ہو کہ اور زیادہ فوج لے کر دشمن پر حملہ کیا جائے۔

ان دونوں صورتوں میں بھاگنا جائز ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اگرچہ اس میں صورت تو بھاگنے کی ہے مگر اس نام سے اس کو تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال اس سے اتنی بات معلوم ہو گئی کہ قانون جنگ اور ماہرین فن کی رائے سے جہاں بھاگنا ضروری ہو گا شریعت اس پر ہرگز مواخذہ نہ کرے گی، جرم اس صورت میں ہو گا جبکہ اپنی جان بچانے کی فکر ہوگی۔

## دست عمل

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتُمْ إِذْ رَمَيْتُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۵﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ ﴿۶﴾

”پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جس وقت تم نے مٹی خاک کی پھینکی تھی تو تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی اور تاکہ اللہ مسلمانوں کو اپنی بارگاہ سے اچھا انعام عطا فرمائے بیشک اللہ سنا جانتا ہے اور یہ جانے رہو کہ اللہ کافروں کی تدبیر کوست کرے گا۔“

جنگ میں دراصل صبر و استقامت اور ثبات قدم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، مگر باوجود اس قلت تعداد کے وہ مظفر و منصور واپس لوٹتے ہیں۔ پس یہ فتح و ظفر نتیجہ ہے اللہ کی نصرت و دستگیری کا، ورنہ ایسے عظیم الشان لشکر پر کامیاب ہونا کسی انسان کی قوت و طاقت میں نہ تھا۔ اس لئے قرآن حکیم اس

کا بار بار تذکرہ کرتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ولقد نصرکم اللہ ببدر و انتم اذلہ (ال عمران ۱۲۳) ایک مقام پر یوں ارشاد کیا: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَخْرَجْنَاكَ بِكَثْرَتِكَ فَلَمَّ تَغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَصَافَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّذَبِّحِينَ ۝ ثُمَّ أَكْرَزَ اللَّهُ سَيِّئَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا (التوبہ ۲۵ تا ۲۶) انسان جس قدر کام اپنی قوت سے کرتا ہے اس کی نسبت اسی کی طرف ہوگی، لیکن اگر خارجی اعانت بھی اس کے شریک کار ہو جائے تو پھر اس کے ثمرات و نتائج کو خارجی قوت کی جانب منسوب کیا جائے گا۔ بچہ کا ہاتھ پکڑ کر لکھو ادینا لکھوانے والے کی طرف منسوب ہوگا۔ جنگ بدر میں کامیابی حاصل کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا، رحمت الہی کا نزول ہوا اور ملائکہ الرحمن نے مسلمانوں کی دستگیری کی، اس لئے ان تمام کامیابیوں کو جو اس لڑائی میں حاصل ہوئیں اللہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نسبت آپ کو معلوم ہے کہ وہ نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ فتح و کامرانی کی دعا مانگ رہے تھے اور آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے: یا رب ان تهلك هذه العصابة فلن تعبد في الارض ابدا، جب آپ کو اپنی کامیابی اور جنود ضلالت کی ذلت و رسوائی کا یقین ہو گیا تو آپ باہر نکلے اور فرمایا: سيهزم الجمع ويولون الدبر، پھر ایک مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر کفار کی طرف پھینکی اور کہا: شامت الوجوه، ”یہ کنکریاں ہر ایک کافر کی آنکھ میں پڑیں“، یہ بھی بالاتر قوت کا اثر تھا۔ اس لئے فرمایا کہ: وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى۔ جب بیعت ارضوان ہوئی ہے تو اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک کو اپنا ہی ہاتھ فرمایا ہے: اِنَّ الدِّينَ يَاسِيَعُونَكَ اِثْمًا يَاسِيَعُونَ اللهَ يَدُ اللهَ فَوْقَ اَيْدِيهِمْ (الفتح ۱۰)۔ جب انسان پر ان صلیق و نسکی و محیای و مماتی اللہ رب العلمین کی حقیقت طاری ہو جاتی ہے تو اس کے افکار و خیالات، جذبات و احساسات اور اعضاء و جوارح سب اسی کے تابع فرمان بن جاتے ہیں، اس کے اندر حقیقت اسلامیہ کی عملی روح ہوتی ہے۔ اس کا دل جمال الہی کا مسکن اور اس کا چہرہ حسن حقیقت کا مظہر ہوتا ہے، وہ دنیا کی تمام طاقتوں اور ماسوی اللہ قوتوں سے منہ موڑ کر صرف خدائے اسلام کا وفادار اور تابع احکام ہوتا ہے اور اللہ کے استغراق و استہلاک میں اس طرح فنا ہو جاتا ہے کہ پھر دنیا کی صدا بقوائے شیطانیہ اس پر حملہ آور ہونے سے ڈرتی ہیں اور ہر آن و ہر لمحہ اس کے اعمال کی زبان صدائے توحید سے غلغلہ آندازا قلم روح و معنی ہوتی ہے، وہ نفس و شیطان کے تسلط کی زنجیریں توڑ کر حقیقی عبودیت کی محویت و خود فراموشی کے مقام میں پہنچ جاتا ہے یعنی اپنی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اللہ کے ہاتھ بک جاتا ہے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی قبلہ ارواح و کعبہ قلوب کے آگے جھک جاتا ہے، پھر وہ صحیح معنی میں مسلم ہوتا ہے اور اسلام کے معنی گردن کے رکھ دینے، حوالہ کر دینے اور جھکا دینے کے ہیں۔ پس جمال الہی اس کی تمام قوتوں کا احاطہ کر لیتا ہے اور اس کی ہر چیز کو اپنے حسن کی تجلیات کا آئینہ بنا دیتا ہے۔ وہ بولتا ہے تو اللہ کی آواز نکلتی ہے اور دیکھتا ہے تو اللہ کی بصیرت سے دیکھتا ہے:

فاذا اجبته كنت سبعة الذي يسبح به وبصره الذي يبصر به ویده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها

وان سالنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعینہ (بخاری باب التواضع)۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود!

بدر کے عرصہ کارزار میں مسلمانوں کا جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا تھا، نبی کریم کی مضطربانہ دعا آپ کو یاد ہے، پس جب مسلمان مرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تو کامیاب و بامراد واپس لوٹے اور نصرت الہیہ نے ان کی دستگیری کی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو سنتا اور نیتوں کو جانتا ہے، اس لئے انہیں نوازش ہائے گونا گوں سے سرفراز کیا گیا اور اس تمام تر جنگ و پیکار کا مقصد یہ تھا کہ کفار کی ان کوششوں کو بیکار کر دیا جائے جو حق کے مٹانے کے لئے ہو رہی تھیں۔

## آفتاب آمد دلیل آفتاب

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ ۚ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَمَا هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نَعْدًا ۚ وَلَكِنْ تُغْفِرْ عَنْكُمْ فَمَنْتَكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٨﴾

”اگر تم فتح چاہتے ہو تو فتح تمہارے سامنے آ موجود ہوئی اور اگر باز آ جاؤ تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر پھر کرو گے تو ہم بھی پھر کریں گے اور تمہارا جھٹھاہر گز تمہارے کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔“ جس وقت کفار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے مکہ سے روانہ ہوئے تو انہوں نے بیت اللہ الحرام کے پردوں کو پکڑ کر یہ دعا کی: اللہم انصر اعلیٰ الجندین واکرم الفئتين وخیر القبلیتین، ”خداوند! ان دونوں گروہوں میں سے اس کی نصرت و اعانت کر جو اعلیٰ شریف اور معزز ترین ہو“ بعض روایات میں آتا ہے کہ ابو جہل بن ہشام نے میدان بدر میں یوں دعا کی تھی: اللہم اینا کان خیر عندک انصرہ۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ مبارکہ میں ان مشرکین کو دعوت اسلام دیتے اور یہ لوگ وحی الہی کی مخالفت کیا کرتے تو یہ بھی کہا کرتے تھے: إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمِطْ عَنْ لَيْلَانَا حِجَابَ مَنْ السَّمَاءِ أَوْ اثْبِتْنَا بِعَذَابِ الْكَيْمِ (الانفال ۳۲) اس پر ان سے کہا جاتا ہے کہ جس دلیل فتح و کامرانی کے تم طالب تھے وہ تو آگئی، اب اپنی آنکھیں کھولو، اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے سے باز آ جاؤ تو بہتر ہے، ورنہ اگر باوجود اظہار حجت اور وضوح حق پھر بھی اس کی مخالفت ترک نہ کی اور اس کی فاسامانی کی فکر میں رہے تو ہم بھی تمہیں تباہ و برباد کرنے سے دریغ نہ کریں گے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہمیں انداز حرب دیکر تمہارا گروہ خواہ کتنا ہی کثیر التعداد کیوں نہ ہو غالب نہیں ہو سکتا: ان کید الشیطن کان ضعیفا اور ہم دائمی طور پر ارباب ایمان ہی کو کامیاب و شاد کام کیا کرتے ہیں، ان حزب اللہ ہم المفلحون اور ان جند بنالہم الغلبون اور کتب اللہ لا غلبینا وادرسلی اور ان اللہ لمع المومنین اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔



## اولی الامر کی اطاعت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَاتَّبَعْتُمْ تَسَعُفُونَ ﴿٥٦﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَبَعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٥٧﴾ إِنَّ سَعْيَ الدُّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ﴿٥٩﴾ وَلَوْ سَمِعْتُمْ لَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٦٠﴾

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے نہ پھر و حالانکہ تم سنتے ہو اور ان جیسے نہ بنو جنہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ سنتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک تمام جان داروں میں بدتر وہی بہرے گوئیں ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو ان کو سنا تا اور اگر انکو اب سنا دے تو ضرور بے رخی کرتے ہوئے روگردانی کریں۔“

اللہ تعالیٰ نے کفار کو ذلیل و رسوا کر کے مسلمانوں کو آئندہ نصرت کا وعدہ دیا، مگر اس کے لئے چند شرطیں لگادیں:

(الف) اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم مانیں۔ آپ کے بعد جس نفس قدسی کے ہاتھ میں مسلمانوں کی عنان سیاست ہو جو ملک کے نظم و نسق اور امن و سلامتی کا ذمہ دار و کفیل ہو اور جسکے ہاتھ میں فوجوں کی باگ ہو اسکی پوری اطاعت کریں۔

(ب) حکم ملنے پر روگردانی نہ کریں اور اس کے لئے یہودیوں کی مثال پیش کی جو کتاب الہی کو اول سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں مگر عمل کرنے کا نام تک نہیں لیتے اور اس لئے سبعنا و عصینا کے ترمذ کا پورا مصداق ہیں۔

قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ علمی اور عملی دونوں قوتوں کی تربیت ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام ان دونوں چیزوں سے حصہ وافر رکھتے تھے، ان کی نسبت یہ جملہ ثابت ہے کہ فتعلینا القرآن والعمل جیسا۔ زبان سے تو ہر کس و ناکس عقائد و یقینات اسلامیہ حب، مذہبی اور ولولہ دینی کا اظہار کرنے کو تیار ہے مگر اس کے اعمال حیات ہی اس دعویٰ کی بہترین شہادت ہو سکتے ہیں، اس لئے صحابہ کرام کفر و اسلام میں مابہ الامتیاز صرف نماز کو خیال کرتے تھے، پھر ان سے بدترین اور کون ہو سکتے ہیں جو اول تو اس تعلیم صحیح میں غور ہی نہیں کرتے اور اگر درس و فکر اور بحث و نظر کے بعد ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوں تو ان کے دور کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت قرآن نے کہا: لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أذانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّ هُمْ أَصْلٌ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف ۱۷۹)، یہی الاعی، شہا البریہ، اصحاب النار اور اولیاء الشیطن ہیں۔ خدا کے دائمی قانون اور نوا میں فطرت کے بموجب ان کی فاسقانہ زندگی کی وجہ سے ان کے دل پر موت و ہلاکت طاری ہو گئی ہے، ان کا ضمیر بالکل مردہ ہو گیا ہے، ان کی فطرت صالحہ کا آئینہ گرد آلود اور مکدر ہو گیا ہے اور علم الہی میں ان کی تباہی و بربادی ایک فیصل شدہ امر ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی انتہائی شفقت و رحمت کی وجہ سے ان بد نعتان نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی جان عزیز تک قربان کرنے کو تیار ہیں مگر انہیں توجہ تک نہیں ہوتی۔

## جہاد ہی میں زندگی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٥﴾ وَاتَّقُوا فَتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمْتُمْ مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٦﴾

”مسلمانو! جب اللہ اور اس کا رسول تم کو ایسے کام کی دعوت دے جس میں تمہاری زندگی ہے تو اس کا حکم بجالاؤ اور جان لو کہ آدمی اور اس کے دل میں اللہ آڑ بن جاتا ہے اور یہ بھی جان لو کہ تم اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے اور تم اس بلا سے ڈرتے رہو جو خاص کر تم میں سے ظالموں ہی پر نہ پڑے گی اور جان لو کہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔“

دنیا میں تنازع للبقاء کے اصول کے مطابق ہر چیز جنگ میں مصروف ہے مگر زندگی صرف اسی کو نوازش ہوگی جو اصل واصل ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جس وقت اللہ اور اس کا رسول مسلمانوں کو جہاد کا حکم دے تو فوراً امید ان میں آمو جو ہوں کہ انفرادی و اجتماعی حیات کا راز سربستہ اسی جہاد فی سبیل اللہ میں پنہاں ہے، یہی چیز تم کو دائمی زندگی بخشنے گی۔ اس لئے جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ ای الناس افضل تو آپ نے جواب دیا: مومن یجاہد فی سبیل اللہ بنفسہ و مالہ، ایک جگہ ارشاد فرمایا: لئلا تغدو فی سبیل اللہ او روحہ خیر من الدنیا وما فیہا، ترمذی میں ہے: من رابط لیلة کانت لہ کالف لیلة صیامہا و قیامہا۔ لیکن اگر جہاد کا ارادہ بھی نہ کیا تو ان مصائب کا شکار ہونا پڑے گا:

(الف)۔ رسول کی تعلیم کا ایک ایک حرف تمہارے لئے زندگی بخش ہے اسکی خلاف ورزی سے تمہاری قوت ارادی کمزور ہو جائے گی، تم مضبوط و ثابت قدم نہ رہ سکو گے، ارادہ کرتے ہی فسخ کر دیا کرو گے اور لعناہم و جعلنا قلوبہم قاسیہ کی کیفیت تم پر طاری ہوگی۔

(ب)۔ اعمال انسانی کی حالت مختلف ہے۔ بعض اوقات اس کے اعمال کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے اس لئے صرف مجرم ہی گرفتار ہوتا ہے اور کبھی ان کا اثر قوم پر بھی پڑتا ہے پھر سب کے سب مبتلائے آلام و مصائب ہوتے ہیں۔ اگر تم نے جہاد سے انکار کیا تو یاد رہے صرف انکار کرنے والے ہی گرفتار مصیبت نہ ہوں گے بلکہ پوری قوم کی قوم دوسروں کی غلام بن جائے گی۔ حدیث میں آتا ہیں: اذا ضن الناس بالدينار والدرهم وتبايعوا بالعين واتبعوا اذناب البقر وترکوا الجہاد فی سبیل اللہ انزل اللہ بہم بلاء فلم یرفعہ حقیر اجمعوا اور یہی وجہ ہے کہ اس شخص کو منافق کہا گیا جو جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو ہی کو دل سے نکال دے: من مات ولم یغزو ولم یحدث نفسه به مات علی شعبة من النفاق۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہایت ہی سخت ہے اس لئے سوچ سمجھ کر مخالفت کریں۔

قلت تعدا کا عذر

وَإِذْ كُنْتُمْ أَذْنًا قَلِيلًا مُّسْتَعْصِفُونَ فِي الْأَرْضِ تُخَافُونَ أَنَّ يُتَخَفَّكُمْ النَّاسُ فَأُولَئِكَ يَنْصَرُّوكُمْ وَرَبُّكُمْ مِنَ الظَّالِمِينَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٧﴾

”اور یاد کرو جب تم زمین میں تھوڑے سے کمزور تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اچک لے جائیں پس اللہ نے تم کو جگہ دی اور تم کو اپنی مدد سے زور دیا اور تم کو ستھری چیزوں کی روزی دی تاکہ تم احسان مانو۔“

اگر تم کہو کہ خلیفہ اسلام کا حکم جہاد تو سر آنکھوں پر مگر تعداد کی قلت اور سامان حرب کے فقدان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت لڑنا خلاف مصلحت ہے تو یہ عذر بھی مسموع نہیں۔ اس لئے کہ تم مکہ کی حالت پر غور کرو جب مسلمانوں کی تعداد اقل قلیل تھی، ہر شخص تم کو کمزور و ناتواں خیال کرتا تھا اور خود تمہیں بھی ہر وقت اس امر کا خوف دامن گیر تھا کہ کہیں دشمن ہم کو فنانہ کر دے مگر باوجود ان باتوں کے اللہ نے تم کو پناہ دی، اپنی نصرت و دستگیری سے تائید کی اور بہترین چیزیں کھانے کو نوازش کیں اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ تم آئندہ چل کر قلت تعداد اور فقدان اسباب کا عذر پیش کر کے جہاد فی سبیل اللہ سے منہ نہ موڑ لو۔ جنگ میں کامیابی کے لئے قلت و کثرت پر نظر نہ ہونی چاہئے۔ حنین کی لڑائی میں تمہیں اپنی کثرت تعداد پر ناز تھا مگر شکست کھائی: **وَإِذْ مَرَّ حُنَيْنٌ إِذْ أَعْبَدْتُمْ كُفْرًا فَمَا تَعْلَمُونَ ۚ أَتُحِبُّونَ شَيْئًا وَصَافَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِئْسَ رَحْبٌ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ** (التوبہ ۲۵)۔ مدینہ کی زندگی پر نظر ڈالو۔ ابو ہریرہؓ کے پیٹ میں بھوک کے مارے بل پڑے جاتے ہیں اور کئی دفعہ غشی کی نوبت آتی ہے۔ پھر یہ وہی ابو ہریرہؓ ہیں جو دیوار کعبہ کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے کسریٰ کے رومال سے ناک صاف کرتے ہیں اور عدی بن حاتم قیصر و سکریٰ کے خزانے کو اپنے پاؤں سے ٹھکراتے ہیں۔

### فرض منصبی کی حفاظت

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْلِئِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۖ وَأَعْلَمُوا أَنْتُمْ أَمْوَالَكُمْ وَأَوْلَادَكُمْ فَتَنَتُهُ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ** (الانفال ۷۲ تا ۷۴)۔

”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت مت کرو اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد بس امتحان گاہ ہیں اور یہ بھی جان لو کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہیں۔“

اللہ اور اس کے رسول نے جو فرائض تمہارے ہے مقرر کر دیے ہیں ان کے ادا کرنے میں کبھی بددیانتی نہ کرو بلکہ انہیں نیک نیتی اور خلوص سے ادا کرو اور خود مسلمانوں کی عام جماعت نے بھی جو مناصب جلیلہ تمہارے سپرد کئے ہیں ان میں بھی خیانت سے کام نہ لینا۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری استعداد و قابلیت دیکھ کر یہ فرض جلیل تمہارے متعلق کر دیا گیا ہے اس لئے خیانت تمہاری شان سے بہت ہی گری ہوئی بات ہے۔

اس وقت تمہارے سامنے دو فرائض ہیں۔ ایک وہ کام ہے جو قوم کی جانب سے تمہارے سپرد کیا گیا ہے، اگر اس کی جانب توجہ کرتے ہو تو تمہارے مال و اولاد کو نقصان پہنچتا ہے اور مال و اولاد کی حفظ و نگہداشت سے ملک و ملت کی فنا ہونے کا اندیشہ ہے، اس کشمکش میں تمہارے جذبہ اسلام پرستی اور ولولہ دینی کا امتحان ہو گا۔ یہ مال و اولاد دراصل تمہارے لئے امتحان گاہ ہیں، اگر تم نے ملک و ملت کی خاطر ان کو قربان کر دیا تو دنیا و آخرت میں تمہیں بہترین جزا ملے گی، ان کی ضروریات بھی

خود بخود سہولت و آسانی سے پوری ہو جائیں گی۔ ابراہیم علیہ السلام نے وطن، قوم، اپنی جان عزیز اور خود اولاد کو توحید پر قربان کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ مال و اولاد کا ترک کرنا کوئی نیکی نہیں: لا رِہْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ بَلْکَ اِنْ دُوْنُوْکَ کَاھُوْنَ اَضْرُوْرِیْ ہِے کہ آزمائش پوری ہو۔ ایک جگہ فرمایا: اِنِّہَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِیْمَنْعُکُمْ ۗ وَاللّٰہُ عِنْدَکَ اَخْبَرُ الْعَظِیْمِ (التغابن ۱۵) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَبَلَّوْکُمْ بِالْسَّيْرِ ۚ وَالْخَبَرِ فِیْمَنْعُکُمْ (الانبیاء ۳۵) اسی لئے سورہ منافقون کے آخر میں آیا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تِلْہِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ۚ وَمَنْ یَفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (المنفقون ۹)

### تقویٰ اللہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکْفِرْ عَنْکُمْ سَبِیۡتَکُمْ ۚ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ۚ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۹﴾

”اے ایمان والو! اگر اللہ سے ڈرتے رہو گے تو تمہارے لئے ایک امتیاز کر دے گا اور تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔“

اگر تم نے قانون الہی کی پابندی کی اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیا تو حسب ذیل نتائج رونما ہوں گے:

(الف) فرقان کی قوت نوازش ہوگی جس سے تم نیک و بد، غث و سمین، اچھے اور برے، دوست اور دشمن اور حق و باطل میں تمیز کر سکو گے۔ جنگ میں اس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے تاکہ دشمن کا مکرو فریب کامیابی نہ ہو سکے۔

(ب) ہر کام کرنے والے سے ضرور کچھ نہ کچھ فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں، ان کا جبر و نقصان محض تائید الہی پر موقوف ہے جس کو یہاں بتایا گیا ہے کہ تمہاری غلطیاں تمہاری راہ ترقی میں رکاوٹ کا باعث نہ بنیں گی۔

دوسری جگہ اس وعدہ کا ان الفاظ میں اعادہ کیا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ ۚ وَامِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کَفٰلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ ۚ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ ۚ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ۚ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰﴾ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَہْلُ الْکِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰہِ ۚ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۱﴾ (الحدید ۲۷-۲۸)۔

### دارالندوہ میں مشورہ

وَ اٰذِیْنٰکُمْ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاَلِیْہِمْ شُرَکَآؤُکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ ۚ وَیَمْنُکُمْ وُوْنَ وِیۡنَکُمْ اللّٰہُ ۚ وَاللّٰہُ خَبِیْرُ الْبَکْرِیۡنِ ﴿۱۲﴾

”اور جب کافر تم پر داؤ چلانا چاہتے تھے تاکہ تم کو قید کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا نکال دیں اور وہ داؤ کر رہے تھے اور اللہ بھی داؤ کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر والا ہے۔“

اس آیت میں کئی زندگی کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کفار قریش نے دیکھا کہ مدینہ کے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو انہوں نے دارالندوہ میں ایک مجلس شوری قائم کی، اس

میں قریش کے تمام بڑے بڑے سرداروں نے شرکت کی، جن میں ابوسفیان، حکیم بن حزام اور ابو جہل بن ہشام بھی تھے، بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد بن عبد اللہ کو ایک مکان میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ بھی ”زہیر“ و ”نافہ“ کی طرح مر جائے، مگر اس رائے کو اس خیال سے مسترد کر دیا گیا کہ ان کے خاندان کے لوگ بدلہ لینے کو تیار ہو جائیں گے، کسی نے کہا کہ اس کو کسی سرکش اونٹ پر بٹھا کر یہاں سے نکال دو، ہماری طرف سے کہیں جائے کہیں رہے، جسے خواہ مرے، اس پر کسی نے جواب دیا کہ پھر یہ دوسروں کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کر دے گا، اس لئے جلا وطنی بھی مناسب نہیں۔

آخر ابو جہل بن ہشام نے کہا کہ عرب کے ہر ایک مشہور قبیلہ سے ایک ایک جو انمرد کا انتخاب کر کے رات کی تاریکی میں ان کے مکان کو گھیر لیا جائے، جب صبح کو وہ نماز کے لئے نکلیں تو سب بہادر اپنی اپنی تلوار سے ان پر وار کریں اور ان کی بوٹی بوٹی کر دیں۔ اس تدبیر کو سب نے بالاتفاق منظور کر لیا، کیونکہ اس صورت میں نہ تو ان کے قبیلہ کو بدلہ لینے کی طاقت ہوگی اور نہ ان کو سچا جاننے والے کچھ شر و فساد اٹھا سکے گے۔

یہ تو انسانی تدبیر تھی۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کی معرفت رسول اللہ ﷺ کو ان تمام باتوں کی اطلاع کر دی، آپ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا اور خود ابو بکر کو ساتھ لے کر غار ثور میں پہنچ گئے، کفار نے غارتک تعاقب کیا مگر ناکام و خاسر واپس لوٹے۔ دوسری جگہ اس تدبیر کا ان الفاظ میں ذکر کیا: وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا يَلْبِثُونَ خَلْقَكَ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل ۷۶) جب دشمنان دین کی یہ کیفیت ہے، انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تو ان سے دوستی کی کیا توقع ہو سکتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں استقلال و ثبات قدم کی صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ قانون الہی کی پابندی کی جائے۔ اسی پابندی کا یہ نتیجہ تھا کہ کفار کی ہر تدبیر ناکام رہی اور خدا کی بات پوری ہو کر رہی۔

وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آلِيْنَا قَالُوا قَدْ سَبَعْنَا نَوْنَشَاءُ نَعْلَنَّا وَمِثْلَ هَذَا ۖ إِنَّ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝

”اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس جیسا کہہ لیں، بس تو یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔“

ان لوگوں کو نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ بغض و عداوت ہے بلکہ اس تعلیم صحیح کو بھی مٹانے کی فکر میں ہیں جو قرآن ان کے لئے زندگی بخش ہے۔ اس کی نسبت ان کی رائے یہ ہے کہ ہم بھی اس طرح کہہ سکتے ہیں۔ قرآن حکیم میں گزشتہ امتوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے مقصد یہ ہے کہ انسان عبرت اندر روز ہو اور ان سے استہداد و استدلال کا کام لے، مگر یہ لوگ ان میں درس و فکر سے کام نہیں لیتے، اس لئے کہتے ہیں کہ: إِنَّ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۖ قَالُوا: آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۖ اُنْكُتِبَتْهَا فِيْهِ تَمَثَّلُ عَلَيْهِ بَكْرَةً ۚ وَاصْبِلَا ۖ قُلْ اَنْتَ لَمْ يَخْلَعْ السَّيْرَتِي السُّلُوتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّكَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيْمًا (الفرقان ۶۳۵)۔

## قانون تعذیب

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنَّ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٠﴾  
وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣١﴾

”جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ! اگر یہی دین تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر دردناک عذاب لے آ اور اللہ ان کو عذاب نہ دیتا جب تک تم ان میں تھے اور اللہ انکو عذاب نہ دے گا جب تک وہ استغفار کرتے ہیں۔“

بعض لوگ اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر حق کی مخالفت کے باوجود گرفتار عذاب نہیں ہوتے تو انہیں اپنی راستی کا اور یقین ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اگر یہ تعلیم درست ہے جس کی ہم مخالفت کرتے ہیں تو ہم کیوں نہیں ماخوذ ہوتے؟ اصل بات یہ ہے کہ انہیں قانون تعذیب کا علم نہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ عذاب کن اسباب و مراتب کے بعد نازل ہوا کرتا ہے: وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْضَةٌ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (العنکبوت ۵۳)۔ ایک جگہ آتا ہیں: وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَانًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (ص ۱۶) شعیب علیہ السلام کی قوم بھی اسی غلطی کا شکار ہو رہی تھی جب وہ عذاب کی دعا مانگ رہی تھی: فَاسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (الشعر ۱۸)۔

اس آیت نے بتا دیا کہ عذاب کی تاخیر کے اسباب حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ رسول اللہ ﷺ ایک عظیم الشان نبی، اللہ کے آخری رسول اور رحمۃ للعالمین ہیں، اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا ہے آپ کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے خود کفار کا غلط معیار بھی پیش نظر رکھ لیا جاتا ہے اگرچہ اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو اور یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ عام مخالفین آپ کی صداقت اور راستی سے واقف ہو جائیں۔ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک آپ کی سچائی صرف اسی صورت میں تسلیم کی جاسکتی تھی جب آپ کشتی میں اس کو گرا دیں، ظاہر ہے کہ یہ کوئی صحیح معیار نہ تھا مگر آپ نے بقاضائے شفقت و رحمت اس کو بھی قبول کیا اور ان کو کشتی میں گرا دیا، اسی بنا پر وہ مشرف باسلام ہوئے۔ پس جب تک کفار کے دل میں اس شبہ کے باقی رہنے کی گنجائش تھی کہ

شاید وہی حق پر ہوں اور یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو، اس لئے اس وقت تک عذاب نازل نہیں ہوا۔

(ب)۔ جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیاد رکھی تو انہوں نے دعا کی تھی کہ اس کو امن کا شہر بنانا: إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا (البقرہ ۱۲۶) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف اجابت بخشا اور اس کو ہمیشہ کے لئے امن کا گھر بنادیا: إِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا (البقرہ ۱۲۵) اب اگر ان کفار کی درخواست پر عذاب کر دیا جائے تو دعائے خلیل کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، اس لئے عذاب میں تاخیر ضروری ہے تاکہ وعدہ الہی پورا ہو کر رہے۔

(ج)۔ خود رسول اللہ ﷺ کا قیام مکہ بھی ایک مستقل سبب ہے۔ ترمذی میں ہیں:

انزل علی امانین لامتی وما کان اللہ ليعذبہم وانت فہیم وماکان اللہ معذبہم وہم یستغفرون فاذا مضیت ترکک فیہم الاستغفار الی یوم القیۃ۔

”آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لئے دو چیزیں عذاب الہی سے بچنے کے لئے نازل کی گئی ہیں میرا وجود اور استغفار، میرے بعد صرف طلب مغفرت ہی نجات کا باعث بن سکتی ہے۔“

(د)۔ عذاب کے نزول سے قبل خبیث و طیب کا امتیاز ضروری ہے، پس جب تک یہ دونوں جماعتیں مخلوط ہیں عذاب نہیں نازل ہو گا۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا: لِيَبَيِّنَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ فَيَرْكَبَهُ جَبِينًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ (انفال ۷۳)۔

(ہ)۔ بعض لوگ استغفار بھی کرتے ہیں، اس لئے عذاب الہی موخر ہو گا، جیسا کہ ترمذی کی حدیث تم ابھی پڑھ آئے ہو۔

### بیت اللہ کے وارث

وَمَا لَهُمْ آلَا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۖ إِنْ أَوْلِيَاءُكَ إِلَّا الْمُشْكُونَ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٧﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٨﴾

”اور اب ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے اور وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس کے متولی نہیں بس اس کے متولی تو پرہیزگار ہی ہیں لیکن ان میں اکثر لوگ خبر نہیں رکھتے اور خانہ کعبہ کے پاس سٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا ان کی نماز ہی کیا تھی تو اس کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو جو تم کرتے تھے۔“

جب کفار قریش کی یہ حالت ہو گئی کہ مسجد حرام میں آنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور وہ تمام رکاوٹیں بھی دور ہو گئیں جو عذاب الہی کی روک کا باعث بن رہی تھیں تو ان پر عذاب کیوں نہ نازل ہو گا، یہ لوگ لاکھ اپنی تولیت اور وراثت کے دعاوی پیش کریں مگر ان حرکات کی وجہ سے ان کے تمام حقوق باطل ہو گئے، بیت اللہ کے وارث تو صرف ارباب صلاح و تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس آیت میں پیشین گوئی کے طور پر فرمادیا کہ کفار قریش عنقریب اس وراثت سے محروم کر دیے جائیں گے اور فرزند ان اسلام ان کی جگہ لیں گے۔ سورہ توبہ میں اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا: مَا كَانَ لِلْمُشْكِرِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿٦٩﴾ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ (التوبہ ۱۸۲)۔

قریش کا یہ دعویٰ تو ضرور ہے کہ وہ ملت ابراہیمی کے پابند ہیں مگر ان کے اعمال اس کے بخط مستقیم مخالف ہیں۔ حج بیت اللہ کو جاتے ہیں تو وہاں جا کر سٹیاں اور تالیاں بجانا ان کا کام ہے، بھلا ایسے لوگ اس گھر کے وارث بن سکتے ہیں، اب تو انہیں اپنی کفر و باطل پر ستارہ سعی و کوشش کے عواقب المیہ بھگتنا پڑیں گے۔



إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٨﴾ لِيَبْذِرَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكَبَهُ جَبِينًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩﴾ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَآ قَدْ سَلَفَ ۚ وَإِنْ يُعْودُوا فَأَقْعَدْ مَضَّتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٠﴾

”بیشک جو کافر ہیں وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ سے روکیں، تو وہ خرچ کرتے رہیں گے پھر انجام کار وہ ان کے لئے موجب حسرت ہو گا اور آخر وہ مغلوب ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ سب جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھے پھر ان سب کا ڈھیر بنائے پھر اس کو جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ نقصان والے ہیں۔ کافروں سے کہہ دو کہ اگر باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا معاف کر دیا جائے اور اگر پھر وہی کریں گے تو اگلے لوگوں کی روش پڑ چکی ہے۔“

کفار اپنا تمام مال و متاع اور ہر قسم کی سعی و کوشش لوگوں کو بیت اللہ الحرام میں آنے سے روکنے اور مسلمانوں کو دوسروں کا غلام بنانے میں صرف کر رہے ہیں، یہ ایسا ہی کرتے رہیں گے، انجام کار باطل فنا ہو جائے گا اور چاروں طرف حق کی فرمانروائی ہوگی، اس وقت مخالفین حسرت و ندامت کے مارے پانی پانی ہو جائیں گے کہ خرچ بھی کیا اور ذلیل و رسوا بھی ہوئے۔ یہ تو دنیا کی تکلیف و مصیبت ہے، مرنے کے بعد ان سب کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ لیکن اسلام کے غلبہ و اقتدار سے قبل ضروری تھا کہ خبیث اور طیب میں فرق و امتیاز کیا جائے تاکہ دونوں کی صفیں جدا گانہ نظر آنے لگیں، مخالفین اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر لیں اور پھر سب کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ اب بھی اگر یہ لوگ باز آجائیں تو بہتر، ورنہ تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لیں، جن قوموں نے ہماری مخالفت کی ہے وہ کس طرح تباہ و برباد ہو گئیں، وکان حقاعلینا نصر المومنین اور کتب اللہ لا غلبین انا ورسلی اور ان حزب اللہ ہم المفلحون اور والعاقبۃ للبتقین اسی سنت اللہ کو بیان کرتی ہیں۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ یہی تذکیر بایام اللہ ہے اور اسی لئے بار بار کہا گیا: سَيَذَرُ الْاَرْضَ فَاتَّخِذُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (النمل ۶۹)، پس اگر اپنی فلاح و کامرانی کے طالب ہو تو اسلام کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔

ہمیشہ جنگ کرتے رہو

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١﴾ وَإِن تَوَلَّوْا فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ ۖ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿١٢﴾

”اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سب دین اللہ کا ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اگر سرتابی کریں تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے، کیا اچھا حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار۔“  
گزشتہ رکوع میں بتایا گیا کہ اس قسم کے لوگ مسلمانوں کو تباہ کرنے کی فکر میں رہیں گے۔ ان کے مقابلہ میں ارباب



اخلاص و توحید کی ضرور مدد ہوگی۔ لیکن اس نصرت و اعانت کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اس قرآن کو اپنا دستور العمل بنالیں جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اور کفار کے ساتھ برابر جنگ کرتے رہیں۔ دنیا میں نور اور ظلمت و حق اور باطل، اسلام اور کفر کے سلاسل مختلفہ ہمیشہ رہیں گے، دونوں ایک دوسرے کو فنا کرنے کی کوشش کریں گے، کفر و باطل پرستی کے ہوتے ہوئے دنیا میں امن و سلامتی کا قیام ناممکن ہے، پس اگر چاہتے ہو کہ کرۂ ارضی امن و ایان کا گہوارہ بن جائے تو دائمی طور پر جنگ کے لئے تیار ہو یہاں تک کہ قانون الہی رائج و نافذ ہو، کوئی انسانی طاقت اس کی تصحیح و تنقیص نہ کر سکے، فتنہ فرو ہو جائے، چاروں طرف اسلام کی حکومت ہو اور جملہ مذاہب و اقوام اس کے ماتحت امن کی زندگی بسر کریں۔ اسی کو کہا گیا: حق تضرع الحرب اوزارہا یعنی جب تک دنیا میں جنگ کی صورت باقی ہے مسلمان اس کے لئے تیار رہیں گے، یہی حق لا تكون فتنة ویكون الدين لله ہے، اسی کی نسبت حدیث میں آیا: امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فاذا قالوها عصوا مني دماءهم واموالهم الا بحقها وحسابهم على الله جب ایک شخص نے دربار رسالت میں سوال کیا کہ: رجل یقاتل شجاعة ویقاتل حمية ویقاتل رياء، ان میں سے کونسا شخص اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا ہے، تو آپ نے فرمایا: من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله تو اس سے بھی یہی مراد ہے۔ اسامہ بن زید نے ایک ایسے شخص کو مار ڈالا جس نے لا اله الا الله کہہ دیا تھا، اس کی اطلاع جب آپ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا: اقتلته بعد ما قال لا اله الا الله فكيف تصنع بلا اله الا الله يوم القيامة، اسامہ نے عرض کیا کہ اس نے جان بچانے کی خاطر ایسا کیا تھا، آپ نے کہا: هلا شققت عن قلبه ”تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا“، آپ بار بار یہی فرماتے تھے کہ قیامت کے روز تم اس کلمہ توحید کا کیا جواب دو گے یہاں تک کہ حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ کاش میں اس روز سے قبل تک مسلمان ہی نہ ہوتا: تَبَيَّنْتُ لَئِي لَمْ أَكُنْ أَسَلِّتُ إِلَّا يَوْمَئِذٍ، تو اس سے بھی یہی بتانا تھا، اس لئے فرمایا: تَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبہ ۲۹) اس لئے کہ یہ فتنہ و فساد کے بانی ہیں اور الفتنة اشد من القتل ”بد نظمی قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں ہے“۔ پس ان لوگوں کا گرفتار کرنا ضروری و لازمی ہے۔

اسلام دنیا میں خون بہانے اور انسان کو ذبح کرنے کے لئے نہیں آیا، اس کا مقصد اصلی قانون الہی کی نشر و اشاعت اور امن و سلامتی کا قیام ہے، اس لئے جس وقت بھی کفار اسلام کی مخالفت ترک کر دیں، صحیح تعلیم دنیا میں رائج ہو جائے اور شہنشاہی قانون کے درجہ پر قرآن کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر تلوار کو نیام میں کر لیا جائے گا، اس کے بعد وہ جو کچھ کریں گے اللہ کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا، لیکن اگر انہوں نے سرتابی کی تو تمہاری ولایت و نصرت کے لئے اللہ کافی ہے، وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا، پس صرف اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی غایت الغایات اور مقصد حیات بنالو اور مال غنیمت کی پروا نہ کرو۔

## تقسیم غنائم

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُصْمَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ إِن كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَتَوْنَا عَلَىٰ عَهْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّفَقُّى الْجَبْعِينَ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٩﴾

”اور جان رکھو کہ جو کچھ تم لوٹ کر لاؤ تو اللہ اور رسول اور قربت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا اس میں سے پانچواں حصہ ہے اگر تم اللہ پر اور اس غیبی مدد پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن نازل کی جس روز دو لشکر مل گئے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔“

یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد امن و سلامتی کا قیام اور قانون الہی کی نشر و توزیع ہے یعنی یہ بتا دیا کہ جب ایک مسلمان اس فرض اہم کی خاطر گھر سے نکلے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد جمع مال نہیں ہو سکتا، البتہ اگر کچھ ہاتھ آجائے تو اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ اس کا پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کی نذر ہو گا جو اس کو اپنے اہل و عیال، عزیز و قریب، یتامیٰ و مساکین اور مسافروں پر صرف کر دیں گے۔ ذوی القربیٰ میں صرف بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب شامل ہیں کیونکہ ان لوگوں نے زمانہ کفر میں بھی آپ کی ہر طرح حمایت کی۔ یہ ضروری نہ ہو گا کہ ان پانچوں مصارف میں مال برابر تقسیم کیا جائے، بلکہ امام ضرورت کو دیکھے گا، حضرت عمر کے زمانہ میں ذوی القربیٰ نے دولت مند ہونے کی وجہ سے اس مال کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔

جنگ بدر کو یوم الفرقان سے تعبیر کیا گیا اس لئے کہ اس روز کفار کو سخت ترین ہزیمت نصیب ہوئی، کفر و بطلان کا جھنڈا اگر گیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ مسلمان بھی زندہ رہنے کی قابلیت رکھتے ہیں، ادھر حق و باطل میں تمیز ہو گئی۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدُوِّ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدُوِّ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۖ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۖ وَلَكِنَّ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۚ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَبِيْعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾

”جب تم اس سرے پر تھے اور کافر پر لے سرے پر اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو ضرور وعدہ میں اختلاف کرتے، لیکن تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جسے اسکو کرنا تھا تاکہ جو مرتا ہے سمجھ بوجھ کر مرے

اور جو زندہ رہتا ہے سوچ کر زندہ رہے اور بیشک اللہ سنا جانتا ہے۔“

معمر کے بدر میں جس قدر کامیابی ہوئی وہ محض فضل و احسان خداوندی کا نتیجہ تھی۔ ورنہ واقعات تو یہ تھے کہ مدینہ کے اس طرف لشکر اسلام خیمہ زن تھا اور دوسری جانب لشکر کفار، پانی بھی اسی طرف تھا، پھر جس قافلہ کی تلاش میں مسلمان نکلے تھے وہ بھی سمندر کے کنارہ اس میدان سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، ان حالات کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غزوہ بدر کی کامیابی کسی کی قوت بازو کی طرف منسوب کی جائے۔ فرض کیجئے کہ یہ لوگ آپس میں خط و کتابت کر کے

لڑائی کی ایک تاریخ معین کر لیتے، پھر بھی بالکل ممکن تھا کہ مسلمان اپنی بے سروسامانی کا خیال کر کے میدان جنگ میں نہ جاتے یا کفار ہی نہ آتے، مگر اللہ تعالیٰ تو کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ رسول ﷺ کے ہاتھوں اسی زندگی میں کافروں کی شان و شوکت کو مٹا دیا جائے اور اس کی نسبت قرآن حکیم نے اپنے نزول کی ابتدائی ایام میں خبر دے دی تھی:

وَلَنَذِيْقَنَّهٖم مِّنَ الْعَذَابِ الْاٰخِثِ الَّذِیْ دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهٖمْ یَرْجِعُوْنَ (السجدہ ۲۱) ایک جگہ فرمایا: کَذٰلِکَ الْعَذَابُ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ ۚ لَوْ کَاثُرًا یَّعْلَمُوْنَ (القلم ۳۳) تاکہ آج جو لوگ ہلاک ہوں وہ کتے کی موت نہ مریں، بلکہ اپنے تمام ارمان نکال کر مریں اور جو زندہ رہیں وہ عزت و احترام کی زندگی بسر کریں۔ اللہ تعالیٰ کو تو ہر ایک گروہ کی حالت معلوم ہے اور وہ سب کی دعاؤں کو سنتا ہے۔

### گدایانِ عشق

اِذْ یُنَادِیْکَہُمُ اللّٰہُ فِی مَآمِنَکَ قَلِیْلًا ۚ وَلَوْ اَرَادَکَہُمْ کَثِیْرًا لَّفَیْشَلَتْہُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاٰمْرِ وَلَیْکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ ۚ اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ السُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ یُنَادِیْکَہُمْ ۝ اِذْ التَّقِیْنُمْ فِیْ اَعِیْنِکُمْ قَلِیْلًا وَیَقْلِلْکُمْ فِیْ اَعِیْنِہُمْ لَیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۚ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

”جب اللہ نے تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑا دکھایا اور اگر وہ تمہیں بہت کر دکھاتا تو تم ضرور بزدل ہو جاتے اور کام میں جھگڑا کرتے، لیکن اللہ نے بچالیا، بیشک وہ دلوں کی باتوں کو جانتا ہے اور جب مد بھیڑ کے وقت تمہاری آنکھوں میں تم کو کافر تھوڑے دکھائے اور کافروں کی آنکھوں میں تم کو تھوڑا دکھایا، تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جس کو کرنا تھا اور اللہ ہی کی جانب تمام کام لوٹا جاتے ہیں۔“

ان آیات میں بھی یوم الفرقان کے بعض واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے کہ غزوہ بدر سے قبل رسول اللہ ﷺ نے خواب میں بدر کا واقعہ دیکھا کہ کفار کی تھوڑی سی تعداد ہمارے مقابلہ پر ہے، آپ نے اس خواب کی اطلاع صحابہ کو دی، اس میں شک نہیں کہ کفار کی تعداد حقیقت میں کہیں زیادہ تھی، مگر جنگ کی کامیابی کا دار و مدار اخلاق فاضلہ، صبر و استقامت اور ثبات قدم پر ہوتا ہے، اگر یہ ہیں تو کفار و منافقین کے عظیم الشان لشکر بھی حقیر و ذلیل دکھائی دیں گے، اور ایک صابر و مستقل مزاج فوج کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے ان دشمنانِ دین کو تھوڑی تعداد میں دیکھا اور اسی خواب کی وجہ سے مسلمانوں میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا ہو گیا اور یہی اللہ کا مقصد تھا۔

جب دونوں فوجیں میدان میں صف آرا ہوئیں تو اس وقت بھی یہی کیفیت تھی کہ مسلمان اپنی بلند حوصلگی، جرأت و جلاوت، اعتماد و توکل علی اللہ اور وعدہ نصرت کی وجہ سے کفار کی تعداد کو کم خیال کرتے تھے۔ ابن مسعود کہتے ہیں: لقد قللوا فی اعیننا یوم بدر حتی قلت لرجل الی جنبی نراہم سبعین قال لا بل ہم مائۃ حتی اخذنا رجلا منهم فسالنا ۛ قتال کنا

الفا، ”جنگ بدر میں یہ لوگ ہمیں بہت کم دکھائی دیتے تھے یہاں تک کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان کی تعداد ستر ہو گی اس نے کہا نہیں سوہوں گے یہاں تک کہ ہم نے ایک کافر کو گرفتار کیا جس نے بتایا کہ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔“ جس وقت امام احمد بن حنبل طرطوس پہنچے ہیں اور ابراہیم بن مصعب کو تو ان کے پاس گیا، تو وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بے خوف نہیں پایا: یومئذ مانحن فی عینہ الا کا مثال الذباب، ”ہم عمال حکومت ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وہ وقعت نہیں رکھتے تھے“ اور یہ بالکل حق ہے جن لوگوں کی نظروں میں جلال الہی سمایا ہو، وہ مٹی کے ان پتلوں کو کیا چیز سمجھتے ہیں جنہوں نے لوہا تیز کر کے کندھے پر ڈال رکھا ہے یا بہت سا چاندی سونا اپنے جسم پر لپیٹ لیا ہے، ان کو تو خود اقلیم عشق الہی کی سروری و شہنشاہی اور شہرستان صدق و صفا کا تاج و تخت حاصل ہے۔

میں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم

شہان بے کمر و خردان بے کلہ اند!

کفار کو اپنے لشکر کی کثرت اور آراستگی، سامان پر غرور و تکبر رہا، اس لئے وہ مسلمانوں کو حقیر و ذلیل ہی خیال کرتے رہے اور حقیقت میں ان کی تعداد بھی ان سے کئی گنا کم تھی۔ غزوہ بدر کے متعلق اسی قسم کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں بھی آتی ہے: قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَةٍ تَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يُوْثِقُونَهُمْ مِّثْلَهُمْ رَأَى الْعَيْنُ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ ۚ مَنْ يَشَاءُ (آل عمران ۱۳) اس میں اور سورۃ انفال کی آیت میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ اس میں ایک حقیقت ثابتہ کو بیان کیا جاتا ہے کہ کفار کو مسلمان اپنے سے دو چند دیکھتے تھے، مسلمانوں کی تعداد تو صرف ۳۱۳ تھی، کفار چھ سو آدمی تو میدان میں لائے تھے اور باقی کو پہاڑ کے پیچھے چھپا رکھا تھا کہ ضرورت کے وقت ان سے کام لیں گے، اس لئے مسلمانوں کا اپنے آپ سے ان کو دو گنا دیکھنا حقیقت پر مبنی تھا۔

جنگ بدر دراصل رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی نہایت ہی زبردست دلیل تھی، نہ صرف اس لئے کہ اس کی بنا پر وہ تمام پیشین گوئیاں ثابت ہو گئیں جو قرآن حکیم میں بیان کی گئی تھیں کہ کفار ذلیل ہوں گے اور وہ بھی ایک ایسے لشکر کے ہاتھوں جو تعداد اور سامان میں ان سے کم ہوگا، بلکہ اس لئے بھی کہ تورات و انجیل میں بھی اس جنگ کی خبر ملتی ہے اور وہ یہ ہے۔

”عرب کی بابت الہامی کلام۔ عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے اے دوانیوں کے قافلہ۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تپاکی سرزمین کے باشندو روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگتے ہیں، کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا، ہنوز ایک برس، ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا:“ (یسعیا ۲۱: ۲۱ تا ۱۷)

یہ لڑائی جس طرح کفار قریش کے لئے یوم الفرقان تھی ایسے ہی یہود و نصاریٰ کے لئے بھی ہی کیونکہ ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو انجام ان لوگوں کا ہوا ہے وہی ہمارا ہو گا: ”اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گریگا اسے پس ڈالے گا۔“ (متی ۱۲: ۴۴)

جھگڑا مت کرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۸﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۹﴾

”اے ایمان والو! جب تم کسی فوج سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم مراد پاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اس آیت میں فرمایا کہ ثابت قدمی کامیابی کی ذمہ دار و کفیل ہے اور چونکہ جنگ میں اکثر وحشت و بربریت کا ظہور ہوتا ہے اس لئے ذکر اللہ پر زور دیا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تقویٰ و طہارت کی وجہ سے تم ان ناشائستہ حرکات کے مرتکب نہ ہو گے جن کا عام طور پر میدان جنگ میں جوش و ہيجان کے وقت ارتکاب کیا جاتا ہے، تم میں ہمت اور جرأت پیدا ہوگی اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ہر چند پر خستہ دل و ناتواں شدم  
ہر گاہ کہ یاور وئے تو کردم جواں شدم!

حدیث میں آتا ہے: اثنتان لا یردان الدعائی عند النداء وعند الباس حیث یلحم بعضهم بعضاً، ”اذان اور لڑائی کے وقت ضرور دعا قبول ہوتی ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یلیہا الناس لا تتبنوا لقاء العدو واسألوا اللہ العافیة فاذا لقیتموہم فاصبروا واعلموا ان الجنة تحت ظلال السیوف، ”لوگو! دشمن سے جنگ کرنے کی تم اپنی طرف سے آرزو نہ کرو بلکہ اللہ سے خیر و عافیت کے طلبگار ہو مگر جس وقت مقابلہ ہو جائے تو صبر و استقامت سے کام لو اور یہ یقین کر لو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ملے گی۔“

اللہ نے جو قانون نازل کیا ہے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لو اور جس طریق پر رسول نے اس کی شرح و تفسیر کی ہے اس کو اپنا طریق کار اختیار کر لو اور آپس میں کبھی منازعت نہ کرو، کیونکہ جہاں تم نے اختلاف کیا تمہارا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا، دشمن تم کو حقیر و ناتواں خیال کرنے لگیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ضعیف و ناتواں انسانوں کا آپس میں متحد ہونا وہ اثر رکھتا ہے کہ عظیم الشان لشکر بھی اس کا نمونہ پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بار بار اتحاد و اجتماع پر زور دیا ہے، ایک جگہ فرمایا: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً

فَأَلَفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (ال عمران ۱۰۳) آگے چل کر بتایا کہ اختلاف و تفریق کی زندگی کو بقا و قیام نہیں: وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها (ال عمران ۱۰۳) خدا نے اتحاد کو اپنی ایک نعمت قرار دیا: لَوَ أَتَقَفَّتْ مَابِی الْأَرْضِ جَنَیْعًا مَّا أَفَلَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَئِنَّ اللَّهَ أَفَلَتْ بَيْنَهُمْ (الانفال ۶۳) اس لئے حدیث میں آیا: علیکم بالجماعة فان الشیطن مع الغدة هو من الاثنين ابعدا اور علیکم بالسواد الاعظم اور ید الله علی الجماعة۔ یہی اجتماع تھا جس نے عرب کو شتر بانی سے جہانبانی تک پہنچا دیا، نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا یہی مشاققا تھا کہ اجتماعی زندگی پیدا ہو، اسی حیات اجتماع کو مضبوط کرنے کے لئے زکوٰۃ فرض ہوئی: توخذ من اغنیائهم فترد علی فقرائهم حج بیت اللہ میں عرفات کے اجتماع پر زور دیا اور اسی اتحاد باہمی کو ان الفاظ میں بیان کیا: مثل المؤمنین فی توادهم وتعاطفهم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی۔

### اسباب ہزیمت

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

”اور ان جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کو نکلے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔“

جہاں مسلمانوں کو فتح و کامرانی کے مختلف اسباب و وسائل تعلیم دیے وہاں یہ بھی بتا دیا کہ میدان جنگ کو جاتے وقت فخر و تکبر، عجب و غرور اور نمود و شہرت سے پرہیز کرنا، کیونکہ یہی چیزیں شکست کا باعث بن جاتی ہیں، کفار مکہ کو دیکھو عظیم الشان لشکر لئے ہوئے آرہے ہیں مگر شکست کھاتے ہیں، اس لئے کہ وہ شہرت و ناموری اور غرور و تکبر کی خاطر گھروں سے نکلے تھے، جس وقت ابو جہل کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان قافلہ کو بچالے گیا ہے تو بعض نے اس سے کہا کہ اب مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں، مگر اس نے جواب دیا: لا والله لانرجع حتی نرد ماء بدر و تنح الجزور و نشرب الخبر و تعترف علينا القيان و تتحدث العرب ببكائنا فيها يو منا ابدا ”ہم ہرگز واپس نہ ہوں گے جب تک بدر پہنچ کر جانو رزق نہ کریں، شراب نہ پیئیں اور گانے والی عورتیں نہ گائیں تاکہ اہل عرب ہمیشہ کے لئے اس واقعہ کو یاد رکھیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بد کے روزیوں دعا کی تھی: اللہم ان قریشا قد اقبلت بفخرها و خيلائها لتجادل رسولک۔ مسلمانوں کے لشکر کی قرآن حکیم نے سب سے بڑی خصوصیت یہ بیان کی ہے: لا رفث ولا فسوق ولا جدال۔ اس کے علاوہ کفار میں ایک مرض یہ بھی تھا کہ وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے تھے اور انہوں نے مکہ کے دوران میں مسلمانوں پر بے انتہا مصیبتیں نازل کر رکھی تھیں، پھر ایسے لوگ کہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَ آتِ الْفَيْتَنِ نَكَصَ عَلَى عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”اور جب شیطان نے ان کے اعمال ان کو بھلے کر دکھائے اور یوں کہا کہ لوگوں میں سے آج کے دن تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں تو وہ اپنے اپنے لڑنے چلتا بنا اور کہا کہ مجھ کو تم سے کچھ سرور کار نہیں میں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ کی ماری بڑی سخت ہیں۔“

قریش جب بدر کے قریب پہنچے تو ان کو اطلاع ملی کہ قافلہ بچ گیا ہے، اس لئے واپس لوٹ جانا چاہئے مگر ابو جہل کی رائے یہی تھی کہ اس مرتبہ جنگ ہو کر رہے۔ اتفاق سے اس اختلاف رائے کے وقت شیطان بھی سراقہ بن مالک بن جعشم سردار بنو بکر کی صورت میں آمو جو ہوا، اس نے ان لوگوں کی ہمت بڑھائی ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا اور کہا کہ آج تم یقیناً کامیاب ہو کر رہو گے، مگر جب جنگ شروع ہوئی اور اس نے ملائکہ الرحمن کو دیکھا تو بھاگا، لوگوں نے اس کو روکا مگر اس نے جواب دیا کہ میں فرشتوں کو دیکھ رہا ہوں اور وہ تمہاری نظروں سے مخفی ہیں ان سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔

جب کفار کو شکست ہوئی اور یہ لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹے تو ان لوگوں نے سراقہ سے بد عہدی کی شکایت کی، اس نے کہا کہ میں تو اس روز یہاں سے کہیں نہیں گیا۔ اس لئے واقعہ یہی ہے کہ شیطان اس سردار کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ شیطان کے مواعید کا ذبہ پر کسے اعتماد ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ آتا ہیں: **يَعِدُهُمْ وَيُنَبِّئُهُمْ** وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (النساء: ۱۲۰) سورہ حشر میں فرمایا: **كَمْثِلِ الشَّيْطَانِ** اِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اُنْفِرْ ؕ فَلَبِثَا كَفَرًا ؕ قَالَ اِنِّیْ بِرِیِّ مِّنْكَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (الحشر: ۱۶) قیامت کے روز وہ اپنے احباب سے یوں خطاب کرے گا: اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقِّ وَعَدْتُكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیْ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاَسْتَجَبْتُمْ لِیْ ؕ فَلَا تَلُومُوْنِیْ وَلَوْ مَوَّا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَا اَنَا بِمُصْرِحِكُمْ وَمَا اَنْتُمْ بِمُصْرِحِیْ ؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَا اَشْكُرُكُمْ مِّنْ قَبْلِ (ابراہیم: ۲۲) پس ان آیات سے یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے اتفاق کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ قانون الہی کے پابند ہوں، رسول اللہ کے نقش قدم پر چلیں، وحدت مقصد ہو، استقامت اور ثبات قدم کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور نام و نمود اور عجب و غرور سے مجتنب رہیں۔

### ارباب نفاق

اِذْ يَقُولُ الْمُبَغِّضُونَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ عَرَّ هَؤُلَاءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَانِ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۵ وَكَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَكَّلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ اَلْبَلٰیكُمُ یَیْضُرِبُوْنَ ۙ وُجُوْهُهُمْ وَاَدْبَارُهُمْ ؕ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝۶ ذٰلِکَ بِمَا قَدْ مَتَّ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلٰمٍ لِّلْعٰبِدِیْنَ ۝۷

جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ ان کے دین نے ان کو تو مغرور کر دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے اور کاش تم دیکھو جب فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں ان کے منہ اور پٹھوں پر مارتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ جلنے والا عذاب چکھو، یہ اس کا بدلہ ہے جو تمہارے ہاتھوں نے بھیجا اور اس لئے کہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

شیطان کا اپنے دوستوں کو خوش کرنا وار اعمال فاسقہ کو ان کی نظروں میں اچھا کر دکھانا صرف کفار ہی کے ساتھ



مخصوص نہیں بلکہ منافقین مدینہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو کفر و نفاق کے امراض خبیثہ کا شکار ہیں۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کفار کے مقابلہ میں جارہی ہے تو کہنے لگے کہ: غرہو لاعدینہم، مسلمان اس خیال باطل میں مبتلا ہیں کہ صرف مذہب کی بنا پر ترقی کریں گے، مذہب اسلام کی پابندی سے انہیں ہر قسم کی کامیابی نصیب ہوگی اور اگر تمام دنیا بھی ان کے فنا کرنے کا فیصلہ کرے تو پھر بھی ناکام رہے گی۔ واقعہ بدر کی مثال ان منافقوں کے سامنے تھی اور ان کا خیال تھا کہ مسلمان غرور اور تکبر میں ایسا کر رہے ہیں جو ۳۱۳ کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ غرور اور تکبر کی بنا پر نہیں بلکہ اعتماد و توکل علی اللہ کا نتیجہ ہے جو ان میں اس قدر جوش و ولولہ پیدا ہو گیا ہے اور جو شخص بھی خدائے واحد پر بھروسہ کرے گا وہ اس کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ وہ عزیز و حکیم ہے، ضرور غالب کر کے رہے گا۔

پھر جو لوگ اس مرض کفر و نفاق کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں ان کے انجام پر نگاہ ڈالو، کس طرح مرنے کے وقت ان کو تکلیف و مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جنگ بدر میں جو کفار مرے ان کی حالت آپ کے سامنے ہے اور تمام دشمن دین کی عاقبت کار ایسی ہی ہو ا کرتی ہے اور موت کے فرشتے اسی طرح ان کی جان نکالتے ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ ۖ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ (الانعام ۹۳) اور یہ تمام تر سختی اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ حدیث میں آتا ہے:

ان الله تعالى يقول اني حرمت الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرما فلا تظلموا يا عبادي انما هي افعالكم احصوها لكم فمن وجه خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذلك فلا يلو من الانفسه۔

تذکیر بایام اللہ

كَذَابِ ۖ اِلٰ فِرْعَوْنَ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكْ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاَنَّ اللّٰهَ سَبِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ كَذَابِ ۖ اِلٰ فِرْعَوْنَ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَاَعْرَضْنَا اِلٰ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلًّا كَاْنُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝

”جیسے فرعون کی قوم اور ان لوگوں کی عادت تھی جو ان سے پہلے تھے کہ اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے تو ان کے گناہوں پر اللہ نے ان کو پکڑا بے شک اللہ قوت والا سخت عذاب کرنے والا ہے، یہ سب اس لئے ہے کہ اللہ ہر گز اس نعمت کو نہیں بدلتا جو کسی قوم کو دی ہو جب تک کہ وہ اپنا حال نہ بدل دیں، جیسے فرعون کی قوم اور ان لوگوں کی عادت تھی جو ان سے پہلے تھے کہ اپنے رب کی آیتیں جھٹلائیں تو ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر ہلاک کر دیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور وہ سب ظالم تھے۔“

قریش بیت اللہ کے مجاور تھے، جب تک انہوں نے ایک حق پرست جماعت کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی ان کو اس



عزت سے محروم نہیں کیا گیا۔ ان کی مثال فرعون کی قوم اور ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، انہوں نے آیات الہیہ کی تکذیب شروع کی تو مبتلائے عذاب ہوئے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم کو کوئی نعمت نوازش کرتا ہے تو اس میں کوئی رد و بدل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو بگاڑ نہ لے۔ اس تبدیلی کے ہوتے ہی خدا کے فرشتے اس قوم کی تباہی کے لئے مسلط کر دیئے جاتے ہیں: **إِنَّ اللَّهَ لَا يُعْطِي مَا يَقُومُ حَتَّىٰ يُعَذِّبُوا مَا بَالِغُ أَنْفُسِهِمْ** (الرعد ۱۱) چنانچہ دیکھ لو کہ جب تک فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اپنے فرائض ادا کرتے رہے ان سے سلطنت نہیں چھینی گئی، مگر جس وقت وہ ایک حق پرست جماعت کے فنا کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو غرق کر دیا اور ان سے تمام نعمتیں چھین لیں: **فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَوَعْيُونٍ ۖ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝ (الشعر ۵۷-۵۸)** کفار قریش بھی فرعونوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ بھی شیل موسیٰ ہونے کی وجہ سے ان کو تباہ کر دیں گے۔

### نقض عہد

**إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۱) الَّذِينَ عَاهَدَتْ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ۝ (۲) فَمَا تَعْلَقُوهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ (۳) وَإِنَّمَا تَخَافَنَ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةٍ فَانْصِرْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ (۴) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ۝ (۵)**

”سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو منکر ہیں پھر نہیں مانتے وہ لوگ کہ جن سے تم نے عہد لیا پھر وہ اپنا عہد ہر دفعہ توڑ ڈالتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں، تو اگر ان کو لڑائی میں پاؤ تو ایسی سزا دو کہ ان کو دیکھ کر پچھلے لوگ بھاگ جائیں شاید وہ عبرت پکڑیں اور اگر تم کو کسی قوم کی طرف سے دغا کا اندیشہ ہو تو ان کا عہد ان کی طرف برابر سرا بر پھینک مارو بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ نکلے بیشک وہ عاجز نہیں کر سکتے۔“

گزشتہ آیت میں بتایا تھا کہ یہ تمام کفار ظالم ہیں۔ اب ان کے امتیازات و خصائص بیان ہوتے ہیں:

(الف) ان کو ایمان باللہ سے بے انتہا نفرت ہے۔

(ب) اپنے کسی عہد پر قائم نہیں رہتے اور ان کو ہمیشہ توڑتے رہتے ہیں۔ دنیا کے امن عامہ کی خاطر ان لوگوں سے یہی سلوک ضروری ہے، ان کو ایسی سزا دی جائے کہ دوسرے کافر بھی اس سے عبرت اندوز ہوں اور نقض عہد کا سد باب ہو جائے۔ کفار قریش کبھی اپنے عہد پر قائم نہ رہے، اس لئے جنگ بدر میں ان کی قوت پاش پاش کر دی گئی۔ بنو قریظہ نے بھی جنگ احزاب میں خلاف عہد قریش کی اعانت کی اس لئے فوراً تباہ کر دیئے گئے۔

پس ظاہر ہے کہ اگر کفار اپنی شرارت سے باز رہیں، اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کریں اور نقض عہد کے مرتکب نہ ہوں تو مسلمان بھی ان سے مزاحم نہ ہوں گے، لیکن اگر وہ خیانت سے باز نہ آئے تو مسلمان بھی ان کی سرکوبی

کے لئے تیار ہیں اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان خیانت کرنے والوں کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کامیاب نہ ہونے دے گا۔ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے دربار مصر میں اپنی پاکدامنی کا اظہار کیا اور عزیز مصر نے ان کو خزان ملک کا مالک بنا دیا تو انہوں نے بھی اپنے آقا کو مخاطب کر کے اسی قانون کی طرف توجہ دلائی تھی کہ خائن کبھی اس طرح ترقی نہیں کر سکتا: **ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنَّهُ لَمْ اَكُنْ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ** (یوسف ۵۲) کفار کبھی مسلمانوں سے بازی نہ لے جائیں گے۔ سورہ عنکبوت میں فرمایا: **اَمْرٌ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ اَنْ يَّسْتَفْتُوْنَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ** (العنکبوت ۴) ایک جگہ آیا: **لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي النَّارِ وَلَيْسَ الْبَصِيْرُ** (النور ۵۷) دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: **لَا يَغۡزِيۡكَ تَغۡلِبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوۡا فِي الْبِلَادِ ۖ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۝۱۱ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْبِهَادُ** (ال عمران ۱۹۶ تا ۱۹۷)۔

### سامان حرب کی فراہمی

**وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنۭ قُوَّةٍ ۚ وَمِنۭ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُنۡهَوْنُ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ اٰخِرِيۡنَ مِّنۭ دُوۡنِهِمۡ ۚ لَا تَعْلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنْ شَیْءٍ فِیۡ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفِّ الْیَکُمۡ وَ اَنْتُمْ لَا تَظۡلُمُوۡنَ** ①

”اور جہاں تک ہو سکے ان کے مقابلہ کے لئے قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور ان کے سوا دوسروں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے دھاک بٹھاؤ گے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تم کو پورا دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔“

دنیا کی سرکش طاقتوں اور شیطانی حکومتوں نے ہمیشہ صرف قوت کے آگے سر جھکا یا ہے، اخلاقیات کا وعظ، نوع انسانی کی ہمدردی اور علوم و معارف کی نشر و اشاعت ان لوگوں کے نزدیک دلفریب الفاظ ہیں، اگر کبھی شرمندہ معنی نہ ہوئے۔ امن و سلامتی نے جب کبھی پناہ لی ہے تو تلوار کے سایہ میں اور عہد کی پابندی بھی ہوئی ہے تو اسی وقت جب دیکھا کہ دشمن زیادہ طاقتور ہے، ورنہ عہد ناموں کی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ وقعت نہ کی گئی اور بعض لوگ تو طاقت کے غرور میں یہاں تک پکار اٹھے کہ عہد نامے صرف توڑنے کی غرض سے کئے جاتے ہیں۔ یہ تمام کرشمے قوت و طاقت ہیں اور یہ کوئی نئی چیز نہیں، صدیوں پیشتر یہی آواز ہمارے کان میں آتی ہے:

ونتکر ان شئنا علی الناس قولهم

ولا ینکھون القول حین نقول!

ایک جاہلی شاعر اپنی طاقت کا یوں اظہار کرتا ہے:

اذا بدغ الفطام لنا صبی

تخله الجبابر ساجدینا!

چونکہ لوگ قوت و طاقت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں مانتے، اس لئے فرمایا کہ مسلمان بھی تلوار کا جواب تلوار سے دینے کے لئے تیار رہیں تاکہ نہ صرف موجودہ دشمن مرعوب ہوں، بلکہ وہ بھی ہیبت زدہ ہو جائیں جو آئندہ تم سے برسرِ پیکار ہونے کا خیال رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ اسی آیت کے متعلق خطبہ دے رہے تھے تو آپ نے فرمایا: **اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمِيْ اِلَّا اِنَّ الْقُوَّةَ** الرمی (مسند امام احمد) ابن عباس کی رائے ہے کہ ہر وہ چیز جس سے جہاد میں فائدہ اٹھایا جاسکے قوت کے معنی میں داخل ہے، خواہ وہ جدید ترین سامان حرب ہو، حصون و قلاع ہوں اور خواہ وہ ہوائی جہاز اور آبدوز کشتیاں ہوں۔ تیر انداز کا ذکر حدیث میں بار بار اس لئے آتا ہے کہ اس زمانہ میں سب سے زیادہ یہی مفید و کارآمد چیز تھی، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ تیر اندازی کو گھوڑے کی سواری پر ترجیح دیتے تھے جیسا کہ امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے: **ارمواد و کبوا و ان ترمو** اخیر من ان تر کبوا، ایک حدیث میں آتا ہے: **من تعلم الرمی ثم ترکہ فلیس منا و عصى، نسائی میں ہے: من رمی بسهم فی سبیل اللہ فهو عدل محرار، ابوداؤد نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ ایک تیر چلانے سے تین شخص جنت میں داخل ہوں گے۔ تیر بنانے والا، چلانے والا اور ترکش سے تیر نکال نکال کر دینے والا: لید خلعن بالسهام الواحد ثلاثۃ نفر الجنة** صانعہ یحتسب فی عملہ الخیر و الرامی بہ و السبدیہ۔ آپ نے فرمایا کہ ان تین چیزوں کے سوا باقی سب کھیل حرام ہیں: **تادیب الرجل فرسه و ملاعبۃ اہلہ و رمیہ بقوسہ، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر گھوڑا رکھا اس کو ہر چیز کے بدلے میں ثواب ملے گا یہاں تک کہ لید اور بول کا بھی حساب ہو گا: من احتبس فرس فی سبیل اللہ ایما** نا باللہ و تصدیقا بوعده فان شعبہ و ربه و روثہ و بولہ فی میزانہ یوم القیمة، عروۃ بن الجعد الباریق روایت کرتے ہیں: **الخیل معقود فی نواصیہا الخیر الی یوم القیمة الا جرو الغنیمة۔**

جو شخص جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے گا اس کو پورا بدلہ ملے گا، تاریخ شاہد ہے کہ قلیل ترین مدت میں عرب کس طرح تمام دنیا پر چھا گئے، یہ اسی وعدہ کا ایفا تھا۔ سورہ بقرہ میں ہے: **مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اُتْبِیْتُ سَبْعَ سَنَاطِلٍ فِی کُلِّ سَنَابِلَةٍ مِّائَةُ مِائَةٍ حَبَّةٍ ۚ وَاللّٰهُ یُضَعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ (البقرہ ۲۶۱)** ابوداؤد میں ہے: **ان الدرهم یضاعف ثوابہ فی سبیل اللہ الی سبعمائة ضعف۔**

### خون ریزی مقصد نہیں

**وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلٰی اللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّیِّعُ الْعَلِیْمُ ۝۱۰ وَ اِنْ یُرِیدُوْا اَنْ یَّخْذَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰهُ ۚ هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِقَضَیْرٍ وَّ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۱ وَ اَلْفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلْفَتْ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلْفَ بَیْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝۱۲**

”اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی جانب جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، بیشک وہ سنا جانتا ہے اور اگر وہ تم

کو دھوکا دینا چاہیں تو تم کو اللہ کافی ہے، اس نے تم کو اپنی امداد سے اور مسلمانوں سے قوت دی اور مسلمانوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دی، جو کچھ زمین میں ہے اگر تم سب کا سب خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ نے ان میں الفت ڈال دی بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے۔“

جنگ بدر میں باوجود سامان حرب نہ ہونے کے مسلمان کامیاب تو ہو گئے مگر آئندہ کے لئے انہیں تعلیم دی گئی کہ ہر قسم کے جدید ترین آلات جنگ سے مسلح رہیں اور ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہیں اور یہ صرف اس غرض کے لئے ہے کہ ان تیاریوں کی وجہ سے دشمن خود بخود مرعوب ہو جائے گا اور لڑائی کے تمام منافذ بند ہو جائیں گے، ورنہ مسلمانوں کی کمزوری سے ممکن ہے کہ مخالفین کے حوصلے بڑھ جائیں پس یہ تیاری دراصل امن و سلامتی کی بہترین تدبیر ہے نہ کہ جنگ کا پیش خیمہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ہر طرح کے سامان حرب سے مسلح ہو گئے تو انہیں کہا گیا کہ تم خون ریزی کے لئے نہیں آئے ہو بلکہ امن کے پیغامبر ہو، اس لئے جس وقت بھی کوئی قوم صلح کے لئے خواہش کرے تو فوراً البیک کہو اور صلح کرنے میں قانون الہی کو پیش نظر رکھو۔

اگر صلح و آشتی میں دشمنوں کا مقصد تمہیں دھوکا دینا ہے تو تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی خوف زدہ نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ تمہاری نصرت و دستگیری کے واسطے کائنات ارضی تمہارے ساتھ ہوگی، آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے، پہاڑ اور طوفان راہ صاف کریں گے اور ارباب ایمان تمہارے لئے قربان ہونے کو تیار ہوں گے، جن کے دل باہمی الفت و محبت سے لبریز ہیں اور یہ تالیف قلوب صرف خدائے قدوس کے کرشمہائے قدرت کا نتیجہ ہے، ورنہ یہ کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا کہ عرب جیسی جنگجو اور خون ریز قوم میں باہمی الفت قائم کر دیتا مگر قرآن نے ایسا کر دکھایا۔ جس وقت جنگ حنین کی غنیمت تقسیم ہونے لگی تو رسول اللہ ﷺ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا یا معشر الانصار! الم اجدکم ضللاً فہداکم اللہ فی وعاۃ فاغناکم اللہ فی وکنتم متفرقین فالفکم اللہ فی، ”تم گمراہ تھے میرے تعلیم سے تم ہدایت یاب ہوئے، تمہاری ناداری و تہی دستی دور ہوئی اور اختلاف و تفریق کی جگہ اتحاد و اسلاف نے لی“ انصار ہر ایک جملہ کے بعد اللہ و رسولہ عرض کرتے تھے۔ خدانے یہ الفت پیدا کی اور وہ عزیز و حکیم ہے، اس باہمی الفت کی وجہ سے وہ تم کو کفار کے ملکوں پر غالب کر دے گا اور وہاں تم آسمانی بادشاہت کا جھنڈا گاڑو گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ٥٦

”اے نبی! تجھ کو اور ان مسلمانوں کو جو تیرے پیرو ہیں اللہ بس کرتا ہے۔“

چونکہ تم سب کے سب اللہ کے قانون کو بلند و برتر کرنے کی غرض سے مصروف پیکار ہوتے ہو تو تمہیں مطمئن رہنا چاہئے کہ اللہ تمہارا مددگار ہے۔

## تحریر علی القتال

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ خَرِّصِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۖ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ اَلَّذِينَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

”اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو، اگر تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب ہوں گے اس لئے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے، اب خدا نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا ہے کہ تم میں ضعف ہے، سو اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور جو تم میں سے ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

دشمن بہت کثرت سے ہیں اور ہر وقت آمادہ جنگ و پیکار، ادھر مسلمانوں کو بھی دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہ معلوم نہیں کہ ان کے مخالف کس قدر اور کہاں کہاں آباد ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رکھیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر وقت تلوار چلاتے رہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہر آن و ہر لمحہ مستعد رہیں، جو فوج چھاؤنی میں مقیم ہے وہ بھی دراصل مصروف جہاد ہی ہے کیونکہ اس کو بھی روز مرہ قواعد و فنون حرب کی مشق کرنی پڑتی ہے۔

جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی سے تیار ہوئے ہیں ان میں سے بیس مقاصد حیات پر مر مٹنے والے، دو سو کافروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوں گے اور اگر سو ہوں گے تو ایک ہزار پر غالب آجائیں گے اور ارباب ایمان کیوں نہ ان ہزاروں کافروں پر غالب و قاہر ہوں گے جو عقل و دانائی سے بے بہرہ، وحدت مقصد سے ناواقف اور اعتماد توکل علی اللہ سے محروم ہیں، انہیں اجتماعی نشو و نما سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف انفرادی ترقی کے خواہاں ہیں اور اس لئے اپنی ذاتی خواہشات پر ملک و ملت کے فوائد کو قربان کر دیتے ہیں، جو شخص صدامعبودان باطل سے خوف زدہ ہو، وہ اس نفس قدسی کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے جس کے دل میں صرف ایک اللہ ہی کا خوف ہو۔

ظاہر ہے کہ رسول کریم کی صحبت سے جس درجہ کے جانباز اور فداکار سپاہی تیار ہوں گے ویسے بعد کو عام طور پر نہ ہوں گے، اس لئے آپ کے زمانہ حیات میں مہاجرین و انصار کے یہی شایان شان تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں کا مقابلہ کرے مگر پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ضعف و اضمحلال کو دیکھ کر اس قانون میں یہ رعایت بھی کر دی کہ لازمی طور پر ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے قرآن حکیم کی جن پانچ آیات کو منسوخ تسلیم کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے، لیکن اس کو منسوخ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ اب بھی اگر کوئی مسلمان دو سے زیادہ کفار کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہو تو اس کو شریعت منع نہ کریگی۔

## کتاب من اللہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْمَاءٌ حَتَّى يُنْخَنَ فِي الْأَرْضِ ط تَرْيُدُونَ عِصْرَ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ يُبْدِ الْآخِرَةَ ط وَاللَّهُ عَزِيزٌ  
حَكِيمٌ ﴿٥﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦﴾ فَكُلُّوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا  
اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧﴾

”نبی کو مناسب نہ تھا کہ ان کے پاس قیدی رہیں جب تک ملک میں خوب قتل نہ کریں، تم لوگ تو دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے اگر ایک بات نہ ہوتی کہ اللہ پہلے لکھ چکا تھا تو اس مال لینے میں ضرور تم پر بڑا عذاب آپڑتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے حلال طیب کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہیں۔“

لڑائی کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخالف کی قوت پاش پاش کر دی جائے اور جو لوگ دائرۃ اسلام میں داخل ہوں ان کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ باقی نہ رہے، اول تو جنگ شروع ہی نہ ہو اور جب ابتدا کر دی جائے تو اس وقت تک آرام لینا ٹھیک نہیں جب تک دو ٹوک فیصلہ نہ ہو جائے، لوگوں کا گرفتار کر لینا اور ان کو قیدی بنانا نبی کے شایان شان نہیں، کیا یہ لوگ روپیہ کے آرزو مند ہیں اور اس طرح اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا مشایہ ہے کہ تمہارے اخلاق محکم و استوار ہوں، دین الہی کو تمہارے فی الواقع حاصل ہو اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو۔

بدر کی لڑائی میں ستر کافر گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے ان میں حضرت عباس اور عقیل بھی تھے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ان قیدیوں کی نسبت کیا رائے ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیجئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ سب کو قتل کیا جائے، عبد اللہ بن رواحہ کی رائے تھی کہ سب کو آگ کی نذر کیا جائے، مگر آپ نے ابو بکر کی رائے کو پسند کیا اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ چونکہ جنگ کے موقع پر مقتضائے مصلحت یہی ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت پاش پاش کر دی جائے، اس لئے فدیہ لے کر دشمنوں کو چھوڑ دینا مصالح جنگ کے خلاف تھا اور پھر ایسے وقت میں جبکہ مسلمانوں میں پوری قوت نہیں آئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ماکان النبی الخ یعنی میں اس طرف توجہ دلا دی۔

اس فدیہ لینے میں گو عارضی مصلحت پوری ہو سکتی تھی، مگر اصلی مدعا پورا نہیں ہوتا تھا کہ دشمن میں پھر مزاحمت کی قوت ہی باقی نہ رہے، اسی لئے نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی، آگے چل کر تسلی بھی دے دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسے اسباب فراہم کر دے گا کہ تم کو اس غلطی کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پس حاصل کلام یہ ہوا کہ آئندہ مسلمانوں کی جماعت کو ایسے معاملات میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

کتاب من اللہ سے کیا مراد ہیں؟ مفسرین کرام اس سے عام طور پر تقدیر مراد لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازیلی میں ایسا ہی مقدر ہو چکا تھا، مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ کتاب سے مراد سورۃ یوسف ہے جس کا مکہ مبارکہ میں کئی سال قبل نزول ہو چکا تھا، اس حقیقت سے رسول اللہ ﷺ بخوبی آگاہ تھے کہ سورۃ یوسف میں دراصل خود ان کے اور مسلمانوں کے آئندہ حالات پیشین گوئی کے طور پر بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ نحن نقص عليك احسن القصص بہا اوحینا اليك هذا القرآن وان

کنت من قبله لمن الغافلین کا یہی منشاء ہے، لہذا کان فی یوسف و اخوته ليات للسائلین بھی اسی کی تائید کرتی ہے، ذلک من انباء الغیب نجیہ الیک و ما کنت لذلک اذ اجتمعوا امرهم و هم ینکرہون کا مطلب بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور قل ہذا سبیل ادعوالی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی سے بھی اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے۔

خوشر آن باشد کہ ستر دلبران

گفتہ آید در حدیث دیگران!

رسول اللہ ﷺ کو سورہ یوسف کی وجہ سے یقین تھا کہ جس طرح برادران یوسف اپنے بھائی سے معافی خواہ ہوئے تھے، ایسے ہی قریش مجھ سے عفو و مغفرت کے طالب ہوں گے، غزوہ بدر میں جب رؤسائے قریش گرفتار ہو کر آئے تو آپ نے رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ سے خیال کیا کہ یہ وہی وقت ہے اور اس لئے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا، لیکن دراصل ابھی اس پیشین گوئی کا مصداق حقیقی ظاہر نہ ہوا تھا، مگر آپ کے لئے استدلال کا موقعہ یقیناً حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ عذاب ٹل گیا، لیکن آئندہ کے لئے اس امر کو واضح کر دیا کہ ایسے دقیق استنباطات نہ کئے جائیں کیونکہ عوام الناس کے افکار و خیالات کی رسائی یہاں تک غیر ممکن ہے، کلم الناس علی قدر عقولہم کا زرین اصول کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ فتح مکہ کے روز اس سورہ کا مصداق ظاہر ہوا اور جس وقت برادران قریش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: لا تضرب علیکم الیوم یرغفر اللہ لکم و هو ارحم الرحیمین۔

وعدۃ الہی

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَمْثَالِ ۖ إِنِّي نَعِّمُ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِيكُمْ خَيْرًا مِمَّا آخِذَ مِنْكُمْ وَ يُغْفِرْ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَإِنِّي يُؤْتِي دَاخِيَا تَنَّاكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (الانفال ۷۰ تا ۷۱)۔

”اے نبی! ان قیدیوں سے کہد و جو تمہارے ہاتھ میں ہیں کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی معلوم کر لیا تو اس سے بہتر تم کو عطا فرمایا گا اور تم کو بخشے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر تم سے دغا کرنی چاہیں گے تو اللہ سے پہلے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو گرفتار کر دیا اور اللہ جانتا ہے حکمت والا ہیں۔“

جو لوگ جنگ بدر میں گرفتار ہو گئے تھے جب ان سے فدیہ طلب کیا گیا تو کسی نے کہا کہ مجھے لوگ زبردستی لے آئے ہیں، میرا ردہ تو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا نہ تھا۔ حضرت عباس نے عرض کیا: ان کنت مسلماً یا رسول اللہ، مگر آپ نے ان کو جواب دیا کہ اب تو بہر حال فدیہ ادا کرنا ہو گا، بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ جب ان سے اپنا، عقل اور نول کا فدیہ طلب کیا گیا تو انہوں نے کہا: یا محمد تنکفی اتکف قریشاً ما بقیت، ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں زندگی بھر قریش کا دست نگر بن جاؤں۔“ آپ نے فرمایا وہ سونا کہاں ہے جو تم اپنی بیوی کے پاس رکھ آئے ہو، یہ تمام روایات ان آیتوں کے نازل ہونے کا باعث ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں فدیہ تو ہر صورت میں ادا کرنا ہو گا، البتہ اگر تمہارے قلوب میں کچھ بھی



خیر و برکت ہوگی تو اس وقت جس قدر مال تم سے لے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں مل جائے گا اور اس کے علاوہ گناہ بھی معاف ہوں گے۔

نبیہی میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت بحرین سے مال آیا تو آپ کے حکم سے اس کو مسجد میں رکھا گیا، آپ نے نماز سے فارغ ہو کر اس کو تقسیم کرنا شروع کیا تو عباس بھی آگئے اور عرض کیا کہ مجھے اپنا اور عقیل کا فدیہ دینا پڑا تھا اب کچھ نوازش کیجئے نیا رسول اللہ اعطی فادیت نفس و فادیت عقیلا، آپ نے فرمایا جس قدر اٹھا سکتے ہو لے لو۔ عباس نے مال جمع کرنا شروع کیا اور عرض کیا کہ کسی کو اعانت کے لئے فرما دیجئے، آپ نے فرمایا کہ خود ہی اٹھا لو جس قدر اٹھا سکتے ہو۔ آخر وہ سامان لے کر چلے تو آپ بہت دیر تک ان کو دیکھتے رہے، جاتے ہوئے عباس کہتے جاتے تھے کہ: اما احدی اللتین وعدنا اللہ فقد انجونا وماندری مایصنم فی الاخری ”خدا نے ایک وعدہ تو پورا کر دیا دیکھ دوسرے کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا“۔

### سیاسی مواخات

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَالَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ الْأَعْلَىٰ قَوْمِ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَبْغَضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝

”جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے اور جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی تمہیں ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک ہجرت نہ کریں اور اگر تم سے دین میں مدد چاہیں تو تم پر امداد کرنی لازم ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں عہد ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد ہوگا“۔

جہاد فی سبیل اللہ کا اہم ترین مقدمہ ہجرت ہے۔ لغت میں اس کے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، مگر اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لئے اپنی دنیوی محبوبات و مآلوفات ترک کر دے مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز اقرباء کے قرب کو، وطن و مکان کو تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے، خدا کے ہر رسول اور ان کے پیروں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی ہے۔ انی مہاجرالی بئی اور انی ذاہب الی بئی۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں بعض اوقات اہل و عیال، مال و متاع، دوست و احباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری



زنجیروں سے بھاری ہے، اس لئے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تارکین وطن پر کیا گیا۔

مگر مادہ پرست اقوام نے اس کو ذلیل کر دیا اور روحانی کمالات سے دور جا پڑے، پھر بھی دنیاوی فضائل پورے طور پر حاصل ہو گئے۔ یہ علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی اور تمدن کی وسعت اسی ہجرت کے ثمرات و نتائج ہیں۔ مگر اسلام کا نصب العین اس سے بہت بلند تر ہے اس لئے ارشاد ہو ا ہے کہ محض رضائے الہی کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ دو۔

جب ہجرت مقدمہ جہاد ٹھہرا تو ضروری تھا کہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی جاتی اور بتا دیا جاتا کہ بہترین مسلمان کون لوگ ہیں، اس لئے ان آیات میں ان کے مختلف اقسام بیان کئے اور وہ یہ ہیں:

(الف) اسلام نسلی اور ملکی امتیازات سے بالاتر ایک قومیت بنانا چاہتا ہے، اس لئے حکم ہے کہ جو لوگ اللہ کا قانون بلند و برتر کرنے اور انسانوں کا انسانوں سے رشتہ کاٹ کر صرف اللہ سے جوڑنے کے لئے اپنے آپ کو، مال و متاع کو اور وطن و دیار کو ترک کر کے مرکز اسلام میں آجاتے ہیں کہ ارتقائے اسلام کی صورت پیدا ہو اور اپنی ہر عزیز چیز اس کی خاطر قربان کر دیتے ہیں۔

(ب) جو لوگ دارالاسلام میں رہتے ہیں وہ ان فداکاران ملت کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دیتے ہیں، ان کے قصور و محلات کے دروازے ان مہاجرین کے لئے ہر وقت مفتوح رہتے ہیں اور ان کی نصرت و دست گیری میں اپنی تمام قوت صرف کر دیتے ہیں، یہ انصار ہیں۔

یہی ارباب صدق و اخلاص ہیں اور یہی اسلام میں معزز و محترم، صرف ان کے لئے دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود مخصوص ہے اور انہیں کی مدح و ثنا قرآن حکیم میں بار بار آتی ہے: قَدْ ثَابَ اللّٰهُ عَلَى الْبَيْتِ وَالْمُحَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ النُّصْرَةِ (التوبہ ۱۱)۔

مسلمان تو ہیں مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی، ان کے متعلق دو باتیں بیان کیں:

(۱) جب تک ہجرت نہ کریں تمہیں ان کی ولایت و رفاقت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) مگر پھر بھی کلمہ گو ہیں۔ اگر ان پر کوئی دشمن حملہ آور ہو اور اس مرکزی جماعت سے وہ اعانت کے طلبگار ہوں تو اس کا فرض ہو گا کہ ان دور افتادہ مسلمانوں کی مدد کرے، شاید اب بھی یہ لوگ عقل سے کام لے کر اس مرکزی جماعت سے اپنا رشتہ قائم کر لیں، مگر اتنا یاد رہے کہ ان کفار کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کی مدد نہ کرنا جن سے تمہارا عہد و میثاق ہے، اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے اعمال کو باریک بین نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جب یہ ہجرت نہیں

کر سکتے تو اس مرکزی جماعت کی نگاہ میں ان کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے۔

تم دیکھتے نہیں کہ مسلمانوں کو مٹانے کے لئے تمام دنیا کے کفار ایک ہو جاتے ہیں: الکفر، ملۃ واحدة، وہ کسی جگہ کے ہوں، کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، مگر اسلام کی مخالفت میں مشترک ہونے کی وجہ سے آپس میں اتحاد قائم کر لیتے ہیں، پس مسلمانوں کا بدرجہ اولیٰ فرض ہے کہ وہ باوجود اختلاف رنگت و نسل آپس میں متحد ہو جائیں اور دشمنان دین کے مقابلہ میں ایک ہو جائیں، اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو تمام زمین فساد کا گھر بن جائے گی اور کفار آہستہ آہستہ مسلمانوں کی قوت تباہ و برباد کر دیں گے۔

رزق کریم

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ إِلَىٰ سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَسُّهُمُ الْكُفْرُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَقَرٌّ وَمَكَانٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَسُّهُمُ الْكُفْرُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَقَرٌّ وَمَكَانٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَسُّهُمُ الْكُفْرُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَقَرٌّ وَمَكَانٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَسُّهُمُ الْكُفْرُ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَقَرٌّ وَمَكَانٌ ۖ

”اور جو ایمان لائے اور وطن چھوڑ آئے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی لوگ سچے مسلمان ہیں، ان کیلئے بخشش اور عزت کی روزی ہے اور جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم ہی میں داخل ہیں اور اللہ کے حکم میں رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔“

اس اسلامی برادری کو پھر ایک مرتبہ واضح کیا جاتا ہے کہ حقیقت اصل یہ سامنے آجائے: (الف) مہاجرین (ب) انصار یہی حقیقت میں مسلمان ہیں، ان کی غلطیاں بفضل خداوندی ترقی میں حارج نہ ہوں گی، دنیا و آخرت میں ان کو نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ رزق ملے گا، اس جگہ ان کو حکومت نوازش ہوگی اور مرنے کے بعد فردوس کے وارث بنیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے عرب میں ایک جدید قومیت کی بنیاد رکھی اور مدینہ آتے ہی آپ نے مہاجرین و انصار کو بھائی بھائی بنا دیا جس میں رنگت و نسل اور اسود و احمر کا کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہا اور پھر یہی قانون ہمیشہ کے لئے ہو گیا کہ جو لوگ بعد کو دائرۃ اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے ان مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چل کر دارالاسلام میں جمع ہو جائیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے تو وہ بھی اس مقدس جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔

یہ برادری ایسی مستحکم ہے کہ حقیقت میں اس کو رحمی اور صلبی رشتہ داروں پر بھی تفوق حاصل ہے اور اسی لئے مہاجرین و انصار ابتداءً اسلام میں ایک دوسرے کے وارث بنے تھے، مگر چونکہ ایک دوسری مصلحت کے مطابق اکثر اوقات قانون نگویں کو ترجیح دی جاتی ہے اس لئے مہاجرین کے وسیع ہونے پر اس مواخت کو صرف روحانی حلقہ میں محدود کر دیا اور وراثت کی تقسیم کا قانون جداگانہ بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، وہ ہر ایک ضرورت کے لئے الگ الگ قانون نوازش کرتا ہے، چنانچہ وراثت کے احکام سورہ نساء میں موجود ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ  
 سورة التوبة (رکوع ۱۶: آیات ۱۲۹)

سورة کا نام

کفار قریش رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بار بار عہد و پیمان کرتے، ہر مرتبہ توڑ ڈالتے اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے سے دریغ نہ کرتے، ارباب ایمان ان تمام حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور خاموش رہتے، کہ انہیں حکم دیا گیا تھا: فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ (البقرة ۱۰۹) ”سو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے“۔ آخر جب ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس میں ایک قطرہ کی بھی گنجائش باقی نہ رہی تو انہیں تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی: اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظُلُمًا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (الحج ۳۹)، ”ان لوگوں کو جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے“۔ اس لئے کہ اسی کی تیز دھار نے عاجز و در ماندہ بندوں کو قوی و طاقتور بنایا ہے اور اسی کی خون آشامی نے ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف کیا ہے: وَآتَيْنَا الْحَدِيثَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَاقِمٌ لِلنَّاسِ (الحديد ۲۵) ”اور ہم نے لوہا اتارا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے دوسرے فائدے ہیں“۔ پس جب نقض عہود کی حد ہو گئی اور اس جرم کا ہمیشہ ارتکاب ہونے لگا تو انجام کار اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور تمام کفار کو اعلان جنگ دے کر بتا دیا کہ آج کی تاریخ سے اسلام ان کے ساتھ کسی قسم کا عہد نہیں کرے گا اور خدائے قدوس ان جر اشیم کفر سے اپنے مخصوص بندوں کو بالکل ممتاز کر دے گا۔

چونکہ اس سورة میں کفار کے ہر قسم کے عہد ناموں اور پابندیوں سے علیحدگی کا اظہار کیا گیا ہے اس لئے اس کا نام براءۃ تجویز ہوا، یہ نام اگرچہ بہت زیادہ مشہور ہے، مگر اسی درجہ کی شہرت توبہ کے نام کو بھی ہے بلکہ عوام الناس تو اسے سورة توبہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ان تین صحابہ کی توبہ کے قبول ہونے کا تذکرہ ہے جو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے عام طور سے تمام مہاجرین و انصار اور ان کے صحیح متبعین پر بھی بار بار اپنی رحمت کے نازل ہونے کا ذکر کیا جس کا مفصل تذکرہ اس سورة کے آخر میں آئے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کو سورة العذاب کہتے تھے، سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اسے سورة الفاضلہ کہا کرتے تھے، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کا نام البقشقه تھا، علاوہ ازیں المنقرہ، البحوث الحافرة، الميثرة، المخزيه، المنكله، المشردة، اورا لمدمدہ بھی صاحب التفان نے بیان کئے ہیں مگر زبان زد خاص و عام براءۃ اور توبہ ہی ہیں۔

## ترتیب نزول

تمام سورۃ پڑھنے کے بعد ہر شخص باسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس کا نزول سب سے آخر میں ہوا ہے، بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: آخر سورۃ نزلت براءۃ، ”سب سے آخر میں توبہ ہی کا نزول ہوا۔“ ظاہر ہے کہ اس کا مقام نزول مدینۃ النبی کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، اسی پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے اور یہی ابن عباس ابن زبیر اور قتادہ کی رائے ہے، ترتیب آیات و واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ تمام و کمال ۹ ہجری میں نازل ہوئی ہے، ہاں اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کی ابتدائی آیات اس سال کے آخر میں نازل ہوئی ہوں گی، کیونکہ یہی وہ آیات تھیں جن کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مشرکین عرب کے سامنے حج کے روز تلاوت کیا تھا تاکہ ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اب اسلام ان سے کوئی جدید عہد نہیں کرے گا، آیات نمبر ۱۹ سے آخر سورہ تک غالباً غزوہ تبوک سے فوراً قبل یا بعد اور عجب نہیں عین دورا ان جنگ میں نازل ہوئی ہوں، ظاہر ہے کہ جنگ تبوک بھی ہجرت کے نویں ہی سال وقوع میں آئی تھی۔

بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ اس سورۃ کی آخری دو آیتیں مکی ہیں، لیکن اوّل تو بخاری کی روایت اس خیال کی تکذیب کرتی ہے دوسرے ممکن ہے کہ ان لوگوں کا یہ مطلب ہو کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کی خاطر مکہ تشریف لے گئے ہیں اس وقت ان آیات کا نزول ہوا ہو، بہر حال قول فیصل یہی ہے کہ سورۃ مدنی ہے۔

## ما قبل سے تعلق

انفال و توبہ میں جہاد فی سبیل اللہ کا تذکرہ ہے، سورۃ انفال کے آخر میں فرمایا تھا: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ هَاجَرُوا وَ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَا وَ نَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، یہی وہ لوگ تھے جن کی نسبت کہا گیا تھا: أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَ رِزْقٌ كَرِيمٌ، پس جب مسلمانوں میں مذہبی اتحاد اور سیاسی یگانگت قائم ہو گئی تو فوراً بعد سورۃ توبہ میں مخالفین اسلام کو اعلان جنگ دیا گیا: براءۃ من اللہ و رسول الی الذین عاہدتم من المشرکین۔ پہلی سورۃ میں عہود کی پابندی اور صلح کا تذکرہ تھا، ان جنحو للسلم فاجنح لہا و توکل علی اللہ، اب چونکہ کفار نے بار بار اپنے عہد ناموں کو توڑ ڈالا اور ہمیشہ مسلمانوں کو تکلیف دی، اس لئے توبہ میں ان پابندیوں سے مسلمانوں کو آزاد کر دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب سوال کیا گیا کہ ان دونوں سورتوں کو ملانے اور ان کے درمیان بسم اللہ نہ لکھنے کا کیا سبب ہے تو انہوں نے فرمایا:

کان رسول اللہ ﷺ مہاجر علیہ الزمان و هو تنزل علیہ السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیہ شیء دعا بعض من یکتب فیقول ضعوا ہذا الایۃ فی السورۃ التی یدکر فیہا کذا و کذا و کانت الانفال من اول ما نزل بالمدینۃ و کانت براءۃ من اخر ما نزل من القرآن و کانت قصتها شبیہۃ بقصتها و خشیت انها منها و قبض رسول اللہ ﷺ و لم یمیز لہا انها منها فمن اجل ذلك قرئت بینما ولم اکتب بینہما سطر

بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتها فی السبع الطوال۔

”رسول ﷺ پر ایک ہی وقت میں مختلف سورتیں نازل ہوتیں تو آپ کسی کاتب کو بلا کر فرمادیتے کہ ان آیات کو فلاں فلاں سورتوں میں لکھ دو۔ مدینہ میں سب سے پہلے انفال اور آخر میں براءۃ نازل ہوئی پھر دونوں کے قصبے ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، مجھے خیال ہوا کہ توبہ بھی اس کا ایک حصہ ہے ادھر اس پر بغیر کسی قسم کی روشنی ڈالے رسول اللہ کی وفا ت ہو گئی اس لئے میں نے ان دونوں کو ملا تو دیا مگر بنظر احتیاط درمیان میں بسم اللہ نہ لکھی۔“

غالباً اسی بناء پر حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ ان دونوں کو ایک ہی سورۃ فرمایا کرتے تھے: انہا مع الانفصال سورۃ واحدۃ۔

## ترک بسم اللہ

اگرچہ امام شافعی علیہ الرحمۃ اس بات کے قائل ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے، مگر جمہور علماء اور تمام احناف اس طرف گئے ہیں کہ یہ قرآن حکیم کی ایک آیت تو ہے مگر کسی سورۃ کا جز نہیں اور تمام سورتوں کی ابتدا میں تیناؤ تبرکاً درج کی گئی ہے، تاکہ ہر سورۃ دوسری سے ممتاز نظر آئے، مگر برخلاف اس کے سورۃ توبہ کے شروع میں اس کو تحریر نہیں کیا گیا، اس کا اصلی سبب تو وہی ہے جس کو ہم ابھی ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں او وہ ایسی روایت ہے جس کو نہ صرف ترمذی نے بیان کیا ہے بلکہ امام احمد، ابو داؤد، اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے، بعض لوگوں نے ترک بسم اللہ کے بعض دوسرے اسباب بھی بیان کئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ان البسملۃ امان وبراءۃ نزلت بالسیف، ”بسم اللہ تو امن کا پیغام ہے اور سورۃ توبہ میں جہاد کا تذکرہ ہے۔“ اسی قسم کا خیال محمد بن الحنفیہ اور سفیان بن عیینہ نے بھی ظاہر کیا ہے۔ مبرد کہتا ہے کہ اہل عرب کا دستور تھا کہ جس وقت وہ عہد نامہ توڑنے کی اطلاع اپنے دشمن کو دیتے تو بسم اللہ ترک کر دیتے، سورۃ براءۃ میں مسلمانوں کو کفار کے ساتھ جدید عہد ناموں سے روک دیا گیا، اس لئے بسم اللہ بھی درج نہ کی گئی۔

## موضوع سورۃ

دنیا میں ہر چیز کا قیام اس کے مرکز کے ساتھ وابستہ ہے، ہر دریا کے لئے ضروری ہے کہ اس کا تعلق ایک محفوظ چشمہ کے ساتھ ہو، فضائے آسمانی میں بے شمار ستارے روشن دکھائی دیتے ہیں مگر ان سب کو روشنی اور حرارت سورج ہی سے ملتی ہے، درخت کی ٹہنیوں کو دیکھو کس قدر ہیں، مگر یہ سب کی سب اپنی تروتازگی کے لئے اس کی جڑوں کی دست نگر ہیں، ہر تعلیم کے لئے لازمی ہے کہ اس کی ایک درس گاہ ہو، ٹھیک اسی طرح ہر قوم کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی ارضی مرکز ہو: اللہ الذی رفَعَ السُّبُلَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَحَّ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ يَّجُوزِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى (الرعد ۲) یہ سنت اللہ ہے ولن تجد لسنة اللہ تبدیلاً، اسی قانون کے مطابق اسلام نے امت کے بقا اور حق کے قیام کے لئے ہر طرح کے مرکز قرار دیے تھے، پس ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کے لئے قرار دے دیا جاتا۔

سرزمین عرب میں مذہبی حکومت کی باگ قریش کے ہاتھ میں تھی اور یہ بھی صرف اس لئے کہ وہ بیت اللہ کے مجا

ور اور خادم تھے، باقی تمام امور کے فیصلہ کے لئے ہر قبیلہ کا اپنا اپنا سردار ہوتا تھا، مگر کبھی کبھی یہ قبائل اپنے جھگڑے قریش کے پاس بھی لے جایا کرتے، لیکن یہ لوگ مجبور نہ تھے کہ ان کے فیصلہ کو ضروری تسلیم کر لیں، کیونکہ قریش اپنے اثر کو اپنی لامذہبیت کی وجہ سے کھو چکے تھے، قبائل عرب اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہایت ہی دور بین نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ فتح مکہ ہوتے ہی کفار قریش کی طاقت بالکل تباہ ہو گئی ہے تو ان میں حرکت پیدا ہوئی اور جوق جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے: ﴿رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ (النصر ۲) ”اور تم دیکھو کہ لوگ جو ق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔“

مرکزی حکومت کا مسلمانوں کے ہاتھ میں آنے کا یہ مطلب تھا کہ اب عرب کے اطراف میں کلمۃ اللہ بلند ہو گیا ہے، قانون الہی کی حکومت ہے اور قرآن اس کا دستور العمل ہے، جو شخص اس کتاب عزیز کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے گا، وہ حکومت کے نزدیک باغی قرار دیا جائے گا، ملک میں نظم و نسق صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ رائج الوقت قانون کے آگے تمام رعایا کی گردنیں جھک جائیں، اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ باغی ہے اور سرزمین عرب میں رہنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں، ایسے آدمی کو شریعت کی اصطلاح میں کافر کہا گیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ دنیا کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ اس صداقت کے آگے خمیدہ گردن ہے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے، رعایا مکمل آزادی کے لئے کوشاں ہے، مگر برطانیہ کے نیک دل معصوم فرشتے اس کو بھی بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس سے رائج الوقت قانون کی توہین ہوتی ہے۔ شاہ پسند اور سرمایہ داری کے اصول نے دنیا کو تباہ کر دیا ہے، بولشویک اٹھتے ہیں کہ ان اصول کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں، مگر یورپ کے اقتدار پسند اور مہاجن اس کوشش کو انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں، پس اسلام دنیا میں آیا کہ توحید کا اعلان کرے اور بت پرستی کی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دے: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال ۳۹) رحمۃ للعلمین نے فرمایا: امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ کلمہ توحید کو مان لیں۔“

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اس کی دعوت دنیا کی بین المللی دعوت ہے، وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرہ ارضی میں پھیل جانے والے تھے، پس ضروری ہوا کہ ان بکھرے ہوئے اجزاء کے لئے ایک ایسا مقام مخصوص کر دیا جاتا جس سے اس کی دائمی متحدہ قومیت قائم رہتی، جو ان تمام متفرق اجزاء کے لئے مرکزی نقطہ ہوتا، وہی جگہ تمام امت کی تعلیم کے لئے ایک مرکزی درس گاہ ہوتی اور وہی مقام تمام کرہ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کے لئے نقطہ وحدت ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ارضی وسعت کے لئے عبادت کدہ ابراہیمی کو کعبۃ اللہ، حجاز کو اس کی سرزمین اور جزیرہ عرب کو اس کا دائمی مرکز بنایا، یہی اسلام کا سب سے پہلا سرچشمہ تھا، یہی ناف زمین ہے اور دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت کے لئے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درس گاہ بھی۔ اسی جگہ ہے: ﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِبْلًا لِلنَّاسِ﴾ (المائدہ ۹۷) اور اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنَا (البقرہ ۱۲۵) اور وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (آل

عمران (۹۷) اور وَحِیْتُ مَا كُنْتُمْ قَوْلًا وُجُوهَكُمْ شَطْرًا (البقرہ ۱۵۰) اور اَوْ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ اُنْتَيْنِ مِنْ كُلِّ فِتْجَةٍ عَيْنِي (الحج ۲۷) اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو تمہارے پاس پیادے اور سوار ہو کر دہلی اور ٹٹنیوں پر چلے آئیں گے جو وہ ہر دور و دراز راستہ سے آئیں گے۔ سب اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔

اب چونکہ مشرکین کے ساتھ دینی اتحاد قائم کرنا اصول اخلاق کے لئے جن پر اسلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے خود کشی کے مرادف ہوتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بلا کسی رعایت کے کفار سے جزیرۃ العرب کو ہمیشہ کے لئے پاک و صاف رکھنے کے نہایت ہی صاف احکام نافذ کئے اور اپنی حیات طیبہ میں اس کے ایک حصہ کو ان جراثیم کفر سے پاک کر کے تمام مسلمانوں کو بتا دیا کہ بقیہ اجزا کی وہ تکمیل کریں اور تمام ملک کو ان سے محفوظ کر دیں۔ انشا اللہ کون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم هذا سے یہی مراد ہے جس کا اعلان حضرت علی نے ایام حج میں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے بار بار فرمایا: اخرجوا البشرا من جزیرۃ العرب (بخاری) امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے: اخرجوا البشرا من جزیرۃ العرب دینان، موطن میں ہے: لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب، مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہے: لاخرجن اليهود والنصارى من جزیرۃ العرب حتى لا ادع الامسلیا، امام احمد نے ابو عبیدہ بن الجراح سے روایت کیا ہے: اخرج ما تکلم به رسول اللہ ﷺ اخرجوا اليهود اهل الحجاز و اهل نجران من جزیرۃ العرب۔

کتاب و سنت کی یہ تصریحات تمہارے سامنے ہیں جو اس حقیقت کا بآگاہ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ اسلام نے عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لئے مخصوص کر دیا ہے، نہ تو وہاں کسی غیر مسلم کو آباد ہونے کی اجازت ہے اور نہ غیر مسلم کی حکومت اور اس کی حاکمانہ نگرانی و بالادستی جائز ہو سکتی ہے اور یہ اس سورت کا موضوع اصلی ہے۔ سورۃ انفال کی تعلیم سے جب مسلمان قانون جنگ کے ماہر ہو گئے تو اب اس سورۃ میں سب سے پہلے عرب کو اور بعد ازاں تمام مخالفین کو اعلان جنگ دیا گیا کہ اگر وہ اسلام کے بقایاں مزاحم ہوئے تو جس طرح سر زمین عرب میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی اور باطل کا کامل طور سے استیصال کیا گیا، اسی طرح ہر جگہ اہل کفر کی سرکوبی کر دی جائے گی: کنتم خیر امة اخرجت للناس تاہمرون بالعرف و تنہون عن المنکر۔

### خلاصہ مضامین

اس سورۃ کو حسب ذیل ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

### باب اول: اعلان جنگ

اس میں ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ابتداءً سورۃ میں مشرکین کو اعلان جنگ دیا گیا، اس قطع تعلق کے بعد دوسری آیت میں ان کو چار ماہ غور کے لئے



دیئے گئے، اس تقاطع کا اعلان حج اکبر کے دن کیا گیا کیونکہ اطراف عرب کے نمائندے شرکت کی غرض سے وہاں آئے ہوئے تھے اور ان کی معرفت تمام قبائل کو اطلاع ہو سکتی تھی۔ آیت نمبر ۷ سے ان اسباب کو بیان کیا جو اس قطع تعلق کا باعث بنے۔ جب مخالفین اسلام کو اعلان جنگ دیا گیا تو آیت نمبر ۱۶ سے فرزند ان اسلام کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کیا گیا کہ ان کی حیات قومی کار از اسی حقیقت میں پنہاں ہے۔ جنگ شروع ہونے سے قبل اکثر مختلف قسم کی معذوریاں بیان کر کے اپنے آپ کو جنگ سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، آیت نمبر ۷ سے ان حیلوں کا ذکر کر کے ہر ایک کو غلط ٹھہرایا اور بتا دیا کہ ان میں سے ایک بات بھی قابل توجہ نہیں۔

شبہات تو زائل ہو گئے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن لوگوں کے ساتھ جنگ کی جائے، اس لئے آیت نمبر ۲۹ میں اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا۔ دشمنان دین برابر اس کوشش میں رہیں گے کہ مسلمانوں کو مٹا دیں، اس لئے خود ان کو بھی اپنے مخالفین کے مقابلہ میں ہمہ تن مستعد جنگ رہنا چاہئے اور اس سلسلہ کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس لئے آیت نمبر ۶۳ میں بتایا کہ سپاہیوں کو سال بھر میں چار ماہ کی رخصت دی جائے گی کہ آرام کر سکیں اور گھر کا نظم و نسق کرنے کے قابل ہوں۔ دشمن نے سب طرف سے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے اور تمام دنیا کے لوگ ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں، اس لئے آیت نمبر ۳۸ میں فرمایا کہ تمام مسلمان بلا استثناء تیار ہوں اور کوئی شخص بھی کسی قسم کا عذر پیش کر کے پیچھے رہنے کی کوشش نہ کرے اور پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ آیت نمبر ۱۴ میں بتایا کہ جہاد کے لئے ہر وقت تیار رہیں، نہیں معلوم دشمن کب اور کس وقت حملہ کر دے، جب حالت یہ ہے کہ ہر شخص تمہارا دشمن ہے اور باوجود اس کے تم اپنے اغراض کی وجہ سے تیاری نہیں کرتے اور جہاد سے مستثنیٰ رہنے کی فکر میں ہو تو یاد رہے اس جرم کی پاداش میں تم گرفتار مصائب ہو گے، آیت نمبر ۴۲ میں اسی مضمون پر ردِ شنی ڈالی گئی ہے۔

### باب دوم: ارباب نفاق

اس میں منافقین کے حسب ذیل اقسام بیان کی گئی ہیں: جنگ شروع ہو گئی، دشمن سے مقابلہ میں ارباب نفاق مختلف قسم کے عذر پیش کر کے جہاد سے بچنا چاہتے ہیں، اس لئے یہاں سے ان رکاوٹوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو دور ان جنگ میں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی کا پورا یقین ہو اور مدت بھی زیادہ نہ صرف ہو تو شریک ہونے کو تیار ہیں، اس جنگ میں یہ دونوں باتیں نہیں اس لئے شرکت ہی بے سود ہے، آیت نمبر ۴۲ سے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ آیت نمبر ۴۵ سے اس جماعت کا بیان ہے جو یہ خیال کرتی ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے اور پھر وہ اسی بات پر قناعت نہیں کرتی بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے اور جب مسلمانوں کی جماعت حق کی دعوت کے لئے جاتی ہے تو یہ بھی اپنے جاسوس روانہ کر دیتی ہے تاکہ وہ ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کی یادداشت تیار کریں اور واپسی پر ان کی وجہ سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچائیں۔ بعض منافقین یہ عذر پیش کرتے ہیں

کہ اگر ہم نے جہاد میں شرکت کی ہمارے مذہبی کاموں میں خلل واقع ہو گا اور تھوڑی بہت نیکی سے بھی محروم رہیں گے اس لئے جنگ سے الگ رہنا بہتر ہے۔ مگر ان کا یہ کہنا بھی سراسر نفاق پر مبنی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی کامیابی انہیں ناگوار گزرتی ہے، آیت نمبر ۴۹ سے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ آیت نمبر ۵۸ سے ان لوگوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں جو روپیہ ملنے پر فوراً شرکتِ جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور جہاں تھوڑی سی تاخیر ہوئی آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتے۔ بعض لوگوں کا یہ کام ہوتا ہے کہ اپنے امیر کے ہر کام پر نکتہ چینی کرتے ہیں تاکہ رکاوٹ پیدا ہو، ان کی تنبیہ کے لئے گزشتہ اقوام کے واقعات بیان کئے گئے، آیت نمبر ۶۱ سے ان کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض اربابِ نفاق یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس روپیہ ہو تو ضرور ہی قومی کاموں میں صرف کریں مگر جب ان کی یہ آرزو پوری ہو جاتی ہے تو نہ صرف بخل کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ ان مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں جو اپنی غربت کی وجہ سے معمولی رقمیں چندہ میں دیتے ہیں، ان لوگوں کا تذکرہ آیت نمبر ۶۷ سے شروع ہوتا ہے۔

### باب سوم: السابقون الاولون

یہاں تک ان لوگوں کا تذکرہ تھا جو پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں، ان سب کو قرآن حکیم نے منافقین کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اب آیت نمبر ۸۲ سے بتایا جاتا ہے کہ جہاد سے پیچھے رہنے کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس تہدید کے بعد ان کے حالات میں کس قسم کا تغیر رونما ہو گا، یہ بیان آیت نمبر ۸۴ سے شروع ہوتا ہے، پہلے اہل مدینہ کا تذکرہ ہے جنہوں نے ابتدا میں مدد دینے سے انکار کیا، پھر بتایا کہ ایک ہی مرتبہ جنگ سے پیچھے رہنے کی وجہ سے آئندہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے گا، بعد ازاں اعراب کی حالت بیان کی کہ وہ بھی مختلف بہانے بنا کر اپنے آپ کو معذور قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسے حالات کا پیدا کر لینا جو جہاد کے لئے رکاوٹ بن جائیں خود ایک قسم کا نفاق ہے، اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کا تذکرہ کیا۔ آیت نمبر ۱۰۰ سے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا بیان کیا، کچھ تو ان میں السابقون الاولون ہیں، بعض وہ ہیں جنہوں نے اچھے اور برے ہر قسم کے اعمال کا ارتکاب کیا مگر باوجود غلط کاری میں مبتلا ہونے کے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو نیک نیتی سے غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان سب جماعتوں کے نتائج اعمال پر بحث کی۔ آیت نمبر ۱۰۸ سے نمبر ۱۱۱ تک اس جماعت کی خصوصیات بیان کیں جو مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ آیت نمبر ۱۱۲ میں بتایا کہ سرفروشان اسلام کو بہترین نعمتیں ملیں گی اور چونکہ جنگ ہمیشہ نہیں رہتی، اس لئے آیت نمبر ۱۱۴ سے ان کی ممتاز خصوصیات بیان کیں کہ ہر شخص انہیں دیکھتے ہی شناخت کر سکے۔ پھر جب وہ ہمہ تن مسلم ہیں اور خدا کے ہاتھ میں بک گئے ہیں تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے عزیز ترین کافر رشتہ دار پر رحم نہیں کر سکتے، اس کے لئے حضرت ابراہیم کا اسوہ حسنہ پیش کیا۔ آیت نمبر ۱۱۸ سے ان اصحابِ ثلاثہ کا بیان شروع کیا جو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے موردِ عتاب ہوئے

تھے اور فوراً بعد ان صحابہ کرام کا تذکرہ کیا جو اس سخت تکلیف میں بھی جاں نثاری سے باز نہ آئے، آیت نمبر ۱۲۱ میں بتایا کہ مرکزی جماعت کو تو ایک لمحہ کے لئے بھی جہاد سے پیچھے نہ رہنا چاہئے، اس لئے کہ ان کے لئے انعام و اکرام بھی بے شمار ہیں۔ آیت نمبر ۱۲۳ میں شخصی و اجتماعی فرائض کی تقسیم کی۔ آیت نمبر ۱۳۴ میں فرمایا کہ دنیا میں جہاد فی سبیل اللہ کے اہم فرض کی اشاعت کن تدابیر سے ممکن ہے اور آخر میں بتایا کہ اگر امت مسلمہ میں سے ایک تنفس بھی اس فریضہ ملی کے ادا کرنے کو تیار نہ ہو گا تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ عرش عظیم کا مالک اور زمین و آسمان کا شہنشاہ اعظم خود اس قانون کو بلند و برتر کرنے کے لئے اپنے دوسرے بندوں کو چن لے گا اور اسی پر سورۃ البراءۃ ختم ہو جاتی ہے۔



## باب نمبر ۱

### فصل اول

### اعلان جنگ

#### انذار حرب

مشرکین عرب نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ سے عہد و پیمان کرنے شروع کر دیئے، ان میں سے بعض عہد ناموں میں تو مدت معین کی جاتی تھی، مگر بعض میں اس تحدید کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ جب اور جس وقت فریقین میں سے کسی کو ضرورت ہوتی فوراً اعلان جنگ کر دیتا، عہد نامے سبھی کچھ تھے، لیکن کفار کبھی ان کے پابند نہ ہوتے اور اپنی بد عہدی سے مسلمانوں کو ہمیشہ تکلیف میں رکھتے، صلح نامہ حدیبیہ کا جو حشر ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ۹ ہجری میں جب آپ غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو بہت سے قبائل نے اپنے عہد ناموں کو توڑ ڈالا اور منافقین نے بھی بے بنیاد خبروں کے اڑانے میں کمی نہ کی، پھر خود ان کے عقائد اور اقوال و اعمال ہی اس قسم کے تھے کہ ان لوگوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن ہی نہ تھا، اس لئے ارشاد ہوا:

بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

”اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو صاف جواب ہے جن سے تم نے عہد کیا۔“

مسلمانوں نے آج تک اپنے عہد کی پابندی کی تھی، اس لئے کہ ان کی شریعت نے ان کو اسی قسم کی تعلیم دی تھی: وَ اَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل ۳۴) ایفائے عہد ہی پر ان کو جنت کا وعدہ دیا گیا تھا: الَّذِينَ يُوْفُونَ بَعْدَ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْعَهْدَ ۚ اِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْمُكْفَرُونَ (النساء ۱۰۱) مگر کفار نقض عہد کر کے ان کو ہر موقع پر تکلیف میں ڈالتے: الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ (الانفال ۵۶) باوجود اس کے پھر بھی فرزند ان اسلام کو وحی الہی کی جانب سے یہی تعلیم دی جاتی کہ وہ صرف امن و سلامتی کے لئے بھیجے گئے ہیں، اگر کفار صلح کے لئے ہاتھ بڑھائیں تو انہیں فوراً الیک کہنا چاہئے: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْعَلْ لَّهُمْ سُلُوكًا وَسَلَامًا ۚ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (الانفال ۶۱) مگر جب ان کی بد عہدی کی انتہا ہو گئی اور مسلمانوں کا پیمانہ نمبر لبریز ہو گیا تو خدائے قدوس نے اعلان کر دیا کہ اب جبکہ اطراف عرب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور قرآن کو قانون سلطنت تسلیم کر لیا گیا ہے، اللہ اور اس کا رسول ہر اس شخص کو اعلان جنگ دیتا ہے جس کی گردن اس قرآن کو قانون کے آگے نہ جھکی ہو، آج کی تاریخ سے مسلمانوں کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کفار نے مسلمانوں کے ساتھ بعض ایسے عہد نامے کئے تھے جن میں مدت کی تعیین نہ تھی، بلکہ ہر فریق کو ہر وقت توڑنے کا اختیار تھا، اس آیت نے صرف انہی عہد ناموں سے بحث کی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ باقی تمام عہد ناموں کے لئے لسان الہی نے یہ رعایت ملحوظ رکھی کہ ان سب کی چار ماہ مدت قرار دے دی، اس میں وہ عہد نامے بھی آگئے جن کا زمانہ چار ماہ سے کم تھا۔ رہے وہ جن میں مدت کا تذکرہ تھا اور زمانہ بھی چار ماہ سے زائد، ان کی نسبت خود قرآن نے کہہ دیا: **فَأَيُّ عَهْدِهِمْ إِلَيْهِمْ عَهْدُهُمْ إِلَىٰ مَدَّتِهِمْ** (التوبہ ۴) یہ محمد بن اسحق، مجاہد، اور دوسرے لوگوں کا قول ہے، اور اسی کو حافظ ابن کثیر نے ترجیح دی ہے۔

### غور کی مہلت

قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری سلطنت کو اعلان جنگ دیتی ہے تو اس کو کچھ نہ کچھ وقت غور و فکر کے لئے بھی دیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وہ اپنے تمام حالات دیکھ کر فیصلہ کر لے کہ اسے جنگ کرنی ہے یا صلح کے لئے ہاتھ بڑھانا ہے، اللہ تعالیٰ نے جب کفار کو اعلان جنگ دیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

فَسَيُحْوَإِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةٌ أَشْهُرٌ وَعَلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ①

”تو اے مشرک! زمین میں چار ماہ چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔“

دنیاوی حکومتوں کا دستور یہ ہے کہ اعلان جنگ کے بعد دشمنوں کو غور کا موقع بہت کم دیتی ہیں، اس لئے کہ ان کا مقصد جمع مال کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اسلام رحمت ہے اور وہ امن و سلامتی عالم کے قیام کے لئے بھیجا گیا ہے، اس لئے ارضی حکومتوں کے خلاف اس نے اپنے مخالفین کو چار ماہ کا مل غور کی مہلت دی، اس درمیان میں وہ تمام عرب میں باطمینان رہ سکتے ہیں، اپنے اور دشمنوں کے حالات کا اچھی طرح مطالعہ کر کے اپنے مستقبل کے متعلق خوب دل جمعی سے فیصلہ کر سکتے ہیں، اگر وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوں تو انہیں لپک کہا جائے گا، لیکن اس مدت کے ختم ہوتے ہی عرب کی ایک انج زمین بھی ان کو پناہ نہ دے سکے گی۔

مخالفین کو اس امر میں غور کرنا چاہئے کہ جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی، ان کے پاس ساز و سامان نہ تھا، عرب کا ایک ایک باشندہ ان کا دشمن تھا، ہر طرف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے، یہودی ایک طرف ان کی جان کے لیوا تھے، دوسری جانب نصاریٰ ان کو خوفزدہ کر رہے تھے، مجوسی بھی کسی سے کم نہ تھے، جب ان حالات میں مسلمان زندہ رہے تو اب اس وقت تم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہو جبکہ تمام عرب پر ان کا قبضہ ہے، ہر طرف ان کی حکومت ہے، اس وقت کفار یقین کر لیں کہ وہ مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آسکیں گے، بلکہ جو شخص قرآن سمجھنے کے باوجود اسکی مخالفت کرے گا، وہ خود ذلیل ہو گا۔

اربعة اشهر کے متعلق زہری کی رائے ہے کہ اس سے شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم مراد ہیں، مگر اکثر ارباب تفسیر

اس طرف گئے ہیں کہ یہ مدت ذی الحجہ سے شروع ہو کر ربیع الاول پر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے اور یہی سدی اور قتادہ کی رائے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان آیات کا اعلان ایام حج میں ہوتا ہے تو اس سے شوال اور ذیقعد کس طرح مراد ہو سکتے ہیں۔

### الحج الاکبر

وَ اِذَا نَزَلَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولُهُ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۖ وَرَسُولُهُ ۚ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُمْ  
خِيَارُكُمْ ۖ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۚ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝

”اور حج اکبر کے دن لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کا رسول بھی مشرکوں سے بیزار ہے، تو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔“

عوام الناس کا خیال ہے کہ حج جس سال جمعہ کے روز ہو اس کو حج اکبر کہتے ہیں اور اگر باقی ایام میں ہو تو وہ اصغر ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے، حج کسی روز ہو اس کو اکبر ہی کہا جائے گا، البتہ عمرہ کو حج اصغر کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں طواف کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا ہوتا ہے، حج اکبر کا اطلاق یوم عرفہ پر ہوتا ہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا حقیقی اجتماع اسی روز ہوتا ہے، یہی عمر، ابن عباس، سعید بن المسیب، ابن زبیر، عطاء، طاؤس اور مجاہد کی رائے ہے۔ مسور بن مخرمہ نے روایت کیا ہے: خطب رسول اللہ ﷺ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ فَقَالَ اِمَّا بَعْدُ فَاَنْ هَذَا يَوْمُ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ، ”شب عرفہ کو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا یہ یوم الحج الاکبر ہے۔“ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ حج کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا: الحج عرفہ۔ فقہاء کے نزدیک اس شخص کا حج نہیں ہوتا جو تمام ارکان حج کو ادا کرے اور میدان عرفات میں نہ جائے، اس لئے یہی قول قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے کہ حج اکبر سے مراد یوم عرفہ ہے۔

حج کے اعظم ترین مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع ہو کر خدائے قدوس کی عبادت کے ساتھ ساتھ مسلمانان عالم کی فلاح و بہبود کی تجاویز پر غور کریں اور مشورہ کر کے ان کے لئے ایک پروگرام (لائحہ عمل) تیار کریں۔ مشرکین ان ایام حج میں وہاں جمع ہوا کرتے تھے، چونکہ تمام عرب کے نمائندوں کا اجتماع اس روز ہوا کرتا تھا اور اس روز کسی چیز کا اعلان کر دینا اس امر کے مرادف ہوتا تھا کہ تمام عرب میں اس کی تشہیر ہو گئی، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر و علی رضی اللہ عنہما کو روانہ کیا کہ ایام تشریق میں اس اعلان جنگ کی اطلاع سب کو کر دیں، اس روز جن باتوں کا اعلان کیا گیا ان کو ترمذی، ابن ابی حاتم، حاکم، حافظ ابو بکر بن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں نقل کیا ہے:

فَنَادَىٰ اِنَّ اللّٰهَ بَرِيٌّ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُولُهُ فَنَادَىٰ اَرْضَ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ وَلَا يَحْجُنُ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عَرَبِيًّا وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا مَوْمِنًا فَاِذَا اَعْيَا عَلٰى قَامَ اَبُو بَكْرٍ يِّنَادِي بِهَا۔

(۱)۔ آج کی تاریخ سے جو شخص قرآن کو اپنا قانون نہ مانے گا اس کو باغی تصور کیا جائے گا اور وہ واجب القتل ہوگا: اِنَّ اللّٰهَ بَرِيْءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ وَرَسُوْلُهُ (التوبہ ۳)۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (التوبہ ۵)۔

(۲)۔ مشرکین کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ ہوگی: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ ۲۸)۔

(۳)۔ مشرکین ننگے بدن طواف کعبہ کیا کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ آلودہ عصیاں کپڑوں کے ساتھ طواف کرنا جائز نہیں، مگر شریعت اسلام نے اس غلط خیال کو رد کر کے فرمایا: وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عَرِيَانٌ۔

(۴) قرآن کو نہ ماننے والے جنت میں داخل ہونے کے مستحق نہیں: وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْاٰمُوْمِنُ۔

(۵) جن کفار نے اب تک نقض عہد کا ارتکاب نہیں کیا ان کا عہد نامہ قائم رہے گا: اِنْ يَتَمَنَّوْا اِلٰى كُلِّ ذِي عَهْدٍ عَهْدًا۔

جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان امور کا اعلان کر دیا تو کفار نے کہا: یا علی ابلغ ابن عمک انا قد نبذنا العهد وراہ ظہور نا وانه ليس بيننا بينه عهد الا طعن بالرماح وضرب بالسيف، ”اے علی اپنے بھائی سے کہہ دو کہ ہمارے نزدیک ان عہد کی کوئی عزت نہیں اب صرف نیزوں کی آنی اور تلوار کی دہار ہی انصاف کرے گی۔“

طرفین سے اعلان جنگ کے بعد اگرچہ مصالحت کی کوئی صورت ممکن نہ تھی، مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے لسان نبوت سے ایک مفید امن و امان استثناء کر دیا کہ اگر اب بھی کفار باز آجائیں تو ان پر وہی رحمتیں اور برکتیں نازل ہو سکتی ہیں، ورنہ وہ یاد رکھیں کہ عاقبت کار فتح و کامرانی صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ کتب اللہ لا غلبن انلا ورسلی اور ان حزب اللہ ہم المفلحون اور ان چند نالہم الغالبون اور العاقبة للمتقين اسی سنت اللہ کو واضح کرتی ہیں، ان کید الشیطن کان ضعیفا اور ان کی الکفر بین فی ضلال اور ان حزب الشیطن ہم الخصمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ارباب کفر ہمیشہ ناکام رہیں گے اور ان کو ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑے گی، ان الباطل کا نذر ہوتا۔

### پابندی عہد

إِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يَظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتَيْتُمُوْا اِلَيْهِمْ عٰهَدُهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

”مگر ان مشرکوں سے ان کے عہد ان کی مدت تک پورے کرو جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا، پھر انہوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی ہے، بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو امن و سلامتی کا پیغام اپنے ساتھ لایا ہے، اس نے تلوار کے سایہ میں اس وقت پناہ لی جب اسے بے انتہا مجبور و مضطر کیا گیا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقْتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۝

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (الحج ۳۹-۴۰) مگر عین اس وقت بھی جبکہ دوسرے لوگ انتہائی غضب اور غصہ کی حالت میں ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں، اسلام نے جادۂ اعتدال سے انحراف نہیں کیا، اگرچہ اصول مروت و اخلاق کی پابندی ہر شخص کے لئے عموماً اور انبیاء و رسل کے لئے خصوصاً ضروری ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایک مصلح اپنے بے گناہ تبعین کو قتل ہو تا دیکھا کرے اور باوجود انتقام کی طاقت کے مخالفین سے باز پرس نہ کرے، اس لئے قرآن حکیم نے ایسے مواقع میں وہی حکم دیا جو سلاست فطرت کا تقاضا ہے۔

حدیبیہ کے میدان میں کافروں اور مسلمانوں میں جو صلح نامہ مرتب ہوا تھا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی: ان یضعوا الحرب عشا سنین یا من فیہا الناس ”دس سال تک جنگ نہ ہوتا کہ لوگ سامون ہو جائیں“، اس عہد نامہ میں بنو بکر قریش کے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے، مگر بالآخر بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے آلات حرب سے ان کی مدد کی، اس پر بنو خزاعہ نے بھی دربار رسالت سے امداد کی درخواست کی، عمرو بن سالم الخزاعی نے پُر درد نظم میں تمام واقعات گوش گزار کئے، جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

لا ہم انی ناشد محبدا  
حلف ابینا وایہہ الا تلدا!

کچھ غم نہیں، میں محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔

فانصر رسول الله نصرا عتدا  
وادع عباد الله يا توا مددا!

اے پیغمبر خدا! ہماری اعانت کر اور خدا کے بندوں کو بلا سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے!

ان قریشا اخلفوک الموعدا  
ونقضوا میثاقک الموکدا!

قریش نے آپ سے وعدہ خلائی کی انہوں نے اس مضبوط معاہدے کو جو آپ سے کیا تھا توڑ ڈالا۔

وجعلوا لی فی کداء رصدا  
وزعموا ان لست ادع واحدا!

ہمیں خشک گھاس کی طرح پامال کر دیا، وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری امداد کو کوئی نہیں آنے کا۔

وہم اذل و اقل عددا  
ہم بیتونا بالوتیر ہجدا!

وہ تو ذلیل ہیں اور قلیل ہیں انہوں نے وتیر میں ہمیں سوتے ہوئے جاگ لیا۔



## فَقَتَلُونَا رُكْعًا وَسَجْدًا!

ہم کو کور کوع اور سجود کی حالت میں پارہ پارہ کر دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ۸ ہجری میں حملہ کر کے مکہ فتح کر لیا۔ یہ حالات تھے جن کی بنا پر اعلان جنگ کیا گیا مگر پھر بھی جو قبائل اپنے عہد پر قائم رہے، شریعت نے ان کے حسن اخلاق کو فراموش نہیں کیا، بلکہ ان کی نسبت حکم دیا کہ ان کا عہد نامہ قائم رہے گا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عرب میں صرف بنو ضمرہ اور بنو مدلج ہی ایسے قبیلے تھے جو نقض عہد کے مرتکب نہیں ہوئے اور نو ماہ تک ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے جو ان کے عہد کی انتہائی مدت تھی، اسی پابندی عہد کو قرآن حکیم نے اس جگہ تقویٰ سے تعبیر کیا ہے جب فرمایا: ان الله يحب المتقين۔

## قتل عام

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوا مِنْهُمْ وَاقْتُلُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ⑩

”پھر جب پناہ کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور ان کو پکڑو اور گھیر واد ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا رستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اگر یہ مہلت گزر جائے اور پھر بھی یہ مشرک عرب کی حدود میں قیام پذیر رہیں جو مسلمانانِ عالم کا راضی مرکز ہے تو مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ اپنے مرکز کو ہر قسم کے دشمنوں سے پاک رکھنے کی کوشش کریں، چاہے اس کوشش میں ان کفار کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور جنہوں نے نقض عہد ہی اپنا شعار بنالیا ہو ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے، اگر انہیں ایسی سخت سزا نہ دی گئی تو دوسرے لوگوں کو بھی ان ناشائستہ حرکات کی جرأت ہو گی اور قانونِ الہی کی کوئی عزت نہ رہے گی، انہیں گرفتار کرنے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہئے، کہ اسی صورت میں نظامِ صالح قائم رہ سکے گا۔

لیکن جب وہ قرآن کو اپنا قانون تسلیم کر لیں اور یہ صرف زبانی اقرار نہ ہو، کیونکہ انسان بسا اوقات سزا سے بچنے کے لئے ایسا کر لیتا ہے، بلکہ عملاً اس کا اظہار ضروری ہو گا اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ نماز و زکوٰۃ کے پابند بن جائیں، اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو گویا انہوں نے اسلام کے ابتدائی قانون کو مان لیا، اب اس کے بعد ان سے کسی قسم کا تعرض نہ ہو گا۔ امام احمد نے اپنی مسند میں انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے:

امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله، فاذا شهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واستقبلوا قبلتنا واكبلوا ذبيحتنا وصلواصلونا فقد حرمنا علينا دماءهم

واموالہم الا بحقہا، لہم مال المسلمین وعلہم ما علیہم۔

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ توحید و رسالت کی خاطر لوگوں سے جنگ کروں پھر جب وہ توحید اور میری رسالت کو تسلیم کر لیں، ہمارے قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھیں، ہمارا ذبح کیا ہوا کھائیں تو قانونی جرائم کے سوا ان کا خون اور ان کا مال ہمارے لئے حرام ہو گا اور وہ سود و زیاں میں مسلمانوں کے شریک ہوں گے۔“

خود قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے: فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمُ (التوبہ ۱۱)۔

اسی آیت سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے استدلال کر کے زکوٰۃ نہ دینے والوں پر جہاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، عبد الرحمن بن زید بن اسلم کہتے ہیں: ابی اللہ ان یقبل الصلوٰۃ الا بالزکوٰۃ، ”اللہ تعالیٰ زکوٰۃ کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا“، عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں: امرتم باقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ ومن لم یؤت فلا صلوٰۃ لہ، ”تمہیں نماز اور زکوٰۃ کا حکم ہے اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز کس کام کی۔“

## درس قرآن

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَا أَمَرَهُ ۚ ذَٰلِكُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ۝

”اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس لئے کہ وہ نہیں جانتے۔“

اگر مشرکین سے کوئی شخص جاہل ہے یعنی اسے اب تک مسلمانوں سے ملنے جلنے کا پورا موقع نہیں ملا اور نہ وہ اچھی طرح قرآن سن سکا ہے، تو چونکہ اس کتاب عزیز کا اہم و اعظم مقصد ہدایت انسانی ہے اور نفوس بشریہ کا مہذب بنانا اس کے پیش نظر ہے، اس لئے حکم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو قرآن حکیم کی تبلیغ کی جائے اور پھر اس کو ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جو اس کے زاویہ نگاہ سے امن اور سلامتی کی جگہ ہو، اس تھوڑی سی صحبت و ہم نشینی سے اسے قرآن میں درس و فکر کا موقع مل جائے گا اور اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام جن باتوں پر زور دیتا ہے وہ ہر فرد انسانی کے لئے نہایت ہی مفید اور سود مند ہیں۔ اس طرح پر کیا عجب ہے کہ داعیہ فطرت اس کو حق کی جانب رہنمائی کرے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی مخالفین اسلام کو قرآن حکیم کے احکام اور فرزند ان اسلام کے حالات میں غور کرنے کا موقع ملا تو ان کی گردنیں تسلیم کے طور پر جھک گئیں اور دائرۃ اسلام میں داخل ہو گئے۔ خالد بن ولید جنگ احد میں کفار کے کمان دار ہیں کہ مسلمانوں کو فناء کر دیں، پھر وہی خالد ہیں جو اپنے ہاتھ سے لات و غزی کے مندروں کو گراتے اور دربار رسالت سے سیف اللہ کا خطاب پاتے ہیں۔ سہیل بن عمرو قریش کے سفیر صلح ہیں، ان کو رسول اللہ سے اتنی عداوت ہے کہ جب صلحنامہ میں اپنے اسم مبارک کے ساتھ آپ رسول اللہ لکھتے ہیں تو وہ نہایت ہی برا فروختہ ہوتے ہیں، پھر وہی سہیل ہیں جو خود بخود مدینہ میں حاضر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں۔

## وجہ مختصمت

گزشتہ رکوع سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ قرآن کے آگے خمیدہ گردن نہ ہوں گے اور اس کو اپنا دستور العمل نہ بنائیں گے وہ باغی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی حکومت کی حدود میں باغیوں کا وجود اس سلطنت کی تباہی کا موجب ہو گا اور اس لئے کوئی دانشمند سلطنت اس امر کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی حدود میں مفسد اور فتنہ پرداز لوگ باقی رہیں، اس لئے قرآن حکیم نے ان باغیوں کو گزشتہ رکوع میں اعلان جنگ دے دیا، اس کے بعد ان کے لئے صرف دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں، اسلام قبول کریں، ورنہ اسلامی حکومت کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ ان کو اعلان جنگ دینے کے کونسے اسباب تھے، قاعدہ ہے کہ اعلان جنگ دیتے وقت ان اسباب کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو اس جھگڑے کا باعث ہوئے ہیں۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ①

”مشرکوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کس طرح رہ سکتا ہے، مگر ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد کیا ہے، تو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو بیشک اللہ پر ہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

فتح مکہ کے روز عرب کی سر زمین میں ایک انقلاب عظیم ہو گیا، حکومت کے بدل جانے سے ہر چیز میں تغیر آ جاتا ہے۔ کفار جب اپنے گرد و پیش دیکھیں گے کہ اس وقت زمام سلطنت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کو ہم کل تک ذلیل خیال کرتے تھے تو ان کی رگ حمیت میں جوش آ جائے گا اور اس جنون و وارفتگی میں عجب نہیں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیں، انہیں خیال ہو گا کہ شاید اس مجنونانہ حرکت سے کھوئی ہوئی طاقت مل جائے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس سفاکی کے ارتکاب کے وقت وہ کسی قانون کے پابند نہ ہوں گے اور یہ تو بارہا تجربہ ہو چکا ہے کہ انہوں نے عہد ناموں کو توڑا اور مسلمانوں کو تکلیفیں دیں، اس لئے ایسے باغیوں سے تعلقات رکھنا ایک لمحہ کے لئے بھی جائز نہیں اور نہ اللہ و رسول کے نزدیک ان کے عہد ناموں کی کوئی عزت ہے، البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اپنے عہد پر قائم رہے اور وہ صرف بنو زمرہ اور بنو مدیج ہی تھے۔

## مزید تشریح

كَيْفَ ۚ اِنْ يَّظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ اِلَّا وَاَدِمَةً ۚ يُؤْذِنُكُمْ بِاَقْوَاهِمَ ۚ وَتَلِيٰ قُلُوبُهُمْ ۚ وَاکْثَرُهُمْ لَمُسْقُونَ ②  
اِشْتَرَوْا بِاَيِّتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِهِ ۚ اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ③ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ اِلَّا وَاَدِمَةً ۚ وَاولٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ④

”صلح کیوں کر رہے ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر تم پر غالب آجائیں تو نہ تمہاری قربت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا تم کو اپنی زبانی باتوں سے رضامند کر رہے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں اکثر فاسق ہیں، انہوں نے اللہ کی آیتوں کے بدلے تھوڑا سا ممول لیا، پھر اللہ کے راستہ سے روکا، بری حرکتیں ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ قربت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا اور وہی لوگ زیادتی پر ہیں۔“

دنیا میں صرف شرک ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے تمام محاسن اخلاق کو برباد کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ابتداءً صرف شرک ہی کو سب سے بڑا سبب قرار دیا جس کی بنا پر مخالفین قابل اعتماد نہ رہے، اب ان آیات میں بتایا جاتا ہے کہ اس شرک کی وجہ سے ان میں اور کو کسی بد عملیاں رونما ہوتی ہیں، اگر وہ مسلمانوں پر غالب آجائیں تو پھر کسی قربت اور عہد و پیمان کا لحاظ نہیں کرتے: **إِنْ يَتَّقَوْكُمْ يُكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَسْطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتُهُمْ بِالسُّوِّ (الممتحنہ ۲)** ”اگر کا فر تم کو پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور تم پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانی برائی کے ساتھ چلائیں۔“ اپنے دلفریب الفاظ اور ولولہ انگیز تقریروں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کے دل ویسے ہی حسد سے بھرے ہوئے ہیں، وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ جس طرح بن پڑے ان کو تبا کر دیں یا انہیں اپنا غلام بنالیں، خود کسی مذہب کے پابند نہیں اور ان کی زندگی فسق و فجور کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس میں دراصل یہ حقیقت واضح کر دی کہ ان کے عقائد کی بنیاد حق پر نہیں اور انسان کے اندر اخلاق فاضلہ صرف قانون الہی کی پابندی سے پیدا ہو سکتے ہیں اور اس لئے بد عہدی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جب لازمہ بیت ان میں اثر کر گئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیاوی فوائد کی خاطر دین کو بیچ ڈالتے ہیں، اللہ کی آیات کو پردہ بنا کر بد اخلاقی پھیلاتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

**فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا نَفْسَكُمْ فِي الدِّينِ ۖ وَفَصِّلُوا الِأَلِيَّةَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝**

”پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم

آیتیں مفصل بیان کرتے ہیں۔“

اگر وہ ابتدائی مدارج کو تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں ان سے کوئی پر خاش نہیں، اہل علم اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ شرک و بت پرستی کے دلدادہ اور یہودیت و عیسویت کے شیدائی ان کے کبھی دوست نہیں بن سکتے پس وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی دوستی پر اعتماد نہ کریں۔

بہترین علاج

**وَأِنْ كُنْتُمْ لَا تَكْفُرُونَ فَمَا لَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا أَتَيْتُمُ الْكُفْرَ ۖ إِنَّهُمْ لَا آيَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ ۝**

”اور اگر عہد کئے پیچھے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے پیشواؤں سے لڑو، بلاشبہ ان کی

قسمیں کچھ بھی نہیں شاید وہ باز آجائیں۔“

اگر باوجود عہد کرنے کے پھر بھی یہ لوگ باز نہ آئیں، اپنی بات کی کچھ بھی وقعت نہ کریں، ہر جگہ اسلام پر آوازے کسیں، مسلمانوں کو مورد طعن و تشنیع بنائیں اور اس امر کا اعلان کریں کہ جب تک اسلام کے نام لیوا برباد نہ ہوں گے کرۂ ارضی امن سے معمور نہ ہوگی تو ایسے لوگوں کا بہترین علاج یہی ہے کہ ان کے رؤسا و امرا اور صاحبان سیاست کو بالکلہ نیست و نابود کر دیا جائے، اس لئے کہ قوم کی ترقی کا دار و مدار اور فتح و شکست کا انحصار انہیں لیڈروں کے وجود پر ہوتا ہے، تمام اعمال قومی کے یہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جس وقت یہ قتل کئے گئے قوم خود بخود ان ناشائستہ حرکات سے باز آجائے گی اور چاروں طرف امن و سلامتی نظر آنے لگے گی، مگر یہ بہترین دل و دماغ نہایت ہی محفوظ ہوتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دشمن کی زد میں نہ آجائیں، اس لئے ان فراعنہ وقت کو مارنے کے لئے قتل عام کی ضرورت ہوگی کہ سرچشمہ گھر فنا ہو، لڑائی کا مقصد بھی دراصل یہی ہوتا ہے کہ مخالف قوت کے اعضاء و ارکان فنا ہو جائیں جو فساد کے اصلی بانی ہیں۔

أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ قَالَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِيهِمْ وَيُنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيَذْهَبُ غِيظُ قُلُوبِهِمْ ۖ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

”تم کیوں نہ ایسے لوگوں سے لڑو جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسول کے نکال دینے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی تم سے پہلے چھیڑ شروع کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو، پس اگر تم مسلمان ہو تو اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو، تم ان سے لڑو تاکہ اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دے اور ان کو رسوا کرے اور تم کو ان پر فتح دے اور مسلمان لوگوں کے دل ٹھنڈے کرے اور ان کے دل کی جلن نکالے اور جسے چاہے گا اللہ توبہ کی توفیق دے گا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں مسلمانوں کو اور زیادہ جوش دلایا جاتا ہے کہ تم ان کفار سے کیوں نہیں جنگ کرتے جنہوں نے اپنے عہد ناموں کی پروا نہ کی، رسول اللہ ﷺ کو مکہ مبارکہ سے نکالنے کی کوشش کی، ایک جگہ آتا ہے: وَإِذْ يَبْغِي بَكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُغَيِّبُواكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ (الانفال ۳) سورہ ممتحنہ میں فرمایا: يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ (الممتحنہ ۱) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا (بنی اسرائیل ۷۶) اور یہ بغض و عداوت صرف آپ ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اب بھی ان مخالفین کی سعی و کوشش یہی ہے کہ آپ کے جانشینوں اور نام لیوؤں کو مرکز اسلام سے نکال دیں اور خود اس پر قابض ہو جائیں، پھر ابتدا بھی انہی لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ صلح نامہ حدیبیہ کو جس طرح بنو بکر نے توڑا اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

تم ان لوگوں سے کیوں نہیں جنگ کرتے، کیا ان سے ڈرتے ہو؟ تمہیں تو صرف ایک اللہ ہی سے ڈرنا چاہئے، اسی کے قانون کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا خیال تمہیں ہر وقت دامن گیر رہے، تم جنگ کے لئے آگے بڑھو تو حسب ذیل فوائد

حاصل ہوں گے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک انبیاء علیہم السلام کے متبعین کی تعداد کم ہوتی تھی اس لئے اس وقت تک امتوں کو عذاب دینے کا قانون یہ تھا کہ آفات ارضی و سماوی سے ان کو ہلاک کر دیا جاتا، مگر جب ایمان داروں کی تعداد میں اضافہ ہو تا گیا تو پھر خود ان کے ہاتھوں مخالفین کو ذلیل کیا جانے لگا، اب خود مسلمان ہی اللہ کا دست عمل بن کر حق و صدق کی نشر و اشاعت کریں گے اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو: یستبدل قومًا غیرکم ثم لا ینکونوا امثالکم کے مطابق ذلیل ہوں گے۔ جب ان لوگوں کا قتل ضروری قرار پا گیا ہے تو بہتر ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائے، کیونکہ انہیں بے انتہا مظالم کا شکار ہونا پڑتا ہے، انسان کا فطری تقاضا ہے کہ مظلوم ہونے کے بعد جب تک وہ ظالم سے انتقام نہ لے چکے اس کو سرور نہیں حاصل ہوتا، اس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، اس کے قوائے عملیہ بیکار ہو جاتے ہیں، اس لئے اب اگر مسلمان اپنے ہاتھ سے کفار کو قتل کریں گے تو ان کی طبعیت میں مسرت پیدا ہوگی اور آمادہ کار ہو جائیں گے: واغرقنا ال فرعون و انتم تنظرون اور قانون عدل کے مطابق اس سرور کا بدلہ ہو گا جو ابتدا میں ظالموں کو حاصل ہوا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کفار میں سے قابل اصلاح افراد یقیناً حق کے تابع بن کر اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق قرار پائیں گے۔

## فصل دوم آمادہ گی جہاد

مقصد انتخاب ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٩﴾

”کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ تم چھوٹ جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو متمیز نہیں کیا جو تم میں سے جہاد کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بناتے اور جو تم کرتے ہو اللہ کو سب کی خبر ہے۔“ تمام دنیا مسلمانوں کی دشمن ہے، ہر ایک اجنبی حکومت ان کو فنا کرنے کی فکر میں ہے اور کوئی غیر مسلم سلطنت ان کی طرف دست اعانت دراز کرتی ہے تو وہ مکرو فریب اور دجل و شیطنت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہے کہ ان دشمنوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو آمادہ جہاد کیا جائے اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ان کی زندگی کا راز سربستہ اسی جہاد فی سبیل اللہ میں پنہاں ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے ترک کر دیں گے تو چاروں طرف

سے دشمن ان پر حملہ آور ہوں گے اور انہیں تباہ کر دیں گے، اس لئے فرمایا کہ جب تک تم میں سے مجاہدین کو ممتاز نہ کیا جائے گا تمہیں خاموش بیٹھنے نہ دیا جائے گا، ایک جگہ فرمایا: أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (العنکبوت ۲) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْتُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّآلِّينَ وَذُلُّوا (البقرہ ۲۱۳) ایک جگہ اس طرح آتا ہے: مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (ال عمران ۱۷۹) اور اس جہاد سے مقصود قتل و خونریزی نہیں بلکہ غرض یہ ہے:

(الف)۔ اس نبی کی تعلیم سے تمہارے اخلاق کس درجہ مہذب و شائستہ ہوئے اور ہر ایک مسلمان نے فرداً فرداً آپ کی ذات اقدس سے کس قدر فائدہ اٹھایا اس کو واضح کر دیا جائے۔

(ب)۔ اس وقت اور آئندہ زمانہ کے لوگوں کو دکھایا جائے کہ اس امت میں اور گزشتہ امتوں میں اتباع انبیاء کے اعتبار سے کتنا فرق ہے، بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کو یہ جواب دیا تھا: اذهب انت و ربك فقاتلانا هنا قلاعدون۔

(ج)۔ آئندہ چل کر تمہیں حکومت دی جائے گی، پس جب تک نبی کی نگرانی میں اس اہم ترین خدمت کے لئے تیار نہ ہو، کام نہیں چل سکے گا، گویا مسلمان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا تمہیں معلوم ہے جس وقت نبوت کے تیر ہویں سال مدینہ کے ۷۳۳ اور دو عورتیں اس لیے مکہ مبارکہ حاضر ہوئیں کہ رسول اللہ کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دیں تو حضرت عباس نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا لوگو! تم جانتے ہو کہ قریش ان کے جانی دشمن ہیں، اگر تم ان سے عہد کرتے ہو تو یہ سمجھ لینا کہ ایک نازک اور مشکل کام ہے، محمد سے عہد باندھنا سرخ و سیاہ لڑائیوں کو مول لینا ہے: لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

### رفع اعذار و موانع

جب چاروں طرف سے دشمن مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں تو ضروری ہے کہ ہر ایک فرزند اسلام جہاد کے لئے ہر وقت آمادہ رہے، اس موقع پر بعض کمزور طبیعتیں مختلف قسم کے حیلے بہانے کر کے اس فکر میں رہتی ہیں کہ ان کو جہاد کی شرکت سے مستثنیٰ کر دیا جائے، آگے چل کر بتایا جائے گا کہ جنگ کے لئے تیاری نہ کرنا اور ایسے اسباب فراہم کرنا جن کی بنا پر جنگ میں شریک نہ ہو سکیں، نفاق ہے۔ پس آج ہر مسلمان اپنے حالات کا اندازہ لگا کر خود ہی اس امر کا فیصلہ کر لے کہ وہ کہاں تک نفاق میں مبتلا ہے۔ آئندہ آیات میں ان عذروں اور رکاوٹوں کو بیان کیا جاتا ہے جو جنگ شروع ہونے کے وقت عام طور پر پیدا کی جاتی ہیں، ہر ایک عذر لنگ کی حقیقت مستورہ کو بھی نقاب کر کے بتایا جائے گا کہ یہ سب باتیں غلط اور مہمل ہیں اور ہر ایک مسلمان کو جہاد کی تیاری کرنی پڑے گی۔

مذہبی تقدس



مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ كَيْفَ أَنْ يَعْبُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿۵۹﴾ إِنَّمَا يَعْبُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿۶۰﴾

”مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں اور اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے جائیں، یہی لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت گئے اور یہی لوگ آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، بس اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور نماز قائم کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا جس توقع ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔“

مسلمانوں کی مسجدیں صرف عبادت گاہیں ہی نہیں بلکہ تعلیم گاہیں اور دارالحکومت بھی ہیں، جامع مسجد کی حیثیت ناؤن ہال کی ہے، ان مسجدوں کو صرف وہی شخص آباد کر سکتا ہے جو عالم ہو اور قرآن حکیم کے مطالب سے نوجوبی واقف ہو۔ اور جو لوگ اس قرآن ہی سے نا آشنا ہیں، انہیں کیا حق ہے کہ اللہ کی مسجدوں میں قدم رکھیں، اگر ایک شخص قرآن سننا ہے اور اس کی گردن اس کے آگے نہیں جھکتی تو وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ کی مسجدوں کا اکرام اور ان کی نگہداشت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں ایمان باللہ و بالیوم الآخر ہو اور وہ اسلام کے ابتدائی حکموں کا بھی پابند ہو تو اس کے دل میں صرف ایک اللہ ہی کا خوف ہو گا اور دوسرے کی چاہت اس میں جگہ نہ پاسکے گی۔

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرِجَالٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (الاحزاب ۴) اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ کفر و شرک کے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں ان کی تمام تر زندگی باطل پرستار نہ سعی و کوشش کی مجسم تصویر ہوتی ہے، وہ اگر بعض اعمال صالحہ کے پابند ہوں، فرشتے بن کر لوگوں کے سامنے آئیں اور اپنی معصومیت سے عوام الناس کو فریفتہ کر کے انہیں یہ بتادیں کہ ہم تمہارے مقدس مقامات کا احترام کریں گے، تمہارے حقوق کی نگہداشت کریں گے، تمہارے مذہبی و سیاسی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں گے اور تمہیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش عمل میں لائیں گے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان جھوٹے وعدوں پر ہرگز اعتماد نہ کریں اور ان کی باتوں میں آکر جنگ سے باز نہ رہیں، کیونکہ یہ اعلان صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ فرزند ان اسلام ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور جہاد نہ شروع کر دیں۔ ان لوگوں کے وعدوں پر اعتماد کرنا خود اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے، وہ ان وعدوں کے کبھی پابند نہ ہوں گے، فاعتبدوایا اولی الابصار۔

احب الاعمال الى الله

گزشتہ آیات میں ابتدائی تعلیم پر زور دیا گیا تھا، اب ایک شخص اسی کو اپنی زندگی کا انتہائی مقصد بنالیتا ہے اور کہتا ہے کہ



نماز پڑھنا اور دوسرے لوگوں کو چند اعمال کا پابند کرنا ہی حقیقت اسلام ہے۔ ان ہی باتوں کو وہ اعلیٰ تعلیم خیال کرتا ہے اور ان کی وجہ سے اپنے آپ کو حقیقی جہاد فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ کرنا چاہتا ہے، مگر حسب ذیل آیات حقیقت کو یوں بے نقاب کرتی ہیں۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٩﴾

”کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کو اس شخص جیسا ٹھہرایا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

اس آیت کے شان نزول میں ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ عثمان بن طلحہ، عباس اور علی رضی اللہ عنہم میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی جس میں ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے پر ترجیح دیتا تھا، عثمان نے کہا میں بیت اللہ کا کلید بردار ہوں اور اگر چاہوں تو اس میں سو بھی سکتا ہوں۔ حضرت عباس نے جواب دیا: انا صاحب السقایۃ والقائم علیہا ولو اشاءت فی المسجد، ”میرے ذمہ حاجیوں کو پانی پلانا اور اس کی نگرانی ہے، میں بھی مسجد الحرام میں سونے کا مجاز ہوں۔“ اس پر حضرت علی نے کہا کہ میں ان باتوں کو تو نہیں جانتا، البتہ یہ ضرور ہے کہ میں اب تک جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہا ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسباب نزول میں ایک اور روایت بھی ہے جس کو مسلم نے اپنی صحیح میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں نعمان بن بشیر انصاری سے نقل کیا ہے، نعمان کہتے ہیں کہ میں چند صحابہ کے ساتھ منبر نبوی کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ تین آدمیوں نے آپس میں یہ گفتگو شروع کی، ایک نے کہا: ما ابالی ان لا اعمل للہ عملاً بعد الاسلام الا ان اسقی الحاج، ”قبول اسلام کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا اور کسی نیکی کی ضرورت نہیں۔“ دوسرے نے کہا، بلکہ مسجد حرام کی آبادی ضروری ہے۔ تیسرے نے جواب دیا: بل الجہاد فی سبیل اللہ خیر مما قلتم، ”سب سے بہتر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ مسجد نبوی کا احترام ضروری ہے، نماز سے فارغ ہو کر ہم دربار رسالت میں جا کر اس سوال کو پیش کر دیں گے۔ چنانچہ جمعہ کے بعد یہ لوگ گئے اور اس تمام گفتگو کو جناب رسالت سے عرض کیا تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ان دونوں روایات نے دراصل اس آیت کی تفسیر کر دی کہ جبکہ عالم اسلام پر مصیبتوں اور تکلیفوں کا گھناؤں اندھیرا چھا رہا ہو، شہنشاہ دین و ملت نے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لئے اپنی مجتمع قوت سے کام لیا ہو، تمام مقدس مقامات اور مرکز خلافت پر غیروں کا قبضہ ہو، سرزمین عرب پر غیر مسلموں کی نگرانی و بالادستی ہو، لاکھوں کروڑوں مسلمان ان کفار کے ظلم سے تنگ آ کر راتوں کو اٹھ اٹھ کر مضطربانہ دعائیں مانگتے ہوں جن کی آہ نیم شبی کنگرہ عرش کو بھی ہلا دیتی ہو، جبکہ اسلام اپنے ہر فرزند سے اس امر کا طالب ہو کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اپنا آخری قطرہ خون اسلام و خلافت کے بچانے کے لئے صرف کر دے اور جامعہ اسلامیہ کی حفاظت کے لئے سر بکف کوشش کرے، اس وقت ارباب عمامہ و علمائے سوء کا مدارس میں بیٹھ کر کتاب و سنت کے محض الفاظ کو دہراتے رہنا، چند ابتدائی مسائل پر اپنی تمام قوت صرف کر دینا، خافقا

ہوں میں بیٹھ کر صرف زبانی اللہ اللہ کے نعرے لگانا، اپنی بعض قوتوں کو مہذب کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا اور دن رات تسخیر قلوب کے اور ادو وظائف ہی میں منہمک رہنا اصل مذہب اور اساس ملت خیال کرتے ہیں۔ ان سے یہ کیونکر توقع ہو سکتی ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے غوامض و اسرار اور حقائق و معارف تک رسائی حاصل کر کے پورے مسلمان بن سکیں گے، ان کی تمام تر ذہانت و فطانت تو اپنے آپ کو اس حقیقت اسلامیہ سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش میں صرف ہوتی ہے، مگر وہ یاد رکھیں کہ قرآن حکیم کا نازل کرنے والا ایسے انسانوں کو ظالموں کے گروہ میں داخل کرتا ہے اور اس کے نزدیک ان لوگوں کے برابر بھی عزت و توقیر پر پشہ نہیں، قرآن نے دوسری جگہ اسی کو احب الاعمال الی اللہ فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَأَنَّهُمْ بُنَيَانٌ مَّرْصُوعٌ** (اصف ۴) نماز و روزہ تو دراصل شریعت اسلامیہ کا ایک رکن ہے اور جب تک انسان تمام احکام الہیہ کا پابند نہ ہو وہ کبھی سچا مسلمان نہیں بن سکتا۔ سورہ بقرہ نے بتایا: **لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ** (البقرہ ۱۷۷) سورہ نساء نے اس پر اور زیادہ روشنی ڈالی، جہاں اس نے قصر رکعات اور قصر جماعت پر بحث کی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے طرز عمل سے قصر اوقات بھی ثابت کر دیا جیسا کہ ہم سورہ بقرہ میں بیان کر آئے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک طالب علم ابھی ابھی سکول میں داخل ہوا ہے اور دوسرا کالج کی انتہائی تعلیم بھی حاصل کر چکا ہے، جس طرح یہ دونوں اپنے فرائض و اعمال حیات کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح یقین کر لو کہ مساجد الہی کی تعمیر اور مجاہد فی سبیل اللہ میں برابری کی کوئی نسبت ہی نہیں اور جو یہ خیال کرے کہ دونوں برابر ہیں تو قرآن حکیم ان کو ظالم کے نام سے یاد کرتا ہے، اس لئے کہ قوموں کی حیات و ممات کے راز سے وہ واقف نہیں۔ اگر تمہیں خیال ہو کہ احادیث میں افضل الاعمال نماز کو کہا گیا ہے تو وہ بھی اپنے درجہ میں ٹھیک ہے، یعنی انفرادی حیثیت میں وہی بہترین عمل ہے، مگر جب قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہو گا تو اس وقت اعلیٰ ترین عمل یہی جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا جائے گا۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ أَعْظَمَ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿١١٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَّتِ لَهُمْ فِيهَا نِعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿١١١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ أَجَزُّ عَظِيمٌ ﴿١١٢﴾

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بڑھ کر ہیں اور یہی مراد پانے والے ہیں، ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضامندی اور ان باغوں کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کو دائمی آرام ہے، ان ہی میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔“

حدیث میں آتا ہے: انا امرکم بخمس، اللہ امرنی بہنت الجباعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبیل اللہ، ”میں تمہیں پانچ باتوں کو حکم دیتا ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے ایسا ہی ارشاد ہوا ہے۔ لزوم جماعت، احکام کا سننا، اطاعت امیر، ترک وطن اور جہاد فی سبیل اللہ۔“ گویا نشانہ یہ تھا کہ جو لوگ اس رکن کے پورے پابند ہو چکے ہیں اب ان کے

فرائض بڑھ جائیں گے۔ جب وہ ابتدائی جبری تعلیم کو خوب اچھی طرح ادا کر رہے ہیں تو اب ان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کے نام پر جان دینے کو تیار ہوں۔ اگر نماز پر زور دیا گیا تھا تو اس سے مراد یہ تھی کہ اسلام کی تعلیم اس جگہ سے شروع ہوتی ہے، یہ مطلب نہ تھا کہ یہی اعلیٰ تعلیم ہے، پس کامیاب وہی رہیں گے جو اس اعلیٰ تعلیم کی جانب قدم بڑھائیں گے اور اپنی زندگی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر دیں گے۔ صرف اسی کے اختیار کرنے سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں: ان السیف محال لخطا یا (احمد) اور جنت کے ابواب بھی اسی تلوار کے سایہ میں ہیں: ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف (مسلم) پھر کون ہے جو اس جنت کا خریدار ہے؟

### دنیاوی ضروریات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٦١﴾ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَتَّخِشُونَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٦٢﴾

”ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو رفیق نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلہ میں عزیز رکھیں اور جو تم میں سے ان کی رفاقت کرے گا تو وہی لوگ گنہگار ہیں۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا خوف کرتے ہو اور جو بیبیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

بعض لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ماں باپ کی محبت، عزیز و اقربا کی نگہداشت، مساکین و یتامی کی نگرانی اور زمین و جائیداد کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، پھر اور صد ہا دنیوی ضرورتیں ہیں جن کو ترک نہیں کیا جاسکتا، اس بنا پر وہ استثنائی درخواست کرتے ہیں۔ انہیں جواب دیا گیا کہ ایک مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس نے سب محبتوں کو خیر باد کہہ کر صرف ایک اللہ اور اس کے کلمہ حق کی چاہت کے لئے اپنے دل کو مخصوص کر لیا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حریت حقہ کی اشاعت میں اس کے عزیز و قریب رکاوٹ بن جائیں۔ ایک مسلم کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (الحشر ۲۲) اس کی نسبت تو یہ کہا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّهُمْ لَبُّوا الْجَنَّةَ ۖ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (التوبہ ۱۱۱)

مشرکین کو مکہ سے نکال دیا گیا کہ وہ قرآن کو حکم نہیں مانتے تھے اور اس کی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ اس کے بعد

ابتدائی تعلیم شروع ہوئی کہ مسجدیں آباد ہوں اور حاجیوں کی خدمت کریں اور اعلیٰ ترین تعلیم یہ قرار پائی کہ ہر فرزند اسلام اللہ کے نام پر قربان ہونے کو تیار رہے۔ سر زمین عرب میں صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کے طریق کار کا اتباع کرتے ہوں، جن کی زندگی کی انتہائی غرض ہی یہی ہو کہ دنیا میں ایک عالمگیر اسلامی حکومت قائم کریں، قرآن حکیم کو کراہی کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچادیں اور اس فرض جلیل کے ادا کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہو، خواہ وہ عزیز و قریب ہی کیوں نہ ہوں، پھر کس قدر تعجب ہے کہ ایمان باللہ کا دعویٰ کرنے کے بعد دنیاوی ضرورتوں کی وجہ سے تم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دو اور اگر ایسا کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو جو غلامی و محکومی کی صورت میں نازل ہوگا۔

### قلت تعداد

بعض لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہماری تعداد کم ہے، ہمارے پاس سامان حرب نہیں، ہم ویسے بھی کمزور و ناتواں ہیں، ادھر مخالفین تعداد کے اعتبار سے، شان و شوکت کے اعتبار سے، سامان حرب کی فراوانی اور ذرائع و وسائل کی کثرت کے اعتبار سے ہم پر کہیں زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ایسے موقع پر دشمن سے جنگ کرنی ہلاکت کے مرادف ہے اور خود قرآن میں تصریح ہے: وَلَا تَلْقُوا بَايِدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ❶، ان لوگوں کو جواب دیا جاتا ہے:-

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۚ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۖ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَصَافَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَاءٍ رَحِيثٍ ثُمَّ وَلَيْتُمْ مُّذَبِّحِينَ ۖ ❷ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ❸ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ❹

”بہت موقعوں پر اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تمہیں مغرور کر دیا تھا تو وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود اپنی فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دے کر ہٹ گئے پھر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے رسول اور مسلمانوں پر تسکین نازل کی اور فوجیں اتاریں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو خوب سزا دی اور کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اللہ اس کے بعد جسے چاہے توبہ نصیب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

۸ ہجری میں جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن اور ثقیف کے دونوں قبیلے مکہ اور طائف کے درمیان حنین میں اس غرض کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں، بنو ہوازن کا سردار مالک بن عوف اور ثقیف کا عبد یالیل بن عمرو تھا۔ کفار چار ہزار اور مسلمان بارہ ہزار تھے، صحابہ کو اپنی کثرت پر ناز ہونے لگا اور بعض کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکل گئے: لَنْ نَغْلِبَ عَنْ قَلَةٍ، ”آج ہماری تعداد اتنی ہے کہ دشمن ہم پر غالب نہیں

❶ اس آیت کے متعلق جو مغالطہ ان کج فہموں کے قلوب میں ہے اس کو ہم نے اپنی تفسیر سورہ بقرہ المومنون بہ الخلافۃ الکبریٰ میں دور کر دیا ہے

آسکتا۔“ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدا میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا، تمام صحابہ پھر آپ کے گرد جمع ہو گئے، دوبارہ حملہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے شکست کے بعد فتح و کامرانی نوازش فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی یہ نصرت و امداد کچھ غرور و خنہیں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جنگ بدر، احد اور احزاب بھی اس میں شامل ہیں۔ ان آیات نے بتا دیا کہ قلیل تعداد کا عذر کر کے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے نہ رکنا چاہئے، اس لئے کہ جنگ میں کامیابی کے لئے کثرت تعداد کی ضرورت نہیں، بلکہ صبر و استقامت، استقلال و ثبات قدم اور ایثار و سرفروشی کی ضرورت ہے۔ جب یہ امتیازات ایک فوج میں ہوں گے تو وہ ضرور ایسے لشکر پر غالب آئے گی جو اگرچہ تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہو مگر اس میں فوجی ڈسپلن اور نظم و باقاعدگی کی کمی ہو اور جذبات حقہ کا فقدان ہو۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کہتا ہے: کَمْ مِّن فِئۡةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئۡةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (البقرہ ۲۴۹)

### غربت کا خوف

کفار و مشرکین کے ساتھ تجارتی تعلقات ہیں، مسلمانوں کی آمدنی کے ذرائع ان مخالفین ہی کے ہاتھ میں ہیں اور انہیں سے روپیہ وصول ہوتا ہے، اگر مسلمانوں کو ان دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی وجہ سے ہمارے تمام ذرائع آمدنی مسدود ہو جائیں گے، کہیں سے روپیہ وصول نہ ہو گا اور چاروں طرف سے غربت و افلاس ہم پر حملہ آور ہو گا، اس لئے مصلحت اس امر کی مقتضی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ ہی نہ کی جائے ورنہ تمام قوم کی قوم برباد ہو جائے گی۔ اس غلط فہمی کو قرآن حکیم یوں دور کرتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّا الْمُسْلِمِيْنَ كُنُوْا نَجَسٌ فَلَا يَغۡتَرِبُوْا اَلۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ؕ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيْکُمُ اللّٰهُ مِّنۡ فَضْلِهٖ اِنْ شَآءَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حٰکِمٌ ﴿۸﴾

”مسلمانو! مشرک تو نرے ناپاک ہیں تو اس سال کے بعد مسجد الحرام کے پاس نہ بھٹکنے پائیں اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے تو تم کو عنقریب اپنے فضل سے غنی کر دے گا، بیشک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

حج کے زمانہ میں عام طور پر دستور تھا کہ تجارت کی چیزیں وہاں کثرت سے آتیں اور خرید و فروخت کا سلسلہ جاری ہوتا، ذوالحجہ اور عکاظ کی منڈیاں خصوصاً اس بات کے لئے مشہور تھیں۔ وہاں میلے لگتے، بڑے بڑے تاجر اپنی دکانیں کھولتے اور مختلف قبائل اپنے مفاخر قومی بیان کرتے، جب اس سال مشرکین کا داخلہ بند ہو گیا تو قدرتی طور پر اس خیال کا آنا ضروری تھا کہ اب ہماری ضروریات کیونکر مہیا ہوں گی، کیونکہ کفار کے نہ آنے سے آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو گئے اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا: من این نعیش، ”اب کس طرح گزارہ ہو گا۔“ ان کے جواب میں فرمایا کہ مشرکین تو یکسر ناپاک ہیں، امراض کے جراثیم ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں، شرک و بت پرستی اور خیالات فاسدہ

کی اشاعت ان کی فطرت بن گئی ہے، جہاں جائیں گے یہ بیماریاں ان کے ساتھ ہوں گی اور ہر جگہ وبائے عام کی طرح پھیل جائیں گی، اس لئے ایسے ناپاک لوگوں کا مسجد حرام کے قریب بھی آنا حرام ہونا ضرور ہے، ہاں اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان کے نہ آنے سے تمہاری تجارت بند ہو جائے گی تو تم اس بد ظنی کو دل سے نکال دو اور محض اس وجہ سے جہاد فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر دو۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جو مسلمانوں کو دو لٹمنہ کر دینے کا وعدہ دیا تو دیکھو یہ الفاظ کس قدر جلد پورے ہو کر رہے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں پر چند ہی روز میں مسلمانوں نے قبضہ کر لیا اور تمام مہذب دنیا ان کے زیر نگیں ہو گئی۔ آج بھی جو لوگ ترک موالات کرنے سے صرف اس بناء پر رکے ہوئے ہیں کہ سرکاری ملازمت چھوڑ دینے پر ان کے گذارہ کی کیا صورت ہوگی تو وہ ان آیات میں بار بار غور کریں: ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ۔

### جزیرہ نمائے عرب

جمہور اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت سے صرف یہی مراد نہیں کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں بلکہ یہ کہ وہ کسی حال میں وہاں داخل بھی نہ ہوں اور مسجد حرام سے مقصود صرف احاطہ کعبہ ہی نہیں بلکہ تمام سر زمین حرم اور اس بارے میں اس کثرت سے صحیح احادیث مروی ہیں کہ کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے متعلق فرمایا: المدینۃ حرام ما بین عیدالی ثور، ”مدینہ کی زمین بھی مکہ کی طرح حرام ہے اور غیر و ثور اس کے حدود ہیں۔“ مسلم میں ہے: ان احرام ما بین لابق المدینۃ ان یقطع اعضاھا اذ یقتل صیدھا ”میں تمام مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں اس کی حدود میں شکار کرنا اور درختوں کا کاٹنا ممنوع ہے۔“ حضرت انس کی روایت کو بخاری و مسلم دونوں نے بیان کیا ہے: اللہم ان ابراہیم حرم مکۃ و ان احرام ما بین لابتیھا، ”خداوند ابراہیم نے مکہ کو حرام ٹھہرایا اور میں مدینہ کو حرام کرتا ہوں۔“

ظہور اسلام کے وقت مشرکین کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی عرب میں آباد تھے، یمن میں نجران عیسائیوں کا مرکز تھا، مدینہ کو خود رسول اللہ نے اپنی زندگی ہی میں ان عناصر سے پاک کر دیا تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ صحابہ کو لے کر یہودیوں کے بیت المدراں میں تشریف لے گئے اور فرمایا یا معشایہود! اسلموا تسلموا، ”یہودیو! اسلام لاؤ تو نجات پاؤ گے“، پھر فرمایا: اعلیو ان الارض للہ و لرسولہ و ان ارید ان اجلیکم من ہذا الارض فن وجد منکم ببالہ شیئاً فلیبعہ والا فاعلموا ان الارض للہ و رسولہ، ”میں نے تمہیں اس ملک سے خارج کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، پس اگر تم اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کر لو ورنہ یقین کر لو کہ اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے۔“ آپ کی وفات کے بعد خیبر اور نجران ہی دو ایسے مقامات باقی رہ گئے تھے جہاں ابھی یہودیوں اور عیسائیوں کی آبادی تھی، اس لئے وفات سے قبل آپ نے ان کے اخراج کی وصیت فرمادی۔ مرض الموت میں جن تین باتوں پر آپ نے خاص طور سے زور

دیا ان میں سے ایک بات یہ تھی: اخراجوا المشرکین من جزیرۃ العرب، ”مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو“۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہود و نصاریٰ کے الفاظ موجود ہیں: لاخر جن اليهود والنصارى من جزیرۃ العرب حتى لا ادم الا مسلما، ”میں جزیرہ عرب سے تمام یہود و نصاریٰ کو نکال کر اس کو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص کر دوں گا“۔ ایک حدیث میں ہے: اخراجوا اليهود اهل الحجاز و اهل نجران من جزیرۃ العرب۔ نجران سے عیسائیوں کے اخراج کے متعلق امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے: ما زال عمر حتى وجد الثبت عن رسول الله انه قال لا يجتمع بجزیرۃ العرب دينان فقال من كان له من اهل الكتابين عهد فليأت به انغذله والا فاني مجليكم فاجلاهم، ”حضرت عمر حدیث“ لا يجتمع بجزیرۃ العرب دينان ”کی اصلیت کے متعلق تحقیقات کرتے رہے، جب یہ روایت پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگر کسی اہل کتاب کے پاس کوئی عہد نامہ ہو تو وہ لائے کہ میں اسے نافذ کر دوں، ورنہ میں انہیں جلا وطن کر دوں گا، چنانچہ عدم ثبوت کی بنا پر انہوں نے تمام عیسائیوں کو نجران سے خارج کر دیا“۔

اب صرف جزیرہ نمائے عرب کی تحدید کا سوال رہ جاتا ہے، اس کے متعلق تمام جغرافیہ دان اس امر پر متفق ہیں کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں داہنی جانب دجلہ ہے اور عرض کا خط کھینچیں تو بائیں شام۔ آج کل کے جغرافیوں میں یہ حدود بیان کی جاتی ہیں: بچچم میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند، پورب میں خلیج فارس اور دکن میں ملک شام۔

## فصل سوئم

### جاہدوا فی اللہ حق جہادہ

#### اصلاح عام

اس میں شک نہیں کہ جہاد کا اصلی مقصد دنیا میں امن قائم کرنا ہے، قرآن حکیم نے خود اس کی حد بتادی حتی تضع الحرب اوزارها (محمد ۴) ”جس وقت جنگ اور اس کے تمام اسباب بند ہو جائیں اور زمین امن کا گہوارہ بن جائے“ تو فرزند ان اسلام بھی اپنی تلواریں نیام میں کر لیں۔ لیکن اس جنگ کے لئے یہ شبہ پیدا کیا جاسکتا ہے کہ کافروں کو تو بیشک تلوار کے گھاٹ اتارنا ضروری ہے، اس لئے کہ وہ توحید کے نہایت ہی سخت مخالف ہیں، مگر باقی مذہبوں کو کیوں نشانہ جہاد بنا یا جائے اور انہیں کیوں نہ اپنے خیالات کی اشاعت کا موقع دیا جائے؟

اگر آپ غور کر کے دیکھیں تو دنیا میں سب سے بڑے دو مذہب ہیں، یہودیت و نصرانیت، ان میں زمانہ دراز تک



انبیاء کا سلسلہ قائم رہا اور ان کے پاس کتب الہیہ ابھی موجود ہیں۔ پہلے ان کے حالات کو دیکھو، باوجود اہل کتاب ہونے کے انہوں نے کیسے کیسے غلط عقائد اپنی طرف سے بنائے ہیں، جب ان کی دروغ بافیوں کی یہ کیفیت ہے تو اور مذاہب تو ان سے کہیں زیادہ خراب حالت میں ہیں، پھر جب اہل کتاب کے ساتھ جنگ کرنی ضروری ہے تو باقی ادیان کے ساتھ بدرجہ اولیٰ لازمی ہوگی، اس لیے قرآن حکیم صرف اہل کتاب کے عقائد و اعمال پر بحث کرتا ہے، اسی پر دوسرے مذاہب کو قیاس کرلو۔

فَاتَّبِعُوا الذِّينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الذِّينِ اُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَهُمْ لَمِغْرُونَ ﴿۵﴾

”جو نہ اللہ کو ماننے میں اور نہ روز آخرت کو اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دیا اور نہ سچا دین قبول کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے، ان لوگوں سے لڑو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔“

اہل کتاب میں حسب ذیل امراض موجود ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور جب تک اس ذات واحد پر ایمان نہ ہو انسان بیشتر حالات میں کبھی نیک کاموں کا خوگر نہیں ہو سکتا۔

(ب) جزائے اعمال کا یقین نہیں، اس لئے اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے اور ہر برائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حالانکہ قیامت پر ایمان لانے کا مثالیہ تھا کہ لوگ ہر وقت احتساب اعمال کا خیال رکھیں مگر انہوں نے قیامت کا تصور ہی ایسا بگاڑ دیا ہے کہ اب لوگ کفارہ کے بھروسہ پر اپنے آپ کو ذمہ دار خیال نہیں کرتے اور اس طرح ان کی زندگی امن عالم کے لئے خطرناک بن گئی ہے۔

(ج) شرائع الہیہ نے جن چیزوں کو متفقہ طور پر حرام کر دیا ہے وہ ان کو بھی حلال سمجھتے ہیں، شراب خوری ان کا لازمہ حیات ہے، بلکہ عیسائی حکومتیں اپنی نگرانی میں اس کو فروخت کرتی ہیں اور لوگوں کو اس کا ٹھیکہ لینے پر مجبور کرتی ہیں، زنا ان کے نزدیک کوئی جرم نہیں، حکومت کی سرپرستی میں قمار خانے کھلے ہیں اور سود پر تو ان کی زندگی کا دار و مدار ہے۔

(د) جرائم پیشہ قبائل کی طرح یہ کسی مقررہ قانون کے پابند نہیں۔

یہ ان لوگوں کے عقائد ہیں جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں، جن کا دعویٰ ہے کہ نلن تمسنا النار الا ایاما معدودات، ”ہم صرف چند روز تک جہنم میں جائیں گے“، جو یہ کہا کرتے ہیں نلن یدخل الجنة الا من کان ہودا اونصاری، ”جنت کے ٹھیکیدار صرف یہودی اور عیسائی ہیں۔“ پس جب ان کے ساتھ جنگ کرنی ضروری ہے تو باقی مذاہب کے ساتھ بدرجہ اولیٰ کرنی پڑے گی اور اس جنگ سے مقصد یہ ہے کہ ان کو اتنا ذلیل کر دیا جائے کہ سر اٹھانے کے



قابل نہ رہیں، کیونکہ اگر انہیں حکومت مل گئی تو ان خیالات کی اشاعت میں سربکف کوشش کریں گے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور اس طرح امن عامہ خطرہ میں پڑ جائے گا۔ پس اصلاح عالم کی خاطر ان کو اتنا عاجز کر دیا جائے کہ مسلمانوں کو جزیہ دیں، معن یدوہم صاغدون سے یہ مراد نہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ذلت آمیز سلوک کیا جائے، محکوم ہونا سب سے بڑی ذلت ہے اور یہ کافی ہے۔

### غلط عقائد

اب ان کے بعض عقائد کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، اسی ذیل میں ان کے کارناموں پر بھی روشنی پڑیگی۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ۚ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۚ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِيُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَتَلْتَهُمُ اللَّهُ أَتَى يَوْمُكَ كُفُونٌ ۝

”اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، یہ ان کا قول ان کے منہ سے ہے، اگلے کافروں کے قول کی ریس کرنے لگے، اللہ ان کو غارت کرے کہاں پھرے جارہے ہیں۔“

باوجود اس بات کے کہ یہود و نصاریٰ کتب آسمانی کے حامل اور رسولوں کے سلسلہ سے واقف ہیں، پھر بھی انہوں نے اپنے عقائد میں شرک کو داخل کر لیا ہے۔ ابراہیم سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک صد ہا انبیاء ان میں مبعوث ہوئے جن کی تعلیم یہ تھی کہ صرف ایک اللہ کی غلامی کرنی چاہئے فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (البقرہ ۱۳۲) ”مرو تو مسلمان مرو“۔ مگر پھر بھی یہودیوں کا ایک فرقہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگا اور اسی قسم کے واہیات باتیں عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسو ب کہیں۔ مذہبی آدمی ہو کر مشرکوں کی سی باتیں کرتے ہیں، لعنت ہو ان پر کیسی کفر کی باتیں اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔

### شرک فی الاعمال

جب عقائد میں شرک آگیا تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان کے اعمال بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ گزشتہ آیات میں ان کے غلط عقیدوں کا تار و پود بکھیرا تھا اب ان کے اعمال کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

”انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علموں، پیروں اور مسیح بن مریم کو خدا بنالیا، حالانکہ انہیں صرف یہ حکم ہوا تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ان کے شریک بنانے سے وہ پاک ہے۔“

علماء اور مشائخ کی عزت صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے کلام کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے کلمۃ الحق کی اشاعت ہوتی ہے، اگر یہ خصوصیت ان میں قائم نہ رہے اور ان کی ہر بات بے چوں و چرا تسلیم کی جانے لگے تو پھر

ان میں فرعونیت کا پید ا ہونا لازمی ہے۔ اہل کتاب میں یہی خرابی تھی کہ انہوں نے کتاب اللہ کو تو پس پشت ڈال دیا تھا اور اپنے پیروں اور عالموں کے اقوال کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیا تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ایک روز دربار رسالت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ سورۃ براءۃ کی یہی آیت تلاوت فرما رہے تھے، عدی نے عرض کیا: انہم لم یعبدوہم، ”وہ لوگ ان کی پوجا تو نہیں کرتے تھے“، آپ نے فرمایا: بیل انہم حرموا علیہم الحلال واحلولہم الحرام فاتبعوہم فذلک عبادتہم ایاہم، ”ان علماء و مشائخ نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا تو ان لوگوں نے انکا اتباع کیا، عبادت کا یہی مطلب ہے۔“

يُيَذُّونَ اَنْ يُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبٰى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُتِمَّ نُورُهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ﴿٣٠﴾ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۚ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾

”چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اگرچہ کافر برائیاں مگر اللہ اپنا نور ضرور پورا کر کے رہے گا، اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا تا کہ ہر دین پر اس کو غالب کر دے اگرچہ مشرک ناخوش ہوں۔“

حاملین مذہب ہونے کی حیثیت سے تو ان کا اولین فرض تھا کہ کتاب الہی کے ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ کو دنیا کا دستور العمل بنانے کی کوشش کرتے، مگر ان بد بختوں کی عقل پر ایسے پتھر پڑ گئے کہ اس فرض کو انجام دینے کی بجائے ان کی کوششوں نے ایسا غلط راستہ اختیار کر لیا ہے کہ اس کا نتیجہ حق کی آواز کو پست کر دینا ہے، مگر وہ یاد رکھیں کہ اللہ کا نور پورا ہو کر رہے گا۔ اہل کتاب کو بہترین مذہب دیا گیا، مگر انہوں نے اس کی تعلیم کو بالکل بگاڑ دیا، اب مذہب کے مقصد اصلی کو پورا کرنے کے لئے ایک رسول آیا ہے جس کا دین تمام دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔ یہود و نصاریٰ اس مذہب کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہیں گے اس لئے مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ ان کو کمزور کر دیں۔

احادیث میں تفصیل کے ساتھ اس فتح و کامرانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ان اللہ ذوی لی الارض مشارقہا و مغاربہا ویسبغ ملک امتی ما ذوی لی منها، ”اللہ تعالیٰ نے زمین کے مشرق و مغرب کو لپیٹ کر میرے سامنے رکھ دیا، جس قدر زمین لپیٹ دی گئی وہ سب میری امت کے زیر حکومت ہوگی۔“ مسند امام احمد میں ہے: انہ ستفتح لکم مشارق الارض و مغاربہا و ان عملہا فی النار الا من اتقی اللہ وادی الامانۃ، ”زمین کے مشرق و مغرب تمہارے لئے مفتوح ہوں گے اور اس کے حکام میں سے صرف وہی لوگ جنت کے مستحق ہوں گے جو تقویٰ اللہ اختیار کریں اور ادائے امانت کے خوگر ہوں۔“

عالم اور دولتمند

لِيَكُنَّ الدِّيْنُ اَمْنًا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَخْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُوْنُ اَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنِ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ يَكْنٰوْنُ الذَّهَبَ وَ الْفِصَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾ يَوْمَ يُخْلٰى عَلَيْهِمْ نَارٍ جَهَنَّمَ

فَتُكْذِبُ بِهَا جِبَاهَهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا تَفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٥٠﴾

”مسلمانو! اہل کتاب کے اکثر عالم اور پر لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو، جس دن وہ دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پشتیں داغی جائے گی اور کہا جائے گا کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔“

ان علماء اور مشائخ کی یہ حالت ہے کہ غلط عقیدے اور رسمیں بنا کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں، خود بدترین نمونے بن کر لوگوں کو سیدھے راستے سے روکتے ہیں اور اس طرح علم صحیح کی اشاعت نہیں ہونے دیتے۔  
قوم کی تباہی اس وقت آتی ہے جب اس کے علماء و مشائخ اور ارباب دولت خراب ہو جائیں اور بالکل مردہ بن جائیں، اہل کتاب کے عالموں اور پیروں کی حالت تو معلوم ہو گئی اب دولتمندوں کو دیکھو جن کو روپیہ اس لئے دیا گیا تھا کہ جتنا روپیہ ان کی ضروریات سے بچ جائے وہ رشتہ داروں اور قومی کاموں میں صرف کریں، مگر انہوں نے زمین میں گاڑنا شروع کر دیا، اس لئے قیامت کے روز قانون مکافات عمل کے مطابق یہی روپیہ گرم کر کے ان کے جسموں کو اس سے داغا جائے گا<sup>۱</sup>۔

جہاد ہمیشہ رہے گا

یہاں تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ کسی بڑی سے بڑی مذہبی جماعت کا تقدس ہمیں جہاد فی سبیل اللہ سے روک نہیں سکتا، اب بتایا جاتا ہے کہ اشہر حرم اور مقدس مہینوں میں بھی جنگ نہیں رک سکتی، بلکہ ہمیشہ جاری رہے گی۔

۱ ان آیات میں اہل کتاب کے عالموں، پیروں اور دولتمندوں کا تذکرہ ہے لیکن اگر تم غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ان کا ایک ایک حرف آج بھی امت مسلمہ پر صادق آ رہا ہے۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں: من فسد من علماء ثنائین فیہ شبہ من الیہود ومن فسد من عبادنا کان فیہ شبہ من النصارى، ہمارے عالموں سے جو خراب ہو اس میں ضرور یہودیت اثر کر گئی ہے اور اگر ہمارے صوفیا خراب ہوں تو وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں۔ علماء و مشائخ کو دیکھو وہ کس طرح دنیا سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں مگر سب سے زیادہ حریص اور طامع وہی ملیں گے، سچ ہے:

عجبت من شیخی ومن زهدا      وذكرہ النار واهوا لها!

ترجمہ: میں اپنے شیخ اور اس کے زہد کو دیکھتا ہوں اور جس وقت وہ دوزخ اور اس کی تکالیف کا ذکر کرتا ہی تو حیرت میں رہ جاتا ہوں۔

یکبرہ ان یشرب فی فضا      ویسرق الفضا اتنا لها!

ترجمہ: چاندی کے برتن میں پانی پینا اس کے نزدیک کر وہ ہی لیکن اگر چاندی کو کہیں دیکھ پائے تو فوراً چالے۔

ابن المبارک نے خوب کہا:

وهل افسد الدین الا لبلوک      و احبار سوء ورهبانها!

ترجمہ: اور دین کو دو دولتمندوں علماء سوار صوفیاء کے سوا اور کس نے خراب کیا ہے۔

ہمارے زمانہ کے بھی اکثر عالموں اور پیروں نے اپنی آمدنی کے چند ذرائع مقرر کر لئے ہیں اور چونکہ ان کا مقصد جمع مال ہو تاہیں اس لئے وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ لوگ ان کے مجوزہ طریقوں کو ترک نہ کر دیں پھر اس صورت میں انہیں قرآن میں غور کرنے کا کہاں موقع مل سکتا ہے۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ  
الَّذِينَ انْقَضَتْ فَلَا تُحِلُّوا فِيهِمْ أَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْبَشَرَ كَيْدًا كَافَّةً كَمَا يُفْتَاتُونَكُمْ كَافَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ  
الْمُتَّقِينَ ﴿٥٠﴾

”اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے جس دن اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ان میں چار مہینے  
ادب کے ہیں، یہی دین سیدھا ہے تو ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو اور تم تمام مشرکین سے لڑو جس طرح وہ تم سب سے  
لڑتے ہیں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ مسلسل کام کرنے کے بعد وہ آرام کی طلبگار ہوتی ہے، اس لئے جب جہاد ہمیشہ رہے گا تو  
ضروری ہوا کہ سپاہیوں کو سال بھر میں چار ماہ کی رخصت دی جائے اور وہ ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب ہیں۔ ان دنوں  
مسلمانوں کو اپنی طرف سے جنگ شروع کرنے کی ممانعت ہیں، لیکن اگر کفار کی جانب سے ابتدا ہو تو جواب دینے کے لئے  
خود مسلمانوں کو بھی ہتھیار سنبھالنے پڑیں گے۔ ان مہینوں کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی جیسا کہ بعض اہل علم کا خیال ہے  
بلکہ یہ حرمت قیامت تک رہے گی اور اس کا منشا صرف اتنا ہے کہ مسلمان جنگ کی ابتدا نہ کریں۔ حدیث میں آتا ہے:

ان النبی ﷺ خطب فی حجة فقال الزمان قد اstdار کھیئة یوم خلق السموات والارض السنة اثنا عشر شهر  
منها اربعة حرم ثلاثة متوالیات ذوالقعدة وذوالحجة والمحرّم ورجب الذی بین جمادی وشعبان (بخاری) ”حجۃ  
الوداع کے روز رسول اللہ ﷺ نے ایک مبسوط خطبہ دیا جس میں آپ نے فرمایا کہ سال کے بارہ مہینے ہیں ان میں سے  
ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب حرام ہیں۔“ اب جو لوگ ان مہینوں کی حرمت کو منسوخ مانتے ہیں وہ بتائیں کہ حجۃ الوداع  
کے بعد آپ نے کس وقت نسخ فرمایا؟

ان مہینوں کی حرمت کے قائل اب تک صرف اہل عرب ہی تھے مگر اب قانون کو عام کیا جائے گا اور چونکہ اسلام  
عالمگیر مذہب ہے، اس لئے تمام دنیا کے مسلمان ان مہینوں کا احترام کریں گے، مگر اس حرمت سے یہ مراد نہیں کہ تم  
بے دست و پا ہو کر بیٹھ جاؤ بلکہ جب مخالفین تم کو متحد ہو کر تباہ کرنا چاہتے ہیں تو تم بھی اکٹھے ہو کر ان کا نام و نشان مٹا دو، جب  
تمام دنیا تمہیں برباد کرنے کی ٹھان لے تو اس وقت کمال تقویٰ یہی ہے کہ تم بھی ان کی فناسامانی پر کمر بستہ ہو جاؤ۔

دھوکا دہی

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوْطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ  
فِيحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زَيْنَ لَهُمْ سُوَ أَعْمَالِهِمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٥١﴾

”بس مہینوں کا سرکا دینا کفر میں زیادتی ہے، جس سے کافر گمراہ کئے جاتے ہیں کہ اس مہینے کو ایک برس حلال سمجھتے ہیں  
اور دوسرے برس کو حرام کرنے لگتے ہیں تاکہ گنتی پوری کر لیں جو اللہ نے ادب کی رکھی ہے، پھر جو اللہ نے حرام کیا

حلال کر لیں ان کی بدکرداریاں ان کو آراستہ کر دکھائی گئی ہیں اور اللہ کا فرقہ کو ہدایت نہیں دیتا۔“  
عرب کے لوگ ابراہیمی ملت پر ہونے کی وجہ سے ان مہینوں کی تعظیم تو ضروری خیال کرتے تھے۔ چونکہ وہ جنگجو تھے اور ان کا گزارہ عام طور سے لوٹ مار پر تھا اس لئے تین ماہ تک مسلسل خاموش رہنا بھی ان کے لئے سخت تکلیف دہ تھا، اس لئے جنگی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وہ ان پاک مہینوں میں تبدیلی کر دیتے اور حج کو موخر کر دیتے، اس عادت کو النسی کہا گیا ہے، اس بیہودہ حرکت کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ مہینے حلال بن جاتے اور حلال کو حرام بنا کر نافرمانی کے مرتکب ہوتے، اس کے علاوہ فریب کاری بھی تھی۔ اسلام نے ان مہینوں کی حرمت کو قانونی شکل دے دی، اب کسی شخص کو طاقت نہیں کہ اس حرمت کو بدل سکے بلکہ جو لوگ ان کا احترام نہ کریں گے ان سے جنگ کی جائے گی۔

### کوئی استثنا نہیں

گذشتہ آیات کا حاصل یہ تھا کہ تمہیں اہل کتاب سے جنگ کرنی پڑیگی، اب اس غزوہ کا تذکرہ آتا ہے جس میں اہل کتاب سے جنگ ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا كُنْكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَثَأَقَلُّتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۖ أَرَضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۖ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٥٠﴾

”مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو زمین پر ڈھسے جاتے ہو، کیا آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر راضی ہو بیٹھے، سو آخرت کے حساب میں دنیا کی زندگی کا فائدہ کچھ نہیں مگر تھوڑا۔“

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ہر قل شاہ روم نے چالیس ہزار فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی ہے، آپ نے یہ خبر سنتے ہی اعلان کر دیا کہ تمام مسلمان بلا استثنا تیار ہوں، لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ قحط کی وجہ سے تمام لوگ پریشان تھے، شام کی سرحد پر تبوک واقع تھا جہاں مسلمانوں کو جنگ کے لئے جانا تھا، ادھر مدینہ کے تمام نخلستان پک چکے تھے اور یہی وقت کھجوروں کے اتارنے کا تھا، اس پر گرمی کی شدت مستزاد، پھر مقابلہ ایک ایسی فوج سے تھا جو نظم و ترتیب اور قوت و طاقت میں کہیں بڑھ چڑھ کر تھی، یہ امتحان کا وقت تھا اور بعض مخلصین سے لغزش کا ظہور ہوا۔ باوجود ان تمام باتوں کے تیس ہزار فرزند ان اسلام توحید کے جھنڈے کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کے فقر و فاقہ کی یہ کیفیت تھی کہ دس صحابہ میں ایک سواری تقسیم ہوئی، خوراک بھی بہت کم تھی، اس لئے غزوہ تبوک کو جیش العسرة بھی کہتے ہیں، اس آیت میں اسی جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

حکومت کا مرکز قائم ہو چکا ہے، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو جاری کرنے کے لئے اس مرکز کو مضبوط کر دیا جائے، ورنہ اس کی کمزوری سے دشمن فائدہ اٹھائیں گے۔ اس وقت عیسائیوں کی ایک جماعت مسلمانوں کو تباہ

کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، پھر ایسے وقت میں مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ جب انہیں اللہ کی راہ میں اور اس مرکز کے بقا کی خاطر جہاد کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو کابلی اور سستی کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا راز صرف جہاد ہی میں پنہاں ہے: اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِیَاۤیْحٰیہِیْکُمْ (الانفال ۲۴) ”جب اللہ اور اس کا رسول تم کو ایسی چیز کی دعوت دے جس میں تمہاری زندگی ہے تو اسے فوراً لبیک کہو“۔ کیا تم دنیا کی چند روزہ زندگی پر فریفتہ ہو گئے ہو حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ حدیث میں آتا ہے: ما الدنیا فی الاخرۃ الا کما یجعل احدکم اصبعہ ہذا فی الیم فلینظر یم ترجع و اشار بالسبابۃ (مسلم) ”اپنی شہادت کی اگلی سمندر میں ڈال کر دیکھو اس کے ساتھ کس قدر پانی آتا ہے یہی حال دنیا کا آخرت کے مقابلہ میں ہے۔“

اَلَا تَنْفَعُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۚ وَ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَصْرُوْهُ شَیْئًا ۚ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

”اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو دردناک عذاب دے گا اور تمہارے بدلے دوسرے لوگ پیدا کر دے گا اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو یہ خیال نہ کرنا کہ تمہارے رہ جانے سے مسلمانوں کی ترقی رک جائے گی، یہ تو نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جگہ سخت ترین عذاب ہو گا۔ دنیا کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ جس قوم نے بھی تلوار سے علیحدگی اختیار کی ہے اس کا کیا انجام ہوا ہے، کس طرح اس نے جنگجو اقوام کے لئے جگہ خالی کر دی ہے؟ اور خدا کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ ایک قوم کی تباہی پر دوسری کو کھڑا کرے: فاعتبوا یا اولی الابصار۔

غار ثور کا واقعہ

اَلَا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِثْنِیْنِ اِذْ هُبَاۤیِ النَّاٰرِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْہَا وَجَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا السُّفْلٰی ۚ وَکَلِمَۃَ اللّٰہِ هِیَ الْعُلَیَّا ۚ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝

”اگر رسول کی مدد نہ کرو گے تو یقیناً اللہ ان کی مدد کر چکا ہے جس وقت ان کو کافروں نے نکالا ہے کہ وہ دو میں دوسرے تھے، جب دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ تم غم نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اپنی طرف سے ان پر تسکین اتاری اور ایسی فوجوں سے ان کی مدد کی کہ تم نے ان کو نہیں دیکھا اور کافروں کی بات نیچی ہو کر رہی اور اللہ ہی کا بول بالا اور اللہ غالب صاحب تدبیر ہے۔“

اس آیت میں غار ثور کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ جب کفار مکہ نے ظلم و ستم میں حد سے تجاوز کیا اور دارالندوہ میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا تو وحی الہی نے آپ کو مدینہ کی جانب ہجرت کرنے

کی اجازت دی۔ آپ اور حضرت ابو بکر شب کے وقت شہر سے نکلے اور تین میل کے فاصلہ پر غار ثور میں چھپ گئے، کفار بھی آپ کی تلاش میں وہاں آگئے اور ادھر ادھر تلاش کرنے لگے اس وقت حضرت ابو بکر کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں آپ کو نہ دیکھ پائیں، آپ نے فرمایا: لا تحزن ان اللہ معنا:

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است!

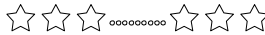
ایسے خوف اور دہشت کے وقت میں سکون و اطمینان قلب کا رہنا بڑی ہی قوت کا کام تھا، اس اطمینان اور استقلال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر بے نیل مر ام گھروں کو واپس لوٹے اور خدا کی بات پوری ہو کر رہی، اللہ کی بات تو ہر صورت میں اوپر ہی رہے گی مگر مسلمانوں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ اللہ کا دست عمل بن کر اس کے قانون کو بلند کریں ورنہ وہ تو فرشتوں سے بھی کام لے سکتا ہے، اگر تم نے اس کو اپنا مقصد حیات نہ بنایا تو تباہ کر دیئے جاؤ گے۔

ہر وقت تیار رہو

إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۵۹﴾

”ہلکے اور بو جھل نکل کھڑے ہو اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، اگر تم علم رکھتے ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

ایک مسلمان کا فرض یہی ہے کہ وہ کسی حالت میں ہو جس وقت الجہاد! الجہاد! کا اعلان سے فوراً میدان جنگ میں حاضر ہو جائے اور اپنی ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دے۔ اسے نہ تو افلاس اور دو لہتمندی مانع ہو، نہ انفرادی اجتماع کا خیال ہو، جوانی اور بڑھاپے کی جانب توجہ نہ ہو اور پیدل اور سواری کا خطرہ تک نہ آنے پائے، غرض یہ کہ شخصی مصلحتوں پر غور کئے بغیر ہر وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار رہے۔



## باب ۲ فصل اوّل ارباب نفاق

### مصالح خصوصی

اب تک گزشتہ آیات میں ان مشکلات کو بیان کیا گیا تھا جو جہاد فی سبیل اللہ شروع ہونے سے قبل لوگوں کے لئے رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہیں، اب ان امور پر بحث ہوتی ہے جو جنگ شروع ہونے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعْدَتْ عَنْهُمْ السُّبَّةُ ۖ وَ سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٥﴾

”اگر کچھ فائدہ قریب الحصول اور سفر متوسط درجہ کا ہو تا تو تمہارے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو مسافت دور معلوم ہوئی اور اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے بن پڑتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوتے، یہ لوگ اپنی جانیں وبال میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔“

تمام عیسائی دنیا مسلمانوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے، ہر طرف سے ان پر حملے ہو رہے ہیں، ان کے ملکوں پر غیروں کا قبضہ ہو رہا ہے مگر آہ ٹم آہ! مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اس سخت ترین مصیبت کے وقت مدافعت کے فرض سے الگ رہنے کی فکر میں ہیں، وہ اوّل تو یہ چاہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین دلادیا جائے کہ جنگ میں کامیابی قطعی ہے، وہ انجام کی فکر میں ہیں اور بغیر اس نتیجہ کے معلوم کئے آگے بڑھنا خلاف عقل سمجھتے ہیں، دوسرے ان کی دلی آرزو یہ ہے کہ سفر بھی دور داز کا نہ ہو، کسی قسم کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بیکار ہیں اور یہ انہیں کو سوچتی ہیں جن کے دل ملک اور قوم کی ہمدردی سے خالی ہوں اور صرف زبانی باتوں سے مسلمانوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، بلکہ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ضرور اس موقع پر مدد کرتے، مگر حق یہ ہے کہ انہیں اپنے آپ کو جنگ سے مستثنیٰ کرنے کا کوئی حق نہ تھا، ان کا فرض تیاری کرنا تھا، چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے انہیں ضرور سزا ملے گی اور ان حرکتوں سے وہ اسلام کو نقصان پہنچانے سے رہے خود اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالیں گے ①۔

① ان آیات میں اگرچہ غزوہ تبوک کی طرف اشارہ ہے مگر یہ آج بھی ہم مسلمانوں پر صادق آ رہی ہیں، اپنے گرد و پیش دیکھو اسلامی حکومتوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور ہم کس خواب خرگوش ہیں۔



## عفو و درگزر

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ ۚ لِمَ أَذْنَتْ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَّبِعَنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَذِبِينَ ﴿٦٠﴾ لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٦١﴾

”اللہ نے تم کو معاف کر دیا، تم نے ان کو کیوں اجازت دے دی تھی یہاں تک کہ تم پر سچے ظاہر ہو جاتے اور یہ کہ تم جھوٹوں کو جان لیتے، تم سے وہ لوگ رخصت نہیں مانگتے جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے ہیں کہ اپنے مال اور جان سے لڑیں اور اللہ پر ہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔“

جس وقت بعض منافقین نے غزوہ تبوک سے مستثنیٰ ہونے کی درخواست پیش کی تو آپ نے مصلحت سے کام لے کر ان کے جھوٹے عذر قبول کر لئے۔ ان لوگوں کے عذروں کو قبول کر لینا یہ معنی رکھتا تھا کہ ان کو ہلاکت میں جانے کا موقعہ دیا جا رہا ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم نے تمہاری خطا معاف کر دی اور یہ غلطی اس قسم کی ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کی بے اعتنائی کو دیکھتا ہے اور پروا نہیں کرتا، ایسا کرنا اس کی شفقت کے خلاف ہے، اس کے بعد فوراً ایک قاعدہ کلیہ بتادیا گیا کہ ارباب ایمان کبھی استثنائی درخواست نہ کریں گے بلکہ ان کی تو ہمیشہ یہی آرزو رہتی ہے کہ وہ اپنی ہر چیز اللہ کے نام پر قربان کر دیں: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین (الانعام ۶۲) ”میری ہر قسم کی عبادت زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لئے ہے۔“

## شکی لوگ

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَذَدُّونَ ﴿٦٢﴾ وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً ۚ وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقُعْدِينَ ﴿٦٣﴾

”بس تم سے وہی رخصت مانگتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے تو وہ اپنے شک ہی میں بھٹکتے ہیں اور اگر نکلنا چاہتے تو اس کا کچھ سامان تیار کرتے، لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا ناپسند ہو اتوان کو کامل بنادیا، اور کہدیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔“

یہاں سے نہایت ہی تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں جو بظاہر تو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور باطن اس کی بیخ کنی کی فکر میں رہتے ہیں، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے حالات کو پڑھ کر اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔

جنگ سے بھاگنے کی صرف وہی شخص کو شش کرے گا جس کا دل ایمان سے خالی ہو، جسے ہر وقت یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ مسلمانوں کا پابند مذہب بن کر ترقی کرنا ممکن نہیں اور اسی شک کی وجہ سے وہ خود حیران و سرگردان پھرتا ہو کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان لوگوں کا ارادہ جنگ کے لئے نکلنے کا تھا اور معذور ہونے کے باعث رہ گئے تو یہ خیال بھی غلط ہے، اس لئے کہ تیاری کرنا ان کا فرض تھا، اس کے بعد اگر کوئی دقت پیش آ جاتی تو یہ امام کا کام تھا کہ ان کو مستثنیٰ کر دیتا، یہ خود اپنے آپ کو مستثنیٰ کرنے والے کون تھے، یہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نااہلوں کو جہاد کی عزت سے محروم رکھنا چاہتا تھا اس لئے سستی اور کابلی کا شکار بن گئے اور شرکت سے محروم رہے۔

### جاسوس ہیں

لَوْ خَرَجُوا فِیْكُمْ مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا أُوْضِعُوا لَكُمْ مِیْغُونًا ۚ الْفِتْنَةُ ۚ وَفِیْكُمْ سَمْعُونُ لَهْمٌ ۖ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظَّالِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ لَقَدْ ابْتِغَوْا لِفِتْنَتِهِمْ مِّنْ قَبْلِ وَقَلَبُوا اِلَکَ الْاُمُوْرَ حَتّٰی جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ کَرِهُوْنَ ﴿۲۹﴾

”اگر یہ تمہارے ساتھ نکلتے بھی تو بس تم میں خرابیاں ہی بڑھاتے اور تمہارے درمیان بگاڑ ڈالنے کی خاطر دوڑے دوڑے پھرتے اور تم میں بعض ان کی سن بھی لیتے ہیں اور اللہ خالموں کو خوب جانتا ہے، انہوں نے پہلے بھی فساد ڈلوانا چاہا تھا اور تمہارے لئے تدبیروں کو الٹ پھیر کرتے رہے یہاں تک کہ سچا وعدہ آپہنچا اور اللہ کا حکم غالب ہوا اور وہ ناخوش ہی رہے۔“

یہ سمجھانے کا شفقت آمیز طریقہ ہے کہ مجرم کو اس کے قصور کا ذمہ وار بنادیا اور ادھر مسلمانوں کو بھی اطمینان دلادیا کہ اچھا ہوا یہ تمہارے ساتھ نہیں گئے، فائدہ کی بجائے نقصان ہی پہنچاتے، دوسروں پر برا اثر پڑتا، خرابیاں پھیلانے اور تم میں فتنہ و فساد برپا کرنے کے لئے تمہارے درمیان ریشہ دو انیاں کرتے، یہی ان کی عادت ہے اور کبھی اس سے باز نہ آئیں گے۔ اگرچہ یہ منافقین اس وقت تمہارے ساتھ میدان جنگ میں نہیں مگر ان کے جاسوس برابر لگے ہوئے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ تمہاری کمزوریوں کی یادداشت تیار کریں اور جب تم واپس جاؤ تو ان کی ایک فہرست مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔

غزوہٴ احد میں عبد اللہ بن ابی بن سلول اسی عادت سے مجبور ہو کر اپنے ساتھیوں کو راستہ سے واپس لے آیا۔ غزوہٴ احزاب میں یہودی عہد نامہ توڑ کر کفار مکہ کے ساتھ مل گئے، غزوہٴ تبوک میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر اللہ کی فضل و کرم سے تمہیں کامیابی ہوئی اور یہ فتح تو ان کے لئے سخت ناگوار تھی۔ ان منافقین کی اس قسم کی عادتوں کے متعلق ایک جگہ فرمایا: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا اِلَیْنا فَهَؤُلَاءِ عِیْنُهُمْ لَکِیْۤیْمُوْنَ (الانعام ۲۸) ”اور اگر واپس بھی کئے جائیں تو پھر بھی وہی کریں جس سے ان کو منع کیا گیا اور بیشک وہ جھوٹے ہیں۔“ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خِیْنًا لَّاسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (الانفال ۲۳) ”اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو ان کو سنا تا اور اگر ان کو اب سنادے تو ضرور بے رخی کرتے ہوئے روگردانی کریں۔“ سورہٴ نساء میں آتا ہے: وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنۡ اُقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ اَوْ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ ۚ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُعْطُوْنَ بِہِ لَکَانَ خِیْنًا لَّہُمْ (النساء ۶۶) ”اور اگر ہم ان کو حکم دیدیتے کہ اپنے آپ

کو ہلاک کر ڈالو یا اپنے وطن سے نکل جاؤ تو کبھی ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے تھوڑے اور اگر وہ یہی کریں جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر ہو۔“

پس جو لوگ جہاد فی سبیل اللہ سے بچنا چاہتے ہیں ان کی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنی چاہئے اور اگر وہ ابتدا ہی سے بدکار چلے آتے ہیں تو ان کے پیچھے رہنے سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ ان کی شرکت کبھی مفید نتائج نہیں پیدا کرے گی۔

فتنہ سے بچتے ہیں

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ اِنَّنِي فَتَنْتُ بِالْغِنَى ۚ وَالْاٰلِي الْاِفْتِنَةِ سَقَطُوْا ۚ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ ۝۵ اِنَّ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَّسُوْهُمُ ۚ وَاِنَّ تُصِيبَكَ مُصِیْبَةٌ یَّقُوْلُوْا اَقْدَاۤ اَحْذَنَّاۤ اَمْرًا مِّنْ قَبْلُ وِیَسُوْلُوْا وَاَهُم فَرِحُوْنَ ۝۶

”اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھ کو رخصت دیجئے اور بلا میں نہ پھنسائے، سن لو یہ تو بلا میں آہی گرے اور کافروں کو دوزخ گھیرے ہوئے ہے اور اگر تم کو بھلائی پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچ جائے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی اپنا کام ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا اور خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں۔“

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آپ نے ایک منافق جد بن قیس سے غزوہ تبوک میں شریک ہونے کے لئے فرمایا تو اس نے جواب دیا کہ میرا طبعی میلان عورتوں کی جانب بہت زیادہ ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ رومیوں کی عورتیں میرے لئے فتنہ کا دروازہ نہ کھول دیں، اس لئے مجھے تو مدینہ ہی میں رہنے دیجئے۔ آپ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے، اور غصہ میں آکر اس کو رہنے کی اجازت دیدی۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ جبکہ عالم اسلامی پر مصیبتوں اور تکلیفوں کے بادل امنڈ آئے ہوں اس وقت جو زاہدان خشک ”بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر“ کے مصداق اللہ اللہ کے نعرے لگاتے ہیں اور علمائے سوء کتاب و سنت کے محض الفاظ پر اپنی قوت صرف کرتے ہیں اور جب ان کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کہا جاتا ہے تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اگر ہم بھی جہاد میں شریک ہو گئے تو ہم تھوڑے بہت نیک کام سے بھی محروم رہ جائیں گے اور مفت کا فتنہ کھڑا ہو جائے گا، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جس وقت انہوں نے اسلام کی مدافعت میں حصہ نہ لیا اور دشمنوں کو ممالک اسلام پر حملہ کرنے سے نہ روکا تو انہوں نے خود فتنہ کو دعوت دے دی، اب کفار ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے ملکوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان زاہدان گوشہ نشین کو ذبح کریں گے اور جو باقی رہ جائیں گے وہ غلاموں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پھر بتاؤ فتنہ یہ ہے یا وہ، کیا غلامی میں بھی کوئی دین باقی رہ سکتا ہے؟

ان میں سے منافقین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی انہیں ناگوار گزرتی ہے اور اگر سوئے اتفاق سے انہیں تکلیف پہنچے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی عقلمندی سے کام لے کر اس میں شرکت نہیں کی، ہمیں تو پہلے ہی خیال تھا کہ اس کامیابی انجام ہو گا، کاش وہ اس بات کو سمجھتے کہ کامیابی تو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے کیونکہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

## غازی یا شہید

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا ۖ هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾ قُلْ هَلْ تَرَىٰ صُورًا لِّمَا لَا  
إِحْدَى الْحُسَيْنَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَكُصْ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۚ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ  
مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥١﴾

”کہہ دو کہ ہم کو کچھ نہ پہنچے گا مگر وہی جو ہمارے لئے اللہ نے لکھ دیا ہے وہی ہمارا کار ساز ہے اور اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے، کہہ دو تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے تم پر عذاب ڈالے، تو تم منتظر ہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔“

ایک مسلمان جب تقدیر کے آگے اپنی گردن خم کر لیتا ہے تو دنیا کے تمام باطل پرستوں کے آگے سر بلند ہو جاتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر مجھے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور مسلمان تو ایک لمحہ کے لئے بھی ناکام نہیں رہ سکتا، وہ تو صرف فتح و کامرانی ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ اگر اس جہاد فی سبیل اللہ میں مر جاتا ہے تو بہرہ اندوز شہادت ہوتا ہے اور اگر زندہ رہا تو غازی ہونے میں کلام نہیں، فرض ادا کرنا تھا اور وہ ہو گیا۔ رہے مخالفین اسلام، ان کی حالت یہ ہے کہ چونکہ وہ اسلام کے دشمن ہیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ آفات ارضی و سماوی سے تباہ ہو جائیں، مسلمانوں کے ہاتھ سے ذلیل ہوں۔ اگر انتظار کرنا ہے تو کر دیکھو۔

## روپیہ بیکار ہے

قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّنْ يَتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۚ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ  
إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿٥٣﴾ فَلَا تُعْجِبَكَ  
أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَآئِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٥٤﴾

”کہہ دو کہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، تم بیشک نافرمان لوگ ہو اور اس کے سوا اور کوئی چیز ان کا خرچ قبول کرنے سے مانع نہیں آئی کہ وہ اللہ اور رسول کے منکر ہوئے اور نماز کو نہیں آتے مگر اکسائے ہوئے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے، پس ان کے مال اور اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں، بس اللہ چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں ان کو مبتلائے عذاب رکھے اور ان کی جان اس حال میں نکلے کہ وہ کافر ہوں۔“

گزشتہ آیات میں منافقین کے جو حالات بیان کئے گئے تھے، ان کی وجہ سے مسلمانوں نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تو اس وباؤ میں آکر انہوں نے مذہبی چندوں میں حصہ لینا شروع کر دیا، ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم اس تعلیم کو صحیح سمجھتے ہو تو اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہو جاؤ، اس وقت اسلام کو اسی جانی قربانی کی ضرورت ہے، اگر اس کے لئے تیار ہو تو پھر مال بھی قبول کیا جاسکتا ہے اور اگر یہ نہیں تو روپیہ دینا بے سود ہے اور شریعت کی نظر میں اس روپیہ کی کوئی عزت

نہیں، تم سے بڑھ کر اور کون بے حیا ہو گا کہ اپنا خون تو بہاتے نہیں جس کی اس وقت ضرورت ہے اور روپیہ دے کر اس کو ٹالنا چاہتے ہو۔

ایسے لوگوں کے صدقات ہر گز قبول نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان ہیں، نماز کی شرکت میں کابلی سے کام لیتے ہیں اور یہ سستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے جس سے ان منافقین کے پوست کندہ حالات معلوم ہو جاتے ہیں، تو یہ نماز میں اس وقت شریک ہوتے ہیں جب قرآن ختم ہونے کے قریب ہو، تا کہ یہ اپنی لاعلمی کا اظہار کر سکیں، پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ان سے کہا جائے تو انہیں بہت ناگوار گزر رہا ہے، جن لوگوں کی دولت قوم اور ملک کے کام نہ آئے وہ کس کام کی، اس کی وجہ سے تو یہ ان کے لئے عذاب کا باعث بن جائے گی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَا تَتَذَكَّرْ عَيْنِيكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَاهُ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْثَتِهِمْ فِيهِ ۚ وَرِثْ قِطْعَ حَبِوٍّ أَبْغَىٰ (طہ ۱۳۱) ”اور اس چیز کی جانب اپنی آنکھ نہ اٹھاؤ جس سے ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو نفع دیا۔ وہ دنیوی زندگی کی آرائش ہے تاکہ ہم ان کو اس میں آزمائیں اور تمہارے رب کی دی ہوئی روزی بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔“ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: اَيُّحَسِبُونَ اَنْتَابَا نُبْذُهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَبَيْنَ ۙ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَلْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ (المؤمنون ۵۵ تا ۵۶) ”کیا یہ لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد سے امداد کئے جا رہے ہیں تو ان کے لئے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں بلکہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔“

## کذب آفرینی

وَيَخْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنْهُمْ لَبِئْسَ لَكُمْ ۙ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ ۙ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرِقُوْنَ ۙ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغْرَبًا اَوْ مَدْخَلًا لَّوَلَوْ اِلَيْهِ وَهَمَّ يَخْتَفُوْنَ ۙ

”اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ بیشک وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں، اگر کہیں پناہ یا کوئی غاریا گھس بیٹھنے کی جگہ پالیں تو اس طرف باگیں تڑا کر دوڑ پڑیں۔“

منافقین کی عام عادت یہی ہے کہ قسمیں کھا کر اپنی باطل پرستی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ہیں حالانکہ وہ خوف و دہشت سے سہمے جاتے ہیں اور سچی بات زبان سے نہیں نکال سکتے، اس لئے کہ اگر ان میں ہمت ہوتی تو اللہ کے نام پر جان دینے سے جی نہ چراتے، گویا ان کی اصلی حالت یہ ہے کہ صرف دکھانے کی خاطر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے، ان کے تمام رشتہ دار بھی اتفاق سے مسلمان واقع ہوئے ہیں، اگر انہیں موقع مل جاتا تو فوراً اسلام کو خیر باد کہہ دیتے، اب صرف گرد و پیش کی مجبوریوں نے ان کو مسلمان بنا دیا ہے۔

## بندگان زر

اب ایسے لوگوں کا تذکرہ آتا ہے جو جہاد سے صرف اس لئے بھاگتے ہیں کہ انہیں روپیہ نہیں ملتا، اگر آج روپیہ مل جائے تو ہر طرح کی خدمت کو تیار ہیں، گویا وہ روپیہ کے بندے ہیں

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّالِيكَ فِي الصَّدَقَاتِ ۚ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَّمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْتَخْطُونَ ۝ وَكَوَّأَتْهُمْ رِضْوَانًا مَّا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ ۚ إِنَّا إِلَى اللَّهِ دَاْعُونَ ۝

”اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تم پر خیرات بانٹنے میں طعن کرتے ہیں، پس اگر اس میں سے ان کو دیا جائے تو راضی ہوتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو فوراً ہی ناخوش ہو جاتے ہیں اور کیا اچھا ہوتا اگر اس پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور کہتے کہ ہم کو اللہ کافی ہے ہمیں آئندہ اپنے فضل سے وہ اور اس کا رسول بہتیرا دے گا اور ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔“

جب غزوہ حنین کا مال غنیمت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے ان لوگوں کو زیادہ دیا جو ابھی حال ہی میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس پر ذوالنورینؑ نے کہا: اعدل فانك لم تعدل، ”عدل کیجئے آپ نا انصافی سے کام لے رہے ہیں۔“ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: لقد خبت وخسرت ان لم اكن اعدل۔ ”اگر میں عادل نہیں تو دنیا میں اور کون عدل کا دعویٰ کر سکتا ہے۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

صدقات و خیرات کی تقسیم امیر کی مرضی پر ہوتی ہے، اگر اسے خیال ہے کہ فلاں جگہ اتنا روپیہ صرف کرنے سے مسلمانوں کو بے انتہا فوائد حاصل ہوں گے تو قانون شریعت میں اس کی گنجائش ہے اور کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ امیر پر اس امر میں اعتراض کرے، کاش یہ نکتہ چینی کرنے والے ذرا عقل سے کام لیتے، مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اگر روپیہ مل جائے تو خوش ہیں ورنہ سب سے زیادہ مخالف، ان کے لئے مناسب یہ تھا کہ امیر کی تقسیم پر رضامندی کا اظہار کرتے، جو کہ رہ جاتی وہ بھی کسی نہ کسی طرح پوری ہو جاتی، مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ میدان جنگ میں صرف قانون الہی بلند و برتر کرنے کے لئے جاتا ہے، دولت کا حاصل کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا: انا الی اللہ راغبون اس کا طفرائے امتیاز ہے۔

## مصارف صدقات

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَبْدِيِّنَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَافَةُ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرْمَيْنِ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

”بس زکوٰۃ تو فقیروں، محتاجوں، ان کا رکوں جو خیرات وصول کرنے پر مقرر ہیں اور جن کے دلوں کا پر چانا منظور ہے کا حق ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں اور اللہ کے راستہ اور مسافروں میں، یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

ہر قسم کے جھگڑوں کو دور کرنے کے لئے خیرات کے مصارف معین کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی امام کو اختیار ہے جہاں چاہے صرف کرے، خواہ وہ ایک ہی جگہ تمام روپیہ خرچ کر دے یا سب کو برابر دے دے یہی۔ امام مالک، ابو حنیفہ، عمر، حذیفہ، ابن عباس، ابو العالیہ، سعید بن جبیر، اور میمون بن مہران رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے بلکہ ابن عبد البر نے تو اس پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

فقیر، وہ شریف آدمی جو باوجود مفلس ہونے کے اپنی حاجت دوسروں کے پاس نہ لے جائے اور کسی پر اپنی غربت کا اظہار نہ کرے۔

مسکین، جس کا افلاس ظاہر ہو چکا ہو اور عام لوگوں کو اس کی ضروریات کا علم ہو جائے۔ ابن عباس، حسن، مجاہد اور عکرمہ کی یہی رائے ہے، اسی کو زہری اور ابن شیبہ نے اختیار کیا ہے۔

الرقاب جو لوگ اس وقت غلام ہیں ان کو آزاد کر دیا جائے، جہاں غلاموں کی تجارت ہوتی ہے اس کو بند کر دیا جائے، اسلامی حکومتوں کو مخالفین اسلام آہستہ آہستہ اپنے قبضہ میں لارہے ہیں، ان کو غیروں کی چالوں اور سیاسی فریب کاریوں سے آگاہ کرنے کے لئے باقاعدہ تبلیغ و دعوت کی جائے اور سب کو آزادی حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جائے، ان تمام کاموں پر اسی مد سے روپیہ صرف ہو گا۔

فی سبیل اللہ، مجاہدین فی سبیل اللہ کی اعانت، حدود مملکت کی نگرانی، دوسرے مصالح ملکی اور اشاعت اسلام کے تمام فرائض بھی اسی سے سرانجام پاتے تھے۔

### رسول پر نکتہ چینی

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۖ قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۹﴾

”اور بعض ان میں ایسے ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص ”کان“ ہے کہہ دو ”کان“ تمہارے بھلے کو ہیں،

اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی بات کا یقین کرتے ہیں اور ان کے حق میں رحمت ہیں جو تم میں سے ایمان لائے اور جو اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات پر نکتہ چینی کرنا اپنا فرض قرار دے رکھا تھا اور اپنی کج فہمی کی وجہ سے آپ کی سود مند تعلیم کے ایسے پہلو تلاش کرتے رہتے جو محل اعتراض بن سکیں۔ اگر کوئی شخص ہٹ دہرمی سے کام لے تو عمدہ سے عمدہ قانون میں بھی شک پیدا کیا جاسکتا ہے، یہ منافقین کہتے ہیں کہ رسول اللہ تو کان کے کچے ہیں جو کچھ آپ سے کہا جاتا ہے اس کو فوراً مان لیتے ہیں اور ذاتی رائے نہیں رکھتے۔ اس پر فرمایا گیا کہ رسول کا ہر اچھی بات قبول کر لینا تمہارے لئے باعث رحمت ہے، ورنہ اگر آپ اپنی طبعیت پر رہتے اور اپنے معیار پر لوگوں کو پرکھتے تو ایک آدمی بھی اس قابل نہ نکلتا جو آپ



سے فیضیاب ہو سکتا، آپ تو اپنے اوپر جبر کر کے اپنے بلند ترین مرتبہ سے نیچے اترتے ہیں اور یہ لوگ اپنی بدینتی کی وجہ سے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

يَخْلُقُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْا عَنْكُمْ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوا اَنَّهُ مِّنْ قِيَادِهِ  
اللّٰهُ وَرَسُولُهُ فَاَنَّهُ نَارٌ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝

”تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تم کو راضی کر لیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو راضی کریں اگر ایمان رکھتے ہیں، کیا وہ نہیں جان چکے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا یہی بڑی رسوائی ہے۔“

یہ لوگ اس درجہ احمق بن گئے ہیں کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی ہر کوشش صرف کر دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی کی پروا تک نہیں کرتے حالانکہ اصل چیز وہی تھی، اگر ایک شخص تعلیم کو تو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر معلم کا ادب نہیں کرتا تو یہ بالکل بے کار ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ اَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَفْهِمُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝

”منافقین ڈرتے ہیں کہ مبادا مسلمانوں پر ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کو بتا دے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، کہہ دو اچھا تمسخر کرتے رہو، اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس بات کا تم کو ڈر ہے۔“

گزشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ تو رسول کو ”اذن“ کہتے ہیں حالانکہ اللہ کے نزدیک یہی پسندیدہ چیز تھی۔ اذن کے دو معنی ہیں۔ ایک تو کانوں کا کچا اور اسی معنی میں منافقین نے یہ لفظ رسول اللہ ﷺ کے لئے استعمال کیا تھا، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ باوجود دانش و بینش کے کسی شخص کو بلا کسی قوی قرینہ کے جھوٹا نہ سمجھے، اس طرح کا اذن ہونا جس کو قرآن حکیم مزید وضاحت کے طور پر اذنِ خیر کہتا ہے رسول اللہ ﷺ کے لئے ضروری تھا۔

منافقین اس بات کا خیال کر کے کہ ان کے مکرو فریب کا تار و پود بکھیرا جا رہا ہے سہمے جاتے تھے، قرآن حکیم میں اعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اس لئے ارباب نفاق کے نام معین کر کے نہیں بتائے گئے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی تو کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ان منافقین کی خطرناک کارروائیوں پر بالکل پردہ ڈال دیا جاتا، لہذا قرآن حکیم نے حسب موقع مومنین کو اس خبیث جماعت کی طرف سے ہوشیار کرنے میں ذرہ برابر کمی نہیں کی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَيَقُولُوْنَ قَدْ اَنفُسُهُمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ؕ يَصْلَوْنَهَا ؕ فَبِئْسَ الْبَصِيْرُ (المجادلہ: ۸) ”اور وہ لوگ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تم کو ایسے کلمہ سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ نے بھی تم کو دعا نہیں دی اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اس کلمہ پر جو ہم کہتے ہیں اللہ ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا، ان کو جہنم کافی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے پس وہ بری جگہ ہے۔“ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: اَنَّهُ حَسِبَ الذِّنِّیْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرْءًۢسًۢا اَنْ لَّنْ يُخْرِجَهُ اللّٰهُ اَضْغَانُهُمْ ۝ وَلَوْ نَشَاءُ لَآ كَرِيْنُكُمُ فَلَكَرْتُمُ بِسَيِّئِهِمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد ۲۹ تا ۳۰) ”وہ لوگ جن کے دلوں میں



مرض ہے کیا وہ خیال رکھتے ہیں کہ اللہ ان کے کینوں کو ہرگز ظاہر نہ کرے گا اور اگر ہم چاہیں تو تم کو وہ لوگ دکھادیں، پس تم ان کے چہرے سے پہچان لو اور طرز کلام میں تم ضرور ان کو پہچان لو گے۔“

تمسخر واستہزا

وَلَمَّا سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦٠﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبُ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦١﴾

”اور اگر ان سے پوچھو تو کہتے ہیں کہ ہم تو محض مشغلہ اور کھیل کر رہے تھے، کہہ دو کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی کرتے تھے، بہانے نہ بناؤ تم ایمان لا کر کافر ہو گئے اگر ہم تم میں سے بعض کو معاف بھی کر دیں تو دوسروں کو سزا بھی ضرور دیں گے اس لئے کہ وہ خطا دار تھے۔“

جب ان کے اس اعتراض کو سنجیدگی کے ساتھ حکیمانہ طور پر رد کر دیا گیا تو عاجز آ کر کہنے لگے کہ ہم نے تو ویسے ہی مزاحیہ لفظ کہہ دیا تھا، اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ کلام الہی کے ساتھ اس قسم کا استہزا صاف بے ایمانی کی دلیل ہے، اب تمہارا عذر لنگ مسموع نہیں ہو سکتا کیونکہ تم جان بوجھ کر گناہ کے مرتکب ہو چکے تھے اور اگر تم میں سے بعض نادانوں کو معاف بھی کر دیا گیا تو بھی تمہارے سرگروہ سزا سے نہیں بچ سکتے۔

الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بِغُضُوبٍ مِّنْ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْبُيُوتِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ ۚ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۚ إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٦٢﴾ وَعَدَ اللَّهُ الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقَاتِ النَّارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعْنَهُمُ اللَّهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٦٣﴾ كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوَّلَادًا ۖ فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَائِقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَائِقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَائِقِهِمْ وَخُضِّتُمْ كَالَّذِينَ خَاضُوا ۖ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَسِرُونَ ﴿٦٤﴾

”منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے برے کام کا حکم دیتے ہیں اور بھلے سے منع کرتے ہیں اور مٹھیاں بھیج بھیج لیتے ہیں، یہ لوگ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے ان کو بھلا دیا، بیشک منافق ہی فاسق ہیں، اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا اس میں ہمیشہ رہیں گے وہی ان کو کافی ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے، جیسے تمہارے اگلے تھے کہ تم سے زیادہ زور میں تھے اور مال اور اولاد زیادہ رکھتے تھے تو وہ اپنے حصے کے فائدے اٹھا گئے سو تم نے بھی اپنے حصہ کے فائدے اٹھائے، جیسے تم سے پہلوں نے اپنے حصے کے فائدے اٹھائے تھے اور تم بھی ایسی باتوں میں گھسے جیسے وہ گھسے تھے، ان کا یہ حال ہوا کہ ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہو گئے اور وہی نقصان میں رہے۔“

اتحاد مقصد کے اعتبار سے منافق مرد و عورت یکساں ہیں کہ دونوں کی غرض مسلمانوں کو مرکزی قوت کی حفاظت اور فریضہ جہاد سے روکنا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے انہیں بڑی ہی سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے، انہوں نے ان

فرائض کو فراموش کر دیا جو ان کے لئے زندگی بخش تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب ان چیزوں کو مفید سمجھ رہے ہیں جو ان کے لئے مضرت کا باعث ہیں، انہوں نے عین ضرورت کے وقت اسلام کی مدد نہ کی، پس خدا بھی عین ضرورت کے وقت ان کی حاجت روائی نہ کریگا۔ ان لوگوں کا اصلی مقصد قانون توڑنا ہے، اس لئے ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جس سے قانون خود بخود ٹوٹ جائے۔ جو لوگ حفاظت اسلام کا خیال ترک کر دیں، جہاد فی سبیل اللہ سے نفرت کریں اور محض زبانی دعویٰ اسلام کرتے پھریں، ان میں اور ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں رہتا جو اسلام کی جانب رخ تک نہ کریں، پھر گزشتہ امتوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ ان کا کیا انجام ہوا۔

تذکیر یا پیام اللہ

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۖ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ ۚ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٠﴾ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٥١﴾ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكِنٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۖ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٢﴾

”کیا ان کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے، نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین کے لوگ اور الٹی ہوئی بستیوں کے رہنے والے، ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر آئے، تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نیک کام کا حکم کرتے ہیں اور برے کام سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے، اللہ نے مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور دائمی بہشت میں نفیس مکانوں کا وعدہ اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔“

ان گزشتہ اقوام کے حالات پڑھو جو شام، عراق اور یمن میں آباد تھیں، رسولوں کی نافرمانی کرنے سے ان پر کیسے کیسے عذاب نازل ہوئے، رہے مومن مرد اور عورتیں، تو وہ جسم واحد کی طرح ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: المؤمن للمؤمن والبنیان یشد بعضہ بعضا وشبک بین اصابعہ، ”رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر ملا کر فرمایا کہ اس طرح ایک مسلمان دوسرے کی قوت کا باعث ہوتا ہے“۔ دوسری روایت میں آتا ہے: مثل المؤمنین فی تواضعهم وتراحمهم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکى منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمى، ”باہمی محبت کے اعتبار سے مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں، ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو تمام جسم محسوس کرتا ہے“۔ یہ لوگ اصولی امور کو ہمیشہ پہلے لیتے ہیں، قرآن کی حفاظت ان کا اولین کام ہے، جہاد کر کے مرکزی قوت کو کمزور ہونے سے بچاتے ہیں، اللہ

تعالیٰ ان کو دنیا میں عزت نوازش کرے گا اور یہ بات اس عزیز و حکیم کے نزدیک کچھ بھی نہیں، مگر چونکہ ایک وفادار بندے کے لئے مالک کی رضامندی سب سے بڑی نعمت ہے، اس لئے ارشاد ہو گا کہ آئندہ تم احکم الحاکمین کی خوشنودی سے ہمیشہ سرفراز ہو گے، ضیئلہ عنہم ورضوا عنہ۔ حدیث میں آتا ہے:

ان الله يقول لاهل الجنة يا اهل الجنة! فيقولون لبيك ربنا وسعديك والخير في يدك فيقول هل رضيتم فيقولون ربنا وما لنا لا نرضى وقد اعطينتنا ما لم نعطه احد امن خلقك فيقول الا اعطيكم افضل من ذلك قالوا يا ربنا وای شيء افضل من ذلك قال احل عليكم رضوانی فلا اسخط علیکم بعدة ابد (بخاری)

”اللہ تعالیٰ اہل جنت سے کہے گا کہ کیا تم راضی ہو، وہ جواب دیں گے کہ ہم کیوں نہ راضی ہوں، یہ نعمتیں تو اب تک کسی کو بھی نہیں دی گئیں اس پر رب الارباب فرمائے گا کہ میں تمہیں اس سے بھی بہترین چیز نوازش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اب ہم تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گے۔“

### الجہاد فی سبیل اللہ

جو لوگ جہاد فی سبیل اللہ سے بھاگنے کی فکر میں رہتے ہیں ان کے بیشتر اقسام کا تذکرہ آچکا لیکن اس درمیان میں ایک اور جماعت پیدا ہو جاتی ہے جس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجاہد ہی پیدا نہ ہوں، کیونکہ اگر حکومت کو مجاہد مل گئے تو اس گروہ کی ذلت ہوگی اور لوگ یوں طعنہ زنی کریں گے کہ دیکھو تم تو پیچھے رہ گئے مگر دوسرے سرفروش میدان عمل میں تم سے آگے نکل گئے، اس لئے وہ طرح طرح کے حیلے بناتے ہیں اور مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو کبھی مسلمان نہیں کہا جاسکتا، بلکہ انکو کفار کے ساتھ ملا دیا جائے گا، انکے متعلق حکم ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۚ يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ۚ وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَتُّوا بِآلِهِمْ يَتْلُوهُمْ إِلَّا أَنْ أَعْلَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكْ خَيْرًا لَهُمْ ۚ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۚ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۚ

”اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے، اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے تو نہیں کہا حالانکہ بیشک انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور مسلمان ہوئے پیچھے کافر ہو گئے اور ایسی چیز کا قصد کیا جس کو نہ پایا اور یہ سب اس کا بدلہ لادیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا، سوا اگر توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر روگردانی کریں تو اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور روئے زمین پر نہ ان کا کوئی حمایتی ہو گا اور نہ مددگار۔“

ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی ترقی رک جائے، اس لئے قیام سلطنت کی خاطر کفار کے ساتھ تلوار سے اور حفاظت دین کے لئے منافقین کے ساتھ زبان سے جہاد کیا جائے، حاکم کے لئے بسا اوقات اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ شریروں کو بھی اپنے ساتھ نباہ سکے۔ علاوہ ازیں منافقین بالکل کفر صریح کے تو مرتکب نہ تھے اس لئے اسلام کے ظاہری اقرار نے ان کو تلوار کے جہاد سے بچالیا، ارباب نفاق کے ساتھ صرف زبان سے جہاد ہو سکتا ہے، یہی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے ہے اور اسی کو ابن جریر نے ترجیح دی ہے، ان کا مقابلہ نہایت ہی سختی سے کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ان کی ہمتیں بڑھ جائیں گی۔

یہ لوگ بارہا اپنی زبان سے ایسے کلمات نکال دیتے ہیں جو ان کے نفاق پر صراحۃً دلالت کرتے ہوں۔ ایک مرتبہ عبد اللہ بن ابی بن سلول نے کہا: لَیْسَ دَجَعْنَا إِلَى الْمَدِیْنَةِ لَیْخْرَجَنَّ الْأَعْرَضُ مِنْهَا الْأَذَلَّ (المنافقون ۸) ”اگر ہم مدینہ کو واپس لوٹے تو ہم ان ذلیل مسلمانوں کو شہر سے نکال باہر کر دیں گے“۔ جب ان سے اس کے متعلق باز پرس کی جاتی ہے تو صاف انکار کر دیتے ہیں، اسی غزوہ حبوک ہی میں ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ ایک تنگ راہ میں سے گذریں تو آپ کو گھاتی میں گر ادیں، مگر عین وقت پر آپ کو اطلاع ہو گئی اور اس لیے وہ بھاگ گئے۔ بنو نضیر نے بھی ایک مرتبہ کوشش کی کہ چچی کا پاٹ آپ پر گر ادیں، مگر وہاں سے بھی اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔

ان لوگوں کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ بالکل عاجز و درماندہ اور مفلس تھے، اسلام نے ان پر نوازش ہائے گونا گوں کیں اور آج یہ محسن کش اسلام کی خدمت کرنے کی بجائے اس کے بالکل دشمن بن گئے ہیں، اگر اب بھی یہ توبہ کریں اور ملک و ملت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر لیں تو بہتر، ورنہ مسلمانوں کو ترقی دے کر انہیں ذلیل کر دیا جائے گا اور پھر اس وقت کسی کو طاقت نہ ہوگی کہ ان کی مدد کر سکے۔

## بخیل لوگ

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَیْنِ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ؕ فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ ۝۵۱ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًاۤیْنِ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهُۥۤ بِمَاۤ اٰخَلَفُوْا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ؕ ۝۵۲ اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِّرٰتِهِمْ وَنَجْوٰیہُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلٰمُ الْغُیُوْبِ ؕ ۝۵۳

”اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہم کو دے گا تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور نیک بندے بن جائیں گے، پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا تو مغل کرنے لگے اور نال کر پھر گئے تو اس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کے دلوں میں اس دن تک نفاق رکھ دیا کہ وہ اللہ سے ملیں گے اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے اس وعدہ کا خلاف کیا جو اس سے کیا تھا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے، کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ ان کا بھید اور سرگوشی جانتا ہے اور یہ کہ اللہ غیب کی تمام باتوں کو خوب جانتا ہے۔“

اب تک مختلف قسم کے لوگوں کا تذکرہ آچکا ہے جو جہاد سے بچنا چاہتے ہیں، ان میں سے آخری قسم کے ارباب نفاق یہ ہیں جو اللہ سے تو عہد کرتے ہیں کہ اگر اس نے انہیں مالامال کر دیا تو وہ ضرور اس کی راہ میں قربانی کریں گے اور نیک بن جائیں گے، لیکن جس وقت ان کو دولت مل گئی تو بخل شروع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا اور تمام عمر جھوٹ بولنے میں بسر کی، اس جرم کی وجہ سے ان کے دل میں ہمیشہ اس بات کا ڈر رہے گا کہ اللہ ان پر عذاب نازل نہ کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ حرکتیں اللہ پر مخفی نہیں رہ سکتیں، مسلمان کی تو ہر چیز خدا کے ہاتھ میں بک چکی ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآلِهِمُ الْجَنَّةَ (التوبہ ۱۱۱) ”بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے خرید لیا“، دو تہمتوں کا حال تو اسی قسم کا دیکھا گیا ہے:

امرانہ دولت میں ہیں غافل ہم سے  
زندہ ہے ملت بیضاء غربا کے دم سے

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑥ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۖ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑦

”یہ ایسے ہیں کہ دل کھول کر خیرات کرنے والے مسلمانوں اور ان لوگوں پر طعن کرتے ہیں جن کو مزدوری کے سوا اور کچھ میسر نہیں آتا، پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، ان کے لئے تم مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو اگر تم ان کے حق میں ستر مرتبہ استغفار کرو گے تب بھی اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا، یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

جنگ تبوک کی تیاری کے دوران رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو مالی قربانی کی دعوت دی تو ہر ایک صحابی نے اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ لا کر پیش کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا۔ آپ نے ان سے پوچھا: ما ابقيت لاهلك، ”اپنے اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑ آئے؟“ انہوں نے جواب دیا: ابقيت لهم الله ورسوله، ”اللہ اور اس کے رسول کو“:

آنکس کہ ترا بخو است، جان راچہ کند؟  
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند؟  
دیوانہ کنی ہر دو جہاںش بخشی  
دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند؟

منافقین کی حالت یہ تھی کہ ہر ایک مسلمان پر آوازے کتے، اگر ایک دولت مند مسلمان بہت ساسا مان لے کر آتا تو کہتے کہ صرف لوگوں کو دکھانا مقصود ہے اور اگر کوئی غریب مسلمان تھوڑی سی کھجوریں لاتا تو کہتے خدا کو ان کی کیا ضرورت

ہے۔ بخاری نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: لما نزلت اية الصدقة كنا نعامل على ظهورنا فجاء رجل فتصدق بشيء كثير فقالوا امرأى وجاء رجل فتصدق بصاع فقالوا ان الله لغنى عن صدقة هذا، ”جب آیہ الصدقہ نازل ہوئی تو ہم صدقات اپنے کندھوں پر لاد لاد کر دربارِ رسالت میں حاضر کرتے، بڑی رقم لانے والے کو یہ منافقین ریاکار بتاتے اور تھوڑا سا صدقہ لانے والے سے کہتے کہ خدا کو اس کی کوئی ضرورت ہے۔“

ان اربابِ نفاق کی اصلی خرابی یہ ہے کہ خود اپنے عہدوں کے پابند نہیں بنتے اور جو مخلص مسلمان اپنے شوق سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، ان بد بختانِ ملت کا مقصد یہ ہے کہ کسی مسلمان کو ترقی نہ کرنے دیں اور قرآن یہ چاہتا ہے کہ فرزندِ انِ اسلام زندہ رہیں، پھر جو لوگ اسلام تباہ کرنے کی فکر میں ہیں ان سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو گا۔ چونکہ یہ نالائق مرکزی نقطہ سے ہٹ گئے ہیں، اس لئے اب کوئی عمل صالح ان کے لئے نفع بخش نہیں ہو سکتا اور چونکہ انہوں نے مسلمانوں کو برباد کرنے کی کوشش کی اس لئے عذابِ الہی سے کوئی چیز ان کو نجات نہیں دے سکتی۔ خود رسول اللہ ﷺ کی توبہ بھی ان کے لئے رحمت کے دروازے نہ کھول سکے گی۔

اس آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اگر آپ ستر مرتبہ توبہ کریں تو بھی اس کو شرفِ اجابت نہ بخشا جائے گا تو اس سے یہ خیال نہ آنے پائے کہ اس سے کوئی مخصوص عدد مراد ہے اور اس سے زیادہ توبہ کرنے پر ان کی مغفرت ہو جائے گی، بلکہ اہل عرب اس عدد کو بیان کر کے کثرت مراد لیتے ہیں اور وہی یہاں مقصود ہے، غرض یہ ہے کہ ان جرائم کے بعد ان کے لئے توبہ کسی طرح بھی قبول نہیں ہو سکتی۔

## باب نمبر ۳ فصل اوّل

### السابقون الاولون

#### پیچھے رہنے کا نتیجہ

جہاد فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ رہنے کی کوشش کرنے والوں کا تذکرہ ختم ہو گیا، اب بتایا جاتا ہے کہ اس فرض جلیل کے ادا کرنے سے باز رہنا، مرکزی قوت کو محفوظ نہ رکھنا اور اپنے مصالح خصوصی کے اعتبار سے مقاصد ملی کو نظر انداز کرنا کس قدر خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۖ لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ﴿۸﴾ فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹﴾

”جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ رسول اللہ کے خلاف اپنے بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے اور ان کو برا لگا کہ اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور بولے کہ گرمی میں نہ جاؤ، کہہ دو دوزخ کی آگ زیادہ گرم ہے کاش یہ سمجھتے تو وہ تھوڑا ہنس لیں اور بہت سارو دیں، بدلہ اس کا جو کماتے تھے۔“

جو لوگ جہاد سے عہد اُچھے رہ گئے وہ خود تو اس فرض جلیل کے ادا کرنے سے رہے، مگر دوسروں کو بھی بہکانا شروع کر دیا کہ گرمی کا زمانہ ہے، ریگستانِ عرب کی حرارت سے جل بھن جاؤ گے، نہ جانا ہی بہتر ہے یہ پیچھے تو رہ گئے لیکن انہیں اس بات کا خیال نہ آیا کہ ہم اس نازک ترین موقع پر مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں، انہیں اب تک ہم پر اعتماد رہا، اب محض گرمی کا بہانہ کر کے رک جانا کس قدر بے ایمانی ہے، اگر یہ تھوڑی سی کوشش کرتے اور اس تکلیف کو برداشت کر لیتے تو فتح سکتے تھے، اب پیچھے رہ کر جہنم کی آگ کے مستوجب ہوئے، مسلمان تو اپنے جذبہ اخلاص سے مجبور تھے، باوجود شدت حرارت جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے، ان چند ایام تک منافقین خوش ہو لیں، جب وہ لوگ واپس آجائیں گے تو انہیں ہمیشہ کے لئے رونا پڑے گا۔

فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ

إِنَّمَا رَضِيتُمْ بِالْعُقُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَأَقْعُدُوا مَعَ الْخُلَفَاءِ ۖ وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ﴿۷﴾ وَلَا تَعْجَبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَ بِهِم بِهَاتِي الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۸﴾

”تو اگر تم کو اللہ ان کو کسی گروہ کی طرف واپس لے جائے پھر یہ تم سے نکلنے کی اجازت چاہیں تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ ہر گز کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے، تم کو پہلی مرتبہ بیٹھ رہنا پسند آیا تو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو اور ان میں سے جو مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو، بیشک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا اور فاسق ہی مر گئے اور ان کے مال اور اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں بس اللہ چاہتا ہے کہ ان کے سب دنیا میں ان کو مبتلائے عذاب رکھے اور ان کی جان نکلے اور وہ اس وقت بھی کافر ہوں۔“

یہ لوگ اس درجہ پر آگئے ہیں کہ ان کو دوبارہ مسلمانوں میں شریک کرنا خلاف مصلحت ہوگا، کیونکہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہے گی کہ ایک ایک کر کے مسلمانوں سے بدلہ لیں، وہ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کی فکر میں رہیں گے اور کہتے پھر یں گے کہ ہم نے اس وقت خوب دانشمندی سے کام لیا، اس لئے جس وقت آپ ان منافقین کی طرف لوٹ کر آئیں تو باوجود ان کی درخواست کے ان سے فرما دیجیے کہ اب تمہاری امداد کی ضرورت نہیں، تم نے پہلے عین وقت پر دھوکا دیا، اس لئے اب تم پر اعتماد کرنا خلاف عقل ہے۔ جب تم نے دیکھا کہ ہم کامیاب ہو گئے ہیں تو محض نام کی خاطر ہمارے شریک کار ہونا چاہتے ہو۔

بخاری نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت عبد اللہ بن ابی راس المنافقین مر گیا تو اس کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ کفن کے لئے اپنی قمیص نوازش کیجئے اور نماز جنازہ بھی آپ ہی پڑھائے، آپ اس غرض کے لئے تشریف لے چلے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن کھینچ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! تصلى عليه وقد منعك ربك ان تصلى عليه، “آپ کو تو اس پر نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے،” آپ نے فرمایا: انما خيبي الله فقال استغفر لهم ولا تستغفر لهم ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم وسأبذهم على السبعين، ”مجھے خدا نے اختیار دیا ہے کہ مغفرت طلب کروں یا نہ کروں ستر مرتبہ تک تو وہ نہیں بخشے گا اور میں اس سے زیادہ استغفار کروں گا۔“ حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا کہ وہ منافق ہے، مگر باوجود اس کے آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھادی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ چونکہ وہ کفر کی حالت میں مرے ہیں، اس لئے اب نہ نماز کی ضرورت ہے اور نہ توبہ و استغفار کی۔

رسول اللہ ﷺ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ جس آیت میں استغفار کی ممانعت کی گئی ہے اس میں بالکل طلب مغفرت سے روکا گیا ہے، آپ یہ بھی جانتے تھے کہ ستر سے مراد کثرت ہے نہ کسی قسم کی تحدید، مگر غایت شفقت سے آپ نے حضرت عمرؓ کی بات نہ مانی اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تا آنکہ ممانعت کا صراحۃً حکم نازل ہو گیا، اس کے بعد



پھر آپ نے کسی منافق کے لئے نماز جنازہ نہیں پڑھی، ادھر حضرت عبد اللہ کی بھی دل جوئی مقصود تھی جو نہایت ہی مخلص اور جاں نثار صحابی تھے۔

منافقت کی بیشتر صورتیں کثرت مال ہی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ایسے مالداروں کے الگ ہونے پر مسلمانوں کو ہمت نہ ہارنی چاہئے۔

## دولت اور نفاق

وَإِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً أَنْ أَمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقُعْدِيِّينَ ۖ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۸﴾ لَكِنَّ الرُّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۹﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾

”اور جب کوئی سورت اس حکم کی آتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان میں سے مقدور والے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ جاؤ ہم بیٹھے والوں کے ساتھ رہ جائیں، ان کو پسند آیا کہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی سو وہ سمجھتے نہیں، لیکن رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور ان ہی کے لئے ساری خوبیاں ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے باغ تیار کر رکھے ہیں کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی بڑی کامیابی ہے۔“

جب کوئی ایسی سورت نازل ہو جس میں قرآن حکیم کو دستور العمل بنانے اور رسول اللہ کی حمایت میں جنگ کرنے کا حکم ہو تو دولت مند جن سے توقع ہی یہی تھی کہ اس موقع پر اسلام کی خدمت کریں گے، وہی صد ہاتھم کے حیلے بنا کر پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہر کے نظم و نسق کے لئے بہر حال کچھ نہ کچھ لوگ ضرور رہیں گے تو ہمیں بھی ان میں شامل کر دیجئے گویا چوڑیاں پہن کر عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں، اسی حالت کا نقشہ دوسری جگہ یوں کھینچا گیا ہے: فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُمْ بِاللَّسَنَةِ جَذَاجٍ (الاحزاب ۱۹) ”سوجب خوف کا موقع آتا ہے تو ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہاری طرف تکتے ہیں، ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو، پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو تیز تیز زبانوں سے تم پر زبان درازی کرتے ہیں۔“ ایک مقام پر یوں ارشاد ہو: فَإِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً مُّحْكَمَةً ۖ وَذُكِّرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۖ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَكَرَّرَ الْبَغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأُولَئِكَ لَهُمُ (محمد ۲۰) ”پھر جب کوئی واضح سورت نازل کی جائے گی اور اس میں جہاد کا ذکر کیا جائے گا تو جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے ان کو تم دیکھو گے کہ تمہاری طرف اس طرح تکتے ہیں جیسے موت سے بے ہوش آدمی تکتا ہو، سو ان کے لئے خرابی ہے۔“

ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، اب یہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے، مردانگی کا جوہر ان سے سلب ہو چکا ہے، ادھر ان کے قلب سلیم کی پاکیزگی جاتی رہی، اس لئے ان کی طرف سے اعراض کر کے رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کی جانب توجہ کرنی چاہئے جو اپنی ہر چیز اللہ کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہیں، یہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے۔

## گاؤں کے لوگ

وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦﴾ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَأَعْيَنُهُمْ تَفِيضٌ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ﴿٧﴾

”اور دیہاتی بہانہ باز آئے کہ ان کو اجازت مل جائے اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا بیٹھے رہے، ان میں سے جو کافر ہوئے ہیں عنقریب انہیں دردناک عذاب پہنچے گا کمزوروں اور نہ پیاروں اور نہ ان پر جن کو کچھ میسر نہیں کہ خرچ کریں گناہ نہیں، جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں، نیکو کاروں پر الزام کی کوئی راہ نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور نہ ان پر کچھ الزام ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ تم ان کو سواری دیدو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں جس پر تم کو سوار کراؤں تو وہ ایسی حالت میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اس غم میں کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں۔“

انسان کو اپنا طرز عمل ایسا بنانا چاہئے کہ آئندہ کبھی اس کے متعلق عذر خواہی کی نوبت ہی نہ آئے اس لئے کہ یہ بھی نفاق کا ایک حصہ اور ملک و ملت کی خدمت نہ کرنے کی ابتدا ہے، دیہات کے لوگ آتے ہیں اور عدم شرکت کے لئے مختلف قسم کے بہانے بناتے ہیں، ایسی ناشائستہ حرکت کرنے والوں کو سخت سزا ملے گی، مسلمان تو عنقریب اس ملک کے بادشاہ بن جائیں گے، پھر اس وقت جو منافقین کی حالت ہو گی ظاہر ہے۔ قرآن حکیم نے اس آیت میں جن کو معذور قرار دیا ہے انہیں ضروری ہے کہ وہ اس وقت بھی اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں۔ حدیث میں آتا ہے، آپ نے فرمایا: الدین النصیحة، ”دین خیر خواہی کا نام ہے۔“ صحابہ نے عرض کیا کس کے لئے، آپ نے فرمایا: للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمة المسلمین وعامتهم، ”اللہ، رسول، قرآن حکیم، ائمہ و امراء اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کو دین کہتے ہیں۔“

جس وقت آیات جہاد نازل ہوئیں تو چند صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر سواری کا انتظام ہو جائے جائے تو چلنے کو حاضر ہیں، آپ نے اس کا جواب نفی میں دیا تو وہ غم زدہ ہو کر واپس تو ہو گئے، مگر رنج و غم کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ایسے ہی لوگوں کی نسبت حدیث میں آتا ہے: لقد تروکم بعد کم قوما ملستم من مسیرو ولا انفقتم من نفقة ولا قطعتم وادیا الا وہم معکم فیہ، قالوا یا رسول اللہ! وکیف یكونون معنا وہم بالمدینۃ، فقال حبسہم العذر (ابوداؤد)

تبوک میں جا کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم ایک ایسی جماعت کو چھوڑ کر آئے ہو جو اگرچہ تمہارے ساتھ نہیں، مگر اجر و ثواب میں برابر ہے صحابہ نے عرض کیا وہ تو مدینہ میں رہ گئے پھر ثواب میں برابر کس طرح ہو سکتے ہیں، آپ نے جواب دیا کہ وہ اپنی معذوریوں کی وجہ سے رک گئے۔“ ورنہ شوق شہادت اور ولولہ جہاد تم سے کم نہیں رکھتے۔

### قابل الزام

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۖ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ ۚ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ تُؤْمِنَ كُفْرًا كُنَّا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥١﴾ سَيَخْلِفُونَكُمْ بِاللَّهِ كُفْرًا إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لَتُغَرَضُوا عَنْهُمْ فَاعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّمَا رَجْسٌ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾ يَخْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٥٣﴾

”بس الزام کی راہ ان پر ہے جو تم سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں، انہیں پسند آیا کہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی سو وہ نہیں جانتے، جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تو منافق تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے کہہ دینا کہ عذر مت کرو، ہم تمہارا ہر گز یقین نہ کریں گے، ہم کو اللہ تمہاری خبریں بتا چکا ہے اور ابھی اللہ اور اس کا رسول تمہارے کام دیکھے گا، پھر تم اس کی جانب لوٹائے جاؤ گے جو غائب و حاضر کو جانتا ہے، پھر جو تم کیا کرتے تھے وہ تم کو بتا دے گا، جب تم ان کی جانب لوٹ آؤ گے تو تمہارے سامنے وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے درگزر کرو، پس تم ان سے درگزر کرو کہ وہ لوگ گندے ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اس کی سزا جو وہ کرتے تھے، وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو تم اگر ان سی راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ تو نافرمان لوگوں سے راضی ہوتا نہیں۔“

اہل دولت ہی سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ عین مصیبت کے وقت کام آئیں گے، مگر وہ عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور اس لئے یہی مورد الزام بھی ہیں۔ غزوہ تبوک سے واپسی پر یہ لوگ لاکھ عذر پیش کریں، مگر اب ان پر اعتماد نہیں ہو سکتا، رہی ان کی قسمیں تو وہ صرف اس لئے ہیں کہ دربار رسالت میں ان پر عتاب نازل نہ ہو تو آپ ان سے قطع نظر کر لیجئے اس لئے کہ وہ از فرق تا بقدم امراض و مفاسد ہیں وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ ان سے خوش ہو جائیں، مگر اللہ کی رضا تو انہیں نصیب نہیں ہو سکتی جبکہ یہ ہمیشہ سے قانون شکن رہے ہیں۔

### دیہاتی زندگی

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٤﴾ وَالْأَعْرَابُ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَزِيزٌ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ

الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتَوَقَّعُ قُرْبَ اللَّهِ فَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى ۖ وَأَلَا إِنَّهُمْ مُكْتَبُونَ ﴿٥٠﴾  
سَيَذَلِّلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥١﴾

”گنوار کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ ان احکام کو نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اتارے ہیں اور اللہ سب جانتا حکمت والا ہے اور بعض گنوار ایسا ہے کہ جو خرچ کرتا ہے اس کو تاوان سمجھتا ہے اور تمہارے حق میں گردشوں کا منتظر رہتا ہے، ان ہی پر گردش بد پڑے اور اللہ سننے والا جاننے ہے والا ہے اور بعض دیہاتی ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے تقرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ بناتے ہیں، سن لو وہ واقعی ان کے لئے قربت کا سبب ہے، اللہ اپنی رحمت میں ان کو داخل کر لے گا بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

جو لوگ شہروں اور قصبوں کو چھوڑ کر گاؤں اور جنگلوں میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں وہ تہذیب اور علم و سیاست سے دور جا پڑتے ہیں، ارباب کمال کی انہیں صحبت نصیب نہیں ہوتی اور اس لئے تاریکی میں زندگی بسر کرتے ہیں، پھر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ایک انسان جنگل میں بسیرا ڈال کر اسلامی احکام سے غافل ہو جائے اور فرائض اسلامی معلوم نہ ہونے پر عین وقت کے وقت عذر خواہی کرنی شروع کر دے۔ ابو داؤد اور بیہقی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: من بد اجفاء، ”جس نے دیہات کی زندگی اختیار کی اس میں سختی اور شدت آجائے گی“، اس لئے اس آیت میں صحرا نشینوں کی مذمت بیان کی گئی کہ اچھی صحبتیں انہیں میسر نہیں آتیں، پھر یا تو وہ ملک و ملت کی خدمت ہی نہیں کرتے اور یہ کفر ہے اور جو کرتے ہیں تو زبردستی کی وجہ سے جو نفاق ہے، انہیں چاہئے تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت کو غنیمت سمجھتے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے، پھر جب ان میں یہ جوش نہیں پیدا ہوا تو وہ اسی لائق ہیں کہ احکام الہیہ سے غافل رہیں، اس جہالت کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا پڑتا ہے اسے ناحق کا تاوان خیال کرتے ہیں اور اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ جلد مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے کہ اس تاوان سے نجات ملے، مگر ان پر تو کیا گردش آئے گی خود وہی مبتلائے مصیبت ہوں گے۔

ان کے مقابلہ میں ان دیہاتیوں کو دیکھو جو مدینہ آتے رہتے ہیں اور جناب رسالت مآب کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں، وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اسی لئے ان پر دونوں جہان میں رحمتیں نازل ہوں گی۔

### السَّابِقُونَ وَالْأُولُونَ

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ ۖ ذَلِكُمْ أَجْرُهُمْ عَمَّا كَفَرُوا ۖ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ  
جَلَّتْ تَحْرِيئُهَا الْأَنْفُسُ خَلِيدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَلِكُمْ الْقَوْلُ الْعَظِيمُ ﴿٥٢﴾

”اور پہلے سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار اور جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے باغ تیار کر رکھے ہیں کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

ہر نیک کام کی ابتدا مشکل ہوتی ہے اور جو لوگ اس تکلیف کی حالت میں حق کے لئے سرفروشی کرتے ہیں وہ ہر جگہ معزز و محترم ہوتے ہیں، لہذا اسی راز فطرت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا کہ: السابِقون الاولون، اور اس سے صحابہ کے کسی خاص گروہ کی تعیین مراد نہیں، گویا کہیے کہ اس میں وہ صحابہ شامل ہیں جنہوں نے بیعت الرضوان میں شرکت کی تھی، ابوموسیٰ اشعری اور سعید بن المسیب کی رائے ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں جانب نماز پڑھی، مگر ہماری رائے میں یہ آیت نہ صرف مہاجرین و انصار پر مشتمل ہے بلکہ اس میں قیامت تک کے مسلمان آجاتے ہیں بشرطیکہ وہ اخلاص کے ساتھ ان مہاجرین کے نقش قدم پر چلیں۔

سورہ جمعہ میں آتا ہے: وَاٰخِرِينَ مِنْهُمْ لَيَاِلْحِقُوْا بِهِمْ۔ ”اور وہ لوگ بھی جواب تک ان سے نہیں ملحق ہوئے۔“ سورہ انفال میں ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدِ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مَعَكُمْ۔ ”اور جو بعد میں دولت ایمان سے مشرف ہو کر ہجرت و جہاد کے فرائض کو ادا کریں گے وہ بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

### مختلف اقسام

اگر مہاجرین و انصار کا طریق عمل چھوڑ دیا گیا تو حسب ذیل قسموں کے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔

وَمِنْ حَوْلِكُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ مُنْفِقُوْنَ ۖ وَمِنْ اَهْلِ الْبَدِيْنَةِ ۚ مَرَدُّوْا عَلٰى النِّفَاقِ ۚ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يَرْجُوْنَ اِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿٦٠﴾ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا صَالِحًا وَّاٰخَرًا سَيِّئًا عَسٰى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦١﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّ صَلٰوَتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۚ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ ۚ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٣﴾ وَقُلْ اَعْمَلُوْا فَيَسِيْرَ اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَ الْبُؤْسُوْنَ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَ السَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٤﴾

”اور تمہارے گرد و نواح کے بعض گنوار منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر آڑے ہوئے ہیں، تم انکو نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں، ہم انہیں دوسری سزا دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کی جانب لوٹائے جائیں گے اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا انہوں نے ایک نیک اور دوسرا بڑا کام ملایا، امید ہے کہ اللہ اپنی توجہ فرمائے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ان کے مالوں میں سے صدقہ لو کہ اس کے سبب ان کو پاک اور صاف بناؤ اور ان کے لئے دعا کرو بیشک تمہاری دعا ان کے لئے تسکین کا سبب ہے اور اللہ سزا جانتا ہے، کیا وہ نہیں جان چکے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات لیتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے اللہ اور اس کا رسول اور مسلمان تمہارے اعمال دیکھ لیں گے اور اسی کی جانب لوٹائے جاؤ گے جو چھپے اور کھلے کا واقف ہے، توجہ تم کر رہے تھے وہ تم کو جتا دے گا۔“

ان آیات میں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے:

(الف) منافقین کی ایک جماعت ہے جو نہ صرف دیہات تک محدود ہے بلکہ اس کے کچھ آثار مدینہ میں بھی ملتے ہیں، گو تمہیں ان لوگوں کا علم نہ ہو مگر ہم خوب جانتے ہیں وہ ہمیشہ اور ہر جگہ ذلیل ہوں گے۔

(ب) دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں ابھی تک شریعت کا پورا اتباع نہیں آیا، چونکہ انہوں نے شریعت کی پابندی میں ضرور کچھ نہ کچھ تکلیف برداشت کی ہے اس لئے عجب نہیں اللہ ان کی توبہ قبول کر لے رہے ان کے برے اعمال تو ان کے جبر نقصان کی یہ صورت ہے کہ ان کے صدقات قبول کئے جائیں کہ اس سے ان کا تزکیہ ہو گا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی ان کے لئے دعاء کرنی چاہئے کیونکہ آپ کی دعا ان میں اور زیادہ اخلاص پیدا کر دے گی، یہ لوگ حسن نیت کے ساتھ نیک کام کرتے رہیں، ضرور ایک وقت ایسا آئے گا جب تمام مسلمان ان کی قدر کریں گے۔

ان آخری آیات میں دراصل چند ان صحابہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کابلی کی وجہ سے غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس ہو کر مدینہ پہنچے تو ان لوگوں کو اپنی سستی پر ندامت ہوئی اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا کہ جب تک آپ نہ کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے رہیں گے، آپ نے انہیں اس حال میں دیکھا تو اصل حقیقت دریافت کی، واقعہ معلوم کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ کے حکم کا انتظار کرو، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان لوگوں نے کفارہ کے طور پر اپنا تمام مال و متاع دربار سالت میں پیش کر دیا کہ اس کو فقر میں تقسیم کر دیا جائے۔

وَ اخْذُوْنَ مَرْجُوْنَ لَا مَرِئَ لَہُمْ اَمَّا یُعَذِّبُہُمْ وَاَمَّا یُتُوبُ عَلَیْہُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۳۹﴾

”اور کچھ اور لوگ ہیں کہ ان کا معاملہ اللہ کے حکم پر ملتوی ہے یا ان کو عذاب دے اور یا ان پر توجہ فرمائے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

(ج) یہ تیسری قسم ہے جن کی نسبت مسلمان کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، ان کے اعمال سے دونوں قسم کے شبہات پیدا ہوتے ہیں، کبھی یہ خیال آتا ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ ان کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں، اگر کوشش کرتے تو اپنی جہالت کو دور کر سکتے تھے اور کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اخلاص سے کیا اس لئے ان کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کیا جاتا ہے، یہ لوگ ہلال بن امیہ، مرارۃ بن الربیع اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم ہیں جو کابلی کی وجہ سے جنگ تبوک میں شریک نہ ہو سکے ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

مسجد ضرار

گزشتہ رکوع میں بتایا گیا تھا کہ مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چلنے سے کامیابی نصیب ہو سکتی ہے، اس کو ترک کرنے کے بعد مختلف اقسام کے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہوا، اب ایک ایسی جماعت کا ذکر آتا ہے جو اس مقدس

گروہ کے بخط مستقیم مخالف ہے اور اس کا نصب ہی بالکل جداگانہ ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِزْوَاجًا لِّبَن حَارَبِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ مِنْ قَبْلُ  
وَلَا يَخْلِفْنَ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٥٠﴾ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لِمَسْجِدٍ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ  
مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ﴿٥١﴾

”اور جنہوں نے تکلیف پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور اس کے لئے جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ رہا ہے اور گھات لگانے کو مسجد کھڑی کی اور اب قسمیں کھانے لگیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمیں کچھ مقصود نہ تھا اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں، تم اس مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہو، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی اس لائق ہیں کہ تم اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

بنو خزرج میں ایک شخص ابو عامر راہب تھا جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی بن گیا تھا، اس نے کئی مرتبہ رسول اللہ کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا اور بالآخر جنگ حنین کے بعد شام کی طرف بھاگ گیا، وہاں سے مدینہ کے چند مخصوص منافقین کو لکھا کہ میں شاہ ہر قل کی فوجوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہوں، تم ان کے لئے کوئی مناسب مقام پہلے سے تیار کر لو، حسن اتفاق سے ابو عامر تو وہیں مر گیا اور ان لوگوں نے مسجد قبا کے قریب اپنی مسجد بنائی، اس کے بنانے میں ان کے مقاصد حسب ذیل تھے:

- (۱)۔ مسجد قباء کو رسول اللہ ﷺ، مہاجرین اور انصار نے بنایا تھا، ایسی مقدس مسجد کو یہ لوگ نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔
- (۲)۔ تمام اطراف ملک میں کفر و نفاق کی اشاعت کے لئے اس کو مرکز بنانے کی فکر میں تھے۔
- (۳)۔ مسلمانوں میں اختلاف کی آگ بھڑکانی چاہتے تھے، ان کی مرکزیت اور وحدۃ مقصد کو ضرر پہنچانا ان کے پیش نظر تھا اور ان کی جماعتوں اور حکومتوں کو ایک دوسرے کا مخالف بنانا ان کی غرض تھی۔

- (۴)۔ جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں اور جو اسلامی حکومتوں سے بغاوت کریں ان کو پناہ کی جگہ مل جائے۔
- جب یہ مسجد بن گئی تو ان منافقین نے رسول اللہ ﷺ سے اس میں نماز پڑھنے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ غز وہ تبوک سے واپس آ کر وہاں نماز پڑھوں گا، جب آپ اس جنگ سے واپس تشریف لائے تو ان لوگوں نے ایفاء وعدہ کی

• اگر چشم بصیرت دے تو یورپ کے طرز عمل پر غور کرو، کبھی عربی خلافت کا مسئلہ ہے، کبھی اقوام کی آزادی ہے، کبھی تہذیب اور علم کی اشاعت ہے اور کسی جگہ تجارت کے فروغ کی خاطر سڑکیں تیار کی جا رہی ہیں، تونس، الجزائر، مراکش اور ایران اسی کا شکار ہوئے، ترکی سلطنت کے جس قدر حصے الگ ہوئے وہ اسی چالبازی کے نتائج ہیں: فہل من مدکر۔

• یورپ کی گذشتہ ایک سو سال کی تاریخ دیکھ لیتے ہیں۔



التجاک، آپ وہاں جانے کو تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا کہ اگرچہ اس مسجد کے بانی اصلاح کا دعویٰ کرتے ہیں مگر دراصل اس کے مقاصد نہایت ہی ہلاکت انگیز ہیں، آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں جس کی بنیاد محض پاکیزگی پر ہے اور جس کے تمام نمازی تقویٰ کی مجسم تصویر ہیں۔

یہ مسجد کونسی ہے؟ اہل علم اس میں مختلف رائے ہیں۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت اہل قبا کے حق میں نازل ہوئی ہے، یہی ابن عباس، عروہ بن الزبیر، عطیہ العوفی، عبد الرحمن بن زید بن اسلم، شعبی، حسن بصری، سعید بن جبیر اور قتادہ کی رائے ہے۔ یہی وہ مسجد ہے جس کو مدینہ آتے ہی رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام نے بنایا تھا، جس کے قبلہ کی تعیین خود جبریل علیہ السلام نے کی تھی اور جس کی زیارت کے لئے رسول اللہ ﷺ سوار اور پیادل جایا کرتے تھے، جب اس آیت کو مسجد قبا کے حق میں تسلیم کیا گیا تو مسجد نبوی اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہو جائے گی اور یہی ہماری رائے ہے۔

جب جناب رسالت مآب کو اس مسجد کے اغراض کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کو گرا کر کوڑا کرکٹ کی جگہ بنادیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دشمن اپنی ریشہ دوانیوں کے لئے عبادت گاہوں کو سامان حرب اور سیاسی چال بازیوں کا مرکز بنائے تو ان کا گرا دینا ضروری ہوگا، بعض فقہاء کی رائے ہے کہ ایک محلہ میں صرف ایک ہی مسجد ہونی چاہئے کیونکہ دوسری مسجد کے بن جانے سے پہلی مسجد کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہیں۔

### انتباہ

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٍ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شِقَاٍ جَوْفٍ هَاٍ فَاتَّهَارَ بِهِ فِي نَارٍ جَهَنَّمَ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾

”بھلا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور خوشنودی پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی ہو جو گرنے ہی کو ہو، پھر وہ اس کو دوزخ کی آگ میں لے گری اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ان کے دلوں میں ہمیشہ شک کا سبب رہے گی، مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ واقف حکمت والا ہے۔“

ان دونوں مسجدوں کے باہمی فرق کو اور زیادہ واضح کر کے بتادیا کہ مسجد قبا کی بنیاد رضائے الہی کی تلاش اور پاکیزگی پر رکھی گئی ہے اور مسجد ضرار کے مقاصد ہی جداگانہ ہیں، جس کا سوائے بربادی کے اور کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا، اس مسجد کی وجہ سے ان منافقین کے دلوں میں نفاق ہمیشہ رہے گا اور کوئی چیز ان کے قلوب کو پاک نہ کر سکے گی۔

ان آیات نے ہمیں ایک دائمی قانون بتادیا کہ مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چلنا کامیابی کا اصلی ذریعہ ہے، اگر اس سے الگ ہوئے تو ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔



## فصل ثانی

### اشاعت جہاد

بہترین سودا

مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر نہ چلنے سے جو نتائج بد پیدا ہو سکتے تھے ان کا بیان آچکا، اب بتایا جاتا ہے کہ السابقون الاولون، کے اتباع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرے گا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْفُرْقَانِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾

”بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا کہ ان کے لئے جنت ہے، یہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔ تورہ، انجیل اور قرآن میں اللہ کے ذمہ سچا وعدہ ہو چکا اور اللہ سے زیادہ قول کا پورا کوں ہے، تو اس بیع پر خوشیاں مناؤ جس کا معاملہ تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

جو لوگ قرآن حکیم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، مخالفین کو تلوار کے گھاٹ اتارتے ہیں اور خود بھی جام شہادت نوش کرتے ہیں یہی جنتی ہیں اور یہ وعدہ ہر کتاب الہی میں موجود ہے: ”اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے، تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا اور آکر میرے پیچھے ہو لے“ (متی ۱۹: ۱) کتاب استثناء کا اٹھا بیسواں باب تو اسی قسم کے وعدوں سے بھر ا ہوا ہے، چند آیات ملاحظہ ہوں:

”اور ایسا ہو گا کہ اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے تاکہ ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے فرماتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا تجھے زمین کی قوموں کی بہ نسبت سرفراز کریگا اور جب تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا ہو گا تو یہ ساری برکتیں تجھ پر آدینگی اور تجھے پہنچے گی“ (استثناء ۲۸: ۲) اور لیجئے: پس اے اسرائیل سن لے اور اس کے کرنے پر دھیان رکھ تاکہ تیرا بھلا ہو اور تم نہایت فراوان ہو جاؤ اس سر زمین میں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے، جیسا خداوند تمہارے باپ داداؤں کے خدا نے تم سے کہا ہے، سن لے اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے، تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ“ (استثناء ۶: ۴، ۵، ۳)

قرآن حکیم ان وعدوں کی تجدید کرتا ہے۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام لوگوں نے مسجد میں زور سے تکبیر کہی اتنے میں ایک انصاری مسجد میں آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا یہ آیت آپ پر نازل ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے عرض کیا: ینیع ریحہ لانقیل ولا نستقیل، ”یہ تجارت تو بڑی ہی سود مند ہیں، ہم اسے ہر گز واپس نہیں کریں گے۔“

## خارجی علامات

الَّتِي تَأْتِيُونَ الْعِبَادُونَ الْحَيْدُونَ السَّائِمُونَ الرَّاكِعُونَ السَّجِدُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٧﴾

”یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، اللہ کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم کرنے والے اور برے کام سے منع کرنے والے اور اللہ کی حمد و کا خیال رکھنے والے اور مومنین کو مژدہ سنادو۔“

جنگ کے مواقع تو کبھی کبھی آتے ہیں، اس لئے اب وہ علامات بتائی جاتی ہیں جنکی وجہ سے ہر شخص ان سرفروشان ملت کو شناخت کر سکے۔ التابون، گر گر کر سنبھلنے والے، سب سے پہلے توبہ کا ذکر کیا کہ توبہ کے وقت انسان جان دینے پر پورا آمادہ ہو جاتا ہے اور یہی العبدون کا مطلب ہے، السائحون، اشاعت اسلام کے لئے دور دور از سفر کرنے والے کہ ہر ذی فہم غیر مسلم کے پاس قرآن کی آواز پہنچ جائے، یہ صحیح معنی میں مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور انہی کے لئے ہر قسم کی کامیابی ہے۔

دعائے مغفرت نہ کرو

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلنَّاسِ كَيْفَ وَلَوْ كَانُوا أُولَىٰ قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٣٧﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِابْنِهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَبَّىٰ تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿٣٨﴾

”نبی اور مسلمانوں کو یہ جائز نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں اس کے بعد کہ ان کو ظاہر ہو چکا کہ وہ دوزخی ہیں اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت مانگنا صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس سے کر لیا تھا، پھر جب ابراہیم پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے، بیشک ابراہیم بڑے نرم دل بردبار تھے۔“

جب مومن خدا کے ہاتھ میں گیا تو پھر اسے یہ جرات ہی نہیں ہو سکتی کہ معلوم ہونے کے بعد خدا کے کسی دشمن کے لئے رحم کی دعا کرے، اسلام کی اصلی روح یہی ہیں: اشد اعلیٰ الکفار رجاء بینہم، خواہ وہ کافر کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو، اس پر یہ کہجا سکتا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے کیوں دعا کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ دعائے مغفرت کا وعدہ اس وقت

ہوا تھا جس وقت انہیں اپنے باپ کی نسبت پورے طور پر مخالف اسلام ہونے کا یقین نہ تھا، چنانچہ جب انہیں اپنے باپ کے کفر کا پورا یقین ہو گیا تو اس سے فوراً علیحدگی اختیار کر لی حالانکہ ایک نرم دل اور حلیم شخص کے لئے باپ سے الگ ہونا سخت دشوار تھا۔

ابن بریدہ اپنے والد سے راویت کرتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھ کر ہماری طرف توجہ کی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، حضرت عمر نے اس رونے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اِنِّی سَالَتُ رَبِّی عَزَّوَجَلَّ لَا لِاسْتِغْفَارٍ لَامِی فَلَہِمْ یَا ذُنَّی فِدَمَعَتِ عَیْنَاۤی رَحْمَۃً لِّہَا مَنَ النَّارِ (مسند امام احمد) ”میں نے اپنی والدہ کے لئے اللہ سے استغفار کی اجازت طلب کی تو روک دیا گیا اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔“

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰۱﴾ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ يُحْيِی وَيُمِیْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنۢ بَلٰیءٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۲﴾

”اور اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو گمراہ کرے بعد اس کے کہ ان کو راہ پر لا چکا ہو جب تک ان کو وہ چیزیں نہ بتادے جن سے وہ بچتے رہیں، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے، آسمانوں اور زمین کی سلطنت بیشک اللہ ہی کی ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے اور اللہ کے سوانہ تمہارا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔“

سنت اللہ یہ ہے کہ پہلے ایک قوم کو سیدھا راستہ دکھایا جاتا ہے، اگر صداقت معلوم ہونے کے بعد بھی وہ اس راستہ کو ترک کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی برکتوں سے محروم کر دیتا ہے، پس اگر کفار عرب نے رسول ﷺ کے خلاف راہ اختیار کی اور مسلمانوں کو ان سے اپنے تمام تعلقات توڑنے پڑے تو سراسر قصور ان کافروں کا ہے اس لئے کہ قرآن نے ان کو کھول کھول کر کے سب کچھ بتا دیا تھا اور مسلمانوں کو ان کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اس خدا پر اعتماد کئے ہوئے ہیں جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور جس کے ہاتھ میں موت و حیات کا رشتہ ہے، وہ مسلمانوں کو بہت جلد خلافت کبریٰ تک پہنچا دے گا اور اگر ان کی استعداد میں کچھ کمی ہوئی تو اس کو پورا کر دے گا۔

اصحابِ ثلاثہ

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَٱلْأَنْصَارِ ٱلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِی سَاعَةِ ٱلْعُصْمَةِ مِّنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فِرَاقِیْ مَنَّهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّہٗ بِهِمْ رَعُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۰۳﴾

”اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر توجہ فرمائی جنہوں نے مشکل کی گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا اس کے بعد کہ ان میں سے بعض کے دل ڈگمگائے تھے پھر اللہ ان پر مہربان ہوا، بیشک وہ بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔“

اس کرۂ ارضی کی پشت پر بہترین لوگ وہ ہیں جنہوں نے سخت تکلیف کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا۔ غزوہ تبوک کے واقعات کو یاد کیجئے جس کو مسلمانوں کی غربت کی وجہ سے جیش العسرة اور غزوہ العسرة بھی کہتے ہیں۔ قتادہ کہتے

ہیں کہ سامان خوراک کی یہ کیفیت تھی کہ دودو صحابہ میں ایک کھجور تقسیم ہوتی تھی اور بعض اوقات یہاں تک نوبت پہنچی کہ صرف اس کی گٹھلی چوسنے پر قناعت کرنی پڑی، دور ان سفر میں ایک جگہ پانی ختم ہو گیا، قریب تھا کہ لوگ اونٹ ذبح کریں، حضرت ابو بکر نے دربار رسالت میں دعا کے لئے عرض کی آپ نے اسی وقت دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اس قدر پانی برسا کہ سب سیراب ہو گئے: ثم ذهبنا ننظر فلم نجدها تجاوزت العسکر، ”پھر ہم یہ دیکھنے کو لشکر سے باہر گئے کہ کہاں تک بارش ہوئی ہے تو دیکھا کہ لشکر سے باہر اس کا اثر تک نہ تھا۔“ ان حالات میں جن لوگوں نے ساتھ دیا وہ یقیناً اللہ کی بار بار رحمت کے مستحق ہیں۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِفُوا حَتَّىٰ إِذَا صَافَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَصَافَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الشَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾ (التوبہ ۱۱۸)۔

”اور ان تین شخصوں پر بھی جو ملتوی کئے گئے یہاں تک کہ جب زمین باوجود وسعت کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ان پر تنگ ہو گئیں اور سمجھ گئے کہ اللہ کے سوا اور کسی کے پاس پناہ نہیں، پھر ان پر مہربان ہوا کہ توبہ کئے رہیں، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہیں۔“

ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ ہجرت کے نویں سال رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع ہو رہی ہے، یہ سن کر آپ نے بھی تیاری کا حکم دیا اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا، تبوک پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دلیرانہ تیاری کا حال سن کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ آنحضرت نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔ اس مدافعت میں حقیقی مسلمانوں میں سے صرف تین شخص نہ جاسکے، کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع، یہ دل کی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں، بلکہ سستی اور کاہلی کی وجہ سے رہ گئے، چلنے کا پورا سامان کر لیا تھا مگر پوری مستعدی سے کام نہ لیا۔

جب آنحضرت واپس آئے تو منافقین نے آکر عذر پیش کرنے شروع کئے اور آپ نے ہر ایک کو معاف کر دیا، مگر جب یہ تینوں بزرگ حاضر ہوئے اور سچ سچ عرض کر دیا کہ سستی اور کاہلی کی وجہ سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقع نکل گیا تو ان کے فیصلہ کو خدا پر چھوڑ دیا گیا۔

یہ تاریخ اسلام کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ کو اگرچہ منافقین کے مقابلہ میں انکی رعایت یقیناً منظور ہوگی، مگر دقت یہ تھی کہ اہل نفاق تو جھوٹی قسمیں کھا کر اور عذر کر کے کم از کم ظاہری طور پر قانون کے پابند رہے اور یہ لوگ چونکہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتے تھے اور اپنے قصور کے معترف تھے، اس لئے اگر ان کو بھی معاف کر دیا جاتا تو پابندی قانون باز بچہ اطفال بن جاتی، علاوہ ازیں چونکہ یہ مخصوص لوگ تھے، ان سے ایسی ضرورت کے وقت اتنی بڑی کمزوری کا اظہار دراصل محاسبہ کے قابل تھا اس لئے آپ نے ان کی توبہ قبول نہ کی اور حکم دیا کہ گھر میں ٹھرو اور فیصلہ خداوندی کا انتظار کرو، مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان سے تمام تعلقات منقطع کر دیں۔ نہ کوئی بات چیت کرے، نہ ملے جلے، نہ اور کسی

طرح کا واسطہ رکھے، پھر ان کی بیویوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں۔

کعب کہتے ہیں: کنت اشہد الصلوٰۃ مع المسلمین واطوف بالاسواق فلا یکفی احد، ”مسلمانوں کے ساتھ میں نماز ادا کرتا اور بازاروں میں گشت لگاتا مگر تمام مدینہ میں ایک شخص بھی مجھ سے بات نہ کرتا“۔ ولق رسول اللہ ﷺ وهو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ فاسلم واقول فی نفسی احراک شفقتیہ برد السلام علی امرا، ”نماز کے بعد میں آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا اور دل میں کہتا کہ آپ نے سلام کا جواب دیا ہے یا نہیں“۔ یہاں تک کہ ایک روز تنگ آکر میں اپنے چچیرے بھائی ابو قتادہ کے پاس گیا، مگر اس نے بھی منہ پھیر لیا اور جواب تک نہ دیا اس پر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس درمیان میں ایک اور حیرت انگیز واقعہ ہو گیا، غسان کے عیسائی بادشاہ کو اس قصہ کی اطلاع ملی تو اس نے کعب کو خط لکھا: بلغنا ان صاحبک قد جفاک وان الله لم يجعلک فی دار هوان ولا مضیة فالحق بنانا واسک، ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تمہارے ساتھ بد سلوکی کی ہے، اب میرے پاس چلے آؤ، دیکھو کیسی عزت ہوتی ہے“۔ کعب بن مالک کو خط ملا تو اپنی کے سامنے آگ میں جھونک دیا اور کہا یہ اس کا جواب ہے، اس کی بے التفات بھی دوسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ زیادہ عزیز و محبوب ہے۔

اے جفا ہائے تو خوش ترز وفائے دگر اس!

آخر پورے پچاس دن کی گریہ وزاری اور عبادت و استغفار کے بعد ان کی آزمائش پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور مندرجہ بالا آیت نازل کی، جب کعب کو قبولیت توبہ کی مسرت اندوز خبر ملی تو انہوں نے اپنا تمام مال و متاع شکرانہ قبولیت میں لٹا دینا چاہا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿٥٨﴾

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔“

اس آیت میں ان تین صحابہ کی تعریف کی گئی ہے کہ محض صدق اور اخلاص کی بدولت وہ ان اعلیٰ ترین مراتب تک پہنچے، مومنین کو تاکید کر دی کہ انکا پورا اتباع کریں اور سچائی ہی کو ذریعہ نجات جانیں، ادر ہر منافقین کو تنبیہ ہو گئی کہ صرف جھوٹ بولنے کی وجہ سے تم ناکام ہوئے، اب بھی اگر سچ کو اختیار کر لو تو سب کچھ ہے۔

اعلیٰ ترین طبقہ کے فرائض

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْصَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ ثِيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٩﴾ وَلَا يَنْفَعُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾

”اہل مدینہ اور ان کے گرد و نواح کے دیہاتوں کو مناسب نہ تھا کہ رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ کہ رسول کی جان سے اپنی جانوں کو زیادہ چاہیں، یہ اس لئے کہ ان جہاد کرنے والوں کو اللہ کی راہ میں نہ پیاس اور نہ رنج اور نہ بھوک پہنچتی ہے اور نہ ایسے مقام پر چلتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور دشمن سے کوئی چیز حاصل نہیں کرتے ہیں مگر ان کے لئے ان سب پر عمل نیک لکھا جاتا ہے، بیشک اللہ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتا اور کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا خرچ کرتے ہیں اور کوئی میدان طے نہیں کرتے مگر یہ کہ سب ان کے نام لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا بہتر سے بہتر بدلہ دے۔“

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ہر متاع عزیز اللہ کے نام پر بیچ چکے ہیں، پس یہ اعلیٰ ترین طبقہ کے افراد ہیں اور اس لئے ان کے فرائض حیات بھی سب سے بالاتر ہوں گے۔ عام مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ وہ اللہ کے ہر حکم کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں، مگر اس اعلیٰ ترین طبقہ کا یہ فرض ہو گا کہ ہر وقت مصروف کار ہے اور موقع بموقع اسلامی فرائض کی اشاعت کرتا رہے، جب ان فرائض کے ادا کرنے میں یہ لوگ سربکف کوشش کریں گے تو انہیں ہر ادنیٰ ترین تکلیف کے معاوضہ میں بے انتہا نعمتیں ملیں گی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جنگ تبوک کے لئے تین سو اٹھ تمام ساز و سامان کے ساتھ دیئے تو رسول اللہ نے فرمایا: ماعلیٰ عثمان ان ماعمل بعد هذا ”اگر اس کے بعد عثمان کوئی نیک کام بھی نہ کرے تو اس کی نجات کے لئے یہی کافی ہے۔“

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۶﴾

”اور یہ ٹھیک نہیں کہ سب کے سب مسلمان نکل کھڑے ہوں پھر کیوں نہ ان کی ہر جماعت میں سے چند لوگ نکلیں تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور جب وہ ان کی جانب لوٹ آئیں تو اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ وہ بچتے رہیں۔“

گزشتہ آیت میں بتایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مسلمانوں کو آرام طلب نہ ہونا چاہئے، باقی وہ اس کا خوف نہ کریں کہ انہیں ہمیشہ جنگ پر بھیجا جائے گا، کیونکہ خود مصلحت اس امر کی مقتضی ہے کہ کچھ لوگ ضرور پیچھے رہیں جو مجاہدین کے اہل و عیال کی نگرانی کریں اور ممکن ہے وہ خدمت تمہارے ہی سپرد ہو جائے، بہر حال ہر جماعت میں سے کچھ لوگ ضرور اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں جو علم دین حاصل کرنے کی خاطر برابر کے ہم رکاب رہیں اور پھر فارغ ہو کر اپنی قوم کو تعلیم دیں۔

ان آیات پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں جنگ و جدل کی تعلیم اور ترغیب ہے اور یہ اصول اخلاق کے منافی ہے۔ مگر انہیں سوچنا چاہئے کہ کیا دنیا میں شریر لوگ ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو ایک کامل شریعت میں جہاد کی تعلیم ناگزیر ہے اور جب جہاد واجب ہو تو اس کے تمام متعلقات بھی واجب ہوئے۔ ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ جو فطرت انسانی کا خالق ہے ہمیشہ اس کی رعایت فرماتا ہے، پس جو چیز زیادہ گراں اور زیادہ ضروری ہو گی اس کی تاکید بھی نہایت ہی شدید ہو گی، یہی وجہ ہے کہ جہاد پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔

## جہاد کی ابتدا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٣﴾

”اے ایمان والو! اپنے آس پاس کے کافروں سے لڑتے چلو اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔“

مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا فرض ہے کہ ان کافروں سے جنگ کریں جو ان کے بالکل متصل ہیں اور اس سختی کے ساتھ لڑیں کہ آخر دشمنانِ دین بالکل مقہور ہو جائیں اور سختی کی ضرورت اس لئے ہے کہ کوئی شخص تم میں سستی نہ پیدا کر سکے، تا آنکہ وہ ملکِ مسلمانوں سے آباد ہو، پھر اس جگہ کے مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ اپنے قریب کے کافروں سے جنگ کریں و ہدم جراتا آنکہ دینا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں قرآن کی حکومت قائم ہو۔ اس وقت مرکزی جماعت کا فرض یہ ہو گا کہ ان مجاہدین کے اہل و عیال کی خبر گیری کرے اور ان کی ہمت افزائی کے لئے ہر قسم کے ضروری سامان فراہم کرتی رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے عرب کو پاک کیا پھر عیسائیوں کی جانب توجہ کی۔

## مسرت و شادمانی

وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً فَمِنْهُمْ مَن يَقُولُ أَكُنْمْ زَادَتْهُ لِهَذِهِ آيَاتًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَوَازَتْهُمْ آيَاتُنَا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٢٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٢٥﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذْكُرُونَ ﴿٢٦﴾ وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً تَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ هَلْ يَرِيكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٢٧﴾

”اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا ایمان اس سورت نے بڑھادیا، سو جو ایمان رکھتے ہیں پس اس سورت نے ان کا ایمان تو بڑھادیا اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے تو اس سورت نے ان میں ان کی گندگی پر ایک اور گندگی بڑھائی اور وہ کافر ہی مر گئے، کیا نہیں دیکھتے کہ ہر سال میں ایک بار یادو بارہ بتلائے مصیبت ہوتے رہتے ہیں پھر نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ تم کو کوئی دیکھتا تو نہیں پھر چل دیتے ہیں، اللہ نے ان کے دل پھیر دئے ہیں اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔“

جب قرآن حکیم کی کسی سورت میں لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی جائے تو اہل ایمان اس حکم کے سنتے ہی مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ ایمان کا بقا ضروری ہے اور یہ نہیں باقی رہ سکتا جب تک مرکزی قوت کو تمام بیرونی حملوں سے محفوظ نہ کر دیا جائے اور اس کے لئے جہاد ضروری ہے، مگر یہی حکم منافقین کے لئے موت ثابت ہوتا ہے، ان کی خباثت میں اور ترقی ہوتی ہے، وہ جہاد کی مصلحتوں سے واقف نہیں اور اس لئے کہتے رہیں کہ یہ تو



دنیاوی حکومت کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ سال میں چند ایک مرتبہ ضرور اس قسم کے واقعات ہو جاتے ہیں جو مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی مرکزی حکومت کی حفاظت میں سرفروشانہ اقدام کریں، مگر باوجود اس کے ان کی آنکھیں پھر بھی نہیں کھلتیں، بلکہ غلامی ان کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کر گئی ہے کہ جہاد کا حکم سنتے ہی فوراً بھاگ جاتے ہیں اور یہ حیلہ تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے جہاد کی اطلاع تو ملی نہیں، پھر شرکت کی کیا ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ایک شخص احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دے تو اس کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں، وہ نہ تو کسی اچھی بات کو سمجھتا ہے اور نہ اپنے فرائض کی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔

حسبی اللہ

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۲﴾

”بیشک تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئے جن پر تمہاری تکلیف شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی کے حریص ہیں، ایمان والوں کے ساتھ نہایت شفیق مہربان ہیں، اس پر اگر لوگ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ مجھ کو اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔“

جو لوگ قلب سلیم رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کا حکم بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہے، جہاد کے احکام ایسی ذات قدسی کی طرف سے دیے جاتے ہیں جو اجنبی نہیں کہ تم سے دشمنی کا اظہار کر رہا ہے، بلکہ تم ہی میں سے ایک عربی ہے اور اسے برابر یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ تمہیں ہر قسم کا فائدہ حاصل ہو، پس جو نبی اس درجہ رحم مجسم ہو اس کی نسبت تمہیں یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تمہیں ایسا حکم دے گا جو تمہاری تکلیف کا باعث ہو؟ ایسا ہونا غیر ممکن اور محال ہے اس لئے جہاد کا حکم رحمت کی منافی نہیں، بلکہ تم غور کرو تو تمہاری حیات اجتماعی ہے۔ لہذا تمہیں حکم ہے کہ جہاد کا عمل کئے بغیر تم غیروں کی دست برد سے ہر گز محفوظ نہیں رہ سکتے اس لیے دنیا میں جہاد کا حکم تمہارے لئے بے انتہا فوائد اپنے اندر رکھتا ہے، غصہ ان تکرہوا شیئا وھو خیر لکم۔ ”جس چیز کو تم ناپسند کرتے ہو عجب نہیں وہی تمہارے لیے رحمت کا موجب بن جائے۔“

لیکن اگر باوجود ان کھلے کھلے احکام کے پھر بھی تم نے غفلت سے کام لیا اور سرفروشان اسلام کی جماعت تیار نہ کی جو ہر وقت اللہ کے نام پر سر دینے کو تیار ہو تو تمہیں یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ رسول اللہ کے لئے صرف ایک اللہ کافی ہے، اس کا اعتماد کسی انسانی قوت پر نہیں، بلکہ اس ذات واحد پر ہے جو عرش عظیم کا مالک ہے، وہ اپنے قرآن اور کلمہ حق کی حفاظت کے لئے تم سے بہتر نفوس قدسیہ سارے عالم سے منتخب کر لے گا۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولى ونعم النصير۔ وھذا آخر ما اردنا ایراد فی تفسیر سورۃ۔ البراءۃ واللہ اعلم بالصواب۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔





بسم اللہ الرحمن الرحیم  
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

## سورۃ یوسف (رکوع ۱۱ آیات ۱۱۱)

سورۃ کا نام

قرآن حکیم میں بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی کئی نام ان کی خصوصیات کی بنا پر ذکر کئے گئے ہیں، مگر یہ سورہ مبارکہ ان ممتاز سورتوں میں سے ہے جس کا صرف ایک ہی نام ہے اور وہ سورۃ یوسف ہے۔ اگر تمام قرآن پاک کو آپ ایک مرتبہ دیکھ جائیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سورۃ یوسف کے علاوہ اس کتاب عزیز میں صرف دو مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اسم گرامی ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ انعام میں ہے: **وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَأَيُّوبَ ۚ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (الانعام ۸۴)** ”اور ہم نے ان کو اسحق اور یعقوب بخشے اور سب کو ہدایت دی اور پہلے نوح کو بھی ہم نے ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور ہارون کو بھی اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں“۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: **وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ (المومن ۳۴)** ”اور پہلے یوسف بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے تو وہ جولائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے“۔ ان دو مواقع کے علاوہ کہیں بھی آپ کا تذکرہ نہیں آیا اور آپ کی سوانح حیات جس قدر سراہہ عبرت و بصیرت اپنے اندر رکھتی ہے ان سب کو ایک ہی جگہ اس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورت میں تمام تر قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے اس لیے اس کا نام سورۃ یوسف قرار پایا۔

مقام نزول

اس امر پر مفسرین کرام کا قاطبہ اتفاق ہے کہ یہ سورۃ تمام و کمال مکہ مبارکہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔

ترتیب مضامین

ابتدائی آیات میں ان نتائج کا ایجاز و اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو اس قصہ کے حقیقی اغراض و مقاصد ہیں۔ آیت ۴ سے حضرت یوسف کے واقعات و حالات کی تفصیل شروع ہوتی ہے، حیات یوسفی کے یہ حوادث و سوانح آیت ۱۰ پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آیت ۲۰۱ سے پڑھنے والے کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل کیا جاتا ہے کہ اس قصہ کے بیان کرنے کا منشا کیا تھا؟ گویا مطلب یہ تھا۔

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں  
گفتہ آید در حدیث دیگر اں!

ابن یعقوب کا ذکر کر کے قارئین کرام کو یہ بتادیا جائے کہ یہی واقعات رسول اللہ ﷺ کو پیش آئیں گے اور انہیں نتائج کا ظہور ہو گا جو یوسف کنعان کے لیے منصفہ شہود پر جلوۂ افروز ہوئے پس یہ سورۃ یوسف پیشین گوئی کے رنگ میں رحمۃ للعالمین ہی کی سوانح عمری ہے۔

آگے چل کر فرمایا کہ رشد و ہدایت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان میں صد ہا قسم کی نشانیاں دیکھتے ہیں، مگر پھر بھی ان کی چشم بصیرت وا نہیں ہوتی، کیا عجب ہے کہ اس جرم عظیم کی پاداش میں وہ کسی شدید ترین ناگہانی عذاب میں مبتلا نہ کر دیئے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب و حواریین جو شب و روز فرزند ان آدم کو راہ حق و صدق کی دعوت دیتے ہیں تو ظن و تخمین کی بنا پر نہیں، بلکہ علی وجہ البصیرۃ۔ اس پر بھی یہ لوگ اپنی کج روی ترک نہ کریں تو مصلحین و دعاۃ کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ مضمون آیت نمبر ۱۰۸ پر ختم ہو جاتا ہے۔

دنیا میں آج تک یہی دستور چلا آیا ہے کہ مردوں ہی میں سے انبیاء و رسل کا انتخاب کیا گیا ہے، پھر جن لوگوں نے ان ارباب خیر و صلاح کی مخالفت کی وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ چنانچہ ام ماضیہ کے واقعات بکثرت اس کلیہ کی تائید میں پیش کیے جاسکتے ہیں، جب انبیاء کرام ان لوگوں کے ایمان و اسلام سے بالکلیہ مایوس ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو چن لیتا ہے، ان پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور معاندین کو برباد کر دیتا ہے، یہاں پر آیت نمبر ۱۱۰ ختم ہو جاتی ہے۔ سب سے آخری آیت میں فرمایا کہ ان قصص و حکایات کا تذکرہ افسانہ گوئی کی غرض سے نہیں کیا گیا، بلکہ مقصود عبرت و بصیرت، تصدیق و تفصیل اور ہدایت و رحمت ہے اور اسی پر سورۃ یوسف کو ختم کر دیا گیا۔

## بائبل اور قرآن

قرآن بھی گزشتہ اقوام و امم کے واقعات و حوادث بیان کرتا ہے اور بائبل بھی، مگر دیکھو دونوں کے انداز بیان میں کس قدر فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کے واقعات تورات کی چار کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، کیونکہ مقصود تاریخ محض تھا، لیکن قرآن حکیم نے جس قدر بیان کیا ہے وہ زیادہ سے زیادہ تین چار صفحات میں آسکتا ہے، کیونکہ مقصود عبرت و موعظہ، استدلال و استشہاد اور جمع نتائج تھا۔ قرآن صرف حضرت موسیٰ کی پیدائش، خروج، محاربہ فلسطین و عمالقہ اور پھر از موسیٰ میں سے صرف قصہ طالوت و عہد داؤد و سلیمان کو بالا اختصار بیان کرتا ہے اور ان کے نتائج پر توجہ دلا کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

حضرت لوط کے واقعات کتاب پیدائش کے تین صفحات میں آئے ہیں لیکن قرآن حکیم تمام سوانح لوط میں سے

صرف اسی قدر حاصل سخن لے لیتا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيعًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۖ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ۖ وَمَنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ قَالَ لِيَقُومُوا لَوْلَآءَ بَنَاتُ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْذَلُوا فِي صَیْغِهِ ۚ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ۝ قَالَوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ۖ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝ قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أَوْ إِيَّائِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝ قَالُوا يَلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصْلَوْا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۚ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّن سِجِّيلٍ ۚ مَّنْضُودٌ ۝ مُّسْوَمَةٌ ۖ عِنْدَ رَبِّكَ ۚ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ۝ (هود ۷۷-۸۳)

”اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غم ناک اور تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے کہ آج بڑی مشکل کا دن ہے اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ دڑتے ہوئے آئے اور یہ لوگ پہلے ہی سے فعل شنیع کیا کرتے تھے، لوط نے کہا کہ بھائیو یہ جو میری قوم کی لڑکیاں ہیں، یہ تمہارے لیے پاک ہیں تو خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبروندہ کھوؤ، کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں؟ وہ بولے تم کو معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی بیٹیوں کی نہیں کچھ حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اسے تم جانتے ہو، لوط نے کہا اے کاش مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا، فرشتوں نے کہا کہ لوط! ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں، یہ لوگ ہر گز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی کہ جو آفت ان پر پڑنے والی ہے وہی اس پر پڑے گی، ان کے عذاب کے وعدے کا وقت صبح ہے اور کیا صبح کچھ دور ہے، تو جب ہمارا حکم آیا، ہم نے اس بستی کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا، ان پر پتھر کی تہ بہ تہ یعنی پے در پے کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کیے ہوئے تھے اور وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔“

اب غور کرو، سارے قصہ لوط کا حقیقی حاصل یہی ہے اور جتنا واقعہ بیان کیا ہے اس کے انداز بیان، خواتیم آیات اور جابجا کے اشارات میں کس طرح ہدایت، تنبیہ، موعظہ و بصیرت کو ملحوظ رکھا ہے، برخلاف اس کے کہ صفحات پیدا کنش و خروج ان۔ حکم و بصائر سے یک سر خالی ہیں، البتہ نہایت تفصیل سے ایک بے اثر قصہ جمع کر دیا ہے، لایسمن ولا یغنی من جوع۔ حضرت لوط و غیر ہم کا نسب نامہ، وطن کی حالت، قوم کی بدکاریوں کے مشروح واقعات، آپس کا سوال و جواب، بعد از عذاب کی حالت، ان تمام امور کو قرآن نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ہمیشہ بہ تتبع قرآن ہر حکیم اجتماعی نظر انداز کر دے گا۔

اب سورۃ یوسف کو لیجئے، غیر ضروری ٹکڑوں کو کسی طرح نظر انداز کر دیا ہے، بھائی مشورہ کرتے ہیں کہ باپ سے یہ جا کر کہیں گے، اب چاہئے کہ ان کا باپ کے پاس جانا اور طے شدہ مشورہ کے مطابق باتیں کرنا بھی بیان کیا جائے، داستان

سرا اس قسم کے ٹکڑوں کو ہمیشہ دو جگہ دکھلائے گا، ایک مشورہ کے وقت، ایک ملاقات پدر کے وقت، تورات میں ایسا ہی ہے، لیکن قرآن صرف ایک موقع کو لے لیتا ہے اور چونکہ دوسرے موقع پر اسی کے مطابق کام ہوا ہے، اس لیے اس کو بیان نہیں کرتا: ارجعوا الی ایکم۔ الی۔ واستل القریۃ التی کنا فیہا والعید التی اقبلنا فیہا وانا لصدقون، اب اس کے بعد ہی باپ کا جواب ہے: قال بل سولت لکم انفسکم امرا۔

پھر جس مقام پر اشخاص کے ناموں سے کوئی خاص نتیجہ با اثر نہیں مرتب ہوتا، وہاں ان کے نام بھی نہیں لئے جاتے، یوسف کے بھائیوں کے نام نہیں بتلائے کیونکہ ان سے کوئی فائدہ نہ تھا اور اہل کتاب کو معلوم، کتاب پیدا نش نے نہ صرف ان بھائیوں کے نام ذکر کیے ہیں، بلکہ ان کے حالات بھی بیان کئے ہیں۔

اسی طرح بائبل اور قرآن میں بیان قصص و اخبار ام ماضیہ میں زمین و آسمان کا فرق دکھائی دے گا، ہم نے صرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے، تفصیلات کے لئے آپ خود قرآن اور بائبل کا مقابلہ کیجئے، قرآن نے صرف ۹ آیات میں نہایت ہی معنی دلاویز ترتیب کے ساتھ حضرت یوسف کا نہ صرف پورا قصہ بیان کر دیا ہے بلکہ تمام حکم و بصائر اور نتائج و شواہد کو بھی بے حجاب کر دیا ہے کہ یہی مقصد حقیقی تھا، جو قرآن کے صرف تین صفحات میں آگیا ہے، بخلاف اس کے کتاب پیدا نش نے پورے ۲۵ صفحات میں ایک بے اثر قصہ بیان کر دیا ہے، جو عبرت و بصیرت اور ہند و مو عظمت سے بالکل خالی ہے۔

### موضوع سورۃ

جن لوگوں نے عمیق غور و فکر اور دقت نظر سے سورہ یوسف کا درس و مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس تمام سورہ مبارکہ میں کن حکم و بصائر کی طرف بلیغانہ انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن عام لوگ جب ان واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہیں، تو یک سر حیرت و استعجاب بن جاتے ہیں کہ کہاں قتل کا مشورہ، مصر کی غلامی، قید کی زندگی اور کہاں تخت مصر، خزان ملک اور تسکین فی الارض۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یوسف کے ساتھ جو کچھ گزرا وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ دیکھئے ابنائے یعقوب ان کے قتل کا مشورہ کرتے ہیں، مگر ایک بھائی کی رائے ان سب پر غالب آ جاتی ہے اور وہ کنوئیں میں ڈال دیئے جاتے ہیں، وہاں سے غلامانہ حیثیت میں مصر پہنچتے ہیں، عزیز مصر اپنی بیوی سے کہتا ہے: اکر فی مثنوا عسی ان ینفعنا اون تخذہ ولد ا، ”اس کو عزت و اکرام ہے رکھو عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ دے یا ہم اسے پیٹا بنالیں“۔ کچھ مدت بعد امر آة العریز اور لائعات مصر کے حوادث کی بنا پر وہ کئی سال تک قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں رہتے ہیں، اب وہ خواب ہمارے سامنے آتا ہے جسے بادشاہ نے دیکھا اور جس کی تعبیر دے کر وہ خزان مصر کے مالک بن گئے۔

واقعات کی یہ ایک کڑی تھی، اب اس کا دوسرا سلسلہ ملاحظہ ہو۔ برادران یوسف تین بار غلہ کی خاطر دربار مصر میں آتے ہیں اور آخری ملاقات ذریعہ تعارف بن جاتی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے تمام خاندان کو لے کر دیدار یوسفی سے

اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے ہیں، یوسف کا خواب پورا ہوتا ہے اور اس پر وہ قدوس حق نواز کا شکر ادا کر کے بتوفی مسلباً والحقنی بالصالحین، کی دعا مانگتے ہیں۔

جس وقت باپ اور بیٹے کی ملاقات ہوئی ہے اور بیٹے نے اپنے تمام سابقہ حالات باپ سے بیان کر دیئے تو آخر میں انہوں نے کہا: ان ربی لطیف لباشاء انہو العلیم الحکیم، ”بے شک میرا پروردگار ان امور کا داننا ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے، وہ داننا اور حکمت والا ہے۔“ دراصل یہی آیت اس سورہ مبارکہ کا موضوع ہے، یہی مغز سخن ہے اور یہی محور کلام ہے۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے کام اسی طرح کیا کرتا ہے، عام لوگ اس کی کنہ اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، مگر سرائر و محجوبات کا جاننے والا اپنی حکمت و مصلحت سے اس کو پورا کر دیتا ہے اور پھر سب کے سب اسی کے اسرار و مصالح بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔

### اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت یوسف ایک خواب دیکھتے ہیں جس کی نسبت حضرت یعقوب کو یقین کامل ہے کہ اس خواب کا دیکھنے والا ایک روز حیرت انگیز جاہ و جلال کا مالک ہوگا، مگر وہ حیران ہیں کہ ہم جھوٹوں میں رہتے ہیں، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں، یہ خواب پورا ہوگا تو کیوں کر؟ اب تم اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھو۔

کسی نہ کسی طرح اس خواب کی اطلاع بھائیوں کو ہو جاتی ہے، ان میں سے ہر شخص اس امر کا آرزو مند تھا کہ وہ ابراہیم کی نبوت، اسحق کے علوم و معارف اور یعقوب کے فضائل و کمالات کا وارث ہو، مگر جب انہوں نے یوسف کا خواب سنا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ شرف و مجد تو اس لڑکے کو ملا چاہتا ہے، اس کو باپ سے الگ کر دو، جب یہ نہ ہوگا تو بدرجہ مجبوری یہی امانت ہمارے سپرد کر دی جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے آتش حسد سے جل کر اس کے قتل پر کمر باندھی، مگر یہاں اس علیم و حکیم کی لطف فرمائی دیکھو کہ انہوں نے یہ ارادہ بدل دیا اور اسے کنوئیں میں پھینک کر چلے گئے۔

یوسف اندھیرے کنوئیں میں ہیں، مگر خدا نے انکا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک قافلہ آتا ہے جو انہیں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور یوں انہیں ایک حد تک اطمینان نصیب ہوتا ہے، جہاں وہ سالہا سال تک رہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں ہر چیز میں تصرف کرتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سبب ظاہر ہے، حضرت یوسف خواب دیکھتے ہیں کہ وہ ایک نہ ایک وقت کسی ملک کے حاکم اعلیٰ ہوں گے، ان کے ذریعہ سے ان کے خاندان کے تمام افراد عزت و سرفرازی کی زندگی بسر کریں گے، مگر بظاہر حالات یہ صورت ممکن نہ تھی، بلاشبہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ ایک شخص کو تختہ خاک سے اٹھا کر تخت شاہی پر بٹھا دے، مگر ایسا ہوتا نہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ایسے اسباب پیدا کر دیئے جائیں جن کا آخری نتیجہ کسی ملک کی حکومت و بادشاہت ہو، مگر حکومت ملنے سے پیشتر یہ ضروری تھا کہ وہ ان تمام لوازمات سے متصف ہوں جو فرماں روائی

کے لیے ضروری ہیں، کنعان میں یہ ممکن نہ تھا، اس کے قریب ترین اگر کوئی ملک تھا تو وہ مصر تھا، جہاں ایک باقاعدہ حکومت تھی، مگر مصری آج کل کے ہندوؤں کی طرح چھوٹ چھات کے پابند اور عبریوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لیے یہ صورت اختیار کی گئی کہ بھائیوں نے غصہ میں آکر انہیں کنوئیں میں پھینک دیا اور قافلہ نے ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جس کا گھر سیاسیات مصر کا مرکز تھا اور اس طرح ساہسال تک حضرت یوسف کو نظم و نسق ملک، سیاسیات مصر اور معاشرتی و اخلاقی نشو و نما کی تعلیم کے کسب و حصول کا موقع ملا اور: **وَلَنُعَلِّمَهُ مِنْ تَاوِيلِ الْاَحَادِيثِ**، کی حقیقت مستورہ بے حجاب ہوئی۔

### جذبہ امانت

حکومت کے لئے اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ صاحب تخت و تاج فن سیاست کا ماہر، نظم و ادارہ شناس ملکی سے واقف اور تمام علوم و فنون میں درخور دانی رکھتا ہو تو اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا امین ہو، اس کی امانت و دیانت اور عدل و انصاف پر سب کو اعتماد کامل ہو۔ اس لیے کہ اگر اس نے دوران حکومت میں خیانت کی تو امن عامہ کا قیام ناممکن ہے اور رعایا کا ایک فرد بھی اپنے آپ کو مامون خیال نہ کرے گا۔

عزیز مصر کے گھر میں رہ کر حضرت یوسف علیہ السلام ”تَاوِيلِ احَادِيثِ“ کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں، اب ان کے جذبہ امانت کے اظہار و اعلان کا وقت آتا ہے، امر آة العزیز اور لائتمات مصر کے حوادث رونما ہوتے ہیں اور ان سب پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ یوسف انسان نہیں فرشتہ ہے، مگر صرف عزیز مصر اور عورتوں کا اعتراف کافی نہیں، انہیں تو ملک مصر کا بادشاہ ہونا ہے، جب تک تمام ملک ان کے علم و دیانت سے واقف نہ ہو جائے وہ کیسے اس منصب جلیل پر فائز ہو سکتے ہیں، اس لئے وہ قید ہوتے ہیں، بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کرتے ہیں اور جب تک زنان مصر اس حادثہ فاجعہ کی حقیقت کو برسرِ دربار بیان نہیں کرتیں، وہ قید خانہ سے نکلنا گوارا نہیں کرتے، بالآخر وہ اپنے جرم کا اقرار کرتی ہیں، شاہ مصر، ارکان حکومت اور تمام رعایا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سرزمین مصر میں یوسف سے بڑھ کر نہ تو کوئی علم صحیح کا مالک ہے اور نہ کوئی صاحب دیانت و امانت۔ پس ان کو وہ سب کچھ ملا جس کے وہ حقدار تھے۔

### باقی خواب

مگر اس عجیب و غریب خواب کا ایک حصہ ابھی باقی ہے، شدید ترین قحط پڑا جو کئی سال تک رہا، دربار میں بھائیوں کا تعارف ہو اور انجام کار سب کے سب مصر میں آباد ہو گئے اور شاہانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

### رجوع الی المقصود

کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ واقعات کی جو رفتار تھی، اس کا یہی نتیجہ نکلنے والا تھا، مگر اللہ کے علم میں یہ سب کچھ تھا

اور اس نے اپنی حکمت کی بنا پر یہ کیا۔ اب پھر تم ایک مرتبہ اس قصہ پر نگاہ ڈالو اور یوسف کے ارشاد کو دیکھو: اِن بَنِي لَٰطِيفٍ لَّمَّا يَشَاءُ اِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔ اس تفصیل کے بعد اب تم حضرت یعقوب علیہ السلام کے ان اقوال کو بھی سمجھ جاؤ گے: اِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (یوسف ۶) ”وہ دانا اور حکمت والا ہے“۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۚ فَصَبْرٌ جَبِيْلٌ ۚ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ، (یوسف ۱۸) ”بلکہ تم اپنے دل سے یہ بات بنالائے ہو، اچھا صبر کہ وہی خوب ہے اور تم جو بیان کرتے ہو اس کے بارے میں خدا ہی سے مدد مطلوب ہے“۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۚ فَصَبْرٌ جَبِيْلٌ ۚ عَسٰی اللّٰهُ اَنْ يَّاتِيَنَّ بِهِمْ جَبِيْعًا اِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (یوسف ۸۳) ”بلکہ یہ بات تم نے اپنے دل سے بنالی ہے تو صبر ہی بہتر ہے، عجب نہیں کہ خدا ان سب کو میرے پاس لے آئے، بیشک وہ دانا اور حکمت والا ہے“۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ يُّوسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (یوسف ۸۷) ”میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا پتہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر لوگوں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا“۔

یہ اس خدائے قدوس کی لطف فرمائی ہے جو لطیف ہے، علیم ہے اور حکیم ہے۔ وہ جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس طرح اس کے لیے اسباب فراہم کر دیتا ہے کہ مخالف تو مخالف انہوں کو بھی اس کا وہم و گمان نہیں ہوتا، اسی کا نام اصطلاح میں تدبیر ہے اور سورۃ یوسف تدبیر الہی کی ایک مثال ہے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اپنی کتاب حجتہ اللہ البالغہ کا پہلا باب یہ قرار دیا ہے: باب الابداع والخلق والتدبیر، اور تدبیر کی ان الفاظ میں تعریف لکھی ہے۔

والثالثة التدبیر و مرجعه الى تصییر حوادثها موافقة للنظام الذى ترتضیه حکمته مغفیه الى المصلحة التى اقتضاها جوده كما انزل من السحاب مطرا واخرج به نبات الارض لیا کل منه الناس والا نعام فیکون سببا لحياتهم الى اجل معلوم وکما ان ابراهيم صلوات الله عليه القى فى النار فجعلها الله بردا وسلا ما لیبقي حیا وکما ان ایوب علیسلم کان اجتمع فى بدنه مادة البرص فانشأ الله تعالى عینا فیها شفائ مرضه وکما ان الله تعالى نظر الى اهل الارض فبقتهم عر بهم وعجهم فاوحى الى نبيه ﷺ ان ینذرهم ویجاهدهم لیخرج من شاء من الظلمت الى النور۔

”اور تیسری قسم تدبیر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حوادث و واقعات کو اس طرح لے جانا جو اس نظام الہی کے مطابق ہو، جسے اس کی حکمت و تدبیر چاہتی ہے تاکہ وہ مصلحت پوری ہو جو اس کے جو دو بخش کا مقتضاء ہے مثلاً آسمان سے پانی نازل کرتا ہے کہ ایک زمانہ معلوم تک انسان و حیوان نباتات و حبوب کھا کر اپنی زندگی کے دن پورے کر سکیں، ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو ان کو زندہ رکھنے کے لیے اسی آگ کو برد و سلام بنا دیا گیا، ایوب کے جسم میں مادہ فاسد جمع ہو گیا تو اللہ نے اسی جگہ ایک چشمہ پیدا کر دیا جو اس مرض کا علاج تھا، عرب و عجم جب سب کے سب خدا کی نظر میں مبغوض و محقوق بن گئے تو اس نے رسول اللہ کو انداز و جہاد کے لیے مبعوث کیا تاکہ جس کا جی چاہے ظلمت و تاریکی کو فروضالت سے نکل کر نور و ہدایت اسلام کی طرف آجائے۔



حضرت یوسف علیہ السلام کے سوانح و حالات بیان کر کے فرزند ان اسلام کو تدبیر الہی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اس میں درس و فکر کریں اور یاس انگیز و حسرت ناک حالات میں بھی خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، جو غلامی سے نکال کر بادشاہت تک پہنچا سکتا ہے، وہ جو فعال لہا یرید، ہے اس پر اعتماد کر کے دیکھو، اپنی قابلیت کو ضائع نہ ہونے دو، جہاں بانی و جہاں داری میں کمال پیدا کرو، مقاصد حیات سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہو، اجتناب من الشرک والمعاصی تمہارا طغرائے امتیاز ہو، ورع و تقویٰ اور صبر و استقامت تمہارا طرہ افتخار ہو، پھر دیکھو وہ کار ساز حقیقی کس طرح تمہاری نصرت و یادری کرتا ہے اور کسی کس طرح: انہ من یتق ویصدق ان اللہ لایضیع اجر المحسنین پر نازل فرماتا ہے۔

یہ سورت ایک درس حقیقت ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور صبر سے اعتصام و تمسک کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا، ان کو بہر صورت شاد کام و مراد کرتا ہے اور واقعات خواہ کیسے ہی مدہش و الم ناک ہوں، مگر وہ انہیں حوادث کو متقین و صابریں کے حق میں موجب خیر و برکت بنادیتا ہے: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ (طارق ۳) اور ہو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اس کو کافی ہے، تحقیق اللہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے۔

تنبیہ

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، بہت سی بے سرو پا باتیں ہیں جو ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں، بیہودہ قصے اور فرضی روایات ہیں جو زبان زد خلایق ہیں، اسرائیلی روایات کو بغیر نقد و اختیار کے قبول کر لیا گیا ہے اور اب ان کی حیثیت ایک فرضی ہیر و کی سی رہ گئی ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر میں صرف ان باتوں کا ذکر کیا ہے جن کو تمام اہل علم صحیح تسلیم کرتے ہیں، اور ان تمام سے کلیۃً احتراز کیا ہے جنہیں محققین علمائے کرام نے پایہ اعتبار سے ساقط قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## باب نمبر ۱ صبر و تقویٰ فصل اول تاویل احادیث کی تعلیم

سر دلبر ال

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الرَّ ۖ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَافِلِينَ ۝

”الرا، یہ روشن کتاب کی آیات ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے تم سے ان واقعات کا بیان اچھی طرح کرتے ہیں اگرچہ تم اس سے قبل ان سے بے خبر تھے۔“

احسن القصص، لغت میں قصہ یا قصہ کے معنی ہیں کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے پیچھے پیچھے چلتا، قرآن میں آتا ہے: وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّهِ (القصص ۱۱) ”اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا“، دوسری جگہ ہے: فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا (الکہف ۶۲) ”تو وہ اپنے پاؤں کے نشانات دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے“ قصص مفر د اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، قصہ کو اسی لیے قصہ کہتے ہیں کہ واقعات کے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ احسن القصص کے معنی ہیں بیان کا بہترین طریق، احسن کا تعلق بیان سے ہے نہ کہ حکایت سے۔

یہ آیات اس کتاب کی ہیں جو حلال و حرام کو، رشد و غوایت کو اور ہدایت و ضلالت کو واضح کر دیتی ہے، جو اہم ماضیہ کے عبرت انگیز و بصیرت افروز واقعات بیان کرتی ہے، جو آئیو الے حوادث کو پیشین گوئی کے طور پر ذکر کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو آئندہ کیا پیش آئے گا، آپ کی ذات اقدس پر جو آلام و مصائب نازل ہوں گے، ان کے نتائج کیا نکلیں گے ان تمام رموز و اسرار کو یہی کتاب بتا دے گی۔

اس قرآن کو ہم نے عربی میں نازل کیا کہ اس میں درس و فکر کر سکو، اس کے حکم و بصائر سے لطف اندوز ہو سکو اور اس کی آواز حق و صدق کو دنیا کے ہر گوشہ اور کونہ میں پہنچا سکے۔ اس راہ میں مشکلات و موانع ہیں، تکالیف و شدائد ہیں اور مصائب و عواقب ہیں، تمام دنیا تمہاری مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے گی اور کرہ ارضی سے تمہیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں گی۔ اس قرآن کی تبلیغ کیا ہے، گویا ایک جہان سے لڑائی مول لینا ہے، چونکہ یہ سب کچھ اسی قرآن کی بدولت ہونے والا ہے اس لیے ہم آج ان تمام واقعات و حوادث کو بیان کئے دیتے ہیں جو آئندہ پیش آئیں گے اور ساتھ ہی ان کے نتائج و ثمرات بھی بتا دیں گے۔

ظاہر ہے کہ تمہیں ان آنے والے واقعات کی اس سے قبل کوئی اطلاع نہ تھی: مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِنشَاءُ (الشوریٰ ۵۲) ”تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو“ اور اگر بالفرض آپ جانتے بھی ہوتے تو پھر بھی تمہارے اختیار میں یہ نہ تھا کہ اپنی زندگی کو ان کے مطابق بناتے چلے جاتے، بلکہ یہ سراسر وحی والہام ہے اور قصہ یوسف کے پیرایہ میں آپ کے سوانح و حالات بیان کئے گئے ہیں۔

خوشر آن باشد کہ ستر دلبراں  
گفتہ آید در حدیث دیگران۔

اس حقیقتِ مستورہ کی پردہ کشائی انشاء اللہ کتاب کے آخر میں ہوگی۔

### سچا خواب

اس قدر تمہید کے بعد اب حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات کی تفصیل شروع ہوتی ہے جس کی ابتدا ایک خواب سے ہوئی جو حسب ذیل ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝

”جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔“

کتاب پیدائش کے بیان کے مطابق یوسف ابھی سترہ سال کے تھے کہ انہوں نے حیرت انگیز خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج سب کے سب ان کے آگے سر بسجود ہیں اور ان کی عظمت و جلالت قدر کا اظہار کر رہے ہیں۔

### تعبیر

قَالَ يٰمُوسَىٰ لَا تَتَّبِعْ رُءْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مَا تَدْرِي ۖ وَأَخْبَدُكَ عَلَىٰ الْوَيْلِ مِنَ الْآخَادِيثِ ۖ وَنِعْمَ نِعْمَتُهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتْبَعَا عَلَىٰ أَبِيكَ مِنْ

قَبْلُ اٰیٰتِهِمْ وَاسْحَقَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

”انہوں نے کہا کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا، نہ ہی تو وہ تمہارے حق میں کوئی فریب کی چال چلیں گے، کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ کرے گا اور باتوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا اور جس طرح اس نے اپنی نعمت ابراہیم اور اسحاق پر پوری کی تھی اسی طرح تم پر اور اولاد یعقوب پر پوری کرے گا۔“

اجتہاد مشتق ہے جی سے، اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے خاص کر لینا۔ تاویل۔ اوّل سے ہے، اس کے معنی رجوع کرنا ہیں، تاویل کا مفہوم یہ ہے کہ محتملات کلام میں سے قوی احتمال کو بیان کر دیا جائے۔

”حضرت یعقوب علیہ السلام کو جس وقت نبوت ملی تھی اور آپ کے بڑے بھائی عیسو کو اس شرف و مزیت سے محروم کر دیا گیا تھا تو اس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اپنے باپ اسحق کی وفات کے بعد میں یعقوب کو قتل کروں گا کہ اسی کی وجہ سے میں نبی نہ بن سکا۔ چنانچہ یعقوب کی والدہ رقبہ نے کہا: دیکھ تیرا بھائی عیسو تیری بابت اپنی تسلی کرتا ہے کہ تجھے مار ڈالے، سو اس لیے اے میرے بیٹے تو میری بات مان، اٹھ اور حاران میں میرے بھائی لابن کے پاس بھاگ جا اور تھوڑے دن اس کے ساتھ رہ، جب تک تیرے بھائی کی جھنجھلاہٹ جاتی نہ رہے اور تیرے بھائی کا غصہ تجھ سے نہ پھرے اور جو تو نے اس سے کیا ہے سو بھول جا دے تب میں تجھے وہاں سے بلا بھیجوں گی۔“ (پیدائش ۲۷: ۲۲ تا ۴۵)

انہوں نے یوسف کا خواب سنا تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ ہمارا اصلی جانشین یہی ہے، جو ابراہیم و اسحق کے علوم کا وارث ہو گا اور نبوت مجھ سے منتقل ہو کر اس کے پاس جائے گی اس پر انہیں اپنے تمام گزشتہ واقعات یاد آ گئے، عیسو کی مخالفت، ان کے مار ڈالنے کی کوشش اور انجام کار جلا وطنی، ادھر میاہ اور راخل میں سخت رقابت تھی اور اس کا اثر ان کی اولاد پر بھی نمایاں تھا، اس لیے انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میرے باقی بیٹے اس خواب کی وجہ سے یوسف کے دشمن بن جائیں گے اور اس کی جان لینے کی کوشش کریں گے، اس لیے انہوں نے سب سے پہلے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ اس خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کریں، پھر یہ تعبیر دی:

(الف)۔ اللہ تعالیٰ تجھے برگزیدگی اور امتیاز خاص نوازش فرمائے گا۔

(ب)۔ تمہیں ایسی تعلیم دے گا کہ واقعات کو سن کر ان کی کنہ و حقیقت اور علت العلل تک پہنچ جاؤ گے، خواب کی صحیح تفسیر دے سکو گے اور فراست صادقہ کے نور سے ہر چیز کو اصلی صورت میں دیکھ لو گے۔

(ج)۔ جس طرح تمہارے آبائے کرام، ابراہیم و اسحق نبوت کے منصب جلیل پر فائز ہوئے تم بھی اس شرف مجدد پر سرفراز ہو گے۔

دنیا میں ہزاروں لاکھوں انسان ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی نظر انتخاب صرف ایک شخص پر پڑتی ہے، اسے نبوت کے

لیے چن لیتا ہے اور وہی اس کی حکمت کو جانتا ہے: اللہ اَعْلَمَ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام ۲۴) ”اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو کہ جہاں بھیجے اپنا پیغام“ میرے بارہ لڑکے ہیں مگر اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تمہیں اس فرض مقدس کے لیے چن لیا ہے۔

## آیات لسا تلکین

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَأَخُوْتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّالِكِينَ ①

”ہاں ہاں! یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔“

جو لوگ رسول خدا ﷺ سے حضرت یوسف کے سوانح و حالات دریافت کرتے ہیں، انہیں یقین کر لینا چاہئے کہ:

(۱)۔ مکہ اور مدینہ میں وہی واقعات ظہور پذیر ہوں گے جو کنعان و مصر میں صدیوں پیشتر وقوع میں آئے۔

(۲)۔ آپ شیل یوسف ہیں۔

(۳)۔ تمام قریش اور بنی اسرائیل کو ایک نہ ایک دن اسی نبی اقی کے آگے خمیدہ گردن ہونا پڑے گا جس طرح ابنائے یعقوب انجام کار یوسف کے آگے جھکے۔

## مشورہ قتل

اِذْ قَالُوا لَيُؤْسَفُ لَكُمْ وَآخُوهُ أَحَبُّ اِلَىٰ آيَاتِنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۚ اِنَّ اَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ① اَقْتُلُوا يُوسُفَ اَوْ اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَيْبَتِكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ② قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فَعِلٰلِينَ ③

”جب انہوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہم سے زیادہ ابا کو پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت کی جماعت ہیں، کچھ شک نہیں کہ والد صریح غلطی پر ہیں یوسف تو کیا تو جان سے مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو پھر والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم اچھی حالت میں ہو جاؤ گے، ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو جان سے نہ مارو، کسی گھرے کنویں میں ڈال دو کہ کوئی راہ گیر نکال کر اور ملک میں لے جائے گا اگر تم کو کرنا ہے تو یوں کرو۔“

عصبہ کے معنی مضبوط اور شدید ہونے کے ہیں، جماعت میں استحکام اور مضبوطی آجاتی ہے، اس لیے اس کو عصبہ اور عصا بہ کہتے ہیں، اس کا اطلاق گھوڑوں، پرندوں اور مردوں کی جماعت پر ہوتا ہے، خواہ وہ دس ہوں یا دس سے زیادہ۔ یوسف کے خلاف مشورہ کر نیوالے بھی دس ہی تھے۔ غیبیہ العجب، ہر وہ چیز جو کسی چیز کو غائب کرے اور چھپائے اسے غیبی بہ کہتے ہیں، جب کے اصلی معنی قطع کرنے کے ہیں، یہاں وہ کنواں مراد ہے جس کی مینڈھ نہ ہو: غیبیہ العجب، کنویں کی

تلیٹی جو گہرائی کی وجہ سے دکھائی نہ دے۔ یلنقطہ، رستہ میں سے کسی چیز کو اٹھالینے کو لانتقاط کہتے ہیں۔ اسی سے لقط اور لقیط ہے سیارہ وہ قافلہ یا جماعت جو سفر کے لئے رستہ طے کرتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔  
 “از بطن لیاہ بیگم: ربوبن، شمعون، لاوی، یہوداہ، اشکار، زبلون،

ایضازلہ لونڈی: جدا، آشر

بلہالونڈی: تقائی، دان”

راخل بیگم: یوسف، بن یامین (کتاب پیدائش ۳۵: ۲۳ تا ۲۶)

ان تمام بیٹوں میں سے صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی نبوت سے سرفراز ہوئے تھے، کتاب، سنت، تمام صحابہ اور جمہور امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ برادران یوسف میں سے کوئی بھی نبی نہ تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حزم، حافظ ابن کثیر اور جملہ مفسرین کرام اسی طرف گئے ہیں۔

یوسف اور بن یامین سب سے چھوٹے تھے، اس لیے حضرت یعقوب ان کی خاص طور پر حفظ و نگہداشت کرتے، یوسف اپنے باپ کی ممانعت سے پہلے اپنا خواب بھائیوں سے ذکر کر چکے تھے اور ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے، اس بنا پر ان کے دل میں یہ شبہ قوی تر ہوتا گیا کہ ہونہ ہو، یوسف ہی ہمارے والد کے علوم و معارف نبوت کا وارث ہو گا اور ہم اس شرف و مزیت سے محروم رہ جائیں گے، اب بہتر یہی ہے کہ اس کو جان سے مار ڈالو یا کسی ایسی جگہ پھینک دو کہ پتہ نہ لگے، یہ افسوسناک امر ہے کہ ہم جو ان ہوں، قوت و طاقت والے ہوں اور تعداد میں بھی زیادہ مگر ہمیں تو کوئی نہ پوچھے اور جتنی محبت ہو اس بچہ کے ساتھ۔

یہ ایک سازش ہے اور گناہ کا مشورہ، مگر پرواہ نہیں جب یوسف نہ ہو گا تو باپ کی محبت خود بخود ہماری طرف رجوع کرے گی، پھر بعد کو توبہ بھی کر لیں گے۔

تدبیر الہی

یہ تو انسانی تدبیر تھی، مگر اللہ تعالیٰ کی بات سب پر غالب رہی، اس کی غرض تو صرف اتنی تھی کہ یوسف کو کنعان سے نکال کر قریب ترین ملک میں پہنچا دیا جائے۔ یہ بھائی ایک سبب بن گئے، انہوں نے تو قتل کا مشورہ کیا تھا، خدائے لطیف نے اپنی باریک ترین تدبیر سے کام لیا اور خود ان میں سے ایک نے یہ تجویز کر دی کہ قتل کی ضرورت نہیں گہرے کنوئیں میں ڈال دو، قافلہ والے اس کو کسی اور جگہ لے جائیں گے اور تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ “تب ربوبن نے سن کر اس کو ان کے ہاتھوں سے بچایا اور بولا، چاہئے کہ ہم اسے قتل نہ کریں اور ان سے کہا کہ خونریزی نہ کرو، بلکہ اسے اس کنوئیں میں جو بیابان میں ہے ڈال دو اور اس پر ہاتھ نہ ڈال” و۔ (پیدائش ۳: ۲۱ تا ۲۲)

## باپ سے درخواست

چنانچہ اس مشورہ کے بعد وہ لوگ مل کر حضرت یعقوب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حسب ذیل درخواست پیش کی۔  
 قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمُرُنَا أَنْ يَبْعُوا يُوْسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنُغْضُوْنَ ۝ أَرْسَلْهُ مَعَنَا غَدًا يَزْنِمْ وَيَلْعَبُ وَإِنَّا لَهُ لَنُحْضِنُ ۝ قَالَ  
 إِنِّي لَخَشِئْتُ أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ ۝ قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا  
 لَّخَسِرُونَ ۝

یہ مشورہ کر کے وہ یعقوب سے کہنے لگے کہ ابا جان کیا سبب ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ خوب میوے کھائے اور کھیلے کودے ہم اس کے نگہبان ہیں، انہوں نے کہا کہ یہ امر مجھے غمناک کیے دیتا ہے کہ اسے لے جاؤ اور مجھے یہ بھی خوف ہے کہ تم کھیل میں اس سے غافل ہو جاؤ اور اسے بھیڑ یا کھا جائے، وہ کہنے لگے کہ اگر ہماری موجودگی میں کہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں اسے بھیڑ یا کھا جائے تو ہم بڑے نقصان میں پڑ گئے۔

یہ بتایا گیا ہے رت سے، حرص کے ساتھ کھانے کو کہتے ہیں، رتعت الباشیہ، مویشی کا چراگاہ میں چرنا، محاورہ میں یرتعم ویلعب ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں، کہا کرتے ہیں: خرم القوم یرتعم ویلعب، کھانے پینے اور کھیلنے کو دینے کے لئے لوگ باہر گئے۔ اس جگہ میوے کھانا مراد ہے۔

آپ ہم پر اعتبار نہیں کرتے، آپ ہمیں یوسف کا غیر سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ہمارا عزیز بھائی ہے اور ہم اس کے خیر خواہ ہیں، ان لوگوں نے اس طریق پر اپنے والد سے باتیں شروع کیں کہ انہیں انکار کی گنجائش نہ رہی، انہیں یہ درخواست منظور ہی کرنی پڑی پھر بھی انہوں نے اتنا ضرور کہا یہ بچہ ہے، اس کے چلے جانے سے مجھے خواہ مخواہ تکلیف ہوگی اور پھر جنگل کا مقام ہے ممکن ہے ذرا تم ادھر ادھر ہو اور اسے بھیڑ یا کھا جائے۔

فرزند ان یعقوب نے پہلی بات کا کوئی جواب نہ دیا کہ اسی کی بنا پر یہ تمام سازش ترتیب دی گئی تھی، البتہ دوسرے اندیشہ کو انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بھلا یہ ممکن ہے، اس کا خیال بھی دل میں نہ لایئے، آخر ہم کس روز کے لیے ہیں، اگر بھیڑیے سے بھی اس کی حفاظت نہ کر سکے تو پھر تو بالکل بودے ہی نکلے، بہر صورت حضرت یعقوب اپنے فرزند یوسف کو ان کے ساتھ روانہ کرنے پر راضی ہو گئے۔

## صبر جمیل

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْتَمَعُوا أَن يُجْعَلُوا فِي غِلْمَةِ الْجُؤِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝  
 وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ۝ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِشُ وَتَرَكَنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ  
 وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ۝ وَجَاءُوا عَلَى قَبْرِهِ بِدَرَكْدَبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمُ الْاُنْفُسُ كُنْ

أَمْرًا فَصَبْرًا جَبِيلًا ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾ (یوسف ۱۸ تا ۱۸)

”غرض جب وہ اس کو لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس کو گھرے کنوئیں میں ڈال دیں تو ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم ان کو اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو اس وحی کی کوئی خبر نہ تھی، وہ رات کے وقت اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ اباجان، ہم تو دوڑنے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہو گئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑ یا کھا گیا اور آپ ہماری بات کو باور نہیں کریں گے گو ہم سچ ہی کہتے ہوں اور ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کالہو بھی لگالائے، یعقوب نے کہا کہ حقیقت میں یوں نہیں ہے بلکہ تم اپنے دل سے یہ بات بنالائے ہو، اچھا صبر کہ وہی خوب ہے اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں خدا ہی سے مدد مطلوب ہے۔“

نستبقی، یہ بات افتعال سے ہے جس کی خصوصیت اشتراک ہے۔ یعنی دو شخصوں کا مل کر اس لیے درڑنا کہ آگے کون نکلتا ہے۔ سولت، زینت کے معنی میں ہے، تسویل کسی کام کا آراستہ کرنا، اغوا کرنا بھی کہتے ہیں۔

بہر حال یہ لوگ اپنے بھائی کو لے گئے اور وہاں جا کر ایک تاریک کنوئیں میں ڈال دیا۔ عین اس وقت جب کہ یوسف کا کوئی مددگار نہ تھا اور ہر طرف سے دشمن ان پر ہجوم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے انکی نصرت و یاری کی اور انہیں الہام کیا کہ وہ ان تکالیف و شدائد کی وجہ سے پریشان خاطر نہ ہوں، یہ صرف چند روز کی بات ہے عنقریب تم اس سے نجات پاؤ گے، اعلیٰ ترین مراتب پر فائز ہو گے اور یقیناً وہ وقت بھی دور نہیں جب یہی بھائی تمہارے سامنے ذلیل ہو کر آئیں گے اور تمہیں ان کو ان ظالمانہ حرکات پر نادم و متاسف کرنے کا موقع ملے گا۔

ان لوگوں کو کیا خبر تھی کہ جس لڑکے کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے خداوند قدوس کس طرح اس کو اطمینان قلب نوازش فرما رہے ہیں، بے شک وہ یہ نہ جانتے تھے کہ یہ مظلوم ایک روز خزان مصر کا مالک ہوگا، سب پر اس کی حکومت و فرمانروائی ہوگی اور ہم بھیک منگوں کی صورت میں اس کے دربار میں حاضر ہوں گے۔

بندہ ان یاس انگیز و روح فرسا حالات میں عموماً راہ حق سے منحرف ہو جاتا ہے، کاش اس کی نظر اپنے پروردگار پر ہو اور دیکھے کہ وہ رحمن و رحیم کس طرح عین یاس و قنوط کے عالم میں اپنے بندے کی طرف دست اعانت دراز کرتا ہے اور اپنی نصرت و یاری سے اس کی ڈھارس بندھاتا ہے۔

یہ تمام واقعہ سکیم کی وادی میں مقام و تین کے قریب ہوا، جیسا کہ کتاب پیدائش سے ظاہر ہے۔

شب کو یہ لوگ واپس آئے، روتے روتے تمام واقعہ بیان کیا اور تصدیق میں یوسف کا خون آلود قمیص بھی پیش کر دیا، مگر وہ جھوٹے تھے، اپنی بات پر انہیں یقین نہ تھا، اس لیے آخر میں یہ بھی کہہ دیا: وما انت ببؤمن لنا لو كنا صادقین، ”اور آپ ہماری بات کو باور نہیں کریں گے گو ہم سچ ہی کہتے ہوں۔“



یعقوب علیہ السلام نے دیکھا قیص کسی ایک جگہ سے بھی نہیں بچتا، وہ خود یوسف کے خواب کی تعبیر دے چکے تھے کہ ایک نہ ایک روز وہ حکومت پر سرفراز ہوں گے، ان کے بھائی ان کے آگے خمیدہ گردن ہوں گے اور تمام پچھلی بشارتیں اسی کے ذریعہ پوری ہونے والی ہیں، انہیں لوگوں کے بغض و عداوت کی بھی خبر تھی، اس لیے انہوں نے تمام واقعات سن کر صرف اتنا کہا: فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون، ”اچھا صبر کہ وہی خوب ہے اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں خدا ہی سے مدد مطلوب ہے۔“

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر زنا کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے ایک روز رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: واللہ لئن حلفت لاتصدقنی وان اعتذرت لاتعذرونی فبشلی ومثلکم یعقوب وولده فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون، ”اگر میں سچ کہوں تو تم میری تصدیق نہ کرو گے اور اگر عذر کروں تو اسے قبول نہ کرو گے، میرا واقعہ تو بالکل یعقوب اور ان کے فرزند کا سا ہے،“ اور اس کے بعد انہوں نے یہی آیت تلاوت کی۔ خدا نے حضرت عائشہ کو اس صبر جمیل کا یہ اجر دیا کہ خود قرآن کریم میں ہمیشہ کے لئے ان کی برأت و پاک دامنی کا اعلان کر دیا گیا: اُولَٰئِكَ مِذَّةُ غُرَّتٍ وَفِثَاءٍ يُفْتُونَ (النور ۲۶) ”یہ انکی باتوں سے بری ہیں،“ یہاں بھی حضرت یعقوب ہی کی بات پوری ہو کر رہی اور انجام کار یوسف کو ان سے ملا دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ صبر جمیل کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: صبر لا شکوی فیہ فمَن بَثَّ لَمْ یَصبر، ”صبر وہی ہے جس میں شکایت نہ ہو جس نے غم و اندوہ کا اظہار کیا وہ صابر نہیں ہو سکتا۔“ قرآن کریم نے مختلف مقامات میں صبر کرنے والوں کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ ہم سورہ بقرہ کی تفسیر الخلافہ الکبریٰ میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں، اس کی طرف رجوع کیجئے۔

## ایک سوال

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادران یوسف نے یہ کیا عذر کر دیا کہ انہیں بھیڑیا کھا گیا، گویا جو کچھ باپ نے کہا تھا ان بر خورداروں نے اسی کا اعادہ کر دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت یعقوب اور ان کا خاندان جنگل میں رہتے تھے، بکریاں چراتے تھے اور انہیں پران کا گزارہ تھا، شہر میں جو لوگ رہتے ہیں انہیں ہمیشہ چور کا ڈر رہتا ہے۔ جنگل میں عموماً شیر اور بھیڑیے ہی کا خطرہ ہوتا ہے، یہ لوگ جنگل ہی سیر کو جا رہے تھے، انہیں قدرتی طور پر اس کا خوف ہونا چاہئے تھا، اسی خیال سے انہوں نے فرمایا: وَاخَافَ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ، ابنائے یعقوب کو ایک بہانہ مل گیا، واپس آکر اسی کو دہرایا، یعقوب اس کا جواب بھی نہ دے سکتے تھے، سنتے ہی خاموشی ہو گئے۔

## یا بشری

برادران یوسف تو جو کچھ کر سکتے تھے کر کے چلے گئے، مگر اللہ تعالیٰ کی غرض ہی دوسری تھی، وہ اسکی تکمیل میں ایک سبب بن گئے، وقت آگیا تھا کہ یوسف کو اس تاریک کنوئیں سے نکال کر مصر پہنچا دیا جائے، اب تدبیر خداوندی ملاحظہ ہو۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ قَالَ يَبُشَىٰ هَذَا غُلْمٌ ۖ وَاسْتَوذَعُوا بَيْعًا ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخِيسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۖ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٦١﴾

“اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنوئیں کے قریب ایک قافلہ آوارہ ہوا اور انہوں نے پانی کے لئے اپنا سقہ بھیجا اس نے کنوئیں میں ڈول لٹایا وہ بولا زہے قسمت، یہ (نہایت ہی حسین) لڑکا ہے اور اس کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے خدا کو سب معلوم تھا اور اس کو تھوڑی سی قیمت یعنی معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا اور انہیں ان کے بارے میں کچھ لالچ بھی نہ تھا۔

وار دہم، وہ شخص جو لوگوں کو پانی پلانے کے لیے پانی پر آتا جاتا ہے۔ ادلی، اسم دلو سے یہ فعل بنایا گیا ہے۔ یعنی اس نے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈالا، دلو ڈول کو کہتے ہیں، اس کی جمع دلاء آتی ہے۔ بضاعہ مال کا وہ حصہ جو تجارت کے لئے رکھا جائے یہ بضع سے ہے، گوشت کے کاٹے ہوئے ٹکڑے کو کہتے ہیں، حدیث میں آتا ہے: فاطمة بضعة منی، ”فاطمہ میرے گوشت اور جسم کا ایک ٹکڑا ہے“، شہوہ، یہ لغات اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی خریدنا اور بیچنا دونوں آتے ہیں، اسی لیے یہاں مفسرین نے اس کے فاعل میں اختلاف کیا ہے۔ زاهدین، زہد، قلت رغبت کو کہتے ہیں، ذہید قلیل چیز۔

تین دن تک حضرت یوسف اسی کنوئیں میں رہے، اتنے میں اسمعیلیوں کے ایک قافلہ نے آکر وہاں منزل کی جو مدین سے مصر کو سامان تجارت لیے جا رہا تھا اور اس وقت پہنچا تھا جب یوسف کے بھائی اپنا کام کر چکے تھے اور روٹی کھانے بیٹھے تھے، انہوں نے اپنا سقہ پانی لانے کے لئے کنوئیں پر بھیجا اس نے جو ڈول ڈالا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کے اندر ایک حسین و جمیل لڑکا بیٹھا ہے، وہ انہیں قافلہ میں لے آیا، ان لوگوں نے خوش ہو کر ان کو اس المال کی طرح چھپا لیا، اس لیے کہ غلامی کا رواج عام تھا اور کم سن اور خوبصورت لڑکا نہایت قیمتی سامان سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ اگرچہ اس وقت یہ لوگ یوسف کو فروخت کرنے کے لیے چھپا رہے ہیں، مگر یہی غلام آگے چل کر اسی ملک کا بادشاہ بن جائے گا اور ان کا وہاں لے جانا یوسف کے دخول مصر کا ایک سبب ہو گا اور یوں تدبیر خداوندی اپنی غرض پورا کرے گی۔

بہر صورت قافلہ مصر میں داخل ہوا۔ یہ لوگ یوسف کے کمالات و فضائل سے واقف نہ تھے، اس لیے انہوں نے اونے پونے اس خزانہ مصر و جگر گوشہ یعقوب کو تھوڑے سے درہموں پر فروخت کر دیا۔

لطف خداوندی

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَّا أَوْ نَسْتَفِذَهُ وَلَدًا ۖ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا

لِيُؤسِفَ فِي الْأَرْضِ ۖ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۖ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰﴾  
وَلَنَبَايَعَنَّ أَشَدَّهُ اتِّبَانَهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱﴾

”اور مصر میں جس شخص نے ان کو خرید اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو عزت و اکرام سے رکھو، عجب نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح ہم نے یوسف کو سر زمین مصر میں جگہ دی اور غرض یہ تھی کہ ہم ان کو باتوں کی تعبیر سکھائیں اور خدا اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو دانائی اور علم بخشا اور نیکو کاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔“

یہ بالکل ممکن تھا ایک معمولی آدمی حضرت یوسف کو خرید لیتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و تدبیر سے ایسے سامان فراہم کر دیئے کہ فوطی عفار کے سوا اور کسی نے انہیں نہ خریدا، یہ فرعونی امیر اور بادشاہ کے جلوداروں کا سردار تھا، اس کی بیوی کے متعلق عجیب و غریب باتیں کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں، کتاب و سنت میں اس کے نام کی تصریح نہیں کی گئی، نہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے شادی سے قبل یوسف کو خواب میں دیکھا تھا، اسی بنا پر اس نے مصر میں اپنی شادی کرائی تھی اور نہ بعد کو اس کا نکاح حضرت یوسف سے ہوا، یہ تمام باتیں از قبیل مَزُخَرَات ہیں۔

اگر قرآن کریم کی یہ آیت اپنے سامنے رکھ لی جائے: اَلْغَيْبِطُ لِلْغَيْبِطِينَ ۚ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۚ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ ۚ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ (النور ۲۶) ”ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے ہیں۔“

تو ہمیں اور بھی یقین ہو جاتا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کا نکاح ہر گز یوسف علیہ السلام سے نہیں ہوا۔ کتاب پیدائش کو دیکھتے ہیں تو اس میں آتا ہے۔

”اور فرعون نے یوسف کا نام صنفات فصیح رکھا اور اس نے اون کے پجاری فوطیفرع کی بیٹی آسانہ کو اس سے بیاہ دیا۔“ (۴۱: ۴۵)

اس کے علاوہ کسی نکاح اور بیوی کا تذکرہ اس میں موجود نہیں، اس لیے کتاب پیدائش کے اس بیان پر اعتماد کر کے ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام آسانہ تھا، نہ کہ زلیخا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فوطیفرانے اپنی بیوی سے کہا کہ اگرچہ ہم نے اس کو ستے داموں خریدا ہے مگر اس کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی میں خوب کوشش کرنا، ہم اسے اچھی قیمت پر فروخت کریں گے، ورنہ اپنا بیٹا بنالیں گے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اشد الناس فراسة ثلاثة العزيز حين تفرس في يوسف فقال لا مراثة اكرمي مثواه عسى ان ينفعنا والبراق لمارات فقلت يا ابت استاجرة وابوبكر حين استخلف عمر۔

”لوگوں میں سب سے زیادہ ارباب فراست و بصیرت یہ تین شخص گذرے ہیں، عزیز مصر جس نے یوسف کو دیکھ کر اپنی بیوی سے کہا اس کو عزت و اکرام سے رکھو عجب نہیں کہ ہمیں فائدہ دے، حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی جس نے

اپنے باپ سے موسیٰ کے متعلق کہا: يَا بَتِ اِسْتَاْجِرْكَ ۚ اِنِّ خَیْرٌ مِّنْ اِسْتَاْجَرْتَ النَّفِیْ (القصص ۲۶) ابان کو نوکر رکھ لیجئے اور تیرے ابو بکر جب انہوں نے حضرت عمر کو اپنا جاننشین مقرر کیا۔

اب تم گزشتہ واقعات پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈالو اور تدبیر خداوندی سے لطف اندوز ہو، بھائیوں کی کوشش یہ تھی کہ اس کو مار ڈالیں مگر خدا نے ان کے ہاتھ سے نجات دلوا دی، قافلہ والوں نے لا پرواہی کر کے ان کو فروخت کر دیا اور اب یہ ہوا کہ خود عزیز مصران کے اکرام و احترام کے لئے تیار ہے، وہ ان کی راست بازی، نیک عمل اور پاک نفس سے اس درجہ متاثر ہے کہ ان کو اپنے تمام کاروبار کا مختار کل بنا دیتا ہے: ”چنانچہ یوسف اس کی نظر میں مورد لطف ہوا اور اس نے اس کی خدمت کی اور اس نے اپنے گھر کا مختار کیا اور سب جو کچھ اس کا تھا اس کے قبضہ میں کر دیا۔“ (پیدائش ۳۹: ۴)

یوں حضرت یوسف کو سر زمین مصر میں قوت و غلبہ عطا کیا گیا، اس کی غرض یہ تھی کہ وہ سیاست ملک سے واقف ہوں، ہر چیز کی کنہ و حقیقت کا ان کو علم ہو اور اس طرح آئندہ کے لئے تیار ہو سکیں۔ لوگ عموماً ظاہر بین ہوتے ہیں، ان کی نظر ہماری حکمت اور مصلحت پر نہیں ہوتی، مگر ہم جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یوسف کے حق میں وہی ہوا جو ہمارا ارادہ تھا، بھائی ان کو نامراد کرنا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے جو کچھ کیا وہی اس کی فتح و فیروز مندی کا ذریعہ بن گیا۔

جب حضرت یوسف کی عمر ۲۰ سال کی ہو گئی تو ہم نے ان کو علم و حکمت نوازش کی، بیشک جو لوگ ورع و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں ہم انہیں اسی طرح مراتب عالیہ پر فائز کرتے ہیں، یوسف صدیق ایسے ہی تھے، اس لیے ان کے ساتھ آئندہ بھی اسی قسم کا سلوک ہو گا۔

### استدلال و استشہاد

گذشتہ آیات میں درس و فکر کرنے سے حسب ذیل بصائر و حکم کا استنباط ہوتا ہے:

(۱)۔ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سنا تو اس کی تعبیر دینے سے قبل فرمایا کہ اس خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا ورنہ وہ تمہیں اذیت پہنچائیں گے۔ حسد ایک بدترین خصلت ہے اس سے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں، اس لیے حاسد کو کبھی اس قسم کا موقع ہی نہ دیا جائے کہ وہ حسد کر کے تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔

(۲)۔ جب آپ نے تعبیر دی، تو فرمایا: ویتنم نعمتہ علیک وعلیٰ ال یعقوب کما اتبھا علیٰ ابیک من قبل ابراہیم واسحق، ”اور جس طرح اس نے اپنی نعمت پہلے تمہارے پر داد ابراہیم اور اسحق پر پوری کی تھی اسی طرح تم پر اور اولاد یعقوب پر پوری کریگا“، انکسار و تواضع کی بنا پر تشبیہ دیتے وقت اپنا ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ اس وقت ہی تھے، گویا دوسروں کو حسن ادب کی تعلیم دے رہے ہیں۔

۳۔ برادران یوسف جب مشورہ قتل کرتے ہیں تو کہتے ہیں: و تکتونامن بعدہ قوماً صلحین، توبہ کی امید پر گناہ کا ارتکاب

نہ کرنا چاہئے، نہیں معلوم مہلت ملتی ہے یا نہیں اور پھر گناہ کی بخشش کا وعدہ تو ان کے لیے ہے جو جہالت و لاعلمی میں اس کے مرتکب ہوں، نہ کہ جان بوجھ کر گناہ کرنے والوں کے واسطے۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور پھر اسی میں برابر ترقی کرتے جاتے ہیں۔

۴۔ مشکلات و مصائب کے وقت انسان کو چاہئے کہ جزع و فزع سے پرہیز کرے۔ حضرت یعقوب کے حالات سے عبرت پذیر ہو اور صبر جمیل کو اپنا طغرائے امتیاز بنائے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مظلوم کی نصرت و دستگیری کرتا ہے اور اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔  
 ترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن  
 اجابت از در حق بہر استقبال می آید!

حدیث میں آتا ہے۔

اتق دعوة المظلوم فانه ليس بيننا وبين الله حجاب۔

”مظلوم کی دعا سے بچو، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔“

۶۔ یاس انگیز حالات میں بھی انسان خدا پر اعتماد رکھے کہ یہی وہ صفت ہے جو اس کو شدائد و تکالیف کے برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے اور بڑی بڑی آزمائشوں میں بھی اس کو نیکی و طہارت پر قائم رکھتی ہے: و اوحینا الیہ لتبکنھم بامرھم ہذا وھم لایشعرون۔

”تو ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم ان کو اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو اس وحی کی کوئی خبر نہ تھی۔“

## فصل ثانی

### دوسرا دور

معاذ اللہ

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق تدبیر الہی اپنا کام کر رہی ہے، مصر میں ان کو قوت و غلبہ حاصل ہو گیا، وہ مدتوں عزیز کے گھر میں حاکمانہ اقتدار کے ساتھ زندگی بسر کر چکے اور ان کی تاویل احادیث کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی، اب اسی تدبیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، ان کے جذبہ امانت و دیانت کی آزمائش ہوتی ہے اور اس کے اعلان و اشتہار کے اسباب پیدا ہوتے ہیں، جس کا پہلا حصہ امراۃ العزیز پورا کرتی ہے۔

وَرَادَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۖ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٠﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنَّ رَأْيَهَا رَدَّهُ ۖ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٣١﴾

”تو جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کر کے کہنے لگی جلدی آؤ، یوسف نے کہا کہ خدا پناہ میں رکھے، میرے رب نے تو میرا مقام پاک بنایا ہے بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے، عورت اپنی بات پر رہی اور یوسف اپنے جوابات پر رہا، اگر یوسف نے برہان رب نہ دیکھی ہوتی تو وہ کچھ کچھ ہو جاتا، ایسا ہی ہوا تا کہ ہم ان سے بدی اور بے حیائی کو دور ہی رکھیں بیشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہے۔“

راودتہ، رادیداد کے معنی طلب کرنے کے ہیں اور مرادوت کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی دوسرے آدمی سے ارادہ میں جھگڑا کرو، یعنی جس چیز کو وہ طلب کرتا ہے یا اس کا جو ارادہ ہے اس کے خلاف تم ارادہ رکھو، رادوتہ عن نفسه کے معنی یہ ہوئے کہ اس عورت نے یوسف کو ان کے ارادے سے پھیرنا چاہا، رادوتہ کے معنی پھسلاوٹ میں لگے رہنے کے بھی ہیں، یعنی وہ عورت ان کو ہمیشہ ہم بستری کی دعوت دیا کرتی تھی غلقت، کثرت سے بند کرنا یعنی بہت دروازوں کا بند کرنا ہیئت لك، اس کے معنی ہیں آؤ، عکرمہ کے نزدیک یہ حورانی زبان کا لفظ ہے۔ برہان، دلیل اور بیان واضح۔ السوء والفحشاء، بدکاری اور بے حیائی، بعض لوگ ان دونوں میں یہ فرق کرتے ہیں کہ سوء تو مقدمات زنا مثلاً بوسہ و نظربا تشہوة اور فحشاء سے مراد زنا۔

”امر آة العزیز اس گھر کی مالک ہے، حسن و جمال، عزۃ و جاہ اور دولت و ثروۃ والی ہے، اس نے تمام دروازوں کو بند کر لیا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اس سے قبل وہ بارہا حضرت یوسف علیہ السلام کو حرام کاری کی دعوت دے چکی ہے اور وہ ہر چند یوسف کو روز بروز کہتی رہی، پر اس نے اس کی نہ سنی کہ اسکے ساتھ سووے یا اس کے ساتھ رہے۔“ (پیدائش ۳۹: ۱۰)

حضرت یوسف علیہ السلام بالکل نوجوان ہیں، اس وقت آپ کی عمر ۲۲ یا ۲۳ سال کی ہوگی، پیکر حسن و جمال ہیں، شادی شدہ نہیں ہیں، بے وطن ہیں، کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ اس کے غلام ہیں۔

ان حالات میں بڑے بڑے پاکباز انسان اور فرشتہ خصلت بزرگ بھی پھسل جاتے ہیں مگر وہ پاکی و قدوسیت کا فرشتہ تھا، وہ پیکر عصمت اور مجسمہ ملکوتیت تھا، وہ کب اس کے دام فریب میں آسکتا تھا، اس نے فوراً جواب دیا: معاذ اللہ انہ بنی احسن مثنوی انہ لا یفلح الظالمون، اس گناہ سے پناہ! تیرا شوہر میرا آقا ہے اس نے مجھ پر اعتماد کیا، عزت و احترام کے ساتھ رکھا پھر یہ کسی طرح ممکن ہے کہ میں ایک ایسی چیز کا ارتکاب کروں جو امانت میں خیانت، راست بازی کے خلاف اور ادائے فرض میں کوتاہی ہے، جو نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام قوم اور ملک کے لئے ظلم صریح ہے اور اس حقیقت اصلہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ ظالم کو دنیا و آخرت میں کہیں بھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

پاک دامنی

آیت : وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا رَأْيُ بَرَّهَانَ رَبِّهِ کی تفسیر میں لوگوں کو عجیب عجیب حیرانیاں ہوئی ہیں، قرآن پکار

پکار کر کہہ رہا ہے کہ باوجود ان حالات کے یوسف کا دامن بالکل پاک و صاف رہا، یہاں تک کہ ان کے دل میں بھی اس جرم کے ارتکاب کا خطرہ تک نہ گذرا، مگر یہ لوگ ہیں کہ کتابوں میں بے دھڑک ایسی لائینی روایات نقل کرتے ہیں مثلاً مجلس منها مجلس الرجل من امراته۔

اگر ہم صرف قرآن کی اندرونی شہادت کو اپنے سامنے رکھیں تو روز روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، سب سے پہلے آپ یہی دیکھئے کہ امراۃ العزیزان کو بلارہی ہے، مگر وہ فرماتے ہیں: معاذ اللہ انہ بنی احسن مٹوا ی انہ لا یفلح الظلمون، اب یہ اس سے بھاگتے ہیں، دروازے پر عزیز مل جاتا ہے، عورت کی کوشش یہ ہے کہ خاوند کو مائل کر کے اپنے حق میں فیصلہ کروائے، مقدمہ پیش ہوتا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے: انہ من کید کن ان کید کن عظیم یوسف اعرض عن هذا واستغفر لی لذنبک انک کنت من الخاطیین، ”یہ تمہارا فریب ہے اور کچھ شک نہیں کہ تم عورتوں کے فریب بڑے بھاری ہوتے ہیں یوسف اس بات کا خیال نہ کرو اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ بیشک خطا تیری ہی ہے۔“ اب ان عورتوں کو دیکھئے جنہوں نے ہر ممکن طریق سے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی وہ اپنی شکست کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں: حاش للہ، ما هذا بشئ ان هذا الا ملک کریم، ”سبحان اللہ! یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔“ اسی جلسہ میں امراۃ العزیز یوں گویا ہوتی ہے: فذلک الذین لم یتنfy فیہ ولقد رادو ته عن نفسه فاستعصم۔ ”یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعن دیتی تھیں اور بیشک میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر یہ بچا رہا۔“

شاہ مصر کا دربار قائم ہے، یہی مقدمہ درپیش ہے۔ کس کس طرح یوسف کی عصمت و پاک دامنی کا اعلان و اشتہار ہو رہا ہے، عورتیں کہتی ہیں: ما علمنا علیہ من سوء، ”ہمارے علم میں یوسف کی کوئی برائی نہیں۔“ امراۃ العزیز یوں اقبال جرم کرتی ہے: الثن حصص الحق انارادته عن نفسه وانه لمن الصدقین، ”اب سچ کھل گیا میں نے ہی اس کو پھسلایا تھا اور وہ سچوں میں سے ہے“ اور سب سے آخر میں اس آیت کو بھی فراموش نہ کرو جس کی تفسیر آگے آئے گی: کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادۃنا المخلصین، ”ایسا ہی ہوا تا کہ ہم ان سے بدی اور بے حیائی کو دور ہی رکھیں بیشک وہ ہمارے خاص بندوں میں سے ہے۔“

کیا ان حقائق ثابتہ کے بعد بھی کوئی شخص اپنی زبان سے حضرت یوسف کے متعلق ایسی بات نکال سکتا ہے، معاذ اللہ۔

### معنی خیز تفسیر

اب آپ اصل آیت میں غور کیجئے جو دو جملوں پر مشتمل ہے۔

(الف)۔ ولقد همت به، اس عورت نے ان کا قصد کر ہی لیا تھا۔

(ب)۔ وهم بهالولان رای برهان رہے، اگر یوسف اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی قصد کر لیتے۔

امام فخر الدین رازی نے اسی معنی پر جزم کیا ہے، ابن حزم کی یہی رائے ہے، صاحب فتح البیان اس آیت کے متعلق ابو



حاتم کا یہ قول نقل کرتے ہیں: کنت اقرا علی ابی عبیدۃ غریب القرآن فلما اتیت علی قوله ولقد هبت به وهم بها قال هذا علی التقدیم والتاخیر کانہ قال ولقد هبت به ولولان رای برهان ربہ لہم بها ”میں ابو عبیدہ سے غریب القرآن کی تعلیم حاصل کرتا تھا جب اس آیت پر پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی اس آیت کو یوں پڑھو۔ ولقد هبت به ولولان رای برهان ربہ لہم بها۔“ اب مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے یعنی اگر حضرت یوسف علیہ السلام اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی امرۃ العزیز کا قصد کر لیتے، مگر اس سے قبل ہی وہ برہان رب دیکھ چکے تھے اس لیے انہوں نے عورت کا قصد ہی نہیں کیا۔

رہا یہ اعتراض کہ لولا کی شرط مقدم نہیں ہوتی، تو اس کو امام فخر الدین رازی نے صاف کر دیا ہے اور قرآن کی ایک دوسری آیت پیش کر کے اس قاعدہ کو باطل قرار دیا ہے۔ وَ أَصْبَحَ فُؤَادُ أَمْرُمُوسَىٰ فَرِحًا ۖ إِنَّ كَاذِبًا لَّتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَنَّهُ رَبَّنَا عَلٰی قُلُوبِنَا (القصص: ۱۰)۔

”اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا، اگر ہم انکے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصہ کو ظاہر کر دیں۔“

### برہان رب

انبیاء کرام کی تعلیم و تربیت خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے: ادبہ فی فاحسن تادیب، ”میرے رب نے مجھے بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔“ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے مخالف پر کامیابی ہوئی تو اسی حجت قاہرہ کی بدولت جو خدا نے انہیں نوازش کی تھی: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ (الانعام: ۳۸) ”اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی۔“ موسیٰ کو جو فرعون پر غلبہ نصیب ہوا تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ آیات کبریٰ سے سرفراز کئے گئے تھے: فَآرَاهُ الْآيَاتِ الْكُبْرٰی (الزمر: ۲۰) ”غرض انہوں نے ان کو بڑی نشانی دکھائی۔“ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی ان کے پروردگار کی طرف سے وہ حجت سکھائی گئی جو انہوں نے امرۃ العزیز کے سامنے بیان کر دی اور وہ یہی تھی: معاذ اللہ انہ ربی احسن مثلی انہ لا یفعلہم الظالمون۔

واقعات یہ ہیں کہ صاحب حسن و جمال عورت ایک غریب الوطن اور غیر شادی شدہ نوجوان کو زنا کی دعوت دیتی ہے، ان حالات میں کسی کا بچ کر نکل جانا غیر ممکن ہے: الا من رحم اللہ، اس وقت خدا نے اس کی نصرت اور دست گیری کی، معاذ اللہ کہا، اور صاف نکل گئے۔

### عبادنا المخلصین

اس آخری ٹکڑے میں نہایت زور کے ساتھ ان تمام روایات کا ذہ اور خیالات فاسدہ کی قلبی کھول دی ہے جو بعض ناعاقبت اندیش حضرات ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، خواتیم آیات دراصل اس تمام آیت کا نچوڑ ہوتی ہیں، یہاں دو چیزوں کی نفی کی گئی ہے سوء اور فحشاء کی، ہم ابتدا میں ان لفاظ کی لغوی تحقیق کر چکے ہیں یعنی سوء سے مراد تو مقدمات زنا



ہیں، مثلاً بوسہ لینا اور شہوت کی نظر سے دیکھنا وغیرہ اور فحشاء خود زنا کو کہتے ہیں یعنی ہم نے اس کٹھن وقت میں یوسف کو ثابت قدم رکھا تا کہ اس کو زنا اور اس کے تمام مہادی سے محفوظ و مصون رکھیں، یوسف تو ہمارے پاکیزہ بندوں میں سے تھے، ان کا مطلوب ہماری ذات اقدس کے سوا اور کوئی نہ تھا، ایسے لوگوں پر شیطان اپنا اثر نہیں ڈال سکتا: لَا كَيْدَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا عِيشَتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۵﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۶﴾ (الحجر ۳۹ تا ۴۰) ”اور سب کو بہکاوں گاہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں ان پر قابو چلنا مشکل ہے۔“

## فریب کاری

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَبِيضَهُ مِنْ دُبُرٍ ۖ أَلْقَيْهَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۖ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

”اور دونوں دروازے کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پکڑ کر جو کھینچا تو پیچھے سے پھاڑ ڈالا پھر دونوں نے دروازے کے پاس ہی عورت کے خاوند کو دیکھ پایا، تو عورت بولی کہ جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے اس کی اس کے سوا کیا سزا ہے کہ یا تو قید کیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے گا۔“

یوسف تو معاذ اللہ کہہ کر نہایت تیزی سے باہر کی طرف بھاگے کہ اس عورت کے خدع و فریب سے نجات حاصل کریں، مگر اس پر بھی شہوۃ کا جن سوار تھا۔ ان کا بھاگنا تھا کہ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی، اگرچہ وہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے، مگر انہیں ان تمام دروازوں کو بھی کھولنا تھا جنہیں وہ نہایت احتیاط سے بند کر چکی تھی پھر بھی اس نے آخری دروازے کے پاس ان کو لے ہی لیا۔ مگر وہ چونکہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے، انہیں پکڑ تو نہ سکی البتہ اس کا قمیص ہاتھ میں آگیا اس پر بھی وہ نہ رکے پیچھے سے کرتہ پھٹ گیا اور یوسف دروازے کے باہر تھے وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ عزیز بھی موجود ہے۔

یہ دیکھ کر عورت کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، مگر اس نے فوراً اپنے ہوش و حواس کو درست کیا اور کمال خدع و فریب سے اپنی تائید میں اپنے خاوند کے جذبات کو برا بیخنتہ کرنا چاہا کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ دے، کہا: ”یہ عبری غلام جو تو نے ہم پاس لا رکھا، گھس آیا کہ ٹھٹھا کرے اور جب میں نے آواز بلند کی چلا اٹھی تو وہ اپنا پیرا ہن مجھ پاس چھوڑ کر باہر نکل بھاگا“ (پیدائش ۳۹ تا ۱۷۱) تیری بیوی ہو اور اس پر غلام دست درازی کرے، بس اس کی یہی سزا ہے کہ اسے قید کر دیجئے یا ایسی سخت سزا دیجئے کہ ہمیشہ یاد رکھے۔

## عزیز کا فیصلہ

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَبِيضُهُ قُدًّا مِّنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۱۸﴾ وَإِنْ كَانَ قَبِيضُهُ قُدًّا مِّنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۹﴾ فَلَمَّا رَا قَبِيضَهُ قُدًّا مِّنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِّنْ

کَیْدِکُنْ ۚ اِنَّ کَیْدَکُنْ عَظِیْمٌ ﴿۱۸﴾ یُوسُفُ اَعْرَضَ عَنْ هٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرَ لِنَفْسِکَ ۚ اِنَّکَ کُنْتَ مِنَ الْخٰطِیِّیْنَ ﴿۱۹﴾

”یوسف نے کہا کہ اسی نے مجھے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور عورت کے قبیلے میں سے ایک گواہ نے شہادت دی کہ اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو یہ سچی اور وہ جھوٹوں میں سے ہے اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹی اور وہ سچوں میں سے ہے، جب اس کا قمیص دیکھا تو پیچھے سے پھٹا ہوا تب اس نے کہا، یہ تمہارا فریب ہے اور کچھ شک نہیں کہ تم عورتوں کے فریب بڑے بھاری ہوتے ہیں، یوسف اس بات کا خیال نہ کر اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ بیشک خطا تیری ہی ہے۔“

جس وقت یہ مقدمہ پیش ہوا تو امرأۃ العزیز کے ایک رشتہ دار نے کہا کہ اس واقعہ کا گواہ تو کوئی نہیں جو عینی شہادت دے سکے، اب قرآن کو دیکھنا چاہئے اگر قمیص آگے سے پھٹا ہے تو یہ شخص مجرم ہے ورنہ وہ عورت، دیکھا تو قمیص پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ اب عزیز پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یوسف کا دامن بالکل پاک ہے اور تمام تر شرارت اسی عورت کی ہے، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے صاف کہہ دیا کہ تم اس سے معافی مانگو تم ہی نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے اور یوسف سے کہا کہ اس واقعہ کو بھول جاؤ اس کا ذکر بھی کسی سے نہ کرنا۔

### ایک اور حیلہ

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَأَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِہٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۚ اِنَّا لَنَلٰہَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْہِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَہُنَّ مِثْکًا ۚ وَاتَتْ کُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْہُنَّ سِکِّیْنًا ۚ وَقَالَتْ اٰخِرُ مَا جِئْتُم عَلَیْہِیْنَ ۚ فَلَمَّا رَاٰیْنَهُنَّ اُكْبَدْنَ ۚ وَفَطَعْنَ اَیْدِیْہُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا لَہٰذَا بَشَرًا ۚ اِنْ لَّہٰذَا اِلَّا مَلٰکٌ کَرِیْمٌ ﴿۲۱﴾

”اور شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے، ہم دیکھتی ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہے، جب اس نے ان عورتوں کی چال سنی تو ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لئے کھانا تیار کیا اور ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آؤ، جب عورتوں نے ان کو دیکھا اسے بہت بڑا سمجھا اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے ساختہ بول اٹھیں کہ سبحان اللہ یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔“

شغفہا، شغاف اصل میں اس جھلی کو کہتے ہیں جو دل کے گرد ہوتی ہے اسے غلاف القلب بھی کہتے ہیں، مراد اس سے سویدائے قلب ہے۔ مٹکا، محفل جس میں تکیے لگائے جائیں اور دعوت کا سامان ہو مصری تکیہ لگا کر کھانا کھایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ تو پس پردہ ہوا تھا، مگر کسی نہ کسی طرح اس کی خبر نکل گئی اور رؤسائے شہر کی عورتوں نے یہ سن کر امرأۃ العزیز کی تحقیق و تضحیک کرنی شروع کی کہ یہ عورت بالکل ہی نالائق ہے جو غلام کو بھی اپنے قابو میں نہیں لاسکتی، ہم ہوتیں تو ایک ہی چلتر میں یوسف کی تمام پاک بازی ختم کر دیتیں۔ دراصل ان عورتوں کو جمال عصمت یوسفی کی خبر نہ تھی، جو یوں طعنہ

زن ہوئیں اور اپنے خدع و فریب کی تعریف کی۔

جب امر اء العزیز کو اطلاع ملی کہ ان کو اپنی چالبازیوں پر ناز ہے تو اس نے ان سب کی دعوت کی اور یوسف کو بھی اس موقع پر بلالیا، انہوں نے ہزار طریق سے اس کو پھسلانے کی کوشش کی اور جب وہ کسی طرح بھی کامیاب نہ ہوئیں تو اپنے آخری حربہ سے کام لیا، یعنی چھریاں لے کر ہاتھ کاٹ ڈالے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہم تمہارے عشق میں گھلی جاتی ہیں، اگر ہماری بات نہ مانو گے تو یاد رکھو انہی چھریوں سے ہم اپنے آپ کو ذبح کر ڈالیں گی۔

مگر اس کوہ عصمت پر ان تمام فریب کاریوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، انہیں اس کی نیکی اور پاکیزگی کا قائل ہونا پڑا اور بیک آواز پکارا اٹھیں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہے، ورنہ یہ ممکن تھا کہ حسن و جمال کی نمائش کے باوجود دُش سے مس نہ ہوتا، گویا ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک کریم کہہ کر پائی و عصمت اور اپنی شکست کا اعتراف کیا کہ ان کا کوئی چلتے اور مکر کامیاب نہ ہو سکا۔

### اعتراف شکست

یہ عورتیں دراصل خود یوسف پر بھیجی ہوئی تھیں اور ان کے دیدار کی مشتاق۔ بالآخر وہ بھی ناکام ثابت ہوئیں تو امر اء العزیز نے کہا

قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَنِي فِئْهِ ۖ وَقَدْ رَاوْهُنَّ عَنْ نَفْسِهِ فَاَسْتَعْصَمَ ۚ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا امُرُّكَ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُونَا مِنَ الصَّغِيرِۖنَ ﴿٦٦﴾

”تب عزیز کی عورت نے کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعن دیتیں تھیں اور بیشک میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر یہ بچار ہا اور اگر وہ یہ کام نہ کرے گا جو میں اس سے کہتی ہوں تو قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو گا۔“

یہی وہ غلام ہے جس پر فتح یاب نہ ہونے کی صورت میں تم نے مجھ پر زبان طعن دراز کی تھی، اب تم نے بھی اس کی عصمت و پاکیزگی کا اعتراف کر لیا، میں نے ہر ممکن طریق سے اس کو پھسلانے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح بھی قابو میں نہ آیا، لیکن ابھی میں اسے ایک موقع اور دیتی ہوں، اگر اب بھی وہ اس پر راضی نہ ہو تو پھر قید ہے اور ذلت و رسوائی۔

### السجن احب الی

قَالَ رَبِّ السَّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِي اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرَفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

فَاَسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصْرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ اِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاوْاْ الْاٰلِیْتَ لَیْسَ جُنَّتْ حَقِّۙ حَبِیْنِ ﴿٦٩﴾

”یوسف نے دعا کی کہ پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹاؤ گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، تو خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان سے عورتوں کا مکر دفع کر

دیایشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، پھر باوجود اس کے کہ وہ لوگ نشانیاں دیکھ چکے تھے، ان کی رائے ٹھہری کہ کچھ عرصہ کے لئے ان کو قید کر دیں۔“

حضرت یوسف نے دیکھا کہ حسن و جمال اور دولت و ثروت والی عورت ان کو دھمکی دے رہی ہے، دوسری عورتیں بھی اس کی پوری تائید کر رہی ہیں تو انہوں نے والہانہ و مضطربانہ دعا کی کہ خداوند! صورت حال تیرے سامنے ہے، میں ایک عاجز و درماندہ انسان ہوں، تیری نصرت و کام گاری کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں، اگر اس وقت بھی تو نے اس فتنہ کو نہ روکا تو مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں اس گناہ کا ارتکاب نہ کر بیٹھوں، میں اس گناہ پر قید کو ترجیح دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی، اس کو شرف اجابت بخشا اور پھر آخر عمر تک ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ وہ عالم السرائر و الخفایا ان کی مضطربانہ دعا کو سن رہا تھا اور ان مصیبت انگیز حالات سے پورا باخبر تھا۔

عزیز مصر کو یہ معلوم تھا کہ یوسف بالکل معصوم ہیں، شاید کا فیصلہ ان کے حق میں ہے، ان کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے، اس نے خود اپنی بیوی پر الزام رکھا تھا اور ان سے چشم پوشی کی درخواست کر چکا تھا، مگر ان آیات بینات کے باوجود اس نے بلا تعین جرم و میعاد قید انہیں قید خانہ میں ڈال دیا، اس کو خیال یہ تھا کہ ادھر شہر میں جو چرچا ہو رہا ہے کہ امراۃ العزیز نے اس نوجوان کو خراب کرنے کی کوشش کی وہ اس سزا دینے سے بند ہو جائے گا۔

یہاں بھی دراصل تدبیر الہی اپنا کام کر رہی تھی، یوسف کے کمالات و فضائل کی ابھی عام طور پر شہرت نہ ہوئی تھی، قید خانہ ان کے ارتقائے حقیقی کا اولین زینہ ہو گا، اسی جگہ تاویل احادیث کی حقیقت مستورہ بے حجاب ہو گی اور یہیں ان کی عصمت و پاکیزگی فطرت کا تمام مصر کو اعتراف کرنا پڑے گا۔

## ساقی و بادرچی

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنٌ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَرْسِلُكُمْ فَوْقَ رَأْسِي ۖ  
خُبْرَاتُكُلُ الطَّيْرِ مِنْهُ ۖ نَبْتَنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَأْتِيكَ مِنَ الْخُسَيْنِينَ ﴿٥٨﴾

”اور ان کے ساتھ دو اور نوجوان داخل زنداں ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے، دیکھتا ہوں کہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی خواب دیکھا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور جانور ان میں سے کھا رہے ہیں تو ہمیں ان کی تعبیر دیجئے کہ ہم تمہیں نیکو کار دیکھتے ہیں۔“

حضرت یوسف زنداں میں گئے تو داروغہ جیل نے ان کی نیکی، پاکیزگی اور تقدس سے متاثر ہو کر تمام قیدیوں کی نگرانی ان کے سپرد کر دی، جن کو آپ کی وجہ سے بے انتہا آرام نصیب ہوا، اس دوران میں شاہ مصر کا ساقی اور بادرچی قید ہوئے اور ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب ذکر کر کے آپ سے تعبیر کی خواہش کی، ساقی نے یہ خواب دیکھا کہ شاہ کو انگور کی شراب نچوڑ نچوڑ کر پلا رہا ہے اور نان بابائی کے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے جس میں سے پرندے نونچ نونچ کر کھا رہے ہیں۔

## اعلان توحید

قَالَ لَا يَأْتِيَكُمَا طَعَامٌ تُزْزِقْنِيهِ إِلَّا يَأْتِيَاكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَاكُمَا ۚ ذَلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ﴿٦٠﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي ابْرَهِيمَ وَاسْحَقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَلِكُمْ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَئِنْ أَكْثَرَ النَّاسُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ يَصَاحِبِي السَّجْنَ عَازِبَاتٍ مَتَّعِفَاتٍ خِيَرَاتٍ أَمْرَ اللَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٦٢﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْبَاءَ سَعَتْنُهُنَّ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَلِكُمْ الدِّينُ الْقَنِيمُ وَلَئِنْ أَكْثَرَ النَّاسُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٣﴾

”یوسف نے کہا کہ جو کھانا تم کو ملے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ میں اس سے پہلے تم کو اس کی تعبیر بتا دوں گا، یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور روز آخرت کا انکار کرتے ہیں میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں اور اپنے باپ دادا، ابراہیم اور اسحق اور یعقوب کے مذہب پر چلتا ہوں، ہمیں شایاں نہیں ہے کہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں یہ خدا کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر بھی، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے، میرے قیدے خانہ کے رفیقو بھلا کئی کئی جد اجداد آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا وغالب، جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی، سن رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

اللہ کے بندوں کی ابتدا ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کبھی انہیں کلمہ حق و حریت کے اعلان کا موقع ملا ہے، وہ اس سے کبھی نہیں چوکتے اور اپنے فرض کو ادا کر کے چھوڑتے ہیں، جس وقت امر آؤ العزیز نے ان کو زنا کی دعوت دی تھی تو اس وقت بھی انہوں نے صاف صاف الفاظ میں زنا کی برائی بیان کر دی اور اس کے نتائج فاسدہ کی طرف توجہ دلا دی، اب یہ دوسرا موقع ہے کہ دو قیدی آپ کی طہارت و پاکیزگی سے متاثر ہو کر آپ سے خواب کی تعبیر پوچھتے ہیں، آپ نے ان کے حسن ظن سے فائدہ اٹھایا اور چاہا کہ انہیں راہ حق و صدق دکھادیں۔

قبل اس کے کہ آپ انہیں توحید خداوندی کی طرف توجہ دلائیں، آپ نے ان سے دو باتیں کیں:

(الف)۔ روزانہ تمہارے پاس معین وقت پر کھانا آتا ہے، اس کے آنے سے پیشتر ہی میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔

(ب)۔ قبل اس کے کہ ہر ایک خواب کے صحیح نتائج تمہارے سامنے آئیں، تمہیں ان کی اصلی تعبیر معلوم ہو جائے گی۔  
ان دو باتوں کے بیان کرنے سے غرض یہ تھا کہ دیر تک بیٹھے رہنے سے اکتانہ جائیں، ان کی طلب صادق باقی رہے اور اس شوق میں وہ ان کلمات رشد و ہدایت کو یکسر گوش بن کر سنتے رہیں، شاید سعادت کی راہیں ان کے لئے کشادہ ہو جائیں اور وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہوں۔

اس قدر تمہید کے بعد اب انہوں نے اصل مطلب کی طرف یوں متوجہ کیا کہ مستقبل کے حالات کی اطلاع اللہ کے سوا کسی انسان یا فرشتہ کو حاصل نہیں، ہاں یہ کہ وہ خود ہی اپنے فضل سے کسی کو ایک خاص چیز کی اطلاع کر دے، اس لیے انسان کا فرض یہی ہے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان رکھے، جس کا مطلب یہ ہے:

(الف)۔ جو لوگ کفر و شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان سے کلیۃً اعراض و اجتناب اور اپنی کامل برأت و پاک دامنی کا اعلان: اِنَّا بَرِءٌ مِّنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الممتحنہ ۴) ”ہم تم سے اور ان بتوں سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔“

(ب)۔ اقرار توحید کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انبیاء و رسل کے سلسلہ حق کو بھی بلا اختلاف و تفریق تسلیم کر کے ان کے طریق عمل کو اسوہ حسنہ قرار دیا جائے: فَبِهِذِهِمْ اُفْتَدِیْہُ (الانعام ۹۰) ”تو تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔“

(ج)۔ کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہے یا اس کا شریک ٹھہرائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر فضل و احسان ہے کہ اس نے تم لوگوں کی راہ نمائی و ہدایت کے لیے ابراہیم اور ان کے مقدس خاندان کو نبوت کے منصب جلیل پر فائز کیا، مگر لوگ ہیں کہ پروا نہیں کرتے اور ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

اے زندان کے رفیقو! تم خود ہی انصاف کرو، ایک شخص وہ ہے جو صدہا آقاؤں کا غلام ہے اور دوسرا اپنی جبین نیاز صرف ایک ہی مالک السموات والارض کے آگے خم کرتا ہے، نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کس کی حالت بہتر ہوگی اور پھر یہ واحد مالک وہ ہے جو تمام کائنات ارضی و سماوی پر قاهر و ضابط ہے اور کسی کو طاقت نہیں کہ اس کے حکم سے سر مو انحراف کر سکے: وَلَکَ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَ کَرْهًا وَّ اِلَیْہِ یُجْعَلُوْنَ (ال عمران ۸۳) ”اور سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“

عام لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ اشرف مخلوقات ہیں، اپنے شرف و مجد کو کھودیتے ہیں، اپنے سے کمتر چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، ان اصنام و طواغیت کے آگے خمیدہ گردن ہوتے ہیں، جنہیں وہ خود اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ کوئی شجر و حجر کو پوجتا ہے اور کسی نے قبور انبیاء و اولیاء کو اپنا معبود و مسجود بنالیا ہے، حالانکہ اگر وہ ذرا عقل و خرد سے کام لیتے اور کتب الہیہ میں درس و فکر کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شرک کرنا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے، وہ صرف اللہ ہی ہے جس کا ہر حکم نافذ ہوتا ہے اور اس کو اپنی پرستش کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہیں۔

یہی منہاج نبوت ہے، اسی پر تمام انبیاء کرام متفق ہیں اور ان میں سے ایک نے بھی آج تک راہ حق سے انحراف نہیں کیا، مگر لوگ عجیب ہیں کہ اس صاف اور روشن صراط مستقیم کو چھوڑ کر کفر و شرک کی ظلمت و تاریکی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی جہالت و لاعلمی کی وجہ سے طرح طرح کے نقصان اٹھاتے ہیں۔

## حقیقی تعبیر

يَصَاحِبِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ  
الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿٦﴾ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ۚ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ  
فَكَذَّبَ فِي السِّجْنِ بِضَمٍّ سِنِينَ ﴿٧﴾

”میرے زندان کے رفیقو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا اور  
پرندے اس کا سر نوح نوح کر کھا جائیں گے، جو امر تم مجھ سے پوچھتے تھے وہ فیصل ہو چکا ہے اور دونوں میں سے جس کی  
نسبت یوسف نے خیال کیا کہ وہ رہائی پائے گا اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کرنا، لیکن شیطان نے ان کا اپنے  
بادشاہ سے ذکر کرنا بھلا دیا اور یوسف کئی برس جیل میں رہے۔“

پند و موعظت کافی ہو گئی اور اس وعظ و نصیحت سے راہ حق ان کے سامنے کھل گئی، اس لیے اب حضرت یوسف نے  
 وعدہ کے مطابق آپ کے خواب کی یہ تعبیر بیان کی :

ساتی چند روز کے بعد رہا ہو گا اور بادشاہ کو شراب پلایا کرے گا۔

نان بھائی پھانسی چڑھے گا اور پرندے اس کا سر نوح کر کھا لیں گے۔

جب حضرت یوسف تعبیر دے چکے تو ان لوگوں نے کہا: مارا اپنا شیئا، ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا، مگر آپ  
نے فرمایا کہ جو کچھ تم سے کہا گیا ہے وحی والہام کی بنا پر کہا گیا ہے اور یہی ہو کر رہے گا۔ چنانچہ تیسرے روز شاہ مصر کی سالگرہ  
تھی ساتی رہا ہو گیا اور وہ مصلوب ہوا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کا بھی ہے، ربیعہ بن امیہ بن خلف نے ایک روز حضرت عمرؓ سے اپنا ایک خواب  
بیان کیا کہ میں ایک سرسبز و شاداب میدان میں جا رہا ہوں، اس کے بعد ایک چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان میں چل گیا، اس  
کی تعبیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہیں دولت اسلام نصیب ہوگی، پھر تم مرتد ہو جاؤ گے۔ اس نے کہا میں نے تو کوئی خواب  
نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا تَقْضِ الْأَمْرَ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ، یہی ہوا کہ ربیعہ اسلام لا کر مرتد ہو گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

## صاف مطلب

عام مفسرین نے اذکرنی عند ربك کے یہ معنی لیے ہیں کہ بادشاہ سے میری رہائی کے لیے سفارش کرنا، لیکن قرآن نے  
جو گفتگو نقل کی ہے اس سے یہ نہیں نکلتا کہ حضرت یوسف نے قیدیوں سے اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا کہیں بھی اشارہ ذکر  
کیا ہے، بلکہ ان دو قیدیوں سے ان کی جو گفتگو ہوئی ہے وہ تو تعبیر خواب اور دین حق کے بارے میں ہوئی ہے، اس لیے اس کا  
صاف اور سادہ مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساتی جب رہا ہو کر بادشاہ کے پاس جائے تو کسی مناسب موقع پر بادشاہ سے اس  
تعلیم اور دین حق کا ذکر کرے جو اس نے حضرت یوسف کی زبان سے سنا ہے، شاید شاہ اس دعوت کو قبول کر لے۔



## بادشاہ کا خواب

مصلحت الہی اس امر کی متقاضی تھی کہ یوسف ابھی چند سال اور جیل میں رہیں تاکہ تاویل احادیث کی تعلیم اپنے اتمام و اکمال کو پہنچے۔ اب وقت آگیا کہ وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کریں، ان کا خواب پورا ہوا اور درجہ اجتناب کو پہنچیں، اس کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ خود بادشاہ وقت ایک خواب دیکھتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سَوِيَّاتٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ وَسَبْعَ سُثُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَةٍ ۚ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ الْأَعْيُنُ إِن كُنْتُمْ لِلرُّعْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٥٠﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعِلْمٍ ۖ ﴿٥١﴾

”اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دہلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور سات خشک، اے سردارو اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ، انہوں نے کہا یہ تو پریشان خواب ہیں اور ہمیں ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں آتی۔“

اضغاث جمع ہے ضغث کی، سینکڑوں کو جمع کر کے مٹھاسا لینے کو کہتے ہیں، پھر استعارہ ان خیالی باتوں اور شیطانی وساوس کو کہتے ہیں جو آدمی خواب میں دیکھتا ہے، کیونکہ قوت متخیلہ بے جوڑ باتوں کو جمع کر لیتی ہے۔ احلام جمع ہے حلم کی، جھوٹے خواب جن کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

شاہ مصر کو اس خواب سے تعجب اس لیے ہوا کہ سات دہلی گائیں موٹی تازی کو کھا گئی ہیں، ایسے ہی سبز اور خشک بالیں، اس لئے اس نے دربار کے جادو گروں اور دانش مندوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو وہ کچھ نہ بتا سکے، بلکہ خواب پریشان کہہ کر ٹال دیا۔

## ذریعہ نجات

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٥٢﴾ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سَوِيَّاتٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ وَسَبْعِ سُثُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَةٍ ۚ لَعَلَّكَ آتٍ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ تَزُولُ ثَوْنِي سَبْعَ سِنِينَ دَآبَا ۖ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذُرُّوهُ فِي سُثُلٍ ۖ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٥٤﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَحْصِنُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٥٦﴾

”اب وہ شخص جو دونوں قیدیوں میں سے رہائی پا گیا تھا اور جسے مدت کے بعد وہ بات بھی یاد آگئی، بول اٹھا کہ میں آپ کو اس کی تعبیر لاتا ہوں، مجھے جیل تک جانے دیجئے، اے یوسف اے سراپا صدق ہمیں بتائیے کہ سات موٹی گایوں کو سات دہلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز سات خوشے خشک تاکہ میں لوگوں کے پاس جاؤں، عجب نہیں کہ وہ بھی سمجھ جائیں، انہوں نے کہا کہ تم لوگ سات سال تک متواتر کھیتی کرتے رہو گے تو جو غلہ کالو تو تھوڑے سے غلہ کے سوا جو کھانے میں آئے اسے خوشوں ہی میں رہنے دینا، پھر اس کے بعد سات سال سخت آئیں گے کہ جو غلہ تم نے جمع



کر رکھا ہو گاسب کو کھالو گے، صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تم با احتیاط رکھ چھوڑو گے، پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد سنی جائے گی اور اس میں وہ انگور بھی نچڑیں گے۔“

شاہ کا خواب سن کر اور اہل دربار کی عاجزی دیکھ کر ساقی کو خود اپنا واقعہ یاد آگیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی یاد آگئی کہ حضرت یوسف نے کیا کہا تھا، تب اس نے اپنا واقعہ بادشاہ کے گوش گزار کیا اور گزارش کی کہ اگر آپ قید خانہ تک مجھے جانے کی اجازت دیں تو میں ابھی اس مشکل کو حل کئے دیتا ہوں۔

بہر حال ساقی گیا اور تمام خواب ذکر کر کے حضرت یوسف سے درخواست کی کہ سب لوگ پریشان ہیں، آپ تعبیر بتا دیجئے تاکہ میں انہیں مطمئن کر سکوں، آپ نے نہ صرف تعبیر دی بلکہ جو مصائب آنے والے تھے ان کا اعلان بھی بتا دیا، آپ نے فرمایا:

(الف)۔ سات سال تم مسلسل کھیتی کرو گے، یہ زمانہ سرسبزی و شادابی کا ہو گا، مگر جس قدر غلہ پیدا ہوا ہو اس میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لینا باقی محفوظ رکھنا۔

(ب)۔ اس کے بعد قحط کا زمانہ آئے گا اور وہ بھی برابر سات سال تک رہے گا، جو غلہ تم گذشتہ سالوں میں بحفاظت تمام جمع کر چکے ہو، اسی پر تمہارا گزارہ ہو گا، کیونکہ امساک باراں کی وجہ سے مطلق کوئی چیز پیدا نہ ہو گی، یہاں تک کہ یہ غلہ بھی بہت کم رہ جائے گا۔

(ج)۔ پندرہواں سال سرسبزی و شادابی اور خوش حالی و فارغ البالی کا ہو گا اور ہر چیز کی کثرت ہو گی۔

### الزامات کی تحقیق

ساقی نے جا کر اس خواب کی تعبیر شاہ سے ذکر کی تو سن کر حیران رہ گیا اور چاہا کہ خود اس صاحب عقل و خرد سے باتیں کرے، اس نے کہا:

وَقَالَ الْمَلِكُ اَنْتُمْ بِهٖ ۙ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ اَرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي تَقْطَعْنَ اَيِّدِيَهِنَّ ۚ اِنَّ رَبِّيْ يَكِيْدُھِنَّ عَلَیْھِمْ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوْذْتُنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْہِ مِنْ سُوٍّ ۚ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ اَلْنَّ حَصَّصَ الْحَقُّ ۚ اَنَا رَاوْذْتُهُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ وَاِنَّہٗ لَبِنَ السُّدٰی ۝ ذٰلِكَ لَیَعْلَمَنَّ اَنَّیْ لَمْ اُخْنِہٖ بِالْغَیْبِ ۚ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَهْدِی الْخَآئِنِیْنَ ۝ وَمَا اُبْرِئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَآ مَارَآةٌۢ بِالسُّوْرِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ۚ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

”بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لاؤ، جب یوسف کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، میرا مالک تو ان فریب کاریوں سے خوب واقف ہے، بادشاہ نے عورتوں سے پوچھا کہ اس وقت کا معاملہ کیا ہے، جب تم نے یوسف کو پھسلا نا چاہا تھا، سب نے کہا

خدا کی پناہ، ہمارے علم میں یوسف کی کوئی برائی نہیں۔ امر آۃ العزیز بولی اب سچ کھل گیا، میں نے ہی اس کو پھسلا یا تھا اور وہ سچا ہے، یہ اس لیے کہتی ہوں کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تو خیانت والوں کی چال چلنے نہیں دیتا اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتی، کیونکہ نفس تو برائی پر اکسایا ہی کرتا ہے، سوائے اس کے کہ جس پر پروردگار رحم کرے، میرا رب غفور اور رحیم ہے۔“

بادشاہ نے اپنا قاصد بھیجا کہ یوسف کو لے آؤ، مگر انہوں نے فرمایا، جب تک عورتوں کا مقدمہ فیصلہ نہ ہوئے میں جیل سے باہر قدم نہ رکھوں گا۔ حزم و احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ انکار کر دیں، اس لئے کہ آگے چل کر انہیں اسی ملک میں حکومت کرنا تھی اور انہیں لوگوں سے کام لینا تھا، اگر یہ معاملہ گوگوں میں رہتا تو ممکن تھا کہ ایک طرف توشاہ کا دل صاف نہ ہوتا وہ سمجھتا کہ میں نے ایک قیدی پر لطف احسان کیا ہے، دوسرے اور لوگ بھی کھلم کھلا نہ سہی درپردہ ہی آپ پر نکتہ چینی کرتے، انہیں آپ کی امانت و دیانت پر اعتماد نہ ہوتا جو ایک حکمران کے لیے ضروری ہے۔

ان کا یہ مطالبہ کہ خود شاہ اس مقدمہ کی تحقیق کرے، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ان کا دامن بالکل پاک و صاف تھا ورنہ ایک مجرم کسی طرح ایسا مطالبہ کر سکتا ہے اور شاہ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جو شخص اتنی مدت قید میں رہنے کے باوجود پھر بھی نکلنے کو تیار نہیں، وہ ضرور صاحب عقل و خرد اور صبر و استقامت ہے اور اس کے مقدمہ کا بہت جلد فیصلہ کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف کے اس انکار کی بہت مدح و ستائش فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

عجبت من يوسف من وكمه وصبره والله يغفر له حين سئل عن البقرات العجاف والسبان ولو كنت مكانه لما اخبرتهم حتى اشتطت ان يخبروني ولقد عجبت منه حين اتاه الرسول فقال ارجع الى ربك ولو كنت مكانه ولبثت في السجن ما لبث لاساعت الا جابة وباء درتهم الى الباب ولما ابتغيت العذر انه كان حليفا ذاناعة۔

”مجھے یوسف کے جو دو کم اور صبر و استقلال پر حیرت ہوتی ہے کہ جب ان سے گایوں والے خواب کی تعبیر دریافت کی ہے تو وہ فوراً بتا دیتے ہیں۔ اگر میں ان کی جگہ پر ہوتا تو جب تک وہ لوگ میری رہائی کو تسلیم نہ کر لیتے انہیں اس کی تعبیر نہ بتاتا، پھر مزید تعجب اس امر پر ہے کہ جب قاصد آیا تو آپ نے اس کو واپس کر دیا۔ میں ہوتا اور جتنی دیر تک یوسف قید میں رہے اتنی دیر قید میں رہا ہوتا تو فوراً قاصد کی بات مان لیتا باہر نکلنے کے لئے دروازے کے پاس آنے میں جلدی کرتا اور اس کے لئے بالکل عذر خواہ نہ ہوتا، بیشک یوسف بڑے ہی حلیم اور بردبار تھے۔“

امر آۃ العزیز کی شہادت

شاہ نے عزیز کی بیوی اور دوسری عورتوں کو بلایا اور اس تمام واقعہ کی ان سے تفصیل طلب کی، تمام عورتوں نے متفقہ طور پر عین دربار میں یوسف کی برأت و پاکدامنی کی شہادت دی، لوگوں کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ شہر میں جس قدر

باتیں یوسف کے چال چلن اور سیرت کے متعلق مشہور تھیں، وہ سب بے سرو پا ہیں اور ان کا دامن بالکل پاک و صاف ہے۔

جب حالات یہاں تک پہنچ گئے تو امر آة العزیز کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنے جرم کا اقرار کرتی، اس لیے اس نے سب سے آخر میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے حسب ذیل بیان دیا۔  
حق و صدق واضح ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہی اس پیکر عصمت و مجسمہ ملکوتیت کو راہ حق سے منحرف کرنے اور گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ہر کوشش میں مجھے ہی ناکام رہنا پڑا اور ملک کریم کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی، یہ بیان میں اس لئے دے رہی ہوں کہ یوسف کو اطلاع ہو جائے جو ابھی جیل ہی میں ہے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں اس کی خیانت نہیں کی بلکہ سچے طور پر اس کی پاکیزگی فطرت اور طہارت دامنی کا سر در بار اعلان کیا ہے، میں اس کے حق میں اب کوئی خیانت نہیں کرنا چاہتی اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک خائن کی چال چلنے دے، میں مجرم ہوں، میرا دل اس پر ملامت کر رہا ہے، میں اپنی کوئی برأت نہیں کرتی، اس لئے کہ نفس امارہ ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اس کے خدع و فریب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس کے شامل حال توفیق خداوندی ہو، بہر صورت اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنی رحمت سے کام لے کر میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

### محقق کی رائے

بعض مفسرین نے ذلك ليعلم سے ان ربی غفور رحیم تک تمام بیان کو حضرت یوسف کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ وہ ابھی تک قید ہی میں ہیں اور جب تک ان کے مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے باہر آنے پر رضامند نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام بیان امر آة العزیز ہی کا ہے جیسا کہ ہم نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے۔ یہی حافظ ابن کثیر اور دوسرے محققین کی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

وهذا القول هو الا شهر والاليتق والان نسب بسياق القصة ومعاني الكلام وقد حكاها الماوردي في تفسيره وانتدب لنص الامام ابو العباس بن تيمية رحمه الله فافرد بتصنيف على حدة۔

“اس کو امر آة العزیز ہی کا قول قرار دینا قصہ اور معانی کلام کے لحاظ سے الیق وانسب ہے اور یہی رائے زیادہ مشہور ہے، ماوردی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے اور امام ابن تیمیہ نے اسی قول کی تائید میں ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے۔“

### تمکین فی الارض

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ اَسْتَخْلِصْهٗ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَتْهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدِنَّا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ۝ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَاۤئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لَیُوسُفَ فِی الْاَرْضِ یَتَّبِعُوْا مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ نَّصِیْبُ

بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵﴾ وَلَا جُزْأَ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۶﴾

”بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنا مصاحب خاص بناؤں گا، پھر جب ان سے گفتگو کی تو کہا کہ آج سے تم ہمارے ہاں صاحب منزلت اور صاحب اعتبار ہو، یوسف نے کہا کہ مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں جگہ دی اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے، ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے اور جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے ان کے لئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔“

امر آة العزیز اور لائعات مصر کی شہادت کے بعد شاہ کے دل میں حضرت یوسف کی نسبت بے انتہا عقیدت پیدا ہو گئی اور اس کے مختلف اسباب تھے:

- (۱)۔ تمام کاہن اور جادوگر تعبیر خواب سے عاجز تھے، صرف یہی تھے جنہوں نے اس کو اطمینان بخشا۔
- (۲)۔ باوجود مدتہائے دراز تک زنداں میں رہنے کے انہوں نے نکلنے میں جلدی نہیں کی، بلکہ صبر و استقلال اور ثبات قدم سے کام لیا۔
- (۳)۔ امر آة العزیز ہی کی بدولت ان پر یہ تمام تکالیف نازل ہوئیں، مگر جب انہوں نے مقدمہ کی تحقیق چاہی تو اس کا نام تک نہ لیا بلکہ صرف اتنا کہا: مابال النسوة التي قطن ايديهن، ”ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔“

- (۴)۔ ان کا دامن بر سر دربار تمام الزامات سے پاک و صاف بتایا گیا۔
- (۵)۔ ساتی نے بھی یقیناً اپنے واقعات شاہ کے گوش گزار کیے ہوں گے اور یوسف کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی مدح و ستائش کی ہوگی۔

ان اسباب و وجوہ کی بنا پر اس نے اور زیادہ شوق و ولولہ کے ساتھ یوسف کو جیل سے طلب کیا، خود ان کی زبان مبارک سے خواب کی تعبیر سنی، اسے معلوم ہو گیا کہ اس وقت تمام سرزمین مصر میں اس نوجوان سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ چنانچہ اس نے یوسف سے کہا: ”از بس کہ خدا نے تجھے اس سبب میں پیدائی دی ہے، سو کوئی تجھ سے ساقی اور دانش ور نہیں ہے، تو میرے گھر کا مختار ہو اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تحت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ رہوں گا۔“ (پیدائش ۳۱: ۳۹ تا ۴۰) مکیں، امین کا یہی مطلب ہے جو کتاب پیدائش کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

حفیظ علیم

حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ سے کہا کہ آئندہ جو واقعات مصر میں پیدا ہونے والے ہیں اور جس قدر سخت و شدید قحط اس ملک میں رونما ہوگا، ان کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ایسے شخص کو مالیات کا وزیر بنایا جائے جس میں حسب ذیل

خصوصیات ہوں:

- (۱)۔ وہ امین اور سمجھدار ہو۔
- (۲)۔ آمدنی کے ذرائع و وسائل پر اس کی نظر ہو۔
- (۳)۔ وہ جانتا ہو کہ حکومت کی مالی حالت کو کس طرح محکم و استوار کیا جاسکتا ہے۔
- (۴)۔ سلطنت کی تمام ضروریات سے واقف ہو۔
- (۵)۔ مدات مصارف کا مکمل منبجی علم رکھتا ہو۔
- (۶)۔ ضروری و غیر ضروری میں فرق و امتیاز کر سکتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قیام مصر کے دور ان میں ان تمام باتوں کی تعلیم دے دی تھی، ان کے علم و فضل کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہو چکا تھا، ان کی امانت و دیانت سے ایک ایک بچہ واقف تھا، تدبیر الہی اپنا کام پورا کر چکی تھی اور اب وہ ہر طرح اس قابل تھے کہ اس بار گراں کو سنبھال لیں، چنانچہ انہوں نے اس کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ میں حفیظ و علیم ہوں۔

اب تمام مصر میں حضرت یوسف ہی کی حکومت تھی، جو چاہے احکام نافذ کرتے، بیشک جو محسنین ہوتے ہیں ان کو اسی طرح دنیا میں نمایاں اور ممتاز کر دیا جاتا ہے لیکن یہ دراصل بہت ہی حقیر اور ادنیٰ ثواب ہے، جو کچھ صحیح معنی میں ان ارباب ورع و تقویٰ کو ملنے والا ہے وہ تو مرنے کے بعد ہی ملے گا۔

بصائر و حکم

یہاں تک حضرت یوسف کی زندگی کا ایک باب ختم ہو جاتا ہے۔ تدبیر الہی کے لطائف اور کرشمہ سازیوں کو دیکھو، ابتدا کس طرح ہوئی، انجام کیسا شاندار ہوا اور یعقوب نے جو تعبیر اس خواب کی دی تھی، کس طرح پوری ہوئی: ان بے لطیف لبایشاء انہو العلیم الحکیم۔

قبل اس کے آگے بڑھیں، ہم چاہتے ہیں کہ پھر ایک مرتبہ پیچھے نگاہ ڈال لیں اور ان بصائر و حکم اور عبر و موعظ کو تلاش کریں جو آیات ماسبق میں پنہاں ہیں کہ وہ ہمارے لیے چراغ راہ و مشعل ہدایت ثابت ہوں۔

(۱)۔ اگر کوئی شخص برائی کا مرتکب ہو اور اس کا ذکر ضروری ہو تو اشارات و کنایات سے کام لیجئے، قرآن نے عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا، بلکہ یہ کہا: واددتہ القی ہونی بیتھا عن نفسه۔ ”تو جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔“

(۲)۔ زنا بدترین ظلم ہے، جو شخص اس میں پھنستا ہے وہ تمام ملک و ملت پر ظلم کرتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا: اِنَّهٗ لَا يَفْدَحُ الظُّلْمَ۔ ”بے شک عالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔“

(۳)۔ اگر انسان صرف ایک خدا کا ہو رہے تو وہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر برائی سے اس کو بچا لیتا ہے: كَذٰلِكَ لَنُصْرَفِ عَنْهٗ السُّوءُ وَالْفَحْشَاءُ۔ ”تا کہ ہم ان سے بدی اور بے حیائی کو دور کھیں۔“

(۴)۔ زانیہ عورت اور مرد کے تعلقات مودت کبھی اخلاص پر مبنی نہیں ہوتے اور ان کی محبت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی: اِلَّا اِنْ يَسْجُنَ اَوْ عَذَابُ الْيَمِّ، ”یا تو قید کیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے۔“

(۵)۔ اگر گواہ موجود نہ ہوں تو قرائن سے کام لے کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے: اِنْ كَانَ قَبِيصُهُ قَدْ مِّنْ قَبْلِ، ”اگر اس کا قیص آگے سے پھٹا ہو۔“

(۶)۔ اگر دنیا کی باطل قوتیں اور شیطانی حکومتیں حرص و آرز کے سبز باغ دکھا کر تمہیں راہ حق سے منحرف کرنے کی کوشش کریں، ملک و ملت سے غداری کے لئے مجبور کریں اور ایسا نہ کرنے پر تمہیں بوجھل بیڑیوں، آہنی زنجیروں، زندان کی کوٹھڑیوں اور پھانسی کے تختوں کی دھمکی دیں تو تم ان مصائب کو مسرت و شادمانی کے ساتھ قبول کر لو، مگر صراط مستقیم کو نہ چھوڑو اور ملک و ملت سے غداری و فریب کاری نہ کرو: رَبِّ السَّبْحَنِ اِحْبَبُ اِلٰى مَبَايِدِ عَوْنِى الْيَهُ، ”پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔“

(۷)۔ ہر مصیبت و تکلیف کے وقت انسان خدا ہی کی طرف رجوع کرے: رَبِّ السَّبْحَنِ اِحْبَبُ اِلٰى۔

(۸)۔ ہر گناہ سے بچنے کے لئے خدا ہی کی توفیق کا طلب گار ہو: وَالْاِتِّصَافِ عَنِ كَيْدِ هٰنِ اَصْبِ الْيَهُنِ وَاَكُنْ مِنَ الْجَهْلِيْنَ، ”اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔“

(۹)۔ ہر مسلمان کے ایمان کو اتنے رفیع و بلند مقام پر ہونا چاہئے کہ وہ مصیبت و تکلیف کے مقابلہ میں اس کا زیادہ خیال کرے۔

(۱۰)۔ کسی بڑے سے بڑے انسان کو اپنے تقویٰ پر غرور و استکبار زیبا نہیں: اَصْبِ الْيَهُنِ، ”میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔“

(۱۱)۔ مبلغین و دعاۃ اسلام کا یہ فرض ہے کہ وعظ و تذکیر کے وقت سامعین کی دلچسپی کا ضرور لحاظ رکھیں: قَبْلِ اِنْ يٰتِيْكَمُ، ”اس سے پہلے کہ تمہارے پاس کھانا آجائے۔“

(۱۲)۔ علم حاصل کرنا ہو تو استاد کے ادب و احترام کا لحاظ کرنا ضروری ہے: اِيْهَا الصَّدِيقُ افْتَتَا، ”اے سراپا صدق! ہمیں بتائیے۔“

(۱۳)۔ خدا پرستوں کو دنیوی عزت کی چاہ نہیں ہوتی، ان کی نظر طہارت و پاکیزگی پر ہوتی ہے: ارجع الی ربک، ”اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ“۔

(۱۴)۔ صبر اور عصمت سے تمسک و اعتصام کرو کہ یہی کامیابی کی راہ ہے: استخلصہ لنفسی، ”میں اسے اپنا مصاحب خاص بناؤں گا“۔

(۱۵)۔ اگر ملک میں ارباب علم و فضل اور دانش و بینش کا فقدان ہو تو جس شخص میں شوئ ملک کے نظم و ادارہ کی اعلیٰ ترین قابلیت ہو، چاہئے کہ وہ خود اپنی خدمات پیش کرے اور ملک کو بتا دے کہ اس سے قابل تر اور کوئی شخص موجود نہیں، اجعلنی علی خزائن الارض لئ احفیظ علیہم، ”مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں“۔



## باب نمبر ۲

## خواب کا سچا ہونا

## فصل اول

## بھائیوں کی آمد

وَجَاءَ اخُوَتُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ⑤ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِآيَةٍ لَّكُمْ مِّنْ اٰيٰتِكُمْ اَلَّا تَكُوْنُوْنَ اِلَّآ اَوْفٰى الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ⑥ فَاِنْ لَّمْ تَأْتُوْنِيْ بِهَا فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ⑦ قَالُوْا سَنُتَاوَدُّ عَنْهُ اٰبَاؤُنَا اِنَّا لَنَفْعِلُوْنَ ⑧ وَقَالَ لِفَتٰىنِهٖ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رَحَالِهِمْ لَعَلَّهٖمْ يَعْرِفُوْنَهَا اِذَا اُنْقَلِبُوْا اِلٰى اٰهْلِهِمْ لَعَلَّهٖمْ يَرْجِعُوْنَ ⑨

”اور یوسف کے بھائی آئے اور اس کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے ان کو پہچان لیا اور وہ اس کو نہ پہچان سکے، جب اس نے ان کے لیے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا کہ جو باپ کی طرف سے تمہارا ایک اور بھائی ہے اسے بھی میرے پاس لے آنا کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ بھی پوری پوری دیتا ہوں اور مہمان داری بھی خوب کرتا ہوں اور اگر تم اسے میرے پاس نہ لاؤ گے تو نہ تمہارے لیے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس آنا، انہوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ کے ارادہ کو پھیریں گے اور ہم یہ کام کر کے رہیں گے اور یوسف نے اپنے خدام سے کہا کہ ان کا مال ان کی خرجیوں میں رکھ دو، عجب نہیں کہ جب یہ اپنے اہل و عیال میں جائیں تو اسے پہچان لیں اور عجب نہیں کہ یہ پھر یہاں آئیں۔“

اخوة جمع ہے اخ کی، یہ جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس یا اس سے کم پر ہوتا ہے۔ جمع کثرۃ کے لئے اخوان ہے جو دس سے زیادہ پر بولا جاتا ہے۔ بجهاز ہم، جھاز مصدر ہے تجهیز کا، جس طرح سلام مصدر ہے تسلیم کا، اس سے مراد ان تمام چیزوں کا مہیا کرنا ہے جن کی مسافر کو ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن کریم نے درمیانی واقعات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، اس لئے کہ وہی ہوا جس طرح یوسف نے تعبیر دی تھی، سات سال فرانی و وسعت رزق کے گذر گئے اور اس کے بعد شدید ترین قحط نمودار ہوا جو برابر سات سال تک رہا، کنعان بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا، آخر تنگ آکر حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر روانہ کیا، یوسف نے دیکھتے ہی انہیں پہچان لیا۔ وہ کیونکر پہچان سکتے تھے؟ اس لئے کہ یوسف جب گھر سے جدا ہوئے تھے تو سترہ برس کے لڑکے تھے اور اب وہ چالیس کے لگ بھگ تھے، دوسرے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ چند سکوں کا بکا ہوا غلام



مصر کا حکمران ہو گا۔ ان کو عزت و اکرام سے رکھا اور روانگی کے وقت ان سے کہا کہ دوسری مرتبہ آؤ تو اپنے چھوٹے بھائی کو بھی لے آنا، ورنہ کچھ نہ ملے گا۔

جب ان کی روانگی کا وقت ہوا تو آپ نے ان کا وہ سامان بھی بوریوں میں بند کر دیا جو وہ بطور معاوضہ اپنے ہمراہ لائے تھے، اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ ان کے گھر میں اس کے سوا اور کیا رکھا ہے، یہ بھی امید تھی کہ گھر جا کر جب اس سامان کو دیکھیں گے تو یہ ضرور دوسری مرتبہ بھی آنے کی کوشش کریں گے اور بھائی کو بھی ساتھ لائیں گے، نیز یہ بھی خیال تھا کہ شاید حضرت یعقوب کو اس سے کچھ پتہ مل سکے۔

### روانگی کی اجازت

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أٰبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسَلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتِلَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنُتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ فَاللَّهُ خَبِيرٌ وَخَفِيضٌ ﴿٥١﴾ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَبِيذُ آخَانًا وَنَذَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيرٌ ﴿٥٢﴾ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتِيَْنِي بِهِ إِلَّا أَن يُحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٥٣﴾

”جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے تو کہنے لگے کہ ابا ہمارے لئے غلہ کی بندش کر دی گئی ہے تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم پھر غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ یعقوب نے کہا کہ میں اس کے بارے میں تمہارا اعتبار نہیں کرتا، مگر ویسا ہی جیسا پہلے اس کے بھائی کے بارے میں کیا تھا، سو خدا ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے اور جب انہوں نے اپنا سباب کھولا تو دیکھا کہ ان کا سرمایہ ان کو واپس کر دیا گیا ہے کہنے لگے ابا! ہمیں اور کیا چاہئے، دیکھئے یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اب ہم اپنے اہل و عیال کے لیے پھر غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی نگہبانی کریں گے اور ایک بار شتر زیادہ لائیں گے، یہ غلہ تھوڑا ہے، یعقوب نے کہا کہ جب تک تم خدا کا عہد نہ کرو کہ اس کو میرے پاس لے کر آؤ گے میں اسے ہر گز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا مگر یہ کہ تم گھیر لیے جاؤ، جب انہوں نے ان سے عہد کر لیا تو یعقوب نے کہا کہ جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اس کا خدا صامن ہے۔“

مانہنی میں ما استفہا میں ہے اور نبغی کے معنی طلب کرنے کے ہیں۔ نذیر مشتق ہے میدہ سے اور میدہ کہتے ہیں کھانے کی چیز کو۔ موثقاً مصدر ہے معنی میں ثقہ کے اور ثقہ اس عہد کو کہتے ہیں جس پر اعتماد و وثوق کیا جائے، پھر یہ مصدر معنی میں مفعول کے ہے یعنی: عہدا موثقاً۔

ان لوگوں نے واپس جا کر اپنے والد سے کہا کہ اگر آپ کو پھر بھی غلہ لینا منظور ہے تو اس مرتبہ بن یامین کو ہمارے ساتھ ضرور روانہ کیجئے، مگر وہ ایک مرتبہ یوسف کا تجربہ کر چکے تھے اور اگرچہ اب انہوں نے حفاظت کا وعدہ بھی کیا، مگر آپ کو یقین نہ آیا، اس لیے کہ جب آدمی ایک دفعہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کر دے تو اس کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ کتاب

پیدائش میں ہے: ”تب اسرائیل نے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ کیوں بد سلوکی کی کہ اس مرد سے کہا کہ ہمارا ایک اور بھائی ہے، وہ بولے کہ اس مرد نے ہمیں تنگ کر کے ہمارا اور ہمارے کنبے کا حال پوچھا کہ کیا تمہارا باپ اب تک جیتا ہے، آیا تمہارا کوئی اور بھائی ہے تو ہم نے باتوں کے سر رشتے کے موافق اس سے کہا کیا ہم جانتے تھے کہ وہ ہمیں کہے گا کہ اپنے بھائی کو لے آؤ۔“ (پیدائش ۴۳: ۷۶) اس بیان کے بعد حضرت یعقوب کو ان کی بات ماننی پڑی۔

جب انہوں نے سامان کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام نقدی واپس کر دی گئی ہے، اب تو وہ اور بھی خوش ہوئے اور اصرار کا ایک اور موقع ان کے ہاتھ آگیا، بہر صورت تمام بھائیوں نے خدا کو وکیل بنا کر نچتہ وعدہ کیا کہ ہم بن یامین کو ضرور ساتھ لے کر آئیں گے مگر پھر بھی حضرت یعقوب نے ایک استثنا کر دیا کہ اگر بالفرض تم سب کے سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو پھر میں اس کی واپسی کا تم سے مطالبہ نہ کروں گا اور: اللہ علی ما نقول وکیل، کہہ کر بن یامین کو ان کے سپرد کر دیا۔

اللہ پر بھروسا

وَقَالَ يٰٓيُنٰى لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْۢ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۚ وَمَا غَفٰی عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَیُّوْثِرُ عَلَیْهِ تَوَكَّلْ ۚ وَعَلٰیہِ فَلَیْتَوَكَّلِ الْیَسْتَوَكِّلُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمۡ مَا كَانِ یُغْفِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةًۢ بِّنَفْسٍ یَّعْقُوْبُ قَضٰہَا وَاِنَّہٗ لَذُوْ عَلٰمٍ لِّمَا عٰلَنُوْہُ ۚ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۷﴾

”اور اس نے کہا اے میرے بیٹو، ایک دروازہ سے داخل نہ ہونا الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا میں تم کو اللہ کے حکم سے تو ذرا بھی بچا نہیں سکتا، حکم صرف اللہ ہی کا ہے، میں نے اس پر توکل کیا اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور جب وہ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے ان کو حکم دیا تھا داخلہ کا، یہ حکم ان کو خدا کے حکم سے نہ بچا سکتا تھا، ہاں یعقوب کے دل میں ایک بات تھی جسے اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ علم والا ہے اس لیے کہ ہم نے اسے علم دیا تھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

رواگی کے وقت حضرت یعقوب نے انہیں یہ وصیت کی کہ ایک ہی دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا، اس کے متعلق لوگوں نے مختلف توجیہات کی ہیں، مگر باوجود اس کے پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔ دراصل اس کا پورا پورا جواب کتاب پیدائش سے ملتا ہے ”اس میں ہے کہ جب یہ نوجوان ایک ہی شکل و صورت کے شہر میں داخل ہوئے تو انہیں جاسوسی کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا اور تین دن کی قید کے بعد رہا کئے گئے، ہم سب ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں، ہم سچے ہیں، تیرے غلام جاسوس نہیں۔ وہ بولا کہ نہیں بلکہ تم زمین کی بری حالت دیکھنے آئے ہو۔“ (پیدائش ۴۲: ۱۲ تا ۱۱)

اس واقعہ کا ذکر یہ لوگ اپنے والد سے کر چکے تھے، اس لیے انہوں نے شفقت پذیری کے لحاظ سے اس مرتبہ مزید حزم و احتیاط سے کام لیا اور اس مصیبت سے بچنے کی ایک تدبیر بتادی۔ ظاہر ہے کہ جب یہ لوگ مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں گے کسی کو ان کی طرف توجہ بھی نہ ہوگی اور ان کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، بہر حال یہ ایک انسانی تدبیر

تھی، ورنہ ہوتا وہی ہے جو وہ چاہتا ہے اور اسی ذات واحد پر انسان کو اعتماد توکل کرنا چاہئے۔  
 بظاہر واقعات کی رفتار الم ناک ویاس انگیز تھی، مگر یعقوب اس امر سے خوب واقف تھے کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز مخفی ہے اور کسی خاص مقصد کے لیے سب کچھ ہو رہا ہے، البتہ عام لوگ ان رموز و اسرار سے واقف نہیں ہوتے اور اس لیے جلد ہمت ہار دیتے ہیں۔

### پیالہ کی چوری

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السَّقْلِيَّةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَتَيْنَهَا الْعِذْرَانِكُمَا لَسْلِسًا قَوْمًا قَالُوا وَاقْبَلُوا عَلَيْنَاهُم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٥١﴾ قَالُوا لَنَفْقِدَ صَوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٥٢﴾

”اور جب وہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ میں تمہارا بھائی ہوں تو جو سلوک یہ کرتے رہے ہیں اس پر اب افسوس نہ کرنا، جب ان کا سامان سفر مکمل کر دیا تو اپنے بھائی کی خورجی میں گلاس رکھ دیا تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ قافلے والو تم تو چور ہو، وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے، وہ بولے بادشاہ کا پیالہ ہمیں نہیں ملتا اور جو شخص اسکو لے آئے اس کے لیے ایک بار شتر انعام اور میں اس کا ضامن ہوں۔“

اوی، جگہ دینے اور منزل میں اتارنے کو ایواء کہتے ہیں۔ سقلیہ، پانی پینے کا برتن جس سے پانی پیاجاتا ہے۔ رحل، پالان شتر، اس کی جمع ارحل اور رحال آتی ہے۔ عید اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس پر بوجھ لد اہو، یہ تعبیر سے لیا گیا ہے جس کے معنی آنا اور جانا ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ قافلہ حمیر کو عید کہتے ہیں، پھر وسعت استعمال سے ہر قافلے کو عید کہنے لگے۔ صواع، سقلیہ اور صواع کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پانی پینے کا برتن اس کی جمع صبعان آتی ہے۔

حضرت یوسف نے دو دو بھائیوں کو ایک ایک مکان میں اتارا اور بن یامین کو اپنے پاس ٹھہرایا اور اس سے کہا کہ اب تمہیں ان نالائق بھائیوں سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہئے۔ بہر حال ان لوگوں کا سامان تیار ہو گیا اور وہ روانہ ہو گئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بن یامین کی بوری میں پیالہ کار کھنا ابنائے یعقوب کی شرارت اور سازش تھی، مگر یہ حقیقت کے خلاف ہے، بات یہ تھی کہ حضرت یوسف ابھی اپنی شخصیت کو بھائیوں پر ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لیے مجبور ہو کر رخصت تو کر دیا مگر اپنے بھائی کی بوری میں اپنا چاندی کا کٹورا رکھ دیا کہ نشانی رہے، بھائیوں پر اس کا اظہار خلاف مصلحت تھا اس لیے یہ بات پوری پوشیدگی کے ساتھ عمل میں آئی۔

جب یہ قافلہ روانہ ہو گیا تو شاہی ملازموں نے دیکھا کہ پیالہ گم ہے۔ ابنائے یعقوب ہی ان مکانوں میں ٹھہرے تھے جہاں سے یہ بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا، اس لیے یہ قدرتی امر تھا کہ سب سے پہلے شبہ انہیں لوگوں پر ہو جو وہاں مقیم تھے، اس لیے انہوں نے ان کو چور چور کہہ کر پکارا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص چوری کا پتہ دے گا اسے ایک بار شتر انعام ملے گا۔

## کدنا لیلوسف

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْتُم بِفِئْتِنَا فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا لِنُؤْمِنَ ۝۵۰ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُكَ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۵۱ قَالُوا جَزَاؤُكَ مَنْ وُجِدَ فِيْ رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُكَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْظٰلِمِيْنَ ۝۵۲ فَبَدَا بِاَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَا۟ۤ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَا۟ۤ اَخِيْهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَّ اُخْذَ اَخَاكَ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۝۵۳ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مِّنْ نَّشَآءٍ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۵۴

”وہ کہنے لگے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں نہیں آئے کہ خرابی کریں اور نہ ہم چوری کیا کرتے ہیں، بولے کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو چور کی سزا، انہوں نے کہا کہ جس کی خرجی میں وہ دستیاب ہو وہی اس کا بدل قرار دیا جائے، ہم ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں، پھر مؤذن نے دوسروں کی خرجیوں کو دیکھنا شروع کیا، پھر یوسف کے بھائی کی گون میں سے اس کو نکال لیا، اسی طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی، ورنہ شاہی قانون کے مطابق وہ مشیت خدا کے سوا اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے، ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑا ہے۔“

منادی کرنے والوں سے ابنائے یعقوب نے بہت کچھ کہا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور کہا کہ اگر تم خود چور ثابت ہوئے تو کیا سزا ہوگی، سب نے مل کر کہا کہ بس چور کو پکڑ لو۔ اب شاہی چوہداروں نے ان کی تلاشی لینی شروع کی اور سب سے آخر ان کی خرجی کو دیکھا، کیونکہ بن یامین پر اس لیے شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ تو خود حضرت یوسف کے مہمان تھے، مگر جب ان کو کامیابی نہ ہوئی تو آخر کار انہوں نے بن یامین کی پوری بھی دیکھی اور اس میں وہ پیالہ مل گیا۔

حضرت یوسف کو جب اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو سمجھ گئے اس میں خدائی ہاتھ کام کر رہا ہے، اس لیے سن کر صرف اتنا کہا کہ ہم اسی کو روکیں گے جس کے پاس ہماری چیز نکلی۔

کید کے معنی مخفی اور دقیق تدبیر کے ہیں، مصری قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے اور نہ انہوں نے روکنا چاہا اگرچہ دل اس کے لیے بیقرار اور بے چین تھا، اب حکمت الہی نے ایک خفیہ اور دقیق تدبیر پیدا کر دی۔ سچ ہے سب سے بڑھ کر اللہ ہی کا علم ہے۔

## اتتم شرمکانا

اب بن یامین روک لیا گیا تو ابنائے یعقوب نے عزیز مصر کے روبرو حسب ذیل رحمت کی درخواست پیش کی۔

قَالُوا اِنْ يُّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخُوْهُ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَغَايَا يُّوسُفَ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُنْذِرْهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۝۵۵ قَالُوا يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَكَ اَبَا سَعِيْدًا كَبِيْرًا فَاُخْذَ اَحَدًا مَّكَانًاۙ اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْحٰسِنِيْنَ ۝۵۶ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنْ نَّأْخُذْ اِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مُتَاعِنًا عِنْدَكَۙ اِنَّا اِذَا الظَّالِمُوْنَ ۝۵۷

”برادران یوسف نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی، یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں مخفی رکھا اور ان پر ظاہر نہ ہونے دیا اور کہا کہ تم بڑے شریر ہو اور جو تم بیان کرتے ہو خدا اسے خوب جانتا ہے، وہ کہنے لگے کہ اے عزیز مصر اس کے والد بہت بوڑھے ہیں تو اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں، یوسف نے کہا کہ خدا اپناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا کسی اور کو پکڑ لیں، ایسا کریں تو ہم بڑے بے انصاف ہیں۔“

ابنائے یعقوب نے کہا کہ بن یامین کی چوری کوئی عجیب بات نہیں، اس لیے کہ اس کا بھائی بھی چور تھا۔ حضرت یوسف حاکم ہیں، صاحب اقتدار ہیں، ان کو اس بیہودہ بکواس پر سزا دے سکتے تھے، وہ عاجز و در ماندہ اور ان کے دست نگر ہیں، مگر اس پر بھی انہوں نے کمال حلم و بردباری سے کام لیا ہے، ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ یہ لوگ کس قدر شریر اور دیدہ دلیر ہیں کہ میرے سامنے بے حیائی کے ساتھ مجھ پر تہمت لگا رہے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ تمام تر کذب و افتراء ہے اور میرا دامن اس سے کبھی بھی آلودہ نہیں ہوا۔ جھوٹوں کا قاعدہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے سے کبھی نہیں چوکتے، تعریف کا موقع ہو تو جھوٹی تعریف بھی کر دیں گے، مذمت کا موقع ہو تو جھوٹا الزام لگا دیں گے۔ بھائی سوتیلے پن کے جوش میں اپنے بغض و حسد کو ظاہر کرنے سے نہ رک سکے، اس سے یہ بتانا تھا کہ بغض و حسد انسان کو کیسی کیسی غلط بیانیوں کا عادی بنا دیتا ہے۔

اب ان لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ بن یامین کو چھوڑ دیجئے، آپ نے ہمیشہ ہم پر احسان کیا ہے، اب اس کے بوڑھے باپ پر رحم کیجئے اس کی زندگی اس کے بغیر نہ گذر سکے گی اور اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ جرم کی سزا ملنی چاہئے تو ہم حاضر ہیں جس کو چاہئے گرفتار کر لیجئے، مگر آپ نے ان کی یہ درخواست ان الفاظ کے ساتھ نامنظور کر دی کہ چور کو چھوڑ کر بے گناہ کو پکڑنا ظلم ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

مشورہ کے مطابق بیان

فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا قَالَ كَبِيرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اٰبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوَدِّعًا مِنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِيْ يُوْسُفَ فَلَنْ اَبْرِمَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَأْذَنَ لِىْ اَبِىْ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِّىْ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۱۰ اِذْجَعُوْا اِلٰى اٰيِنِكُمْ فَقُولُوْا اَيُّا بَاۡنَا اِنَّ اِبْنَكُمْ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا اِلَّا بِسَاۡعِدِنَا وَمَا كُنَّا لِّلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝۱۱ وَسَلِّ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِزْرَ الَّتِىْ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۝۱۲ وَاقْبَلِ الصَّدَقٰتِ ۝۱۳

”جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے، سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے خدا کا عہد لیا ہے اور اس سے پہلے بھی تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو تو جب تک والد مجھے حکم نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں، یا خدا میرے لئے کوئی اور تدبیر کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، تم سب والد کے پاس واپس جاؤ اور کہو کہ ابا آپ کے عاجز ادے نے چوری کی اور ہم نے جو شہادت دی وہ اپنے علم کے

موافق دی اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے، آپ اسی بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم رہے اور اس قافلہ سے دریافت کر لیں جس میں لوٹ کر آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔“

درخواست مسترد کر دی گئی اور بن یامین کو چوری کے جرم میں روک لیا گیا۔ اب یاس و قنوط کے عالم میں انہوں نے الگ جا کر مشورہ کرنا شروع کیا کہ والد سے جا کر کیا کہیں۔ سب سے بڑے نے کہا کہ میں اب کس منہ سے اپنے باپ کے پاس جاؤں، تمہیں معلوم ہے کہ رواجی کے وقت والد نے تم سے عہد غلیظ لیا تھا، پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ ایک مرتبہ یوسف کے معاملہ میں تم انہیں دھوکا دے چکے ہو۔ میں تو اسی جگہ رہتا ہوں، البتہ تم جاؤ اور یہ عرض کرنا کہ ابا جان! آپ کے صاحبزادے نے چوری کا ارتکاب کیا اور قید کر لیا گیا۔ اس ایک جملہ میں طعن ہے، تحقیر ہے، ملامت ہے۔ اپنی بڑائی اور مغرورانہ بربریت ہے اور حد درجہ کی سنگ دلی کہ بوڑھے باپ کی آخری عمر میں بھی طعن و تشنیع سے باز نہ رہ سکے۔ ہمیں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں، اگر آپ کو ہم پر اعتماد نہ ہو تو آپ ہر جگہ ہمارے متعلق دریافت فرما سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ گاؤں جہاں ہم نے منزل کی اور قافلہ جس کے ساتھ ہم سفر میں رہے ان میں سے ہر ایک ہماری صداقت اور پاک دامنی کی شہادت دے گا۔

### صبر جمیل

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۶۷﴾  
”یعقوب نے کہا بلکہ یہ بات تم نے اپنے دل سے بنالی ہے تو صبر ہی بہتر ہے، عجب نہیں کہ خدا ان سب کو میرے پاس لے آئے بیشک وہ دانا اور حکمت والا ہے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام ایک مرتبہ یوسف کے بارے میں ان لوگوں کا تجربہ کر چکے تھے، اس لیے انہوں نے ان کا بیان سن کر وہی جواب دیا جو یوسف کو بھیڑ یا کہا جانے کی خبر سن کر کہا تھا: بیل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل، انہیں یوسف کے خواب پر یقین تھا، وہ جانتے تھے کہ اس کا پورا ہونا یقینی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس خواب کی حقیقی تعبیر سے قبل ان میں سے ایک بھائی بھی مر جائے اس لیے انہوں نے پورے وثوق سے کہا کہ ان روح فرسا و الم ناک حوادث کی حکمت تو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، مگر خدا کی ذات سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ ایک دفعہ تو ان سب سے میری ملاقات ہو کر رہے گی۔

### اعتماد علی اللہ

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا سَعْدُ عَلَى يَدَيْكَ عَيْنُكَ مِنَ الْحُزْنِ فَهِيَ كَلِيمٌ ﴿۶۸﴾ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَوُا تَذْكُرُ يَوْسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ﴿۶۹﴾ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوا بَثْنِي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷۰﴾ يُفَوِّئُ أَذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يَوْسُفَ وَآخِيهِ وَلَا تَأْتِيَسُوا مِنْ رُوحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأْتِي صُنْ مِنْ رُوحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ﴿۷۱﴾  
”اور یعقوب نے ان سے منہ پھر لیا اور کہنے لگے ہائے افسوس یوسف اور رنج و الم میں ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور وہ

رنج و غم میں چھپائے ہوئے تھا، بیٹے کہنے لگے کہ واللہ تو یوسف ہی کا ذکر کرتا رہے گا یہاں تک کہ تو مرنے کے قریب ہو جائے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائے، یعقوب نے کہا کہ میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ ہی سے کرتا ہوں اور اللہ ہی کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اے میرے بیٹو جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا پتہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

یاسفی، اسف کہتے ہیں شدتِ حزن و حسرت کو۔ کظیم، لیا گیا ہے کظم سے اس کے اصلی معنی باندھنے اور روزن پیدا کرنے کے ہیں، کظیم اس شخص کو کہتے ہیں جو غصہ کو ظاہر نہ ہونے دے، یہ فاعل کے معنی میں ہے یعنی روکنے والا۔ حرصاً رنج و غم کی وجہ سے جسم و عقل کے فاسد ہونے اور جسم کے گھل جانے کے معنی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کو زمانہ ہو گیا مگر یعقوب نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا تھا، اب جو بن یا مین کا حادثہ پیش آیا تو وہ غم بھی تازہ ہو گیا، بے اختیار زبان سے یاسفی علی یوسف نکل گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نبی اللہ کو غم تھا اس میں گھلے جاتے تھے، مگر کبھی اس رنج و اندوہ کو ظاہر نہ ہونے دیا اور یہ غم اس لیے نہ تھا کہ ان کا بیٹا گم ہو گیا ہے، بلکہ اس لئے کہ ابراہیم و اسحق کے علوم کا وارث گم گیا ہے اور اب یہ خاندان نبوت اور اس کی برکات سے محروم رہ جائے گا۔ باقی لڑکے تو سب نالائق تھے، اس لئے یہ غم ان کو اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا اور آخر اس کا اثر ان کی آنکھوں پر بھی پڑا۔

انتہائے صبر

چنانچہ اس حکم کی بنا پر ابنائے یعقوب تیسری مرتبہ پھر مصر گئے، کیونکہ قحط کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور عزیز کی خدمت میں باریاب ہو کر کہنے لگے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿۸۰﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿۸۱﴾

”جب وہ یوسف کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ عزیز ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں، آپ ہمیں پورا غلہ دیجئے اور خیرات کیجئے کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے، یوسف نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم نادانی میں پھنسے ہوئے تھے تو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

ہماری حالت سخت ناگفتہ بہ ہے، سب طرف سے ہمیں تکلیفوں اور مصیبتوں نے گھیر رکھا ہے، ہمیں غلہ چاہئے مگر اس کے معاوضہ میں ہم جو کچھ لائے ہیں وہ نہایت ہی حقیر اور ناقابلِ التفات چیز ہے، ہماری نظر تو آپ کی بخشش و کرم اور جو دوعطا پر ہے۔ یوسف نے یہ حالات سنے تو بے چین ہو گئے، ان کا بیان نہ صبر لبریز ہو گیا، اس میں ایک قطرہ کی بھی گنجائش باقی نہ رہی، ان سے نہ رہا گیا اور بے تابانہ انہوں نے کہا، تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم اپنی جہالت و لاعلمی کی وجہ سے یوسف اور بن یا مین کے ساتھ کیا کچھ کر چکے ہو؟



## استعجاب و حیرت

قَالُوا عِرَّاكَ لَکُنْتَ یُوسُفَ قَالَ اَنَا یُوسُفُ وَهَٰذَا اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اِنَّهُ مَن یَّتَّقِ وَیَصْدِرَ قَانَ اللّٰهُ لَا یُضِیْعُ  
اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

”وہ بولے کیا تم ہی یوسف ہو، انہوں نے کہا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے جو شخص خدا سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو خدا انکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

عائدات میں استفہام تقریری ہے اور یہ سوال تمام تر تعجب و حیرت اور استعجاب و استغراب سے پُر ہے۔ غور کیجئے یہ لوگ کس طرح اس نتیجہ پر پہنچ گئے اور انہوں نے یوسف کو شناخت کر لیا۔  
(۱)۔ جب حضرت یعقوب کو ان لوگوں نے بن یا مین کی چوری کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا: عسی اللہ ان یا تینی بہم جعیلاً، ”عجب نہیں کہ خدا ان سب کو میرے پاس لے آئے۔“

(۲)۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا: اذہبوا فافتحوا من یوسف واخیہ، ”جاؤ مصر ہی میں ان دونوں کو تلاش کرو۔“

(۳)۔ مصری اس زمانہ میں ہندوؤں کی طرح چھوت چھات کے سخت پابند تھے اور عبریوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ”انہوں نے اس کے لئے الگ اور ان کے لئے جدا اور مصریوں کے لئے جو ان کے ساتھ کھاتے تھے علیحدہ چنا، اس لئے کہ مصر کے لوگ عبرانیوں کے ساتھ کھانا کھا نہیں سکتے، مصری اسے مکروہ جانتے ہیں۔“ (پیدائش ۴۳: ۳۳) مگر ابنائے یعقوب نے بار بار اس امر کا تجربہ کر لیا تھا کہ عزیز مصر کے کریمانہ اخلاق ان مصریوں سے بدرجہا افضل و احسن ہیں اور ان کے ساتھ نہایت ہی شرافت سے پیش آتے ہیں۔

(۴)۔ وہ نہ صرف یوسف ہی سے واقف ہے بلکہ اس کے بھائی کو بھی جانتا ہے۔

(۵)۔ اذاتتم جاہلون کہہ کر خود ان کی طرف سے معذرت کر رہا ہے۔

یہ مختلف دلائل ہیں جو ہم نے صرف قارئین کرام کے اطمینان کے لئے لکھ دیئے ہیں، ورنہ اس سوال میں جو لطف ہے اس سے وہی لوگ حظ وافر حاصل کر سکتے ہیں جنہیں عربیت کا ذوق ہے۔

بہر حال آپ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ بے شک میں ہی وہ مظلوم و ستم رسیدہ یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، دیکھو مصیبتوں پر مصیبتیں اور تکلیفوں پر تکلیفیں آئیں مگر خدا کے لطف و احسان کی طرف نگاہ کرو کہ وہی تکالیف ہمارے لیے موجب راحت و آرام بن گئیں اور ہمارے مراتب و درجات بلند ہوئے۔ یاد رکھو جس دل میں عظمت و جلال ربانی محکم و جاگیر ہو جاتا ہے، جو اپنے دل کو خواہشات نفسانی سے روکتا ہے، جو تکلیف و مصیبت کے وقت جبل استقامت و استقلال بن جاتا ہے اور جو اپنے عقائد صالحہ کو خارجی اثرات و ضلالت سے محفوظ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور اس کی نصرت و یاری کرتا ہے اور اسے ہر قسم کی فضیلت و برتری نوازش فرماتا ہے۔



## حجتہ اللہ البالغہ

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ اَتَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ۝ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْنُكَ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ ۝ اِذْهَبُوْا بِبَقِيَّةِ مَوْصٰى هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اِيْنِ يَّاتِ بِصِدْقًا وَّاَتُوْنِ بِاٰهْلِكُمْ اٰجْمَعِيْنَ ۝

”وہ بولے، خدا کی قسم، خدا نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطا کار تھے، یوسف نے کہا کہ آج کے دن تم پر کچھ عتاب نہیں ہے، خدا تم کو معاف کرے اور وہ بہت رحم کرنے والا ہے، یہ میری قمیص لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرہ پر ڈال دو، وہ دیکھنے لگیں گے اور تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔“

پہلے امر اؤ العزیز اور تمام عورتوں کو عین دربار میں عصمت یوسفی کا اقرار کرنا پڑا تھا، اب برادران یوسف کو علی الاعلان اپنے قصور کا اعتراف کرنا پڑا، بے شک خدا کا وہ وعدہ پورا ہو کر رہا جو اس نے کنوئیں میں حضرت یوسف کے ساتھ کیا تھا، لَتَتَّبِعْنَهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا کہ ”تم ان کو اس سلوک سے آگاہ کرو گے۔“

جس وقت ان لوگوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو آپ نے ان کے اطمینان کے لئے فرمایا کہ تم ان ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے پریشان خاطر مت ہو، میں تم پر کوئی ملامت نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ بھی درگزر کرے گا، اب جس طرح تم سے ہو سکے، میرا قمیص لے کر کنعان واپس جاؤ، اس سے والد محترم کو مسرت و شادمانی ہوگی، ان کا تمام حزن و ملال جاتا رہے گا، ان کی آنکھوں میں جو ضعف آگیا ہے، اس کے دیکھتے ہی سب دور ہو جائے گا اور پھر سب مل کر یہاں چلے آؤ۔

## کرشمہ ہائے قدرت

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمُ اِنِّیْ لَاجِدٌ رِّیْحٍ یُّوسُفَ لَوْلَا اَنْ تَفْعَدُوْنَ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلٍکَ الْقَدِيْمِ ۝ فَلَمَّا اَنْ جَاءَ النَّبِیُّدُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهِ فَاَرْتَدَّ بِصِدْقٍ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قَالُوْا یٰۤاَبَا نَا اَسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ۝ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

”اور جب قافلہ مصر سے چلا تو اس کے باپ نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہرہ کا ہوانہ سمجھو، انہوں نے کہا خدا کی قسم تو اپنی پرانی غلطی میں ہے پھر جب خوش خبری دینے والا آپہنچا تو اس نے قمیص کو اس کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ بصیر ہو گئے کہا کیا میں تمہیں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، بیٹوں نے کہا کہ ابا ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی مغفرت مانگیں، بے شک ہم خطا کار تھے، انہوں نے کہا کہ میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس قافلہ کا مصر سے روانہ ہونا تھا کہ بوئے یوسفی نے حضرت یعقوب کے دماغ کو معطر کر دیا اور وحی الہی نے انہیں اطلاع دی کہ جدائی کے دن ختم ہو نیوالے ہیں اور وصال کی خوشخبری جلد پہنچنے والی ہے۔ علم النفس کا ایک معمولی طالب علم بھی اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ اگر دو شخصوں کے تعلقات موذت پاک و طاہر ہوں تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو حالت

ایک پر گذرتی ہے، باوجود بعد مسافت کے دوسرا بھی اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، روزمرہ کے واقعات ہیں جس قدر طبیعت میں صفائی اور پاکیزگی ہوگی، اسی قدر یہ چیز زیادہ نمایاں ہوگی۔ تمہارا ایک عزیز بیمار ہے، مدت سے اس کا کوئی خط نہیں آیا، یکایک ایک روز تم کہتے ہو کہ آج فلاں شخص کا خط آئے گا، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکیہ آتا ہے اور واقعی اسی دوست کا خط تمہارے حوالے کرتا ہے۔

مدتہائے دراز کی مجبوری و فراق کے بعد حضرت یعقوب پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی اور بے اختیار ہو کر ان لوگوں سے کہا جو وہاں موجود تھے کہ ہونہ ہو یہ تو بوائے یوسفی ہے جو مصر کی طرف سے آرہی ہے، مگر انہوں نے یہی کہا کہ تم تو بوڑھے ہونے کی وجہ سے اس قسم کی بہکی باتیں کرتے ہو۔ آخر کار قافلہ آگیا اور اس نے پیرا ہن یوسفی آپ کے سامنے ڈال دیا۔ اسکو دیکھتے ہی آپ کا تمام حزن و غم کافور ہو گیا اور کمال فرحت و سرور کی وجہ سے آنکھیں بھی روشن ہو گئیں۔ بعض امراض ایسے ہیں کہ جب وہ ایک خاص حالت تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے لیے کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ مریض کو بالکل ناگہانی مسرت و شادمانی کی خبریں سنائی جائیں کہ اسی ایک صورت سے مرض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ حضرت یعقوب کی حالت اسی قسم کی تھی۔ اب جو یکایک یوسف کے زندہ ہونے، ملک مصر کا بادشاہ بننے اور تقویٰ و طہارت سے زندگی بسر کرنے کی مسرت اندوز خبر سنی تو ان کا سب غم جاتا رہا اور بالکل تندرست ہو گئے۔

### عجائبات قدرت

ایک وقت تھا کہ یوسف کنوئیں میں ہیں، کنعان سے زیادہ فاصلہ نہیں، مگر یعقوب کو ذرہ برابر بھی خبر نہ ہوئی کہ اس پر کیا گذر رہی ہے اور آج ایسی حالت میں ان کی خبر گھر والوں کو سنارہے ہیں، جب کہ دونوں کے درمیان کئی منزلوں کی مسافت ہے۔ شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند  
کہ اے روشن گہر پیر خردمند!  
زمصرش بوے پیرا ہن شنیدی  
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی!  
گفت احوال ما برق جہان است  
دے پیدا و دیگر دم نہان است  
گہے بر طارے اعلیٰ نشینیم  
گہے بر پشت پائے خود نہ سینیم

ابنائے یعقوب نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور والد سے معافی خواہ ہوئے۔ اگرچہ ان لوگوں نے اپنی شرارتوں سے

آپ کی زندگی تلخ کر دی تھی مگر آخر ایک ہی باپ کی اولاد تھے ان سے اگر بدلہ لیتے تو پھر بھی آپ ہی کو تکلیف پہنچتی۔ آپ نے فرمایا کہ خاطر جمع رکھو۔ انشاء اللہ میں تمہارے لیے صمیم قلب سے دعا کروں گا، ملتوی اس لئے کر دیا کہ بھائیوں نے جس قدر ظلم کیا تھا وہ حضرت یوسف کی ذات خاص پر کیا تھا۔

## اقسام قیص

اس سورہ مبارکہ میں تین قیصوں کا ذکر آیا ہے:

(الف)۔ جس کے ذریعہ سے حضرت یعقوب کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ یوسف کو بھیڑ یا کھا گیا۔

(ب)۔ جب امراۃ العزیز نے اپنے خاوند کے روبرو یوسف پر الزام لگایا تو اسی قیص سے ان کی بریت ہوئی۔

(ج)۔ قیص ہی نے والد کو یوسف کی زندگی اور اقبال مندی کا یقین دلایا۔ یہ تینوں قیص حضرت یوسف علیہ السلام کے

تھے۔ اب اسی ذیل میں دو اور قیص کا ذکر سن لیجئے۔

(د)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک قیص پہنے ہوئے ہیں اور لمبا اتنا ہے کہ چلتے وقت زمین پر گھسیتا

ہو اجاتا ہے۔ آپ نے یہ خواب دربار رسالت میں عرض کیا اور اس کی تعبیر چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تدین اور تقویٰ نے تمہارے تمام جسم کو ڈھانپ لیا ہے تو لباس التقویٰ ۱ ذلک خیر

(الاعراف ۲۶) ”اور سب سے اچھا لباس پرہیزگاری کا ہے۔“

(ه)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے فرمایا: ان الله سيقبض قبضا وانك لتصلاس على خلقه، ”اللہ تعالیٰ تمہیں

ایک قیص پہنائے گا، لوگ اس کے اتارنے کی کوشش کریں گے، دیکھنا اس کو الگ نہ کر دینا۔“ یہاں آپ نے قیص

سے مراد خلافت اور حکومت لی۔

## قد جعلها ربی حقا

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مَصْرًا إِنَّ شَاءَ اللَّهِ أَمْنٌ ۖ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ

وَحَرَّوَالَهُ سُجْدًا وَقَالَ يَا بَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ

السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ

الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝

”جب یہ سب لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا مصر میں داخل ہو جائیے خدا نے

چاہا تو وہاں امن سے رہنے گا اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدے میں گر پڑے، اس وقت

یوسف نے کہا، اباجان یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچا کر دیا اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب مجھ کو جیل سے نکالا اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا، آپ کو بیابان سے یہاں لایا، بیشک میرا پروردگار ان امور کا دانہ ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے وہ دانا اور حکمت والا ہے۔“

حضرت یوسف کی والدہ کا انتقال تو اسی وقت ہو گیا تھا جب بن یامین کی پیدائش کے بعد نفاس ہی میں تھیں اس کے بعد حضرت یعقوب نے ان کی خالہ سے نکاح کر لیا تھا، یہاں ابو یہ سے مراد یعقوب اور یوسف کی خالہ مراد ہیں۔

یعقوب اپنے تمام خاندان کو لے کر مصر میں داخل ہوئے، یوسف نے انچیس شہر میں ان کا نہایت ہی شاندار استقبال کیا، کیونکہ اسی شہر میں سالانہ جشن ہوا کرتے تھے اور ان کے اعزاز میں دربار منعقد کیا۔ دربار میں حضرت یوسف آئے تو تمام درباریوں نے مصر کے دستور کے مطابق تعظیم دی اور سجدے میں گر پڑے، ان کے والدین اور بھائیوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی سجدے میں جھک گئے اور درباریوں کا ساتھ دیا۔

یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ دنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ حکمرانوں اور پیشواؤں کے آگے سجدے کرتے ہیں اور اسے تعظیم و احترام کی خاص علامت سمجھتے ہیں۔ مصر، بابل، ایران، ہندوستان اور سلاطین بنی اسرائیل سب کے یہاں یہ طریقہ رائج تھا، مگر اسلام نے اس کو یکسر روک دیا ہے۔ یہ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے، کوئی دوسری ہستی اس میں شریک نہیں ہو سکتی، یہاں صرف گذشتہ واقعہ کی حکایت ہے اور بس۔

یوسف نے مزید اکرام و احترام کے اظہار کے طور پر اپنے ماں باپ کو بلند مسند پر جگہ دی اور اپنی سابقہ زندگی کے حالات بیان کرنے شروع کئے، مگر آپ نے اس دلاویز و لطیف طریق سے ان کا تذکرہ کیا کہ واقعات بھی سب آگئے اور کسی کو ناگوار بھی نہ گذرا۔

یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کنویں میں گرنا مصر میں آنے کا سبب ہو گا۔

قید میں جانا مصر کے تخت و تاج کے مالک بن جانے کا ذریعہ ہو گا۔

اور قحط کا پڑنا یعقوب اور اولاد یعقوب کے داخلہ مصر کا باعث بن جائے گا۔

یہ سب اس خدائے قدوس کی کرشمہ سازیاں ہیں، جس نے ہر مرتبہ مجھ پر احسان فرمایا اور ہر تکلیف کو راحت سے بدل دیا۔ بیشک وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کی باریکیوں کو اس کے سوا کون جان سکتا ہے، لوگوں کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے مگر وہ باطن اور حقیقت کو نہیں دیکھتے: یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم ۷) ”یہ دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔“

یوسف کی دعا

خواب کی تعبیر پوری ہو گئی، تدبیر الہی نے اپنا کام کر لیا اور ان بی لطیف لمایاں کی کرشمہ سازیوں کو سب نے برائے العین مشاہدہ کر لیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے خاتمہ بالخیر کی دعا کرتے ہیں اور اسی پر یہ عبرت اندوز اور بصیرت افروز

قصہ ختم ہو جائے گا۔

رَبِّ قَدْ آتَيْنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيّ الدُّنْيَا  
وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۰﴾

”میرے رب! تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور مجھے تاویل احادیث کی تعلیم دی، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے تو مجھے مسلمان ہی ماریو اور نیکیوں ہی کے ساتھ ملا دیجیو۔“

اے میرے خداوند! تو نے مجھے ہر قسم کی روحانی و جسمانی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، تو ہی زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور دنیا و آخرت میں صرف تیری ہی ذات میری ولی و کارساز ہے، تو مجھے بقیہ زندگی میں بھی اپنا ہی فرمانبردار رکھیو۔ جب مروں تو اسی حالت اسلام پر اور یہ کہ مجھے میرے آبائے کرام ابراہیم و اسحق اور یعقوب کے ساتھ ملا دیجیو۔

### پند و موعظت

یہاں پر یہ قصہ بالکل ختم ہو گیا، آیاتِ مابقی میں عبرت و بصیرت کے جو مخفی خزان ہیں وہ نذر ناظرین کرام ہیں:  
(۱)۔ اگر تمہارے جمیعت تمہارے دشمنوں کی نظر میں کھٹکتی ہے تو بظاہر الگ الگ ہو جاؤ اور اس طرح اپنے پیش نظر مقصد کے لئے مصروف عمل ہو جاؤ۔ نوادخلوا من ابواب متفرقة، ”اور الگ الگ دروازے سے داخل ہونا۔“

(۲)۔ اسباب و وسائلِ دنیوی سے کام لینے کے باوجود تمہارا اعتماد تو کل اللہ کی ذات پر ہو۔ وعلیہ فلیتوکل المتوکلون، ”بھروسہ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ فقط اللہ پر بھروسہ کریں۔“

(۳)۔ قحط کے زمانہ میں جو افسر رسد کی تقسیم پر مقرر ہو، اسے ہر شخص کے لئے اتنی مقدار مقرر کر لینی چاہئے کہ اس کو آخر تک نبھاسکے۔ ولین جلاء بہ حمل بعید، ”اور جو اس کو لائے گا اسے بارشتر انعام ملے گا۔“

(۴)۔ رنج و غم انسانوں پر ظاہر نہ کرو، بلکہ اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے: انما اشکو ابشی وحنی الی اللہ، ”میں تو اللہ ہی کے حضور میں فریاد کرتا ہوں۔“

(۵)۔ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ ولا تالیسوا من روح اللہ۔

(۶)۔ جب ایک مسلمان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے دشمنوں کو عفو عام دے دے: لا تشیبه علیکم الیوم: ”آج تم پر کوئی عتاب نہیں۔“

(۷)۔ حسد سے پرہیز کرنا ضروری ہے، برادرانِ یوسف کے انجام پر نظر ڈالو: خذوا له سجدا، ”سب اسکے آگے جھک گئے۔“

(۸)۔ جب مصیبتوں میں مبتلا ہو تو یوسف کی تکالیف کو مع ان کے نتائج کے یاد کرو۔

(۹)۔ اگر غلامی و محکومی میں مبتلا ہو تو اس پر قانع نہ ہو جاؤ، اللہ پر اعتماد رکھو، جس نے یوسف کو غلامی سے نکال کر تختِ مصر کا مالک بنادیا، وہ تمہیں بھی یہ عزت و سرفرازی نوازش فرما سکتا ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

## فصل دوم

### رسول اللہ ﷺ

الہام

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ يُوحِيهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اُجْمِعُوا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْكُرُوْنَ ﴿۳۱﴾

”یہ اخبار غیب میں سے ہیں، جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور جب برادران یوسف نے اپنی بات پر اتفاق کیا تھا اور وہ فریب کر رہے تھے تو تم ان کے پاس نہ تھے۔“

جو واقعات گذشتہ آیتوں میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو ان کا کوئی علم نہ تھا، آپ سے دو ہزار سال پہلے کے واقعات ہیں۔ گذشتہ واقعات و حوادث کے علم و سماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں، ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے پاس موجود نہیں اور اگر بالفرض آپ اس وقت وہاں موجود ہوتے جب یوسف کے بھائی ان ناشائستہ حرکات کا مشورہ کرتے تھے اور آپ ان تمام باتوں سے واقف ہوتے تو پھر بھی ناممکن تھا کہ آپ اپنی زندگی کو ان واقعات و حوادث کے مطابق بنا لیتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام کے آپ کو ان امور کی اطلاع دی، آپ کی حیات طیبہ میں وہی پیش آیا جو یوسف کے ساتھ ہوا، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ

حضرت یوسف علیہ السلام

(۱)۔ آپ کی روحانی زندگی کی ابتدا خواب سے ہوئی۔ (۱)۔ آپ ابتدا میں خواب ہی دیکھا کرتے تھے۔

بخاری میں ہے: اول ما بدی بہ رسول اللہ ﷺ من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم فكان لا يرى رؤيا الا جاءت مثل فلق الصبح، ”وحی کی جو ابتدا ہوئی تو ابتدا میں آپ روئے صالحہ ہی دیکھا کرتے تھے اور جو کچھ دیکھتے وہی وقوع میں آتا۔“

(۲)۔ خواب سن کر حضرت یعقوب کو خیال آیا کہ (۲)۔ ورقہ بن نوفل نے وحی کی خبر سن کر کہا: یات برادران یوسف کے دلوں میں حسد پیدا ہو گا۔

اذیخا جک قومک، ”جو شخص بھی اس الہام کو لاتا ہے جس کو آپ پیش کر رہے ہیں اس کو ضرور تکلیف پہنچتی ہے، کاش میں اس وقت زندہ ہوں جب تمہاری قوم تمہیں یہاں سے نکال دے گی۔“

(۳)۔ نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کی امت کو بھی یہ عزت نوازش کی گئی: **وَ جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ** (الحج ۷۸) ”اور خدا کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے۔“

(۳)۔ آپ کو درجہ اجتناب نصیب ہو گا۔

(۴)۔ آپ عرب و عجم کو عقل و خرد کی تعلیم دیں گے: **وَّ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ (الجمعة ۲)** ”اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔“

(۴)۔ آپ کو تاویل احادیث کی تعلیم دی جائے گی۔

(۵)۔ سورۃ انفال میں ہے: **وَ اِذْ يَبْتَغِيكَ الْاَزْدِيُّ كَفَرًا** ”جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں یا وطن سے نکال دیں۔“

(۵)۔ بھائیوں نے قتل اور کنویں میں گرانے کا مشورہ کیا۔

(۶)۔ قریش کے یہ دس بطون تھے جو سب سے زیادہ آپ کی مخالفت کرتے تھے اور جو سورۃ یوسف کے نزول کے بعد یکے بعد دیگرے مسلمان ہو گئے، بنو مخزوم، بنو عدی، بنو تیم، بنو اسد، بنو امیہ، بنو سہم، بنو جحج، بنو عبد الدار، بنو کعب اور بنو نوفل۔

(۶)۔ اس مشورہ میں دس بھائی شریک تھے۔

(۷)۔ مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت کفار قریش کے خوف سے آپ تین دن تک غار ثور میں مخفی رہے۔

(۷)۔ کنوئیں میں تین دن تک رہے۔

(۸)۔ اوس و خزرج کے قافلہ نے عقبہ میں آپ سے ملاقات کی تو اللہ کا شکر ادا کیا۔

(۸)۔ قافلہ والے دیکھ کر خوش ہوئے۔

(۹)۔ رؤساء قریش نے حسین بیوی، دولت اور حکومت کا لالچ دیا۔

(۹)۔ امر آة العزیز اور زنانِ مصر نے ہر طرح کا لالچ دیا۔

(۱۰)۔ کئی سال قید میں رہے۔  
(۱۰) شعب ابی طالب میں آپ کئی سال قید رہے، موسم حج میں گھاٹی سے نکل کر توحید کا اعلان فرماتے۔

(۱۱)۔ مصر کی حکومت ملی۔  
(۱۱)۔ تمام حجاز کی حکومت ملی۔

(۱۲)۔ ابنائے یعقوب قحط میں مبتلا ہوئے۔  
(۱۲)۔ بعد از ہجرت قریش پر قحط کی وبا نازل ہوئی۔

(۱۳)۔ رحم کی درخواست لے کر آپ کے پاس گئے۔  
(۱۳)۔ ابوسفیان نے تمام قریش کی طرف سے درخواست پیش کی۔

(۱۴)۔ مصر کا غلہ بھائیوں کو دیا۔  
(۱۴)۔ مکہ کی منڈی مجدد تھی، جس کے رئیس ثمامہ بن اثمال تھے، آپ نے انہیں حکم دیا اور انہوں نے مکہ والوں کے لئے غلہ روانہ کیا۔

(۱۵)۔ لا تثیب علیکم الیوم فرمایا۔  
(۱۵)۔ فتح مکہ کے روز آپ نے تمام قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا اور لا تثیب علیکم الیوم کہہ کر سب کو عفو عام عطا فرمایا۔

(۱۶)۔ تمام خاندان مصر میں آکر آباد ہو گیا۔  
(۱۶)۔ قریش اور تمام قبائل عدنان آپ کی زندگی ہی میں مدینہ آکر آباد ہو گئے۔

(۱۷)۔ یعقوب نے آپ کا بے انتہا احترام کیا۔  
(۱۷)۔ آپ کے چچا عباس مسلمان ہو گئے: العم صنوا بیہ۔

(۱۸)۔ ہجرت جاہ و جلال کا سبب ثابت ہوئی۔  
(۱۸)۔ مدینہ کی تشریف آوری کے نتائج دنیا کے سامنے ہیں۔

یہ چند باتیں ہیں جو غور و فکر کے بعد سپرد قلم کی گئی ہیں، جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی درجہ مشابہت اور مماثلت ہے، اگر آپ بھی دونوں کی زندگیوں کا درس و مطالعہ کریں تو ان کے علاوہ اور بھی چیزیں نکل سکتی ہیں: فوق کل ذی علم علیم۔

انبیاء کرام کا طریق عمل

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۳۰﴾ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾ وَكَانَ مِنْ آيَةِ اللَّهِ عَلَى الْبَشَرِ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُنْزِلُ عَلَيْهَا رِيحًا مُغْرِضُونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا يَوْمُ مِنْ أَكْثَرُهُمْ بِآلِهِ إِلَّا هُمْ مُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾ أَفَأَمِنُوا



أَن تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۷۰﴾

”اور بہت سے آدمی تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں اور تم ان سے اس کا کچھ صلہ بھی نہیں مانگتے، یہ قرآن اور کچھ نہیں تمام عالم کے لیے نصیحت ہے اور آسمان وزمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گذرتے ہیں اور ان سے اعراض کرتے ہیں اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں، کیا یہ اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے یا ان پر ناگہانی قیامت آجائے اور انہیں خبر نہ ہو۔“

رسول اللہ ﷺ کی شان تو یہ تھی کہ آپ ہر شخص کو مسلمان دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کوئی انکار کرتا تو آپ کو اس سے تکلیف ہوتی، یہاں تک کہ لسان الہی کو اس پر تنبیہ کرنی پڑی: لَعَلَّكَ بَاحِثٌ خَفِيٍّ لِّلْمُؤْمِنِينَ (الشعراء ۳) ”شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔“ ایک حدیث میں آتا ہے: اتم تنہا فتون کتہافۃ الفراشة علی النار وانا اخذ بکم الحجو، ”جس طرح پتنگے آگ میں گرتے ہیں اس طرح تم کرتے تھے اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر نکال رہا تھا کہ آگ سے بچ جاؤ۔“ اب جو لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے شاید ان کو یہ ڈر ہو کہ آپ طامع اور حریص ہیں۔

یاد رکھو، اس باب میں انبیاء کرام کا ایک ہی طرز عمل رہا ہے، وہ یہ کہ ان میں سے ایک بھی اجرت کا طالب نہیں ہوتا۔ دیکھئے نوح علیہ السلام فرماتے ہیں: وَيَقُولُوا لَا آسَأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَا لَا إِن آجُرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ (ہود ۲۹) ”اور اے بھائیو! میں اس نعمت کے بدلے تم سے مال و زر کا خواہاں نہیں ہوں، میرا صلہ تو خدا کے ذمے ہے۔“ ہود کا بھی یہ ارشاد ہے: يَقُولُوا لَا آسَأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِن آجُرِي إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي (ہود ۵۱) ”بھائیو میں اس وعظ کا تم سے کچھ صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔“ اور قرآن پر تو کوئی بھی معاوضہ طلب نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تمام عالم کے لئے ذکر اور نصیحت ہے۔

لوگوں کے سامنے روزمرہ ہزار ہا نشانیاں آتی ہیں، مگر وہ ان سے عبرت اندوز نہیں ہوتے، اگر ارباب عقل و خدا اس قصہ یوسف ہی میں غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ایک امت کے برباد اور دوسری کے زندہ ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ یہ تو عام لوگوں کا حال ہے، پھر جو ایماندار ہوتے ہیں ان کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ شرک ان میں ضرور پایا جاتا ہے، خود مسلمانوں میں اس کے آثار قبر اور پیر پرستی کی صورت میں ملتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو اس امر کا خوف نہیں رہا کہ کہیں یکا یک ان پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔

انجام

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَنَ اللَّهُ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۷۱﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِیْ إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ أَلَمْ يَنْظُرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَكَ آذُنُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ قَدْ كَذَّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرٌ مِّنَّا فَتُحْيَىٰ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا يَذُوبُ بِأَسْنَانِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٥٩﴾

”اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو میرا طریق تو یہ ہے کہ سب کو خدا کی طرف بلاتا ہوں، میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں وہ ہم سب دین کے ایک معقول رستے پر ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شریک کرنے والوں میں نہیں ہوں اور ہم نے تم سے پہلے بھی بیستوں کے رہنے والے آدمی ہی بھیجے تھے کہ ہم ان پر وحی نازل کیا کرتے تھے، تو کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گئے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا اور کچھ شک نہیں کہ جو لوگ پرہیز گار ہیں ان کے لئے عاقبت کا گھر بہتر ہے، تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے، یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے اور ان کو ایسا واہمہ گذرا کہ ہمارے ساتھ وعدہ خلافی تو نہیں کی گئی تو عین وقت پر ہماری مدد ان کے پاس آپہنچی، تو جس کو ہم نے چاہا سچا دیا اور گنہگار لوگوں سے تو ہمارا عذاب نل ہی نہیں سکتا۔“

گزشتہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو ایمان کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں، مگر اس باب میں رسول اللہ اور آپ کے متبعین کا طرز عمل بالکل صاف ہے۔ عیسائی، یہود اور ہندو باوجود ادعائے توحید مشرکانہ امور میں مبتلا ہیں، لیکن آپ اور آپ کی جماعت دنیا کو علی وجہ البصیرۃ صحیح توحید کی طرف بلاتی ہے اور صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ خدا کی ذات ان تمام نقائص و ذمائم سے پاک ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اگر یہ لوگ رسول کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ وہ انسان ہے تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ آج تک سوائے انسانوں کے اور کسی کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی کیونکہ فرشتہ اور جن غیر جنس ہونے کی وجہ سے نمونہ نہیں بن سکتے۔ انکار کرنے والوں کو اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑا کر اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ اس صورت میں وہ ضرور عذاب میں مبتلا ہوں گے اور کامیابی صرف ارباب صلاح و تقویٰ ہی کو نصیب ہوگی۔

رسول کا فرض صرف تبلیغ و دعوت ہے، وہ اس میں اپنی انتہائی سعی و کوشش صرف کر دیتے ہیں، جب اس پر بھی اللہ کی امداد نہیں آتی تو انہیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم نے خدا کے وعدہ نصرت کو غلط تو نہیں سمجھ لیا، کیونکہ وہ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ پس جب خدا کی راہ میں قربانیاں کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو اس وقت قدوس حق نوا کی اعانت نازل ہوتی ہے، جو مجرموں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

ہدایت و رحمت

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَنَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّلْقَوْمِ الْمُتَّقِينَ ﴿٦٠﴾

”اس میں شک نہیں کہ عقل والوں کے لئے ان لوگوں کے حالات میں بڑی عبرت ہے، یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات تو

ہے نہیں بلکہ جو آسمانی کتابیں اس کے نزول سے پہلے موجود ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت اور رحمت ہے۔“

قرآن حکیم اہم سابقہ اور انبیائے کرام کے قصص و اخبار بیان کرتا ہے تو اس کی غرض افسانہ گوئی نہیں، جیسا کہ تورات کا طریق ہے، بلکہ مقصود عبرت و بصیرت اور پسند و موعظت ہے، استدلال و استشہاد ہے اور یہ کہ آئندہ کے لیے ان سے اصول و کلیات اخذ کریں۔ اگر تم اس کتاب عزیز میں درس و فکر کرو گے تو تمہیں حسب ذیل چیزیں ملیں گی:

(۱) - عہدۃ اولی الالباب، ارباب عقل و بصیرت اس کو مستقبل کے لئے شمع ہدایت بنا سکتے ہیں۔

(۲) - تصدیق الذی بین یدیہ : دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کے بزرگوں کو برا بھلا کہتی اور ان کی کتابوں کو غلط قرار دیتی ہیں، مگر قرآن تمام انبیائے سابقین اور صحائف و اسفار آسمانی پر ایمان لانا ضروری قرار دیتا ہے، یہی ایک کتاب ہے جو تمام قوموں کو ایک میدان میں جمع کر سکتی ہے اور جس سے عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔

(۳) - تفصیل کل شیء، ”دنیا اور آخرت کی زندگی کے ہر شعبہ کی تفصیل ہے۔“ جن مسائل کو کتب سابقہ نے اجمالاً بیان کیا تھا قرآن ان کی پوری تفصیل کرتا ہے اور اس طرح الگ الگ کر کے بیان کرتا ہے کہ شبہ و التباس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

(۴) - ہدٰی، نزول قرآن سے قبل ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا، وید ہندوؤں کے لئے، ژند و دستا مجوسیوں کے لئے، تورات یہودیوں کے لئے اور انجیل صرف نصاریٰ کے واسطے تھی، مگر قرآن کاروئے سخن عالمگیر ہے اور اس کے سامنے تمام اقوام و ملل برابر ہیں، اسود و احمر میں کوئی تفریق نہیں، وہ ہر انسان کو کامیابی و سعادت کی منزلوں تک پہنچاتا اور ہر طرح کی گمراہیوں سے بچاتا ہے۔

(۵) - رحمة، تمام قوموں میں کسی نہ کسی قسم کی باہمی تفریق موجود ہے، اچھوت ناپاک ہے اور کبھی برہمن کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا، قرآن نے بزرگی کا صرف ایک معیار قرار دیا ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیكُمْ (الحجرات ۱۳) ”بے شک اللہ کے نزدیک بڑی عزت اسی کو ہے جس کو بہت بڑا ادب ہو۔“ اور ترقی کا راستہ سب کے لئے کھول دیا ہے۔ اب جو شخص اس کتاب عزیز سے تمسک و اعتصام کرے گا، اس کو اللہ کی رحمت ڈھانپ لے گی اور ہر جگہ کامیاب ہو گا۔

بسم الله الرحمن الرحيم  
الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

## ذکری: پارہ عم کی تفسیر

مکی اور مدنی تقسیم

مفسرین کرام نے قرآن حکیم کی سورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک کانام مکی ہے اور دوسرے کو مدنی کہتے ہیں، دونوں حصوں کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

مکی سورتیں

- (۱)۔ ان میں زیادہ تر جذبات کا لحاظ کیا گیا ہے۔
- (۲)۔ دعوت و تبلیغ اسلام پر زور ہے، طرز خطاب میں بھی نرمی اور ملاطفت پیش نظر ہے اور جہاد کا ذکر نہیں۔
- (۳)۔ فواصل کا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔
- (۴)۔ الفاظ پر عظمت اور شان دار ہیں۔
- (۵)۔ توحید، قیامت اور عبرت و موعظت پر مشتمل ہیں۔
- (۶)۔ اعمال و عبادات کا مطالبہ بہت کم ہے، زیادہ تر عقائد سے بحث کی گئی ہے۔
- (۷)۔ یہود و نصاریٰ سے کوئی جھگڑا نہیں۔
- (۸)۔ چھوٹی چھوٹی آیتیں اور چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔

مدنی سورتیں

- (۱)۔ خیالات میں گہرائی اور عمق ہے۔
- (۲)۔ نشر و اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ جہاد کا بھی حکم ہے۔
- (۳)۔ فواصل کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور جو ہیں تو وہ بڑے بڑے ہیں۔
- (۴)۔ قانونی الفاظ ہیں۔

(۵)۔ احکام اور قوانین ہیں۔

(۶)۔ اعمال اور عبادات کا سب سے زیادہ مطالبہ ہے۔

(۷)۔ اہل کتاب سے باقاعدہ مناظرہ ہے۔

(۸)۔ بڑی بڑی آیتیں اور بڑی بڑی سورتیں ہیں۔

اسی فرق کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حق اذا ثاب الناس الى الاسلام ثم نزل الحلال والحرام ولونزل اول شيء لا تشبهوا الخمر لقالوا الاندم الخمر ابدأ ولونزل لاتزنوا لقالوا الاندم الزنا ابدأ۔ القد نزل ببكة وانا جارية العب“ بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر” وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده (بخاری)

”ابتدا میں سورہ مفصل نازل ہوئیں، جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا پھر جب لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو احکام کا نزول شروع ہوا اور اگر پہلے ہی روز شراب و زنا ترک کرنے کو کہا جاتا تو لوگ صاف انکار کر دیتے جب یہ آیت نازل ہوئی: بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر، تو میں اس وقت مکہ کی گلیوں میں کھیلا کرتی تھی اور سورہ بقرہ و نساء کا نزول اس وقت ہوا جب میں خود رسول اللہ کے پاس موجود تھی۔“

### اس کی حکمت

مدنی سورتوں میں تدبیر منزل، سیاست مدن اور خلافت کبریٰ کے احکام و ضوابط اور امت کی تشکیل و تنظیم کے اصول و قوانین پر بحث کی گئی ہے اور مکی سورتوں میں توحید، قیامت، رسالت اور اخلاق فاضلہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہ نمایاں امتیاز اس لیے ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اہل عرب کو اعمال فاسقہ کو چھوڑنے اور مدنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تو بہت کم لوگ اس صدا پر لبیک کہتے، اس لیے ان لوگوں کی اصلاح و تہذیب کے لئے یہ حکیمانہ صورت اختیار کی گئی کہ شروع میں انھیں جزائے اعمال کی طرف توجہ دلائی گئی اور یہ بتادیا گیا کہ ایک ایسی قوت قاہرہ بھی موجود ہے جو تمہارے ایک ایک عمل حیات کو گہری نظر سے دیکھ رہی ہے، وہ تمہارے کسی کام کو ضائع نہ ہونے دے گی، تمہیں اس کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا اور اس وقت کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہاری مدد نہ کر سکے گی، بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار اور جواب دہ ہو گا۔

### رسول کی ضرورت

جب ایک شخص خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری و مسؤولیت کا دل کے ساتھ یقین کرے تو اب وہ خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس کرے گا کہ اسے اخلاق فاضلہ اور جرائم کا علم ہوتا، کہ وہ معاصی سے پرہیز کر کے نیکی کی راہ اختیار کر سکے،

مگر خود انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنی فطرت صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو گرد آلود کر لیتا ہے، حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سوء معرفت اس کے قلب سلیم کو بالکل تاریک و مظلم بنا دیتے ہیں: ظلمت بعضها فوق بعض اور وہ اس طرح راہ حق سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس لیے قدم قدم پر اس کو ایک ہادی اور ہر کی ضرورت ہے جو اس کو نیکی اور بدی کی راہ دکھاوے اور راستہ کے تمام نشیب و فراز سمجھا دے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلم قانت دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور میں کھڑا اھدنا الصراط المستقیم کی دعا مانگتا ہے۔

پس قرآن کریم نے فطری طریق تعلیم اختیار کیا، جب خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری کو وہ لوگ سمجھ گئے تو انھیں بتایا گیا کہ اس اللہ کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کے لیے وہ اپنا رسول بھیجتا ہے، اس کے پاس اس کے احکام و فرامین ہوتے ہیں، تمہارا فرض ہے کہ اس کا اتباع کرو تا کہ راہ حق پاسکو: فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنْ هَذِي هَذِي فَمَنْ تَبِعَ هَذَا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرة ۳۸ تا ۳۹) ”جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرو تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

### قلب القرآن

چنانچہ اگر آپ کی سورتوں کو مدنی حصہ سے الگ کر لیں تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ان سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت اور جزائے اعمال پر زور دیا گیا ہے، اگر اعمال کی طرف توجہ کی گئی ہے تو بہت کم، اس لیے کہ عمل نتیجہ ہیں عقائد صالحہ اور یقین و اذعان کا، جب تک ایک خیال آپ کے دل میں محکم و استوار نہ ہو گا اس سے داعیہ عمل کے پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے عملاً قانونی زندگی مدینہ منورہ ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا میں جس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ان سب میں اصول و کلیات کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں، سب کے سب انہی عقائد و یقینات کی دعوت دیتے ہیں جن پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں اور وہ یہی توحید، رسالت اور قیامت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ یسین کو حدیث میں قلب القرآن کہا گیا کیونکہ اس میں ان ہی اہمات مسائل پر بحث کی گئی ہیں۔ سورہ اخلاص میں صرف توحید کا ذکر تھا، اس لیے لسان نبوت نے اس کو ثلث قرآن فرمایا۔

اس تمہید کو پیش نظر رکھ کر اگر آپ تیسویں پارہ میں درس و فکر کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی اکثر سورتوں میں بھی یہ تین چیزیں زیر بحث و نظر ہیں، مگر ہر ایک سورہ کا طریق استدلال و استشہاد دوسری سے بالکل جداگانہ ہے اور ہر جگہ انداز گفتگو نزلاً، جاذب قلوب و انظار اور پر از عبرت و بصیرت ہے۔

## النبأ

(رکوع ۲- آیات، ۴۰)

### موضوع سورۃ

اس وقت سورۃ النبأ آپ کے سامنے ہے، اس کا موضوع اثبات قیامت ہے۔ یہی مقصد اور بھی کئی ایک سورتوں کا ہے، مگر اس کا طریق بحث و نظر سب سے الگ ہے۔ اس میں کاشت کاروں کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان ہی چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کھیتی باڑی کے لیے ضروری ہیں، ظاہر ہے کہ کسان جس قدر محنت کرتا ہے، اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کھیتی تیار ہو جانے کے بعد اس کو کاٹ لے اور غلہ الگ کر کے بھوسا جانوروں کے آگے ڈال دے۔ پس جس طرح ہر کاشت کار کے نزدیک فصل کاٹنے کا دن مقرر ہے، ایسے ہی انسانوں کے فنا کرنے کا بھی ایک وقت معین ہے، اس روز اچھوں اور بروں میں تمیز ہوگی اور ہر ایک اپنے کیے کا بدلہ پائے گا۔ اس دن کا نام یو الفصل ہے اور اسی دن کی چند خصوصیات بیان کر کے آخر سورۃ میں اسی کا اعادہ کیا کہ یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔

### جزائے اعمال پر زور

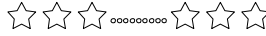
قرآن مجید کا بڑا حصہ اسی کے بیان پر مشتمل ہے اور اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کفار و معاندین اسلام کو سب سے زیادہ اس کے متعلق شکوک و شبہات ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے: مَنْ يُعْجِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيمٌ (یسین ۷۸) ”جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو انھیں کون زندہ کرے گا“۔ کسی کا یہ خیال ہے: وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً (الکہف ۳۶) ”اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو“۔ بعض کی یہ رائے ہے: مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (الجمانیہ ۲۴) ”ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے“۔ ایک جماعت کے خیالات یہ ہیں: وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَّا نَذَرُوا مَا السَّاعَةُ ۚ إِنَّ نَحْنُ إِلَّا ظُلُمَاءُ وَمَا نَحْنُ بِمُحْسِنِينَ (الجمانیہ ۳۲) ”اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا“۔ کبھی یوں سوال کرتے: مَقَىٰ هَذَا الْوَعْدِ (۶۳:۸۴) ”یہ وعدہ کب پورا ہوگا“۔

غرض یہ کہ مخالفین اسی قسم کے خیالات اس عقیدہ صالحہ کے متعلق ہمیشہ سے ظاہر کرتے آئے ہیں۔ اس میں غلط

فہمی پیدا ہونے کی وجہ سے کسی نے تنازع کی پناہ لی، نصاریٰ نے کفارہ کو اپنی گناہوں کی آڑ بنالیا اور بعض لوگ تو سرے ہی سے اس کا انکار کر بیٹھے۔ گویا انہوں نے اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کو بالکل فراموش کر دیا اور اگر یہی عقیدہ لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا صرف کھیل اور کود کا گھر بن جائے گی، کسی کو بھی نیکی کی طرف توجہ نہ ہوگی، زمین کا سنگار لٹ جائے گا، ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی اور اکثر فرزندانِ آدم مجسمہ ملعونیت و شیطنیت بن جائیں گے۔

عیسائی اقوام کی حالت تمہارے سامنے ہے، جو انسانوں کی صورت میں درندوں اور بھیڑیوں کی طرح اپنے ہی بھائیوں کو چیرتے اور پھاڑتے ہیں: **وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا** (الکہف ۱۰۴) ”اور وہ اپنی غلط فہمی سے اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔“ یہ کفارہ کے نتائج ہیں اور حریت فاسقہ کے ثمرات۔

پس اس شر و طغیان کو روکنے کے لئے جزائے اعمال پر زور دیا گیا کہ ہر ایک انسان اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے اور اپنی مسئولیت کا خیال کر کے ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اس کے نتائج و ثمرات میں اچھی طرح غور و فکر کرے۔





## یوم الفصل

### عظیم الشان خبر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ ۝ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ۝

”یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔ کیا بڑی خبر کی نسبت جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔“

نباء عظیم سے کیا مراد ہے؟ اس میں علمائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد قیامت ہے، اسی طرف ضحاک گئے ہیں، اسی کو رازی اور ابن کثیر نے ترجیح دی ہے اور اسی کی تائید قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا: قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ ۝ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝ (ص ۶۷-۶۸) ”کہہ دو کہ یہ ایک بڑی ہولناک چیز کی خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے“۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنْهُمْ مَبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (الطّفن ۳۴) ”کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے جائیں گے یعنی ایک بڑے سخت دن میں جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے“۔ اس کے علاوہ سورۃ کا انداز بیان، طریق استدلال اور خواتیم آیات اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ اس میں صرف مسئلہ قیامت پر بحث کی گئی ہے اور اس لیے نباء عظیم سے مراد قیامت ہے۔

قرآن نے اس موضوع پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور ہر جگہ مختلف طریق سے اس پر نظر ڈالی ہے کہ اس کے تمام پہلو سامنے آجائیں، اس لیے کہ یہی ایک مسئلہ ہے جس کی نسبت لوگوں میں سب سے زیادہ اختلاف ہے، یہودیوں کے بعض فرقے اس کا کلمۃ انکار کرتے ہیں، نصاریٰ صرف معاد روحانی کے قائل ہیں، ہندو تناخ کی صورت میں جزا سزا تسلیم کرتے ہیں، مشرکین عرب ازراہ تعجب کہا کرتے تھے: عَاذًا مِّمَّنَّا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجَعُ بَعِيدٌ (ق ۳) ”بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو پھر زندہ ہوں گے، یہ زندہ ہونا بے عید از عقل ہے“۔ کبھی وہ یوں کہتے: عَاذًا لِّمَزْدَوْدُونَ فِي الْكَافِرَةِ ۝ عَاذًا كُنَّا عِظَامًا مَّخْفِيَةً ۝ (الزمر ۱۰ تا ۱۱) ”کیا ہم اٹنے پاؤں پھر لوٹیں گے بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے“۔

اس شدید اختلاف کی وجہ سے قرآن نے بھی اس پر نہایت ہی جامع اور حاوی بحث کی، ایک جگہ اس نے اثبات قیامت پر یوں استدلال کیا: وَهَرَبْنَا مِثْلًا لِّآدَمَ خَلَقْنَاهُ ۖ قَالَ مَنْ يُّبْئِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُخْبِتُهَا الَّذِي اَنْشَأَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ (یسین ۷۸ تا ۷۹) ”اور ہمارے بارے میں مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو کون زندہ کرے گا، کہہ دو کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ سب قسم کا پیداکرنا جانتا ہے۔“ سورہ بنی اسرائیل میں نہایت ہی لطیف پیرایہ میں اس پر روشنی ڈالی:

وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا إِنْ أَتَانَا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝ قُلْ كُونُوا حِجَارًا أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ۚ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيَذَرُوكُمُ اللَّيْلَ رُغُوسُهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَى هُوَ ۚ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَرِينًا ۝ (بنی اسرائیل ۹۵ تا ۹۹) ”اور کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر انھیں گے، کہہ دو کہ خواہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی بڑی سخت ہو، جھٹ کہیں گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا، کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا، تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہو گا، کہہ دو امید ہے کہ جلد ہو گا۔“

کہیں یوں جواب دیا: اَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (ق ۱۵) ”کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ از سر نو پیدا کرنے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

ایک مقام پر انسانی پیدائش سے یوں استدلال کیا: اَلَمْ يَكُنْ لَّكَ نُفُوسَةٌ مِّنْ مَّيِّتٍ يُنْفِثُ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الْبَشَرَ إِنَّا لَآلِهُمُ الْآلَافُ ۝ اَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يُّعْثِيَ الْمَيِّتَ ۝ (القیامہ ۷۷ تا ۸۰) ”کیا وہ مئی کا جور حم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا، پھر لو تھڑا ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا، پھر اس کے اعضا کو درست کیا، پھر اس کی دو قسمیں بنائیں ایک مرد اور ایک عورت، کیا اس خالق کو اس بات پر قدرت نہیں کہ مردوں کو جلا اٹھائے۔“

ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ سَیِّئَةٌۭۢ بِخَلْقِهِنَّ بِقَدْرِ عَلٰی اَنْ يُعْثِيَ الْمَيِّتَ ۚ بَلٰی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (الاحقاف ۳۳) ”کیا انھوں نے نہیں سمجھا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے، ہاں ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

سورہ ذاریات میں نزول باراں اور اس کی مختلف کیفیات سے استدلال کر کے کہا: اِنَّمَا تَتَّعِدُونَ لَصَادِقٍ ۚ ۝ وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۚ (الذاریات ۶۵ تا ۶۶)، ”جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا ہے اور انصاف کا دن ضرور واقع ہو گا،“ غرض یہ کہ اس بحث کا کوئی پہلو نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

ایک نکتہ

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝

”دیکھو یہ عنقریب جان لیں گے پھر دیکھو یہ عنقریب جان لیں گے۔“

ارباب تفسیر نے ان دونوں آیتوں کے مطلب میں ٹم کی وجہ سے اختلاف کیا ہے جو تراخی کے لیے آتا ہے۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ اس تکرار سے صرف تاکید کا اظہار مقصود ہے، ضحاک کہتے ہیں کہ پہلی آیت کفار کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے واسطے ہے، ہر ایک جماعت اپنے اپنے عقائد کے ثمرات و نتائج کو دیکھ لے گی، کچھ لوگ اس طرف بھی گئے ہیں کہ پہلی آیت نزع سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری قیامت سے۔

اس میں شک نہیں کہ تم کی وجہ سے ہر ایک بزرگ نے اس فرق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ان دونوں آیتوں میں ہونا چاہئے، مگر ہمیں ان سب سے اختلاف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اول تو ہم قرآن میں کسی آیت اور قصہ کے تکرار کے قائل نہیں، اگر ایک ہی آیت کئی جگہ آجائے تو ہر مقام پر اس کا مطلب جداگانہ ہوگا، جو سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر معین کیا جاسکتا ہے۔ یہی حال قصص القرآن کا ہے: وشرح ذلك يطول، دوسرے اگر اس تمام انکار کا نتیجہ مرنے ہی کے بعد ظہور پذیر ہو گا تو یہ تمام بحث و نظر اور جدل و مناظرہ بے کار ٹھہرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ذمہ داری اور مسؤلیت کا انکار کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی زندگی کو اپنی تمام کائنات حیات تصور کرتے ہیں: مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْدِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (الباقیہ ۲۳) ”ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔“ مگر ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر قیامت کا ہونا ان کے نزدیک بعید از عقل اور خارج از امکان ہے تو ہم اسی سورت میں ایسے دلائل وبراہین بیان کیے دیتے ہیں جن سے ان کے تمام شکوک و شبہات یک قلم رفع ہو جائیں گے اور اگر باوجود ان روشن شواہد و بینات کے پھر بھی وہ تسلیم نہ کریں اور اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو اس ضد کا تو کوئی علاج نہیں۔ مرنے کے بعد یہ حقیقت مستورہ خود بخود بے حجاب ہو جائے گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ شدید ترین غلطی میں مبتلا تھے: وَ اَنْفُسُكَ بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْسَاهُمْ ؕ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوتُ ؕ بَلٰى وَعَدَا عَلٰیهِ حَقًّا ؕ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾ لِيَبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَاٰثِرُوْنَ كَذِبِيْنَ ﴿۶﴾ (النحل ۳۸-۳۹)، ”اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہیں خدا اسے قیامت کے دن قبر سے نہیں اٹھائے گا، ہرگز نہیں یہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور اس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے اور اس لیے کہ کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔“

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهْدًا ﴿١﴾ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ﴿٢﴾ وَخَلَقْنَكُمْ أَزْوَاجًا ﴿٣﴾ وَجَعَلْنَا بَيْنَكُمُ سُبُلًا ﴿٤﴾ وَجَعَلْنَا الْبَيْلَ رِيَاسًا ﴿٥﴾ وَجَعَلْنَا الشَّوَارِعَ مَعَاشًا ﴿٦﴾ وَبَيَّنَّا فَوْقَكُمُ السَّمَاءَ إِدَادًا ﴿٧﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا قُرُونًا وَمِنْ كُلِّ غَمٍّ جُنُودًا ﴿٨﴾ وَتَبَيَّنَّا لَكُمُ النُّجُومَ ﴿٩﴾ لِتَحْسَبُوا بِسْمِ اللَّهِ يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿١٠﴾

”کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا اور پہاڑوں کو اس کی میخیں نہیں ٹھہرایا، بے شک بنایا اور تم کو جوڑا جوڑا بھی پیدا کیا اور نیند کو تمہارے لیے موجب آرام بنایا اور رات کو پردہ مقرر کیا اور دن کو معاش کا وقت قرار دیا اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور آفتاب کا روشن چراغ بنایا اور نچرتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسیا تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کر س اور گھنے گھنے باغ۔“

## تشریح الفاظ

سببات لیا گیا ہے سبب سے، اس کے لغوی معنی قطع کرنے کے ہیں، نیند سے دن بھر کی تکلیف دور ہوتی اور تھکان قطع ہوتی ہے اس لیے اس کو سببات کہا گیا، یوم السبت یعنی آرام کا دن۔ یہودیوں نے جو غلط باتیں اللہ کی طرف منسوب کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا نے چھ روز میں آسمان وزمین کو بنالیا تو اپنی تھکن کو دور کرنے کے لئے اس نے شنبہ کے روز آرام کیا۔ معاش مصدر ہے عاش یعیش سے یعنی وقت معاش۔ شداد جمع ہے شديدة کی، اس کے معنی مضبوط کے ہیں۔ وہاب کے معنی خوب روشن ہونے کے ہیں۔ معصات سے مراد بادل ہیں۔ شج کہتے ہیں شدت کے ساتھ بہنے کو اور یہ لازم و متعدی دونوں طریق پر استعمال ہوتا ہے۔ لازم کی مثال تو اسی آیت میں موجود ہے اور متعدی کی مثال وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: افضل الحج العج والشج، ”بہترین حج وہ ہے جس میں بلند آواز سے تلبیہ کھاجائے اور کثرت سے جانوروں کا خون بہایا جائے۔“

## مناظر قدرت سے استدلال

ہم نے موضوع سورت پر بحث کرتے وقت بیان کیا تھا کہ اس سورت کا روئے سخن کائناتوں کی طرف ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں وہی چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کی کسان کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ اگر وہ ان میں درس و فکر کرے گا تو ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ قیامت کا ہونا ایک یقینی امر ہے۔

قرآن مجید کا یہ مخصوص انداز ہے کہ جب کبھی وہ تذکیر و موعظت کرتا ہے تو غیر متعارف اور نامانوس چیزوں کو پیش نہیں کرتا، بلکہ وہی روزمرہ کی چیزیں ہیں جن کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں، مگر ذہن ان کی طرف منتقل نہیں ہوتا: بیرون علیہا وہم عنہا معروضون۔ یہی مناظر قدرت ہیں، نجوم و کوکب ہیں اور ثوابت و سیارات ہیں جن کی جانب وہ ہمیں توجہ دلاتا ہے کہ ہم ان سے عبرت اندوز ہوں اور ان سے استدلال و استشہاد کا کام لیں۔ ﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝﴾ (الذاریات ۲۰ تا ۲۱) ”اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔“

ان آیات میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی شرح و تفصیل کی محتاج نہیں، ایک کسان ہی ان کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے، وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، کھیتی کو پانی دیتا ہے، دن رات اس کی حفاظت کرتا ہے، ایک مدت کی حفظ و نگہداشت کے بعد اس کا کھیت لہلہانے لگتا ہے، فصل بالکل تیار ہو جاتی ہے، اب وقت آتا ہے کہ وہ اس کو کاٹ لے۔

## قیامت کا دن

إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝

”بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔“

ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ جب کھیت تیار ہوتا ہے تو پھر اسے کاٹ لیا جاتا ہے اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ کھیت کا مالک اپنی فصل کو اسی طرح میدان میں کھڑا رہنے دے گا۔ ایسے ہی تم یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ نے بھی انسانوں کے فنا کرنے کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے، اس روز ان کی دنیاوی ترقی رک جائے گی، ان سب کو ایک مقام پر جمع کر دیا جائے گا اور ہر ایک اپنے کیے کا بدلہ پائے گا: **يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَنَّةِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ** (التغابن ۹) ”جس دن وہ تم کو یعنی قیامت کے دن اکٹھا کرے گا وہ نقصان اٹھانے کا دن ہے۔“

یہی یوم الفصل ہے جس روز اچھوں اور بروں کو الگ کر دیا جائے گا، جس طرح کاشت کار فصل کاٹ لینے کے بعد غلہ اور بھوسہ کو الگ الگ کر دیتا ہے: **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالشَّيْطَانِ وَالصَّالِحِينَ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ** (الحج ۱۷) ”جو لوگ مومن یعنی مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوس اور مشرک خدا ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔“ سورہ سجدہ میں فرمایا: **إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ** (السجدہ ۲۵) ”بلاشبہ تمہارا پروردگار ان میں جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے تھے قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا۔“

ایک کسان کی زندگی اس نظارہ سے واقف ہے، وہ ہمیشہ یہی کام کرتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے روز اعمال صالحہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرے گا اور بروں کو جہنم میں: **وَالْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنِ الْفَجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝**

## آثار و قرائن

**يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝**

”جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ غٹ کے غٹ آ موجود ہو گے اور آسمان کھولا جائے گا تو اس میں دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔“

ان آیات میں قیامت کے بعض ابتدائی حوادث کا ذکر کیا گیا ہے، بارش نازل ہونے سے قبل سرد ہوا چلتی ہے تو لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ باران رحمت کا نزول ہو گا اور زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جائے گی، اسی طرح جب قیامت برپا ہوگی تو اس وقت قدرت الہیہ اپنا اثر دکھائے گی، تمام مردوں میں زندگی پیدا ہو جائے گی اور سب کے سب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے: **يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ** (بنی اسرائیل ۷۷) ”جس دن ہم سب

لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔“

موجودہ نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا، نجوم و کواکب کا نام و نشان باقی نہ رہے گا: **إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَحَرَتْ ۝** (الانشقاق ۲۳) ”جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑپڑیں گے،“ آسمان میدان محشر کے

لیے دروازوں کی شکل میں بدل جائے گا: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلُ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا (الفرقان ۲۵) ”اور جس دن آسمان ابر کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل کیے جائیں گے“ اور پہاڑوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ ہوا میں اڑتے دکھائی دیں گے۔ جب موجودہ نظام ہی نہ رہا تو تمام قوانین میں بھی تبدیلی ہو نا ضروری ہے، ہر اس کشش کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ پر قائم و ثابت رکھے ہوئے تھی، اب اس کے سوا کیا ہو گا کہ وہ خلا میں پھیل جائیں۔

### پہاڑوں کے مختلف حالات

قرآن مجید نے علامات قیامت بیان کرتے ہوئے پہاڑوں کی مختلف حالتیں اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے ذکر کی ہیں، ہم ان کے بعض حالات کو ایک سلسلہ میں بیان کیے دیتے ہیں کہ آیات کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔  
ان کی پہلی حالت یہ ہوگی: وَحِطَّتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (الحاقة ۱۳) ”زمین اور پہاڑ دونوں اٹھالیے جائیں گے پھر ایک بارگی توڑ پھوڑ کر برابر کر دیے جائیں گے۔“

پھر یہ ہو گا: وَيَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفِهْرِ الْمَشْهُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۝ (القارعة ۵۲-۵۳) ”وہ قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے رنگ برنگ کی دھکی ہوئی اون۔“

اس کے بعد کی کیفیت یہ ہے: إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۖ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۖ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّطْبَقًا (واقعة ۶۳-۶۴) ”جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے اور پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں پھر غبار ہو کر اڑنے لگیں۔“

سورہ طہ میں یوں آتا ہے: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۚ (طہ ۱۰۵-۱۰۶) ”اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کچی اور پستی دیکھو گے نہ ٹیلا اور بلندی، تیری الجبال تحسبها جامدة ۖ وَهِيَ تَمُوتُ مَرًّا السَّحَابِ، میں بھی اسی کی ایک حالت بیان کی گئی ہے: (النمل ۸۸) ”اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں، مگر وہ اس روز اس طرح مارے پھریں گے جیسے بادل“ اور ایک کیفیت یہ ہیں: وَيَوْمَ نُسِفُ الْجِبَالِ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً (مریم ۴) ”اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو صاف میدان دیکھو گے۔“

پہاڑوں کی سب سے آخری شکل وہ ہوگی جو آیت زیر بحث میں بیان کی گئی ہے، جہاں کل تک سر بٹک پہاڑ کھڑے تھے قیامت کے روز تو دیکھے گا کہ وہ اب چٹیل میدان ہیں، اب نہ تو انسان کے چھپنے کے لیے کوئی جگہ باقی ہے اور نہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعمال کی باز پرس سے محفوظ رکھ سکتا ہے، بلکہ ہر ایک شخص کو اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے کاموں کا جواب دینا ہو گا: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔

## نتائج اعمال

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِلطَّاغِينَ مَابًا ۝ لِّلَّذِينَ فِيهَا أَهْقَابًا ۝ لَا يَذُقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝ إِلَّا حَبِيمًا وَغَسَاقًا ۝ جَزَاءً وَفَاءً ۝

”بے شک دوزخ گھاٹ میں ہے یعنی سرکشوں کا وہی ٹھکانا ہے، اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے وہاں نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے نہ کچھ کھانا یا نصیب ہو گا مگر گرم پانی اور بہتی پیب، یہ بدلا ہے پورا پورا۔“

جن لوگوں نے دنیا میں اپنی صورت نوعیہ کو خراب کر دیا اور اپنی فطرت صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو خارجی اثرات ضلالت سے گرد آلود کر دیا وہ اس گھاس اور بھوسہ کی طرح ہوں گے جو جانوروں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے اور وہ اس کو پاؤں کے نیچے روندتے ہیں، ان تمام انسانوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو ان کی تاک میں لگی ہوگی، یہ اس جگہ مدت ہائے دراز تک رہیں گے، شدت حرارت کی وجہ سے انھیں پانی کی تلاش ہوگی، مگر ان کی تمام سعی و کوشش بے کار جائے گی اور یہ ان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ہوگا: وَمَا رِبَكْ يَظْلَامُ لِلْعَبِيدِ۔ سورہ انعام میں ہے: وَمَنْ جَاءَ بِالسَّبِيَّةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (انعام ۱۶۰) ”اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

## عذاب کا سبب

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ۝ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۝ فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۝ (النبا ۳۰ تا ۳۲)۔

”یہ لوگ حساب آخرت کی امید ہی نہیں رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو جھوٹ سمجھ کر جھٹلاتے رہتے تھے اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر ضبط کر رکھا ہے، سواب مزا چکھو، ہم تم پر عذاب ہی بڑھاتے جائیں گے۔“

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دو قوتیں نوازش فرمائی ہیں:

(الف)۔ قوت نظریہ کہ ہر ایک کام کی حقیقت اصل یہ معلوم کرے۔

(ب)۔ قوت عملیہ، اس تلاش و تحقیق کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہو۔

ان لوگوں کو سخت ترین عذاب اس لیے ہو رہا ہے کہ انھوں نے اپنی دونوں قوتوں کو برباد کر دیا، انھیں اپنی ذمہ داری اور مسؤلیت کا مطلق خیال نہ تھا اور وہ: مَا ظَنُّ السَّلَاحَةِ کہہ کر قیامت کا انکار کرتے تھے پھر اسی کے ساتھ اس تعلیم کی بھی تکذیب کرتے جو انھیں جزائے اعمال کی طرف متوجہ کرتی۔

علم النفس میں یہ مسئلہ جلی بدیہیات سے ہے کہ انسان خواہ کیسا ہی حقیر سے حقیر کام کیوں نہ کر دے اس کا اثر ضرور باقی رہتا ہے اور اس شخص کو اس کا بدلہ ملتا ہے۔ اگر اس نے نیکی کی ہے تو کم از کم آئندہ نیک کاموں میں اس کو مدد ملے گی اور اگر اس نے برائی کا ارتکاب کیا ہے تو اسے بدکرداری کا شوق پیدا ہوگا، اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:



فَأَمَّا مَنْ آطَىٰ وَ اتَّقَىٰ ۖ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَّ لَهُ لِيُسْرَىٰ ۖ ۝۱۰ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنَىٰ ۖ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَّ لَهُ لِيُسْرَىٰ ۖ ۝۱۱ (ایل ۱۰ تا ۱۱) ”تو جس نے خدا کے رستے میں مال دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقہ کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اسے سختی میں پہنچائیں گے“، ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَ الْآيِلَ وَ مَا وَسَقَىٰ ۖ وَ الْقَمْرَ إِذَا انْتَسَقَىٰ ۖ ۝۱۲ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۖ ۝۱۳ (انشقاق ۱۲ تا ۱۳) ”اور رات کی قسم اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کر لیتی ہے ان کی اور چاند کی جب کامل ہو جائے کہ تم درجہ بدرجہ رتبہ اعلیٰ پر چڑھو گے۔“

اسی حقیقت نفس الامری کو آیت وکل شیء احصینہ کتابا میں بیان کیا، اگرچہ یہ لوگ اپنے اعمال فاسقہ کو بھول جائیں، مگر ان کے ایک ایک کام پر ہماری نظر ہے اور ان کے تمام اعمال حیات کو ہم نے محفوظ رکھا ہے: أَخْصَهُ اللَّهُ وَ نَسُوهُ (المجادلہ ۶) ”خدا کو وہ سب کام یاد ہیں اور یہ ان کو بھول گئے“، پس آج جو کچھ مل رہا ہے یہ اپنے ہی اعمال کے نتائج ہیں اور اس لیے عذاب کے سوا اور کیا چیز مل سکتی ہے۔

### ارباب تقویٰ

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کا تذکرہ تھا جو اعمال فاسقہ کی وجہ سے بالکل بے کار ہو چکے ہیں اور اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہا، یہی شر البدریہ ہیں یہی الاعی ہیں، یہی اولئک کا لانعام ہل ہم اضل کے مصداق حقیقی ہیں اور یہی الذین لایعلمون کے گروہ میں داخل ہیں اس لیے ان کی وہی حیثیت ہے جو بھوسہ کی ہو آ کرتی ہے۔ آئندہ آیات میں ان ارباب صلاح و تقویٰ کا بیان ہے جن کی تمام تر زندگی نیکی میں گزری ہے، جن پر ان صلاح و نسکی و معیای و مماتق للہ رب العالمین کا رنگ غالب ہے اور جو قلب سلیم لے کر مالک یوم الدین کے دربار میں حاضر ہوں گے

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۖ ۝۱۴ حَدَاقًا وَ أَعْنَابًا ۖ ۝۱۵ وَ كَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۖ ۝۱۶ وَ كَأْسًا دِهَاقًا ۖ ۝۱۷ لَآ يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَ لَآ كِذْبًا ۖ ۝۱۸ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ۖ ۝۱۹ رَبِّ السَّعَادَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَآ يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۖ ۝۲۰

”بے شک پرہیز گاروں کے لیے کامیابی ہے یعنی باغ اور انگور اور ہم عمر نوجوان عورتیں اور شراب کے چھلکتے ہوئے گلاس، وہاں نہ بیہودہ باتیں سنیں گے نہ جھوٹ خرافات، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر، وہ جو آسمانوں اور زمین اور جو ان دونوں میں ہے سب کا مالک ہے بڑا مہربان، کسی کو اس سے بات کرنے کا یارا نہ ہو گا۔“

مغاز مصدر ہے اور اس کے معنی کامیاب ہونے کے ہیں، حدائق کے معنی اس باغ کے ہیں جو چار دیواری سے گھر اہوا ہو اور یہ حدیقہ کی جمع ہے، کواعب جمع ہے کاعب کی، یہ کعب سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کے ابھرنے کے ہیں، کعب ٹخنے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں طرف سے ابھرا ہوا ہوتا ہے، اس لیے کاعب اس نوجوان عورت کو کہا جاتا ہے



جس کا سینہ ابھرا ہوا ہو، دھاقا اضداد میں سے ہے، اسکے معنی بھرنا اور خالی کرنا دونوں آتے ہیں۔ اس جگہ بھرنے کے معنی ہیں۔

## جنت کی حقیقت

آیات مذکورۃ الصدر میں جو نعمتیں بیان کی گئی ہیں وہ صرف ارباب تقویٰ کے لیے مخصوص ہیں، قرآن نے مختلف الفاظ میں جنت کے خصوصیات کو بیان کیا ہے: فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَكْتُمُ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (الزخرف ۷۱)، ”وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے موجود ہو گا اور اے اہل جنت تم اس میں ہمیشہ رہو گے“، دوسری جگہ آتا ہے: وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ (الانبیاء ۱۰۲) ”اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اس میں یعنی ہر طرح کے عیش اور لطف میں ہمیشہ رہیں گے“، سورہ حجر میں فرمایا: اَدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اَمْنٍ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا نَصَبًا وَّ مَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرِجِيْنَ ۝ (الحجر ۳۶ تا ۳۸) ”ان سے کہا جائے گا کہ ان میں سلامتی اور خاطر جمع سے داخل ہو جاؤ اور ان کے دلوں میں جو کدورت ہو گی ان کو ہم نکال کر صاف کر دیں گے گویا بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں نہ ان کو وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے“، حدیث میں آتا ہے: ملاعین رأی ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر، ”نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس جنت کی نعمتوں کا وہم و گمان بھی گزرا۔“

کتاب وسنت کی ان تصریحات کے بعد کون شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہی دنیا جنت ہے؟ اس عالم کون و فساد میں جنت کا ہونا غیر ممکن ہے، اس لیے کہ یہاں نیکی اور بدی، خیر اور شر اور رنج و راحت کا اس درجہ اختلاط والتباس ہے کہ دونوں کا جد اکرا نہ محال قطعی ہیں اور جنت ایسی جگہ ہے کہ جہاں لطف و سرور کے سوا کوئی چیز نہیں اور اگر قرآن و حدیث کے ان ارشادات کے ساتھ یہ بھی ملا لیا جائے کہ یہ الطاف ہائے گونا گوں اس اللہ کی طرف سے نوازش ہوں گے جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور جس کی صفت رحمت ہر جگہ کار فرما ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لطف و نوازش بھی کرے اور اس میں شائبہ تکلیف بھی ہو؟ اس لیے جنت وہی ہو سکتی ہے جس میں راحت و آرام کے سوا کچھ نہ ہو اور یہ دنیا اس کی جگہ نہیں۔

اس روز جو کچھ ملے گا وہ خدائے قدوس کی رحمت کا نتیجہ ہو گا، پھر جب زمین و آسمان کا مالک دینے پر آئے تو اس کی دین کا کیا پوچھنا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ جو کچھ ہے اس کا فضل ہی فضل ہے، کوئی شخص اپنے استحقاق کی بنا پر اس سے اپنا حق نہ طلب کر سکے گا، اس کی جلالت و کبریائی اور ہیبت و جبروت کی یہ کیفیت ہو گی کہ بغیر اجازت اس سے کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑے گی۔

کس روز

يَوْمَ يَقُومُ الزُّوْمُ وَ اَلْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اٰذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ۝

”جس دن روح اور فرشتے صف باندہ کر کھڑے ہوں گے تو کوئی بول نہ سکے گا مگر جس کو خداے رحمن اجازت بخشے اور اس نے بات بھی درست کہی ہو۔“

اسی دن یہ نتائج نکلیں گے، اس روز کائنات ارضی و سماوی کی مرکزی روح بھی حاضر ہوگی جو اپنی مرکزیت کی بنا پر تمام اجزاء کائنات میں عموماً اور جملہ افراد نوع انسانی میں خصوصاً باعتبار انعام و تعذیب موثر ہے، اسی کے عکس کی بدولت تمام ارواح میں زندگی کے آثار نمایاں تھے، ملائکہ بھی اس روز موجود ہوں گے جو مختلف قوتوں کے مظاہر تھے اور جن کو لوگوں نے غلطی سے اللہ کی بیٹیاں بنا رکھا تھا۔ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا (بنی اسرائیل ۴۲) وہ بھی دربار خداوندی میں صف بستہ اپنی عاجزی و در ماندگی کا اظہار کر رہے ہوں گے۔ وَ جَاءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (النجر ۲۲) تجلیات الہیہ کا ظہور ہوگا، شہنشاہ زمین و آسمان کی جلالت قدر کے باعث سب کے سب بے بس ہوں گے اور کسی کو یارے تکلم نہ ہو گا۔ نَبِيٍّ مِّنْ دُونِكَ لَا يَعْزِمُكَ ۚ وَ خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (طہ ۱۰۸) ”اس روز لوگ ایک پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے اور اس کی پیروی سے انحراف نہ کر سکیں گے اور خدا کے سامنے آوازیں پست ہو جائیں گی تو تم آواز خفی کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔“

البتہ وہی شخص بول سکے گا جس کو اللہ خود اجازت فرمادے اور بولنے والا بھی سچ سچ کہے۔ نَبِيٍّ مِّنْ دُونِكَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا (طہ ۱۰۹) ”اس روز کسی کی سفارش کچھ فائدہ نہ دے گی مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے اور اس کی بات پسند فرمائے۔“

### رجوع الی المقصود

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلٰى رَبِّهِ مَآبًا ﴿٥٠﴾ اِنَّا اَنْزَلْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْنًا ۙ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاۤهُ وَيَقُوْلُ الْكُفْرُ يَلِكُنِيْ فَنُكِّنْتُ لِرَبِّاە ۙ ﴿٥١﴾

”یہ دن برحق ہے پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنا لے، ہم نے تم کو عذاب سے جو عنقریب آنے والا ہے آگاہ کر دیا ہے جس دن ہر شخص ان اعمال کو جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے دیکھ لے گا اور کافر کہے گا کہ اے کاش

میں مٹی ہوتا۔“

جس قدر دلائل ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ قیامت ضرور ہونے والی ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔ ان الدین لواقعہ، اگر طلبہ کو امتحان کا یقین نہ ہو تو وہ کبھی اپنا وقت درس و مطالعہ میں صرف نہ کریں گے، اگر سپاہی کو باز پرس کا خوف نہ ہو تو وہ رات کے وقت اپنا عیش و آرام ترک کر کے پاسبانی نہ کرے گا، ایسے ہی اگر ہمارے اعمال ضائع جاتے ہیں اور ان کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی تو دنیا صرف کھیل اور تماشہ کا گھر رہ جاتی ہے اور عقل سلیم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

پس جزائے اعمال یقینی ہے اور ہم سے باز پرس ہوگی، تو اب جس کا جی چاہے اپنے اخلاق میں تہذیب و شائستگی پیدا کر لے کہ اس کو دربار الہی میں تقرب حاصل ہو اور تمام اقوام عالم کے سامنے اس کو ذلیل نہ ہونا پڑے: **يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ** (ال عمران ۱۰۶) ”اس روز بہت سے چہرے سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔“

یہ عذاب کچھ دور نہیں، بلکہ سر پر کھڑا ہے، قیامت کے روز جب کفار سے سوال کیا جائے گا کہ تم دنیا میں کتنی مدت رہے تو وہ جواب دیں گے: **لَبِشْنَا يَوْمًا** او بعض یوم **(المؤمنون ۱۱۳)** ”ایک دن پورا یا اس کا کچھ حصہ“ دوسری جگہ آتا ہے کہ جس وقت قیامت کا ہولناک منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہو گا تو وہ یوں خیال کریں گے: **كَانَتْهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبِسُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى** (النازعات ۴۶) ”جب وہ اس کو دیکھیں گے تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں صرف ایک شام یا صبح رہے تھے۔“ حدیث میں آتا ہے: بعثت انا والساعة کھاتین، ”جس طرح یہ دونوں انگلیاں باہم دگر ملی ہوئیں ہیں، اسی طرح میرے بعد اب قیامت ہی آنے والی ہے“ (در میان میں اور کوئی نبی نہیں آئے گا) دوسری حدیث میں آتا ہے: من مات فقد قامت قیامتہ، مرنے کے بعد انفرادی اعمال کا حساب کتاب فوراً شروع ہو جاتا ہے، اجتماعی افعال کی باز پرس اس وقت ہوگی جب تمام نوع انسانی ایک میدان میں جمع ہو جائے، پہلی قیامت صغریٰ ہے اور دوسری قیامت کبریٰ۔

اس روز ہر شخص اپنے تمام اعمال دیکھ لے گا و جدوا ما عبدوا حاضر، ایک جگہ یوں ارشاد ہے: **يُنَبِّئُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ** (القیامۃ ۴۶) ”اس دن انسان کو جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے سب بتا دیے جائیں گے۔“ ان اعمال فاسقہ کو دیکھ کر اس کو بے حد ندامت ہوگی اور شرم کے مارے گڑ جائے گا۔ اس لیے ہر وہ شخص جس میں نوع انسانی کے قانون کا کامل ظہور نہ ہوا ہو گا اس کی یہ خواہش ہوگی کہ مٹی بن جائے اور کسی قسم کا احساس اس میں باقی نہ رہے، مگر یہ آرزو بیکار جائے گی: **يَوْمَئِذٍ يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا** (النساء ۴۲) ”اس روز کافر اور پیغمبر کے نافرمان آرزو کریں گے کہ کاش انکو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی اور خدا سے کوئی بات چھپانہ سکیں گے۔“



## النازعات

(آیات ۴۶-۴۷ رکوع ۲)

### موضوع سورۃ

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو ذمہ دار اور مسؤل پیدا کیا گیا ہے، اس سے یقیناً ایک روز باز پرس ہوگی اور اسے اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا، اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لے تو اس کی زندگی کے روزانہ واقعات اس عقیدہ صالحہ کی شہادت دیں گے، مگر اس کی غفلت اور خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ روزمرہ وہ ان بینات و شواہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر بھی اس مسؤلیت کی طرف اس کی توجہ منعطف نہیں ہوتی نیرون علیہا وہم عنہا معروضون۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار اس کا ذکر کرتا ہے، تاکہ انسان کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اس کے نتائج و ثمرات میں بھی اچھی طرح غور و فکر کرے، چنانچہ سورۃ نازعات کا بھی وہی موضوع ہے جو سورۃ نبا کا تھا مگر انداز گفتگو اور طریق استدلال اس سے بالکل جداگانہ ہے۔

ابتدائی پانچ آیات میں فرشتوں کے مختلف فرائض بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب اس وقت وہ اللہ کا ہر حکم ماننے کے لیے ہمہ تن تیار رہتے ہیں اور اس کی تعمیل میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے تو یاد رکھو اسی طرح انھیں صرف فرمان خداوندی کا انتظار ہے، فوراً اس تمام کائنات ارضی و سماوی کو نیست و نابود کر دیں گے اور کسی چیز کا بھی نام و نشان باقی نہ رہے گا، پھر آیت ۱۴ تک بتایا کہ قیامت کی نسبت جو تمہارے دل میں شبہات ہیں کہ وہ ایک نہایت ہی مشکل کام ہے تو ان تمام شکوک کو دل سے نکال دو اس لیے کہ وہ صرف ایک ڈانٹ ہوگی اور تم سب کے سب میدان حشر میں خوفزدہ موجود ہو گے۔ اگر اب بھی تمہیں یہی خیال ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلہ کائنات کس طرح تباہ ہو گا تو تاریخ عالم کی ورق گردانی کرو اور فرعون کے جاہ و حشمت، قوت و طاقت اور پھر تباہی و بربادی کو اپنے سامنے لاؤ، یہی ایک واقعہ تمہارے لیے عبرتوں اور بصیرتوں کا دروازہ کھول دے گا: آیت ۲۶ تک یہی مضمون ہے۔

انسان کو اپنی نسبت کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ بھلا میں کس طرح فنا ہو کر دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہوں؟ اس پر فرمایا کہ تم پہاڑوں کو دیکھو، دن اور رات میں غور کرو، زمین اور اس کے دریاؤں کی طرف نظر دوڑاؤ پھر بتاؤ ان تمام چیزوں کا پیدا کرنا مشکل تھا یا تمہارا۔ آیت ۳۴ سے بتایا گیا کہ اگرچہ اس وقت تمہیں کسی قسم کا احساس نہیں ہو تا مگر جب وہ حادثہ کبریٰ رونما ہو گا، اس دن تمہیں اپنے تمام اعمال یاد آجائیں گے، مگر اس وقت نصیحت حاصل کرنا بے کار ہو گا۔ اس روز تو نتائج نکلیں گے، جن لوگوں نے دنیاوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی وہ جہنم میں جائیں گے اور ارباب ایمان جنت میں، آیت ۴۱ تک

یہی مضمون ہے۔

جب اس قسم کے ہولناک نتائج انسان کے سامنے آتے ہیں تو وہ اتنی بات تو ضرور تسلیم کر لیتا ہے کہ قیامت یقیناً آئے گی، مگر چونکہ ابھی تک استبعاد اس کی طبعیت میں باقی ہے، اس لیے اب یہی خیال دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور وہ پوچھتا ہے کہ اتنا بڑا حادثہ کب رونما ہو گا تا کہ اس تاریخ سے قبل مناسب تیاری کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ رسول کا یہ کام نہیں، اس کا فرض انداز و تبشیر ہے اور بس۔ نہ وہ اس تاریخ کی تعیین سے واقف ہے اور نہ اس کے دائرہ عمل میں یہ بات داخل ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، ہاں اس کے آثار و قرائن کا اس کو علم ہے اور انھیں اس نے تمہارے سامنے من و عن بیان کر دیا ہے اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ البتہ اتنی بات یاد رہے کہ جب وہ وقت آئے گا تو دنیا کی تمام زندگی تمہارے نزدیک صرف ایک شام یا صبح کے مانند معلوم ہو گی اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔



## رفع استبعاد قیامت

### اقیام القرآن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَاللَّيْلِ عُرْفًا ۝ وَالنَّجْمِ نُجُجًا ۝ وَالسَّيْحَةِ سَهَبًا ۝ فَالْمَدْبُورَاتِ أَمْرًا ۝

”ان فرشتوں کی قسم جو دُوب کر کھینچ لیتے ہیں اور ان کی جو آسانی سے کھول دیتے ہیں اور ان کی جو تیرتے پھرتے ہیں، پھر لپک کر آگے بڑھتے ہیں پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔“

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں کی قسمیں بیان کی ہیں ان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان چیزوں کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بطور شواہد و بینات کے پیش کیا گیا ہے، ان کی عظمت اور جلالت قدر ذکر کرنا مقصود نہیں، جیسا کہ عام طور پر مفسرین کرام کا خیال ہے اور غالباً اسی لیے امام فخر الدین رازی نے نوالتین والیتون کی تفسیر میں ان کے طبی فوائد شمار کیے ہیں۔

ایک انسان کوئی دعویٰ کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں گواہ لاتا ہے، لیکن جب اس کے پاس گواہ نہیں ہوتے تو وہ قسم کھاتا ہے یعنی جس چیز کی قسم کھاتا ہے اس کو وہ آخری اور قطعی شہادت کی شکل میں پیش کرتا ہے، یہی مطلب اقسام القرآن کا ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنا اور ذہن نشین کر لیجئے کہ بسا اوقات ہمارے دعویٰ اور قسم میں کوئی ربط اور تعلق نہیں ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ جو قسمیں بیان فرماتا ہے ان کا دعویٰ کے ساتھ بہترین تعلق ہوتا ہے، اس دعویٰ کی تصدیق آپ کو اس وقت ہوگی جب آپ ہماری تمام کتاب پڑھ لیں گے۔

عربی زبان میں کئی الفاظ قسم کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ان کا باہمی فرق بیان کر دیں، تاکہ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۱)۔ قسم: اس کے معنی شہادت کے ہیں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو برابر استعمال کرتا ہے۔

(۲)۔ یسین: اس کے اصلی معنی توکیل اور ذمہ داری کے ہیں اور یہ معاملات کے زیادہ مناسب ہے۔

(۳)۔ ایلائہ: بالکل نذر اور منت کے معنی میں ہے، اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب آپ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد کریں، مگر عموماً اس کا استعمال ضرر کے لیے مخصوص ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔

(۴)۔ حلف: ادنیٰ درجہ کے لوگ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، شریف انسان اس کے استعمال سے پرہیزی کرتا ہے اور

اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے، قرآن نے خود اس کی مذمت کی ہے: وَلَا تُطَعَّمُ كُلَّ خَلَافٍ مَّهِينٍ (القلم ۱۰)، ”اور کسی ایسے شخص کے کہنے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے۔“

### رجوع الی المقصود

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ اس سورت کی قسموں میں غور کیجئے، جن کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں، مگر حافظ ابن کثیر نے صرف ایک ہی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ ان تمام اقسام سے فرشتے مراد ہیں اور ان کے مختلف اعمال کی ان آیات میں تشریح کی گئی ہے۔ ابن مسعود، ابن عباس، مسروق، سعید بن جبیر، بوصاح اور ابو لہٰجی اسی طرف گئے ہیں اور یہی ہمارا خیال ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کفار کے نزدیک مشکل ترین مسئلہ یہی ہے کہ قیامت کس طرح ہو سکتی ہے اور وہ بار بار اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہیں، ان آیات میں فرشتوں کے مختلف اقسام اور ان کے فرائض کی طرف ان منکرین قیامت کو متوجہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض فرشتے وہ ہیں جو کفار کی روح قبض کرنے پر معین کیے گئے ہیں، چونکہ ان لوگوں نے اپنی تمام زندگی غیر ذمہ دارانہ طریق پر بسر کی ہوئی ہے، اس لیے مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور ہر ممکن طریق سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ان کی روح جسم کے ہر ایک کونے میں چھپتی ہے کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکل آئے، اس لیے فرشتوں کو ان کے جسم کے ایک ایک کونہ کی تلاش کر کے ان کی روح کو نکالنا پڑتا ہے۔

مگر ان کے برخلاف ایک مسلمان اللہ کے نام پر ہر وقت مرنے کو تیار رہتا ہے، وہ نہایت مسرت و شادمانی سے اپنی جان عزیز خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور فرشتوں کو ان کی روح قبض کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

ہم اپنی تفسیر میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے ملائکہ پیدا کیے ہیں اور ہر جماعت کے فرائض جدا گانہ ہیں، اگر ایک جماعت حافین حول العرش ہے تو دوسری حبلۃ العرش، بعض وہ فرشتے ہیں جو آسمان وزمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں، وہ صرف حکم خداوندی کے منتظر ہیں، جس وقت وہاں سے کوئی حکم ملتا ہے فوراً آگے بڑھتے ہیں کہ سب سے پہلے میں اس کو لے لوں، ارشاد خداوندی کے بعد سب کے سب اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس طرح مصروف ہو جاتے ہیں کہ انہیں دنیا جہان کی مطلق خبر نہیں رہتی۔

### فرشتوں کی خصوصیت

قرآن کریم نے اگرچہ فرشتوں کے مختلف اقسام بیان کیے ہیں مگر خصوصیت سب کی ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (التحریم ۶) ”جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں“، اس صفت کو پیش نظر رکھ کر کفار کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آج جس

طرح وہ ان فرائض کی بجا آوری میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے، اسی طرح جب مالمک السموات والارض اس کائنات عالم کو فنا کرنے کا ارادہ کرے گا تو صرف ایک اشارہ کن کافی ہو گا اور یہ تمام فرشتے ایک ہی آن میں سب کچھ نیست و نابود کر دیں گے۔ ﴿يَوْمَ يَغِيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَنَفْحِ الْبَصْرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (النحل ۷۷) ”اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے اور خدا کے نزدیک قیامت کا آنایوں ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی جلد تر، کچھ شک نہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔“ سورہ لقمر میں فرمایا ﴿وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدٌ كَنَفْحِ الْبَصْرِ﴾ (القمر ۵۰) ”اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے۔“

پس کفار و منکرین قیامت اسے کچھ مشکل خیال نہ کریں، ان اقسام سے عبرت اندوز ہوں اور اس آنے والے دن کے لیے تیار ہو جائیں۔

### اظہار تعجب

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ يَقُولُونَ عَرَانَا ۝ لَمْرُدُّوْنَ فِي الْحَاظِرَةِ ۝ عَرَا كُنَّا عِظَامًا مَّخْرِجَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذَا كُنَّا فَخْرًا ۝ فَالْيَوْمَ نَخْلَعُهَا زُجْرًا ۝ وَاحِدَةً ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝

”(غرض روز قیامت ضرور آنے والا ہے) جب کہ زمین لرز جائے اور زلزلے کے بعد زلزلہ آئے اس دن بہت سے دل دھڑک رہے ہوں گے، ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوں گی، کہتے ہیں کہ کیا ہم مرے پیچھے پھر اٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے، کہتے ہیں کہ ایسا ہوا تو یہ لوٹنا نقصان کی بات ہے سو قیامت کی بس اتنی حقیقت ہے کہ ایک ڈانٹ بتائی اور ایک دم سے سب لوگ میدان حشر میں آ موجود ہوئے۔“

راجفہ، رجف زلزلے کو کہتے ہیں۔ رادفہ، ہر وہ چیز جو ایک چیز کے بعد آئے، اسی سے ردیف شعر ہے۔ واجفہ، وجاف کہتے ہیں ڈرنے اور مضطرب ہونے کو۔ حافرہ حفہ سے، جس کے معنی کھودنے کے ہیں اس سے مراد قبر ہے، نخرہ پرانے اور بوسیدہ ہونے کو کہتے ہیں، ساہرہ۔ میدان۔

حادثہ قیامت جب رونما ہو گا تو اس سے قبل مسلسل یکے بعد دیگرے زلزلے آئیں گے، جیسا کہ جدید ترین تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کی کیفیت یہ ہو گی کہ خوف و دہشت کے مارے سب کے دل دھڑک رہے ہوں گے اور اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو یاد کر کے ان کی آنکھیں شرم و ندامت اور حسرت و یاس میں نیچے جھکی ہوں گی۔

کفار مشرکین کے سامنے جب اس حادثہ کبریٰ کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں تو وہ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اور ہنسی کے طور پر کہتے ہیں کہ کیا واقعی قبروں میں پھر دوسری مرتبہ زندگی ملے گی؟ بھلا کیا سڑگل جانے کے بعد پھر ہڈیاں درست



ہو جائیں گی بے شک اگر ایسا ہوتا تو یہ لوٹنا یقیناً نقصان کا موجب ہو گا۔

یہ لوگ قیامت کو بعید از عقل و فہم خیال کرتے ہیں، انھیں کسی طرح بھی یقین نہیں آتا کہ ایسا ممکن ہے، اس لیے وہ اس خیال پر ہنستے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ خدائے قادر و توانا کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں، صرف ایک حکم کی دیر ہے کہ سب کے سب اس کے روبرو ایک میدان میں جواب دینے کے لیے موجود ہو جائیں گے: وَ نُنْفِخُ فِي السُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُنْفِخُ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ فِيْ سَاوِيٍّ يَنْظُرُوْنَ (الزمر ۶۸) ”اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر وہ جس کو خدا چاہے پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے“، دوسری جگہ آتا ہے نِيَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَنَدٍ وَ تَقُلُوْنَ اِنْ لِّمِشْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۵۲) ”جس دن وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی تعریف کے ساتھ جواب دو گے اور خیال کرو گے کہ تم دنیا میں بہت کم مدت رہے۔“

### فرعون کی ہلاکت

اگر ان لوگوں کو اب بھی شک و اشتباہ ہے اور ان کے خیال میں یہ بات نہیں آسکتی کہ اتنا بڑا کارخانہ کس طرح فنا کیا جاسکتا ہے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے تو انھیں چاہیے کہ وہ ذیل کے واقعہ میں غور و فکر سے کام لیں، اس سے ان کے تمام شبہات زائل ہو جائیں گے۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوسٰى ۝ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٖ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعٰوْنَ اِنَّهٗ طَغٰ ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَنْتَقِیَ ۝ وَ اِهْدِيْكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْلُسِیَ ۝ فَاَرٰهُ الْاٰیٰةَ الْكُبْرٰى ۝

”موسیٰ کا قصہ بھی تم کو پہنچا ہے جب کہ ان کو طویٰ کے میدان پاک میں ان کے پروردگار نے پکار کر فرمایا کہ موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے بہت سراٹھا رکھا ہے اور کہو کہ بھلا تجھ کو اس کی بھی کچھ فکر ہے کہ تو پاک صاف ہو جائے اور میں تجھ کو تیرے پروردگار کی طرف کا راستہ دکھاؤں اور تو اس سے ڈرے، چنانچہ موسیٰ نے جا کر اسکو بڑا معجزہ دکھایا۔“

کوہ طور کے دامن میں جو وادی ہے اس کا نام طویٰ ہے، چنانچہ ایک جگہ آتا ہے: وَ نَادٰیْہٖ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَ قَرْنَبْنٰہُ نَجِیًّا (مریم ۵۲) ”اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب پکارا اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔“

ان آیات میں فرعون کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو مصر کا سب سے زیادہ جابر اور متکبر بادشاہ تھا، جسے انتہائی ظلم و جور پر کمر باندھ رکھی تھی اور جو اپنے تیرے دو عصیان کے نشہ باطل میں اس قدر مست تھا کہ اپنے آپ کو انار بکم الاعلیٰ کہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، جنہوں نے اس کو ہر قسم کے معجزات دکھائے کہ وہ عبرت پکڑے۔

## عِبْرَةُ لِمَنْ يَخْشَى

فَكَذَّبَ وَعَصَى ۖ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَى ۖ فَخَسَفَ فَنَادَى ۖ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ۖ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخْصَى ۖ وَالْأُولَى ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِمَنْ يَخْشَى ۖ

”تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی پھر لوٹ گیا اور لگامو سی کے خلاف تدبیریں کرنے یعنی لوگوں کو جمع کیا اور ان میں یوں منادی کرادی اور کہہ دیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں تو اس کو خدا نے آخرت اور دنیا میں دھر پکڑا، بیشک جو شخص ڈرتا ہے اس کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔“

نکال بمعنی تنکیل، اس عذاب کو کہتے ہیں جسے لوگ دیکھ کر یاس کر عبرت پکڑیں، اس کے اصلی معنی منع کرنے کے ہیں چونکہ تعذیب بھی لوگوں کو ان باتوں کے کرنے سے روکتی ہے، جن کا نتیجہ تعذیب ہو، اس لیے تنکیل کو تعذیب کہتے ہیں۔ اگرچہ حضرت موسیٰ نے ہر ممکن طریق سے فرعون کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور ہر قسم کے دلائل اس کے سامنے پیش کیے، مگر وہ برابر ان تمام باتوں کا انکار ہی کرتا رہا، بلکہ ان معجزات قاہرہ کو دیکھنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو موسیٰ کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اس نے تمام اطراف مملکت سے عظیم الشان لشکر جمع کیا اور انار بکم الاعلیٰ کا ڈنکا بجا دیا۔

بے شک موسیٰ ایک عاجز و در ماندہ انسان تھے، ان کے پاس کوئی مسلح فوج نہ تھی جو ان کا مقابلہ کرتی، فرعون کا لشکر ہر قسم کے آلات حرب سے آراستہ تھا اور تمام ملک کا خزانہ اس کی امداد پر، مگر دیکھو اس کا انجام کیا ہوا، اس کی اتنی بڑی سلطنت کہاں گئی: فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۖ (الشعر آء ۵۷-۵۸) ”تو ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکال دیا اور خزانوں اور نفیس مکانات سے“ اس قصہ کی مزید تفصیل اور اس کے دلچسپ نتائج و عبر ہماری کتاب ”بصائر“ میں ملاحظہ کیجئے۔

اب غور کرو! کیا حکم خداوندی کے اجرا میں اس کی اتنی بڑی سلطنت کوئی رکاوٹ پیدا کر سکی؟ کیا اس کے لشکر نے کچھ مدد کی؟ ہر گز نہیں فرعون کا یہ واقعہ عبرتوں اور بصیریوں کے صدا خزانے اپنے اندر مخفی رکھتا ہے، پس وہ لوگ جو قیامت کو ناممکن خیال کرتے ہیں وہ دیکھ لیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے جبار بادشاہ کو آن واحد میں نیست و نابود کر دیا، اسی طرح وہ تمام کائنات ارضی و سماوی کو بھی ایک ہی لمحہ میں فنا کر سکتا ہے۔

عَاثْتُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءِ بُلُهَا ۖ رَفَعَ سَنَكَهَا فَسَوْسُهَا ۖ وَانْقَطَسَ لَيْلُهَا وَآخِرَ جُزْأِهَا ۖ وَالْأَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۖ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعُهَا ۖ وَالْجِبَالُ أَرْسُهَا ۖ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۖ

”گو! جھلا تمہارا پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا بنانا کہ اس کو خدا نے بنایا اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اس کو ہموار کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کی دھوپ نکالی اور اس کے علاوہ زمین کو بچھایا اسی میں سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا اور

پہاڑوں کو اس میں گاڑ کر پلا دیا، یہ سب تمہارے اور تمہارے چار پایوں کے فائدہ کے لئے۔“  
سبکھا، کسی چیز کی بلندی جب نیچے کی جانب سے اوپر کی طرف تک لی جائے۔

اعطش، اس کے لغوی معنی اندھیرے کے ہیں، یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا۔ دَحَھا، دَحَھتے ہیں۔ بچھانے کو مرعھا، چراگاہ۔“

جو لوگ قیامت کو ناممکن الوقوع خیال کرتے ہیں وہ ذرا اس بات میں تو غور کریں کہ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کا پیدا کرنا مشکل تھا یا اس بے ستون آسمان کا بنانا؟ جب اس نے یہ نیلگوں چھت بنائی اور نہ صرف یہ بلکہ دن اور رات، زمین اور پہاڑ، پانی اور مرغزار، تو اس کے لیے قیامت اور انسان کو دوبارہ زندگی بخشا کیا مشکل ہے؟  
یہ سمجھ لیجئے کہ اوپر جو کچھ مذکور ہوا ہے وہ تمام و کمال صرف انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو کیا وہ انسان جس کی خاطر جمادات، نباتات، حیوانات اور کواکب و سیارات پیدا کیے گئے مرنے کے بعد بالکل فنا ہو جائے گا اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا؟ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام کارخانہ لغو و مہمل ہو، ضرور ایک نہ ایک دن اس نظام کو توڑ دیا جائے گا اور اس روز انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔

## نتائج اعمال

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَةُ الْكُبْرَىٰ ۖ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ ۚ وَبُورَّتِ الْجَنِيمُ لِمَنِ يُؤْزَىٰ ۚ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۖ وَآثَرَ الْحَيَوةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ الْجَنِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ

”تو جب بڑی آفت آئے گی، اس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے نکال کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔“

الطامة، کہتے ہیں بڑی مصیبت اور آفت کو جو کسی طرح نہ ٹل سکے اور سب پر غالب آجائے والساعة ادھی وامر۔  
ان شواہد و بینات کے بعد انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حادثہ کبریٰ اور یہ مصیبت عظمیٰ یقینی اور قطعی ہے اور اس سے کسی طرح بھی بچاؤ ممکن نہیں۔ جب یہ انقلاب عظیم رونما ہو گا تو ہر انسان کو اپنے تمام وہ اعمال یاد آجائیں گے جو اس نے اپنی زندگی میں کیے تھے، مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے بالکل بھول گیا تھا۔ ادھر یہ اعمال یاد آئیں گے اور ادھر دوزخ اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی: وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَاِدُّهَا ۖ كَانَ عَلَىٰ رِبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم ۷۱) ”اور تم میں کوئی نہیں مگر اسے اس پر گزرنہا ہو گا، یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔“

یہ وقت نتائج اعمال کا ہو گا، جن لوگوں نے اس زندگی میں طغیان و سرکشی اختیار کی اور دنیاوی فوائد کو آخرت پر برابر

ترجیح دیتے رہے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، لیکن جو اپنی ذمہ داری و مسؤولیت کے خیال سے ورع و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے رہے، اللہ کا خوف ان کے دل پر طاری رہا اور انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شیطانی وساوس اور خواہشات نفسانی سے بچایا تو وہ یقیناً جنت میں جائیں گے۔

غرض یہ کہ اس روز صرف اعمال پر فیصلہ ہوگا: کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المذثر ۳۸) ”ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے۔“

## قیامت کی تاریخ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِلُهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا آتَتْ مُنْذِرُ مَن  
يَخْشَاهَا ۚ كَالَّذِينَ يَدْعُونَ يَوْمَ نَبَأُ الْآعْشِيَةِ أَوْ يُضْهِئُهَا ۝

”لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، سو تم اس کے ذکر سے کس فکر میں ہو، اس کا منتہا یعنی واقع ہونے کا وقت تمہارے پروردگار ہی کو معلوم ہے، جو شخص قیامت سے ڈرنا چاہتا ہے تم اس کو آگاہ کر دینے والے ہو اور بس، لوگ جس دن قیامت کو دیکھیں گے تو ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ دنیا میں دن کے آخر پر ہر ٹھہرے یا اول پہر۔“

ان کفار و معاندین کو چاہئے تو یہ تھا کہ جب قیامت کے یہ ہولناک واقعات و حوادث سنے تھے تو اس سے عبرت پکڑتے، اپنی اصلاح کرتے اور اپنی ذمہ داری و مسؤولیت کا خیال کر کے اعمال فاسقہ سے مجتنب رہتے، مگر ان کے تمر و طفیان کی حالت یہ ہے کہ اب آپ سے اس کی تاریخ و وقوع پوچھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آج کسی شخص کو اپنے مرنے کی تاریخ معلوم ہو جائے تو اس کے تمام کاروبار زندگی میں اسی وقت ایک انقلاب عظیم رونما ہو گا اور پھر وہ کم از کم اس دنیا کے کام کانہ رہے گا، اسی پر آپ قیامت کو قیاس کر لیجئے، اس نظام عالم کو قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی تاریخ کسی کو معلوم نہ ہو اور تو اور خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کا علم نہیں حالانکہ تمام انبیاء کرام سے زیادہ آپ نے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

حضرت جبریل نے آپ سے اس کی تاریخ کا سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: مَا لِسْؤَلٍ عَنْهُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، ”اس میدان میں ہم دونوں برابر ہیں“، اسی لئے سورہ اعراف میں آتا ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِلُهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عَلَيْهَا بِنَاءُ بُنْيَانٍ لَّا يُجَالِيهَا بِنُفُثِهَا وَلَا هُوَ يُغْلَبُ فِي السَّانِئَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَالَّذِينَ هُمْ عَنْهَا يُحْفَظُونَ ۚ قُلْ إِنَّمَا عَلَيْهَا بِنَاءُ بُنْيَانٍ لَّا يُجَالِيهَا بِنُفُثِهَا وَلَا هُوَ يُغْلَبُ فِي السَّانِئَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَالَّذِينَ هُمْ عَنْهَا يُحْفَظُونَ (الاعراف ۱۸۷) ”اے پیغمبر لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا تھل بیڑا بھی ہے، تم ان کو جواب دو کہ اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے بس وہی اس کو اس کے وقت مقرر پر لا دکھائے گا، وہ ایک بڑا بھاری حادثہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں واقع ہوگا، قیامت تو بس

اچانک تم لوگوں کے سامنے آ موجود ہوگی، اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت کا حال اس طرح اصرار کے ساتھ دریافت کرتے ہیں کہ گویا تم اس کی ٹوہ میں لگے رہے ہو اور تم کو اس کا وقت معلوم ہے، تو ان سے کہو کہ قیامت کا علم تو بس خدا ہی کو ہے، لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔“

بعض کتابوں میں قیامت کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بہت سے نجومی بھی اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں، مگر یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ سرتاپا غلط ہے اور کسی شخص کو اس کا علم نہیں ہو سکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا خدا کا محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

## دنیا کی زندگی

رسول کا فرض اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ آثار و قرائن بیان کر کے لوگوں کو اس کے لیے تیار کر دے اور اس کے نتائج و عواقب ان کے سامنے پیش کر دے، تاریخ بتانا نہ اس کا کام ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت و بزرگی ہے۔ آج تو یہ لوگ جلدی کرتے ہیں، اس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب وہ وقت آجائے گا تو ان کو اپنی تمام زندگی اس کے سامنے بالکل بے معنی اور بے حقیقت معلوم ہوگی اور وہ ایسا خیال کریں گے کہ دنیا میں ہماری زندگی چند گھنٹوں کی تھی، تو پھر جس حیات مستعار کا یہ نتیجہ ہو اس پر اترانے اور فخر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سورہ احقاف میں آتا ہے: **كَأَنَّهُمْ يَوْمَ رَيْدُونَ مَا يُوعَدُونَ ۚ لَمْ يَلْبِسُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ (الاحقاف ۳۵)** ”جس دن یہ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن“، ایک جگہ یوں آتا ہے: **لَيْسَتْ نَارُ مَا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ (المؤمنون ۱۱۳)** ”ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔“



## عبس

(آیات، ۴۲)

## تلخیص مضامین

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کی بنا پر دنیا میں مختلف قسم کے لوگ پیدا کیے ہیں، بعض امیر ہیں بعض غریب۔ ایک ابتدا ہی میں دو متمند گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا مفلس و قلاش باپ کے گھر میں، اس تفریق و امتیاز کی بنا پر ارباب دولت و ثروت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دنیا کے ہر کاروبار میں ان کو غریب اور مساکین کے مقابلہ میں نمایاں اور ممتاز حیثیت دی جائے، پھر ان کا یہ غرور باطل یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ وہ تعلیم الہی کے کسب و حصول میں بھی اس فرق و امتیاز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ مطالبہ قطعاً غلط اور بے بنیاد دلائل پر مبنی ہے۔

سورہ عبس میں اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصولاً یہ چیز غلط ہے، تعلیم میں مساوات ضروری ہے، اسی لیے ابتدائے سورہ میں حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ آیت ۱۱ سے بتایا ہے کہ قرآن کی تعلیم بہترین ہے اور اس کے حامل مخصوص لوگ ہوں گے پھر آیت ۱۷ سے اس غرور باطل کے پتلے انسان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف دوروں کا مطالعہ کرے، پیدائش، موت اور اس کے درمیان کا حصہ، کیا ان میں سے کسی حصہ میں بھی فقیر اور شاہ کا امتیاز کیا گیا ہے؟

آیت ۳۳ سے بتایا کہ قیامت کے روز نسل و خاندان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، بلکہ ہر شخص اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہوگا، پس جب یہ غرور باطل اس روز کچھ کام نہ آئے گا تو آج خود بخود کیوں نہیں اس کو چھوڑ دیتے، آیت ۳۸ سے نتائج کی طرف توجہ دلائی اور اسی پر سورہ کو ختم کر دیا۔



## مساوات عمومی

عبداللہ بن ام مکتوم  
رسول اللہ ﷺ کو حکم تھا کہ سب سے پہلے اپنے عزیز و قریب کو ہدایت کی طرف بلائیں، نواذد عشیرتک الا قریبین، چنانچہ ایک روز سرداران قریش میں کا ایک سردار آپ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا اور آپ کے سامنے اسلام کی تعلیم پیش کر رہے تھے کہ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتوم ایک نابینا صحابی آپ کے پاس آئے، ان کی والدہ ام مکتوم حضرت خدیجہ کی خالہ ہیں، آپ نے عبداللہ کو دیکھا تو آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ رئیس قوم محض اس وجہ سے کہیں اسلام سے برگشتہ نہ ہو جائے کہ میرے پیروکار غریب و مفلس لوگ ہیں، اس خیال کا آنا تھا کہ حسب ذیل آیات نازل ہوئیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا يَذْرَئُكَ لَعَلَّهٗ يَكْفُرُ ۝ اَوَيْدُكَ فَمَنْعَكَ الدِّكَرَ ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَعْفٰی ۝ فَانْتَ لَهُ تَصَدَّقُ ۝ وَمَا عَلٰیكَ الْاَلَمِ ۝ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰی ۝ وَهُوَ يَخْفٰی ۝ فَانْتَ عَنْهُ تَلَهٰی ۝

”ترش رو ہوئے اور منہ موڑ بیٹھے کہ ایک نابینا ان کے پاس آیا اور تم کیا جانو عجب نہیں کہ تمہاری تعلیم سے وہ سنور جائے یا نصیحت کی باتیں سنے اور اس کو نصیحت سود مند ہو، توجو شخص بے پروائی کرتا ہے اس کی طرف تو تم خوب توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ ٹھیک نہ ہو تو تم پر کچھ الزام نہیں اور جو خدا سے ڈر کر تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے تو تم اس سے بے اعتنائی کرتے ہو۔“

تصدی یہ صدہ سے ہے، اس کے معنی سامنے آنے اور متوجہ ہونے کے ہیں یہ تولى ہے۔ کی ضد ہے، تلهی یہ لہی سے لیا گیا ہے، اس کے معنی اعراض کرنے اور منہ موڑ لینے کے ہیں۔“

یہ عتاب نہیں

دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری تعلیم کتاب و حکمت کے لیے تھی اور اس لیے آپ اپنا تمام وقت لوگوں کی ہدایت و رہنمائی میں صرف کرتے تھے اور بعض اوقات یہ ولولہ تبلیغ اسلام اپنی انتہائی مدارج طے کر لیتا تھا، اس لیے خود لسان الہی کو اس سے روکنا پڑتا تھا، اس لیے کہ بسا اوقات مومنین صالحین کی حق تلفی ہوتی تھی اور آپ کا تمام وقت معاندین کے ساتھ صرف ہو جاتا تھا، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: لَعَلَّكَ بِاِحْمٍ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء ۳) شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے، ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَاضِدٌ نَّفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنُكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الدُّنْيَا (الکہف ۲۸) اور جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارنے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں ان کے ساتھ صبر کیے رہو اور تمہاری نگاہیں ان پر سے گذر کر اور طرف نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ۔ خود حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ ایک غریب مسلمان آتا ہے، مگر آپ کی تمام تر توجہ اس شخص کی طرف رہتی ہے جس کے دل میں اسلام کی طرف ذرہ برابر بھی میلان نہیں پیدا ہوا۔

وحی الہی ہمیشہ مواقع کی منتظر رہتی ہے۔ چنانچہ فوراً اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں جو زیب عنوان ہیں، جو ایک طرف ان کفار و معاندین اسلام کی زجروت و توبخ اور تنبیہ و تادیب پر حاوی ہیں کہ اب انھیں قابل توجہ خیال نہیں کیا جاتا اور دوسری جانب ان فرزند ان اسلام کے لیے فرح انبساط اور مسرت و شادمانی کا ذخیرہ ہیں جو اس میں شک نہیں کہ غریب اور مفلس ہیں، مگر دولت ایمان سے مالا مال ہیں، پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی توجہ کو ان لوگوں کی طرف پھیر دیا جو حقیقت میں اس شفقت و رحمت کے اہل تھے اور فرمایا: اَذِّنْ بِهٖ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُحْشَرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَّلٰى وَلَا شٰفِئِعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۚ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا اٰوَلٰٓءِذَا مَنَّ اللّٰهُ عَلٰیهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ۙ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشَّاكِرِيْنَ ۝ (الانعام ۵۳) اور جو لوگ خوف رکھتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر کیے جائیں گے اور جانتے ہیں کہ اس کے سوانہ تو ان کا کوئی دوست ہو گا اور نہ سفارش کرنے والا، ان کو اس قرآن کے ذریعے نصیحت کرو تا کہ پرہیزگار بنیں اور جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں اور اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو اپنے پاس سے مت نکالو، ان کے حساب کی جواب دہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جواب دہی ان پر کچھ نہیں، پس ایسا نہ کرنا، اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ جو دو لٹمنہ ہیں وہ غریبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم میں سے فضل کیا ہے، بھلا خدا شکر کرنے والوں سے واقف نہیں؟

### عصمت انبیائے کرام

کوئی انسان اپنی سعی و کوشش سے نبی اور رسول نہیں بن سکتا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مخصوص فضل اور احسان ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس فضیلت و برتری کے لیے چن لیتا ہے: اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ، لیکن جس برگزیدہ ہستی کو وہ چن لیتا ہے، اس کے تقویٰ و طہارت اور ورع و پاکیزگی کو اس کی تمام امت بھی متفقہ طور پر نہیں پہنچ سکتی، وہ اپنے اتباع و مقلدین کے لیے نمونہ عمل اور اسوۂ حسنہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل مخصوص سے اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو ہر قسم کے زلیخ و کج روی سے بچاتا ہے: فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور ۲۸) ”تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو“، سورہ جن میں آتا ہے: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اٰتٰلَعُوْا رِسٰلَتِ رَبِّهِمْ وَاَحْلٰطَ بِمَا لَكَدٰلٰہُمْ وَ



أَخْطُو كُلَّ شَيْءٍ عَدَاً ۝ (الزلزلہ ۲۸-۲۷) ”اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تاکہ معلوم فرمائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیے ہیں اور یوں تو اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔“

پس اللہ تعالیٰ ہر صورت میں اپنے نبی کی حفاظت کرتا ہے، کبھی اس کو ایک جگہ رحمت کرنے سے روکتا ہے کہ وہ اس کا صحیح محل استعمال نہیں اور کبھی اس کو صبر و استقامت کی تعلیم دیتا ہے کہ اس کی غیرت اس کا تقاضا کرتی ہے، خود اس قصہ کو دیکھیے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ آپ بیجا موقع پر اپنی رحمت و شفقت کو استعمال کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوراً روک دیا اور صحیح جانب متوجہ کر دیا۔

### غلط فہمی کا ازالہ

ان آیات سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا ہے کہ عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے آتے ہی چند سوالات کیے تھے، جن کی بنا پر آپ ناراض ہو گئے، چنانچہ بعض روایات بھی اس خیال کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں اور اسی بنا پر امام فخر الدین رازی کو اپنی عادت کے مطابق ان امور کو تسلیم کر کے جواب دینا پڑا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ احادیث سب کی سب کمزور اور ضعیف ہیں، چنانچہ آیت وما یدریک لعلہ یز کی اویذ کہ فتفتعه الذکر ی، ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کو اس کی ہرگز اطلاع نہ تھی کہ وہ اس غرض کے لیے آئے ہیں، اگر آپ کو معلوم ہوتا آپ یقیناً ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

اس کے سوا ان آیات کا اور کوئی مطلب نہیں کہ ان کا آنا ہی آپ کو ناگوار گذرانا کہ روساء قوم یہ نہ کہیں کہ ادنیٰ درجہ کے لوگ اس رسول کا اتباع کرتے ہیں اور اس لیے اسلام سے رک جائیں، چنانچہ مجاہد کی بھی یہی رائے ہے۔

### خصوصیات قرآن

كَلَّا أَتَاهَا ذِكْرًا ۝ فَتَن شَاءَ ذِكْرًا ۝ فِي صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ ۝ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

”ہرگز نہیں ایہ (قرآن مجید) تو ایک نصیحت ہے، سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے، بہ مکرم، معظم، بلند مقام اور پاکیزہ صحیفوں میں درج ہے، جو بزرگ اور نیک کاتبوں کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔“

سفرہ جمع ہے سافر کی، لکھنے والے کو کہتے ہیں، اس کے لغوی معنی ظاہر کرنے کے ہیں، لکھنے والا بھی اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کو سافر کہتے ہیں۔ بردہ جمع ہے بار کی اس کے معنی فرماں بردار کے ہیں۔

گذشتہ آیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعوتِ وارشاد میں غلو سے کام لے رہے تھے اور ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کرتے تھے، اس لئے آپ کو بتایا گیا کہ آپ پریشان خاطر نہ ہوں، اگر آپ کی سعی و کوشش کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی: نَكُنتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّطٍ (الغاشیہ ۲۲)، ”تم ان

پر داروغہ نہیں ہو۔“

اب ان آیات میں قرآن کریم کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ جو تعلیم آپ کو دی گئی ہے، جلالت قدر میں دنیا کی کوئی تعلیم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ قرآن یکسر تذکیر و موعظت اور پسند و نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے عبرت اندوز و بصیرت افروز ہو، آپ کو اپنے علوم مرتبت سے نیچے اترنے اور الحاح و تضرع کی ضرورت نہیں، ملاء اعلیٰ میں یہ کتاب عزیز نہایت ہی بلند اور عالی شان اور اق میں لکھی ہوئی ہے۔ وَ اِنَّهُ فِيْ اَمْرِ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلٰى حَكِيْمٌ (الزخرف ۲۳) ”اور یہ بڑی کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہمارے پاس لکھی ہوئی اور بڑی فضیلت اور حکمت والی ہے۔“

اس کی پاکی اور تطہیر کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں تک کسی غبیث کی رسائی نہیں ہو سکتی بِقِ كِتٰبٍ مُّكْنُوْنٌ ۝ لَا يَشْعُرُ اِلَّا الْمُنْظَرُوْنَ (الواقعه ۷۹) ”اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں“، دوسری جگہ فرمایا: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مُّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْضُوْطٍ (البروج ۲۲۲) ”بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا“، ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وَ اِنَّهُ لِكِتٰبٍ عَزِيْزٍ ۝ لَا يٰتِيْنِهٖ الْبٰطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (فصلت ۴۲) ”اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے، دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔“ جن فرشتوں کی معرفت اس قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کیا جاتا ہے، ان کی طہارت و پاکیزگی، ورع و تقویٰ اور قدر و منزلت میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا: اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطٰعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (التکویر ۲۱) ”اے شک یہ قرآن فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے، جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا سردار اور امانت دار ہے۔“

اعتبار

پس جس قرآن کی یہ صفات و مختصات ہوں اس کے لیے اصرار و الحاح کی ضرورت نہیں، بلکہ آپ ان معاندین کی پر واک نہ کیجئے، جس کا جی چاہے ایمان لے آئے، خواہ انکار کر دے: فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ۔ قرآن کی جو صفات اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے لطیف طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں بھی وہی لوگ اس کے حامل اور پیغامبر ہوں گے جن میں یہ صفات ممتاز اور نمایاں ہوں گی۔ چنانچہ صحابہ کرام کی جو جماعت رسول اللہ کی صحبت سے تیار ہوئی، ان کے فضائل و کمالات کو دیکھیے تو ان آیات کا ایک ایک حرف ان پر صادق آئے گا: ب فہداهم اقتده، تمہیں چاہیے کہ تم لوگ بھی اسی رسول اور اس کے اصحاب کی پیروی کرو تا کہ تم میں وہی خصوصیات رونما ہوں۔

انسان کی ناشکر گزاری

قَتَلَ الْاِنْسَانَ مَا اَنْكَرَ ۝ ۱۰ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝ ۱۱ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ۝ ۱۲ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهُ ۝ ۱۳ ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاَقْبَرَ ۝ ۱۴ ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشُرَهُ ۝ ۱۵ كَلَّا لَبَآئِيْغُصٌ مَّا اَمَرَ ۝ ۱۶ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ۝ ۱۷ اَنَّا صَبَبْنَا

الْبَاءَ صَبَابًا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعَيْنَبًا وَفَصْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنعَامِكُمْ ۝

”آدمی پر خدا کی بارود کس قدر ناشکر گزار ہے، خدا نے اس کو کس چیز سے پیدا کیا، نطفہ سے، پہلے اس کو بنایا پھر اس کی ہر ایک چیز کا اندازہ باندھ دیا، پھر نیکی اور بدی کا راستہ اس پر آسان کر دیا پھر اس کو قبر میں لیجا دیا اور اس کو چاہے گا اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ حق تو یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ آدمی کو حکم دیا اس نے اس کی تعمیل ہی نہیں کی، تو آدمی کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف توجہ کرے کہ ہم نے اوپر سے پانی برسا یا پھر ہم نے زمین کو پھاڑا پھر ہم نے زمین میں یہ سب کچھ اگایا یعنی غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ، یہ سب اس لیے کہ تم لوگوں کو اور تمہارے چارپایوں کو فائدہ پہنچے۔“

قضا: ترکاری، اس کے لغوی معنی کاٹنے کے ہیں، ترکاری بھی برابر کاٹی جاتی ہے اس لیے اس کو قضا کہتے ہیں۔ غلبا جمع ہے اغلب کی، وہ درخت جس کی شاخیں دوسرے سے لپٹی ہوئی ہوں۔ ابا: چارہ۔  
اللہ تعالیٰ نے تو فرزند آدم کی فلاح و کامرانی کے لیے انبیاء و رسل کا سلسلہ قائم کیا اور ان کی معرفت اپنی تعلیم نازل کی، مگر یہ اب اپنی دولت و ثروت پر نازاں ہیں، اپنی نسل کا انھیں غرور ہے اور اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور نمایاں خیال کرتے ہیں، اس لیے ان کی خواہش یہ ہے کہ ہمیں فقر اور مساکین سے الگ کر کے تعلیم دی جائے اور یہ صرف اسی لیے قرآن کی تعلیم سے گریز کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے والے دنیاوی لحاظ سے معمولی ہیں: اَنْتُمْ كَمَا امَنَ السُّفَهَاءُ (البقرة ۳۱) ”کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح اور احمق ایمان لے آئے ہیں“، کبھی کہتے ہیں: اَنْتُمْ لَكُمْ وَ اتَّبَعَكَ الْاَذْدَلُونَ (اشعر آء ۱۱۱) ”کیا ہم تم کو مان لیں اور تمہارے پیرو تو زلیل لوگ ہوئے ہیں۔“

ابتدا و انتہا

ان احمقوں کو چاہیے کہ اپنی زندگی کی ابتدا و انتہا میں غور کریں، کیا ان کی پیدائش ایک غریب کے مقابلہ میں کسی بہتر طریق سے ہوئی ہے؟ وہی منی کا قطرہ ہے جس سے امیر اور غریب کی تخلیق عمل میں آئی ہے، پھر موت اور عالم برزخ دونوں کے لیے برابر ہیں، سب کو خدا نے نیکی اور بدی کا راستہ بتا دیا ہے اور کسی قسم کی تفریق نہیں کی۔

درمیانی زندگی

اب تم زندگی کے درمیانی مراحل کو دیکھو، آسمان سے پانی سب کے لیے برابر نازل ہوتا ہے، زمین سے ہر قسم کی سبزی تمام کے واسطے نکلتی ہے، اس میں نہ صرف امیر و غریب شریک ہیں، بلکہ ان کے چارپائے بھی حصہ دار ہیں۔ انسان اس قدر عاجز و درماندہ ہے کہ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی بخشش و جود کا رہن منت ہے، اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ ناپاک قطرہ منی سے بنایا گیا ہے، اپنی زندگی کی ہر گھڑی کو قائم رکھنے کے لیے وہ یکسر محتاج و دست نگر ہے، اس عجز و

درماندگی میں ایک فقیر اور بادشاہ، غلام اور آقا، عورت اور مرد ایک ہی سطح پر ہیں، پھر یہ اس کی کس قدر بد بختی ہے کہ قدرت تو اس کو کہیں بھی ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کرتی، مگر وہ خواہ مخواہ غریب اور امیر میں فرق و امتیاز کی دیوار حائل کرنا چاہتا ہے۔

### اسلام کی خصوصیت کبریٰ

دنیا میں اسلام آیا کہ تمام قومی و نسلی امتیازات مٹا کر ہمیشہ کے لئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دے اور عمل کے قانون الہی کا آخری اعلان کر دے۔ اسلام سے قبل سرزمین عرب میں قوم و نسب کے غرور و استکبار کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں کا ایک شتربان اپنے شرف و مجد خاندانی کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی حقیر و ذلیل خیال کرتا تھا اور یہ صرف عرب ہی کی حالت نہ تھی، تمام دنیا اس میں مبتلا تھی اور ہر طرح کے قومی و وطنی امتیازات کے بتوں کی پرستش میں مصروف تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے اولین کاری ضرب اسی غرور و نسب و قوم کے بت پر لگائی اور اللہ کے اس قانون فطرت کی عام منادی کر دی کہ: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ ۚ** (الحجرات ۱۳) ”ہر طرح کی فضیلت و بزرگی کی بنیاد صرف عمل ہیں اور کوئی شے نہیں، قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لیے ہے کہ باہد گر پہچان ہو اور تمیز کا ذریعہ ہو اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلائے، سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔“

فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے اپنی تقریر میں فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمُ غَيْبَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَالَىٰ ظُهُمُا بَابَائِهَا** فالنَّاسُ رَجُلٌ يَتَّقِي عَلَى اللَّهِ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيْنَ عَلَى اللَّهِ وَالنَّاسُ بَنُو آدَمَ وَخَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مِنَ التُّرَابِ، ”لوگو! اللہ نے تم کو جاہلیت کے فخر و غرور اور خاندانی تکبر و نخوت سے پاک کر دیا ہے، انسان دو ہی قسم کے ہیں، شریف و متقی جو اللہ کے نزدیک محترم ہیں اور دوسرا فاجر و بد بخت جو بدترین خلایق ہیں، سب کے سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا تھا،“ اسی طرح کبھی آپ نے یہ فرمایا: **لَيْسَ مِنْكُمْ مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ**، ”جس نے قومیت کی طرف لوگوں کو بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے،“ ایک مرتبہ آپ نے کہا: **لَيْسَ مِنْكُمْ مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ**، ”جو غرور قومی میں مر گیا وہ ہماری جماعت سے خارج ہو گیا۔“

آپ نے حجۃ الوداع کے روز جو آخری پیغام اپنی امت کو دیا، اس میں اولین چیز یہی تھی کہ آپ نے نوع انسانی کی مساوات عمومی کا اعلان کیا: **لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَبِيٍّ وَلَا لِعَجَبِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ** کلکم ابناء آدم، ”عربی اور عجمی کو ایک دوسرے پر کوئی بزرگی حاصل نہیں تم سب کے سب ایک آدم کی اولاد ہو،“ یہ بھی فرمایا: **لَيْسَ لَأَحَدٍ فَضْلٌ عَلَى أَحَدٍ** الا بدین و تقویٰ، ”کسی شخص کو دین اور تقویٰ کے بغیر دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں تم سب اولاد آدم ہو

اور وہ مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر اسلامی مساوات کا اور کیا ثبوت مل سکتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے: لو کان زید حیا ما استخلف رسول اللہ ﷺ غیرہ، ”اگر آنحضرت ﷺ کے غلام زید زندہ ہوتے تو آپ ان کے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے۔“

## غور و نسل بے کار ہے

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۝ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمُّهُ وَأَبْنَاهُ ۝ وَصَاحِبَتُهُ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝

”تو جب قیامت کا غل مچے گا، اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے، ہر شخص اس روز ایک ذکر میں ہو گا جو اسے مصروفیت کے لیے بس کرے گا۔“

اگر خاندان و قومیت کا غرور و تکبر چھوڑ دو تو بہتر، ورنہ یاد رہے ایک وقت یقیناً آنے والا ہے، جب تمہیں ان امتیازات رنگ و نسل کو خود بخود خیر باد کہنا پڑے گا۔ اس روز حالت یہ ہو گی کہ سب کے سب نفسی نفسی پکاریں گے، ہر ایک کو اپنی اپنی نجات کی فکر ہو گی، آدمی اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی اس خوف کے مارے بھاگے گا کہ ان کے اعمال فاسقہ کی باز پرس کہیں اس سے نہ ہو جائے، وہ خود فکر رستگاری میں اس قدر منہمک ہو گا کہ خاندانی تعلقات سب بھول جائیں گے۔

پس جب اس روز تم ان قومی اور وطنی روابط کو جبراً ادا کرنا ترک کر دو گے تو آج خود بخود کیوں اس فخر سے دست بردار نہیں ہو جاتے۔

## عمل کی قاہرہ قوت

وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌُ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجِرَةُ ۝

”کتنے لوگوں کے منہ اس دن چمکتے ہوں گے ہشاش بشاش اور کتنے لوگوں کے منہ اس دن ایسے ہوں گے کہ ان پر گرد پڑی ہو گی اور گرد کے علاوہ ان پر کالک بھی چھا رہی ہو گی، یہی وہ لوگ ہیں جو دنیا میں کافر اور بدکار تھے۔“

ان آیات میں پھر اسی قانون حقیقت اور سنتہ اللہ کو بیان کیا جاتا ہے جس کی ہمہ گیری کائنات ارضی و سماوی کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ علم و عمل کی قاہرہ قوت ہے۔ دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی ان ہی دو چیزوں پر موقوف ہے۔ چنانچہ قیامت کے روز یہی فطرۃ اللہ اپنا ظہور دکھائے گی، جن لوگوں نے علوم الہیہ کو اخذ کر کے اپنے اخلاق درست کر لیے، وہ مسرور و شادان نظر آئیں گے اور جن بد بختان ملت نے اپنے فطری جذبہ کو فنا کر دیا، تزکیہ نفس کی طرف توجہ نہ کی، وہ ناکام و خاسر رہیں گے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آیات الہیہ کا انکار کیا اور ہمیشہ احکام خداوندی کی نافرمانی کی پھر بھلا انہیں کامیابی ہو تو کیونکر؟

## التکویر

(آیات ۲۹)

### تلخیص مضامین

سورہ عبس کے شروع میں فرمایا تھا: کلا انھا تذکرة فمن شاء ذكره فی صفح مکرمۃ مرفوعة مطهرة بایدی سفرة کما ہر بردۃ، ان صفات و مخصوصات قرآن کو سن لینے کے بعد یقیناً مخالفین کی توجہ اس کتاب عزیز کی طرف ہوگی اور انھیں اس میں درس و نظر کا موقع ملے گا، اس میں غور و فکر کرنے کے وقت ضرور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا، کہ یہ تعلیم کہاں سے آتی ہے؟ یہ شخص جو اس قرآن کو پیش کر رہا ہے، کہیں مجنون و پاگل تو نہیں؟ چنانچہ وہ اس قسم کے الفاظ رسول اللہ کی شان میں کہا بھی کرتے تھے، اس لیے سورہ تکویر میں ان کے اس سوال کا جواب دیا گیا اور ان کو اس نظام کی طرف توجہ دلادی گئی، جہاں سے اس کا فیضان ہوتا ہے۔

اصل مضمون شروع کرنے سے قبل حادثہ قیامت کے مختلف اثرات و نتائج بیان کئے اور فرمایا عذبت نفس ما حضمت، جب حالت یہ ہے کہ انسانی اعمال اس روز ہر شخص کے سامنے پیش کیے جائیں گے تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان منکرین قیامت کو قرآن کریم کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ ان علوم کا اصلی مرکز کو نسا ہے؟ چنانچہ اس کے بعد اس نظام کو بیان کیا، مگر اس کی تقسیم کردی، ایک تو دن اور رات کو شامل ہے، جس میں کسی کو شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں، اسی طرح اگر وہ اس نبی امی کے حالات کا درس و مطالعہ کریں گے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔ لیکن اس کے علاوہ نجوم و کوکب میں خمسہ متخیرہ ہیں، جن کی حقیقت سوائے مخصوص ارباب ہیئت و نجوم کے اور کوئی نہیں جانتا، مگر کسی کو ان سے انکار کی گنجائش بھی نہیں، پس اسی پر تم وحی و الہام کے نظام کو قیاس کر لو، البتہ یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جو فرشتہ اس پیغام کو لاتا ہے وہ معزز، محترم اور دیانت دار ہے اور وہ اگرچہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہے، مگر ہمارے بند محمد نے اس کو اصلی شکل و صورت میں بھی کئی مرتبہ دیکھا ہے۔

آگے چل کر نبی کریم کی خصوصیات بیان کیں کہ ارباب فلسفہ کی طرح وہ بخیل نہیں، بلکہ انھیں ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قرآن تمہیں سنادیں اور یہ بھی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ جس شخص نے اس کتاب کریم کی پیروی کی ہے وہ اعمال و اخلاق میں بہت زیادہ مہذب و شائستہ بن گیا ہے، اگر یہ علوم شیطان کی طرف سے ہوتے تو یہ اخلاقی ارتقانا ممکن تھا، جب یہ عمدہ ترین نتائج تمہارے سامنے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں اس کے آگے خمیدہ گردن ہو جاتے؟ یہ تو ایک عالم گیر قانون اخلاق و ارتقا ہے، کسی قوم، ملک، رنگ اور نسل کی اس میں خصوصیت نہیں، اب جس کا جی چاہے اس کو مان لے۔

## وحی والہام

## واقعات قیامت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

۱۱ إِذَا السَّمَاسُ كُودَتْ ۱۲ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۱۳ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۱۴ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۱۵ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۱۶ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۱۷ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۱۸ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُيِّلَتْ ۱۹ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۲۰ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۲۱

”جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے اور جب دریا آگ ہو جائیں گے اور جب روحیں بدنوں سے ملا دی جائیں گی اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی اور جب دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی اور جب بہشت قریب لائی جائے گی ہر شخص معلوم کرے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔“

عشار جمع ہے عشاء کی، اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل پر دس مہینے گزر گئے ہوں، یہ اونٹنی عرب کے نزدیک بہت زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے۔ عطلت کے معنی ہیں بے کار چھوڑ دینے کے۔ وحوش جمع ہے وحش کی، اس جنگلی جانور کو کہتے ہیں جو آدمیوں سے مانوس نہ ہو۔ حشرات کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ زوجت لیا گیا ہے تزویج سے اور اس کے معنی ایک چیز کو دوسری سے ملانے کے ہیں۔ مؤدۃ واحد مؤنث مفعول کا صیغہ ہے وائید سے اور وائد زندہ درگور کرنے کو کہتے ہیں۔ کشط، کھولنا، جب ذبیحہ کی کھال اتار کر گوشت کھول دیا جاتا ہے تو اسے کشط الذبیحہ کہتے ہیں۔

انسان روح اور جسم سے ترکیب دیا گیا ہے، مگر وہ عموماً اپنے جسم کی حفاظت میں روح کو فراموش کر دیتا ہے اور فضائل اخلاق و محاسن عادات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے، لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس روز فوز و کامرانی صرف اس شخص کے لیے مخصوص ہوگی جو بقلب سلیم اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا۔ ان آیات میں اس دن کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

آج لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں: یسجدون للشمس من دون اللہ، مگر اس روز نہ صرف یہ بے نور ہوگا، بلکہ تمام نجوم و کواکب بھی تاریک ہو جائیں گے، انسان اپنی عزیز ترین اشیاء سے فائدہ اٹھانا بھول جائے گا، سب کے سب میدان



محشر میں موجود ہوں گے: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا آلٍ يَنْتَظِرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ (الانعام ۳۸) ”اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا حیوان یا دوپروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں، ہم نے کتاب یعنی لوح محفوظ میں کسی چیز کے لکھنے میں کوتاہی نہیں کی، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کیے جائیں گے۔“

ان حوادث کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ارواح و اجسام کا باہمی اختلاط و امتزاج ہو گا اور اس لڑکی کو بھی زندگی بخشی جائے گی جسے صرف اس لیے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ خرچ کی کفایت ہو یا دامادی کے ننگ و عار سے بچاؤ ہو: وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِمَّنْ إِمْلَاقٍ (الانعام ۱۵) ”اور ناداری کے اندیشہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔“

زمین جسمانیات کا مرکز ہے اور آسمان روحانی ضروریات کا مخزن، جسمانیات کی جس جگہ انتہا ہوتی ہے وہاں سے روحانیت کی ابتدا ہے، جس روزیہ بیچ کا حجاب بھی اٹھادیا جائے گا تو روحانیت بالکل سامنے آجائے گی، اسی طرح دوسرے واقعات پیش آئیں گے، اس دن ہر شخص اپنے تمام اعمال ان آنکھوں سے دیکھ لے گا: يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ (ال عمران ۳۰) ”جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پائے گا اور ان کی برائی کو بھی دیکھ لے گا“، ایک جگہ فرمایا: يَتَّبِعُوا الْإِنْسَانَ يَوْمَ يُعَذِّبُ بِمَا قَدَّمَ وَ أَخَّرَ (القيامة ۱۳) ”اس دن انسان کو جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے سب بتا دیے جائیں گے“، کفار پکارا ٹھیں گے: مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَافِظًا (الکہف ۴۹) ”یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو، کوئی بات بھی نہیں مگر اسے لکھ رکھا ہے اور جو عمل کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے۔“

### خمسہ متحیرہ

اب بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کہاں سے نازل ہوتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اس نظام سے کیا تعلق ہے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُشْكِ ۖ الْجَوَارِ الْكُنُكِ ۖ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۖ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۖ

”ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور جو سیر کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔“

خنس جمع ہے خانس کی اور یہ خنوس سے لیا گیا ہے، اس کے معنی چھپنے اور پیچھے ہٹنے کے ہیں اور اسی لیے شیطان کو بھی خناس کہتے ہیں، کنس جمع ہے کانس کی اور یہ کنوس سے مشتق ہے جس کے معنی کناس میں داخل ہونے کے ہیں اور کناس وہ جگہ ہے جہاں شب کے وقت جانور رہتے ہیں۔ عسعس اضداد میں سے ہے اور اسکے معنی اقبال و ادبار دونوں کے آتے ہیں۔

ان آیات میں دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:



(الف)۔ تم نے آسمان پر بارہا پانچ ستاروں کو دیکھا ہے جو ایک رفتار پر کبھی قائم نہیں رہتے، صرف بڑے بڑے نجومی اور ہیئت دان ہی ان کی نقل و حرکت اور طلوع و غروب کے لیے قانون معین کر سکتے ہیں، مگر باوجود اس کے آج تک کسی نے ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا۔ ان ستاروں کے نام زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں۔

(ب)۔ شب کو تاریکی تمام عالم پر چھا جاتی ہے، پھر مشرق کی جانب سے ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور آن واحد میں تمام عالم بقعہ نور بن جاتا ہے۔ افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ اس دل فریب نظارہ کو دازنہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ بن کر اس کے سامنے آتی ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں ہوتا۔

## تطابق اقسام

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٥٨﴾ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٥٩﴾ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٦٠﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ﴿٦١﴾ وَقَدْ رَآهُ بِآثْقِ الْمُبِينِ ﴿٦٢﴾

”کہ بے شک یہ قرآن فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجہ والا سردار اور امانت دار ہے اور مکہ والو تمہارے رفیق یعنی محمد ﷺ دیوانے نہیں ہیں، بیشک انہوں نے اس فرشتے کو آسمان کے کھلے یعنی مشرقی کنارہ پر دیکھا ہے۔“

کون و مکان کے جو سلاسل مختلفہ تمہارے سامنے ہیں ان سے بالاتر ایک اور نظام بھی ہے، مگر وہاں تک تمہارے عقل کی رسائی غیر ممکن ہے، جو چیزیں بظاہر تمہیں غیر منظم دکھائی دیتی ہیں وہ اس بالاتر نظام میں نہایت ہی مربوط اور مرتبہ ہوتی ہیں، اس بلند و رفیع نظام کے جس قدر معاملات ہیں، وہ جبریل کی معرفت رسول اللہ پر القا ہوتے ہیں۔

عرش اعظم تمام روحانیت و مادیات کا مرکز حقیقی ہے، کائنات ارضی و سماوی کے متعلق ہر قسم کا حکم اسی جگہ سے نازل ہوتا ہے اور اس سے جبریل علیہ السلام کا تعلق نہایت محکم اور مضبوط ہے، پھر یہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس فرشتہ کے اثر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اس کو جو حکم اس عالم روحانیت سے ملتا ہے وہ اسے بے کم و کاست رسول تک پہنچا دیتا ہے اور اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا، گویا دوسرے الفاظ میں ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح قرآن ہماری روحانی ترقی کا ذمہ دار ہے، ویسے ہی مادی نشو و ارتقا بھی اس کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ وہ نظام ہے جہاں سے قرآن نازل ہوتا ہے، اس کا فہم و ادراک عام عقولوں سے بالاتر ہے، خمسہ متحیرہ کا سلسلہ تمہارے سامنے ہے، اسی پر اس کو بھی قیاس کر لو۔

اب اسی قسم کے دوسرے حصہ کو دیکھو، رات اور دن سے کسی شخص نے آج تک اختلاف نہیں کیا ایسے ہی محمد

بن

عبداللہ کی حالت ہے: فَقَدْ كُتِبَتْ فِيكُمْ عُمَرَا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس ۱۶) ”میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں

اور کبھی ایک کلمہ بھی اس طرح کا نہیں کہا بھلا تم سمجھتے نہیں۔“ تم خود اس کو صادق اور امین کے نام سے پکارتے ہو، اس کی چالیس سالہ زندگی تمہارے سامنے ہے، آج تک اس نے کبھی بھی جنون اور پاگل پن کا اظہار نہیں کیا۔  
البتہ تمہیں ایک خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جبریل فرشتہ کا ایک انسان کے ساتھ کیا ربط و اتحاد ہو سکتا ہے تو یہ خیال بھی بالکل بے بنیاد ہے، اس لیے کہ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے اس فرشتہ کو افق آسمان پر دیکھا ہے۔

### بعض خصوصیات

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٌ ﴿٣٧﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿٣٨﴾ فَكَيْنَ تَذَهَّبُونَ ﴿٣٩﴾

”وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں اور یہ شیطان مردود کا کلام نہیں، پھر تم کدھر جا رہے ہو۔“  
اس رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے جو کچھ الہام ہوتا ہے وہ اس کی اشاعت و تبلیغ میں بخل و امساک سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے دوسروں کے پاس پہنچا دے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ ۱۲۸) ”لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے، تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔“

اب اس تعلیم کو دیکھو جسے وہ پیش کرتا ہے تو اس کا سب سے بڑا امتیازی نشان یہ ہے کہ جو لوگ اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ اخلاقی طور پر روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں، اگر اس قانون سے ترقی کی جگہ تنزل ہوتا تو اعتراض کی گنجائش بھی تھی، صحابہ کرام کے واقعات تمہارے سامنے ہیں، بھلا شیطان کو ایسی تعلیم سے کیا سرکار، اس کا تو جو قدم اٹھے گا وہ تنزل ہی کی طرف ہو گا: اِنَّ الشَّيْطَانَ اَنْ يُؤَيِّدَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ (المائدہ ۹۱) ”شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور رنجش ڈال دے۔“

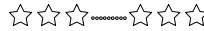
### عالم گیر تعلیم

اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٤٠﴾ لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يُّسْتَعِيْمَ ﴿٤١﴾ وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يُّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٢﴾

”یہ تو جہان کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے یعنی اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔“

قرآن کسی خاص قوم اور ملک کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ یہ ایک عالم گیر قانون اور دستور پسند و مواعظت ہے، سب قومیں اس کے آگے سرنگوں ہو کر رہیں گی، اگر تمام مذاہب و ادیان عالم کے صحائف کو جمع کر کے صرف ان مشترکہ اصول کو

- لیا جائے جو تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر مفید و نافع ہوں تو وہ صرف اسی قرآن میں ملیں گے اور وہ حسب ذیل ہیں:
- (الف)۔ عبادت: ہر شخص اپنی فطرت سے اپنے خالق و مدبر کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا گیا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ اس نے غیر خالق اور غیر مدبر کو اپنا پیداکرنے والا اور مدبر تسلیم کر لیا ہو۔
- (ب)۔ طہارت: ہر قسم کی ظاہری و باطنی پاکیزگی ہر سلیم الطبع انسان اپنی جبلت سے پسند کرتا ہے اور اس لیے تمام شرائط الہیہ اور نوا میں فطرت نے اس پر زور دیا ہے۔
- (ج)۔ عدالت: ہر چیز کو اپنے اپنے موقع و محل پر رکھنا انسانی فطرت کی خصوصیت کبریٰ ہے، گو ذاتی اغراض اور اخلاقی رذیلہ اکثر اوقات اس جذبہ انسانیت کو مغلوب کر دیتے ہیں۔
- (د)۔ سماحت: تحمل یا بردباری اقام علی المہالک یا رواداری، وہ اخلاق ہیں جن پر کاربند ہوئے بغیر کوئی فرد یا قوم اس دنیا میں امن و چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتی اور نہ اس دنیا میں عدالت قائم کر سکتی ہے۔
- ان اصول اربعہ پر تمام دنیا متفق ہو سکتی ہے اور قرآن سے بہتر اور کسی کتاب نے ان پر روشنی نہیں ڈالی۔ ان حقائق ثابتہ کے بعد جس کا جی چاہے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے اور اس طرح اپنی فطرت کو تباہ ہونے سے بچالے۔



## الانفطار

(آیات: ۱۹)

### تلخیص مضامین

اس سورۃ میں فاتحۃ الکتاب کی ایک آیت ”مالکِ یوم الدین“ کی تفسیر ہے۔ چنانچہ ابتدا میں بتایا کہ جب حادثہ قیامت برپا ہو گا تو تمام اعمال موجود کر دیے جائیں گے، جب ایک عمل بھی ضائع نہیں جاتا تو پھر تعجب ہے کہ انسان کیوں اپنی اصلاح نہیں کرتا، حالانکہ اللہ نے انسان اور اس کی ضروریات کو پیدا کیا۔ اگر وہ غور کرے تو خود اس کی زندگی جزائے اعمال کی شہادت دے گی، اللہ کے فرشتے اس کی ہر نقل و حرکت کی نگرانی کرتے ہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ قیامت کے روز محض اعمال پر فیصلہ ہو گا، اس روز صرف اللہ کی حکومت ہو گی اور تمام معاملات اسی کے حضور میں پیش کیے جائیں گے۔

## مالکِ یوم الدین

### حادثہ قیامت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝ عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝ (الانفطار ۵ تا ۱۰)

”جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے اور جب دریا بہہ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گے اور جب قبریں اکھڑ دی جائیں گی تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا تھا اور پیچھے کیا چھوڑا تھا۔“

جب موجودہ نظام کی ضرورت نہ رہے گی اور اعلیٰ ترین قوت اس تمام نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی اس وقت آسمان فنا ہو جائے گا، ثوابت و سیارات جھڑ پڑیں گے اور زمین میں جس قدر اجسام مدفون ہیں ان کو بدن کا ضروری حصہ دے دیا جائے گا، اس وقت حالت یہ ہو گی کہ آج جو امور ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں وہ آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، تمام وہ اعمال جو ہم نے اپنی زندگی میں کیے تھے اور وہ صدقات جو ہمارے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے سب کے سب موجود ہوں گے۔

## آخر یہ کیوں

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسُوِّكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝

”اے انسان! تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا، وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا اور تیرے قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔“

تجربہ یہ ہے کہ اے ظلوم و جہول انسان کس چیز نے تجھے بہکا دیا کہ وہ رب کریم جس نے یہ عظیم الشان نظام قائم کر رکھا ہے، تمہیں بے کار چھوڑ دے گا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنْتُمْ اَخْلَقْتُمْ عَبَثًا وَاَنْتُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (المومنون ۱۱۵) ”کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے“، دوسری جگہ فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۖ (الحجر ۸۵) ”اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوقات ان میں ہیں اس کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اور قیامت تو ضرور آکر رہے گی“، سورہ قیامہ میں آتا ہے: اِيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ اَنْ يُتْرَكَ سُدًى (القیامہ ۳۶)، ”کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔“

جس انسان کے یہ خیالات و افکار ہیں، اسے چاہیے کہ اپنی خلقت پر غور کرے، وہی خدائے قدوس ہے جس نے اس وقت تمہیں پیدا کیا جبکہ تمہارا نام و نشان بھی نہ تھا: هَلْ اَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا (الدر) ”بے شک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھا،“ سورہ مریم میں فرمایا: يَقُولُ الْإِنْسَانُ عَرَادًا مَا مِثْلُ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ اَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ اَنْ اَخْلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكْ شَيْئًا ۝ (مریم ۶۷-۶۶) ”کافر انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا، تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا کیا ایسا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔“

پھر اس خدائے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے سب سے پہلے مادہ میں اجتماع و انضمام پیدا کیا اور اس سے تخلیق و تکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظاہر کیے، تم میں مختلف قوتیں پیدا کیں، روحانی و جسمانی ضروریات کا انتظام کیا، خارجی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا اور تم میں سے ہر ایک کی استعداد و قابلیت کے مطابق اسباب و وسائل فراہم کر دیے۔ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے تم کس غفلت میں مبتلا ہو اور کس بنا پر مجازات کا انکار کرتے ہو؟

## محافظ موجود ہیں

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالْبَيِّنَاتِ ۝ وَاِنَّ عَلَيْنَا لَلْغَفِيلُ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝

”مگر سہی بات یہ ہے کہ تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں عالی قدر، تمہاری باتوں کے لکھنے والے، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔“

باوجود ان شواہد کے تم برابر یوم الدین کا انکار کیے جا رہے ہو، حالانکہ ہر شخص پر قدرت نے اپنے مگر ان کا مقرر کیے ہوئے ہیں، ہر انسان میں تین مرکز موجود ہیں:

(الف)۔ عقل: یہ علوم و معارف اور فضل و کمال انسانی کا مرکز ہے۔

(ب)۔ قلب: یہ تمام اخلاق و اعمال کا مرکز ہے، اسی سے ہر قسم کا داعیہ خیر و شر تولید کرتا ہے۔

(ج)۔ نفس: اس کا فرض یہ ہے کہ بدن کی تربیت کرے اور اس کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھے۔

دنیا میں ہر چیز اپنا مرکز رکھتی ہے۔ درخت اپنی جڑ سے خوراک حاصل کرتا ہے، نجوم و کواکب کو سورج سے روشنی ملتی ہے، عقائد و یقینیات کا مرکز تو حید ہے۔ اسی طرح انسان سے جس قدر اعمال و اخلاق کا ظہور ہوتا ہے، ان میں سے ایک چیز بھی ضائع نہیں جاتی، بلکہ اپنے اپنے مرکز سے جاملتی ہے۔ ان اعمال و اخلاق کا اولین اثر خود نفس انسانی پر پڑتا ہے، آئندہ وہ جو اعمال کرے گا دراصل ان ہی کاموں کے نتائج ہوں گے جو اس نے پہلے کیے تھے، جیسا کہ علم النفس میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا: فَامَّا مَنْ اَعْطٰی ۙ وَ اَنْتٰی ۙ ۝ وَ صَدَقَ بِالْحُسْنٰی ۙ ۝ فَسَنِيْسِيْمَا ۙ لِيْسِيْمَا ۙ ۝ وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ ۙ وَ اسْتَغْنٰی ۙ ۝ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ ۝ فَسَنِيْسِيْمَا ۙ لِيْسِيْمَا ۙ ۝ (اللیل ۱۰ تا ۱۵) ”تو جس نے خدا کے راستے میں مال دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا اسے سختی میں پہنچائیں گے۔“ حدیث میں آتا ہے: اسلمت علی ما اسلفت من الخیر، ”کفر کے زمانہ کی نیکیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہیں قبول اسلام کی توفیق نصیب ہوئی۔“

مگر یہ اثر اسی جگہ تک رک نہیں جاتا، بلکہ یہاں سے متجاوز ہو کر ملاء اعلیٰ پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے جو اخلاق و اعمال انسانی کے لیے اصلی مرکز مقرر کیے گئے ہیں۔ ان مرکوزوں تک اعمال کو پہنچانے کے لیے فطری قوتیں مصروف کار ہیں، روحانی صورت و اشکال ان اخلاق کی پوری محافظ و نگران کار ہیں اور وہ چونکہ ہر وقت ساتھ ہیں اس لیے کوئی فعل ضائع نہیں جاتا۔ مرکز تو اعلیٰ ترین دفتر ہے جہاں انسانی اعمال کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور یہ کراماتیں اس دفتر کے کارندے ہیں، جنہیں ایک ایک عمل معلوم ہے: مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق ۱۸) ”کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔“

ظہور نتائج

اِنَّ الْاَكْبَرَّ اَرْكَانِيْنَ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَكِنِّيْ جَحِيْمٍ ۝ يَّصْلُوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِيْبِيْنَ ۝

”بے شک نیکو کار نعمتوں کی بہشت میں ہوں گے اور بد کردار دوزخ میں یعنی جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے اور اس سے چھپ نہیں سکیں گے۔“

تمام اخلاق و اعمال تو محفوظ ہی ہیں، اس لیے نتائج کی صورت یہ ہوگی کہ جن لوگوں نے یوم الدین کے خوف سے برو

تقویٰ کی زندگی بسر کی ہوگی وہ کامیاب ہوں گے اور جنت میں جائیں گے، مگر جن بد بختان نوع انسانی نے فسق و فجور میں دن کاٹے ہوں گے وہ ناکام و خاسر جہنم میں چلے جائیں گے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے نتائج سے محفوظ رہ سکے، کیونکہ چھپنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

### مالک یوم الدین

وَمَا آذُرُكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ ثُمَّ مَا آذُرُكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ يَوْمَ لَا تَهْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝

”اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے، جس روز کوئی کسی کا کچھ بھلا نہ کر سکے گا اور حکم اس روز صرف خدا ہی کا ہوگا۔“

قیامت کے روز یہ حالت ہوگی کہ کوئی شخص بھی ایک دوسرے کو نفع نہ پہنچا سکے گا، اس دن صرف اللہ کی حکومت ہوگی: لیس الملک الیوم، للہ الواحد القہار، دوسری جگہ آتا ہے: الملک یومئذ الحق للرحمن، تمام معاملات کا مرافعہ اللہ کی طرف ہوگا، درمیان میں وسائط کا سلسلہ قائم نہ رہے گا اور خدائے جلیل و جبار خود تمام فیصلوں پر نظر ثانی کرے گا۔



## الطففین

(آیات، ۳۶)

### تلخیص مضامین

حدیث میں آتا ہے: ”لایومن احدکم حق یحب لایحیہ مایحب لنفسه“، ”تم میں سے کسی شخص کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جسے وہ خود دوست رکھتا ہے“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے حواریوں کو یہی نصیحت کی تھی: ”تو دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کر جو تو چاہتا ہے کہ دوسرے تیرے ساتھ کریں۔“ اس سورت کا یہ موضوع ہے اور یہ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سب پر حاوی ہے، اس قانون پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے نتائج اس سورت میں بیان کے گئے ہیں۔

ابتدا میں ان لوگوں کا حال ہے جو تجارت میں خود تو زیادہ وصول کر لیتے ہیں، مگر جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو کم دیتے ہیں، ان کو تنبیہ کی گئی کہ اس حرکت سے باز آجائیں، ورنہ اللہ کے دربار میں انھیں اپنی اس بد عملی کا جواب دینا پڑے گا اور انجام کار جہنم میں داخل ہوں گے اور اس ذمہ داری سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو بد کرداری اور بطالت کا عادی ہو اور جب اس کی یہ حالت ہے تو وہ اسے بھی ذہن نشین کر لے کہ قیامت کے روز شہنشاہ اعظم کے دربار میں اس کا داخلہ نہ ہو سکے گا۔

البتہ جن ارباب اخلاص و ایمان نے کسی قسم کی کمی لین دین میں نہیں کی اور ہمیشہ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا، وہ جنت میں جائیں گے، اگرچہ دنیا میں تطفیف کرنے والے ان متقین کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا کرتے تھے، مگر قیامت میں معاملہ بالکل برعکس ہو گا اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔





## القسطاس المستقیم

تاجروں کی مثال

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ لِلْبَاطِلِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوَّزْتُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝

”ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔“

تطفیف، ناپ تول میں کمی کرنے کو کہتے ہیں۔ اکتیال، ناپ کر لینا اور علی کے معنی من کے ہیں۔ ان آیات میں ان تاجروں کی حالت بیان کی گئی ہے جو خود تو خوب ٹھوک بجا کر لیتے ہیں، مگر جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو کم دیتے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں یہی مرض تھا، انھوں نے فرمایا: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطِاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (الشعر ۱۸۱ تا ۱۸۳) ”دیکھو پیانہ پورا بھر کر دو اور نقصان نہ کیا کرو اور ترازو سیدھی رکھ کر تول کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو“، مگر جب وہ کسی طرح نہ مانی تو تباہ کر دی گئی۔ قرآن نے اس کے متعلق نہایت ہی صاف اور صریح احکام نافذ فرمائے ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے: وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوا بِالْقِسْطِاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ احْسَنُ تَاْوِيْلًا (بنی اسرائیل ۳۵) ”اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیانہ پورا بھر کر دو اور جب تول کرو تو ترازو سیدھی رکھ کر تول کرو، یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔“ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْبِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام ۱۵۲) ”اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔“ سورہ رحمن میں ہے: وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْبِيْزَانَ (الرحمن ۹) ”اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔“

امثال القرآن

قرآن مجید کا عام دستور یہی ہے کہ وہ مثالوں میں قوموں کے عروج و زوال، صعود و ہبوط، علو و تسفل، اور ارتقا و تنزل کے اہمات مسائل اور اصول و کلیات بیان کرتا ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی ان مباحث میں درخور وانی حاصل کر لے، ان آیات میں اگرچہ سوداگروں کی ایک خرابی بیان کی گئی ہے، مگر دراصل ان میں ایک ایسے ہمہ گیر قانون کی تعلیم دی گئی ہے جو اجتماعی اور انفرادی طور پر زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، حکومت اگر رعایا سے اطاعت اور فرمانبرداری کی

آرزو مند ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے تمام حقوق ادا کرے اور دیانت داری کے ساتھ کامل آزادی کے حصول میں اس کی معین و مددگار ہو، خاوند اپنی بیوی سے محبت و چاہت کا طلبگار ہے تو وہ بھی ان لزوجہ علیہا کے مطابق اسے منزلی مراعات دینے سے گریزنہ کرے، آقا و غلام، باپ اور بیٹا اور اسی طرح اقوام و ملل سب کا فرض ہے کہ وہ اس قاعدہ کلیہ کو ہر گز نظر انداز نہ کریں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کو آویزہ گوش بنائیں، جس کا مطلب شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ہر چہ بر خود سپیدی بردیگر اں پسند۔

### تذکیر بامبعد الموت

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

”کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اٹھائے بھی جائیں گے یعنی ایک برے سخت دن میں جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس بدکرداری کا ایک روز جواب دینا پڑے گا، اس دن کی ہولناکی کا نقشہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: يَوْمَ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِنِسْفِ الْأَرْضِ بِأَنفُسِهِمْ وَبِأَصْحَابِهِمْ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُسَوِّدُ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَبِينًا ۝ ثُمَّ يُنَجِّهِ ۝ كَلَّا (المعارج ۱۱ تا ۱۵)، ”اس روز گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں سب کچھ دیدے یعنی اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور جتنے آدمی زمین پر ہیں غرض سب کچھ دیدے اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑالے لیکن ایسا ہر گز نہیں ہو گا۔“ طبرانی میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورہ کی تلاوت یہاں تک کی تو روتے روتے ان کی ہچکی بند ہو گئی اور آگے پڑھنے سے رک گئے۔

آج جن حکومتوں نے ظلم و جور پر کمر باندھ رکھی ہے، اپنی رعایا کے حقوق ادا نہیں کرتیں اور ان کی حریت و آزادی میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں، انھیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ خدائے منتقم و جبار کے عذاب سے کسی طرح بچ نہیں سکتیں۔

### جد اگانہ نتائج

ذیل کی آیات میں بتایا جاتا ہے کہ کمی کرنے والوں کو کیا سزا ملے گی۔

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ۝ كِتَابٌ مَّرْجُونٌ ۝ وَإِنَّ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ يَوْمَئِذٍ لَا يُفْعَلُ لَهُمْ جُنْدٌ ۝ وَإِنَّمَا كِتَابٌ عَلَيْهِ يُتْلَىٰ عَلَيْهِ إِذَا تَشَاءُ ۝ إِذَا تَشَاءُ عَلَيْهِ إِذَا تَشَاءُ ۝ إِذَا تَشَاءُ عَلَيْهِ إِذَا تَشَاءُ ۝ إِذَا تَشَاءُ عَلَيْهِ إِذَا تَشَاءُ ۝

”سن رکھو کہ بدکاروں کے اعمال سچین میں ہیں اور تم کیا جانتے ہو کہ سچین کیا چیز ہے، ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے، یعنی جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور اس کو جھٹلاتا وہی ہے جو حد سے نکل جانے والا

گنہگار ہے، جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔“  
 انسان جب ایک بد اخلاقی کامر تکب ہوتا ہے اور پھر اس کو اپنی عادت بنا لیتا ہے تو انجام کار اس کے تمام اعمال پر اس کا اثر پڑتا ہے اور روح اعظم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اس کی تمام بد اخلاقیات ایک دفتر میں جمع ہوتی رہتی ہیں، جس کا نام سچین ہے، قیامت کے روز جب یہ لوگ اپنا اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو بے انتہا تکلیف محسوس کریں گے، اس وقت انھیں معلوم ہو گا کہ اس ذمہ داری سے ہمارا انکار کرنا بے سود تھا اور یاد رہے کہ اس کا وہی شخص انکار کرتا ہے جو قانون الہی کی پابندی سے گریز کرتا ہے اور تعلیم الہی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہ اسے قصص و حکایات سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، لیکن یہ لوگ انکار کرتے رہیں، اس کی وجہ سے ایک حقیقت ثابتہ باطل نہیں ہو سکتی۔

### انکار کا سبب

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٠﴾ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمْ حُجُّوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ﴿٦٢﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٦٣﴾

”دیکھو جو اعمال بد کرتے ہیں، ان کا ان کے دلوں پر رنگ بیٹھ گیا ہے، بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے، پھر دوزخ میں جا داخل ہوں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔“

ان کے انکار کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے قانون فطرت کی پابندی نہیں کی اور برابر فسق و فجور میں مبتلا رہے، کثرت معاصی نے ان کے قلوب کو رنگ آلود کر دیا اور اب ان کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں: لَمْ يَكْفُورْ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اِذَا نَا لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف ۱۷۹) ”ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ لوگ بالکل چار پاؤں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے، یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یہی وہ حالت ہے جس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا: و لیس در اذ ذلک حبة خردل من الایمان، اسی کیفیت کو قرآن نے کفر، جہول اور ختم سے تعبیر کیا ہے یہی شقاوت قلب ہے،، اسی پر فہمی کا الحجارۃ او اشد قسوا کا اطلاق ہوتا ہے اور اسی کا نتیجہ انکار مسؤلیت ہے۔

ایک شخص کی اعلیٰ ترین کامیابی یہ ہے کہ اسے زمین و آسمان کے خالق اور مدبر کی زیارت نصیب ہو، مگر اس انکار کی پاداش میں ان کا داخلہ دربار شاهی میں ممنوع قرار دیا جائے گا اور جب اس ذلت و رسوائی کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹیں گے تو لوٹتے ہی دوزخ میں گر پڑیں گے، اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی وہ یوم الدین ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

## ارباب تقویٰ

اب ان ارباب قدس و طہارت کا تذکرہ آتا ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں عدل و مساوات سے کام لیتے ہیں اور ہر ایک کے حقوق انصاف کے ساتھ ادا کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔

كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْاَنْبِيَآءِ لَفِيْ عَلَيِّنَا ۝ وَمَا اَذْرٰكَ مَا عَلَيْنَا ۝ كِتٰبٌ مَّرْكُوْمٌ ۝ يَشْهَدُ الْبَقَرَةُ ۝ اِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلٰى الْاٰرَآئِكَ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِِهِمْ نَضْرَةً النَّعِيْمِ ۝ يَسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتْمُهُ مَسْكٌ ۝ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْبُتْنَافِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنَا يَشْرَبُ بِهَا الْبَقَرَةُ ۝

”یہ بھی سن رکھو کہ نیکو کاروں کے اعمال علیین میں ہیں اور تم کو کیا معلوم کہ علین کیا چیز ہے، ایک دفتر ہے لکھا ہوا، جس کے پاس مقرب فرشتے حاضر ہوتے ہیں، بے شک نیک لوگ چین میں ہوں گے، تختوں پر بیٹھے ہوئے نظارے کریں گے، تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے، ان کو شراب خالص سر بمہر پلائی جائے گی، جس کی مہر مشک کی ہوگی، تو نعمتوں کے شائقین کو چاہئے کہ اسی سے رغبت کریں اور اس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی، وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا مقرب ہیں گے۔“

نضرة کے معنی تروتازہ اور بارونق ہونے کے ہیں، جس رنگ میں چمک ہوتی ہے اسے ناظر کہتے ہیں۔ رحیق اس شراب خالص کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو۔ مختوم، وہ جس پر مہر لگا دی گئی ہو اور ختام، جس سے شیشہ اور بوتل کے منہ پر مہر لگائی جاتی ہے۔ تنافس باب تفاعل کے وزن پر ہے، اس کے معنی دو شخصوں میں سے ہر ایک کا کسی چیز کو اختیار کر لینے کے ہیں، تنافس دراصل نفیس سے لیا گیا ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں نفیس چیز کو لے لوں۔ مزاج کے معنی ایک چیز کو دوسری میں ملانے کے ہیں۔ تسنیم لیا گیا ہے سنم سے، جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، اونٹ کے کوہان کو سنم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بہت اونچا ہوتا ہے، جنت کی تمام شرابوں میں سے بہترین یہی شراب ہوگی، اس لیے اس کا نام تسنیم رکھا گیا۔

البتہ صدق و اخلاص اور انصاف و رواداری برتنے والے علیین میں ہوں گے جو تجلیات الہیہ کا ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، جس کی تعبیر ان الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے کہ جس طرح زمین کا تعلق آفتاب عالم تاب سے ہے، ایسے ہی جنت تو زمین کی مانند ہے اور علیین اس کے لیے سورج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں: هُوَ فَوْقَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ عِنْدَ قَائِمَةِ الْعَرْشِ الْيُسْنَى، ”عرش کے دائیں ستون کے پاس ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔“ اس جگہ مقربان درگاہ الہی آرام کرتے ہوں گے، ہر قسم کی نعمتوں سے سرفراز ہونے کے بعد دیدار الہی سے شرف اندوز ہوں گے اور ان کی فرحت و سرور کے لیے ان کو ایسی شراب دی جائے گی جو ہر قسم کی برائی سے پاک و صاف ہوگی، پس اگر ریس کرنی ہو تو ان لوگوں کی ریس کرنی چاہیے نہ مثل هذا فليعمل العاملون۔

## مقربین اور ابرار

تسnim جو بہترین شراب ہے وہ مقربین کو ملے گی اور ابرار کو جو شراب میسر ہوگی وہ اس سے کمتر ہوگی، مگر ان کے ساتھ اتنی رعایت اور کردی جائے گی کہ ان کی شراب میں کبھی کبھی تسnim بھی ملا دی جائے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں کے مراتب میں فرق ہے۔ اس تفاوت کو مفسرین کرام نے مختلف طریق سے بیان کیا ہے: بعض کہتے ہیں کہ مقربین تو وہ ارباب عشق و شیفنگی ہیں جن کو محض ذات باری کے ساتھ جنون و وارفتگی ہے، وہ صرف اسی کے عشق میں مجنونانہ بادیہ پیمائی کرتے ہیں، نہ انھیں ثواب کی توقع ہے نہ عذاب کا خوف، لیکن ابرار انعام الہیہ کے امیدوار ہوتے ہیں اور حسن ثواب کی امید میں عمل صالح کرتے ہیں۔ ارباب تصوف و احسان کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ مقربین تو وہ ہیں جو فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مراتب عالیہ پر فائز ہو گئے اور ابرار وہ ہیں جنھیں انشراح صدر و توحاصل ہو گیا مگر ابھی تک وہ فنا و بقا کے منازل طے نہیں کر سکے۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ہر عمل نیک کا ایک درجہ عالی اور ایک سافل ہے۔ اس علو و تسفل میں صدق و اخلاص نیت اور آداب و سنن کی نگہداشت کو دیکھا جاتا ہے، جس نے درجہ کمال کو پایا وہ مقرب بن گیا، ورنہ ابرار میں شامل ہو گا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں استاد اور شاگرد کا فرق ہے۔ مقرب فطرۃً صالح ہے اور ابرار تعلیمات الہیہ کی پابندی سے مقرب کے ساتھ مل جاتے ہیں، اس کو یوں سمجھ لو کہ ایک شخص پیدائشی حسین ہے اور دوسرا ابن سنور کر خوبصورت ہو گیا ہے، اسی طرح مقرب تو فطرت ہی سے عمدہ ترین اخلاق لے کر آتا ہے اور ابرار اس سے اخذ و قبول کر کے اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ دنیا میں ان لوگوں کو مقربین ہی کے فیض صحبت سے توحید و معرفت کی شراب نصیب ہوئی تھی، اس لیے مرنے کے بعد بھی انھیں چشمہ تسnim سے شراب حقیقت پینے کو ملے گی۔

## تقسیم کی اصلی غرض

اس فرق و امتیاز کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہر شخص کی انتہائی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اخلاق صالحہ کی پابندی کرے، خواہ یہ اس کا طبعی تقاضا ہو یا اس میں اسے تکلف سے کام لینا پڑے، جس طریق پر بھی وہ نظام صالح کی پابندی کرے گا اللہ کی نعمتوں سے محروم نہ رہے گا، بلکہ مقربین اور ابرار کے گروہ میں داخل ہو گا۔

## باہمی تقابل

إِنَّ الَّذِينَ أٰجَرُوا كَاثِرًا مِّنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا يَفْضَحُوْنَ ۖ وَاِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَوْنَ ۖ وَاِذَا اِنْقَلَبُوْا اِلٰى اٰهْلِہِمۡ اِنْقَلَبُوْا فِکَہِیۡنَ ۖ وَاِذَا رَاوْہُمْ قَالُوْا اِنَّ ہٰؤُلَاءِ لَصٰلِحُوْنَ ۚ وَمَا اُرْسِلُوْا عَلَیْہِمۡ حَفِظٰیۡنَ ﴿ۛ﴾

”جو گنہگار یعنی کفار ہیں وہ دنیا میں مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گذرتے تو حقارت سے اشارے کرتے اور جب اپنے گھر کو لوٹتے تو اترتے ہوئے لوٹتے اور جب ان مومنوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ تو گمراہ ہیں حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔“

یتغامزون لیا گیا ہے غمزہ سے اور اس کے معنی ہیں پلک اور بھوں سے اشارہ کرنا۔

ارباب تطفیف نہ صرف اپنے جرم کو جرم نہیں سمجھتے، بلکہ ان پر ہنسی کرتے ہیں جو اس گناہ میں ان کے شریک نہیں ہوتے، اپنی آنکھوں سے ان کی تحقیر کرتے ہیں، اپنے گھروں میں بھی انکا تذکرہ کر کے خوب تمقہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے بے وقوف ہیں جو دنیا داری اور تجارت کے اصول سے بالکل ناداواقف ہیں، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ کیا آپ ان کے نگران کار ہیں جو اس قدر رنج و غم اظہار کر رہے ہیں۔

### الجزء من جنس العمل

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٥٠﴾ عَلَى الْأَذْنَائِ يَنْظُرُونَ ﴿٥١﴾ هَلْ تُؤِيبُ الْكَفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٥٢﴾  
 ”تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے اور تختوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہوں گے، لو کافروں کو ان کے عملوں کا پورا پورا بدلہ مل گیا۔“

قیامت کے روز یہی مسلمان جن کو ضعیف و کمزور اور بے وقوف خیال کیا جاتا تھا، ان کافروں پر ہنستے ہوں گے، اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی وجہ سے عزت و اکرام کے اعلیٰ ترین مراتب و درجات پر فائز ہوں گے، اب کفار کو اپنی حقیقت اصلہ نظر آجائے گی، دوسری جگہ ان کفار کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: قَالَ اخْسَوْا فِيهَا وَلَا تَكْمُنُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمِنًا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِيمِينَ ﴿٥١﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سَخِرِيًّا حَتَّى أَنْسَوْكُمُ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿٥٢﴾ إِنِّي جَعَلْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَآ صَبَرُوا ۚ إِنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٣﴾ (المؤمنون ۱۰۸ تا ۱۱۱) ”خدا فرمائے گا کہ اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو، میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو دعا کیا کرتا تھا کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے تو تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے، تو تم ان سے تسخر کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے پیچھے میری یاد بھی بھول گئے اور تم ہمیشہ ان سے ہنسی کیا کرتے تھے، آج میں نے ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا کہ وہ کامیاب ہو گئے۔“

حدیث میں آتا ہے: الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف لو اقسام على الله لآبره، الا اخبركم باهل النار كل عتل جواظ متكبر، ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جلتی کون لوگ ہیں، وہ جو ضعیف ہیں، جنہیں لوگ عاجز و زور ماندہ خیال کرتے ہیں، مگر اللہ کے نزدیک ان کے تقرب کی یہ کیفیت ہے کہ اگر وہ کسی کام کے لیے خدا کی قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کر دیتا ہے، اور ہر سخت متکبر اور کٹر دوزخی ہے۔“

## الانشقاق

(آیات: ۲۵)

## تلخیص مضامین

ابتدا میں حادثہ قیامت کے بعض واقعات بیان کر کے بتایا کہ ہر ایک شخص دنیا کی زندگی میں تکلیف اٹھا کر انجام کار اللہ کے دربار میں حاضر ہو گا، جہاں اعمال نامے دائیں اور بائیں ہاتھ میں ہر ایک انسان کو مل جائیں گے، اصحاب الیمین تو جنتی اور اصحاب الشمال دوزخی ہوں گے، اس لیے کہ یہ لوگ جزائے اعمال کا انکار کرتے تھے، پھر مناظر قدرت پیش کر کے اس نظریہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی کہ انسان یا تو ترقی کرتا ہے یا تنزل کے گڑھے میں گرتا ہے، جب حالت یہ ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نیک کام کرے، مگر اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اس کی پروا نہیں کرتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام اعمال کی نگرانی کرتا ہے اور مرنے کے بعد اسی شخص کو کامیابی نصیب ہوگی جو اس دنیا میں نیک زندگی بسر کرے گا۔

ان سطروں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب انسانی حیات کا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں جاتا، بلکہ اس کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا یا پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو پھر وہ نیک کام کیوں نہ کرے جو اسے دنیا و آخرت میں سود مند ہو اور یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔

## یا ایہا الانسان انک کادح

## ہلاکت و بربادی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ ۝

”جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کا فرمان بجالائے گا اور اسے واجب بھی یہی ہے اور جب زمین ہموار کر دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی اور بالکل خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کے ارشاد کی تعمیل کرے گی اور اس کو لازم بھی یہی ہے (تو قیامت قائم ہو جائے گی)۔“

موجودہ نظام صرف اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ فرزند آدم اس سے فائدہ حاصل کرے، جب وہ خود ہی نہ رہا تو پھر اس

کائنات کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان کو بھی فنا کر دیا جائے گا اور زمین میں اب تک جو کچھ پوشیدہ تھا باہر نکل آئے گا۔ یہ سب ایک حکم کا نتیجہ ہو گا اور کسی کو طاقت نہ ہوگی کہ اس کے خلاف کر سکے۔

### اصحاب الیومین

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّكُمْ كَادُمْ إِلَىٰ رَبِّكُمْ كَذِبًا فَلْيَقِئْهُ ① فَأَمَّا مَنْ أُوثِقَ كِتَابُهُ بِبَيْبُتِهِ ② فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ③ وَيُنْقَلَبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ④

”اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا، تو جس کا نامہ اعمال اس کے دامن میں دیا جائے گا اس سے حساب آسان لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے گا۔“  
اعمال کے اعتبار سے انسان کی تین ہی حالتیں تصور میں آسکتی ہیں:-

(۱)۔ اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کی پابندی کی بنا پر ترقی کرنا چلا جائے۔

(۲)۔ فسق و فجور اور بد عملی و بطالت کی وجہ سے قعر مذلت و نکبت میں گرنا جائے۔

(۳)۔ سکون کی حالت قائم ہے اور اب وہ نہ تو آگے بڑھتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیسری حالت صرف فرض کر لی گئی ہے، ورنہ دراصل یہ کوئی چیز نہیں، اس لئے شریعت بھی صرف پہلی دو صورتوں سے بحث کرتی ہے، حدیث میں بھی انھیں دو کا تذکرہ ہے اور آیت زیر بحث بھی اسی قانون کو بیان کرتی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کام میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے اور اسے اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہیں، تا آنکہ وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے، وہاں اسے اگر اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں مل گیا تو کامیاب رہا، اس سے اگر حساب طلب بھی کیا جائے گا تو بس یوں ہی سا۔

بخاری میں ہے: من نوقش الحساب عذب، ”جس شخص سے خوب ٹھونک بجا کر حساب لیا گیا وہ ضرور معذب ہوگا۔“ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ شبہ وارد کیا کہ قرآن میں تو فسوف يحاسب حسابا يسيرا آتا ہے پھر یہ اختلاف کیسا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ليس ذلك حساب ولكن ذاك العرض من نوقش الحساب عذب، ”یہ حساب یسیر بھی کوئی حساب ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان چیزوں کو اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور بس، ورنہ جس سے باقاعدہ حساب طلب کیا گیا تو اس کی خیر نہیں،“ اسی لیے آپ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللّٰهُمَّ حاسبني حسابا يسيرا، بقیہ میں ہے کہ جس شخص میں یہ تین صفات ہوں گی قیامت کے دن اس سے حساب یسیر لیا جائے گا: تعطفی من حرمک و تعفو عن ظلمک، و تصل من قطعک، ”تو اس کو دے جو تجھے محروم کر دے، جو تجھ پر ظلم کرے تو اس سے در گذر کر اور قاطع رحم کے ساتھ صلہ رحمی کر۔“



## مجرمین کے نتائج

وَ اَمَّا مَنْ اَوْفَىٰ كَيْلِبُهُ وَّرَاءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝ وَيَصْلٰى سَعِيرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِىٓ اَهْلِهٖ مِّنْمُؤَدِّرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يُخَوِّرَهٗ ۝ بَلٰى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِبَصِيرًا ۝

”اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا، یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ خدا کی طرف پھر کرنے جائے گا، ہاں ہاں اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا۔“  
 ثبوت مشتق ہے مشابہۃ سے جس کے معنی دوام اور مواظبت کے ہیں، آخرۃ کی موت و ہلاکت بھی غیر منقطع ہوگی، اس لیے اسے ثبوت کہا جاتا ہے۔ حور، رجوع کو کہتے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ راحت کے بعد رنج، فراخی کے بعد تنگ دستی اور ترقی کے بعد تنزل سے پناہ مانگا کرتے تھے: اللھم انی اعوذ بک من الحور بعد الکور۔  
 لیکن جن لوگوں کا اعمال نامہ پشت کی طرف سے پیش کیا جائے گا، وہ ہلاکت و بربادی کے لیے مخصوص ہوں گے اور دوزخ کے سوا ان کو اور کوئی جگہ نہ ملے گی، یہ بد بخت دنیا کے عیش میں منہمک تھے، انھیں اپنی ذمہ داری اور مسؤولیت کا خیال بھی نہ تھا اور یہ اس گمان باطل میں تھے کہ سرور و شادمانی کی یہ کیفیت دائمی ہے، مگر یہ امید سراب سے زیادہ نہ تھی، اللہ کی نظر ان کے ایک ایک عمل پر تھی، وہ بھلا ان کو کیسے مہمل چھوڑ سکتا تھا۔

## مناظر قدرت

فَلَا اُقْسِمُ بِالْشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا انْشَقَّ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝

”ہمیں شام کی سرخی کی قسم اور رات کی اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کر لیتی ہے اور چاند کی جب کامل ہو جائے کہ تم درجہ بدرجہ رتبہ اعلیٰ پر چڑھو گے۔“

اصل لغت کے اعتبار سے شفق کے معنی وقت کے ہیں، اسی لیے رقت قلب کو شفقت کہتے ہیں، یہاں وہ سرخی مراد ہے جو غروب آفتاب کے بعد آسمان کے کناروں پر باقی رہتی ہے۔ وسق کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ انشاق، اجتماع و تکامل۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنائی ہے، مگر وہ اس میں درس و فکر سے کام نہیں لیتا۔ مناظر قدرت تمہارے سامنے ہیں، ان میں غور کرو تو بہت سے حقائق مستورہ بے حجاب ہوں گے۔ مغرب کے وقت ذرا سی تاریکی شروع ہوتی ہے، پھر بڑھتے بڑھتے تمام عالم پر چھا جاتی ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے پاس کی چیز بھی دیکھ نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایک عالم تھا، اب چاند کو دیکھو وہ ابتدا میں بالکل ایک باریک خط کی طرح دکھائی دیتا ہے، مگر چند روز کے بعد بدر کامل بن کر تمام دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔

یہ قدرتی مناظر تمہارے سامنے ہیں، اگر تم غور کرو تو عبرت و بصیرت کی صد ہاراہیں اپنے سامنے کشادہ پاؤ گے۔ انسانی اعمال کی بھی یہی کیفیت ہے، اگر ایک شخص برائی کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر پڑ جاتا ہے، اگر اس نے توبہ کر لی تو بہتر، ورنہ وہ سیاہی ترقی کرتی جاتی ہے، تا آنکہ اس کا دل بالکل تاریک ہو جاتا ہے اور اب وہ نور کی بجائے ظلمت میں بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے اور اگر اس نے نیکی کی تو اسے نیکی میں مدد ملے گی، تا آنکہ وہ خدائے قدوس کے دربار میں قلب سلیم لے کر حاضر ہو۔ ترقی دونوں کی ہوگی، ایک کی نور کی طرف اور دوسرے کی ظلمت کی جانب، سکون کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

## اعتبار

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٥١﴾ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكِيدُونَ ﴿٥٢﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٥٣﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٥٤﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٥٥﴾

”تو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ کافر جھٹلاتے ہیں اور خدا ان باتوں کو جو یہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے، تو ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو، ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔“

جب حالت یہ ہے کہ ہر ایک انسان اپنے اخلاق و اعمال میں برابر ترقی ہی کرتا رہتا ہے تو پھر برائی کرنے والے کو کیا ہو گیا؟ نیکی اور صداقت میں آگے بڑھنے کی کیوں نہیں کوشش کرتا؟ دنیا میں بھی آرام ملے گا اور آخرت بھی سدھر جائے گی۔ اقتضائے عقل تو یہی تھا کہ اس میں خضوع اور انابت الی اللہ کے جذبات حقہ پیدا ہوتے، مگر ان حقائق ثابتہ کے باوجود اس کی حالت یہ ہے کہ وہ جزائے اعمال کا برابر انکار کیے چلا جاتا ہے اور اس زعم باطل میں گرفتار ہے کہ قیامت نہیں ہوگی، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے ایک ایک کام کو احاطہ کئے ہوئے ہے، ان اعمال فاسقہ کی پاداش میں اسے عذاب سے نجات نہ مل سکے گی اور ارباب ایمان و اخلاص کی فوز و کامرانی میں کوئی شبہ نہیں۔



## البروج

(آیات ۲۲)

## تلخیص مضامین

ابتدا میں چند قسمیں بیان کیں، پھر لف و نشر غیر مرتب کے طور پر سب سے پہلے شاہد و مشہود کا قصہ بیان کیا، پھر یوم موعود کا فیصلہ سنایا اور آخر میں تاریخ عالم کے چند واقعات ذکر کر کے اس حقیقت پر مہر لگادی کہ مخالفین اسلام ضرور برباد ہوں گے اور یہی اس سورۃ کا موضوع ہے۔

## مخالفین اسلام یقیناً برباد ہوں گے

## اقسام ثلاثہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝ وَشَاهِدًا مَّشْهُودًا ۝

”آسمان کی قسم جس میں برج ہیں اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور حاضر ہونے والے کی اور اس کی جس کے پاس حاضر کیا جائے۔“

بعض لوگوں نے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کی تفسیر میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جن سے یہ کتاب عزیز کبھی بحث نہیں کرتی اور نہ اس کے دائرہ میں یہ چیز داخل ہے۔ علم نجوم و ہیئت کے ماتحت قرآنی آیات کی تفسیر کرنا یقیناً اس کے موضوع سے دور نکل جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت ہمیں معلوم ہے کہ وہ ان غیر ضروری مباحث کی طرف کبھی توجہ نہ کرتے تھے، بلکہ سادہ اور عام فہم مطلب لیتے اور اسی پر عمل کرتے۔

## والسما ذات البروج

اس سورۃ کا موضوع آپ کے سامنے ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ۔ اس دعویٰ پر اللہ تعالیٰ نے چند شہادتیں پیش کی ہیں، سب سے پہلے تم اس آسمان کی طرف نگاہ بلند کرو جو

نجوم و کواکب سے درخشندہ ہے، جس کے وجود پر ہزار ہا سال گزر چکے ہیں، جس نے صد ہا اقوام کے عروج و زوال اور علو و تغلّب کو دیکھا ہے، پس جب سے یہ آسمان قائم ہے اور جس وقت سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کے حالات و واقعات کا درس و مطالعہ کرو، تاریخ پڑھو اور قوموں کے ہبوط و صعود کے فلسفہ میں بحث و نظر کرو تو تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ آج تک جس فرد یا قوم نے کلمہ حق کی مخالفت کی ہے اور سچائی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں وہ ہمیشہ برباد ہوئی ہے۔ عادیثہ کی قومیں تمسّیں یاد ہیں، بابل و نینوا کے کھنڈرات کو جا کر دیکھو، کلدانیوں اور آشوریوں سے دریافت کرو، تمام اقوام عالم اس سنۃ اللہ کا زبان حال سے اقرار و اعلان کر رہی ہیں کہ قانون الہی کی مخالفت کر کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

### اليوم الموعود

اگر تاریخ کے اوراق میں اور قوموں کے تسلط و تنزع میں تمہارے لیے کوئی عبرت و بصیرت نہیں اور تم ان سے نصیحت اخذ نہیں کرتے تو تمہارے پاس الہامی کتابیں ہیں، انبیاء کے مکاشفات ہیں، ان لوگوں کے حالات و واقعات ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکتہ الرحمن کو دیکھا ہے، انہوں نے عالم غیب کے سرائر و عجوبات کو بے نقاب کیا ہے اور قیامت اور نتائج اعمال پر بحث کی ہے، وہ بھی اس حقیقت ثابتہ پر مہر لگاتے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کرنے والے انجام کار ذلیل و رسوا ہوں گے: **الا ان حزب الشیطن هم الخسرون۔**

### شاهد و مشہود

پھر اگر انبیاء کے مکاشفات و الہامات بھی تمہارا اطمینان نہیں کر سکتے تو شاہد و مشہود کا واقعہ تمہاری عبرت کے لیے بس کرتا ہے۔ چند نوجوان ایمان لاتے ہیں، بادشاہ وقت ان کو بت پرستی پر مجبور کرتا ہے، جب وہ کسی طرح سے حق کو نہیں چھوڑتے تو انھیں آگ کی نذر کرتا ہے، مگر انجام کیا ہوتا ہے؟ تماشا دیکھنے والے بھی نذر آتش ہو جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔

پس تاریخ اقوام و ملل، انبیاء کرام کے مکاشفات و الہامات اور شاہد و مشہود کا واقعہ تینوں اس امر پر شاہد ہیں کہ مخالفین حق اور معاندین اسلام ضرور تباہ ہو کر رہیں گے اور مسلمان ہی انجام کار شاد کام و بامراد ہوں گے۔

### شہادت کی تفصیل

قَتِيلَ أَصْحَابِ الْأَعْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُُوْدٌ ۝

”خندقوں کے کھودنے والے ہلاک کر دیے گئے، یعنی آگ کی خندق میں جس میں ایبندھن جھونک رکھا تھا، جبکہ وہ ان کے کناروں پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو سختیاں اہل ایمان پر کر رہے تھے ان کو سامنے دیکھ رہے تھے۔“

احدود کے معنی زمین کو شق کرنے اور اسکو مستطیل کھودنے کے ہیں، اسکی جمع احادیث آتی ہے اور اس کا مصدر خد ہے۔ اب لف و نشر غیر مرتب کے طور پر ان اقسام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جن سے اس دعویٰ پر استدلال کیا گیا ہے کہ مخالفین اسلام ضرور برباد ہوں گے۔ سب سے آخر میں شاہد و مشہود کا تذکرہ تھا اس لیے سب سے پہلے اسی کو لیا گیا۔ ان آیات میں کن لوگوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں؟ احادیث میں مختلف لوگوں کا تذکرہ ہے، مگر غرض سب کی ایک ہے اور اگر جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو حاصل تمام قصص کا ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جس کو ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ چند حق پرستوں کو اس ملک کے بادشاہ نے بت پرستی پر مجبور کیا، جب وہ کسی طرح اس کے لیے تیار نہ ہوئے تو اس نے ان کو جلانے کی خاطر بڑی بڑی خندقوں میں لکڑیاں جمع کر کے آگ تیار کی، جب وہ خوب روشن ہو گئی تو ان ارباب ایمان کو اس میں جھونک دیا اور اس درد انگیز و ہیبت ناک منظر کو دیکھنے کے لیے شہر کے تمام لوگ اور امر اور وسائے سلطنت خندقوں کے کناروں پر بیٹھ گئے، اسی دور ان میں آگ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے کہ ان کو بھی جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا جو اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ان آیات میں یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں نہ صرف مشرکین مکہ کے لیے درس عبرت تھا جو مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، بلکہ آج بھی قرآن حکیم بیاںگ دھل اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ جو مسیحی اقوام اسلامی حکومتوں کو برباد کرنے کی فکر میں ہیں وہ اس شیطنت سے باز آجائیں، ورنہ اللہ کے آہنی پنجے کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے اور اس کی گرفت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ فہل من مد کم۔

## جرم کی نوعیت

وَمَا تَقْتُلُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَبِيدِ ① الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ②

”ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے جو غالب اور قابل ستائش ہے، جس کی آسمانوں اور زمین میں بادشاہت ہے اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔“

ان نوجوانوں کا اگر کوئی جرم تھا تو یہ کہ وہ ایک اللہ کے پرستار بن گئے تھے اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ شخصی حکومتوں اور سرمایہ داروں کے نزدیک سب سے بڑا جرم یہی رہا ہے کہ ایک شخص کی گردن ان فراعنہ کے آگے کیوں نہیں جھکتی۔

جس وقت جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لے آئے تو فرعون نے ان کو راہ حق سے منحرف کرنے کی پوری کوشش کی، مگر جب وہ اس میں ناکام رہا تو اس نے یوں دھمکی دی : لَا قُطْعَنَ اٰیْدِیْکُمْ وَاَزْجُلْکُمْ مِّنْ خِلَافِ ثَمَّ لَا صَلٰبَ بَیِّنْکُمْ اَجْمَعِیْنَ (الاعراف ۱۲۳) ”میں پہلے تو تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹا دوں گا پھر تم سب کو

سولی چڑھا دوں گا، مگر وہ ان باتوں سے مطلق خوف زدہ نہ ہوئے، انھوں نے جواب دیا: وَمَا تَنْتَقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِأَلَيَّتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا (الاعراف ۱۲۶) ”اور اس کے سوا تجھ کو ہماری کوئی بات بری لگتی ہے کہ جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے پاس آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔“ فرزند ان اسلام کو بھی جب سر زمین مکہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان کا بھی یہی گناہ تھا کہ وہ ایک ہی خدا کے پوجنے والے تھے: الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (الحج ۴۰) ”یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے،“ حضرت شعیب علیہ السلام کو جو ان کی قوم نے اخراج عن الوطن کی دھمکی دی تھی تو اس کا سبب بھی اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ خدائے واحد کے آگے خمیدہ گردن تھے: قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشُعْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِكُمْ أَوْ لَنَعُودَنَّ فِيْكَ وَلَنَمِيتَنَّ (الاعراف ۸۸) ”تو ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ شعیب یا تو ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنے شہر سے نکال دیں گے یا تو تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ۔“

کیا یہ ظالم و جابر حکومتیں اس خیال میں ہیں کہ جس قد و س حق نواز سے انھوں نے لو لگائی ہے وہ اپنے عاجز و در ماندہ بندوں کی امداد نہ کرے گا؟ وہ خدا عزیز ہے، زمین و آسمان کی حکومت اس کے قبضہ میں ہے اور نہایت ہی دور بین نگاہوں سے دونوں جماعتوں کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان تو مغلوب ہوں اور کافر غالب آ جائیں: ان الله لا يحب الكافرين۔

### الہامات انبیائے کرام

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝

”جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیفیں دیں اور توبہ نہ کی ان کو دوزخ کا عذاب بھی ہو گا اور جلنے کا عذاب بھی ہو گا اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

شاہد و مشہود کے بعد اب تم تمام صحائف و اسفار آسمانی کا درس و مطالعہ کرو اور انبیائے کرام کے الہامات کو دیکھو، وہ بھی اسی حقیقت کبریٰ پر متفق ہوں گے:

(الف)۔ جن لوگوں نے حق پرستوں پر ظلم کیا، انھیں ہر طرح کی تکلیف و مصیبت میں ڈالا اور پھر ان جرائم سے توبہ بھی نہ کی تو وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے اور جب کبھی حق و باطل کا تصادم ہو گا تو پرستار ان باطل ہی ذلیل و رسوا ہوں گے۔  
(ب)۔ ارباب ایمان کے لیے کامیابی حتمی ہے، انھیں ہر قسم کی نعمتیں نوازش ہوں گی اور وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔

پس انبیاء کے الہامات، اولیاء کے مکاشفات اور ملائکہ الرحمن سے مکالمہ کرنے والے، سب اسی فطرۃ اللہ پر مہر لگاتے ہیں اور اسی سنت خداوندی کا بآنگ دہل اعلان کرتے ہیں۔

اگر عذاب میں تاخیر ہو

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ إِنَّهُ هُوَ يُبْعِدُ وَيُعِيدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَالٌ لِّبَاطِنٍ ۝

”بے شک تمہارے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک بڑی شان والا، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ سنت اللہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات ظالموں کو باوجود ظلم و جور کامیابی ہوتی ہے، اس لیے عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پرستاران حق بے یار و مددگار چھوڑ دیے گئے ہیں، بلکہ کبھی کبھی یہ خیال یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ خود مسلمانوں ہی کو غلط کار قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ فراعنہ عصر کو اس ظاہر فریب کامیابی پر اترنا جانا چاہیے، اگرچہ اس وقت انھیں فتح و کامرانی نصیب ہو رہی ہے، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ ایک قسم کی مہلت ہے جو انھیں دی جا رہی ہے، وہ جب پکڑنے پر آئے گا تو اس کی پکڑ بڑی ہی سخت ہوگی: وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٥١﴾ (الاعراف ۱۸۲ تا ۱۸۳) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا اور میں ان کو مہلت دیے جاتا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔“ سورہ آل عمران میں فرمایا: وَلَا يَخْصِبُ الَّذِينَ كَفَرُوا آثَابًا شَدِيدًا لَّهُمْ خَيْرٌ لَّكَفْسِهِمْ إِنَّمَا شَدِيدُ الْعِقَابِ يُدْرَأُ أَثَابًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (ال عمران ۱۷۸) ”اور کافر لوگ یہ نہ خیال کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دیے جاتے ہیں، ان کے حق میں اچھا ہے، نہیں بلکہ ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کر لیں آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔“

الغرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرما دیا کہ اگر مخالفین اسلام کو کبھی کامیابی ہو جائے تو فرزند ان توحید کو اس سے پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ یہی فتح و نصرت ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی اور یہ خود اپنے ہاتھوں ان تمام اسباب و وسائل کو فراہم کر آئیں گے جو ان کی بربادی کا باعث ہوں: ان ربك لبا لمرصاد، اگر مسلمان اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیں تو اب بھی اپنے ماحول میں ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس کائنات میں اللہ کی مختلف صفات مصروف عمل ہیں۔ بعض اوقات وہ نئے سرے سے ایک چیز کو پیدا کرتا ہے اور کبھی اسی کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے، یہی عادت اس کی قوموں اور ملتوں کے متعلق بھی ہے، اگر ایک حکومت ظلم کرتے کرتے انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کو بالکل برباد کر دیا جاتا ہے اور دوسری قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ سورہ دخان میں اس سنۃ اللہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: كَمْ تَرَكُوا مِّنْ جَبَلٍ وَاعِثٍ ۚ وَرُءُوعٍ ۚ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۚ وَ نَعْبَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ﴿٥٠﴾

كَذٰلِكَ ۚ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا يٰسٰى اٰمِلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُبِيْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ عَلَِيًّا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ اخْتَلٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الدرخان ۳۲۵-۳۲۸)

”وہ لوگ بہت سے باغ اور چشمے چھوڑ گئے اور کھیتیاں اور نفیس مکان اور آرام کی چیزیں جن میں عیش کیا کرتے تھے، اسی طرح ہوا اور ہم نے دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کا مالک بنادیا پھر ان پر نہ آسمان اور زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی یعنی فرعون سے، بے شک وہ سرکش اور حد سے نکلا ہوا تھا اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا۔“

لیکن اگر ایک قوم اپنے اعمال فاسقہ سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اسکو چشمہ حیات پر لے آتا ہے اور اس کو زندگی نوازش فرماتا ہے: ثُمَّ رَدَدْنٰ لَكُمْ الْكُرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمَدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْنًا (بنی اسرائیل ۶) ”پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تم کو جماعت کثیر بنادیا۔“ قوم یونس کے متعلق آتا ہے: فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةً اَمَّتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمُ يٰسٰى ۚ لَبَآ اَمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (یونس ۹۸) ”تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا، ہاں یونس کی قوم کہ جب ایمان لائی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک مدت تک فوائد دنیاوی سے ان کو بہرہ مند رکھا۔“

اقوام و امم کے عروج و زوال کا یہی قانون ہے کہ جو قوم قعر مذلت میں گرتی ہے وہ اپنے اعمال قبیحہ کی بنا پر گرتی ہے، مگر اللہ غفور و ودود بھی ہے: ان الله لا يغير ما بقول حتى يغيروا ما بانفسهم۔ اس کی مغفرت کی شان ملاحظہ ہو: ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء۔ اس کی ایک صفت سبقت رحمتی علی غضبی بھی ہے پھر بھلا وہ کیسے بنی آدم کو چھوٹے چھوٹے گناہوں کی وجہ سے عذاب دے گا، بلکہ اس کا عفو عام اور اس کی رحمت سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

لیکن انسان اس رحمت کی وجہ سے مغرور نہ ہو جائے، وہ ذوالعرش المجید، فعال لمایرید بھی ہے، وہ ملک و سلطنت کا مالک ہے، جلالت و کبریائی میں کوئی اس کا عدیل نہیں اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پس ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کی تمام صفات کو ہمیشہ سامنے رکھے اور ہر حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سفاکی و بربریت کے وقت دیکھ لے کہ ارباب صدق و اخلاص کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ تو نہیں بنا رہی ہے۔

## تاریخی شہادت

هَلْ اَتٰنَاكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝

”بھلا تم کو لشکروں کا حال معلوم ہوا ہے۔ یعنی فرعون اور ثمود کا۔“

اب تک موضوع سورۃ پر دو قسم کی شہادتیں بیان ہو چکی ہیں :



(۱)۔ شاہد و مشہود کا واقعہ، جس سے عرب کے لوگ خصوصاً واقف ہیں۔

(۲)۔ انبیائے کرام کے الہامات، جن سے بڑھ کر واقعات قیامت اور نتائج اعمال اور کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔

اب ان آیات میں فرعون و ثمود کے حالات سے استشہاد کیا گیا، ان کے واقعات اور احوال تاریخ میں محفوظ ہیں اور ہر شخص ان سے واقف ہے، اس لیے صرف اشارہ کر دیا، ذہن خود بخود نتیجہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔  
کیا مخالفین اسلام اور مسیحی حکومتوں کو یہ واقعات یاد ہیں؟ اگر چشم بصیرت واسے تو وہ ان حقائق کو دیکھیں اور دُؤلِ اسلام کی بیخ کنی سے باز آجائیں، ورنہ ان کے ساتھ مستقبل قریب میں وہی ہوگا جو فرعون و ثمود کے ساتھ ہوا۔

کفار کا انکار

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝

”لیکن کافر جان بوجھ کر تکذیب میں گرفتار ہیں اور خدا بھی ان کو گردا گرد سے گھیرے ہوئے ہے۔“

باوجود ان تاریخی واقعات اور دوسرے دلائل کے کفار اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ عاقبت کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے، اس لیے کہ وہ فرزندان اسلام کی بے سروسامانی، بدنظمی اور فرقہ بندی کو دیکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کی عالم گیر برادری کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، ادھر ان کو اپنی کثرت تعداد، فراوانی دولت اور آلات حرب پر ناز ہے، ان حالات میں اس سنت اللہ پر ان کو یقین آئے تو کیسے؟ مگر ان مخالفین اسلام کو یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ ان کو سب طرف سے گھیرے ہوئے ہے، وہ ان کی داخلی اور خارجی قوتوں کو جانتا ہے اور جس وقت چاہے انھیں ہلاک کر سکتا ہے۔

یہ فیصلہ اٹل ہے

بَلْ هُوَ قَوْلُ مَنْ مَّجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝

”یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔“

ان آیات کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو عام مفسرین نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نہایت ہی عظیم و جلیل کتاب ہے جیسا کہ سورہ عبس میں گزر چکا اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی اسی قسم کی آیات اس کے متعلق بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک جگہ فرمایا: إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَا يَسْخَرُ إِلَّا الْبَاطِلُونَ ۝ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (الواقہ ۷ تا ۸) ”یہ بڑے رتبہ کا قرآن ہے جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں، پروردگار عالم کی طرف سے اتارا گیا ہے۔“ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۝ تَنْزِيلٌ مِّن حَكِيمٍ حَبِيبٍ ۝ (المومن ۳۱ تا ۳۲) ”اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے اور دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔“

غرض یہ ہے کہ کئی زندگی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف ممکن نہیں اور کوئی بڑی سے بڑی حکومت اس میں رد و بدل کرنے پر قادر نہ ہوگی، اس لیے کہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لله لحافظون کا وعدہ جس طرح ماضی کے لیے تھا ویسا ہی مستقبل کے لیے بھی ہے۔

ربط آیات کے لحاظ سے ان آیتوں کا یہ مطلب بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں جس حقیقت کبریٰ کا اعلان کیا گیا ہے کہ انجام کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے، اگرچہ کفار اپنے سامان اور تعداد کے غرور میں کتنا ہی اس سنت اللہ کی تکذیب کریں، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ فیصلہ ایک شدنی امر ہے، یہ ایک بابرکت قانون ہے اور کوئی چیز اس کے نفاذ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔

### لوح محفوظ

لوح محفوظ کے متعلق مفسرین کرام کا کسی قدر اختلاف ہے مگر حاصل سب کا یہ ہے کہ لوح محفوظ عالم روحانیت میں ایک لوح ہے، جس میں اس کائنات کے متعلق تمام سنن و نوا میں الہیہ خدائے قدوس نے محفوظ کر دی ہیں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، غرض یہ ہے کہ اس زبردست قانون کی جو شخص بھی مخالفت کرے گا وہ تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

## الطارق

(آیات: ۱۷)

### تلخیص مضامین

نجوم و کواکب کے نظام کی طرف توجہ دلا کر بتایا کہ جس طرح ایک قوت ان کی نگران کار ہے، ایسے ہی ہر نفس انسانی پر ایک محافظ ہے جو اس کے ایک ایک عمل پر نظر رکھتا ہے۔ آگے چل کر نتائج اعمال پر دو قسم کی دلیلیں پیش کیں، ایک میں انسان کے کتم عدم سے وجود میں آنے سے یہ ثابت کیا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کو دوسری مرتبہ بھی زندگی بخش سکتا ہے، اس کے بعد بارش کی مثال بیان کر کے واضح کیا کہ ایسے ہی گل سڑ جانے کے بعد فرزند آدم کو حیات تازہ بھی دی جاسکتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ اور یقینی بات ہے۔ باقی جو لوگ اسکا انکار کرتے ہیں انھیں موقع دیا جاتا ہے کہ وہ پھر اس میں غور کریں کہ شاید یہ مسئلہ ان کی سمجھ میں آجائے۔

## یوم الدین

### الطارق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّعَلَيْهَا حَافِظٌ ۝

”آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا کہ کوئی تنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں۔“

ماوردی کہتے ہیں کہ طروق کے اصلی معنی دروازہ کھٹکھٹانے کے ہیں، رات کے آئینوالے کو طارق اس لیے کہتے ہیں کہ اس وقت لوگ آرام میں ہوتے ہیں اور اس کو دروازہ کھٹکھٹانی کی ضرورت ہوتی ہے، پھر ہر اس چیز کا نام طارق رکھا گیا جو شب کے وقت ظاہر ہو، نجوم و کواکب کو اس لیے طارق کہتے ہیں کہ وہ شب کے وقت طلوع کرتے ہیں، چنانچہ فراء کی یہی رائے ہے۔ حدیث میں ان ناگہانی حوادث سے پناہ مانگی گئی ہے جو رات کو آئیں: اعوذ بک من شر طوارق اللیل، کیونکہ اس وقت ان کا تدارک مشکل سے ہوتا ہے۔

اس سورۃ میں طاریق سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح لسان الہی نے خود النجم الشاقب سے کر دی کہ یہ وہ ستارہ ہے جو طلوع ہونے کے ساتھ ہی ظلمت کے پردوں کو چاک چاک کر دیتا ہے، ثاقب روشن کو کہتے ہیں۔

### طریق استشہاد

آسمان کو دیکھو، ان گنت ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، شب کے وقت لوگوں کی رہنمائی کا سبب بنتے ہیں، جب سے کائنات ارضی و سماوی کی تکوین ہوئی ہے اسی وقت سے یہ بھی اپنی درخشندگی سے تمام عالم کو منور کیے ہوئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے، ایک ہی طرح پر نظر آ رہا ہے اور یہ نظام ایک ہی انداز پر قائم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک دوسرے کے احاطے میں گھس جائے یا اپنے وقت سے قبل طلوع و غروب کرے: لَا الشُّشُ يُتَّبِعُنِي لَهَا أَنْ تَذَرِكَ الْقَمَرُ وَلَا الْيَلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۖ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (یسین ۴۰) ”نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔“

اس نظام شمسی کو دیکھنے کے بعد ہر شخص اس نتیجے پر آسانی پہنچ سکتا ہے کہ ان ستاروں سے بالاتر ایک اور نظام بھی ہے جو ان تمام نجوم و کواکب اور ثوابت و سیارات کی حفاظت کرتا ہے، جو ان کو جکڑ بند کیے ہوئے ہے اور کسی کو آگے پیچھے نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح تم یہ بھی یقین کر لو کہ ایک ارفع و اعلیٰ ہستی ہے جو تمام انسانوں کو ایک ہی قانون کا پابند بنائے ہوئے ہے: وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا ۚ اِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (ال عمران ۸۳) ”حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرماں بردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ وہی ذات رحمن و رحیم ہے جو ان کے ایک ایک عمل کی نگرانی ہے اور اس کو ضائع نہیں ہونے دیتی: اِنْ عَلِيْكُمْ لِحٰفِظٰیْنَ كَرٰمًا كَاتِبٰیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ، پس جس خدا کی یہ قدرت، یہ عظمت اور یہ حفاظت ہے اس کے لیے ہر جان کی نگہداشت، اسے جزا و سزا کے لیے قائم رکھنا اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنا کو نسا د شوار کام ہے۔

### نفسی شہادت

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۚ ① خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ② یُخْرِجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ③

”تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے، وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے جو پیٹھ اور سینہ کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔“

زور کے ساتھ پانی کے بہنے کو عربی میں دَفَقَ کہتے ہیں، منی بھی زور کے ساتھ عورت کے رحم میں جاتی ہے اس لیے اس کو بھی ماء دافق کہتے ہیں، چنانچہ فراء اور انخفش نے اس کے معنی مصبوب فی الرحم کے کیے ہیں، عورت کے سینہ کی ہڈی کو تریبہ کہتے ہیں، جہاں گلوبند پڑا رہتا ہے، اس کی جمع ترائب آتی ہے، یہاں ترائب سے مراد سینہ ہے، جیسا کہ ابن

عباس، عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ نے بیان کیا ہے۔

اگر کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ جب ایک چیز فنا ہو کر بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کس طرح زندہ کرے گا۔ اسے چاہیے کہ اپنی پیدائش میں غور کرے، خود اس کا طریق تخلیق اس شبہ کو دور کر دے گا، پیدا ہونے سے قبل اس کا نام و نشان بھی نہ تھا، لیکن اللہ کی کرشمہ سازی دیکھو کہ ماں باپ اپنی قوت جسمانی قائم رکھنے کی خاطر مختلف چیزیں کھاتے ہیں، اکثر لذائذ نفسانی پورا کرنے کی غرض سے مرد و عورت کا اجتماع ہوتا ہے، لیکن اندر ہی اندر خدا نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے کہ دونوں کے اختلاط سے اولاد صالح پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ اولاد پیدا کرنا خود ایک انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

### بعث بعد الموت

إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۖ يَوْمَ تُبْلَى السَّائِرُ ۚ ۝ فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نِاصِرٍ ۝

”بے شک خدا اس کے اعادے یعنی پھر پیدا کرنے پر قادر ہے، جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کی کچھ پیش نہ چل سکے گی اور نہ اس کا کوئی مددگار ہو گا۔“

جو خدا انسان کو اس طریق پر پیدا کر سکتا ہے، وہ اس کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ جب ایک شخص بالکل نیست و نابود ہو جائے تو اسے دوسری مرتبہ زندگی بخش دے اور یہ حیات بعد العمات اس روز نوازش ہوگی جس دن ہر شخص کے تمام رموز و اسرار ظاہر ہو جائیں گے۔ نہ تو کوئی اندرونی قوت ان جرائم کو چھپا سکے گی اور نہ کوئی خارجی مددگار ان کے معاصی کی پردہ پوشی کر سکے گا: یرفع لكل غادر لواء عندنا مسته یقال ہذا غدر فلان بن فلان، ”ہر غدار کے بیٹھنے کی جگہ پر جھنڈا نصب کر کے اعلان کیا جائے گا کہ یہ شخص دنیا میں لوگوں کے ساتھ غدر کیا کرتا تھا۔“

### نشأۃ ثانیہ

وَالسَّائِرُ ذَاتِ الرَّجْعِ ۚ ۝ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۚ ۝ إِنَّهُ لَنَقُولُ فَضْلٌ ۚ ۝ وَمَا هُوَ بِالنَّهْلِ ۚ ۝

”آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے اور زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہے کہ یہ کلام حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہے اور بیہودہ بات نہیں۔“

رجع کے معنی بارش کے ہیں، جیسا کہ زجاج نے بیان کیا ہے، ابن عباس بھی والسباء ذات الرجع کے معنی ذات المطر یعنی بارش والا کرتے ہیں۔ صدم پھٹنے کو کہتے ہیں، نباتات زمین کو پہاڑ کہلاتے ہیں، اس لیے زمین کو ذات الصدم کہا گیا۔ آسمان سے جب بارش نازل ہوتی ہے تو زمین میں جو بیج بویا گیا تھا اس میں زندگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں، آخر کار زمین پھٹتی ہے اور سب طرف سبزہ زار لہلہانے لگتا ہے۔ اس پر تم انسان کی دوبارہ زندگی کو قیاس کرو، مرنے کے بعد اس

کے اجزاء مٹی میں جا کر مل جاتے ہیں اور منتشر ہو جانے کی وجہ سے ہماری نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، مگر جن قوتوں نے اس کو پہلی بار پیدا کیا تھا وہ اب بھی اسی طرح ان متفرق اجزاء کو ایک جگہ جمع کر کے انھیں زندگی دے دیں گی جس طرح بارش پودوں کو پیدا کر دیتی ہے اور یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں، بلکہ بڑی ہی حکمت و دانائی کی بات ہے۔

### مزید مہلت

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۖ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۖ فَمَهْلِكُ الْكَافِرِينَ أَهْلَهُمْ رُؤُودًا ۖ

”یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگ رہے ہیں اور ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں، تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی مہلت دو۔“

جزائے اعمال کا مسئلہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے اور خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کتب سماویہ اور سلسلہ انبیاء و رسل سے واقف نہ ہوں، اس لیے جب کبھی انھیں اس ذمہ داری اور مسوئیت کی جانب متوجہ کیا جاتا ہے تو بچوں کی طرح اس میں شبہات پیدا کرتے ہیں اور اس کا برابر انکار کیے جاتے ہیں، یہی انکا کید اور مکر ہے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

ہم بھی ان کی حالت سے خوب واقف ہیں، اس لیے ہر ممکن طریق سے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، مختلف قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں اور ہر زاویہ نگاہ کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں، شاید یہ لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں اور اس دقیق نکتہ تک ان کی عقل کی رسائی ہو سکے، اس لیے انھیں مہلت دینی چاہیے اور عذاب میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، اگر اس پر بھی نہ مانیں تو پھر دنیا و آخرت میں ان پر عذاب کا نازل ہونا یقینی اور قطعی امر ہے۔



## الاعلیٰ

(آیات: ۱۹)

### تلخیص مضامین

ابتداء سورۃ میں اللہ کی صفت ربوبیت بیان کر کے بتایا کہ اس صفت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے سلسلہ وحی والہام قائم کرے، تاکہ جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقا بھی حاصل ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے، یہ الہام آخری اور دائمی ہو گا جو آپ کی طرف کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے موجودہ حالات اور اس کے انتہائی کمالات سے خوب واقف ہے اور اس کتاب عزیز میں ان تمام امور کا لحاظ کیا گیا ہے، اس قرآن کو کامیاب بنانے کے لیے وہی خدا ہر قسم کی آسانی پیدا کر دے گا۔ نبی کا فرض صرف اتنا ہو گا کہ اس کی عام اشاعت کر دے، البتہ اس سے فائدہ وہی حاصل کرے گا جو عاقبت اندیش اور دور بین ہو گا۔

اس کے بعد کامیابی اور خسران کے اصول و کلیات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انسان اس قدر کوتاہ بین واقع ہوا ہے کہ وہ دنیاوی فوائد کو آخرت کے دائمی ثمرات و نتائج پر ترجیح دیتا ہے اور یہ غلط ہے۔ آخر میں رسول اللہ کے الہامات کی نسبت بیان کیا کہ اس قرآن میں جن عقائد و یقینیات اور اصول اساسی پر بحث کی گئی ہے، ان پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں، ہر الہامی کتاب نے ان ہی کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، اس لیے اب دنیا کا اجتماع بھی صرف قرآن ہی پر ہو سکتا ہے جو ان سب کا جامع ہے اور اسی پر سورۃ کو ختم کر دیا۔

## ضرورت الہام

الحمد لله رب العالمین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسُوِّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝

”اے پیغمبر! اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے انسان کو بنایا پھر اس کے اعضا کو درست کیا اور جس نے اس کا اندازا ٹھہرایا پھر اس کو راستہ بتایا۔“

اس رب بزرگ کی تسبیح و تقدیس بیان کرو جس کی بعض صفات ربوبیت حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ خلق: عدم محض سے اس نے زمین و آسمان کو ہماری ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے پیدا کیا، بدیع السبلوات والارض میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور خلق الانسان من علق بھی اسی تخلیق کی ایک جزئی ہے۔

(ب)۔ تسویہ: لغت میں اس کے معنی برابر کرنے کے آتے ہیں، گویا ایک چیز کی ظاہری و باطنی قوتوں کو اس طریق سے اس میں ودیعت کرنا اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو ایک دوسرے سے اس انداز کے ساتھ ملانا کہ ان میں کمال درجہ کی موزونیت پیدا ہو جائے: مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفْوُتٍ ۚ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۚ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۚ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيدٌ ﴿۳۲۳﴾ (الملك ۳۲۳) ”کیا تو خدا کے رحم کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے، ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ، بھلا تجھ کو آسمان میں کوئی شکاف نظر آتا ہے، پھر دوبارہ سہ بارہ نظر کر، تو نظر ہر بار تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔“

(ج)۔ تقدیر: جب اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں قوتیں رکھ دیں تو ضروری تھا کہ ان کے اعمال و وظائف کی نوعیت اور دائرہ و میدان عمل کا تعین ہوتا، ورنہ تسویہ کا عمل رائیگاں جاتا، اعمال کی نوعیت مقرر کرنا یہی تقدیر ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۸۰﴾ وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿۸۱﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۸۲﴾ (یسین ۸۰-۸۲) ”اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے، یہ خدا کے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے، نہ تو سونج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔“

(د)۔ ہدایت: ان مدارجِ علمشہ کے بعد اب اس بات کی ضرورت ہے کہ موافق اسباب فراہم ہوں اور مشکلات و موانع کو دور کیا جائے، غرض یہ کہ عمل کا اجر اور بقا و قیام، اعمال کی بارآوری اور نتائج کا ظہور، سب ہدایت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اعتبار

رب کے معنی ہیں کہ ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشو و نما دینا تا آنکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے، پس جب رب العالمین کے یہ کارنامے ہوں تو یقیناً وہ اس امر کا مستحق ہے کہ ہر وقت اسی کی حمد و ستائش کی جائے اور یہ کہ سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ، اول سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی اسی خدا ہی کو لائق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب کبھی اس سورت کی تلاوت کرتے تو ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ کے بعد سبحان ربی الاعلیٰ فرماتے، بخاری میں ہے کہ ”آپ عید کی نماز میں سورہ اعلیٰ اور غاشیہ پڑھا کرتے اور اگر جمعہ اور عید کا ایک ہی دن میں اجتماع ہو جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی



دوسور تیں تلاوت کرتے۔“

مسند امام احمد میں ہے: لما نزلت فسمي باسم ربك العظيم قال لنار سول الله ﷺ اجعلوهاني ركوعكم، فلما نزلت سمي باسم ربك الاعلى قال اجعلوهاني سجودكم، ”جب فسمي باسم ربك العظيم کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے فرمایا، اس کو رکوع میں سبحان ربی العظیم کی صورت میں ادا کرو اور سمي باسم ربك الاعلى پر کہا کہ تم سجدہ میں سبحان ربی الاعلى پڑھا کرو۔“

## حیوانات کی نگہداشت

وَالَّذِي آخَرَهُ الْمَرْعَى ۝ فَجَعَلَهُ عُشَّاءَ آحُوَى ۝

”اور جس نے چارہ اگایا پھر سب کو سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔“

عشاء، خشک چیز کو کہتے ہیں، جب گھاس خشک ہو جاتی ہے تو سبزی کی جگہ اس پر سیاہی چھا جاتی ہے اس کا نام احوئی ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا وہ پہلو بیان کیا گیا ہے جو حیوانات سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلے خدا نے مختلف چیزوں کو پیدا کیا پھر ان کی ضروریات و لوازمات پورا کرنے کے لیے دنیا میں اسباب و وسائل فراہم کر دیے، نباتات میں چلنے کی طاقت نہ تھی تو انھیں جڑیں دی گئیں، مگر جانور چل پھر سکتے تھے، ان کے لیے چراگاہ بنادیے کہ موسم بہار میں تروتازہ گھاس کھائیں، جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اسی گھاس کو خشک سیاہ رنگ کا کر دیتا ہے، جو ان کے لیے زندگی بخش ثابت ہوتی ہے اور انھیں توانائی بخشتی ہے۔

## وحی والہام

سَنُقَرِّئُكَ فَلَا تَنْسَى ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ۝

”ہم تمہیں پڑھا دیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے مگر جو خدا چاہے، وہ کھلی بات کو بھی جانتا ہے اور چھپی کو بھی۔“

جس خدا نے انسانوں اور حیوانوں کی سابقہ ضروریات انجام دی ہے، اسی کی ربوبیت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت کا بھی ایک نظام صالح قائم کرے۔ چنانچہ وہ تمہیں اے محمد ﷺ ان تمام سنن و نوا میں کی تعلیم دے گا جو جملہ اقوام و امم کے نشو و ارتقا کے لیے ضروری ہوں گی اور تمہیں قرآن پڑھائے گا جس کا ایک ایک حرف تمہارے سینہ میں محفوظ رہے گا۔

## الا ما شاء الله

اس کی شرح میں علمائے کرام مختلف الرائے ہیں، فراء یہ کہتا ہے کہ یہ الفاظ صرف یمنین و برکت کی غرض سے ذکر

کیے گئے ہیں، ورنہ نسیان کلی رسول اللہ ﷺ پر کبھی بھی طاری نہیں ہوا، نماز میں جو دو ایک مرتبہ آپ بعض آیات کو بھول گئے تو وہ صرف عارضی طور پر تھا اور دوسرے صحابہ کے یاد دلانے سے آپ کو وہ آیات یاد آ گئیں، اسی قسم کی آیت جنت میں داخل ہونے والوں کے لیے بھی آتی ہے: خالد بن فہما ما دامت السموت والارض الا ماشاء ربك، اور اس قسم کے الفاظ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ اور دوسرے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ محض اللہ کی بخشش و عطا اور لطف و کرم کے نتائج ہیں، ورنہ کوئی شخص اپنے استحقاق کی بنا پر ذرہ برابر بھی طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

حسن اور قتادہ کی رائے ہے کہ اس میں ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو منسوخ الحکم والتلاوت ہیں۔ چنانچہ علامہ زرخشری فرماتے ہیں: جعل النسیان علیہ بمعنی رفع الحکم والتلاوة، بعض اس کو قلت کی طرف مشیر سمجھتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں فراء کی رائے سب سے زیادہ قابل ترجیح ہے۔

### جہر و خفی

خدائے قدوس اس قرآن کو کیسے بھول جانے دے گا، وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ علیم بذات الصدور ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کی استعداد علمی و عملی اس وقت کس قدر ہیں اور قیامت تک ان کا نشو و ارتقا کہاں تک ہو گا، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تمام سابقہ تعلیمات مٹ چکی ہیں اور کسی الہامی کتاب کے کسی حصہ کے متعلق بھی یقین و اذعان کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خدا کے الفاظ ہیں۔ ان حالات میں قرآن کی حفظ و صیانت بدرجہ اولیٰ لازمی و ضروری ہے کہ یہی آخری الہام ہے، اسی پر: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا کی مہر ثبت ہے اور اسی کی شان میں: انانحن نزلنا الذکر واناله لحافظون نازل ہوا ہے۔

### باہمی تطبیق

گذشتہ آیات میں حیوانات کی ربوبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ موسم بہار میں تروتازہ گھاس ان کے کام آتی ہے اور خزاں میں وہی خشک ہو کر ان کے لیے زندگی بخش ثابت ہوتی ہے۔

بالکل یہی حال نبوت کا ہے، دنیا کے لیے بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب خود نبی اس میں جلوہ افروز ہو، اس کی وفات کے بعد اس کے حواری اور اصحاب اس کی بشارت کو دور و نزدیک پہنچا دیتے ہیں، جو اگرچہ کسی حیثیت سے بھی نبی کے مراتب عالیہ تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے، مگر لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہوتے ہیں اور ان کی معرفت دنیا کو امن و اطمینان قلب اور حیات دائمی نصیب ہوتی ہے۔ اسی کو حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے: خیر القرون قریٰ ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم، دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے: اصحابی کالنجوم بالیہم اقتدیتم اھتدیتم اور اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر، بھی اسی قبیل سے ہیں۔

## تبلیغ قرآن

وَيُسَبِّحُكَ اللَّيْلُ نَائِيًّا ۝ فَذِكْرُنَا إِنَّمَا نُنْفَعُ الذِّكْرَىٰ ۝ سَيَذَكِّرُنَا مَنْ يَشَاءُ ۝ وَيَجْجِبُهَا الْأَشْقَىٰ ۝ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۝ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝

”ہم تم کو آسان طریقے کی توفیق دیں گے، سو جہاں تک نصیحت کے نافع ہونے کی امید ہو نصیحت کرتے رہو، جو خوف رکھتا ہے وہ تو نصیحت پکڑے گا اور جو بے خوف بد بخت پہلو تہی کرے گا، قیامت کو بڑے تیز آگ میں داخل ہو گا پھر وہاں نہ مرے گا نہ جئے گا۔“

اللہ نے اپنے رسول کو ایسی قوم میں نبی بنا کر بھیجا جو صدیوں سے مذہب و قانون کے نام سے نا آشنا محض تھی اور جو امیوں کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ ترقی ہمیشہ تدریجی ہو ا کرتی ہے، اس لیے قرآن حکیم مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا، جس سے ایک طرف تو یہ آسانی ہو گئی کہ لوگوں کو اس کتاب عزیز کے حفظ کرنے میں بے انتہا سہولت و آسانی ہو گئی اور دوسری جانب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے احکام و اوامر پر عمل کرتے کرتے سعادت و کامرانی کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچ گئے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں سہولت پیدا ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ قرآن تمام ام و اقوام کی ضروریات دینی و دنیوی کا ذمہ دار و کفیل اور ان کے نشو و ارتقا کے لیے ایک مدون و مرتب دستور العمل ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی آواز کو دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا دیا جائے اور ارض الہی کی ایک انچ جگہ بھی ایسی نہ ہو جہاں قرآن اور اس کے تراجم موجود نہ ہوں۔ چنانچہ اس آیت میں آپ اور آپ کے متبعین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس کی تبلیغ و اشاعت میں سر بکف کوشش کریں۔

ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ ہم ہر شخص کو قرآن سنا دیں اور اس کے شبہات دور کر دیں، مگر یہ یاد رہے کہ اس کتاب مبین سے وہی شخص فائدہ حاصل کرے گا جو انفرادی و اجتماعی مصائب و آلام سے خوف زدہ ہو گا اور جس نے بد عملی و بد کرداری کی راہ اختیار کی وہ کبھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو گا، مگر یہ انحراف و اجتناب اس کے حق میں مفید نہ ہو گا، بلکہ اس کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں نہ زندگی ہے نہ موت۔

## راہ نجات

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ بَلْ تُؤَثِّرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةَ خَيْرًا ۝ اَبْلَغَىٰ ۝

”بے شک مراد کو وہ پہنچ گیا جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا، مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔“

دنیا میں انسانی اعمال کو مختلف ہوں، مگر اللہ کی نظر میں وہی کامیاب ہے جو برے کاموں سے الگ رہ کر تزکیہ نفس کی راہ اختیار کرتا ہے اور اپنے خالق سے صحیح رشتہ قائم کر کے تمام زندگی کلمہ حق کی نشر و اشاعت میں صرف کر دیتا ہے۔

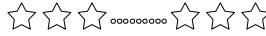
مگر انسان کی بھی عجیب حالت ہے، اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ دنیا کے چند روزہ عیش و کامرانی کو حیاۃ جاودانی پر ترجیح دیتا ہے، اگر وہ ذرا غور سے کام لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے، دوام صرف جنت ہی کی ہر چیز کو حاصل ہے۔

دین قیم

إِنَّ هَذَا لَنَیُّ الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٥﴾ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ ﴿١٦﴾

”یہی بات پہلے صحیفوں میں مرقوم ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔“

قرآن جن اصول و عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہی ابراہیم و موسیٰ، نوح و عیسیٰ اور داؤد و سلیمان کی نبوت کے اصول اساسی تھے، تمام آسمانی کتابیں ان امور پر متفق ہیں اور یہی کلیات رسول اللہ ﷺ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، تمام مذاہب وادیان نے ان اصول حقہ کو فراموش کر دیا ہے جن پر ان کے مذہب کا دار و مدار تھا، قرآن انھیں یاد دلاتا ہے اور اس عالم گیر برادری کی طرف بلاتا ہے جس کے لیے دنیا کا ہر تعلیم یافتہ آج بے قرار نظر آ رہا ہے، مگر اس مشکل کا حل صرف قرآن کے اتباع میں ہے، اس لیے کہ یہ ان امور کی طرف بلاتا ہے جن پر تمام مذاہب متفق ہیں۔



## الغاشیہ

(آیات، ۲۶)

### تلخیص مضامین

۱۶ آیات تک کفار و مومنین کے نتائج اعمال پر بحث کی، آیت ۲۰ تک ان خصوصیات کو بیان کیا جن پر قوموں کی فضیلت و برتری اور آخرت میں فوز و کامرانی موقوف ہے، رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ لوگوں کو ان حقائق عالیہ کی طرف متوجہ کر دے، اس کے بعد ہر شخص اپنے لیے راہ عمل معین کرنے میں آزاد ہے، مگر اس آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس سے باز پرس بھی نہ ہوگی، قیامت کے روزان سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ اس لیے کہ جا کہاں سکتے ہیں؟ آخر لوٹ کر ہماری ہی طرف تو آتا ہے۔

## اصول کامرانی

### ناکام لوگ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَلْ اُنْشِکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝ وَجُوْهُ یَوْمَیْنِ غَاشِیَةٍ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً ۝ تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اِنِّیْةٍ ۝ لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ حَرِیْمٍ ۝ لَا یُسْبِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوعٍ ۝

”بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی یعنی قیامت کا حال معلوم ہوا ہے، اس روز بہت سے منہ والے ذلیل ہوں گے، سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے دھکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، ایک کھولتے ہوئے چشمے کا ان کو پانی پلایا جائے گا اور خاردار جھاڑ کے سوا انکے لیے کوئی کھانا نہیں ہو گا جو نہ فریبی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔“

غاشیہ، اس چیز کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے کسی کو گھیرے، قیامت تمام مخلوق کو سب طرف سے احاطہ کرے گی، اس لیے اسے غاشیہ کہا گیا۔ ناصبہ مشتق ہے نصب سے، اس کے معنی مشقت سے تھک کر چور چور ہو جانے کے ہیں۔ اینیۃ، گرم کھولتا ہوا چشمہ جس کی گرمی انتہا کو پہنچ گئی ہو۔ حریم، ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے، جب تک تر ہے اس کو شبرق کہتے ہیں اور اونٹ اسے کھاتا ہے، جب خشک ہو جائے تو اس کے کانٹے بن جاتے ہیں اور زہریلی ہو جاتی ہے، پھر اونٹ اس

کے قریب بھی نہیں جاتا۔

ان آیات میں کفار کے نتائج اعمال بیان کیے گئے ہیں جو دنیا میں اگرچہ محنت و مشقت کرتے رہے مگر انجام کار انکی تمام کوششیں اکارت گئیں: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿٥٠﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿٥١﴾ (الکہف ۱۰۳ تا ۱۰۴) ”کہہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں، وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔“

### ارباب ایمان

وَجُودًا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾ لَسَعِيَهَا رَاضِيَةً ﴿٥٣﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٥٤﴾ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ﴿٥٥﴾ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿٥٦﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ﴿٥٧﴾ وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ﴿٥٨﴾ وَنَبَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿٥٩﴾ وَزَوَاجٌ مَبْثُوثَةٌ ﴿٦٠﴾

”بہت سے منہ والے اس روز شادماں ہوں گے، اپنے اعمال کی جزا سے خوش دل، بہشت بریں میں، وہاں کسی طرح کی بکواس نہ سنیں گے، اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے، ہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے اور آنخورے قرینے سے رکھے ہوئے اور گاؤں کیے قطار کی قطار لگے ہوئے اور نفیس فرش بچھے ہوئے۔“

نبارق جمع ہے ہرقہ کی، اس کے معنی تکیہ کے ہیں۔ ذراہاں، عمدہ بچھونے اور نفیس فرش کو کہتے ہیں، اس کا واحد

ذریعہ ہے۔

ان آیات میں ارباب ایمان کے نتائج اعمال ذکر کیے گئے ہیں، یہ اگرچہ نعمتوں سے مالا مال ہوں گے، مگر کیا مجال کہ ان کی زبان سے کوئی بات خلاف تہذیب بھی نکل جائے۔ سورہ مریم میں آتا ہے: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا (مریم ۶۲) ”اس میں سلام کے سوا کوئی بیہودہ کلام نہ سنیں گے۔“ ایک جگہ یوں ارشاد ہوا: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ﴿٦١﴾ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿٦٢﴾ (الواقعہ ۲۵ تا ۲۶) ”وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ، وہاں ان کا کلام سلام سلام ہو گا۔“

دنیا کا عام دستور یہ ہے کہ جو لوگ عزت و مرتبت اور دولت و ثروت کے مراتب عالیہ پر فائز ہوتے ہیں اور تمام لوگ ان کو اکرام و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، عموماً ان کی مجالس فواحش و منہیات کا مرکز بن جاتی ہیں، تمسخر و استہزاء سب و شتم اور لغو و مہمل بکواس ان کی صحبتوں کا طغرائے امتیاز ہوتا ہے مگر اہل جنت ان تمام بیہودہ حرکات سے پاک ہوں گے اور وقار و سنجیدگی ان کی مجالس پر برستی ہوگی۔

### طبع انسانی کا خاصہ

گذشتہ سطروں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسانی عمل کا کوئی حصہ بھی ضائع نہیں جاتا اور دنیا و آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور مل کر رہتا ہے، پس جب یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے تو پھر وہ اپنے اندر ان اوصاف کو کیوں نہیں پیدا کرتا جو اس کو ہر

زندگی میں کامیاب کریں اور وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۖ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۖ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۖ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۖ

”کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہیں۔“

انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ باہر سے متاثر ہوتی ہے، مگر اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزمرہ ایک چیز کو دیکھتی ہے اور اس سے عبرت اندوز نہیں ہوتی نہیرون علیہا ہم عنہا معروضون، اس لیے قرآن کریم انہی چیزوں کو بار بار ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ کبھی تو ہم ان سے سبق اندوز ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام روزمرہ یہی ستارے، چاند اور سورج دیکھتے، مگر ان کے دل میں کبھی کوئی خاص کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی اور پھر یہی نجوم و کواکب تھے جن کو دیکھ کر وہ تو حید باری کے قائل ہوئے اور پکارا ٹھے: يَتَقَوَّمُوا بِرَبِّهِمْ مِمَّا تُشِيرُ كُنُونَ ۖ لَئِنْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِينَ فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَكُنُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۖ (الانعام ۷۸ تا ۷۹) ”لوگوں جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں، میں نے سب سے یک سو ہو کر اپنے آپ کو اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“

### سادگی طبع

یہی چاند اور سورج ہیں، نجوم و کواکب ہیں، ثوابت و سیارات ہیں، لیل و نہار ہیں، دریا اور پہاڑ ہیں، جن کی طرف اللہ تعالیٰ انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ ان سے نتائج و عبر حاصل کرے۔

قرآن نے ان آیات میں صرف وہی چیزیں ذکر کی ہیں جن کے دیکھنے کے ہم یوم ولادت سے عادی ہیں، یہی اونٹ ہے جو اس قدر اطاعت شعار ہے کہ ایک بچہ بھی اس کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے، اس پر بوجھ لاد سکتا ہے، وہ جنگل کی جھاڑیاں کھاتا اور ایک مرتبہ پانی پی کر کئی روز تک اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اب دیکھو یہ جانور اپنے مالک کے لیے کس قدر تکلیف و مصیبت برداشت کرتا ہے، اس کے لیے یکسر اطاعت و انقیاد بن جاتا ہے اور باوجود اس کے خود اس کی ضروریات زندگی کس قدر مختصر اور سادہ ہیں، جنگل کی جھاڑیوں اور کانٹے اسکی غذا کے لیے کافی ہیں اور پانی کی یہ حالت ہے کہ ایک دفعہ پی لیا اور دس پندرہ روز تک اس کا محتاج نہ ہو گا۔

اونٹ کی زندگی کے یہ تمام حالات ہمارے لیے سرمایہٴ عبرت و بصیرت ہیں اور ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ جو شخص ملک کی خدمت کا آرزو مند ہے، نوع انسانی کی ہمدردی اس کا نصب العین ہے اور کلمۃ اللہ کی فضیلت و برتری اس کی

غایۃ الغایات تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس اونٹ سے نصیحت پذیر ہو، اسی طرح ملک اور قوم کی خدمت میں جان توڑ کوشش کرے اور اپنی ضروریات حیات اس قدر سادہ اور مختصر کر دے کہ دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔

مہر دے اہل سے مراد ابر کے ٹکڑے لیے ہیں، مگر یہ معنی نہ صرف ربط آیات کے لحاظ سے غلط ہے، بلکہ تمام اہل لغت و تفسیر کے بھی خلاف ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علم الحیوانات سیکھنے کی ترغیب دی ہے۔

### بلندی مقصد

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیرا مة اخر جت للناس کے لقب سے سرفراز کیا ہے وہی شہداء علی الناس ہیں، فاستبقوا الخیرات کا حکم بھی ان ہی کو دیا گیا ہے، انھیں ہی کلمہ حق کی نشر و اشاعت کرنی ہے اور ہر برائی کو دنیا سے دور کرنا ہے، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد کس قدر راہم و اعظم ہے۔

ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ ہر انسان میں موجود ہے اور جب تک یہ جذبہ نہ ہوتی ممکن نہیں، مگر بہت سے لوگ ہیں جو اپنے مقصد کو محدود اور دائرہ عمل کو تنگ کر لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے بعد ان کی ہمتیں بھی پست ہو جاتی ہیں، ان کی ترقی رک جاتی ہے اور پھر ان کا رخ تنزل کی طرف ہو جاتا ہے، حالانکہ میدان ترقی میں انسان کی نظر ہمیشہ اعلیٰ پر ہونی چاہیے، ورنہ باطل قناعت پیدا ہو جائے گی، اس دنیائے عمل میں قدر و قیمت اسی شخص کی ہوتی ہے جس کا مقصد نہایت ہی بلند ہو۔

مسلمانوں کو حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جہاں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوں گے اور یہ وہ جگہ ہوگی جس مقام پر ہر مسلمان کے کمالات و فضائل کا اظہار ہو گا اور تمام عالم اسلامی کو معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت دنیائے اسلام میں بہترین شخص کون ہے؟ اس لیے حکم دیا گیا: فاستبقوا الخیرات، ”تم میں سے ہر ایک مسلمان طہارت و پاکیزگی اور ورع و تقویٰ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے“، تاکہ حج کے روز کسی کو ندامت نہ ہو۔

سورہ تغابن میں آتا ہے: نیوم یجمعکم لیوم الجمع، ذلک یوم التغابن، قیامت کے روز تمام اقوام و ملل ایک میدان میں جمع ہوں گے، ہر ایک امت کا دوسری سے اخلاق و کمالات میں مقابلہ ہو گا، پھر اس روز جو قوم بازی لے گئی وہی فیروز مند و خوش بخت رہی اور دوسری کو حسرت و ندامت کے سوا اور کیا حاصل ہو، گار رسول نے فرمایا: انی مکار ثربکم الامم فلا تقتلن بعدی، ”تمہاری کثرۃ تعداد کی بنا پر میں قیامت کے روز دوسری امتوں پر فخر کروں گا، اس لئے ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا“ اور نہ باہمی جدال و قتال اور خوں ریزی سے تمہاری تعداد کم ہو جائے گی اور مجھے مسابقت اور افتخار کا موقع نہ مل سکے گا۔

ان تمام تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کی تمام قوموں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں اور ہر فرزند اسلام



میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ اگر موقع پڑے تو وہ تمام دنیا کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے قرآن نے علما گننے کی یوں تعلیم دی: واجعلنا للمتقین اماما، تقویٰ تو ہر شخص میں ہوگا، مگر ہم اسی پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جائیں، بلکہ ہماری نظر اتنی بلند ہو کہ ہم متقین کے امام و پیشوا بننے کی آرزو اور کوشش کریں۔

والی السباء کیف رفعت میں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ جب ہم اپنا مقصد حیات معین کرنے کا ارادہ کریں تو ہماری نظر معمولی انسانوں اور ادنیٰ نمونوں کو دیکھ کر اسی جگہ نہ رک جائے، بلکہ ہم آسمان کو دیکھیں جو کس قدر بلند ہے اور بغیر ستونوں کے قائم ہے، اسی طرح ہمارا مقصد حیات بھی نہایت ہی بلند ہو اور پھر اس کے کسب و حصول کے لیے ہم کسی انسان پر اعتماد نہ کر بیٹھیں، بلکہ ہماری نظر صرف خدا پر ہو: ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ۔ اس آیت مبارکہ میں علم ہیئت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

### استقلال

جس شخص کا مقصد اس قدر بلند ہو گا اسے تکالیف و شدائد سے بھی دوچار ہونا پڑے گا اور یہی وقت اس کے امتحان کا ہوگا، اگر اس نے ان تمام عوائق و موانع کی پروا نہ کی، بلکہ ہر رکاوٹ کو دور کر کے آگے بڑھتا چلا گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو وہ یقیناً اپنی مراد کو پالے گا، اسے صبر و تحمل، استقلال و ثبات قدم، صمیم قلب اور عزم راسخ سے کام لینا پڑے گا، تب کہیں جا کر کامیابی کا منہ دیکھے گا۔

قرآن نے بار بار ارباب ایمان کو ان جذبات حقہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان فرزند ان اسلام کی مدح و ستائش کی ہے جو مصیبتوں کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقِصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۚ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۚ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۚ (البقرہ ۱۵۵ تا ۱۵۷) ”اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میوؤں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنا دو، ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں“، ایک جگہ فرمایا: وَكَانَ مِّن دُونِ قَتْلٍ ۚ مَعَهُ رَيْثُيْنِ كَيْفِيَّةٍ ۚ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (ال عمران ۱۴۶) ”اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل اللہ خدا کے دشمنوں سے لڑے ہیں تو جو مصیبتیں ان پر راہ خدا میں واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ بزدلی کی، نہ کافروں سے دبے اور خدا استقلال رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

پہاڑوں کو دیکھئے آندھیاں چلتی ہیں، طوفان آتے ہیں، شہروں کے شہر برباد ہو جاتے ہیں دریا اپنا رخ بدل دیتے ہیں،

حکومتوں میں انقلابات رونما ہوتے ہیں، قومیں صفحہ دنیا سے ناپید ہو جاتی ہیں، مگر پہاڑ ہیں کہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور ایک انچ بھی وہاں سے نہیں ہٹتے۔ پس جو شخص اعلیٰ ترین مقاصد لے کر دنیا میں آیا ہو وہ ان پہاڑوں سے ثابت قدمی کا سبق سیکھے اور اس طرح گڑ جائے کہ کوئی چیز بھی اس کے پائے استقامت میں تزلزل نہ پیدا کر سکے، اسکے بعد کامیابی ہی کامیابی ہے۔ علم جبال سیکھنے کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

## فروتنی

جو لوگ بے انتہا قربانیوں کے بعد ان اعلیٰ ترین مقاصد میں کامیاب ہوں تو رد عمل اور ری ایکشن کے طور پر ان میں جذبہ انتقام پیدا ہو جاتا ہے اور ان لوگوں پر ظلم و ستم کرنا شروع کر دیتے ہیں جنہوں نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی تھی اور اس میں وہ بسا اوقات بے گناہوں کو بھی تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ہنگامہ ۷۵ء کی مثال تمہارے سامنے ہے، جب انگریزوں کو ہندوستانیوں پر کامیابی ہوئی تو انھوں نے کس طرح ہزاروں لاکھوں بے گناہ لوگوں کو بے وجہ برباد کیا، لارڈ کچر کو فتح سودان سے اطمینان نہ ہوا اور مصلح اعظم، حضرت مہدی علیہ الرحمۃ والعتران کی لاش بھی اس فرعون مصر کے ظلم و ستم سے نہ بچ سکی۔

مگر انسانیت اعلیٰ کا معلم قرآن کہتا ہے کہ اس وقت تم زمین سے عبرت پذیر ہو، لوگ اس کی پشت پر ہر قسم کی ناشائستہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں، اس پر بول و براز کرتے ہیں، مگر پھر بھی وہی زمین تمہارے سامنے عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتی ہے، تم سے کوئی انتقام نہیں لیتی، پس تم بھی اپنی فتح و کامرانی کے بعد زمین کی طرح عاجز بن جاؤ اور اپنے مخالفین کے سامنے فروتنی کا اظہار کرو۔

علم طبقات الارض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

## ایک مثال

اگر ان صفات حسنہ سے متصف کسی نمونہ کے طالب ہو تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھو جو سادہ معیشت اور اعلیٰ تخیل کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فاتحانہ حیثیت سے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، آپ کے شدید ترین دشمن آپ کے سامنے آتے ہیں، جن کو آپ بآسانی قتل کر سکتے ہیں، مگر آپ العفو اقرب للتقویٰ کے مطابق انہم الطلقاء فرما کر سب کو آزاد کر دیتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دشمن پر قابو پا چکے ہیں، اس کی گردن اپنی تلوار سے اڑا سکتے ہیں کہ اتنے میں وہ آپ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیتا ہے، آپ فوراً اس کی چھاتی سے اتر آتے ہیں کہ دنیا کے سامنے عمل کے لیے ایک صحیح نمونہ پیش کریں، یہ تو شمشیر نمونہ از خردارے ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دوستوں کی زندگی تو اس قسم کے مسئلہ و نظا رے پر ہے اور یہی لوگ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔

## فرض تبلیغ

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝  
إِنَّ إِلَيْنَا أِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝

”تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا، بیشک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے پھر ہمیں ان سے حساب لینا ہے۔“

یہ کائنات ارضی و سماوی تمہارے سامنے ہے، جو بانگ دھل تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہے کہ تم اس سے عبرت اندوز و بصیرت افروز ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف اتنا ہے کہ تمہاری غفلت کے پردوں کو چاک چاک کر دے، ان حقائق و مصارف کی طرف تمہیں توجہ دلاوے جو لازمہ حیات ہیں اور جن پر تمہاری انفرادی اور اجتماعی کامیابی کا دار و مدار ہے، راہ حق دکھانے کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ اس کی تعلیم سے تم ہدایت یافتہ کیوں نہیں ہو گئے؟ اس کا فرض صرف تبلیغ تھا اور وہ اس نے ادا کر دیا: وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۝ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدَ (ق ۴۵)، ”اور تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو، پس جو ہمارے عذاب کے وعدے سے ڈرے اس کو قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔“

باوجود اس تذکیر و موعظت کے جو لوگ اس تعلیم سے احتراز کریں گے اور انکار و جھوٹ کی زندگی بسر کریں گے، بتدریج ان کی تمام قوتوں پر عالم ممت طاری ہو جائے گا اور عذاب اکبر میں مبتلا ہوں گے، ان سب کو آخر ہمارے ہی دربار میں ایک روز حاضر ہونا ہے، پھر ہم ان سے ایک ایک چیز کا حساب لے لیں گے۔



## الفجر

(آیات، ۳۰)

### تلخیص مضامین

اس سورۃ میں جزائے اعمال پر بحث کی گئی ہے، ابتدا میں چار شہادتیں پیش کیں، آیت ۴ تک بتایا کہ قومیں جو دنیا میں برباد ہوتی ہیں تو وہ قانون جزائے اعمال کے تحت برباد ہوتی ہیں۔ آیت ۲۰ تک انفرادی جزا و سزا کا تذکرہ کیا اور پھر آخر سورۃ تک اس مضمون کو واضح کیا کہ جس طرح دنیا میں اجتماعی اور انفرادی طور پر سزا ملتی ہے، ویسے ہی مرنے کے بعد بھی عقاب و ثواب اور پھر جنت و دوزخ کا سلسلہ قائم ہو گا اور اسی پر سورۃ کو ختم کر دیا۔

## جزائے اعمال

### اقسام کی تفصیل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالْفَجْرِ ۝ وَكَیَالِ عَصْفٍ ۝ وَالسَّفْحِ وَالْوُتْقِ ۝ وَالْبَلِّ اِذَا یَسَّرَ ۝ هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ ۝

”فجر کی قسم اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب جانے لگے، بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں کہ کافروں کو ضرور عذاب ہو گا۔“

مفسرین کرام نے ان اقسام کی شرح و تفصیل میں اختلاف کیا ہے۔ علی، ابن عباس مجاہد، عکرمہ اور سدی کے نزدیک ہر روز کی صبح مراد ہے، مسروق اور محمد بن کعب کی رائے میں یہ یوم النحر کی فجر ہے، قتادہ کے نزدیک محرم کی پہلی تاریخ ہے، ضحاک کی رائے ہے کہ یہ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ ہے، بعض نے ان قرآن الفجر کا مشہودا کی بنا پر اس سے نماز فجر مراد لی ہے، دوسرے لوگوں نے وجعلنا من الباکل شق حی کی وجہ سے فجر کے معنی چٹمہائے آب بیان کئے ہیں۔

فجر کے بعد لیالی عشر کے متعلق بھی وہی اختلاف آرا ہے، کہ یہ کونسی دس راتیں ہیں۔ ایک جماعت رمضان کی آخری دس راتیں کہتی ہے، دوسرا گروہ محرم کی ابتدائی دس راتیں لیتا ہے، ایک طائفہ نے ذرا تفصیل سے کام لیا ہے، انہوں نے ان

دس راتوں کو سال کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، ۳۱ لیلیۃ القدر کی راتیں، عید الفطر کی رات، یوم النحر کی رات، ۷ رجب کی شب، ایک شب برات اور عرفہ کی رات۔ ایک قول یہ ہے کہ ذی الحجہ کی پہلی دس راتیں ہیں۔

### ہماری رائے

یہ مختلف اقوال ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں۔ احادیث میں کثرت سے ان کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، بخاری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: ما من ایام العمل الصالح احب الی اللہ فیہن العمل من ہذا الیام یعنی عشاء ذی الحجۃ، قالوا ولا الجہاد فی سبیل اللہ، قال ولا الجہاد فی سبیل اللہ الا رجلاً خرم بنفسه وماله، ثم لم یرجع من ذلک بشئ، سال کے تمام دنوں میں سے ذی الحجہ کے ابتدائی دس ایام میں جو عمل صالح کیا جاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، کیا جہاد بھی اس کے برابر نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مساوات کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص اس طرح اللہ کی راہ میں جنگ کرے کہ سب کچھ جان و مال قربان ہو جائے۔ "نساؤں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیال عشر کے معنی ذی الحجہ ہی کیے ہیں، ایک روایت میں آتا ہے کہ جب ایک شخص حج سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے گویا ابھی ماں کے پیٹ سے معصوم پیدا ہوا ہے: کیوم ولدتہ امہ۔

پس فجر سے مراد سویں ذی الحجہ کی صبح اور لیالی عشر اسی ماہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حاجیوں کو جو یہ ثواب مل رہا ہے تو وہ ان کے سابقہ اعمال حسنہ ہی کا نتیجہ ہے۔ حج حقیقت میں ایک کسوٹی ہے جس سے نیک و بد میں تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں آتا ہے کہ حج کے بعد لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں: فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلَقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ (البقرہ ۲۰۰ تا ۲۰۱) "اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا سے التجا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جو دینا ہے دنیا ہی میں عنایت کر، ایسے لوگوں کا آخرۃ میں کچھ حصہ نہیں اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشو اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھو۔"

### جنت اور طاق

شفع اور وتر کے متعلق امام فخر الدین رازی نے مفسرین کرام کے بیس اقوال نقل کیے ہیں، مگر حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابن جریر طبری نے ان میں سے کسی ایک قول کو بھی اختیار نہیں کیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ دونوں قسمیں انفرادی جزائے اعمال سے تعلق رکھتی تھیں، ایسے ہی والشفع والوتر واللیل اذیسا سے استدلال کیا گیا ہے کہ اقوام و مل بھی اپنے اعمال کے نتائج سے بچ نہیں سکتیں، بلکہ اسی دنیا میں ان کو اپنے کیے کا بدلہ مل جاتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال اسی قانون کا ایک شعبہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج تک کسی صاحب تفسیر نے شفع اور وتر کے وہ معنی مراد نہیں لی جنہیں ہم ابھی بیان کریں گے، مگر ہمیں جو یہ جدید راہ عمل ان تمام حضرات سے الگ اختیار کرنی پڑی تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خود ان بیس اقوال میں سے ایک رائے بھی ایسی نہیں جس سے ہمیں اطمینان قلب اور خلج صدر حاصل ہو، ادھر ایک حد تک قرآن کریم سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ سورہ حاقہ میں جزائے اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: **وَمَا عَادَ فَاهُ لَكُوا بِرِيحٍ صَوَّصٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَنِيَةً أَيَّامٍ ۖ حُسُومًا ۖ فَتَنَّى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى ۖ كَأَنَّهُمْ أُغْبِضُوا نَجْلٍ خَاطِيَةٍ (الحاقۃ ۶ تا ۷)** ”رہے عادیان کا نہایت تیز آندھی سے ستیاناس کر دیا گیا، خدا نے اس کو سات رات اور آٹھ دن لگا تار ان پر چلا رکھا تو اے مخاطب، تو لوگوں کو اس میں اس طرح ڈھے اور مرے پڑے دیکھے، جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔“

یہ عذاب ہے جو قوم عاد پر اس کی نافرمانی کی وجہ سے نازل کیا گیا، خود آگے چل کر اس سورۃ میں اسی قوم عاد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے شفع اور وتر سے ہم نے قوم عاد کی یہ سات راتیں اور آٹھ دن مراد لیے ہیں۔

### واللیل اذالیس

اس رات کی تفسیر میں بھی ہم سب سے الگ گئے ہیں اور ہماری رائے میں یہ وہ رات ہے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے ہیں، فرعون نے اپنا لشکر جمع کر کے ان کا دور تک تعاقب کیا، مگر بنی اسرائیل تو نجات پا گئے اور فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہو گیا: **أَنَّا بَعَدْنَاهُ فَاخْرَبْنَا مُوسَىٰ بِرَبِّهِ ۚ فَكَفَرْنَا ۚ وَكَانَ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَنِيَةً أَيَّامٍ ۖ حُسُومًا ۖ فَتَنَّى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى ۖ كَأَنَّهُمْ أُغْبِضُوا نَجْلٍ خَاطِيَةٍ (الحاقۃ ۶ تا ۷)** ”ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ، پھر ان کے لیے دریا میں لاشیں مار کر خشک رستہ بنا دو، پھر تم کو نہ فرعون کے آپکڑنے کا خوف ہو گا اور نہ غرق ہونے کا ڈر، پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا تو دریا کی موجوں نے ان پر چڑھ کر انہیں ڈھانک لیا یعنی ڈبو دیا اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور سیدھے رستہ پر نہ ڈالا۔“

### عبرت و موعظت

یہ واقعات و حوادث تمہارے سامنے ہیں، تاریخ کے اور اق اس کی شرح و تفصیل سے بھرے پڑے ہیں، تم خود ان حالات سے واقف ہو، پھر کیا ان میں تمہارے لیے کوئی عبرت و بصیرت نہیں، ایک عقلمند آدمی اگر ان میں غور کرے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ نہ صرف ہر شخص اپنے اعمال کا مذمہ دار اور جواب دہ ہے، بلکہ قومیں اور ملتیں بھی اس مسؤلیت سے نہیں بچ سکتیں۔

حجر کہتے ہیں رکاوٹ کو، عقل انسان کو فسق و فجور اور بے حیائی سے روکتی ہے، اس لیے حجر کے معنی عقل کے ہوئے اور ذی حجر قلمند کو کہتے ہیں۔

## تذکیر بایام اللہ

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۚ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۚ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخِرَ بِالْوَوَادِ ۚ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۚ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۚ فَأَكْنُتُوا فِيهَا الْفُسَادَ ۚ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْبِرِّصَادِ ۚ

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا، جو ارم کہلاتے تھے، اتنے دراز قد کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے تھے اور ثمود کے ساتھ کیا کیا، جو وادی قریٰ میں پتھر تراشتے اور گھر بناتے تھے اور فرعون کے ساتھ کیا کیا، جو خیے اور میخیں رکھتا تھا، یہ لوگ ملکوں میں سرکش ہو رہے تھے اور ان میں بہت سی خرابیاں کرتے تھے تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا، بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔“

حضرت نوح علیہ السلام کی پانچویں پشت کے پوتے کا نام عاد ہے، پھر اس کی نسل کے تمام لوگ عاد کہلانے لگے، ان ہی کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھی بنا کر بھیجے گئے تھے، جب ان لوگوں نے اپنے رسول کی نافرمانی کی تو آندھی سے ہلاک ہو گئے اور صرف ایمان والے بچ گئے، پھر ان کی نسل چلی اور وہ بھی عاد ہی کہلانے لگی، مگر امتیاز کے لیے ان لوگوں کو عاد اولیٰ یا عاد ارم کہنے لگے، جو عذاب سے ہلاک ہو گئے تھے اور دوسروں کو عاد ثانیہ کا نام دیا گیا۔ ارم یا تو اس شہر کا نام ہے جس میں یہ جاکر بس گئے تھے یا اپنے دادا کی طرف منسوب تھے جس کا یہی نام تھا اور اسی کی یاد میں ایک شہر بھی اسی نام سے آباد کیا تھا۔ عباد اس جگہ عمود کے معنی میں ہے جس کو ستون کہتے ہیں، ان کے شہر کی عمارتوں میں ستون کثرت سے تھے، اس لیے اس کو ستونوں والا شہر فرمایا اور اگر ذات العباد کو قوم عاد کی صفت قرار دیا جائے تو اس وقت آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ لوگ بڑے قد آور تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ثمود ہے، چابوا، کسی چیز کے کاٹنے کو چوب کہتے ہیں، گریبان کو جیب اسی لیے کہتے ہیں کہ اسے قطع کرتے ہیں۔

اوتاد جمع وتد کی ہے، اس کے معنی میخ کے ہیں، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ فرعون کے پاس گھوڑوں کے باندھنے کے لیے سونے اور چاندی کی میخیں تھیں یا یہ کہ وہ مجرموں کو چومینا کر کے سزا دیا کرتا تھا۔ صب کے معنی پھینکنے کے ہیں اور سوط کوڑے کو کہتے ہیں۔ مرصاد، وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کا انتظار کیا جائے، یہ وصد سے ظرف مکان ہے۔

اہل عرب ان اقوام کے حالات سے خوب واقف ہیں، اس لیے ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہے، نتائج و عبر کی طرف طبیعت خود بخود منتقل ہو جائے گی، ان امتوں نے اپنے رسولوں کی نافرمانی کی، اپنی رعایا پر بے جانتہ دیا اور اپنی ذمہ داری و مسؤولیت سے ہمیشہ انکار کرتی رہیں، ان لیے ان جرائم کی پاداش میں ان سب کو ہلاک کر دیا گیا اور اب صرف تاریخوں کے اور اق میں ان کے نام ہی نام رہ گئے ہیں۔

جب ایک قوم کسی غلطی میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ اس کو اصلاح کا موقع دیتا ہے، جو لوگ اپنی حالت درست کر لیتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں اور اگر وہ جرم و معصیت پر اور زیادہ دلیر ہو جائیں، تا آنکہ ان کا وجود امن عامہ کے لیے خطرناک بن جائے تو اس وقت اللہ کا غضب ان پر نازل ہوتا ہے اور ان کو یک قلم محو باطل کر دیا جاتا ہے، یہی مطلب ہے ان ربک لبالمصدا کا۔

### انفرادی احتساب

گذشتہ آیات میں اجتماعی ذمہ داری اور جواب دہی پر بحث کی گئی تھی، اب بتایا جاتا ہے کہ اقوام و امم کی طرح افراد بھی اپنے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اور ہر ایک کو اسی دنیا میں اس کا بدلہ مل جاتا ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَ نَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝  
وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝

”مگر انسان عجیب مخلوق ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ آہا میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب دوسری طرح آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہائے میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔“

دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک شخص کو عزت دیتا ہے تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ نے مجھے تمام نوع انسانی پر فضیلت و برتری نوازش کی ہے، اب وہ اسے بالکل آزاد چھوڑ دیا اور اس کے اعمال فاسقہ پر کوئی مواخذہ نہ کرے گا، پس وہ طغیان و سرکشی کرتا ہے اور عذاب الہی سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔

پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ اسے تنگی رزق اور تکلیف و مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے تو وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلیل کر دیا، اس کی نظر عنایت مجھ پر نہیں رہی، اس لیے اب میں جو عمل بد کروں مجھ سے باز پرس نہ ہوگی اور اگر نیکی کروں گا تو اس کا کچھ ثواب نہ ملے گا، حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان مصائب و آلام کا مقصد صرف یہ ہو کہ اس کے کمالات و فضائل کا اظہار ہو اور وہ عیوب و نقائص سے پاک و صاف ہو جائے، سچ ہے انسان بڑا ہی بے صبر واقع ہوا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْبُصْلَيْنِ ۝ (المعارج ۲۲ تا ۲۹) ”کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے، جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے، مگر نماز گزار۔“

### اس کا اصلی سبب

كَلَّا بَلْ لَا تَكْرَهُمُ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْبُسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ الثَّمَاثَ أَكْلًا لَّبِثًا ۝ وَتَحِبُّونَ الْهَالِكًا حُبًّا جَبَّ ۝



”نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کو بہت عزیز رکھتے ہو۔“

تراث اصل میں وراثت تھا، واو مضموم تا سے بدل لیا گیا، اس کے معنی میراث کے آتے ہیں۔ لم بہت جمع کرنے کو کہتے ہیں، اگر ایک لشکر میں بہت آدمی جمع ہوں تو اس کو کتیبہ ملبومہ کہتے ہیں۔ جم کے معنی کثیر کے ہیں۔

تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حصول دولت و راحت دنیا اللہ کی رضامندی اور اس کے اکرام و احترام کے نتائج ہیں یا دنیاوی فقر و فاقہ اور آلام و مصائب اس کی ناراضگی اور توہین کے آثار، بلکہ تم ان سب کا اصلی سبب دریافت کرو تو وہ خود تمہارے اپنے اعمال ہیں، جن کے نتائج تمہیں مل رہے ہیں: وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (شوریٰ ۳۰) ”اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے فعلوں سے۔“ دوسری جگہ آتا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم ۴۱) ”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔“

خدا نے جو تمہیں دولت دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر روپیہ تمہاری ضروریات سے بچ جائے، اسے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دو، مگر تم بخل و ماسک سے کام لیتے ہو اور بے یار و مددگار یتیم کی نگرانی بھی نہیں کر سکتے، اگر جیب سے خرچ کرنا مشکل تھا تو دوسرے شخص کو غریب و نادار کی اعانت کے لیے کہہ سکتے تھے، مگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکا اور تم اس قدر حریص بن گئے کہ مردوں کا مال بھی سمیٹ کر کھانے لگے تو اب یہ یقین کر لو کہ ان ہی اعمال کی پاداش میں تم پر یہ شدائد و آلام نازل ہو رہے ہیں۔

### آخری احتساب

یہاں تک یہ مضمون صاف ہو گیا کہ دنیا ہی میں انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملنا شروع ہو جاتا ہے اور یہ قانون نہ صرف افراد انسانی کے لیے ہے، بلکہ اقوام و ملل بھی اس کی ہمہ گیری میں داخل ہیں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ بہت سے کام ہیں جن کی سزا و جزا اس ننگ دنیا میں نہیں مل سکتی، اس لیے مرنے کے بعد بھی ثواب و عقاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور جنت و دوزخ کی تقسیم اس کے تحت میں ہوگی

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِئَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝ يَقُولُ يَلَيِّنَتْنِي قَدَمْتُ لِحَيَاتِي ۝

”تو جب زمین کی بلندی کوٹ کوٹ کر پست کر دی جائے گی اور تمہارا پروردگار جلوہ فرما ہو گا اور فرشتے قطار باندھ کر آمو جو دوں گے اور دوزخ اس دن حاضر کی جائے گی تو انسان اس دن متنبہ ہو گا، مگر تنبہ سے اسے فائدہ کہاں مل سکے گا، کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی جاودانی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔“

دک کے معنی انہدام و کسر کے ہیں، دکا دکا یعنی ایک کے بعد دوسرا۔ ان آیات میں بعض حوادث قیامت ذکر کیے گئے ہیں۔ اس روز زمین و آسمان کے مالک کا دربار قائم ہوگا، تمام ملائکہ صف بستہ ادب کے ساتھ کھڑے ہوں گے، دوزخ بھی حاضر کی جائے گی، ان مدہش و الم ناک مناظر کو دیکھ کر ہر شخص عبرت پذیر ہوگا، مگر اس وقت یہ چیز کام نہ آئے گی، کیونکہ یہ وقت ظہور نتائج کا ہوگا۔

### ظہور نتائج

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۖ وَلَا يُوثِقُ وِثْقَهُ أَحَدٌ ۖ يَأْتِيهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ۖ اَرْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً ۖ فَأَدْخِلِي فِي عِلْدِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۖ

”تو اس دن نہ کوئی خدا کے عذاب کی طرح کسی کو عذاب دے گا اور نہ کوئی ویسا جکڑنا جکڑے گا، اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، تو میرے ممتاز بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔“

دشاق کے معنی باندھنے کے ہیں، جس طرح اغلال و سلاسل سے مجرم کو جکڑ بند کر دیتے ہیں۔  
قرآن کریم نے نفس کے تین اقسام بیان کیے ہیں:

(۱)۔ اِمَارَةُ: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةً بِالسُّوءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي (یوسف ۵۳) ”کیونکہ نفس امارہ انسان کو برائی ہی سکھاتا ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔“

(۲)۔ لَوَامَةُ: لَا اَقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ وَلَا اَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۖ (القیامہ ۲۲) ”ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی۔“

(۳)۔ مَطْمَئِنَّة: جس کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے نِیَاتِهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ۔

جن لوگوں نے دنیاوی زندگی فسق و فجور میں بسر کی ہوگی اس روز انھیں ایسی سزا ملے گی کہ ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی نہ سنی، لیکن ارباب تقویٰ و طہارت کو خاص مقربین میں شامل کیا جائے گا اور اللہ کی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

## البدل

(آیات، ۲۰)

## تلخیص مضامین

شروع میں چند قسموں کو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا کہ کوئی انسان بھی راحت و آرام کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، بلکہ ہر ایک کو ہم نے تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ موہوم راحت کے عشق میں اپنی دولت برباد کرتے ہیں، انھیں بتایا گیا کہ حقیقی آرام اس طرح نہیں ملا کرتا، بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ان اعمال کا اپنے آپ کو خوگیر بنائے جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں اور صبر و رحم کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دے تب کہیں جا کر اسے اطمینان کامل کی زندگی نصیب ہوگی، ورنہ اس کی جگہ دوزخ ملے گی۔

## لقد خلقنا الانسان في كبد

## طریق استشہاد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۖ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۖ وَالْأَيْدِ مَا وَلَدْتُ ۖ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝

”ہمیں اس شہر مکہ کی قسم اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو اور باپ اور اس کی اولاد کی قسم، بے شک ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے۔“

لغت میں کبد کے معنی مشقت اور شدت کے آتے ہیں، دودھ جب گاڑھا ہو جائے تو کہتے ہیں تکبد اللبن، جگر کو کبد اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ خون ہی ہے غلیظ ہو کر سخت ہو گیا ہے۔

دنیا میں انسان کو ایک لمحہ بھی راحت نہیں، ہر وقت وہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے، یہ دنیا تو دارالعمل ہے، اس لیے کوئی شخص بے کار نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے آرام نہیں مل سکتا۔

## رسول اللہ ﷺ

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جو اوپر ذکر کی گئی، لیکن اگر تم یہ کہو کہ اس عالم میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہونا چاہئے جو حقیقی راحت اور آرام کو پالے، تو ہماری رائے میں اگر کسی ہستی کو یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے تو وہ صرف رسول اللہ کی ذات اقدس ہے کہ دنیائے آج تک ایسا پاک باز انسان ایک بھی پیدا نہیں کیا۔

مگر تم اس قدسی صفت انسان کے وہ حالات پڑھو جو اسے کئی زندگی میں پیش آئے تو تم خود پکارا ٹھوگے کہ بے شک انسان مصیبت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، آپ توحید خالص کا زندگی بخش پیام لے کر آتے ہیں، ہر کوچہ و بازار میں اس صدائے حق کو بلند کرتے ہیں، سب لوگ آپ کو صادق اور امین کہتے ہیں، مگر پھر بھی آپ کے دشمن اور خون کے پیاسے ہیں، یہاں تک کہ آپ ان مظالم سے تنگ آکر ہجرت اختیار کرتے ہیں، کیا آپ کی کئی زندگی کے درس و مطالعہ کے بعد کوئی شخص یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ میں حقیقی راحت کا استحقاق رکھتا ہوں۔

## فرزند آدم

اس کو بھی جانے دو کہ یہ ایک اعلیٰ ترین مثال تھی، تم ایک معمولی انسان کو لو، باپ اور بیٹے کو دیکھو دونوں رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں، باپ کو اپنی اولاد کی حفظ و نگہداشت، تعلیم و تربیت اور کسب معاش کی حیرانی ہے، بچہ ہے کہ بے دست و پا عاجز و درماندہ، ہر بات میں دوسروں کا محتاج و دست نگر، اپنی حفاظت سے عاری اور ماں باپ کے لیے بار دوش۔ یہ دونوں مثالیں تمہارے سامنے ہیں، کیا ان کے بعد بھی کسی اور دلیل کی ضرورت ہے؟ یہ حالات خود اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ ہم نے ہر انسان کو تکلیف و مصیبت ہی میں پیدا کیا ہے۔

## غلط مصرف

أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يُقَدَّرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۝ أَيْحَسِبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۝ أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝

”کیا وہ خیال رکھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پائے گا؟ کہتا ہے کہ میں نے بہت سامان برباد کر دیا، کیا اسے یہ گمان ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں؟ بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، یہ چیزیں بھی دیں اور اس کو خیر و شر کے دونوں راستے بھی دکھا دیے۔“

لبد جمع ہے لبدۃ کی، اس کے لغوی معنی ایک کو دوسرے پر رکھنے کے ہیں، مگر اب اس سے مراد مال کثیر ہے۔ نجد اونچے مقام کو کہتے ہیں، ملک نجد کو اسی لے نجد کہتے ہیں کہ وہ تہامہ کے مقابلہ میں بلند جگہ پر واقع ہے، ان آیات میں نجدین سے مراد خیر و شر کے دونوں راستے ہیں، جیسا کہ سورہ دہر میں آتا ہے: إِنْآ هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا

(الذہر ۱۳) ”ہم نے اسے راستہ بھی دکھادیا، اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکر۔“

ایک شخص روز ولادت سے وفات تک تکلیف میں مبتلا ہے، مگر اس کے جہل و نادانی کی یہ حالت ہے کہ فریب دہ آرام اور باطل راحت کے حصول میں اپنی قوت و طاقت صرف کر دیتا ہے، کیا وہ اس خیال میں ہے کہ جس فاطر السموت والارض نے یہ قانون بنایا ہے وہ اسے یوں ہی آزاد چھوڑ دے گا۔

وہ دولت جمع کرتا ہے، تمام عمر اس کے کسب و حصول میں صرف کر دیتا ہے، پھر اس کو بیجا مواقع خرچ کرتا ہے، ناچ اور نگ کی صحبتیں منعقد ہوتی ہیں، اسلامی حکومتوں کے برباد کرنے سرکاری خطابات حاصل کرنے اور درباروں میں کرسی نشینی کے عشق میں وہ غیر مسلم حکومتوں کو چندے دیتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اب اس تک و دو کے بعد خطاب یافتہ ہو جانے اور حاکم اعلیٰ کی صحبت و ہم نشینی پر مجھے حقیقی راحت مل جائے گی۔ پھر اس تمام بد اخلاقی اور فسق و فجور کی زندگی کے بعد بھی اسے یاس و حرمان اور ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہوتا، تو پکار اٹھتا ہے کہ میں نے تو اپنی تمام دولت یوں ہی برباد کر دی اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

بھلا کیا ایک غیر مرئی ہستی اس کی ان تمام حرکات کو نہیں دیکھ رہی تھی، وہ کس طرح اس بد اخلاق کو نتائج صالحہ سے شرف اندوز کر سکتی تھی، جب کہ اس کا ہر قدم جو اٹھتا تھا تو اس میں فرزند ان اسلام ہی کی تباہی و بربادی مضمر ہوتی تھی، اگر وہ اپنی جہالت و لاعلمی کا عذر کرے تو یہ مسموع نہیں، اس لیے کہ قانون سے ناواقفیت کسی عقل مند کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں، آخر آنکھیں کس لیے تھیں، اگر اندھا تھا تو خدا نے زبان اور دو ہونٹ نوازش کیسے تھے کسی سے پوچھ لیتا، پھر نیکی اور بدی کی راہیں اس کے سامنے کشادہ تھیں، رشد و ضلالت میں تمیز کر دی گئی تھی، سعادت و شقاوت میں کسی قسم کا اشتباہ و التباس نہ رہا تھا، دونوں میں حد فاصل قائم تھی، تم نے جو راہ اختیار کی وہ اپنی پسند و اختیار سے کی، اب یہ عذر لنگ کیسا۔

اصلی راہ

اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کون سی راہ ہے جس پر چل کر ایک انسان حقیقی راحت کے کسب و حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُلْ رَغِيْبًا ۝ اَوْ اطْعَامًا ۝ يَوْمَ ذِي مَسْعِيَّةٍ ۝ يَتَجَدَّأْ مَقْرَبًا ۝ اَوْ مَسْكِيْنَا ۝ اَوْ مَسْكِيْنَا ۝

”مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گذرا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے، کسی کی گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھانا یا تیم رشتہ دار کو یا فقیر خا سار کو۔“

اقتحام، کسی سخت کام میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ عقبہ، پہاڑ کی گھاٹی۔ فک کے معنی دور کرنا اور رقبہ، گردن، یہاں غلام آزاد کرنا مراد ہے۔ مسعبہ مصدر ہے سب سے لیا گیا، اس کے معنی بھوک کے ہیں۔ مقربہ کے معنی قربت فی

النسب کے ہیں۔ متنبہ مصدر ہے قرب یترب سے، غربت وافلاس کے معنی میں، اس قدر حقیر ہو جانا کہ مٹی کے ساتھ مل جائے۔

### فك رقبة

وہ دشوار گزار راہ جس کے طے کر لینے کے بعد راحت ہی راحت ہے، یہ ہے:  
(الف)۔ جن ممالک میں غلاموں کی تجارت ہوتی ہے وہاں غلاموں کو آزاد کرنا۔

(ب)۔ جو لوگ قرض لے کر بنیوں اور ساہوکاروں کے سود و سود میں پھنس کر غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، جو اسلامی ممالک یورپین مہاجنوں اور بینکروں کے پنجہٴ ظلم میں اس قدر جکڑ بند ہو گئے ہیں کہ ان پر یورپین حکومتوں کو اقتدار و تسلط حاصل ہو گیا ہے، انھیں ان دجالہ و شیاطین کے قہر و استبداد سے بچانا، ان کے مکرو فریب کو واضح کرنا اور ان کے قرضوں سے انھیں نجات دلانا۔

(ج)۔ جو غیر مسلم اقوام اپنی آزادی کو سلب کر چکی ہیں اور غیروں نے ان کو اپنا غلام و محکوم بنا لیا ہے، کامل آزادی اور استقلال تام کے حصول میں ان کی مدد کرنا، انھیں تعلیم دینا اور ان کی راہ آزادی میں جس قدر کاوٹیں ہوں ان کو دور کرنا۔

### مساکین ویتائے

غربت وافلاس اور گرانی اجناس کے ایام میں اپنے رشتہ دار یتائی کی امداد و اعانت، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی حفظ و نگہداشت الزم اللوازم ہے۔ اگر ان کی نگرانی نہ کی گئی تو تعلیم نایافتہ افراد کی کثرت ہوگی اور وہ قوم کے لئے بار دوش ہونے کے علاوہ خود اس کی راہ ترقی میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

پھر تمہاری جیب اپنے ہی عزیزوں کے لیے مخصوص نہ، بلکہ تمہارے جو دو عطا کو عام ہونا چاہئے، جو مسکین بھی مل جائے اس کی امداد کرو، اسے کھانا کھلاؤ کہ نوع انسانی کی ہمدردی ایک مسلم کا فرض اولین ہے۔

### اصحاب الیمنۃ

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا تَوَاصَوْا بِالْعَدْرِ تَوَاصَوْا بِالْبَرْحَةِ ۝ اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ الْيَمِينَةِ ۝

”پھر ان لوگوں میں بھی داخل ہو جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت اور لوگوں پر شفقت کی وصیت کرتے رہے، یہی لوگ

صاحب سعادت ہیں۔“

مگر ان اعمال صالحہ کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دل ایمان باللہ سے خالی نہ ہو، راہ حق و اعلائے کلمۃ اللہ میں نہ صرف

ہر قسم کی تکلیف و مصیبت خود ہی برداشت کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اس جذبہ حقہ کی تلقین کرے اور آپس میں رحم و محبت، الفت و یگانگت اور شفقت و رحمت کی وصیت کرے کہ اسی سے قوم کے اجزائے مختلفہ باہم و گروہ پرپوست رہتے ہیں اور حیات قومی باقی رہتی ہے۔

صرف یہ لوگ ہیں جن کو اصحابِ یمن و برکت کہا جاسکتا ہے، یہی دنیا میں کامیاب ہوں گے اور انہی کو مرنے کے بعد حقیقی راحت نصیب ہوگی۔ اصحابِ الیمین یعنی دائیں طرف کے لوگ، لسانِ الہی ان اہلِ یمن کو سعید و خوش بخت کا لقب دیتی ہے۔

### بد بخت

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿٥٠﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ ﴿٥١﴾

”اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بد بخت ہیں، یہ لوگ آگ میں بند کر دیے جائیں گے۔“  
مگر جو لوگ ان صاف و صریح احکام کی نافرمانی کریں گے، آیاتِ الہیہ کا انکار ان کا شیوہ بن جائے گا تو وہی بد بخت و نامراد ہوں گے، دوزخ کے سوا اور کوئی جگہ ان کے رہنے کی نہ ہوگی اور انہیں دائمی راحت سے محروم کر دیا جائے گا۔



## الشمس

(آیات، ۱۵)

### تلخیص مضامین

ابتدائی دس آیات میں مناظر قدرت سے اور آخری پانچ آیتوں میں ایک مشہور تاریخی واقعہ سے استدلال کر کے بتایا کہ کامیاب صرف وہ لوگ ہیں جو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کے خوگیر ہوں اور فاسق و فاجر کے لیے ناکامی و خسران کے سوا اور کچھ نہیں۔

## کامرانی و خسران

### مناظر قدرت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝ وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَهَّاهَا ۝ وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّاهَا ۝ وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَاهَا ۝ وَالسَّجَّادُ وَمَا بَنَاهَا ۝ وَالْأَرْضُ وَمَا طَحَاهَا ۝

”سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے اور دن کی جب اسے چکا دے اور رات کی جب اسے چھپائے اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا اور زمین کی اور اس کی جس نے اسے پھیلا یا۔“

قرآن کریم کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دعاوی کے ثبوت میں مناظر فطرت سے استدلال کرتا ہے۔ ایک جگہ آیہ: وَمِنْ بَيْنِهِ الْبَيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (فصلت ۳) ”رات اور دن، سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں“، آل عمران میں فرمایا: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (ال عمران ۳) ”بیشک آسمان و زمین کی پیدائش اور اختلاف لیل و نہار میں عقل والوں کے لیے صد ہا عبرتیں اور بصیرتیں ہیں“، یہی چاند اور سورج ہیں جن سے ہم کوئی سبق نہیں لیتے، مگر یہی چیزیں تھیں جن سے ابراہیم کو توحید خالص کی راہ ملی۔

ان آیات میں بھی سورج اور چاند، دن اور رات، آسمان اور زمین کو اس حقیقت ثابتہ کے لیے دلیل میں پیش کیا ہے کہ کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس کی راہ اختیار کریں گے اور ناکامی و خسران ان کے لیے ہے جو اس سے گریز کریں۔



## طریق استدلال

اس کائنات ارضی و سماوی کی زندگی کا انحصار اسی سورج اور چاند پر ہے۔ نہ صرف نباتات اور حیوانات، بلکہ حیات انسانی کا دار و مدار بھی اسی شمس و قمر پر ہے۔ اشجار کی تروتازگی، شگوفوں کا کھلنا، کھیتوں کا لہلہانا اور ابن آدم کا ایاب و ذہاب ان ہی کی حرارت و برودت کے ثمرات و نتائج ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک چیز بھی زندہ نہ رہ سکے۔

یہی حال انسانوں کی حیات روحانی کا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت و رہ نمائی اور فلاح و کامرانی کے لیے انبیاء و رسل مبعوث کرتا ہے، پھر ان کے حواریین و اصحاب ہیں، جو لوگ ان کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں اور ان کے مواعظ حسنہ کو آویزہ گوش بناتے ہیں وہ ابرار و متقین کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور انحراف و اجتناب کی صورت میں ان کے قلوب و اذہان رات کی طرح تاریک ہو جاتے ہیں جن میں ظلمت و اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، فانہا لا تعی الا بصار ولکن تعی القلوب التقی الصدور۔

## نفس انسانی

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۖ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۱

”اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا، پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔“  
قرآن نے اکثر مقامات میں خود نفس انسانی کو بھی بطور شہادت کے پیش کیا ہے۔ سورہ ذاریات میں آتا ہے: وَفِي الْأَرْضِ لِبَنَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۖ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (الذاریات ۲۱۲۲۰) ”اور یقین رکھنے والوں کے لیے اسی زمین میں نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہارے نفس کے اندر بھی، کیا تم نہیں دیکھتے،“ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہے: سَنُنَبِّئُكُم بِالْأَخْفَىٰ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَقٌّ لِّیَبْتَلِيَنَّهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (فصلت ۴۴) ”ہم ان کو عنقریب عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیائے کرام کی معرفت نیکی اور بدی کی راہ واضح کر دی ہے اسی طرح اس نے خود نفس انسانی میں ایک ذوق صحیح پیدا کر دیا ہے جس سے وہ نیکی اور بدی خیر اور شر اور اصلاح و فساد میں فرق و امتیاز کر سکتا ہے، جب رسول اللہ ﷺ سے گناہ کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: الاثم ملاحا فی نفسک، ”گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے،“ یہ ذوق شہادت ایک فطری چیز ہے، آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اسی کا نام نور ایمان ہے اور یہی خیر و شر میں حد فاصل قائم کر سکتا ہے۔

پس جب نفس انسانی خود اس بات پر شاہد ہے کہ انسانی اعمال ضائع نہیں جاتے، بلکہ ان کے نتائج ضرور نکلتے ہیں، ان خیدا فخیروان شرافشا، ”اگر اچھے کام کیے ہیں تو نتائج عمدہ نکلیں گے اور اگر گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو دوزخ ہے،“ اس لیے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ راہ سعادت و کامرانی اختیار کرے۔

## جواب قسم

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ رَزَقَهَا ① وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ②

”کہ جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارہ میں رہا۔“  
دسہا کی اصلی دس سے ہے اور یہ تدسیس سے ہے جس کے معنی ایک چیز کو دوسری میں چھپانے کے ہیں، یعنی وہ شخص جو عمل صالح میں شہرت حاصل نہ کرے۔

یہی آیات جواب قسم ہیں اور یہی اس سورہ کا موضوع ہیں۔ چنانچہ ان مناظر قدرت اور نفس انسانی کی شہادت سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ کامیابی صرف اسی شخص کو نصیب ہوگی جو قانون الہی کا اتباع کرے اور انبیائے کرام کی تعلیم حقہ سے منحرف کبھی فائز المرام نہیں ہو سکتا۔

## تاریخی شہادت

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوِيهَا ① إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا ② فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ③ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ④ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَحَسَّوْهَا ⑤

”قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر کو جھٹلایا جب ان میں سے ایک نہایت بد بخت اٹھا تو خدا کے پیغمبر صالح نے ان سے کہا کہ خدا کی اونٹنی اور اس کے پاس پینے کی باری سے حذر کرو، مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو ہلاک کر کے برابر کر دیا۔“

اس دعویٰ کے ثبوت میں اب ایک تاریخی واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اللہ نے قوم ثمود کی اصلاح کے لئے پیغمبر صالح کو بھیجا، جب ان لوگوں نے ان سے تصدیق کے طور پر دلیل طلب کی تو قدوس حق نواز نے انہیں ایک اونٹنی نوازش کی اور اس کے متعلق چند قیود لگادیں۔ سورہ ہود میں آتا ہے: وَيَقُومُ لَهُنَّ نَاقَةٌ ۖ لَكُمْ آيَةٌ ۚ فَذُرَّوهَا تَأْكُلْ فِي أََرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ (ہود ۶۴) ”اور یہ بھی کہا کہ بھائیو یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی یعنی معجزہ ہے تو اس کو چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے اور اس کو کسی طرح کی تکلیف نہ دینا، ورنہ تمہیں جلد عذاب آپکڑے گا“  
سورہ شعراء میں فرمایا: لَهُنَّ نَاقَةٌ ۖ لَهَا شَرَبٌ ۖ وَلَكُمْ شَرَبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ ۝ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ يَوْمَ عَظِيمٍ (الشعراء ۱۵۵-۱۵۶) ”دیکھو یہ اونٹنی ہے، ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا، نہیں تو تم کو سخت عذاب آپکڑے گا۔“

مگر قوم ثمود نے پیغمبر کے انداز و ترہیب کی کوئی پروا نہ کی، اس کے بد بخت ترین انسان نے نہ صرف اس رسول کی تکذیب کی اور اونٹنی کو مار ڈالا، بلکہ خود اس عبد صالح کو بھی مار ڈالنے کی خفیہ سازش کی: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ (النمل ۲۸-۲۹) ”اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے،

کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے، پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔“

یہ لوگ رسول کی نافرمانی کرتے تھے، بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے، انہوں نے اس کی اونٹنی کو مار ڈالا اور خود اس کے مارنے کی فکر میں تھے، مگر قوم خاموش تھی اور ٹس سے مس نہ ہوتی تھی، اس لیے نہ صرف مجرم ہی ہلاک ہوئے، بلکہ ساری کی ساری قوم برباد ہو گئی۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ جزائے اعمال یقینی ہیں اور رسول کی نافرمانی کے بعد کامیابی ناممکن ہے۔

## قرآن کا منصب اصلی

وَلَا يَخَافُ عَقِبَهُآ ۝

”اور اس کو اس کے انجام کا کچھ بھی ڈر نہیں۔“

جب ایک قوم مجسمہ شیطنت و ملعونیت بن جاتی ہے اور اس کا وجود عالم انسانیت کے لئے معصیت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کر دیتا ہے کہ یہی اس کی حکمت و تدبیر اور مصلحت عمومی کا اقتضا ہے اور پھر اس کی ہلاکت و بربادی پر اسے کسی قسم کا افسوس نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کا ایک اعلیٰ ترین وصف یہ ہے کہ وہ تمام کتب سابقہ کی حفظ و صیانت کرتا اور ان کی غلطیوں کو واضح کرتا ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ (المائدہ ۴۸)﴾ ”اور اے پیغمبر ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان سب پر شامل ہے“ دوسری جگہ فرمایا: إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَكْفِيْكَ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِنَّكَ أَنتَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (النمل ۷۶) ”بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر باتیں جن سے وہ اختلاف کرتے ہیں بیان کر دیتا ہے۔“

بنی اسرائیل نے اپنی کتابوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی ہیں جو بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں۔ مثلاً خدا کی نسبت آتا ہے: ”اور خدا نے ساتویں دن اپنے کام کو جو کرتا تھا پورا کیا اور ساتویں دن اپنے سارے کام سے جو کرتا تھا فراغت پائی“۔ (پیدائش ۲:۲) طوفان نوح کے متعلق آتا ہے کہ: ”جب طوفان ٹھم گیا اور نوح علیہ السلام نے مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں تو خدا نے کہا: انسان کے لیے میں زمین میں پھر کبھی لعنت نہ کروں گا اس لیے کہ انسان کی دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور جیسا کہ میں نے کیا ہے پھر سارے جانداروں کو نہ ماروں گا“۔ (پیدائش ۸:۱۲)

ان کے پہلے انفر اعلیٰ اللہ کا جواب قرآن نے یوں دیا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۚ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوبٍ (ق ۳۸) ”اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوقات ان میں ہیں سب کو چھ دن میں بنادیا اور ہم کو ذرا بھی تھکان نہیں ہوا“۔ دوسرے بہتان عظیم کا جواب ولا یخاف عقبہا سے دیا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت و رحمت کی بنا پر کرتا ہے، ایک قوم کی بربادی اور دوسری کا استخلاف فی الارض اسی قانون حکمت کے مطابق ہے اور اس میں حرص و طمع یا خوف و حذر کو مطلق دخل نہیں۔

## الدلیل

(آیات ۲۱)

### تلخیص مضامین

اس سورۃ کا موضوع ان سعیمک لشتی ہے، اس پر رات اور دن اور مرد و عورت سے استدلال کر کے بتایا کہ اس اختلاف اعمال میں کامیابی صرف اسی کو نصیب ہوتی ہے جو تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے اور جو لوگ تعلیم الہی کا انکار کرتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام و نامر اور ہتے ہیں اور ان کی دولت بھی ان کے لیے بیکار ثابت ہوتی ہے۔ آیت ۲۰ سے اس مضمون پر روشنی ڈالی کہ انسان کے اعمال اور ان کے نتائج سے اللہ خوب واقف ہے، پھر کون ہے جو اس کے احتساب سے بچ سکے اور اس مسؤولیت میں شقی اور بد بخت کے لئے آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، البتہ کامیاب صرف اہل تقویٰ ہی ہوں گے۔

## ان سعیمک لشتی

### اختلاف اعمال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ اللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰوُ ۝ وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۝ وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرُ وَ الْاُنْثٰی ۝ اِنَّ سَعِیْکُمْ لَشَتٰی ۝

”رات کی قسم جب دن کو چھپائے اور دن کی قسم جب چمک اٹھے اور اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ پیدا کیے، کہ تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔“

تجلی کے معنی ظہور و انکشاف کے ہیں۔ شقی جمع ہے شتیت کی، جس طرح مریض کی جمع مرضی آتی ہے، بعد و افتراق کو کہتے ہیں۔

رات کی تاریکی جب تمام عالم پر چھا جاتی ہے تو بعض لوگ تو ذکر الہی میں مصروف ہو جاتے ہیں: وباللیل ہم یستغفرون، کچھ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور چوروں کی جماعت نقب زنی کے مشورے کرتی ہے۔ پھر یہی کیفیت دن کی ہے، ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ اب تم خود انسانی خلقت کو دیکھو تو اس میں بھی مرد و عورت کے دو ممتاز گروہ نظر آئیں گے جو اپنے اپنے مآلوفات و مطلوبات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں، پھر ہر ایک کا

دارہ عمل جداگانہ، ایک کے جسم کی ساخت ایسی ہے کہ وہ مہالک و شدائد کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے اور دوسرے کا وظیفہ حیات منزلی کی حفظ و نگہداشت ہے۔

ان تمام شواہد و بینات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ انسانوں کی سعی و کوشش طرح طرح کی ہے اور ان کے اعمال میں اختلاف ہے۔

کامیاب لوگ

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَّاهُ إِلَىٰ سُبْحَىٰ ۖ

”تو جس نے خدا کے رستے میں مال دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا، اس کو ہم آسان طریقہ کی توفیق دیں گے۔“  
اللہ نے انسان کو دو قوتیں نوازش کی ہیں، ان ہی کی تکمیل پر اس کی فوز و کامرانی کا دار و مدار ہے (۱) قوت عملیہ (۲) قوت نظریہ۔ پہلی قوت کی اصلاح و تہذیب کے لیے فرمایا کہ جس شخص نے خدا کی رضامندی حاصل کرنے اور افراد ملت کی نصرت و اعانت میں اپنی دولت صرف کر دی اور ہمیشہ اعمال صالحہ کرتا رہا، اپنے پروردگار کی نافرمانی نہ کی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی قوت نظریہ کو بھی فراموش نہ کیا، بلکہ ہر نیکی کی تصدیق کی، انبیاء و رسل کی تعلیمات کی تکذیب نہ کی اور عقائد حسنہ کا پابند رہا تو ہم اس کے لیے ہر نیکی میں آسانی پیدا کر دیں گے۔

بخط مستقیم مخالف

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَّاهُ إِلَىٰ عُسْرَىٰ ۖ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۖ

”اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو چھوٹ سمجھا، اسے بد نصبتی میں پہنچائیں گے اور جب وہ دوزخ کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔“  
تردئی باب تفضل کے وزن پر ہے اور تردی من الجبل سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ سے نیچے گرنے کے ہیں، اسی سے والحدیۃ قرآن میں ہے۔

ان آیات میں اس شخص کے خصائص و امتیازات بیان کیے گئے ہیں جو عقائد و اعمال کے اعتبار سے پہلے کا بخط مستقیم مخالف مخالف ہے۔ وہ سخی تھا تو بہ بخیل، وہ متقی تھا اور یہ اپنے آپ کو تعلیمات الہیہ سے بالکل بے نیاز خیال کرتا اور ہر برے کام کا ارتکاب کرتا ہے، وہ ہر نیکی کی تصدیق کرتا تھا اور یہ اس کا شدید ترین مخالف ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ اور زیادہ بد کرداری میں منہمک ہو گا اور وہ راہ اس کے لئے آسان ہو جائے گی، مگر یہ یاد رکھے کہ جس مال و دولت کے غرور باطل میں وہ فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس کیلئے بیکار ہے اور دوزخ میں گرتے وقت وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔  
علم النفس کے طلباء اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ جب ایک شخص کوئی کام کرتا ہے تو اس کا اثر اس کے تمام

اعضاء وجوارح محسوس کرتے ہیں، اگرچہ اس کو پہلے روز اس کے کرنے میں دقت محسوس ہوئی تھی، مگر دوسرے روز اس کو وہی کام نسبتاً آسان معلوم ہو گا، وہ دم چرا۔ اسی حقیقت کو ان قرآنی آیات نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید میں بکثرت احادیث پیش کی جاسکتی ہیں۔ بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے کو دفن کرنے کی غرض سے یقبع غرقہ میں موجود تھے، آپ نے صحابہ سے فرمایا: ما منکم من احد الا وقد کتب مقعده من الجنة ومقعدة من النار فقالوا یا رسول الله افلاتک فقال اعلوا فکل یسرا لبا خلق له ثم قرأ فما من اعطى واتقى وصدق بالحسنى فسنیسره له لیسره لی قوله للعسری، ”تم میں سے کوئی شخص نہیں جس کے متعلق جنت اور دوزخ کا فیصلہ نہ کر دیا گیا ہو، صحابہ نے عرض کیا تو پھر ہم اسی پر اعتماد کر کے عمل کیوں نہ ترک کر دیں، آپ نے فرمایا نہیں، عمل کیے جاؤ اس لیے کہ اس کو اسی کام میں آسانی پیدا کر دی جائے گی جس کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی اور اس کی تصدیق میں آپ نے ان آیات کی تلاوت کی جو زیر عنوان ہیں۔“

اور اسی طرح دیکھا بھی جاتا ہے، نیک لوگوں کو برے اعمال کا ارتکاب مصیبت گزرتا ہے اور نیک کام خوش دلی سے کرتے ہیں اور برے لوگ بالکل اس کے برعکس ہیں۔

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۖ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۚ فَأَنْذَرْتَكُمْ نَارًا تَلْقَوْنَ ۖ لَا يَصْلُهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۖ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ

”ہمیں تو راہ دکھانا ہے اور آخرت اور دنیا ہماری ہی چیزیں ہیں، سو میں نے تم کو بھڑکتی ہوئی آگ سے متنبہ کر دیا اس میں وہی داخل ہو جو بڑا بد بخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔“

تلقى، شعلہ مارنا اور بھڑک اٹھنا، دوزخ کا ایک نام لظی بھی ہے کیونکہ اس کی آگ ہمیشہ بھڑکتی اور شعلہ مارتی رہتی ہے۔

ہمارا کام صرف اتنا تھا کہ ہر انسان کو نیکی اور بدی کی راہ دکھادیں، چنانچہ سب سے اول ہم نے خود اس کے اندر ایک ایسی قوت رکھ دی جو نیک و بد میں تمیز کرے: هَبْلِ الْإِنْسَانِ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۖ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۖ (القیامہ ۱۴-۱۵) بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے، اگرچہ عذر معذرت کرتا رہے۔ پھر اس قوت کی مزید تہذیب و تکمیل کے لیے ہم نے انبیاء کرام کا سلسلہ قائم کیا، انھیں کتابیں دیں، اس کے بعد بھی اگر ایک شخص گمراہ ہو جائے تو اس کی مرضی۔

ابتدا میں ہم نے مختلف فطرتیں پیدا کیں، ان کی اعانت کے لیے اسباب و وسائل فراہم کیے اور آخر کار جو معیار ترقی ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق ان کے اعمال و اخلاق کا احتساب بھی ہم ہی کریں گے کہ ہم ہی اس کی ابتدائی حالت اور انتہائی نشو و ارتقا سے واقف ہیں، اس لیے جو لوگ اس راہ ترقی سے منحرف ہونا چاہتے ہیں انھیں اس آگ سے ہر وقت خوف زدہ رہنا چاہیے جس کا ایندھن بد بخت ابنائے آدم ہوں گے اور وہ نامراد کون ہیں؟ وہی جو تعلیم الہی کا انکار کریں اور اپنے آپ کو بے نیاز خیال کر کے ان علوم حقہ سے روگردانی کریں۔

## ارباب تقویٰ

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝ وَمَا لِحَدِّثِكَ مِنْ رِعْمَةٍ تُجْزَى ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۝

”اور جو بڑا پرہیزی گارہے وہ اس سے بچا لیا جائے گا، جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو اور اس لیے نہیں دیتا کہ اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلا اتار تا ہے بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا۔“

گذشتہ آیات میں اشدقی اور اس کے عواقب المیہ بیان کیے گئے تھے، اب اتقی اور اس کے نتائج کا تذکرہ ہے۔ لسان شرع میں متقی وہ ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی دولت صرف کرتا ہے، اس لیے نہیں کہ کسی کا اس پر احسان ہے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تہذیب نفس، تزکیہ اخلاق اور رضائے الہی حاصل ہو، اللہ تعالیٰ ان صدقات کو نہ صرف قبول فرمائے گا بلکہ اس کو اس قدر نعمتیں نوازش کرے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

سورہ بقرہ میں قبول صدقات کے لیے چند شرطیں بیان کی گئی ہیں، فرمایا: الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۖ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ ۲۶۳) ”جو لوگ اپنے مال خدا کے رستے میں صرف کرتے ہیں، پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر احسان رکھتے ہیں اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس تیار ہے اور قیامت کے روز نہ ان کو کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ آگے چل کر آتا ہے: تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى (البقرہ ۲۶۴)، ”اپنے صدقات و خیرات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا۔“ اسی لیے حدیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی: لا یعلم شہالہ ما انفق یمینہ، ”جب وہ خرچ کرتا ہے تو اس طرح کہ اس کے بائیں ہاتھ تک کو یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔“

یہی صدقات و خیرات اللہ کے دربار میں شرف اجابت حاصل کرتے ہیں اور ایسے ہی خرچ کرنے والوں کو ہر قسم کی نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

## الضحیٰ

(آیات ۱۱)

## تلخیص مضامین

چند قدرتی مناظر پیش کر کے ثابت کیا کہ اللہ نے اپنے رسول کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے بلکہ عنقریب آپ پر اس قدر نعمتیں نازل کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے، پھر مزید اطمینان کے لئے فرمایا کہ آپ کی ترقی برابر جاری رہے گی اور آپ کی ہر آئندہ حالت گزشتہ سے بہتر ہو کرے گی، خدا کا یہ وعدہ جس طرح مستقبل کی لیے ہے ایسے ہی ماضی کے متعلق بھی تھا، اس پر آپ کی سابقہ زندگی کے بعض واقعات پیش کئے، اس کے بعد آپ کو وہ زمین بتائی گئی جہاں آپ کی تعلیم کا بیج بار آور ہو گا اور جس جگہ آپ قرآن سنائیں گے۔

## واما بنعمة ربك فحدث

## شان نزول

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَاقَلَىٰ ۝

”آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھاجائے کہ اے محمد تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔“

جب سورج اونچا ہو کر چمکنے لگے تو دن کے ابتدائی حصہ کو ضحیٰ کہتے ہیں۔ سحی کے معنی ڈھانپ لینے اور چھاجانے کے ہیں، ودع اصل میں تودیع سے لیا گیا ہے، جس کے معنی رخصت کرنے میں مبالغہ کرنے کے ہیں، یہاں چھوڑنا اور دست بردار ہونا مراد ہے، قلی ماخوذ ہے قلی سے، بغض رکھنا اور ناراض ہونا۔

تمام مفسرین کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی زمانہ نبوت میں نازل ہوئی تھی، روایات میں اس کے نزول کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے: اشتکی النبی ﷺ فلم یقم لیلة اولیلتین، فانت امرأة ققلت یا محمد ما اری شیطانک الا قد ترکک فانزل اللہ عزوجل والضحیٰ واللیل اذا سحی ما ودعک ربک وما قلی (بخاری) ”ناسازی



طبع کے باعث رسول اللہ دو ایک شب قیام نہ کر سکے تو ایک عورت نے آکر کہا کہ میرے خیال میں تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔“

روایات اس امر پر متفق ہیں کہ فترۃ الوحی کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور یہ کہ تاخیر الہام کی بناء پر آپ پڑمر دہ خاطر رہتے تھے، اس لیے اللہ نے یہ سورت نازل کی کہ آپ کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور وہ آپ سے ناراض بھی نہیں، بلکہ آپ کے مدارج عالیہ میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔

### دن اور رات کی شہادت

قدرت نے دن اور رات کا سلسلہ قائم کیا ہے: وجعلنا النهار معاشا، دن اس لیے ہے کہ انسان محنت کرے اور قوت بازو سے روزی کما کر نہ صرف خود کھائے بلکہ دوسروں کو بھی کھلائے، اس کے بعد رات آتی ہے: وجعل اللیل سکنا، دن بھر کام کرنے کی وجہ سے اس کی جس قدر قوتیں مضطرب ہو چکی ہیں وہ شب میں آرام کرنے کی وجہ سے عود کر آئیں اور دوسرے روز کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو۔

اسی پر تم وحی الہی کے نزول کو قیاس کرو۔ ایک الہام نازل ہوتا ہے۔ اس میں عقائد و یقینیات ہوتے ہیں، احکام و اوامر کی تعلیم ہوتی ہے، منہیات و جرائم سے روکا جاتا ہے اور ان تمام الہامات کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان پر عمل کریں اور مہذب و شائستہ بن کر ترقی کر سکیں کہ تدریجی ارتقاء ہی ہمیشہ مفید اور پائیدار ہوتا ہے۔

اگر اسی کے برخلاف سلسلہ تعلیمات تو برابر قائم رہے، مگر لوگوں کو ان پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ترقی نہ کر سکیں گے اور تمام قانون کتاب کے اور اق ہی میں بند رہے گا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ دن تو برابر رہے اور رات نہ ہو، عاقبت کار، کام کرتے کرتے قوتیں بالکل ہی مضطرب ہو جائیں گی اور تھوڑی سی مدت کے بعد یہ دنیا جنگلی جانوروں کا مسکن بن جائے گی۔

پس نزول الہام و عدم نزول بالکل دن اور رات کی طرف ہے، بیچ میں جو زمانہ گذرتا ہے اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ خدا تم سے ناراض ہے اور اس نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے، بلکہ یہ تاخیر نہایت ہی اعلیٰ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور غرض یہ ہے کہ اس فرصت کے وقت میں نازل شدہ الہام پر خوب اچھی طرح عمل ہو جائے اور مزید تعلیم قبول کرنے کی لوگوں میں قابلیت اور استعداد پیدا ہو۔

### دائمی وعدہ

وَلَا خِزْيَةَ لَخَيْوَلَّكَ مِنَ الْآلِئِ ۝ وَكَسُوفٌ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝

”اور آخرۃ تمہارے لیے پہلی حالت سے کہیں بہتر ہے اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔“

اگرچہ مفسرین نے اولیٰ سے دنیا اور آخرت سے قیامت کے بعد کے ثمرات مراد لیے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ کا دائرہ محدود کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ربط آیات اس کا مقتضی ہے۔

چند روز تک وحی رک جانے سے رسول اللہ ﷺ کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ آپ سے ناراض ہیں اور آپ کی روحانی ترقی رک گئی ہے، گذشتہ آیات میں آپ کو بتایا گیا کہ فترۃ وحی کا مقصد یہ نہیں جو آپ نے معین کیا ہے بلکہ اس کی غرض ہی بالکل دوسری ہے۔ قرآن کریم کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم سے ایک ایسی جماعت تیار ہو جو یکسر عمل ہو اور دوسروں کے لئے نمونہ بن سکے اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم تدریجاً نہ دی جائے کہ آہستہ آہستہ ان میں قوت عمل پیدا ہو اور وہ جاگیر ہو جائے، پس اگر نزول الہام میں تاخیر ہو تو آپ اس سے پریشان خاطر نہ ہوں۔

قرآن آہستہ آہستہ تینیں سال میں نازل ہوا، کبھی تو ایک ہی وقت میں مختلف سورتیں نازل ہوتیں اور کبھی دیر ہو جاتی تانکہ ضرورت کے مطابق وحی آتی، گویا اس کتاب عزیز کے نزول میں وقت اور ضرورت کا لحاظ کیا گیا، ممکن تھا کہ پھر کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تو آپ اس کو پھر ناراضگی پر حمل کرتے، اس لیے ان آیات میں ہمیشہ کے لئے آپ کو یہ بتادیا گیا کہ آپ اس دیر سے گھبرانہ جایا کریں بلکہ آپ کی ہر آئندہ حالت گذشتہ سے بہتر ہو کرے گی اور آپ کی ترقی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ رکے گی۔

ہم نے اولیٰ سے آپ کی پہلی حالت اور آخرت سے آئندہ کے حالات مراد لیے ہیں اور سیاق و سباق کا اقتضا بھی یہی ہے، دوسری آیت بھی اسی پہلے وعدہ کی مزید تصدیق و توثیق ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

### ماضی کی تذکار

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۖ

”بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی، بیشک دی اور رستہ سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔“

ان آیات میں بتایا جاتا ہے کہ وللاخرة خيالك من الاولیٰ کا وعدہ اگرچہ ہم نے تم سے اب کیا ہے لیکن اگر تم اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ بد و طفولیت سے آج تک ہمارا طرز عمل تمہارے ساتھ یہی رہا ہے مثلاً:

(الف)۔ آپ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، چھ برس کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئی، آپ کے دادا عبد المطلب آپ کی پرورش کرتے رہے اور ان کے مرنے پر آپ کے چچا ابوطالب آپ کے متکفل ہوئے اور ہمیشہ آپ کی حمایت کرتے رہے۔

(ب)۔ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی عرب کو بد اخلاقی اور خانہ جنگی میں مبتلا پایا، آپ ان کی اصلاح کے خواہاں تھے اور مختلف

تدابیر کام میں لاتے تھے، آپ نے حلف الفضول میں شرکت کی مگر باوجود ان باتوں کے وہ حقیقی راہ آپ کے سامنے ابھی نہ آئی تھی جو نہ صرف عرب کو ان نقائص و ذمائم سے پاک و صاف کر دیتی، بلکہ تمام عالم کو ہر قسم کے مصائب و آلام سے نجات دے دیتی: وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (الشوریٰ ۵۲) اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعہ سے قرآن بھیجا ہے، تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو، لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بیشک اے محمد تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔“

آپ اس قانون کی تلاش میں تھے جو منبع ہدایت و سعادت ہو، مگر آپ کو معلوم نہ تھا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کے بعد قرآن نازل کر کے آپ کو حقیقی راہ بتادی۔

(ج)۔ عائِل، فقیر کو کہتے ہیں، جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کو ایک اونٹنی اور ایک لونڈی کے وراثت میں اور کچھ نہ ملا تھا، مگر آپ کی تجارت نہایت کامیاب رہی اور ادھر خدیجہ الکبریٰ نے اپنی تمام دولت آپ کی نذر کر دی۔ غرض وہ خدا جس نے ان تمام حالات میں تمہاری دست گیری کی، اب بھی تمہارے ساتھ ہے اور تمہیں وعدہ دیتا ہے کہ تمہاری ہر آئندہ حالت گزشتہ سے بہتر ہو کرے گی: وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا۔

ارحموا من فی الارض

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۖ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۖ

”تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔“

رسول اللہ ﷺ یتیمی کی تکلیف و مصیبت دیکھ چکے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ یتیم کا نہ تو کوئی نگران کار و مربی ہوتا ہے اور نہ اس کی تعلیم و تہذیب کا ذمہ دار و کفیل، اس کی کیفیت اس پتے کی سی ہوتی ہے جو جنگل میں ہے، ہوا کے جھونکے آتے ہیں جو کبھی اس کو شمال کی طرف لے جاتے ہیں اور گاہے جنوب کی طرف، اس حالت میں یتیم کی امداد و سرپرستی نہ صرف عام ہمدردی انسانی کا تقاضا ہو گا بلکہ قومی زندگی کے بقا و قیام کے لیے اس کی اعانت و دست گیری ضروری و لازمی ہوگی۔ آپ کی تھوڑی سی مدد اس کو آپ کا بے دامن غلام بنادے گی، جس جگہ آپ کا پسینہ گرے گا وہ اپنا خون بہانے کو تیار ہو گا، وہ آپ کا دست و بازو بن جائے گا اور آپ کے مقصد حیات کا بہترین معاون و مددگار، ادھر آپ کی تعلیم و تربیت کی بدولت وہ مہذب و شائستہ بن جائے گا اور جس قوم کے تمام افراد تعلیم یافتہ ہوں اس کے نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لیکن اگر آپ نے اس کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ غیر مہذب بن کر قوم کے لیے بارود شن ثابت ہو گا، اپنی بد اخلاقی و بد کرداری سے تمام ملت کو نقصان پہنچائے گا یا غیر مذہب کے مبلغین و دعاۃ اپنے اثر سے کام لے

کر اسکو اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔ چنانچہ ہم روزمرہ ان الم ناک حوادث کا تذکرہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ان مصالح کی بنا پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ یتامیٰ پر ظلم و ستم نہ کریں اور ان کی ہر ممکن طریق سے امداد کریں۔ آپ نے فرمایا: انا و کافل الیتیم کھاتین، ”میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح باہم دگر ہوں گے جیسے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں۔“

اسی کے ساتھ ساتھ سائل کو بھی مت جھڑکو، اس لفظ کو بھیک مانگنے والے ہی میں حصر کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جس طرح ایک شریف مفلس و نادار پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے، ویسے ہی وہ شخص بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو آپ سے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کرنے کا آرزو مند ہو، تم بخل مت کرو اور اس کو تعلیم دو۔

## تبلیغ قرآن

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

”اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔“

اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں آپ کو نوازش کی ہیں ان کا ذکر لوگوں کے سامنے کیجئے، ظاہر ہے کہ کوئی نعمت نہ تھی جو آپ کو نہ دی گئی ہو، مگر اعلیٰ و افضل ترین نعمت یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو قرآن دیا: ووجدك ضالاً فهدى، جس میں تمام نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور فلاح و کامرانی کے اصول و ضوابط ہیں، جو دنیا و آخرت کی سعادت و فوز کبیر کا ذمہ دار و کفیل ہے پس اس آیت میں ہمارے نزدیک نعمت سے مراد قرآن کریم کی دعوت و تبلیغ کا حکم ہے۔

دوسرے لوگوں نے نعمت کی تفسیر میں کئی ایک چیزیں بیان کی ہیں اور بے شبہ وہ سب ٹھیک اور درست ہیں، مگر ہم قرآن ہی کو بہتر خیال کرتے ہیں، یہی تبيين الكل شيء ہے، شفاعة لسان الصدور ہے، اسی کی شان میں لا ريب فيه ہے، اسی کی تبلیغ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ تھی اور اسی کی جب تکمیل ہو گئی تو آپ اس دار فانی سے ملاء اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے۔

## الانشراح

(آیات: ۸)

### تلخیص مضامین

ابتدائی چار آیتوں میں ان رکاوٹوں کو بیان کیا جو داعیِ حق کی راہ میں آتی ہیں، پھر بتایا کہ دنیا میں تکلیف و راحت تو آم ہیں اور آخر میں فرمایا کہ جب تم اپنے فرائض رسالت و دعوت الی الحق والحریۃ سے فارغ ہو کر و تواتابت الی اللہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور ان فرصت کے اوقات میں تبتل الی اللہ اختیار کرو۔

## رفع موانع

### شرح صدر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

”اے محمد! کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا، بے شک کھول دیا اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی اور تمہارا ذکر بلند کیا۔“

دنیا میں زندہ رہنے کا حق صرف اسی جماعت کو حاصل ہے جو اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو، مگر یہ عظیم و جلیل فرض وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس یقین و اذعان کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھے کہ ایسا کرنا میرا تقاضائے فطرت ہے اور یہی میری زندگی کا اصلی مقصد ہے، گویا اس کی فطرت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس آواز کو دنیا کے ہر گوشہ اور کونہ میں پہنچا دے، جب اس کی یہ حالت ہوگی تو کوئی بڑی سے بڑی رکاوٹ اور مزاحمت اس کو راہِ حق سے منحرف نہ کر سکے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آگ میں کود پڑے تو یہی داعیہ فطرت تھا جس نے ان کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ جل جائیں مگر توحید کو ہاتھ سے جانے نہ دیں، لوط علیہ السلام کو اسی لیے ہجرت کرنی پڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی ہر خواہش کو جو رد کر دیا تو اسی لیے کہ توحید کے سوا ان کی فطرت اور کسی چیز کو قبول ہی نہ کر سکتی تھی، شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم کہتی ہے کہ

تم بت پرستی کرو تو وہ اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں نَعْدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنَّ عُنْدَنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهَ مِنْهَا (الاعراف ۸۹) اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹ و افتراء باندھا، جادو گر جب رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آتے ہیں تو فرعون کی دھمکیاں ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کر سکتیں۔

یہی شرح صدر ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور جب تک کسی کام کے متعلق یہ کیفیت کسی شخص میں نہ پیدا ہو وہ عزم راسخ، بلند ہمت اور استقلال و ثبات قدم سے کبھی بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا، فرض کے ادا کرنے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل مخصوص سے رسول اللہ ﷺ کی راہ سے اس کو دور کر دیا۔

بوجھ کا ہلکا ہونا

وزن، بوجھ کو کہتے ہیں، انقراض دراصل اس آواز کو کہتے ہیں جو بوجھ اٹھاتے وقت جانور کی پیٹھ سے نکلتی ہے، یہاں اس سے کمر توڑنا مراد ہے۔

دوسری رکاوٹ جو مبلغ حق اور داعی حریت کی راہ میں آتی ہے وہ اس کو اعوان و انصار کا نہ ملنا ہے۔ اکثر تحریکات جو فنا ہو جاتی ہیں تو صرف اسی لیے کہ ان کے بانیوں کو رفقاء کار نہیں ملتے، جو ان کے نصب العین کو اپنا مقصد حیات بنا کر اس کی نشر و اشاعت میں سربکف کوشش کرتے۔

رسول اللہ ﷺ دنیا میں آئے تو آپ اکیلے تھے، سر زمین عرب کے لیے آپ کی صدائے توحید ایک انوکھی اور غیر مانوس آواز تھی، آپ لوگوں کے پاس جاتے تھے، قبائل پر اپنے آپ کو پیش کرتے تھے، مگر ہر طرف سے انکار ہی انکار تھا اور آپ ہر وقت حزن و ملول رہتے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس رکاوٹ کو دور کر دیا اور آپ کو بہترین اصحاب نوازش فرمائے جنہوں نے اپنی تمام زندگیاں اور جائیدادیں آپ کی محبت اور آپ کے مقصد کی اشاعت میں قربان کر دیں۔

رفع ذکر

تیسری رکاوٹ یہ ہے کہ اگرچہ آپ کے مقاصد نہایت ہی شاندار اور بلند پایہ ہوں، لیکن اگر آپ کے نام سے لوگ واقف نہ ہوں اور آپ نے اپنا لوائے شہرت بلند نہیں کیا تو لوگوں کی حالت یہ ہے کہ آپ کی آواز پر کان تک نہ دھریں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ رکاوٹ بھی خدا نے دور کر دی، خود آپ کی زندگی ہی میں عرب کا ہر شخص آپ کے حالات سے واقف تھا، یہ شہرت ایک طرف تو آپ کو مخالفین کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی جو لوگوں کو آپ کے خلاف ابھارتے اور دوسری جانب آپ کے دُعا و مبلغین نشر و اشاعت اسلام میں مصروف تھے اور جب کوئی شخص دائرۃ اسلام میں داخل ہوتا

تو توحید کے ساتھ آپ کی رسالت کا بھی اقرار کرتا، حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وَضَمَّ اللَّهُ اسْمَ النَّبِيِّ إِلَى اسْمِهِ  
إِذَا قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمَوْذِنَ اشْهَدُ

”اور اللہ نے اپنے نام کے ساتھ نبی کے نام کو بھی ملا دیا، چنانچہ مؤذن دن میں پانچ مرتبہ کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں۔“

وَشَقَّ لَهُ مِنْ اسْمِهِ لِيَجْلِهَ  
فَذُو الْعَرْشِ مَحْبُودٌ وَهَذَا مُحَمَّدٌ

”اور آپ کی جلالت قدر کیلئے خود اپنے نام میں سے آپ کا اسم گرامی رکھا، صاحب عرش محمود ہیں تو آپ کا نام محمد ہے۔“

## رنج و راحت

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ① إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ②

”ہاں ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے اور بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔“

اگرچہ ابتدائے کار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکالیف و شدائد کا سامنا کرنا پڑا مگر آخر کار ان سب دقتوں کے بادل چھٹ گئے اور رنج و غم کے بعد سرور و راحت کے ایام آ گئے، پس کوئی شخص عارضی رکاوٹ کی وجہ سے پریشان خاطر نہ ہو، اس لیے کہ خدا کا یہ دائمی وعدہ ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت کا آنا یقینی ہے۔ امت مسلمہ کے لئے ان آیات میں بہت بڑا درس عبرت و بصیرت ہے، وہ ان موجودہ ناگفتہ بہ حالات اور دُورِ اسلامی کی بے چارگی سے گھبرانہ جائے اس لیے کہ اسی ظلمت سے امید کی کرن ٹکٹنے والی ہے اور یہی تاریکی شب صبح کے آنے کی خوشخبری دے رہی ہے۔

## انابت الی اللہ

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ③ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ④

”تو جب فارغ ہو کر تو عبادت میں محنت کیا کرو اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔“

لوگ اپنی کامیابی کے لیے ارباب دولت و ثروت پر اعتماد کرتے ہیں، اخبارات و جرائد کی امداد پر انھیں بھروسہ ہوتا ہے، شہرہ آفاق ارباب سیادت و سیاست کے اشارہ ابرو کے منتظر ہوتے ہیں، مگر دراصل ان میں سے کوئی جماعت بھی قابل اعتماد نہیں، اس لیے کہ یہ لوگ اسی وقت تک آپ کے ساتھ ہیں جب تک ان کے اغراض آپ کے ساتھ وابستہ ہیں اور جہاں ان کے مقاصد کے خلاف کوئی بات ہوئی فوراً الگ ہو جائیں گے۔

داعی حق کے لیے صرف ایک ہی ذات ہے جو اعتماد و توکل کے لائق ہے اور وہ صرف خدا کی ذات ہے، جو نحن اقرب الیہ من جبل الوردین کا مسرت اندوز پیام دیتی ہے، جو غار کی تاریکی اور دشمنوں کے جھوم کے وقت بھی ان اللہ معنا سے

ہمت افزائی کرتی ہے۔ سورہ توبہ میں یہی حکم دیا گیا: قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (التوبہ ۱۲۹) ”تو کہہ دو کہ خدا مجھے کفایت کرتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے“ سورہ شعراء کی یہی تعلیم ہے: تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۱۰۱﴾ الَّذِي يَدْرِكُ حِينَ تَقُومُ ﴿۱۰۲﴾ وَ تَقْلُبُ فِي السُّجُودِ ﴿۱۰۳﴾ (الشعراء: ۲۱۹-۲۲۱) ”اور خدائے غالب اور مہربان پر بھروسہ رکھو جو تم کو جب تم تہجد کے وقت اٹھتے ہو دیکھتا ہے اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی“۔ سورہ مزمل میں یہی سبق دیا: اِذْ كُنَا اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبْتَئِلُ اِلَيْهِ تَبْتَئِلُ ﴿۱﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿۲﴾ (المزمل ۹۳-۹۴) ”تو اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ، وہی مشرق اور مغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ“۔

آیات زیر بحث میں اسی امر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ جب آپ تبلیغ رسالت کے فرائض سے فارغ ہو جایا کریں تو فوراً خدا کی طرف رجوع کریں اور اس کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کی امداد و اعانت کے طالب ہوں کہ اس کی نصرت و دست گیری کے بغیر کسی انسان کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔





## التین

(آیات: ۷)

### خلاصہ مضمون

انسان کی فطرت نیک ہے یا بد؟ حکماء قدیم و جدید کا اس کے متعلق سخت اختلاف ہے۔ اس سورہ مبارکہ نے چند شہادتیں ذکر کر کے اس حقیقت مستورہ کو بے نقاب کیا کہ انسان فطرت اسلام و صلاحیت پر پیدا کیا گیا ہے، پھر اس کے خراب کرنے والوں اور قائم رکھنے والوں کے نتائج بیان کر کے بتا دیا کہ جزائے اعمال سے انکار کرنا غیر ممکن اور محال ہے، اس لیے کہ اللہ احکم الحاکمین ہے اور وہ ضرور ہر ایک انسان سے فرداً فرداً باز پرس کرے گا۔

## فما یکنذبک بعد بالذین

### تین اور زیتون

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝

”انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔“

تین کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تین سے مراد مسجد دمشق ہے، ایک جماعت کی رائے میں یہ اس پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جو دمشق کے متصل ہے، قرطبی کی رائے میں اصحاب کہف کی مسجد ہے، عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ تین وہ مسجد ہے جسے نوح علیہ السلام نے کوہ جودی پر تعمیر کیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ یہ وہی انجیر کا درخت ہے اور اس کا پھل جسے ہر شخص جانتا ہے۔

یہی اختلاف زیتون کے متعلق بھی ہے۔ کعب، قتادہ، ابن زید اور دوسرے لوگوں کی رائے میں یہ بیت المقدس ہے، مجاہد اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ وہی زیتون ہے جس کا تیل نکالتے ہو، ابن عباس کی رائے میں یہ بلاد فلسطین کی طرف اشارہ ہے، مگر اس روایت میں ایک مجہول راوی موجود ہے اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

ان اقوال مختلفہ میں سے ہماری رائے یہ ہے کہ تین سے مراد وہ جگہ ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان سے نجات پانے کے بعد کوہ جودی کے اوپر نماز پڑھی تھی، استشہاد دراصل اس مقام سے نہیں، بلکہ اس کا ذکر کر کے حضرت نوح، ان کی نبوت اور اس کے ثمرات و نتائج کی طرف توجہ دلا کر یہ بتانا ہے کہ ہم نے انسان کو ہر اعتبار سے اشرف مخلوقات پیدا کیا ہے، نوح اور اس کے ہمراہان سفر اپنی فطرت صالحہ پر قائم رہے، اس لیے وہ نہ صرف اعلیٰ ترین مراتب انسانیت پر فائز ہو گئے، بلکہ خوفناک طوفان سے بھی نجات پا گئے، مگر جن لوگوں نے اس رسول کی نافرمانی کی اور اپنی فطرت کو خراب کر لیا وہ ذلیل ترین عذاب میں مبتلا ہوئے۔

زیتون سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے، اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا، عیسائیوں میں اب تک اس کے تیل کو مقدس تیل کہا جاتا ہے، تھوڑا سا تیل رسم تاج پوشی ادا کرنے کے لئے بادشاہ کو لگایا جاتا ہے اور شام کے لوگ زیتون کا تیل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح ہمارے ملک میں گھی۔ پس یہاں مسجد بیت المقدس کا ذکر کر کے حضرت عیسیٰ، ان کی نبوت اور اس کے ثمرات کی طرف توجہ دلا کر یہ بتانا ہے کہ اگر ایک شخص اپنی فطرت کے آئینہ کو گرد و غبار ضلالت سے پاک و صاف رکھے تو وہ ان مدارج عالیہ تک ترقی کر سکتا ہے۔

### بقیہ اقسام

طور سینین اور بلد امین میں کسی کو اختلاف نہیں، بلکہ سب اسی امر پر متفق ہیں کہ طور سے وہ پہاڑ مراد ہے جہاں حضرت موسیٰ کو اللہ سے شرف ہم کلامی نصیب ہوا اور بلد امین سے غرض مکہ معظمہ کا ذکر کرنا ہے۔

### استشہاد کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے چار مقامات کا تذکرہ کر کے ان بنوتوں کی طرف توجہ دلائی جن کا ان مقامات میں ظہور ہوا۔

(الف)۔ مسجد جودی: جہاں حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد خدا کا شکر ادا کیا۔

(ب)۔ زیتون: شام، جس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔

(ج)۔ طور سینین: حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے۔

(د)۔ بلد امین: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

غرض ان چار مقامات کے ذکر سے یہ ہے کہ انسان کے شرف و مجد کو واضح کیا جائے اور یہ حقیقت اصل یہ لوگوں کے سامنے آجائے کہ وہ بد کرداروں کو دیکھ کر فسق و فجور پر قانع نہ ہو جائیں، بلکہ طہارت و پاکیزگی کے ان اعلیٰ ترین نمونوں کو دیکھ کر نیکی اور فرشتگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ ہم نے ہر شخص کو بہترین شکل و صورت پر پیدا کیا ہے اور اسے اعلیٰ ترین اخلاق و جذبات نوازش کیے ہیں۔

## احسن تقویم

آیت، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، ان تمام سابقہ اقسام کا جواب ہے۔ ابن عباس اس کے یہ معنی کرتے ہیں نبی احسن خلق، واحدی دوسرے مفسرین کی رائے یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو منہ کے بل جھکا ہوا پیدا کیا ہے، مگر انسان کو سیدھا بنایا ہے اور اسے علم، فہم، نطق، عقل، تمیز اور ادب سے آراستہ کیا ہے، پس وہ ظاہر و باطن کے اختیار سے بہترین طریق پر پیدا کیا گیا ہے، تقویم کے معنی تعدیل کے ہیں، قرطبی کے نزدیک انسان کا اعتدال واستواء ادب ہے۔

ان تمام اقوال میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، بلکہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فرزند آدم نہ صرف ظاہری اعضاء و جوارح کے اعتبار سے بہترین ہے بلکہ جذبات و عواطف کے لحاظ سے بھی اس کی فطرت بالکل صالح اور نیک ہے۔ اب اگر وہ بدی کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت کا تقاضا نہیں، بلکہ ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہی اس سورت کا موضوع ہے اور گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کر کے یہی بتانا ہے کہ انسان کی فطرت بہترین پیدا کی گئی ہے اور وہ محض نیکی ہی نیکی ہے، شر و فساد کا اس میں نام و نشان تک نہیں۔

## بدترین خلاق

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ①

”پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت کو بدل کر پست سے پست بنا دیا۔“

جو لوگ اپنے قلب سلیم کی خارجی اثرات ضلالت سے حفاظت نہیں کرتے اور اپنے صاف و شفاف آئینہ فطرت کو گرد آلود ہونے دیتے ہیں تو وہ جس طرح کہ اشرف مخلوقات تھے، اب شر البریہ بھی بن جاتے ہیں، وہی الاعمی ہیں اور وہی حیوانات سے بھی بدتر ہیں: لَهِمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بَہَا وَلَہُمْ اُذُنٌ لَا یَسْمَعُونَ بَہَا وَلَہُمْ اَعْيُنٌ لَا یُبْصِرُونَ بَہَا وَلَئِنْ کَانَ لَافْعَامٌ لِّہُمْ اَضَلُّ اُولَئِکَ ہُمُ الْغَافِلُونَ۔

یہ فیصلہ کسی ایک جماعت اور ایک وقت سے مخصوص نہیں، بلکہ یہ ایک عالم گیر قانون ہے اور ہر گروہ اور ہر وقت کے لیے ہے، اسی پر نوح کے زمانہ میں عمل کیا گیا، ابراہیم و موسیٰ کے لوگوں کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک ہوا اور عیسیٰ و محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی یہی سنتہ اللہ تھی۔ پس کوئی شخص بھی اس قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور ہر ایک فطرت صالحہ کو مسخ کرنے والا معذب ہو گا۔

## ایک استثناء

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ①

”مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔“

مگر اب بھی ہم بتائے دیتے ہیں کہ ایک شخص خواہ بے انتہا جراتم و معاصی کا مرتکب ہو اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ جس وقت وہ ایمان باللہ کو اپنا طغرائے امتیاز بنالے گا اور نیک کام کو اپنی غایت الغایات تو اسے اتنا اجر ملے گا کہ اس کی کوئی حد نہ ہوگی اور آخرت کے عذاب سے اگر کوئی چیز نجات دلا سکتی ہے تو وہ ایمان باللہ اور عمل صالح ہی ہے۔

## جزائے اعمال

فَمَا يَكْذِبُكَ بَعْدُ بِالذِّبِّ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝

”تو اے آدم زاد! پھر تو جزا کے دن کو کیوں جھٹلاتا ہے، کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔“

کیا ان شہادتوں کے بعد کسی شخص کو یہ ہمت ہے کہ جزائے اعمال کا انکار کرے، ان پیغمبران جلیل اور ان کے رفقاء کار کو جو اجر غیر ممنون سے سرفراز کیا گیا تو یہ ان کے اعمال صالحہ ہی کا نتیجہ تھا اور اگر دوسروں کو شر البریہ بنایا گیا تو یہ بھی ان کی بدکرداری کا ثمرہ تھا۔

یہ حقائق عالیہ تمہارے سامنے ہیں، تاریخ کے اوراق ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں اور سب کے سب بابتگ دہل بتا رہے ہیں کہ جزائے اعمال یقینی ہے اور ہر شخص سے اس کے کاموں کے متعلق باز پرس کی جائے گی، اب جو شخص اس جواب دہی اور مسؤلیت سے انکار کرتا ہے وہ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ نیک و بد کا انجام ایک ہی ہو گا، روشنی اور تاریکی میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں، زہر اور قند ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور سب سے آخر میں یہ کہ اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں جو نیکیوں اور بدوں کو ایک ہی قسم کا بدلہ دے رہا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔ انبیائے کرام کے واقعات اس پر شاہد ہیں، خدائے قدوس ضرور نیک و بد میں تمیز کرتا ہے اور ہر ایک کو اس کا بدلہ دیتا ہے: اَمَرَ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۚ سَوَاءٌ مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (الجماعہ ۲۱) ”جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی، یہ جو دعویٰ کرتے ہیں برے ہیں۔“ سورہ قلم میں فرمایا: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ ۚ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۚ (القلم ۳۵ تا ۳۶) ”کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کی طرح نعمتوں سے محروم کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسی تجویزیں کرتے ہو،“ ایک جگہ آتا ہے: اَمَرَ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ اَمَرَ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (ص ۲۸ تا ۲۹) ”جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے، کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔“

پس خدا کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ نیک و بد میں تمیز ہو اور ہر ایک کو الگ الگ اپنے اپنے کام کا بدلہ ملے۔

## العلق

(آیات: ۱۹)

### تلخیص مضامین

آیت ۵ تک یہ بتایا گیا کہ قرآن کا نزول محض اللہ کے کرم کا نتیجہ ہے، مگر انسان اس صحیح تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتا، پھر آیت ۹ سے ۱۴ تک رسول اللہ ﷺ کی کلی زندگی کا تذکرہ کیا اور آخر میں فرمایا کہ اگر دشمنان اسلام اس تعلیم کی مخالفت سے باز نہیں آتے تو ان کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں، پس داعیِ حق ان مخالفین کی اطاعت نہ کرے، بلکہ توبہ و انابت الی اللہ کو اپنا شعار بنالے۔

## دشمنان اسلام کی بربادی

### شوق عبادت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ أَوْ رَبُّكَ الْأَكْمَرُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

”اے محمد! اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔“

بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قبل از نبوت رسول اللہ ﷺ کئی کئی روز تک غار حرا میں محکف رہتے تا آنکہ پورے چالیس سال کے بعد اللہ نے اپنا ابتداء ای الہام نازل کیا اور جبرئیل نے ان آیات کی تلاوت کی جو زیب عنوان ہیں، آپ خوف زدہ ہو کر گھر آئے اور خدیجہ سے تمام قصہ بیان کیا، انہوں نے کہا آپ مجسمہ بُنکی اور فرشتگی ہیں، اللہ آپ کو ہلاک نہیں کرے گا اور مزید اطمینان کے لیے ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جنہوں نے تمام حالات سننے کے بعد کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ فرشتہ جبرئیل ہے جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا۔

## آپ کا خوف زدہ ہونا

بعض لوگوں نے مذکورۃ الصدر روایت کو اس لیے مجروح قرار دیا ہیں کہ رسول ایسے موقع پر خوف زدہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ آپ کو ورقہ بن نوفل، ایک عیسائی عالم کی تصدیق پر اطمینان ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ ناموس الہی کا آنا آپ کی زندگی کا اولین موقع تھا، اس لیے خوف زدہ ہونا قدرتی امر تھا۔ جس وقت حضرت ابراہیم کے مہمانوں نے کھانا نہ کھایا تو وہ بھی ان سے ڈر گئے تھے: فَلَمَّا رَأَىٰ اٰیٰتِهِمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِمْ نَكَهَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلٰی قَوْمِ لُوطٍ (ہود) جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں جاتے یعنی وہ کھانا نہیں کھاتے تو ان کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا، فرشتوں نے کہا کہ خوف نہ کیجئے، ہم قوم لوط کی طرف ان کے ہلاک کرنے کو بھیجے گئے ہیں۔ جب فرعون کے دربار میں جادو گروں نے نظر بندی کر کے رسیوں کو سانپ کر دکھایا تو موسیٰ بھی ڈر گئے تھے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيفَةً ۙ مُّوسٰی ۙ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۷۷﴾ (طہ ۶۷-۶۸) ”اس وقت موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا، ہم نے کہا خوف نہ کرو، بلاشبہ تم ہی غالب ہو۔“ حضرت داؤد کا بھی یہی حال ہوا تھا: اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوُدَ فَقَالَ لَا تَخَفْ (ص ۲۲) ”جس وقت وہ داؤد کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گئے، انہوں نے کہا کہ خوف نہ کیجئے۔“

ان تمام امثال سے یہ معلوم ہو گیا کہ خوف زدہ ہونا پیغمبری میں کوئی نقص نہیں پیدا کرتا، پھر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ کے خاندان میں نبوت کا سلسلہ نہ تھا اور نہ انبیاء کرام کی اس قسم کی حالتوں سے عرب کے لوگ واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے نزول وحی کے وقت آپ کی خاص کیفیت دیکھی تو اس کو جنون و سحر کی طرف منسوب کیا اور آپ کو پاگل کا نام دیا، عرب ان پڑھ تھے، اس لیے آپ کے اطمینان کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو سلاسل انبیاء سے واقف تھے۔ چنانچہ ورقہ کی شہادت پر آپ کی پریشانی رفع ہو گئی، پھر اس کے بعد اس قسم کا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔

## ما انابقاری

جس وقت ناموس الہی نے آپ سے پڑھنے کو کہا تو آپ نے فرمایا کہ میں قاری نہیں ہوں اور نزول وحی کے بعد آپ ڈر گئے، اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو اوپر گزر چکی، اس کا دوسرا مطلب یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ جس وقت جبریل نے آپ سے پڑھنے کو کہا اور آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میرے اوپر ایک عظیم الشان بوجھ ڈالا جا رہا ہے اور تمام دنیا کی ہدایت و سعادت میرے متعلق کر دی گئی ہے تو آپ اس عظیم ترین ذمہ داری کو دیکھ کر گھبرا گئے کہ میں عاجز و مسکین بندہ اتنا بڑا بار نہیں برداشت کر سکتا، میرے کندھے اس کے اٹھانے سے کمزور ہیں، میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ اس پر خدیجۃ الکبریٰ نے عرض کیا: ابشر، فواللہ ما یغزیک اللہ ابد انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکمل وتقوی الضیف وتعین علی

نواب الحق بش، ارت ہو، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی آپ کا شیوہ ہے، تکالیف و شدائد میں آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں، بھلا ایسے آدمی کو بھی خدا ذلیل کر دے گا، کبھی نہیں۔  
تو یہ دراصل گراں باری فرض کا خوف تھا، اپنی ذمہ داری کا ڈر اور مسوئیت کا خیال تھا، اس کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔

### ابتدائی الہام

مفسرین اس امر میں اختلاف کرتے ہیں کہ اولین الہام کون سا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سورہ علق کی یہی آیات نازل ہوئیں جو زیر بحث ہیں، ایک گروہ سورہ فاتحہ کو اور دوسرا سورہ مدثر کو اولین الہام قرار دیتا ہے۔  
ہماری رائے یہ ہے کہ تینوں اقوال اپنے اپنے اعتبار سے بالکل ٹھیک ہیں۔ سورہ علق کی ان آیات میں صرف اس امر کی آپ کو اطلاع دی گئی ہے کہ آپ کی معرفت تمام دنیا میں نور تو حید پھیلنے والا ہے، اس اعتبار سے یہی اولین الہام ہے، مگر جن لوگوں نے سورہ مدثر کو اولین کہا تو ان کا منشا یہ تھا کہ اب آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ فرض تبلیغ ادا کرنے کو تیار ہو جائیں، چنانچہ ہم فائدہ کے الفاظ اسی توجیہ کی تائید کرتے ہیں، گویا اولین تیاری کا حکم سورہ مدثر ہی میں دیا گیا اور اس لحاظ سے یہی پہلا الہام ہے، لیکن جن حضرات نے سورہ فاتحہ کو اولیت دی ہے تو ان کی غرض یہ تھی کہ قانون اور دستور العمل کے لحاظ سے ایک مکمل سورت سب سے پہلے یہی نازل ہوئی ہے۔

### رجوع الی المقصود

العلق، الدم الجامد، جما ہوا خون، جب فرشتہ نے غار حرا میں آپ سے کہا، تو پڑھ، تو آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا لکھا نہیں اور یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اگرچہ تم لکھنے پڑھنے سے واقف نہیں، مگر ہم عنقریب تم پر ایک کتاب نازل کرنے والے ہیں اور تم میں پڑھنے کی صفت پیدا کر دیں گے، دیکھو ہم نے اس کائنات ارضی و سماوی کو عدم محض سے پیدا کیا ہے، پس جو خدا ان تمام چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ تمہیں پڑھوانے پر بھی قدرت رکھتا ہے، پس تم اس کے حکم اور ارادے سے پڑھو۔

تم انسان کی پیدائش پر غور کرو، جنین کی ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ محض خون کی ایک پھٹکی ہوتا ہے، مگر اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ وہ اسی خون بستہ کو ایک حی و قائم اور دانا و بینا انسان بنا دیتا ہے، پھر وہی انسان علم و معرفت کی بنا پر اشرف المخلوقات بن جاتا ہے اور ہر چیز کو اپنا مطیع و منقاد بنالیتا ہے، پس جس خدا کی یہ صفات و مختصات ہوں وہ تم جیسا انسان کامل بھی بنا سکتا ہے اور تمہیں پڑھنے کی قوت بھی نوازش فرما سکتا ہے پس تم اس اللہ کا نام لے کر پڑھو۔

### احسانات خداوندی

اس رب کریم کا نام لے کر شروع کرو جس نے ایک طرف تو گوشت کے لو تھڑے زبان کو ذریعہ افہام و تفہیم بنایا

اور دوسری جانب ایک بے جان لکڑی قلم کو وجہ بیان و تمییز اور وسیلہ بقائے علوم و خیالات بنایا، یاد رکھو وہ تمہیں بھی قاری اور معلم بنانے پر قادر ہے، اس خدا کی طرف نظر کرو جس نے انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جن سے وہ واقف نہ تھا، پس وہی معلم حقیقی تمہیں اتنا علم نوازش کرے گا کہ تمام عالم کی امتیں اور قومیں مل کر بھی اس علم کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

## انسان کی سرکشی

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَيِّطٌ ۝۱۰ اَنْ رَّاهُ اسْتَغْنٰ ۝۱۱ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْوَجْهُ ۝۱۲

”مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے، کچھ شک نہیں کہ اس کو تمہارے پروردگار ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

سابقہ آیات کے نزول کے بعد وحی کا آنا ایک مدت تک رک گیا، جس کا ضروری تذکرہ واضحی کی تفسیر میں آچکا ہے، یہ ٹکڑا آخر تک کئی سال کے بعد نازل ہوا، اللہ کی ربوبیت تو وہ کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم اور جو دو بخشائش سے انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقا کا بھی سامان کیا اور رسول اللہ ﷺ کو کتاب مبین دی۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ یہ حیوان ناطق، ظلم و جہول انسان اس کے آگے جھک جاتا اور سوائے اس کے اور کسی کو نہ پکارتا، مگر اس کے طغیان و سرکشی کی یہ کیفیت ہے کہ تھوڑے سے مال و متاع پر اتنا اتر جاتا ہے کہ کسی قانون اخلاق و مروت کی پروا تک نہیں کرتا اور اپنے آپ کو پابندی قرآن سے بالاتر خیال کرتا ہے حالانکہ انجام کار اسے اسی رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس نے اس پر یہ نعمتیں نازل کیں، وہ ایک ایک کا حساب لے گا۔

## مخالفت کی انتہا

اَرَعَيْتَ الَّذِي يَنْهٰی ۝۱۳ عِبْدًا اِذَا صَلَّى ۝۱۴ اَرَعَيْتَ اِنْ كَانَ عَلٰى الْهُدٰی ۝۱۵ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ۝۱۶ اَرَعَيْتَ اِنْ كَذَّبَ ۝۱۷ وَ تَوَلٰی ۝۱۸ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰی ۝۱۹

”بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے یعنی ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے، بھلا دیکھو تو اگر یہ راہ راست پر ہو یا پرہیز گاری کا حکم کرے تو منع کرنا کیسا اور دیکھ تو اگر اس نے دین حق کو جھٹلایا اور اس سے منہ موڑا تو کیا ہوا، کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔“

دنیا میں آپ کو اس قسم کے لوگ بھی ملیں گے جو حق کی تلاش و جستجو میں تو ہیں مگر اپنے احباب و اقربا کے دباؤ سے اس راہ کو ترک کر دیتے ہیں اور پھر اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان لوگوں کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں جو پیکر صدق و اخلاص ہیں اور طہارت و پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔



ایک شخص اللہ کی یاد کرتا ہے، اس کی ربوبیت کو تسلیم کر کے اس کے آگے جھکتا ہے، لوگوں کو ورع و تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، مگر ادھر اس بد بخت انسان کو بھی دیکھو جس نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا ہے، صلوٰۃ الہی ادا کرنے سے لوگوں کو روکتا ہے، جس بات کو خود اس کا دل تسلیم کرتا ہے اس کے جہود و انکار کا مرتکب ہوتا ہے، اپنے فطرتی جذبات کے مٹانے کی فکر میں ہے، کیا اچھا ہوتا اگر وہ خود راہ صدق و اخلاص اختیار کرتا اور دوسروں کو اسی طرف بلاتا، مگر وہ تو اس کے بحضہ مستقیم مخالف ہے۔ تو پھر کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، اگر یہ شقی ازلی لوگوں کے مواخذہ سے بچ گیا تو اللہ کی باز پرس سے کہاں نجات پائے گا؟ اس کی پکڑ تو بڑی ہی سخت ہے، ان اخذ الیم شدید۔

### تباہی کا اعلان

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ كَلَّا لَا تَطَعُهُ ۝ اسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝

”دیکھو اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے یعنی اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی کے بال، تو وہ اپنے یارانِ مجلس کو بلائے، ہم بھی اپنے مولانا دوزخ کو بلائیں گے، دیکھو اس کا کہنا ماننا اور سجدے کرنا اور قرب خدا حاصل کرتے رہنا۔“

نسفعا، دراصل نفسعن تھا، عام کتابت میں تو یوں ہی لکھا جاتا ہے، مگر قرآن کے رسم الخط میں اس کو الف سے تحریر کرتے ہیں، لغت میں سفع کے معنی کسی چیز کو شدت کے ساتھ کھینچنے کے ہیں۔ نادى، مجلس شوریٰ کو کہتے ہیں، لوگ اس میں باہمی مشورہ کرتے ہیں، اسی سے دارالندوہ ہے، اس جگہ نادیہ سے اس کے یارانِ مجلس اور ہم نشین مراد ہیں۔ ذبیئہ جمع ہے ذبیئہ کی، ذہن کہتے ہیں دفع کرنے کو، زبانہ وہ فرشتے جو کفار کو دوزخ میں دھکے دے کر ڈال دیں گے۔ اگر باوجود تذکیر و موعظت اور پند و نصیحت مخالفین اسلام اپنی ضد اور عداوت پر برابر قائم رہے اور تعلیمات قرآن و فرزند ان اسلام کے برباد کرنے میں سعی و کوشش کرتے رہے تو ہم انھیں ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ وہ تیار ہو جائیں، اپنے تمام احوال و انصار کو جمع کر لیں اور اپنے امکان بھر اسلام کی مخالفت کر لیں، ہم نے بھی ان کی تباہی و بربادی کا فیصلہ کر لیا ہے، ان بد بختوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتاریں گے اور کتے کی موت ماریں گے، ان کی فناسامانی کے لیے انسانوں ہی کی ایک جماعت کھڑی کر دیں گے اور اسی دنیا میں ان کی ہلاکت کے تمام سامان جمع کر دیں گے۔

دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، ابو جہل نے رسول اللہ اور مسلمانوں کی مخالفت کی، چند ہی روز کے اندر غزوہ بدر میں وہ ذلیل ترین موت مرا۔ اسلام کی مخالفت کرنے والے یہ یقین کر لیں کہ جس طرح یہ قانون ابو جہل و ابولہب کے لیے تھا، ویسے ہی آج بھی ہر فرعون کے لیے ہے۔ باقی کفار و معاندین کی سعی و کوشش سے فرزند ان اسلام کو پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے، وہ ان کی پروا تک نہ کریں، توجہ و اتانت الی اللہ کو اختیار کریں کہ توکل و اعتماد علی اللہ ہی فوز و کامرانی کی مفتاح حقیقی ہے۔

## تاخیر کا سبب

ہم گذشتہ اور اق میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ اولین الہام صرف پانچ آیات تک ہی ہوا اور باقی سورت کئی سال کے بعد نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمان خداوندی کے مطابق لوگوں کو راہ حق کی طرف بلانا شروع کر دیا اور مزید تعلیم و تربیت کے لیے دوسری سورتیں حسب ضرورت نازل ہوتی رہیں، مگر آپ کی دعوت کے ساتھ ساتھ معاندین کی سعی و کوشش بھی زور پکڑتی گئی اور قدم قدم پر مخالفت ہونے لگی، اس بغض و عداوت اور کفر و جہود کو دیکھ کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انکی سرزنش ضروری ہے، ورنہ کلمۃ اللہ بلند و برتر نہ ہو سکے گا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ رک جائے گا۔

اس مخالفت سے قبل آپ کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ میں انہیں ایسی چیز دے رہا ہوں جو ان کی دنیا اور آخرت کے لیے یکساں طور پر مفید و نافع ہے، پھر کس کو ہمت ہوگی کہ ایسے مشربرکات و نتائج قانون کی مخالفت کرے۔ چنانچہ جس وقت ورقہ بن نوفل نے آپ سے نزول الہام کی تفصیل سنی تو کہا: ہذا الناموس الذی انزل علی عیسیٰ لیتنی فیہا جذعا لیتنی اکون حیاحین یخشاہ قومک، ”یہ تو وہی فرشتہ ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا، اے کاش میں اس وقت طاقتور ہوتا اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب تمہاری قوم والے تمہیں ہجرت پر مجبو کر دیں گے۔“ یہ سن کر آپ حیران رہ گئے اور پوچھنے لگے: ہم مخرجی ”کیا وہ مجھے جلاوطن کر دیں گے۔“ ورقہ نے کہا: نعم لم یات رجل قط ہما جئت بہ الا عودی وان یدرکنی یومک انصرک نصرما مؤزرا، ”ہاں ہاں جو شخص بھی یہ تعلیم لاتا ہے جس کے حامل آپ ہیں، تو اس کی ضرور مخالفت ہوتی ہے اور اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی پوری پوری امداد و اعانت کروں گا۔“

رسول اللہ ﷺ مجسمہ رحمت و شفقت تھے، اس لیے آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی لوگوں کی مخالفت اور عداوت کا گمان نہ تھا، اسی لیے آپ نے ورقہ کی بات پر اظہار تعجب کیا، بہر حال کئی سال تک آپ دعوت و ارشاد میں مصروف رہے، مگر حالت یہ تھی کہ جس قدر آپ ان کو حق کی طرف بلاتے تھے اسی قدر وہ مخالفت میں بڑھتے چلے جاتے تھے، آپ کعبہ میں نماز ادا کر رہے ہیں اور لوگ آپ کے ساتھ تمسخر و استہزاء کر رہے ہیں، ابو لہب عین جلسہ میں آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: تبارک سائر الیوم الہذا جعلتنا طائف میں جاتے ہیں تو لہو لہان ہو کر واپس آتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ مد تہائے دراز تک اس دشمنی کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ ارباب ایمان کی اس تکلیف و مصیبت اور کلمہ حق کی عاجزی و درماندگی دیکھ کر آپ میں جذبہ انتقام بھڑک اٹھا اور اب آپ کی طبیعت خود اس امر کی مستعدی ہوئی کہ کفار و معاندین اسلام کی تنبیہ و تادیب ضروری ہے۔

جب نوبت یہاں تک آگئی اور آپ کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا تو خدائے حق نواز نے کئی سال کے بعد اس سورت کا آخری حصہ نازل کیا اور یہی مصلحت عمومی کا اقتضا بھی تھا، اگر ابتدا ہی میں یہ ٹکڑا نازل ہو گیا ہوتا تو آپ وہی کہتے جو ورقہ بن نوفل سے کہا تھا، مگر تنزیل وحی والہام میں ہمیشہ ضرورت اور وقت کا لحاظ کیا جاتا ہے اور اس میں یہی ہوا۔

## القدر

(آیات ۵)

### تلخیص مضامین

اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے فضائل و برکات بیان کر کے بتایا ہے کہ اسی شب میں قرآن کا نزول ہوا ہے اور اس نے اس شب کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے پس اگر تم اس کتاب عزیز اور جبل اللہ الجلیل سے تمسک و اعتصام کرو گے تو ان تمام صفات و محضات کو حاصل کر لو گے جو اس شب کی بیان کی گئی ہیں۔

## العروۃ الوثقی

### شب قدر کی بزرگی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَزْدَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنْزِيلُ الْمَلِكِ ۝ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَّمَ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

”ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے، شب قدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے، اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں، یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔“

دنیا کی بقا و دیات و روحانیت کی آویزش پر ہے، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس تصادم اور کشمکش میں ملکیت پر بہیمیت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس وقت چاروں طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہو جاتا ہے، پس یکا یک اللہ کی رحمت بھی جوش مارتی ہے اور پھر روحانیت کو مادیت پر غلبہ نصیب ہو جاتا ہے، گویا دوسرے الفاظ میں کبھی موسم بہار سے قلوب و افکار میں تروتازگی پیدا ہوتی ہے اور کبھی خزاں کے جھونکے ان کو پژمردہ کر دیتے ہیں۔

نبی کی بعثت قوم کے لیے بہار کا حکم رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے نزول روحانیت ہوتا ہے اور تمام لوگوں میں زندگی کی لہر

دوڑ جاتی ہے، مگر جب اس کی تعلیم سے انحراف شروع ہو تو پھر خزاں اپنا اثر دکھاتی ہے اور قوائے علیہ پر عالم ممات طاری ہو جاتا ہے، اس موت کے بعد نئی زندگی دینے کے لیے دوسرا نبی بھیج دیا جاتا ہے، جس شب کو اس قسم کی روحانیت کا نزول ہو، اس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں۔

## نزول قرآن

اسی شب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا کہ نوع انسانی رشد و ہدایت کا باعث ہو، لیخرجہ الناس من الظلمات الى النور، ظاہر ہے کہ قرآن مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا اور اس کی تکمیل میں ۲۳ سال لگ گئے، یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ یہ کتاب عزیز پہلی مرتبہ رمضان میں شب قدر کو نازل ہوئی۔ گذشتہ سورت سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اولین الہام کونسا ہوا اور اس سورت سے اس کی ابتدا کا پتہ لگ گیا۔ چنانچہ قرآن کی دوسری آیات بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۱۸۵) ”روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن اول اول نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کو الگ کرنے والا ہے۔“ سورہ دخاں میں ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْراً مِّنْ عِنْدِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (الدخان ۶۳۳) ”ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا، ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں، اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے جاتے ہیں یعنی ہمارے ہاں سے حکم ہو کر، بے شک ہم ہی پیغمبر کو بھیجتے ہیں، یہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے، وہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔“

جہو رامت کا اتفاق ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں اور اس کے آخری دس روز کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔

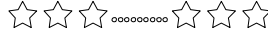
## خصوصیات شب

جس طرح موسم بہار نباتات میں نئی روح پھونک دیتا ہے، اسی طرح یہ شب روحانیت کے نزول کے لیے مخصوص ہے۔ اس ایک شب میں عبادت کا اجر و ثواب ایک ہزار ماہ کی عبادت کے برابر ہے، اس میں ملائکہ زمین پر نازل ہوتے ہیں، جو یکسر خیر و برکت ہوتے ہیں اور اس لیے تمام کائنات ارضی ایک بقعہ رحمت بن جاتی ہے، یہ دلفریب و کیف پرور نظارہ طلوع فجر تک رہتا ہے۔

## تنبیہ و اعتبار

لسان الہی نے اس شب کی اعلیٰ ترین خصوصیت یہ بتائی کہ ہزار ماہ سے بہتر یہ ایک شب ہے۔ احادیث میں اسکے تلاش کرنے کی خاص طور پر تاکید ہے، مگر بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص تمام عمر اس کی جستجو میں رہے اور وہ کامیاب نہ ہو،

اس لیے خدا نے اس شب میں قرآن نازل کیا جس نے اس کی تمام برکتوں اور رحمتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا، پس جب کبھی دنیا میں روحانیت کا تنزل ہو گا تو اس کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جس قدر خارجی اعانت کی ضرورت ہو گی اس کو صرف قرآن حکیم ہی پوا کر سکے گا اور شب قدر کے نہ پانے والے جب اس کتاب عزیز سے تمسک و اعتصام کر لیں گے تو وہ ان تمام فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوں گے جو اس شب کے لیے مخصوص ہیں، کیونکہ قرآن اسی رات میں نازل ہوا اور اس نے اس کی تمام خیر و برکت کو اپنے اندر لے لیا۔ فہل من مدکہ۔



## البینہ

( آیات ۸ )

### تلخیص مضامین

اہل کتاب اور مشرکین کی اصلاح ناممکن ہے جب تک رسول اللہ ﷺ کو مبعوث نہ کیا جائے جو وہی اصول و کلیات اور عقائد و یقینیات ان کے سامنے پیش کریں گے جن پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے، آخر سورت میں مخالفین اور موافقین کے نتائج ذکر کر دیے اور اسی پر سورت کو ختم کر دیا۔

## نبی الانبیاء کی ضرورت

### تقسیم مذاہب

اسلام سے قبل دنیا میں جس قدر مذاہب تھے ان کو دو طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف)۔ جن لوگوں نے علی الاعلان بت پرستی شروع کر دی اور بعض اشیاء کو مظاہر الہیہ مان کر بت بنا لیے، لسان شرع میں ان سب کو مشرکین کہا جائے گا، اگرچہ فی الحقیقت ان کے پاس ابتدا سے کوئی مذہب موجود ہو اور اس میں صحیح بات بھی پائی جائے، جیسے ہندو اور کفار مکہ۔

(ب)۔ جن مذاہب میں بت پرستی حرام ہے، ان کو اہل کتاب کہا جائے گا، اگرچہ ان کے عام لوگوں میں ایک درجہ شرک کا موجود ہو، مگر انھیں بت پرست اور مشرکین نہ کہا جائے گا۔ چنانچہ آریہ اس صنف میں داخل ہیں کیونکہ ان کے مذہب میں بت پرستی حرام ہے۔

مشرکین عرب کا دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے پابند ہیں۔ اگرچہ ان میں حج اور قربانی وغیرہ کے رسوم اب تک موجود تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مذہب کو کلیۃً چھوڑ کر بت پرست بن گئے تھے، یہاں تک کہ ابراہیم واسلمعیل کے بت بھی بیت اللہ میں موجود تھے اور وہ گھر جو صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اب تین سوساٹھ بتوں کا مسکن بن گیا تھا۔

اہل کتاب کی بھی یہی حالت تھی، عہد عتیق و جدید کے باوجود اعمال کفریہ کا ارتکاب کرتے اور عزیز و عیسیٰ کو خدا کا حقیقی بیٹا کہتے تھے، اسی قسم کی دوسری مشرکانہ رسوم بھی ان میں جڑ پکڑ چکی تھیں اور یہ کفر والحاد اس درجہ ان میں جاگیر ہو گیا تھا کہ معمولی قوت تجدید سے ان کی اصلاح غیر ممکن تھی، اس لیے ایک موسس و مصلح واعظم کی ضرورت تھی جو ان دور از عقل عقائد کو بالکل نیست و نابود کر دے۔

### رسول من اللہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتِبَ قَبِيَّةٌ ۝

”جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک، وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی یعنی خدا کے پیغمبر جو پاک اور اق پر ہتھے ہیں، جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔“  
رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل تمام مذاہب میں تحریف ہو چکی تھی، عقائد بگڑ گئے تھے، اعمال صالحہ کا نام و نشان نہ تھا، کتب سماویہ پس پشت ڈال دی گئی تھیں، اکثر تو جزائے اعمال ہی کا انکار کرتے اور جو تسلیم کرتے تھے انہوں نے کفارہ کو اپنی آڑ بنا لیا تھا، تمام ناشائستہ حرکات کا ارتکاب ہوتا اور دعویٰ یہ کیا جاتا کہ مذہب کا یہی حکم ہے۔

جب ایک جماعت کسی غلط کام کو مذہب کے نام سے کرتی اور ثواب کی امیدوار ہوتی ہے تو پھر اس کی اصلاح مجدد کے لیے غیر ممکن ہے، اس لیے کہ جس قدر قوت کے ساتھ وہ فسق و فجور پر قائم ہے جب تک اسی درجہ کاری ایکش اور رد عمل نہ ہو گا اصلاح نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کئی مجددین ملت عیسوی میں پیدا ہوئے، مگر نصاریٰ کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، مشرکین کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

پس جب کائنات ارضی انسانوں کے فسق و فجور سے ظلمت و تاریکی کا گھر بن گئی تھی اور حق کی روشنی بجھ گئی تھی تو وقت آگیا کہ آخری رسول کا آفتاب فاران کی چوٹیوں پر طلوع کرے، دعائے خلیل کو شرف قبول نصیب ہو اور مسیح نے جس آنے والے کی بشارت دی تھی اس کے آنے کی خوش خبری سن کر بنی آدم عبرت اندوز و بصیرت افروز ہوں اور حق و صداقت کی پیروی کریں۔

آپ ہی کا وجود اقدس وہ روشن دلیل ہے جس نے آتے ہی اوہام و ظنون کے پردے چاک چاک کر دیے، سلاسل و اغلال رسوم کو توڑ دیا اور سب کو ظلمت سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ بینہ کی تفسیر خود آگے رسول من اللہ سے کر دی ہے، اس رسول کا یہ فرض ہو گا کہ وہ لوگوں کے سامنے پاک صحیفوں کی تلاوت کرے۔

کتاب قبیہ کے متعلق بعض مفسرین کرام یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صحف انبیاء عظام ہیں یعنی رسول ان ہی اصول و کلیات کی تعلیم دیں گے جو تمام صحائف و اسفار آسمانی میں دیے گئے تھے اور جن سے ایک نبی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔

نوح سے لے کر محمد علیہم السلام تک کی دعوت ایک ہی تھی۔

دوسرے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ کتب قبیلہ سے مراد قرآن کی مختلف سورتیں ہیں، اس لیے کہ ہر ایک سورت مستقل کتاب قیم ہے، یہ قیادہ کی رائے ہے، ہماری رائے میں دونوں قول ٹھیک ہیں، قرآن وہی اصول پیش کرتا ہے جو پہلی کتابوں میں مذکور تھے، مگر لوگوں نے ان کو فراموش کر دیا، اسی لیے آپ کو مذکور کیا دلانے والا، کہا گیا ہے، قرآن کی مختلف سورتوں میں وہی کلیات ذکر کے گئے ہیں جن پر تمام مذاہب متفق ہیں، اس لیے آپ اہل کتاب اور مشرکین کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں کہ انھیں وہ باتیں یاد آجائیں، اس طرح تمام ادیان ایک عالم گیر برادری میں شامل ہو جائیں۔

اختلاف کیوں ہوا

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

”اور اہل کتاب جو متفرق و مختلف ہوئے ہیں تو دلیل واضح کرنے کے بعد ہوئے ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، مشرکین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شدید ترین غلطیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس رسول کا اتباع نہ کریں، یہود و نصاریٰ کو آپ کی صداقت کا ایسا ہی علم تھا جس طرح انھیں اپنی اولاد کا یقین تھا۔ یہود و نصاریٰ نے کہا یہ رسول ابناؤں کے، یہ لوگ بھی آپ پر ایمان نہ لائے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس اللہ کے رسول قبل ازیں آچکے تھے جنہوں نے صحیح تعلیم ان کے سامنے پیش کر دی تھی، مگر انھوں نے ان انبیائے کرام کو بھی نہ مانا، بلکہ ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اختلاف میں پڑ گئے، ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے، بعض اجزائے کتاب کو لے لیا اور دوسرے حصص کا انکار کر دیا، تبلیس الحق بالباطل کے مرتکب ہوئے اور اس طرح ضروری اور غیر ضروری کو خلط ملط کر کے اصل کتاب ہی کو بے کار کر دیا، اب وہ کتاب اس قابل نہیں رہی کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ان حالات میں یہ ظاہر ہے کہ کوئی پرانی کتاب آسمانی انسانوں کی رہ نمائی کا فرض ادا نہیں کر سکتی، بلکہ جدید پیغمبر اور نئی کتاب کی ضرورت ہے، جو عالم گیر اصول و کلیات کی طرف انسانوں کو دعوت دے، اس لیے رسول اللہ کی بعثت ضروری ہے۔

کیا تعلیم تھی

وَمَا أَمْرٌ إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝

”اور ان کو حکم تو یہی تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں ایک سو ہو کر اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے۔“

حنفاء جمع حنیف کی ہے، اس شخص کو کہتے ہیں جو تمام مذاہب سے الگ ہو کر دین اسلام کی طرف رجوع کرے،



لغت میں اس کے معنی میلان کے آتے ہیں، عرف میں یہ میلان الی الخیر کے لیے مخصوص ہے اور اب اس کے یہ معنی ہیں کہ یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور شرک سے الگ ہو کر اسلام کا پابند ہونا۔

ان اہل کتاب کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ خدا اور بندوں کے تعلقات درست رکھیں، خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، سب سے کٹ کر اسی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیں اور لوگوں کو مختلف نہ ہونے دیں، بلکہ ان کو ایک لڑ میں پرو لیں اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مل کر نماز پڑھیں تاکہ قوم میں نظم و ترتیب قائم رہے اور اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے زکوٰۃ دیں جو ان کی اصلاح میں صرف ہوگی، مگر ان لوگوں نے ان احکام کو پس پشت ڈال دیا اور اپنے ابا پیل واکاذیب کو مذہب کا نام دے کر ان پر عمل کرنے لگے، جب اہل کتاب کی یہ حالت ہو تو مشرکین تو ان سے کہیں زیادہ خراب ہوں گے کہ ان کے پاس نہ کوئی پیغمبر آیا نہ آسمانی کتاب۔

### مخالفین کا انجام

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ①

”جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔“

برا، کے معنی خلق اور بریہ، مخلوقات، کفار و مشرکین اور اہل کتاب کے باہمی اختلاف کے وقت اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا اور اگر اب بھی یہ لوگ آپ کی تعلیم کو نہ مانیں تو ان سے بڑھ کر اور کون بد بخت ہو سکتا ہے، جس کا نتیجہ جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

### ضیالہ عنہم

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ② جَزَاءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رِضْوَانُ اللَّهِ عَنْهُمْ وَرِضْوَانُهُ ذَلِكَ لِمَنْ حَاشَىٰ رَبَّهُ ③

”اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ تمام خلقت سے بہتر ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ابد الابد ان میں رہیں گے، خدا ان سے خوش اور وہ اس سے خوش، یہ صلہ اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا رہا۔“

مگر جن لوگوں نے اپنی قوت نظری اور عملی دونوں کی تکمیل کی، ان کا شمار اشرف ترین مخلوقات میں ہوگا، وہ جنت کے وارث ہوں گے، جہاں اعلیٰ ترین نعمتیں موجود ہوں گی، ان ارباب قدس و طہارت کی سب سے بڑی فضیلت و بزرگی یہ ہوگی کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اپنے پروردگار سے راضی کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو قبول اور انکی دعاؤں کو شرف اجابت بخشا اور اللہ کے خوف سے ان لوگوں کی گردنیں اسکے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکیں۔

## الزلزال

(آیات، ۸)

## تلخیص مضامین

اس سورت کی ابتدائی آیات میں قیامت کے ان حوادث کا ذکر کیا گیا ہے جو شروع میں رونما ہوں گے، پھر اس خوفناک حادثہ کا انجام یہ ہو گا کہ تمام بنی آدم اپنے اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، اس روز کی کیفیت یہ ہو گی کہ کوئی چیز بھی مخفی نہ رہ سکے گی، بلکہ اگر حقیر ترین نیکی یا بدی کی ہے تو وہ بھی سامنے آجائے گی۔

## واقعات قیامت

## زلزلہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ○ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ○ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ○

”جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے بوجھ نکال ڈالے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا ہے۔“

حادثہ قیامت کی ابتدا جن واقعات سے ہو گی ان کا کچھ تھوڑا سا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔ تمام صحیح احادیث اور موجودہ زمانہ کی تحقیقات اس حقیقت پر مہر لگاتی ہیں کہ قیامت کی ابتدا زلزل سے ہو گی اور ان کی کثرت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ زمین میں جس قدر خزانوں و دفائن اور دوسری چیزیں مخفی ہیں سب کی سب ان جھٹکوں کی وجہ سے باہر آجائیں گی۔ چنانچہ یہ روز مرہ کے مشاہدات ہیں کہ جن مقامات میں زلزلوں کی کثرت ہے وہاں سب مدفون چیزیں باہر آ جاتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: تَلْقَى الْأَرْضُ أَفْلَاحًا كَبِدَها امثال الاسطوان من الذهب والفضة فيجئ القتاتل فيقول في هذا قتلت ويحيى القاطع فيقول في هذا قطع رحى ويحيى السارق فيقول في هذا قطع يد ثم يدعونه فلا يأخذون منه شيئاً (مسلم) ”زمین اپنے جگر کے ٹکڑے نکال دے گی، چاندی اور سونے کے ستونوں کی طرح یہ ٹکڑے ہوں گے، قاتل دیکھ کر کہے گا کہ میں

نے اس کے لیے قتل کا ارتکاب کیا، قطع رحم والے نے اسی کے لیے عزیزوں کو ترک کیا تھا اور اسی کے لیے چور کا ہاتھ کاٹا گیا، پھر ان سے کہا جائے گا کہ لے لو، مگر وہ کچھ بھی نہ لیں گے۔“

ان تمام تغیرات و انقلابات کو دیکھ کر انسان حیران و پریشان ہو گا، وہ کہے گا کہ میرے آرام کی جگہ تو فنا ہو گئی اب میں کہاں جاؤں اور یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔

### حکم خداوندی

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۚ

”اس روز وہ اپنے حالات بیان کر دے گی، کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہو گا۔“

یہ تمام کائنات ارضی و سماوی تو صرف انسان ہی کے لیے ہے، جب یہی نہ رہا جس کے لیے ہر چیز کی تخلیق عمل میں آئی تھی تو اب ان تمام چیزوں کا رشتہ بھی اس سے ٹوٹ جائے گا اور ایک روحانی قوت کے اثر سے ان میں سے ہر چیز کے اندر قوت گویائی پیدا کر دی جائے گی، زمین کو بھی یہ قوت نوازش ہوگی اور اس الہام ربانی کی بدولت وہ ان تمام اعمال کو بیان کر دے گی جو اس کی پشت پر ابن آدم نے کیے ہیں۔

### مختلف گروہ

يَوْمَئِذٍ يَصُدُّ النَّاسُ أَسْتَاتًا لِّيُمْدَا أَعْمَالَهُمْ ۚ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۚ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۚ

”اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں، تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

دنیا میں انسانوں کے باہمی تعلقات شعوب و قبائل اور خاندانوں کے اعتبار سے تھے مگر مرنے کے بعد یہ نظام جاتا رہے گا اور اس کی جگہ تعلقات کی نئی صورت قائم ہوگی، اس وقت باہمی ربط و تعلق کا ذریعہ انسان کے اعمال اور اخلاق ہوں گے، درمیان میں سے زمانہ کا سوال اٹھا دیا جائے گا اور اغراض و مقاصد کے اعتبار سے لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، لا انساب بینہم یومئذ ولا یتساءلون۔

انسانی اعمال کا ادنیٰ ترین حصہ بھی ضائع نہیں جاتا، اس لیے قیامت کے روز ہر شخص اپنی نیکی اور بدی بلا کم و کاست دیکھ لے گا، اس کے بعد فیصلہ ہو گا جس کا تذکرہ سورہ قارعہ میں ہے۔

## العادیات

(آیات ۱۱)

### تلخیص مضامین

ابتدائی پانچ آیات میں گھوڑے کی مختلف حالتوں سے استدلال کر کے بتایا کہ انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا، آیت ۸ میں اس ناشکر گزاری کے اسباب پر بحث کی اور آخر میں تذکیر بہا بعد الموت سے انسان کو توجہ دلائی کہ وہ اپنی اصلاح کر لے۔

## ان الانسان لربہ لکنود

### گھوڑوں کی شہادت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالْعَدِیَّتِ صَبَحًا ۝ فَالْمُؤْرِیَّتِ قَدَحًا ۝ فَالْمُغِیْرَتِ صُبْحًا ۝ فَالْفَائِزَتِ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَنَعًا ۝

”ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں، پھر پتھروں پر نعل مار کر آگ نکالتے ہیں، پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں، پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں، پھر اس وقت دشمن کی فوج میں جاگتے ہیں۔“

عادیات جمع ہے عادیۃ کی، یہ عدو سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوڑنے کے ہیں، صبحا، وہ آواز جو دوڑتے وقت گھوڑے کے منہ سے نکلتی ہے جسے ہا پینا کہتے ہیں۔ موریات جمع ہے موریۃ کی اور اس کی اصل ایاء ہے، آگ نکالنا، قدحا، آگ نکالنے کے لیے مارنا۔ مغیرات جمع ہے مغیرۃ کی، دشمن کو قتل کرنے یا اس کا مال لوٹنے کی غرض سے اس پر حملہ کرنا۔ اشارۃ ماخوذ ہے، اشارت سے غبار کو حرکت دینا اور اڑانا، نقعا غبار کو کہتے ہیں۔ فوسطن، دشمن کی فوج میں جاگتے ہیں۔

قرآن کے اولین مخاطب عرب ہی تھے، ان ہی کی زبان میں یہ نازل ہوا اور ان ہی کی رسوم و عوائد پر اس نے عمیق ترین نظر ڈالی، اگرچہ دنیا میں ہر جگہ گھوڑے کو عزیز رکھتے ہیں، مگر ایک عرب کے نزدیک یہ جانور عزیز ترین ہے، یہی اس کی جائداد اور یہی اس کی اولاد ہے، اس لیے کہ عرب فطرۃً آزاد اور شاہ سوار پیدا ہوا ہے، زندگی کے ہر لمحہ میں وہ اس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے، وہ جب اس پر سوار ہوتا ہے تو گھوڑے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے مالک کی اطاعت و

فرمانبرداری میں اس قدر تیز بھاگتا ہے کہ دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگتا ہے، یہاں تک کہ پتھروں سے آگ نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔

تمام دنیا آرام میں ہوتی ہے، پرندے اپنے آشیانوں ہی میں ہوتے ہیں، مگر صرف یہ ایک وفادار و اطاعت شعار حیوان ہے جو اپنے مالک کی خوشنودی مزاج اور حق خدمت گذاری ادا کرنے کے لیے اپنے آرام اور راحت کو ترک کرتا اور عین صبح کے وقت دشمن پر حملہ آور ہوتا ہے، سوار کے اشاروں پر کبھی ایک طرف دشمن کی صف کو الٹ دیتا ہے اور کبھی دوسری جانب کثرت غبار کی وجہ سے زمین و آسمان کو ایک کر دیتا ہے۔

وہ جانتا ہے کہ موت سامنے کھڑی ہے، مگر اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے مالک نے عین شدت بھوک و پیاس میں دانہ اور پانی دیا ہے، اس لیے میری سب سے بڑی سعادت و نیک بختی یہی ہے کہ اپنے مالک کا ہر حکم مانوں، اس لیے وہ عین اس وقت دشمن کی فوج میں گھس جاتا ہے جب تلواریں ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں کہ اگر دم نکلے تو مالک کی وفاداری ہی میں نکلے۔

## انسان کی ناشکری

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝

”کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان ناشناس اور ناشکر ہے اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔“

تم گھوڑے کی ایک ایک وفا شعاری پر غور کرو، اس کے مالک نے جسم و جان عطا نہیں کی، اس نے چند سکوں کے عوض میں اسے خریدا ہے، اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے دانہ اور پانی دیا ہے، مگر اس تھوڑے سے احسان کے عوض تم دیکھو کہ وہ حیوان لایعقل اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔

یہ تو ایک حیوان کا حال تھا، اب تم انسان کو دیکھو جو اشرف المخلوقات ہے، جس کے پاس جو کچھ ہے خدائے قدوس کی بخشش ہے، تم گھوڑے کی قربانی اور انسان کے اعمال کا مقابلہ کرو تو خود بخود پکاراٹھو گے کہ فرزند آدم خدا کا بڑا ہی ناشکر گذار ہے۔ یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ صرف گھاس اور پانی دے کر تم تو گھوڑے سے اتنا کام لو کہ اس کی جان تک نکل جائے اور تم خالق ارض و سما، کا ذرہ برابر بھی شکر ادا نہ کر سکو جس نے تمہیں ہر چیز نوازش فرمائی ہے۔

ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے جرائم کی عذر خواہی کر سکتا ہے اور اپنے معاصی کو چھپا سکتا ہے، مگر جب وہ سب سے الگ ہو کر اپنے گریبان میں منہ ڈالتا ہے، خدا کی نعمتوں اور اپنی سرکشی کو دیکھتا ہے تو پکاراٹھتا ہے کہ واقعی میں خدا کا سخت ناشکر گذار ہوں: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ (القلمہ ۱۳ تا ۱۵) ”بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے اگرچہ عذر و معذرت کرتا۔“ ایک جگہ فرمایا: قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السِّنَّ وَ الْآبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (الملک ۲۳) ”وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے مگر تم کم احسان مانتے ہو۔“

انسان اس گھوڑے سے سبق اندوز ہو اور کم از کم اتنی قربانی تو کر دے جتنی یہ جانور کرتا ہے۔ گھوڑے کی سواری کیجیے، تلوار و بندوق کے استعمال سے واقف ہو، جدید ترین آلات حرب میں درخور وافی حاصل ہو اور اسلام و امت مسلمہ کی حفظ و صیانت کے لیے ہر وقت پاد رکاب رہے۔

## مرض کا سبب

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ①

”وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔“

اس آیت میں گزشتہ مرض ناشکر گزاری کا سبب بتایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے جمع مال و دولت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنالیا ہے، اس کے کسب و حصول میں نہ تو وہ کسی قانون کی پروا کرتا ہے اور نہ اخلاق و مروت کی، وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے روپیہ سمیٹتا اور اپنے صندوقوں میں بند رکھنا چاہتا ہے کہ لوگ اسے دولت مند کہیں، اس کی دولت سے نہ اس کے خاندان کو فائدہ پہنچتا ہے نہ ملک و ملت کو، پھر یہ مال کس کام کا۔

خیر سے مال مراد ہے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے، قرآن میں کئی جگہ خیر کا اطلاق دولت ہی پر آیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ (البقرة ۱۸۰) ”تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ مال چھوڑ جائے والا ہو تو وہ وصیت کر جائے۔“ دوسری جگہ آیات: وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ وَمَا تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفِّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (البقرة ۲۷۲) ”تم جو مال خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تم ہی کو ہے اور تم تو جو خرچ کرو گے خدا کی خوشنودی کے لیے کرو گے اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دے دیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہ کیا جائے گا۔“

## غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت میں انسان کی ناشکر گزاری کا سبب اس کا مال و دولت کو جمع کرنا بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ شبہ ہو کہ قرآن حصول دولت کو گناہ قرار دیتا ہے اور اسلام کے نزدیک روپیہ کمانا حرام ہے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن نے آتے ہی سب سے اول رہبانیت کو مٹایا جو صدہا معاصی و جرائم کا ذریعہ بن گئی تھی اور لیس لاکھ انسان الا ماسعی کا اصول قائم کر کے بتا دیا کہ ہر شخص کو اپنی دنیوی و اخروی زندگی کے بقاء و قیام کے لیے خود کو شش کرنی چاہیے، وہ کسی کے لیے بار دوش ثابت نہ ہو۔ سورہ نساء میں فرمایا: وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء ۵) ”دنیا میں قوموں کی زندگی کا اعظم ترین راز اسی دولت میں پنہاں ہے، اس لیے بے عقلوں کو ان کا مال جسے خدا نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا ہے مت دو۔“ آیات مابقی میں مال و دولت پر لفظ خیر کا اطلاق خود اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ شریعت کی نظر میں روپیہ

ایک عمدہ اور خیر و برکت کی چیز ہے، اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ روپیہ خوب کمائے۔  
 البتہ قرآن اس دولت کو غضب الہی اور دخول جہنم کا سبب بھی قرار دیتا ہے جب یہ قوم و ملک اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے صرف نہ کی جائے۔ سورہ توبہ میں آتا ہے: **وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالنِّقْمَةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبِئْسَ مَا كَانُوا يَكْنِزُونَ** (التوبہ ۳۴-۳۵) ”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو، جس دن وہ مال و دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان بخیلوں کی پیشانیاں اور پہلو اور پٹھے داغے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔“

### تذکیر ببا بعد الموت

**أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثَ رَمَاهُ فِي الْقُبُورِ ۖ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۚ إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ** ①

”کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے اور جو بھید دلوں میں ہیں وہ ظاہر کر دیئے جائیں گے، بیشک انکا پروردگار اس روز بھی ان سے خوب واقف ہے۔“

ان آیات میں اس مرض کا علاج بتایا گیا ہے۔ جس انسان کی سرکشی اور تمرد کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مال و دولت کے غرور باطل میں اپنے فرائض انسانیت کو بھی فراموش کر چکا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو تعلق باللہ کا خیال نہیں آتا وہ اپنے انجام اور عاقبت کا پر بھی غور کرے، وہ آج اپنے اعمال و اخلاق کی توجیہ لوگوں کے سامنے کر سکتا ہے، مگر اسے وہ وقت بھی یاد کر لینا چاہیے جس روز اس کے تمام سرا و مجربات عالم آشکارا ہو جائیں گے اور باوجود کمال سعی و کوشش کے وہ ان کو چھپانہ سکے **كَانِيَومِئِذٍ لِّلنَّاسِ ۚ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَافِيَةٌ** ② (الحاقة ۱۸) ”اس روز تم سب لوگوں کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔“

تم دنیا ہی سے اپنی ناشائستہ حرکات چھپاتے تھے، اس لیے اسی کے سامنے تمہارے تمام عیوب ظاہر کر دے جائیں گے، اللہ تو اس وقت بھی تمہارے ہر ایک کام سے واقف ہے، مگر وہ فوراً مواخذہ نہیں کرتا، بلکہ تمہیں مہلت دیتا ہے کہ شاید تم اپنی اصلاح کرو، پس جو شخص مال کی محبت میں اس درجہ منہمک ہے وہ اس کے نتائج پر بھی غور کرے اور اپنی ذمہ داری اور مسؤولیت کو فراموش نہ کرے۔

## القارعة

(آیات، ۱۱)

### تلخیص مضامین

قیامت کی تصویر کھینچ کر بتایا گیا کہ انسانوں کو اس روز دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، فبنہم شقی وسعید، ایک وہ جو اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے جنت کے وارث ہوں گے اور دوسرے وہ جو اپنے فسق و فجور کی پاداش میں جہنم واصل ہوں گے۔

## یوم التغابن

### تباہی عالم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ الْقَارِعَةُ ۝ الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوفِ ۝

”کھڑکھڑانے والی، کھڑکھڑانے والی کیا ہے اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے، وہ قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔“

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام قارعہ ہے، جس کے معنی کھڑکھڑانے والی ہیں، کیونکہ ہر شخص کا دل اس کی دہشت کی وجہ سے دھڑکتا ہو گا۔ فراش، تپنگے کو کہتی ہیں، جو شب کے وقت چراغ کی روشنی پر گرتا اور جل جاتا ہے، وہ اس نور کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور انجام کو معلوم کیے بغیر جہالت کی وجہ سے اس پر گر کر جل جاتا ہے، قیامت کے روز یہی حال انسانوں کا ہو گا، جو اس روز کی ہولناکی اور خوف سے ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں گے اور حیران ہوں گے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ عہن اون کو کہتے ہیں، یہی مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ کی رائے ہے۔ نقش، دھننے کو کہتے ہیں، جب نداف اون کو دھنتا ہے تو اس کے تمام بال ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، اگر معمولی ہوا بھی چلے تو وہ فوراً ہوا میں اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے، قیامت کے روز پہاڑوں کا یہی حال ہو گا، کثرت زلازل کی وجہ سے ان کے اجزاء اس قدر الگ الگ ہو جائیں گے جس طرح اون کے بال۔



ان آیات میں حادثہ قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے، مگر قیامت کے روز یہ کشش اتصال جاتی رہے گی، اس لیے اس دن ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ کر اڑتی پھرتی نظر آئے گی۔

## نتائج اعمال

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاغِبَةٍ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۖ وَمَا أَذْرَاكَ  
مَا هِيَ ۖ نَارُ حَامِيَةٍ ۖ

”تو جس کے اعمال کے وزن بھاری نکلیں گے وہ دل پسند عیش میں ہو گا اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے اس کا مرجع ہادیہ ہے اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ہادیہ کیا چیز ہے، وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔“

اس روز نتائج کی صورت یہ ہوگی کہ تمام اعمال کو وزن کیا جائے گا، دنیا میں انسان نے ہر چیز کے وزن کرنے کے لیے مختلف قسم کے ترازو بنائے ہیں، سردی اور گرمی معلوم کرنے کے آلات اس ترازو سے بالکل مختلف ہیں جو اتناج تولنے کے کام آتی ہے، اس روز جو ترازو ہوگی وہ اخلاق کی ہوگی، اعمال کی غرض اخلاق فاضلہ کا پیدا کرنا اور خبیث جذبات کا دور کرنا ہے، پس اس روز اخلاق کی باٹ میں انسانی اعمال کی جانچ ہوگی، جس شخص کے اخلاق اچھے ہوں گے وہ جنت میں جائے گا، ورنہ اس کے رہنے کی جگہ دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ ہوگی۔



## التکاثر

(آیات، ۸)

### تلخیص مضامین

لوگ ہر چیز کی کثرت کے طالب اور حقیقت سے بالکل بے خبر رہتے ہیں تا آنکہ موت آجاتی ہے۔ کاش وہ جانتے کہ اللہ کے نزدیک کثرت مطلوب نہیں، بلکہ وہ جذبات حقہ جو ان سے پیدا ہوتے ہیں، اگر اس حقیقت سے انسان خبردار ہوتا تو اپنی آنکھوں سے اسی دنیا میں جنت اور دوزخ دیکھ لیتا، مگر وہ غفلت سے کام لے رہا ہے اور ان چیزوں کی پروا نہیں کرتا جو اس حقیقت کی طرف اسے متوجہ کرتی ہیں، لیکن قیامت کے روز اس سے ان ہی چیزوں کی باز پرس ہوگی۔

## حقیقت اعمال

### کثرت طلبی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝

”لوگو تم کو بہت سی طلب نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں جادیکھیں، دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔“

الہاء، کہتے ہیں لہو کی طرف پھرنا اور ایک چیز سے غافل ہو جانا۔ تکاثر کے معنی ہیں کسی چیز کی کثرت پر فخر و مباہات کرنا، عام طور پر لوگ مال، اولاد اور عزت کی وجہ سے اپنے بھائیوں پر فخر کرتے ہیں، اس لے تکاثر ان ہی چیزوں کی کثرت طلبی پر بولا جاتا ہے۔

مفسرین نے تکاثر سے مال و اولاد ہی مراد لی ہے۔ مسلم میں ہے: یقول العبد مالی مالی وانبالہ من مالہ ثلاث، ما اکل فافی اولیس فابلی او تصدق فامضی و ما سوی ذلک فذاہب و تارکہ للناس، ”بندہ تو مال مال پکارتا ہے، حالانکہ اس

کا صرف وہ حصہ ہے جو اس نے کھا کر فنا کر دیا یا کپڑے پہن کر ردی کر دیے یا اللہ کی راہ میں صدقہ دے دیا، اس کے بعد جس قدر بچ گیا وہ دوسرے لوگوں کا حق ہے، حسن بصری نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ مال و اولاد کی کثرت طلبی نے تم کو بالکل غافل کر دیا۔

### حقیقت اعمال

ہمارا خیال یہ ہے کہ تکار کا لفظ عام ہے اور اس میں نہ صرف مال و اولاد ہی شامل ہیں بلکہ اعمال تک داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کے بعض اطلاقات بیان کیے ہیں، مال و اولاد میں بند نہیں کر دیا۔ قرآن کریم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر اعمال پر نہیں بلکہ ان حقائق و جذبات پر ہوتی ہے جو ان اعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ قربانی کے متعلق فرمایا: **يَنَالُ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ وَمِنْكُمْ (الحج ۳۷)** ”خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے۔“ نماز کے متعلق آتا ہے: **ان الصلوة تنها عن الفحشاء والمنكر، روزے کی نسبت فرمایا: يَنَالُهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ ۱۸۳)** ”تم پر روزے فرض کے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔“

غرض ان تصریحات سے یہ ہے کہ شریعت کے پیش نظر اخلاق ہیں نہ اعمال مگر ایہ اخلاق نہیں پیدا ہو سکتے جب تک اعمال نہ ہوں۔ اس لیے شریعت ہر شخص کے لیے چند اعمال کی پابندی لازم کر دیتی ہے اور اس پابندی میں اعلیٰ ترین و ادنیٰ ترین انسان برابر ہوتے ہیں، قانون ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا، البتہ نتائج کے اعتبار سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہو گا۔

مگر دوسری طرف یہ بھی خیال تھا کہ بعض لوگ جہالت کی وجہ سے یہ دعویٰ نہ کر بیٹھیں کہ ان اعمال کی بنا پر شریعت جن جذبات و حقائق کی طالب ہے وہ ہم میں پہلے ہی سے موجود ہیں، اس لیے ہمیں ان اعمال کی پابندی کی ضرورت نہیں تو اس کا سد باب کرنے کے لیے قرآن نے کہا: **اِنَّ اَكْمَرَ مَكْمَ عِنْدَ اللّٰهِ اَتَقَفَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات ۳۹)** ”خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبر دار ہے۔“ پس جب ان حقائق سے اللہ کے سوا اور کوئی خبر دار نہیں تو اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ انسان ان اعمال کی پابندی کرتا رہے، مگر اس کی اصل نظر جذبات و اخلاق پر ہو۔ حدیث میں آیا ہے: **خير العمل ماد او مر عليه صاحبه وان قل، ”بہترین عمل وہ ہے جو اگرچہ تھوڑا ہو مگر بلا ناغہ ہوتا رہے“ کہ اس کا اثر یقیناً اخلاق پر پڑتا ہے۔**

## رجوع الی المقصود

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ ان آیات میں غور کریں، ان کا مطلب بالکل صاف ہے، تم لوگوں پر ہر چیز کی کثرت طلب اس درجہ غالب آگئی ہے کہ اب تم ان حقائق و جذبات سے بالکل غافل ہو گئے ہو جو شریعت کے پیش نظر ہیں اور یہ مرض تم میں اس قدر جاگیر ہو گیا ہے کہ مرتے دم تک اس میں مبتلا رہو گے، تم اس گمان باطل میں ہو کہ محض کثرت ہی تمہیں دنیا و آخرت میں کامیاب کر دے گی، اگرچہ تم میں اخلاق نہ ہوں، مگر یہ خیال بالکل غلط ہے، تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک شدید ترین غلطی تھی۔

اس کی ایک نظیر تمہارے سامنے ہے۔ مہاجرین و انصار ظاہری اشکال و صورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ان کی روح و حقیقت کا بھی خیال رکھتے تھے، اس لیے جلد تر کامیاب و بامراد ہو گئے، مگر ایک جماعت منافقین کی بھی تھی جو ان تمام اعمال صالحہ کی پابند تھی جن کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے، مگر حقیقت سے بالکل دور تھی، اس لیے جلد برباد ہو گئی اور ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار کی مستحق قرار پائی۔

اگر ان مثالوں سے تمہاری چشم بصیرت و انہیں ہوتی تو مرنے کے بعد تم خود دیکھ لو گے کہ اللہ کو کثرت مطلوب نہ تھی۔

## اگر حقیقت پیش نظر رہتی

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَتَّبِعُوا الْبَاقِیْنَ ۝ ثُمَّ لَتَنُودُنَّاهُمْ عَنِ الْيَقِينِ ۝

”دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم الیقین رکھتے تو غفلت نہ کرتے تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے، پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین الیقین آجائے گا۔“

اگر تمہیں قرآن پر یقین و اذعان ہوتا اور رسول اللہ کی تعلیمات کو صحیح سمجھتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ شریعت میں اعمال کی صرف ظاہری صورتوں ہی کا لحاظ نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی نظر ہمیشہ حقیقت و اصلیت پر رہی ہے، اگر تم اپنے اعمال میں اس کا خیال رکھتے تو تمہاری یہ حالت ہوتی کہ دوزخ ان آنکھوں سے دیکھ لیتے اور تمہیں معلوم ہو جاتا کہ عالم آخرت میں حقائق و ارواح کی قدر و قیمت ہے: ان الله لا ينظر الى صوركم و افعالكم ولكن ينظر الى قلوبكم و نیاتکم، ”اللہ تمہاری صورتوں اور عملوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر قلوب و نیات پر ہوتی ہے۔“ اور اگر رسول اللہ ﷺ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی نتائج اعمال کا تمہیں یقین نہ ہو تو یاد رکھو مرنے کے بعد اپنی آنکھوں سے عذاب الہی کا مشاہدہ کر لو گے۔

## نعمت کا مطلب

ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

”پھر اس روز تم سے نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔“

روایات میں آتا ہے کہ ابن مسعود نعمت سے مراد امن و صحت لیتے ہیں، ابن عباس کے نزدیک تندرستی اور کھانے پینے کی ہر چیز ہے، بعض لوگ آنکھ اور کان مراد لیتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ، ابو بکر اور عمر ایک انصاری کے باغ میں گئے، انھوں نے گوشت، کھجوریں اور ٹھنڈا پانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا تم سے ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ نعمت کے مختلف اطلاقات ہیں، حصر مقصود نہیں، نعمت سے مراد قرآن بھی ہے کہ اس سے بڑھ کر نوع انسانی کے لیے خدا کی اور کوئی نعمت ہو سکتی ہے، اس نے ہم پر واضح کر دیا کہ آخرت میں صرف اخلاق کام آئیں گے: الا من لقی اللہ بقلب سلیم، ہم نے قرآن جیسی نعمت کو پس پشت ڈال دیا اور کثرت کی طلب میں حقیقت سے دور جا پڑے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس بھی اس کا مصداق ہو سکتی ہے، آپ ہی کی معرفت فرزند ان آدم کو قرآن ملا، غرض یہ ہے کہ نعمت کا لفظ عام ہے کسی ایک معنی میں حصر کرنے کی ضرورت نہیں۔



## العصر

(آیات ۳)

## تلخیص مضامین

تاریخ کی شہادت پیش کر کے انسان کے خسران و خذلان کو ثابت کیا اور آخری آیت میں فوز و کامرائی ام کے اہم اصول و کلیات بیان کیے۔

## کلید کامرائی

## زمانہ کی شہادت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ ۝

”عصر کی قسم ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔“

ہر انسان اپنی کوشش میں ناکام ہے اور یہ نامرادی دنیا و آخرت، افراد اور امم سب پر حاوی ہے۔ یہ دعویٰ ہے جو اس سورت کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ زمانہ کو دیکھو جب سے زمین و آسمان قائم ہیں اور اس ارض الہی کی پشت پر فرزند آدم آباد ہیں اس وقت سے لے کر آج تک کے حالات کا درس و مطالعہ کرو، ان قوموں کے عروج و زوال کے سوانح و حالات کو گہری نظر سے دیکھو، انکی داستان علو و تسفل اور اق تاریخ میں محفوظ و ثبت ہے، اس کو پڑھو، پس عصر کے معنی تاریخ کے ہوئے اور دونوں آیتوں کا ترجمہ یہ ہوا کہ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔

## طرق تذکیر

قرآن کریم کے پند و موعظت کے تین طریقے ہیں،

(الف)۔ تذکیر بآلاء اللہ: اپنی نعمتیں یاد دلا کر فرائض انسانیت ادا کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے، فاذا کم و آلاء اللہ۔

(ب)۔ تذکیر بایام اللہ: قوموں کے عروج وزوال کو پیش کرنا ذکر ہم بایام اللہ۔

(ج)۔ تذکیر بما بعد الموت: قیامت اور برزخ کے حالات و واقعات سے عبرت پذیر کرنا۔

سورہ عصر میں تذکیر بایام اللہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اسی سے استدلال کر کے قوموں کے عروج وزوال میں غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

## کامیاب لوگ

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَّصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔“  
اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب ہیں:

(۱)۔ ایمان: یہ امن سے ہے جس کے معنی طمانیت کے ہیں: وامنہم من خوف، اللہ کا نام مؤمن ہے، اس لیے کہ جب عاجز بندہ پریشان و مضطرب ہو کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اسے امن و اطمینان قلب نوازش فرماتا ہے، پس کامیابی کی اولین شرط ایمان باللہ ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے احکام کو تسلیم کرتا ہے، اسی کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے اور اس کے در کو چھوڑ کر دوسروں کو جہہ سائی نہیں کرتا۔

(۲)۔ عمل صالح: ایمان کا تعلق محض دل سے ہے بسا اوقات نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود اپنے آپ کو اس کے متعلق دھوکا ہو جاتا ہے، اس لیے شریعت نے اگر ایک طرف زبان سے اقرار پر زور دیا تو دوسری جانب عمل کی طرف توجہ دلائی تاکہ عمل سے اس کے اقرار کی تصدیق ہو، اس لیے ایمان اور عمل صالح دونوں کو ملا کر مومن کی تعریف بنتی ہے۔ اس آیت میں صرف عمل صالح کہا گیا، کسی خاص نیک کام کی تشریح نہ کی، اس لیے کہ انسانی فطرت ہی نیکی اور فرشتگی پر پیدا کی گئی ہے اور اللہ نے اس کو نیکی اور بدی کا رستہ بتا دیا ہے، پس وہ وہی کام کرے گا جو نظام عالم کے لیے مفید ہو۔

(۳)۔ تو اوصیٰ بالحق: یہ چیزیں انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہیں، مگر فرد کچھ نہیں جب تک تمام قوم کو فلاح و کامرانی نصیب نہ ہو، اس لیے محض ایمان باللہ و عمل صالح پر قانع ہو جانا اللہ کی نظر میں کامل شرعی زندگی نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ اس کی زندگی اور موت قوم کے ساتھ وابستہ ہو، زاویہ نشینی اور راہبانہ زندگی شریعت کے نزدیک ناجائز ہے۔ ہر مسلم کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی وصیت کرے، اس لیے کہ استقامت ہی کامیابی کی اصلی کنجی ہے، مگر یہاں پر آکر اس کا قدم رک نہ جائے بلکہ ضروری ہے کہ جس حق پر وہ خود قائم ہے اس کی روشنی تمام عالم میں پھیلا دے اور دنیا کا کوئی گوشہ اسلام کی آواز سے خالی نہ رہے، اس لیے کہ دنیا میں چاروں طرف عقائد میں فساد آچکا ہے، اخلاق برباد ہو گئے ہیں اور لوگوں نے راہ صدق و اخلاص چھوڑ دی ہے، دنیا میں قوموں کی زندگی اپنے مقاصد و اغراض کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ وابستہ ہے، تمہاری کتاب اعلیٰ ترین، تمہارے عقائد افضل

ترین اور تمہارے اصول و کلیات تعلیم عین فطرت انسانی کے مطابق ہیں، پس قرآن کریم کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کی غایۃ الغایات بنا لو اور اس کی دعوت و تبلیغ میں سر یکف کوشش کرو۔

(۴)۔ تو اوصی بالصبر: مگر یاد رہے دعوت و ارشاد کی راہ میں تکالیف و شدائد ہیں، عوائق و موانع ہیں، آلام و مصائب ہیں، قید خانے کی کوٹھری اور آہنی زنجیریں ہیں اور سب سے آخر میں جلاوطنی کی سختیاں اور موت کی گھڑیاں ہیں، پس تم ایک دوسرے کو وصیت کرو کہ وہ ان تمام الم ناک حوادث میں صبر و استقامت سے کام لے، راہ حق سے منہ نہ موڑے اور پہاڑوں کی طرح ثبات قدم و عزم راسخ کا اظہار کرے اللہ کی رحمتیں بھی انہی لوگوں پر نازل ہوتی ہیں جو اس کی راہ میں صبر کے دامن کو نہیں چھوڑتے: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ بِالْحَيَاةِ الْآخِرَةِ أَنْتُمْ تَخَافُونَ ﴿۱۰﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿۱۱﴾ نَزَّلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ ﴿۱۲﴾ (نصرت ۳۰ تا ۳۲) ”جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ، ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور وہاں جس نعمت کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو جو چیز طلب کرو گے تمہارے لیے موجود ہوگی، یہ بخشنے والے رحمان کی طرف سے مہمانی ہے۔“

گو یا اس سورت نے کامیابی و کامرانی کے حسب ذیل اصول بتائے ہیں:

(الف)۔ ایمان باللہ۔

(ب)۔ عمل صالح۔

(ج)۔ تواصی بالحق۔

(د)۔ تواصی بالصبر۔

اب اگر تم تاریخ کی ورق گردانی کرو گے اور فلسفہ معراج و زوال اقوام و ملل کا بغور مطالعہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جن قوموں نے ان اصولوں سے اعتصام کیا تھا وہی کامیاب ہوئیں اور دوسری جماعتوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔



## الهزة

(آیات، ۹)

### تلخیص مضامین

جو لوگ اخلاق و اعمال اور قانون شریعت کی پروانہ کر کے ہر جائز و ناجائز طریق سے دولت کماتے ہیں، انہیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ مال ہمیشہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ جہنم کا ایندھن ہو گا اور اپنے ہمراہ انہیں بھی دوزخ میں لے جائے گا۔

## اخلاق اور دولت

### باہمی تصادم

دنیا میں عموماً دو قسم کے آدمی نظر آتے ہیں، ایک تو وہ ہے جو دولت کماتا ہے اور اس کے کسب و حصول میں فضائل اخلاق و محاسن اعمال کو ترک کر دیتا ہے، خدع و فریب اور مکر و زور کی راہ اختیار کرتا ہے، اگر وہ دجل و شیطنت سے کام لیتا ہے تو مال تو اس کے قبضہ میں آجاتا ہے مگر مذہب اور اخلاق سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، مگر اسی کے بالمقابل وہ شریف انسان بھی ہے جو ان حالات میں غربت و افلاس کو ترجیح دیتا ہے مگر اخلاق اور مذہب کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پہلی طرز کے لوگ کسی طرح بھی جنگلی بھیڑیوں اور درندوں سے کم نہیں، اگرچہ ان کی صورتیں انسانوں کی ہیں، مگر حقیقت میں وہ بہائم اور مجسمہ شیطنت و دجالیت ہیں، تم یورپ کی عیسائی اقوام کو دیکھو وہ دنیا بھر کی فریب کاریاں اور دغا بازی کرتے ہیں کہ زمین کا ایک ٹکڑا مل جائے اور تیل کے چشموں پر کسی دوسرے حق دار کا قبضہ نہ ہو۔ اس سورت میں اسی جماعت کے بعض خصائص و امتیازات بتائے جاتے ہیں اور ان کے انجام پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

### گمان باطل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۚ ۝ الْذِي جَعَلَ مَالًا وَعَدَدًا ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَكَ ۝

”ہر طعن آمیز اشارے کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے، جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہو گا۔“

ہمدہ، لیا گیا ہے ہمد سے، لغت میں توڑنا کہتے ہیں، اس جگہ عیب چینی مراد ہے، کیونکہ اس کا مرتکب لوگوں کی عزت برباد کرتا ہے۔ لہذا، ماخوذ ہے لہز سے، طعن کرنے کو کہتے ہیں۔ عدد کے معنی شمار کرنے اور گننے کے ہیں۔ اخلدہ اور خلدہ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ اس کو ہمیشہ رکھے گا۔

جو لوگ حصول دولت کو اپنی زندگی کی انتہائی غرض بناتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ تمام اخلاق کریمانہ سے بعد و ہجر اختیار کر لیتے ہیں اور ان ارباب صدق و اخلاص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو دولت کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کرتے۔ ان پر آوازے کتے ہیں، ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ہمیشہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں عزت تو صرف اس شخص کی ہے جو مالدار ہو، یہ بد بخت دولت کی محبت میں سرشار ہیں، اس کو گن گن کر رکھے ہیں اور اس گمان باطل میں ہیں کہ دولت کی فراوانی اور مال کی کثرت ان سے فرشتہ اجل کو دور کر دے گی۔ مگر ان سے کوئی جا کر کہہ دے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ بیشک کے سامان نہیں، بلکہ تباہی اور بربادی کی تیاریاں ہیں، اس خدع و فریب کا نتیجہ ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ آج یورپ کی سفید رنگ عیسائی اقوام کی یہی کیفیت ہے، وہ مسلمانوں کو فنا کرنے کی تجویز میں ہیں اور آئے دن ان کے نقائص و ذمائم اخبارات و تصانیف کے ذریعے دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک پہنچا دیتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنی چشم بصیرت واکریں، قرآن کے درس و مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوں اور کوئی حکم اجتماعی انہیں قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بتا دے۔

نتیجہ

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْافِيدَةِ ۝ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُمِدَّدَةٍ ۝

”ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے، وہ خاکی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چالپنے لگی اور وہ اس میں بند کر دیئے جائیں گے یعنی آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں۔“

دبند کے معنی پھینکنے اور ڈال دینے کے ہیں۔ حطمہ دوزخ کا نام ہے اور اس کے لغوی معنی کسی چیز کے ٹکڑا ٹکڑا کر دینے کے ہیں، دوزخ بھی ہر اس چیز کو چور اچور کر دے گی جو اس میں ڈالی جائے گی، اس لیے دوزخ کو بھی حطمہ کہتے ہیں۔ تطلّع ماخوذ ہے طلوع سے، اس کے معنی بلند ہونے کے ہیں۔ موصدہ یعنی مطبقہ، بند کرنا۔ عمد جمع ہے عمود کی، اس کے معنی ستون ہیں۔ گذشتہ آیات میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور قلب چونکہ تمام اخلاق و کمالات، فضائل و رذائل، نیت و مقاصد اور عقائد و یقینات کا مرکز ہے، یہی وجدان کا اصلی موطن ہے اور یہی شعور کی جگہ، اس لیے جہنم کی شعلہ مارنے والی آگ کا اولین حملہ اسی قلب پر ہو گا اور اسکی شدت الہاب و حرارت کی یہ حالت ہے کہ وہ لمبے لمبے ستونوں میں بند ہے، جو ہر طرف سے مسدود ہونے کی وجہ سے اور زیادہ تیز ہو گئی ہے۔

## الفیل

(آیات، ۵)

### تلیخ مضامین

اس سورت میں کمال ایجاز و اختصار کے ساتھ ابرہہ والی یمن کے اس حملہ اور نتیجہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس نے بیت اللہ کے گرانے کی خاطر اس اول بیت وضع للناس پر کیا تھا اور جس حملہ کی وجہ سے اس سال کا نام عام الفیل ہو گیا تھا۔

## شعائر الہیہ

### واقعہ کی تفصیل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۝ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝ وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝  
تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ کَعْصِیْفًا مَّا کُوْنُ ۝

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، کیا ان کا داؤں غلط نہیں کیا، (کیا) اور ان پر جھل کے جھل جانور بھیجے، ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے، تو ان کو ایسا کر دیا جیسا کھایا ہوا بھُس۔“

ابرہہ بن الاسرم، حبشی سردار، مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھا، یمن کے عیسائیوں نے اس کی سرکردگی میں بیت اللہ الجلیل کے توڑنے کی خاطر مکہ پر فوج کشی کی، خانہ کعبہ کے توڑ دینے سے اس کی غرض یہ تھی کہ اس کے ٹوٹ جانے سے اس کا کنیسہ عرب کا مرجع بن جائے گا اور اہل عرب میں عیسوی مذہب کی بآسانی نشر و اشاعت ہو سکے گی۔

قریش میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کے لشکر کا مقابلہ کرتے، اس لیے شہر خالی کر کے باہر چلے گئے۔ جانے سے قبل سردار قریش عبد المطلب بیت اللہ میں گئے اور زنجیر کعبہ کو پکڑ کر یوں گویا ہوئے:

لَا هُمْ اَنْ يَّعْبُدُوْا اِلٰهًا غَيْرَ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَهُوَ يَخْلُقُهُمْ اِذَا يَشَاءُ يَنْفَعُهُمْ اَوْ يَضُرُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

”ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر خالی کر کے جا رہے ہیں، مگر کوئی غم کی بات نہیں ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا

ہے، خداوند! تو بھی اپنے گھر کی حفاظت اور اس کو دشمنوں کی دست برد سے بچالے۔“

وانصر علی آل الصلیب و عابدیہ الیوم آلک!

”صلیب کے پوجنے والے عیسائیوں کے مقابلہ میں تو اپنی آل قریش کی نصرت و اعانت فرما۔“

لا یغلبن صلیبہم و محالہم عد و امحالك!

”اے خدائے کعبہ! دیکھ آج کے دن صلیب پرست تیرے گھر پر قابض نہ ہو جائیں!“

ان کنت تارکهم و کعبتنا فامر مابدالك!

”اگر تیرا یہی منشا ہے کہ یہ عیسائی ہمارے کعبہ پر قبضہ کر لیں تو پھر جو تیرا جی چاہے ارشاد فرما۔“

جب تمام قریش شہر چھوڑ کر باہر خیمہ زن ہوئے تو عبدالمطلب کو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ اونٹ دشمن کے لشکر میں پہنچ گئے ہیں، وہ اس حبشی سردار کے پاس گئے اور ان اونٹوں کا مطالبہ کیا، ابراہہ نے ان کی آمد پر بہت زیادہ ادب و احترام کا لحاظ کیا تھا، مگر اس سوال پر کہنے لگا کہ میں تو آپ کو صاحب دانش و سنیش خیال کرتا تھا، اگر آپ مجھ سے یہ کہتے کہ میں خانہ کعبہ توڑے بغیر چلا جاؤں تو کیا اچھا ہوتا، انھوں نے جواب دیا کہ میں صرف ان اونٹوں کا مالک ہوں، اس لیے مجھے ان کی فکر ہے، خانہ کعبہ کا جو مالک ہے اس کی فکر وہ آپ کرے گا۔ بہر حال مکہ مبارکہ پر ابراہہ نے حملہ بول دیا۔

### قانون تعذیب امم

قرآن کریم میں درس و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک قوم لغی وعدوان کے انتہائی منازل طے کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس امت کو برباد کر دیتا ہے، مگر اس قانون تعذیب امم کو دو تاریخی دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف)۔ ایک دور ابتدا سے شروع ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک انبیاء کرام کے اصحاب و حواریین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، اس لیے مخالفین کے مقابلہ میں انھیں جانے کا حکم نہیں دیا جاتا، بلکہ کائنات ارضی و سماوی کو ان کی ہلاکت و بربادی پر متعین کیا جاتا ہے، کبھی طوفان آتا ہے، کسی وقت آندھی آتی ہے اور کبھی زلزلوں سے ایک مجرم جماعت کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی فرعون اور اسکی قوم ہے۔

(ب)۔ اب رسولوں کے اتباع و متبعین کی تعداد کافی ہونے لگی، اس لیے قانون یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے دشمنوں کو ذلیل کر دیا جائے، لیکن اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں کہ اب خدا ہماری اس تقسیم کا پابند رہے گا، بلکہ وہ ذوالعرش المجید اور فعال لمایید ہے، جس طریق پر چاہے ایک قوم کو برباد کر سکتا ہے۔

لارڈ کچز اپنے آپ کو فرعون مصر کہا کرتا تھا، اس لیے وہ ٹھیک اپنے پیش رو کی طرح غرق بھی ہوا۔ یمن کے عیسائی آگے بڑھے کہ بیت اللہ کو توڑیں، قریش عاجز و درماندہ تھے، دنیا میں اور کوئی طاقت نہ تھی جو اس اول بیت وضع للناس

کی حفظ و نگہداشت میں اپنا خون بہا دیتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قانون تعذیب ام کی شق اول کے مطابق چڑیوں کو بھیجا، ابرہہ کو اپنے عظیم الجثہ ہاتھیوں پر فخر و ناز تھا، اس لیے خدا نے بھی ایک حقیر ترین پرندے کو اس متکبر لشکر کے برباد کرنے کے واسطے جن لیا، وہ چڑیاں اصحاب فیل پر کنکریاں گراتی تھیں اور جس پر کنکری گرتی تھی وہ چچک کے مرض میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ عرب میں سب سے پہلے چچک کا ظہور اسی واقعہ سے ہوا، ٹھیک اسی زمانہ میں علاقہ سویز اور طور سینا میں چچک کا مرض پھیلا ہوا تھا، ممکن ہے کوئی بہت بڑی آندھی چڑیوں کو اس علاقہ سے اڑالے گئی ہو، جو اپنے ساتھ چچک کے جراثیم ان کنکریوں میں لے گئی ہوں تاکہ اللہ کے حکم سے انہیں تباہ و برباد کر دیں۔

یہ ایک عذاب تھا جو ان بد بختوں پر مسلط کر دیا گیا تھا، انہیں یہ بتانا تھا کہ ہم کائنات ارضی و سماوی کی حقیر ترین چیز کو بھی ہلاکت و بربادی کا سبب بنا سکتے ہیں، یہی پانی ہے جو انسانوں کی زندگی کا باعث ہوتا ہے و جو جعلنا من الماء کل شیء حی، مگر اسی سے ہم نے دشمنان نوح کو برباد کر دیا۔ یہی ہوا ہے جس نے قوم عاد کو نیست و نابود کر دیا۔ پس خدا کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ جس سے چاہے تباہی کا کام لے لے۔ نو ما یعلم جنود ربک الاہو۔

غرض اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام حملہ آور عیسائی برباد ہو گئے، انھیں اپنے مقاصد میں ناکامی اور خسران نصیب ہوا اور ان کا خود گرجا بھی جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

## تشریح الفاظ

کید کی پوری تفصیل سورہ آل عمران میں گذر چکی ہے، اس کی طرف رجوع کیجئے، یہاں بری تدبیر مراد ہے۔ تضلیل کے معنی ضائع کرنے اور تدبیر میں ناکام رہنے کے ہیں۔ ابابیل کے معنی گروہ، جماعتیں اور فرقے ہیں، اس کا اطلاق جانوروں اور پرندوں پر ہوتا ہے۔ سحیل یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہے، جسے سنگ گل یعنی کنکر کہتے ہیں۔ صصف، برگ کشت۔ ماکول جس کو جانوروں نے کھا لیا ہو اور باقی کو ردی سمجھ کو زمین پر پھینک دیا یا پاؤں تلے روند ڈالا۔

## ضروری تشریح

اس قدر تشریح کے بعد اب زیادہ تفسیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصحاب فیل کا حملہ مشہور ترین قصہ ہے، جس کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ عرب کے نزدیک تو یہ واقعہ اس درجہ اہمیت رکھتا تھا کہ انھوں نے اپنا سال ہی اس سے شروع کیا اور اس کا نام عام الفیل رکھا اور سب سے عجب بات یہ ہوئی کہ اس حادثہ کے دو ایک ماہ بعد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی جیسا کہ تمام معتبر روایات سے ثابت ہے۔

## نتائج و عبر

یہ ایک واقعہ تھا جو ہو گیا، مگر قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں جو اس قصہ کی حکایت کرتی، بلکہ اس کے بیان سے غرض عبرت و بصیرت ہے اور اس سے حسب ذیل نتائج و عبر کا استخراج و استنباط ہوتا ہے:

(۱)۔ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا، ان کو اپنی یادگار قرار دیتا اور ان کی حفظ و نگہداشت اپنے اوپر لیتا ہے، وہ شعائر الہیہ یہ ہیں:

(الف)۔ قرآن: اس کی نسبت فرمایا: **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** (الحجر ۹) ”بیشک یہ کتاب نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔“

(ب)۔ محمد ﷺ: آپ اللہ کے رسول ہیں، قرآن میں آتا ہے: **وَاللَّهُ يَعْصِيكَ مِنَ النَّاسِ** (المائدہ ۶۷) ”اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔“

(ج)۔ نماز: اس کو کفر و اسلام میں مابہ الامتياز چیز قرار دیا گیا، قرآن نے اکثر مقامات میں اس کو ایمان کے ساتھ ذکر کر کے بتا دیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اس کا پڑھنا ہر مسلمان پر لازم کر دیا اور آج بلاشبہ جس طریق پر نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ ادا کیا کرتے تھے، یہی اس کی حفظ و نگہداشت ہے۔

(د)۔ بیت اللہ: اس کا نام ہی اپنی نسبت کو ظاہر کر رہا ہے، ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے آج تک اس کا حج ہوتا ہے، اس کی حفاظت کی یہ صورت کر دی: **وَمَنْ يُؤْذِ فِيهِ بِالْحَادِ بِظُلْمٍ لَّنُكَرُهُ مِنْ عَذَابِ آلَيْنَا** (الحج ۲۵) ”اور جو اس میں شرارت سے کج روی و کفر کرنا چاہے اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔“

سورہ فیل نے اس حقیقت پر مہر لگا دی کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور وہی اسی کا نگران کار ہے، قریش اگر ناقابل تھے تو خدا نے اس کی حفاظت کے دوسرے سامان پیدا کر دیے اور وہ اب بھی ایسا کر سکتا ہے، مگر فرزند ان اسلام کو چاہیے کہ اس سعادت کبریٰ کو وہ خود حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک ارض حجاز کو تمام غیر مسلم اقوام کے اثر و نفوذ اور بالادستی سے پاک و صاف نہ کر لیں، اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو وہ اس زعم باطل میں نہ رہیں کہ ہمارے انحراف و اجتناب سے کعبہ کی نگرانی بھی نہ ہوگی، یاد رکھو وہ خدائے قہار تمہاری اعانت سے بالکل بے نیاز ہے، بلکہ تم ہی اس کے محتاج ہو، وہ اس کی حفظ و صیانت کے لیے دوسری قوتوں سے بھی کام لے سکتا ہے: **وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَبِيرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ** (الحج ۳۰) ”اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں، عظمت رکھے تو یہ پروردگار کے نزدیک اس کے حق میں بہتر ہے۔“ اس کے بعد فرمایا: **وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ** (الحج ۳۲) ”اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں، عظمت رکھے تو یہ فعل ان کی پرہیزگاری میں سے ہے۔“

## عیسائی اور مسلمان

(۲)۔ ابرہہ نے ۵۷۱ء میں مکہ پر فوج کشی کی، اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، واقعہ فیل دراصل آپ کے لیے پیش خیمہ تھا، باوجودیکہ قریش مشرک تھے اور حملہ آور عیسائی، مگر پھر بھی خدا نے ان صلیب پرستوں کو ذلیل کیا، یہ ایک ایسی فتح مبین تھی جس میں انسانی ہاتھ کو مطلق دخل نہ تھا، غرض یہ تھی کہ خانہ کعبہ اور مکہ کی بزرگی مسلم ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی بابرکت ولادت کا مقصد یہ تھا کہ آپ ایک جدید امت مسلمہ کی بنیاد ڈالیں جو عالمگیر برادری قائم کرے، تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لے آئے اور بیت اللہ اس کی تمام سعی و کوشش کا مرکز ہو، لیکن عین آپ کے ظہور قدسی سے چند ماہ قبل ایک عیسائی بادشاہ اس بیت اللہ الجلیل کو توڑنے کی فکر کرتا ہے، اس توافق حالات سے لطیف طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ دنیا میں اس اقل بیت وضع للناس کے شدید ترین دشمن یہی عیسائی ہوں گے، وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہیں گے کہ بیت اللہ کو تباہ و برباد کر دیں، ارض حجاز پر قبضہ کر لیں، اس مرکز کو ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو عیسائی بنالیں، ورنہ ان کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔

تاریخ اپنے پورے تسلسل کے ساتھ ہمارے اس نتیجہ کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے اور آج کل کے واقعات تو کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں، حسین کا جو انجام ہوا وہ سب پر ظاہر ہے۔

## القریش

### چار آیات

تمہید

قریش کو تجارت کا شوق تھا اور وہ سردی اور گرمی میں یمن اور شام کی طرف تجارت کے قافلے لے کر جاتے اور مالا مال ہو کر واپس لوٹتے، انھیں دشمن کا خوف نہ تھا اور ان کی ضروریات زندگی بھی سب کی سب پوری ہو جاتیں، اس لیے انھیں چاہیے کہ اسی ایک خدا کی عبادت کریں جس نے ان پر یہ نعمتیں نازل کیں اور اصنام و طواغیت کے آگے سر بسجود نہ ہوں۔

### صوفیائے کرام و علمائے عظام

### شوق تجارت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۝ الْفَهْمُ رِحْلَةُ الْيَسْتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۝  
الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝

”قریش کے مانوس کرنے کے سبب یعنی ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب لوگوں کو چاہیے کہ اس نعمت کے شکر میں اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔“

(الف)۔ الف، الا ف اور ایلاف، تینوں کے معنی ہیں الفت دلانا، دوسرا ایلاف پہلے سے بدل واقع ہوا ہے۔ رحلۃ کے معنی کوچ کرنے کے ہیں اور یہ ارتحال کا اسم ہے۔

قریش اس قبیلہ کا نام ہے جس میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے، یہ لوگ بیت اللہ کے مجاور اور خادم تھے، اس جا رب کشی کا یہ اثر تھا کہ تمام قبائل عرب اور دور و دراز کے لوگ ان کی عزت و تکریم کرتے، ملک میں سب طرف لوٹ مار رہتی، مگر بیت اللہ کے ادب و احترام کی وجہ سے مکہ مبارکہ میں برابر امن و امان رہتا۔ یہ لوگ سردی میں یمن کی طرف اور گرمی میں شام کی جانب تجارت کی غرض سے سفر کرتے، اللہ کے پاک گھر کی ہمسائیگی کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی ان کا مزاحم نہ ہوتا، بلکہ سب ان کا اکرام و احترام کرتے، ان کی خدمت میں نذر و ہدا یا پیش کرتے اور انجام کار اپنی تجارت میں شاد کام و بامراد ہو کر



اپنے گھروں کو واپس لوٹتے۔

اس سورت میں ان نعمتوں کو یاد دلانا قریش سے یہ کہا گیا کہ تمہاری عزت لوگوں کے دلوں میں صرف اس لیے ہے کہ تم بیت اللہ کے مجاور اور خادم ہو، ورنہ سرزمین عرب میں اور بھی قبائل ہیں مگر انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں، پس جب تمہاری یہ عزت و تکریم محض بیت اللہ کے خدمت گزار ہونے کی وجہ سے ہے اور اس کی ہمسائیگی کی بدولت کسی کو تم پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تو شرط انصاف یہی ہے کہ جس گھر کی بدولت تمہیں یہ سب کچھ حاصل ہے اسی کے مالک کی غلامی کرو اور اسی ایک اللہ کے آگے خمیدہ گردن ہو جاؤ۔

بصائر و حکم

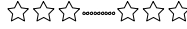
اس سورہ مبارکہ میں عبرتوں اور بصیرتوں کے مخفی خزانے ہیں، اگر دیدہ عبرت سے اس کا درس و مطالعہ کیا جائے تو اس سے حسب ذیل حکمتوں کا استنباط و استخراج ہوتا ہے:

(۱)۔ دنیائے اسلام آج بھی اہل عرب کی وہی عزت و تکریم کرتی ہے جو اہل عرب قریش کی کیا کرتے تھے، عربوں کے اکرام و احترام کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے گھر کے مجاور، رسول اللہ کی مسجد کے جارب کش اور اس سرزمین کے رہنے والے ہیں جہاں سرور عالم خداہ اپنی وامی جلوہ افروز ہوئے، پس جب ان کے ادب و احترام کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں تو ان کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ سرزمین عرب کو غیر مسلم اقوام کے ناپاک اثرات سے بالکل صاف کر دیں، اس بقعہ مبارکہ کو صرف فرزند ان اسلام ہی کے لیے مخصوص کر دیں، بیت اللہ کو اصلی معنی میں حراماً منأبنا دیں، کسی غیر مسلم طاقت سے نہ سر اُٹھائے کوئی وظیفہ طلب کریں نہ کسی یورپین حکومت کی بالادستی قبول کریں اور نہ غیر اللہ سے خوف زدہ ہوں، اس لیے کہ جس خدا نے قریش کو اطعمہم من جوع و امنہم من خوف سے سرفراز کیا تھا وہ اللہ آج بھی زندہ ہے، غیر مسلم اقوام کے خوف سے بھی ان کو محفوظ و مصون کر دے گا اور اسی گھر میں بیٹھے بیٹھے تمام دنیا کی دولت ان کے پاؤں پر نثار دے گا: وکان وعدا مفعولاً۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دونوں چیزوں کی بشارت دیتا ہے یعنی دشمنوں سے محفوظ رکھے گا اور ان کو معیشت کی فکر سے بے نیاز کر دے گا، جو اپنی زندگی خدائے قدوس کے گھر کی حفظ و صیانت میں لگا دیں گے، خدا کا وعدہ سچا ہے، اس پر اعتماد کر کے دیکھو، من اصدق من اللہ قیلاً، ”اللہ سے بڑھ کر سچ بولنے والا اور اپنی بات کا پکا کون ہے۔“

(۲)۔ دنیائے اسلام میں ہر جگہ علمائے کرام و صوفیائے عظام کو بہت زیادہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تمام مسلمان بلا استثناء ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں، ان کے ادب و اکرام کا اگر کوئی سبب ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے کلام کو لوگوں کے پاس پہنچاتے ہیں، اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اور اسی کی طرف سب کو بلاتے ہیں، اگرچہ اس وقت ان میں سے اکثر اپنے فرائض کو فراموش کر چکے ہیں اور راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر کتاب

وسنت کے ساتھ انہیں جو نسبت ظاہری حاصل ہے تمام دنیا ان کے ادب و احترام کو اب بھی برابر ملحوظ رکھتی ہے۔ پس جب ان دونوں گروہوں کی عزت اسی وجہ سے ہو رہی ہے تو انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ اللہ کی غلامی اور عبودیت کا جو اپنی گردن سے اتا کر غیروں کا طوق لعنت اس میں ڈال لیں، اپنی ابلیسانہ کارروائیوں سے غیر مسلم اقوام کو بلاد و امصار اسلامی پر قبضہ کرنے میں مدد کریں اور جب ہلال کی جگہ صلیب لہرانے لگے تو درباروں میں حاضر ہو کر اپنے عیسائی حکمرانوں کی خدمت میں تبریک و تہنیت پیش کریں، جیسا کہ بد بختانہ وہ اب تک کرتے رہے ہیں، الا ماشاء اللہ وقلیل ماہم۔



## الباعون

### سات آیات

تمہید

اس سورت میں قوموں کی تباہی و بربادی کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب پر بحث کی گئی ہے اور وہ بخل و امساک ہے۔ قول اور عمل میں باہمی تطابق ضروری ہے اور آخر میں ان لوگوں کو دھمکی دی ہے جو باوجود نماز کے پابند ہونے کے ذرا ذرا سی بات میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

## مالی قربانی

### زبانی دعویٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَرَعَيْتَ الَّذِیْ یُكَدِّبُ بِالذِّیْنِ ۝ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْا اِلَیْهِمْ ۝ وَلَا یَحْضُ عَلٰی طَعَامِ الْمُسْكِیْنِ ۝

”بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی بد بخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔“

قوموں کی تباہی و بربادی کے اصول و کلیات تو بہت ہیں، مگر دو چیزیں ایسی ہیں جو ان سب کی اصل و اساس ہیں، جب کسی قوم کے افراد اپنی ضرورتوں کو مقدم کر دیں، اپنے ذاتی نفع و ضرر کو ترجیح دیں اور قوم کی پروا نہ کریں تو اس جماعت کا زندہ رہنا غیر ممکن ہو جاتا ہے، کوئی جماعت ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے پاس روپیہ نہ ہو اور جب ارکان ملت ہی بخل و امساک پر کمر باندھ لیں تو دوسرا کون ان کی امداد کرے گا۔

اقوام و ملل کی تباہی اسی مال کی محبت سے شروع ہوتی ہے۔ ایک شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ جزائے اعمال یقینی ہے، میری ہر سعی و کوشش کا نتیجہ قومی نشو و نما ہے اور اس کا دائمی ثمرہ مرنے کے بعد ملے گا، مگر اس کے اعمال اس دعویٰ کے بخط مستقیم مخالف ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ قوموں کی حیات مساکین و یتامیٰ کی تربیت کے ساتھ وابستہ ہے، اگر ان افراد کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کیا جائے گا تو یہ قوم کے لیے بار دوش ثابت ہوں گے اور غیر مذاہب کے لوگ انھیں

اپنی طرف لے جائیں گے، مگر باوجود اس کے اس کی حالت یہ ہے کہ نہ صرف ان کی حفظ و نگہداشت سے انکار کرتا ہے، بلکہ اس کے مصالح خصوصی اور ذاتی اغراض اس پر اس درجہ غالب آگئے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کی امداد و اعانت پر نہیں ابھار سکتا۔

جس شخص کے یہ اعمال ہوں تو کیا کوئی عقل مند انسان بھی اس کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ جزائے اعمال کا اقرار کرتا ہے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے، ہر گز نہیں، بلکہ یہ بد بخت اپنے عمل سوء سے اپنے دعویٰ کی آپ تکذیب کر رہا ہے، پھر جس قوم میں اس قسم کے افراد کی کثرت ہو اس کے زندہ رہنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

### حقیقت نماز سے غفلت

قَوْلُ الْمُتَصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرْءَوْنَ ۝ وَيَتَنَعَوْنَ الْمَاعُونَ ۝

”تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے۔“

بھلا ان لوگوں کی نمازیں کس کام کی؟ نماز کی غرض تو یہ تھی کہ انسان ہر قسم کی بد اخلاقی اور خلاف مروت و دیانت باتوں سے پرہیز کرے، اس سے بڑھ کر اور کیا بد اخلاقی ہو سکتی ہے کہ ہمارا ایک بھائی بھوک کے مارے تڑپ رہا ہے، مگر ہم ہیں کہ ٹس سے مس بھی نہیں ہوتے، اس کو بھوکا مرنے دیتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی سے اس کو کچھ دلوادیں۔ نماز میں سر بسجود ہونے کا مقصد یہ تھا کہ میں رضائے الہی حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی تک مٹانے کو تیار ہوں۔ اگر یہ جذبہ صادق ہو تو بندگان خدا کی خدمت کو اپنا فخر خیال کرے، لیکن جب مخلوق خدا کی دل آزاری کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ نماز ریاکاری کی پڑھ رہا ہے۔

### ماعون

ایک یتیم اور مسکین کی امداد تو بڑی بات ہے، اس میں تو بخل کا مرض اتنا ترقی کر گیا ہے کہ معمولی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی دوسرے کو عاریتہ نہیں دے سکتا۔

ماعون کے متعلق احادیث میں مختلف چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان روایات کی بنا پر مفسرین کرام کے اقوال میں بھی بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، لیکن دراصل ان میں کوئی اختلاف نہیں، اس لیے کہ یہ لفظ عام ہے اور تمام چیزیں اس کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ غرض ان سب کی یہی ہے کہ جو شخص ان حقیر و ادنیٰ چیزوں میں بھی ایثار و فدویت سے کام نہیں لے سکتا اور اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس سے کسی بڑی قربانی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ قوموں کی تباہی اس مرض بخل ہی سے شروع ہوتی ہے، پس مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس خبیث مرض سے بچنے کی کوشش کریں اور ملک و ملت اسلام کے نام پر اپنی دولت لٹانے کو تیار ہو جائیں کہ اس کے بغیر نہ تو کلمۃ اللہ بند و برتر ہو سکتا ہے اور نہ بلاد اسلام کو مکمل آزادی مل سکتی ہے۔

## الکوثر

### تین آیات

تمہید

ان تین آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے، اس کی نشر و اشاعت کرو اور جانی قربانی کے لیے تیار ہو، اس کے بعد تمہارے دشمنوں کا تباہ و برباد ہو جانا قطعی اور یقینی ہے۔

## حیات ملی

### کوثر کا مطلب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِنَّا اَعْطٰیْنٰكَ الْکُوْثَرَ ①

”ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی ہے۔“

لفظ کوثر دراصل کثرت سے فاعل کے وزن پر صیغہ مبالغہ ہے، اس کے معنی میں مفسرین نے شدید اختلاف کیا ہے، اس کی تفسر میں سولہ اقوال بیان کے گئے ہیں، اس کے اصلی معنی خیر کثیر ہی کے ہیں، مگر اختلاف اس میں ہے کہ اس کا صحیح اطلاق کس پر ہوتا ہے، اگر بنظر غور دیکھا جائے تو ہر قوم اپنے مقصود کے اعتبار سے ٹھیک ہے، ہم ان میں سے صرف ایک کو منتخب کرتے ہیں اور وہ قرآن کریم ہے۔

سورہ بقرہ میں آتا ہے تِلْوَی الْحِکْمَةِ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ ۲۶۹) ”وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی۔“ اس آیت میں خیر کثیر کا اطلاق حکمت اور دانائی کی باتوں پر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ قرآن سے بڑھ کر دنیا کے لیے اور کون سی دانائی ہو سکتی ہے: وَ اِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ۚ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَبِیْبٍ ۝ (فصلت ۴۲-۴۱) ”اور یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے، اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے اور دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔“ اس آیت کی بنا پر ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل ترجیح قول یہی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔

مگر ساتھ ہی اس کے ہم اس حدیث کو بھی تسلیم کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حوض کوثر دیا گیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ دونوں اقوال کا مصداق ایک ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔

کتاب و سنت کے درس و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا موطن بھی ہے جہاں معانی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اسے حکماء کی اصطلاح میں عالم مثال کہتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اپنی کتاب حجة اللہ البالغہ، البدور البارغہ اور خیر کثیر میں اس کی تفصیل کی ہے۔ سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے بھی اس کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے، ومن شاء التفصیل فلیدجم ثبہ۔

عالم مثال کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک کتاب ہے جو دنیا کو علم بخشی ہے، اسی کتاب عزیز کی مثالی صورت وہ حوض کوثر ہے جس کی صفات و محضات حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔

## شکر نعمت

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ①

”تو اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔“

اس عظیم و جلیل نعمت، اس خیر کثیر اور اس بصائر للناس قرآن کریم کا شکر یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے نماز پڑھو، اس نماز میں قرآن پر غور کرو، اس کتاب عزیز کی نشر و اشاعت کی تدابیر سوچو اور تمہاری سعی و کوشش یہ ہو کہ اس کی آواز دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جائے: بدغم ما انزل الیک، ”جو قرآن تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کا شکر یہی ہے کہ اسے دوسروں کے پاس پہنچا دو۔“

دوسرے اللہ ہی کے لیے قربانی کرو، تا آنکہ ان صلاقی و نسکی و محیای و مصلاتی اللہ رب العالمین کی حقیقت تم پر طاری ہو جائے، تم ابراہیم کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھو، خدائے قدوس کے قانون کو بلند کرنے کی خاطر وہ اپنی جان، اپنا وطن، اپنی قوم اور اپنے بیٹے کو قربان کر چکے تو انھیں دنیا و آخرت کی امامت و سرفرازی نوازش کی گئی: واذ ابتلی ابراہیم ربہ بکلمات فاتمهن قال انی جاعلک للناس اماما۔ اسی ایثار و فدویت کی بدولت انھیں دین اور دنیا کی برگزیدگی بخشی گئی: ولقد اطفینہ فی الدنیا وامنن فی الاخرۃ لئن الصالحین۔

قربانی کا مقصد محض جانور ذبح کرنا نہیں، بلکہ غرض یہ ہے کہ ذبح کرتے کرتے ہم خود اللہ کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہو جائیں اور کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی اس راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ انسان کی سب سے بڑی سعادت و نیک بخشی یہ ہے کہ وہ کلمۃ اللہ کی بلندی و برتری کے لیے سب کچھ قربان کر دے، اسلام میں قومیت اور وطنیت کوئی چیز نہیں، بلکہ جو کچھ کریں اللہ کے قانون کی نشر و اشاعت اور عالمگیر برادری کے قیام کے لیے کریں۔

## اس کا نتیجہ

إِنَّ شَأْنَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ

”جو تمہارا برا چاہے اسی کا کوئی نام لیوانہ رہے گا۔“

شانی کے معنی مغض کے ہیں اور شنان بغض کو کہتے ہیں۔ ابتر اس جانور کو کہتے ہیں جس کی دم کٹی ہوئی ہو، اس شخص کو بھی ابتر کہا جاتا ہے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کا نام لینے والا نہ ہو، عموماً اولاد ہی سے باپ دادا کا نام باقی رہتا ہے، پس ابتر وہ شخص ہے جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے، اس آیت میں یہی مراد ہے۔

روایات میں آتا ہے جب کبھی عاص بن وائل کے پاس رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا کہ اس کا تو نام ہی نہ لو، اس کے اولاد تک نہیں جو اس کا نام زندہ رکھے، اس کے مرتے ہی یہ تمام جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی۔

اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ بشارت دی گئی کہ آپ کفار کی یہ باتیں سن کر پریشان خاطر نہ ہوں، آپ کے دشمن مٹ جائیں گے اور ان کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ اللہ نے آپ کو ایسی عظیم الشان خیر و برکت دی ہے جس کا سلسلہ ہی منقطع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ بڑھتا ہی جائے گا۔ چنانچہ یہ وعدہ پورا ہو کر رہا، رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک دنیا کے ہر گوشہ اور کونہ میں پہنچا ہوا ہے، مگر کفار و معاندین اس طرح بے نام و نشان ہیں کہ تاریخ کے اور اق بھی ان کے حالات و واقعات سے خالی ہیں۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس سورت میں جو وعدہ دیا گیا ہے وہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات کے لیے مخصوص ہے، بلکہ تمام امت مسلمہ بھی اس میں شریک ہے اور خداوند قدوس آج بھی پکار پکار کر فرزند ان اسلام کو یہ مسرت اندوز بشارت دے رہا ہے کہ اگرچہ دنیا سے عیسائیت تمہارا نام و نشان مٹانے پر متحد ہو چکی ہے اور ہر طرف سے تکلیفوں اور مصیبتوں کی تاریکی نے تمہیں گھیر لیا ہے، مگر یاد رکھو اگر تم فصل لربک وانح کی حقیقت اپنے اوپر طاری کر لو، قرآن کریم کی نشر و اشاعت کے لیے تمام دنیا کو چھان مارو اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ، ایک ایک مسلمان مجسمہ آشیا و فدویت ہو اور جب کبھی اسلام کو ضرورت ہو تو وہ اپنا آخری قطرہ خون تک اس کے حفظ و صیانت میں بہانے کو تیار ہو تو پھر دنیا تمہاری ہے، تمہارا ہی بول بالا ہو گا، تمہارا ہی ذکر خیر ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا اور تمہارے تمام دشمن نیست و نابود ہو جائیں گے، وما ذلک علی اللہ بعز

یز۔

## الکافرون

(آیات ۶)

تمہید

اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم ہوا ہے کہ وہ کفار سے انقطاع تعلقات و روابط کا اعلان ان الفاظ میں کر دیں کہ نہ تو میں اس وقت کفار کے معبودان باطل کی پرستش کر سکتا ہوں اور نہ آئندہ وہ مجھ سے اس قسم کی توقع رکھیں بلکہ اب ان سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لیا گیا ہے۔

## انقطاع تعلقات

ناممکن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۝

”اے پیغمبر! منکران اسلام سے کہہ دو کہ اے کافر! جن بتوں کو تم پوجتے ہو، ان کو میں نہیں پوجتا اور جس خدا کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے۔“

سورہ کوثر میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے اشاعت قرآن اور قربانی کو اپنا نصب العین بنالیا تو ہر جگہ وہی کامیاب رہیں گے اور ان کے مخالفین کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اب اس سورت میں تمام معا ندین اسلام پر یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام میں اتحاد ناممکن ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک سال میں تمہارے معبودان باطل کی پرستش کروں اور دوسرے سال تم میرے خدا کو پوجو۔

جو لوگ عرب کے حالات سے واقف ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ ہر قبیلہ اپنا جدا گانہ بت رکھتا تھا، جب کبھی دو قبیلوں میں اتحاد ہوتا تو وہ اس اتحاد کے حفظ و بقا کے لیے دوسرے قبیلے کے بت کی بھی پرستش شروع کر دیتا، یہی وجہ تھی کہ بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت جمع ہو گئے تھے یعنی باہمی اتحاد و یگانگت کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ایک دوسرے کے خدا کی تعظیم کریں، چنانچہ یہی درخواست کفار قریش نے رسول اللہ سے کی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش نے کہا:



(الف)۔ ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ مکہ میں آپ سے بڑھ کر کوئی دولت مند نہ ہوگا۔

(ب)۔ ہماری لڑکیاں موجود ہیں، ان میں سے جو آپ کو پسند ہو اس سے نکاح کر لیجئے۔

اور اس کے عوض میں آپ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کیجئے اور اگر یہ شرائط بھی منظور نہ ہوں تو پھر ہم یہ عرض کریں گے تعبد الہتنا سنة ونبعد الہک سنة، ”ایک سال تم ہمارے خداؤں کو پوجو اور ایک سال ہم تمہارے معبود کی پرستش کریں گے“۔ اس گفتگو کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورہ کافرون نازل فرمائی۔

جس قدر بت پرست اقوام ہیں، ان میں جو بتوں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس کا یہی سبب ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن میں آتا ہے: وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّن دُونِ اللَّهِ أَوثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّصِيرِينَ۔ (العنکبوت ۲۵) ”اور ابراہیم نے کہا کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو، تو دنیا کی زندگی میں باہم دوستی کے لیے، مگر پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا“۔

پس جب کفار قریش کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں تو نہایت ہی صاف اور غیر مشتبہ الفاظ میں یہ کہہ دیا گیا کہ اس وقت کفر و اسلام کا اتحاد ناممکن ہے۔

### دائمی فیصلہ

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۖ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَّا أَعْبُدُ ۚ

”اور میں پھر کہتا ہوں کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو، ان کی میں پرستش نہیں کروں گا اور نہ تم اس کی بندگی کرو گے جس کی میں بندگی کرتا ہوں“۔

ان آیات میں اس علیحدگی اور انقطاع تعلقات کو اور زیادہ واضح اور روشن الفاظ میں بیان کر دیا کہ جس طرح اس وقت اتحاد باہمی ناممکن ہے اسی طرح تم آئندہ کے لیے بھی یقین کر لو کہ ہم میں اور تم میں اسلاف و یگانگت کی کوئی صورت نہیں اور ہم سے تم اپنی تمام توقعات کو منقطع کر لو۔

ان الفاظ میں نہ صرف برأت اور علیحدگی کا اعلان ہے بلکہ لطیف طریق پر ان کے معبودان باطل کی برائی بھی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس طرح مخاطب کر کے فرمایا تھا: مَا هَذِهِ الشَّيَاطِينُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَابِدُونَ ۖ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ۖ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۖ (الانبیاء: ۵۲-۵۳) ”یہ کیا مورتیں ہیں جن کی پرستش پر تم معترف و قائم ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ ابراہیم نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے“۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورہ شعر آء میں آتا ہے: فَلْيَنْهَمْ عَذُوبَیْهِ الْآرَبُ الْعَلْبِیْنَ (الشعر آء ۷) ”وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدا رب العالمین میرا دوست ہے“۔

## آخری اعلان

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ①

”تم اپنے دین پر اور میں اپنے دین پر۔“

ان الفاظ نے اس فیصلہ پر مہر لگادی اور یہ طے ہو گیا کہ کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ارباب ایمان کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔

## ادوارِ ثلاثہ

ہر نبی اور داعیِ حق کو ان تین منازل میں سے گزرنا پڑتا ہے:

(الف)۔ انداز و تبلیغ: یہ اولین منزل ہے، جب نبی اپنے مقاصد کا اعلان کرتا ہے، اس وقت متلاشیانِ حق تو اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور مخالفین اس سے بغض و عداوت کا اظہار کرتے ہیں: وَ أَفْزِزْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ② وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ③ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنَّي بِرَبِّي مِمَّا تَعْمَلُونَ ④ (الشعر آء: ۲۱۶ تا ۲۱۳) ”اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو اور جو مومن تمہارے پیرو ہو گئے ہیں ان سے بتواضع پیش آؤ، پھر اگر لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال سے بے تعلق ہوں۔“

(ب)۔ ہجرت الی اللہ: جب مخالفت بڑھ جاتی ہے تو اب اسے ترک وطن اور ذہاب الی اللہ کی مقدس منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ یہ ہجرت اگر ایک طرف اربابِ قدس و طہارت کی فتح و کامرانی کی تمہید ہوتی ہے، تو دوسری جانب کفار و معاندین کی تباہی و بربادی کا بھی پیش خیمہ ہوتی ہے اور درمیان کا زمانہ ان کے لیے ایک طرح کی مہلت کا وقت ہوتا ہے، اگر اصلاح کر لیں تو بہتر ہے ورنہ بہت جلد ہلاک ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب لوط علیہ السلام نے اپنے وطن کو ترک کر دیا اور ان کی قوم کے لوگ فسق و فجور ہی میں مبتلا رہے تو فوراً ہلاک بھی کر دیے گئے۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی راہ لی اور کفار اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ابتداء غزوہ بدر میں اور انجام کار فتح مکہ کے روز ان کا نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔

(ج)۔ فتح و کامرانی: ذہاب الی اللہ کے بعد رسول اللہ کی کامیابی ہی کامیابی ہے، فتح و ظفر اس کے ہم رکاب ہوتی ہے اور نصرت بالربیب مسیّدۃ شہر کا ظہور ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب سورہ کافرون میں معاندین اسلام سے انقطاع تعلقات کر لیا گیا تو فوراً بعد سورہ نصر نازل کر کے اہل ایمان کو فوز و فلاح کی بشارت دی اور سورہ تہت میں کفار کی شکست کا اعلان کر دیا۔

## یہ اعلان جنگ ہیں

اس سورت کو بعض لوگوں نے صلح و آشتی پر محمول کیا ہے حال آنکہ ایسا نہیں۔ اول تو اس کا نام ہی ظاہر کر رہا ہے کہ اب رسول کو ان لوگوں کی ہدایت کی امید رکھنا فضول ہے، اس لیے کہ انہوں نے کفر و بت پرستی پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جیسا کہ ہم شان نزول میں بیان کر چکے ہیں اور متکبرین ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ یہی جواب فرعون نے موسیٰ کو دیا تھا: قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا ۚ وَقَالُوا إِنَّا بِكَ لَكِرْهُونَ (القصص ۴۸) ”کہنے لگے کہ دونوں جادو گر ہیں ایک دوسرے کے موافق اور بولے کہ ہم سب سے منکر ہیں۔“ سورہ زخرف میں آتا ہے: وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ (الزخرف ۳) ”اور جب ان کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے۔“ سورہ سبائیں فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَوْمِيهِ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا ۚ إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَآلَادًا ۚ وَمَا نَحْنُ بِبُعْدَ بَيْنٍ ۝ (سبا ۳۳-۳۵) ”اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں اور یہ بھی کہنے لگے کہ ہم بہت سامان اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔“

علاوہ ازیں مفسرین کرام نے اس سورت کے تین نام ذکر کیے ہیں اور تینوں انقطاع تعلقات اور اعلان جنگ کو ظاہر کرتے ہیں:

(۱) المناذہ: سورہ انفال میں کفار کے عہود کے متعلق آتا ہے: وَمَا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ (انفال ۵۸)، لفظ مناذہ کے معنی پھینکنے کے ہیں، گویا اس سورت میں بھی کفار کے عہود و موافقت کو انہی پر پھینک دیا گیا ہے اور ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب ہمیں تم سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) الاخلاص: اس نام کا بھی اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں کہ مسلمانوں اور کافروں کی جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کر دیا جائے۔ نبی اسی تفریق و امتیاز کے لیے آتا ہے کہ کسی قسم کا شک و اشتباہ باقی نہ رہے: وَلِيُمَيِّضَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيُنَاقِضَ الْكَافِرِينَ (ال عمران ۱۴۱)۔

(۳) المقسمۃ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ناپاکی سے قطع تعلق اور طہارت و پاکیزگی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پس یہ تینوں نام اس حقیقت پر مہر لگا دیتے ہیں کہ موضوع سورت کافروں سے انقطاع تعلقات ہے۔

## لکم دینکم ولی دین

جس طرح کہ گذشتہ اسمائے سورت اپنا مطلب آپ واضح کر رہے ہیں اسی طرح سورت کی آخری آیت بھی ہر قسم کے غبار شک و اشتباہ کو دور کر دیتی ہے اور یہ الفاظ بالکل ایسے ہی واقع ہوئے ہیں جیسے سورہ یونس میں فرمایا گیا ہے: وَإِنْ

كَذَّبُواكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيْعُونَ مِمَّا آعَمَلُوا وَآنَا بِرِيْعٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (یونس ۴۱) ”اور اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے اعمال کا، تم میرے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں کا جواب دہ نہیں ہوں۔“ ایسے ہی حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو مخاطب کیا تھا: اِنِّیْ بِرَءٍ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنیْ فَآئِئْهُ سَیْهِدِیْنِ ﴿۷۱﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَآئِیَةً فِیْ عَقِبِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ (الزخرف ۲۶ تا ۲۸) ”جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں، ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

پس اس سورت کا موضوع اور مضمون انقطاع تعلقات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔



## النصر

(آیات ۳)

تمہید

اس میں فتح مکہ، مسلمانوں کی نصرت و کامرانی اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کا اعلان کیا گیا ہے۔

## فوز و ظفر کا اعلان

## نصرت الہیہ کا اظہار

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

”جب خدا کی مدد آپہنچی اور فتح حاصل ہوئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اسی سے مغفرت مانگو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔“

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے قبائل عرب میں اسلام پھیلانے کی سعی و کوشش شروع کی تو عام طور پر لوگوں نے آپ کی طرف توجہ نہ کی بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ اس وقت ان لوگوں سے برسرِ پیکار ہیں جو اشرف ترین عرب ہیں۔ ہم اس جنگ کے نتائج کو خاموشی سے دیکھتے ہیں، جو غالب ہو گا اسی کا ہم ساتھ دیں گے۔ کیونکہ وہی حق و صداقت پر ہو گا۔ گویا انہوں نے مکہ مبارکہ کے فتح و سقوط کو معیار حقانیت قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی اسی فتح مکہ کو صداقت کا نشان تسلیم کر کے فرمایا کہ جس وقت نصرت الہیہ کا ظہور ہو، مکہ پر مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے اور لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہونے لگیں تو سمجھ لو کہ تم نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ اس فتح سے قبل تو لوگ انفرادی طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تھے مگر اسکے بعد یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک ایک دن میں کئی کئی قبائل مدینہ میں حاضر ہو کر اسلام کا اظہار کرتے اور واپس جا کر دوسروں کے اسلام کا ذریعہ بنتے۔

## اعلان وفات

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لیے اور قیامت تک کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ بشر ہیں اور آپ کی ذات اقدس میں بشریت کے تمام صفات و محضات بھی موجود ہیں، وقت معین پر آپ اس دنیا سے ملاء اعلیٰ کی طرف بھی تشریف لے جانے والے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے فرائض نبوت کی تحدید کر دی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی حیات مقدس میں عرب کا دارالحکومت مکہ فتح ہو گیا جو تمام ملک کا مرکز اور ام القریٰ ہے اور جہاں سے اطراف و جوانب ملک میں نہایت ہی سہولت اور آسانی کے ساتھ اسلام کی آواز پہنچ سکتی ہے تو گویا آپ نے تبلیغ رسالت کا فرض ادا کر دیا۔ بقیہ حصص دنیا میں آپ کے اصحاب و حواریں اس آواز کو پہنچا دیں گے جنہیں آپ نے اس فرض جلیل کے لیے تیار کر دیا ہے۔

پس جب کہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور تمام قبائل عرب نے یکے بعد دیگرے دائرۂ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا تو گویا آپ اپنے مقصد رسالت سے فارغ ہو گئے اس لیے حکم ہوا کہ آپ اپنا تمام وقت اب اللہ کی تعجید و تقدیس اور توبہ و انابت الی اللہ میں صرف کیجئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے پر آپ رکوع و سجود میں ”سجائک اللهم ربنا و بحمدک اللهم اغفر لی“ بہت پڑھا کرتے تھے۔ اسی سورت کے سننے پر ابو بکر رضی اللہ عنہ رو پڑے تو لوگ حیران رہ گئے، مگر جب تھوڑی سی مدت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی، اس وقت صحابہ کو معلوم ہوا کہ اس میں آپ کی وفات کا اعلان تھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ بعض صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ آپ ابن عباس کو ہمارے برابر کیے دیتے ہیں، حالانکہ اس کی عمر کے درجہ کے ہمارے لڑکے ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے ان لوگوں کو ابن عباس کے ساتھ بلایا اور کہا: ماتقولون فی قول اللہ عزوجل اذا جاء نصر اللہ والفتح فقال بعضهم امرونا ان نحمد اللہ ونستغفرہ اذا نصرنا وفتح علينا وسكت بعضهم فلم يقل شيئا فقال لي اكد لك تقول يا ابن عباس فقلت لا فقال ما تقول فقلت هو اجل رسول اللہ ﷺ اعلم له قال اذا جاء نصر اللہ والفتح فذلك علامۃ اهلك فسبق بحمد ربك واستغفره انه كان توابا فقال عمر بن الخطاب لا اعلم منها الا ما تقول (بخاری) ”سورۃ نصر کی کیا تفسیر کرتے ہو، بعض تو بالکل خاموش رہے، مگر دوسروں نے کہا کہ فتح و نصرت کے وقت ہمیں حمد و استغفار کا حکم دیا گیا ہے، پھر انھوں نے یہی سوال مجھ سے کیا تو میں نے کہا کہ فتح مکہ کو رسول اللہ کی وفات کی علامت قرار دیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔“

## دوسری توجیہ

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارباب قدس و طہارت کو فتح و کامرانی کی بشارت دیتا ہے مگر اس مسرت اندوز خبر کی تکمیل میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ اس درمیان میں تکالیف و مصائب کے بادل چھا جاتے ہیں، ناکامیاں اور

مایوسیاں سامنے آتی ہیں اور کبھی کبھی یہ خیال بھی دل میں آنے لگتا ہے کہ شاید یہ وعدہ ہی غلط نہ ہو۔ اس لیے اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کی معرفت تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ فتح و نصرت میں تاخیر ہونے کی وجہ سے جو رنج و غم تم لوگوں کو لاحق ہوا ہے اس کے لیے اللہ سے استغفار کرو، توبہ و انابت لی اللہ کی راہ اختیار کرو اور دعا کرو کہ باطل کو فنا کرنے کے واسطے اللہ حق کو قائم و دائم رکھے۔ وہ اگر عارضی طور پر مسلمانوں کو امتحان میں ڈال رہا ہے تو یہ خیال ہرگز دل میں نہ لاؤ کہ وہ تمہاری سعی و کوشش کو ضائع کر دے گا: ان اللہ لایضیع اجر المحسنین۔ وہ تواب ہے، تکلیفوں اور محنتوں کی صورت میں اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اور یہ سلسلہ برابر قائم رہتا ہے، تا آنکہ وہ درجہ کمال کو حاصل کر لیتے ہیں۔ پس اب فتح مکہ کی وجہ سے خوف دور ہو گیا اور تمہارا کام تسبیح و تقدیس کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔



## الہب (آیات ۵)

تمہید

اس سورت میں ابو لہب اور اس کی بیوی کی ہلاکت و بربادی بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت کریں گے تو نہ صرف وہی تباہ ہوں گے بلکہ وہ لوگ بھی دوزخ میں داخل ہوں گے جو ان کے شرکاء کا رہے۔ پس جس طرح سورہ نصر میں مسلمانوں کی کامیابی کا اعلان کیا گیا ہے ویسے ہی اس سورت میں کفار و معاندین اسلام کی ذلت و رسوائی ذکر کی گئی ہے۔

## کفار کی ہزیمت

ابو لہب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تَبَّتْ یَدَاۤ اَبْنٰی لَہٖۤ وَ تَبَّ ۝ مَا اَغْنٰی عَنْہٗ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ۝ سَیَصْلٰی فَاَرَا ذٰلَکَ لَہٖۤ ۝ وَ اَمْرًاۤتُہٗ حَبَالَۃٌ ۝ الْحَطَبُ ۝ فِی جَنَدِہَا حَبِلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

”ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو، نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہو گا اور اس کی جو رو بھی جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے، اس کے گلے میں موج کی رسی ہوگی۔“

تب دراصل تباہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں۔ وہاں کید فاعون الافی تباہ۔ یدا کے معنی دونوں ہاتھ کے ہیں مگر مراد اس سے خود اس شخص کا خسران و خذران ہے، ہاتھ ہی پکڑنے اور کام کرنے کا ذریعہ ہیں جب وہ ٹوٹ گئے تو گویا وہ خود ہی معدوم ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد لفظ تب بول کر بتا دیا کہ اس سے مراد ابو لہب کی تباہی ہے۔ لہب، جب آگ خوب روشن ہو جائے اور شدت حرارت کی وجہ سے اس میں شعلے نکلنے لگیں تو ان شعلوں کو لہب کہتے ہیں، اس سے مراد شدید حرارت آگ ہے۔ حبالۃ الحطب، حطب ایندھن کو کہتے ہیں، ابو لہب کی بیوی کا نام ام جمیل تھا، وہ لوگوں کے پاس رسول اللہ ﷺ کی چغلیاں کھایا کرتی تاکہ قبائل عرب آپ کے خلاف ہو جائیں اور اس طرح آپ کے خلاف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے۔ جید گردن۔ حبل، رسی اور مسد، موج کو کہتے ہیں۔

ابو لہب کا اصلی نام عبد العزیٰ بن عبد المطلب ہے۔ یہ رسول اللہ کا چچا اور آپ کا شدید ترین دشمن تھا۔ جب قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی: وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ تو آپ پہاڑی پر تشریف لے گئے اور تمام قبائل قریش کو جمع کر کے



فرمایا: اراتیم ان حدثتکم ان العدو مصبحکم او ممسیکم اکنتم تصدقونی، ”اگر میں تم سے یہ کہوں کہ دشمن تم پر صبح یا شام کو حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے“ سب نے کہا ضرور، اس پر آپ نے فرمایا: فانی نذیرکم بین یدی عذاب شدید، ”تو پھر یہ سمجھ لو کہ میں اس عذاب سے تم کو ڈراتا ہوں جو میری آنکھوں کے سامنے ہے“، ابو لہب نے یہ سن کر کہا: ألہذا جعلتنا تبألک، ”تم ہلاک ہو، کیا تم نے اسی لیے ہم سب کو جمع کیا تھا“۔ (بخاری)

مسند امام احمد میں ربیعہ بن عباد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی قبیلہ عرب کو توحید کی دعوت دیتے اور انھیں بت پرستی چھوڑنے کو کہتے تو جب آپ اپنی تقریر ختم کر چکے تو ایک شخص یہ کہتا کہ بدعت و ضلالت کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں، یہ تمہیں لات وعزیٰ چھوڑنے کو کہتا ہے، اس کی بات پر کان نہ دھرو۔ ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون شخص ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہ آپ کا چچا ابو لہب ہے۔

اس سورت میں ابو لہب کا نام خاص طور سے لیا گیا ہے حالانکہ مخالفین اور بھی تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی تکذیب میں سب سے زیادہ اسی بد بخت کا حصہ تھا۔ یہی برابر آپ کے تعاقب میں رہتا، جس قبیلہ میں آپ تبلیغ کے لیے جاتے یہ بھی آپ کے ساتھ ہوتا، لوگوں کو راہ حق سے روکتا اور ایسے اسباب پیدا کرتا کہ کسی کو قرآن میں درس و مطالعہ کا شوق ہی نہ ہو۔

ابو لہب پر اس سورت میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ مال و دولت کے غرور باطل میں وہ کلمہ حق کی مخالفت نہ کر لے ورنہ جب ہمارا عذاب اس کی طرف متوجہ ہو گا تو اس میں سے کوئی چیز بھی اس کی نجات کا باعث نہ بن سکے گی۔ پھر اس وقت نہ صرف وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا بلکہ اس کی بیوی بھی اس کے ہمراہ ہو گی۔ کیونکہ باطل کو فروغ دینے اور حق کو مٹانے میں وہ اس کی دست راست تھی اور ہر طرح اس کی معاون و مددگار تھی۔

### درس عبرت

آج جو لوگ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں، اسلامی حکومتوں کے فنا کرنے کے منصوبے باندھتے ہیں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ان کا نصب العین ہے وہ اس سورت سے سبق اندوز ہوں۔ وہ یاد رکھیں کہ جس طرح ابو لہب اور اسکے رفقاء نے کار کا نام و نشان مٹ گیا اور ان کی دولت و ثروت ان کے کچھ کام نہ آئی اسی طرح آج بھی وہ منتقم و جبار زندہ ہے، اس کے قانون تعذیب ام میں تبدیلی نہیں ہو ا کرتی، وہ عنقریب تم میں سے ایک ایک کو فنا کر دے گا اور اس وقت تمہارے جنود مجندہ کچھ کام نہ آئیں گے۔

نہ صرف ائمہ کفر و ضلالت ہی برباد ہوں گے بلکہ وہ لوگ بھی جو سر آیاعلنا ان دجالہ و شیاطین عصر کی امداد و اعانت کرتے ہیں اور انھوں نے بھی مسلمانوں کی تباہی کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ ایسے بد بختان نوع انسانی ابو لہب کی بیوی کے انجام سے عبرت اندوز ہوں۔ ان فی ذلک لعبرة لا ولی الا بصار۔

## الاخلاص

(آیات ۴)

تمہید

اس سورت میں توحید خالص اور اسلام کا مقصد وحید ظاہر کر کے تمام ان مذاہب کا رد کیا ہے جو کسی نہ کسی شکل میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

## توحید خالص

اللہ کی وحدانیت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝

”کہو کہ وہ ذات پاک جس کا نام اللہ ہے، ایک ہے اور وہ معبود برحق بے نیاز ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔“

مسلمانوں کی نصرت و کامرانی اور کفار کی ذلت و رسوائی کے بعد آخر میں پھر ایک مرتبہ اصل و اساس اسلام و عصارہ ایمان کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ توحید خالص ہے جس پر تمام انبیائے کرام متفق ہیں۔ دنیا میں مختلف چیزیں اپنے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں، ہر ایک کا تعلق اپنے اپنے مرکز سے ہے اور پھر یہ تمام مراکز مختلفہ ایک بالاتر ہستی میں جا کر جذب ہو جاتے ہیں، وہی اعظم ترین مرکز اللہ ہے، زمین و آسمان میں جس قدر انوار و برکات مصروف عمل ہیں، سب اسی ایک چشمہ بفیض سے مستعار لیے گئے ہیں، وہاں محض خیر ہی خیر ہے، اس جگہ شر و فساد کا نام و نشان تک نہیں، وہی اللہ ہے جس کے قبضہ قدرت میں ملکوت السموات والارض ہیں، جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

## احد اور واحد

اگرچہ خلیل کی یہ رائے ہے کہ احد اور واحد میں کوئی فرق نہیں مگر جمہور علماء کے نزدیک دونوں کے معانی الگ الگ ہیں اگر یہ کہا جائے کہ لایقاً وہ احد تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کوئی شخص بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اگر احد کی جگہ واحد کا لفظ استعمال کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک شخص تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا البتہ اس سے زائد کر سکتے ہیں۔ ازہری کی رائے یہ ہے کہ احدیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے، دوسرا اس سے متصف نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام مقام احدیت اور واحدیت میں فرق کرتے ہیں۔

## اللہ الصمد

مفسرین کرام نے صمد کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ امام فخر الدین رازی نے اس کے متعلق اٹھارہ اقوال نقل کیے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ صمد کا لفظ اتنا وسیع ہے کہ وہ ان تمام معانی پر حاوی ہے۔ یہ مختلف صفات ہیں جو ان حضرات نے بیان کیے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے صمد کے معنی دریافت کیے گئے تو آپ نے فرمایا: السید الذی یصمد الیہ فی الحوائج ”وہ سردار جس کی طرف حاجتوں اور ضرورتوں کے وقت قصد کیا جائے“۔

اس تفسیر کے بعد ہر مسلمان کے لیے راہ عمل معین ہو جاتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے وقت صرف اللہ ہی کے آگے دست سوال دراز کرے، اپنے اوپر ایسا نعبد وایاک نستعین کی حقیقت طاری کرے۔ اس لیے کہ غیر اللہ سے اعانت کا طالب ہونا اور انسانوں کے آگے اپنی حاجات پیش کرنا بالکل ممنوع اور ناجائز ہے۔ بعض لوگ علماء و مشائخ کی طرف رجوع کرتے ہیں، کچھ لوگ پیغمبروں اور فرشتوں سے طالب اعانت ہوتے ہیں، مگر اللہ الصمد کے ہوتے کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

بعض حضرات نے صمد کے معنی ٹھوس کے کیے ہیں یعنی اس پر کوئی تغیر نہیں آتا اور وہ اپنی ذات میں قوی اور مستقل ہے، وہ واجب الوجود ہے، شروع سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہی سردار، آقا اور شہنشاہ ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور وہی تمام فضائل و کمالات کا جامع ہے۔

## برابری کا دعویٰ

عام طور پر اللہ کے متعلق لوگوں کے خیالات یہ ہیں:

(۱)۔ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور جنات کو اس کا رشتہ دار کہتے تھے، نجوم و کواکب کی پوجا کرتے اور ان کے ناموں پر معبد بنا رکھے تھے۔

(۲)۔ ہندوؤں کی اس وقت تک یہی حالت ہے، ہزاروں معبودان باطل ہیں جن کے نام پر انھوں نے اپنے مندر بن رکھے ہیں اور جن میں اگر ایک طرف رام اور ہنومان کی پوجا ہوتی ہے تو دوسری جانب مہادیو اور اس کے لنگ کے آگے بھی سربسجود ہوتے ہیں، وہ اسی گمان باطل میں ہیں کہ بت پرستی کے بغیر انسانی ارتقا غیر ممکن ہے۔

(۳)۔ یہودی حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور ان کا اپنی نسبت یہ دعویٰ ہے: نحن ابناء اللہ واحباؤہ۔

(۴)۔ عیسائی بھی ان کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، اب، ابن اور روح القدس کو خدا مانتے ہیں اور ہر ایک کو برابر کا خدا تسلیم کرتے ہیں۔

سورہ اخلاص ان تمام عقائد باطلہ کا صاف صاف رد کرتی ہے اور بباگ دہل پکارتی ہے: لم یلد، وہ کسی کا باپ نہیں اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی جانشینی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔

ولم یولد، اس کا باپ بھی کوئی نہیں جو اس سے بالاتر ہو۔

ولم یکن لہ کفو أحد، نہ اس کے کوئی برابر ہے جو اس کا نعم البدل قرار دیا جاسکے۔

نتیجہ

جب خداوند قدوس سے اعلیٰ، اس کے برابر اور اس کے قائم مقام کوئی قوت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لا الہ الا اللہ۔ دنیا میں جس قدر بادشاہ اور حکمران ہیں ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ گویا ایک ادنیٰ ترین انسان اور شہنشاہ اعظم دونوں برابر ہیں۔ اس اسلامی توحید کو مان لینے کے بعد ہر شخص کی ہمت بڑھ جائے گی اور اس کے دل میں امنگ پیدا ہوگی کہ میں ترقی کر کے بادشاہ کے درجہ تک پہنچ جاؤں۔ پس دنیا میں اگر کوئی عقیدہ اعلیٰ ترین ہمت و استقلال اور ولولہ عمل پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف عقیدہ توحید ہے اور اس کو اصلی صورت میں صرف اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔



## الفلق

(آیات ۵)

تمہید

مقصد اسلام گذشتہ سورت میں بیان کیا گیا ہے، اب سورہ فلق اور سورہ ناس میں اس کے حفظ و بقا اور ثبات و استقامت کی دعا مانگی گئی ہے۔ سورہ فلق میں تمام ان مضرات سے بچنے کی دعا تعلیم دی گئی ہے جو جسم کو نقصان پہنچانے والی ہیں، سورہ ناس میں ان اشیاء سے پناہ مانگی جائے گی جو روح کے لیے نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔

## جسمانی مضرات سے تعوذ

توطیہ و تمہید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝

”کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں، ہر چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا اچھا جائے اور گندوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔“

فلق کے لغوی معنی جدا ہونے کے ہیں، چونکہ صبح بھی رات سے جدا ہوتی ہے اس لیے اب اس کے معنی صبح ہی کے آتے ہیں۔ چنانچہ جابر، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر کی یہی رائے ہے۔ غاسق، یہ لفظ غسق سے لیا گیا ہے اور اس سے مراد رات ہے۔ وقوب کے معنی داخل ہونے کے ہیں۔ نفاثات لیا گیا ہے نفث سے، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی آہستہ سے پھونک مارنے کے ہیں۔ جب ایک پودا زمین سے سر نکالتا ہے تو ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ان آفات و ہلات سے اس کو بچانے کی کوشش کی جائے جو اس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے ہیں، ان آفتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- (۱)۔ بعض جانور اسی تلاش میں ہر وقت پھرتے رہتے ہیں کہ سبزہ زار ملے تو اپنا پیٹ بھریں۔ چنانچہ وہ ہر پودے کو کھا جاتے ہیں۔ اس لیے پودے کے گرد اگر کانٹوں کی باڑھ لگانی پڑتی ہے کہ ان جانوروں کی دست برد سے محفوظ رہے۔
- (۲)۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کو پانی اور کھاد وقت پر ملے، اگر تھوڑی سی بھی تاخیر ہو گئی تو وہ مر جھا جائے گا۔
- (۳)۔ ناگہانی طور پر کوئی مصیبت آ جاتی ہے، مثلاً شب کے وقت مالک آرام سے سو رہا تھا اور یہاں طوفان باد و باران نے اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔
- (۴)۔ ایک شخص مالک کا دشمن ہے، مگر مالک اتنا طاقت ور ہے کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس لیے وہ اپنا تمام غصہ اس پودے پر نکالتا ہے اور اسے کاٹ ڈالتا ہے۔
- پودا جب تک ان آفات و مصائب سے محفوظ نہ رہے گا اس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہیں۔

### رجوع الی المقصود

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ اصل سورت میں غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمیں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے۔

### خلاف فطرت سے پناہ

(۱)۔ ہر چیز کا وجود فی نفسہ اس کائنات ارضی و سماوی کے لیے نہایت ہی مفید اور نافع ہے۔ اس میں ضرر اور نقصان کا پہلو اس وقت آتا ہے جب اس کی نسبت دوسری چیز کی طرف ہو۔ تلوار کی بہترین صفت یہی ہے کہ وہ تیز ہو، مگر جب اس سے کسی کی گردن کٹ جائے تو کہیں گے کہ یہ تلوار بری ہے، کیونکہ اس سے ایک انسان کی زندگی ختم ہو گئی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں جو فی نفسہ مفید ہیں، مگر وہ فرزند آدم کی فطرت کے بخط مستقیم مخالف ہیں۔ وہ جب اس پر حملہ آور ہوتی ہیں تو اسے جادہ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں اور اس کے مقاصد حیات کے کسب و حصول میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ان کے مضر اثرات و نتائج سے بچنے کے لیے تعلیم دی گئی کہ تم یوں اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ اے خداوند! تو تاریکی سے روشن صبح نکالتا ہے، پس تو ہی ہمیں ان خلاف فطرت اشیاء کی ظلمت سے محفوظ رکھ۔

### ضروریات زندگی فراہم ہوں

(۲)۔ چاند کی روشنی اور ٹھنڈک پودوں کی نشو و بالیدگی میں ایسے ہی معاون و مددگار ہوتی ہے جس طرح سورج کا نور اور اس کی حرارت۔ اگر چاند طلوع نہ کرے اور تمام شب تاریک ہی رہے، تو پودے پوری قوت کے ساتھ نشو و نما حاصل نہ کر سکیں گے۔

اسی طرح اگر ایک شخص اپنے فرائض حیات تو ادا کرنا چاہتا ہے مگر افلاس و ناداری کی وجہ سے مجبور ہے کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی بھی فکر کرے، لیکن اگر وہ اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف ہو گیا تو مقصد اصلی سے ہٹ جائے گا اور روپیہ کمانے ہی میں اپنا تمام وقت صرف کر دے گا۔

آیت ومن شر غاسق اذا وقب میں اسی سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تو اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں لگ جائیں اور اس کی وجہ سے ہماری قوم اور ملک کو سخت نقصان پہنچے۔ پس اے مالک الملک! تو ہی ہماری ضروریات کو پورا کر اور ان کے فراہم کرنے کی وجہ سے جو ضرر ملک و ملت کو پہنچ سکتا ہے اس سے محفوظ رکھ، ایسا نہ ہو کہ ان چیزوں میں پھنس کر ہم اپنا مقصد حیات ہی فراموش کر دیں اور اس طرح پھر کہیں کے بھی نہ رہیں۔

### ناگہانی آفات

(۳)۔ ہم ایک عزم صمیم کر لیتے ہیں، ملک و ملت کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں اور کلمۃ الحق کی فضیلت و برتری کو اپنی غایب الغایات قرار دے لیتے ہیں، اتنے میں ناگہانی طور پر ہمارے عزیز و قریب، دوست و احباب اور بیوی بچے آجاتے ہیں، اس راہ کی مشکلات و موانع کا ذکر کرتے ہیں، تکالیف و شدائد کی ہولناک تصویر کھینچ دیتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ارادے سے باز آجائیں، اسے کمزور کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، تا آنکہ بسا اوقات ان کے غیر محسوس اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس مقصد کو بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

پس اے صبح کے روشن کرنے والے خدا! انہا اموالکم و اولادکم فتنہ کے شر و فساد سے بچا، ان کے اثر بد سے محفوظ رکھ اور ایسا عزم راسخ، قلب صمیم اور پختہ ارادہ نوازش فرما کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں، دریا اپنا رستہ تبدیل کر لیں اور آبادیاں بن ہو جائیں مگر میں اپنے مقصد سے ایک انچ بھی نہ ہٹوں اور اسی پر اپنی جان دے دوں۔ یہی مطلب ہے ومن شر النفثات فی العقد کا۔

### حاسد سے بچا

(۴)۔ بعض لوگ ہماری کامیابیوں اور کامرانیوں سے ناخوش ہوتے ہیں، غصہ میں آکر اپنا ہاتھ کاٹ لیتے ہیں، ہمیں ذلیل و رسوا کرنے کیلئے منصوبے باندھتے ہیں، سازشیں کھڑی کرتے ہیں، ہمارے ہی آدمیوں کو خفیہ امداد دے کر ہماری

مخالفت پر کھڑا کر دیتے ہیں کہ ہماری حکومتیں برباد ہوں اور ہلال کی جگہ صلیب کی فرمان روائی ہو۔

پس اے رب الارباب! اور اے خداوندوں کے خداوند! تو ان کے شر و فساد سے پناہ میں رکھ، ان کی سازشوں کو طشت ازبام کر، ان کے منصوبوں کو کامیاب نہ ہونے دے، ان کے ارادوں میں کمزوری پیدا کر، تیری تائید ہمارے شامل حال ہو، ہم دن دوئی رات چو گنی ترقی کریں اور ہمیں ہر جگہ فتح و کامرانی نوازش فرما۔

## الناس

(آیات ۶)

تمہید

گذشتہ سورت میں جسمانی مضر توں سے پناہ مانگنے کے لیے تعلیم دی گئی تھی، اس میں روحانی نقصانات سے بچنے کی دعا بتائی گئی ہے۔ یہ ضرر پہنچانے والے انسان ہوں یا جن، سب سے تعوذ کیا گیا ہے اور اللہ کی تین صفات سے اعانت طلب کی گئی ہے۔

## روحانی مضرات سے تعوذ

شدید ترین دشمن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

”کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، یعنی لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی، شیطان و سوسہ انداز کی برائی سے، جو لوگوں کے دلوں میں و سوسہ ڈالتا ہے، خواہ وہ جنات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔“

اس سورت میں اس دشمن سے پناہ مانگی گئی ہے جو خود ہمارے اندر ہے، جسے ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں: نَبِيْفٍ اَدَمَرٍ لَا يَفْتِنُكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا آخَرَهُمْ اَبْوَيْكُم مِّنَ الْجِنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوَاتِهِمَا ۚ اِنَّهُ يَزِيْغُكُمُ هُوَ وَ قَبِيْلُهُ مِّنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۚ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطٰنِ اَوْلِيَاءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف ۲۷) ”اے بنی آدم! دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکانہ دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر بہشت سے نکلوا دیا اور ان سے ان کے کپڑے اتروا دیے تاکہ ان کے ستر ان کو کھول کر دکھا دے، وہ اور اس کے بھائی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے، ہم نے شیطانوں کو انہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔“



انسان میں اصل اور حقیقت الحقائق کے اعتبار سے علوم اور اخلاق ہیں، ان کا شدید ترین دشمن یہی شیطان ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے، جس کا اثر خاموش مگر دیرپا ہے، جو گھن کے کیڑے کی طرح اندر ہی اندر روح انسانی کو کھا جاتا ہے۔

### صفات الہیہ

جب فرزند آدم کرہ ارضی پر قدم رکھتا ہے تو ماں باپ اس کی نشو و تربیت میں لگ جاتے ہیں، یہ اس کا اولین تعلق ہے، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی تمام آرزوؤں اور توقعات کا مرکز یہی ماں باپ ہیں، مگر جب عمیق غور و فکر سے کام لیتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ محض ذرائع و وسائل ہیں، ان کی معرفت مجھے رزق ملتا ہے اور میری پرورش ہوتی ہے، ورنہ اصل میں رب الناس ہے جو میری تمام ضروریات کا ذمہ دار و کفیل ہے، جس نے میری خاطر چاند، سورج، پہاڑ، سردی، گرمی، دن اور رات کو بنایا ہے۔ اس لیے جب ابن آدم پر اس کا دشمن حملہ کرتا ہے تو طبعی طور پر وہ اسی رب کی طرف رجوع کرتا ہے جس نے اس کی جسمانی تربیت کا سامان کیا ہے کہ وہی اس کی روحانی نشو و ارتقا کے اسباب بھی فراہم کرے۔

مگر جب وہی انسان بڑا ہوتا ہے، عہد شباب میں قدم رکھتا ہے اور حاکم وقت سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا بادشاہ مجھے ہر دشمن سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن بہت جلد اس کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ روئے زمین کے تمام فرمانروایاں عاجز محض ہیں، ان لوگوں کی حکومت صرف اجسام تک ہے۔ پس وہ ان سب سے کٹ کر زمین و آسمان کے شہنشاہ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے تمام انسانوں کے بادشاہ! مجھے دشمن سے بچالے۔

پہلی دو صورتوں میں تو ممکن ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی سے نظر کو زیادہ بلند نہ کرے اور ارباب دنیا ہی کو اپنا آخری چارہ کار خیال کر لے، مگر اس کا دشمن اپنے خدع و فریب میں براہر مصروف ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اسے چین نہیں لینے دیتا، اس لیے اب وہ اپنے معبود حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس کے سوا کوئی ذریعہ نجات نہیں۔

### پناہ کی طلب

پس ایک عاجز و درماندہ انسان اپنے رب، اپنے پادشاہ اور اپنے معبود کو پکارتا ہے کہ اے ہم سب کے پروردگار! اے ہم سب کے شہنشاہ اور اے ہم سب کے معبود!!! تیری توفیق کے ہم طلب گار ہیں، ملک و ملت کی خدمت اور کلمۃ الحق کے بلند و برتر کرنے کا جذبہ صادق نوازش فرما، اس راہ میں جو رکاوٹیں پیدا ہوں، جس قدر خیالات فاسدہ اور بری حرکتیں سد راہ ہوں ان سب سے ہمیں محفوظ رکھنا، ان لوگوں سے بچا جو ہمارے ارادوں میں تزلزل پیدا کرنے کی کوشش کریں، جنات اور انسانوں سے، ظاہری اور باطنی دشمنوں سے ہماری نگہداشت کر، ان میں سے کوئی چیز بھی ہم پر اثر نہ ڈال سکے، ہم اپنے مقصد حیات میں پورے کامیاب ہوں اور قلب سلیم لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوں۔

## ابتدا اور انتہا

قرآن پاک کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے ہوئی اور اس کا خاتمہ رب الناس ملک الناس الہ الناس پر ہوا اور اس طرح لطیف طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب عزیز کسی ایک ملک، آب و ہوا اور رنگت و نسل کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ یہ تمام مذاہب و ادیان اور اقوام و ملل کے لیے ہے اور اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگوں کو شعوب و قبائل، وطنی اور قومی تعصبات اور جنسی جذبات و عواطف سے پاک و صاف کر کے ایک عالم گیر برادری میں منسلک کر دے جس میں اسود و احمر اور زنگی و رومی کی کوئی تمیز نہ ہو۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی سیدنا  
و مولانا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین الی یوم الدین، آمین یا رب العالمین۔



## قرآن حکیم کی تفسیر و تعبیر کا جامع اسلوب

قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور عمومی پھیلاؤ کے لئے برصغیر پاک و ہند میں جس تحریک کا آغاز حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، وہ آپ کی نسبی اور روحانی اولاد کے ذریعہ سے بتدریج آگے بڑھتی رہی۔ قرآن حکیم کے حوالے سے آپ نے جس فکر و عمل کی بنیاد رکھی، اس کا اساسی مقصد ہر شخص کے دل و دماغ تک عام فہم انداز میں قرآنی علوم و معارف پہنچانا تھا۔ چنانچہ آپ کے بعد آپ کے خانوادہ نسبی و روحانی نے اسی انداز فکر و عمل پر کام کر کے انسانی قلوب میں قرآنی تعلیمات منتقل کرنے کی جدوجہد فرمائی۔

حضرت الامام ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے قرآنی انقلاب کی گزشتہ تقریباً ہزار سالہ تاریخ کا تحلیل و تجزیہ کر کے سب سے پہلے اس کی جامع فلاسفی کا تعین فرمایا۔ چنانچہ قرآن کی حکمت اور اس کے اسرار و رموز کی بنیادی فلاسفی کا تعین کرتے ہوئے معرکت الآراء کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ سپرد قلم فرمائی، اس میں آپ نے قرآنی انقلاب کے جملہ اساسی اصولوں اور اس کے عملی تقاضوں کا ایسا جامع خلاصہ بہترین ترتیب کے ساتھ بیان کیا، کہ جس سے دین اسلام کا مربوط نظام فکر و عمل اور اساسی جوہر کھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

اسی طرح آپ نے گزشتہ تفسیری ورثہ پر نظر کرتے ہوئے، قرآن حکیم کے علوم و معارف کا انتہائی تدبیر سے جائزہ لیا۔ قرآن حکیم کے اس ہمہ جہتی مطالعہ کی وجہ سے آپ کے سامنے تفسیر قرآن کے بنیادی اساسی اصول متقن ہو کر سامنے آ گئے، چنانچہ آپ نے منفرد انداز میں اس سلسلہ کی بنیادی کتاب ”الغور الکبیر فی اصول التفسیر“ لکھی۔ گزشتہ چودہ سو سالوں میں اصول تفسیر پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں قرآن حکیم کا ایک ایسا تفسیری اسلوب سامنے آتا ہے، جس سے عام فہم انداز میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے تمام پہلو، اس سے استفادہ کرنے والے کے قلب و دماغ تک جا پہنچتے ہیں۔ ادھر ادھر کی تمام قیل و قال سے جان چھوٹ جاتی ہے، اور قرآن حکیم کی حقیقی تعلیمات کا اثر دل و دماغ تک منتقل ہوتا جاتا ہے۔

قرآنی تعلیمات کی بنیادی فلاسفی اور اساسی اصول تفسیر متعین کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم کے دیگر زبانوں میں ترجمہ کی راہ کھولی، تاکہ ہر قوم اپنی زبان میں ترجمہ قرآن کے ذریعہ قرآنی علوم و معارف کو صحیح تناظر میں سمجھ سکے، چنانچہ آپ نے سب سے پہلے ہندوستان کی عام فہم علمی زبان فارسی میں قرآن حکیم کا

بہترین ترجمہ کیا۔ قرآن حکیم کی آیات و نصوص پر از حکمت ہیں، اور بڑی جامعیت کے ساتھ اپنے تلی اور جامع کلمات کی صورت میں انسانی معاشرے کے جملہ دائروں کے بارے میں بنیادی راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ان آیات و نصوص کا ایسے ہی جامع اور پر از حکمت اسلوب میں ترجمہ ہونا ضروری ہے۔ ایسا ترجمہ ہی قرآنی علوم و معارف کو صحیح طور پر سمجھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اور آپ کے صاحبزادگان کے تراجم قرآن کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے، جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے تراجم اہل زبان کے دل و دماغ میں قرآنی تاثیر پیدا کرنے کا باعث بنتے رہے ہیں۔

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کا یہ وہ شاندار طرز فکر و عمل اور جامع اسلوب تھا جسے اولاً آپ کے خانوادہ نسی نے پروان چڑھایا۔ چنانچہ آپ کے عالی مقام صاحبزادگان حضرت الامام شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر لکھیں۔ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی نے ”تفسیر عزیزی“ لکھی، جس میں آپ نے ہندوستان کے بلند طرز تمدن کو سامنے رکھ کر قرآنی تعلیم کے اس جدید اسلوب کو بیان کرنے کی سعی فرمائی، اسی طرح حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت سے بھرپور اردو تراجم کر کے اس اسلوب تفسیر و ترجمہ کو عام کیا۔

مسلمانوں کے زوال اور غلامی کے دور میں قرآنی تعلیم کا جو بنیادی اثر اور لازمی تقاضہ سامنے آیا۔ وہ جہاد حریت اور آزادی کی تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ کیونکہ غلام قوم میں قرآنی تعلیم کا پہلا اور لازمی اثر اپنی قومی آزادی کا حصول ہوتا ہے۔ آزادی فکر و عمل کے بغیر قرآن کی مجموعی تعلیمات پر کماحقہ عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اس پس منظر میں ہمیں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے خلیفہ اجل حضرت سید احمد شہید کی ”تحریک جہاد و حریت“ کے ڈانڈے قرآنی تعلیم کے لازمی اثر سے جڑتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبد العزیز کے نواسے اور جانشین حضرت الامام شاہ محمد اسحاق دہلوی، دہلی کے مرکز میں بیٹھ کر اس تحریک کی بھرپور مالی امداد فرماتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہندوستان بھر میں اپنی سرپرستی اور نگرانی میں دیگر اہم امور سرانجام دیتے ہیں۔

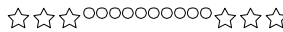
اس طرح خانوادہ ولی اللہی نے جہاں اس خطہ میں قرآنی تعلیمات کی بنیادی فلاسفی، اس کے اصول اور عام فہم انداز میں اس کی نشر و اشاعت کا کام کیا۔ وہاں اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ قرآنی تعلیم کے لازمی اثر.... تحریک جہاد و حریت.... کی آبیاری کی، اس خطہ میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا۔ اور اس کے لئے قربانیاں دیں۔

اگلے دور میں ان حضرات کے فکر و عمل کی وارث جو جماعت سامنے آتی ہے۔ اس کے سرخیل سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے دو اجل خلفاء حضرت الامام حکیم الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام

ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف خانوادہ ولی اللہی کے طرز فکر و اسلوب کو آگے منتقل کیا۔ بلکہ عملی جدوجہد کر کے قربانیوں کا لازوال نقش قائم کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی و تھانہ بھون کے میدان میں جہاد و حریت کا مرحلہ ہو، یا دیوبند کا مرکز قائم کر کے، ولی اللہی اصول پر قرآنی علوم و معارف کو انسانی قلوب میں منتقل کرنے اور اس حوالے سے جذبہ صادقہ پیدا کرنے کا عمل ہو۔ ہر ایک دائرے میں ان حضرات کی جدوجہد ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔

ان حضرات نے اگلے دور کے لئے جو جماعت تیار فرمائی، اس کے بنیادی ارکان ان حضرات ثلاثہ کے جانشین اور خلفائے اجل ہیں۔ جن میں ممتاز ترین حضرت قطب عالم حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اسیر مالٹا رحمۃ اللہ علیہ، قطب الارشاد حضرت مولانا غلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان میں حضرت عالی رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قرآنی تعلیمات کو اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ بستی بستی گاؤں گاؤں پھیلانے میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا باہمی تعلق تو ایسا تھا گویا ”ایک جان دو قالب“ ہیں۔

ان تینوں حضرات نے باہم مل کر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی جو حکمت علمی مرتب کی تھی اس کے کئی پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو اس حوالے سے بڑا جامع نظر آتا ہے کہ اس کے نتیجہ کے طور پر قرآنی تعلیمات کا پھیلاؤ ہوا، اور اغیار کے فکری اور عملی کردار کا توڑ سامنے آیا۔ مسلمانوں کے قلوب میں قرآن کے عالمی نظریہ پر یقین کامل اور اعتماد واثق پیدا ہوا۔ اور قرآنی نظریہ کے حوالے سے تربیت یافتہ افراد کی ایک ایسی کیمپ تیار ہوئی جو ہر قسم کے مادی مفاد اور ذاتی لالچ سے مبرا ہو کر خالص قومی مفاد، اجتماعی جذبہ اور ملی تقاضوں کے مطابق کام کرتی ہوئی قربانی دیتی ہے۔ اور یوں اگلی نسلوں کی جانب قرآنی علوم کو صحیح تناظر میں منتقل کرنے والی مخلص جماعت اور قیادت سامنے آتی ہے۔



## ”مکاتب قرآنیہ“ کا قیام

قرآنی تعلیم کے حوالے سے ان حضرات کی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ سامراجی نظریہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستان بھر میں قرآنی تعلیم کے ابتدائی مکاتب جا بجا قائم کئے جائیں۔ اس طرح ہر بستی کے ہر گھر میں قرآنی تعلیم کچھ اس طرح پھیلا دی جائے کہ جسے ان کے دلوں سے نکال باہر کرنا ممکن نہ ہو۔ اور سیاسی طور پر زوال کے اثرات ان کی فکری زندگی پر مرتب نہ ہوں۔ اس لئے کہ سیاسی زوال کے دور میں اگر کسی قوم کا اپنے فکر و نظریہ پر کامل اعتماد قائم رہے، تو وہ آگے چل کر کسی وقت بھی اپنے اندر اعلیٰ تنظیم پیدا کر کے سیاسی نظام بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر سیاسی زوال کے ساتھ فکری افلاس بھی پیدا ہو جائے اور اپنے فکر و نظریہ پر اعتماد نہ رہے، تو ایسی صورت میں قوم کا دوبارہ ابھرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس سوچ کے پیش نظر ان حضرات نے ”مکاتب تعلیم قرآنیہ“ کی ایک وسیع تحریک ملک بھر میں جاری فرمائی۔ ہر ہر بستی اور محلہ میں چھوٹے مکتب قائم کئے جس میں ”نورانی قاعدہ“ جیسا عام فہم قاعدہ پڑھا کر قرآنی الفاظ کی صحت اور تلفظ کی صحیح ادائیگی کو عام کیا گیا، اور دین اسلام کے بنیادی ضروری مسائل یاد کرائے گئے اور ان کی عملی مشق کے ذریعہ نوعمری میں ہی دینی حوالے سے پختگی پیدا کر دی گئی، بچپن میں ہی دل و دماغ پر قرآنی تعلیم کی ایسی چھاپ لگادی جاتی۔ کہ بڑے ہونے پر وہ جس ماحول میں بھی جائے اس کا دین اسلام کے بنیادی قرآنی نظریہ کے ساتھ محبت اور شیفتگی کا تعلق برقرار رہے۔ چنانچہ اس حوالے سے ہندوستان بھر میں مکاتب قرآنیہ کا جال پھیلا دیا گیا۔ اس سارے عمل کی نگرانی اور سرپرستی براہ راست حضرت اقدس رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ قرآن حکیم سے محبت و تعلق اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جس وسیع پیمانہ پر قرآنی تعلیم کو عام کرنے میں آپ نے جدوجہد فرمائی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ”مسدس مالٹا“ میں فرماتے ہیں:

چشمہ فضل و معدن احسان  
کاشف رمز علم القرآن  
محمل صدق قوم فخر زماں  
خیر کم من تعلم القرآن  
زینت زیب الف ثانی مرد  
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

ایک اور مسدس میں اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

ہوئے عثمان جامع قرآن  
 وہ بدہ تم تھے قاسم فرقان  
 تم بلا شک تھے نائب عثمان  
 آج سنسان کیوں نہ ہو میدان  
 زینت و زیب الف ثانی مرد  
 شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

ان حضرات کی حکمت عملی کے اس پہلو کا سب سے روشن رخ یہ ہے کہ اس طرح ہندوستان بھر کے ہر شہر، محلہ اور بستی میں مکاتب قرآنیہ قائم کئے گئے، اور اس کے ذریعے سے قرآنی تعلیم پر اعتماد اور پختگی پیدا ہوئی۔ اور دیگر افکار اور نظریات سے مرعوبیت کی بجائے آگے چل کر عام لوگوں میں آزادی و حریت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور قرآنی تعلیم کا عمومی پھیلاؤ سامنے آیا۔

قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت کا دوسرا پہلو:

ان حضرات کی قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لئے بنائی گئی حکمت عملی کا دوسرا پہلو انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ قدیم طرز تعلیم کے ذریعہ جو افراد دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں، ان میں گواہ ایک درجہ میں قرآنی تعلیم اور اس کے نظریہ سے محبت اور شیفتگی تو پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک درجہ میں دین اسلام پر اعتماد اور اس کی عظمت کا نقش بھی دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن چند ایک ذی استعداد اور سمجھدار علماء کو چھوڑ کر عمومی طور پر افراد کی جو کھپ تیار ہو رہی ہے، وہ زوال کے دور میں کام کرنے کی قرآنی حکمت عملی اور اس کی سیاسی اپروچ سے عموماً آشنا ہے، اس طرح دور جدید میں تعلیم یافتہ طبقے کو دین اسلام کی عالمگیر اور آفاقی حکمت سے آگاہ کرنے کے واضح شعور میں بندرتج کی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ افراد اسلام کے دور عروج میں لکھی گئی تفسیروں اور کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہنے کی وجہ سے دور زوال کے معروضی تقاضوں سے قطعاً آشنا ہوتے جاتے ہیں۔ دور زوال میں آزادی و حریت کے حصول اور اسلام کے حوالے سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیل نو کے جو مسائل اور تقاضے ابھر رہے ہیں، ان کا صحیح ادراک عمومی طور پر قدیم تعلیم یافتہ طبقہ میں نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآنی علوم کے حوالے سے ان کی تکمیل کے لئے مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت واضح طور پر سامنے آئی۔

دوسری طرف جدید تعلیم نے جہاں ہندوستان کی نوجوان نسل کو مغربی تہذیب و تمدن، اور اس کی سیاست اور معیشت کے نئے زاویے اور یورپین علوم و حکمت تو کسی درجہ میں سکھا دیئے۔ لیکن اسے قرآن حکیم کے انسانیت دوست عالمی فکر

اور خدمت انسانیت پر مبنی نظریہ سے ناآشنا رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے خطے کی وہ قومی روایات جن پر ہر معاشرہ اپنی سیاست اور معیشت کی بنیاد رکھتا ہے، اس سے نوجوان نسل کو بے بہرہ کر دیا۔ یعنی یورپین ممالک تو اپنی قومی روایات اور تاریخی سماجی رسوم کو اپنی جدید سیاسی زندگی میں پوری پوری اہمیت دے کر اپنے معاشرہ کی تشکیل نو کا کام سرانجام دیں۔ اور ہندوستان کی نئی نسل ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ قومی سیاسی روایات کو نظر انداز کر کے سامراجی ممالک کی سرمایہ پرستانہ سوچ اور نظریہ کی گرویدہ ہو جائے؟

اس طرح ہندوستان میں دو الگ الگ ایسے طبقے جدید و قدیم تعلیم کے حوالے سے پیدا ہونا شروع ہو گئے، جن کا نقصان قومی سطح پر ظاہر ہونے لگا۔ ایسے ماحول میں اس بات کی ضرورت تھی کہ قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایسے نہج پر دینی و قومی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے، جس میں قرآن حکیم کا انسانیت دوست حکیمانہ اسلوب اور اس کا عالمی سماج قائم کرنے کا آفاقی نظریہ پڑھے لکھے طبقہ کے سامنے آئے۔ یہ کام اپنی تمام تر وسعت اور اہمیت کے باوجود بڑی نزاکت کا حامل تھا۔ وہ اس طرح پر کہ اس کام میں ایک طرف یہ ضروری تھا کہ قرآنی انقلاب کے دنیا میں برپا ہونے سے لے کر آج تک تقریباً تیرہ سو سال کے علوم و افکار کی بنیادی اور اساسی روح اور آفاقی حکمت کو پیش نظر رکھا جائے یعنی گزشتہ دور کے تفسیری، حدیثی اور فقہی ذخیرہ کی اساسیات اور اس کی مربوط فلاسفی اور حکمت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہو۔ تو دوسری طرف دور زوال کے حقیقی اسباب معلوم کرنا۔ اور جدید دور میں معروضی تقاضوں کے پیش نظر سیاسی نتائج کے حصول کی حکمت عملی کی صلاحیت اور استعداد کا پیدا کرنا بھی انتہائی ضروری ہوا۔

گویا قرآن حکیم کی آفاقی روح کی اساس پر قائم قدیم علوم و معارف کے بنیادی اثاثہ سے استفادہ کرتے ہوئے، دور جدید کے تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک مربوط نظام فکر و عمل قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ افراد کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو سکے، جو ایک طرف اپنے قرآنی نظریہ کے حوالے سے کسی قسم کی مرعوبیت کا شکار نہ ہو بلکہ اس کی آفاقی حکمت پر مکمل عبور اور گرفت رکھتی ہو، اور دوسری طرف معروضی حالات کے تناظر میں قرآنی سیاست کی حکمت عملی سے بہرہ ور ہو۔

## جمعیت الانصار کا قیام

جدید و قدیم تعلیم یافتہ طبقات کی قرآنی علوم و معارف کے حوالے سے بلند تر تربیت کے حوالے سے ان اکابرین ثلاثہ یعنی حضرت اقدس رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وسیع تر نظام قائم کیا، اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ فکر و عمل کی اساس پر ”جمعیت الانصار“ کے نام سے اس عظیم کام کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو سندھ سے بلا کر اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری سپرد کی۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ اس سے پہلے دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ ”دارالرشاد“ پیر جھنڈا میں کام کر رہے تھے۔ یہ



ادارہ آپ نے ان حضرات اکابرین کے مشورہ سے ولی اللہی اسلوب پر تعلیم و تربیت دینے کے لئے شوال ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں قائم فرمایا تھا۔ چنانچہ سات سال تک سندھ میں ماحول بنانے اور ایک قومی مرکزیت قائم کرنے کے بعد حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو دیوبند بلا لیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے باقاعدہ سندھ کا سفر کیا اور وہاں کے ماحول کا جائزہ لے کر انہیں دیوبند آنے کے لئے فرمایا، چنانچہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سندھ میں دارالرشاد (پیر جھنڈا) تشریف لائے۔

تو حضرت نے مجھے ۱۳۲۷ھ سے دارالعلوم دیوبند میں قیام کا حکم دیا۔ (۱)

چنانچہ رمضان ۱۳۲۷ھ کے آخری عشرہ میں حضرت سندھی اپنے تیار کردہ دو تین حضرات کے ساتھ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے چند روز بعد ۲ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ برطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۹ء بعد نماز تراویح شب نوبت ”جمعیۃ الانصار“ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا، جس میں باقاعدہ طور پر اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔

قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کے حوالے سے جمعیۃ الانصار کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ”جمعیۃ الانصار“ کے ”قواعد و مقاصد“ کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

”ابو الحسین عبید اللہ بن الاسلام سندھی مدرسہ عالیہ دیوبند اور ”جمعیۃ الانصار“ کے متعلق معلومات تازہ کرنے کی غرض سے عرض پرداز ہے، کہ اہل علم کی نظر میں کوئی تعلیم گاہ (اس وقت تک) اسلامی دارالعلوم یا مذہبی یونیورسٹی نہیں بن سکتی جب تک اس میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات شائع کرنے والے معنوی خلفاء تیار کرنے کا پورا تہیہ (عزم) نہ کر لیا جائے، جن کی تفصیل میں شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں۔

المعتنین بتعلیم الشرائع والقرآن والسنن والامریین بالمعروف والنہیین عن المنکر والذین یحصل بکلامہم نصرة الدین.... الى آخرہ۔

ایسے افراد تیار کئے جائیں، جو قرآن و سنت اور شرائع دینیہ کی طرف بھرپور توجہ دیں اور سماجی زندگی کے ہر دائرہ میں بھلائی کا حکم دینے والے ہوں اور برائی سے روکنے والے ہوں، اور وہ ایسے افراد ہوں جن کے طرز گفتگو سے دین کا غلبہ اور اس کی نصرت ہوتی ہو۔“ (۲)

دینی تعلیم کی بنیادی خصوصیت بیان کرنے کے بعد حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں، کہ اس دور میں جدید و قدیم تمام طبقات کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے افراد کی ضرورت ہے، جو تمام طبقات کو اپنے فکر و عمل سے مطمئن کر کے قرآنی تعلیم کو غالب کرنے کا جذبہ بیدار کریں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”اس وقت جبکہ عام افراد قوم میں مذہبی تعلیم سے علیحدہ رہنے کے نقصانات کا ہلکا سا احساس پیدا ہو چلا ہے، نہایت ضروری ہے کہ حاملین دارالعلوم اپنے نظامات کو وسیع کر کے اس پیمانہ پر لانے کی کوشش کریں، جس سے تشنہ کام قوم کے تمام (جدید و قدیم) طبقات آسانی سے ابر ہو سکیں، لیکن اس قسم کی کوششوں سے پہلے اپنی منتشر قوم کا جمع کرنا اس درجہ ضروری ہے جیسے تعمیر مکان کے لئے اینٹ پتھر وغیرہ۔ جب تک سامان پورا امہیانہ ہو لے تو کسی تجویز میں کامیابی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔

الحمد للہ اس مبارک تمہید کی ابتدائی ”جمعیۃ الانصار“ کی صورت میں شمس الانمہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین اور فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم (جو بانی قدس سرہ کے ظاہری و باطنی جانشین ہیں) کی متفقہ کوششوں سے نمودار ہوئی۔“ (۳)

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے تربیتی نظام کا جو نقشہ ”جمعیۃ الانصار“ کے پیش نظر رہا، وہ انتہائی بلند تر خصوصیات کا حامل تھا، چنانچہ ”جمعیۃ الانصار“ کے ایک انتہائی اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس حوالے سے ایک بنیادی تربیتی نظام کے لئے چند دفعات منظور کی گئی، اس اجلاس کی کاروائی ضبط تحریر میں لاتے ہوئے، حضرت مولانا سندھی رقم طراز ہیں:

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ (۲۳ اپریل ۱۹۱۰ء) کو دیوبند میں جلسہ ”اجتماع الانصار“ منعقد ہوا، جس میں علاوہ تیس (30) اراکین جمعیت کے استاذ العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم العالی، صاحبزادہ عالی جاہ مولانا مسعود احمد گنگوہی سلمہم اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری مدظلہم العالی، جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ، جناب مولانا حبیب الرحمن مددگار مہتمم مدرسہ عالیہ سرپرستان ”جمعیۃ الانصار“ بھی شامل ہوئے، اس میں قواعد نمبر 61 سے 66 تک منظور کرنے کی تحریک کرتے ہوئے بندہ ناظم نے کہا۔“

حضرت سندھی نے اس اجلاس میں مذکورہ دفعات کے حوالے سے ایک تمہیدی تقریر فرمائی، اور پھر درج ذیل دفعات منظوری کے لئے اجلاس کے سامنے پیش فرمائیں:

”الانصار کے قواعد آپ کے سامنے موجود ہیں ”ان میں دفعہ نمبر (3) یعنی ”اس ”جمعیۃ الانصار“ کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید و حمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج و اشاعت ہے“ ایک امر مجمل ہے، میری رائے میں اس کی تفصیل کے لئے یہ موزوں ہو گا۔ (کہ درج ذیل دفعات 61 تا 66 کا اضافہ کیا جائے)

دفعہ نمبر ۶۱: ”جمعیۃ الانصار“ اپنے فرائض (یعنی مدرسہ کی تعلیمی، انتظامی اور مالی ترقی) کی تعین و تشخیص کے لئے پانچ شعبے قرار دیتی ہے:

(الف) تکمیل التعليم (ب) نظام التعليم (ج) الارشاد (د) التالیف والاشاعة (و) جلسہ علمیہ۔

دفعہ نمبر ۶۲: ”جمعیۃ الانصار“ کے شعبہ ”تکمیل التعليم“ کا فرض ہو گا کہ مدرسہ عالیہ دیوبند کے موجودہ نصاب کو ختم کرنے والے حضرات کے لئے جو درجہ تکمیل کھولا جاتا ہے، اس کی ضروریات مہیا کرے۔

تشریح دفعہ:

(الف).... درجہ تکمیل میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تالیفات اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کے خاندان کی کتابیں، مثل حجة اللہ البالغہ، خیر کثیر اور عبقات از شاہ محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ، تکمیل لا زہان از شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ وغیرہ اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے بعض کتبوبات پڑھائے جائیں گے۔

(ب).... علم تفسیر و کلام و ادب وغیرہ فنون کی اعلیٰ کتابیں بھی داخل درس ہوں گی۔

(ج).... تقریر و تحریر کی خاص مشق کرائی جائے گی

(د).... طریقہ تدریس و انتظام سکھایا جائے گا

دفعہ نمبر ۶۳: مدرسہ عالیہ دیوبند کی سرپرستی جو مدرسہ قبول کرے اور اس کے نظامات تعلیمیہ اپنے ہاں نافذ کرے، اس کی اصلاح اور امداد ”جمعیت الانصار“ کے شعبہ ”جمعیت نظام التعليم“ کا فرض ہوگا۔

دفعہ نمبر ۶۴: ”جمعیت الارشاد“ کی ذمہ داری ایسے افراد تیار کرنا قرار دیا گیا جس میں مذکر، واعظ اور تحریر و تقریر کا ملکہ رکھنے والے حضرات کی تعلیم و تربیت ہو۔

دفعہ نمبر ۶۵: ”جمعیت الانصار“ کے شعبہ جمعیت التالیف والاشاعت میں:

(الف).... ائمہ متقدمین۔

(ب).... حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ کے خاندان یعنی شاہ عبد العزیز و شاہ عبد القادر و شاہ رفیع الدین و شاہ محمد اسماعیل و شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(ج).... مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد قدس اللہ اسرار ہما کی تالیفات و تصنیفات کی حفاظت (یعنی کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں جمع کرنا) اور ان کی اشاعت بذریعہ طبع و نسخ و ترجمہ ہوگی۔

(د).... اور اسی منہاج پر جدید کتب و رسائل مختلف زبانوں میں تصنیف و شائع کرائے جائیں گے۔

حضرت سندھی رحمۃ اللہ نے ”اجماع الانصار“ کے سامنے یہ دفعات منظوری کے لئے پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر کے آخر میں درج ذیل الفاظ فرمائے۔

”یہ پانچ شعبے ہیں جو میری رائے میں دفعہ نمبر (3) کی تفصیل ہو سکتے ہیں، ان میں اچھی طرح غور فرمایا جائے اور اس کی منظوری دی جائے۔“

اس کے بعد حضرت سندھی اپنی تقریر پر شرکاء اجلاس کا رد عمل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

”اس تقریر کے ختم ہونے پر حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری اور جناب صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب نے ان خیالات پر تحسین و آفریں فرمائی اور جمعیت کے ساتھ پوری ہمدردی اور تعاون کا اظہار فرمایا،.... آخر میں تمام شرکاء اجلاس نے متفقہ طور پر ان دفعات مذکورہ بالا کی منظوری دی۔“ (4)

”اجماع الانصار“ کے اجلاس میں منظور کردہ ان دفعات کی روشنی میں جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ اس طرح ”جمعیت الانصار“ نے قرآنی تعلیمات کی آفاقیت، وسعت اور اس کے حکیمانہ اسلوب کو سمجھنے کے لئے ولی اللہی علوم و افکار کی اساس پر دینی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ اہتمام کیا اور دور زوال میں مسلمانوں کی ذمہ داری کس رخ پر عائد ہوتی ہے،

اس کو معلوم کرنے کے لئے زوال کے دور میں کام کرنے والے محققین علماء خانوادہ ولی اللہ کی کتابوں کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا باقاعدہ عمل شروع کیا۔ تاکہ اس دور کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے حوالے سے مستند فکر و عمل سامنے رہے۔ اور دور عروج میں مسلمانوں کے خوش کن حالات پڑھ پڑھ کر دین اسلام کے حوالے سے کسی خیالی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں، بلکہ دور زوال میں دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے زمینی حقائق سے آگاہ رہ سکیں اور دین کے غلبہ کی حکمت عملی صحیح نہج پر قائم کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔

ایک طرف تو ”جمعیۃ الانصار“ نے قرآنی علوم و معارف کو اس کی پوری روح کے ساتھ سمجھنے، تو دوسری طرف سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت اور ان کو قرآنی علوم و معارف سے آگاہ کرنے اور اس حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو سمجھانے کے لئے درج ذیل قواعد و ضوابط طے کئے۔ اس کی چند دفعات ملاحظہ ہوں:

”(۱).... انگریزی مدارس (گو نمٹ اسکول اور کالجوں) میں مسلمان طلبہ کی ”مذہبی تعلیم“ اور ان کے دارالاقامہ میں مسلمان طلبہ کی ”مذہبی تربیت“ کے لئے ”جمعیۃ الانصار“ کے ارکان و اعموان وقف ہوں گے۔“

اس دفعہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اہل علم کو گورنمنٹ سکولوں اور کالجوں میں اگرچہ بعض امور خلاف طبع پیش آئیں، لیکن مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لئے یہ تکالیف برداشت کرنی چاہئے۔“

ہمارا نصاب اس وقت فقط ارکان اسلام کی تعلیم ہوگی، جو عام مروجہ کتابوں، مثل راہ نجات و مالا بدمنہ کے ذریعہ دی جائے۔ ترجمہ قرآن شریف اور حدیث شریف کی کوئی مختصر کتاب اور علم الاخلاق کے چند اسباق بھی ساتھ شامل رہیں گے۔ ہمیں قطعی امید ہے، کہ ہماری جمعیت کے اراکین جب شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی حجتہ اللہ البالغہ اور مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کے رسائل پیش نظر رکھیں گے،.... جو ہمارے درجہ تکمیل کے نصاب میں داخل ہیں،.... تو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو اسلامی تعلیمات پر مطمئن کر دیں گے۔“ (۵)

## دفعہ دوم (۲)

ہر ایک انگریزی مدرسہ (سکول و کالج) میں کم از کم 25 فیصد طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو، ان کے لئے جمعیۃ انعامی وظائف جاری کرے اور انتظام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے لائق استاذ بہم پہنچائے۔

## دفعہ سوم (۳)

ایسے منتہی (گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ) طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو، ان کے لئے مدرسہ عالیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو، اور جمعیت ۳۰ یا ۳۰ ماہوار کے وظائف جاری کرے۔

## دفعہ چہارم (۴)

”جمعیۃ الانصار“ مدرسہ عالیہ دیوبند میں دو سال کے لئے ایک ایسی جماعت کھولے گی، جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دے سکے اور جس قدر تالیفات اس وقت تک اس باب میں لکھی جا چکی ہیں ان کے زیر مطالعہ ہوں۔ اس کے لئے دس سے بیس تک وظیفہ دیا جائے گا۔ (۶)

ان دفعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ”جمعیۃ الانصار“ کے پیش نظریہ بات تھی کہ ہماری وہ نونہال اور نوجوان جو جدید تعلیم کے حصول کے لئے سکولوں اور کالجوں کا رخ کرتے ہیں، ان میں قرآنی علوم و معارف کے بنیادی نظریات، عملی ذمہ داریوں اور ملی تقاضوں کا شعور بیدار کیا جائے اور انہیں قومی اور ملی ذمہ داریوں سے کچھ اس طرح آگاہ کر دیا جائے، کہ وہ برطانوی حکومت کے سیاسی مقاصد کا آلہ کار بننے کی بجائے قومی مقاصد کے لئے اپنی عملی ذمہ داریاں نبھائیں، اور ان کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ جہاں نسلِ آہندوستانی اور نام کے مسلمان ہیں، وہاں ان کا ذہن، فکر اور قلب و دماغ قرآنی علوم و معارف اور اس کی عملی ذمہ داریوں سے بخوبی آشنا ہو جائے۔

اس کے لئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی اور عملی کاوشیں اپنے مربوط اور سائنٹیفک نظام فکر و عمل کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ اذہان و قلوب کو بڑی عمدگی سے اپیل کرنے کی صلاحیت کی حامل ہیں۔ ولی اللہی نظام فکر حیات انسانی کے تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کے متعلق ایسی بنیادی راہنمائی فراہم کرتا ہے، جو جدید دور کی سماجی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ”جمعیۃ الانصار“ کے پیش نظریہ تھا کہ قرآن حکیم کے اس طرح کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر کے ذریعہ سے تعلیم و تربیت کا اعلیٰ نظام قائم کیا جائے۔

ایک طرف جدید و قدیم تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے لئے ”جمعیۃ الانصار“ نے تعلیم و تربیت کا یہ نظام قائم کیا، تو دوسری طرف قرآنی علوم و معارف کے حوالے سے عوام الناس کی تربیت اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے عمومی جلسوں کا نظام قائم کیا گیا ”جمعیۃ الانصار“ کے ابتدائی قواعد و ضوابط میں اس کے لئے ”جلسہ علمیہ“ کی اصطلاح مقرر ہوئی، لیکن پھر اس جلسہ کا نام ”موتمر الانصار“ رکھا گیا، اس عمومی جلسہ میں مقررین کے لئے جو دائرہ کار طے کیا گیا، اسے ایک دفعہ کے ذریعہ متعین کر دیا گیا:

دفعہ نمبر ۵۳: ”جلسہ علمیہ“ میں فقط قرآن شریف اور حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوا کریں گے“ (7)

گویا فرقہ وارانہ مسائل اور مناظرانہ مباحث اور سطحی اور رسمی تقریروں کی بجائے قرآن و سنت کی حکمت، مقاصد اور ان کے اسرار و لطائف اس انداز میں بیان ہوں، کہ سامعین کے قلوب میں قرآنی تعلیم کی عظمت اور محبت پیدا ہو، اور اس کے نتیجے میں قرآنی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرے اور جو ذمہ داریاں قرآنی تعلیمات کو ماننے والوں پر عائد ہوتی ہیں انہیں سمجھا جائے اور اس کے لئے عملی کوشش کی جائے۔ اس طرح عوام میں قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے اپنی قومی ذمہ داریوں اور ملی تقاضوں کا شعور بیدار کرنے کے لئے جلسہ عمومی کا انتظام کیا گیا۔

”مؤتمر الانصار“ کا پہلا جلسہ عام ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ کو مراد آباد میں ہوا اور دوسرا جلسہ ۸، ۷، ۶ اپریل ۱۹۱۲ء بمطابق ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کو میرٹھ میں منعقد ہوا اور تیسرا جلسہ عام ۱۰، ۹، ۸ اگست ۱۹۱۳ء شعبان ۱۳۳۱ھ کو ”شمشہ“ میں رکھا گیا۔ ان تمام اجلاس ہائے عام میں عام مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے شرکت کی اور ان میں عوامی تحریک پیدا ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنے بڑے اجتماعات منعقد کرنے کی یہ اولین کاوشیں تھیں جو انتہائی کامیاب رہیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایک تو جلسہ عام کے ذریعہ اجتماعیت پیدا کرنے کا رواج قائم ہوا، دوسرے یہ اجتماعات صاحب دل حضرات کے مواعظ اور خطبات سے مسلمانوں کے قلوب میں قرآن و سنت سے سچی محبت اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے اور یوں عملی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اجتماعی طاقت کا اظہار ہوا۔

قومی سطح پر اس اجتماعی طاقت سے فائدہ اٹھانے کا موقع اس وقت آیا، جب بلقانی ریاستوں نے برطانوی اور روسی سازش سے ۱۹۱۲ء میں ترکوں پر حملہ کر دیا اور جنگ بلقان نے خلافت عثمانیہ کے حصہ بخرے کرنے کے لئے تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا، تو دارالعلوم اور جمعیت الانصار نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لئے سر توڑ کوشش کی اور اس سلسلہ میں ”مؤتمر الانصار“ کی اجتماعیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ چنانچہ ”جمعیت الانصار“ کے تمام شعبے اس سلسلہ میں سرگرم عمل ہو گئے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں:

”بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا،.... حضرت مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتاویٰ چھپوائے، مدرسہ دیوبند کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے دئے اور ہر طرح سے مدد کی“ (۸)

چنانچہ ”جمعیت الانصار“ کے زیر نگرانی ”ہلال احمر“ کی شاخیں ہندوستان بھر میں قائم کرائی گئیں اور ہر جگہ سے ترکوں کی مالی اعانت کے لئے چندے کی تحریک کی گئی اور وفود کے ذریعے سے مسلمانوں کے قومی اور ملی جذبات کو ایک راہ عمل پر چلانے کی سعی و کاوش کی گئی۔ اس سلسلہ میں پورے ہندوستان میں گویا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک قومی اور ملی تحریک پیدا کر دی گئی، چنانچہ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ (جو گزشتہ ”القاسم“ میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود قسبات اور دیہات ہند کے تمام اطراف میں دورہ کر کے رؤساء، علمائے، مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہے ہیں، محض ان لوگوں کے مواعظ اور اس جماعت کی جدوجہد سے ایک بڑی مقدار جس کا تخمینہ تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے سے (ترکوں کے لئے) بھیجا گیا ہے، اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کے معرفت بھی پچھتر ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بینک کے توسط سے پریذیڈنٹ ”حلال احمر“ ”سطنطیہ“ کے نام سے پہنچایا گیا۔

یہاں اس قدر ذکر بے محل نہ ہوگا، کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب صدر انجمن ”ہلال احمر“ سہارنپور،

حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی، حکیم محمد یوسف گنگوہی، مولانا حکیم محمد احمد رام پوری کے مساعی جیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، م غرباء اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقم جمع کر لینا آسان نہیں۔“ (۹)

اس طرح ”جمعیۃ الانصار“ نے قرآنی علوم و معارف کی محض علمی و فکری تربیت کا ہی نظم نہیں قائم کیا، بلکہ بڑی حکمت عملی کے ساتھ برطانوی تسلط کے خلاف ترکوں کی امداد اور تعاون کرتے ہوئے قومی جدوجہد کے علمی رخ پر بھی کام سرانجام دیا۔

### عام فہم ترجمہ قرآن کی ضرورت اور ترجمہ شیخ الہند

”جمعیۃ الانصار“ کی ساری علمی و عملی جدوجہد کی بنیاد قرآن حکیم کی جامع تعلیمات سے نوجوانوں کو آگاہ کرنے پر تھی۔ اور اس عظیم الشان کام کے لیے ضرورت تھی ایک ایسے عام فہم ترجمہ قرآن حکیم کی، جس میں ایک طرف قرآن کریم کے حکیمانہ طرز فکر اور اس کی جامعیت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو، تو دوسری طرف وہ ایسے عام فہم اسلوب میں ہو، جس میں اپنے دور کے محاورات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ چنانچہ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کی پر از حکمت آیات مبارکہ کا اس دور کی اردو زبان میں پورا پورا اور صحیح ترجمہ کیا جائے، لیکن یہ کام وہ فرد کر سکتا ہے، جو ایک طرف رائج اردو کے اسلوب اور اس کے محاورات سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور اس حوالے سے اہل زبان ہو، اور دوسری طرف قرآن حکیم کی نصوص میں فصاحت و بلاغت بلند اسلوب اور اس کی آفاقی حکمت و سیاست کا بھرپور شعور رکھتا ہو۔ اس کام کے لئے سب کی نظریں شمس الائمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کی جانب تھیں۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ حضرت شیخ الہند کے بعض شاگردوں (حضرت تھانوی اور حضرت میرٹھی) نے قرآن کریم کے عام فہم اردو تراجم کر دئے تھے، اور جو ایک درجہ میں قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے، لیکن ایک ایسے ترجمہ قرآن کی بہر حال ضرورت موجود تھی، جس میں حکمت سے بھرپور اردو اسلوب میں قرآنی آیات کے پر از حکمت مطالب کا اظہار کیا گیا ہو۔ گویا انسانی سوسائٹی کے تمام انفرادی اور اجتماعی دائروں، سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں اور ملکی و بین الاقوامی نظاموں کے متعلق قرآن حکیم جو بنیادی راہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس حوالے سے آفاقی فلاسفی اور عالمی نظام کے احکام بیان کرتا ہے، قرآن حکیم کے جامع ترجمہ کے ذریعہ اس کے حکیمانہ فکر و عمل کا کلی اظہار سامنے آجائے، یعنی قرآنی نصوص اپنے حکیمانہ اسلوب میں انسانی زندگی کے تمام دائروں کے حوالے سے جس طرح عمومیت رکھتی ہیں، اس طرح ترجمہ میں اس عمومیت کا لحاظ رکھا جانا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر ”عارف حکمت یمانی“ حضرت اقدس شاہ عبد الرحیم رائے پوری قدس سرہ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ سے انتہائی اصرار کے ساتھ قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کے لئے فرمایا۔ اسی طرح امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے قرآنی حکمت و سیاست سیکھ کر اسے

اپنے دل و دماغ میں رچا بسا لیا تھا، اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے قرآنی نصوص کے بلیغانہ اسلوب اور فصاحت و بلاغت کے معجزانہ طریق کو شیخ الہند سے سیکھ کر پوری طرح جذب کیا تھا، ان ہر دو حضرات نے بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترجمہ قرآن حکیم کی درخواست کی، اس کے علاوہ وہ تمام مصالح بھی آپ کے پیش نظر تھیں جو گذشتہ گزری ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب "حیات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ" میں لکھتے ہیں:

"بعض اہل علم کی استدعا اور بہت سی مصالح سے، اور حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری قدس سرہ کی نہایت آرزو دیکھ کر، م حضرت مولانا (شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا" (۱۰)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرط پر یہ کام شروع فرمایا، کہ حضرت اقدس رائے پوری اس پر نظر ثانی فرمایا کریں، حضرت رائے پوری نے اسے منظور فرمایا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جتنا ترجمہ قرآن لکھتے، حضرت اقدس رائے پوری کے پاس "رائے پور" لے آتے یا حضرت رائے پوری دیوبند آجاتے، تو ایسے موقعوں پر حضرت شیخ الہند اپنا لکھا ہوا ترجمہ آپ کو سناتے تھے، یوں نظر ثانی کا کام ہوتا رہا۔ اس طرح تقریباً ایک تہائی قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا۔ چنانچہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں۔

"ہمیں حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ کی عظمت شان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ ترجمہ قرآن تحریر کر کے رائے پور لے جایا کرتے تھے اور ترجمہ حضرت رائے پوری کو سناتے تھے، اس وقت ہم متنبہ ہوئے کہ حضرت رائے پوری کا کتنا اونچا مقام ہے، جو ان کی تواضع اور انکساری کی وجہ سے اب تک ہم سے پوشیدہ تھا" (۱۱)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے، چونکہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کے قدیم اردو ترجمہ: "موضح القرآن" کو جدید اردو کے حکیمانہ اسلوب میں ڈھالا ہے، اس لئے حضرت رائے پوری کی مجلس میں اپنا ترجمہ سناتے وقت حضرت شیخ الہند اس کی وضاحت فرماتے تھے، کہ حضرت شاہ صاحب کے قدیم جملوں کی جگہ پر اختیار کردہ اردو جملوں اور محاورات کا انتخاب کس بناء پر کیا گیا، چنانچہ اردو جملوں کے انتخاب میں حکیمانہ وسعت اور جامعیت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ "ترجمہ شیخ الہند" کی تاریخی حیثیت، حکیمانہ اسلوب اور اس کے تحریری پس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ کیا، جبکہ ہندوستانی سلطنت ختم ہونے پر تھی، یہ ترجمہ عجیب زبانوں میں جتنے ترجمے ہوئے، ان سب میں بے نظیر تھا.... اس کے بعد شاہ صاحب کے بیٹوں نے اردو میں ترجمے شروع کئے، اس لئے کہ زمانہ بدل گیا تھا.... ان میں سب سے اچھا ترجمہ "موضح القرآن" شاہ عبد القادر دہلوی کا ہے۔ اس کی اردو آج بعض حیثیتوں سے متروک ہو رہی تھی، میرے استاذ حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آج کے دور کے موافق اس کی اردو درست کر دی.... خالی یہ ترجمہ پڑھنے سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، وہ فارسی میں بھی نہیں آتا،



اس لئے کہ اس میں جو حکمت کے کلمے ہیں، وہ ٹھیک ٹھیک ترجمہ کر دئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ حکمت کو حکیم ہی کا دماغ سمجھ سکتا ہے۔

ہمیں اس ترجمہ کے چند اوراق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند میں سنائے، اصل میں تو آپ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری کو یہ ترجمہ سنا رہے تھے، اس طرح ہم کو بھی سننے کا شرف حاصل ہو گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سنانے میں لگا، جس میں آپ نے شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ میں تبدیلیاں کر کے بتائیں اور بتایا کہ ان کی کیا ضرورت ہے۔ “(۱۲) اس طرح “جمعیت الانصار” کے حضرات سرپرستان نے قرآن حکیم کا ایک ایسا عام فہم اردو ترجمہ تیار کیا، جو سلف صالحین کے اصول اور ولی اللہی اسلوب پر قرآنی علوم و معارف کو عام کرنے میں اساسی اہمیت کا حامل قرار پایا۔ آج تمام اردو دنیا میں یہ ترجمہ اس حوالے سے معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

حضرات اکابرین ثلاثہ نے “مکاتب قرآنیہ” کے قیام اور “جمعیت الانصار” کے نظام کی صورت میں قرآنی علوم و معارف کے پھیلاؤ کے لئے جو تحریکات برپا کیں تھیں، ان کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا کہ رسمی طور قرآن کریم کی تعلیم کا انتظام ہو جائے، اور بے روح ادارے معنی ظاہری طور پر کھڑے کر دئے جائیں بلکہ اس تمام تر سعی و کوشش کا بنیادی اساسی مقصد یہ تھا، کہ دور زوال میں قرآن کی تعلیم کا لازمی اثر یعنی..... تحریک، جہاد و حریت..... کے حوالے سے نوجوانوں کو بیدار کیا جائے۔ ایک مسلمان جب قرآن پر اعتماد و یقین کا اظہار کرتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے، کہ وہ اغیار کی غلامی سے نجات حاصل کر کے پوری آزادی و حریت کے ساتھ اپنا نظام، اپنے انسانیت دوست نظریہ کے مطابق تشکیل دے سکے۔ چونکہ یہ دور زوال ہے، اس لئے ذلت کی زندگی سے نکلنے کے لئے آزادی کے حصول کی جدوجہد فرائض قرآنیہ میں سے ہے۔ چونکہ اس دور میں آزادی کے حصول کی حکمت عملی خفیہ رکھنا ضروری تھا۔ اور ظاہری طور پر کام کرنے میں کئی مشکلات تھیں، اس لئے ایک مخصوص مدت تک یہ کام مخفی طور پر جاری رکھا گیا اور ظاہری طور پر کام کے لئے راہ ہموار کی گئی۔

اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ “مکاتب قرآنیہ” قائم کرنے کی تحریک ہو، یا “دارالرشاد” (پیر جھنڈا) کا قیام ہو، “جمعیت الانصار” کا وسیع نظام ہو، یا آگے چل کر “نظارۃ المعارف القرآنیہ” کا وسیع ترین نیٹ ورک ہو، یہ سب “دارالعلوم دیوبند” کے مقاصد کو پھیلانے کی وہ ارتقائی صورتیں ہیں جو اپنے اپنے احوال و مقام پر بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اور دارالعلوم دیوبند وہ ادارہ ہے جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں جن مقاصد کے لئے قائم کیا تھا، اس کی وضاحت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

“حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مدرسہ کو محض درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم نہیں کیا

تھا، مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی

ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔“ (۱۳)

قرآنی علوم و معارف کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کا وہ نظام، جو ان حضرات نے قائم کیا؟ اس کا اساسی مقصد کیا تھا

اس نظام کے تیار کردہ اولین فرد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے نزدیک دارالعلوم دیوبند کا مرکز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی و جہاد حریت کے تسلسل کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اور یوں قرآنی علوم و معارف کا لازمی اثر جدوجہد آزادی کے حوالے سے متعین طور پر موجود تھا، چنانچہ ”جمعیۃ الانصار“ جیسی سرگرمیاں اس کی ارتقائی شکل کے طور پر منظم کی گئی تھیں، اور پھر یہ نظریہ اور فکر و عمل صرف حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ہی نہیں تھا، بلکہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کے تربیت یافتہ مخصوص خلفاء اور اوپر کی سطح کی مرکزی جماعت کے تمام حضرات کا ہی جذبہ تھا۔ چنانچہ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”لان الامر (الجہاد) لم یکن مقصوداً علی شیخنا فقط بل کان معہ جماعة من اتباع مولانا محمد قاسم نانوتوی و طائفة من اتباع مولانا رشید احمد مثل مولانا عبد الرحیم الرائی پوری“

ترجمہ: جہاد حریت کا کام صرف ہمارے شیخ حضرت شیخ الہند ہی نہیں کر رہے تھے، بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے تربیت یافتگان کی ایک جماعت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کے تربیت یافتہ خلفاء کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی، جیسا کہ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمہ اللہ ہیں۔“ (۱۴)

اس طرح گویا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت گنگوہی کے تربیت یافتہ حقیقی جانشین اور خلفاء ”جہاد حریت“ کے معاملہ میں مکمل طور پر متفق اور یکجان تھے، چنانچہ حضرت رائے پوری، حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری تینوں اجل خلفاء، جہاں اپنے عام مریدین سے ”بیعت سلوک“ لیتے تھے، وہاں مخصوص باصلاحیت اور منتخب اہل افراد سے ”بیعت جہاد و حریت“ بھی لیا کرتے تھے۔

”جمعیۃ الانصار“ کی تحریک نے ایسا ماحول تیار کیا، جس میں ایک طرف عام مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو منظم کر کے ان میں قرآنی نظریہ کے حوالے سے پختگی اور اعتماد پیدا کیا، تو دوسری طرف مخصوص باصلاحیت و عالی استعداد حضرات کی بلند تربیت کا بھی اہتمام ہوا۔ چنانچہ دیگر حضرات کے علاوہ خود حضرت سندھی رحمہ اللہ نے جو ”جمعیۃ الانصار“ کے روح رواں تھے، اس زمانہ میں اعلیٰ تربیت حاصل کی، چنانچہ آپ نے دیوبند کے سرپرست حضرات کے ماحول سے بہت کچھ سیکھا اور اس حوالے سے آپ کے ذہن و فکر میں پختگی پیدا ہوئی۔ بالخصوص حضرات سرپرستان حضرت شیخ الہند، حضرت رائے پوری اور حضرت سہارنپوری سے براہ راست آپ نے فیض حاصل کیا۔ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے ولی اللہی علوم و معارف کی کتابیں پڑھ کر انہیں اچھی طرح ہضم کیا اور اپنی روح کی گہرائیوں میں انہیں جذب کیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

”میں نے ”جمعیۃ الانصار“ کا کام تقریباً چار سال تک کیا، اس دوران ”حجۃ الاسلام“ از مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے اہم مقامات اور حضرت شیخ الہند کے ترجمہ ”موضح الفرقان“ کے اہم مقامات خود حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے پڑھے، مزید برآں یہ کہ اس ماحول میں رہ کر میں نے یہ سیکھا، کہ ہمارے طریقہ کے مخالف مسلمانوں کی جو دیگر جماعتیں ہیں، ان سے سیاسی معاملات میں کیسے اتحاد ممکن ہے اور یہ بات بھی سیکھی کہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے

ساتھ سیاسی اتحاد و اتفاق کیونکر ممکن ہے۔ یہ اس لئے کہ میں اپنے شیخ کے حکم سے ان معاملات میں پڑتا تھا، اور جہاں کوئی مشکل پیش آتی، تو ان کی طرف رجوع کرتا تھا، آپ بہت عمدہ طریقہ سے راہنمائی فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سیاسی معاملات میں جو راہنمائی فرماتے تھے، وہ عام طور پر سنن نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء راشدین کے اقوال و افعال سے مستنبط ہوتی تھی، پھر یہ مستنبط شدہ قول آپ اپنے استاذ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے نقل کیا کرتے تھے، یا آپ کا اپنا استنباط ہوتا تھا، تو اس کی تصریح فرمادیا کرتے تھے۔“ (۱۵)

اس طرح حضرت سندھی رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تعلیم اور دیوبند کے اونچے درجہ کے ماحول کی تربیت سے قرآنی علوم و معارف اور ان سے اخذ و استنباط کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ مکمل کیا اور اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادہ عالی مقام کی بیان کردہ قرآنی فلاسفی، اس کے اصول اور ان کے تراجم قرآن کی گہراہی اور عملی زندگی میں ان کے انطباق اور اخذ و استنباط کو بڑی عمدگی سے اخذ کیا۔ اور یوں حضرت سندھی رحمہ اللہ دیوبند کے اس اونچے قرآنی ماحول کے مزاج میں ڈھلتے چلے گئے، جو دنیا بھر میں اپنی وسعت گہرائی اور عملی زندگی کے حقائق سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے ممتاز حیثیت کا حامل تھا، چنانچہ آپ کے مزاج میں بھی قرآنی علوم و معارف کی وسعت کو سمیٹنے، اس کے عمق اور گہرائی کو جانچنے اور انسانی سوسائٹی میں اس کے عملی انطباق کا بلند ملکہ پیدا ہو گیا۔

۱۳۰۸ء / ۱۸۹۰ء میں آپ نے دیوبند میں قرآنی علوم کے جس مطالعہ کا آغاز فرمایا تھا، ”جمعیۃ الانصار“ کے سلسلہ میں دیوبند کے چار سالہ قیام میں اس مطالعہ کا ایک پہلو مکمل ہو جاتا ہے۔ یوں گویا ۳۲ سال تک حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی راہنمائی اور دیوبند کے ماحول کی تربیت اور صحبت نے آپ میں قرآنی علوم و معارف کی اساسی حکمت اور اس حوالے سے اخذ و استنباط کی بنیادی صلاحیت کو نکھار کر رکھ دیا۔ البتہ مطالعہ قرآن کا دوسرا پہلو، یعنی انسانی سوسائٹی پر قرآن کے عملی انطباق کے لئے اس دور کی معروضی سیاست، انسانی سماج کے بنیادی مسائل اور انسانیت دوست نتائج کے حصول کی بلند تر حکمت عملی کے حوالے سے ”جمعیۃ الانصار“ کا دور آپ کے لئے ابتدائی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کہ اس نشان راہ پر آپ نے تادم حیات سفر جاری رکھا۔ اس دور میں آپ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے جو سیاسی اسلوب سمجھا، اس کی بنیاد پر ملکوں اور قوموں کا مطالعہ کیا، عملی تجربات کئے، نتائج اخذ کئے اور اپنے فکر و عمل کو ایک ترقی یافتہ شکل دی اور اس پر جدوجہد کی۔

یہی وجہ ہے کہ آئندہ چل کر حضرت سندھی رحمہ اللہ نے ہندوستان کے اونچے درجہ کی سیاست اور یہاں کے حقیقی مسائل کا ہی ادراک نہیں کیا، بلکہ عالمی سطح پر برطانوی سماج کے نظام فکر و عمل اور یورپین سیاست کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس طرح قرآنی علوم و معارف کو دور کے معروضی تقاضوں کے تناظر میں سمجھنے اور اس کے غلبہ کے لئے عملی نتائج کے حصول کے حوالے سے آپ کے سامنے ایک بلند افق روشن ہو گیا۔ یوں ایک ایسا جامع تفسیری اسلوب واضح ہو کر سامنے آتا ہے، جو ایک طرف اصول تفسیر کے بنیادی اساسی اصولوں پر پورا اترتا ہے، تو دوسری طرف دور حاضر کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی مسائل کے بارے میں ایک واضح اور بلند تر فکری اور عملی حل پیش کرتا ہے۔ حضرت سندھی اپنے

تفسیری اسلوب کے تخلیقی مراحل اور اس کے مکمل پس منظر کا حال خود بیان فرماتے ہیں:

”اب ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ دیوبند سے پڑھا ہے اور دیوبندی سکول جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے اساسی فکر پر مرتکز ہے، چنانچہ۔

۱۔ دیوبند کی تعلیم،

۲۔ یورپ کی سیاست کا مطالعہ،

۳۔ اور شاہ ولی اللہ کا فکر۔

یہ تین چیزیں ہیں، جنہوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی بنادیا۔ .... قرآن کا اس طرح مطالعہ کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب قرآن حکیم دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت دیتی ہے، اور اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطہ نظر پر جمع کرے۔“ (۶۱)

دیوبند کے قیام میں حضرت سندھی نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کا فکر اور دیوبند کے ماحول کا بلند اجتماعی مزاج اپنے دل و دماغ میں رچا بسا لیا تھا۔ اب ضرورت تھی اس بات کی کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست کا صحیح تناظر میں مطالعہ کیا جائے اور سامراجی سیاست کے مقابلہ پر عملی نتائج کے حصول کے لئے محنت اور جدوجہد کی جائے۔

”نظارة المعارف القرانیہ“ کا قیام پس منظر اور مقاصد

۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کی ملکی سیاست اور بین الاقوامی حالات نے کروٹ لی، وہ اس طرح کہ برطانوی سامراج نے جب سے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، اس کا دار الخلافہ ”کلکتہ“ تھا۔ ظاہری طور پر ہندوستانی سیاست کا مرکز یہی شہر قرار پایا۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کا دار الخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل کر لیا۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو برطانوی بادشاہ جارج پنجم نے دہلی میں ایک بڑا دربار منعقد کیا اور دہلی کو برطانیہ کی ہندوستانی حکومت کا دار الخلافہ بنادیا۔ اور اسی موقع پر تقسیم بنگال کی نتیجہ کا اعلان بھی ہوا، جس سے ہندوستان کی قومی سیاست میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اور تمام تر سیاسی سرگرمیوں کا رخ ”کلکتہ“ کی بجائے ”دہلی“ کی طرف ہو گیا، اس طرح دہلی ہندوستانی سیاست کا مرکز و محور بن گیا۔

بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے بھی یہ سال بڑی اہمیت کے حامل تھے، وہ اس طرح کہ یورپین ممالک کی سرمایہ پرستانہ ذہنیت نے عالمی بحران کی شکل اختیار کر لی، انہوں نے اپنی فاضل پیداوار کی کھپت کے لئے اپنے زیر تسلط علاقوں میں اضافہ کے لئے جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ان کی ہوس زر نے پوری دنیا کو بحران میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس، اٹلی اور روس نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف صوبوں اور علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایسی ہولناک جنگوں کا آغاز کیا، جو آگے چل کر جنگ عظیم اول کی صورت اختیار کر گئیں۔ ایک طرف اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کی شہ پر ۳۰ ستمبر ۱۹۱۱ء کو طرابلس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا، تو دوسری طرف زار روس برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ سازش سے بلقان کی ریاستوں، بلغاریہ، مائٹی نیگرو، سربیا، البانیہ اور یونان نے ترکی کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ

سب سے پہلے مانٹی نیگرو نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ”باب عالی“ کے خلاف اعلان جنگ کیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے دوسری بلقانی ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ میں اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لئے شمولیت اختیار کر لی، اس طرح سرمایہ دارانہ ذہنیت نے عالمی سطح پر انسانیت دشمنی پر مبنی ایسی تباہی و بربادی مچائی، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، چنانچہ قرآن کو ماننے والی جماعت کے لئے انسانیت دوستی کی اساس پر یہ ضروری ہو گیا کہ اس کے خلاف اپنی عملی جدوجہد کو زیادہ زوردار طریقہ سے منظم کرے۔

ان قومی اور بین الاقوامی حالات کے مقابلہ پر یہ ضروری تھا کہ ہندوستان کی قوم پرست انسانیت دوست قوتوں کو یکجا جمع کیا جائے، بالخصوص مسلمانوں کے جو دودھڑے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ حضرات کے بنتے جا رہے تھے، انکی دوری کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ قوتوں کے خلاف قومی جدوجہد آزادی کو منظم کیا جائے، چنانچہ علی گڑھ کی نوجوان طاقت میں قرآنی تعلیمات کی اساس پر قومی جدوجہد کا شعور بیدار کرنا از بس ضروری ہوا، انہی سالوں میں علی گڑھ کی اولڈ بوائز یونین کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر نے کالج کے انتظامیہ کی سرکار پرستی سے تنگ آکر صحافت کے ذریعے قومی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا، پہلے کلکتہ سے انہوں نے ”کامریڈ“ کا آغاز کیا اور جب دارالحکومت دہلی آگیا، تو مولانا جوہر دہلی آگئے اور ”کامریڈ“ بھی دہلی سے نکلنے لگا۔ ”کامریڈ“ کے پہلے ہی شمارہ میں مولانا محمد علی جوہر نے ”جمعیت الانصار“ کے قومی تعلیمی پروگرام کی بھرپور تائید کی اور ”دیوبند“، ”علی گڑھ“ کے درمیان قومی نقطہ نگاہ سے تعلیمی پروگرام کی حمایت میں دار تحریر لکھی۔ چونکہ علی گڑھ کی انتظامیہ اس میں مخلص نہ تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ نوجوانوں کو قومی سیاسی پروگرام میں شریک کیا جائے اور اس کے لئے مولانا محمد علی جوہر کی وساطت سے ”دہلی“ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔

دیوبند کے حضرات سرپرستان حضرت اقدس رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے قومی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ طبقات کے درمیان قومی جدوجہد کے حوالے سے دہلی میں ایک مرکز قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی، اور باہم مشاورت سے یہ طے ہوا کہ ”جمعیت الانصار“ کے مقاصد کو ”دہلی“ کے مرکز سے باندھ دیا جائے، اس کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ جسے ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کا نام دیا گیا۔

چونکہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ جمعیت انصار میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اس طرح کام کر کے اپنی صلاحیت کا واضح اظہار کر چکے تھے، اور آپ میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ دلی الہی علوم و افکار کے اصول پر جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو اپنے دروس قرآن کریم سے اچھی طرح مطمئن کر سکتے تھے، نیز قومی سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے عملی سرگرمی میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور موافق حالات میں صبر و ہمت کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بھی آپ کو حاصل تھا۔ چنانچہ دہلی کے مرکز کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور ان حضرات اکابرین ثلاثہ نے حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ بنا کر دہلی بھیجے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ ان اکابرین ثلاثہ کی جماعت میں عملی نوعیت کے امور کی انجام دہی کی ذمہ داریاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے

سپر دتھیں، اس لئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اس مقصد کے لئے حضرت سندھی رحمہ اللہ کو دیوبند سے دہلی لائے اور وہاں اپنے متعلقین بالخصوص حکیم محمد اجل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے آپ کا تعارف کرایا۔ اور دہلی میں اس قسم کا ادارہ قائم کرنے کے لئے ہدایات دیں۔

چنانچہ ان حضرات کے ساتھ مل کر حضرت سندھی نے دہلی میں ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ قائم کیا۔ اس کے قیام کے اساسی مقاصد، پس منظر اور بنیادی نظام کار کے بارے میں حضرت سندھی رحمہ اللہ ”التمہید“ میں تحریر فرماتے ہیں:

”جب برطانوی حکومت نے اپنا ہندوستانی دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کیا اور اس سیاسی مرکز میں ملک بھر کی سیاسی جماعتوں کا اجتماع ہونے لگا، تو ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں شیخ الہند رحمہ اللہ کے حکم سے میر اقیام دہلی میں ہو گیا۔ یہاں میں نے ایک ادارہ ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ اور اس کے ذیل میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس ادارہ میں ”الفوز الکبیر“ میں بیان کردہ اصول تفسیر کی روشنی میں فن ”اعتبار“ کے طریقہ کار کے مطابق درس قرآن دیا جاتا تھا۔ اور ”حجۃ اللہ البالغہ“ اس طرح پڑھائی جاتی تھی کہ سیاست حاضرہ کے حالات سے بھی مکمل واقفیت حاصل ہوتی رہے۔

اس ادارہ میں مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما مثلاً علی گڑھ سے نواب وقار الملک، دہلی سے مسیح الملک حکیم محمد اجل خان حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ساتھ شریک کار تھے، اس ادارے میں مسلمانوں کے سیاسی راہنماؤں میں سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور علماء دین میں سے بھی نوجوان حضرات کا اچھا خاصہ اجتماع ہو گیا تھا۔ اگر ہمیں مستقل طور پر اس عمل کو جاری رکھنے کا موقع ملتا، تو مسلمان کے لئے اس سے اچھے نتائج سامنے آتے۔“ (۱۷)

یہ ادارہ ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ دہلی کی مشہور فتح پوری مسجد کے شمالی کمروں میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا قیام ۳۱ جون ۱۹۱۳ء مطابق ۸ رجب ۱۳۳۱ھ کو عمل میں آیا۔ اس کا افتتاحی جلسہ اسی دن جامع مسجد فتح پوری میں ہوا اور دوسرا جلسہ ۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو اسی جگہ منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے طبع شدہ اصول اساسی کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(الف) تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھانا۔

(ب) اسلامی مکاتیب، مدارس، اسکول اور کالجوں میں معلمین قرآن تیار کرنا۔

(ج) قرآن حکیم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا۔

(د) قرآن شریف کے مضامین کو عام فہم بنانا، اور ان کی اشاعت و ترویج کے لئے تمام ممکنہ وسائل عمل میں لانا۔

(ه) قرآن کریم پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا تحریر اور تقریراً جواب دینا۔

(و) عربی دان گریجویٹس کو ایک سال میں پورا قرآن حکیم اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھانا، اس کے ساتھ ساتھ ام الصالح موطاء مالک مع شرح شاہ ولی اللہ کو پڑھانا نیز بخاری، مسلم اور ترمذی کے اس قدر حصص پڑھانا جس سے طلباء ان کتب سے واقف ہو جائیں۔“ (۱۸)

اس طرح قرآنی علوم و معارف کے پھیلاؤ کے لئے جو حکمت عملی بنائی گئی، اس کے مطابق قرآن حکیم کو عام فہم انداز

میں کچھ اس طرح پڑھایا جائے کہ نوجوانوں میں دین اسلام کی اساسی اور بنیادی تعلیمات پر کامل اعتماد و یقین پیدا ہو، جذبہ جہاد و حریت پیدا ہو، اور دینی تعلیم سے نوجوانوں کے ذہن اس طرح بیدار ہوں کہ وہ برطانوی سیاسی مقاصد کا آلہ کار بننے کی بجائے قومی سیاسی شعور کے حوالے سے خود اعتمادی کے حامل بنتے چلے جائیں۔ اس طرح نوجوانوں میں قومی سیاست اور اس حوالے سے جہاد و حریت کا جذبہ پیدا ہوتا چلا جائے۔

”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ میں طلباء کی تربیت اور ان میں تحقیق و اجتہاد کی صلاحیت کو کس طرح نکھارا جاتا تھا اس کی وضاحت حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے سامنے آتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”ہم نے مدرسہ “نظارۃ المعارف” میں جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات میں سے پانچ پانچ افراد کا انتخاب کیا اور انہیں ایک کلاس میں اس طرح رکھا کہ دو دو افراد کے درمیان بھائی چارہ قائم ہو جائے۔ جدید و قدیم تعلیم یافتہ احباب میں دو دو کی جماعت میں ایک فرد واحد کی طرح بنادیا گیا۔ ان کی تعلیمی مشغولیت درج ذیل میدانوں میں مقرر کی گئی۔

(الف) کلام اللہ “قرآن حکیم” میں اس طرح غور و فکر کیا جائے کہ حالات حاضرہ میں اس کے نتائج عبرت بالکل واضح ہوں۔ گویا “عبرت” اور “اعتبار” کے اصول پر کلام اللہ میں غور و فکر۔

(ب) حجۃ اللہ البالغہ کو تحقیق سے پڑھنا۔

(ج) مسلمانوں کی قومی اجتماعی سیاست اور یورپ میں غالب سیاسی فکر و عمل کے درمیان موازنہ کرنا۔

اس طرح ان حضرات میں تحقیق و اجتہاد کا اچھوتا اور منفرد اسلوب پیدا کرنے کے لئے کوشش کی گئی۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور مجھے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں ہندوستان چھوڑنا پڑا، اس

طرح ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) میں یہ ادارہ حکومت نے سیل کر دیا“ (۱۹)

حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ادارہ میں تقریباً دو سال کام کیا، اتنے مختصر سے عرصہ میں آپ کے درس قرآن کے طرز نے دہلی میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ قرآنی علوم و معارف کے ان دروس نے جذبہ جہاد و حریت کچھ اس انداز میں پیدا کیا کہ برطانوی حکومت کے سیاسی مرکز میں اس کی لہریں محسوس ہونے لگیں، چنانچہ انگریز حکومت کی طرف سے اس کی جا سوسی ہونے لگی، جس کی کچھ تفصیلات ”ریشمی خطوط سازش کیس“ سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ برطانوی حکومت اس ادارہ کو کس نظر سے دیکھتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے اس کیس کے پیرا گراف نمبر ۷۱ سے ۲۰ تک میں کہا گیا ہے:

نمبر ۷۱:

یہ مدرسہ (نظارۃ المعارف القرآنیہ) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قرآن کی مبدیہ اور اصلی تشریح کے لئے قائم کیا گیا تھا، عربی زبان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، لیکن اس کا کوئی تعلق اس معاملہ سے نہیں۔

سازشیوں میں سے عبید اللہ ناظم اور احمد علی نائب ناظم تھے، خواجہ عبدالحی اور انیس احمد کو وظیفہ ملتا تھا، مولانا محمود حسن، مولوی ابوالکلام آزاد اور مولوی فضل الحسن (حررت موہانی) وزیئر اور قصور کے محی الدین اس کے رفقاء میں شامل تھے۔



نمبر ۱۸:

عبید اللہ نے قرآن کی جو خاص تشریح و تفسیر بنائی وہ جہاد کی فرضیت کے بارے میں تھی، اس موضوع پر عبید اللہ کی تعلیمات کو انیس احمد نے ”تعلیم قرآن“ اور ”کلید قرآن“ نام کی دو کتابوں میں ۱۹۱۳ء/۱۹۱۵ء میں تعین اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نمبر ۱۹:

ان دونوں کتابوں میں مختصر ہندوستانی مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ان کی موجودہ حالت محکومی کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑے مذہبی فریضہ جہاد کو نظر انداز کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے شروع کے متبعین نے اس فریضہ پر عمل کر کے دنیاوی اقتدار اور مذہبی سر بلندی حاصل کی تھی۔

نمبر ۲۰:

اس درس کے علاوہ جو ”نظارہ“ میں دیا جاتا تھا اور جو صریحاً درست نہیں تھا، یہ ادارہ ساز شیوں کے وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے کے لئے بھی ایک تخلیہ گاہ کا کام دیتا تھا۔“ (۲۰)

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا سندھی رحمہ اللہ کی راہنمائی میں ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ محض درس و تدریس کا ایک مدرسہ ہی نہ تھا، بلکہ قرآنی علوم و معارف کا ایک ایسا جاندار طرز و فکر و عمل تھا، جس کے اثرات مسلمانان برصغیر کی قومی زندگی پر نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں، اس ادارہ میں جہاں قرآنی علوم و معارف کے بلند پایہ افکار عالیہ کو سمجھنے سمجھانے اور شعور بیدار کرنے کا کام ہوتا تھا، وہاں انگریز سامراج کے خلاف جذبہ جہاد و حریت بھی بھر پور طریقہ سے پیدا کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تک محققین علماء ربانین کے اساسی فکر و عمل کو بنیاد بنا کر قومی سیاسی جدوجہد کے لئے افراد سازی کے لئے ماحول بنایا گیا تھا، اس طرح قرآن حکیم کی تفسیر و تشریح کا ایک ایسا وسیع اسلوب اور طرز تعبیر سامنے آیا جو فکر و حکمت کی آفاقیت، وسعت اور گہرائی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قومی جذبہ جہاد کے لئے جوش عمل کو منظم کرنے کی خصوصیت لئے ہوئے ہے۔

”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ محض چند طلباء کی تعلیم و تعلم تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ ادارہ ایک ایسے ماحول کا نام تھا، جس کے اثرات ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی تیزی کے ساتھ منتقل ہوئے۔ اس ادارہ نے کلکتہ سے کراچی تک کی قوم پرست مسلمان قوتوں کو منظم کیا، قرآن حکیم کی عالمی حکمت کے عملی انطباق کے حوالے سے واضح فکر دیا۔ فرضیت جہاد کے حوالے سے واضح جذبہ عمل پیدا کیا، قومی سیاست کا دو ٹوک اظہار دیا، بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے جدوجہد کا قطعی راستہ متعین کیا اور ان تمام پہلوؤں کے حوالے سے کراچی سے کلکتہ تک جتنی چھوٹی چھوٹی قوتیں اپنی اپنی



جگہ کام کر رہی تھیں، انہیں ہندوستان کی سطح پر ایک قومی نظم میں پرو دیا۔ ان میں باہمی ارتباط فکرو عمل پیدا کیا۔ رشد و ہدایت کا وہ سلسلہ جو دیوبند، گنگوہ، رائے پور اور سہارنپور کے افق سے ہندوستان میں طلوع ہوا تھا، وہ پورے ملک میں پھیلتا چلا گیا، چنانچہ حیدر آباد سندھ کے قریب پیر جھنڈا کا ”دارالرشاد“ ہو یا ”جمعیۃ الانصار“ ”کاشعہ“ ”جمعیۃ الارشاد“ ہو، وہ ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کا سلسلہ رشد و ہدایت ہو یا کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قائم کردہ ”دارالارشاد“ ہو، یا پھر جامعہ ملیہ میں قائم کردہ ”سلسلہ الارشاد“ اور ”دارالرشاد“ ہو۔ یہ سب کے سب دیوبند اور گنگوہ کے اسی سلسلہ عالی کے فیضان فکرو عمل کے اثرات اور نتائج ہیں۔ چنانچہ کلکتہ کے دارالارشاد کے بارے میں ”ریشمی خطوط سازش کیس“ میں واضح طور پر پیرا گراف نمبر ۲۷، ۲۸ میں تحریر ہے:

”مولوی ابوالکلام آزاد نے اگست ۱۹۱۵ء میں مولوی عبید اللہ سے مشورہ کے بعد ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے خطوط پر کلکتہ میں مدرسہ قائم کیا، جس کا نام ”دارالارشاد“ رکھا، اس مدرسہ میں ابوالکلام آزاد تعلیمات قرآنی کا درس دیا کرتا تھا۔ عبید اللہ کی طرح ابوالکلام کے درس میں بھی سچے مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت کے بارے میں زور دیا گیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تقریروں کی یادداشتوں کے مجموعے طلبہ نے تیار کئے تھے۔“ (۲۱)

”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے قرآنی اسلوب تفسیر نے مسلمانوں کے اہم ترین اداروں اور ان کے روح رواں افراد کی زندگیوں میں ایسی تبدیلی پیدا کی، جس نے آئندہ چل کر قومی تحریکات کی صورت گری میں بنیادی کردار ادا کیا، علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ مخلص افراد کو اس اسلوب تفسیر نے جس خوبی سے متاثر کیا، اس کا اثر و نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگیوں میں انقلاب آگیا۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کی اولڈ بوائز یونین کے روح رواں محمد علی جوہر کی زندگی میں واضح تبدیلی کا اثر اسی اسلوب تفسیر قرآن کی وجہ سے پیدا ہوا، چنانچہ مولانا محمد علی جوہر حضرت سندھی کی رفاقت اور نظارہ کے ماحول کی وجہ سے ”تحریک ریشمی رومال“ کے سرگرم افراد میں شمار ہوتے ہیں، اور میدان صحافت میں ترکوں کی امداد و اعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں سے ہیں۔ مولانا جوہر ایک طرف تو ”نظارہ“ کے قائم کردہ ماحول سے متاثر ہوئے، تو دوسرے طرف جب جہاد و حریت کے لئے کام کرنے کی بناء پر نظر بند ہوئے تو قرآن کے مطالعہ نے آپ کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

”میری پہلی زندگی اور بعد کی زندگی میں علاوہ پیشتر پابندی احکام شریعت کے بس اس قدر فرق ہے کہ پہلے اسلام سے کم واقف تھا، اور ایک معنی میں اس پر بڑی حد تک ایمان بالغیب تھا اور جب سے نظر بندی کے زمانہ میں میں نے قرآن کریم پہلی بار شروع سے آخر تک با معنی اور سمجھ کر پڑھا، میں سمجھتا ہوں کہ میں اسلام کے جوہر اور اس کی روح کو سمجھ گیا ہوں اور تجربہ یورپ و ایشیاء کے بعض ممالک کے مشاہدے نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ مذہب اسلام تفسیر حیات ہے اور زندگی کے لئے آخری اور بہترین نظام ہے۔“ (۲۲)

مولانا محمد علی جوہر کے متعلق ”ریشمی خطوط سازش کیس“ میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس طرح ہے:

”جنود ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے، محمد علی ایم اے.... دہلی کے اخبار ”کامریڈ“ کا بدنام ایڈیٹر ہے....“

ڈاکٹر انصاری کا گہرا دوست اور عبید اللہ کا قریبی ساتھی ہے۔“ (۲۳)

اس طرح قرآنی تعلیمات اور اس کے علوم و افکار کے پھیلاؤ کے لیے ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ نے جو ماحول ہندوستان بھر میں پیدا کیا، اس نے ملک کے طول و عرض میں قرآن حکیم پر غور و فکر کے نئے دریچے کھول دیے۔ انفرادی اور اجتماعی مسائل بالخصوص سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اور یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ جب برطانوی سامراج اس خطہ میں ایک طرف مذہب سے وابستہ طبقات کو سیاست اور جہاد سے الگ کر کے اپنے مقاصد پورے کر رہا تھا، تو دوسری طرف عقل پرستی کے نام پر مذہب کی آفاقی اور انسانیت دوست تعلیمات سے دور کر کے انہیں فرقہ وارانہ راستہ پر گامزن کر کے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے بطور آلہ کار استعمال کر رہا تھا۔ تو ایسے ماحول میں پورے عقل و شعور اور فہم و بصیرت کے ساتھ قرآنی تعلیمات کی انسان دوست حکمت سے جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنوں کو منور کرنا اور مذہب و سیاست اور عقل و شعور کا امتزاج پیدا کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور جذبہ جہاد کے ذریعہ برطانوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کی قومی جدوجہد کی راہ ہموار کرنا اس پر مستزاد ہے۔

”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے قائم کردہ ماحول نے ہندوستان کے ہر مخلص تعلیم یافتہ کو بنیادی طور پر متاثر کیا۔ جس کا اظہار آئندہ چل کر تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات اور جامعہ ملیہ، جمعیت علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کی صورت میں ہوا، اور جو بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوستان کی قومی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ ان تمام تحریکات اور جماعتوں کے پس منظر میں وہی جذبہ کار فرما ہے جو ”نظارۃ“ نے پیدا کیا، اور ”نظارۃ“ کا اصل کام بھی یہی تھا کہ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس کے مندرجہ بالا نتائج ظاہر ہوں۔ چنانچہ اس ماحول نے افراد سازی اور قومی جماعت سازی میں بنیادی کردار ادا کیا۔

”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ قائم کرنے والے تینوں حضرات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، قطب عالم حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری، قطب الارشاد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ایک مرتبہ اپنے مربی و راہنما امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت عالیہ میں تشریف فرما تھے، حضرت شیخ الہند نے آپ سے پوچھا کہ ”حضرت! زوال کے دور میں کام کرنے کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے، آیا کتابیں تصنیف و تالیف کر کے نشر و اشاعت کی جائے یا افراد کی تربیت کر کے یہ کام سرانجام دیا جائے“ اس پر قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ”بھئی! تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد تیار کرنا کتابیں لکھنے لکھانے سے زیادہ بہتر ہے۔ گو افراد بنانا مشکل کام ہے لیکن اصل یہی ہے۔“ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد آپ کے منیوں اجل خلفاء اور جانشین حضرات نے اپنے قلب و دماغ میں بٹھا لیا۔ چنانچہ ان حضرات نے سوائے چند ایک ضروری تحریرات کے افراد کے قلوب میں قرآنی علوم و معارف اور ان کے مقاصد اور ذمہ داریوں کا جذبہ صادقہ منتقل کیا ہے۔ اور اس حوالے سے افراد سازی اور جماعت سازی کا کام کیا ہے؟

اس تناظر میں ”نظارہ المعارف القرآنیہ“ کے پیدا کردہ ماحول نے ایسے افراد تیار کئے، جنہیں دنیا کا کوئی مفاد، خود،

غرضی اور لالچ یا دباؤ اپنے مقاصد سے منحرف نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے افراد بنائے جو قرآن حکیم کی عظمت و محبت کو دل میں بٹھا کر اس کے بتلائے ہوئے قومی جدوجہد آزادی کے راستہ پر بے دھڑک آگے بڑھتے چلے گئے، انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دے کر قرآنی نظریہ کے پھیلاؤ اور وطن کی آزادی کے لئے کام کیا، بڑے بڑے مصائب اور مشکلات کے پہاڑ ان پر ٹوٹے لیکن وہ نہ جھکے نہ بکے، بلکہ بڑی ہمت، جرات اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے قرآنی مشن پر پورے تسلسل کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ چنانچہ ایسے افراد کی فہرست بہت طویل ہے، جنہوں نے قربانیاں دیں۔ ان میں بعض نے شہرت پائی اور بہت سے ایسے گمنام ہیں، جن کی قربانیاں صفحہ قرطاس پر نہیں آئی۔

وہ اہم ترین اور جامع افراد جنہوں نے ان تینوں بزرگوں کی صحبت اٹھائی اور ان کے فیضان سے تربیت پاکر ”جمعیۃ الانصار“ اور ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کا ماحول بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا اور اسی حوالے سے کمال کو پہنچے، وہ قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی جیسی عظیم شخصیات ہیں۔ فکر و عمل کے یہ وہ جامع حضرات ہیں جو قرآنی علوم و معارف کی ولی اللہی تفسیر و تعبیر کے علمی اور عملی ترجمان ہیں۔ ان حضرات نے عظیم قربانی اور محنت سے نہ صرف ابتدائی دور میں قرآنی علوم و معارف کا بہترین ماحول بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا، بلکہ آئندہ کے ادوار میں حضرت ثلاثہ (حضرت عالی رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ) کے جانشین کے طور پر ان کے فکر و عمل کو پوری جامعیت کے ساتھ قائم رکھا۔ یہی نہیں بلکہ قرآنی علوم و معارف کی اساس پر قومی جدوجہد آزادی کے لئے افراد سازی اور جماعت سازی کے عمل کو نہایت عمدگی سے جاری رکھا۔ ان حضرات میں گو شخصیات کے تنوع اور حالات کے اختلاف سے عملی ذمہ داریوں کی نوعیت مختلف رہی ہے۔ لیکن ان حضرات کا بنیادی فکر و عمل، حضرت الامام ولی اللہ دہلوی کے جامع اسلوب تفسیر و تعبیر کا نشان امتیاز تھا۔

اس صدی کی ساٹھ کی دہائی تک ان جامع ترین شخصیات نے اپنے انفس قدسیہ، بلند فکر اور بہترین اور منظم جوش عمل کے ذریعہ قرآنی علوم و معارف کے اس جامع اسلوب کے ذریعہ ملک و ملت کی خدمات سر انجام دیں۔ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ اپنے دور کے معروضی تقاضوں کے پیش نظر اس دور کے چیلینجز کا مقابلہ کیا اور بہترین لائحہ فکر و عمل بنا کر عظیم جدوجہد فرمائی، بلکہ اس جامع فکر و عمل کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے لئے بھی انتھک محنت کی، دین اسلام کا وہ بلند نظریہ جو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ انسانیت دوستی کا درس عام کرتا ہے، اسے نوجوان نسل کے قلوب و اذہان میں پیدا کرنے کے لئے شعوری جدوجہد کی اور اپنے قلب کے جذبہ صادقہ سے کام لے کر اس عظیم نظریہ فکر و عمل کو آئندہ نسلوں کے سپرد کیا۔

فجزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔

## حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

”جمعۃ الانصار“ اور ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والوں میں ایک نام حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ زیر نظر سلسلہ ”تفسیر الفرقان فی معارف القرآن“ آپ کے ہی قلم کا شاہکار ہے۔ دیوبند اور دہلی کے ماحول میں جو کچھ آپ نے سیکھا سمجھا اور دیکھا ”جامعہ ملیہ اسلامیہ“ کے استاذ تفسیر اور ناظم دینیات کی حیثیت سے آپ نے اسے قلمبند کر لیا۔ یہ سلسلہ تفسیر ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے جامع اسلوب تفسیر و تعبیر کا ایک حصہ ہے۔

حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۸۷ء میں ضلع گورداس پور کی تحصیل ”شکر گڑھ“ میں خواجہ عبدالحییم کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول گورداسپور سے میٹرک پاس کیا اور پھر اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن کیا، اس کے بعد دینی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے دورہ حدیث پڑھا اور سند فضیلت حاصل کی۔

”جمعۃ الانصار“ نے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے جو تعلیمی نظام قائم کیا تھا، اس نظام کے مطابق حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے خوب خوب مستفید ہوئے، حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی ملاقات اور استفادہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کہہ نہیں سکتا کہ ان (حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ) سے مل کر کس قدر مسرت و شادمانی اور اطمینان قلب نصیب ہوا، اس کیفیت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے، مولانا کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، وہ جب تک (دیوبند) میں رہے قرآن کریم اور حجتہ اللہ البالغہ کا درس برابر ہوتا رہا۔ سردی کی راتوں میں بارہا ایسا ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد درس شروع ہوا تو رات کے نین چار بج گئے اور استاد و شاگرد میں سے کسی نے بھی تھکن محسوس نہ کی.... دن رات یہی مشغلہ تھا، ان محنتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں درس و فکر کا ذوق پیدا ہو گیا۔“ (۲۴)

”جمعۃ الانصار“ کے زمانہ میں خواجہ عبدالحی فاروقی دیوبند کے ان طلباء میں سے تھے، جو حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ تھے۔ چنانچہ ریشمی خطوط سازش کیس میں بھی ان کے اس تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

”خواجہ عبدالحی پسر خواجہ عبدالحییم.... دیوبند میں عبید اللہ سندھی کا بہت مخلص ساتھی تھا.... وہ دیوبند میں مولانا محمود حسن کے مکان میں خفیہ میٹنگوں میں شامل ہوا کرتا تھا،“ بنو دربانہ ”کی فہرست میں کرل ہے۔“ (۲۵)

دیوبند سے فراغت کے بعد طے شدہ حکمت عملی کے تحت آپ گورنمنٹ کالج میرٹھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے، وہاں آپ نے نوجوانوں میں کام کیا اور اسی دوران ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ دہلی کے مرکز سے آپ نے اپنا تعلق

مسلّم قائم رکھا۔ اور وہاں سے تعلیم و تربیت کے ساتھ کام کرنے کے لئے ہدایات اور راہنمائی بھی لیتے رہے۔ اور تحریک ریشمی رومال کے خفیہ کاموں میں شریک رہے۔

جب حضرت سندھی تحریک ریشمی رومال کے سلسلہ میں کابل تشریف لے گئے، تو آپ کالج کی پروفیسری چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ اس دور ان انہوں نے تحریک کا کام گورداسپور میں بھی کیا اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کیا۔ چنانچہ سی آئی ڈی کے ریکارڈ میں ہے:

”اگست ۱۹۱۵ء میں اس نے گورداسپور میں تقریر کر کے لوگوں کو جہاد پر ابھارا تھا، کچھ عرصہ تک وہ اخبار ”اقدام“ کلکتہ کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل رہا۔ وہ ابو الکلام آزاد اور محی الدین عرف برکت علی قصوری کا ساتھی رہا، یہ سب کے سب انتہائی درجہ میں اتحاد اسلامی کے حامی ہیں۔“ (۲۶)

تحریک ریشمی رومال کے کاموں کے سلسلے میں خواجہ صاحب کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی چونکہ حضرت سندھی رحمہ اللہ کی مشاورت سے مولانا آزاد نے ”دارالارشاد“ قائم کیا ہوا تھا، کلکتہ میں آپ تحریری کام کرتے تھے، اور مولانا ابو الکلام آزاد کے درس قرآن سے بھی مستفید ہوتے تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں:

”آخر مولانا سندھی رحمہ اللہ افغانستان کو روانہ ہو گئے اور میں تین سال کے بعد کالج کی پروفیسری چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا، جہاں

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد ”دارالارشاد“ میں شب کے وقت قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے اور ایک عجیب و دلفر

یب ایمانی کیفیت قلوب و اذہان میں پیدا کرتے تھے“ (۲۷)

گویا خواجہ صاحب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت سندھی کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کے درس قرآن سے بھی مستفید ہوئے، اس طرح ان کا اصل کام تحریک آزادی کے حوالے سے تھا، اس لئے جیسے ہی ریشمی خطوط حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے، ہندوستان میں تحریک کے اراکین کی گرفتاریوں اور تلاشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا آزاد کو حکومت نے ”راپٹی“ میں نظر بند کر دیا اور خواجہ صاحب کو کلکتہ چھوڑنے کا حکم ملا تھا۔ چنانچہ آپ لاہور آچکے تھے، اس لئے انہیں لاہور شہر کی میونسپل حدود کے اندر نظر بند کر دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ پنجاب سی، آئی، ڈی کے دفتر میں ہفتہ وار اپنی حاضری کی اطلاع کریں۔

اس دور ان خواجہ صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور کے نوجوانوں میں قرآن کریم کے درس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور بہت سے نوجوانوں سے ملاقات کر کے ان میں آزادی کے حوالے سے جذبات پیدا کرنے کا کام جاری رکھا۔ اس کے نتائج آگے چل کر ظاہر ہوئے۔

تحریک ریشمی رومال کے راز ظاہر ہونے پر حکومت برطانیہ نے رولٹ کمیشن قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے انتہائی تحریکات سے نمٹنے کے لئے ”رولٹ ایکٹ“ کے نفاذ کی سفارش کی، تاکہ مستقبل میں اس نوع کی تحریکوں کا گلا گھونٹا جاسکے۔ چنانچہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء ایکٹ امپریل لیجسلیٹو کونسل سے پاس کرایا گیا، اس ”کالے قانون“ کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی

تحریک شروع ہو گئی، اس دور ان ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امر تسر“ میں جلیاں والہ باغ“ کا حادثہ فاجعہ پیش آیا اور ۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو پورے پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

“رولٹ ایکٹ“ کے خلاف جو احتجاجی تحریک چلی، حضرت خواجہ عبدالحی صاحب نے اس میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے تیار کردہ نوجوانوں کے ذریعہ لاہور میں مارشل لاء کے خلاف بھرپور رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ اور اس سلسلہ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ چنانچہ بادشاہی مسجد کا سب سے پہلا مقدمہ تھا جو سپیشل ٹریبونل میں پیش ہوا اور خواجہ صاحب کو “عبور دریائے شور“ اور “ضبطی جائیداد“ کی سزا دی گئی اور ۱۵ دن لاہور سنٹرل جیل میں رکھ کر ملتان سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

تقریباً ڈیڑھ سال تک ملتان سنٹرل جیل میں گرفتار رہنے کے بعد اکتوبر ۱۹۲۰ء میں آپ کو رہائی ملی۔ انہی دنوں علی گڑھ میں “جامعہ ملیہ“ کا قیام عمل میں آ رہا تھا، چنانچہ اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت اور اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علی گڑھ تشریف لے گئے، تو خواجہ صاحب بھی رہا ہوتے ہی سیدھے علی گڑھ پہنچے اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے۔

اس موقع پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر نے باہم مشورہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تفسیر و دینیات کا صدر خواجہ صاحب کو مقرر کر دیا۔ اور آپ کو لاہور سے علی گڑھ آنے کا حکم دیا، آپ نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس شعبہ کو کمال خوبی سے چلایا اور مفوضہ ذمہ داریوں کو نبھایا۔ ۱۹۵۰ء تک حضرت خواجہ صاحب جامعہ ملیہ کے شعبہ تفسیر و دینیات میں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ تقریباً ۳۰ سال تک مسلسل آپ نے جامعہ میں قرآن حکیم کا تفسیر و ترجمہ پڑھایا ہے۔

اس دور ان آپ کو امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کے ہندوستان واپسی کے بعد ان سے دوبارہ استفادہ کا بہت موقع ملا، جامع میں حضرت سندھی کے قیام سے آپ نے بھرپور استفادہ کیا۔ بالخصوص حضرت سندھی رحمہ اللہ کے تفسیر اسلوب میں جو آفاقیت، وسعت اور گہرائی ۵۰ سالہ تجربات کے نتیجے میں پیدا ہو چکی تھی اور اس کے پیش نظر میں آپ ہندوستان میں قرآن حکیم کی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لئے جو انقلابی حکمت عملی رکھتے تھے، اسے خواجہ صاحب نے خوب سمجھا اور اس کے مطابق کام کیا۔

حضرت سندھی رحمہ اللہ کے وصال (اگست ۱۹۴۳ء) کے بعد خواجہ صاحب نے قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت کا تعلق قائم کیا اور آپ کی تربیت اور صحبت سے خوب مستفید ہوئے۔ اکثر رائے پور حاضری دیتے اور بسا اوقات حضرت رائے پوری کے طویل اسفار میں بھی ساتھی رہتے تھے۔ آپ کو حضرت اقدس رائے پوری ثانی قدس سرہ سے بہت محبت اور تعلق تھا۔ اور حضرت اقدس بھی آپ کی طرف مخصوص توجہ فرماتے تھے، اکثر علمی مجالس میں آپ سے تفسیری نکات دریافت فرماتے اور حضرت سندھی رحمہ اللہ کا تفسیری نقطہ نظر آپ سے معلوم فرماتے تھے، خواجہ صاحب کا یہ تعلق آخر تک قائم رہا۔

جامعہ ملیہ میں جب پچیس سالہ جوبلی منائی جا رہی تھی اور جامعہ کے مغربی جانب ایک مسجد بنانے کا فیصلہ ہوا، اس موقع پر جامعہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حضرت خواجہ عبدالحی صاحب کے ذریعہ حضرت اقدس شاہ عبد القادر رائے پوری کو جامعہ ملیہ میں تشریف لانے اور مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ حضرت اقدس رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ درخواست قبول کر لی اور ۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء کو رائے پور سے آپ نے سہارنپور کا سفر کیا، اور وہاں سے ۱۹ نومبر کو حضرت مولانا حبیب الرحمن رائے پوری کو ساتھ لے کر دہلی تشریف لائے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بستی نظام الدین دہلی میں قیام فرمایا۔ ۲۰ نومبر کو جامعہ ملیہ تشریف لے جانا تھا، لیکن فسادات اور حالات کی خرابی کی وجہ سے خود حضرت اقدس رائے پوری جامعہ ملیہ تشریف نہ لے جاسکے اور اپنی طرف سے حضرت مولانا حبیب الرحمن رائے پوری کو نمائندہ بنا کر جامعہ میں بھیجا اور ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب سے معذرت فرمائی۔ اس سے قبل رائے پور سے آپ نے اس موقع کی مناسبت سے حضرت خواجہ صاحب کے لئے ایک دستار بھجوائی تھی۔ گویا یہ حضرت کی طرف سے شعبہ تفسیر میں آپ کی خدمات پر اعزاز و انعام تھا، جو حضرت خواجہ صاحب کو اپنے پیرومرشد حضرت اقدس شاہ عبد القادر رائے پوری کے دربار سے ملا تھا۔

۱۹۵۰ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد حضرت اقدس رائے پوری اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے پاکستان آگئے اور یہاں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے عرصہ دراز تک کام کیا۔ اسی عرصہ میں آپ نے اپنے زیر نگرانی چند فقہاء کے تعاون سے ”درس قرآن“ کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھا جو کہ سات جلدوں میں ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ سے طبع ہوتا رہا۔ عام اردو دان طبقہ کے لیے انتہائی مفید ہے۔

پندرہ سال تقریباً آپ نے لاہور میں قیام فرمایا۔ اور درس قرآن کا کام کیا۔ آپ نے ۸ جنوری ۱۹۶۵ء کو لاہور میں انتقال فرمایا، جبکہ آپ کی عمر ۷۸ سال تھی اور قبرستان میانی صاحب میں حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے قریب مدفون ہیں۔ اللہم اغفرہ وارحمہ رحمة واسعة۔

”تفسیر الفرقان فی معارف القرآن“

حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرح سے جامع فکر و عمل شخصیت ہیں۔ آپ نے ایک طرف جدید علوم و افکار بڑی محنت سے پڑھے، پھر آپ نے دیوبند کے دینی ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی شفقت آپ کو حاصل ہوئی، علم حدیث حضرت سے ہی آپ نے پڑھا، دینی علوم کی تکمیل کے دوران ”جمعۃ الانصار“ کی تعلیمی تربیت کے ماحول میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کی ”حجۃ اللہ“ اور دیگر تکمیل کی کتابیں پڑھیں، حضرت سندھی رحمۃ اللہ سے تمام علوم میں فیضان حاصل کیا، ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے ماحول سے مستفید ہوئے،



قرآن حکیم سے خصوصی شغف کی وجہ سے قدیم تفسیری ذخیرہ کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا۔ اور اس سلسلہ میں حضرت سندھی سے بنیادی راہنمائی حاصل کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی درسی صحبتوں سے مستفید ہوئے اور یوں قدیم ذخیرہ تفسیر قرآن، اصول تفسیر اور تاریخ تفسیر سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے ولی اللہی اسلوب تفسیر و تعبیر کی جامعیت کو نہایت خوبی سے سمجھا۔ حضرت سندھی رحمہ اللہ کے واپس ہندوستان آمد پر ان سے دوبارہ استفادہ کا موقع ملا اور پھر آخر میں حضرت اقدس شاہ عبد القادر رائے پوری کے فکر و عمل سے پورے دل و جان سے مستفید ہوئے۔ یہ تو آپ کی فکری چٹنگی اور دین اسلام کے تاریخی ورثہ سے مضبوط تعلق کا حال ہے۔

حضرات خواجہ صاحب نے قرآن کے محض فکر کو ہی معلوم نہیں کیا، اور کتابوں کی چار دیواری میں سے اپنا فکر نہیں بنایا، بلکہ ایک تو جامع شخصیات کی صحبتوں سے فکری چٹنگی حاصل کی۔ اور دوسرے اس فکر کے مطابق عظیم جدوجہد میں عملاً شرکت کر کے بھی قرآن حکیم کو آگے پھیلانے میں عملی مسائل سے بھی آگاہی حاصل کی۔ ”جمعیۃ الانصار“ کی عملی سرگرمیوں سے لے کر ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“، ”تحریک ریشمی رومال“، ”تحریک ترک موالات“ اور ”جامعہ ملیہ“ تک سر تپا بھر پور عملی زندگی گزاری۔ قرآن کے علوم و معارف کو غالب کرنے اور قومی آزادی کے حصول کے لئے ان عظیم تحریکات و جامعات کی عملی سرگرمیوں میں حصہ لینا بلاشبہ جان جو کھوں میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

اس طرح فکر و عمل کی اس جامعیت نے مطالعہ قرآن کے سلسلہ میں آپ کے ذہن کو ایک واضح رخ دیا۔ قرآن حکیم جو انسانی سوسائٹی میں سماجی روابط کے مختلف اتار چڑھاؤ کے متعلق بڑا واضح تجزیہ پیش کرتا ہے، مولانا کا متوازن ذہن اسے اردو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، قرآن کریم نے قوموں کے واقعات و حوادث بیان کر کے ظالم و مظلوم، مطیع و منکر کی نفسیات کا احوال واقعی بیان کیا ہے، مولانا کا نقاد ذہن اپنے گرد و پیش کے واقعات پر انہیں منطبق کرتا ہے، اور ”عبرت“ حاصل کرتا ہے۔ وہ تاثرات جن سے گرد و پیش کی سوسائٹی میں قرآنی تجزیہ کے نتائج واضح طور پر سامنے آئیں، مولانا نے انہیں زبان دی اور تحریر کی صورت میں انہیں کاغذ پر منتقل کر دیا۔

اس سلسلہ میں حضرت خواجہ صاحب جب جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں نوجوانوں کو قرآنی علوم و معارف سے آگاہ کرنے اور اس حوالے سے قومی اور ملی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لئے استاذ مقرر ہوئے، تو آپ نے پوری توجہ کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ قرآنی آیات و سورت اور قصص و واقعات کے تناظر میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سماجی موثرات کو خوبصورت پیرایہ میں بیان کریں۔ اس سلسلہ میں آپ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور حضرت سندھی رحمہ اللہ کے اس بنیادی تفسیری اسلوب کو پیش نظر رکھا، جو دیوبند اور دہلی میں ان حضرات سے سیکھ کر آپ نے جذب کیا تھا۔ سب سے پہلے آپ نے ”قصص القرآن“ پر بڑے موثر پیرایہ میں ایک رسالہ ”البصائر“ کے نام سے تحریر کیا۔ آپ نے اس چھوٹے سے رسالہ میں قصص القرآن کا فلسفہ تاریخ، فراعنہ مصر کے بارے میں قرآنی تجزیہ اور ان کے انجام کا قرآنی خاکہ بڑے دلکش انداز میں تحریر فرمایا۔ یہ آپ کی پہلی تفسیری کاوش تھی، جو کتابی صورت میں طبع ہوئی۔



اس کے بعد آپ نے سورۃ البقرہ کی تفسیر ”الخلافت الکبریٰ“ کے نام سے، سورۃ آل عمران کی تفسیر ”البیان“ کے عنوان سے، سورۃ انفال و توبہ کی تفسیر ”الاصراط المستقیم“ کی صورت میں، سورۃ یوسف کی تفسیر ”عبرت“ کے عنوان سے، سورۃ نور کی تفسیر ”برہان“ کے ذیلی عنوان سے، سورۃ الحجرات کی تفسیر ”سبیل الرشاد“ اور آخری پارہ کی تفسیر ”ذکر“ کے عنوان سے تحریر فرمائی۔ اور اس پورے سلسلہ تفسیر کا نام ”تفسیر الفرقان فی معارف القرآن“ رکھا۔ اس سلسلہ تفسیر کا پہلا حصہ ”الخلافت الکبریٰ“ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ”دارالارشاد“ سے ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ سے طبع ہوا اور آخری پارے کی تفسیر ۱۹۲۸ء میں قرول باغ دہلی سے طبع ہوئی۔ اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریس کے زمانہ میں آپ نے اس تفسیر کو قلمبند کیا ہے۔

اس تفسیری مجموعہ کا بنیادی خاکہ وہی ہے جو امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن فہمی کے لئے قائم فرمایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند اور وہلی کے زمانہ قیام میں حضرت خواجہ صاحب نے حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم کی تفسیر کے حوالے سے جو کچھ پڑھا اور سمجھا تھا اس کی بنیادی ترتیب آپ کے سامنے ہے۔ حضرت خواجہ صاحب حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کی ”الفوز الکبیر“ اور ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں بیان کردہ اصول تفسیر اور قرآنی علوم و معارف کی متعین فلاسفی اور قرآنی تعلیمات کے لازمی اثر تحریک، جہاد و حریت کو پیش نظر کر کے اس تفسیری سلسلہ کو مرتب کرتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ نے قداماء کے تفسیری ذخیرہ سے بھی بھرپور استفادہ کیا، پھر قرآنی تجزیوں اور ان کے سماجی نتائج کو جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے خوبصورت پیرایہ بیان میں قلمبند کیا ہے، تاکہ پوری دلچسپی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھنے والے مخلص نوجوان اس سے پوری طرح مستفید ہوں۔ اس طرح بنیادی طور پر یہ تفسیری مجموعہ، اس جامع تفسیری اسلوب کی بڑی حد تک وضاحت کرتا ہے جو دور زوال میں محققین علماء ربانین نے متعین کیا تھا۔ اور جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات تک پورے تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ صاحب کی تفسیر کے ابتدائی حصے جب طبع ہوئے، تو خود حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکی سے جو کتابیں طلب فرمائیں تھیں، ان میں ”تفسیر خواجہ عبدالحی“ بھی ہے۔

اقبال شیدائی کے نام حضرت سندھی کے مکتوب گرامی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۴ء میں طلب کردہ کتابوں کی فہرست میں یہ تفسیر بھی شامل ہے۔ اس سے اس تفسیر میں حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے اشتیاق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ جہاں علمی حلقوں کے لئے تفسیر قرآن کے حوالے سے ایک واضح راہ عمل متعین کرتا ہے اور قرآن حکیم کی بلند تر حکمت اور فلاسفی کو جامع انداز میں بیان کرتا ہے اور اصول تفسیر اور تاریخ تفسیر کے تناظر میں ایک وقیع اسلوب کو متعارف کرتا ہے۔ وہاں تحریک، جہاد و حریت کے حوالے سے دور حاضر کے قومی اور ملی تقاضوں سے بھی بخوبی آگاہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا اسلوب خالص علمی انداز کا ہے۔ اور قرآنی فلاسفی کی روشنی میں ساری بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت خواجہ صاحب نے اپنے پیرو مرشد قطب الارشاد حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی

خواہش اور امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے کام کرنے کی حکمت عملی کے پیش نظر، عام فہم انداز میں ”درس قرآن“ کے نام سے ایک ترجمہ اور تفسیر لکھا۔ ان دونوں بزرگوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کم تعلیم یافتہ عوام کے ذہنوں کے لئے قرآنی تعلیم عام فہم انداز میں بیان کی جائے۔ بالخصوص قرآن کریم اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے جن بنیادی اخلاقیات کا تذکرہ کرتا ہے، جس سے قومی سطح پر شہری زندگی کی تہذیب و ترتیب قائم ہوتی ہے، اسے اجاگر کیا جائے۔ یہ دونوں حضرات اس خطے کی سماجی زندگی کے مطالعہ سے، اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہاں کے عوام کو شہری زندگی کے بنیادی حقوق کے فہم و شعور سے عام طور پر محروم رکھا گیا ہے۔ علماء اور دینی حلقہ کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دروس قرآن کے ذریعہ اس خطہ کے عوام کے ذہنوں میں بنیادی انسانی حقوق اور سماجی زندگی کے تقاضوں کا شعور بیدار کریں۔ وہ مشنری انداز میں خدمت انسانیت کے جذبہ سے قرآن تعلیم کے حوالے سے عوامی شعور کو منظم کریں۔ اس پس منظر میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گمنامی میں رہتے ہوئے ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ اس ”درس قرآن“ سے معمولی تعلیم یافتہ فرد کے ذہن میں بھی قرآنی اقدار اور اجتماعی و انفرادی اخلاقیات کا بنیادی جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درس قرآن بھی بہت مقبول ہوا اور سات جلدوں میں بار بار طبع ہوتا رہا ہے۔

زیر نظر ”تفسیری مجموعہ“ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے لئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تفسیری ذوق رکھنے والوں کے لیے بنیادی رہنما کام دیتا ہے۔ اس کا اسی حوالے سے مطالعہ کرنا چاہئے اور اس میں بیان کردہ علوم و معارف سے مستفید ہونا چاہئے۔

حضرت خواجہ صاحب کی ان تفسیری کاوشوں کے بارے میں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ یہ تفسیروں کے تحریری ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں اور نہ ہی ان کا مقصد کوئی نام آوری اور شہرت کا حصول ہے، بلکہ اس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل کے ذہنوں میں وہ فکر و عمل اجاگر کرنا ہے، جس سے انہیں اپنی قرآنی ذمہ داریوں سے آگاہی حاصل ہو اور اس سے ہوش مند فکر اور منظم جوش عمل پیدا ہو۔ وہی فکر و عمل جس نے ایک دور میں قرآن عظیم کے ماننے والوں کو پوری دنیا پر غالب کر دیا تھا۔ حق غالب ہوا تھا اور باطل کو سرنگوں ہونا پڑا تھا۔ یہ کتاب ایک مقصد کے لئے تحریر کی گئی ہے، کہ اس کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو پورے شعور کے ساتھ سمجھا جائے اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کے لئے منظم جدوجہد کی جائے۔ قارئین بھی اس کو اسی جذبہ سے پڑھیں گے، تو اس کے مفید اثرات و نتائج سے بہرہ ور ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس تفسیری مجموعہ سے پوری طرح مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور قرآن حکیم کی سمجھ اور شعور سے بہرہ یاب کرے۔ آمین۔

بارون آباد

عبدالحق آزاد

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء

## حوالہ جات

- ۱۔ سندھی عبید اللہ مولانا، التہدید التریف امتہ التجدید عربی مطبوعہ حیدر آباد سندھ۔
- ۲۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، مقدمہ قواعد ومقاصد "جمعۃ الانصار" ص ۲ مطبوعہ دیوبند۔
- ۳۔ ایضاً ص: ۳
- ۴۔ سندھی، مختصر روند اد اجلاس "جمعۃ الانصار" ص ۱۲ تا ۶۲ طبع دیوبند۔
- ۵۔ سندھی، رواند اد جلسہ مؤثر الانصار مراد آباد ص ۶۳۱ طبع دیوبند۔
- ۶۔ سندھی، قواعد ومقاصد "جمعۃ الانصار" ص ۸۲ طبع دیوبند۔
- ۷۔ ایضاً ص ۸۔
- ۸۔ سفرنامہ اسیر مالٹا طبع دیوبند
- ۹۔ سندھی، مضمون "چندہ ہلال احرار و دارالعلوم دیوبند" ماہنامہ "القاسم" ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ص ۹۱، ۹۲ طبع دیوبند۔
- ۱۰۔ دیوبندی اصغر حسین، سید حیات شیخ الہند" طبع دیوبند۔
- ۱۱۔ الحسینی، نفیس، سید، مضمون، "تحریک ریشمی رومال کے سرپرست اعلیٰ" مطبوعہ "ماہنامہ تذکرہ" لاہور۔
- ۱۲۔ سندھی، امالی عبیدیہ قلمی ص ۴۹۱ مکتوبہ مولانا بشیر احمد لدھیانوی۔
- ۱۳۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا "احاطہ دارالعلوم میں بیٹے ہوئے دن" ص ۷۱۔ مطبوعہ مکتبہ حمادیہ کراچی۔
- ۱۴۔ جبار اللہ موسیٰ، الہام الرحمن ص ۶۳۱ مطبوعہ حیدر آباد۔
- ۱۵۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، التہدید التریف امتہ التجدید "عربی ص ۴۲ طبع حیدر آباد۔
- ۱۶۔ افکار سندھی، شعور و آگہی ص ۳۱ طبع لاہور۔
- ۱۷۔ سندھی، التہدید عربی ص ۶۲ طبع حیدر آباد۔
- ۱۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵۲ جون ۱۹۱۳ء ص ۳۱ شمارہ ۴۲ ص ۵۔
- ۱۹۔ سندھی، التہدید عربی ص ۷۲ طبع حیدر آباد۔
- ۲۰۔ ریشمی خطوط سازش کیس اردو ترجمہ از سید محمد میاں صاحب ص ۶۲ ص ۸۶۲ طبع لاہور۔
- ۲۱۔ ایضاً ص ۱۷۲ تا ۱۷۳۔
- ۲۲۔ جوہر محمد علی، مولانا، آپ بیتی اور فکری مقالات ص ۶۴ طبع لاہور۔
- ۲۳۔ ریشمی خطوط سازش کیس کی ڈائیکٹری ص ۵۴۲ طبع لاہور۔
- ۲۴۔ فاروقی عبدالحی خواجہ، مولانا پیش لفظ "البصائر" ص ۵ طبع دہلی۔
- ۲۵۔ ریشمی خطوط سازش کیس ص ۸۹۳ طبع لاہور۔
- ۲۶۔ ایضاً
- ۲۷۔ فاروقی، پیش لفظ۔ البصائر، ص ۵ طبع مکتبہ برہان دہلی۔